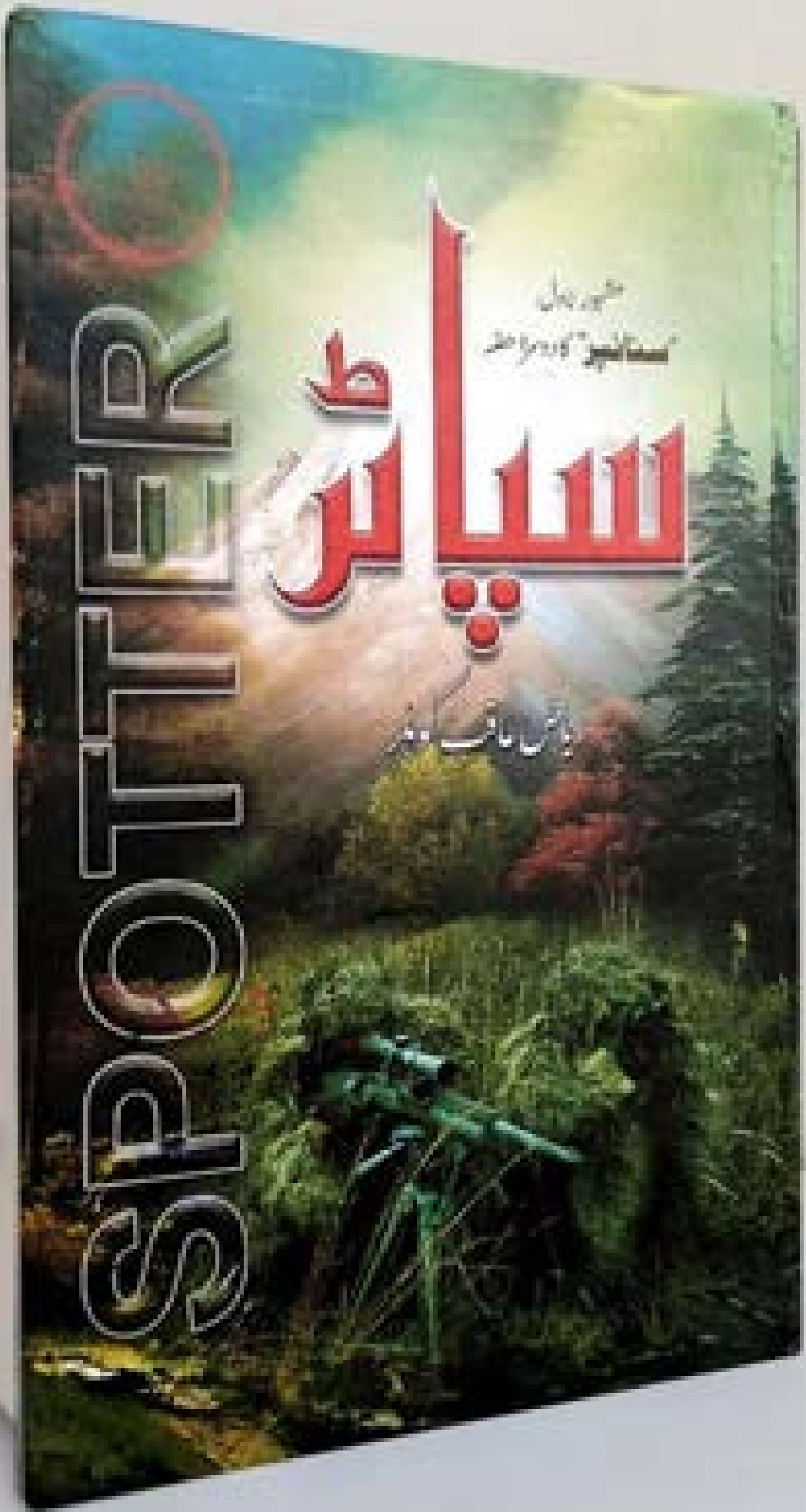
سپائر
عمیرہ احمد

دشمنوں کی صفوں میں کھلبلی مچا دینے والے نشانہ باز کے ہنگامہ خیز شب و روز

سپاٹر

راوی: راجا ذیشان حیدر

ریاض عاقب کوہلر

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور
فون: 042-37652546, 37668958
www.alquraish.com email: info@alquraish.com

انتساب

برادرانِ مکرم.....

رزاق شاہد کوہلر،

جاوید اقبال کوہلر

اور تینوں بہنوں.....

مسز عبدالغفار کوہلر

مسز عصمت اللہ کوہلر

مسز رحمت اللہ کے نام

ریاض عاقب کوہلر کی ناول نگاری

از خورشید ربانی (شاعر، ادیب، کالم نگار و محقق)

اردو کے اہم نقاد اور محقق ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے پاپولر فکشن کے بارے میں لکھا ہے کہ۔''اس قسم کی ناول نگاری میں ایک ہی قسم کی کہانی ہوتی ہے۔ان کے ناول قاری کے دل میں جذبات پیدا نہیں کر سکتے۔اور نہ پڑھنے والے کے شعور میں کوئی بالیدگی پیدا ہو سکتی ہے۔اس طرح کے ناول لکھ کر پیسے تو کمائے جا سکتے ہیں مگر ادب میں مقام حاصل نہیں کیا جا سکتا۔''

جبکہ میرا خیال ہے پاپولر فکشن کو جتنی توجہ ملنا چاہیے تھی اتنی نہیں ملی۔حالاں کہ اس ضمن میں بعض تحریریں حیران کن ہیں۔دنیا میں پاپولر فکشن کو توجہ سے پڑھا جاتا ہے۔اور ان لکھاریوں کی ہر سطح پر پذیرائی کی جاتی ہے۔مگر ہمارے ہاں صورت حال قدرے مختلف ہے۔پاپولر فکشن لکھنے والوں کا ایک مسئلہ تو قاری کی ضرورت پورا کرنا ہے۔دوسرا وہ ادب عالیہ کی انجمن سے دور ہی رہتے ہیں۔اس کے اسباب پر پھر کبھی بات ہوگی اس وقت مجھے ریاض عاقب کوہلر کی ناول نگاری پر اپنے تاثرات نوٹ کرانے ہیں۔اردو پاپولر فکشن لکھنے والوں میں سب سے زیادہ شہرت جن لوگوں کو ملی ان میں رضیہ بٹ، عنایت اللہ، نسیم حجازی، ابن صفی، مظہر کلیم ایم اے، قمر اجنالوی، محی الدین نواب، عمیرہ احمد، نمرہ احمد، ہاشم ندیم، رزاق شاہد اور دیگر شامل ہیں۔

ریاض عاقب کوہلر بھی اسی زنجیر کا حلقہ ہیں۔ان کے اب تک کئی ناول شائع ہو چکے ہیں۔جن میں سے چند میں نے پڑھے ہیں۔اور اس بات پر حیران ہوں کہ پاپولر فکشن نگاروں پر ادب عالیہ کے دروازے کیوں بند ہیں۔ریاض عاقب کوہلر کی تحریر صاف اور شستہ ہونے کے ساتھ ساتھ رواں دواں ہے۔ان کے ہاں تاریخی و ادبی شعور اور اپنے عہد کی نفسیات کی جھلک بھی ملتی ہے۔ان کا ناول سنائپر ایک فوجی کی داستان ہے جو مختلف محاذوں پر داد شجاعت دیتا نظر آتا ہے۔اس ناول میں جنگ کے میدان کے ساتھ ساتھ گھریلو اور رومانی زندگی کی جھلیاں بھی موجود ہیں۔ہیرو ذیشان حیدر کی رومانہ اور پلوشہ خان سے محبت کی داستاں کسی بھی طرح ادب عالیہ کے معیارات سے کم تر نہیں۔ان نسائی کرداروں میں حقیقی زندگی کی بھرپور رمک موجود ہے۔مکالمے اتنے خوب صورت ہیں کہ سبحان اللہ۔ان کے ناول عدوات جو کہ ایک سماجی ناول ہے۔کے مرکزی کردار ثوبان اور نیہا کی زندگی جس بھیانک ماحول سے گزر کر محبت کی دل کش فضا سے ہم کنار ہوتی۔اس پر قربان جایئے۔ان کا ناول ''وفا ہے ذات عورت کی'' بھی ایک سماجی ناول ہے لیکن حقیقت کے بہت قریب

ہے۔ ہمارا سماج ایسے مسائل اور معاملات میں اس بری طرح الجھا ہوا ہے کہ نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی۔ ریاض عاقب کوہلر کی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر قلم اٹھائیں اسے خوب صورتی کے ساتھ انجام تک لے جاتے ہیں۔ مجھے ان کے ناولوں میں جو خاص بات نظر آتی ہے وہ نسائی کرداروں کی شوخی طبع ہے۔ وہ ''سائپر'' کی پلوشہ ہو یا وفا ہے ذات عورت کی ساحرہ (مانو)۔ ہر دو کردار اس قدر شوخ اور زندگی سے بھرپور ہیں کہ دل میں اتر جاتے ہیں۔ بردہ کی قتیلہ بھی شاندار کردار ہے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ریاض عاقب کوہلر ڈیرہ اسماعیل خان ہی نہیں خیبر پختونخوا کے ایک اہم ناول نگار ہیں۔ یہ بات بھی خوش آئند ہے کہ اردو نئی نسل میں اچھے لکھاری ابھر کر سامنے آ رہے ہیں۔ نئے ناول کی اشاعت پر میں بھائی ریاض عاقب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اردو ناول کی تاریخ میں ان کتابیں اہم اضافہ ثابت ہوں گی۔ اور عوامی و ادبی حلقوں میں اس کی خوب پذیرائی ہوگی۔

—●—

آسمان ادب کا درخشندہ ستارا

عارف محمود (مدیر ماہنامہ حکایت، ادیب، تبصرہ نگار، محقق)

گزشتہ چالیس سے زائد برسوں سے میں ماہنامہ حکایت لاہور سے وابستہ ہوں۔ اس طویل عرصے میں میں نے بے شمار موسموں کے سرد و گرم دیکھے۔ آسمان ادب کے افق پر بہت سے سورجوں کو ابھرتے، ڈوبتے دیکھا۔ یہی اس دنیا کی ریت ہے۔ بہت سے سورج ابھرے اور ڈھل گئے، لیکن ریاض عاقب کوہلر جس آب و تاب سے طلوع ہوا۔ اس کا انداز ہی سب سے الگ تھا۔ اس کی تحریر نے قارئین کو اپنے سحر میں جکڑ لیا ہر طرف سے داد و تحسین کا طوفان امڈ پڑا۔ خطوط و فون کالز کا تانتا بندھ گیا۔ ایک کے بعد ایک آنے والے ناول نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ لوگ ان کی تحریروں کے دیوانے ہو گئے۔ اور جلد ہی ان کی شہرت کا سورج نصف النہار پر جا پہنچا۔

میں نے ان جیسا ذہین و فطین قلم کار کم ہی دیکھا ہے۔ ان کا ہاتھ قاری کی نبض پر ہوتا ہے۔ قاری کو تحریر کے سحر میں ایسے باندھتے ہیں کہ وہ ناول ختم ہونے کے کئی دن بعد تک بھی اس کے سحر میں ڈوبا رہتا ہے۔

تحریر میں بہتے پانی کی سی روانی ہے۔ مکالمہ نگاری میں برجستگی، جملوں میں تلوار کی سی کاٹ، برمحل شوخی و شرارت، ایکشن ایسا کہ پڑھنے والے کے سانس رکنے لگیں۔ عشق و محبت کے بے مثال مکالمے، برجستہ ضرب الامثال اور شعروں کا استعمال انھیں ایک بلند مقام عطا کرتا ہے۔

سنائپر کی بے مثال کامیابی کے بعد قارئین کا اصرار تھا کہ اس کا دوسرا حصہ بھی آنا چاہیے۔ قارئین کی خواہش کو مقدم جانتے ہوئے محترم ریاض عاقب کوہلر نے نے "سپاٹر" لکھا اور خوب لکھا۔ بلند مقام پر پہنچنا اتنا اہم نہیں ہوتا، جتنا اس مقام کو برقرار رکھنا ہے۔ ان کی یہی خوبی ان کو دوسرے لکھاریوں سے بلند مقام عطا کرتی ہے۔

جو بھی لکھتے ہیں اس پر پوری تحقیق کرتے ہیں۔ بیسیوں کتابیں کھنگالتے ہیں تب جا کر کچھ لکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لکھے کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ قدرت نے انھیں لکھنے کی بے پناہ صلاحیت بخشی ہے۔ میرا ان کو مشورہ ہے کہ وہ فلم و ڈرامے کی طرف بھی جائیں جہاں نئی کامیابیاں ان کی منتظر ہیں۔

میں اپنی طرف سے اور ادارہ حکایت کی طرف سے ان کی بہت سی کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں۔

استاد محترم کی ناول نگاری

صوفیہ عافین کوہلر (ناول نگار، شاعرہ)

شاعری ہو یا نثر، الفاظ کی تخلیق کو دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ تب جا کر کوئی بھی تخلیق مکمل ہو پاتی ہے۔ جیسے الفاظ کے موتیوں کو نظم کی مالا میں پرونا عرف عام میں شاعری کہلاتا ہے یونہی الفاظ کی جادوگری سے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ان دیکھے کرداروں کو چلتا پھرتا دکھانا ناول نگاری کہلاتا ہے۔ یہاں میں نے نثر نگاری اس لیے نہیں لکھا کہ نظم کے برعکس نثر کی اصناف کی تعریف کسی جامع جملے سے نہیں کی جاسکتی۔

استاد محترم ریاض عاقب کوہلر بھی لفظوں کے کھلاڑی یعنی لکھاڑی ہیں۔ ان کے خوب صورت ناول پر اظہار خیال کرنا گو مجھ جیسی نئی، نوآموز اور دو ناولوں کی ادیبہ کے لیے بہت دشوار ہے لیکن کوشش کرنے میں چونکہ کوئی حرج نہ لگا اس لیے کچھ ٹوٹا پھوٹا لکھ ڈالا۔

لکھنا کتنا مشکل ہے، حروف کو الفاظ کا جامہ پہنا کر فقروں کے قالب میں ڈھالنا کتنا دشوار ہے، کرداروں کی تخلیق اور ان کے مزاج کو آخر تک نبھا ہنا کتنا وقت طلب ہے یہ تب معلوم پڑتا ہے جب قلم کی نوک کاغذ پر رکھ کر کچھ لکھنے کی کوشش کی جائے۔ اپنے پہلے ناول ''عین کی جنگ'' کو لکھتے وقت میں جن مشکلات اور دشواریوں سے دوچار ہوئی اور پھر اپنے دوسرے ناول ''زندگی کے میلے'' میں انھی مشکلات کا پیہم سامنا کیا تو یہ عقدہ وا ہوا کہ زیادہ لکھنے سے لکھاری کی مشکلات میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اگرچہ املا کی اغلاط میں کمی، فقرات کی بنت میں چابک دستی اور الفاظ کے ذخیرہ میں اضافہ تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن نیا پلاٹ سوچنا، اس پر کہانی کو آگے بڑھانا، کرداروں کی تخلیق، مناظر کو صفحہ قرطاس پر اتارنا اور کچھ اچھوتا پیش کرنا یہ ایسی دشواریاں ہیں جو ایک لکھاری کو ہمیشہ لاحق رہتی ہیں۔

استاد محترم ریاض عاقب کوہلر لکھائی کے میدان کے پرانے شاہسوار ہیں اور میری ناقص رائے کے مطابق ان کے ناولوں کی سب سے بڑی خوبی ان کا ہر ناول میں نئے پلاٹ کے ساتھ جلوہ گر ہونا ہے۔ آپ کا پہلا ناول بھگوڑا تھا اس کے بعد دلدل، وفا ہے ذات عورت کی، جنون عشق، عداوت، رکھیل، بردہ، پشیمان، بھگتان، لاڈو رانی، سناپھر اور اب آخری ناول سپاٹر تک سارے ناولوں کو باری باری پڑھتے جائیں ہر ناول کی کہانی دوسرے سے مختلف لگے گی۔ سناپھر اور سپاٹر میں تھوڑی بہت مماثلت اس لیے نظر آتی ہے کہ سپاٹر، سناپھر ہی کا تسلسل ہے۔ دوسری خوبی اردو کی ترویج ہے، کیوں کہ استاد محترم انگریزی الفاظ کا استعمال بہ حالت مجبوری ہی کرتے ہیں۔ (ویسے آج کل میں بھی یہی کوشش کر رہی ہوں کہ انگریزی الفاظ کا کم سے کم استعمال کروں) تیسری خوبی کہانی کا تسلسل و روانی ہے کہ آپ کا ناول ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے

ہموار سڑک پر گاڑی چلتی ہے یا میدانی علاقوں میں دریا کے بہاؤ میں سکون و تسلسل نظر آتا ہے۔ چوتھی خوبی کہانی کا وقت پر اختتام، کبھی یہ نہیں لگا کہ آپ نے کہانی کو خواہ مخواہ طول دیا ہو یا اچانک ختم کر دیا ہو۔ بہترین مکالمہ، خوب صورت کرداروں کی تخلیق، عمدہ منظر نگاری، اچھوتا پلاٹ، بیش بہا معلومات اور دینداری کا تڑکا یہ ایسی خوبیاں ہیں جو آپ کے ہر ناول کا خاصا ہیں۔ آپ کے ناولوں کی جو ایک اور خوبی مجھے محسوس ہوئی ہے کہ ایک بار ناول کو شروع کر لیں تو ختم کیے بنا رہا نہیں جاتا۔

میری طرف سے آپ کو نئے ناول سپاٹر کی اشاعت کی پیشگی مبارک۔ اللہ پاک سے دعا ہے آپ کو صحت سلامتی اور ایمان والی زندگی عطا ہو اور اللہ پاک آپ کو ڈھیروں کامیابیوں سے ہم کنار کرے۔ (آمین)

—●—

سپاہی ادیب

امجد جاوید (ناول نگار، ٹی وی ڈراما اسکرپٹ رائٹر، کالم نگار، شاعر)

''سنائپر'' جب ریاض عاقب کوہلر کا ناول سنائپر میرے سامنے آیا تو نام کے اچھوتے پن کی وجہ سے میں اسے پڑھنے میں خاصا متجسس تھا۔ بلکہ سچ کہوں تو مجھے سنائپر کا معنی تک معلوم نہ تھا۔ اردو لغات کا سہارا لیا تو سنائپر نام ڈھونڈنے میں کامیابی نہ ہوئی۔ تب انگریزی کا لغت اٹھانا پڑا۔ تب پتا چلا کہ سنائپر ''چھپ کر نشانہ لگانے والے'' کو کہتے ہیں۔ تب خاصی حیرانی ہوئی۔

چونکہ میں جانتا ہوں ریاض عاقب کوہلر کا تعلق بھی فوج سے ہے اور جناب اسلحہ کے بارے بھی بیش بہا معلومات رکھتے ہیں۔ اس لیے یقیناً ناول کو خاص ہونا چاہیے تھا۔ اور ناول پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ ریاض عاقب کوہلر خود بھی سنائپر رہ چکے ہیں۔

بہ ہر حال ناول پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ ریاض عاقب کوہلر نے سنائپر کے بارے جو معلومات ہم تک پہنچائیں، جس انداز میں سنائپنگ کو کھول کھول کر بیان کیا یقیناً ایسا کوئی عام آدمی نہیں کر سکتا تھا۔ ایکشن ،سسپنس، تکنیک، رومان، معاشرت اور نہ جانے کون کون سے لوازم ناول میں شامل تھے۔ اس بہترین ناول نے مجھے گرویدہ کر لیا۔ اور پھر سنائپر کے سحر سے نہیں نکلے تھے کہ محترم نے اس کا دوسرا حصہ ''سپاٹر'' لکھ مارا۔ سپاٹر ،سنائپر کے ساتھی کو کہتے ہیں۔ سپاٹر'' ناول کو سنائپر ناول کا باقاعدہ حصہ سمجھا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ اس میں تمام مرکزی کردار وہی ہیں جو سنائپر میں شامل تھے۔ البتہ کہانی نئی اور اچھوتی ہے۔ سنائپر میں شہروں کا ذکر سرسری تھا اور ناول کا زیادہ تر حصہ پہاڑوں، وادیوں اور جنگلوں پر مشتمل تھا تو سپاٹر میں اس کے برعکس ہے کہ پہاڑوں وغیرہ کا تذکرہ کم کم ہے اور زیادہ ناول شہری ماحول پر لکھا گیا ہے۔ مجھے دوسرا حصہ پہلے سے زیادہ اچھا لگا ہے۔ شاید پہلا حصہ پڑھنے کے بعد سنائپر کے کرداروں سے محبت ہو گئی تھی۔

ریاض عاقب کوہلر بھائی کے لیے بہت سی دعائیں اور خواہش ہے کہ آپ ہمیں ایسی ہی بہترین کہانیوں سے نوازتے رہیں۔ تاکہ لکھنے کے سے جو وقت بچے وہ میں اچھے مطالعے میں صرف کر سکوں۔

ہر دل عزیز لکھاری

از رزاق شاہد کوہلر (ناول نگار، کالم نگار، ریڈیو ڈراما اسکرپٹ رائٹر)

اپنے بیس سالہ پیشہ ورانہ دور میں راقم نے بے شمار مشہور و معروف ملکی و غیر ملکی ادباء کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے۔ جن میں ڈائجسٹ لکھاری سے لے کر ادبی رسائل میں چھپنے والے بڑے بڑے نام شامل ہیں۔ انھی میں ایک نام ریاض عاقب کوہلر کا بھی ہے۔ جس نے بہت ہی کم عرصہ میں قارئین کا ایک وسیع حلقہ بنالیا ہے۔ اور ان قارئین کی تعداد آئے روز بڑھتی ہی جارہی ہے۔ آپ نے جتنا بھی لکھا ہے بامقصد اور عمدہ لکھا ہے۔ ورنہ موجودہ دور میں کسی مصنف کو اس قدر چاہنے والے قارئین کا میسر آنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

امید واثق ہے کہ گزشتہ ناول ''سنائپر'' کی طرح آپ نے ''سپاٹر'' بھی پوری لگن کے ساتھ ہی صفحہ قرطاس پر اتارا ہوگا۔ جس کا سحر قارئین پر مدتوں طاری رہے گا۔ دعا ہے کہ آپ کا قلم سے رشتا برقرار رہے۔ اور آپ کے قارئین کو ایسے ہی شہکار پڑھنے کو میسر آتے رہیں۔

—●—

چند باتیں

''سنائپر'' کی ادبی وعوامی حلقوں میں پذیرائی میرے لیے حیران کن وانوکھی ہونے کے بجائے خوش کن ،متوقع اور یقینی تھی۔ ناول کو تحریر کرتے وقت میں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔اور الحمدللہ،اللہ پاک نے میری محنت کا پھل میری امید سے بڑھ کر دیا۔سنائپر کو بے حد پسند کیا گیا اور عوام وخواص میں جہاں اس کی مانگ میں مسلسل اضافہ دیکھنے میں آیا۔وہیں قارئین کا ایک وسیع حلقہ خواہش مند تھا کہ میں اس کا دوسرا حصہ بھی لکھوں۔احباب کی اکثریت نے بھی مجبور کیا اور چند ایسے خواص بھی تھے جو ضد پر اڑ گئے کہ مجھے سنائپر کا دوسرا حصہ لکھنا ہی پڑے گا۔کسی بھی لکھاری کی ایسی تخلیق جو شہرت کی بلندیوں کو چھو لے،مسلسل عروج کی منازل طے کرتی نظر آئے اور اسے پسند کرنے والوں کی تعداد روز افزوں ترقی واضافہ ہو رہا ہوں ؛ایسی تخلیق کو آگے بڑھانا جہاں از حد مشکل ہوتا ہے وہیں یہ دھڑکا بھی لگا رہتا ہے کہ کہیں قارئین اسے ناپسندیدگی کی سند سے نہ نواز دیں۔ بہ ہر حال مشکل تھا یا آسان ہم نے لکھ کر قارئین کی عدالت میں پیش کر دیا۔سپاٹر کی پذیرائی یا ناکامی ہی طے کرے گی کہ راجا ذیشان حیدر کی زندگی کے مزید واقعات پر قلم اٹھایا جائے یا جو کچھ لکھا جا چکا ہے اتنا کافی ہوگا۔سنائپر اور سپاٹر اپنی اپنی جگہ مستقل وعلیحدہ ناول ہیں اور انھیں ملا کر پڑھا جائے تو ایک ہی ناول کا مزا بھی دے سکتے ہیں۔اب آپ لوگوں کی رائے کا انتظار رہے گا۔

آپ تمام کا ریاض عاقب کوہلر

aqibkohlar@gmail.com

''ٹخ ٹخ ٹخ.....تڑتڑتڑ.....'' ایک دم تیز فائرنگ شروع ہوگئی تھی۔ میری آنکھ پہلی گولی ہی سے کھل گئی تھی۔ اور بلا شک وشبہ وہ روزمرہ کا تلاشی فائر نہیں تھا۔ (تلاشی فائر سے مراد دفاع لی ہوئی فوج کا وہ فائر ہوتا ہے جو دشمن کی موجودی کے خطرے کو مدنظر رکھ کر سنتری دشمن کو تاڑے بغیر اندازے سے کرتا ہے ایسا فائر فقط شک دور کرنے کو کیا جاتا ہے)

ساتھ والے بستر پر لیٹا سردار خان بھی اٹھ بیٹھا تھا۔ گولیاں رہائشی مورچے کی غربی دیوار سے ٹکرائیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بہت قریب سے گولیاں چلائی گئی ہوں۔ کلاشن کوف اٹھاتے ہوئے وہ اطمینان سے بولا۔

''راجے! بہتر ہوگا کہ کلمہ شہادت دہرالے۔''

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تم جیسے خان ہی پٹھانوں کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں کہ گولیوں کی آواز پر تمھیں کلمہ شہادت ہی بھول گیا ہے۔''

فوجی جوانوں نے جوابی فائرنگ شروع کردی تھی۔ نمایاں آواز ''رانی'' کی تھی۔ پاک آرمی کے جوان ''ایل ایم جی'' کو پیار سے رانی کہتے ہیں۔ اور بلاشبہ یہ میدان جنگ کی رانی ہے۔ ایک منٹ میں گیارہ سو سے تیرہ سو گولیاں فائر کرنے والی ایسی گن جس کی آواز سن کر ہی دشمن پر لرزہ طاری ہو جائے۔ یہ تیز ترین ریٹ آف فائر والی گن ہے اور اسی وجہ سے اس کے ساتھ دو بیرل استعمال کی جاتی ہیں۔ جونہی ایک بیرل گرم ہوتی ہے فی الفور دوسری بیرل ڈال دی جاتی ہے۔ بیرل تبدیل کرنے کا طریقہ کار نہایت سادہ اور آسان ہے اور اس پر سیکنڈ بھر سے زیادہ وقت بھی خرچ نہیں ہوتا۔

وہ جھکے جھکے دروازے کے قریب ہوا۔ ''کلمہ شہادت کی تلقین تمھاری آخرت سنوارنے کو کی ہے، ورنہ تمھارے کالے کرتوتوں سے بعید ہے کہ تمھیں کلمہ پڑھنا یاد رہے۔''

وہ وقت لفظوں کی گولہ باری کے بجائے عملی اقدام کا تھا میں خاموشی سے اس کی تقلید کرتے ہوئے دروازے کے قریب ہوگیا تھا۔ ایل ایم جی کے ساتھ کلاشن کوفوں کی تڑتڑاہٹ بھی جاری تھی۔ سردار دروازہ کھولنے سے پہلے چھاتی کے بل لیٹ گیا تھا۔ میں نے روشنی بجھادی۔ رات کے وقت سب سے اچھا ہدف روشنی ہی بنتی ہے۔ اور پھر لکڑی کا دروازہ بھی گولی کے خلاف کوئی آڑ مہیا نہیں کرتا۔

عموماً ایکشن فلموں میں ہیرو صاحب کسی میز وغیرہ کی آڑ لے کر گولیوں کی بوچھاڑ سے یوں بچ جاتا ہے جیسے بکتر بند

میں پناہ لے رکھی ہو۔ اور میز کی موٹائی بھی ایک ادھ انچ سے کم ہوتی ہے۔ یاد رکھیں نو دس انچ تک موٹی لکڑی بھی فائر کے خلاف آڑ مہیا نہیں کرتی، تو ایک ادھ انچ موٹی لکڑی کیسے گولی کو روک سکتی ہے۔

رہائشی بینکر کے سامنے فائری خندقیں بنی تھی۔ میدانی علاقے میں ایسی خندقیں زمین کو کھود کر بنائی جاتی ہیں اور کھدائی سے جو مٹی نکلتی ہے وہ خندق کے سامنے بند کی صورت ڈھیر کر دی جاتی ہے۔ لیکن پہاڑی علاقے میں کھدائی نہیں کی جا سکتی اور پتھروں کی دیوار بنا کر فائری خندق بنائی جاتی ہے۔ تا کہ نقل و حرکت کو دشمن کے فائر اور نگرانی سے محفوظ رکھا جا سکے۔

فائری خندق رہائشی بینکر سے ذرا نشیب میں بنی تھی، ہم وہاں تک کھڑے ہو کر نہیں جا سکتے تھے۔ پہاڑوں پر مورچے اور رہائش بنانے میں سب سے بڑا مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ جہاں جگہ اجازت دیتی ہے وہاں دیوار کھڑی کر دی جاتی ہے۔ رہائشی بینکر کی دیواریں بنانے کو تو جگہ مل جاتی ہے لیکن فائری خندقوں کی مسلسل دیوار بنانے کو کافی احتیاطوں کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ وہ دیوار بھی کمروں سے ذرا نشیب میں تھی اور لیٹ ہی کر گولیوں کی بوچھاڑ سے بچا جا سکتا تھا۔

ہم کرالنگ کرتے ہوئے نیچے پہنچے۔ کلاشن کوفوں کے دہانے بارش کے قطروں کی طرح گولیاں اگل رہے تھے۔ دہشت گردوں کی بڑی تعداد حملہ آور ہوئی تھی، دہشت گردوں کی فائرنگ کا عمومی طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ، آڑ میں رہتے ہوئے کلاشن کوف کی نال (بیرل) کو ہدف کی جانب سیدھا کر کے حفاظتی لیور (سیفٹی) کو خودکار (آٹو میٹک) حالت پر رکھ کر لبلبی (ٹریگر) دبا دیتے ہیں۔ اور جب تک میگزین خالی نہیں ہو جاتی لبلبی سے انگلی نہیں اٹھاتے۔ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ کلاشن کوف کے ساتھ مختلف قسم کی میگزینیں استعمال ہوتی ہیں جن میں تیس، چالیس اور پچھتر گولیوں کی میگزینوں کا استعمال عام ہے۔ کلاشن کوفوں کے گرجنے کے ساتھ ایل ایم جی اور جی تھری کا دھاڑنا بھی شروع تھا۔

ہم اس وقت ''کیو جے ٹاپ'' پر موجود تھے۔ شوال وادی عبور کرنے کے بعد ایک مسلسل پہاڑی سلسلہ ہے جو شمالاً جنوباً پھیلا ہوا ہے۔ اس کے سامنے وسیع اور چوڑا نالہ ہے جس کی چوڑائی تقریباً ساڑھے چار پانچ کلومیٹر کے بہ قدر ہوگی۔ نالے کا زیادہ تر حصہ خشک ہے اور درمیان میں بہت کم مقدار میں پانی بہہ رہا ہے جس کا بہاؤ جنوب سے شمال کی جانب ہے۔ اسے افغان نالہ کہا جاتا ہے۔ یہ صرف کہنے کی حد تک نالہ ہے ورنہ اس کی وسعت کسی بھی طرح چوڑی وادی سے کم نہیں ہے۔ نالے میں چھوٹی چھوٹی ٹیکریاں اور پتھر کی چٹانیں بکثرت پھیلی ہیں۔ جتنی کثرت سے چٹانیں اور ٹیکریاں پھیلی ہیں اس سے زیادہ تعداد میں دہشت گردوں کی ٹولیاں اکٹھی ہوئی ہیں۔ جو آرمی کے خلاف تو کارروائیاں کرتے ہی ہیں معصوم مقامی لوگوں کو تنگ کرنے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

نالہ عبور کر کے ایک اور پہاڑی ہے۔ جو کیو جے ٹاپ کے متوازی شمال سے جنوب کی طرف پھیلی ہے۔ اس کے بلند مقام کا نام باک ٹاپ ہے۔ باک ٹاپ کی بلندی قریباً گیارہ بارہ ہزار فٹ ہے۔ اور شمالاً جنوباً اس کی بلندی بتدریج کم ہوتی ہوئی زمین سے مل جاتی ہے۔ اس سے ملحق جنوب کی جانب افغانستان کے شہر لمن کی حدود شروع ہو جاتی ہے۔ اور شمال کی جانب ایک بڑا گاؤں گرش خیل کلے ہے۔ گرش خیل کلے میں امریکی فوج کی ایک چھاؤنی بھی موجود ہے، جبکہ لمن شہر کے شمالی جانب انڈیا کی ایک پوسٹ ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ دہشت گردوں کے اصل ماخذ امریکی چھاؤنی اور انڈین پوسٹ ہی ہیں۔ باک ٹاپ پر بھی دہشت گردوں کے ٹھکانے موجود ہیں۔ انڈیا ہماری سرحد کو کسی صورت محفوظ نہیں دیکھ سکتا اور باڑ کو مکمل ہونے سے روکنے کو مسلسل دہشت گردانہ کارروائیاں کروا رہا ہے۔ بلکہ دہشت گردوں کے ساتھ عموماً انڈیا کے سنائپر بھی پاکستان آرمی کے خلاف مصروف کار نظر آتے ہیں۔ سنائپنگ کے علاوہ گاہے گاہے جسمانی حملے بھی ہوتے رہتے ہیں جن کا منہ توڑ جواب دیا جاتا ہے۔

پہلے سردار اور میں انگور اڈے سے جنوب کی جانب لکواڑا سیکٹر میں تعینات ہوئے مگر وہاں سنائپر حملے قلیل تعداد میں

ہوتے تھے، تبھی ہماری ضرورت کیوجے ٹاپ پر محسوس کی جانے لگی اور ہم یہاں پہنچ گئے تھے۔ دو ہفتے ہونے کو تھے، دن بھر مورچے میں لیٹ کر دشمن کے سنائپروں کو تاڑتے اور شام کو رہائشی بنکر میں گھس کر آرام کرتے۔ ہماری آمد کے بعد یہ دہشت گردوں کا پہلا جسمانی حملہ تھا۔

فائری خندق میں اترتے ہی سردار دوڑ کر قریبی مورچے میں پہنچا۔ خندق میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مورچے بنے ہوئے تھے۔ ایک مورچے کے موکھے (Loop Holes) پر کلاشن کوف کی نال ٹیک کر سردار جوابی فائر کرنے لگا۔ میں نے بھی اس کے دائیں جانب پوزیشن سنبھالی۔ حملہ آور کافی قریب پہنچ چکے تھے۔ اور ان کے چھپ کر قریب پہنچنے میں سنتریوں کی غفلت کے بجائے علاقائی خدوخال کا ہاتھ تھا۔ ورنہ اس علاقے میں پہرے داری سستی یا غفلت کا شکار نہیں ہو سکتے۔ درختوں کے جھنڈ، ابھری ہوئی ڈھلانیں اور اوجھل زمین چھپ کر حرکت کرنے کو نہایت معاون و مددگار ہوتی ہیں۔ خاص کر اندھیرا تو دشمن کے لیے قریبی دوست کی حیثیت رکھتا ہے۔

سردار کے فائر کے ساتھ ہی گولیوں کی بوچھاڑ خندق کی دیوار سے ٹکرائی، سر نیچے کرتے ہوئے وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

''تمھاری کلاشن کوف گونگی ہے۔''

''کوئی نظر بھی آئے یا گولی ضائع کردوں۔'' میں نے منہ بنایا۔

''نشانہ بازی کا مقابلہ نہیں ہے حضور! ایسے موقع پر اندھا دھند فائرنگ کی جاتی ہے۔''

میں ہنسا۔ ''اندھا دھند فائر، اندھے کرتے ہیں۔''

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولا۔ ''اندھوں سے مقابلہ کرتے ہوئے اندھا بننا پڑتا ہے۔''

''بغیر ہدف دیکھے جب بھی ٹریگر دبانے لگوں تصور صاحب کا تنبیہ بھرا وعظ ساعتوں میں گونجنے لگتا ہے۔''

سردار نے موکھے سے بیرل نکال کر ایک چھٹا (برسٹ) گولیوں کا نکالا۔ ''وہ خود تو صوبیدار میجری کے مزے لوٹ رہے ہیں اور تم ان کے نصائح کی خاطر اپنا نقصان کرانے پر تیار بیٹھے ہو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''استاد کی نصیحتوں پر عمل کرنے سے کم از کم نقصان نہیں ہو سکتا۔'' ایک دم فائرنگ میں تیزی آئی، ہمیں موکھے کے سامنے سے ہٹنا پڑا۔ ہمارے دائیں جانب مورچے میں بھی دو جوان موجود تھے۔ ان کے پاس ایل ایم جی تھی۔ اور وہ درمیانے چھٹے فائر کر رہے تھے۔ (ایک تربیت یافتہ فائر ایل ایم جی استعمال کرتے وقت چار اقسام کا فائر کرتا ہے۔ آہستہ، درمیانہ، تیز اور لگاتار۔ ایک بار ٹریگر دبانے سے گن کے دھانے سے نکلنے والی گولیوں کی تعداد کو فائری چھٹا یا برسٹ آف فائر کہتے ہیں۔ اور فائری چھٹے میں گولیوں کی تعداد کا انحصار ٹریگر دبانے کی مدت پر منحصر ہے۔ ایل ایم جی کا ریٹ آف فائر اتنا تیز ہے کہ ایک منٹ ٹریگر کو دبا کر رکھیں تو 1100 سے 1300 گولیاں فائر کر دیتی ہے اس سے قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ چھے سات گولیوں کا چھٹا نکالنے کو ٹریگر کو کتنا دبانا پڑے گا)

وہ دونوں ہم سے چند گز ہی دور تھے۔ اچانک تیز کراہ سنائی دی۔ سردار فوراً بولا۔ ''کام ہو گیا۔''

کراہ میں نے بھی سن لی تھی اور اسی جانب متوجہ تھا۔ ایک جوان کندھے کو تھامے نیچے بیٹھ گیا تھا جبکہ دوسرا ٹارچ روشن کر کے زخم کا معائنہ کر رہا تھا۔ میں تیزی سے ان کی طرف بڑھا، سردار اپنی جگہ ڈٹا رہا۔

زخمی ہونے والے نے گن کی بیرل تبدیل کرنے کو بیرل کیچ کھولا تھا تبھی بھولی بھٹکی گولی نے موکھے سے گزر کر اسے وقتی طور پر ناکارہ کر دیا تھا۔ قسمت اچھی تھی ورنہ تین چار انچ کے فرق کے ساتھ گولی اس کی گردن میں بھی پیوست ہو سکتی تھی۔ اور ایسا ہونے پر ایک ماں کا بیٹا، بہن کا بھائی، کسی بیوی کا شوہر، ننھے منے بچوں کا ابو، بوڑھے باپ کا سہارا منوں مٹی

تلے پہنچ جاتا۔ اور ننھے بچوں کے اپنے باپ کے متعلق استفسار کرنے پر جوان بیوہ اور بوڑھی دادی کے آنسوان معصوموں کی سمجھ سے باہر ہوتے۔

اس کا نام دلدار تھا اور وہ بچ گیا تھا، لیکن ایسے کئی دلدار میں نے ارض پاک پر قربان ہوتے دیکھے ہیں۔ لاش گھر آتی ہے تو کسی کا سر نہیں ہوتا اور کسی کا دھڑ نہیں ملتا۔ لکڑی کے ایک تابوت میں خاکی وردی کی چند جھیاں لپیٹ کر والدین کے بہلانے اور ان کی محبت کو مرکز مہیا کرنے کا حیلہ کر دیا جاتا ہے اور وطن کی خاطر جان دینے والے کے گوشت کے لوتھڑے اور وفادار خون اپنی مٹی میں ایسے خلط ہو جاتا ہے کہ سرخ اور خاکی کی پہچان مٹ جاتی ہے۔

میں نے دلدار کا زخمی کندھا تھامتے ہوئے اس کے ساتھی اسلم کو کہا۔ ''کیو سی بی لے آؤ۔'' (Quick Combat Bandage آرمی میں ہر جوان کو مہیا کی جاتی ہے۔ یہ حادثاتی چوٹ اور گولی وغیرہ لگنے سے بہتے خون کو روکنے کو ابتدائی طبی امداد کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ اسے سادہ زبان میں فیلڈ پٹی بھی کہتے ہیں)

''میرے پاس موجود ہے۔'' اس نے اپنے بنڈوریل (ہتھیار کی اضافی میگزینیں رکھنے اور چھاتی و پیٹھ کو گولی سے بچانے کو بلٹ پروف پلیٹیں ڈالنے کا جیکٹ نما پہناوا۔ اسے عموماً بلٹ پروف جیکٹ کہتے ہیں) کی جیب سے ''کیو سی بی'' نکال کر میری طرف بڑھا دی۔ اس اثناء میں میں نے دلدار کا بنڈوریل اتار دیا تھا۔ حفاظتی پلاسٹک ہٹا کر میں نے نرم پٹی زخم کے منہ پر دبا کر رکھی اور پٹی کو مہارت سے لپیٹ دیا۔

دلدار ہوش میں تھا۔ میں نے اسلم کو کہا۔ ''اسے سہارا دے کر رہائشی بینکر میں لے جاؤ۔''

اس نے اثبات میں سر ہلا کر اپنی جی تھری کندھے سے لٹکائی اور دلدار کے ساتھ فائری خندق میں آگے بڑھ گیا۔ اس حالت میں بھی جوان نے اپنا ہتھیار پیچھے چھوڑنا گوارا نہیں کیا تھا۔

میں نے ایل ایم جی میں بیرل ڈال کر بیرل کیچ بند کیا اور فیڈ ٹوے میں گولیوں کا بیلٹ چڑھا دیا۔ ایل ایم جی میں گولیوں کا بیلٹ چڑھتا ہے اور ایک بیلٹ میں اڑھائی سو گولیاں آتی ہیں۔

سردار قریب آیا۔ ''راجے! میں تمہیں ایل ایم جی کی بے حرمتی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ تم وہ نمونے ہو جو بارہ بور سے بھی ایک ایک چھرہ فائر کرنے کی کوشش کرو گے۔''

''خان صاحب آپ ہی شوق پورا کر لیں۔'' میں نے پیچھے ہو کر کلاشن کوف اٹھالی۔

سردار نے اپنی کلاشن کوف دیوار کے ساتھ کھڑی کی اور ایل ایم جی کا بٹ کندھے میں پھنسا لیا۔ لبلبی دبا کر اس نے ایک لمبا چھٹا نکالا۔ اسی وقت دو تین اور ایل ایم جی بھی گرجیں، سامنے سے آنے والا فائر لمحہ بھر کو رک گیا تھا۔

اسلم دلدار کو پہنچا کر واپس لوٹا۔

میں نے کہا۔ ''تمہیں دلدار کے ساتھ ہی رہنا چاہیے تھا۔''

وہ اطمینان سے بولا۔ ''نرسنگ حوالدار واجد کے حوالے کر آیا ہوں۔''

آرمی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہر پیشے کے صیغے اس میں موجود ہیں۔ علاج معالجے کو میڈیکل کے نمائندے، ہتھیاروں کی دیکھ بھال کو آرمورر، گاڑیوں کی مرمت کو مکینک، سڑکیں، پل وغیرہ بنانے کو انجینئرز وغیرہ۔

میں نے پوچھا۔ ''نائٹ ویدیئنگ (نائیٹ ویژن سائیٹ) مل جائے گی۔''

اسلم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اے این، پی وی ایس فور الفا (AN/PVS-4A) موجود ہے۔''

خوشی کا اظہار کرتے ہوئے میں سرعت سے بولا۔ ''لے آؤ۔'' اس کا ہیولہ دوبارہ اندھیرے کا حصہ بن گیا تھا۔ اس کی واپسی تک میں سردار کی فائرنگ سے محظوظ ہوتا رہا۔ ایک بیلٹ ختم کر کے اس نے دوسرا چڑھا لیا تھا۔ اسلم کے آنے تک

دوسرا بیلٹ بھی ختم ہونے کے قریب تھا۔ اسلم سے شب دید عینک لے کر میں نے بیٹریاں ڈال کر آن کیا۔ اور سامیٹ ایل ایم جی پر لگا دی۔ ''اے این، پی وی ایس فور الفا'' سیکنڈ جنریشن سے تعلق رکھتی ہے۔ (شب دید آلات کی اقسام کے متعلق میں سنائپر میں وضاحت کر چکا ہوں کسی کو جاننے کا شوق ہو تو وہاں پڑھ سکتا ہے)

مورچے کا موکھا اتنا چوڑا نہیں تھا کہ شب دید آلہ لگانے کے بعد بھی دکھاؤ کی سہولت مہیا کرتا۔ سردار نے کہا۔ ''گن کسی اور جگہ لگانا پڑے گی۔''

فائری خندق میں بغیر چھت کے مورچے بنے ہوئے تھے۔ یوں کہ خندق کی دیوار میں جگہ جگہ موکھے بنا کر اٹھی سے مورچوں کا کام لیا جاتا۔ البتہ پوسٹ کے چاروں کونوں میں ایک ایک بڑا مورچہ بنا ہوا تھا۔ وزیرستان میں پاک آرمی کو ایک مسئلہ یہ بھی درپیش ہے کہ دشمن کی سمت متعین نہیں ہے۔ بہ ظاہر تو دشمن مغربی جانب تصور کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ پہرے داروں کو چاروں اطراف کی نگرانی کرنا پڑتی ہے۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے دفاع میں چور رستے موجود ہیں کہ دشمن کو سرحد پار کرنے کو اتنا جوکھم نہیں اٹھانا پڑتا۔ پھر آستین کے سانپ بھی موجود ہیں اور انھیں چھپنے کو کئی ٹھکانے میسر ہیں۔

گن اٹھا کر ہم نے مزید دائیں جانب حرکت کی اور شمال مغربی مورچے کی چھت پر چڑھ گئے۔ اسلم کو ہم نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ مورچے کی چھت پر گولی لگنے کا زیادہ خطرہ تھا، مورچے کے اندر نائب صوبیدار اختر صاحب موجود تھا۔ اس نے ہمیں روکنے کی کوشش کی مگر ہم بااصرار چھت پر چڑھ گئے تھے۔ فوج میں جونیئر سینئر کی تمیز اور نظم وضبط کا اعلیٰ معیار مقرر ہے۔ سینئر کے منع کرنے پر بھی اپنی مرضی پر چلنے کا تصور کسی اور محکمے میں تو ہو سکتا ہے فوج میں نہیں۔ لیکن وہاں ہماری الگ حیثیت تھی۔ ہم براہ راست میجر نعیم کے زیر کمان تھے۔ (میجر نعیم، میجر اورنگ زیب کی جگہ تعینات ہوئے تھے، جواب لیفٹیننٹ کرنل بن چکے تھے)

اختر صاحب ہمیں نصیحت تو کر سکتا تھا حکم دینے کا مجاز نہیں تھا۔ پوسٹ کمانڈر کے لیے ہماری حیثیت مہمان کی سی تھی، تبھی اس نے زیادہ اصرار نہیں کیا تھا۔ وہ فرنٹیئر فورس رجمنٹ کی ایک مایہ ناز یونٹ تھی۔ میجر نعیم سے ہمیں وائرلیس سیٹ پر احکامات موصول ہوتے تھے۔ یا یونٹ کے نمبر پر کال آجاتی تھی۔ افغانستان کی موبائل فون سروس جیسے AWCC (افغانستان وائرلیس کمیونی کیشن) ADIA اور روشن وغیرہ کے سگنل وہاں آتے تھے، مگر ہم نے ان کے کنکشن خریدنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ ان کے بغیر بھی کام چل رہا تھا۔

مورچے کی چھت پر حفاظتی نقطہ نظر سے خطرہ تھا لیکن دکھاؤ کے حالات پہلے سے بہتر ہو گئے تھے۔ دہشت گرد یقیناً کوئی خاص مقصد لے کر آئے تھے تبھی تو مقابلے پر ڈٹے تھے۔ ورنہ عموماً ان کا حملہ لحاتی ہوتا تھا۔ پہلے پہلے میں جتنا نقصان کر سکتے تھے، کرتے اور پھر بھاگ جاتے۔ پہاڑی بناوٹیں کسی بھی آدمی کو فرار ہونے کے بہترین مواقع مہیا کرتی ہیں۔ درختوں کے جھنڈ، پتھریلی چٹانیں، گڑھے، نالوں کے کھڑے کنارے اور کٹی پھٹی زمین فائری اور نظری ہر قسم کی آڑ مہیا کرتی ہے۔

سردار نے بڑی مشکل سے مجھے ایل ایم جی کے پیچھے لیٹنے کی اجازت دی تھی۔ ربڑ آئی شیڈ پر دائیں آنکھ ٹیکتے ہوئے میں نے جونہی دباؤ ڈالا، آئی لینز کو ڈھانپنے والا والا کور خود کار طریقے سے دائیں بائیں ہو گیا۔ سامیٹ کا اندرونی نظارہ روشن تھا۔ ہر طرف سبز سبز نظر آرہا تھا۔ مجھے چودھویں کے چاند کی روشنی سے بھی تھوڑا واضح علاقے کے خدوخال دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں ایک اور بات کی وضاحت کرتا جاؤں کہ گن اور رائفل کے فائر میں فرق ہوتا ہے۔ گن ہمیشہ علاقہ ہدف کو استعمال ہوتی ہے، مطلب گن کا فائر ہدف پر بکھر کر پڑتا ہے۔ اور گن کے اہداف آدمیوں کے جتھے، مورچے اور

گاڑیاں ہوتی ہیں، اس کے برعکس رائفل کا فائر نقطہ ہدف پر ہوتا ہے۔ خصوصاً سنائپر رائفل کا فائر عام رائفلوں سے کئی گنا زیادہ درست اور کارگر ہوتا ہے۔ وہاں ہمارے پاس سنائپر رائفلیں موجود تھیں لیکن ان کے شب دید آلات ہم نہیں منگوا سکے تھے۔ اور مجبوراً ایل جی استعمال کرنا پڑ رہی تھی کہ ''اے این، پی وی ایس فور الفا'' ایل ایم جی ہی پر استعمال ہو سکتی ہے۔ جی تھری، کلاشن کوف یا سنائپر رائفل پر اسے نہیں لگایا جا سکتا۔ (اب تو ایل ایم جی کی نئی سائیٹ بھی آگئی ہے، جو اے این پی وی ایس سے کارکردگی میں کافی بہتر ہے) گو میرے بہت سے قارئین ایسے ہیں جن کا تعلق پاک آرمی سے ہے اور یقیناً انھیں میری وضاحتیں بچکانہ لگتی ہوں گی، لیکن جن کا تعلق فوج سے نہیں ہے اور ان میں بڑی تعداد خواتین کی ہے انھیں سمجھانے کو مجھے بہت سی باتوں کی وضاحت کرنا پڑتی ہے تاکہ وہ بھی کہانی سے لطف اندوز ہو سکیں۔ کیوں کہ بعض باتیں پڑھنے والے کو الجھا دیتی ہیں، اگر ان کی اچھے سے وضاحت کر دی جائے تو قاری کی الجھنیں دور ہو جاتی ہیں۔ اور ایک مصنف کسی مخصوص طبقے کے لیے نہیں سب کے لیے لکھتا ہے، اس لیے جن حضرات کی بصارتوں پر یہ وضاحتیں گراں گزرتی ہوں وہ مجھے معذرت قبول فرمالیں۔ اور ان سطور کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جایا کریں)

دہشت گرد حملہ کرتے ہوئے کافی قریب آچکے تھے۔ ان کی تعداد میری توقع سے بھی زیادہ تھی۔ دونوں جانب سے گولیاں موسلا دھار بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ اگر آپ میں سے کسی کو فائر کا تجربہ ہوا ہو تو پتا ہوگا کہ رات کو فائر کے وقت مزل سے ہلکا سا شعلہ لپکتا نظر آتا ہے اور دن کے وقت مزل کے سامنے سے گرد اٹھتی ہے۔ اور یہ ہتھیاروں کی ایک بڑی خامی ہے۔ پہاڑی علاقوں میں فائر کی آواز سے ہتھیار کی جگہ کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کیوں کہ فائر کی بازگشت چاروں اطراف میں گونج رہی ہوتی ہے۔ لیکن شعلے اور گرد سے ماہر افراد ہتھیار کی جگہ معلوم کر لیتے ہیں۔ ایک سنائپر کا تو کام ہی یہی ہوتا ہے۔ چھت پر لیٹتے ہی سردار نے دو تین جگہوں کی نشان دہی کر دی تھی۔ خود مجھے بھی مختلف چٹانوں کے عقب سے شعلے لپکتے محسوس ہو رہے تھے۔ ایل ایم جی کے بیلٹ میں ہر پانچویں گولی ٹریسر ہوتی ہے۔ جو ہدف تک روشنی کی لکیر بناتی ہوئی جاتی ہے اور یوں فائرر کو اندھیرے میں بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کا فائر ہدف پر لگ رہا ہے یا یہاں دائیں بائیں نکل رہا ہے۔

دشمن پوسٹ سے قریباً ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے پر پہنچ کر پتھریلی چٹانوں کے عقب میں مورچے سنبھالے ہوئے تھے۔ میرے مشاہدے میں کائنات کی بزدل مخلوق دہشت گرد ہیں۔ دولت وغیرہ کے لالچ میں فتنہ فساد تو برپا کیے رکھتے ہیں لیکن وار ہمیشہ چھپ کر کرتے ہیں۔

پاک آرمی کا جوان مخصوص لباس میں متعین جگہ ہی پر پایا جاتا ہے۔ اس کی پہچان واضح ہوتی ہے۔ ایسے ہدف پر چھپ کر دور سے چند گولیاں چلا دینا یا رات کے اندھیرے میں راستے پر IED وغیرہ لگا دینے کو اگر کوئی بہادری سمجھتا ہے تو یقیناً اس کے دماغ کو علاج کی ضرورت ہے۔

عوام کی اکثریت مجاہدین اور دہشت گردوں میں فرق بھی نہیں کر سکتے۔ حالاں کہ ان بھیڑیوں اور آستین کے سانپوں کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔ انڈیا، اسرائیل، افغانستان، امریکہ وغیرہ کی شہ پر پاک آرمی اور نہتی عوام کو نشانہ بنانے والے یہ درندے کسی صورت مجاہد نہیں ہو سکتے۔ افغانستان کے اندر مجاہدوں کا ایک بڑا گروہ کفر سے برسر پیکار ہے۔ انھیں بدنام کرنے کو ملک دشمن ایجنسیوں نے انسان نما حیوانوں کا ایک گروہ پیدا کیا ہے جو پیسے کی خاطر ملک کیا اپنے رشتہ داروں کو بھی ذبح کرنے سے پیچھے نہ ہٹیں۔ یہ ضمیر فروش بھیڑیے، بھیڑوں کے روپ میں ہدف کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اور جونہی موقع ملتا ہے بچھو کی طرح ڈنک مار کر چھپ جاتے ہیں۔ لیکن الحمدللہ پاک آرمی کی مسلسل کوششوں اور قربانیوں سے ان کی تعداد پہلے سے کئی گنا کم ہو گئی ہے۔ اب یہ اپنی بقا کی آخری جنگ لڑ رہے ہیں۔ جیسے ڈوبنے والا بچنے کو

بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارتا ہے یہی حالت ان کی ہوگئی ہے۔شمالی اور جنوبی وزیرستان میں پاک آرمی کے مجاہدوں نے لتر مار مار کر انھیں پاکستان کی حدود سے افغانستان کی طرف دھکیل دیا ہے۔اور جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ ان کی مثال آستین کے سانپ کی سی ہے اور ان میں بڑی تعداد پاکستان کے باسیوں پر بھی مشتمل ہے۔

کافی خواتین وحضرات یہ سمجھتے ہیں کہ وزیرستان کے لوگ دہشت گرد ہیں۔ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔وزیرستان کے لوگ بہت امن پسند اور سچے پاکستانی ہیں۔سادہ دل،محبت کرنے والے،اسلام کے شیدائی،مہمان نواز،نماز وروزے کے پابند،شرعی پردے پر کاربند اور اس کے علاوہ بھی بہت سی خصوصیات کے حامل۔اگر اکا دکا دہشت گردی میں ملوث ہیں تو ان سے کئی گنا زیادہ دوسری قوموں کے افراد دہشت گرد وتخریب کار ہیں۔اس میں پٹھان،پنجابی،سندھی،بلوچی وغیرہ کی تخصیص نہیں ہے۔یوں بھی ایک دہشت گرد کا نہ تو مذہب ہوتا ہے اور نہ قوم۔البتہ دہشت گردوں کے پاس پاکستانی شناخت موجود ہے اور اسی وجہ سے یہ اکثر خود کو چھپانے میں کامیاب رہتے ہیں۔بہ ہرحال میں اندھیری رات کے سخت معرکے کا ذکر کررہا تھا.....

''اے این پی وی ایس فورالفا'' کی عام آنکھ کی نسبت دیکھنے کی طاقت ساڑھے تین گنا ہے اور چاند ستاروں کی روشنی میں یہ انسانوں کے خلاف ساڑھے چار سو سے سات سو میٹر تک دکھاؤ مہیا کرتی ہے۔اور اس وقت دشمن ڈیڑھ دو سو کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔البتہ شب دید آلہ لگا کر فائر کرنے اور دن کی روشنی میں فائر کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔اور سنائپر کو مخصوص رائفل کے بجائے گن استعمال کرنا پڑے تو فائر کی درستی مزید مشکوک ہوجاتی ہے۔کیوں کہ ایک سنائپر کو بھی فائر کرتے وقت اچھے ہتھیار اور دکھاؤ کے بہتر حالات کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہماری پوسٹ سے بھی مسلسل فائر ہورہا تھا اس وجہ سے دشمن آڑ کے پیچھے ہی چھپا تھا۔اگر دن کی روشنی میں میرے پاس سنائپر رائفل ہوتی تو میں اس فاصلے پر دشمن کے کسی بھی عضو کی جھلک پر اسے کامیابی سے نشانہ بنا سکتا تھا۔لیکن اس وقت میرے لیے کامیاب فائر کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔سب سے قریب ظاہر ہونے والے فائر کے شعلے پر نشانہ سادھ کر میں نے سانس روکا اور لبلبی دبادی۔وہاں ایک درمیانے حجم کے پتھر کا ہیولہ نظر آرہا تھا۔ایل ایم جی کی گرج دوسرے ہتھیاروں کے شور کا حصہ بن گئی تھی۔فوراً ہی وہاں سے فائر آنا رک گیا تھا۔پہلے چھٹے کے بعد میں اسی جانب متوجہ ہوکر لیٹا رہا۔

سردار کی طنزیہ آواز گونجی۔''راجے صاحب!خود کو گولی تو نہیں ماردی کہ دو گولیاں نکال کر دم سادھے لیٹے ہو۔''

میں جھلاتے ہوئے بولا۔''تمھیں نہیں معلوم سنائپر کو کیا انتظار ہوتا ہے۔''

''تمھارے ہاتھ میں ایل ایم جی ہے بادشاہو!اور پہلے بھی عرض کی تھی کہ ایل ایم جی کی بے حرمتی نہ کرنا۔''

میں اس کی بکواس پر کان دھرے بغیر ہدف کی جانب متوجہ رہا۔جلد ہی پتھر کی اوٹ سے مجھے ایک ہیولہ نظر آیا،شاید وہ ساتھی کی مرہم پٹی کررہا تھا یا اسے گھسیٹ کر پیچھے لے جانے کی کوشش میں تھا۔میں نے اس کی چھاتی پر شست لیتے ہوئے دوبارہ لبلبی دبادی۔ہیولہ اچھل کر گرا۔میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔

ایل ایم جی کے فائر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جتنا لمبا چھٹا (برسٹ) فائر کرو،گولیاں اتنی زیادہ ہدف پر پھیل کر گرتی ہیں۔کیوں کہ لبلبی (ٹریگر) دبانے سے گن مسلسل جھٹکے لیتی ہے جس سے گولیاں بکھر جاتی ہیں۔اس میں کچھ اور وجوہات بھی شامل ہوتی ہیں جن کی تفصیل کسی اور موقع پر اٹھا رکھتے ہیں۔

میں نے شست دوسرے پتھر کی جانب موڑ دی،کوشش تھی کہ جہاں شعلے کی ہلکی سی جھلک دکھائی دے وہیں نشانہ سادھوں۔فائر ہتھیار کو استعمال کرتے وقت اپنا دایاں گال بٹ پر ٹیکتا ہے،بایاں ہاتھ آگے کو پھیلا کر رائفل کا ''فرنٹ ہینڈ

گارڈ'' پکڑتا ہے، دائیں ہاتھ سے ''پسٹل گرپ'' کو گرفت میں لے کر شہادت کی انگلی لبلبی پر ہوتی ہے اور بائیں آنکھ بند کر کے وہ شست لیتا ہے (کھبا، یعنی بائیں ہاتھ سے فائر کرنے والے کا ہر عمل اس کے برعکس ہوتا ہے) یوں فائر کا سر ہمیشہ بیرل کی سیدھ میں رہتا ہے۔ جبکہ فائر ہوتے وقت مزل سے نکلنے والا شعلہ بیرل کی نشان دہی کرتا ہے۔ اور ایک تجربے کار سنائپر، ہتھیار اور فائر کی اس خامی کا اچھی طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ البتہ یہ فائر کرنا ہر شخص کے لیے ممکن نہیں۔ کوئی منجھا ہوا سنائپر ہی ایسا کر سکتا ہے۔ سردار بھی بہت اچھا فائر رتھا۔ اگر سنجیدہ ہو کر فائر کرتا تو مقابلہ کرتے ہوئے مجھے بھی دانتوں پسینہ آجاتا، مگر اس میں ایک بڑی خامی تھی۔ وہ لاابالی اور بے صبرا تھا۔ اور یہ دونوں عادات اچھے سنائپر کے لیے بہت نقصان دہ ہوتی ہیں۔ میرے اور اساتذہ کے گاہے گاہے ٹوکنے پر وہ وقتی طور پر تو سنبھل جاتا، مگر فطرت کے خلاف چلنا اتنا آسان نہیں ہے۔ امریکہ میں سنائپر کورس کے دوران بھی اس کی جلد بازی نے ہمیں ہار کے دھانے پر لا کھڑا کیا تھا۔

تین چار لمحے شست سادھنے کے بعد میں نے تیسری بار لبلبی دبائی۔ مگر وہاں سے آنے والا فائر نہیں رکا تھا۔ یقیناً دشمن شست لیے بغیر اندھا دھند فائر کر رہے تھے۔ تاکہ جوابی فائر پر وہ بہادر گولی لگنے سے بچ جائیں۔ اور خود ان کا مقصد دہشت ہی پھیلانا ہوتا ہے، کوئی بھولی بھٹکی گولی ہدف ڈھونڈ لے تو سونے پر سہاگا نہیں تو گولیوں کی دو تین میگزینیں ختم کر کے یہ سورما بھاگنے میں دیر نہیں لگاتے۔

لمحہ بھر ٹھہر کر میں نے ایک اور چھٹا فائر کیا، مگر نتیجہ پہلے والا ہی نکلا تھا۔

''راجے بہتر ہوگا ایل ایم جی کے حال پر رحم کرو۔'' سردار نے سہ بارہ ٹوکا۔

''لو، مرو.....'' ایک جانب ہو کر میں نے ایل ایم جی سردار کے حوالے کر دی۔ ایل ایم جی پر ہمیشہ دو آدمی مل کر فائر کرتے ہیں۔ فائر کرنے والے کو ایل ایم جی نمبر ایک اور دوسرے کو ایل ایم جی نمبر دو کہتے ہیں۔ نمبر دو کا کام گن کی نال تبدیل کرنا اور گن لوڈ کرنا ہوتا ہے۔ نمبر دو گن کے دائیں جانب لیٹتا ہے۔ سردار کے جگہ سنبھالتے ہی میں رینگ کر دائیں ہاتھ ہو گیا تھا۔ سردار نے بھی انھی جگہوں پر فائر کرنا شروع کر دیا جہاں سے مزل کا شعلہ جھلک رہا تھا، البتہ میرے برعکس اس نے لمبے لمبے چھٹے فائر کیے تھے۔ اور اصولی طور پر اس وقت سردار کا طریقہ کار مجھ سے بہتر تھا۔

میں نے پیچھے کھسک کر مورچے کی چھت سے نیچے جھانکا اور اختر صاحب کو آواز دی۔ ''سر اشب دیدعینک مل جائے گی۔''

''یہ لو.....'' اس نے ہاتھ اونچا کر کے شب دیدعینک ''سیون ڈی'' مجھے پکڑا دی۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ کچھ شب دید آلات دوربین کی طرح صرف دکھاؤ کے کام آتے ہیں اور کچھ ٹیلی اسکوپ سائیکلوں کی طرح ہتھیار پر لگا کر فائر کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ موخر الذکر آلات ہتھیار کے علاوہ خالی دیکھ بھال کو بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

''شکریہ سر!'' کہہ کر میں واپس اپنی جگہ پہنچ گیا۔ سردار ایک بیلٹ ایمونیشن اڑا چکا تھا۔ نیا بیلٹ لگا کر میں اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔

''کم از کم تین لعنتی نشانہ بن چکے ہیں۔'' نئے ہدف کی جانب بیرل موڑتے ہوئے سردار نے فخریہ لہجے میں اعلان کیا۔ مجھے فوراً ہی یقین آ گیا تھا کیوں کہ ہماری سیدھ میں موجود دشمن کے تینوں مورچے خاموش ہو چکے تھے۔

سامنے اور بائیں جانب ایک آڑ سے گولیوں کی بوچھاڑ کا رخ مورچے کی چھت کی جانب ہو گیا تھا۔ یقیناً بلندی سے ہونے والا فائر دشمن کو بھی دکھائی دے گیا تھا۔ اور اس کی بڑی وجہ ٹریسر گولیاں تھیں۔ ٹریسر گولی نال سے نکل کر جلتے ہوئے انگارے کی طرح ہدف تک جاتی ہے اور دور سے دیکھی جا سکتی ہے۔ ایل ایم جی بیلٹ میں ہر پانچویں گولی ٹریسر ہوتی ہے۔ جو رات کے وقت فائر رکو گولیاں ہدف پر لگنے کی تصدیق کرتی ہیں تو مخالف کو بھی ہتھیار کی پوزیشن سے آگاہ کرتی ہیں۔

ہم نیچے دبک گئے تھے۔ جونہی دشمن کا فائر رکا سردار نے فوراً بٹ کو کندھے میں دبایا اور اسی جانب شست سادھ لی، لمحہ بھر بعد دشمن کی جانب سے ایک اور بوچھاڑ فائر ہوئی، مگر خان صاحب جوش میں آچکے تھے اور خان جب جوش میں آجائے تو جان لیتا ہے یا دیتا ہے، تیسری کوئی صورت نہیں ہوتی۔

''سردار نیچے ہو جاؤ.....'' میں چیخا، مگر کان دھرے بغیر اس نے لبلبی دبائی اور انگلی تب ہٹائی جب اڑھائی سو گولیاں ہدف کے علاقے میں بکھر چکی تھیں۔ دشمن کا وہ مورچہ بھی خاموش ہو گیا تھا۔ میرے پاس گن کی بیرل تبدیل کرنے کا مخصوص دستانہ تو موجود نہیں تھا لیکن بیرل کو تبدیل کرنا ضروری تھا کیوں کہ اتنے لمبے چھٹے کے بعد بیرل انگارے کی طرح ہو گئی تھی۔

میں نے قمیص کے دامن سے ''بیرل کیچ'' کو دبا کر کھولا اور بیرل کو کھینچ کر مورچے کی چھت پر رکھ دیا۔ نئی بیرل چونکہ ٹھنڈی تھی اس لیے پکڑتے ہوئے کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔

بیرل تبدیل کر کے میں نے نیا بیلٹ چڑھا دیا، اس اثناء میں فائرنگ ہلکی ہو گئی تھی۔

''اب یہ بھاگیں گے۔'' میں نے سردار کو ہوشیار کیا۔

''پٹھان سے پنگا لیا ہے، بھاگنا تو پڑے گا۔'' فخریہ لہجے میں کہتے ہوئے وہ ہدف ڈھونڈنے لگا۔ میں نے بھی شب دید عینک آنکھوں سے لگا لی تھی۔ ایک دو ہیولے بھاگ کر ڈھلان اترتے نظر آئے، مگر ان کی خوش قسمتی میرے پاس صرف دیکھنے کی سہولت موجود تھی، ہتھیار سردار خان کے پاس تھا۔ اور اس کی کوشش تھی کہ دشمن اپنے ساتھیوں کی لاشیں اٹھانے میں کامیاب نہ ہو سکیں اس لیے وہ انھی مخصوص اہداف کے اطراف میں گن گھما کر چھوٹے چھوٹے چھٹے فائر کرتا رہا جہاں ہمارے اندازے میں دشمن کی لاشیں پڑی تھیں۔ دہشت گرد ہمیشہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں بھی ساتھ لے جانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کی پہچان پوشیدہ رہے۔

جلد ہی ہماری فائرنگ یک طرفہ رہ گئی، دشمن کی طرف سے مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔ نائب صوبیدار اختر نے چند جوانوں کے ساتھ اگلے علاقے کی تلاشی کو جانا چاہا مگر پوسٹ کمانڈر کیپٹن حفیظ اللہ نیازی نے ''روشنی ہونے کا انتظار کرو۔'' کہہ کر منع کر دیا تھا۔ صبح صادق نمودار ہو گئی تھی۔ جلد ہی ملگجا اجالا ہو جانا تھا۔ فائرنگ رکنے کے بعد سردی محسوس ہونے لگی تھی۔ پہلے لڑائی کے جوش میں ہمیں کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

سردار کو وہیں رکنے کا کہہ کر میں کمرے سے گرم چادریں اٹھا لایا، باقی جوان بھی مورچوں میں ڈٹے ہوئے تھے۔ سرحدوں پر تعینات فوجیوں کی زندگی میں گولیوں کی ''تڑتڑ'' اور توپوں کی گھن گرج روزمرہ کا معمول ہے۔ تربیت یافتہ فوجی اور عام انسان میں بنیادی فرق یہی ہوتا ہے کہ تربیت یافتہ جوان کے اعصاب بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ مسلسل مخصوص حالات میں رہ کر زندگی گزارنے سے مرنے کا ڈر اور خوف اس کے دل میں اتنا نہیں ہوتا جتنا عام آدمی کے دل میں ہوتا ہے۔ اگر عام آدمی بہت زیادہ دلیر، نڈر اور مضبوط اعصاب کا ہو تب بھی ایسے حالات میں حوصلہ چھوڑ دیتا ہے کیوں کہ ایسے ماحول میں زندگی گزارنا کہ راستے پر چلتے ہوئے IED پھٹنے کا خطرہ ہو، بیت الخلا اور غسل خانے میں جاتے وقت دشمن کے سنائپر کا اندیشہ ہو، کھانا کھاتے ہوئے دشمن کے راکٹوں کی فکر ہو اور سوتے ہوئے دشمن کے حملے کا ڈر ہو۔ یہ تربیت یافتہ سپاہی ہی برداشت کر سکتا ہے۔

دوران لڑائی سردار کا مزاق کرنا بعض قارئین کو ہضم نہیں ہوتا ہوگا۔ جب جان پر بنی ہو تو ہنسی مذاق کرنا عجیب لگتا ہے، لیکن یقین مانیں اس سے ناگفتہ بہ صورت حال میں بھی میں نے اپنے ساتھیوں کو قہقہے لگاتے اور ایک دوسرے کو چھیڑتے دیکھا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ایک انسان مختصر عرصے تک تو اپنی فطرت سے لڑ سکتا ہے لیکن جب مسلسل

مشکلات کا سامنا ہو تو ایسے ماحول میں زندگی گزارنا اسے معمول کے مطابق ہی لگتا ہے۔ اور روزمرہ کی زندگی میں ہنسی مذاق انسان کی فطرت ہے۔

اندھیرا چھٹنے لگا تھا۔ پوسٹ کے ایک کونے سے اذان کی مقدس آواز بلند ہوئی۔ پہرے پر متعین افراد کے علاوہ تمام وضو کرنے بڑھ گئے تھے۔ انسان کی ہمت، جرأت، حوصلہ اور طاقت ہمیشہ اللہ پاک کی منشا کی محتاج ہوتی ہے۔ ہر حالت میں اللہ پاک کو ساتھ رکھنے والے ہی کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ کوشش کرنا انسان کا فرض ہے اور اس کوشش کو کامیابی و کامرانی سے سرفراز کرنا ذات باری تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ ہم نے بھی مقدور بھر وطن دشمن عناصر سے مقابلہ کر لیا تھا، اب اپنے رب کی مدد کو شامل حال کرنے کا وقت تھا اس لیے مسجد کی طرف بڑھ گئے۔ نماز کے بعد معلوم ہوا کہ تین جوان زخمی ہوئے تھے۔ دو کے زخم تو معمولی نوعیت کے تھے تیسرے کی حالت البتہ تشویش ناک تھی۔ اور اسے ہسپتال پہنچانے کو بٹالین ہیڈکوارٹر سے کیو آر ایف (Quick Reaction Force) روانہ ہو گئی تھی۔ نرسنگ حوالدار واجد نے تینوں زخمیوں کی مرہم پٹی کر کے ابتدائی طبی امداد دے دی تھی۔ حوالدار واجد کا تعلق ایبٹ آباد سے تھا، نہایت منجھا ہوا اور قابل نرسنگ تھا۔ ہنس مکھ، بذلہ سنج، حاضر جواب اور دلیر۔

پوسٹ پر دو جیپیں موجود تھیں۔ تینوں زخمیوں کو جیپوں میں بٹھا کر پیچھے روانہ کر دیا گیا۔ ایک مخصوص مقام پر کیو آر ایف اور جیپوں کا ملاپ ہونا تھا، زخمیوں کو کیو آر ایف کے جوانوں کے حوالے کر کے جیپوں نے واپس لوٹنا تھا۔

نماز کے بعد کیپٹن صاحب ایک ٹولی کے ساتھ پوسٹ سے آگے بڑھ گیا، ہم دونوں بھی ساتھ ہی تھے۔ سردار، کیپٹن صاحب کو اپنی کارکردگی بتا چکا تھا۔ ہماری نشان دہی پر سب سے پہلے انھی تین پتھروں کے عقب کا جائزہ لیا گیا۔ وہاں پانچ لاشیں اور ایک شدید زخمی موجود تھا۔ بھاگتے وقت دشمن ان لاشوں کو نہیں اٹھا سکے تھے۔ عموماً دہشت گرد ساتھیوں کی لاشوں کو نہیں چھوڑتے، لیکن اب بدقسمتی سے ان کا واسطہ پیشہ ور سنائپروں سے پڑ گیا تھا۔ سردار نے تینوں مقامات کو گن کے فائر سے یوں ڈھانپا تھا کہ بغیر جانی نقصان کے دشمن لاشیں نہیں لے جا سکتا تھا۔ میرا نشانہ بننے والوں میں ایک کو کھوپڑی میں گولی لگی تھی اور دوسرے کی چھاتی میں روشن دان کھلا ہوا تھا۔ باقی چاروں سردار کا شکار بنے تھے تین کے اوپری دھڑ مکمل طور پر چھلنی ہو گئے تھے۔ چوتھے کے دائیں کندھے میں گولیاں لگی تھیں۔ اس کے زخم جان لیوا نہیں تھے لیکن زیادہ خون بہنے سے اس کی حالت تشویش ناک ہو گئی تھی۔

نرسنگ حوالدار واجد اپنے زخمیوں کے ساتھ گیا ہوا تھا۔ دہشت گردوں کی لاشوں کو ہم نے فائری خندق میں پھینکا اور زخمی کو نرسنگ حوالدار کے کمرے میں لے گئے جو آر اے پی (Regiment Aid Post) کا کام بھی دیتا تھا۔

کیپٹن صاحب نے تشویش ظاہر کی۔ ''امید نہیں کہ یہ واجد کے آنے تک زندہ رہ پائے گا۔''

''میں کوشش کرتا ہوں سر!'' اسے تسلی دے کر میں نے سردار کو اشارہ کیا۔ وہ دہشت گرد کے زخم سے کپڑا ہٹانے لگا۔ گولیاں جسم سے پار نکل گئی تھیں۔ میں کیو سی بی (Quick Combat Bandage) کھول کر اس کے زخم پر لپیٹنے لگا۔ ایک پٹی اس کے زخموں کو ناکافی تھی۔ خون کا بہاؤ روکنا سب سے ضروری تھا۔ وہ بری طرح کراہ رہا تھا۔

مجھے گھورتے ہوئے وہ اٹک اٹک کر بولا۔ ''م.....م..... میں مرنا نہیں چاہتا۔''

سردار نے تلخی سے جواب دیا۔ ''ایسا نہ چاہنے کے باوجود کوشش ہماری بھی یہی ہے۔''

میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تمھیں بچانے کی پوری کوشش کر رہا ہوں، یہ بتاؤ تم لوگ کس مقصد سے حملہ آور ہوئے تھے۔''

وہ نقاہت سے بولا۔ ''ہمارے کچھ ساتھیوں نے سرحد عبور کرنا تھی۔ کیو جے ٹاپ کی گشتی ٹولیوں کی توجہ بٹانے کو ہمیں

حملہ کرنا پڑا۔"

میں نے حیرانی ظاہر کی۔ "جھوٹ مت بولو، اس مقصد کو چھوٹا سا حملہ ہی کافی تھا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے سردار کو دردکش ٹیکہ بنانے کا اشارہ کیا۔

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سردار نے ٹیکہ تیار کیا اور اس کے بازو میں لگا دیا۔

میری بات کا جواب اس نے نہیں دیا تھا۔ میں نے اسے ڈرانے کی کامیاب کوشش کی۔

"اگر چاہتے ہو کہ تمھاری جان بچائی جائے تو تعاون کرو، ورنہ کسی دشمن پر دوائیاں اور وقت ضائع کرنے کا ہمیں کوئی شوق نہیں ہے۔"

وہ بہ مشکل زبان ہلانے لگا، اس کی گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ..... ملک گل بدین خان، سردار فیروز خان، کمانڈر عدیل جان اور کمانڈر رنگین خان کی گزشتہ ہفتے بامک ٹاپ پر بیٹھک ہوئی۔ یوں تو ان کی آپس میں نہیں بنتی تھی، لیکن انھیں انڈین ایجنسی را کے ایک میجر نے اکٹھا ہونے پر مجبور کیا۔ اس نے کیو جے ٹاپ سلسلے کی تین پوسٹوں 9,8,7 پر قبضے کا منصوبہ پیش کیا تھا۔ یہ تینوں پوسٹیں قریب قریب واقع تھیں۔ سات اور آٹھ سامنے اور نو ان دونوں کے درمیان اور پیچھے کو ہٹ کر تھی۔ (ویسے تو کیو جے نام کی پوری دس پوسٹیں ہیں جو ایک قطار میں موجود ہیں۔ ان کے ساتھ شمال کی جانب متصل چیا پوسٹوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا یعنی چیا ون، چیا ٹو وغیرہ) میجر نے انھیں باور کرایا کہ ان پوسٹوں پر قبضہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ چاروں کمانڈروں کے لشکر ساتھ مل کر کام کریں۔ اس مقصد کو "را" کے میجر نے بڑی رقم کی پیش کش کی تھی۔ اور آج منصوبے پر عمل کرنے کی شروعات ہو گئی تھی۔ اس کارروائی کا مقصد واقعی اپنے ساتھیوں کو سرحد عبور کرانا تھا، تاکہ کیو جے ٹاپ کی تین پوسٹوں پر دونوں اطراف سے حملہ کیا جا سکے۔

"سردار یہ کمزوری محسوس کر رہا ہے، ڈرپ بھی تیار کرو۔" میں سردار کو مخاطب ہوا۔ جان بچانے کے لالچ میں وہ بڑی اہم معلومات اگل رہا تھا۔ کیپٹن حفیظ اللہ نیازی بھی ہمارے ساتھ ہی موجود تھا۔ زخمی کی باتوں نے اس کے کان بھی کھڑے کر دیے تھے۔

سردار اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ڈرپ تیار کرنے لگا۔ سنائپر کورس کے بعد، عملی میدان میں قدم رکھنے سے پہلے ہمیں چند ہفتوں کا ابتدائی طبی امداد کا کورس لازماً کرایا جاتا ہے۔ اور ایک سنائپر کو ابتدائی طبی امداد کے بارے جاننا کتنا ضروری ہے اس کا اندازہ ہر کوئی کر سکتا ہے۔

اس کی آنکھیں نقاہت سے بند ہو رہی تھیں۔ میں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر آہستہ سے ہلایا۔ "تمھارا نام کیا ہے؟"

وہ اٹک اٹک کر بولا۔ "کک..... کمانڈر شیر گل، میں کمانڈر عدیل کا دست راست ہوں۔"

میں نے اگلا سوال کیا۔ "تینوں پوسٹوں پر ایک ساتھ حملہ کیا جائے گا یا علیحدہ علیحدہ؟"

وہ بہ مشکل بولا۔ "اکٹھے....."

میں نے بے صبری سے پوچھا۔ "کب؟" اس کی حالت کھلی ہوا میں رکھے چراغ جیسی تھی۔ وہ چند ہی لمحوں کا مہمان نظر آ رہا تھا اور اس کے ہلاک ہونے سے پہلے جتنی معلومات اگلوا لینا غنیمت تھا۔

کیپٹن صاحب نے دھیرے سے کہا۔ "اسے سنبھلنے کا موقع دو۔"

میں نے کیپٹن صاحب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی مگر وہ خاموش رہا تھا۔

میں با آواز بلند بولا۔ "سردار ڈرپ میں "اسپیشل سیونگ لیکوڈ ڈالجکشن" ملاؤ تاکہ اس کی جان یقینی طور پر بچائی جا

سکے....."

سردار نے فوراً کہا۔ "آپ کے کہنے سے پہلے ملا دیا ہے، لیکن اسے جگا کر رکھو، اگر بے ہوش ہو گیا تو شاید انجکشن بے کار جائے۔" اس نے سٹینڈ قریب کر کے اس میں ڈرپ لٹکائی اور زخمی کے تندرست ہاتھ میں سوئی لگا دی۔

میں نے اسے ہلایا۔ "شیر دل ہوش میں رہو، ہم تمھاری جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

اس نے آنکھیں کھولیں، عجیب ویرانی اور خالی پن نظر آ رہا تھا۔ اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے میں نے پوچھا۔ "تم نے کیا بتایا حملہ کب ہوگا؟"

"م..... میں..... ہوں....." اس کی آنکھیں دوبارہ بند ہو گئی تھیں۔

"شیر دل خان ہوش میں آؤ۔" میں نے اسے جھنجوڑا۔

"ہوں..... ہاں....." اس نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چہرے پر اذیت جیسے ثبت ہو گئی تھی۔

"مجھ سے باتیں کرو تا کہ تمھاری جان بچائی جا سکے۔"

وہ ہکلایا۔ "کک..... کر رہا ہوں....."

"بتاؤ حملہ کب ہوگا.....؟" میں نے سوال دہرایا۔

"جج..... جمع..... جمع..... آ..... آ....." دو تین ہچکیاں لے کر اس کی گردن ڈھلک گئی تھی۔

کیپٹن حفیظ اللہ نیازی نے منہ بنایا۔ "تمھارا "اسپیشل سیونگ لیکوئڈ انجکشن" تو کسی کام نہ آیا۔"

میں ہنسا۔ "سر! ہم اسے تسلی دے کر کچھ اگلوانے کی کوشش میں تھے ورنہ ہم ڈاکٹر ہیں اور نہ ایسا کوئی انجکشن ہے۔"

کیپٹن حفیظ خوش دلی سے ہنسا۔ "مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔"

میں نے کہا "سر! ہم نے یہ معلومات میجر نعیم تک پہنچانا ہے، آپ بھی بٹالین کمانڈر کو مطلع کر دیں۔"

وہ سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

—●—

سہ پہر ڈھلے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے کیو آر ایف کی گاڑیاں دہشت گردوں کی لاشیں لینے پہنچ گئی تھیں۔ بٹالین کمانڈر اور سیکنڈ ان کمانڈ بھی ساتھ تھے۔ کیو آر ایف کی گاڑیاں تو واپس چلی گئیں البتہ بٹالین کمانڈر عارف عالم اور سیکنڈ ان کمانڈ میجر فیصل وہیں رہ گئے تھے۔ چائے وغیرہ پی کر انھوں نے ہمیں بلا لیا۔ کیپٹن صاحب کے ٹینکر میں کمانڈنگ آفیسران کی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ ہم نے پلاسٹک کی کرسیاں سنبھال لی تھیں۔ اس علاقے میں رہائشی ٹینکر ہی کو دفتر کے طور پر استعمال کیا جاتا اور وہیں پر خصوصی نشست (اسپیشل کانفرنس) بھی ہوتی۔

عارف عالم صاحب مجھے مخاطب ہوئے۔ "جوان! حفیظ صاحب مجھے تفصیل بتا چکا ہے، کیا تمھارے پاس کچھ اور بتانے کو ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "سب کچھ کیپٹن صاحب کے سامنے ہی پیش آیا تھا۔"

انھوں نے اگلا سوال پوچھا۔ "کیا خیال ہے مرنے والا دہشت گرد، جمعہ کہنا چاہتا تھا یا جمعرات؟"

سردار بولا۔ "سر! یقین تو کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ دہشت گردوں کی نفسیات کو مدنظر رکھیں تو ان کی زیادہ تر کارروائیاں جمعہ ہی کو ہوتی ہیں۔"

وہ تحسین آمیز نظروں سے سردار کو دیکھتے ہوئے بولے۔ "صحیح کہا، جوابی کارروائی کے بارے تمھاری کیا رائے ہے۔" (یہاں ایک بات مدنظر رہے کہ لیفٹیننٹ کرنل بہت بڑا عہدہ ہے۔ اور اس رینک کا کوئی آفیسر ایک سپاہی یا حوالدار

سے مشاورت میں وقت ضائع نہیں کرتا لیکن وہاں ہماری حیثیت مختلف تھی۔ ہم کافی عرصہ سے فیلڈ میں تھے، میجر نعیم کی زبانی ان کے کانوں تک ہمارے کارناموں کا تذکرہ پہنچ گیا تھا۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ہمیں اہمیت دینے پر مجبور تھے)

میں انکساری سے بولا۔ ''یہ سوچنا تو آپ کا کام ہے سر! البتہ ہم ہر تعاون کو تیار ہیں۔''

''بریگیڈ کمانڈر سے میری تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے اس ضمن میں چند تجاویز بھی زیر غور آئی ہیں، طے ہوا ہے کہ بریگیڈ کی دوسری یونٹوں سے کچھ نفری منگوا کر پہلی فرصت میں ان تینوں پوسٹوں کے دفاع کو مضبوط کیا جائے۔''

میں نے کہا۔ ''سر! دشمن اپنی کچھ نفری سرحد پار لا چکا ہے، یقیناً پوسٹوں پر اضافی نفری کی آمد پر وہ چوکنا ہو جائیں گے اور منصوبے پر عمل درآمد روک دیں گے۔''

عارف عالم صاحب مسکرائے۔ ''میجر فیصل نے بھی یہی مشورہ دیا تھا۔ لیکن ہمارا مقصد دشمن کا منصوبہ ناکام کرنا ہے چاہے لڑ کر ہو یا بغیر لڑے۔''

''سر! آپ بہتر سمجھتے ہیں، لیکن استادوں سے سنا ہے کہ دشمن کے منصوبے کا علم ہو جانا آدھی فتح ہوتی ہے اور میرا نہیں خیال اپنی برتری میں دشمن کو آدھے کا حصہ دار بنانا عقل مندی ہوگی۔''

''برخوردار! دشمن کا منصوبہ ناکام کرنا تمھاری نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔''

''سر! دشمن کا منصوبہ ناکام نہیں موخر ہوگا۔ ہم اضافی نفری مستقل پاس نہیں رکھ سکتے۔ جونہی امدادی جوان لوٹے دشمن دوبارہ حملہ کرنے کی کوشش کرے گا اور تب ہمیں دشمن کے منصوبے کی کوئی سن گن نہیں ہوگی۔''

عارف عالم صاحب مسکرائے۔ ''شاباش برخوردار!..... اورنگ زیب صاحب تمھاری کافی تعریف کر رہے تھے۔ اور تب مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''تو پھر کیا سوچا ہے سر؟''

وہ اطمینان سے بولے۔ ''بتا تو دیا ہے۔''

میں نے مایوس لہجے میں پوچھا۔ ''یعنی پوسٹوں پر اضافی نفری منگوانا ناگزیر ہے۔''

''ہاں۔'' انھوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جونہی دشمن کو معلوم ہوگا کہ ہم تیار ہیں وہ حملہ موخر کر دے گا۔ اور یقیناً وہ اضافی نفری کی واپسی کا انتظار کرے گا، اس اثناء میں ہمارے چھاپہ مار دستے افغان نالہ میں ان کا شکار کھیلنے نکلیں گے۔ امید ہے ان کے اجتماع کو ہم بھرپور ضرب لگا کر اپنے فائدے میں استعمال کر سکیں گے۔''

ان کا جامع منصوبہ سن کر مجھے اپنے اندیشوں پر شرمندگی ہوئی تھی۔ ''معذرت خواہ ہوں سر! آپ کی سوچ میرے گمان سے بہت آگے ہے۔''

وہ خوش دلی سے بولے۔ ''تمھارا اختلاف کرنا اچھا لگا۔ حکمت کسی کی میراث نہیں ہوتی، تمھارا بغیر تکرار کے متفق ہونا برا لگتا۔ اب میں یقین کر سکتا ہوں کہ اس سے بہتر منصوبہ فی الحال ہم میں سے کسی کے دماغ میں نہیں ہے۔''

''شکریہ سر!''

انھوں نے پوچھا۔ ''تمھارا کیا ارادہ ہے؟''

سردار نے جلد بازی کا مظاہرہ کیا۔ ''ہمیں آپ شانہ بہ شانہ پائیں گے۔''

عارف عالم صاحب نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ ''یقین تھا یہی سننے کو ملے گا۔''

میں خفیف لہجے میں بولا۔ ''لیکن ہمیں نعیم صاحب کی اجازت کی ضرورت پڑے گی سر۔'' ہم چونکہ براہ راست میجر نعیم کے ماتحت تھے اور وہاں ہماری موجودگی کا مقصد کچھ اور تھا اس لیے مجھے صاف گوئی سے کام لینا پڑا تھا۔

مجھے گھورتے ہوئے عارف عالم صاحب مسکرائے۔ ''کرنل اورنگ زیب تمھاری بہادری کے قصے سناتے نہیں تھکتے۔''

میں انکساری سے بولا۔ ''وقت آنے پر ان شاء اللہ آپ کو مایوس نہیں کریں گے سر! البتہ قانونی تقاضوں کو آپ ہم سے بہتر جانتے ہیں۔''

عارف عالم صاحب نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ''اگر میجر نعیم نہ مانا۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''پھر آپ کو احسان مند کرنے کا موقع ہاتھ آجائے گا۔''

ان کا زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ ''اب لگا کہ ایس ایس سے بات کر رہا ہوں۔''

میجر فیصل اور کیپٹن حفیظ بھی مسکرا دیے تھے۔

عارف عالم صاحب خوشگوار لہجے میں بولے۔ ''بہ ہر حال میجر نعیم کی طرف سے تمھیں باقاعدہ حکم مل جائے گا کیوں کہ میرے ناتواں کندھے اتنے بھاری احسان کے متحمل نہیں ہو سکتے۔''

میں خفت سے مسکرا دیا۔

عارف عالم صاحب سنجیدہ ہوئے۔ ''تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ دشمن کے منصوبے کے بارے آئی ایس آئی کی رپورٹ ہمارے پاس ہفتہ بھر پہلے ہی پہنچ گئی تھی۔ دن کا تعین کیے بغیر انھوں نے خطرے کی نشان دہی کر دی تھی۔ اور اب الحمدللہ بات مزید کھل گئی ہے۔'' (پاکستان آئی ایس آئی کی جڑیں دشمنوں کے بہت اندر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ بہت سے خطرات کی نشان دہی یہ خاموش مجاہد پہلے سے کر دیتے ہیں اور انھی معلومات کی بدولت ایسے ہزاروں حادثات سے بروقت نبٹا گیا ہے جو بڑی تباہی کا سبب بن سکتے تھے۔ البتہ ان کی خبر عوام تک نہیں پہنچ پاتی۔ اور ایسے کئی مجاہد گمنامی کی موت کو گلے لگا کر دھرتی اوڑھ چکے ہیں جن کے بارے ان کے گھر والے بھی نہیں جانتے کہ وطن خاطر وہ کیا قربانی دے چکے ہیں)

میں نے پوچھا۔ ''سر! کارروائی کی ترتیب کیا ہوگی؟''

''آج سوموار ہے، پرسوں تک اضافی نفری ہمارے پاس پہنچ جائے گی، کل بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں بریگیڈ کی یونٹوں کے کمانڈنگ آفیسرز جمع ہو رہے ہیں تب حتمی منصوبہ بنایا جائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے انھوں نے نشست چھوڑی، باقی سب بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ عارف عالم صاحب اور میجر فیصل کو گاڑیوں میں بٹھا کر ہم نے الوداعی سیلوٹ کیا اور کمرے میں لوٹ آئے۔

—●—

جمعرات و جمعہ کی شب ہم نہایت چوکس رہے، لیکن دشمن کو اضافی نفری کی خبر پہنچ چکی تھی، تبھی انھوں نے حملے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ ہفتے کی شب میں اور سردار آگے جانے کو تیار تھے۔ موسم کے تیور سہ پہر ہی سے بدلے بدلے تھے اور ایسا موسم چھپ کر سفر کرنے کو نہایت موزوں ہوتا ہے۔ ہم باقی جوانوں سے پہلے روانہ ہو رہے تھے کیوں کہ ہمیں افغان نالے میں کسی مناسب مقام پر کمین گاہ بنا کر چھپنا تھا۔ (سنائپر جگہ کی مناسبت سے مختلف اقسام کی کمین گاہیں بناتے ہیں۔ ان میں زمین کھود کر کھوہ بنانے سے مضبوط مورچہ اور درخت کے اوپر مچان بنانا شامل ہیں۔ ہر کمین گاہ کی علیحدہ خصوصیات اور بنانے کا طریقہ جدا ہے، اگر ان پر تفصیل سے روشنی ڈالوں تو یہ ناول سے زیادہ درسی کتاب بن جائے گی۔ البتہ تھوڑی بہت وضاحت اس لیے کر دیتا ہوں کہ قارئین کو سمجھنے میں آسانی رہے)

اگلے دن چھاپہ مار دستوں نے آنا تھا۔ ہمارا کام سنائپنگ ہی تھا۔ ہمارے علاوہ بھی سنائپرز کی دو ٹولیوں نے روانہ ہونا تھا۔ ایک جوڑی تو الیاس اور شہزاد کی تھی جس نے ''کیو بے فائیو'' سے آنا تھا۔ ایک جوڑی دوسری یونٹ کے سنائپرز کی

تھی ان سے میں ناواقف تھا۔البتہ یہ معلوم تھا کہ وہ ''کیو جے ٹین'' پر موجود تھے۔باقی سنائپرز کا ہم سے رابطہ نہیں تھا۔انھیں اپنی پوسٹوں ہی سے احکام ملتا تھے۔

میں نے رینج ماسٹر کو پلاسٹک کے مضبوط بیگ میں ڈال کر کپڑے کے تھیلے میں ڈال لیا تھا۔سردار کے پاس ڈریگنوو سنائپر رائفل اور ترکی کا ایجاد کردہ نائین ایم ایم پستول جبکہ میرے پاس سائیلنسر لگا بریٹا ایم نائینٹی ٹو (Beretta M 92) موجود تھا۔اٹلی کا ایجاد کردہ نیم خودکار (سیمی آٹومیٹک) خوب صورت پستول۔اس کی میگزین میں پندرہ گولیوں کی گنجائش ہوتی ہے۔کارکردگی میں یہ کسی بھی طرح گلاک سے کم نہیں ہے۔البتہ وزن میں گلاک سے پاؤ بھر اور لمبائی میں انچ بھر زیادہ ہے۔گولی دونوں میں نائین ایم ایم ہی پڑتی ہے۔پاکستان آرمی میں عام طور پر گلاک اور بریٹا استعمال نہیں ہوتے۔لیکن میرے پاس گلاک سیون ٹین، گلاک ایٹین اور گلاک نائینٹین کے علاوہ بریٹا ایم نائینٹی ٹو اور بریٹا نائینٹی تھری موجود تھے۔یہ تمام مختلف معرکوں میں میرے ہاتھ لگے تھے۔سنائپر رائفلوں میں بیرٹ ایم 107 جو اعلیٰ معیار کی سنائپر رائفل ہے وہ یونٹ کے کوت (وہ کمرہ جہاں یونٹ کے ہتھیار رکھے جاتے ہیں) میں میرے نام سے پڑی تھی۔اور بغیر میری اجازت وہ کوئی استعمال نہیں کرسکتا تھا۔البتہ وہ میں گھر نہیں لے جاسکتا تھا کہ پاکستان آرمی کا قانون اس کی اجازت نہیں دیتا ہے۔شاید اس کا لائسنس بنتا ہو لیکن اس بارے مجھے معلومات نہیں اور نہ کبھی پوچھنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔دوران آپریشن دہشت گردوں کے جو ہتھیار پاک فوج کے ہتھے چڑھتے ہیں وہ براہ راست فوج کی تحویل میں جاتے ہیں۔ان کا باقاعدہ اندراج ہوتا ہے۔جی ایچ کیو تک اس کی رپورٹ جاتی ہے۔اس کے بعد ہائی کمانڈ ہی ان ہتھیاروں کے بارے فیصلہ کرتی ہے۔لیکن میرا مسئلہ جدا تھا۔میں نے یہ ہتھیار آرمی کے کسی عام آپریشن میں حاصل نہیں کیے تھے۔یہ بیرون ملک کے معرکوں میں میرے ہاتھ آئے تھے اور ان کے بارے میں نے زبانی طور پر تو اپنے سینئرز کو آگاہ کیا تھا، باقاعدہ تحریری رپورٹ میں ان کا ذکر نہیں کیا تھا۔اور گلاک نائینٹین کے علاوہ تمام ہتھیار یونٹ کے کوت ہی میں رکھے تھے۔گلاک نائینٹین مع عمدہ سائیلنسر البتہ پلوشے نے ضد کر کے اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔اور وہ ایسی لاڈلی ہے کہ ضد منوانا جانتی ہے۔

شام سے پہلے ہی اچھا خاصا اندھیرا چھا گیا تھا۔جولائی میں بھی یہاں موسم خاصا خوشگوار ہوتا ہے کہ رات کو کمبل لپیٹنا پڑتا ہے۔بارش بھی بہت زیادہ ہوتی ہے اور بارش کی زیادتی کی وجہ ہی سے موسم خوشگوار رہتا ہے۔

عشاء کی نماز پوسٹ پر پڑھ ہم محتاط انداز میں نکلے۔براہ راست غربی جانب اترنے کے بجائے ہم نے فرلانگ بھر شمال کی جانب سفر کیا اور پھر ترچھا نشیب میں اترنے لگے۔ہمارا رخ شمال مغرب کو تھا۔ہوا چل رہی تھی، گاہے گاہے بوندا باندی بھی ہونے لگتی۔ہم سادہ کپڑوں میں تھے، کیوں کہ وردی کی وجہ سے دور ہی سے ہماری شناخت ہوجاتی۔افغان نالہ غیر مدفوعہ علاقہ تھا۔

(غیر مدفوعہ علاقے سے مراد دو ملکوں کے درمیان وہ خالی جگہ جس پر کسی ملک کا قبضہ نہ ہو اسے انگریزی میں ''نو مین لینڈ'' کہتے ہیں اسی وجہ سے دہشت گردوں کے خلاف پاکستان آرمی وہاں ہیلی کاپٹر وغیرہ بھی استعمال نہیں کرسکتی تھی کہ پھر افغان حکومت کے ہاتھ احتجاج کرنے کا بہانہ آجاتا)

رینج ماسٹر میرے پاس تھی جبکہ سردار کے جھولے میں سنائپر ٹیم کا دوسرا ضروری ساز و سامان تھا۔غالباً پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ سنائپر ٹیم کے پاس: نقشہ، قطب نما (کمپاس)، دوربین، ٹارچ، رسی، ریڈیو (وائرلیس سیٹ)، ہوا پیما (یعنی ونڈ میٹر، جس سے ہوا کی رفتار ناپی جاتی ہے) اضافی ایمونیشن، لیزر رینج فائینڈر (فاصلہ ناپنے کا آلہ) نائٹ ویدرنگ، جی پی ایس (گلوبل پوزیشننگ سسٹم) ماچس یا لائیٹر، چاقو، چھوٹے دستے کی کلہاڑی، سپاٹر اسکوپ (اس سے بھی دوربین کا کام

لیا جاتا ہے)، گھڑی، خشک راشن، دستی بم وغیرہ موجود ہوتے ہیں۔ سنائپر ہمیشہ جوڑیوں میں کام کرتے ہیں، ایک کو سپاٹر اور دوسرے کو شوٹر کہتے ہیں۔ ''سپاٹر'' ٹیم لیڈر ہوتا ہے جبکہ ''شوٹر'' فائرر۔

بہ مشکل نصف اترائی تک پہنچے تھے کہ ایک دم بارش کی رفتار میں اضافہ ہو گیا۔ مجبوراً ہمیں پانی پلے (رین کوٹ) پہننا پڑے۔ سردار نے ڈریگنوو کی نال کا رخ زمین کی طرف کر دیا تھا تاکہ نال میں پانی نہ چلا جائے۔ ایسا ہونے کی صورت میں فائر کی درستی میں فرق آ سکتا تھا اور گیلا ہونے سے نال کے زنگ پکڑنے کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔

(کوئی بھی ہتھیار یا اس کا ایمونیشن گیلا ہونے سے ناکارہ نہیں ہوتا۔ ہر دو کو سکھا کر استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ گیلا ہتھیار بھی فائر کر سکتا ہے بس فائر کی درستی میں فرق پڑتا ہے۔ مطلب ایمونیشن اگر گیلا ہو تو گولیاں ہدف پر اونچی اور بکھری ہوئی لگیں گی۔ یاد رہے ہتھیار کوئی الیکٹرک مشین نہیں ہے کہ پانی سے ناکارہ ہو جائے)

بارش کی رفتار رفتہ رفتہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ہم نشیب میں اتر رہے تھے، تیز بارش کی وجہ سے پھسلن بڑھ گئی تھی۔ آسمانی بجلی بھی مسلسل چمک رہی تھی۔ ان علاقوں میں یہ بھی بلائے ناگہانی ہے۔ اس سے بچنے کی احتیاطوں میں پانی کے ذخائر سے دور رہنا، درختوں کے نیچے پناہ نہ لینا خاص کر زیادہ بلند درختوں سے بچنا اور دھاتی اشیاء کے اتصال سے بچنا شامل ہے۔

بہتر یہی ہوتا ہے کہ انسان کوئی چھت ڈھونڈے، مگر اس وقت کوئی جائے پناہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہتھیار کو بھی خود سے دور کرنا ممکن نہ تھا۔ بس اللہ پاک کے بھروسے پر تھے۔ عملی زندگی میں بہت سی احتیاطوں کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ لکھائی پڑھائی کچھ اور کہتی ہے تجربات دوسری راہ دکھاتے ہیں۔ اور حقیقت یہی ہے کہ تجربے اور عمل سے بڑا کوئی علم نہیں ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ عملی زندگی میں عموماً کاغذی علم کے الٹ دیکھنے کو ملا ہے۔ خاص کر عملی سنائپر کی زندگی تو نئے وانوکھے واقعات کی تجربہ گاہ ہے۔ ایک سنائپر، جتنے امکان اس کے علم میں ہوں گے ان کا سدباب کر کے دشمن کی راہ میں گھات لگائے بیٹھا ہوگا اور دشمن کے قریب پہنچنے پر کسی نئی صورت حال کا سامنا کرنا پڑ جائے گا۔ ایسی صورت میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا ناکامی کہلاتا ہے اور کچھ کرنے کا مطلب موت کو گلے لگانا ہوتا ہے۔

سردار نے مشورہ دیا۔ ''لڑھکنے سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ فی الحال رک جائیں۔''

مجھے متفق ہونا پڑا۔ کیوں کہ عام حالات میں بھی ڈھلان اترتے ہوئے گرنے کا بہت زیادہ خطرہ ہوتا ہے، اس وقت تو بارش ہو رہی تھی۔ اور پھر گہری تاریکی سونے پہ سہاگا تھی۔ ہم ٹارچ جلانے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے تھے۔

پانی پلے ایک حد تک بارش سے بچاؤ مہیا کرتے ہیں، مسلسل تیز بارش کے سامنے پانی پلے بھی عاجز آ جاتے ہیں۔

وہاں شاہ بلوط کے درختوں کی بہتات تھی۔ اس سدا بہار درخت کے پتے کافی گھنے ہوتے ہیں۔ آسمانی بجلی سے رہنمائی لے کر ہم ایک گھنے درخت کے نیچے ہو گئے۔ رینج ماسٹر کا جھولا میں نے درخت کے تنے پر رکھ دیا تھا کہ اتنی وزنی رائفل کو کندھوں پر اٹھا کر رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ رینج ماسٹر، عام رائفل کی نسبت کافی وزنی ہوتی ہے۔ ایک کلاشن کا وزن قریباً چار کلوگرام ہوتا ہے جبکہ رینج ماسٹر کا وزن سترہ کلوگرام ہوتا ہے۔ غیر فوجی حضرات کو سترہ کلوگرام حقیر وزن لگے گا کہ دس سال کا بچہ بھی اتنا وزن اٹھا سکتا ہے۔ لیکن پتا تب چلتا ہے جب اتنا بوجھ کندھوں پر ہو اور مسلسل چلنا پڑے۔ سنائپر ہونے کے ناتے میرے نزدیک رینج ماسٹر کی سب سے بڑی خامی اس کا وزنی ہونا ہے۔ گو کارکردگی کے مقابلے یہ وزن کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن، سنائپر کو لمبی مسافت طے کر کے دشمن کے علاقے میں جانا ہوتا ہے، مختلف حالات میں اسے اپنی رفتار کم زیادہ رکھنا پڑتی ہے ایسی صورت میں آدھا من وزن بہت معنی رکھتا ہے۔

بارش رکنے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ سردار خان نے بھی جھولا تنے پر رکھا اور درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''یار! ایسی بارش میں مریم (لی زونا) کی یاد اور زور پکڑ لیتی ہے۔'' اس کے لہجے میں اداسی در آئی تھی۔
اس کے ساتھ ہی نشست سنبھالتے ہوئے میں اطمینان سے بولا۔ ''مجھے تو ہر موسم، ہر حالت، ہر وقت یکساں یاد آتی ہے۔''
اس نے منہ بنایا۔ ''براہ مہربانی یہ جھوٹ صرف میری بہن کے سامنے بولا کرو۔''
میں ڈھٹائی سے بولا۔ ''پلوشے کے سامنے تو میں نے کبھی اظہار نہیں کیا۔''
''جتنا تم ڈرتے ہوئے بیوی سے شاید ہی کوئی ڈرتا ہوگا۔''
میں ترکی بہ ترکی بولا۔ ''ڈرتے تم ہو، میں ڈرتا تو دوسری شادی نہ کرتا۔''
وہ استہزائی انداز میں بولا۔ ''جیسے مجھے معلوم ہی نہیں کہ تم نے دوسری شادی کن حالات میں کی تھی۔''
''جیسے بھی کی ہو، اگر ڈرتا تو پلوشے کی واپسی پر اسے طلاق دے دیتا، تم میں اگر جرأت ہے تو دوسری شادی کر کے دکھاؤ۔''
وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ ''میری بھی دوسری ہی شادی ہے جناب۔''
میں نے اکسایا۔ ''پہلی بیوی کے ہوتے دوسری شادی کرو۔''
وہ معصومیت سے بولا۔ ''یار راجے! میری موت کے خواہاں ہو تو خود ہی گولی مار دو، مریم کے ہاتھوں مروا کر کیوں بے عزت کرانا چاہتے ہو۔''
میں نے چھاتی چوڑی کی۔ ''میں تو تیسری شادی کرنے والا ہوں۔''
اس نے منہ بنایا۔ ''یہ سپنے نیند میں اچھے لگتے ہیں۔''
میں نے قہقہہ لگایا۔
سردار نے ٹوکا۔ ''ہی ہی نہ کرو..... تم بیٹھک میں نہیں بیٹھے۔''
ہنسی ایک دم میرے ہونٹوں سے غائب ہو گئی تھی۔ طوفانی بارش میں بھی ہم دشمن کے خطرے سے بے نیاز نہیں ہو سکتے تھے۔ فوجیوں کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے، آگ و خون کے دریا میں تیرتے ہوئے پھول و شبنم کا موضوع چھیڑے رکھتے ہیں۔ گولیوں و بارود کے دھماکوں میں ساز و باجے کی آواز سنتے ہیں۔ موت کے سفر میں زندگی کی باتیں کرتے ہیں، ہجر و جدائی کی ترشی کو وصال کے میٹھے سپنوں سے سہارتے ہیں۔ ہم نے اپنے پیاروں کا ذکر چھیڑ کر آنے والے جاں گسل لمحات کو عارضی طور پر بھلانے کی کوشش میں تھے۔ استاد محترم تصور صاحب فرمایا کرتے: ''سنائپر کا ہر مشن آخری مشن ہوتا ہے اور سنائپر کی بقا موت سے منسلک ہے، مارے گا تو بچے گا نہ مار سکا تو مرے گا۔''
اور ہمارا حالیہ مشن اس لیے بھی مشکل تھا کہ ہدف کوئی مخصوص شخصیت نہیں انسان، مذہب اور وطن دشمن عناصر کا ٹولہ تھا۔ اور افغان نالہ میں ان لوگوں کی ٹولیاں مردار پر اکٹھا ہونے والے گدھوں کی طرح جمع تھیں۔ شاید ہی کوئی اہم ٹیکری ہمیں خالی ملتی۔
سردار نے اندیشہ ظاہر کیا۔ ''ممکن ہے کہ دشمن بھی موسم کا فائدہ اٹھا کر حملے کا قصد کرے۔''
میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''فکر نہ کرو کمانڈنگ آفیسر نے نصف نفری کو جاگتے رہنے کا حکم دیا ہے۔ جوان چوکس ہیں دہشت گردوں نے ایسی جرأت کی بھی سہی تو منہ کی کھائیں گے۔''
''بارش رکتی نظر نہیں آتی یہیں بیٹھے رہے تو طلوع آفتاب کے بعد ہی حرکت کر سکیں گے اور ہمیں آج کی رات ہی مناسب ٹھکانہ ڈھونڈنا ہے۔''

میں چڑ کر بولا۔ ''تم نے خود ہی رکنے کو کہا تھا۔''

''ایک سپاہی کو حوالدار سے زبان لڑانے کی جرأت نہیں ہونا چاہیے۔ اور یوں بھی تمھاری ناقص عقل میں میرے فیصلے نہیں آسکتے۔''

میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''قیامت کی نشانیوں میں پٹھانوں کی عقل مندی کا دعویٰ بھی شامل ہے۔''

''تمھیں کیا پتا خان کیا کیا کر سکتے ہیں۔''

میں برجستہ بولا۔ ''بات کرنے کی نہیں سوچنے کی ہو رہی ہے۔''

وہ بگڑ کر بولا۔ ''تمھارا خیال ہے پٹھانوں کے پاس دماغ نہیں ہوتا۔''

میں ہنسا۔ ''ہوتا ہوگا، استعمال دل ہی کو کرتے ہیں۔''

''مذاق کا وقت نہیں ہے۔'' وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ''مسلسل بیٹھے رہے تو سردی سے جم جائیں گے۔''

سردی تو مجھے بھی لگ رہی تھی۔ اور میں متفق بھی تھا، پانی پلہ جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔ بارش کا پانی پرشور آواز میں نشیب کی طرف بہہ رہا تھا۔ جھولے اٹھا کر ہم نے قدم بڑھا دیے۔ ڈھلان اترنے تک ہمیں نہایت احتیاط کرنا تھی۔ ہمیں آڑا ترچھا (زگ زیگ) چل کر سفر کرنا پڑ رہا تھا۔ جنھیں پہاڑوں میں سفر کرنے کا تجربہ ہو چکا ہو وہ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ بلند ہونے یا نشیب میں اترنے کا آسان اور محتاط طریقہ یہی ہے۔ اور اس وقت بارش کی وجہ سے ہمیں زیادہ احتیاط کرنا پڑ رہی تھی۔ گہری تاریکی چھائی تھی، ٹارچ بھی نہیں جلا سکتے تھے کہ روشنی بہت دور سے نظر آجاتی ہے۔

تھوڑا فاصلہ طے کرتے ہی جھاڑیوں اور کم بلند درختوں کا ایک اور سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ بجلی کی چمک میں جھاڑیاں نشیب تک پھیلی نظر آئیں۔ جھاڑیاں ہمیں نیچے اترنے میں سہولت دے سکتی تھیں، بغیر کسی مشورے کے ہم جھاڑیوں کا سہارا لے کر تیزی سے نشیب میں اترنے لگے۔ ٹہنیوں کو پکڑ کر چلنے سے پھسلنے کا خطرہ بالکل نہیں رہتا۔

نیچے پہنچنے سے چند گز پہلے جھاڑیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہم رینگنے کی رفتار سے تہہ تک پہنچے۔ پانی کا بہاؤ نالے کے درمیان میں تھا۔ تیز بارش کے وقت نالوں میں پانی کی مقدار غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں نالوں کو عبور کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ افغان نالے کی شکل دریا جیسی نہیں تھی کہ تمام پہاڑوں کا پانی اکٹھا بہتا۔ وہاں کئی چھوٹے چھوٹے نالے تھے جن کے بہاؤ کا رخ جنوب سے شمال کی جانب تھا۔ اور چھوٹے نالوں میں بھی اس وقت اچھا خاصا پانی بہہ رہا تھا۔ ہم نے کالے رنگ کے سپورٹس شوز پہنے تھے جو پہاڑی علاقے میں کافی کارآمد ہوتے ہیں۔ دونوں کے بوٹ اس وقت پانی سے شرابور تھے۔ ڈھلوان ختم ہوتے ہی پھسلنے کا خطرہ پہلے کی طرح نہیں رہا تھا۔ البتہ چھوٹے بڑے پتھروں سے الجھ کر گرنے یا پاؤں میں موچ آنے کا خطرہ باقی تھا۔ چاندنی رات یا ٹارچ کی روشنی میں حرکت کرنے میں صرف تھکن ہی رکاوٹ ڈالتی ہے اور اندھیرے میں اس کے علاوہ بھی کئی مسائل درپیش ہوتے ہیں۔

سردار نے کپکپاتے ہوئے دہائی دی ''راجے صاحب! دشمن کا تو پتا نہیں لیکن آج سردی سے نہیں بچنے والے۔''

''اچھا ہے ایک پٹھان تو کم ہوگا پاکستان سے۔''

وہ ہنسا۔ ''پنجابی بھی بچے گا نہیں، تو حساب برابر ہوا۔''

میں نے ہاتھ رگڑتے ہوئے کہا۔ ''پھر تو کوئی پناہ ڈھونڈنا پڑے گی۔''

ہم نالے میں آگے بڑھنے لگے۔ تھوڑا سا چلتے ہی میرے کانوں میں باتوں کی ہلکی سی آواز آئی۔ ایک دم سردار کا ہاتھ پکڑ کر میں نے ہلکے سے دبا دیا۔ قدم روک کر ہم نے آواز کی سمت کان لگا لیے۔ اسی وقت ٹارچ کی ہلکی سی روشنی بھی دکھائی دی تھی۔ وہ ایک ٹیکری کے عقب سے نمودار ہو رہے تھے۔

بجلی تیز چمکی اور ہم نے سرعت سے قریبی جھاڑی کی آڑ پکڑ لی۔ لمحہ بھر بعد بادل گرجا۔ ''کڑ.....کڑ.....کڑ۔'' کی آواز ختم ہوتے ہی نالے کا شور اور بوندوں کی۔ ''ٹپ ٹپ۔'' سنائی دینے لگی۔ اسی اثناء میں دوبارہ آواز ابھری۔ جو اس بار پہلے سے واضح تھی، لیکن الفاظ کی صحیح سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ چند الفاظ جو میرے کانوں میں پڑے ان سے اندازہ ہوا وہ پشتو بول رہے تھے۔ ان کا رخ ہماری ہی طرف تھا تبھی آواز رفتہ رفتہ واضح ہو رہی تھی۔ دو ٹارچوں کی روشنی سے اندازہ ہوا کہ دو ہی آدمی ہیں۔

ان کے مزید قریب آنے پر الفاظ کی سمجھ آنے لگی تھی۔ ''اتنا تیز نہ چلو، میں تھک گیا ہوں۔''

دوسری آواز نے تسلی دی۔ ''تھوڑا فاصلہ ہی رہ گیا ہے۔'' وہ رفتہ رفتہ ہمارے قریب آ رہے تھے۔

پہلا شخص بولا۔ ''ملک گل بدین اتنا بڑا کمانڈر ہے اور اس کے پاس اپنے آدمی کے علاج کو ڈاکٹر موجود نہیں ہے۔''

''اس کے زیادہ تر لشکری پار چلے گئے ہیں۔ تبھی اسے کمانڈر عدیل کی مدد لینا پڑی۔''

پہلے نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''کمانڈر خود تو گرم بستر میں لیٹا ہے، بدبختی تو ہماری ہے جو اس موسم میں خوار ہوتے پھر رہے ہیں۔''

دوسرا کھل کھلا کر ہنسا۔ ''تمھارا جانا تو لازمی تھا میں مفت میں خوار ہو رہا ہوں۔'' وہ سامنے سے گزر کر پہاڑ کی بنیاد میں چلتے ہوئے شمال کی طرف بڑھنے لگے۔ دونوں نے سبز رنگ کے پانی پلے پہنے ہوئے تھے۔

سردار نے دانت پیستے ہوئے سرگوشی کی۔ ''خنزیر ہیں، شروعات کر دینا چاہیے۔'' وہ دہشت گردوں کو عموماً اسی لقب سے یاد کرتا تھا۔ اور حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اس سے بھی غلیظ اور گھٹیا تخاطب کے حق دار تھے۔

''چلو۔'' میں رینج ماسٹر کا جھولا کندھوں سے نکال کر کھڑا ہو گیا۔ سردار نے بھی اپنا جھولا وہیں چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہمارے سامنے سے گزر کر آگے بڑھ گئے تھے اور اب ان کی ہماری جانب پیٹھ تھی۔ ٹارچ کی روشنی ہماری بہترین رہنمائی کر رہی تھی۔

سردار نے پوچھا۔ ''کیا سوچ رہے ہو۔'' اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ مجھے ہی فائر کرنا پڑے گا۔ یوں بھی جب درست، محتاط اور کامیاب فائر کرنے کی ضرورت ہوتی سردار مجھے ہی موقع دیتا تھا۔

میں نے سائیلنسر لگا بریٹا ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ البتہ پستول میں نے پانی پلے کے نیچے رکھا تھا تاکہ گیلا ہو کر پستول کی کارکردگی میں فرق نہ پڑ جائے۔ ہم نے ان کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔ اچانک بجلی زور سے چمکی، اور مختصر لمحات کا فائدہ اٹھا کر میں نے پستول والا ہاتھ سیدھا کیا چمک ختم ہونے تک بریٹا کی نال سے چند گرام سیسہ نکل کر ایک ناپاک وجود سے دھرتی کی جان چھڑا چکا تھا۔ سر میں لگنے والی گولی نے اسے چیخنے کا موقع نہیں دیا تھا، نہ بارش اور نالے کے شور نے اس کے ساتھی کے کانوں تک ''ٹھک۔'' کی آواز پہنچنے دی تھی۔ البتہ اس کے اوندھے منہ گرنے پر ساتھی نے۔ ''سنبھل کر چلو۔'' کا نعرہ بلند کرتے ہوئے ٹارچ کا رخ اس کی جانب موڑا، مگر وہ نصیحتوں سے بہت دور جا چکا تھا۔ جب تک اسے ساتھی کی کھوپڑی میں کھلا روشن دان نظر آتا سردار ٹارچ جلا کر اسے روشنی کے حلقے میں لے چکا تھا۔

''اپنی کھوپڑی بچانے کو تمھیں ہاتھ گردن کے پیچھے باندھنے ہوں گے۔''

''کک.....کون ہو تم.....'' وہ ہکلا گیا تھا۔

''راجے اسے شک ہے۔''

سردار کی بات ختم ہونے تک ایک اور ''ٹھک'' ہوئی اور وہ چیخ مار کر نیچے گر گیا تھا۔ میں نے اس کی داہنی پنڈلی کو نشانہ بنایا تھا۔ اس نے کندھے سے کلاشن کوف لٹکائی ہوئی تھی، گرتے ساتھ اس کے ہاتھ کلاشن کوف کی طرف بڑھے، اگر وہ فائر

کرنے میں کامیاب ہو جاتا، گولی بے شک ہمیں نہ لگتی مگر تڑتڑاہٹ دشمنوں کو چوکنا کر سکتی تھی۔
سردار نے مختصر فاصلہ زقند بھر کر طے کیا اور کلاشن کوف کا کک کرنے تک اس کے سر جا چڑھا۔ پاؤں کی بھرپور ٹھوکر سے اس نے کلاشن کوف دور پھینکی اور اگلی ٹھوکر اس کے چہرے پر رسید کر دی۔
''اوغ۔'' کی آواز سے وہ پیچھے الٹ گیا تھا۔
وہ ہکلاتے ہوئے تعارف کرانے لگا۔ ''مم..... میں کمانڈر عدیل جان کا لشکری ہوں۔''
سردار نے اس کی زخمی پنڈلی پر پاؤں رکھا۔ ''کسی نے پوچھا ہے جو تعارف کرا رہے ہو۔''
''آہ.....'' زوردار کراہ اس کے منہ سے خارج ہوئی تھی۔ ''کک..... کون ہو تم.....؟''
سردار نے اکڑوں بیٹھا اور اس کے لمبے بالوں میں ہاتھ ڈال کر زوردار جھٹکا دیا۔ ''تفتیش ہم نے کرنا ہے پتر!''
''تمھارا نام؟'' اس کے ساتھی کی ٹارچ اٹھا کر میں نے پہلا سوال پوچھا۔
''اباسین خان۔'' اس نے جواب دینے میں دیر نہیں کی تھی۔
میں نے اگلا سوال کیا۔ ''کہاں جا رہے تھے؟''
وہ صاف گوئی سے بولا۔ ''ایک ساتھی کو گولی لگی ہے اس کا علاج کرنے۔''
میں مزید سوال پوچھنے لگا، وہ کبھی رک کر اور کبھی سرعت جواب دینے لگا۔ سردار نے اس کی زخمی پنڈلی پر ہاتھ رکھا ہوا تھا جونہی جواب میں سستی دکھاتا سردار پنڈلی کو دبا دیتا اور اس کی مزاحمت دم توڑ جاتی۔ جو کچھ معلوم ہوا اس کا لب لباب یہ تھا کہ، ملک گل بدین کے دو لشکریوں میں تلخ کلامی ہوئی یہاں تک کہ دونوں نے ہتھیار نکال لیے۔ اور انھیں چھڑانے والا گولی کا نشانہ بن گیا۔ ملک گل بدین کے زیادہ تر لشکری پاک فوج کی پوسٹوں پر حملہ کرنے کو باڑ سے پار جا چکے تھے۔ افغان نالہ میں موجود اس کے آدمیوں میں کوئی ایسا نہیں تھا جو زخمی کے جسم سے گولی نکال سکتا، مجبوراً انھیں کمانڈر عدیل جان سے مدد مانگنا پڑی تھی۔ پہلے بتا چکا ہوں کہ دہشت گردوں کے تمام جتھے پاک آرمی کے خلاف عارضی طور پر اکٹھے ہو گئے تھے۔ عدیل جان نے ملک گل بدین کے دست راست قلات خان کی درخواست پر اباسین خان اور صوبہ خان کو ان کی مدد کو بھیجا تھا۔ اباسین خان ابتدائی طبی امداد کے بارے اچھی شد بد رکھتا تھا۔ ملک گل بدین خود وہاں حاضر نہیں تھا۔
اچھی طرح نچوڑ کر سردار نے کہا۔ ''اسے ساتھی کے پاس پہنچا دو۔''
میں نے منہ بنایا۔ ''گولی ضائع کرنا ضروری ہے۔''
وہ گڑگڑایا۔ ''نہ..... خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔''
سردار نے دانت پیسے۔ ''اسی خدا کے لیے جس کے نام پر تم اتنے اچھے کام کر رہے ہو۔''
اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ ''آ..... آپ کون لوگ ہو؟''
''بیٹا! ہم وہی ہیں جن کے خلاف تم حملے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔'' مزاحیہ لہجے میں کہتے ہوئے سردار نے خنجر نکالا اور اطمینان سے اس کے گلے پر پھیر دیا۔ آخری وقت میں اس نے ہڑبڑا کر مزاحمت کی، مگر یہ ناکام کوشش تھی۔ فس کو پٹھان دشمن کے خلاف کتنا سفاک تھا اس کا اندازہ مجھے کئی بار پہلے بھی ہو چکا تھا۔
وہ اذیت سے پھڑکنے لگا۔ ہمارے دل میں اس کے لیے رتی بھر رحم بھی موجود نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ نہ جانے کتنے معصوموں کے خون سے رنگے تھے اور وہاں بھی اس کی موجودی کا مقصد پاک فوج پر حملہ کرنا تھا۔ آستین کے ایسے سانپوں پر رحم کھانا مظلوموں کے ساتھ زیادتی ہے۔

سردار نے دونوں کی تلاشی لی۔ جیبوں سے انڈین رقم، آئی کام (وائرلیس سیٹ) اور ہتھیاروں کے علاوہ کوئی کام کی چیز برآمد نہ ہوئی۔ البتہ اباسین خان کے تھیلے میں ابتدائی طبی امداد کا ضروری سامان، دو تین قسم کے فورسپ (جسم سے گولی نکالنے کا چمٹی نما مخصوص آلہ) درد کش گولیاں و ٹیکے اور پٹیاں وغیرہ رکھی تھیں۔

لاشوں کو گھسیٹ کر ہم نے جھاڑیوں کے جھنڈ میں پھینکا۔ اور کلاشن کوفوں کو پتھروں میں دبا دیا۔ ابتدائی طبی امداد کا تھیلا اور آئی کام سیٹ بھی ہم نے پاس رکھنا ضروری سمجھا تھا۔ ہمارے پاس اپنی پوسٹ سے ملاپ کو کینوڈ (وائرلیس سیٹ) موجود تھا۔ موبائل فون کی طرح وائرلیس سیٹ بھی مختلف کمپنیاں بنا رہی ہیں، جن میں کینوڈ، آئی کام، مٹرولا، ہیرس وغیرہ شامل ہیں۔ ان سیٹوں میں کنکشن کارڈ یا اس قسم کا کوئی بکھیڑا نہیں ہوتا۔ ہر کمپنی کے سیٹ مخصوص فریکونسی پر کام کرتے ہیں۔ اس لیے دوسری کمپنی کے وائرلیس سیٹ کے ساتھ ملاپ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ پہلے آرمی میں بڑے ریڈیو سیٹوں کا رواج تھا جو کافی وزنی ہوتے تھے، البتہ ان کا ملاپ بھی لمبے فاصلوں تک ہو سکتا تھا۔ اب چھوٹے وائرلیس سیٹ آ گئے ہیں، جنھیں ساتھ پھرانا نہایت آسان ہے، لیکن ان کا ملاپ محدود فاصلے تک ممکن ہے۔ اب تو وزیرستان میں موبائل فون سروس کام کر رہی، اس سے پہلے عام لوگ بھی رشتہ داروں وغیرہ سے رابطے کو وائرلیس سیٹ خرید لیتے تھے۔

ضروری کارروائی کے بعد ہم جانے کو تیار تھے۔ ملک گل بدین کے لشکریوں کا ٹھکانہ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اباسین خان سے اس متعلق ہمیں کافی کچھ معلوم ہوا تھا۔ پہاڑی کی بنیاد میں چلتے ہوئے آگے انٹرینٹ (انٹرینٹ، نقشہ بینی کی اصطلاح میں ایسی جگہ جو پہاڑ کے اندر کی طرف دبی ہوئی ہو، ایسی جگہ پہاڑ کے دو بازوؤں کے درمیان ہوتی ہے۔ جبکہ پہاڑ کے بازو سے مراد وہ ڈھلوان ہے جو بتدریج نیچے ہوتے ہوئے زمین سے مل جائے) آتا تھا۔ اور وہیں ان کا ٹھکانہ تھا۔

اب ہم نے ٹارچیں جلا لی تھیں، کیوں کہ دشمن ہمارے متعلق غلط فہمی میں مبتلا تھا۔

ان کے ٹھکانے تک ہمیں ایک ادھ کلومیٹر فاصلہ طے کرنا پڑا تھا۔ جلد ہی ہم انٹرینٹ تک پہنچ گئے تھے۔ وہاں پہاڑی اندر کی طرف دبی ہوئی تھی۔ سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر روشنی نظر آ رہی تھی۔ بجلی چمکنے پر دو خیمے دکھائی دیئے تھے۔

میں نے جھولے کے تسمے کندھے سے نکالتے ہوئے کہا۔ ''اپنے جھولے یہیں چھوڑنا مناسب رہے گا۔''

سردار نے میری تقلید میں سستی نہیں کی تھی۔ جھولے جھاڑی کے نیچے رکھ کر ہم آگے بڑھ گئے۔ بارش اسی تسلسل سے جاری تھی۔ ہماری ٹارچیں روشن تھیں، سامنے سے بھی ایک دو بار ٹارچ کا اشارہ دیا گیا۔ میں نے بریٹا کے دستے پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ ''کوشش کروں گا کہ تمھیں فائر نہ کرنا پڑے، لیکن تیار رہنا۔''

وہ بے جگری سے بولا۔ ''خان ہر وقت تیار ہوتا ہے۔''

میں نے کارروائی کی ترتیب بتائی۔ ''تم ساتھ والے خیمے کا رخ کرنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' سردار نے کلاشن کوف تیاری حالت میں تھام لی تھی۔

چونکہ کچھ لوگ کلاشن کو کندھے پر لٹکانے کے بجائے ہاتھ میں اٹھانے کے عادی ہوتے ہیں اس لیے کسی کو سردار کی حرکت پر شک نہیں ہو سکتا تھا۔

دونوں خیموں کے درمیان دو گھوڑے یا خچر بھی بندھے نظر آ رہے تھے۔ یقیناً وہ مویشی باربرداری کو استعمال ہوتے تھے۔ عام استعمال کی اشیاء وہ کندھوں پر تو اٹھا کر وہاں تک نہیں لا سکتے تھے۔ جبکہ گاڑیوں کی حرکت بھی سڑکوں تک محدود تھی۔

دو آدمی برساتیاں پہنے خیموں کے باہر ہی ہمارے منتظر تھے۔ انھوں نے خیمے سے چند قدم آگے آ کر ''پہ

خیر۔'' کہتے ہوئے ہمیں خوش آمدید کہا تھا۔

جونھی اگلے والے نے مصافحے کو ہاتھ بڑھایا، برساتی کی جیب سے ہاتھ نکال کر میں نے بجلی کی سی سرعت سے دوبار لبلبی دبادی۔ دونوں بغیر آواز نکالے دھڑام سے نیچے گرے تھے۔ ان کے تڑپتے اجسام کو پھلانگتے ہوئے میں خیمے کی طرف بڑھا، جبکہ سردار کا رخ دوسرے خیمے کی طرف تھا۔ اس وقت ذرا سی سستی کرنے پر ہمیں ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ خیمے میں چار آدمی گپیں ہانک رہے تھے، جبکہ پانچواں پرانے سے گدے پر لیٹا کراہ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے تھے، لیکن میرا ارادہ حیرانی دور کرنے کے بجائے انھیں مزید حیران کرنے کا تھا۔ میں رکے بغیر تسلسل سے بریٹا کی لبلبی دباتا گیا۔ اس فاصلے پر تو کسی اناڑی کی گولی بھی ضائع نہ جاتی تو مجھ سے کیوں کر کوتاہی ہو سکتی تھی۔ چاروں بغیر سوال جواب کے ڈھیر ہو گئے تھے۔ البتہ زخمی اپنی تکلیف بھول کر جھٹکے سے اٹھ بیٹھا تھا۔

''تت.....تم.....تم.....'' گھبراہٹ کے مارے اس سے فقرہ مکمل نہیں ہو پایا تھا۔

میں مزاحیہ انداز میں بولا۔ ''صحیح پہچانا، میرا تعلق پاک آرمی سے ہے۔''

اس کے چہرے پر زردی چھا گئی تھی۔ لمحہ بھر سوچ کر وہ اٹکتے ہوئے بولا۔ ''مم..... میں زخمی ہوں۔''

اسی وقت سردار کی چہکتی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''I have find your thired bride,Congratulation Rajay''۔ (مبارک ہو راجے میں نے تمھاری تیسری دلہن ڈھونڈ لی ہے)

اس کے ہمراہ ایک جواں سال لڑکی موجود تھی، وہ سخت ہراساں اور وحشت زدہ لگ رہی تھی۔

''یہ کون ہے؟'' میں ششدر رہ گیا تھا۔

''یہ بتائے گا ناں؟'' سردار نے کلاشن کوکی نال زخمی کی طرف کرتے ہوئے سیفٹی لیور نیچے کیا۔

وہ گھبراتے ہوئے چیخا۔ ''مم..... مجھے مت مارو، میں سب کچھ بتانے کو تیار ہوں۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ لڑکی کون ہے؟''

وہ تفصیل بتانے لگا۔ ''اسے آج سہ پہر کو، کمین خان اور دل مرجان پکڑ کر لائے تھے۔ بعد میں اسی کی وجہ سے دونوں کا جھگڑا ہوا، انھیں چھڑانے کے چکر میں میں زخمی ہو گیا۔ کمانڈر قلات خان تک یہ بات پہنچی تو اس نے حکم دیا کہ اس کی آمد تک لڑکی کو کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ تبھی لڑکی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر علیحدہ خیمے میں لٹا دیا گیا۔ کل کمانڈر قلات خان آ کر اس کا فیصلہ کرے گا۔''

میں نے اگلا سوال پوچھا۔ ''ملک گل بدین کہاں ہے؟''

''وہ شوال وادی میں ہے۔''

''کیوں؟''

وہ نظریں چراتا ہوا بولا۔ ''کام کے سلسلے میں گیا تھا جلد لوٹ آئے گا۔''

''تمھارا نام؟''

''اصل دین۔''

''اصل ہو یا نقل تمھیں پتا ہونا چاہیے کہ ہمیں گل بدین کے کام کی نوعیت معلوم ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتے ہیں۔ اگر خود کو اذیتوں سے بچانا ہے تو ہر بات کا صحیح جواب دینا، کیوں کہ ہو سکتا ہے جو پوچھ رہا ہوں وہ مجھے پہلے سے پتا ہو اور مقصد تمھیں جانچنا ہو۔''

اس نے خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''میں سب کچھ صحیح بتاؤں گا، مگر وعدہ کرو مجھے زندہ چھوڑ دو گے۔''

میں نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔ ''ہمیں معصوم لوگوں کو قتل کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔'' یقیناً وہ معصوم نہیں تھا اور میں اسے چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا تبھی ذو معنی بات کی تھی۔

اس نے سرعت سے صفائی دی۔ ''میں نے آج تک پاک آرمی کے کسی جوان پر گولی نہیں چلائی۔''

سردار ہنسا۔ ''تو یہاں عبادت کو حاضری دی تھی۔''

''خاموش رہو گل جان!'' میں نے سردار کو جھڑکا۔ ہمارے نقلی شناختی کارڈوں کے مطابق اس کا نام گل جان اور میرا سبحان شاہ تھا۔

میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ''گل بدین شوال وادی میں کیا کر رہا ہے؟''

اصل دین نے اٹکتے ہوئے وہی تفصیل دہرادی جو ہمیں پہلے سے پتا تھی۔

میں نے اگلا سوال پوچھا۔ ''افغان نالہ میں گل بدین کے کتنے آدمی موجود ہیں؟''

''اندازاً بیس، پچیس ہوں گے۔''

میں سردار کی طرف متوجہ ہوا۔ ''دوسرے خیمے میں ان کوئی آدمی موجود تھا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ایک لیٹا تھا، میں نے پکا سلا دیا ہے۔''

''یہاں مجموعی طور پر تم آٹھ آدمی موجود تھے، باقی کہاں ہیں؟''

''باقی کمانڈر قلات خان کے ساتھ ہیں۔''

میں نے سوال دہرایا۔ ''کہاں؟''

''شمال کی جانب قریباً اڑھائی تین کلومیٹر دور رہوں گے۔''

''یہ اتنا لمبا فاصلہ نہیں کہ قلات خان کو اپنی آمد کل پر ٹالنا پڑتی۔''

''موسم کی وجہ سے اس نے آنا پسند نہ کیا۔''

سردار نے کہا۔ ''میں سامان لے آتا ہوں۔'' وہ رینج ماسٹر وغیرہ لانے چل پڑا اور میں کرید کرید کر اصل دین سے معلومات اگلواتا رہا۔

لب لباب یہی ہے کہ قلات خان اڑھائی تین کلومیٹر دور شمال کی طرف موجود تھا اس کے ہمراہ دس بارہ آدمی تھے۔ وہاں اس نے ''بلاکنگ پوزیشن'' لگائی تھی۔ وہ مقام ''کیو جے ایٹ'' سے تھوڑا شمال کی طرف تھا۔ ہم دونوں کیو جے ایٹ'' ہی سے اترے تھے ''کیو جے سیون'' جنوب کی جانب تھی۔ دہشت گردوں کے تمام جتھے مل کر کیو جے ٹاپ کی تین پوسٹوں کو گھیرے میں لے کر حملے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ ایسا ہونے کی صورت میں کیو جے ٹاپ کی پڑوسی پوسٹوں نے لازماً مدد کو آنا تھا اور شمالی کی جانب سے آنے والی مدد کو روکنا قلات خان کی ذمہ داری تھی۔ جنوب کی جانب کمانڈر رنگین خان کے جتھے پھیلے تھے۔ مشرقی جانب ملک گل بدین کے لشکری اکٹھے ہوئے تھے اور مغرب کی جانب کمانڈر عدیل جان اور سردار فیروز خان کا لشکر تھا۔ چند آدمی ملک گل بدین کے بھی تھے۔ چونکہ ملک گل بدین کے لشکریوں کی تعداد دوسرے کمانڈروں سے زیادہ تھی اس لیے اس کی ذمہ داری بھی زیادہ تھی۔ اصل دین نے یہ بھی بتایا کہ پہلے حملہ جمعہ کے دن ہونا تھا۔ پوسٹوں پر اضافی نفری کی آمد پر انھوں نے حملے کا منصوبہ زائد نفری کی واپسی تک ملتوی کر دیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اضافی نفری نے زیادہ دن وہاں نہیں ٹکنا تھا۔ اس دوران وہ تینوں پوسٹوں کے گرد گھیرا مکمل کر کے آہستہ آہستہ گھیرا

تنگ کر رہے تھے۔ باڑ لگنے نے ملک دشمن ایجنسیوں کو حواس باختہ کر دیا ہے اور وہ مل کر پاک آرمی پر کاری ضرب لگانا چاہتے ہیں۔

پاک آرمی کی وزیرستان آمد کے بعد دہشت گردوں نے پورا زور لگایا تھا کہ فوج کو ناکام کر کے واپس جانے پر مجبور کیا جائے۔ اس ضمن میں سادہ لوح مقامی افراد کو بھی بہلا پھسلا کر اپنے مذموم مقاصد کو استعمال کیا گیا اور خود بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا کر پاک آرمی کے خلاف مسلسل جارحانہ کارروائیاں کی گئیں۔ ابتداء میں پاک فوج نے کافی اتلافیاں بھی جھیلیں۔ کیوں کہ پاکستان آرمی روایتی جنگ کے لیے تو تربیت یافتہ تھی لیکن غیر روایتی جنگ اس کے لیے بالکل نئی، الگ اور انوکھی تھی۔ روایتی جنگ میں تو دشمن کا آمنے سامنے مقابلہ کیا جاتا ہے، دشمن کی سمت و مقاصد معلوم ہوتے ہیں۔ جبکہ غیر روایتی جنگ جو پاکستان پر مسلط کر دی گئی ہے بالکل الگ ہے۔ دشمن آستین کے سانپ کی طرح چاروں طرف موجود تھے، ان کی سمت کا تعین نہیں تھا کہ پورے وزیرستان میں پھیلے تھے۔ علاقائی خدوخال ان کے حق میں تھے، بلند پہاڑ، پوشیدہ غار، جنگل اور ہاتھ کی لکیروں کی طرح پھیلے خشک و تر نالے انھیں پناہ دیئے ہوئے تھے۔ ان کی واضح شناخت نہیں تھی اور مقامی افراد میں گھلے ملے تھے۔ بلکہ مقامی افراد کو یرغمال بنایا ہوا تھا۔ یوں بھی پاک آرمی کی آمد سے پہلے وزیرستان کو علاقہ غیر کہتے تھے۔ لوگوں کے پاس بے شمار اسلحہ موجود تھا۔ پستول سے لے کر راکٹ لانچر، مارٹر اور 12.7 ایم ایم جیسی بھاری گنیں موجود تھیں۔ شر پسند، دشمن ملک اور دہشت گرد عناصر پاک آرمی کی آمد و رفت کے راستوں پر آئی ای ڈیز لگا دیتے۔ دور دور سے سنائپنگ کر کے فوجی جوانوں کو نشانہ بناتے۔ موقع ملنے پر کسی ایسی پوسٹ پر حملہ کر گزرتے جہاں ہنگامی صورت میں سپاہ کی تعداد کم ہوتی۔ مقامی افراد کا روپ دھار کر پاک آرمی کے جوانوں کی مہمان نوازی کرنے کے بہانے بے ہوشی کی دوا پلا کر انھیں ذبح کر دینا آئے روز کا معمول تھا۔ ابتداء میں اچھی خاصی ناکامیاں حاصل کرنے اور اتلافیاں برداشت کرنے کے بعد پاک آرمی سنبھل گئی تھی۔ تربیتی مراکز میں جوانوں کو نئے سرے سے تیار کیا گیا، غیر روایتی جنگ کی تربیت دی گئی اور پاک آرمی وزیرستان، سوات، پاڑا چنار وغیرہ میں پھیلی غلاظت کی صفائی میں دل و جان سے جت گئی۔ آج الحمدللہ یہاں کا ماحول بالکل بدل چکا ہے۔ زیادہ تر علاقوں میں تو امن قائم ہو چکا ہے۔

وزیرستان جیسے خوب صورت اور روح پرور علاقے کے باسی بھی اب امن و سکون کی چاپ واضح انداز میں سن رہے ہیں۔ گو کبھی کبھار دہشت گرد بچھو کی طرح ڈنک مار دیتے ہیں کہ انڈیا، امریکہ، اسرائیل وغیرہ پاکستان میں امن دیکھنے کے خواہاں نہیں ہیں۔ لیکن یہ کارروائیاں پہلے کے مقابلے میں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہیں۔ البتہ ان علاقوں کی ترقی کو کافی کام کرنے والے ہیں۔ سڑکیں، کارخانے، ہسپتال، سیر گاہیں اور انتہائی ضرورت کے دوسرے مراکز کی تعمیر اب تک اس رفتار سے شروع نہیں ہوئی جس کی حاجت ہے۔

حق تو یہ ہے کہ سب سے پہلے اس علاقے کی تعمیر و ترقی پر زور دیا جائے۔ یہ سہولیات سے محروم علاقہ ہے۔ لوگوں کی بنیادی ضروریات پوری نہیں ہو رہیں۔ پاکستان کا شہری ہونے کے ناتے ان کا سہولیات پر اتنا ہی حق ہے جتنا لاہور، پشاور، کوئٹہ اور کراچی کے لوگوں کا۔ دہشت گردی سے سب سے زیادہ متاثر وزیرستان کی غریب و سادہ عوام ہی ہوئی ہے۔ انھیں خصوصی طور پر بسانے کا خاطر خواہ بندوبست نہ کیا گیا، ان کے اجڑے گھر نہ بسائے گئے، ان کے زخموں پر پیار، محبت و اپنائیت کے پھائے نہ رکھے گئے تو ملک دشمن عناصر فائدہ اٹھا کر سادہ لوح اور معصوم عوام کو مشتعل کر کے اپنے مقاصد کو استعمال کریں گے۔ سیاست دان آپس کے جھگڑوں میں پڑ کر عوام کے دکھ درد سے بے خبر و بے پروا ہو گئے ہیں اور ایسی لاغرضیاں بہت زیادہ نقصان و تباہی لاتی ہیں۔

سردار کی آمد تک میں اصل دین سے کافی کچھ معلوم کر چکا تھا۔ اس دوران وہ لڑکی کونے میں سہمی ہوئی کھڑی رہی۔ وہ

کبھی ٹکر ٹکر مجھے گھورنے لگتی، کبھی اصل دین کو اور کبھی اس کی نظر بیٹری سے جلنے والے بلب پر جا ٹکتیں جو خیمے کو روشن کیے ہوئے تھا۔ بیٹری کے قریب ایک سولر پلیٹ بھی پڑی تھی۔ یقیناً سولر پلیٹ نے پسماندہ علاقوں کے باسیوں کو اندھیروں سے نکالنے کا کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ شہری آبادی سے دور دراز علاقوں میں بھی جہاں بجلی نہیں پہنچی، روشنی نظر آ جاتی ہے۔

''تمھارا نام۔'' میں لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔

وہ کپکپا گئی تھی۔ ہکلاتے ہوئے بولی۔ ''کک..... کشمالہ۔''

اس کا ڈر دور کرنے کو میں متبسم ہوا۔ ''ان خبیثوں کے ہاتھ کیسے چڑھی ہو؟''

''مم..... میں بکریاں چرا رہی تھی یہ زبردستی پکڑ کر لے آئے۔'' خشک ہونٹوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے اس نے باری باری ایک بھاری جثے والے شخص اور ایک چھریرے بدن والے کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ہرنی کی طرح سہمی ہوئی تھی۔ اچھی خاصی پرکشش و جاذب نظر تھی، تبھی تو خبیث اسے اٹھا لائے تھے۔ گہری نیلی آنکھیں دیکھ کر مجھے گلگارے یاد آ گئی تھی۔ البتہ باقی چہرہ گل سے مختلف تھا۔

یہاں وضاحت کر دوں کہ لڑکی جس پشتو میں بات کر رہی تھی وہ بہ مشکل ہی میرے پلے پڑ رہی تھی۔ وزیرستان کی پشتو کافی کرخت ہے، بولنے والوں کا لہجہ بھی عجیب سا ہوتا ہے۔ الفاظ کو یوں تروڑ مروڑ دیتے ہیں کہ ٹھیک ٹھاک پشتو جاننے والے مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔ میں تو خیر پٹھان نہیں ہوں، سردار خان جیسا خالص پٹھان بھی ان سے گفتگو کرتے ہوئے سر پکڑ لیتا تھا۔ البتہ میری جانِ حیات پلوشے ہر قسم کی پشتو روانی سے بولتی ہے۔ اور اسی کی وجہ سے میں بھی اس قابل ہوا کہ وزیرستانی لب و لہجے کو کم از کم سمجھ لیتا ہوں اس انداز کی پشتو بول اب بھی نہیں سکتا۔

''تمھارا گھر کہاں ہے؟'' میرے سوال جاری رہے۔ اس اثناء میں سردار اندر آ کر خاموشی سے ہماری گفتگو سننے لگا۔

''گرش خیل کے مضافات میں ہے، آج دوپہر کو.....'' وہ تفصیل بتانے لگی۔

پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ بامک ٹاپ کے شمال میں ایک بڑا گاؤں گرش خیل کلے ہے جہاں امریکن فوج کی چھاؤنی بھی موجود ہے۔ گرش خیل کے مضافات میں چند گھرانوں پر مشتمل کافی آبادیاں ہیں اور وہ بے چاری بھی ایسی آبادی ہی سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ خبیث لوگ اس طرح کی معصوم لڑکیوں کو اکیلا دیکھ کر اٹھانے سے بھی نہیں چوکتے ہیں۔ بعض اوقات تو ایسی لڑکیاں مہینوں ان کے پاس پوری ٹولی کی اجتماعی بیوی بنی رہتی تھیں۔ کبھی کبھار یہ معصوم لڑکیوں کو ایک ہی بار خراب کر کے ان کا گلا کاٹ کر دفن کر دیتے اور ایسا بھی ہوتا کہ ہفتہ ڈیڑھ پاس رکھ کر آزاد کر دیتے۔ اس کا انحصار اغواء کرنے والے کی مرضی اور طبیعت پر تھا۔ کشمالہ کو اٹھانے والے دو تھے۔ دونوں گرش خیل ضروری سامان کی خریداری کو گئے تھے کہ واپسی پر جنگلی پھول پر نظر پڑ گئی۔ انھوں نے فی الفور اسے بے ہوش کیا اور اطمینان سے رنگ رلیاں منانے کی نیت سے ساتھ اٹھا لائے۔ لیکن پہلی باری کے حصول میں جھگڑا ہو گیا۔ اصل دین نے انھیں چھڑانے کی کوشش کی اور ٹانگ پر گولی کھا بیٹھا۔ بات ان کے کمانڈر قلات خان تک جا پہنچی۔ جس کی وجہ سے وہ معصوم لڑکی عارضی طور پر ان وحشیوں کی دست برد سے محفوظ رہی تھی۔ البتہ اس کی قسمت عروج پر تھی کہ میں اور سردار بلائے ناگہانی کی طرح وہاں پہنچ گئے تھے۔

سردار شرارتی انداز میں بولا۔ ''اتنی جلدی کاہے کی ہے شادی کے بعد تفصیل جان لیتے۔'' کشمالہ کو بے خبر رکھنے کی غرض سے اس نے اردو میں بات کی تھی۔

میں سنجیدگی سے بولا۔ ''اسے دوسرے خیمے میں لے جاؤ، مجھے اصل دین سے کوئی خاص بات کرنا ہے۔''

سردار سمجھ گیا کہ میں اصل دین کو کشمالہ کے سامنے قتل نہیں کرنا چاہتا۔

''چلو۔'' سردار نے اسے خیمے سے نکلنے کا اشارہ کیا۔

ہماری گفتگو اس کے پلے نہیں پڑی تھی تبھی سردار کے اشارے پر اس کا رنگ خوف سے زرد پڑ گیا تھا۔ کپکپاتے ہوئے پوچھا۔ ''کک کہاں؟''

سردار نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''پریشان نہیں ہوتے تم میری چھوٹی بہن ہو۔''

کشمالہ کے زرد پڑتے چہرے پر خوشگوار حیرانی ابھری اور پھر اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

وہ گلوگیر ہوئی۔ ''آپ مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔''

سردار لاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کھل کھلایا۔ ''جنھیں کہنا تھا، کہہ چکے۔''

وہ سر جھکائے باہر نکل گئی۔

اصل دین نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے قتل کرنے کو تم نے اسے باہر بھیجا ہے نا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''سمجھ دار ہو۔''

وہ گڑگڑایا۔ ''ایک موقع دے دو، میں توبہ کرلوں گا۔''

''میرے مجرم ہوتے تو ضرور معاف کر دیتا، مگر تم معصوم لوگوں کے قاتل ہو اور پاکستان آرمی کا قانون تمھیں موت کی سزا سنا چکا ہے، جسے میں کالعدم نہیں کر سکتا۔'' نفی میں سر ہلاتے ہوئے میں نے اطمینان سے بریٹا کی لبلبی دبا دی۔ گولی اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان میں پیوست ہوئی تھی۔

اسے انجام تک پہنچا کر میں نے خیمے کے دروازے سے جھانک کر زور سے آواز دی۔ ''گل خان۔''

ایک منٹ بعد وہ میرے سامنے تھا۔ کشمالہ بھی ساتھ چلی آئی تھی۔ میری خفگی بھری نظریں دیکھتے ہی اس نے صفائی دی۔

''اسے اکیلے میں ڈر لگ رہا تھا۔''

کشمالہ کی نظر اصل دین کی لاش پر پڑی، اس نے خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور سر جھکا لیا۔

میں نے مشورہ دیا۔ ''لاشوں کو باہر پھینکنے کے بجائے ساتھ والے خیمے میں چلے جاتے ہیں۔''

سردار خفگی سے بولا۔ ''ہمیں بلانے کے بجائے وہیں آجاتے۔''

''صرف تمھیں بلایا تھا تاکہ اکیلے میں پوسٹ سے بات کر سکیں۔''

''اس غریب کو کون سا اردو کی سمجھ آتی ہے، احتیاط ضروری سمجھو تو انگریزی میں بات کر لینا۔''

میں فخر سے بولا۔ ''میری پلوشے کو انگریزی بھی آتی ہے۔''

اس نے قہقہہ لگایا۔ ''مگر یہ پلوشے نہیں ہے راجے صاحب! میرے مذاق کو سنجیدہ لینے کی ضرورت نہیں ہے، تیسری شادی کی کوشش میں پہلی دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔''

میں کھسیاتے ہوئے بولا۔ ''بکواس کرنا کوئی تم سے سیکھے۔''

وہ ترکی بہ ترکی بولا۔ ''اور بے غیرتی کرنا تم سے۔'' ہم خیمے سے باہر نکل آئے۔ خیمے کی روشنی بجھا کر میں نے دروازے کے قمقموں کو بھی باہر سے بند کر دیا تھا۔ بارش کی رفتار پہلے سے ہلکی تو ہو گئی تھی مگر رکی نہیں تھی۔

دوسرے خیمے میں گھستے ہی میں نے سردار کو کہا۔ ''وائرلیس سیٹ دو۔''

اس نے کینوڈ میری جانب بڑھا دیا۔ ہم نے چینل تین پر رپورٹ دینا تھی۔ سیٹ آن کر کے میں کنٹرول کو پکارنے لگا۔

''ایس ایس فار کنٹرول اوور۔'' گو ہر مشن میں سنائپر کا کوڈ نام تبدیل ہو جاتا ہے، مگر مجھے ایس ایس نام سے اتنی

شہرت ملی تھی کہ میجر نعیم نے بااصرار مجھے یہی کوڈ نام استعمال کرنے کا حکم دیا تھا۔ خود مجھے اور سردار کو بھی اس نام سے اچھی خاصی انسیت و اپنائیت تھی۔

دو تین بعد پکارنے کے بعد کیپٹن حفیظ اللہ نیازی کی آواز سنائی دی۔ ''کنٹرول فار ایس ایس سینڈ یور میسج اوور۔'' یقیناً وہ بے صبری سے ہمارے پیغام کا منتظر تھا تبھی تو کینوڈا اپنے پاس رکھا تھا۔

میں خفیہ زبان میں بولا۔ ''ہم منڈی میں پہنچ چکے ہیں، پہلے دو بکرے خرید کر اوپر بھجوائے، بعد میں آٹھ دنبوں کا مول بھی چکا دیا ہے اوور۔'' (مطلب پہلے دو بندوں کو قتل کیا اور اس کے بعد آٹھ اور دہشت گردوں کو بھی ٹھکانے لگا دیا ہے)

''شاباش، ایس ایس! خریداری جاری رکھو، ہم نے مکمل ریوڑ خریدنا ہے۔ اور یہ بھی بتا دو کہ رقم کتنی خرچ ہوئی ہے تاکہ ہمیں پتا چلے تم اس وقت کس جگہ موجود ہو اوور۔'' (یعنی، دہشت گردوں کا صفایا جاری رکھو اور اپنی جگہ کا چھے ہندسی حوالہ بتا دو)

میں سردار کو مخاطب ہوا۔ ''جی پی ایس (Global Positioning System) آن کر کے چھے ہندسی حوالہ بتاؤ۔'' (چھے ہندسی حوالے کے بارے اگر مکمل تفصیل بیان کرنا چاہوں تو پھر یہ سپاٹر ناول کے بجائے نقشہ بینی کی کتاب بن جائے گی۔ مختصراً اتنا جان لیں کہ کسی بھی مقام کے چھے ہندسی حوالہ کے ذریعے اس جگہ کو ڈھونڈنا نہایت آسان ہوتا ہے۔ چھے ہندسی حوالہ زمین پر ایک سو میٹر کے مربع کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک تربیت یافتہ فوجی تو مخصوص نقشے کے ذریعے بھی اپنی جگہ معلوم کر سکتا ہے، عام آدمی اگر ذرا بھی دلچسپی لیں تو GPS کے ذریعے چھے ہندسی حوالے کے بارے جان سکتے ہیں۔ اور آج کل تو موبائل فون کے اندر بھی GPS موجود ہوتا ہے)

سردار نے GPS آن کر کے چھے ہندسی حوالہ بتایا جو میں نے کوڈ ورڈ میں کیپٹن حفیظ کو بتا دیا۔

''ہوٹل چھوڑ کر کسی نئی جگہ پہنچو تو ضرور بتانا، آؤٹ۔'' کیپٹن صاحب نے بات چیت ختم کرنے کا اعلان کیا۔ (ان کے کہنے کا مطلب یہی تھا کہ جہاں بھی جاؤں انھیں جگہ کا چھے ہندسی حوالہ بتاتا رہوں) اور وہ ہماری مدد تبھی کر سکتے تھے کہ انھیں جگہ کے بارے معلوم ہوتا رہتا۔ یوں مارٹر (چھوٹی توپ) وغیرہ کا فائر کرواتے وقت بھی وہ ہمیں آسانی سے بچا سکتے تھے۔

بات چیت ختم کر کے میں نے کینوڈ بند کر دیا تھا تاکہ بیٹری کی بچت ہو سکے۔ گو اضافی بیٹری ہمارے پاس موجود تھی، لیکن نہ معلوم ہمیں کتنا عرصہ باہر رہنا پڑتا۔

سردار نے دہشت گردوں سے چھینا ہوا ''آئی کام'' آن کیا۔ اس پر چینل 17 لگا ہوا تھا۔ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سردار نے مختلف چینل تبدیل کر کے دشمن کی سن گن لینے کی کوشش کی مگر خاموشی چھائی تھی۔ اس نے دوبارہ چینل 17 لگا کر وائرلیس سیٹ بند کر دیا۔

ہم نے برساتیاں اتار کر لٹکا دی تھیں، کشمالہ چادر اوڑھ کر ایک بستر پر بیٹھ گئی تھی۔ نہ اس نے بات چیت کی کوشش کی تھی اور نہ ہم اسے مخاطب کر رہے تھے۔

''اب کیا ارادہ ہے؟'' خاموشی کو سردار خان نے توڑا تھا۔

''صبح تک تو یہ جگہ محفوظ ہے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''رات کے اندھیرے ہی میں کمین گاہ ڈھونڈ سکیں گے، روشنی پھیلنے پر مشکلات بڑھ جائیں گی۔''

میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بارش کافی ہلکی ہو گئی ہے، تھوڑا آرام کر کے نکلتے ہیں۔''

''اس کا کیا کریں گے؟'' اس کا اشارہ کشمالہ کی طرف تھا۔

میں مزاحیہ انداز میں بولا۔ ''میری تو دو موجود ہیں۔ اور دونوں مجھے بہت عزیز بھی ہیں۔ تمھیں ہی ہمت کرنا پڑے گی۔''

'' بکواس نہ کرو اسے گھر تک پہنچانے کا رستہ نکالو۔ بے چاری سخت پریشان لگ رہی ہے۔''

''ہم نے مغرب کی جانب سفر کرنا ہے، گرش خیل بھی اسی طرف ہے۔ آدھے راستے تک ہمارے ساتھ چلی جائے گی، آگے امید ہے اکیلے سفر کرنا مشکل نہ ہوگا۔''

سردار نے منہ بنایا۔ ''رات کو یہ معصوم اکیلے سفر کر لے گی۔''

میں بے نیازی سے بولا۔ ''مجبوری میں جان جوکھم میں ڈالنا پڑتی ہے۔''

''اگر اس کی جگہ رومانہ بہن ہوتی تب بھی تم یہی رائے دیتے۔'' اس نے پلوشہ کے بجائے رومانہ کا نام لیا تھا کیوں کہ رومانہ چھوئی موئی اور گھریلو خاتون تھی، جبکہ پلوشہ نڈر و دلیر تھی اس کے لیے اکیلے کہیں جانا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ایک اجنبی لڑکی اور عزیز ترین قریبی رشتے کو مماثل کرنے کی جرأت ایک خان ہی کر سکتا ہے۔''

وہ اطمینان سے بولا۔ ''اجنبی سہی، مگر مظلوم ہے۔ کسی کی بہن، بیٹی تو ہوگی نا۔ کیا تمھیں اچھا لگے گا کہ پھر کسی بھیڑیے کے ہتھے چڑھ جائے۔ اللہ پاک نے اسے بچانے کو ہمیں سبب بنایا ہے۔ گویا اسے محفوظ ٹھکانے تک پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے۔''

''پھر آرام کا خیال دماغ سے نکالو اور کوچ کی تیاری کرو۔'' مجھے اختلاف کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

وہ ہنسا۔ ''سنا پر کو اتنا نازک بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ایک پہاڑی سے اتر کر لیٹنے کی فکر کرنے لگے۔''

میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اگلی مرتبہ تمھارے ساتھ آنے سے میرا جواب ہے۔ میجر نعیم سے بات کرتا ہوں، کوئی سپاہی دے سکتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اکیلا بھلا۔''

سردار متبسم ہو کر کشمالہ کو مخاطب ہوا۔ ''بہنا! تمھیں گھر کا رستہ معلوم ہے۔''

اس نے اداس نظروں سے سردار کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''گرش خیل کے قریب ہے، اگر وہاں تک چلے جائیں تو آگے پہچان لوں گی۔''

''تمھارے ساتھ ان خبیثوں نے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی تھی ناں۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آپ کا شکریہ بھائی جان! آپ کی وجہ سے میری عزت اور جان بچی۔''

سردار نے ہمدردی سے پوچھا۔ ''کھانا کھایا ہے؟''

''نہیں، لیکن بھوک بھی محسوس نہیں ہو رہی۔ گھر والے پریشان ہوں گے۔ جانے میرے بارے کیا سوچ رہے ہوں۔'' اس کا لہجہ رو دینے والا ہو گیا تھا۔

''فکر نہ کرو، ہم تمھیں گھر تک چھوڑ کر آئیں گے۔ اور ان کی غلط فہمی بھی دور کریں گے۔''

''آپ بہت اچھے ہیں۔'' وہ خوش ہو گئی تھی۔ لمحہ بھر توقف کے بعد بولی۔ ''مجھے فوجی اچھے لگتے ہیں۔''

سردار ہنسا۔ ''ہم فوجی نہیں ہیں۔''

''آپ لوگ جب اس آدمی سے پوچھ تاچھ کر رہے تھے، تب مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ لوگ فوجی بھائی ہیں۔''

''میرا خیال ہے مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہ ہوگا۔'' میں نے روانگی کا عندیہ دیا۔ سردار کے کچھ کہنے سے پہلے

دو مسلح افراد دندناتے ہوئے خیمے میں گھسے۔ کلاشن کوفیں ہماری طرف تنی تھی۔ آگے والا ادھیڑ عمر کا گرانڈیل شخص تھا۔

''خنزیر کا بچہ! ہاتھ اوپر اٹھاؤ..... تمھارا کیا خیال تھا قانون خان سے بچ جاؤ گے۔''

کلاشن کوف کے خوف ناک دہانے کو اپنی جانب اٹھا دیکھ کر بہادری کا مظاہرہ سلطان راہی مرحوم یا بدر منیر ہی کر سکتا تھا۔ برے پھنس گئے تھے۔ امید ہی نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی ہمیں آلیں گے۔

میری پراگندہ سوچوں میں کشمالہ کی چیخ نے خلل ڈالا تھا۔ وہ ''ماما جان!'' کہتے ہوئے قانون خان کی طرف بھاگی۔ ''انھیں کچھ نہ کہو، انھوں نے مجھے خبیثوں سے بچایا ہے اور مجھے بہن بنا لیا ہے۔ اب مجھے گھر پہنچانے جا رہے تھے۔ یہ بہت اچھے ہیں۔ یہ میرے فوجی بھائی ہیں، انھوں نے سارے خبیثوں کو قتل کر دیا ہے.....'' ماموں سے لپٹتے ہوئے وہ پرجوش لہجے میں تفصیل بتانے لگی۔

قانون خان کی درشتی، خوشگوار حیرانی میں تبدیل ہوئی، کشمالہ کا ماتھا چوم کر اس نے کلاشن کوف کندھے پر لٹکائی اور ہمارے طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''شاباش، تم جیسے اعلیٰ خاندان کے جوان ہی ہمارا فخر ہیں۔'' اس نے باری باری سردار اور مجھے گلے لگا کر پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے ہماری پیشانیاں چوم لی تھیں۔ دوسرے جوان نے بھی کلاشن کوف کی نال نیچے کر لی تھی۔ وہ کشمالہ کا بڑا بھائی تھا۔

قانون خان اسے مخاطب ہوا۔ ''ترنگ خان! باقیوں کو بھی اندر بلا لو۔''

تھوڑی دیر بعد پانچ مسلح افراد خیمے کے اندر آ گئے تھے۔ قانون خان کے کہنے پر تمام ہمیں پرتپاک انداز میں ملے۔ تفصیل یہ معلوم ہوئی کہ کشمالہ کو اغواء کرنے والوں کو قانون خان کی بیٹی شمائلہ نے دیکھ لیا تھا۔ انھوں نے کشمالہ کو گھوڑے پر لاد لیا تھا۔ وہ ایک ٹیکری پر چڑھ کر دور تک ان کی حرکت کو دیکھتی رہی۔ جیسے ہی وہ نظر سے اوجھل ہوئے وہ بھاگتے ہوئے گھر پہنچی اور باپ کو ساری تفصیل بتا دی۔ قانون خان تند مزاج کا بگڑا ہوا شخص تھا۔ نڈر دلیر اور کسی سے نہ ڈرنے والا قبایلی۔ وہ فوراً چند احباب کو اکٹھا کر کے بھانجی کو اغواء کرنے والوں کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ دہشت گردوں کی کارروائیاں ان کے لیے نئی بات نہیں تھی۔ چونکہ انھیں کشمالہ کو اغواء کرنے والوں کی جگہ کے بارے معلوم نہیں تھا اس لیے وہاں تک پہنچنے میں انھیں کئی گھنٹے لگے تھے۔ اتنی دیر میں انھوں نے افغان نالہ میں کئی خیمے کھنگالے تھے۔ جن میں کچھ بکروال (بکریاں چرانے والے) کچھ مقامی لوگ اور کچھ دہشت گرد تھے۔ شمائلہ نے انھیں کشمالہ کو اغواء کرنے والوں کی جانے کی سمت بتا دی تھی۔ اندازے سے چلتے ہوئے آخر وہ صحیح مقام پر پہنچ گئے تھے۔ ان کی آمد نے ہمیں تقویت دی تھی۔ کم از کم کشمالہ کا معاملہ بہ احسن خوبی نبٹ گیا تھا۔

مشورے کے بعد انھوں نے دہشت گردوں کی کسی چیز کو نہ چھیڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کیوں کہ اپنا سامان پہچان کر دہشت گردان کے خلاف محاذ آرائی پر اتر آتے تو وہ مقابلہ نہ کر پاتے۔ البتہ ہم نے ان کا اسلحہ اور ایمونیشن ایک مخصوص جگہ چھپا دیا تھا کہ موقع ملنے پر نکال لیں گے یا کم از کم دہشت گردوں کے ہاتھ واپس تو نہیں لگے گا۔ دو عدد آئی کام بھی ملے تھے، وہ اسے مخابرہ کہتے ہیں۔ عام طور پر دہشت گرد کے پاس میں نے آئی کام سیٹ ہی دیکھے ہیں۔ (مخابرہ لفظ وائرلیس سیٹ کا بہترین نعم البدل ہے اور اردو زبان میں اسے وائرلیس کی جگہ ایک مستقل لفظ کے طور پر شامل کیا جا سکتا ہے، ویسے، پہلے اردو میں وائرلیس کے لیے لفظ ''لاسکی'' استعمال ہوتا ہے)

عموماً دہشت گردوں کے پاس آئی ای ڈیز اور بارود وغیرہ مل جاتا ہے، مگر وہاں وہ پوسٹ پر حملے کی غرض سے اکٹھے ہوئے تھے اس لیے بارود وغیرہ پاس نہیں رکھا تھا۔ میرا ارادہ ان کے آنے والے ساتھیوں کے لیے بارودی پھندا تیار کرنے کا تھا۔ کیوں کہ ان کی آمد سو فیصد متعین تھی۔ تھوڑا سوچ کر میں نے سردار سے دستی بم (ہینڈ گرینیڈ) مانگے، اس کے

جھولے میں دو عدد آر جز ایم 72 موجود تھے۔ (دستی بم مختلف اقسام کے ہوتے ہیں۔ آر جز ایم 72 بھی پلاسٹک کے مضبوط خول والے جدید دستی بم ہیں۔ ایک بم میں قریباً 3500 چھرے ہوتے ہیں جو پھٹنے کے بعد پانچ میٹر کے علاقے میں کسی ذی روح کو زندہ نہیں چھوڑتے) سردار نے دونوں بم میرے حوالے کر دیے۔

(یقیناً قارئین نے فلموں میں دستی بم پھینکے جانے کے عملی مظاہرے دیکھے ہوں گے کہ کس طرح چھلا (سیفٹی پن) نکال کر بم ہدف کی طرف اچھال دیا جاتا ہے۔ اور بم دو تین سیکنڈ کے اندر پھٹ جاتا ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا اضافہ کرتا جاؤں کہ دستی بم کا چھلا نکال کر اگر لیور کو مٹھی میں دبا دیا جائے تو جب تک لیور آزاد نہیں ہوگا دستی بم چال نہیں کرے گا۔ اور اگر لیور پر مناسب وزن رکھ کر بم کو یونہی چھوڑ دیا جائے تو جب تک وزن پڑا رہے گا بم فائر نہیں ہوگا)

میں نے ایک بم سے چھلا نکالا اور لیور پر مناسب وزن کا ایک پتھر رکھ دیا۔ دروازے کا کپڑا میں نے اس انداز سے پتھر کے گرد لپیٹا کہ دروازہ کھولنے والا جونہی کپڑا ہٹاتا پتھر بم کے لیور سے ہٹ جاتا اور اس کے بعد نتیجہ صاف ظاہر تھا۔ دوسرے خیمے کے دروازے پر بھی میں نے اسی طرح بم لگا دیا۔

قانون خان وغیرہ میری کارروائی کو حیرت سے دیکھتے رہے مگر انھوں نے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

پھندا لگا کر ہم جانے کو تیار تھے۔ کبھی گھوڑے پر بیٹھنے کا اتفاق ہم دونوں کو نہیں ہوا تھا ورنہ وہاں دو گھوڑے موجود تھے۔ قانون خان نے بھی گھوڑے لے جانے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ ہم بھی نہیں لے جا سکتے تھے۔ مجبوراً گھوڑوں کی لگامیں نکال کر انھیں زبردستی بھگانا پڑا۔

بارش رک چکی تھی۔ اور مطلع صاف ہو گیا تھا کہ ٹمٹماتے ستارے مسافروں کی رہنمائی کو نکل آئے تھے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اتنی ترقی کے باوجود راہ دکھانے کے ضمن میں ستاروں کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔

وہاں سے ہم نے بھی مغرب کی طرف جانا تھا اس لیے انھی کے ساتھ چل پڑے تھے۔ قانون خان ہماری ذات میں کافی دلچسپی لے رہا تھا۔ اور ہمارے بارے زیادہ سے زیادہ جاننے کا متمنی تھا۔ لیکن اس پر شک نہ ہونے کے باوجود ہم اسے اپنے بارے تفصیل نہیں بتا سکتے تھے۔ اور اس کے سوالوں سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ ہم باز پرس شروع کر دیتے۔ اسے محسوس بھی نہ ہوا اور ہم نے اپنے بارے ایک دو جھوٹ بول کر صفائی سے موضوع تبدیل کر کے دہشت گردوں کے ٹھکانوں کا پوچھنا شروع کر دیا۔ چونکہ کشمالہ کو تلاش کرتے ہوئے وہ افغان نالے میں کافی دیر سرگرداں رہے تھے اس لیے ان کے پاس اچھی معلومات ہونی چاہیے تھی۔ خوش قسمتی سے اپنی بھانجی کی وجہ سے وہ دہشت گردوں پر بری طرح تپا ہوا تھا لہٰذا اس نے کافی مفید معلومات ہمارے گوش گزار کی تھی۔

کلومیٹر بھر کا فاصلہ ہم نے ان کی معیت میں طے کیا۔ اس دوران ہمیں دو نالے عبور کرنا پڑے تھے۔ بارش کی وجہ سے نالوں میں پانی کی سطح عام دنوں کی نسبت زیادہ تھی، جوتوں کو گیلا ہونے سے بچانے کو ہمیں ننگے پاؤں نالے سے گزرنا پڑا تھا۔ گو بارش کی وجہ سے ہمارے جوتے پہلے سے گیلے تھے، مگر خیمے میں بیٹھ کر ہم جرابیں تبدیل کر چکے تھے اور اب مزید خشک جرابیں ہمارے پاس نہیں تھیں۔ ایک فوجی کو سب سے زیادہ بچاؤ اپنے پاؤں کا کرنا پڑتا ہے اور سنائپر کے لیے تو اس کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ کسی بھی مشن کی تکمیل میں سب سے اہم مقصود تک پہنچنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہی کارروائی کا مرحلہ آتا ہے۔ اور جو سنائپر مقصود تک نہ پہنچ پائے اس سے ہدف کو ٹھکانہ لگانے کی امید کرنا حماقت ہی ہے۔

قانون خان ٹولی نے اپنے چپل اتارنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ آخر وہ مقام آ گیا جہاں سے ہمیں علیحدہ ہونا تھا۔ انھوں نے ہمیں پرتپاک انداز میں الوداع کیا، کشمالہ نے بھی قریب ہو کر عقیدت بھرے انداز میں شکریہ کہا تھا۔

انھیں رخصت کر کے میں نے کنٹرول کو خفیہ زبان میں پچھلی جگہ چھوڑنے کی بابت مطلع کر کے یہ بھی بتا دیا کہ وہاں ہم

آنے والوں کے لیے انار (دستی بم) چھوڑ آئے ہیں۔ کنٹرول کے نئی جگہ کے بارے استفسار پر بتا دیا کہ، ہم فی الحال راستے پر ہیں۔ کنٹرول سے یہ بھی پتا چلا کہ دوسرے سنائپرز کی جوڑیاں ہم سے پہلے اپنی جگہ پر پہنچ چکی تھیں۔ ہمیں بھی اباسین خان اور اس کا ساتھی نہ ملتے تو کسی کمین گاہ میں ہوتے۔

قانون خان سے ہمیں دہشت گردوں کے دو ٹھکانوں کی جگہ معلوم ہوئی تھی، مگر دونوں قریباً نشیبی علاقے میں تھے، سردار حملہ کرنے پر بہ ضد تھا۔

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ''تین بج چکے ہیں۔ اور ہمارا پہلا ہدف کمین گاہ کی تیاری ہے، روشنی پھیلنے سے پہلے مناسب ٹھکانہ ڈھونڈنا ہوگا۔ ہمارے ساتھی کمین گاہ میں پہنچ کر آرام فرما رہے ہیں۔''

اس نے کہا ''پھر نقشے کی مدد لیتے ہیں۔''

میرے متفق ہونے پر اس نے جھولے سے نقشہ نکال لیا۔ (آرمی کے نقشوں میں علاقائی خدوخال بڑی وضاحت سے بیان کیے ہوتے ہیں۔ اور آرمی میں نقشہ بینی کی خصوصی کلاسیں چلتی ہیں، لیکن عام آدمی ان نقشوں کو نہیں سمجھ سکتے)

چادر اوڑھ کر ہم نے ٹارچ جلائی تاکہ دور سے روشنی نظر نہ آسکے۔ نقشہ زمین پر بچھا کر ہم نے شمال کی سمت سیدھا کیا۔ جی پی ایس کی مدد سے نقشے پر اپنی جگہ معلوم کر کے نزدیک کوئی اونچی جگہ تلاش کرنے لگے۔ کلومیٹر بھر کے فاصلے پر ایک ٹیکری نظر آگئی۔ وہ بامک ٹاپ کے بیس سے تھوڑا نالے کی طرف تھی۔ دونوں نے اتفاق سے اسی جگہ کا چناؤ کیا۔ وہ ہماری جگہ سے دوسو ساٹھ ڈگری بن رہی تھی۔ قطب نما کے ذریعے ہم اس سمت کو بڑھ گئے۔ ٹارچ ایک بار پھر بجھا دی تھی۔

پہاڑی علاقے میں ہموار زمین مشکل سے ملتی ہے۔ بہ ظاہر ہموار نظر آنے والے میدان بھی قریب پہنچنے پر ڈھلوان نما نظر آتے ہیں۔ ہمارا رخ قریباً مغرب کی طرف تھا۔ قریباً اس لیے کہا کہ مغرب کی سمت دوسو ستر ڈگری بنتی ہے اور ہمارا رخ دوسو ساٹھ ڈگری کی طرف تھا۔ مجھے اچھی خاصی تھکن محسوس ہو رہی تھی اور اس کی وجہ رینج ماسٹر تھی۔ اسی لیے دور دراز کے مشن پر سنائپر ہمیشہ ڈریگنوو، سٹائیر، کلیل، ایم 40 اے تھری جیسی نسبتاً ہلکی سنائپر رائفلیں ساتھ لے جانا پسند کرتے ہیں۔ گو رینج ماسٹر سے ان کی رینج نصف ہے، مگر وزن چار گنا کم ہے۔ تبھی دور دراز کے سفر میں ان کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔

سنائپر کا کام گو مخصوص افراد کو نشانہ بنانا ہوتا ہے، لیکن پاک آرمی کے بڑے آپریشن: حملہ، دفاع، پیش قدمی، پس قدمی وغیرہ ہوں؛ چھوٹے آپریشن: چھاپہ، گھات، گشت، نفوذ و خروج وغیرہ؛ عمارتی لڑائی، دہشت گردوں کے خلاف کوئی مخصوص کارروائی، کلیدی افراد (اہم شخصیات) کو نشانہ بنانا، یہاں تک کہ کسی جاسوسی کے مشن میں بھی سنائپر کو بھیجا جا سکتا ہے۔ اور ہر کارروائی میں سنائپر کو مخصوص کام بانٹے جاتے ہیں البتہ وہ مخصوص کام نشانہ بازی سے متعلق ہی ہوتا ہے۔ اور سنائپر صرف ہدف کو ختم نہیں کرتا، ہدف کے خاتمے کے بعد اسے جان بچا کر نکلنا بھی ہوتا ہے۔ اور بھاگتے وقت وہ جتنا ہلکا ہوگا اتنی تیزی سے حرکت کر سکے گا۔ یہ بات بھی مدنظر رہے کہ سنائپر حتی الوسع اپنا ہتھیار پیچھے نہیں چھوڑتا۔ اس وقت سردار کے پاس ڈریگنوو رائفل تھی۔ وہ بھی منجھا ہوا سنائپر تھا۔ اگر کسی وجہ سے ہمیں علیحدہ علیحدہ ہونا پڑتا تو اسے سنائپر رائفل کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

ہمارے سامنے ایک اور نالہ آیا۔ ہمیں پھر جوتے اتارنا پڑے تھے۔ نالے کے ٹھنڈے پانی سے گزر کر ہم دوسری جانب پہنچے۔ جرابوں کے بالائی حصے سے پاؤں خشک کر کے ہم نے جرابیں پہنیں اور بوٹوں کے تسمے مضبوطی سے باندھ کر آگے بڑھ گئے۔ جلد ہی ہم درمیانی بلندی کی ٹیکری کی بنیاد تک پہنچ گئے تھے۔ شمال کی جانب کچھ فاصلے پر کتوں کی بھونکنے کی آواز تسلسل سے آرہی تھی۔ وہ ''بکروالوں'' کے کتے تھے۔ یہ اطمینان ہمیں حاصل تھا کہ دہشت گردوں کے پاس کتے

نہیں ہوتے کیوں کہ وہ ایک جگہ ٹک کر نہیں رہتے۔ شمالی علاقہ جات ہوں، کشمیر ہو یا وزیرستان، جتنے بھی پہاڑی علاقے میں گھوما ہوں یہی مشاہدہ کیا ہے کہ پاک آرمی کی پوسٹوں پر کتوں کا اکٹھ رہتا ہے۔ کتوں کو باقاعدگی سے خوراک مل جاتی ہے اور پہرے داروں کو ایسے دوست مل جاتے ہیں جو دشمن کو دور سے تاڑ کر بروقت چوکس کریں۔ ایک عجیب بات یہ بھی مشاہدہ کی ہے کہ پاک آرمی کی پوسٹوں پر رہنے والے کتے سول کپڑوں والوں کو پوسٹ کے قریب نہیں آنے دیتے البتہ آرمی کی وردی میں کوئی نووارد بھی آجائے تو اس سے تعرض نہیں کرتے۔

''خان صاحب! شب دید عینک سے بلندی کا جائزہ لے لو۔''

سردار نے ''سیون ڈی'' آن کر کے آنکھوں سے لگالی۔ لمحہ بھر جائزہ لینے کے بعد بولا۔ ''بلندی پر ایک مکان نظر آرہا ہے۔''

عینک لے کر میں نے بھی جائزہ لیا۔ درختوں کے جھنڈ میں ایک عمارت کا ہیولہ نظر آرہا تھا۔

سردار نے خیال ظاہر کیا۔ ''ہوسکتا ہے کسی سول شخص کا گھر ہو۔''

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پریشانی ظاہر کی۔ ''اس کے برعکس ہوا تو دہشت گردوں کا مضبوط ٹھکانہ ہوگا۔ اور ایسا ہونے کی صورت میں نہ صرف یہاں پہرے دار موجود ہوں گے بلکہ ان دنوں کافی نفری نے ڈیرے ڈالے ہوں گے۔''

سردار متفق ہوا۔ ''کوئی اور جگہ ڈھونڈیں؟''

میں نے کہا۔ ''قریب سے جائزہ لیے بغیر فیصلہ کرنا بے وقوفی ہوگی۔''

''چلو پھر.....'' شیر دل پٹھان خطروں کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ میں نے بارہا جانچا تھا کہ سردار خان بے وقوفانہ حد تک دلیر تھا۔ خطرات اور اندیشوں کو وہ ہمیشہ ہنسی مذاق میں اڑا دیا کرتا تھا۔ مفاہمت اس کی فطرت میں شامل نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ مجھے اس شعر کے مصداق لگا تھا.....

مفاہمت نہ سکھا جبر ناروا سے مجھے
میں سربکف ہوں لڑا دے کسی بلا سے مجھے

حالاں کہ خوف کا مادہ انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ ہر شخص ڈرتا ہے، دلیر اور بزدل آدمی میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ دلیر شخص اپنے خوف پر قابو پالیتا ہے۔ اپنے اندر کا ڈر وہ دل ہی میں چھپائے رکھتا ہے۔ جبکہ بزدل آدمی اپنے اعصاب پر قابو نہیں پاسکتا اور خوف کو ظاہر کردیتا ہے۔ میں اپنی بات کروں تو عملی زندگی میں بارہا ایسے مواقع آئے ہیں جب میرا دل خوف سے لرز اٹھا۔ موت آنکھوں کے سامنے دکھائی دینے لگی اور ایسے حالات میں ''کل نفس ذائقۃ الموت'' کا اٹل قانون ہی تھا جس نے مجھے بھاگنے سے روکا۔

اس وقت بھی بلندی کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے میرے چہرے پر تفکرات کا جال پھیلا تھا۔ اور ایسا پہلی بار نہیں ہورہا تھا۔ ہر ایسے وقت میں جب موت کچھ زیادہ ہی قریب دکھائی دینے لگے انسان کے احساسات ایسے ہوجاتے ہیں۔ میں اسے کتنا ہی احتیاط پسندی کا نام دوں، فہم و فراست گردانوں، ہوشیاری سے تعبیر کروں، دوراندیشی کہوں یا خبرداری سمجھوں حقیقت میں اسے خوف اور ڈر ہی سمجھا جائے گا۔ صرف پلوشہ کے غائب ہونے کے عرصے میں جب میں اسے مردہ سمجھے ہوئے تھا تب موت کا ڈر میرے دل سے نکل گیا تھا۔ اور اس کی واپسی کے ساتھ زندگی کی ساری دلچسپیاں اور رعنائیاں لوٹ آئی تھیں۔ اس کی محبت کو میں نے ہر رشتے پر مقدم سمجھا تھا۔ وہ مجھے اتنی ہی عزیز اور پیاری تھی۔ اگر کبھی ایسا موقع آیا کہ مجھے اپنی جان اور اس کی زندگی میں ایک کا چناؤ کرنا پڑا تو یقیناً میری ترجیح اس کی سلامتی ہوگی۔ لیکن بات

جب وطن عزیز کی خدمت وحفاظت کی آجاتی تو اپنی عزیز از جان ہستی کے واویلے کو بھی میں نے پس پشت ڈال دیا تھا۔
اس کی شروع دن سے کوشش تھی کہ میں فوج کی نوکری کو خیر باد کہہ دوں۔ اس کی ہر خواہش کو پورا کرنا اپنی پہلی ترجیح جاننے کے باوجود میں نے اس درخواست کو درخور اعتناء نہیں جانا تھا۔ بلکہ ایک بار تو اس کے تکرار کرنے پر اچھی خاصی ڈانٹ پلا دی تھی۔ دو دن وہ اتنی خفا رہی کہ روما کے کمرے میں ڈیرہ لگا لیا تھا۔ عشاء کی نماز پڑھ کر لوٹتا تو روما کا کمرہ بند ملتا۔ تیسرے دن روما کے منت سماجت کرنے پر وہ ہٹ دھرم راضی ہوئی تھی۔ البتہ یہ اسے اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ نوکری چھوڑ دینے کا مشورہ یا درخواست میں کبھی نہیں مانوں گا۔ اور یہ حال صرف میرا نہیں ہر فوجی کا ہوتا ہے۔ ہم بھی عام انسان ہوتے ہیں، ہماری بھی خواہشات، ارمان، آرزوئیں اور تمنائیں ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں وطن کی ہواؤں کا مقابلہ اور گھر کے ماحول کا نعم البدل اللہ پاک کی اصل جنت کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ بہ قول شاعر.....

کوئی بہشت کا پوچھے تو کہہ سکوں ہنس کر
کہ وہ بھی خوب جگہ ہے ہمارے گھر کی طرح

میرا بھی دل چاہتا ہے کہ دن بھر کام کے بعد شام کو گھر لوٹ کر اپنے بیٹے عبداللہ کی قلقاریاں سنوں، چولھے پر بیٹھی روما کو کن انکھیوں سے خود کو تاڑتا دیکھوں اور جب چوری پکڑ لوں تو اس کی حیا آلود مسکراہٹ سے مستفید ہوں جو اس کے سرخ وسفید چہرے کو گلابی کر دیتی ہے، پلوشہ کی اٹکھیلیوں سے محظوظ ہوں، اماں جان، ابو جان اور پھوپی جان کی شفقتیں سمیٹوں۔ جنگلوں، ویرانوں، پہاڑوں اور صحراؤں میں دشمن کا تعاقب کرنا، کبھی ان سے چھپنے کو بھاگنا، کبھی گولی چلا کر دشمن کو سر سے محروم کرنا کبھی اپنے بدن پر گولی کھانا یہ کھیل پڑھنے والوں کو بے شک دلچسپ لگے۔ پڑھ کر لطف اندوز ہوں، اپنے فارغ اوقات میں ان واقعات سے جی بہلائیں مگر جس پر گزرتی ہے صرف وہی اس تکلیف اور درد کو محسوس کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے.....

کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پہ گزر گئی
دنیا تو لطف لے گی میرے واقعات سے

بلندی طے کرتے ہوئے نظریں تسلسل سے دائیں بائیں کا جائزہ لے رہی تھیں اور دماغ الٹے سیدھے خیالات کی جگالی میں مصروف تھا۔ عجیب وغریب خیال تھے جو ساون کی گھٹا کی طرح امڈے چلے آرہے تھے۔ سر جھٹک کر میں نے ان خیالات کو دور کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی تھی۔ ہم خاموشی اور احتیاط سے پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ اندھیرے میں پہاڑی علاقے میں ڈھلان چڑھتے یا اترتے وقت احتیاط کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی دوشیزہ پائل پہن کر بغیر چھن چھن کی آواز پیدا کیے حرکت کرے۔ بہ قول شاعر.....

پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے
تو لاکھ چلے رے گوری تھم تھم کے

یہ خیال کافی شرمندہ کرنے والا تھا اور سردار کو شرمندہ کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے دینا کہاں کی عقل مندی تھی۔ ایک کنکر اس کی حرکت سے لڑھکتا ہوا نشیب کے سفر پر روانہ ہوا، وہ فوراً دبک کے بیٹھ گیا تھا۔ پاس بیٹھتے ہوئے میں نے سرگوشی کی.....

''خان صاحب! اس وقت تمھاری حالت پازیب پہن کر گھر والوں سے چوری چھپے محبوب کی ملاقات کو جانے والی دوشیزہ کی سی ہے۔''

وہ بھڑک کر کھڑا ہوا۔ ''ایسی کی تیسی ان سالوں کی۔''

میں نے فوراً بازو پکڑ کر اسے کھینچ لیا۔ ''خان صاحب! میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''پھر بکواس نہ کرو۔''

آخری تاریخوں کے چاند نے طلوع ہو کر اندھیرے کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا تھا۔ مسلسل تاریکی میں رہنے کی وجہ سے ہماری آنکھوں کو چاند کی روشنی سے بہت تقویت ملی تھی۔

''اپنے جھولے ان جھاڑیوں میں چھپا دیتے ہیں۔'' چند گز دور جھاڑیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے میں نے موضوع تبدیل کیا۔ جھاڑیوں کا سلسلہ نشیب تک چلا گیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ جھکے جھکے ان جھاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔ میں عمارت کے ہیولے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کوشش کے باوجود کوئی حرکت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اگر وہ دہشت گردوں کا ٹھکانہ ہوتا تب بھی پہرے دار نے مورچے میں ہونا تھا جو دن کی روشنی میں نظر نہ آتا تو اس اندھیرے میں کیا دکھائی دیتا۔

لمحہ بھر عمارت کا جائزہ لینے کے بعد میں بھی جھاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ رینج ماسٹر کا جھولا اتار کر میں نے سائیلنسر لگا پستول ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ وہاں سے آگے مزید احتیاط لازمی ہو گئی تھی۔ سردار نے بھی ڈریگنو و تیاری حالت میں پکڑ لی تھی۔ البتہ میرے بتائے بغیر وہ جانتا تھا کہ فائر کرنے کا پہلا حق میرا تھا۔ اور اس کی وجہ میرا اچھا فائر ہونے کے بجائے میرے پاس سائیلنسر لگے بریٹا کا ہونا تھا۔ پستول اس کے پاس بھی موجود تھا، مگر اس پر سائیلنسر لگا ہوا نہیں تھا۔

سردار سے شب دید عینک لے کر میں نے تسموں کی مدد سے آنکھوں پر باندھ لی تھی۔

ہم عمارت سے پچاس قدم دور تھے جب اچانک خاموشی کا پردہ چاک کرتی ہوئے بھیانک آوازیں بلند ہوئیں۔ بڑی جسامت کے تین کتوں نے نمودار ہو کر ہمارا رستہ روک لیا تھا۔

سردار نے سرعت سے کہا۔ ''گولی نہ چلانا۔''

اس کے مشورے کے بغیر بھی میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کیوں کہ گولی لگنے پر کتے اگر ایک دم خاموش ہو جاتے یا ''چیاؤں چیاؤں'' شروع کر دیتے تو دشمن کا گمان یقین میں تبدیل ہو جاتا۔ اس کے برعکس ہونے کی صورت میں وہ جائزہ لینے پر اکتفا کرتا کیوں کہ کتوں کے بھونکنے میں صرف انسانوں کی آمد وجہ نہیں ہے۔ کتے، دوسرے کتوں یا گیدڑ، لومڑ وغیرہ کی آمد پر بھی آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔

کتے ایک مخصوص فاصلے سے آگے نہیں بڑھے تھے ورنہ مجبوراً مجھے گولی چلانا پڑتی۔ ہم سرعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک درخت کے نیچے ہو گئے تھے۔ اب دشمن کے ردعمل کا انتظار تھا۔ کتے برابر بھونک رہے تھے۔ اچانک دروازے کی جانب سے سہمی ہوئی نسوانی آواز ابھری۔ ''کون ہے؟'' آواز کی کھنک و ترنم ظاہر کر رہا تھا کہ نوجوان لڑکی ہے۔

ہم خاموش رہے، البتہ یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ وہ دہشت گردوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ مالکن کی آواز سن کر کتوں کے بھونکنے کی رفتار زیادہ ہو گئی تھی۔ تین چار منٹ بعد مورچے کے موکھے سے ٹارچ کی روشنی چمکی۔ لیکن ہم دونوں درخت کے تنے کے ساتھ دبکے تھے۔ لمحہ بھر بعد دوبارہ آواز آئی وہ کتوں کو ڈانٹ کر خاموش کرا رہی تھی۔ شاید ہمیں دیکھنے میں ناکام رہی تھی۔

مالکن کے ڈانٹنے اور دو تین بار پتھر مارنے سے کتے دروازے کی طرف سمٹ گئے تھے۔ تبھی اس کی آواز ابھری۔

''تم میرے نشانے پر ہو، بہتر ہو گا یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ میں گولی چلانے پر مجبور ہو جاؤں گی۔''

اب مزید چھپنا بے کار تھا، ہم آڑ سے نکل کر سامنے ہوئے، کتے دوبارہ بھونکنے لگے تھے۔ انھیں نظر انداز کر کے میں مورچے کی طرف متوجہ ہوا۔ ''بہن! ہمارا مقصد آپ لوگوں کو نقصان پہنچانا نہیں، کسی ضروری کام سے آئے ہیں، یہاں دن

کا کچھ حصہ گزار کر، چلے جائیں گے۔ آپ کو گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔ ''تمھارا یقین کیوں کروں؟''

میں اطمینان سے بولا۔ ''کیوں کہ آپ کے گھر میں داخل ہونے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''تمھاری آمد کا مقصد کیا ہے؟'' وہ اتنی جلدی مطمئن نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے کہا۔ ''یہ جاننا آپ کے کسی کام نہیں آئے گا۔''

وہ دھمکانے لگی۔ ''مجھے اکیلا سمجھنا تمھاری بھول ہے۔ میرے بھائی گھر ہی میں سوئے ہیں۔''

''جاگ جائیں تو ہمارے پاس بھیج دینا، انھیں مطمئن کر دیں گے۔ فی الحال آپ آرام کریں اور ہمیں اپنا کام کرنے دیں۔'' گفتگو ختم کرنے کا عندیہ دے کر میں سردار کو بولا۔ ''چلو۔''

ہم مکان کے شرقی جانب دو درمیانی اونچائی کے درختوں کی طرف بڑھ گئے۔ دونوں درختوں کے تنوں کے درمیان چار انگل سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ وہاں بہتر مچان بن سکتی تھی۔

سردار نے مشورہ دیا۔ ''مچان کے بجائے ''بیلی ہائڈ پوزیشن'' کیوں نہ بنا دیں۔'' (یہ پوزیشن کسی درخت، پتھر یا کسی بھی دستیاب چیز کے نیچے بنائی جا سکتی ہے جو اوور ہیڈ حفاظت مہیا کرتی ہے اور دشمن کے براہ راست یا بالواسطہ فائر سے سنائپر بچا رہتا ہے۔ البتہ اس میں محنت زیادہ کرنا پڑتی ہے اور کھدائی وغیرہ کو اوزار کی ضرورت بھی پڑتی ہے)

یقیناً اس کا ارادہ گھر والوں سے بیلچے، کدال وغیرہ مانگنے کا تھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''دکھاؤ کم ہو جائے گا، اور رینج ماسٹر کا سائیلنسر ہمارے پاس موجود ہے اس لیے فکر نہ کرو مچان پر ہمارے دیکھے جانے کے امکان کم ہیں۔''

وہ متفق ہوا۔ ''سامان لے آؤں۔''

''اکٹھے چلتے ہیں۔'' میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ مکان ہم سے تیس چالیس گز شمال کی طرف پڑ رہا تھا۔ اوپر چڑھتے ہوئے ہم مکان کے پاس جا کر اس طرف مڑے تھے۔ ان درختوں کے پاس پہنچنے کو مکان کے پاس سے گزرنا ضروری تھا۔ کتوں نے ہمیں دیکھ کر ایک بار پھر اپنی موجودی کا اظہار کرنا ضروری سمجھا۔ البتہ اب ان کے بھونکنے میں پہلے جیسی شدت نہیں تھی۔ سامان لانے میں ہمیں ادھ گھنٹا لگ گیا تھا۔

چھوٹے دستے کی تیز پھل والی کلہاڑی میری جانب بڑھاتے ہوئے سردار اطمینان سے بولا۔ ''راجا صاحب! بسم اللہ پڑھو۔''

''تم بھی تشریف لے آؤ حضور۔'' میں نزدیکی جھاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔ گھنٹا ادھ لگا کر میں نے کئی مضبوط شاخیں کاٹ ڈالیں۔ سردار اس ان شاخوں کو درخت کے نیچے ڈھیر کرتا رہا۔ مچان بنانے کے کئی طریقے ہیں۔ اور اس کا انحصار دستیاب وسائل، درخت کی قسم اور درکار وقت پر ہوتا ہے۔ اگر لکڑی کے پھٹے، رسیاں وغیرہ میسر ہوں تو مچان کو آرام دہ بنایا جا سکتا ہے۔ مچان کی تیاری میں درخت کے چناؤ کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ درخت اکیلا اور نمایاں نہ ہو، درختوں کے جھنڈ سے باہر نہ ہو، کانٹادار نہ ہو، اس پر پرندوں کے گھونسلے نہ ہوں، کیڑے مکوڑے نہ ہوں، اس پر چڑھنا اترنا آسان ہو، پتوں سے بھرپور شاخیں ہوں، شاخیں اتنی مضبوط ہوں کہ سنائپر جوڑی کا وزن سہار سکیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ صرف پڑھنے کی حد تک ہے۔ عملی زندگی میں بہت ساری باتیں نظر انداز کرنا پڑتی ہیں۔ ضروری نہیں کے ہر جگہ ان خصوصیات کے حامل درخت میسر ہوں۔ عموماً سنائپر کے پاس انتخاب کا چناؤ نہیں ہوتا۔ ایسے حالات میں خطرہ مول لینا مجبوری بن جاتا ہے۔ اور ایک سنائپر کی زندگی خطرات کی عملی تفسیر ہی ہوتی ہے۔

اس وقت بھی ہمیں سب سے بہتر وہی دو درخت لگے تھے۔ البتہ ہماری خوش قسمتی کہ وہ بالکل اکیلے اور نمایاں نہیں تھے، گھنے بھی تھے۔ وزیرستان میں شاہ بلوط کے درختوں کی بہتات ہے اور ہم نے شاہ بلوط ہی کے درختوں کا چناؤ کیا تھا۔ مقامی زبان میں وہ اسے ''سیڑائے'' کہتے ہیں۔ اس کی دو تین اقسام ہیں جن میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اس درخت پر کانٹے تو نہیں ہوتے لیکن پتوں کے کنارے نوکیلے ہوتے ہیں جو ننگی جلد پر چبھ سکتے ہیں۔ البتہ لکڑی انتہائی مضبوط ہوتی ہے۔ مقامی لوگ اس کی لکڑی کوئلہ بنانے میں استعمال کرتے ہیں۔ مٹی سے اِگلو (Igloo) نما قد آدم بھٹیاں بنا کر اس میں درخت کی لکڑیاں چھت تک بھر دیتے ہیں۔ پھر اسے دھیمی آنچ پر سلگنے کو چھوڑ دیتے ہیں، چند دنوں میں عمدہ کوئلہ تیار ہو جاتا ہے۔ وزیرستان میں کافی لوگ اسی کاروبار سے وابستہ ہیں۔

درخت پر چڑھنے سے پہلے ہم نے فجر کی نماز پڑھی اور پھر کلھاڑی نیفے میں اڑس کر میں درخت پر چڑھ گیا۔

صبح کا ملگجا اجالا ہر طرف پھیل گیا تھا، اب ٹارچ روشن کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ مناسب بلندی پر پہنچ کر میں نے سردار کو شاخیں پکڑانے کا اشارہ کیا۔ وہ شاخیں دیتا گیا اور میں ترتیب سے رکھتا گیا۔ پہلے مرحلے میں میں نے مچان کا فرش بنایا تھا۔ سردار نے رسی کو ادھیڑ کر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دیے تھے۔ میں شاخوں کو مہارت سے باندھنے لگا۔ طلوع آفتاب تک ہم نے مچان تیار کر لیا تھا۔ مزید تھوڑا وقت لگا کر ہم نے مچان کے چھپاؤ و تلبیس کی ضروریات کو پورا کیا اور سارا سامان مچان پر منتقل کر دیا۔ فارغ ہو کر میں کنٹرول سے رابطہ کرنے لگا۔ کیپٹن حفیظ کو اپنی جگہ کے بارے بتا کر آگے کا لائحہ عمل پوچھا۔

''ہم صبح تین بجے بازار جائیں گے، تب ملاقات ہو گی۔ تم سے بات چیت کو 13 دوست آ رہے ہیں۔ لسننگ پر رہنا آؤٹ۔'' (مطلب یہی تھا کہ وہ آنے والی صبح تین بجے نکلیں گے اور میں چینل 13 پر مزید احکامات کا منتظر رہوں)

''ہم منتظر ہیں۔'' کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''یار! بھوک لگی ہے۔'' سردار نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

''بسکٹ ہی پر گزارا کرنا پڑے گا۔'' میں نے چنوں سے بنے ہوئے مخصوص بسکٹ جھولے سے نکال کر درمیان میں رکھ لیے۔

سردار منہ بنا کر بسکٹ چبانے لگا۔ ان بسکٹوں سے بھوک تو مٹ جاتی ہے، مگر گندم کی روٹی اور سالن کا بدل یہ نہیں ہو سکتے۔ اور بدقسمتی سے سنائپر کا مقصد کی خاطر اٹھنے والا پہلا قدم اس کے پیٹ پر پڑتا ہے۔

اسے بے دلی سے بسکٹ چباتے دیکھ کر میں نے چوٹ کی۔ ''یہ خوراک ہے، دوائی نہیں۔''

سردار نے کہا۔ ''میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ فقرہ ہی غلط ہے، پٹھان سوچا نہیں کرتے۔''

وہ بلبلا اٹھا۔ ''سنو تو سہی۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''بن بلایا مہمان بننا مجھے قبول نہیں ہے۔''

وہ مصر ہوا۔ ''کھانے کے پیسے دے دیں گے۔''

''گھر میں صرف عورتیں ہیں۔ جو اتنی آسانی سے ہم پر اعتبار نہیں کریں گی۔''

''دروازے پر دستک دیں گے، کوئی ردعمل ملا تو بہتر ورنہ چنوں کے بسکٹ تو کہیں گئے نہیں۔''

میں نے فلسفہ جھاڑا۔ ''جو بسکٹ بے عزت ہو کر کھانے ہیں انھیں عزت سے چبا لو۔''

اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔ ''بے عزتی، عزت والوں کی ہوتی ہے۔''

میں نے چوٹ کی۔ ''صحیح کہا، لیکن میں بھی تمھارے ساتھ ہوں۔''

سردار ہنسا۔ ''تمھاری بات کر رہا تھا، کیوں کہ اس کام کو میں تمھیں بھجوانے لگا ہوں۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''سنا ئپر کورس کی کسی بھی کتاب میں کھانا مانگنے کی ذمہ داری شوٹر کے ناتواں کندھوں پر نہیں ڈالی گئی۔''

''کچھ باتیں سپاٹر کی صوابدید پر چھوڑ دی جاتی ہیں۔''

میں نے طعنہ کسا۔ ''تم مانگنے کو جاپان تک چلے گئے اور ایک لڑکی کا ہاتھ مانگ لائے، تو یہاں بھی غیرت کر لو۔''

سردار نے طنزیہ قہقہہ اچھالا۔ ''واہ! چھلنی کوزے کو کہہ رہی ہے تم میں دو سوراخ ہیں۔ جس کی آوارگیوں کی داستان امریکہ سے افغانستان، کشمیر سے وزیرستان اور بھارت سے برطانیہ تک پھیلی ہے، وہ ایک شریف پٹھان پر طعنہ زنی کر رہا ہے۔''

میں ہکا بکا ہوتا ہوا بولا۔ ''برطانیہ کا نام تو میں نے صرف نصاب کی کتابوں میں پڑھا ہے۔''

''شاید ایسا ہی ہو، مگر لورا براؤن کا نام کسی نصابی کتاب کا حصہ نہیں ہے۔''

میں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''دھت تیرے کی، بے شرم پٹھان اسے میں نے دیکھا تک نہیں۔''

''ہاں، دیکھا ہوتا تو آج چوتھی ڈھونڈ رہے ہوتے۔'' سردار نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔ ''ویسے کشمالہ بہن بھی برا انتخاب نہیں تھا۔''

میرا رخ گھر کی جانب تھا۔ اسی وقت دو بچیاں مکان سے برآمد ہوئیں، ان کا رخ ہماری مچان کی طرف تھا۔ ایک کے ہاتھ میں چھابہ اور دوسری نے کیتلی اٹھائی ہوئی تھی۔ مکینوں کو روایتی مہمان نوازی نہیں بھولی تھی۔ غربت اور تنگ دستی بھی اس علاقے کے لوگوں کو مہمان نوازی سے باز نہیں رکھتی۔

''ٹھیک ہے خان صاحب! زیادہ دماغ خراب مت کرو، میں ناشتے کا بندوبست کر لیتا ہوں۔'' میں درخت سے اترنے لگا۔

سردار نے دبے لہجے میں نعرہ بلند کیا۔ ''را جا زندہ باد۔ میں جانتا تھا میرا دوست اتنا ہڈ حرام اور نکما بھی نہیں ہو سکتا کہ اپنے.....'' اس کا سر مکان کی طرف گھوما، بچیوں پر نظر پڑتے ہی دانت پیستے ہوئے بولا۔ ''میں بھی کہوں تم جیسا ڈھیٹ اتنی آسانی سے کیسے راضی ہو گیا۔''

استہزائی قہقہہ بلند کر کے میں نے آخری تین چار فٹ کا فاصلہ چھلانگ لگا کر پورا کیا۔

بچیوں کی عمر سات آٹھ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ نیلی آنکھیں اور معصوم چہروں پر ہلکا سا خوف انھیں مزید پیارا بنا رہا تھا۔

''ارے یہ تو بہت پیاری بیٹیاں ہیں۔''

میں نے چھابہ اور کیتلی لے کر ان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

میرے مشفقانہ رویے سے ان کے چہروں پر چھایا خوف دور ہو گیا تھا۔ ایک بچی ہمت کرتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ''کچھ اور چاہیے۔''

''فی الحال تو کچھ نہیں۔''

ان کے گال چوم کر میں نے دونوں کے ہاتھ پر درمیانی مالیت کا ایک ایک نوٹ رکھ دیا۔ وہ خوشی سے اچھلتی کودتی گھر کو بھاگ گئی تھیں۔

میں برتن اٹھا کر درخت پر چڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہم پراٹھوں سے انصاف کر رہے تھے۔ خوشبو و لذت بتا رہی تھی کہ پراٹھے دیسی گھی کے ہیں۔

''اللہ پاک ہماری بہن کو خوش رکھے۔'' چھابے میں جھاڑو پھیر کر سردار نے پکانے والی کو دعا دی۔

''آمین۔'' کہہ کر میں اطمینان سے لمبا پڑ گیا۔

''ناشتا میں لے آیا تھا، اب پہرے داری کی ذمہ داری تم سنبھالو۔''

سردار نے چوٹ کی۔ ''تم سے بھلائی کی امید کرنا سانڈ سے دودھ ملنے کے مترادف ہے۔''

میں نے اس کے واویلے پر کان دھرے بغیر آنکھیں بند کر لیں۔ کہ ایسی فضول باتیں جواب کی متقاضی نہیں ہوتیں۔ سنائپر کے سخت جان ہونے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ تھکتے نہیں یا ان کے جسم آرام کے طلب گار نہیں ہوتے۔ ان میں بس عام افراد سے برداشت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ اور تھکن کو وہ اپنے اعصاب پر مسلط نہیں کرتے۔

—— ● ——

میری آنکھ باتوں کی آواز سے کھلی۔ دونوں بچیاں دوپہر کا کھانا لائی تھیں۔ سردار مچان سے نیچے جا کر ان سے گپ شپ کر رہا تھا۔ صبح کی نسبت بچیاں زیادہ پر اعتماد نظر آ رہی تھیں۔ اور چہک چہک کر سردار کی باتوں کا جواب دے رہی تھیں۔ دونوں چچازاد تھیں۔ ایک کا نام تنزیلہ اور دوسری کا طیبہ تھا۔ تنزیلہ سال بھر بڑی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تنزیلہ کی امی بیمار تھیں اور اس کا باپ اور چچا کل سہ پہر کو اسے لمن شہر کی طرف لے گئے تھے۔ گھر میں ان کی چھوٹی پھوپھو، دادی اور طیبہ کی ماں موجود تھیں۔ وہاں بہت سے لوگوں نے ایسی جگہ بھی گھر بنائے ہوئے ہیں جہاں آمدورفت نہایت مشکل ہے۔ اور ان لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ کسی مریض کو ڈاکٹر تک لے جانے کا ہوتا ہے۔ چھوٹی موٹی بیماریوں کو تو یہ لوگ خاطر ہی میں نہیں لاتے البتہ بڑی بیماری یا حاملہ عورت کا کیس بگڑ جانے کی صورت میں بے چاروں کو بہت پریشانی اٹھانا پڑتی ہے۔

بچیوں کو رخصت کرتے وقت سردار نے چند درمیانی مالیت کے نوٹ انھیں پکڑا دیے تھے۔ گل بدین کے لشکریوں کی جیبوں سے ہمیں کافی رقم ہاتھ آئی تھی۔

سردار کھانے کے برتنوں کے ساتھ اوپر آ گیا۔ کدو کا سالن جس میں خشک گوشت کے ٹکڑے شامل تھے۔ بھرپور ناشتا کرنے کے بعد خاص بھوک تو نہیں لگی تھی پھر بھی ہم دو دو روٹیاں ڈکار گئے تھے۔

کھانے کے دوران سردار نے دستی بموں کے دھماکوں کا بھی بتا دیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''دھماکے کس وقت ہوئے۔''

''ساڑھے دس بجے۔''

''تمھیں ''آئی کام'' پر دشمن کی بات چیت سننے کی کوشش کرنا چاہیے تھی۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''سنی تھی حضور! صرف ایک ہم بم ہی پھٹا ہے، دوسرے خیمے میں وہ ایک جانب کا کپڑا پھاڑ کر داخل ہوئے تھے اور دستی بم کو دور پھینک کر ناکارہ کر دیا۔ قلات خان بچ گیا ہے، ایک آدمی شدید زخمی اور ایک قتل ہو چکا ہے۔ آرجز ہینڈ گرنیڈ کی وجہ سے انھیں یقین ہو گیا ہے کہ پس پردہ پاک آرمی ہے۔ اپنے تمام لشکریوں کو انھوں نے خبردار کر دیا ہے۔ کمانڈر عدیل جان کے لشکری بھی اپنے دونوں آدمیوں کو بار بار پکار رہے تھے۔ لیکن ان کی اور گل بدین کے آدمیوں کی گفتگو میں نہیں سن سکا۔''

سردار نے کافی کارآمد معلومات حاصل کی تھیں۔''

کھانا کھا کر سردار آرام کرنے لگا۔ رینج ماسٹر کو اب تک ہم نے نہیں کھولا تھا۔ میں دوربین سے علاقے کا جائزہ لینے لگا۔ ہمیں کافی مناسب جگہ ملی تھی۔ وہاں بامک ٹاپ کی طرف سے خطرہ موجود تھا کہ وہ ہماری پشت پر تھی۔ اور فاصلہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ البتہ سائیلنسر کی وجہ سے ہماری کمین گاہ کو پہچاننا اتنا آسان نہیں تھا۔ کوئی مستند سنائپر ہی اندازہ کر سکتا تھا کہ گولی کس طرف سے آ رہی ہے۔ ہمیں وہاں خطرہ صرف قریبی گھر والوں کی طرف سے تھا کہ ان کے ذریعے ہماری وہاں

موجودی کی خبر پھیل سکتی تھی۔ میں نے اس بارے پہلی فرصت میں مکینوں کو ہدایت کر دی ہوتی مگر گھر میں کوئی مرد موجود نہیں تھا جس سے میں بات کر سکتا۔ میں اس لیے بھی مطمئن تھا کہ نزدیک کوئی دوسرا گھر نظر نہیں آ رہا تھا۔ اگر ٹیکری کے مغربی نالے میں کوئی گھر موجود تھے تو ہماری نظر سے اوجھل تھے۔ بچیاں برتن لینے واپس آئیں، میں نے نیچے اتر کر طیبہ کو گود میں اٹھا لیا اور ان سے دوسرے گھروں کی بابت دریافت کرنے لگا۔ دونوں جوش و خروش سے عقبی نالے میں چند گھروں کی خبر دینے لگیں۔ کبھی کبھار وہ ادھر کھیلنے بھی نکل جاتی تھیں۔ مگر آج صبح سے وہ ادھر نہیں جا سکی تھیں۔

میں نے ان کے ساتھ گھر کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے پر رک کر میں نے تنزیلہ کو کہا۔ ''بیٹی! دادی کو بلاؤ، کہنا چچا نے کچھ پوچھنا ہے۔''

وہ بھاگ کر گھر میں گھس گئی، تھوڑی دیر بعد ہی ایک بوڑھی عورت نمودار ہوئی، اس کے ہمراہ ایک جواں سال لڑکی بھی تھی جس نے دوپٹے کا پلو یوں چہرے پر لپیٹا تھا کہ صرف آنکھیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ دونوں نے گہری نظر سے مجھے دیکھا تھا۔

''اسلام علیکم ماں جی!'' میں نے گفتگو میں پہل کی تھی۔

اس نے نحیف آواز میں دعا دی۔ ''جیتے رہو بیٹا۔''

''ماں جی! معافی چاہتا ہوں آپ کو تکلیف دی۔ ہم دشمنوں سے چھپتے پھر رہے ہیں، کل کا دن یہاں گزار کر کسی اور طرف کا رخ کریں گے۔ عرض یہ تھی کہ بچوں کو آج اور کل گھر میں روک کر رکھیں۔ کیوں یہ معصوم ہیں ہمارے چھپنے کی بابت کسی کو بھی خبر دے سکتے ہیں۔ بلکہ ہمارے جانے کے بعد بھی کوشش کرنا یہ اس بارے کسی سے بات چیت نہ کریں تاکہ ہمارے دشمن آپ کے خلاف نہ ہو جائیں۔''

بوڑھی عورت کے پلے تو میری گفتگو نہیں پڑی تھی، لیکن جواں سال لڑکی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسے سمجھانے لگی۔ اس کے منہ کھولنے پر معلوم ہوا کہ وہ بوڑھی خاتون کی بیٹی اور ننھی لڑکیوں کی پھوپھو تھی۔ آواز سن کر میں نے فوراً پہچان لیا تھا کہ رات کو ہمارا استقبال اسی نے کیا تھا۔

بیٹی کے سمجھانے پر اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''آپ ہمارے مہمان ہیں اور مہمانوں کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔''

''اللہ آپ کو اچھی صحت والی لمبی عمر دے ماں جی! ہمیں فقط راز داری کا اطمینان دلا دیں، باقی ہم سنبھال لیں گے۔''

بیٹی نے ماں کو میرا مطلب واضح کیا۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے عورتوں کے ازلی تجسس کا اظہار کیا۔ ''آپ کے دشمن کون ہیں بیٹا۔''

''ہمارے دشمن، آپ کے بھی دشمن ہیں ماں جی! مگر آپ انھیں پہچانتی نہیں ہیں۔ بہرحال ہمیں آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔''

بیٹی کی وضاحت پر وہ ہمیں دعائیں دینے لگی۔ میں نے چند بڑے نوٹ نکال کر اس کی بیٹی کی طرف بڑھا دیئے۔ گہری سیاہ آنکھیں میری جانب اٹھیں، ان میں گھبراہٹ چھپی تھی۔ نفی میں سر ہلا کر وہ گھر میں گھس گئی تھی۔ بوڑھی عورت بھی خفیف انداز میں مجھے پیسے دینے سے منع کرنے لگی۔ یقیناً وہ پیسے کے لالچی نہیں تھے، مگر انھیں پیسے کی ضرورت تھی۔

میں نے تنزیلہ کو پیسے پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''بیٹی، یہ اپنی پھوپھو کو دے دو۔''

بوڑھی عورت انکار میں سر ہلاتی رہی، میں مسکراتا ہوا پلٹ آیا۔ سردار اب تک سو یا تھا۔ میں دوربین سے علاقے کا جائز لینے لگا۔ رات والی جگہ پر اب خیمے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ یقیناً وہ اپنی لاشیں اور خیمے سمیٹ کر لے گئے تھے۔ میں آئی کام آن کر کے ان کی سن گن لینے کی کوشش کرنے لگا، چار بجنے کو تھے جب وائرلیس پر مجھے پکارا جانے لگا۔

''ایس ایس اوور۔''

''ایس ایس سینڈ یور میسج اوور۔'' میں نے جواب دیتے ہوئے پیغام کا پوچھا۔

اس نے کوڈ ورڈ میں چھے ہندسی حوالہ بتایا.....

''ویٹ۔'' اسے انتظار کا کہہ کر میں نے جلدی سے کاغذ پر پہلے والا حوالہ درج کیا اور کہا۔

''سینڈ یور میسج اوور۔''

کنٹرول نے مجھے پانچ مقامات کے چھے ہندسہ حوالے لکھوائے۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ''یہ رقوم پکے حساب کتاب کے بعد پتا چلی ہیں۔''

''راجر آؤٹ۔'' سمجھ جانے کا عندیہ دے کر میں نے بات چیت ختم کر دی۔ بلاشبہ وہ حوالے ان خاموش مجاہدوں کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھے جو کسی گڈریے، بھکاری، دہشت گرد، اسمگلر، شکاری، ڈاکو، تاجر، لکڑہارے یا عام مقامی آدمی کے بھیس میں رہ کر معلوم کر چکے تھے۔ یہ پانچ ٹھکانے ہم دونوں نے سنبھالنے تھے، باقی سنائپرز کو دوسرے اہداف ملے تھے جو ہماری حدود سے باہر تھے۔

سردار نے جمائی لیتے ہوئے مجھے مطعون کیا۔ ''یہ بات چیت مچان سے تھوڑے فاصلے پر جا کر بھی کی جا سکتی تھی۔''

میں اسے لتاڑتے ہوئے بولا۔ ''تمھارے احمقانہ اعتراض کا جواب، ''چونچ بند رکھو'' کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے۔''

''حضرت اقبالؒ نے فرمایا تھا: ''حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی۔'' یقیناً تم جیسے بے حیا سے پالا پڑا ہوگا۔''

''حاجی صاحب! اقبال کا مصرع پڑھ کر بھی تم پٹھان ہی رہو گے، عقل مند نہیں کہلا سکتے۔ اس لیے وعظ و نصیحت چھوڑو اور میری مدد کرو۔'' نقشہ پھیلا کر میں چھے ہندسہ حوالے نقشے پر مارک کرنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ لگا کر ہم نے اپنی جگہ سے پانچوں مقامات کی ڈگریاں اور فاصلے ایک کاغذ پر لکھ لیے تھے۔ صرف ایک جگہ ہماری مار سے باہر تھی۔ کیوں کہ اس کا فاصلہ اڑھائی کلومیٹر کے بہ قدر تھا۔ اور رینج ماسٹر کی کارگر رینج تو آپ لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ دو کلومیٹر ہے۔ باقی چاروں مقامات کے فاصلے رینج میں تھے۔ سورج ڈھلنے سے پہلے ہم نہ صرف ان پانچوں مقامات کو زمین پر ڈھونڈ چکے تھے بلکہ دوربین سے ان کا اچھی طرح جائزہ لے چکے تھے۔ یہ کام نہایت آسان ہے کیوں کہ کمپاس کے ذریعے مطلوبہ ڈگری اور لیزر رینج فائینڈر کے ذریعے فاصلہ ناپ کر وہاں بیٹھے بیٹھے مطلوبہ مقام کو پہچاننا چنداں دشوار نہیں ہے۔ البتہ جو قارئین نقشہ بینی سے واقفیت نہیں رکھتے انھیں اس طریقہ کار کی سمجھ نہیں آئے گی۔

شام کو بچیاں مرغی کا سالن لائی تھیں۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ برتن لینے بچیوں کے بجائے دو عورتیں آئی تھیں۔ اندھیرے میں ان کی شکلیں تو نظر نہیں آ رہی تھیں لیکن آواز سن کر اندازہ ہوا کہ ایک بچیوں کی جواں سال پھوپی اور دوسری طیبہ کی ماں تھی۔ وہ دو کمبل بھی لائی تھیں۔ اور پانی کا گھڑا بھی۔ ہمارے پاس گرم چادریں موجود تھیں مگر وہ سردی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ بلاشبہ ہمیں ان کمبلوں کی سخت ضرورت تھی۔

ہم نے شکریے کے ساتھ کمبل وصول کر لیے۔ زیادہ گفتگو کی کوشش نہ انھوں نے کی تھی نہ ہمیں ہی شوق تھا۔ عشاء پڑھ کر میں نے ایک کمبل نیچے بچھایا اور دوسرا اوڑھ لیا، سردار پہرے داری پر بیٹھ گیا تھا۔ گو اس جگہ زیادہ خطرہ نہیں تھا، لیکن ہم ذرا سا خطرہ مول لینے کو بھی تیار نہیں تھے۔

سردار مجھے ایک بجے جگا کر خود سو گیا تھا۔ میں نے شب دید عینک سے اطراف کا جائزہ لیا اور پھر ایک ٹہنی سے ٹیک لگا کر جانِ حیات کے خیالوں میں کھو گیا۔ چھٹی سے واپس آئے تین ماہ ہونے کو تھے اور اب کال کرنے پر ''اسلام علیکم'' کے بجائے اس کی سسکیاں سنائی دینے لگی تھیں۔ رومانہ نے البتہ ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ اسے بھی تسلیاں دیتی اور مجھ سے بات کرتے ہوئے بھی حوصلے کا اظہار کرتی تھی۔

ہوا کی رفتار دھیرے دھیرے تیز ہو رہی تھی۔ عموماً پچھلی شب کو تیز ہوا شروع ہو جاتی جو طلوع آفتاب کے ساتھ دم توڑ دیتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی دن بھر سائیں سائیں کی آواز سنائی دیتی رہتی۔ خصوصاً سردیوں میں تو یہ ہوا نوکیلی سوئیوں کی طرح آدمی کا بدن چھیدتی تھی۔ جب چاروں طرف سفید برف کی چادر بچھی ہو تب یہ ہوا تکالیف و اذیتوں کے ہر حربے سے لیس ہوتی ہے۔

سوا تین بجے مجھے چھاپہ مار دستوں کی روانگی کا پیغام ملا۔ کیو جے سیون اور ایٹ سے ایک ایک ٹولی اتر رہی تھی۔ کیو جے فائیو اور کیو جے ٹین سے بھی ایک ایک ٹولی نے حرکت کرنا تھی۔ میرے اور سردار کی ذمہ داری کیو جے سیون اور ایٹ کی ٹولیوں کی مدد کرنا تھا۔ کنٹرول نے ان کے کال سائن (جس حوالے سے میں انھیں وائرلیس پر پکار سکتا تھا) بتا دیے تھے۔ میں نے شب دید عینک میں کیو جے ٹاپ کا جائزہ لیا مگر وہ پہاڑی سلسلہ کافی دور تھا اور شب دید عینک کی رینج اتنی زیادہ نہیں ہے کہ مجھے رات کے وقت کوئی حرکت نظر آ جاتی۔ البتہ چھاپہ مار دستوں کے ٹارچ جلانے کی صورت میں ان کا نظر آنا ممکن تھا۔ اور یہ ممکن اس لیے وقوع پذیر نہیں ہو سکتا تھا کہ تربیت یافتہ سپاہ روشنی جلانے کی حماقت نہیں کر سکتی تھی۔ پاک فوج کے مجاہدوں کا اندھیروں میں حرکت کرنا ہی وطنِ عزیز کو روشن رکھے ہوئے ہے۔

صبح کا ملگجا اجالا پھیلتے ہی میں نے سردار کو جگایا اور نماز پڑھنے مچان سے نیچے اتر گیا۔ ہماری سہولت کو میزبان پانی کا گھڑا وہاں چھوڑ گئے تھے۔ عجیب مشن تھا کہ کھانے پینے کی کوئی تنگی پیش نہیں آئی تھی۔ گو بھوک پیاس برداشت کرنا سنائپر کی روزمرہ ہے، لیکن زبردستی بھوکا پیاسا رہنا ایک روزہ دار ہی کا خاصا ہے۔

میں بہ مشکل نماز پڑھ سکا تھا کہ ناشتا آ گیا۔ اتنے سویرے رزق کی آمد پر دل احساسِ شکر گزاری سے بھر گیا تھا۔ علماء سے سنا ہے کہ رزق بھی موت کی طرح انسان کے پیچھے پھرتا ہے۔ ناشتا دینے بچیوں کی جواں سال پھوپھو ہی آئی تھی۔ دوپٹے کا پلو اس نے چہرے کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔

اس نے وضاحت دی۔ ''بچیاں سوئی تھیں اس لیے مجھے آنا پڑا۔''

''شکریہ بہن۔'' میں نے ممنونیت سے کہا۔

''آپ آج چلے جائیں گے۔'' اس کا استفسار مجھے عجیب لگا تھا۔

''امید تو ہے۔'' میں نے جواب گول مول کیا کہ ہمیں خود بھی واپسی کا واضح نہیں تھا۔

''کچھ ضرورت ہو تو مانگ لیا کریں۔'' چہرے سے سرکتے پلو کو اضطراری انداز میں ٹھیک کرتے ہوئے اس نے پیش کش کی۔

اسے گفتگو پر آمادہ دیکھ کر میں نے بات بڑھائی۔ ''تمھارے بھائی اور بھابی کب لوٹیں گے؟''

اس نے تفصیلی جواب دیا۔ ''بات ہوئی تھی، اللہ نے مجھے بھتیجے سے نوازا ہے۔ بھابی بھی ٹھیک ہیں۔ شاید آج رات یا کل تک واپس لوٹ آئیں۔''

سردار نے نماز پڑھ لی تھی۔ قریب ہو کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''میری بہن کا نام کیا ہے؟''

وہ دھیرے سے بولی۔ ''زرمینہ۔''

''شکریہ زرینہ بہن! آپ لوگوں نے ہمارا اتنا خیال رکھا۔'' سردار چوکڑی مار کر نیچے بیٹھا اور پراٹھوں سے کپڑا ہٹانے لگا۔ یقیناوہ نیچے ہی ناشتا نبٹانا چاہتا تھا۔

زرینہ واپس مڑی، لیکن چند قدم لے کر رک گئی، لمحہ بھر رک کر اس کا رخ ہماری جانب ہوا لیکن پھر گھر کو مڑ گئی۔ مجھے لگا کچھ کہنا چاہتی ہے، لیکن گومگو کی کیفیت میں تھی۔ اس کا ہچکچانا عجیب لگا تھا۔

''زرینہ۔'' کیتلی سے پیالی بھرتے ہوئے میں نے پکارا۔

اس کا رخ ہماری جانب ہوا مگر آگے نہ آئی۔

میں نے ہاتھ سے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

وہ جھجکتے ہوئے قریب آ گئی۔ اضطراری انداز میں ہاتھ مروڑتے ہوئے اسے دوپٹے کا پلو سنبھالنا یاد نہیں رہا تھا۔ معصومیت بھرے چہرے پر حیا آلود سرخی پھیلی تھی۔ اس کی گہری سیاہ آنکھیں اور جاذب نظر نین نقش کسی کو بھی بہکا سکتے تھے۔

''کچھ کہنا چاہتی ہو۔'' میں نے متبسم ہو کر بولنے کی ترغیب دی۔

اس نے ہکلاتے ہوئے حاجت بیان کی۔ ''ب..... بھائی..... م..... مجھے موبائل فون کا بہت شوق ہے، لیکن لالا جان کے پاس اتنے پیسے ہی نہیں ہوتے کہ خرید دیں۔ تھوڑا تھوڑا کر کے جمع کیے تھے، لیکن بھابی کی بیماری پر خرچ ہو گئے۔''

میں خوش دلی سے مسکرایا۔ ''موبائل فون چاہیے یا رقم.....''

''موبائل.....'' کالی سیاہ آنکھوں میں حسرت ہلکورے لیتی نظر آئی۔ میں دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ کتنی چھوٹی سی معصوم خواہش تھی جو اس کے لیے پہاڑ بنی تھی۔ بلاشبہ انسان کی خواہشیں کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ ایک تمنا حاصل کرو تو اگلی کو دل مچل اٹھتا ہے، بہ قول شاعر۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے ہیں میرے دل کے ارماں پھر بھی کم نکلے

اگر وہ مہذب دنیا میں ہوتی تو بہ ذات خود کئی دلوں کی تمناؤں کا مرکز ہوتی۔ لیکن ان پہاڑوں میں اسے چاہنے یا سراہنے والا کوئی نہیں تھا۔ اسے اپنی خوب صورتی کا اندازہ تھا نہ اپنی اہمیت کا پتا۔ کیوں کہ ''میرا جسم میری مرضی'' جیسی لعنت سے وہ باحیا، باکردار و معصوم لڑکی کوسوں دور تھی۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وزیرستان کی عورت شرم و حیا کی پتلی ہوتی ہے۔ وزیرستان میں بدکرداری اور فحاشی کا گزر ہی نہیں ہے۔ شادی سے پہلے کے یارانے، عشق معشوقی اور ایسی دوسری خرافات سے وزیرستان کا معاشرہ کوسوں دور ہے۔

زرینہ کی خواہش پر میں نے اپنے قیمتی موبائل فون سے کنکشن کارڈ نکالا، فون کو ری سیٹ کر کے اس کی جانب بڑھا دیا۔ ''یہ لو اب خوش.....''

اس کے چہرے پر بے یقینی ابھری اور اس نے جھجکتے ہوئے موبائل فون پکڑ لیا۔

سردار بولا۔ ''موبائل دے دیا ہے تو چارجر بھی بے چاری کے حوالے کر دو۔''

''ایک منٹ۔'' زرینہ کو رکنے کا اشارہ کر کے میں مچان پر چڑھ گیا اور اپنے جھولے سے چارجر نکال لایا۔ ''یہ بھی رکھ لو۔'' میں نے چارجر بھی اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے متعجب ہو کر چارجر بھی تھاما اور بے یقینی سے مجھے گھورتی رہی۔ اسے یہ سب سپنا لگ رہا تھا۔

میں نے متبسم ہو کر پوچھا۔ ''استعمال کر لو گی ناں؟''

''نہیں تو راجا، اپنا مشن پس پشت ڈال کر یہ ذمہ داری سنبھالنے کو تیار ہے۔'' سردار نے منہ بناتے ہوئے لقمہ دیا۔
سردار کی اردو تو اس کے سر پر سے گزر گئی تھی، البتہ میری بات کا جواب اس نے پر جوش انداز میں سر ہلا کر دیا تھا۔
''تو ٹھیک ہے جاؤ۔'' میں ناشتا کرنے بیٹھ گیا۔
''آ... آپ بہت اچھے ہیں۔'' خوشی سے بھرپور لہجے میں کہہ کر وہ مڑی اور چھوٹے بچوں کی طرح قلانچیں بھرتے ہوئے بھاگ پڑی۔ یقیناً وہ ناشتا لے کر بھی اسی مقصد سے آئی تھی کہ ہم تک اپنی خواہش پہنچا سکے۔
بڑا سا نوالہ لیتے ہوئے سردار نے موشگافی کی۔ ''اگر تمھارا خیال ہے کہ چند ہزار کے موبائل پر زرینہ جیسی حسینہ کا رشتہ مل جائے گا تو یہ خوش فہمی اس کے بھائیوں سے ملتے ہی دور ہو جائے گی۔''
میں نے چوٹ کی۔ ''ساون کے اندھے کو ہرا اور سردار خان کو برا ہی سوجھتا ہے۔''
وہ ترکی بہ ترکی بولا۔ ''دو بیویوں کے ہوتے ہوئے تیسری پھنسانے والے تم ہو اور برا میں ہو گیا جو ایک ہی پر قانع ہے۔''
میں خفگی سے بولا۔ ''ایک غریب لڑکی کی معصوم سی خواہش کو پورا کرنا اتنا غلط ہو گیا کہ تم نے بکواس شروع کر دی۔''
''ان مکالموں سے اسے متاثر کرو جو تمھارے کرتوتوں سے ناواقف ہو۔'' اس کے اطمینان میں فرق نہیں آیا تھا۔
''جلدی سے ناشتا کرو، کہ کارروائی کا وقت قریب ہے۔'' میں نے تنگ آ کر موضوع تبدیل کیا کہ اس کی بکواس اتنی آسانی سے ختم نہیں ہو سکتی تھی۔
''تم سے وقت ملا رہا ہوں۔'' آخری نوالہ منہ میں ڈال کر اس نے چائے کی پیالی اٹھالی۔
''اوپر پہنچ کر اپنی پارٹیوں کو تاڑو، میں بس دو نوالے کر کے آتا ہوں۔''
باقی ماندہ چائے حلق میں انڈیل کر وہ سر ہلاتے ہوئے مچان کی طرف بڑھ گیا۔ اگلے پانچ منٹ میں میں بھی اوپر تھا۔ سردار دوربین آنکھوں سے لگائے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں رینج ماسٹر کو جھولے سے نکال کر پرزوں پر لگا تیل کپڑے سے خشک کرنے لگا۔ کوئی بھی ہتھیار جب استعمال نہ ہو رہا ہو تو اس کے پرزوں پر تیل لگا کر رکھنا مفید رہتا ہے، اس طرح پرزے زنگ بھی نہیں پکڑتے اور چال والے پرزے بھی بہتر حالت میں رہتے ہیں۔ البتہ فائر کرنے سے پہلے پرزوں سے تیل خشک کرنا نہایت ضروری ہے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں ہتھیار صحیح فائر نہیں کرے گا اور گولیاں نشانے پر نہیں لگیں گی۔ فائر کے ضمن میں بہت چھوٹی چھوٹی اور عام سی باتیں ایسی ہیں جن کی احتیاط رکھ کر ایک عام فائر بھی اپنے نشانے کو بہتر کر سکتا ہے۔ سنائپرز تو ہتھیار اور ایمونیشن کے بارے بہت وہمی ہوتے ہیں۔
نرم کپڑے سے میں نے پرزوں کو اچھی طرح صاف کر کے ''پل ان تھرو'' (یہ مضبوط تسمہ ہوتا ہے جس کے ایک جانب انگشت بھر لمبا لوہے کا ٹکڑا لگا ہوتا ہے اور دوسری جانب تسمے کو موڑ کر اس میں کپڑے کی نرم چندی ڈالنے کی جگہ بنی ہوتی ہے۔ اس کی مدد سے نال کی صفائی ہوتی ہے) میں چندی ڈالی تاکہ نال (بیرل) کا تیل خشک کر سکوں۔ رینج ماسٹر کی نال کی صفائی کو لوہے کا راڈ اضافی سامان کے ساتھ ملتا ہے۔ لیکن مشن پر اتنا لمبا راڈ ساتھ پھرانا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ کمی پل ان تھرو سے پوری کی جاتی ہے۔
سردار کی مدد سے میں نے بیرل میں چند پل ان تھرو مارے اور پرزوں کو جوڑنے لگا۔ دو تین منٹ میں رائفل فائر کو تیار تھی۔ رینج ماسٹر پر لیٹ کر ہی فائر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مچان پر اتنی جگہ نہیں تھی کہ پانچ فٹ لمبی رائفل اور پونے چھے فٹ کا فائر لیٹ سکتا۔ یہ مسئلہ پہلے سے میری نظر میں تھا، تبھی میں نے رائفل کی دو پائی کے لیے چاروں اطراف میں جگہیں بنائی تھیں جہاں دو پائی ٹیک کر میں بیٹھے بیٹھے بھی فائر کر سکتا تھا۔ گو سردار بھی اچھا فائر رتھا۔ کم ہی نشانہ خطا کرتا تھا، مگر امریکہ

میں سنائپر کورس کے بعد میری موجودگی میں وہ ہمیشہ سپاٹر کی ذمہ داریاں نبھاتا تھا۔

تیار ہو کر میں نے پوچھا۔ ''کوئی حرکت نظر آ رہی ہے؟''

''سامنے بڑے پتھر کا دایاں کنارا، دو بجے کی لائن، پہاڑ کی بنیاد میں اپنی پہلی ٹولی پہنچ گئی ہے۔'' اس نے پیشہ ورانہ انداز میں سمت دکھائی۔ (دو بجے کا مطلب یہی تھا کہ سامنے بڑے پتھر کے دائیں کنارے پر اگر سوئیوں والی گھڑی رکھ دی جائے تو گھنٹے والی سوئی دو پر پہنچ کر جس جانب اشارہ کرے وہ سمت)

میں نے لیو پولڈ سائیٹ میں اس جانب دیکھا، پاک آرمی کی وردی میں چند افراد محتاط انداز میں ایک جانب بڑھتے نظر آئے۔

''مدد کا نشان بڑا پتھر، دس بجے کی لائن، دوسری ٹولی بھی نمودار ہو گئی ہے۔''

ادھر شست پھیرنے پر بھی مجھے دس بارہ فوجی نظر آئے۔ دونوں ٹولیاں علیحدہ علیحدہ اہداف کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ ان کی حرکت سے ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس ہدف پر حملے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ دشمن کے ٹھکانے ہمارے پاس درج تھے۔ دشمن کے چار ٹھکانے ہمیں نظر آ رہے تھے، اگر ایک ترتیب سے بتانا شروع کروں تو پہلا ٹھکانہ شمال کی جانب تھا۔ اسے ہدف اول کہوں تو اس کے ساتھ جنوب کی جانب ہدف دوم اور اسی رخ آگے بڑھتے ہوئے ہدف سوم اور ہدف چہارم۔ پانچواں ہدف ہماری حد سے باہر تھا اور ہماری جگہ سے نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ ہم نے جن دو جتھوں کی مدد اور رہنمائی کرنا تھی ان میں ایک چیتا دَل اور دوسرا طوفان دَل تھا۔ پہلے مرحلے میں چیتا دَل ہدف سوم پر حملہ کر رہا تھا اور طوفان دل نے ہدف اول پر ہلہ بولنا تھا۔

''ایس ایس فار چیتا دَل اوور۔'' میں پہلی ٹولی سے رابطہ کرنے لگا۔

فوراً ہی جواب آ گیا تھا۔ ''چیتا دَل سینڈ یور میسج اوور۔''

''چیتا دَل، دشمن کے دو پہرے دار نظر آ رہے ہیں، جیسے ہی آپ گھیرا مکمل کر لیتے ہیں میں انھیں ناکارہ کر دوں گا اوور۔''

''ایس ایس، کیا ہم انھیں دور سے نظر آ سکتے ہیں اوور۔''

''چیتا دَل، نالہ عبور کرتے ہی تمھیں رینگ کر جانا پڑے گا۔ شمالی جانب چند جھاڑیاں نظر آ رہی ہیں۔ راجر سوفار۔'' میں نے تصدیق چاہی۔

''یس اوور۔'' چیتا دَل نے سمجھ جانے کا عندیہ دے کر مزید پیغام کا تقاضا کیا۔

''تمھاری ٹولی اس جانب آڑ لے کر ہدف کے قریب پہنچ سکتی ہے۔ اپنے تمام افراد کو وہاں اکٹھا کرو جونہی تمام پہنچ جائیں مجھے مطلع کرو اوور۔''

چیتا دَل کے ''راجر۔'' کہنے پر میری بات جاری رہی۔

''تمھارے اکٹھے ہوتے ہی میں پہرے داروں کو ناکارہ کر دوں گا، میرا اشارہ ملتے ہی تم ہدف پر ہلہ بول سکتے ہو اوور۔''

چیتا دَل نے ''راجر۔'' کہا اور میں نے ''آؤٹ۔'' کہہ کر بات ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

سردار بات چیت ختم ہونے کا منتظر تھا۔ ''فاصلہ تیرہ سو پینتالیس میٹر، ہوا پندرہ کلومیٹر فی گھنٹا۔'' اس نے فاصلہ اور ہوا کی رفتا بتائی۔ (سنائپر کو فائر کرنے سے پہلے ہوا کی رفتار معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ ہوا فائر پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر ہوا کی اقسام کی بات کی جائے تو سات کلومیٹر فی گھنٹا چلنے والی ہوا کو ہلکی ہوا کہتے ہیں جو فائر پر خاص

اثر انداز نہیں ہوتی، البتہ سنائپرز اس کا بھی حساب رکھتے ہیں۔ اس کے بعد درمیانی ہوا جس کی رفتار آٹھ سے سولہ کلومیٹر فی گھنٹا، پھر تازہ ہوا سولہ سے چوبیس کلومیٹر فی گھنٹا، تیز ہوا چوبیس سے بتیس کلومیٹر فی گھنٹا اور بہت زیادہ تیز ہوا جو بتیس کلومیٹر فی گھنٹا سے بھی زیادہ ہوتی ہے)

میں ہوا کا فرق نکالنے کو ڈیفلکشن ناب گھمانے لگا۔ اس اثناء میں سردار نے ہدف کی ڈگری معلوم کی، ڈگری سے مراد بلندی سے نشیب کی ڈگری سے ہے۔ چونکہ ہدف ہم سے گہرائی میں تھا اس لیے میں براہ راست رینج نہیں لگا سکتا تھا۔ (اس بارے میں سنائپر ناول میں خاطر خواہ بحث کر چکا ہوں جسے شوق ہو وہاں دیکھ لے) ڈگری کا فرق نکال کر اس نے رینج بتادی۔ میں نے ایلی ویشن ناب پر مطلوبہ کلک لگائے، رائیفل کاک کی اور بٹ کندھے میں پھنسالیا۔

''چیتا دل'' کے افراد نالے کے اٹھے کنارے کی آڑ لے کر جھاڑیوں کے شمالی جھنڈ میں اکٹھا ہو رہے تھے۔ میں نے وائرلیس سیٹ سردار کی طرف بڑھایا۔

''طوفان دل، کی رہنمائی کرو، انھیں کہو ہدف کا گھیراؤ کر کے تین سو میٹر کے دائرے تک سمٹیں اور اس کے بعد منتظر رہیں، جونہی چیتا دل کارروائی کرے گا فائرنگ کی آواز سن کر دشمن ضرور آڑ سے باہر آئیں گے تب وہ انھیں نشانہ بنا سکتے ہیں۔''

سردار دوربین کے ذریعے ہدف اول کا جائزہ لے کر ''طوفان دل'' کی رہنمائی کرنے لگا۔ وہ ہدف لگ بھگ ساڑھے انیس سو میٹر کی دوری پر تھا۔

اسی اثناء میں چیتا دل ہمیں جگہ پر پہنچ جانے کی اطلاع دینے لگا۔

میں سردار کو مخاطب ہوا۔ ''چیتا دل کو کہو اگلے تیس سیکنڈ میں پیش قدمی کو تیار رہے۔''

طوفان دل کو انتظار کرا کر وہ چیتا دل کو میرا پیغام پہنچانے لگا۔ جبکہ میری توجہ پہرے داروں پر تھی۔ اس علاقے میں عام لوگوں کے مکانوں پر بھی مورچے بنے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ مکان یقیناً زیر تعمیر تھا کہ اس کی چھت پر اب تک مورچے نہیں بنے تھے۔ البتہ یہ معلوم نہیں کہ وہ کسی دوسرے کا مکان تھا یا وہ خود ہی تعمیر کر رہے تھے۔ غالب گمان یہی تھا کہ کسی غریب کے مکان پر وہ زبردستی قابض ہوئے تھے۔

مکان کے دروازے پر ایک پہرے دار کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ دوسرا ساتھی اس کی جانب پیٹھ موڑے چند قدم دور کھڑا تھا۔ گو کھڑا ہوا فرد آسان ہدف تھا کہ اس کا مکمل جسم نظر آ رہا تھا، جبکہ بیٹھے ہوئے آدمی کا صرف سر نظر آ رہا تھا باقی جسم کرسی نے چھپا لیا تھا۔ بلاشبہ کرسی، رینج ماسٹر کی گولی کے خلاف آڑ نہیں بن سکتی تھی، لیکن کرسی میں لوہے کی چادر لگی ہوتی تو گولی کی رفتار کو کم کر کے ہدف کے بچاؤ میں مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔ لڑائی کا بنیادی اصول یہی ہے کہ پہلے آسان ہدف کو نشانہ بناؤ تاکہ یقینی کامیابی حاصل ہو۔ لیکن میں آسان ہدف کو پہلے نشانہ بناتا تو کرسی پر بیٹھا ہوا شخص چوکنا ہو جاتا کیوں کہ اس کا رخ اپنے ساتھی کی طرف تھا۔ اس کے برعکس، کھڑے ہوئے آدمی کی ساتھی کی جانب پیٹھ تھی۔ اس کے چوکنا ہونے تک میں اسے بھی شکار کر سکتا تھا۔

میں نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں کی تھی کہ سنائپر یہ فیصلہ سیکنڈ کے دسویں حصے میں کر چکا ہوتا ہے۔ کرسی پر بیٹھے دشمن کے سر پر نشانہ سادھ کر میں نے سانس روکا اور لبلبی دبا دی۔

عمدہ سائیلنسر کی بدولت صرف۔ ''ٹھک'' کی آواز ابھری .....اور گولی نے اس کے سر کا بالائی حصہ اڑا دیا تھا۔ وہ منہ کے بل گرا۔ میں نتیجہ دیکھنے کو نہیں رکا تھا۔ رائیفل کو دوبارہ کاک کر کے میں نے کھڑے ہوئے شخص پر شست لی۔ ساتھی کے گرنے پر اس نے مڑ کر دیکھا، لمحہ بھر کو وہ سن ہو گیا تھا۔ اور اتنا وقت مجھے کافی تھا۔ دوسری ''ٹھک'' نے اسے

بھی لڑھکا دیا تھا۔ ہمیشہ پہلی گولی چلاتے ہوئے سنائپر متزلزل رہتا ہے، پہلی گولی کے نشانے پر لگتے ہی باقی گولیاں ہدف پر مارنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ کیوں کہ یوں اس کا حوصلہ بڑھنے کے ساتھ اپنے حساب کتاب کی درستی کا یقین بھی ہو جاتا ہے۔ حساب کتاب سے میری مراد ہوا کی رفتار اور ہدف کا فاصلہ جانچ کر درست رینج لگانے سے ہے۔

طوفان دَل کی رہنمائی کر کے سردار اس جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ پہرے داروں کے لڑھکتے ہی اس نے چیتا دَل کو اطلاع پہنچا دی تھی۔

تربیت یافتہ سپاہیوں نے پیشہ ورانہ مہارت سے حرکت شروع کر دی۔ اچانک ایک شخص چھت پر نمودار ہوا۔ اس نے ہاتھ میں موبائل فون پکڑا ہوا تھا۔ شاید موبائل فون کے سگنل کی تلاش اسے چھت پر لے آئی تھی۔ وہ چیتا دَل کے افراد کو دیکھ لیتا تو شور مچا کر اپنے ساتھیوں کو چوکنا کر سکتا تھا۔

''خطرہ۔'' سردار نے اسے دیکھتے ہی نعرہ بلند کیا، لیکن اس سے پہلے ہی میں رینج ماسٹر کے خوفناک دہانے کو اس جانب موڑ چکا تھا۔ اس کی نگاہیں موبائل سکرین پر جمی تھیں، جونہی وہ چھت کے درمیان میں پہنچا میری انگلی نے لبلبی کو پیچھے کھینچ لیا، اس کا رخ میری جانب تھا تبھی طاقت ور گولی نے اسے پیٹھ کے بل نیچے گرا دیا تھا۔

چیتا دَل کے ''دو الفا'' یعنی چار چار آدمیوں کی دو ٹولیاں داخلی دروازے پر پہنچ گئی تھیں، جبکہ باقی نے مکان کو باہر سے گھیر لیا تھا۔ دروازے پر لمحہ بھر ٹھہر کر وہ مخصوص انداز میں مکان میں گھس کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، لیکن اس دوران فائرنگ کی آواز ہمیں سنائی دینے لگی۔ میرے خیال میں چیتا دَل کے حالات قابو میں تھے۔

''فاصلہ بتاؤ۔'' طوفان دَل کی جانب رخ موڑتے ہوئے میں سردار کو مخاطب ہوا۔

میرے کہنے سے پہلے ہی اس نے لیزر رینج فائینڈر کو آنکھوں سے لگا لیا تھا۔ فاصلہ ناپ کر اس نے اونچائی کا فرق نکالا۔ ''ساڑھے اٹھارہ سو میٹر، ہوا کی رفتار وہی ہے۔''

میں نے ایلی ویشن ناب کو مطلوبہ مقدار میں گھمایا اور ڈیفلیکشن ناب کو چھیڑے بغیر ہدف کی جانب متوجہ ہو گیا۔ کافی دور سے بھی فائرنگ کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ یقیناً باقی ٹولیوں نے بھی کارروائی شروع کر دی تھی۔

طوفان دَل کا ہدف زیادہ مشکل نظر آ رہا تھا کیوں کہ مکان کے دو کونوں پر مضبوط مورچے بنے تھے۔ ایک مورچے کا دروازہ ہماری نظر سے اوجھل تھا، اس کا صرف گول موکھا نظر آ رہا تھا جہاں سے نگرانی یا فائرنگ کی جا سکتی تھی۔ البتہ دوسرے مورچے کا دروازہ ہمارے سامنے تھا۔ مورچوں سے باہر ایک آدمی دوربین تھامے فائرنگ کی جانب دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسرا عقب میں کھڑا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ وزیرستان میں گھر عموماً یوں بنائے جاتے ہیں کہ مکان کی دیواریں کمروں سے کافی بلند ہوتی ہیں۔ کمروں کی زیادہ سے زیادہ اونچائی نو دس فٹ ہوتی ہے جبکہ بیرونی دیواریں بیس بیس فٹ اونچی ہوتی ہیں۔ اور ساری تعمیر کچی مٹی سے کی جاتی ہے۔ دیواروں کی موٹائی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ چھوٹے ہتھیار تو کجا، راکٹ لانچر کا گولہ بھی دیوار سے نہیں گزر سکتا۔ مگر وہ عمارت اس کے برعکس تھی کیوں کہ چھت پر کھڑے دونوں افراد مکمل نظر آ رہے تھے۔ اس کا ایک ہی سبب ہو سکتا تھا کہ عمارت میں یا تو دو منزلہ کمرے بنے تھے یا پھر کمروں اور عمارت کی دیواروں کی بلندی یکساں تھی۔

گو اکا دکا فائر ہونا وہاں کی روزمرہ ہے اور کوئی اس کی سن گن بھی نہیں لیتا، لیکن بارش کی طرح موسلا دھار فائرنگ ہر کسی کو متوجہ کر سکتی تھی۔ وہ دونوں بھی تیز فائرنگ کا جائزہ لینے کو چھت پر چڑھے تھے۔ قضا یونہی انسان کو ورغلا کر اس مقام تک لے جاتی ہے جہاں اس نے روح کی امانت سیدنا عزرائیلؑ کو واپس کرنا ہوتی ہے۔

میں نے پہلے عقبی شخص پر شست سادھی، لبلبی دباتے ہی وہ پہلو کے بل گرا، آواز سن کر دوربین والے نے مڑ کر

دیکھا۔ اور بجلی کی سی سرعت سے اوندھے منہ گر کر صحن کی جانب رینگنے لگا۔ اگر میں اونچائی پر نہ ہوتا تو اس کی تدبیر کارگر ہو سکتی تھی، لیکن اس کی بدقسمتی کہ لیٹنے کے بعد بھی وہ میری نظر سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ انگلی کے دباؤ نے لبلبی کو پیچھے دھکیلا اور اس کے آگے بڑھنے کی حرکت کو پھڑکنے میں تبدیل کر دیا۔

سردار نے مجھے مطلع کیا۔ ''مغربی مورچے میں کوئی موجود ہے اور فائر کر رہا ہے۔''

رینج ماسٹر کی میگزین میں پانچ گولیوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ ایک میگزین میں خالی کر چکا تھا۔ نئی میگزین لگا کر میں نے موکھے پر شست سادھی، فائرنگ کی آواز تواتر دگرد ہونے والی آواز میں ضم ہو گئی تھی، لیکن مسلسل گولیوں کے چلنے سے پکی دیوار سے ہلکی سی گرد اٹھ رہی تھی جس نے سردار کے مشاہدے کی تصدیق کر دی تھی۔ موکھے سے اس کا ہیولہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ فائر کرتے ہوئے فائرر نے ماتھا بٹ پر ٹیکا ہوتا ہے۔ اور رائفل کی نال سے بٹ تک ایسے ہی پہنچا جا سکتا ہے جیسے ہاتھ پکڑنے والا باقی جسم تک رسائی پا لیتا ہے۔

رائفل کی نال بھی میری نگاہ سے اوجھل تھی لیکن عموماً فائرر جب موکھے سے فائر کر رہا ہو تو اس نے بیرل کو دیوار پر ٹیکا ہوتا ہے، گویا موکھے کا نچلا کنارا استعمال میں لا رہا ہوتا ہے۔ میں نے موکھے کے نچلے کنارے سے چار انچ اوپر شست لی اور لبلبی دبا دی۔

اسی وقت دو آدمی آگے پیچھے چھت پر چڑھے، دونوں نے ہاتھ میں ہتھیار تھامے تھے۔ وہ بھاگ کر مشرقی مورچے کی طرف بڑھے، سردار نے چیخ کر مجھے مطلع کیا، لیکن میں اس سے پہلے ہی آگے والے پر نشانہ سادھ چکا تھا۔ ہمیشہ حرکتی ہدف پر فائر کرتے ہوئے لیڈ لینا پڑتی ہے یعنی حرکتی ہدف پر براہ راست نشانہ سادھنے کے بجائے اس کے جانے کی سمت مخصوص فاصلے پر شست لینا پڑتی ہے اور یہ لیڈ بھی باقاعدہ حساب کتاب سے لی جاتی ہے۔ لیکن اس کی ضرورت تب پیش آتی ہے جب ہدف دائیں سے بائیں یا بائیں سے دائیں جا رہا ہو، اگر ہدف سامنے سے ہماری طرف آ رہا ہو یا پیچھے جا رہا ہو تو لیڈ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ البتہ بہت زیادہ تیزی سے حرکت کرنے والے ہدف کا فاصلہ کم یا زیادہ ہو سکتا ہے۔ اور ایسا صرف اس وقت ہو گا جب ہدف ہیلی یا ہوائی جہاز ہو۔ کوئی انسان اتنا تیز رفتاری سے حرکت نہیں کر سکتا کہ اس کی وجہ سے رینج میں تبدیلی کرنا پڑے۔

میرا ہدف بھی مخالف سمت کو بھاگ رہا تھا، گویا فاصلہ بڑھ رہا تھا لیکن لیڈ لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے آگے والے کے سر کے بجائے کندھوں کے درمیان نشانہ سادھا کہ حرکتی ہدف کو نشانہ بناتے وقت احتیاط لازمی تھی۔ لبلبی دباتے ہی وہ اوندھے منہ نیچے گرا تھا، اس کا ساتھی ٹھٹک کر رکا اور بدحواسی میں مڑ کر واپس بھاگا لیکن دو سے زیادہ قدم اٹھانے کی مہلت اسے رینج ماسٹر کی گولی نے نہیں دی تھی۔

سردار تحسین آمیز انداز میں بولا۔ ''تمھارا فائر دیکھ کر لگتا ہے ہمیں مزید تربیت کی ضرورت ہے۔''

میں طنزیہ لہجے میں بولا، ''لی زونا سے فرصت ملے گی تو تربیت پر توجہ دو گے نا؟''

وہ برا مناتے ہوئے بولا۔ ''اس کا نام مریم ہے۔''

میں اطمینان سے بولا ''نام سے کوئی فرق نہیں پڑتا، مصرف اس کا تمھیں کام سے نکالنا ہے۔''

وہ وائرلیس سیٹ پر طوفان دل کو چھت کے بارے اطمینان دلانے لگا۔ میں نے رائفل کا رخ پہلے ٹھکانے کی جانب موڑا، جہاں چیا دل کے ''دو الفا'' ہدف کے علاقے میں گھسے تھے۔ (عمارتی علاقے کی لڑائی میں چار آدمیوں کی ٹولی کو ایک الفا'' پکارتے ہیں۔ ہر کمرے کی صفائی کو ایک الفا مقرر کیا جاتا ہے اور انھیں ون الفا، ٹو الفا، تھری الفا وغیرہ کا نام دیا جاتا ہے) لیکن اس سے پہلے ہی میری نظر ہدف دوم پر پڑی جو ہدف اول اور ہدف سوم کے قریباً درمیان میں واقع

تھا۔ وہاں سے دس بارہ افراد تیزی سے طوفان دَل کی طرف بڑھتے نظر آئے۔ یقیناً ساتھیوں نے مخابرے پر انھیں چھاپے کی اطلاع دی تھی اور اب وہ اپنے ساتھیوں کی مدد کو جا رہے تھے۔

''سردار! ہدف اول کی مدد کو جنوب کی طرف سے کچھ افراد روانہ ہیں، فاصلہ ناپ کر طوفان دَل کو باخبر کرو۔''

وہ وائرلیس پر شروع تھا۔ طوفان دَل کو جنوبی جانب سے دہشت گردوں کی مداخلت سے مطلع کر کے اس نے لیزر رینج فائینڈر اٹھالیا۔ فاصلہ ناپ کر اس نے حساب لگایا اور بولا۔

''سترہ سو پینتیس، ہوا کی رفتار تین کلومیٹر فی گھنٹا۔''

ہوا کا رکنا مجھے بھی محسوس ہو گیا تھا۔ میں نے ڈیفلیکشن ناب کو صفر پر گھمایا اور ایلیویشن کے مطلوبہ کلک لگا دیے۔ دہشت گرد ہمارے متوازی چل رہے تھے، اس لیے لیڈ لینا ضروری تھا۔ لیڈ لینے کو ہدف کی رفتار، ہتھیار سے فاصلہ، اور حجم جاننا ضروری ہوتا ہے۔ اور یہ فارمولہ گاڑیوں، ہیلی کاپٹروں یا جہازوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ انسانی ہدف کی کوئی مقرر رفتار نہیں ہوتی۔ اور لیڈ لینے کو سنائپر کا اندازہ ہی حتمی ہوتا ہے۔ میں نے سب سے پیچھے والے شخص پر نشانہ سادھا، اس کا بایاں بازو میری جانب تھا اگر وہ میری طرف یا میرے مخالف جا رہا ہوتا تو چھاتی و پیٹھ کی وجہ سے مجھے زیادہ ہدف ملتا۔ ترچھا ہونے کی وجہ سے ہدف بھی سکڑ گیا تھا اور وہ مسلسل حرکت میں بھی تھا۔ لیکن یہ صورت حال میرے لیے نئی تھی نہ انوکھی۔ اس کے سر پر شست لے کر میں نے رائیفل کی نال کو اس کی حرکت کی سمت مخصوص لیڈ دی اور لبلبی دبا دی۔ گولی کا درمیانی فاصلہ طے کر کے وہاں پہنچنا اور ہدف کا قدم ڈیڑھ لینا ایک ساتھ ہوا تھا۔ رینج ماسٹر کی طاقت ور گولی نے اسے مخالف سمت میں اچھال دیا تھا۔ اس سے دو قدم آگے دوڑنے والے کو یقیناً اس کے گرنے نے متوجہ کیا تھا۔ ایک فر درک کر پیچھے مڑا، اس کی بدقسمتی کہ چوڑا ہدف مہیا کرنے کے ساتھ وہ ایک لحظے کو ساکن بھی ہوا تھا۔ میں پہلے سے رائیفل کاک کر کے فائر کو تیار تھا۔ جب تک اس کی سمجھ میں ساتھی کا گرنا آتا، رینج ماسٹر کی گولی نے اسے ساتھی کے پاس پہنچا دیا تھا۔

دوسری میگزین بھی خالی ہو گئی تھی۔ سرعت سے میگزین اتار کر میں نے نئی میگزین چڑھائی جو سردار نے تیاری حالت میں میرے قریب رکھ چھوڑی تھی۔ اور اگلے شکار پر نشانہ سادھ لیا۔ مسلسل تین بار لبلبی دبا کر میں نے مزید تین کو جہنم کا راستہ دکھایا..... پانچویں شخص کے گرتے ہی بھاگنے والوں کو خطرے کا پتا چلا۔ ایک شخص نے چیخ کر سب کو مطلع کیا۔ اس کا واویلا سننے تمام رک کر اس کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔ یہ سنہری موقع تھا، میگزین کی آخری دو گولیاں چلا کر میں نے موقع ضائع نہیں جانے دیا تھا۔ نئی میگزین لگانے تک وہ سراسیمہ ہو کر آڑ کی تلاش میں بکھر گئے تھے۔ چار افراد خوش قسمت تھے کہ انھیں بڑے پتھروں کی آڑ مل گئی تھی، دو آدمیوں کو مناسب آڑ نہیں ملی تھی۔ ایک ذرا سی ابھری ہوئی زمین کے پیچھے لیٹ گیا اور دوسرا تیز رفتاری سے سو قدم دور پڑی چٹان کی طرف بھاگ پڑا۔ میں نے پہلے بھاگنے والے کو تاڑا تھا کہ چٹان کی آڑ لے کر وہ محفوظ ہو جاتا۔ اس کی پیٹھ میری جانب تھی تیز رفتاری سے بھاگتے ہوئے چونکہ اس کا فاصلہ مسلسل بڑھ رہا تھا اس لیے میں نے رائیفل کی نال کو ذرا سا بلند کر دیا تھا۔

وہ زندگی بچانے کی دوڑ تھی تبھی اس کی رفتار کافی تیز تھی۔ لیکن جب سانس پورے ہو جائیں، موت کا فرشتہ مالک ارض و سماء سے روح قبض کرنے کا حکم وصول کر لے تب، ساری تیزی طراری، چستی چالاکی اور کوشش دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ وہ بھی پتھر سے چند قدم دور تھا جب رینج ماسٹر کی گولی اس کی پشت میں گھس کر چھاتی پھاڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔ وہ اوندھے منہ گرا تھا۔ میں نے فوراً نال کو اس آدمی کی جانب موڑا جسے آڑ نہیں ملی تھی۔ اپنے بھاگتے ساتھی کو نشانہ بنتے دیکھ کر یقیناً وہ دل ہی دل میں خود کو داد دے رہا ہوگا کہ اس نے لیٹ کر عقل مندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن لیٹ کر اس نے میرا کام اور آسان کر دیا تھا۔ اس کی غلط فہمی تو اگلے لمحے ہوا ہو گئی تھی مگر بے چارے کو پچھتانے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ نہ وہ مستقبل

میں غلطی سدھارنے کے قابل رہا تھا۔

اب پتھروں کے عقب میں چار آدمی چھپے تھے، اپنے ساتھیوں کو نشانہ بنتے دیکھ کر وہ بالکل ہی دبک گئے تھے، البتہ ان کے ہتھیاروں نے آگ اگلنا شروع کر دی تھی۔ ہتھیاروں کا رخ اسی ٹیکری کی طرف تھا جہاں ہم چھپے تھے، مگر ہم کلاشن کوف کی رینج سے باہر تھے۔ وہ بس ہمیں۔ ''لخ..... لخ۔'' ہی سنا سکتے تھے۔ ان کی فائرنگ بھونکنے والے کتے کی مثل تھی جو کاٹنا نہ جانتا ہو۔

سردار نے مجھے مطلع کیا۔ ''چیتا دل اور طوفان دل نے اپنے اہداف پر قبضہ جما لیا ہے۔'' اسے چند لمحے پہلے ہی ''سب اچھا'' کی رپورٹ مل گئی تھی لیکن مجھے یکسوئی مہیا کرنے کو وہ خاموش رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''طوفان دل کو ان چار افراد کے بارے بتا دو۔''

وہ طوفان دل کو باخبر کرنے لگا، میں دہشت گردوں کے چوتھے ٹھکانے یعنی ہدف چہارم کا جائزہ لینے لگا۔ وہ بھی نسبتاً ہموار جگہ پر ایک قلعہ نما عمارت تھی، دیواریں اتنی بلند تھیں کہ اونچائی سے بھی صحن نظر نہیں آ رہا تھا۔ عمارت کے شمال مغربی اور جنوب مشرقی کونے میں مورچے بنے تھے۔ مکان کی چھتیں مقامی رواج کے مطابق دیواروں سے اتنی نیچی تھیں کہ چھت پر کھڑا کوئی آدمی نظر نہیں آ سکتا تھا۔ لیکن چھت پر چڑھ کر وہ محفوظ تھے تو یہ نقصان بھی تھا کہ وہاں سے وہ علاقے کا جائزہ بھی نہیں لے سکتے تھے۔ اس مقصد کو وہ مورچے استعمال کر سکتے تھے۔ مورچوں کے موکھے مکان کی دیوار سے فٹ بھر اونچے بنے تھے۔ باقی مورچہ دیوار سے نیچے تھا۔ ہر مورچہ دو جانب کی نگرانی کو بنایا گیا تھا اس لیے جنوب مشرقی مورچے کی جنوبی اور شرقی دیوار میں دیکھ بھال اور فائرنگ کو موکھا بنا تھا جبکہ شمال مغربی مورچے کی شمالی اور غربی دیوار میں موکھا بنا تھا۔ جنوبی مغربی مورچے کا دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ مورچوں میں داخلی رستہ نیچے سے بنا تھا۔ چند سو میٹر پر ہونے والی موسلا دھار فائرنگ سننے کے بعد، بعید تھا کہ وہ جائزہ لینے کی کوشش نہ کرتے۔

شمال مغربی مورچے کا شمالی موکھا تو میری نظر سے اوجھل تھا لیکن وہاں دیوار سے آگے بڑھا ہوا ایک شخص کا سر نظر آ رہا تھا۔ یقیناً وہ سر باہر نکال کر اچھی طرح جائزہ لینے کی کوشش میں تھا۔ میرے جیسے سنائپر کو ایسا موقع گنوانا گناہ کرنے کے مترادف تھا۔ سردار بھی دوربین سے ادھر ہی متوجہ تھا، سر دیکھتے ہی ''لیزر رینج فائینڈر'' اٹھایا اور فاصلہ وغیرہ ناپ کر اعلان کیا۔ ''سترہ سو پندرہ، ہوا ساکن۔''

ایلیویشن ڈرم کو سرعت سے گھما کر میں نے مطلوبہ رینج لگائی، اگلے ہی لمحے مورچے سے باہر نکلا ہوا سر غائب ہو گیا، مگر بے چارہ سلامت سر واپس نہیں لے جا سکتا تھا۔ رینج ماسٹر کی سنگ دل گولی آدھا سر تو ساتھ لے جاتی ہے۔

سردار نے پوچھا۔ ''اس ٹھکانے والے اپنے ساتھیوں کی مدد کو نہیں نکلے۔ کیا انھیں معلوم ہو گیا ہے کہ ٹھکانہ چھوڑنا انھیں ابدی نیند سلا دے گا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بھول گئے، مغربی جانب کمانڈر عدیل جان اور سردار فیروز خان کا لشکر موجود ہے۔ پہلے تینوں ٹھکانے کسی ایک کمانڈر کے تھے اور لازماً ان کا آپس میں رابطہ ہوگا، اس عمارت میں دوسرے کمانڈر کے لشکری ہیں تبھی انھیں صورت حال معلوم نہیں ہے۔ امید ہے پانچواں ٹھکانہ جو ہماری ذمہ داری میں، لیکن رینج سے باہر ہے وہاں بھی دوسرے کمانڈر کے لشکری ہوں گے۔''

سردار نے تجزیہ کیا۔ ''میرا خیال ہے، مغرب کی جانب موجود دہشت گردوں میں سب سے شمال میں گل بدین کے لشکری تھے جنھیں ہم پہلے ہی دن کافی نقصان پہنچا چکے ہیں، درمیان میں کمانڈر عدیل جان کے لشکری ہیں اور ان سے مزید دائیں یعنی جنوب کی سمت کمانڈر فیروز خان کے آدمی ہوں گے۔ فیروز خان کا پہلا آدمی بھی راجے کا شکار ہو چکا ہے امید

ہے غصے میں آکر وہ مزید مواقع دیں گے۔"

میں معترض ہوا۔"گل بدین کے آدمیوں سے تو ہمارا ٹاکرا ہو چکا ہے۔ یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ ان سے متصل کمانڈر عدیل جان کے بندے ہیں۔"

وہ تیقن سے بولا۔"کیوں اپنے آدمی کے زخمی ہونے پر گل بدین کے آدمیوں نے کمانڈر عدیل جان ہی سے مدد مانگی تھی اور ایسی حالت میں قریب کے آدمیوں ہی کو آواز دی جاتی ہے۔"

میں نے اور نقطہ اٹھایا۔"ہوسکتا ہے ان سے متصل تو کمانڈر فیروز کے لشکری ہوں لیکن گل بدین کے دست راست قلات خان کے کمانڈر عدیل جان سے اچھے تعلقات ہوں تب اس سے مدد مانگی ہو۔"

اس نے منہ بنایا۔"یہ تو مانتے ہو ناں پہلے والے تینوں اہداف کسی ایک کمانڈر کے اور آخری دو دوسرے کمانڈر کے ہیں۔"

میں نے استہزائی انداز میں کہا۔"خان صاحب! یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔"

وہ چڑ چڑا کر بولا۔"اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کون سے ٹھکانے کس کمانڈر کے ہیں۔ ہماری نظر میں تمام یکساں طور پر وطن دشمن اور واجب القتل ہیں۔"

"مرحوم مشتاق احمد یوسفی نے کہا تھا کہ:[بندہ جب ایک بار پروفیسر بن جائے تو ساری زندگی پروفیسر ہی رہتا ہے، چاہے بعد میں ہوش مندی کی باتیں کیوں نہ کرنے لگے] تم بھی خان ہو تو خان ہی رہو، عقل مندی کی باتیں کرتے ہوئے کبھی کبھی تکا لگ جاتا ہے تو تمھارے پٹھان ہونے پر شک ہونے لگتا ہے۔"

وہ فخریہ لہجے میں بولا۔"پٹھانوں کی بہادری، دلیری اور جواں مردی کے کارناموں سے تاریخ کے ہزاروں صفحات روشن ہیں۔"

میں نے قہقہہ لگایا۔"کردی ناں پٹھانوں والی بات، زیر بحث موضوع سمجھ داری و عقل مندی ہے اور تم دلیل دے رہے ہو بہادری و دلیری کی۔"

سردار نے کہا۔"مورچے کے مغربی موکھے سے فائر ہو رہا ہے، آواز سے لگ رہا ہے چائنہ ایل ایم جی ہے۔" سنائپر کو فائر کی آواز سے ہتھیار کی قسم پہچاننا اتنا بھی مشکل نہیں ہے۔ ہر ہتھیار کے فائر کی آواز مختلف ہوتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کار، موٹر سائیکل، ٹرک وغیرہ کو دیکھے بغیر ایک ڈرائیور اندازہ کر سکتا ہے کہ کون سی گاڑی کے انجن کی آواز ہے۔

چائنہ ایل جی کی رینج کلاشن کوف سے زیادہ سہی لیکن ہم اس کی کارگر رینج سے باہر تھے۔ البتہ مورچے کا چوڑا موکھا اس کے لیے وبال جان ضرور تھا۔ اندازے سے فائر کی جگہ کا تعین کرتے ہوئے میں نے لبلبی دبائی، فوراً ہی فائرنگ رک گئی تھی۔ ایک بات قارئین اچھے سے جان لیں کہ جب میں فائر کے بارے اپنے اندازے کی بات کرتا ہوں تو اس کا مطلب ایک سنائپر کا اندازہ ہوتا ہے جسے تکا یا اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ اور یہ اندازہ مجھے کڑی تربیت اور عملی زندگی میں فائر کے مسلسل تجربے سے حاصل ہوا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے کے ماہر کا اپنے فن کے بارے اندازہ لگانا اس کے تجربات کا نچوڑ اور مہارت کا حاصل ہوتا ہے۔ اسے عام آدمی کے اندازے کے مماثل کرنا اہل فن کے ساتھ نری زیادتی ہی کہلائی جا سکتی ہے۔

سردار طوفان دل کی رہنمائی کر رہا تھا۔ جن کی آدھی ٹولی تو اپنے ہدف کے علاقے میں مصروف تھی اور بقیہ افراد چھپے ہوئے چار دہشت گردوں کی سرکوبی کو آ رہے تھے۔ ایک سنائپر اتنی آسانی سے اپنے ہدف کا پیچھا نہیں چھوڑتا، مگر ان کی خوش قسمتی کہ مجھے بہت سے اہداف کا سامنا تھا اور مسلسل ایک ہدف کی تاک میں بیٹھنا ممکن نہیں تھا۔

دو آدمی ایک ہی مورچے میں بلیدان دے چکے تھے، شاید مزید موقع مجھے نہ دیتے، میں نے چیتا دَل کے ہدف کا سرسری سا جائزہ لیا، وہاں حالات قابو میں نظر آئے۔ ہدف کی صفائی کر کے انھوں نے ہدف چہارم کی طرف ہی بڑھنا تھا۔

''سردار! چیتا دَل کو تیزی کا کہو۔'' اسے کہہ کر میں ان چاروں کی غلطی ڈھونڈنے لگا جو اب تک پتھروں کے عقب میں چھپے تھے۔ طوفان دَل جتھے کے چھے افراد آدھے چاند کی شکل میں محتاط انداز میں چلتے ہوئے اس جانب بڑھ رہے تھے۔ ان کے اور دشمن کے درمیان اٹھی ہوئی زمین تھی جس کی وجہ سے دونوں ٹولیاں ایک دوسرے کی نظر سے اوجھل تھیں۔ چاروں دہشت گرد اس لحاظ سے نقصان میں تھے کہ طوفان دَل کی آمد سے بے خبر تھے۔ اور ان کے سر پر سناپر بھی مسلط تھے۔ جبکہ پاک آرمی کے جوانوں کو معلوم تھا کہ ان کا سامنا دہشت گردوں سے ہونے والا ہے۔

چیتا دَل ہدف چہارم کی سرکوبی کو روانہ ہو گیا تھا۔ انھیں احتیاط سے آگے بڑھنے کا کہہ کر سردار نے ایک مخصوص چٹان کی نشان دہی کی جہاں رک کر انھیں ہماری اگلی ہدایت کا انتظار کرنا تھا۔ اور پھر طوفان دَل کی ٹولی کو ہدایت دینے لگا۔ ابھری ہوئی زمین کے قریب پہنچتے ہی طوفان دَل کے جوان رینگتے ہوئے بلندی پر پہنچے، اب دشمن ان سے سو ڈیڑھ سو قدم کے فاصلے پر تھا۔ اپنے اپنے ہدف کا چناؤ کر کے انھوں نے ایک ساتھ فائر کھولا، لیکن ناہموار زمین کی وجہ سے ان کے فائر سے صرف دو دہشت گرد ہی نشانہ بنے تھے بقیہ دو جلدی سے پتھروں کے جنوبی جانب کھسک گئے، نامعلوم انھیں میں بھول گیا تھا یا سر پر اچانک پڑنے والی افتاد سے حواس باختہ ہو گئے تھے۔ مزید دو گولیاں خرچ کر کے میں نے انھیں تمام فکروں اور اندیشوں سے چھٹکارا دلا دیا تھا۔

''ایس ایس فار طوفان دَل! ہدف تباہ، آؤٹ۔'' سردار انھیں دہشت گردوں کی ہلاکت سے مطلع کر کے چیتا دَل کو پکارنے لگا جو مطلوبہ چٹان کے پاس پہنچنے والے تھے۔

''ایس ایس فار چیتا دَل! عمارت کے دروازے پر ایل ایم جی مقرر کرو، دہشت گرد وہاں سے باہر آ کر تمھارے خلاف کارگر فائر کر سکتے ہیں اوور۔''

''راجر۔'' چیتا دَل نے سمجھنے کا عندیہ دیا۔

''مورچوں میں داخلے کا رستہ ہماری نظر سے اوجھل ہے۔ اس لیے جنوبی مورچے سے محتاط رہو، اوور۔'' سردار نے اگلی ہدایت دی۔

''راجر۔'' لگا بندھا جواب آیا۔

''عمارت کے سامنے والے نالے کی آڑ لے کر ایک ایل ایم جی گروپ کو عمارت کے جنوب میں بھیجو جو آڑ میں رہ کر جنوبی مورچے کے موکھوں پر نظر رکھ سکے، اوور۔'' سردار کسی کہنہ مشق کمان دار کی طرح چھاپے کی ترتیب بتا رہا تھا۔

''راجر!'' چیتا دَل نے جواب میں دیر نہیں کی تھی۔

''شمال مغربی مورچہ ہمارے قابو میں ہے، ''ایک الفا'' محتاط انداز میں شمالی دیوار کے قریب بھیجو، اوور۔'' چیتا دَل کا ''راجر!'' سن کر اس کی بات جاری رہی۔

''ایک دستی بم شمالی یا مغربی موکھے سے اندر پھینکو، اور چند دستی بم عمارت کے صحن میں اچھال دو تا کہ دشمن کمروں میں گھسنے پر مجبور ہو جائے، اوور۔''

چیتا دَل نے ''راجر!'' کا وظیفہ دہرایا۔

''ایک الفا، محتاط انداز میں عمارت کے داخلی دروازے پر جا کر جنوب مشرقی مورچے کے موکھے سے دستی بم اندر پھینکنے کی کوشش کرے اور شمالی دیوار کے ساتھ موجود الفا غربی جانب سے دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو، آؤٹ۔''

سردار کے ہدایت دینے کے دوران میری نظریں مغربی موکھے پر گڑی رہیں۔ اتنی دور سے کوئی حرکت یا ہیولہ نظر آنا ممکن نہیں تھا۔ اگر رات کا وقت ہوتا ہے اور مورچے میں روشنی ہوتی تو تب یہ امید کی جاسکتی تھی۔ اپنی سپاہ کی حفاظت کو ایک دو گولیاں ضائع کرنا میری مجبوری بن گئی تھی۔ جونہی ''ایک الفا'' (چار آدمیوں کی ٹولی) محتاط انداز میں شمالی دیوار کی طرف بڑھا، میں نے غربی موکھے سے ایک گولی مورچے کے اندر داغ دی۔ اگر مورچے میں کوئی موجود ہوتا اور گولی سے بچ بھی جاتا، تب بھی رینج ماسٹر کی تباہ کن گولی دیوار سے ٹکرا کر اسے اتنا دہشت زدہ کر دیتی کہ وہ نیچے بیٹھنے پر مجبور ہو جاتا۔

میں نے ایک گولی پر اکتفا نہیں کیا تھا، دو تین لمحے ٹھہر کر ایک اور گولی داغ دی۔

''الحمد اللہ اب میں تصور صاحب کو چغلی کر سکتا ہوں کہ راجے نے یکے بعد دیگرے رینج ماسٹر کی دو گولیاں ضائع کی ہیں۔''

''وہ وجہ نہیں پوچھیں گے۔''

''چغلی فرد کی غیر حاضری میں کی جاتی ہے تو وضاحت مجھے ہی کرنا پڑے گی۔ اور چغل خور کی وضاحت سے اللہ پاک امان دے۔'' میرا قہقہہ نکل گیا تھا۔

''فی الحال ہنس لو راجے صاحب! جب تصور صاحب کا بے عزتی بھرا وعظ سنو گے تو لگ پتا جائے گا۔''

میں فلسفیانہ لہجے میں بولا۔ ''کبھی کبھی ہدف کو نہ چھونے والی گولی وہ کام کر جاتی ہے جو ہدف سے ٹکرانے والی گولی کی قسمت میں نہیں لکھا ہوتا۔''

''جب تک تم ان فلسفوں کی وضاحت کرو گے میں یونٹ میں تمھاری بے عزتی کی تشہیر کر چکا ہوں گا۔ مطلب میں تصور صاحب کی گفتگو ریکارڈ کر کے تمام احباب کو تسلی سے سنواؤں گا۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔ ''اور جانتے ہو ناں تصور صاحب نے کیا کہنا ہے یا میں بتا دوں۔'' لمحہ بھر توقف کے بعد اس نے تصور صاحب کے انداز میں فکر مندی ظاہر کی۔ ''ناک کٹوا دی ہے بے شرم نے، میں زیر تربیت جوانوں کو اس کی مثالیں دیتا ہوں اور یہ بے غیرت دو بیوں کی ناز برداریوں میں تربیت سے توجہ ہٹا کر نکما ہو گیا ہے۔ رینج ماسٹر کی دو گولیاں کمینے نے عملی زندگی میں ضائع کر دیں۔ اس سے بہتر تھا تیسری گولی اپنے سر میں مار کر غیرت کی موت مر جاتا۔''

میری مثالیں دینے والی بات سردار نے برحق کہی تھی۔ مجھے خود بھی تصور صاحب کی زبانی یہ سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ جب زیر تربیت سنائپرز کے سامنے انھوں نے کہا تھا۔ ''گولی چلاتے ہوئے ہمیشہ، برخوردار ذیشان کی طرح سوچ سمجھ کر لبلبی دبایا کرو.....''

تصور صاحب کی بات کو من چاہا مطلب دے کر سردار نے احباب کی محفل میں بیٹھ کر یہ موشگافی کی تھی کہ..... ''ہم راجے کی طرح کیسے سوچ سکتے ہیں، وہ تیسری کا سوچ رہا ہے اور ہم بہ مشکل پہلی کو بھگتا رہے ہیں۔''

کہیں ہانکتے ہوئے بھی ہماری نظریں ہدف پر گڑی تھیں۔ چیتا ڈل ٹولی سے دو افراد انھوں نے عمارت کے داخلی دوازے سے پچاس ساٹھ قدم دور ایک بڑے پتھر کی آڑ میں بٹھا دیے تھے۔ ان کے پاس ایل ایم جی موجود تھی۔ دو افراد ایل ایم جی کے ہمراہ نالے میں اتر کر کھڑے کناروں کی آڑ لے کر جنوبی جانب پہنچ گئے تھے۔ شمالی دیوار کے ساتھ ایک الفا پہنچ کر دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑا تھا۔ جبکہ دوسرا الفا پتھر کی چٹان کے پیچھے تیاری حالت میں اپنی باری کا منتظر تھا۔

شمالی دیوار کے ساتھ موجود الفا کے پہلے آدمی نے اپنی کلاشن کی نال مورچے کے موکھے کی طرف کر کے سیکنڈ بھر کے وقفے سے ایک ایک گولی چلانے لگا تا کہ مورچے میں کوئی موجود ہو تو انھیں نشانہ نہ بنا سکے۔ جبکہ دوسرا آدمی دستی بم کی پن نکال کر دیوار سے دو تین قدم دور ہوا اور بم کو موکھے میں اچھال دیا۔ اگر بم موکھے کے بجائے دیوار سے ٹکرا کر واپس گرتا تو

یقیناان کی زندگی کی ضمانت ضبط ہو جاتی، مگر پاک آرمی کے جوانوں کو عملی زندگی میں ایسے کئی خطرات سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔

دستی بم کے لیور کو جب چھوڑا جاتا ہے تو اس کے قریباً چار سیکنڈ بعد بم پھٹتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پھینکتے وقت بم کو اونچا اچھالا جاتا ہے تاکہ جس وقت بم نیچے گرے تو لیور چھوڑنے کے بعد چار سیکنڈ گزر جائیں۔ دوسری صورت میں دشمن تیز رفتاری کا مظاہرہ کر کے بم اٹھا کر واپس بھی پھینک سکتا ہے۔

بم کے مورچے میں گرتے ہی دھماکا سنائی دیا تھا۔ اور اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ بم پھینکنے والے شیر دل جوان نے لیور کو آزاد کر کے بم کو دو تین سیکنڈ ہاتھ ہی میں رکھا تھا۔ بم کی چال میں کتنا ہی حساب کتاب کیوں نہ رکھا جائے ایسی بہادری کا مظاہرہ کرنے کو لوہے کا کلیجہ چاہیے ہوتا ہے۔ کیوں کہ تاخیری میکانی عمل اگر گڑبڑ کر جائے یا بم تھامنے والا سیکنڈوں کا حساب کتاب رکھنے میں غلطی کر جائے تو انجام بھیانک موت ہی ہوتا ہے۔

دھماکا ہوتے ہی چاروں جوانوں نے تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دو دو بم عمارت کے صحن میں اچھالے، یکے بعد دیگرے کئی دھماکے ہوئے تھے۔ چاروں جوان عمارت کی مغربی دیوار کے پاس پہنچے۔ دو جوانوں نے پشت پر پہنے چھوٹے جھولوں سے کوئی چیز نکالی، جب انھوں نے ہاتھ گھما کر دیوار کی اونچائی کی طرف لہرائے۔ تب اندازہ ہوا کہ وہ کمند تھی۔ پلاسٹک کی مضبوط رسی جس کے ایک سرے پر فولاد کا مضبوط آنکڑا جڑا ہوتا ہے، اور رسی میں ہر فٹ بھر کے فاصلے پر گانٹھ لگی ہوتی ہے تاکہ اوپر چڑھنے والے کے ہاتھ رسی پر سے نہ پھسلیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے دو جوان دیوار کے اوپری سرے پر پہنچ گئے۔ انھوں نے اپنے ہتھیار سلنگ کے ذریعے کندھوں سے لٹکا لیے تھے۔ اس اثناء میں دوسرا الفا عمارت کے سامنے پہنچ کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اچانک کان پھاڑ دینے والا دھماکا سنائی دیا۔ یقیناً عمارت کے سامنے پہنچنے والی ٹولی نے راکٹ لانچر سے عمارت کا داخلی دروازہ اڑایا تھا۔

ایک دم تیز فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ دیوار پر چڑھنے والے دونوں جوان ایک لمحہ کو دیوار کے اوپر لیٹے اور پھر اندر کود گئے۔

گولیوں کی برستی بارش میں کسی ذاتی دشمنی یا مفاد کے بغیر کودنے والے جوانوں کے مدنظر صرف وطن کی محبت اور امن و اسلام دشمن عناصر کو کیفر کردار تک پہنچانے کا جذبہ تھا۔ تنخواہ کی مد میں ملنے والے چند ٹکے انھیں موت کے منہ میں نہیں دھکیل سکتے تھے۔ ایسے وقت انھیں بوڑھی ماؤں اور محبوب بیویوں کی منتظر آنکھیں بھول گئی تھیں۔ معصوم بچوں کی قلقاریاں اور شرارتیں ذہن سے محو ہو گئی تھیں، گاؤں کے پر رونق میلے اور گھر کی حسین فضا یاد نہیں رہی تھی۔ کچھ یاد تھا تو وطن کی خاطر جان لینا اور وطن کے لیے گردن کٹانا۔ پاک آرمی کے خلاف بھونکنے والوں کو کبھی ایسی صورت حال سے واسطہ پڑے تو یقیناان کی شلواریں گیلی ہو جائیں گی۔ آرام دہ صوفے پر تشریف ٹیک کر کسی الیکٹرانک ''اینکر پرسن'' کے سامنے چھاتی چوڑی کر کے پاک فوج پر ملک کا سارا بجٹ کھانے کا بہتان لگانا، فوج نے کیا تیر مارا ہے کا نعرہ بلند کرنا، فوج کی کارکردگی پر انگلی اٹھانا، فوج کی قربانیوں کا انکار کرنا نہایت آسان اور سہل ہے۔ ایسے افراد کی سماعتوں نے صرف آتش بازی کی ''تڑ ..... تڑ'' اور میرج بم کے دھماکے سنے ہوتے ہیں۔ توپوں کی گھن گرج، دستی بموں کے دھماکے اور اصلی ہتھیاروں کا گرجنا سن لیں تو صرف آواز کی دہشت ہی سے ان سور ماؤں کی حرکت قلب بند ہو جائے۔

سچ تو یہ ہے مجھے کبھی ایسے افراد سے گلہ نہیں رہا۔ کیوں کہ ان کا بھونکنا اور واویلا کرنا اخلاص، خیر خواہی اور نیک نیتی کے تحت نہیں ہوتا۔ نہ ان کے مدنظر عوام کی بہتری و خوش حالی ہوتی ہے۔ ایسے منافق تو وطن دشمن عناصر کے ایجنٹ بن کر، ان سے ڈالروں کی گڈیاں وصول کر کے طے شدہ ایجنڈے پر کام کرتے ہیں۔ اصل دکھ تو ان سادہ لوح عوام پر ہوتا ہے جن کی

زبان تو اپنی ہوتی ہے مگر الفاظ یہود و ہنود کے آلہ کاروں کے رٹے ہوتے ہیں۔ جن کے ذہن تو اپنے ہیں، مگر سوچتے میر جعفروں اور میر صادقوں کی عقل سے ہیں، جن کی آنکھیں تو اپنی ہیں مگر دیکھتے ٹرمپ اور مودی کی عینک سے ہیں۔ خدارا کبھی آنکھیں بند کر کے ان سپاہیوں کے حالاتِ زندگی پر بھی غور کر لیا کریں جو خوشی میں پیاروں کے ساتھ قہقہے لگا سکتے ہیں اور نہ غم میں ان کے گلے لگ کر آنسو بہا سکتے ہیں۔ پاک فوج کن حالات اور کیسے علاقوں میں اپنی خدمات سرانجام دے رہی ہے کبھی اس پر بھی تحقیق کر لیا کریں۔ کیا اعتراض کرنے والے نہیں جانتے کہ عوام سیلاب کی لپیٹ میں آتے ہیں تو کون سا محکمہ مدد کو دوڑتا ہے، زلزلے کا عذاب ٹوٹے تو کون سی مخلوق دن رات لگا کر زخمیوں و لاشوں کو کندھوں کا سہارا مہیا کرتی ہے، کوئی آفت، کوئی مصیبت، کوئی عذاب آنے پر پہلا سامنا پاک فوج ہی کرتی ہے.....

پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تم بھی تو دلدار نہیں

سچ تو یہ ہے کہ ہر ایسا موقع جب زندگی، بند مٹھی میں سرکتی ریت کی مانند دھیرے دھیرے رخصتی پر آمادہ نظر آئی تب اپنے پیاروں کی یاد کے ساتھ تکمیلِ مقصد کا خیال بھی دل و دماغ پر حاوی رہا۔ موت کو سامنے پا کر بھی ذہن سے یہ احساس محو نہیں ہوا کہ ہم وطن کی حفاظت کی قسم کھا چکے ہیں۔ بہ ہر حال یہ دکھڑے بہت طویل ہیں لیکن اس سے کہانی کا تسلسل متاثر ہوتا ہے اس لیے واپس لوٹتے ہیں.....

دو جوانوں کے اندر کودتے ہی نیچے والے دونوں کلاشن کوفیں ''سلنگ اپ'' کر کے دیوار پر چڑھنے لگے۔ اب عمارت کے اندر لڑائی شروع ہو چکی تھی۔ ہمیں صرف فائرنگ کی آواز سنائی دے رہی تھی، دکھائی کچھ نہیں دے رہا تھا۔ چیتا دل کی جتنی مدد ہم کر سکتے تھے کر لی تھی۔ ہم طوفان دل کی جانب متوجہ ہو گئے، انھوں نے ہدف دوم یعنی دہشت گردوں کے اس ٹھکانے کا رخ کیا جہاں سے مرنے والے افراد اپنے ساتھیوں کی مدد کو نکلے تھے۔

''بھائی سنیں، کچھ مسلح لوگ مغربی جانب سے اوپر آ رہے ہیں۔'' نسوانی آواز ہمیں چونکا گئی تھی۔ ہم سامنے کے منظر میں اس قدر کھوئے تھے کہ زرینہ کی آمد پر بھی مطلع نہیں ہو سکے تھے۔

''کیا؟'' ہم چونک پڑے تھے۔

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''خان صاحب! دشمنوں کا مخابرہ بھی آن کر لینا چاہیے تھا۔''

''تم بتا دیتے۔'' اس نے جھولے سے آئی کام سیٹ نکال کر آن کیا۔ دو تین چینل تبدیل کرتے ہی ٹرانسمشن شروع ہو گئی تھی۔ ایک بھاری آواز سنائی دی۔

''ایک ہی مکان ہے، یقیناً اسی میں چھپے ہوں گے۔''

''مکان کو گھیر لو، یہ وہی خبیث ہے۔ کمینے کی ایک گولی بھی خطا نہیں گئی ہے۔ بچ کر نہیں جانا چاہیے۔''

''خان صاحب مارے گئے۔'' میں سرعت سے رینج ماسٹر کو جھولے میں منتقل کرنے لگا، سردار طوفان دل اور چیتا دل کو خطرے سے مطلع کر کے اپنی روانگی کا بتا رہا تھا۔

زرینہ وہیں کھڑی تھی۔ دہشت گردوں کی گفتگو جاری تھی۔ وہ محتاط انداز میں اوپر چڑھ رہے تھے اور بات چیت سے معلوم ہو رہا تھا کہ ان کی توجہ زرینہ لوگوں کے گھر پر ہے۔ اس بلندی پر سب سے اہم وہی عمارت تھی۔

''اپنے کمبل اور گھڑا واپس لے جاؤ، تاکہ پتا نہ چلے تم نے ہماری مدد کی ہے۔ گھر کا دروازہ اندر سے بند کر لینا اور فقط ہمارے چھپنے کی جگہ کے بارے بتا کر لاعلمی کا اظہار کرنا۔''

اس نے پیشکش کی۔ ''آپ ہمارے گھر میں چھپ جائیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں ہماری وجہ سے تمھیں نقصان ہو سکتا ہے۔''

اس نے معصومیت سے پوچھا۔ ''کیا باقی فوجی آپ کی مدد کو نہیں آئیں گے؟''

''ان گپوں کا وقت نہیں ہے زرینہ! تم پھوٹنے کی کرو۔'' دونوں کمبل اٹھا کر میں نے مچان سے نیچے پھینکے۔ سردار بقیہ سامان اپنے جھولے میں ڈال رہا تھا۔ میں اپنا جھولا اٹھا کر نیچے اترنے لگا۔ زرینہ پانی کا گھڑا خالی کر کے کمبل بغل میں دبائے وہیں کھڑی تھی۔

''سنا نہیں گھر کو بھاگو۔'' میں نے نیچے اترتے ہی اسے جھڑکا۔

ڈانٹ کھا کر وہ سہم گئی تھی۔ ناراضی بھری نگاہ میرے چہرے پر ڈال کر گھر کو مڑ گئی۔ سردار اپنا جھولا پیٹھ پر لادے نیچے پہنچا، ڈریگنوو اس نے ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔ عام سنائپر رائفلوں کے برعکس ڈریگنوو نیم خودکار (سیمی آٹو میٹک) ہے۔ یعنی اسے بار بار کاک نہیں کرنا پڑتا۔ اس کی میگزین میں دس گولیوں کی گنجائش ہے۔ بیرٹ ایم 107 بھی اس لحاظ سے ڈریگنوو جیسی ہے کہ اس کی میگزین میں بھی دس گولیاں پڑتی ہیں اور وہ نیم خودکار بھی ہے۔ البتہ اس کا وزن اور رینج ڈریگنوو سے زیادہ ہے۔

اپنا وائرلیس سیٹ بند کر کے وہ آئی کام پر دشمن کی بات چیت سن رہا تھا۔

میں نے مشورہ دیا۔ ''فرار کو جنوب مشرقی سمت بہتر رہے گی۔''

''چلو۔'' متفق ہو کر اس نے قدم بڑھائے۔ بہ مشکل سو قدم جا سکے ہوں گے کہ مجبوراً ہمیں رکنا پڑا۔ دشمن کا کمانڈر اوپر آنے والے افراد کو بتا رہا تھا کہ جنوب اور مشرق کی طرف کمانڈر رنگین خان کے آدمیوں نے گھیرا ڈال لیا ہے۔''

''طوفان دل اور چیتا دل سے رابطہ کرنا پڑے گا۔'' سردار نے کینوڈ آن کر لیا۔ نشیب میں تیز فائرنگ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''ایس ایس فار چیتا دل، اوور۔''

فوراً جواب آیا۔ ''ایس ایس، دشمن کی بڑی تعداد کا سامنا ہو چکا ہے، تمھاری مدد کی ضرورت ہے، اوور۔''

سردار نے دہائی دی۔ ''ہم نے مدد مانگنے کو رابطہ کیا تھا، آؤٹ۔'' چیتا دل سے مایوس ہو کر وہ طوفان دل سے رابطہ کرنے لگا۔

''ایس ایس فار طوفان دل اوور۔''

''ایس ایس، ہدف دوم میں بھی دشمن کی کافی تعداد موجود ہے۔ انھیں چھوڑ کر آپ کی مدد کو نہیں آ سکتے، اوور۔'' چونکہ طوفان دل اور چیتا دل سے ایک ہی چینل پر رابطہ تھا اس لیے بغیر سوال سنے انھوں نے معذرت کر لی تھی۔ دشمن کے پندرہ بیس افراد تو رینج ماسٹر کا شکار بن چکے تھے، چیتا دل اور طوفان دل نے بھی کافی تعداد کو جہنم واصل کیا تھا، لیکن پھر بھی ان کی بڑی تعداد موجود تھی۔ جنوب مشرق کی جانب پیش قدمی کرنے والے دشمن تو کمانڈر رنگین کے لشکری تھے، مغربی جانب سے چڑھائی کرنے والے جانے کہاں سے آ ٹپکے تھے۔ مگر اس وقت کسی اور موضوع پر سوچنے کے بجائے جان بچانے کا مرحلہ درپیش تھا۔

اب گیند دشمن کے پاس تھی۔ ہمارے چھاپہ مار دستوں میں طوفان دل اور چیتا دل کے علاوہ سیلاب دل اور ضارب دل بھی شامل تھے۔ ان دستوں کے پاس پس قدمی کی سہولت موجود تھی۔ مشرقی جانب پاک فوج کی پوسٹیں تھیں جن کی وجہ سے ان کا عقب محفوظ تھا۔ لیکن ہم دونوں چاروں طرف سے گھر گئے تھے۔

سردار نے کہا۔ ''شمال کی جانب کافی گھنی جھاڑیاں ہیں وہاں سے کوشش کی جا سکتی ہے۔''

''بھاگو۔'' متفق ہوتے ہوئے میں واپس مڑ گیا۔ ہم دونوں کے پاس وزن زیادہ تھا جسے اٹھا کر بھاگنا بہت مشکل تھا۔ البتہ ایک سہولت حاصل تھی کہ ہم نشیب اتر رہے تھے۔ آدھی اترائی کے بعد گھنی جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

سردار پھولے ہوئے سانسوں سے بولا۔ ''جھولوں سے پیچھا چھڑانا پڑے گا۔''

میں ہچکچایا۔ ''اپنا ہتھیار کیسے پھینک سکتے ہیں۔''

سردار مصر ہوا۔ ''جھاڑیوں میں چھپا دیتے ہیں، امید ہے ہمارے بھاگنے پر وہ جھاڑیوں کی تلاش سے باز رہیں گے۔''

میں نے قدم آہستہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی گھنی جھاڑی دیکھو تا کہ سامان دور سے تو نظر نہ آئے۔''

مگر ہماری خوش قسمتی کہ گھنی جھاڑی سے پہلے ہی ہماری نظر پانی کی تنگ گزرگاہ پر پڑ گئی۔ بارشی پانی نے اس جگہ کو کافی گہرا کر دیا تھا۔ پہاڑی علاقے میں بارش کے بعد پانی نشیب کی طرف تیز رفتاری سے بہتا ہے، جس کی وجہ سے چھوٹے بڑے نالے وجود میں آتے ہیں۔ کوہستان کے باسی اور وہ لوگ جنہیں پہاڑوں پر رہنے کا تجربہ ہوا اچھی طرح جانتے ہیں کہ پہاڑ مختلف اور تہہ در تہہ پرتوں سے وجود میں آتے ہیں۔ کچھ حصے خالص پتھریلی چٹانوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ کہیں پتھر، ریت اور مٹی کا ملغوبہ ہوتا ہے۔ کچھ جگہوں پر چکنی مٹی ہوتی۔ کچھ پر بھربھری مٹی ہوتی ہے۔ پانی ہر قسم کی زمین پر رستہ بنا لیتا ہے، لیکن جہاں بھربھری مٹی کی پرتیں ہوں وہاں بننے والے نالے نسبتاً گہرے اور تنگ ہوتے ہیں۔ اور وہ بھی ایک ایسا ہی نالہ تھا۔ ہمارے جھولے ''واٹر پروف'' تھے۔ پانی ہتھیار یا ساز و سامان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ پانی کی گزرگاہ دو فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ دونوں جھولے اندر رکھ کر ہم نے کناروں کی مٹی پر زور زور سے پاؤں مار کر جھولوں پر گرا دیا۔ پانچ چھے منٹ ضائع کر کے ہم نے دونوں جھولوں کو دفن کر دیا تھا۔ اب مستقل طور پر تو نہیں البتہ عارضی طور پر جھولے محفوظ ہو چکے تھے۔ کیوں کہ زیادہ بارش جھولوں پر سے مٹی بہا کر لے جاتی۔ لیکن ہمارا مقصد عارضی طور جھولوں سے چھٹکارا پانا تھا، طویل عرصے تک سامان کو وہاں چھوڑنے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔

ایک آئی کام سیٹ اور ایک کینوڈ ہم نے پاس رکھے تھے تا کہ دشمن کی بات چیت بھی سن سکیں اور اپنوں سے رابطہ بھی بحال رہے۔ جھاڑیوں کا سلسلہ نشیب تک چلا گیا تھا، لیکن جھاڑیاں زیادہ پھیلی نہیں تھیں۔ چوڑائی میں ایک پٹی کی طرح تھیں۔ جھاڑیوں میں بھاگنے کا فائدہ تو یہ تھا کہ ہم دور سے کسی اور نظر نہیں آ سکتے تھے۔ اور نقصان یہ تھا کہ ہماری نظریں بھی دور دور تک دیکھ بھال کے قابل نہیں رہی تھیں۔

سورج آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اور مسلسل حرکت میں ہونے کی وجہ سے اچھی خاصی گرمی محسوس ہونے لگی تھی۔ ڈھلان اترتے ہوئے زور تو نہیں لگتا لیکن، پھسلنے، پاؤں اچٹنے اور موچ آنے کا خطرہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ پختہ سڑک یا ہموار پگڈنڈی تو تھی نہیں کہ بندہ جسم ڈھیلا چھوڑ کر بھاگتا جائے۔ یہاں تو ہر قدم پر گڑھوں، پتھروں اور ناہموار زمین سے واسطہ تھا۔ نیچے دیکھے بغیر آگے بڑھنا ممکن ہی نہیں تھا۔

ہم خاموشی، احتیاط اور سبک روی سے نشیب کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ہر وقت بک بک کرنے والے سردار کی زبان پر تالے لگے تھے، کیوں کہ پیشہ ور سنائپر ہونے کے ناتے وہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ بولنے سے جہاں چھپاؤ خطرے میں پڑتا ہے وہیں سماعتوں کی کارکردگی بھی نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہے۔ خاموش ہونے کی صورت میں انسان کانوں سے بھی آنکھوں کا کام لے سکتا ہے۔ دور سے ہونے والی بات چیت اور پاؤں کی آہٹ تک کانوں کی رسائی آنکھوں کے نظارے سے پہلے ہو جاتی ہے۔ دشمن کی آہٹ سننے کو ہم نے وائرلیس سیٹ بھی بند کر دیے تھے۔

سائلنسر لگا بریٹا میں نے تیاری حالت میں پکڑا ہوا تھا۔ سردار نے بھی ڈریگنوو کاک کی ہوئی تھی۔ سردار دو تین قدم

آگے تھا۔ اچانک رکتے ہوئے وہ ساکن ہوا اور اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر مٹھی بند کر لی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے کوئی آہٹ سنائی دے گئی تھی یا اس نے کوئی حرکت دیکھ لی تھی۔ میں بھی اپنی جگہ پر تھم گیا تھا۔ وہ گھٹنا نیچے ٹیک کر آہستہ سے بیٹھ گیا۔ میں آواز پیدا کیے بغیر اس کے قریب پہنچا۔ اب مجھے بھی باتوں کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ ان کی بے احتیاطی دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ہمیں زرینہ لوگوں کے گھر میں محصور سمجھ رہے تھے۔ ان کی یہ غلط فہمی جب تک برقرار رہتی ہمیں فائدہ تھا۔

سردار کے کندھے پر دباؤ ڈال کر میں نے لیٹنے کا اشارہ کیا اور خود زمین پر بیٹھ کر دھیرے دھیرے آگے سرکنے لگا۔ مگر اس حالت میں بھی میں نے یہ دھیان ضرور رکھا تھا کہ میرا جسم سردار کے دکھاؤ میں رکاوٹ نہ بنے۔

وہ جلد ہی دکھائی دے گئے تھے۔ دو قدم کے فاصلے سے آگے پیچھے روانہ تھے۔ ہاتھ سیدھا کرتے ہوئے میں نے مسلسل دو مرتبہ لبلبی دبائی۔ ''ٹھک .....ٹھک۔'' کی آواز کے ساتھ وہ نزدیکی جھاڑی میں گرے اور اذیت سے اینٹھنے لگے۔ ہم بھاگ کر قریب پہنچے، دونوں کے پاس لکڑی کے بٹ والی کلاشن کوفیں تھیں۔ قلم کی طرح ترشی ہوئی نال ان کے روسی ہونے کی چغلی کھا رہی تھی۔ دونوں نے جیکٹ نما بنڈوریل پہنے تھے، جن کے سامنے سے زنجیر لگی ہوئی تھی۔ زنجیر کھول کر ہم نے ان کے بنڈوریل اتار کر خود پہن لیے کیوں کہ بنڈوریل کی جیبوں میں کلاشن کوف کے اضافی میگزین ڈالے جاتے ہیں۔ ورنہ قمیص کی جیبیں تو اتنے وزنی میگزین نہیں سنبھال سکتیں۔

سردار نے ڈریگنوو کی سیفٹی لگا کر کندھے سے لٹکالی تھی۔ اب ہمیں جس لڑائی کا سامنا تھا اس میں کلاشن کوف کی اہمیت سنائپر رائفل سے بڑھ جاتی ہے۔

کلاشن کوفوں کے لوڈ ہونے کی یقین دہانی کر کے ہم آگے بڑھ گئے۔ چند قدم لینے کے بعد جھاڑیوں کا پھیلاؤ ختم ہو رہا تھا البتہ نشیب کی طرف مزید بیس پچیس گز تک جھاڑیاں چلی گئی تھیں۔ آخری جھاڑی کے پاس ہم لیٹ گئے اور رینگتے ہوئے آگے بڑھے، دو دو کی ٹولیوں میں چھے افراد تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اوپر روانہ تھے۔

''کیا خیال ہے؟'' میں نے سردار کی آنکھوں میں جھانکا۔

وہ دلیری سے بولا۔ ''جان بچانے کی کوشش کرنا بزدلی کہلائے گا۔ ہم اکیلے نہیں ہیں۔ چیتا دل اور طوفان دل کے جیالے زیادہ فاصلے پر نہیں ہیں۔ اب تو یوں بھی ان کے گھیرے سے نکل آئے ہیں۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''ایک خان سے اس کے علاوہ امید ہی کیا کی جا سکتی ہے۔''

میرے اندازکو اس نے اجازت پر محمول کیا تھا، دور والی ٹولی جس کا فاصلہ دو سو گز کے قریب تھا پر نشانہ سادھ کر اس نے مسلسل دو دفعہ لبلبی دبائی، پیٹھ میں گولی لگنے سے دونوں اوندھے منہ گرے تھے، اور اذیت سے ہاتھ پاؤں جھٹکنے کی وجہ سے نیچے لڑھکنے لگے۔ اس دوران جھاڑیوں کے ساتھ سے اوپر کی جانب حرکت کرنے والوں پر میں شست لے چکا تھا۔ کیوں کہ ذرا سی مہلت ملنے پر وہ جھاڑیوں میں گھس کر ہماری لیے مشکل کھڑی کر سکتے تھے۔

''تڑ.....تڑ۔'' کی آواز پر وہ چونکتے ہوئے رکے، لیکن ان کے سنبھلنے سے پہلے میری شہادت والی انگلی لبلبی کو کھینچ چکی تھی۔ ان کا انجام دیکھنے کے بجائے میں درمیان والی جوڑی کی طرف متوجہ ہوا۔ قریب کوئی آڑ نہ پا کر دونوں چند قدم دور پڑے پتھر کی طرف بھاگے تھے۔ میری اور سردار کی کلاشن کوفیں ایک ساتھ گرجی تھیں، پتھر تک پہنچنے کی حسرت دل میں لیے وہ تڑپتے ہوئے نشیب میں لڑھکنے لگے۔

دشمن سے بے نیاز ہوتے ہی سردار نے آئی کام سیٹ آن کر دیا تھا۔ دشمن کا کمانڈر بار بار فائرنگ کے بارے پوچھ رہا تھا۔ مگر وجہ جاننے والوں میں کوئی باقی نہیں بچا تھا کہ جواب دے پاتا۔ مشرقی جانب سے دو افراد موڑ کاٹ کر سامنے آئے، دونوں نے کلاشن کوفیں تیاری حالت میں تھامی ہوئی تھیں، ان کے سر پنڈولم کی طرح حرکت میں تھے۔ لیکن ان کی

احتیاط کا طریقہ کار اچھی تربیت کی نشان دہی نہیں کر رہا تھا۔ انھیں بے فکری سے آڑ نہیں چھوڑنا چاہیے تھی۔ شاید ہماری فائرنگ کو وہ ساتھیوں کی حرکت سمجھے تھے۔ ان کی غلط فہمی ہمارے سامنے نمودار ہونے کے اگلے دو تین سیکنڈ میں رفع ہو چکی تھی۔ وہ نیچے گر کر اذیت سے تڑپنے لگے۔

اچانک ان سے ذرا بلندی پر کلاشن کوفوں کا گرجنا شروع ہوا۔ وہ اندازے ہی سے فائر کر رہے تھے کیوں کہ اب تک ہم جھاڑیوں کی حد سے آگے نہیں نکلے تھے۔ البتہ مناسب آڑ نہ ہونے کی وجہ سے کوئی اچٹتی ہوئی گولی ہمارا مزاج پوچھ سکتی تھی۔ ہمارے سر آڑ کی تلاش میں گھومے، پہاڑی علاقے میں پتھروں کی بہتات ہوتی ہے۔ ہمیں آڑ کی تلاش میں زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑی تھی۔ چند گز اوپر ہی ایک بڑا پتھر نظر آ گیا تھا جس کے پیچھے لیٹی حالت میں ہم دونوں پناہ گزین ہو سکتے تھے۔ پتھر بلندی کی طرف پڑا تھا، وہاں تک رینگ کر پہنچنا دشوار تھا۔ ہم دونوں جھکے جھکے اس جانب دوڑ پڑے۔ آئی کام سیٹ پر کوئی چیخ چیخ کر اپنے کمانڈر کو شمالی جانب ہماری موجودی سے مطلع کر رہا تھا۔

کمانڈ کسی اکبر جان نامی شخص کو پکارنے لگا۔ ''اکبر جان..... اکبر جان۔''

''جی کمانڈر۔'' ایک باریک آواز ابھری۔ یوں لگا جیسے کوئی ادھیڑ عمر عورت مرد بن کر بول رہی ہو۔

''اکبر جان، عمارت کا گھیراؤ ختم کرو، وہ خبیث نکل گئے ہیں۔''

اکبر جان پر اعتماد لہجے میں بولا۔ ''سن لیا ہے کمانڈر، آپ بے فکر رہیں آج بچ کر نہیں نکل سکتا۔''

اسی وقت ایک اور آواز ابھری۔ ''اکبر جان یہاں درخت پر مچان بنا ہے، خالی کھوکے بھی کافی تعداد میں پڑے ہیں۔'' اکبر خان نے اسے وہیں ٹھہرنے کا کہا۔

میں سردار کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ہمیں جلد ہی یہ جگہ چھوڑنا پڑے گی ورنہ گھیرے میں آ جائیں گے۔''

''ان دو سے نبٹ کر ہی بھاگ سکیں گے۔'' سردار نے ڈریگنوو ہاتھ میں لے کر پوچھا۔ ''فاصلہ کتنا ہوگا؟''

''تین سو میٹر ہی ہوگا اور ڈریگنوو کی گولی ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کلاشن کوف پر مطلوبہ رینج لگا کر شست سادھ لی۔ وہ ایک بڑے پتھر کے دائیں بائیں آڑ پکڑے درختوں کے جھنڈ کا جائزہ لے رہے تھے۔ شروع میں انھوں نے مسلسل فائر کر کے ایک ایک میگزین خالی کی تھی، لیکن بعد میں ہدف نظر نہ آنے پر ایمونیشن پھونکنا بند کر دیا تھا۔

شاید پہلے بھی بتایا تھا کہ دائیں ہاتھ سے فائر کرنے والے کو آڑ کی دائیں جانب اور بائیں ہاتھ سے فائر کرنے والے کو آڑ کی بائیں طرف استعمال کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس ہونے کی صورت میں فائرر کا زیادہ تر جسم آڑ سے باہر نظر آئے گا اور آڑ کوئی فائدہ نہیں دے گی۔ انھوں نے ایک پتھر کے دائیں بائیں آڑ لی ہوئی تھی۔ اور دونوں دائیں ہاتھ سے فائر کر رہے تھے۔ یوں ایک فائرر تو اصولی طور پر صحیح جگہ سنبھالے ہوئے تھا اور اس کا زیادہ تر جسم آڑ میں چھپا تھا، جبکہ دوسرے کا بالائی جسم واضح نظر آ رہا تھا۔ کم نظر آنے والا ہدف سردار کے لیے چھوڑ کر میں نے غلطی کرنے والے کو تاڑا، کیوں کہ سردار کے پاس ڈریگنوو تھی اور وہ آسانی سے دوسرے فائرر کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ میرے ہاتھ میں دشمنوں سے چھینی ہوئی کلاشن کوف تھی۔ کلاشن کوف نشانہ بازی میں سنائپر رائفل کے عشر عشیر بھی نہیں ہے اور پھر کلاشن کوف کو میں اپنی مرضی کے مطابق صفر بھی نہیں کر سکا تھا۔ تبھی میں نے بڑے ہدف کو تاڑا تھا۔ میں نے ہدف کی چھاتی پر نشانہ سادھا، تاکہ گولی ضائع نہ جائے۔

ہم نے قریباً ایک ساتھ ہی لبلبی دبائی تھی۔ دونوں کی گولیاں غلط آڑ پکڑنے والے کو لگی تھیں۔ دوسرا فائرر صاف بچ گیا تھا، ساتھی کی کھوپڑی میں روشندان کھلتے دیکھ کر وہ پتھر کے پیچھے سرک گیا تھا۔ یقیناً مرنے والے کے سر میں سردار کی گولی لگی تھی۔

میں نے منہ بنایا۔ ''دھت تیرے کی، خان صاحب! تمھیں دوسرے کو نشانہ بنانا چاہیے تھا۔''

''تمھارے لیے چھوڑ دیا تھا۔''

''میرے لیے چھوڑ دیا تھا۔'' میں نے منہ چڑایا۔ ''سنا پیرا ایفل تمھارے ہاتھ میں۔''

وہ جگہ چھوڑتے بولا۔ ''یہ بحث بعد میں کریں گے، فی الحال بھاگنے کی کرو۔ تمھارے سالے پہنچنے والے ہوں گے۔''

''بکواس نہ کرو۔'' میں نے اس کی تقلید کی تھی کیوں کہ جھاڑیوں کی حدود سے نکلتے ہی ہم بچ جانے والے دہشت گرد کے فائر کی رینج سے نکل جاتے۔

''بکواس کیسی، تم نے وزیرستان ہی سے شادی کی ہے نا۔''

''پلوشے دہشت گرد نہیں، شریف خاندان کی ہے۔ اور یہ کس نے کہا کہ دہشت گردوں کا تعلق وزیرستان سے ہوتا ہے۔'' میں سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''چونچ بند رکھو، تم بیٹھک میں نہیں بیٹھے۔'' لاجواب ہو کر اس نے حالات کا سہارا لیا اور مجھے خاموش ہونا پڑا۔

جھاڑیوں کی حدود سے کھلی جگہ پر آتے ہی ہم مزید محتاط ہو گئے تھے۔ دہشت گردوں کی طرف سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ موت کے کنویں کی موٹر سائیکل کی طرح تسلسل سے آنے لگی تھی۔

نشیب میں آنے کے بعد بھی زمین مکمل ہموار نہیں تھی۔ ہم مغرب سے آنے والے ایک نالے کے قریب پہنچ گئے تھے۔ سردار نالے کے کھڑے کنارے سے اندر کودا، اسی دم سامنے سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی، گولیاں چند فٹ کے فاصلے پر پتھروں سے ٹکرائیں۔ میں نے بغیر کسی تاخیر کے نالے میں چھلانگ لگائی اور ایک بڑے پتھر کے پیچھے دبک گیا، سردار نے مجھ سے پہلے ایک پتھر کی آڑ لے لی تھی۔

میں مایوسی سے بولا۔ ''پھنس گئے ہیں خان صاحب! دشمن سامنے بھی موجود ہے اور عقب سے بھی قریب آنے والا ہے۔''

''نالے میں اوپر کی جانب بڑھتے ہیں۔'' اس نے مغربی سمت اشارہ کیا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پچاس ساٹھ قدم کے بعد نالہ ایک دم اوپر کو اٹھ رہا ہے، دشمن ہمیں چڑھائی چڑھنے کی مہلت نہیں دیں گے۔''

''تم غربی جانب سنبھالو میں مشرق کی سمت دھیان دیتا ہوں۔'' پرجوش پٹھان اتنی جلد ہمت نہیں ہار سکتا تھا۔

میں نے مشورہ دیا۔ ''گرفتاری دے کر مہلت حاصل کر سکتے ہیں۔''

''اپنی سپاہ کی خبر لیتے ہیں، شاید مدد مل جائے۔'' میرے مشورے کو درخور اعتناء (توجہ کے قابل) نہ جانتے ہوئے وہ کینوڈا آن کرنے لگا۔ فوراً ہی آواز آنے لگی، کوئی بار بار ہمیں پکار رہا تھا۔

''چیتا دل فار ایس ایس اوور..... چیتا دل فار ایس ایس اوور.....''

''سینڈ یور میسج اوور۔'' سردار نے بے صبری سے جواب دیا تھا۔

جھلائی ہوئی آواز میں پوچھا گیا۔ ''ایس ایس، کافی دیر سے تمھیں طوفان دل اور میں پکار رہے ہیں جواب کیوں نہیں دے رہے اوور۔''

سردار تلخ ہوا۔ ''ہمارے حالات جاننے کے بعد یہ سوال بے معنی رہ جاتا ہے اوور۔''

''شمالی جانب سے طوفان دل، مشرقی جانب سے چیتا دل اور جنوبی جانب سے ضارب دل کی سپاہ آپ کی کمین گاہ کی طرف پیش قدمی کر رہی ہیں اوور۔''

میرا دل مسرت سے دھڑکنے لگا تھا۔ سردار کے ''راجر'' کہنے پر اس کی بات جاری رہی۔

''دہشت گردوں کے زیادہ تر افراد ہلاک ہو چکے ہیں اور باقی اس ٹیکری کی طرف سمٹ آئے ہیں، اوور۔''

''راجر۔'' سردار نے سمجھ جانے کا اعلان کیا۔

''اپنی جگہ کی نشان دہی کریں کیوں کہ کپڑوں میں ہونے کی وجہ سے آپ دونوں اپنی سپاہ کا شکار بن سکتے ہیں، اوور۔''

''ہم اپنی کمین گاہ والی ٹیکری کے نالے میں پہنچ چکے ہیں اور لگتا ہے اپنے بندے ہم پر فائر کھول چکے ہیں، اوور۔''

''ویٹ۔'' ہمیں انتظار کا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اچانک نالے کے مشرقی کنارے پر ایک باوردی جوان کی جھلک نظر آئی۔ یقیناً وہ سینئر کی ہدایت پر ہمارا جائزہ لے رہا تھا۔ بہ ظاہر وہ بے وقوفی کا مرتکب ہوا تھا کہ یوں چھاتی چوڑی کیے دشمن کے سامنے جانا حماقت تھی۔ مگر پاک فوج کے جوان ایسی حماقتوں کے عادی ہیں۔

میں نے فوراً کھڑے ہو کر ہاتھ لہرائے اور اس نے دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں نوالہ لینے کے انداز میں جوڑ کر انگلیوں کے سروں کو اپنے سر سے لگایا۔ جس کا مطلب تھا میں اس کے پاس پہنچوں۔ (میدان جنگ میں ساتھیوں تک اپنی بات پہنچانے کے مختلف اشارے مقرر ہیں، جن کے بارے ہر تربیت یافتہ اچھی طرح جانتا ہے)

سردار بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ جائزہ لے کر ہم نے عقب محفوظ ہونے کا یقین کیا اور نالے کے مشرقی کنارے کی طرف دوڑ پڑے۔ دہشت گرد آدھی اترائی سے نیچے نہیں آئے تھے۔ پاک فوج کی وردیاں دیکھ کر انھیں اپنی فکر پڑ گئی تھی۔ سردار نے اسی حالت میں آئی کام کی آواز بلند کی۔ کمانڈر، اکبر جان کو اپنے آدمی واپس بلانے کی ہدایات دے رہا تھا۔ ان کی خوش قسمتی یہ تھی کہ مغربی جانب سے انھیں فرار کی راہ میسر تھی۔

نالے کی مشرقی جانب ذرا سی بلند تھی۔ اوپر پہنچ کر ہمیں پاک فوج کے تین جوان پر تپاک انداز میں ملے تھے۔ وقفے وقفے سے باقی جوان بھی اس ٹیکری کو گھیرے ہوئے تھے۔ جنوب کی جانب سے تیز فائرنگ سنائی دے رہی تھی۔ پتا چلا کہ اس ٹیکری کے مغربی جانب گزرنے والے نالے کے سرے پر دہشت گردوں کی ٹولی پاک فوج کے جوانوں کا رستہ روکے ہوئے تھی۔

ڈریگنو و مجھے دو۔'' ساتھیوں سے معانقہ کر کے میں نے سردار کی طرف ہاتھ پھیلائے۔

''تم سپاٹر کی ذمہ داری سنبھالو۔'' ڈریگنو و کندھے سے اتار کر وہ مناسب جگہ پر لیٹ گیا تھا۔ سنائپنگ کا مکمل سامان ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے، اب سب کچھ اندازے سے کرنا تھا۔

لکڑی کے مضبوط تنکے کے ساتھ کپڑے کی دھجی باندھ کر میں نے ہوا کی رفتار معلوم کرنے کو زمین میں گاڑا۔ ونڈ میٹر کے نہ ہونے پر سنائپر ہوا کی رفتار یونہی معلوم کرتے ہیں۔ (شاید کپڑے کی جھنڈی سے ہوا کی رفتار معلوم کرنا قارئین کو عجیب لگے تو تھوڑی سی وضاحت کر دوں کہ، ہوا کی وجہ سے جب جھنڈی لہراتی ہے تو ہم کپڑے اور لکڑی کے درمیان بننے والے زاویے کو جانچتے ہیں۔ ہوا جتنی تیز ہو گی زاویہ اتنا زیادہ بنے گا اور جتنی کم ہو گی، ڈنڈے اور کپڑے کا زاویہ اتنا کم بنے گا۔ پس اس زاویے کو مخصوص فارمولے کے ساتھ ضرب تقسیم کر کے ہمیں ہوا کی رفتار معلوم ہو جاتی ہے)

بلندی کا زاویہ بھی اندازے سے معلوم کر کے میں نے نزدیکی نظر آنے والے دہشت گرد کا فاصلہ سردار کو بتا دیا۔ پتھر کے عقب میں سر ابھارے وہ گاہے گاہے فائر کر رہا تھا۔ سردار ایلیویشن، ڈیفلیکشن ناب کو مطلوبہ مقدار میں گھما کر فائر کرنے کو تیار ہو گیا۔ لبلبی دباتے ہی دشمن الٹ کر پیچھے جا گرا تھا۔ سردار نے رینج میں تبدیلی کیے بغیر اس سے چند قدم دائیں بیٹھے دشمن پر شست سادھی۔ اگلے کے گرتے ہی باقی بے تحاشا جھاڑیوں کی طرف دوڑ پڑے تھے، جو جھاڑیوں سے دور تھے انھوں نے پتھروں کے عقب میں پناہ لے لی تھی۔

اسی اثناء میں کیپٹن حفیظ اللہ نیازی وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ چیتا دل کا کمانڈر تھا۔ ہماری پیٹھ تھپتھپا کر اس نے پیش قدمی کا عندیہ دیا اور ہمیں وہیں ٹھہرنے کو کہا کیوں کہ ہم سول کپڑوں میں تھے۔ اور اپنے ساتھیوں کا شکار ہو سکتے تھے۔

میں نے اسے اطمینان دلایا۔ ''ہم یہیں سے مدد پہنچائیں گے سر۔''

''بے شک۔'' تحسین آمیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے وہ اپنے جتھے کے ہمراہ نالے میں اتر گیا۔ دہشت گرد ٹیکری پر چڑھنے کے بجائے، درمیانی بلندی ہی سے مغرب کا رخ کر رہے تھے۔ مغربی نالے میں اتر کر وہ آسانی سے بالک ٹاپ کی جانب سمٹ سکتے تھے۔

اگلے دو تین گھنٹے اسی کشمکش میں گزرے تھے۔ سہ پہر تک پاک فوج کے جوانوں نے ہماری کمین گاہ والی ٹیکری اور چند دوسری ٹیکریوں پر قبضہ جما لیا تھا۔ میں اور سردار بھی اپنا سامان نکالنے ٹیکری کی جانب بڑھ گئے۔ ایک وردی والا جوان ہم نے ساتھ رکھا تھا تاکہ دور سے دیکھنے والے ہمیں مشکوک نہ سمجھ لیں۔ وہ رات ہم نے وہیں گزاری تھی۔ زرمینہ لوگوں کے گھر کا دروازہ بند ہی رہا تھا۔ بے چاری اکیلی عورتیں سخت ڈر گئی تھیں۔ پاک فوج کے دس جوان معمولی زخمی تھے۔ تین شہید ہوئے تھے اور دو شدید زخمی تھے۔ شدید زخمیوں کو فوراً واپس بھیجا گیا تھا۔

گھر کے دائیں بائیں وردی والوں کو دیکھ کر بچیاں چائے دینے آئی تھیں۔ چونکہ وہ ہم سے مانوس تھیں اس لیے سیدھا ہمارے قریب پہنچی تھیں۔ چھت کے شرقی کونے پر مجھے سرخ لباس کی جھلک دکھائی دی، کوئی وہاں سے ہم پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اور کل زرمینہ نے سرخ لباس ہی پہنا تھا۔

بچیاں برتن رکھ کر ہمارے قریب ہی بیٹھ گئی تھیں۔ چائے زیادہ تھی۔ ہم نے قریب موجود چند اور سپاہیوں کو بھی بلا لیا تھا۔ سردار بچیوں سے گپ شپ کرنے لگا۔ خالی برتن اور انعام وصول کر کے وہ خوشی خوشی واپس لوٹ گئی تھیں۔ البتہ مورچے سے جھلکتا سرخ لباس روانگی تک وہیں دکھائی دیتا رہا۔

طلوع آفتاب کے ساتھ پاک فوج کے جوان منظم انداز میں واپس پلٹے۔ دہشت گردوں کی لاشیں لے جانے کا بندوبست ہمارے پاس نہیں تھا، ان کے ہتھیار، مخابرے اور دوسرا کام کا سامان اٹھا لیا گیا تھا۔ البتہ لاشوں کو ان کے ٹھکانوں میں رکھ دیا تھا تاکہ جنگلی جانور خراب نہ کریں۔ امید یہی تھی کہ ایک دو دن میں ان کے ساتھی واپس پہنچ کر ان کا ''کریا کرم'' کر دیتے۔ (شاید کچھ قارئین کو یہاں کریا کرم کا لفظ مناسب نہ لگے کہ یہ ہندو مردوں کے لیے مستعمل ہے۔ لیکن ان دین، وطن و انسانیت دشمن عناصر کے لیے مجھے اس سے بہتر کوئی لفظ نہیں سوجھتا)

سہ پہر ڈھلے ہم واپس پہنچے، آپریشن نہایت کامیاب رہا تھا۔ دہشت گردوں پر کافی کاری ضرب لگی تھی اور اب انھیں سنبھلنے میں کچھ وقت ضرور لگتا۔

—●—

ایک ہفتے بعد ہماری بدلی پر حوالدار بدرالدین اور نائیک عرفان پہنچ گئے تھے۔انھیں پیشہ ورانہ بھاؤ (بریف) دے کر ہم چھٹی روانہ ہو گئے۔ڈیرہ اسماعیل خان تک تو ہم فوجی قافلے کے ساتھ آئے تھے۔سہ پہر ہونے کو تھی جب ہم کپڑے ڈال کر بس اڈے پہنچ گئے۔وہاں سے سردار نے پشاور اور میں نے راولپنڈی کی بس پکڑی۔

رات کے نو بجے حلہ گنگ بس اڈے پر اتر کر میں نے ٹیکسی لی اور گھر کو روانہ ہوا۔میرا گاؤں شہر سے چھے سات کلو میٹر ہی دور تھا۔دن کو تو میں پیدل ہی چلا جایا کرتا تھا لیکن رات ہو چکی تھی اور رات سے زیادہ پلوشے کو دیکھنے کی خواہش سے مغلوب تھا۔اسے میں نے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی۔گھر کے دروازے پر ٹیکسی کو فارغ کر کے میں نے دروازے کو ہاتھ لگایا تو کھلا ملا۔ابو جان عشاء پڑھ کر نہیں لوٹے تھے۔گھر کے صحن میں ایک قطار میں چار پائیاں رکھی تھیں۔پہلے ابو جان اور امی کی چار پائیاں تھیں،ان سے ملحق عدیل اور پھوپھو کی چار پائیاں تھیں اور پھر درمیان میں چند فٹ جگہ چھوڑ کر پلوشے اور روما کی چار پائیاں لگی تھیں۔صحن میں روشنی ہو رہی تھی،تبھی پھوپھو جان نے مجھے فوراً پہچان لیا تھا۔

''ارے شانی بیٹا!'' وہ وارفتگی سے میری جانب بڑھیں۔بانہوں میں بھر کر انھوں نے میرا ماتھا چوما،ماں جی بھی مسکراتے ہوئے قریب آ گئیں۔عدیل سویا ہوا تھا۔پھوپھو اور ماں جی سے پیار لے کر میں نے عبداللہ کا پوچھا۔فوجی بے چارے کی مجبوری ہوتی ہے کہ براہ راست بچوں کی ماں کا نام لینے کے بجائے بچوں کا ذکر چھیڑ کر اس کے بارے سن گن لینے کی کوشش کرتا ہے۔

پھوپھو مسکرائیں۔''دونوں کمرے میں گھسی،جانے کیا کر رہی ہیں۔''

اسی وقت ابو جان داخل ہوئے۔مجھے دیکھ کر کھل اٹھے تھے۔وارفتگی سے معانقہ کیا،پھوپھو پلوشہ اور روما کو بلانے کمرے کی طرف بڑھیں۔میں نے آواز دے کر روکا۔''پھوپھو جان رہنے دیں،دیکھوں تو یہ اکیلے میں کیا کھچڑی پکا رہی ہیں۔''

پھوپھو شرارت سے مسکرائیں۔''اس شرط پر کہ انھیں ڈانٹو گے نہیں۔''

''اتنی بھولی بھالی ہیں نا کہ مجھے ڈانٹنے دیں گی۔'' منہ بناتے ہوئے میں روما کی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا،وہیں روشنی ہو رہی تھی۔برآمدے میں داخل ہوتے ہی ہلکی ہلکی موسیقی نے میرا استقبال کیا تھا۔

ماڑا ہیے تے ماڑا سہی یار جو ہیے (کمزور،خستہ حال ہے تو کیا ہوا یار تو ہے)

کجھ وی اوہوئے ساڈا پیار جو ہیے (کچھ بھی ہو آخر میرا پیار تو ہے)

کیوں ڈھولے دا،گلہ کراں میں تاں لکھ واری بسم اللہ کراں (کیوں محبوب کا گلہ کروں،میں تو (اس کی آمد پر) لاکھ بار بسم اللہ کروں)

چنگے ہون یار تے ہر کوئی سڑا دا ہیے (جب دوست اچھے ہوں تو ہر کوئی جلتا ہے)

تائیں سارا شہر میڈے نال لڑا دا ہے (اسی وجہ سے پورا شہر میرے ساتھ لڑتا ہے)
او ساریاں تو وڈا فنکار جو ہے۔ (وہ تمام سے بڑا فنکار جو ہے)
کجھ وی ہوے ساڈا یار تاں ہے (کچھ بھی ہو آخر میرا یار تو ہے)
کیوں ڈھولے دا گلہ کراں میں تاں لکھ واری بسم اللہ کراں

دروازے پر دبیز پردہ لٹکا ہوا تھا۔ جھری سے جھانکا تو پلوشے کمر سے دوپٹا باندھے رقص کر رہی تھی اور روما عبداللہ کو گود میں اٹھائے اس کے دونوں ہاتھوں کو تالیوں کے انداز میں بجا رہی تھی۔ میں نے پردے کی جھری سے سرگزار کر ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ روما کا سرخ و سفید چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھل اٹھا تھا۔ میرا اشارہ پا کر وہ مسکراتے ہوئے پلوشہ کی جانب متوجہ رہی جس کے قدم سرائیکی گیت پر بھی اسی مہارت سے اٹھ رہے تھے جیسا کہ پشتو گانوں پر تھرکتی تھی۔ ریشمی بال اب کندھوں سے نیچے تک جھول رہے تھے۔ اس کا خوب صورت رقص مجھے مبہوت کر گیا تھا۔ میں دبے قدم اندر داخل ہوا لیکن آگے بڑھنے کے بجائے دروازے پڑا کھڑا اسے وارفتگی و شوق سے گھورتا رہا، اچانک اس نے دائرے میں چکر کاٹا میرے جانب رخ ہوتے ایک دم اس کا بدن ساکن ہو گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے..... ''راجو!'' کہتے ہوئے اس نے زقند بھری اور پوری شدت سے میرے سینے سے آٹکرائی۔ میرے ہاتھوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا تھا۔ پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح اس کے شاداب چہرے پر پھسل رہے تھے۔

وہ سسکی۔ ''اتنی دیر لگا دی۔''

''گلے شکووں کا بہت وقت پڑا ہے۔'' ماتھے پر بوسا دے کر اسے میں نے نرمی سے علیحدہ کیا اور روما کی طرف بڑھا۔

اس نے ہاتھ ملانے پر اکتفا کرتے ہوئے عبداللہ میری طرف بڑھا دیا تھا۔ وہ چھے سات ماہ کا ہو گیا تھا۔ ماں کی گود سے نکلتے ہی رونے لگا۔

''رُلا دیا ناں میرے شہزادے کو۔'' پلوشہ نے اسے جھپٹ لیا تھا۔

''کیا ہو رہا تھا؟'' شرارتی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے میں روما کو مخاطب ہوا۔

''کچھ نہیں، یونہی گپ شپ کر رہی تھیں۔''

پلوشے نے منہ بنایا ''اچھی طرح دیکھ لیا ہے پھر پوچھنے کا مطلب۔''

''تم خاموش رہو، روما سے پوچھ رہا ہوں کہ تمھیں میں اسی کے حوالے کر گیا تھا۔''

''تو.....'' پلوشہ نے آنکھیں نکالیں۔

میں نے برہمی دکھائی۔ ''تو یہ کہ تمھیں قابو میں رکھنا چاہیے تھا۔ یوں بے شرم عورتوں کی طرح ناچ گانا کون سی شرافت ہے۔''

وہ بگڑ کر بولی۔ ''باجی! آپ عبداللہ کو پکڑیں اور پشتو کا گانا لگائیں۔ دیکھتی ہوں یہ کیسے رو سکتے ہیں۔''

رومانہ کی طرف رخ کرتے ہوئے میں نے آنکھ میچ کر کہا۔ ''روما چلاؤ گانا، دیکھتا ہوں یہ کیسے ناچتی ہے۔''

رومانہ نے مسکراتے ہوئے موبائل فون پر ایک پشتو گیت چلا دیا۔

وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''جی جی میں جانتی ہوں۔ آپ یونہی ترستے رہیں گے۔'' اور عبداللہ کو روما سے لے کر باہر بھاگ گئی۔ اس کے نکلتے ہی روما وارفتگی سے میرے قریب ہوئی۔ ''جھوٹے اجنبی، بتایا کیوں نہیں آپ آ رہے ہیں۔''

''سوچا اپنی روما کو اچانک خوش ہوتا دیکھوں۔''

''کھانا کھا لیا ہے۔'' میری چھاتی سے سر اٹھا کر اس نے آنکھوں میں جھانکا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کب کا تمھارے ہاتھوں کی بنی روٹی کو ترس رہا ہوں۔''

وہ فوراً بولی۔ ''اچھا میں ابھی گرم گرم روٹی بناتی ہوں۔''

''چلو۔'' اسے ساتھ لیے میں باہر نکل آیا۔ کھانا تیار ہونے تک ہم اکٹھے بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ روما نے تازہ روٹیاں بنا کر لے آئی تھی۔ اتفاق سے کدو گوشت بنا تھا جو میرا پسندیدہ کھانا ہے۔ اور پھر محبت کرنے والی بیوی کے ہاتھ کی بنی ہوئی گرم گرم روٹیاں، میں ضرورت سے چند نوالے زیادہ ہی کھا گیا تھا۔

کھانا کھا کر میں ابو جان کی ٹانگیں دبانے لگا۔ دو تین منٹ بعد وہ شفقت سے بولے۔ ''بیٹا! مجھے نیند آ رہی ہے، تم بھی آرام کرو۔''

''جی ابو جان۔'' کہہ کر میں اٹھ گیا۔

روما عبداللہ کو چھاتی سے لگائے بیٹھی تھی۔ میں خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ عبداللہ کو سیر کرا کر اس نے پلوشہ کے حوالے کیا اور میرے پیچھے خواب گاہ میں آ گئی۔ عبداللہ کو پلوشہ نے سنبھالنا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ پہلی رات زبردستی روما کو میرے پاس بھیجا کرتی تھی۔ گو میری پہلی بیوی ہونے کی خصوصیت اسے حاصل تھی، مگر وہ روما کو مقدم رکھتی تھی۔ البتہ روما کی باری ہو یا اس کی، گھر میں آخری رات وہی میرے ساتھ ہوتی تھی۔ ویسے بھی روما اس کا چھوٹی بہنوں کی طرح خیال رکھتی تھی۔ وہ کشمیری چرواہن بہت باظرف اور کشادہ دل کی مالک تھی۔ نرم گفتار، خوش اخلاق، خدمتی اور گلے شکووں سے عاری مزاج کی مالک اللہ پاک کی طرف سے میرے لیے بہت بڑا انعام تھی۔ میں بھی اس کا بہت زیادہ خیال رکھتا تھا۔ وہ مجھے بہت زیادہ پیاری بھی تھی۔ لیکن پلوشے کی بات اور تھی۔ اس کے بغیر تو میں زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

روما کافی دیر دکھڑے سناتی رہی، جدائی کے دنوں کی تلخیاں جو کبھی کال پر نہیں بتا سکی تھی، دوسروں کو تسلی اور دلاسے دے کر خود کو مضبوط و حوصلہ مند ثابت کرنے والی اتنی بھی سخت جان نہیں تھی کہ اکیلے میں نہ روتی۔ بے کیف دنوں اور جاں گسل راتوں کی کہانی سناتے ہوئے وہ سسک پڑی تھی۔ بلاشک و شبہ وہ مجھے بہت زیادہ چاہتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ ماں، باپ، بھائی، رشتہ دار اور گھر بار چھوڑ کر تن تنہا میرے ساتھ چلی آئی تھی۔ گزشتہ شب پلوشہ اور روما کے دیدار کی خوشی نے مجھے سونے نہیں دیا تھا تو آج روما کی وارفتگی اور چاہت آنکھیں بند کرنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ اسے بہت کچھ کہنا، بہت کچھ سننا، بہت کچھ کھوجنا، بہت کچھ ماننا اور بہت کچھ منوانا تھا۔ اسے اپنے جھوٹے اجنبی سے پیار تھا، اس کی ضرورت و حاجت تھی اتنی طویل جدائی کے بعد وہ مجھے سونے کی اجازت کیسے دے سکتی تھی۔ صبح کی اذان کے ساتھ یاقوتی ہونٹوں پر دل فریب تبسم اور کالی سیاہ آنکھوں میں آسودگی و خمار کی فراوانی لیے وہ میری پیشانی پر جھکی۔ ''آپ کے شہزادے کے اٹھنے کا وقت ہوا چاہتا ہے۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''بیٹے کا تو بڑا خیال ہے کہ ساری رات سلائے رکھا، اور شوہر غریب کا کیا جو گزشتہ رات بھی سو نہیں سکا اور آج بھی تم نے پلک جھپکنے کی اجازت نہ دی۔''

اس نے قہقہہ لگایا۔ ''آج رات کو سو جانا۔''

میں مظلومانہ انداز میں بولا۔ ''ہنس لو..... ہنس لو۔''

میرے گال پر چٹکی بھر کر وہ غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔

—●—

نماز پڑھ کر میں سو گیا تھا لیکن نیند کی عیاشی میری قسمت میں نہیں تھی۔ دو تین گھنٹوں بعد ہی پلوشے نے زبردستی جگا کر تیار ہونے کو کہا کہ اسے شاپنگ کرنے جانا تھا۔

میں لجاجت سے بولا۔ ''کل بھی جا سکتے ہیں۔''
''ایسا بس آپ سوچتے ہیں۔'' میری بغلوں میں ہاتھ دے کر وہ گدگدی کرنے لگی۔
''قسم سے سخت نیند آ رہی ہے۔'' میں نے جان چھڑانے کی ایک اور کوشش کی۔
''یہ آپ کا مسئلہ ہے۔'' وہ پلوشہ ہی کیا جو مان جاتی۔
''سہ پہر کو چلے جائیں گے ناں۔'' میری کوشش جاری رہی تھی۔
''آپ عزت سے بستر چھوڑ رہے ہیں یا.....'' اس نے دھمکی آمیز لہجے میں آنکھیں نکالیں۔ ہلکی نیلی موٹی آنکھوں کا رعب ایسا نہیں تھا کہ مزید لیٹا رہ سکتا۔ میں تازہ دم ہونے غسل خانے میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد کھانا کھا کر ہم پانچوں کار میں بیٹھے راولپنڈی جا رہے تھے۔ میں، پلوشہ، روما، پلوشہ کا چھوٹا بھائی عدیل اور عبداللہ۔ ڈرائیونگ سیٹ پر پلوشہ اور اس کے ساتھ روما بیٹھی تھی۔ میں اور عدیل عقبی نشست پر تھے۔

ہماری واپسی شام کو ہوئی تھی۔ عشاء کی نماز پڑھ کر لوٹا تو پلوشہ اپنی خواب گاہ میں دلھن کی طرح سجی سنوری میری منتظر تھی۔ ایک سنائپر کو مشن پورا کرنے کو کئی کئی گھنٹے مسلسل جاگنا پڑتا ہے۔ سخت شاخوں کی مچان، پتھریلی کمین گاہوں، برفیلے کھوہ اور گرم تپتی ریت پر موت و زندگی کی کش مکش سے نبرد آزما ہوتے ہوئے نیند سے لڑنا اور بات ہے، نرم بستر پر ریشمی بانہوں کی آغوش میں لیٹ کر جاگنا علیحدہ مسئلہ ہے۔ اور موخر الذکر مرحلہ زیادہ دشوار ہے، کیوں کہ سکون و آرام کے سارے لوازمات کی موجودی میں نیند کو شکست دینا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس ضدی، ہٹ دھرم اور ہمیشہ اپنی منوانے والی سے زیادہ دیر میری حالت پوشیدہ نہیں رہی تھی۔

''مجھے آپ کی ہوں ہاں سننے کا کوئی شوق نہیں ہے راجو! بہتر ہوگا نیند پوری کر لیں۔''
''شکریہ۔'' اضطراری انداز میں میں نے اسے مزید قریب گھسیٹا حالاں کہ یہ ایک بے فائدہ کوشش تھی۔ وہ پہلے ہی میرے بدن کا جزو بنی ہوئی تھی۔

—●—

وقت نشیب میں بہتے پانی کی طرح گزر رہا تھا۔ منٹوں نے سیکنڈوں کی رفتار پکڑی، گھڑیاں لمحوں میں بٹنے لگیں، گھنٹوں نے ساعتوں کا چولا پہنا اور دن پر لگا کر اڑنے لگے۔ مہینا، ہفتے ہی میں گزر گیا تھا۔ امی، ابو اور پھوپھو کی شفقتیں سمیٹنا، روما و پلوشے کی چاہتیں وصول کرنا، عبداللہ و عدیل پر محبتیں نچھاور کرنے کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں تھا۔ اویس سے بھی دو تین سرسری ملاقاتیں ہی ہو سکی تھیں۔ استاد عمر دراز سے ملاقات کرنے کی توفیق بھی نہ ہوئی۔ بس انھیں گھنٹی کر کے گپ شپ کر لی تھی۔ جینی سے بھی بات ہوئی تھی، پال کلفٹن نے بھی چند چٹکلے سنائے تھے۔ گلگارے سے ملنے کا وعدہ مسلسل التواء کا شکار جا رہا تھا۔ اس کے اصرار کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں تھا تبھی تو اسے گھنٹی بھی نہیں کر سکا تھا۔ دو دن چھٹی رہتی تھی جب اس نے خود کال کر لی۔

''چھٹی پر کب آئے؟'' رسمی کلمات کی ادائی کے بعد تفتیش شروع ہوئی۔
''فوجی چھٹی تبھی آتا ہے جب چھٹی ملتی ہے۔'' مزاحیہ انداز اپنا کر میں نے جواب گول مول کرنا چاہا۔
''یقیناً اس چھٹی پر وعدہ ضرور نبھاؤ گے۔'' تکرار کیے بغیر وہ مطلب کی بات پر آئی۔
''کل.....'' میں نے بہانہ کرنے کو زبان ہلانا چاہی۔
اس نے قطع کلامی کی۔ ''بہانے سے پہلے یہ جان لو کہ اگلے ہفتے آپ کی گڑیا بہن رنزا کی شادی ہے۔''
''کیا.....؟'' خوشگوار حیرت کے ساتھ مجھے اپنی چھٹی ختم ہونے کا دکھ بھی ہوا تھا۔

وہ کھل کھلائی۔''اب کیسے انکار کرو گے۔''

''گل!ایک بات کہوں۔''انکار کرنے کو میں نے تمہیدی الفاظ کی تلاش میں دماغ کے گھوڑے دوڑائے۔

اس کی مترنم ہنسی نے مجھے دوبارہ محظوظ کیا۔''مجھے کچھ کہنے کو آپ کو اجازت لینے کی ضرورت کب سے پیش آنے لگی۔''

''پرسوں میری واپسی ہے۔''ساری تمہیدیں بھلا کر میں نے سچ اگلا۔

''کتنی چھٹی آئے تھے۔''اس کا عام سا لہجہ مجھے ڈرا گیا تھا۔

میں صاف گوئی سے بولا۔''ایک ماہ۔''

''آپ نے گزشتہ چھٹی پر آنے کا وعدہ کیا تھا اور دوسری چھٹی بھی گزار دی۔اسی وجہ سے مجھے گھنٹی بھی نہ کی تا کہ میرے اصرار کا سامنا نہ کرنا پڑے۔''اس کا دکھ بھرا لہجہ مجھے پشیمان کر گیا تھا۔

''گل، یہ بات نہیں ہے.....''میرے پاس سوائے ندامت کے کوئی جواب موجود نہیں تھا لیکن میری معذرت سنے بغیر اس نے قطع کلامی کی۔

''سوری، آیندہ آپ کو بہانے بازی یا انکار کی زحمت نہیں کرنا پڑے گی۔خدا حافظ۔''میرا جواب سنے بغیر اس نے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

میں بلبلا ہوا۔''گل بات سنو.....''مگر وہ جا چکی تھی۔میں نے جوابی کال کی مگر اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔

پلوشہ چائے کی پیالی اٹھائے اندر آئی۔وہ شاید نماز پڑھ کر آ رہی تھی کہ سیاہ دوپٹے میں موہنا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔''کیا ہوا؟''میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ پریشان ہو گئی تھی۔

میرے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔''گلگارے کی کال تھی، رنزا کی شادی میں شرکت کی دعوت دے رہی تھی۔میرے انکار پر سخت خفا ہو کر رابطہ منقطع کر دیا۔''

پلوشہ ہنسی۔''آپ نے پچھلی چھٹی میں اس کے پاس جانے کا وعدہ کیا تھا اور دوسری چھٹی بھی گزار دی۔''

چائے کی پیالی لیتے ہوئے میں رومانوی لہجے میں بولا۔''اپنی پلوشے سے فراغت نصیب ہو تو کچھ یاد آئے۔''

''ایک بات مانیں گے۔''وہ میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

''ٹالی کب ہے۔''بایاں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر میں نے اسے مزید قریب کیا۔

وہ لجاجت سے بولی۔''چھوٹی بہن کی شادی کا کہہ کر چند دن چھٹی مانگ لیں، اس بہانے اپنا وعدہ بھی ایفاء کر لیں گے۔''

اتنا تو میں بھی جانتا تھا کہ اس کے لیے میرے وعدے کا پورا ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا، وہ بس چند دن مزید میرے قریب رہنا چاہتی تھی۔عموماً فوجیوں کی بیویاں ایسی ہی خواہش رکھتی ہیں اور یونہی شوہر کو چھٹی لینے پر اکساتی رہتی ہیں۔کیوں کہ بے چاریاں فوج کے ماحول سے ناواقف ہوتی ہیں۔

میں دکھی دل سے بولا۔''میری واپسی پر ہی کسی دوسرے کی گھر آمد ہو پائے گی۔کوئی ایسا جس کی پلوشے اس کی جدائی کا ایک ایک دن کانٹوں پر لیٹ کر بتا رہی ہو گی۔جس کی نم آنکھیں اپنے راجو کی انگلیوں کی منتظر ہوں گی، جس کی سماعتیں اپنے محبوب کی سرگوشیاں سننے کو بے چین ہوں گی، جس کے بدن کا ہر عضو محبوب کے لمس کو بے کل ہو گا۔''

''مگر کسی کی حالت بھی ایسی نہیں ہو گی جو آپ کی پلوشے کی ہے۔''مجھے بانہوں کے گھیرے میں لیتے ہوئے وہ رو پڑی تھی۔

اس کی آنکھوں کا نمکین پانی چکھتے ہوئے میں نے سمجھایا۔''لوٹوں گا تو اگلی چھٹی ملے گی ناں۔''

''ایک آپ کے نوکری چھوڑ نے سے فوج کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔آپ کی جگہ فوج کو کئی جوان مل جائیں گے۔'' وہ پرانا راگ الاپنے لگی۔

میں ہنسا۔''اگر ہر ایک نے یہی سوچنا شروع کر دیا تو۔''

وہ چلائی۔''فلسفوں سے نہ بہلائیں۔''

''اچھی طرح جانتی ہو میں نہیں مانوں گا پھر توانائیاں کیوں ضائع کرتی ہو۔'' چائے کی خالی پیالی میز پر رکھ کر میں اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

وہ بپھرتے ہوئے بولی۔''میں کچھ نہیں جانتی آپ ابھی گھنٹی کر کے ایک ہفتے کی چھٹی مانگیں۔''

''پلوشے! پاگل نہیں بنتے.....''

وہ مصر ہوئی۔''ہاں یا ناں.....''

''تمھیں.....''

''ہاں یا ناں.....'' وہ کچھ سننے کو تیار نہیں تھی۔

''بہت بری اور گندی ہو۔'' درشتی سے کہہ کر میں تصور صاحب کا نمبر ملانے لگا۔اس لاڈلی کا اتنی سخت بات ہضم کرنا آسان نہیں تھا،لیکن مجھے کال کرتے دیکھ کر احتجاج کیے بغیر مجھے چمٹی رہی۔

''شکر ہے اللہ پاک نے تمھیں بھی توفیق دے دی۔'' سلام کا جواب دیتے ہی تصور صاحب نے پھبتی کسی۔

خفیف ہنسی کے ساتھ میں نے فلسفہ بگھارا۔''بڑوں کی یاد مسئلے یا مصائب کے بعد ہی آتی ہے۔''

وہ بولے۔''کمانڈنگ آفیسر کافی بے چینی سے تمھارے منتظر ہیں۔''

میرے دل میں بدگمانی کی لہر اٹھی کہ شاید میرے مسئلے کا سن کر وہ جان چھڑانا چاہتے ہیں،لیکن فوراً ہی سر جھٹک کر اچھے خیال کو دور پھینکا کہ راؤ تصور صاحب ایسے کمزور کردار کے بالکل بھی نہیں تھے۔

میں مطلب پر آیا۔''ان کے انتظار میں ہفتے بھر کا اضافہ کرنے کے بارے کیا خیال ہے۔''

وہ حیرانی سے مستفسر ہوئے۔''کیا ہوا؟''

میں صاف گوئی سے بولا۔''منہ بولی بہن کی شادی ہے۔شامل نہ ہوا تو رشتے میں دراڑیں پڑنے کا اندیشہ ہے۔''

''جوابی کال کرتا ہوں۔'' انھوں نے انتظار کا کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

''کیا ہوا؟'' کال ختم ہوتے ہی وہ بے تابی سے مستفسر ہوئی۔

''اپنے سینئر کو بتا دیا ہے وہ کمانڈنگ آفیسر سے معلوم کر کے تھوڑی دیر تک بتا دیں گے۔''

''میں صلوۃ الحاجت پڑھ لوں۔'' وہ سرعت سے مصلے کی طرف بڑھ گئی۔بلاشک وشبہ حاجت روا اور مشکل کشا وہ اکیلا مالک ہے۔اور پلوشہ اسی کی بارگاہ میں مانگنے بھاگی تھی۔میری چند دن کی چھٹی کی خاطر جھولی پھیلانے والی نہ جانے میری سلامتی کے لیے کتنی مناجات کرتی ہوگی۔

بہت سے ایسے مواقع جب میری سماعتیں موت کے قدموں کی چاپ واضح انداز میں سن رہی تھیں تب اس صورت حال سے میں اتنے عجیب انداز میں بچا جو کسی چاہنے والے کی مناجاتوں ہی کے مرہون منت ہو سکتا تھا۔یقیناً امی جان،ابو جان،پھوپھو جان بھی میرے لیے دعا گو رہتے تھے،لیکن اس ضمن میں میری شریک حیات بھی کسی سے پیچھے نہیں تھیں۔

عصر پڑھ کر میں عبداللہ کو گود میں بٹھائے ابو جان سے گپ شپ کر رہا تھا۔ روما کھلے باورچی خانے میں ہانڈی بنا رہی تھی۔ دیگچی میں چمچ گھماتے ہوئے نظریں گاہے گاہے میرے چہرے کا طواف کرنے لگتیں اور میرے دیکھنے پر دل فریب تبسم اس کے ہونٹوں پر مچلنے لگتا۔ پلوشہ، عدیل کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلتے ہوئے شور مچا رہی تھی۔ بہن بھائی نے مجھے بھی دعوت دی تھی، لیکن میرے ساتھ کھیلتے ہوئے پلوشہ کی دغابازی عروج پر ہوتی تھی۔ اور احتجاج کرنے پر ناراضی و خفگی کی دھمکیوں سے میری جان سولی پر لٹکائے رکھتی۔ اس کا بہتر حل مجھے یہی سوجھا تھا کہ کھیلنے ہی سے احتراز برتوں۔

موبائل فون کی گھنٹی بجنے پر میری نظریں سکرین پر پڑیں، راؤ تصور صاحب کا نام دیکھ کر میں نے دھڑکتے دل سے کال وصول کی۔

''برخوردار! دس دن کافی ہیں۔''

تصور صاحب کی چہکتی آواز نے میرے کانوں میں رس انڈیلا۔

میں ممنونیت سے بولا۔

''بہت بہت شکریہ سر۔''

تصور صاحب ہنسے۔ ''کمانڈنگ آفیسر کسی ضروری کام سے بے صبری سے تمھارے منتظر ہیں، بڑی مشکل سے آمادہ ہوئے ہیں۔''

میں نے دہائی دی۔

''میری قسمت میں تو راوی نے کافی عرصے سے وزیرستان گردی لکھی ہوئی ہے۔''

انھوں نے پھبتی کسی۔ ''بے شرم اپنے سسرال جانے پر خفا ہو۔''

میں مسمسے لہجے میں بولا۔

''اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کی اگر بھنک بھی پلوشے کو پڑ گئی تو اضافی دس دن تو اسے مناتے ہی گزریں گے۔ اس لیے یہ کہنا ہی پڑے گا کہ میں وہاں بہت خوش ہوں۔ ٹھنڈ کا کیا ہے کہ وہ تو دسمبر جنوری میں تلہ گنگ میں بھی پڑتی ہے، پہاڑوں کا کیا ہے کہ کشمیر جنت نظیر میں یہاں سے بھی زیادہ ہیں۔ باقی رہا دہشت گردوں کا مسئلہ تو وہ ہر جگہ موجود ہیں۔''

انھوں نے قہقہہ لگایا۔ ''یار اب تک بیوی سے ڈرتے ہو۔''

''سر جی! اب منہ نہ کھلوائیں، جیسے کہ میں جانتا ہی نہیں زندگی کے بہترین تیس سال آپ نے فوج میں کیوں گزار دیے۔''

وہ شاکی ہوئے۔ ''دھت تیرے کی بے شرم، کیا تیس سالوں سے میں بیوی کے ڈر سے فوج کی نوکری کر رہا ہوں۔''

میں بے تکلفی سے بولا۔ ''میرے نہ کہنے سے حقیقت نہیں بدلے گی سر! ورنہ آپ کے لیے جھوٹ بولنے کا گناہ لے لیتا۔''

وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولے۔ ''اگر چھٹی کرا سکتا ہوں تو ایک دن پہلے بلوانے کا اختیار بھی رکھتا ہوں۔''

میں گھبرا کر بولا۔ ''مذاق کر رہا تھا سر!''

''پتر! اگر میں نے مذاق کیا تو پلوشہ بی بی یہ چھٹی تو کیا آنے والی کئی چھٹیوں تک تمھارا تھوبڑا نہیں دیکھنا چاہے گی۔''

میں دعوے سے بولا۔

''پلوشہ مجھ سے خفا نہیں ہو سکتی۔''

انھوں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''زرینہ کے ساتھ جو رنگ رلیاں مناتے رہے ہو اس پر موبائل فون اور نقد رقم لٹاتے رہے ہو اس کی بابت معلوم ہونے پر بھی.....''

میں نے دانت پیسے۔

''سردار خان کی گچی (گردن) تو میں ضرور مروڑوں گا۔''

تصور صاحب کا قہقہہ بلند ہوا۔ ''برخوردار! اب تک تو میں نے کشمالہ کا ذکر نہیں کیا، ایک کے ذکر ہی پر تمھاری چیں بول گئی ہے۔''

میں شاکی ہوا۔ ''آپ نے سردار خان جیسے میرے مخالف کی بات پر یقین کر لیا۔''

وہ سنجیدہ ہوئے۔ ''سردار خان نے جو کچھ بتایا ہے اس بارے تو تمھاری کلاس ملنے پر لوں گا..... غضب خدا کا رنج ماسٹر کی دو گولیوں کی اہمیت جانتے ہو۔''

میں نے دہائی دی۔ ''جو پچیس ہدف پر ماری ہیں اس کا ذکر سردار خان نے نہیں کیا۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولے۔

''بہت کمال کیا ہے ناں۔''

''سر! دونوں گولیاں میں نے جان بوجھ کر فائر کی تھیں، حالات ہی ایسے تھے کہ مجھے مجبوراً بغیر ہدف تاڑے نشانہ سادھنا پڑا۔''

وہ تکرار ختم کرتے ہوئے بولے۔

''ملنے پر بات ہو گی جناب، فی الحال چھٹی کے مزے لو۔''

''اسلام علیکم سر!'' میں نے الوداعی سلام کہا اور انھوں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

بے حیا پٹھان نے جیسا کہا تھا ویسا ہی کر دکھایا تھا۔ مجھے تصور صاحب سے بے عزت کرانے کو وہ اتنا بے صبر تھا کہ چھٹی ختم ہونے کا انتظار کیے بغیر انھیں کال کر ڈالی تھی۔

''کیا رہا؟'' باتوں کے شغل میں مجھے پلوشہ کی آمد کا پتا بھی نہیں چلا تھا جو میرے کانوں سے کان جوڑے بات چیت سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ یقیناً گھنٹی آتے ہی وہ اس امید پر قریب آئی تھی کہ یونٹ سے کال ہو گی۔

میں ڈرا کہ کہیں اس نے زرینہ اور کشمالہ کا نام نہ سن لیا ہو تبھی حفظ ماتقدم کے طور پر بولا۔ ''سردار خان نے استاد محترم کو میری جھوٹی شکایتیں لگائی ہیں اسی کے متعلق بات کر رہا تھا۔''

''چھٹی کا کیا ہوا؟''

اسے جھوٹی، سچی شکایتوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔

''دس دن بڑھ گئی ہے۔''

''سچ۔'' خوشی سے کھلتے ہوئے وہ مجھے لپٹ رہی تھی کہ ابو جان پر نظر پڑی۔ مجھے لپٹنے والی بانہیں ایک دم عبداللہ کو گرفت لینے کو بڑھ گئیں۔ حیا کی لالی نے اس کے چہرے کو سرخ گلاب کر دیا تھا۔

—— ● ——

رنزا کی شادی میں شرکت کا موقع مجھے آسانی سے مل گیا تھا۔ رات کو میں نے چند بار گل کا نمبر ملایا مگر اس نے شاید موبائل فون کو پکا ہی بند کر دیا تھا۔ سخت ناراض لگ رہی تھی۔ لیکن یقین تھا میری آمد پر اس کی ناراضی ختم ہونے میں دیر نہ لگتی۔ دوسرے دن میں نے روما اور پلوشے کے ساتھ جا کر شمریز چچا اور اس کے بچوں کے لیے تحائف خریدے۔ اسی رات کو ہم جانے کو تیار تھے۔ میں نے روما کو آنے کی دعوت دی مگر عبداللہ کی وجہ سے اس نے انکار میں سر ہلا دیا تھا۔ امی جان بھی اپنے بھائی اور اس کے بچوں کو ملنا چاہتی تھیں۔ اور ماں کی وجہ سے عدیل بھی مچل اٹھا تھا۔ پلوشہ کے اصرار پر ہم اپنی کار ہی میں روانہ ہوئے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ بھی اسی نے سنبھالی تھی۔ ماں جی اور عدیل تو جلد ہی سو گئے مگر موصوفہ نے مجھے ایک منٹ بھی سونے کی اجازت نہ دی۔

صبح کا ناشتا ہم نے ڈیرہ اسماعیل خان میں جا کر کیا۔ آگے ڈرائیونگ سیٹ مجھے سنبھالنا پڑی، وہ سیٹ سے ٹیک لگا کر اطمینان سے سو گئی تھی۔

گرداوی چیک پوسٹ تک سڑک ہموار ہے، اس کے بعد پہاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ وانہ پہنچ کر ہم انگور اڈے کی سڑک پر مڑ گئے۔ دن کے گیارہ بجے ہم انگور اڈے پہنچ گئے تھے۔ عدیل اور امی جان کو ماموں کے گھر چھوڑ کر ہم کمانڈر نصر اللہ خوجل خیل کو ملنے چل دیے۔ کافی دیر گپ شپ کی، پرانے دوستوں اور واقف کاروں کا ذکر ہوا۔ میری کلاشن کوف اب تک ان کے پاس محفوظ پڑی تھی۔ حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے لے لی کہ آگے اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

وہ رات ہم نے پلوشہ کے ماموں کے ہاں گزاری تھی۔ اگلے دن صبح سویرے روانہ ہوئے۔ انگور اڈے چیک پوسٹ پر اپنا سروس کارڈ دکھا کر ہمیں آسانی سے آگے جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ راستہ مجھے معلوم تھا۔ خواگا اوبو تک سڑک یا گاڑی کا رستہ موجود نہیں تھا مجبوراً ہمیں کار پلوشہ کے ماموں کے گھر چھوڑنا پڑی تھی۔

پلوشہ گلاک نائنٹین لانا نہیں بھولی تھی۔ چیک پوسٹ سے تھوڑا سا آگے آتے ہی اس نے برقع اتار دیا تھا۔

''یہ مجھے دے دو۔'' اس نے بیگ لینے کو ہاتھ بڑھائے۔

میں ہنسا۔ ''کیا یہ ممکن ہے۔''

وہ چاہت سے بولی۔ ''راجو! مجھے اتنا نازک بھی نہ بنائیں۔''

''میرے لیے تو پھول سے نازک، کلی سے کومل اور کونپل سے ملائم ہے میری پلوشے۔''

وہ لاڈ سے بولی۔ ''پٹائی کرتے ہوئے تو یہ بھول جاتا ہے۔''

میں وارفتگی سے بولا۔ ''ہاتھ نہ ٹوٹ جائیں جو تمھاری پٹائی کروں۔''

''بھول گیا ہے، کتنی پٹائی کی تھی۔'' اس نے منہ بسورتے ہوئے مطعون کیا۔ اور یہ طعنہ وہ پہلی بار نہیں دے رہی تھی۔ ہر ایسے موقع پر یاد دہانی کرانا وہ فرض خیال کرتی تھی۔

میں مسمسے لہجے میں بولا۔ ''شادی کے بعد تو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔''

وہ ناز سے بولی۔ ''کوشش تو کرتے۔''

''اتنی جرأت کہاں۔''

''رنڑا لوگوں کو اپنی آمد سے آگاہ کر دیا ہے۔'' اس نے موضوع تبدیل کیا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''فون بند جا رہا ہے۔''

وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''کافی لاڈلی لگتی ہے۔''

میرے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''اس کا گلہ بجا ہے۔ میں وعدہ کر کے بھی نہ جا سکا۔ بیچ میں چھٹی آؤں تو تمھارے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے۔''

اس نے مسکراتے ہوئے میرے پیٹ میں انگلی چبھوئی۔ ''جھوٹے، میں نے تو آپ کے ساتھ ہی آنا تھا۔''

میں نے بات بنائی۔ ''جب تمھارے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے تو وعدہ کیسے یاد رہتا۔''

میرا بازو کھینچتے ہوئے وہ سامنے آئی، سر میری چھاتی پر ٹیکتے ہوئے گلوگیر ہوئی۔ ''راجو! بار بار اقرار کرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں جانتی ہوں آپ کے لیے کیا ہوں۔''

میں نے چھیڑا۔ ''بھینٹری! خود ہی تو پوچھتی رہتی ہو، بتاؤ کتنی پیاری ہوں، کیسی لگتی ہوں، کتنا یاد آتی ہوں۔ اور اب اقرار کی ضرورت نہیں۔''

ہونٹوں پر خفیف ہنسی لیے اس نے علیحدہ ہو کر آگے قدم بڑھائے۔ ''رنڑا کی شادی کہاں ہو رہی ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پتا نہیں۔''

وہ کرید کرید کر چچا شمریز کے کنبے کے متعلق تفصیل پوچھتی رہی۔ گلگارے کے بارے میں اسے پہلے بھی تفصیل بتا چکا تھا، اب دوبارہ سب کچھ دہرانے لگا۔ دوپہر کو ایک چشمے کے کنارے رک کر کھانا کھایا اور پھر چل پڑے۔ رات ہم نے ایک غار میں گزاری۔ حلہ گنگ کی گرمی سے جھلسے اجسام کو وزیرستان کی سردی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ لحاف، کمبل وغیرہ تو تھا نہیں سردی سے بچنے کو آگ جلانا پڑی۔ پلوشے تو آرام سے میری گود میں سر رکھ کر برقع اوڑھ کر لیٹ گئی تھی۔ میں غار کی دیوار سے ٹیک لگائے اونگھتا رہا۔ اگلے روز طلوع آفتاب سے پہلے ہی ہم روانہ ہوئے، یہ وہی راستہ جس پر کبھی برف باری اور سرد ہواؤں سے لڑتا ہوا میں گلگارے کے دروازے پر جا گرا تھا۔ آج موسم صاف تھا۔ سہ پہر ڈھلے ہم آخری ڈھلان پر چڑھ رہے تھے۔ ڈھلان کے خاتمے پر چچا شمریز کے گھر کا دروازہ تھا۔

قریب جا کر میں نے دستک دی۔ دروازہ شمر خان نے کھولا تھا۔

''لالا جان!'' مجھے دیکھتے ہی وہ چیخ کر لپٹ گیا تھا۔

''پلوشہ باجی کیا حال ہے۔'' مجھ سے علیحدہ ہو کر اس نے پلوشہ کے سامنے سر جھکایا۔

''ارے، تم مجھے جانتے ہو۔'' وہ حیران رہ گئی تھی۔

وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ ''اگر آپ لالا جان کے ساتھ نہ آئی ہوتیں تب بھی پہچان لیتا۔''

ہم اندر داخل ہوئے، رنڑا باورچی خانے کے دروازے پر کھڑی تھی، شاید شمر کے چلانے کی آواز نے اسے باہر جھانکنے پر مجبور کیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ''لالا جان!'' کہتے ہوئے بھاگی، لیکن قریب آتے ہی جھجک کر رکی اور میرا ہاتھ تھامتے ہوئے سر جھکا دیا۔ پہلے وہ لپٹ جایا کرتی تھی۔ لیکن اب اس کا بچپنا تھا۔ اور اب وہ بھرپور جوان نظر آ رہی تھی۔

اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے میں نے شفقت سے پوچھا۔ ''کیسی ہے میری بہادر بہن۔''

''بالکل ٹھیک۔'' میرا ہاتھ چھوڑ کر وہ پلوشے سے لپٹ کر بولی۔ ''شکر ہے لالا نے آپ کی زیارت کروا دی۔ ورنہ اب تو ہمیں لگنے لگا تھا کہ پلوشہ باجی کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔''

پلوشہ دھیرے سے مسکرادی تھی۔ بہن بھائی کی وارفتگی اسے حیران کن لگی تھی۔ پہلی بار ہی وہ اس چاہت سے مل رہے تھے جیسے پلوشہ ان کی برسوں کی شناسا ہو۔

میں نے پوچھا۔ ''چچا کہاں ہیں؟''

رنزا بولی۔ ''باجی کو چھوڑنے گئے ہیں، آتے ہی ہوں گے۔''

میں شرارتی لہجے میں بولا۔ ''میری گڑیا اتنی بڑی تو نہیں ہوئی کہ چچا شمریز کو شادی کی جلدی پڑ گئی۔''

سر جھکاتے ہوئے وہ حیا آلود لہجے میں بولی۔ ''باجی تو کہہ رہی تھیں آپ نہیں آئیں گے۔''

''ایسا بھلا ہو سکتا ہے۔''

''آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی۔'' ہمیں اندر چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے گلہ کیا۔

چارپائی پر نشست سنبھالتے ہوئے میں نے کہا۔ ''دوسرا دن ہے گل کا فون بند جا رہا ہے۔''

رنزا ہنسی۔ ''آپ کا انکار سن کر انھیں غصہ آ گیا تھا۔ ویسے آپ بابا جان کے نمبر پر کال کر لیتے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرے پاس چچا جان کا نمبر نہیں تھا۔''

چچا شمیریز اندر داخل ہوئے۔ ہمیں دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھے تھے۔ مجھ سے بھرپور معانقہ کر کے انھوں نے پلوشہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''یقیناً مجھے پلوشہ بیٹی کو دیکھنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔''

ان کا خلوص دیکھتے ہوئے پلوشہ مجذوب ہو گئی تھی۔ بغیر جان پہچان کے اتنی پذیرائی ملے تو آدمی کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

چچا شمیریز نے میرے ساتھ نشست سنبھالتے ہوئے بیٹے کو کہا۔ ''ثمر خان! اپنی باجی کو بلا لاؤ۔''

''صبح آ جائے گی نا۔'' میں نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

چچا شمیریز ہنسے۔ ''دوسرا دن ہے اس کی آنکھیں ماتھے پر ٹنگی ہیں، بروقت اطلاع نہ دی تو قطع تعلق کرنے پر تل جائے گی۔''

''وجہ؟'' میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

وہ ہنسے۔ ''آپ نے غالباً آنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہی برداشت نہیں ہو رہا محترمہ سے۔''

ثمر، باپ کا حکم سن کر کمرے سے نکل گیا تھا۔ ہم گپ شپ کرنے لگے۔ رنزا کی شادی گلگارے کے چھوٹے دیور شمس السلام سے طے پائی تھی۔

گپ شپ کے دوران ہی شام کا ملگجا اندھیرا چھا گیا تھا۔ ہم نماز پڑھنے کی تیاری کرنے لگے۔ نماز سے بہ مشکل فارغ ہوئے تھے کہ ثمر خان لوٹ آیا۔ گل اس کے ساتھ نہیں آئی تھی۔

وہ باپ کو بتانے لگا۔ ''باجی کل آئیں گی۔'' شاید اب تک خفا تھی۔

رنزا کھانا لے آئی۔ کھانے کے بعد قہوہ پیا گیا اور پھر عشاء تک وہیں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ رنزا نے پلوشہ سے جانے کتنے سوال پوچھے تھے۔ پلوشہ مدھر تبسم ہونٹوں پر بکھیرے جواب دیتی رہی۔ رنزا اس سے کافی متاثر نظر آ رہی تھی۔

میں عشاء کی نماز پڑھ کر دعا مانگ رہا تھا جب داخلی دروازے پر دستک ہوئی۔ ثمر خان دروازہ کھولنے چل پڑا۔ اس کی واپسی روشن چہرے اور نیلی آنکھوں والی گلگارے کے ہمراہ ہوئی تھی۔ اسے شوہر پہنچا گیا تھا۔ اپنی بیٹی رنزا کے حوالے کر کے وہ بے تابی سے پلوشہ کو لپٹ گئی تھی۔

میں بھی دعا مانگ کر ان کے قریب پہنچا۔ ''اب کیوں آئے ہیں؟'' نیلی آنکھوں میں گہری خفگی و برہمی نظر آ رہی تھی۔

میں نے اسے چڑایا۔ ''تمھارے لیے نہیں آیا، میری گڑیا بہن کی شادی ہے۔''

''آپ نے تو کہا تھا چھٹی ختم ہوگئی ہے۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''رنزا کی شادی کو اور چھٹی مانگی ہے۔''

وہ شاکی ہوئی۔ ''اور میرے اصرار کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔''

میری نظر پلوشے کی جانب اٹھی وہ مجھے گھور رہی تھی۔ یقیناً گلگارے کے گلے شکوے اسے پسند نہیں آئے تھے۔ کھنکارتے ہوئے میں نے موضوع تبدیل کیا۔ ''ننھی پلوشہ کدھر ہے؟'' گلگارے نے بیٹی کا نام پلوشہ رکھا تھا۔

''یہ لیں لالا جان!'' رنزا نے بچی میرے جانب بڑھائی۔

میں اس کے گال چومتا ہوا بولا۔ ''ارے واہ، یہ تو میری پلوشہ سے بھی زیادہ پیاری اور خوب صوت ہے۔''

گلگارے طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''یہ کیا، آپ کی پلوشہ سے اس کی ماں بھی خوب صورت نہیں ہے۔''

میں گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ ''آپ گپ شپ کرو، میں شمریز چچا سے چند ضروری باتیں کرلوں۔'' پلوشے کی تیز نظریں مجھے ہراساں کررہی تھیں۔

گلگارے برہمی سے بولی۔ ''تھوڑی دیر میرے پاس بھی بیٹھ جائیں اتنی رات کو جھک مارنے نہیں آئی۔''

''صبح سے کونین کی گولیاں چبا رہی ہو۔ آتو گیا ہوں، پھر ناراض ہونے کا مطلب۔''

اس نے آنکھیں نکالیں۔ ''اپنی بہن کی شادی پر آئے ہیں میرے لیے نہیں۔''

میں چڑ کر بولا۔ ''اچھا اگلی چھٹی پر تمھارے لیے آجاؤں گا، اب خوش۔''

''احسان نہیں کریں گے۔'' وہ منہ بناتے ہوئے پلوشہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''اور میری پیاری بہن کو لانا نہ بھولنا۔''

پلوشہ کے ہونٹ مسکرانے کے انداز میں کھلے مگر یہ ایک ناکام کوشش تھی۔

گل شاید توجہ نہیں دے پائی تھی یا تجاہل عارفانہ سے کام لے رہی تھی۔ وہ پلوشے کا ہاتھ تھام کر سہلانے لگی۔ ''مجھے آپ کو ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ اور راجو اتنے کٹھور ہیں کہ ذرا بھی پروا نہیں ہے۔''

پلوشہ ناگواری چھپاتے ہوئے بولی۔ ''آتو گئی ہوں۔''

وہ شوخی سے بولی۔ ''آپ نہیں جانتیں کتنے عرصے سے راجو ترسا رہے ہیں۔ پہلی ملاقات میں درخواست کی تھی۔ نجانے ڈرتے تھے کہ ان کی پلوشہ کو چھین لوں گی۔''

''گل! میں چچا شمریز سے تھوڑی گپ شپ کرلوں۔'' لجاجت سے کہتے ہوئے میں نے ایک بار پھر بھاگنے کی کوشش کی۔

وہ بادل نخواستہ بولی۔ ''ٹھیک ہے جائیں۔''

میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ اس نے آواز دی۔ ''اور ہاں، میں نے بہت سارا شہد جمع کر رکھا ہے، وعدہ یاد ہے ناں۔'' آخری ملاقات میں میں نے کہا تھا: ''اگر پلوشہ کی فکر نہ ہوتی تو کم از کم شہد ختم ہونے تک میں ضرور ٹھہرتا۔'' یقیناً اس نے کچھ نہیں بھلایا تھا۔

''جو بچ گیا ساتھ لے جائیں گے۔'' اطمینان بھرے لہجے میں کہتے ہوئے میں دوسرے کمرے میں گھس گیا۔

گلگارے جانے ان جانے میں اتنی بے تکلفی سے پیش آرہی تھی جو میری بیوی کو کسی بھی صورت برداشت نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے ذرا بھی شبہ ہوتا کہ وہ اتنی اپنائیت کا اظہار کرے گی تو شاید پلوشہ کو ساتھ ہی نہ لاتا۔ چچا شمریز نماز پڑھ کر لیٹ گئے تھے۔ میں ان سے گپ شپ کرنے لگا۔ دوران گفتگو پوچھا۔ ''گل کے بعد رنزا بھی اپنے گھر کی ہوگئی تو بادر جی

خانہ کون سنبھالے گا؟''

وہ معنی خیز لہجے میں مسکرائے۔''رنزا کی رخصتی کے بعد شاید ہمت کرلوں۔''

میں خوش دلی سے بولا۔''ہمت سے مراد اگر دوسری شادی ہے تو یہ قدم آپ کو بہت پہلے اٹھانا چاہیے تھا۔''

وہ صاف گوئی سے بولے۔''بیٹیوں کی وجہ سے حوصلہ نہ کرسکا۔''

''بیوی کی موجودی میں شریعت دوسری شادی کی اجازت دیتی ہے،لیکن بیوی نہ ہونے کی صورت یہ اجازت ضرورت کا درجہ حاصل کرلیتی ہے۔''

وہ مسکرائے۔''دیر آید درست آید۔''

میں بھی ہنس پڑا تھا۔

رنزا نے آکر بتایا۔''لالا جان، پلوشہ باجی اور آپ کے لیے علیحدہ کمرہ تیار کردیا ہے۔''ثمر خان بھی اندر آکر اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔رنزا مجھے اطلاع دے کر پلوشہ اور گلگارے کی طرف چل دی۔

چچا شمریز نے مشورہ دیا۔''تھکے ہوں گے،آپ کو آرام کرنا چاہیے۔''

''صبح گپ شپ کریں گے۔''میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ گیا کہ گزشتہ شب بھی آرام نہیں کر پایا تھا۔اور اس وقت اچھی خاصی تھکن محسوس ہورہی تھی۔

ثمر خان مجھے کمرہ دکھانے آیا اور واپس لوٹ گیا۔پلوشہ اب تک نہیں آئی تھی۔میں چوڑی مسہری پر لیٹ کر پلوشہ کا انتظار کرنے لگا کہ اس نے آتے ساتھ مجھے جگا دینا تھا۔

زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔جلد ہی دروازے پر قدموں کی چاپ ابھری۔کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے تیوریاں چڑھالی تھیں۔''آپ کب سدھریں گے۔''قریب آتے ہی وہ پھٹ پڑی۔

''کک.....کیا ہوا۔''میں ہکلا گیا تھا۔

وہ بگڑ کر بولی۔''معصوم نہ بنیں۔''

میں تجاہل عارفانہ سے بولا۔''کچھ پتہ تو چلے یار،خواہ مخواہ کیوں ڈرا رہی ہو۔''

''مجبور نہ کریں کہ آپ کو قتل کرکے خودکشی کرنا پڑے۔''

میں ہنسا۔''پھوپھو جان کو منع بھی کرتا ہوں کہ سالن میں زیادہ گرم مسالہ نہ ڈالا کریں۔''

وہ بپھرتے ہوئے بولی۔''گلگارے بی بی کیوں اتنی بے تکلف ہورہی تھی۔''

''یار،سب کچھ بتا تو دیا تھا۔''میں نے دہائی دی۔

''مگر یہ ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ آپ کو ان نظروں سے دیکھتی ہے،جس کی اجازت میں کسی کو نہیں دے سکتی۔''

میں نے دلیل دی۔''روما بھی تو دیکھتی ہے۔''

''وہ الگ معاملہ ہے،ان کے خلوص کی وجہ سے مجھے چپ سادھنا پڑی۔باقی کسی ایک کو حصہ دار بنانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں نے اپنے راجو کو چوک میں رکھ دیا ہے اور جس کی مرضی آئے حق جتانا شروع کردے۔''

''گلگارے کو بھی تم سے پیار ہے،یہاں تک کہ بیٹی کا نام تمھارے نام پر رکھا ہے۔''

وہ ترشی سے بولی۔''تو جو مجھے چاہے گی اسے راجو سے محبت کرنے کی اجازت دے دوں گی۔''

میں مدافعانہ انداز میں بولا۔''اس نے میری جان بچائی ہے۔''

وہ بے پروائی سے بولی۔''احسان مند ہوں اور ساری زندگی رہوں گی۔موقع آیا تو جان دے کر بدلہ چکانے کی

کوشش کروں گی، مگر راجو میں شرکت گوارا نہیں ہے۔"

میں نے صفائی دی۔ "وہ شادی شدہ ہے یار!"

"تو شوہر کی وفادار رہے۔"

"پلوشے! یاد رکھنا وہ اعلیٰ کردار کی مالک ہے۔"

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ "اس کے کردار پر شک نہیں، انداز سے چڑ ہے۔"

میں بے بسی سے بولا۔ "تم ناقابلِ علاج ہو۔"

"تو....." اس نے طنزیہ نظروں سے گھورا۔ "گولی مار دیں نشانہ آپ کا یوں بھی خطا نہیں جاتا۔"

میں جھلاتے ہوئے بولا۔ "پلوشے پٹو گی۔"

"ہاتھ تو لگاؤ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی جاؤں گی۔"

"یار! مجھے نیند آ رہی ہے۔" میں نے تنگ آ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"پہلے کبھی خفا ہو کر سونے کی اجازت دی ہے۔" اس کے ہونٹوں پر دل آویز تبسم ابھرا اور وہ میرے چہرے پر جھک گئی۔

اس کی پیش قدمی کا جواب دیتے ہوئے میں نے وارفتگی سے پوچھا۔ "کیا کوئی تمھاری جگہ لے سکتا ہے؟"

اس نے منہ بنایا۔ "خوف جگہ چھننے کا نہیں ہے، آپ کی بے راہ روی سے تنگ ہوں۔"

میں بے بسی سے مسکرا دیا تھا۔ مجھے سیدھے اور کرارے جواب دینا اسے اچھی طرح آتا تھا۔ بیوی بن کر بھی وہ محبوبہ کے درجے پر فائز تھی۔ اور ایسی بیوی کو جو محبوبہ بھی ہو، شوہر کو تگنی کا ناچ نچانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔

"بس یہ افسوس ہے کہ تم مجھے اتنی پیاری کیوں ہو۔"

"یہ فقط جھوٹا دعوا ہے۔" وہ کروٹ لے کر نزدیک سمٹی۔ مجھے گردن پر حلاوت آمیز اور گرم لمس محسوس ہوا جو اعلان کر رہا تھا کہ اسے میری بات پر سو فیصد یقین تھا۔ بس غصے میں ہونے کی وجہ سے اقرار نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

"جانتی ہو تمھارے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟"

وہ ناز سے بولی۔ "یہی کہ میرے بن رہنا مشکل لگتا ہے۔"

"نہیں بلکہ تم چوہوں سے بھی نہیں ڈرتی ہو۔"

اس نے وارفتگی سے اعتراف کیا۔ "آپ کی جدائی سے ڈرتی ہوں۔"

میں بے ساختہ بولا۔ "میں بھی۔"

—●—

اگلے دن شادی کے ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ شادی ہو اور ہلا گلا نہ ہو ایسا وزیرستان میں نہیں ہو سکتا۔ گو وہ علاقہ افغانستان کی حدود میں داخل تھا، لیکن وہاں رواج وزیرستان والے ہی تھے۔ پلوشے شور وغل اور ہلہلے کی ویسے ہی متوالی تھی۔ دن بھر رقص وسرود میں مشغول رہتی۔ گھر میں چونکہ غیر عورتوں کا بھی اکٹھ ہوتا اس لیے ناشتے کے بعد میں بیٹھک میں گھس جاتا۔ آخری دن عصر کے وقت دلھن لے جانے والوں کے لیے لکڑی کا چند انچ لمبا کھونٹا قریباً تین ساڑھے تین سو میٹر کے فاصلے پر گاڑا گیا۔ رواج کے مطابق جب تک دولھے والے کھونٹے کو گرا نہ دیتے دلھن کو نہیں لے جا سکتے تھے۔ چاہے اس کے لیے وہ پوری رات ہی کوشش کرتے رہتے۔

دولھا اور اس کے ساتھیوں کو فائر کی دعوت دی گئی۔ چونکہ یہ تقریب چچا شمریز کی حویلی سے متصل میدان ہی میں برپا

تھی اس وجہ سے عورتیں چھت پر چڑھ کر تماشا دیکھ رہی تھیں۔ میرے اندازے میں ہدف کا فاصلہ کلاشن کوف کی کارگر رینج سے تھوڑا زیادہ تھا۔ دولھا اور اس کے دوست باری باری نشانہ آزما رہے تھے۔ مگر کامیابی کسی کے نصیب میں نہیں تھی۔ عموماً تو دلھن والے کھونٹے کو معمولی سا زمین میں دباتے ہیں کہ ذرا سا گولی قریب کیا لگی اور کھونٹا گر گیا، اسی طرح وہ زیادہ سے زیادہ سوڈیڑھ سو میٹر کے فاصلے پر کھونٹا گاڑتے ہیں تاکہ جلدی ہی جان چھوٹ جائے۔ مگر وہ کھونٹا کچھ زیادہ ہی گہرائی میں دبایا گیا تھا کہ جب تک گولیاں مار کر اسے توڑا نہ جاتا زمین سے نہیں نکل سکتا تھا۔ فاصلہ بھی زیادہ تھا۔ مجھے یہ کسی کی شرارت لگ رہی تھی۔ یا تو اس کے پیچھے پلوشہ کا ہاتھ تھا یا گل نے ایسا کیا تھا۔

دولھے کے زیادہ تر دوست قسمت آزمائی کر چکے تھے۔ لیکن کھونٹا ان کا منہ چڑاتا ہوا قائم دائم تھا۔ کئی میگزینیں خالی کر کے بھی انھیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اب تو دولھے کے دوست نشانہ سادھنے سے کترانے لگے تھے۔

میں چچا شمریز کے پہلو میں بیٹھا دلچسپی سے ان کی کوششوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں موجود لوگوں میں فقط چچا شمریز ہی مجھے جانتا تھا، باقی لوگوں کے لیے میں اجنبی تھا۔ اور میرا تعارف کرانے یا اپنی نشانہ بازی سے انھیں متاثر کرنے کا کوئی شوق یا ارادہ نہیں تھا۔ اسی وقت ثمر خان قریب آ کر میرے کان میں سرگوشی کرنے لگا۔

''لالا جان! گل باجی کہہ رہی ہیں کہ کھونٹا کافی گہرائی تک ٹھونکا گیا ہے۔ اس لیے ٹوٹ سکتا ہے گر نہیں سکتا۔''

میں مسکرایا۔ ''تو؟''

ثمر خان بولا۔ ''کہہ رہی ہیں آپ کو فائر کرنا ہوگا۔''

میں نے مسکرا کر پوچھا۔ ''کہاں ہے وہ؟''

ثمر خان نے حویلی کی چھت کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہاں کھڑی ہیں، پلوشہ باجی بھی ان کے ہمراہ ہیں۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''پہلے سے شک تھا یہ کچھ ایسا ہی کریں گی۔''

ثمر خان نے مزید انکشاف کیا۔ ''گل باجی کہہ رہی ہیں تین گولیوں ہی میں کھونٹا گرانا ہوگا۔''

چچا شمریز نے بھی ہماری باتوں پر کان دھرے تھے۔ میری طرف جھک کر دبے لہجے میں بولے۔

''بیٹا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ مجھے پتا ہوتا پلوشہ بیٹی اور گل یہ شرارت کریں گی تو انھیں کبھی کھونٹا لگانے نہ بھیجتا۔''

شمریز چچا کے درخواست نما حکم پر مجھے اٹھنا پڑا۔

تین ساڑھے تین سو میٹر کے فاصلہ پر نشانہ لگانا میرے لیے مذاق ہی تھا لیکن اس صورت میں جب میرے پاس سنائپر رائفل ہوتی۔ کلاشن کوف، یورشی رائفل (اسالٹ رائفل) ہے اور صفر ہونے کے باوجود اس سے اتنی باریکی میں نشانہ نہیں سادھا جا سکتا۔ قائین کی معلومات کو عرض کرتا چلوں کہ ہر ہتھیار کی گولی میں بارود کی مخصوص مقدار ہوتی ہے، لیکن پھر بھی بارود جانچنے والے پیمانے کو وزن کی ایک بریکٹ بتائی جاتی ہے جیسے جی تھری کی ہر گولی میں 382 گرین (گرین وزن کا پیمانہ ہے) سے لے کر 394 گرین تک کا بارود معیاری تصور کیا جاتا ہے۔ اور ایسا یورشی رائفلوں میں ہوتا ہے۔ بارود کی مقدار کا ذرا سا فرق گولی کو ہدف سے اوپر نیچے کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس سنائپر رائفلوں میں ہر گولی کے اندر مقرر مقدار ہی میں بارود پڑتا ہے۔ اس میں کمی بیشی کا احتمال نہیں ہوتا۔ البتہ ایک ہی ہتھیار کے ایمونیشن کو جب مختلف کمپنیاں بناتی ہیں تو ہر کمپنی ایمونیشن میں اپنے حساب سے بارود ڈالتی ہے۔ اور فائر کی آسانی کو ہر کمپنی اپنے تیار کردہ ایمونیشن کے ساتھ فائرنگ ٹیبل بھی جاری کرتی ہے تاکہ فائر ایمونیشن جانچنے کے جھنجٹ سے بچ جائے۔

میں یہ معلومات حاضرین کو نہیں سمجھا سکتا تھا۔ اور نہ یہ ان کے مطلب کی بات تھی۔ ان کے لیے فقط ایک ہی دلیل تھی کہ ''یہ گز اور یہ میدان۔'' کھونٹا گر گیا تو واہ..... واہ۔ نشانہ خطا ہو گیا تو استہزائی نعرے۔

البتہ ایک بات میرے حق میں جاتی تھی کہ وہاں مجھے جاننے والا کوئی نہیں تھا کہ نام کو بٹا لگتا۔ چچا شمریز کے کنبے یا پلوشے کو سمجھانا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ البتہ گل نے دوسری خواتین کے سامنے کوئی لاف زنی (ڈینگیں مارنا) کی تھی تو یقیناً اس کی سبکی ہوتی۔ بہ ہر حال سر پر پڑی مصیبت کو گلے لگانا مجبوری بن جاتی ہے۔

فائر کرنے کی مخصوص جگہ پر جا کر میں ترچھا بیٹھ گیا۔ حاضرین کا دباؤ باقہقہ ابھرا کیوں کہ ہدف کی جانب میرا بایاں بازو آ رہا تھا۔ اگر فائرنگ پوزیشن کی بات کی جائے تو ایک فائر بارہ مختلف حالتوں سے فائر کر سکتا ہے۔ تفصیل بتانا تو باعث طوالت ہوگا البتہ یہ عرض کرتا جاؤں کہ فائر کرنے کو سب سے بہترین لیٹی حالت ہوتی ہے۔ اور سنائپر عموماً اسی حالت میں فائر کرنا پسند کرتے ہیں۔ اس کے بعد آرام دہ اور پرسکون بیٹھی پوزیشن ہوتی ہے۔ عام فائر تو بیٹھی پوزیشن میں اپنا رخ ہدف کی جانب ہی رکھتے ہیں مگر سنائپرز کا انداز تھوڑا جدا ہوتا ہے۔

میں نے آرام دہ حالت میں بیٹھ کر گھٹنے کھڑے کیے اور دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹیک دیں، کلاشن کوف کا فرنٹ ہینڈ گارڈ بائیں کہنی پر رکھ کر میں نے بایاں ہاتھ ریئر سائیٹ کے پیچھے لا کر رائفل کو مضبوطی سے جکڑ لیا تھا۔ دایاں ہاتھ پسٹل گرپ کے گرد لپیٹتے ہوئے میں نے شہادت والی انگلی ٹریگر پر رکھی، دایاں گال بائیں ہاتھ کے ساتھ رسیور کور پر ٹیک کر بائیں آنکھ بند کر دی۔ دائیں آنکھ سے ریئر سائیٹ کے کٹاؤ میں سے دیکھتے ہوئے میں نے فرنٹ سائیٹ کی ٹپ کا اوپری کنارہ کھونٹے کے پیندے سے ملایا اور سانس روک کر لبلبی دبا دی۔ کلاشن کوف کی گولی کھونٹے کا ایک حصہ اڑا کر لے گئی تھی۔ حاضرین کا تحسین آمیز نعرہ بلند ہوا تھا۔ میں نے شست تبدیل کیے بغیر دوبارہ نشانہ سادھا، اب ہدف کا حجم پہلے سے کم رہ گیا تھا۔ چند سیکنڈز کے وقفے سے میں نے دوبارہ لبلبی دبا دی۔ کھونٹے کا زمین سے اوپر نظر آنے والا حصہ غائب ہو گیا تھا۔ خشک لکڑی کے تین چار انچ چوڑے ٹکڑے کی کلاشن کوف کی گولی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں تھی۔ مجھ سے پہلے فائر کرنے والے اگر براہ راست کھونٹے کو نشانہ بنا لیتے تو کامیاب ہو گئے ہوتے۔

گہرا سانس لیتے ہوئے میں نے میگزین اتاری، رائفل کاک کی، چیمبر سے گولی نکال کر میگزین میں بھری اور میگزین چڑھا کر سیفٹی لگا دی۔

سب سے پہلے دولھے صاحب نے مجھے چھاتی سے لگاتے ہوئے پیٹھ تھپتھپائی تھی۔ اس کے بعد دولھے کے دوستوں نے باری باری معانقہ کر کے تعریفی جملے کہے تھے۔ ملنے ملانے سے فارغ ہو کر میں چچا شمریز کے پہلو میں جا بیٹھا۔ میری جانب جھکتے ہوئے وہ تحسین آمیز انداز میں بولے۔

''ان بے چاروں کو کیا پتا کہ جس نشانے بازی کو یہ کارنامہ گردان رہے ہیں وہ ایس ایس کے لیے معمولی بات ہے۔''

میں نے مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ اس کے بعد ڈھول و شہنائی کے ساتھ مردوں کا رقص شروع ہو گیا تھا۔ مغرب کی اذان سے تھوڑا پہلے عارضی طور پر ہنگامہ سرد ہوا تھا۔ اسی رات انھوں نے دلھن کو لے جانا تھا۔

نماز کے بعد کھانا کھایا گیا۔ اس کا سارا خرچ اور بندوبست دولھے کے گھر والوں کی ذمہ داری تھی۔

کھانا میں نے ثمر خان اور چچا شمریز کے ساتھ بیٹھ کر کھایا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ثمر خان نے انکشاف کیا۔ ''آج گل باجی اور پلوشہ باجی نے رقص کا مقابلہ کیا اور گل باجی ہار گئیں۔''

میں ہنسا۔ ''گل بے چاری کا کیا قصور، پلوشے سے پیشہ ور رقاصہ بھی ہار جائے گی۔''

عشاء کے بعد پھر ہنگامہ شروع ہو گیا تھا۔ کلاشن کوفوں کے دہانے کھل گئے تھے۔ مسلسل ہوائی فائرنگ کر کے نہ جانے وہ کس جذبے کا اظہار کر رہے تھے۔ شادیوں میں سیکڑوں، ہزاروں گولیاں ہوا میں اڑانا پٹھانوں ہی کا خاصہ ہے۔

گو میرا ہتھیار اور فائر سے رشتہ بہت پرانا ہے۔ دوران تربیت جانے میں کتنی گولیاں پھونک چکا ہوں، لیکن وہ فائر

اس طرح بے ہنگم اور فضول نہیں ہوتا۔ گولیوں کا یہ ضیاع راؤ تصور صاحب دیکھ لیتے تو یقیناً انھیں دل کا دورہ پڑ جاتا۔ میرا تو سر درد کرنے لگا تھا۔ میں بیٹھک میں آ گیا۔ اندر کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اسی وقت ثمر خان بھاگتا ہوا آیا۔

''لالا جان! پلوشہ باجی پھر ناچ رہی ہیں۔''

میرے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا، دل اپنی البیلی محبوبہ کی شوخیاں دیکھنے کا متقاضی ہوا۔ اور میں ثمر خان کے ساتھ بیٹھک کے گھر کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں شاید دروازے پر کھڑا رہتا مگر ثمر خان میرا ہاتھ پکڑ کھینچتے ہوئے بولا۔

''لالا! یہاں سے خاک نظر آئے گا، میرے ساتھ آئیں۔'' وہ مجھے بیٹھک سے ملحق کمرے میں لے گیا وہاں سے کمروں کے اندر ہی اندر سفر کرتے ہوئے ہم سیڑھی والے کمرے میں پہنچے اور چھت پر چڑھ گئے۔ اب پلوشہ کا تھرکتا ہوا وجود میری پیاسی نظروں کے سامنے تھا۔ گھر میں میں نے اس کی کئی بار منت کی تھی مگر وہ میرے سامنے رقص کرتے ہوئے شرماتی تھی۔ اس مرتبہ چھٹی پر آ کر اس کا ذرا سا مٹکنا دیکھنے کو ملا مگر مجھے دیکھ کر اسے رقص بھول گیا تھا۔ اور بعد میں اس نے یہ کہتے ہوئے کھلا انکار کر دیا تھا کہ۔ ''بھول گئے خود ہی ناچنے سے منع کیا تھا۔''

چچا شمریز نے گھر کے صحن میں سورج کی روشنی سے براہ راست چارج ہونے والی دو بڑی بتیاں لگائی تھیں جن کی وجہ سے اچھی خاصی روشنی پھیلی تھی۔ اتنی کہ مجھے پلوشے کے سانچے میں ڈھلے بدن کے نشیب و فراز واضح نظر آ رہے تھے۔ اس کے گرد لڑکیوں نے گھیرا ڈالا ہوا تھا اور وہ تالیاں بجاتے ہوئے شور مچا رہی تھیں۔ ہمیں بیٹھے ہوئے چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ گہری نیلی آنکھوں والی گل والہانہ انداز میں لہراتے ہوئے پلوشہ کا ساتھ دینے لگی۔ مجھے پرائی لڑکی کو اس کی بے خبری میں دیکھنا اچھا نہیں لگا تھا۔

''چلتے ہیں۔'' میں نے ثمر خان کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

ثمر خان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے انکشاف کیا۔ ''گل باجی جانتی ہیں آپ انھیں دیکھ رہے ہیں۔''

''کیا؟'' میں متعجب ہوا۔

وہ اطمینان سے بولا۔ ''انھوں نے ہی آپ کو یہاں لانے کا کہا تھا، کہ ان کے اور پلوشہ باجی کے درمیان ہار جیت کا فیصلہ آپ کریں گے۔''

''میری نظریں خوش بدن دوشیزہ کی جانب اٹھیں جس کا جسم خوب صورت انداز میں بل کھاتے ہوئے لہرا رہا تھا۔ ثمر خان کے انکشاف نے مجھے حیران کے ساتھ پریشان بھی کر دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کہ گل خود مجھے اپنا رقص دکھانے کی خواہاں تھی میں اس نظارے سے لطف اندوز نہیں ہو پایا تھا۔

''چلو ثمر خان! اگر کسی نے ہمیں یہاں دیکھ لیا تو بات کا بتنگر بن جائے گا۔'' ثمر خان کو زبردستی کھینچتے ہوئے میں سیڑھی سے نیچے اتر گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم بیٹھک میں پہنچ گئے تھے۔

رات کے دس بجنے کو تھے جب چچا شمریز میرے پاس آیا۔ رنزا کو رخصت کرنے کا وقت ہو گیا تھا۔

انھوں نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ ''ذیشان بیٹا! ثمر خان کے ساتھ جا کر اپنی بہن کو رخصت کر دو۔''

میں نے اعتراض کرنا چاہا۔ ''چچا جان!.....''

انھوں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اسے بہن نہیں سمجھتے یا کوئی اور مسئلہ ہے۔''

''چلو ثمر خان۔'' میں کھڑا ہو گیا۔ شمریز چچا نے اعتراض کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔

ثمر خان اور میں اندر پہنچے، عورتوں نے رنزا کو گھیرا ہوا تھا۔ انھوں نے ادھر اُدھر ہو کر ہمیں راستہ دیا۔ پلوشہ اور گل

،رنڑا کے دائیں بائیں بیٹھی تھیں۔

''کتنی پیاری لگ رہی ہے میری گڑیا بہن۔'' رنڑا کی ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھ کر میں نے اس کا سر بلند کیا۔

تیز سسکی بھرتے ہوئے اس نے میری چھاتی پر سر رکھ دیا تھا۔شفقت وعقیدت بھری پاکیزہ محبت کے احساس نے مجھے لپیٹ میں لے لیا تھا۔ میں بہن کے رشتے سے تہی دامن ہوں۔رنڑا ایسی لڑکی تھی کہ پہلے دن سے مجھے لالا جان بنا لیا تھا۔اسے اپنے لالا پر بھروسہ، اعتماد وفخر تھا، وہ اپنے لالا کو دنیا کا سب سے بہادر فرد گردانتی تھی، وہ چھوئی موئی اور ڈرپوک سی لڑکی مجھے سگی بہنوں کی طرح عزیز تھی۔اس کے رونے نے مجھے بھی جذباتی کر دیا تھا۔منہ بولی بہن کو رخصت کرتے وقت میری یہ حالت تھی تو سگی بہنوں کو رخصت کرنے والوں پر کیا گزرتی ہوگی۔یقیناماں کے بعد بہن بہت ہی پیارا،خوب صورت اور دلکش رشتہ ہے۔اپنے بھائیوں کے لیے ہمیشہ قربانیاں دینے والیاں، بھائی کے لیے اپنے حق سے دست بردار ہونے والیاں، بہ ظاہر نرم ونازک مگر درحقیقت چٹانی ارادوں کی مالک بہنیں اللہ پاک کا بہترین تحفہ ہیں۔

میں اس کے لیے تین قیمتی سوٹ،خوب صورت جوتے،اور ایک موبائل فون لے کر آیا تھا۔یہ تحائف میں نے آتے ساتھ اس کے حوالے کیے تھے۔اس وقت وہ میرے ہی لائے ہوئے کپڑوں میں ملبوس میں تھی۔

میرے بعد وہ ثمر خان کو بھی چٹ گئی تھی۔وہ اس سے چھوٹا تھا،لیکن بھائی چھوٹا ہو یا بڑا بہنوں کا محافظ ورکھوالا ہوتا ہے۔

''بہادر بہنیں تو نہیں روتیں۔'' اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے بہ ظاہر مزاحیہ انداز اپنایا،مگر میرے حلق سے رندھی ہوئی آواز برآمد ہوئی تھی۔

''چلو ثمر خان۔'' رنڑا کا دایاں بازو تھامتے ہوئے میں نے ثمر خان کو اشارہ کیا۔اور ہم دونوں اسے گھر سے باہر لے آئے۔وہاں باربرداری کو زیادہ تر گھوڑے، خچر،اونٹ اور گدھے استعمال ہوتے ہیں۔وہ ایک اونٹ پر ڈولی باندھ کر لائے تھے۔ویسے تو وزیرستان میں دلھن لے جانے کو گاڑیوں کا رواج ہے لیکن جن علاقوں میں گاڑیوں کی آمدورفت نہیں ہوسکتی وہاں آج بھی اونٹ اور گھوڑے وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔

رنڑا کے سر پر بوسہ دے کر اسے میں نے بازوؤں میں بھر کر سجی ہوئی ڈولی میں بٹھا دیا۔گل بھی اس کے ہمراہ بیٹھ گئی تھی۔اونٹ کو اٹھایا گیا۔پانی کے دو قطرے میرے گالوں پر لڑھکے اور زبان سے بے ساختہ نکلا۔

''اللہ پاک تمھارا نصیب اچھا کرے میری گڑیا بہن۔''

اپنے بازو پر ہلکی سی گرفت کا احساس ہوا۔میں چونکتے ہوئے متوجہ ہوا۔وہ پلوشے تھی۔

''چلیں۔'' اس کے لہجے میں بھی اداسی گھلی تھی۔میں اس کے ساتھ گھر کی طرف بڑھ گیا۔ثمر خان اور شمریز چچا اپنی خواب گاہ میں گھس گئے تھے۔قریبی رشتہ داروں کی چہل پہل جاری تھی لیکن ایک رنڑا کے جانے سے گھر ویران لگنے لگا تھا۔''رنڑا'' پشتو میں روشنی کو کہتے ہیں۔اور اس وقت لگ رہا تھا اس گھر کی روشنی حقیقت میں رخصت ہوگئی ہو۔

''راجو! پریشان نہیں ہوتے۔'' پلوشہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے تسلی دینے لگی۔وہ نٹ کھٹ اور چلبلی لڑکی میرے متعلق نہایت حساس تھی۔

میں دل گرفتہ ہوا۔''پلوشے مجھے آج محسوس ہو رہا ہے کہ سپوگمائے کی جدائی پر تمھیں کتنا دکھ ہوا ہوگا۔''

''اچھا سچ بتائیں، میرا رقص اچھا لگا یا گلگارے کا۔'' اس نے ایک دم موضوع تبدیل کر دیا تھا۔

میں متحیر ہوا۔''تمھیں کیسے پتا میں دیکھ رہا تھا۔''

وہ اطمینان سے بولی۔''گلگارے نے بتایا تھا۔''

مجھے گلگارے کے فعل پر کوفت ہوئی تھی۔ جانے وہ کیا ثابت کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ایک بات یقینی تھی کہ وہ مضبوط کردار کی مالک تھی۔ گو مجھ سے گفتگو کرتے وقت وہ کچھ زیادہ ہی حق جتانے لگتی تھی، مگر کبھی اکیلے میں بھی اس نے اخلاق سے گری ہوئی بات یا حرکت نہیں کی تھی۔ میں خود بھی اس کے ساتھ کسی رشتے کا تعین نہیں کر پا رہا تھا۔ شروع دن سے میرے بہن کہنے کو اس نے ناپسندیدہ گردانا تھا۔ وہ خطوط اور موبائل فون کے پیغامات میں بھی خود کو'' آپ کی گڑیا بہن رنژا کی باجی لکھا کرتی۔'' براہ راست اس نے کبھی مجھے بھائی تسلیم نہیں کیا تھا۔ اپنی شادی سے پہلے تک تو اس کا یہ فعل قابل اعتراض نہیں تھا۔ مگر اب وہ میرے بارے دل میں کوئی لطیف جذبات رکھتی بھی تھی تو اسے دل کی بات چھپانا چاہیے تھی۔

''کیا سوچ رہے ہیں۔'' پلوشے نے میری ٹھوڑی سے پکڑ کر ہلایا۔

میرے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اسے حقیقت بتائے بغیر دھیرے سے بولا۔ ''میں صرف اپنی پلوشے کا رقص دیکھنے آیا تھا۔ جب گل شروع ہوئی تو میں چلا گیا تھا۔''

''اچھا۔'' طمانیت سے کہتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔

—●—

اگلے دن طلوع آفتاب کے ساتھ ہی گلگارے کو اس کا شوہر وہاں چھوڑ گیا تھا۔ وہ چند منٹ چچا شمریز کے ساتھ بیٹھا رہا۔ مجھ سے معانقہ کرتے ہوئے اس نے پر خلوص انداز میں شکریہ ادا کیا تھا۔ نشانہ بازی کی صلاحیت نے پٹھانوں کے درمیان مجھے عموماً سرخ رو ہی رکھا ہے۔ ہتھیار سے لگاؤ پٹھانوں کے خون میں شامل ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے عربوں کو تلوار بازی اور تیر اندازی کا شوق ہوتا تھا۔ نبی پاک ﷺ نے بھی اس شوق کو پسند فرمایا ہے۔ بلا شبہ ایک جنگجو مومن ہی اسلام کی اشاعت، حفاظت اور ترقی کا ضامن ہو سکتا ہے۔ زیادہ دور نہ جائیں 1948 کی پاک بھارت جنگ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ، جب ریاستِ کشمیر میں ہندوؤں، سکھوں اور ریاستی افواج کی قتل و غارت کی کارروائیاں حد سے بڑھیں تو کشمیر کے انقلابی لیڈروں نے شمال مغربی سرحد کے قبائلی سرداروں سے رابطہ کر لیا۔ قبائلی سرداروں نے کشمیری مسلمانوں کی آواز پر لبیک کہا اور پٹھانوں کے جتھے جنگ آزادی میں شامل ہونے کو کشمیر کی طرف چل پڑے۔ اس وقت پاکستانی فوج کے بکھرے ہوئے غیر منظم یونٹ یا تو پنجاب میں تقسیم ملک سے پیدا شدہ حالات سے برسر پیکار تھے، یا مہاجرین کے قافلوں کو حفاظت مہیا کر رہے تھے کہ ان قافلوں پر ہندو اور سکھ بلوائی حملے کر رہے تھے۔ قبائلیوں کی کشمیر میں آمد کے ساتھ ہی آزادی کی تحریک کو چار چاند لگ گئے اور مہاراجہ کی فوج کو ہر جگہ شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستان آرمی کی کشمیر آمد تک ہندوؤں کو ہر جگہ انھی پٹھانوں نے شکست و ہزیمت سے دوچار کیا تھا۔ اور ان کا راستہ روکا، ورنہ ہندو اس وقت گلگت تک پہنچ چکا ہوتا۔ گو بعد میں پاک آرمی نے حالات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے، کہ قبائلی پٹھان کوئی منظم فوج نہیں تھے۔ وہ دشمن کے خلاف چھاپہ مار کارروائی تو کامیابی سے کر گزرتے لیکن دشمن کی شکست کے بعد زمین پر قبضہ جمانے کے بجائے کسی اور سمت کا رخ کر لیتے تھے۔

پلوشے تھوڑی دیر پہلے ہی ثمر خان کے ساتھ گھر سے باہر نکل گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اپنی کلاشن کوف اور ثمر خان کے ہاتھ میں خالی بوتلیں دیکھتے ہی مجھے پتا چل گیا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ جلد ہی کلاشن کوف کے فائر کی آواز سنائی دینے لگی۔

گل بیٹی کو سلا کر ہمارے پاس آ بیٹھی تھی۔

نشست سنبھالتے ہی وہ شوخی سے بولی۔ ''شکریہ۔''

''کس بات پر؟'' میں نے حیرانی ظاہر کی۔

اس نے انکشاف کیا۔ ''اگر کل آپ کھونٹے کو نہ گراتے تو میری سبکی ہو جانا تھی۔ میں نے تماشا دیکھنے والی لڑکیوں کے سامنے اعلان کیا تھا کہ رنڑا کا لالا جان تین گولیوں میں ہدف گرا دے گا۔''

میں معنی خیز لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''رنڑا کا لالا جان، تمھارا کیا لگتا ہے؟''

شمریز چچا نے اونچا قہقہہ بلند کیا تھا۔ گل کے جواب دینے سے پہلے دروازے پر دستک ہوئی اور چچا شمریز اس جانب

بڑھ گئے۔

جواب گول کرتے ہوئے اس نے موضوع تبدیل کیا۔ ''پلوشہ کا رقص اچھا تھا یا میرا۔'' یقیناوہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔اور جو موضوع اس نے چھیڑ دیا تھا اس بارے میں متردد تھا۔ گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے میں نے انکشاف کیا۔

''کل ہم واپس جائیں گے۔''

وہ شاکی ہوئی۔ ''کیوں..... کیوں..... کیوں؟''

میں لجاجت سے بولا۔ ''گل! چھٹی کے پانچ دن بقایا ہیں اور تین دن گھر تک پہنچنے میں لگیں گے۔''

وہ سرعت سے بولی۔ ''خواگا اوبو سے پانچ کلومیٹر شمال کی طرف ترنگ خیل کلے ہے اب وہاں سے انگوراڈے تک گاڑی مل جاتی ہے۔اگر یہاں سے صبح کو چلیں تو سہ پہر تک انگوراڈے پہنچ جائیں گے۔''

میں نے چڑ سا گیا ہوا۔ ''تو۔''

وہ اطمینان سے بولی۔ ''دو دن مزید رہنا پڑے گا۔''

میں ملتجی ہوا۔ ''گل! سمجھنے کی کوشش کرو۔''

وہ برہمی سے بولی۔ ''یہ کوشش آپ کیوں نہیں کرتے۔''

میں سٹ پٹاتے ہوئے بولا۔ ''یہاں چار دن تو گزار لیے ہیں۔''

وہ بے نیازی سے بولی۔ ''اپنی گڑیا بہن کے لیے گزارے ہیں۔''

''شاید ضد و ہٹ دھرمی تمھارا مذہب ہے۔'' میں جھلا گیا تھا۔

''تو جائیں، آپ کو پکڑا تو نہیں ہے۔'' وہ بگڑ گئی تھی۔

گہرا سانس لیتے ہوئے میں نے سر پکڑ لیا تھا۔ وہ خواہ مخواہ اپنی اہمیت جتانا چاہ رہی تھی۔ مجھے دو دن رکنے میں اتنا تردد نہ ہوتا اگر گزشتہ رات پلوشے سختی سے واپسی کا اعلان نہ کر چکی ہوتی۔تب میں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔اب میرے رکنے پر وہ بدک سکتی تھی۔یوں بھی گلگارے اور میرے تعلق کو وہ ناپسندیدگی کی سند سے نواز چکی تھی۔اس کے نزدیک کسی شادی شدہ لڑکی کا مجھ سے بے تکلف ہونا نہ صرف غلط بلکہ بہت بے ہودہ تھا۔ گورنڑا بھی نہایت دلکش، جاذب نظر اور پرکشش لڑکی تھی، لیکن اس کی زبان مجھے لالا جان کہتے نہیں تھکتی تھی۔ میں بھی اسے گڑیا بہن کہتا تھا۔لیکن گل کی گفتگو میں نہ تو بہن بھائی کا سابقہ، لاحقہ شامل ہوتا اور نہ غیروں کی سی جھجک تھی۔ وہ بے تکلفی اور اپنائیت سے مخاطب ہوتی۔ مجھے گھورتے ہوئے اس کی آنکھوں میں وارفتگی پوشیدہ ہوتی جو پلوشہ کو بالکل ناقابل قبول تھی۔

اچانک پلوشہ چہکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ ''راجو! دو تین گولیوں سے کل جتنے فاصلے پر میں نے بوتل کو نشانہ بنا لیا ہے۔آپ بے شک ثمر خان سے پوچھ لیں۔'' وہ دروازے کو رخ کر کے ثمر خان کو آواز دینے لگی۔

گل ایک جھٹکے سے اٹھ کر بغلی دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''جی باجی!'' ثمر خان اندر آیا۔

''اسے کیا ہوا؟'' پلوشہ نے گل کی پشت کو گھورا۔

میں نے سرعت سے بہانہ گھڑا۔ ''شاید ننھی پلوشہ جاگ گئی ہے۔''

منہ بناتے ہوئے اس نے کندھے اچکائے اور ثمر خان کی جانب متوجہ ہوئی۔ ''ثمر خان! راجو کو بتاؤ ناں میں نے دو تین گولیوں میں کتنی آسانی سے ہدف کو نشانہ بنایا ہے۔''

وہ سعادت مندی سے بولا۔ ''جی لالا جان، باجی سچ کہہ رہی ہیں۔''
پلوشے ہر قسم کے ہتھیار چلا لیتی تھی مگر اس کا نشانہ بالکل واجبی سا تھا۔ ایسے لڑاکے قریبی لڑائی میں تو کارگر فائر کر لیتے ہیں لیکن سنائپنگ ان کے بس سے باہر ہوتی ہے۔ میں نے سر جھٹک کر متبسم ہوا۔
''ثمر خان سچ بتاؤ، پلوشے نے کتنی گولیاں فائر کی ہیں؟'' چونکہ کلاشن کوف کی ''ٹخ..... ٹخ'' کافی دیر تک سنتا رہا تھا اس لیے پلوشے کی دو تین گولیوں والی بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔
وہ ہکلایا۔ ''دد..... دو ہی کی ہیں لالا جان!''
میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ''تمھارے بابا جان جھوٹ کے بارے کیا کہتے ہیں۔''
وہ سرعت سے بولا۔ ''یہی کہ جھوٹ مذاق میں بھی نہیں بولنا چاہیے۔''
میں نے چٹکی بجاتے ہوئے اشارہ کیا۔ ''اب سچ اگلو۔''
پلوشہ نے جلدی سے لقمہ دیا۔ ''زیادہ سے زیادہ پانچ، چھے گولیاں چلائی ہوں گی۔ کیوں ثمر خان۔''
''ثمر خان سر جھکاتے ہوئے بولا۔ ''لالا جان! صرف دو ہی چلائی ہیں۔''
میں نے آنکھیں نکالیں۔ ''ثمر خان.....''
وہ گھبرا کر بولا۔ ''سس..... سچ کہہ رہا ہوں لالا جان صرف دو میگزین خالی کی ہیں۔''
پلوشہ تلملاتے ہوئے بولی۔ ''میرا موبائل فون فوراً واپس کرو۔''
وہ لجاجت سے بولا۔ ''بب..... باجی! لالا جان نے زبردستی اگلوایا ہے۔''
اس نے برہمی ظاہر کی۔ ''میں کچھ نہیں جانتی، جو معاہدہ ہوا تھا تم اس پر پورے نہیں اترے۔''
ثمر خان نے ملتجی نگاہوں سے مجھے گھورا، میں متبسم ہوا۔ ''بھاگ جاؤ، اسے میں پکڑ لیتا ہوں۔''
وہ فوراً مڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ پلوشہ کے قدم اٹھانے سے پہلے میں نے اسے تھام لیا اور اس کی ہلکی نیلی آنکھوں کو باری باری ہونٹوں سے چھوتے ہوئے وارفتگی سے بولا۔ ''جب ان رائفلوں کا نشانہ رینج ماسٹر سے کئی گنا زیادہ کارگر اور درست ہے تو تمھیں کسی اور ہتھیار سے خود کو اچھا نشانہ باز ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''
''دروازہ کھلا ہے کوئی آ جائے گا۔'' حیا آلود لہجے میں کہتے ہوئے وہ کسمساتے ہوئے میری گرفت سے نکل گئی تھی۔
میں نے ہنستے ہوئے کلاشن کوف اٹھالی تا کہ صفائی کر سکوں۔ فائر ہونے کے بعد جتنا جلدی ہتھیار کو صاف کیا جائے اتنا بہتر ہوتا ہے۔ دیر ہونے کی صورت میں بارود کے ذرات اور بُلٹ کی رگڑ سے چمٹنے والے سیسے سے بیرل کی اندرونی سطح رفتہ رفتہ خراب ہونے لگتی ہے۔ زیادہ عرصہ گزرنے پر بیرل کے اندر گڑھے بن جاتے ہیں اور ہتھیار فائر کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ ذاتی ہتھیار کی صفائی کے بارے سنائپر تو کچھ زیادہ ہی وہمی ہوتے ہیں۔ خاص کر راؤ تصور صاحب کے شاگرد تو اپنے چہرے کی صفائی سے زیادہ توجہ اپنے ہتھیار کی صفائی پر دیتے ہیں۔

—●—

رات کے کھانے پر چچا شمریز نے جانے کی بابت دریافت کیا تھا۔ یقیناً اس کی منشا یہی تھی کہ ہم چند دن مزید رہیں۔
میرے بولنے سے پہلے گل نے اطمینان سے کہا۔ ''بابا جان! یہ دو دن مزید ٹھہریں گے۔''
چچا شمریز مسرت سے بولے۔ ''سچ؟'' اسی وقت پلوشہ نے مجھے گھورا، لیکن کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔
میں نے صفائی سے موضوع تبدیل کیا۔ ''چچا جان! آپ ثمر خان کو پڑھنے شہر کیوں نہیں بھیجتے۔''
میرے جواب دینے سے اعراض برتنے کو جانے انھوں نے کیا سمجھا تھا، مگر دوبارہ اس موضوع پر زبان نہ

کھولی۔ میں پلوشے کی موجودی میں گل کو نہیں سمجھا سکتا تھا ورنہ میرا لہجہ سن کر پلوشے بپھر جاتی۔ گل کا مطالبہ ناجائز نہیں تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں میری محسنہ تھی اور اتنا حق جتا سکتی تھی کہ دو دن رکنے کو کہہ دے، لیکن اپنی جانِ حیات پلوشے کی مرضی کے خلاف کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اسے ناراض کرنے کا حوصلہ کرنا کم از کم میرے بس سے باہر تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ گل کو اکیلے میں اپنی مجبوری کا بتا کر اور اگلی چھٹی پر آنے کا وعدہ کر کے منالوں گا۔ وہ نہایت سمجھ دار لڑکی تھی، یقیناً میری حالت کا ادراک اسے آسانی سے ہو جاتا۔

شمریز چچا بولے۔ ''گل تو کب کا زور دے رہی ہے، یہ بے شرم خود ہی شوق نہیں رکھتا۔''

وہ معصومیت سے بولا۔ ''لالا جان! اسکول جانے کا کیا فائدہ، جبکہ میں آپ کی طرح نشانے باز بننا چاہتا ہوں۔''

میں نے قہقہہ لگایا۔ ''یہی تمھاری بے وقوفی ہے۔ کیا بغیر تعلیم کے اچھا نشانے باز بننا ممکن ہے۔''

وہ معترض ہوا۔ ''نشانے بازی کا تعلیم سے کیا تعلق۔''

''ایک گولی فائر کرتے وقت ہوا کی رفتار، بلندی پستی کا زاویہ، ہدف کا فاصلہ، ایمونیشن کی قسم اور کئی ایسی باتوں کا جاننا ضروری ہوتا ہے جو بغیر تعلیم کے ممکن نہیں اور یہ سب کچھ میں تب سکھا سکتا ہوں جب تم اچھی تعلیم حاصل کرلو۔'' میرے لبوں پر شرارتی مسکراہٹ ابھری۔ ''تمھاری پلوشہ باجی کو میں کوشش کر کے بھی اچھا نشانے باز نہ بنا سکا۔ اگر پڑھی لکھی ہوتی تو ایک بوتل پر دو میگزین ایمونیشن نہ پھونکتی۔''

چچا شمریز اور گل کا قہقہہ بلند ہوا، پلوشے برہمی سے مجھے گھورنے لگی تھی۔

''ٹھیک ہے میں پڑھائی کرنے شہر جاؤں گا، مگر آپ وعدہ کریں جب میں تعلیم مکمل کرلوں گا تو مجھے اپنے جیسا نشانے باز بنائیں گے۔''

''ان شاء اللہ میں تمھیں ضرور سکھاؤں گا۔'' میں نے وعدہ کرنے تساہل نہیں برتا تھا۔

کھانے کے بعد ہم عشاء تک وہیں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ گل کو کس طرح اکیلا کر کے سمجھاؤں۔ ایک دو بار آنکھیں چار ہونے پر جبکہ پلوشہ کسی اور جانب متوجہ تھی میں نے اشارے میں اجازت مانگی، مگر اس نے بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

عشاء کی نماز پڑھ کر میں موقعے کا متلاشی ہوا مگر پلوشے مجھے کمرے میں لے گئی۔

''راجو! سوتے ہیں، کل کا دن سفر میں گزرے گا اور مجھے سخت نیند آئی ہوئی ہے۔''

''جیسی سرکار کی مرضی۔'' میں نے سرِ تسلیم خم کیا۔

وہ طمانیت سے مسکرا دی تھی۔ ہم سونے لیٹ گئے مگر میری نظروں سے نیند غائب تھی۔ میں کسی طرح گل کو قائل کرنا چاہ رہا تھا۔ ورنہ صبح ہمارے چلے جانے کو وہ اپنی سبکی خیال کرتی، اس کا مان ٹوٹ جاتا، وہ پکی ناراضی گانٹھ لیتی۔ اور یہ مجھے منظور نہیں تھا۔ اسے منانا اتنا بھی دشوار نہیں تھا بس پلوشہ کی غیر موجودی میں اسے ملنے کی ضرورت تھی۔ ارادہ تھا کہ پلوشہ کے سو جانے پر اس کے پاس جاؤں گا۔ یقیناً اس نے چچا شمریز اور ثمر خان کے کمرے ہی میں سونا تھا۔ اور چچا شمریز کی موجودی مجھے تقویت دیتی۔

پلوشے تھوڑی دیر اٹھکیلیاں کر کے سو گئی تھی۔ وہ کافی گہری نیند سوتی تھی۔ شادی ہو جانے کے باوجود اس کی نیند الھڑ نادان لڑکیوں کی طرح بے فکری والی تھی۔ لیکن میں اس کے گہرے سانس سن کر بھی نہ اٹھ سکا کہ وہ میرے بازو پر سر رکھے لیٹی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ میری چھاتی پر دھرا تھا۔ میں چاہت بھری نظروں سے اس کا معصوم چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ میری شریک حیات تھی، میرے دکھ سکھ کا ساتھی، ہنسی خوشی کی حصے دار، درد و غم بانٹنے والی، میری عزت، میرا مان، میری

محبت، چاہت، الفت۔ اس کے دم سے میری زندگی میں بہاریں تھیں، وہی میرے قہقہوں کی ضامن تھی، اسی کی وجہ میرے گھر کی رونقیں تھیں، بلا شک وشبہ وہ بہت قیمتی، انمول اور بہترین بیوی تھی۔ اس کی دید سے میری آنکھیں سیر نہیں ہوتی تھیں۔ اسے تکتے تکتے پتا ہی نہ چلا اور میں نیند کی میٹھی وادیوں میں کھو گیا تھا۔ میری آنکھ پلوشہ کی آواز سے کھلی تھی۔ ہلکے سے بڑبڑا کر اس نے کروٹ تبدیل کی اور مخالف جانب رخ موڑ لیا۔ جمائی لیتے ہوئے میری نگاہ گھڑی پر پڑی۔ سوئیاں دو کا ہندسہ عبور کر چکی تھیں۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا گل کو قائل کرنے کا منصوبہ ادھورا رہ گیا تھا۔ اتنی رات گئے گل سے بات چیت کرنا مجھے عجیب لگ رہا تھا۔ گو چچا شمریز کے کمرے میں موجود ہونے کی وجہ سے مجھے جھجک محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن پھر بھی رات کے دو بجے گفتگو مناسب نہ رہتی۔ میں دوبارہ لیٹ گیا، لیکن گل کی ناراضی کا خیال آتے ہی میں نے کمرِ ہمت باندھنے کا فیصلہ کر لیا۔

ہمارے کمرے سے متصل گھر کا سٹور تھا اور اس کے ساتھ چچا شمریز کی خواب گاہ تھی۔ گل کی شادی کے بعد ثمر خان اور رنزا بھی باپ کے کمرے ہی میں سوتے تھے۔ البتہ گل جب وہاں آتی تو دونوں بہنیں علیحدہ کمرے میں سوتی تھیں، جو باورچی خانے سے ملحق تھا۔ آج رنزا کی غیر موجودی میں گل کو باپ کے کمرے ہی میں سونا چاہیے تھا۔ یہی سوچ مجھے چچا شمریز کی خواب گاہ میں لے گئی، دروازہ بھیڑا ہوا تھا مگر اندر سے کنڈی نہیں تھا۔ میں بے تکلفی سے دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا۔ ہلکی چرچراہٹ ابھری جو خاموشی کے ماحول میں صور اسرافیل محسوس ہوئی تھی۔ وہاں گل موجود نہیں تھی۔ یقیناً وہ آج اکیلے کمرے میں لیٹی تھی۔ چچا شمریز اور ثمر خان دروازے کی چرچراہٹ سے نہیں جاگے تھے۔ میں دبے قدموں واپس مڑا اور دروازے کو بھیڑتا ہوا باہر نکل گیا، دوسری بار بھی دروازے نے "چوں..... چوں" کر کے گہرا احتجاج کیا تھا۔

گل کے پاس اکیلے کمرے میں جانے کی ہمت خود میں مفقود پاتا تھا۔ گو میرا غلط ارادہ نہیں تھا، نہ گل کمزور کردار کی مالک تھی لیکن پھر بھی رات کے اس وقت ہمارے گفتگو کرنے کو کسی صورت مناسب خیال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں اپنے کمرے کی طرف مڑا۔ دو قدم لیتے ہی میری سماعتوں میں دھماکا ہوا۔

"راجو!" گل کی مدہم آواز نے بھی مجھے اچھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ خواب گاہ کے دروازے پر کھڑی تھی۔

"کیا بات ہے؟" چند قدم لے کر اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"وہ..... مم..... میں....." میں گڑبڑا گیا تھا۔ میری چور نظریں چچا شمریز کی خواب گاہ کی جانب اٹھیں اور پھر میں نے مڑ کر اپنے کمرے کی طرف دیکھا۔ پلوشے یا چچا شمریز کسی کے جاگنے کی صورت میں بھی بھاری ندامت میرا نصیب بن سکتی تھی۔

"مجھے ڈھونڈ رہے تھے۔" گل کی آواز میں ذرا بھی جھجک اور ہکلاہٹ شامل نہیں تھی۔

"ہا..... ہاں، مگر فی الحال تم سو جاؤ صبح بات کریں گے۔" میں نے ہاتھ اس کی ملائم و گرم گرفت سے چھڑانا چاہا۔

اس نے گرفت سخت کرتے ہوئے برہمی ظاہر کی۔ "خود پر بھروسہ نہیں ہے یا میرے کردار پر شبہ ہے۔"

میں چڑچڑا ہوا۔ "گل فضول باتیں نہ کرو۔"

وہ بدتمیزی سے بولی۔ "اور آپ کا کیا، میرا مطلب آپ کو مکمل اجازت ہے فضول باتوں کی۔"

"آرام کرو۔" میں نے اپنے کمرے کی طرف مڑنا چاہا کہ وہاں مزید ٹھہرنا مناسب نہیں تھا۔

"ٹھہریں۔" میرے ہاتھ پر اس کی گرفت سخت ہوئی۔ "پہلے یہ بتائیں کیا کہنا چاہتے تھے۔"

"گل سو جاؤ۔" میں نے دبے لہجے میں جھڑکا۔ "کوئی اٹھ گیا تو الگ تماشا بن جائے گا۔"

وہ بے پروائی سے بولی۔ ''ڈرتا کون ہے۔''

''سمجھنے کی کوشش کرو۔'' میں جھلا گیا تھا۔

''میرے ساتھ آئیں۔'' اس نے مجھے اپنے کمرے کی طرف کھینچا۔

''پاگل تو نہیں ہوئی ہو۔'' میں بدک گیا تھا۔

''راجو! میں جانتی ہوں آپ نے کوئی ضروری بات کرنا ہے، اب وقت ہے کرلو۔ وہاں کوئی جھانکنے نہیں آئے گا۔ اور کم از کم آپ کو میرے کردار پر شک نہیں کرنا چاہیے۔''

''گل میں شک.....''

''چلیں۔'' قطع کلامی کرتے ہوئے اس نے مجھے دروازے کی جانب کھینچا اور میں ہچکچاتا ہوا ساتھ ہولیا۔

''بیٹھو۔'' اس نے مجھے خالی چارپائی پر دھکیلا اور دوسری چارپائی پر نشست سنبھال کر متبسم ہوئی۔ ''اب بولیں عشاء کو کیا اشارے کررہے تھے۔''

میں شاکی ہوا۔ ''تمہیں نہیں معلوم۔''

اس نے منہ پھلایا۔ ''راجو میرا اتنا حق بھی نہیں ہے کہ آپ کو دو دن رکنے کا کہہ سکوں۔''

میں بغیر لگی لپٹی رکھے بولا۔ ''میں آج تک تمہارے ساتھ رشتے کا تعین نہیں کرسکا۔ تجاہل عارفانہ سے کام لے کر اسے اچھی دوستی کا نام دے سکتا ہوں، مگر عورت مرد کی دوستی کی نہ شریعت اجازت دیتی ہے اور نہ ہمارا معاشرہ۔ یہ تمہارے شوہر کو پسند ہوگا نہ میری بیوی ہی اس کی اجازت دے گی۔ پلوشہ بہت فراخ دل بیوی اور اعلیٰ ظرف لڑکی ہے۔ لیکن یقین مانو پہلے دن سے میرے ساتھ تمہاری بے تکلفی کو نہ صرف شدت سے محسوس کیا ہے بلکہ ناپسندیدگی کی سند سے نوازا ہے۔ حالاں کہ رنزا بھی تمہاری طرح خوب صوت، معصوم اور پیاری ہے مگر اس کی بے تکلفی پلوشہ پر گراں نہیں گزری کہ وہ مجھے لالا جان کہتی ہی نہیں سمجھتی بھی ہے۔''

اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔ ''آپ کو بھائی سمجھتی ہوں اور نہ بہن بننے پر تیار ہوں۔''

''وہی تو جاننا چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان کیا رشتہ ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں جانتی۔''

''کیا چاہتی ہو؟'' میں کھل کر سامنے آگیا تھا کہ جب تک اس کی غرض معلوم نہ ہوتی سمجھانا دشوار تھا۔

ارزق چشم (نیلی آنکھیں) میرے چہرے پر مرکوز ہوئیں۔ ان میں گلہ، شکوہ اور اذیت ہویدا تھی۔

''کبھی تنہائی میں بھی میری قابل گرفت حرکت دیکھی ہو۔ سب کے سامنے بھی آپ کا ہاتھ پکڑ لیتی ہوں اور اب بھی صرف ہاتھ چھونے کی گستاخی کی ہے۔ اور قسم کھاتی ہوں اگر جذبات سے مغلوب ہوکر آپ مجھے نازیبا چھونے کی کوشش کرتے تو تھپڑ مارنے میں تامل نہ برتتی۔ شوہر کی امانت میں خیانت کا میں تصور بھی نہیں کرسکتی۔ البتہ دل میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اور امید ہے بے اختیاری کو کرما کا تعین بھی قلم بند کرنے سے گریز فرمائیں گے۔''

میں نے دہائی دی۔ ''گل! میں کیا کروں، تم میری محسنہ ہو۔ تمہیں خفا نہیں کرسکتا۔ تمہارا حق جتانا یا فرمائشیں کرنا بھی مجھے گراں نہیں گزرتا، مگر میری شریک حیات اس کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ صرف میری بیوی ہی نہیں محبوبہ بھی ہے۔ اسے ناراض کرنے یا دکھ دینے کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا۔ ہمارے الجھے ہوئے رشتے کی زد میں آکر دونوں کی خانگی زندگی کسی بھی بڑے حادثے کا شکار ہوسکتی ہے۔''

وہ بے نیازی سے بولی۔ ''پروا کسے ہے۔''

میں معترف ہوا۔ ''مجھے۔''

اس کے ہونٹوں پر خوب صورت مسکراہٹ ابھری۔ ''تو یہ آپ کا مسئلہ ہے۔''

میں جز بز ہوا۔ ''گل تنگ نہ کرو سمجھیں۔''

''یہی درخواست آپ سے بھی ہے۔'' وہ کچھ سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔

میں تلملاتے ہوئے بولا۔ ''چاہتی کیا ہو؟''

اس نے منہ بنایا۔ ''کچھ بھی نہیں۔''

''صبح ہم واپس جائیں گے۔'' میں نے لاینحل بحث کا خاتمہ کیا۔

لبوں پر مدھر تبسم بکھیرتے وہ مخمور لہجے میں بولی۔ ''صرف اتنی سی بات منوانے کو آپ رات کے دو بجے مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔''

''تو کیا کرتا، پلوشے صبح جانے پر بہ ضد تھی اور تمھاری سوئی مجھے روکنے پر اٹکی تھی۔''

وہ خوش دلی سے بولی۔ ''ٹھیک ہے چلے جانا۔''

''شکر ہے۔'' میرے چہرے پر اطمینان پھیل گیا تھا۔

وہ کھل کھلائی۔ ''آپ پوچھ رہے تھے نا مجھے کیا چاہیے؟''

''تو.....'' بے ربط ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے میں نے نظریں چرائیں۔

وہ وارفتگی سے بولی۔ ''بس اتنا مان رکھ لیا کریں۔ یہ مجھے کافی سے بھی زیادہ ہے۔ اور یقین کریں میں نے آج ایک لمحے کو بھی آنکھیں نہیں جھپکیں، مسلسل جاگ کر آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ آپ سے بات چیت کی غرض ہی سے میں علیحدہ سوئی ہوں۔ جونہی ابو جان کے کمرے کا دروازہ چرچرایا مجھے معلوم ہو گیا کہ آپ تشریف لے آئے ہیں۔''

''اجازت ہے۔'' میں نے اٹھنے کو پر تولے۔

''ایک بات پوچھوں؟''

''تمھیں اجازت مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

وہ شاکی ہوئی۔ ''اتنا برا رقص تو نہیں کرتی کہ آپ نے تھوڑی دیر دیکھنا بھی پسند نہ کیا۔''

رقص کو اعضاء کی شاعری کہتے ہیں اور اس نسبت سے اس کے مصرعے، تشبیہات و استعارات، قافیے ردیف اور بندشیں ایسی تھیں کہ سننے والے، میرا مطلب دیکھنے والے عقل و خرد سے بے گانہ ہو جاتے۔ وہ خوش شکل ہی نہیں خوش بدن بھی تھی۔ شادی کے بعد اس کا چھریرا بدن فربہی مائل ہو گیا تھا جو پہلے سے زیادہ جاذب نظر اور پر کشش لگتا تھا۔ میں یہ سب کچھ سوچ کر رہ گیا تھا کہ کہنے کا حوصلہ مفقود پاتا تھا۔ وہ میرے لیے قابل احترام و معزز تھی اور جن کی عزت کی جاتی ہے ان پر پھبتیاں کسی جاتی ہیں نہ حیا سوز گفتگو کی جاتی ہے۔

بدقت تمام بولا۔ ''تمھیں ناچتے ہوئے دیکھنے کا مجھے قانونی اختیار نہیں تھا۔''

وہ مصر ہوئی۔ ''میں نے خود بلایا تھا۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''ہاں، مگر تمھارے پاس بھی یہ اختیار نہیں ہے۔''

میرے روبرو آتے ہوئے اس نے گہری نظروں سے میری آنکھوں میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

''راجو! اپنی گڑیا بہن کی باجی کو مجبور سمجھ کر معاف کر دینا۔''

میرے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ ابھری۔ ''اپنا خیال رکھنا گل!'' اور دروازے کی طرف مڑ گیا کہ وہاں میں نے اتنی

دیر لگادی تھی جو بدنامی سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ گل سے اپنا رشتہ میں اب بھی نہیں سلجھا سکا تھا، لیکن کم از کم یہ اطمینان ضرور ہو گیا تھا کہ وہ بے راہروی پر آمادہ نہیں تھی۔ محبت اور عزت و عصمت میں چناؤ کا مرحلہ آتا تو اس کا انتخاب عصمت ہوتی۔ اسے بس ذرا سی توجہ درکار تھی۔ میں نے ابتداء ہی سے اسے بہت زیادہ اہمیت اور مان دیا تھا اور اب اسے اپنا حق سمجھ کر وہ دست بردار ہونے پر تیار نہیں تھی۔

دھیرے سے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے میں نے باہر قدم رکھا اور میرے سر پر جیسے بم پھٹا تھا۔ پلوشہ صحن کے بیچوں بیچ کھڑی اسی جانب متوجہ تھی۔ میں سن ہی تو رہ گیا تھا۔ پورے جسم سے جان جیسے رخصت ہو گئی تھی۔ میں نے فوراً خود کو سنبھالنے کی کوشش کی کہ غیر ہوتی حالت مجھے مجرم ثابت کر دیتی، جبکہ میرا فعل غلط ہونے کے باوجود میں ضمیر کی عدالت میں پاک صاف تھا۔

''یہاں کیوں کھڑی ہو اندر آجاتیں۔'' کوشش کے باوجود میں لہجے کی لرزش پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ لگ رہا تھا کوئی انہونی ہو گئی ہے۔ پلوشہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ گہرے سانس لیتے ہوئے وہ بار بار یاقوتی لبوں کو باہم بھینچ کر تر کر رہی تھی۔

اس نے ماضی کریدا۔ ''آپ نے تو خواب گاہ میں اس لیے قدم رکھا تھا کہ آپ کے پاس ماہین کو قتل کرنے اور طلاق دینے کا اختیار تھا۔ مظلوم حوا زادی کے بس میں کیا ہے۔ میں تو صحن میں کھڑی خوش فہمیاں پال رہی تھی، کمرے میں جھانک کر دل خراش منظر دیکھنے کی تاب مجھ میں کہاں تھی۔''

''اے..... ایسا کچھ نہیں ہے پلوشے! میں قسم کھاتا ہوں ہم صرف بات کر رہے تھے۔ میں بس اسے سمجھا رہا تھا۔''

وہ زہر خند ہوئی۔ ''جیسے ماہین، طاہر کو سمجھا رہی تھی ہے نا۔''

اسے بازوؤں سے تھامتے ہوئے ملتجی ہوا۔ ''تت..... تم..... تم غلط سمجھ رہی ہو پلوشے! کیا اپنے راجو پر اعتماد نہیں ہے۔''

وہ کراہی۔ ''کوئی دوسرا بتاتا تو اس کا گریبان تھام لیتی۔''

''میں نے پوچھا۔ ''کیا اپنے راجو پر اعتماد نہیں ہے؟''

وہ ایک جھٹکے سے خود کو چھڑاتے ہوئے سسکی۔ ''تھا، اسی کا نتیجہ تو بھگت رہی ہوں۔''

''جانتی تو ہو گل ہمارے جانے کے حق میں نہیں تھی اور تم واپسی کی خواہاں تھیں، میں بس اسے سمجھانے گیا تھا کہ اپنی بیوی کی بات نہیں ٹال سکتا۔ میرا مقصد فقط اسے دل آزاری سے بچانا تھا۔''

وہ تلخی سی بولی۔ ''اگر اس کا شوہر تمنا کرتا کہ میں دو دن مزید یہاں قیام کروں تو کیا سمجھانے کو مجھے اس کے ساتھ اکیلے کمرے میں بند ہونے کی اجازت دے دیتے۔''

میرا ہاتھ گھوما، تھپڑ اکھا کر وہ نیچے گر گئی تھی۔

آنکھیں برساتے ہوئے وہ لرزتے ہوئے اٹھی۔ ''کاش یہ اختیار عورت کے پاس بھی ہوتا۔''

''پلوشے میری جان!'' میں نے اسے بانہوں میں بھرنے کی کوشش کی، مگر دونوں ہاتھ سینے پر ٹیکتے ہوئے اس نے مجھے پیچھے دھکیلا اور کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

میں فوراً گل کی خواب کی طرف بڑھا۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ شاید مجھے خواب گاہ کی طرف آتے دیکھ کر وہ دروازے سے ہٹی تھی۔ اور اس نے سارا تماشا دیکھ لیا تھا۔ ''گل چلو میرے ساتھ، پلوشہ کو بتاؤ کہ ہمارے درمیان کیا بات ہوئی۔''

اس نے بے پروائی ظاہر کی۔ ''ضرورت ہی کیا ہے۔''
''دماغ خراب ہوا ہے تمھارا۔'' میں بپھر گیا تھا۔ ''میری بیوی کی غلط فہمی دور کرنے کو تو تمھیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔''
اس نے منہ بنایا۔ ''آپ کی بیوی سے تعلق ہے نہ اس کی پروا۔''
میں کراہتے ہوئے بولا۔ ''گل! تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہو۔''
وہ اطمینان سے بولی۔ ''کیوں کہ یہی حقیقت ہے۔''
میں روہانسا ہوا۔ ''گل اس نے کوئی الٹا سیدھا قدم اٹھالیا تو میری زندگی برباد ہو جائے گی۔''
اس نے بے نیازی دکھائی۔ ''جو خود تباہی کے گڑھے میں گر چکی ہو اسے کیا فکر۔''
میں بھناتے ہوئے بولا۔ ''تم نے جانا ہے کہ نہیں۔''
اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ گہرا سانس لیتے ہوئے میں نے غصہ قابو کیا اور اسے ملامتی نظروں سے دیکھتے ہوئے واپس مڑا۔
وہ ایک دم پکاری۔ ''راجو۔''
امید و بیم کی حالت میں میں رک گیا تھا۔ وہ قدم بڑھاتے ہوئے میرے سامنے آئی۔ ''اگر میرے جانے سے کوئی فرق پڑتا تو اس کی منت سے گریز نہ کرتی۔ آپ کی خوشیاں مجھے اتنی ہی عزیز ہیں جتنی اپنی یا رنژا کی خوشیوں کی خواہاں ہوں۔ مگر یقین کرو مجھے دیکھ کر وہ مزید بگڑ جائے گی۔ اپنے شوہر کو جھٹلانے والی اس لڑکی پر کیسے اعتماد کر سکتی ہے جسے اپنے تئیں اس نے شوہر کے ساتھ پکڑا ہو۔ آبرو باختہ لڑکی کو غلط بیانی یا جھوٹی قسمیں کھانے میں کیا قباحت ہو سکتی ہے۔''
''گل!'' میں نے نڈھال ہو کر سر پکڑ لیا تھا۔
''پریشان نہیں ہوتے۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر سہلایا۔ ''غلط فہمیاں دیر پا نہیں ہوتیں۔''
میں کراہتے ہوئے بولا۔ ''اس کی نظروں سے گر گیا ہوں، میری حماقت سے اس کی آنکھیں برس رہی ہیں۔ وہ دکھی، خفا، غمگین و آزردہ ہے۔ گل تم نہیں جانتیں وہ میرے لیے کیا ہے۔''
اس کے لبوں پر پھیکا تبسم ابھرا۔ ''آپ بھی نہیں جانتے، کسی کے لیے آپ کیا ہیں۔''
میں شاکی ہوا۔ ''کیا یہ وقت ایسی باتوں کا ہے۔''
وہ مجھے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ''آپ بھی اس کے لیے سب کچھ ہیں۔ چند دن صبر کریں کب تک دور رہ پائے گی۔ زیادہ سے زیادہ اگلی چھٹی تک؛ پھر چند گلے شکوے کرے گی، آئندہ احتیاط کا وعدہ لے گی اور معاف کر دے گی، مان جائے گی، آغوش محبت وا کر دے گی۔ میرا یقین کرو راجو! فی الحال میرے یا آپ کے صفائیاں دینے سے مسئلہ حل نہیں ہونے والا۔''
دکھی دل سے سر ہلاتے ہوئے میں باہر نکل گیا۔ اپنے کمرے کو جاتے ہوئے میرے قدم من من کے ہو رہے تھے۔ ایک فضول پریشانی کو حل کرتے کرتے میں لاینحل مسئلے کا شکار ہو گیا تھا۔ گل کی ناراضی اور خفگی میرے لیے اتنی اہمیت کی حامل نہیں تھی کہ اس کے لیے میں پلوشہ کے اعتماد کو داؤ پر لگا دیتا، مگر حادثے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ آفات یونہی انسان کو گھیرتی ہیں، ناگہانی افتاد اسی طرح آتی ہے۔ بلائیں یونہی گلے پڑتی ہیں اور انسان ہکا بکا، مبہوت، متحیر اور متعجب ہو کر سوچتا رہ جاتا ہے کہ یہ کیا ہو گیا؟..... اگلا مرحلہ پشیمانی و پچھتاوں کا ہوتا ہے؛ کاش یوں نہ کیا ہوتا، ہائے ذرا سا سوچ لیا ہوتا، عقل و ہوش مندی سے کام لیا ہوتا وغیرہ وغیرہ۔ مگر حادثے کے بعد ہاتھ ملنا کسی کام نہیں آیا کرتا۔ دروازہ کھول کر میں مضمحل قدموں سے داخل ہوا۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے لکڑی کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ لمحہ بھر اسے گھورنے کے بعد میں دوسری

کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھا اور ملتجی ہوا۔

''چندا، ایک بار میری بات تو سن لو، مجھے صفائی کا موقع تو دو، میری حالت سمجھنے کی کوشش تو کرو۔''

وہ خاموش بیٹھی رہی، میری جانب دیکھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی۔

لمحہ بھر توقف کے بعد میں نرم لہجے میں گویا ہوا۔'' بہ خدا میں نے سمجھا وہ ثمر یز چچا کے کمرے میں لیٹی ہے۔ اور میں اتنی رات گئے بھی اس کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا، لیکن تمھیں دیکھتے دیکھتے پتا ہی نہ چلا نیند آ گئی۔ جاگا تو دو بج رہے تھے، سوچا صبح موقع نہیں ملے گا اور تمھاری موجودگی میں اسے سمجھاؤں گا تو تمھیں برا محسوس ہوگا۔ یہی سوچ کر چچا ثمر یز کے کمرے میں داخل ہوا مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ میں واپس آ رہا تھا تبھی اس نے عقب سے آواز دی، شاید دروازے کی چرچراہٹ پر اس نے باہر جھانکا تھا۔ میں نے رک کر کہا صبح بات ہوگی مگر وہ اسی وقت بلت چیت پر بہ ضد ہوئی اور مجھے اپنے کمرے میں کھینچ کر لے گئی۔ چند منٹ باتیں کیں اسے سمجھایا کہ ہم دونوں شادی شدہ ہیں اور ہمارا ایک دوسرے سے تعلق رکھنا درست نہیں ہے۔ بلاشبہ وہ میری محسنہ ہے مگر اسے اتنا بے تکلف نہیں ہونا چاہیے.....'' میں مزید تفصیل بھی بتلاتا رہا، صفائیاں دیتا رہا، قسمیں کھانے سے بھی نہ ہٹا مگر اس کی چپ نہ توڑ سکا۔ اسے بانہوں میں بھر کر مسہری پر لٹایا، اس نے احتجاج کیا نہ زبان کھولی اور نہ آنکھوں سے پلکوں کی جھالر ہٹائی۔

میں مزید پیش قدمی کر کے وارفتگی کا اظہار کرنے لگا مگر وہ سرد لاش کی طرح بے حس و حرکت پڑی رہی۔ اس کی خفگی عارضی، ناراضی لمحاتی، غصہ وقتی اور برہمی ناپائیدار ہوتی تھی۔ لیکن اس بار معاملہ مختلف لگ رہا تھا۔ میں صبح کی اذان تک اور پھر نماز کے بعد طلوع آفتاب تک اسے موم کرنے کی کوشش کرتا رہا، گدگدی کر کے ہنسانے کی کوشش کی، منتیں کر کے سمجھانے کی کوشش کی، معافیاں مانگ کر منانے کی کوشش کی، مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ ثمر خان ناشتا لے آیا، چائے کی پیالی اٹھا کر اس نے باقی لوازمات کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ مجھ سے چائے بھی نہ پی گئی۔ سوچا شاید اس کا دل پسیج جائے اور وہ ناشتا کرا دے۔ لیکن میری یہ کوشش بھی ناکام گئی تھی۔ ناشتا کر کے ہم نے جانے کی تیاری پکڑی۔ چچا ثمر یز، گل اور ثمر خان سے وہ نارمل انداز میں ملی تھی۔

چچا ثمر یز سے معانقہ کر کے میں نے گل کو دیکھ کر خفیف سا سر ہلایا اور ثمر خان کے ساتھ ہو لیا۔ اس نے ہمیں ترنگ خیل کلے کا راستہ دکھا کر لوٹنا تھا۔

پہلے ہم خواگا اوبو پہنچے، رنڑا سے الوداعی ملاقات کر کے آگے بڑھ گئے۔ ثمر خان کلومیٹر بھر ہمارے ساتھ آیا، اس سے آگے راستہ سیدھا تھا۔ اسے الوداع کر کے ہم چلتے رہے۔ وہ بالکل خاموش اور چپ چپ تھی۔ کئی بار بہانے بہانے سے میں مخاطب کر چکا تھا مگر جواب ندارد۔

ترنگ خیل ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، انگوراڈے سے وہاں تک کچی سڑک آتی تھی جو مختلف قصبوں اور دیہاتوں سے ہوتی ہوئی پکتیکا تک چلی گئی تھی۔ آگے جا کر یہ کچی سڑک پختہ ہو جاتی تھی۔

ہم دن کے قریباً ساڑھے دس بجے ترنگ خیل کلے پہنچ گئے تھے۔ گھنٹا ادھ بعد ہمیں انگوراڈے والی گاڑی مل گئی تھی۔ سہ پہر ڈھلے ہم انگوراڈے پہنچ گئے تھے۔ امی جان اور عدیل بے تابی سے منتظر تھے۔ امی جان کے مشورے پر ہم نے رات وہیں گزاری اور اگلی صبح ناشتا کر کے نکل پڑے۔ شام تک ہم حلہ گنگ پہنچ گئے تھے۔

''پلوشے کے ساتھ کوئی گڑبڑ چل رہی ہے۔'' اکیلے ہوتے ہی روما نے پوچھا تھا۔

''کچھ خاص نہیں۔'' میں ٹال گیا تھا۔

وہ بھی اصرار کیے بغیر خاموش ہو گئی تھی۔ اگلی رات بھی میں روما کے ساتھ رہا کہ پلوشے نے صحن میں چارپائی لگائی

ہوئی تھی۔ دن بھر بھی وہ مجھے مخاطب نہیں ہوئی تھی۔

روما نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''اجنبی! آپ جھوٹ بولنا کب چھوڑیں گے۔''

''روما! اس کی عقل چھوٹے بچوں جتنی ہے، فضول بات پر موڈ بنایا ہوا ہے۔ مجھے تو بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔''

روما نے منہ بسورا۔ ''وہ بھی کچھ نہیں بتا رہی اور آپ بھی چھپا رہے ہیں۔''

''اسے گلہ ہے کہ میں گل کو اہمیت دیتا ہوں، حالاں کہ وہ شادی شدہ ہے اور مضبوط کردار کی لڑکی ہے۔ اس کی بے تکلفی برداشت کرتا ہوں کہ اس نے میری جان بچائی ہے، اپنی محسنہ سمجھ کر اگر ہنس کر بات کر لیتا ہوں تو اسے ناگوار گزرتا ہے۔ بتاؤ یہ کوئی خفا ہونے کی بات ہے۔''

''آج اپنی خواب گاہ میں بیٹھی رو رہی تھی۔ میرے کریدنے پر بھی کچھ بتانے کو تیار نہ ہوئی۔ اور آپ جو تفصیل بتا رہے ہیں وہ میرے ذہن کو نہیں لگ رہی۔''

میں دکھی لہجے میں بولا۔ ''میرے کردار پر شک کر رہی ہے۔''

''کک..... کیا، مگر کیوں؟'' روما ہکلا گئی تھی۔

مجبوراً مجھے تفصیل دہرانا پڑی کہ روما جیسی مخلص شریک حیات سے کچھ چھپانا نہایت معیوب تھا، ممکن تھا۔ پلوشہ سے معلوم ہونے پر وہ بھی خفا جاتی تو یک نہ شد دو شد والا معاملہ ہو جاتا۔

''جھوٹا اجنبی!'' تفصیل سن کر، میرے گال پر چٹکی کاٹتے ہوئے وہ متبسم ہوئی۔

میں گلوگیر ہوا۔ ''پلوشے زیادتی کر رہی ہے۔''

''میرے اجنبی!'' روما نے تڑپ کر مجھے بھینچ لیا تھا۔ ''پریشان کیوں ہوتے ہیں میں اسے سمجھاؤں گی۔ وقتی ابال ہے ٹھیک ہو جائے گا۔''

میں متفکر ہوا۔ ''ڈر لگ رہا ہے کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر بیٹھے۔''

''آپ کی روما کس لیے ہے۔'' پراعتماد لہجے میں کہتے ہوئے اس نے مجھے وقتی طور پر مطمئن کر دیا تھا۔

—●—

صبح کی نماز پڑھ کر میں دوبارہ سو جاتا تھا۔ گو یہ کوئی اچھا عمل نہیں ہے لیکن بس عادت بنی تھی۔ دن چڑھے اٹھ کر ناشتا کرتا۔ ابو جان زمینوں کی طرف نکل جاتے اور دوپہر کو لوٹتے تھے۔ میں تھوڑی دیر امی جان اور پھوپھو جان سے گپ شپ کرتا عبداللہ سے کھیلتا اور پھر لیٹ جاتا۔ پلوشے یا روما میں سے کوئی ایک میرا ساتھ دینے آ جاتی۔

انگوراڈے سے لوٹے تین دن ہو گئے تھے پلوشہ نے سیدھے منہ بات کرنا تو درکنار دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ یہ تو ناممکن ہے کہ گھر کے بڑوں کو ہماری خفگی کا پتا نہ چلتا مگر انھوں نے استفسار نہیں کیا تھا۔

وہ گھر میں میرا آخری دن تھا۔ ناشتا کر کے میں نے روما سے پلوشہ کا پوچھا۔

وہ شوخی سے مسکرائی۔ ''اپنے کمرے میں گھسی ہے، آپ منانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔''

میں نے امید ظاہر کی۔ ''ہاں، آخری دن ہے، شاید مان جائے۔''

وہ پرخلوص لہجے میں بولی۔ ''ان شاء اللہ مان جائے گی۔''

دل میں پیا جوت جلائے میں اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ عموماً وہ اس وقت پھوپھو جان اور عدیل کے کمرے میں گھسی ہوتی تھی، مگر آج میری چھٹی کا آخری دن تھا شاید وہ مجھے منانے کا موقع فراہم کرنے کو اپنے کمرے میں لیٹی تھی۔

دروازہ ہلکے سے کھٹکھٹا کر داخل ہوا۔ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے وہ آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ نپے تلے قدم رکھتے

ہوئے میں قریب پہنچا ہلکے سے کھنکار کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کے بدن میں جنبش نہیں ہوئی تھی۔ نہ اس نے آنکھیں کھولنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔

لمحہ بھر بیٹھ کر میں نے اس کا ہاتھ نرمی سے تھاما اور ہولے ہولے سہلانے لگا۔

''معافی نہیں ملے گی؟'' میں نے تمہید باندھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔

''کل واپسی ہے۔ اور تم فوجیوں کی ہنگامہ خیز زندگی سے اچھی طرح واقف ہو، کیا معلوم موت لوٹنے کی مہلت نہ دے۔'' میں نے جذباتی دھونس جمانے کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

میں ملتجی ہوا۔ ''مجھ سے غلطی سرزد ہوئی، حماقت کر بیٹھا، بے وقوفی ہوگئی، گناہ کیا ہے، جہالت کا مظاہرہ کیا ہے، جو سمجھو مجھے قبول ہے بس راضی ہو جاؤ تمہاری خفگی برداشت نہیں ہو رہی پلیز صرف ایک بار معاف کر دو، آخری بار معاف کر دو۔''

''ایک شرط پر.....'' اس کی جذبات سے عاری آواز ابھری۔ میں خوشی سے اچھل پڑا تھا۔

''قبول ہے..... ہر شرط قبول ہے، بغیر سنے منظور کرتا ہوں۔''

اس نے اطمینان بھرے انداز میں میرے سر پر ڈنڈا رسید کیا۔ ''مجھے طلاق چاہیے۔''

''کک..... کیا..... ہوش میں تو ہو۔'' میں نے اسے بازوؤں سے تھام کر متوحش انداز میں جھنجوڑا۔

ایک جھٹکے سے خود کو آزاد کراتے ہوئے وہ بیڈ سے اٹھ کر کرسی پر جا بیٹھی۔ ''طلاق نہیں دو گے تو میں خلع لے لوں گی۔''

''شاید مار کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔'' درشتی سے کہتے ہوئے میں جارحانہ انداز میں اس کی جانب بڑھا۔

''کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔'' میرے قریب پہنچنے سے پہلے وہ تن کر کھڑی ہوگئی تھی۔

میں اپنی جگہ منجمد ہو کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے گھورنے لگا۔ جذبات سے عاری چہرہ لیے وہ بے نیازی سے کھڑی تھی۔

''پلوشے.....'' دو تین لمحوں بعد میرے حلق سے رندھی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

''چند دن کی مہلت دیتی ہوں خوب اچھی طرح سوچ لو، نہیں تو مجھے پھوپھو جان اور بابا جان کو ساری بات بتا کر عدالت سے رجوع کرنا پڑے۔'' یہ کہتے ہی وہ لمبے ڈگ بھرتی دروازے کی جانب چل دی۔

میں نڈھال سا بیڈ پر گر گیا تھا۔ وہ میرے تصور سے زیادہ خفا تھی۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اس حد تک چلی جائے گی۔ میں کافی دیر تنہا لیٹا سوچتا رہا۔ اور آخر یہی فیصلہ کیا کہ اسے اپنے حال پر چھوڑ دینا بہتر رہے گا۔ یقیناً دو تین ماہ کی جدائی اس کا غصہ کم کرنے میں معاون ثابت ہوتی۔ البتہ یہ اطمینان ضرور تھا کہ امی جان اور ابو جان اسے کبھی ایسا قدم اٹھانے کی اجازت نہ دیتے۔

—●—

آخری رات بھی اس سے دوری رہی۔ صبح میرے جانے کے وقت اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ کئی بار دستک کے جواب میں بھی اس نے دروازہ کھولنے کی زحمت نہ کی۔ مجبوراً اسے ملے بغیر رخصت ہونا پڑا۔ راستے میں اس کی ناراضی کا سوچتے ہوئے پتا ہی نہ چلا کس وقت یونٹ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ سردار خان دس دن پہلے ہی وزیرستان روانہ ہو گیا تھا۔ گھنٹی پر بات کرتے ہوئے اس نے مجھے خوب کھری کھری سنائی تھیں۔

''زن مرید، نکما، نکھٹو، ہڈحرام، بے شرم، ڈرپوک، غدار.....'' اور بھی کافی ہذیان بکتا رہا جس میں ناقابل تحریر الفاظ کی کثرت تھی۔ اسے میرے دس دن چھٹی لینے پر تپ چڑھا ہوا تھا۔ وہ خود تو مہینہ چھٹی کاٹ سکا تھا، میرے زائد دن اسے ہضم نہیں ہو رہے تھے۔ یوں بھی فوج میں گھر سے کال کر کے چھٹی مانگنے کا رواج کم ہی ہے۔ اول تو ایسی درخواست کی شنوائی ہی نہیں ہوتی، بالفرض کوئی سینئر مان بھی جائے تو واپسی پر ایسے جوان کا انٹرویو ضرور ہوتا ہے۔ جس کا مقصد تفصیل معلوم کرنے سے زیادہ جوان کو شرمندگی دلانا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے فوج میں کسی حادثے وغیرہ کی وجہ ہی سے مزید چھٹی مانگنے کی جرات کی جاتی ہے، ویسے نہیں۔

دروازے ہی سے ملنے ملانے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ایک یونٹ سے تعلق رکھنے والے گھر کے افراد کی طرح ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں غمگین اور خوشی و مسرت میں شامل۔

روما کو کال کر کے میں نے خیریت سے پہنچ جانے کا مژدہ سنایا اور ساتھ ہی ناراض محبوبہ کی خیریت بھی پوچھ لی۔

روما نے مسکرا کر کہا۔ ''اسے کیا ہوا، ٹھیک ٹھاک اور ہنستی کھیلتی ہے۔ اب عبداللہ کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی ہے۔''

تھوڑی دیر بعد میں اپنی پلاٹون کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ دوست احباب اکٹھے ہو گئے تھے۔ موسم کی مناسبت سے پہلے ٹھنڈے سے تواضع ہوئی، پھر چائے کا دور چلنے لگا، اسی گپ شپ میں شام کی اذان ہونے لگی تھی۔ میں نماز پڑھ کر کھانا کھانے ''سولجر میس'' کی طرف چل پڑا، مگر راستے ہی میں حوالدار میجر کا پیغام ملا کہ مجھے راؤ تصور صاحب یاد کر رہے تھے۔ ڈنر کا ارادہ مؤخر کرتے ہوئے میں ان کے کمرے کی طرف مڑ گیا۔

پرتپاک معانقے کے بعد انھوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ رسمی گفتگو کے دوران ہی ان کا اردلی کھانا لے آیا تھا۔ کھانے کے دوران ہلکی پھلکی گفتگو چلتی رہی۔ قہوہ پیتے ہوئے وہ مطلب کی بات پر آئے۔

''عشاء پڑھ کر تمھیں کمانڈنگ آفیسر کو ملنا ہے۔''

''اس وقت۔'' میں حیران رہ گیا تھا۔

''وہ بے صبری سے تمھارے منتظر تھے۔ اور پہلی فرصت میں ملنے کا حکم دیا ہوا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''بنگلے پر جانا پڑے گا؟''

''عشاء پڑھ کر ہنگامی چٹھیاں (ایمرجنسی ڈاک) وغیرہ دستخط کرنے تھوڑی دیر دفتر میں بیٹھتے ہیں تبھی مل لینا۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد ہم عشاء تک اکٹھے بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ آخری مشن کے بارے انھوں نے کریدکر تفصیل معلوم کی تھی۔ اور ہمارے مچان چھوڑ کر بھاگنے کے فیصلے کو رد کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا زرینہ لوگوں کی حویلی میں گھس کر دشمن سے دو دو ہاتھ کرنا زیادہ بہتر رہتا۔ کیوں کہ مورچہ بند ہو کر ان کا زیادہ نقصان کر سکتے تھے۔ اور اپنی سپاہ کا افغان نالہ میں موجود ہونے کا مطلب یہی تھا کہ اپنے ہدف کا خاتمہ کر کے وہ ہماری مدد کو ضرور پہنچتے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ یوں ہم دشمن کا زیادہ نقصان کر سکتے تھے۔

عشاء پڑھ کر میں کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل وسیم کے دفتر میں پہنچ گیا تھا۔ اردلی کو بھیج کر اپنی آمد سے مطلع کیا۔ انھوں نے فوراً اندر بلا لیا تھا۔

''خوش آمدید جوان!'' انھوں نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے مصافحے کو ہاتھ بڑھایا۔

میں نے ادب سے ہاتھ ملا کر ان کے اشارے پر نشست سنبھال لی۔

آخری مشن کی کامیابی پر مبارک باد دے کر انھوں نے گھر بار کی خیریت پوچھی اور مطلب کی بات پر آ گئے۔

''برخوردار! میں بے چینی سے تمھارا منتظر تھا۔ ایک معزز شخص کا احسان بقایا ہے اور اب انھوں نے خود درخواست کر کے یہ موقع فراہم کیا ہے جو میں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔''

میں نے فرماں برداری سے سر جھکایا۔ ''حکم کریں سر۔''

وہ تفصیل بتاتے ہوئے بولے۔ ''انھوں نے ایک بہترین سنائپر کا تقاضا کیا ہے۔ گو اس ضمن میں باقاعدہ سرکاری چٹھی بھی ہمیں مل چکی ہے، مگر انھوں نے گھنٹی کر کے درخواست کی تھی کہ اپنا بہترین سنائپر ان کے حوالے کروں اور میں نے راؤ تصور صاحب کے مشورے سے تمھارا انتخاب کیا ہے۔ تمھیں یہ جان کر یقیناً حیرت ہوگی کہ ہفتہ بھر پہلے میرے محسن نے دوبارہ کال کر کے یاددہانی کرانے کے ساتھ یہ کہا ہے کہ اِس مشن پر اُس سنائپر کو مقرر کروں جو انڈین دہشت گرد رنجیت چوپڑہ کو ٹھکانے لگانے گیا تھا۔''

میں انکساری سے مسکرایا۔ ''میرے بارے تصور صاحب کچھ زیادہ ہی خوش فہم ہیں۔''

وسیم صاحب کا قہقہہ بلند ہوا۔ ''وہ تو میں بھی ہوں۔''

''کرنا کیا ہے سر!'' میں نے مطلب کی بات جاننا چاہی۔

ان کا دوسرا قہقہہ بلند ہوا۔ ''پتا نہیں۔'' میں بھی ہنس دیا تھا۔

''اس پتے پر چلے جاؤ، تفصیل وہ خود ہی بتائیں گے۔'' وسیم صاحب نے ایک خوب صورت تعارفی کارڈ میری جانب بڑھا دیا۔

کارڈ لے کر میں نے مندرجات پر نگاہ دوڑائی۔ بریگیڈئر ریٹائرڈ فہیم اسلم انصاری کا نام اور چکلالہ کینٹ راولپنڈی کا پتا درج تھا۔ ساتھ ہی موبائل فون نمبر اور پی ٹی سی ایل نمبر بھی درج تھے۔ اتنے سینئر افسر کے نام نے مجھے مرعوب کر دیا تھا۔ فوج کا آفیسر ریٹائرڈ ہو یا حاضر سروس جوانوں کے لیے ایک سا قابلِ احترام ہوتا ہے۔ اس کے نام کے ساتھ صاحب کا سابقہ یوں جڑ جاتا ہے کہ نام کا حصہ ہی معلوم ہوتا ہے۔

میں نے پوچھا۔ ''سر! بریگیڈئر صاحب کو کس وقت ملنا ہوگا؟''

وسیم صاحب بولے۔ ''وہ اتنے بے چین ہیں کہ رات کے تین بجے بھی چلے جاؤ تو خوش آمدید کہیں گے۔''

''آپ کا کیا حکم ہے؟''

وہ خوش دلی سے بولے۔ ''تھکن محسوس نہیں کر رہے تو بریگیڈئر صاحب کے گھر تک چھوڑ سکتا ہوں۔''

''آپ کو زحمت ہو گی۔'' میں نے رسمی جھجک ظاہر کی کہ ویسٹرج سے چکلالہ کینٹ کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا لیکن راولپنڈی کی سڑکوں پر جو ٹریفک کا ازدحام ہر تا ہے وہ مختصر فاصلے کو طوالت میں تبدیل کر دیتا ہے۔

''اس بہانے انصاری صاحب کو مل لوں گا۔'' میرے استفسار کو رضامندی جانتے ہوئے وہ کھڑے ہو گئے۔ راستے میں وہ سنجیدگی سے بولے۔

''برخوردار! یاد رکھنا انصاری صاحب پاکستان کے ہیرو ہیں۔ ایک ایسے شخص جنھوں نے اپنی جوانی وطن عزیز پر قربان کر دی۔ مزید تفصیل ان سے گپ شپ کرتے ہوئے پتا چل جائے گی۔''

''جی سر۔'' میں نے بہ ظاہر سعادت مندی سے سر ہلایا مگر ان کی یاد دہانی عجیب لگی تھی۔ کیوں کہ بریگیڈئر کے عہدے تک سروس کرنے والے کے بارے ایسی یقین دہانی کرانے کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ بلاشبہ تیس سال سروس کرنے والے کو وطن کے لیے پسینہ و خون بہانے کے کئی مواقع ملے ہوں گے۔

چکلالہ کینٹ تک ہمیں گھنٹا ایک لگ گیا تھا۔ داخلے پر اپنی شناخت کرا کر وسیم صاحب چھاؤنی کی کشادہ اور ہموار سڑکوں پر کا دوڑانے لگے۔ دس پندرہ منٹ بعد کار ایک درمیانے حجم کے بنگلے کے سامنے روک کر ہم تعارف کراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد ہم انصاری صاحب کے سامنے بیٹھے تھے۔ انصاری صاحب پر رعب شخصیت کے مالک تھے، نفاست سے ترشی ہوئی چھوٹی داڑھی جس میں نصف سے زیادہ بال سفید نظر آ رہے تھے۔ گھنی مونچھیں، کھلتی ہوئی سفید دودھیا رنگت۔ گہری سیاہ آنکھیں جو مقابل کا ایکسرے کرتی نظر آتیں۔ ان کے ہمراہ تیس، بتیس سال کی جوان طرح دار خاتون بھی موجود تھی۔ اس سے پہلے کہ انصاری صاحب کے ساتھ اس کے رشتے کا تعین کرنے کو ذہن کے گھوڑے دوڑاتا، انصاری انھیں مخاطب ہوئے۔

''شہناز بیگم! ہمیں چائے پلا کر آپ آرام کر سکتی ہیں۔''

''جی ضرور۔'' وہ خوش دلی سے مسکراتے ہوئے خادمہ کو آواز دینے لگیں۔

چائے آنے تک انصاری صاحب، کرنل وسیم سے رسمی گفتگو کرتے رہے۔ ہمیں چائے پلا کر شہناز بیگم خواب گاہ کی طرف بڑھ گئیں۔ انصاری صاحب، کرنل وسیم کی طرف متوجہ ہوئے۔

''تمھیں جانا چاہیے کیوں کہ ہم کافی دیر تک گپ شپ کرنے والے ہیں۔''

''شکریہ سر!'' اجازت ملتے ہی وسیم صاحب رخصت ہو گئے۔

''تو آج کل کیا چل رہا ذیشان میاں۔'' کرنل صاحب کے جاتے ہی وہ بے تکلفی سے مخاطب ہوئے۔

میں ادب سے بولا۔ ''چھٹی سے آج ہی لوٹا ہوں سر! پہلے پاک، افغان سرحد پر تعینات تھا۔''

''گھر میں خیریت ہے؟..... اگر مزید چھٹی چاہیے ہو تو بتاؤ، کیوں کہ میں نہیں چاہتا دوران مشن تمھیں گھر کے مسائل ستاتے رہیں۔''

''الحمدللہ سر بالکل خیریت ہے۔ آپ بے فکر ہو کر کام بتا سکتے ہیں۔''

وہ صاف گوئی سے بولے۔ ''گو ایک پاکستانی سنائپر کو موت سے ڈرانا عجیب بلکہ احمقانہ لگتا ہے، لیکن تمھیں خطرے سے آگاہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چوں کہ یہ میرا ذاتی کام ہے اور تمھاری ذمہ داری وطن کی خدمت و حفاظت ہے اس لیے تمھارے پاس انکار کا انتخاب موجود ہے۔''

میں محتاط انداز میں بولا۔ ''میرا نہیں خیال اتنے بڑے عہدے کا آفیسر کوئی غیر قانونی کام لینا چاہے گا۔ باقی اہل پاکستان کی خدمت بھی دراصل وطن ہی کی خدمت ہے۔''

انھوں نے بھرپور قہقہہ بلند کیا۔ ''ہوشیار ہو، غیر قانونی کام کا ذکر کے اپنی ترجیحات کا اعلان خوب صورت انداز میں مجھ تک پہنچانے کا شکریہ۔''

میں خفیف ہوتا ہوا بولا۔ ''سر! اگر برا لگا ہو تو معذرت خواہ ہوں۔''

وہ خوش دلی سے بولے۔ ''اچھا لگا ہے اس لیے تو شکریہ کہا ہے۔''

''تو کام بتائیں۔''

اس کے ہونٹوں پر خوب صورت مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ شرارتی لہجے میں بولے۔ ''ایک خوب صورت، پرکشش و جاذب نظر حسینہ کو اغواء کرانا ہے، عمر یہی کوئی اٹھارہ سال آٹھ مہینے اور.....'' انھوں نے گھڑی پر نگاہ ڈال کر لمحہ بھر توقف کیا۔ ''سترہ دن، نام ہے پرملہوترا۔''

میں نے الجھن آمیز حیرانی سے پوچھا۔ ''سمجھا نہیں سر!''

وہ شوخی سے بولے۔ ''میں سمجھا دوں گا، پہلے ہامی تو بھرو۔''

میں اتنے سینئر آفیسر کے مذاق کا برا بھی نہیں منا سکتا تھا۔ مجبوراً ان کا ساتھ دینا پڑا۔ ''سر! قسم لے لیں کبھی کسی لڑکی کو اغواء کرنے کا اتفاق نہیں ہوا، نہ اغواء برائے تاوان والے کسی ٹولے سے واقفیت ہے۔ میرا کام تو لبلبی دبا کر دشمن کو اوپر پہنچانا ہے۔ اور کسی خوب صورت لڑکی پر گولی چلانا، چاہے وہ ہندو ہی کیوں نہ ہو خاصا دشوار ہے۔''

وہ دل کھول کر ہنسے، پہلی نظر میں پررعب، سنجیدہ و بردبار نظر آنے والا شخص نہایت زندہ دل، ہنس مکھ اور جلد بے تکلف ہونے والا تھا۔

''یار تمھیں گولی چلانے کو کس نے کہا ہے۔ اسے گولی لگی تو اس سے پہلے میری جان نکل جائے گی۔ میں نے کہا اغواء کر کے لانا ہے۔ اور ایمان سے، وہ مجھے شہناز بیگم سے بھی کئی گنا زیادہ عزیز ہے۔ وہ ہے ہی اتنی پیاری کہ اب کیا کہوں۔''

میں نے چپ سادھ لی تھی۔

انھوں نے ایک اور قہقہہ اچھالا۔ ''شاید سوچ رہے ہو کہ ایک بڈھا اٹھارہ سالا دوشیزہ سے کیسے محبت کر سکتا ہے، مگر یار محبت تو محبت ہے نا کسی سے بھی ہو سکتی ہے، مجھے بھی ہو گئی۔''

میں ہکلایا۔ ''نن..... نہیں سر! ایسی گستاخانہ سوچ میرے دماغ میں پیدا نہیں ہو سکتی۔''

انھوں نے ایک دم غیر متعلق سوال پوچھا۔ ''شادی شدہ ہو؟''

''جی سر!'' میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دشمن جاں کو دکر میری آنکھوں میں آ بسی۔ وہ تو ناراض ہونا جانتی ہی نہیں تھی۔ پتا نہیں اتنا سنجیدگی سے خفا ہونا کہاں سے سیکھ لیا تھا۔

انھوں نے دوسرا سوال پوچھا۔ ''بچے کتنے ہیں؟''

''سر! ایک بیٹا ہے۔'' انھیں سنجیدہ دیکھ کر میرے ہونٹوں سے بھی ہنسی غائب ہو گئی تھی۔

ان کے سوال جاری رہے۔ ''جانتے ہو، مرد کو بیٹا زیادہ پیارا ہوتا ہے یا بیٹی؟''

''سر! سنا تو یہی ہے کہ بیٹی زیادہ پیاری ہوتی ہے۔''

''صحیح سنا ہے یار! بیٹی بہت پیاری ہوتی ہے۔ خاص کر اس صورت میں جب اکلوتی ہو۔'' وہ دکھی نظر آنے لگے، ہنستے چہرے پر غم کے بادل چھا گئے تھے۔ چند لمحے گہری سوچ میں ڈوبے رہے اور پھر میری طرف رخ موڑا، گہرے رازوں کی امین آنکھوں میں پانی کی مقدار گنجائش سے بڑھ گئی تھی۔ اگلے ہی لمحے مقدس پانی کٹوروں کا بند عبور کر کے گالوں پر لڑھکتے ہوئے اعلان کرنے لگا کہ دکھ کے اظہار میں بڑے عہدہ داران کا طریقہ کم درجہ لوگوں سے مختلف نہیں ہوتا۔ انھیں آبدیدہ

دیکھ کر میں مجبوب ہو گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیسے تسلی دوں۔ ایک سپاہی، بریگیڈئر کو کیا دلاسا دیتا۔ مگر پھر میں حوصلہ کر کے اٹھا اور قریب بیٹھ کر ان کا ہاتھ سہلانے لگا۔

''سر! دکھوں کا مقابلہ کرنا مشکل ضرور ہے پر ناممکن نہیں ہے۔ اللہ پاک کی ذات پر توکل کرنا ایسا ہتھیار ہے جو ہر دکھ کا گلا کاٹ دیتا ہے۔ امید کا دامن پکڑے رکھنا کامیابی کی نوید لاتا ہے اور جب تک آس زندہ ہوتی ہے ناممکنات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔''

گہرا سانس لیتے ہوئے انھوں نے رومال آنکھوں پر پھیرا اور شفقت بھرے لہجے میں بولے۔ ''شکریہ بیٹا!''

میں خاموشی سے ان کے مزید بولنے کا منتظر رہا دو تین لمحے سوچنے کے بعد انھوں نے انکشاف کیا۔

''پرماملہوترا میری بیٹی ہے، میری ننھی شہزادی، جان سے پیاری پری ہے۔''

''کیا.....؟'' میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔

میری حیرانی کو درخور اعتناء نہ جانتے ہوئے ان کی بات جاری رہی۔ ''اس وقت میں کیپٹن تھا۔ تین ماہ دورانیے کے انٹیلی جنس کورس میں نمایاں کارکردگی نے میرے لیے ایک ایسی راہ کا تعین کر دیا تھا جسے اختیار کرنے کی صورت میں گھر بار کیا، وطن کی آب ہوا بھی شجر ممنوعہ بن جاتی۔ غیر شادی شدہ ہونا میرا انتخاب کرنے والوں کے لیے مزید ترغیب آمیز تھا۔ مجھے اپنا پیارا وطن چھوڑ کر غیر معینہ مدت تک بھارت میں رہنا تھا۔ کافی سوچ و بچار کے بعد میں نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ والدہ صاحبہ حیات نہیں تھیں ورنہ یہ فیصلہ آسانی سے نہ کر سکتا۔ والد صاحب ریٹائرڈ کرنل تھے اور ایک فوجی کو وطن کی محبت کا درس دینا اس کی خدمات کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ انھوں نے میرے فیصلے کو کشادہ دلی سے سراہا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک عظیم شخص تھے۔ آج اپنی اولاد سے جدا ہونے کے بعد مجھے ان کے دکھ کا ادراک ہو رہا ہے۔ گو مجھ سے بڑا بھائی انھیں سنبھالنے کو موجود تھا پر ان کا اپنا مقام تھا وہ میری جگہ کبھی پُر نہیں کر سکتے تھے۔ ابو جان کی شفقت پدری پر وطن کی محبت غالب آ گئی اور انھوں نے اپنے دکھ کو بہ ظاہر ہنستے ہوئے گلے سے لگا لیا تھا۔ خیر میری رضامندی اور ابو جان کی اجازت ملنے کے بعد میری تربیت نئے سرے سے شروع ہوئی۔ جو سال بھر جاری رہی جب پتا چلا کہ تین ماہ کے کورس میں میری سکھلائی ابجد سے آگے نہیں بڑھ پائی تھی۔ اس بار مجھے ہندی اور بھارت میں بولی جانے والی دوسری دو تین مشہور زبانیں مراٹھی تامل وغیرہ سکھائی گئیں، ہندی رسم الخط سکھایا گیا اور میری تربیت اس نہج پر ہوئی کہ میں سوچتا بھی ہندی میں تھا۔ (بے شک ہندی، اردو کی اصل ایک ہے، مگر وقت گزرنے کے ساتھ اردو میں سنسکرت کے مشکل اور ناقابل فہم الفاظ متروک ہو گئے اور ان کی جگہ عربی و فارسی کے سہل و خوش تلفظ الفاظ کثیر تعداد میں در آئے اور اردو نے رسم الخط بھی عربی، فارسی سے مستعار لے کر ایک علیحدہ شناخت بنا لی جبکہ ہندی سنسکرت سے جڑی رہی) مجھے نئی شناخت ملی، میرا نام پاریش ملہوترا رکھا گیا۔ انبالہ کے ایک مضافاتی گاؤں کی شہریت ملی۔ نقلی والدین ملے۔ لیکن ان بے چاروں کی نظر میں، میں ان کا سگا بیٹا ہی تھا۔ اس معاملے میں ذرا سا خطرہ بھی مول نہیں لیا گیا تھا۔ موہن ملہوترا کا بڑا بیٹا لڑکپن میں غائب ہو گیا تھا۔ اس کی تلاش میں کافی سرگرمی دکھائی گئی مگر بیٹا واپس نہ مل سکا۔ آخر رو دھو کر انھیں چپ سادھنا پڑی۔ ماں کسی بھی مذہب، کسی بھی مسلک، کسی بھی قوم کی ہو ماں ہی ہوتی ہے۔ اولاد کو بھول جانا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ رادھا ملہوترا ابھی اپنے بیٹے کو بھلا نہیں پائی تھی۔ پاکستان میں جونہی میری تربیت شروع ہوئی، انبالہ میں موجود مخصوص افراد نے موہن ملہوترا کے گرد دائرہ تنگ کرنا شروع کر دیا۔ بڑی چابک دستی اور منصوبہ بندی سے اس تک بیٹے کی زندگی کی نوید پہنچائی گئی۔ پگلی ماں کی تو نیندیں ہی حرام ہو گئیں۔ اپنی بے چینی و بے قراری پر جو دبیز پردے ڈالے تھے وہ تار عنکبوت کی طرح بکھر گئے۔ میری ناگفتہ بہ حالت کی تصاویر دکھا کر ان کے سکون و آرام کو تہ و بالا کیا گیا۔ یہاں تک کہ موہن ملہوترا نے بیٹے کی

بازیابی کی کوششیں تیز کر دیں۔ دوران تربیت مجھے ان کے پورے خاندان کی تصاویر دکھا کر نہ صرف ان کی شناخت میرے دماغ میں نقش کی گئی بلکہ پارتھ ملہوترا کے دائیں گال پر بنا مخصوص تل اور بائیں کہنی پر پرانے زخم کا نشان بھی میرے جسم کا حصہ بن گیا تھا۔ تربیت کے خاتمے پر میں خفیہ طریقے سے انبالہ پہنچایا گیا۔ آخر ایک دن موہن ملہوترا اپنے بیٹے کے حصول میں کامیاب ہو ہی گئے۔ سات آٹھ سال بعد انھیں بیٹا ملا تھا۔ پورے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ مجھے اپنے اغواء کی مکمل کہانی ازبر تھی۔ کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا تھا۔

موہن ملہوترا ایک متمول شخص تھا۔ شناخت کے مرحلے سے فارغ ہوتے ہی میں نے باپ کے سامنے پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ پارتھ مڈل میں تھا جب غائب ہوا تھا۔ اب میں وہیں سے آغاز کرتا تو یقیناً آٹھ دس سال حصولِ تعلیم ہی میں برباد ہو جاتے۔ مگر موہن ملہوترا نے میرے لیے گھر ہی پر استاد کا بندوبست کر دیا۔ پہلے ہی سال میں نے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ اگلے دو سال میں ایف اے کر کے میں نے آرمی جوائن کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اپنے شناختی کاغذات میں میں نے عمر کافی کم درج کرائی تھی۔ میرا چہرہ بھی ایسا تھا کہ عمر سے پانچ چھے سال چھوٹا ہی لگتا تھا۔

موہن ملہوترا کی کوشش سے میں بھارتی فوج میں آفیسر بھرتی ہو گیا۔ پاک فوج کی اعلیٰ تربیت نے مجھے ہر میدان میں سرخ رو رکھا۔ بہ ہر حال یہ طویل داستان ہے جو ایک نشست میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے میں اجمالاً ان واقعات پر روشنی ڈال رہا ہوں۔ تربیت کے خاتمے پر کیپٹن بننے تک مجھے چھوٹے چھوٹے کام سونپے جاتے رہے اور پھر میرے ذمہ ایک عجیب کام لگایا گیا۔ مجھے پاروتی شکلا نامی لڑکی کو محبت کے جال میں پھانس کر شادی کرنا تھی۔''

گہرا سانس لے کر انھوں نے صوفے سے ٹیک لگائی چند لمحوں بعد مضمحل آواز ابھری۔'' جاسوس بننے والے کو ایسے غیر اخلاقی کاموں سے بھی پالا پڑتا ہے جن کی اجازت نہ شریعت دیتی ہے اور نہ انسان کا ضمیر، مگر مادرِ وطن قربانی مانگتی ہے اور بیٹوں کو سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ میں بھی چھٹیوں میں آگرہ پہنچ گیا کہ اس کا تعلق آگرہ ہی سے تھا۔ وہ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھی۔ کم بخت فوجیوں میں ایک خصلت مشترک ہے کہ محبت کرتے ہیں مگر طریقہ کار سے ناواقف ہوتے ہیں اور میں تو اس معاملے بالکل اناڑی تھا۔ یونیورسٹی کی طالبہ کا سامنا کرنا مجھے ٹینک کے نیچے لیٹنے سے مشکل لگ رہا تھا۔ اس کی دلکش شکل اور تیزی طراری دیکھ کر تو میں نے ناکامی کا اعلان کرنے کا ارادہ کر لیا۔ گو اس کی تصویر میں نے پہلے سے دیکھی ہوئی تھی، لیکن سامنے آنے پر وہ تصویر سے کئی گنا زیادہ خوب صورت وطرح دار لگی۔ تین دن مسلسل اس کا پیچھا کرتا رہا۔ وہ کلاس روم میں ہوتی اور میں نامراد عاشق کی طرح سبزہ زار یا کیفے میں بیٹھ کر راہ تکتا رہتا۔ تعاقب کے چوتھے دن جب وہ سہیلیوں کے جھرمٹ میں کیفے میں بیٹھی تھی اور میں فیصلہ کر چکا تھا کہ شام کو اپنی ناکامی کی باقاعدہ رپورٹ متعلقہ شخص کے حوالے کر دوں گا۔ بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر وہ اپنی سہیلیوں کو معذرت کرتے ہوئے میرے سامنے آ بیٹھی۔ میں اسے پھانسنے کے چکروں میں تھا لیکن اس کے قریب آنے پر ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اور میرے چہرے پر گھبراہٹ نمودار ہو گئی تھی۔ اس نے اطمینان بھرے انداز میں پانی کا گلاس بھر کر میری جانب کھسکا دیا۔

''پانی پی لو۔''

میں نے پورا گلاس ایک ہی سانس میں معدے میں انڈیل لیا تھا۔

اس نے اطمینان سے پوچھا۔'' اب بتاؤ، پیچھا کیوں پڑے ہو؟''

''نن..... نہیں مادام..... ایسا تو نہیں ہے۔'' میں بری طرح ہکلا گیا تھا۔

اس نے آنکھیں نکالیں۔'' پاروتی شکلا کو جھوٹ بولنے والے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔''

میں نے تھوک نگلتے ہوئے دائیں بائیں دیکھ کر راہ فرار تلاش کی، عجیب مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس کا قریب بیٹھنا اچھا بھی لگ رہا تھا اور بھاگنا بھی چاہتا تھا۔ اس کی مترنم آواز حواسوں پر چھا رہی تھی اور استفسار سے گھبراہٹ بھی ہو رہی تھی۔ اس کی صورت سے آنکھیں ٹھنڈک بھی پا رہی تھیں اور نظریں بھی چرانا چاہتا تھا۔

''کیا پوچھا ہے۔'' میز پر دونوں ہاتھ ٹیکتے ہوئے وہ آگے کو جھکی۔

اور تب اس چیونٹی کے مصداق جو ہاتھی کے پاؤں تلے آتے وقت بے بسی سے کاٹ لیتی ہے، میں نے بھی ہڑبڑاتے ہوئے اُگلا۔ ''تت..... تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کی موٹی آنکھوں نے پھیل کر پورے چہرے کو ڈھانپ لیا تھا۔ ''کیا آپ پاگل ہیں۔''

تیر کمان سے نکل چکا تھا، پیچھے ہٹنے اور انکار کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ میری قسمت میں یونیورسٹی کے طلبہ کی مار لکھی تھی تو اسے ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ تبھی ہمت باندھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہاں، چند دن ہی ہوئے ہیں پاگل ہوئے۔ جب تمھیں پہلی بار دیکھا تھا۔''

وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''مسٹر! یقیناً آپ پاروتی شکلا سے واقف نہیں ہیں، ورنہ ایسی جرأت کبھی نہ کرتے۔''

منہ پر تھپڑ نہ پڑتے دیکھ کر ہمت سوا ہو گئی تھی۔ میں نے بات بڑھائی۔ ''کیپٹن پاریش ملہوترا، جنم بھومی انبالہ ہے۔ آگرہ کسی کام سے آیا تھا اور اب کسی بھی کام کے قابل نہیں رہا۔ مجھ سے شادی کر لو تا کہ میں دھرتی ماتا کی خدمت نچنت (بے فکر) ہو کر کر سکوں۔''

''یقیناً آپ دیوانوں سے بھی دو قدم آگے ہیں۔'' اس کے ہونٹوں پر مدھر تبسم ابھرا، تب وہ اتنی پیاری، اچھی اور پرکشش لگی کہ مجھے اپنا فعل نہایت غلط محسوس ہوا۔ نہ جانے اس سے کیا کام نکلوانا چاہتے تھے۔ ایک دم میں نے ناکامی کے اعتراف کا فیصلہ کیا، کہ بھارت میں فقط ایک ہی کام نہیں تھا۔ نہ میں اکیلا جاسوس ہی تھا۔ اس کام کو کوئی دوسرا بھی منتخب کیا جا سکتا تھا۔ یہ سوچتے ہی میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر لمبے ڈگ رکھتا ہوا کیفے سے باہر جانے لگا۔

''اے! کہاں چل دیے۔'' اس نے بوکھلاتے ہوئے آواز دی، مگر میں نہ رکا۔ کیفے سے چند قدم ہی دور آیا تھا کہ کسی نے پیچھے سے ہاتھ پکڑا۔ میں چونکتے ہوئے مڑا۔ پاروتی ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرے کھڑی تھی۔

''انکار تو نہیں کیا کہ آپ ترنت (فوراً) بھاگ پڑے۔''

''کک..... کیا۔'' میں ہکلا گیا تھا۔

وہ بے باکی سے بولی۔ ''مجھے گھورنے والے آپ اکیلے نہیں ہیں کہ تفتیش کرتی پھروں، البتہ اس قابل لگنے والے پہلے ہیں جسے نظر انداز نہ کیا جا سکے۔''

اس کے اعتراف نے مجھے گنگ کر دیا تھا۔

وہ شوخی سے مسکرائی۔ ''منہ میں گھنگنیاں ڈالے کھڑے رہو گے یا کچھ کھانے پینے کی دعوت بھی دو گے۔''

''مم..... میں نے ویسے ہی مذاق کیا تھا۔ ایک دوسری لڑکی کو پسند کرتا ہوں، اس کے لیے یادگیے مکالمے تمھارے سامنے دہرا دیے۔'' میں نے جھوٹ کا سہارا لے کر خوب صورت بلا سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی جو چند لمحوں میں حواسوں پر چھانے لگی تھی۔ میں کوئی بھی ایسا کام نہیں کر سکتا تھا جس سے اس کی ذات کو ادنیٰ سا نقصان پہنچتا۔ کسی ایک کام میں ناکامی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میری ساری خدمتوں پر پانی پھر جاتا۔

اس کے چہرے پر تحیر ابھرا، شوخ آنکھوں کی گہرائی میں اضطراب ہلکورے لیتا ہوا نمودار ہوا۔ اور اس سے پہلے کہ شکوہ کرتی نگاہوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑتے، میں پیچھے مڑ کر تیز قدموں سے اپنے ہوٹل کی طرف چل پڑا۔ شام کو

ناکامی کی رپورٹ تحریر کر کے میں نے مخصوص ذریعے سے اس شخص تک پہنچادی جس سے مجھے ہدایات ملا کرتی تھیں۔ وہ رات آنکھوں ہی میں بیتی تھی۔ پاروتی کے ساتھ مختصر لمحات گزار کر اتنی بے چینی تھی تو اس کا مستقل ساتھ مجھے کام ہی سے نکال دیتا۔

اگلے دن واپس انبالہ روانہ ہوا تا کہ بقیہ چھٹی گھر گزار سکوں۔ البتہ گھر واپس آ کر محسوس ہوا کہ میں صرف جسمانی دوری پیدا کرنے میں کامیاب ہوا تھا دل و دماغ سے اسے نہیں جھٹک پایا تھا۔

دوسرے دن مجھے اپنی رپورٹ کا جواب موصول ہوا تھا۔

''اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، اصل ہدف کوئی اور ہے۔ وہ صرف درمیانی کڑی ہے۔ تم اسے شریک حیات بنا سکتے ہو۔''

میں کافی بے چینی و بے سکونی محسوس کر رہا تھا۔ اسے نقصان نہ پہنچنے کی خبر نے مجھے اسی دن آگرہ لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ انبالہ سے آگرہ تک قریباً ساڑھے چار پانچ سو کلومیٹر کا فاصلہ میں نے راستے میں رکے بغیر طے کیا تھا۔ رات ہوٹل میں گزار کر میں اگلی صبح سویرے ہی یونیورسٹی پہنچ گیا تھا۔ اس کی روزمرہ معلوم تھی۔ ڈرائیور اسے چھوڑ کر واپس لوٹ جاتا تھا۔ وہ پیریڈ شروع ہونے سے ادھ پون گھنٹا پہلے آتی اور فالتو وقت یونیورسٹی کی لائبریری میں گزارتی تھی۔ خالی پیریڈ کے دوران وہ سہیلیوں سے گپ شپ کرتی، کیفے میں جا کر کھانے پینے کا شغل کرتی، چھٹی کے وقت دوبارہ تھوڑی دیر لائبریری میں گزارتی، یہاں تک کہ ڈرائیور لینے پہنچ جاتا۔

اس کی آمد سے پہلے میں یونیورسٹی لائبریری کے مخصوص گوشے میں موجود تھا جہاں وہ بیٹھا کرتی تھی۔ ایک کتاب کھول کر بہ ظاہر صفحات پر نظر دوڑا رہا تھا مگر میرا رواں رواں اس کی آمد کا منتظر تھا۔ اور پھر وہ پہنچ گئی۔ کتابوں کی الماری کا رخ کرنے سے پہلے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ سن کھڑی مجھے گھورنے لگی۔ دو تین لمحے بعد جانے کے ارادے سے مڑی، تبھی میں نے آواز دی۔

''مس شکلا.....'' گومگو کی کیفیت میں وہ رک گئی تھی۔ بلاشبہ سخت خفا تھی۔ اور چھوٹی سی ملاقات کے بعد ناراضی کا اظہار بتا رہا تھا کہ میں اس کے لیے کتنا اہم تھا۔

کتاب بند کر کے میں قریب ہوا، غزالی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دھیرے سے بولا۔ ''شما کردو۔''

اس نے سرد مہری سے پوچھا۔ ''کیا ہم ایک دوسرے سے واقف ہیں۔''

''پتا نہیں۔'' میں نے دائیں بائیں سر ہلایا۔

''لڑکیوں کو چھیڑنے کا نتیجہ جانتے ہیں۔''

میں اداسی سے بولا۔ ''شاید۔''

وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔ ''یقیناً جس لڑکی کے لیے مکالمے یاد کر رکھے تھے، اس نے دھتکار دیا ہے جو دوبارہ میری ضرورت پڑ گئی ہے۔''

میں بے بسی سے بولا۔ ''مجھے اظہار کرنا نہیں آتا، نہ روٹھوں کو منانا جانتا ہوں اور نہ یہ پتا ہے کہ جو پیارا لگے اس سے کیسے جان چھڑائی جاتی ہے۔ کوشش کی تھی ناکام رہا، مجبوراً واپس آنا پڑا۔''

''میں سکھا دیتی ہوں اظہار کیسے کرتے ہیں۔'' یاقوتی لبوں پر مدھر تبسم ابھرا جو اس کا سب سے بڑا ہتھیار تھا، میرے ہاتھوں کو پکڑ کر اپنے کندھوں پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''اب بولیں، پاروتی! مجھے بہت اچھی لگتی ہو، تم سے پریم کرنے لگا ہوں، کیا میری بے رونق زندگی میں بہار بن کر آ سکتی ہو۔ اگر تم نے انکار کیا تو میں بے موت مارا جاؤں گا..... میری آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کر رومانوی لہجے میں بول دیں..... چلیں شاباش۔''

اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے میں دل کی گہرائی سے بولا۔''شادی کرو گی۔''

اس نے شرما کر آنکھیں جھکالی تھیں۔'' انصاری صاحب نے خاموشی سادھ لی۔ میں بھی چپ چاپ ان کے بولنے کا منتظر رہا۔ تھوڑی دیر گہری سوچوں میں کھوئے رہنے کے بعد وہ دھیرے سے مسکرائے۔''جانتے ہو، پاروتی سے ملاقات میں نے اتنی تفصیل سے کیوں بیان کی۔''

میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ ورنہ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ تھا کہ محبوب کی باتیں کرنے سے کبھی سیری نہیں ہوتی، خاص کر پہلی ملاقات یاداشت میں یوں محفوظ رہتی ہے جیسے لمحہ بھر پہلے کی بات ہو۔ مجھے بھی تو اپنی پلوشے کی پہلی دید از برتھی۔ گو ہماری ملاقات دشمنوں کے انداز میں ہوئی تھی لیکن پھر بھی وہ سہانا وقت یاداشت میں ثبت ہو گیا تھا۔

انھوں نے قہقہہ لگایا۔''تمھیں شاید کبھی محبت نہیں ہوئی۔''

میں نے مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ انھوں نے ملازمہ کو چائے کا بتا کر بات جاری رکھی۔

''یار! وہ مجھے بہت پیاری تھی۔ اس کی رضامندی پا کر میں نے بغیر تاخیر کے والدین کو انبالہ سے بلا لیا تھا۔ چھوٹی بہن اور بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ والدین کافی عرصے سے مجھے زور دے رہے تھے ایسے عالم میں جب میں نے اپنی خواہش ان تک پہنچائی تو وہ بھاگے چلے آئے۔

اگلے دن ہم پاروتی شکلا کے گھر پہنچ گئے۔ وہ اس دن یونیورسٹی نہیں آئی تھی۔ جب اس کے والد سے تعارف ہوا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ لمبے تڑنگے کرنل دھیرندر شکلا کی شخصیت میرے لیے انجانی سہی مگر اس کا ریفرنس باور کرانے کو کافی تھا کہ پاروتی شکلا کے ذریعے مجھے کس کڑی سے جوڑا جا رہا تھا۔

میرا خاندانی پسِ منظر، فوج کی نوکری اور پاروتی کی مرضی، ان عوامل کے ہوتے ہوئے مجھے ٹھکرانا آسان نہیں تھا۔ خرانٹ شکل کے دھیرندر شکلا نے رضامندی ظاہر کر دی۔ اس کے خشونت بھرے چہرے پر کرختگی، بے رحمی، کھردار پن اور درشتی گویا ابل رہی تھی۔ پاروتی جیسی ملائم، دلکش اور پیاری لڑکی کا والد مجھے دل کی گہرائیوں سے ناپسند آیا تھا۔

دونوں طرف رضامندی کے بعد پاروتی کی تعلیم مکمل ہونے تک شادی مؤخر کی گئی۔ اس کا آخری سمیسٹر شروع تھا۔ تین ماہ بعد وہ میری زندگی میں باقاعدہ دلھن بن کر داخل ہوئی۔

وہ مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی۔ اور میں بھی بغیر کسی لالچ، غرض اور مطلب کے اس پر فدا تھا۔ شادی کے ایک ماہ بعد ہی پاکستان کے ساتھ حالات خراب ہوئے اور مجھے کشمیر کے محاذ پر جانا پڑا۔ بہت مشکل اور کڑا وقت تھا، مختصر یہ کہ اللہ کے فضل و کرم سے اپنے کسی بھائی کی گولی کا نشانہ نہ بنا اور چھے سات ماہ بعد چھٹی آ گیا۔ گھر آ کر پتنی کو دیکھا تو خوف و گھبراہٹ سے چکر آ گئے تھے۔ وہ چھے سات ماہ کی حاملہ تھی۔ میں کسی صورت بچہ نہیں چاہتا تھا، لیکن اب پاروتی کو حمل گرانے پر راضی کرنا ناممکن تھا۔ یوں بھی جس جی کو اللہ پاک دنیا میں بھیجنا چاہے اس کی راہ میں کوئی دنیاوی طاقت رکاوٹ نہیں ڈال سکتی۔ مجبوراً چپ سادھنا پڑی۔ اللہ پاک نے مجھے ایک خوب صورت بچی کا باپ بنا دیا۔ جیسے پرما کی دنیا میں آمد میری منشا کے خلاف ہوئی تھی یونہی میرے دل پر اس کے قابض ہونے میں بھی میرے ارادے یا خواہش کا عمل دخل نہیں تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی روز بہ روز میرے دل میں اس کی محبت بڑھتی گئی۔ البتہ ایک دھیان میں نے ضرور رکھا کہ پاروتی دوبارہ ماں نہ بن سکے۔ اگر بے احتیاطی سے حمل ہو بھی گیا تو میں نے پاروتی کی بے خبری میں اسے ایسی دوائیاں کھلا دیں جس سے حمل ضائع ہونا پڑا۔ تین چار حمل ضائع ہونے کے بعد اس نے میری مسلسل نصیحتوں کو قابل عمل جانتے ہوئے

دوسری اولاد کی خواہش دل سے نکال دی تھی۔ بہ ہر حال یہ ضمنی بات ہے۔ پاروتی سے شادی کے چند ماہ بعد ہی مجھے دھیرندر شکلا کے مزید نزدیک ہونے کا حکم ملا تھا۔ وہ مستقل مقبوضہ کشمیر کے محاذ پر تعینات تھا۔ اس کے بارے جو تفصیل ملی تھی میرے دل میں اس کی نفرت کا گراف مزید بلند کر دیا تھا۔ مظلوم کشمیریوں پر ظلم ڈھانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ کشمیری مجاہدوں میں بھی وہ شیطان کی طرح مشہور تھا اور اسے قتل کرنے کی کوششوں میں مجاہدین اپنا کافی نقصان کر چکے تھے۔ میں اس کا داماد تھا، ایسے موقع کا حصول مشکل نہیں تھا کہ اسے کیفر کردار تک پہنچا سکتا، مگر ایسی صورت میں ایک تو خود پھنس جاتا دوسرا دھیرندر شکلا ایک اہم شخص تھا، اس کی وساطت سے مجھے کافی کارآمد معلومات اور دشمن کے راز مل جاتے تھے۔ جو اس کے خاتمے کے بعد ناممکن الحصول ہو جاتے۔ میں طبیعت پر جبر کر کے اس ظالم کے مزید قریب ہونے لگا۔ مسلمانوں سے اظہار نفرت، انھیں دہشت گرد، ظالم اور سفاک قرار دینا، پاک فوج کی بزدلی اور ڈرپوکی پر لطائف اور پاکستان سے بغض و عناد کا پرچار ایسے منتر تھے جس سے میں اس کا منظور نظر بنتا گیا۔ اس کے چھٹی آنے پر بے شمار ملاقاتیں ہوتیں اور باتوں باتوں میں کافی معلومات اگلوا لیتا۔ اس کی غیر موجودی میں اس کے سامان کی بھی تلاشی لے لیتا تھا۔ اس کے قریب ہونے کی مجبوری میں مجھے انبالہ چھوڑ کر آگرہ میں مستقل رہائش اختیار کرنا پڑی۔ میرا یہ فعل پاروتی کے نزدیک اسے خوش کرنے کو تھا۔ گو میں اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا لیکن آگرہ منتقل ہونا سراسر احکامات کے تابع ہوا تھا۔

میرے دل میں پاروتی کو مسلمان کرنے کی بڑی حسرت تھی، لیکن اپنی محبت و خواہش پر میں نے وطن کی محبت کو مقدم رکھا۔ تبھی پاروتی کو حق کی راہ دکھانے کا حوصلہ نہ کر سکا، یونہی پرما کے بارے بھی ایسی کوشش نہ کر سکا تھا۔ البتہ ایک خیال میں نے ضرور رکھا کہ وہ ہندومت کے قریب نہ جا سکے۔ میری کوشش سے وہ اول دن سے آزاد خیال اور لبرل بن گئی تھی۔ البتہ میں خود اپنے بناوٹی مذہب کا بہت دھیان رکھتا تھا۔ کیوں کہ اسی طرح میری شناخت زیادہ پوشیدہ رہ سکتی تھی۔

میرے سسر دھیرندر شکلا بریگیڈیئر، میجر جنرل اور پھر لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے تک پہنچ گئے تھے۔ اچھے سروس ریکارڈ کے ساتھ میں نے بھی لیفٹیننٹ کرنل کا رینک لگا لیا تھا اس دوران پاک فوج کے مطلوبہ اہداف خوش اسلوبی سے پورے کرتا رہا۔ میں ہمیشہ بچ بچا کے اور نہایت احتیاط سے کام کرتا تھا۔ ہفتوں کا کام مہینوں تک مؤخر رکھتا اور بے احتیاطی نہ کرتا۔ لیکن میرے چوکنا ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ باقیوں سے بھی غلطی نہیں ہو سکتی تھی۔

جاسوسی کا کام نہایت توجہ، باریک بینی، بروقت فیصلہ کرنے کی صلاحیت اور ہوشیاری کا متقاضی ہے۔ ایک جاسوس کے واسطے پھیلے ہوئے نہیں ہوتے۔ ورنہ ایک کے پکڑے جانے کی صورت تمام دشمن کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ البتہ ایک دو افراد سے رابطہ رکھنا مجبوری ہوتا ہے۔ اور میری بدقسمتی کہ دشمن کے راز اور معلومات وغیرہ میں جس آدمی کے ذریعے بھیجا کرتا تھا وہ پکڑا گیا۔ اور ایجنسی کے غیر انسانی تشدد کے سامنے اس نے میرا راز فاش کر دیا۔ چونکہ میرا سسر ایک جنرل تھا اور شروع دن سے اس کے خفیہ ایجنسیوں سے روابط تھے بلکہ وہ بہ ذات خود "را" اور دوسری ایجنسیوں میں کافی سروس گزار چکا تھا۔ ایجنسیوں نے جونہی میرے خلاف دائرہ تنگ کرنا شروع کیا، میرے سسر کے ایک خیر خواہ نے اس تک یہ خبر پہنچا دی۔ اسے میری خوش قسمتی سمجھو کہ جب وہ اپنے خاص کمرے میں ایجنسی کے بندے سے گفتگو کر رہا تھا تب پاروتی نے اتفاق سے ساری گفتگو سن لی تھی۔ وہ چند لمحے پہلے ہی گھر پہنچی تھی اور والد کی تلاش میں اس کے مخصوص کمرے کی طرف بڑھی، اندر داخل ہونے کو وہ دروازہ دھکیلنے ہی لگی تھی کہ والد کے منہ سے میرا نام سن کر لمحے بھر کو ٹھہر گئی۔ جوں جوں گفتگو آگے بڑھی خوف و ڈر سے اس کا خون خشک ہوتا گیا۔ والد کو ملے بغیر وہ سرعت سے پلٹی اور گاڑی بھگاتے ہوئے گھر پہنچ گئی۔

انصاری صاحب نے چپ سادھ لی تھی۔ کافی دیر سر جھکائے بیٹھے رہے۔ پھر ان کی اذیت بھری آواز نے خاموشی کو

توڑا۔

'' ان لمحوں کو بیان نہیں کر سکتا۔ گھر پہنچ کر سب سے پہلے اس نے میرا گریبان پکڑا تھا، مجھے دھوکے باز، مطلبی، ظالم، خودغرض اور نجانے کیا کیا پکارا اور پھر مجھے لپٹ کر یوں بلک بلک کر روئی جیسے دودھ پیتا بچہ روتا ہے۔ میں بھی جانتا تھا کہ جدائی کی گھڑی سر پر پہنچ گئی ہے۔ پاروتی کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور ایسا ہی تھا جیسے گردن کٹنے کے بعد زندہ رہنا۔ اگر وہاں رکنے کی کوئی صورت بچنے کا ذرا سا بھی احتمال ہوتا تو میں نہ بھاگتا، مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ مجھے اپنے جگر کے دو ٹکڑوں، پرما اور پاروتی کو وداع کہنا پڑا۔ پرما تو گھر پر موجود ہی نہیں تھی۔ چونکہ میں جانتا تھا کہ وہاں میری نگرانی ہو رہی ہے اس لیے پاروتی مجھے کار کی ڈگی میں چھپا کر باہر لے گئی۔ وفا کی پتلی مجھے چھوڑنے انبالہ تک آئی۔ میں نے اسے ساتھ لے جانے کی بڑی کوشش کی پر وہ نہ مانی۔ گو اس نے وطن کی محبت پر میری محبت کو ترجیح دی تھی مگر اس کی بھارت ماتا سے محبت اور اپنے دھرم سے لگاؤ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ اسی وجہ سے تو میں اسے اسلام کی دعوت نہیں دے سکا تھا۔

بہ ہر حال وہ مجھے انبالہ چھوڑ کر آنسو بہاتے ہوئے واپس لوٹ گئی۔ میں کس طرح بھارت سے نکلا یہ ایک الگ کہانی ہے۔ پاکستان پہنچنے میں پورا مہینا لگا تھا۔ یہاں آتے ہی سب سے پہلے میں نے پاروتی اور پرما کی خبر لی۔ تب خیر خواہوں کی زبانی یہ روح فرسا خبر پہنچی کہ پاروتی بہ خیریت آگرہ نہیں پہنچ پائی تھی۔ راستے ہی میں حادثے کا شکار ہو کر مذبوحانہ اجل ہو گئی تھی۔ یقیناً میری جدائی کا دکھ اس سے برداشت نہیں ہو پایا تھا۔ اور میں بے وفا آج بھی زندہ سلامت بیٹھا ہوں۔'' انصاری صاحب کی آنکھوں میں نمی نمودار ہوئی، ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے انھوں نے آنکھوں پر رومال پھیرا اور ان کی بات جاری رہی۔

'' یہاں میری بریگیڈیئر رینک تک ترقی ہو چکی تھی اور سروس کے اختتامی دو تین ماہ ہی باقی تھے۔ ناگفتہ بہ حالت کی بدولت میں سروس جاری رکھنے سے قاصر تھا۔ میجر جنرل کے عہدے کی پیش کش ہوئی لیکن مجھے انکار میں سر ہلانا پڑا۔ پاکستان آتے ہی میرے لیے اہمیت کا حامل کوئی کام تھا تو وہ اپنی پری کی بہ خیریت واپسی تھی۔ اور میں اسی کوشش میں لگ گیا۔ بھارت میں کافی خیر خواہ موجود تھے۔ ریاست کے مخالف، علیحدگی پسند تنظیمیں، جاسوس، ساتھی، مجرم ٹولے، بالکل جیسے پاکستان میں یہ عناصر کثیر تعداد میں بھرے پڑے ہیں یہی صورت حال اپنے پڑوسی بھارت میں بھی ہے۔

جنرل دھیرندر شکلا اپنی پوتی کو ساتھ لے گیا تھا۔ کیوں کہ میرے فرار سے دو تین سال پہلے ہی میرے نقلی ماتا پتا کی وفات ہو چکی تھی اور پرما اسی کی ذمہ داری میں آتی تھی، اگر میرے والدین زندہ ہوتے تب بھی وہ پرما کو ان کے حوالے کرنے پر تیار نہ ہوتا کیوں کہ وہ اچھی طرح جانتا ہے میں پری کو کس قدر چاہتا ہوں۔ خاص کر اپنی بیٹی کو میں کافروں کے پاس پرورش پانے نہیں چھوڑ سکتا۔ میری غیرت کیسے گوارا کر سکتی ہے کہ میری بیٹی کسی ہندو کے بچے پیدا کرے۔ اب میری بے صبری سمجھو یا حماقت کہ میں نے پہلی فرصت میں پرما کو حاصل کرنا چاہا۔ اور تیزی میں درستی بھول گیا۔ جس کی وجہ سے پہلی کوشش ناکام ہوئی اور جنرل دھیرندر شکلا نہ صرف ہوشیار ہو گیا بلکہ اس نے پرما کی حفاظت کا بھی خاطر خواہ بندوبست کر دیا۔ پہلی کوشش کی ناکامی سے بھی میں نے کوئی خاص سبق نہ سیکھا اور جلد بازی میں دوسری کوشش بھی کر ڈالی۔ اب نامعلوم میرے مقرر کیے ہوئے آدمی نالائق تھے یا وہ پرما کے حصول کی سنجیدہ کوشش نہیں کر رہے تھے کہ دوسری کوشش بھی ناکام چلی گئی۔ بلکہ اس دفعہ میرے دو آدمی بھی کام آ گئے تھے۔ تنگ آ کر میں نے سسر کو کال کی، اس کی منت زاری کی کہ وہ پری کو میرے پاس بھیج دے۔ لیکن اس نے کھری کھری سنا کر رابطہ منقطع کر دیا۔ پری کا فون نمبر اس نے شروع ہی دن سے تبدیل کر دیا تھا تاکہ میں اسے کال نہ کر سکوں۔ چند ماہ ہوئے وہ ریٹائرڈ ہو گیا ہے اس کے پاس قلم، بددیانتی اور ناجائز

ذرائع سے کمائی ہوئی بے بہا دولت ہے۔ دہشت گرد تنظیموں کو اسلحہ فراہم کرنے کی اجازت تو بھارتی سرکار کی طرف سے حاصل تھی اس اجازت نامے کو اس ظالم نے پیسے کے حصول کا مستقل ذریعہ بنالیا تھا۔ افغانستان میں بھی اس کی آمدورفت رہی ہے۔ مختلف جتھوں کو اسلحہ کی فراہمی کے ساتھ وہ پوست کی اسمگلنگ میں بھی ملوث رہا ہے۔ افغانستان کی جانب سے جو انڈیا دراندازی کررہا ہے اس کے پیچھے تجویز کار "ماسٹر مائینڈ" وہی ہے۔ اور دولت کی فراوانی کی وجہ سے انڈیا کے مختلف شہروں میں اس نے اپنی کوٹھیاں بنا رکھی ہیں۔"

وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ "کچھ پلے پڑا؟"

اب میری سمجھ میں آیا تھا کہ وسیم صاحب انھیں ہیرو کیوں کہہ رہے تھے۔ بلاشبہ وہ پاکستان کے اصل ہیرو تھے۔ انھوں نے پاکستان کی خاطر اپنی خواہشات، جوانی، محبت اور اولاد تک قربان کی تھی۔ میں عقیدت سے بولا۔ "سب کچھ، سوائے اس کہ سنائپر کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے۔"

"کیوں کہ پرما کی واپسی میں سب سے بڑی رکاوٹ دھیرندر شکلا کی ذات ہے۔ گو میں مانتا ہوں کہ دونوں ممالک کی سرحدوں کی حفاظت کرنے والوں کے خلاف شہر میں جاکر کوئی کارروائی کرنا بالکل غلط اور ناروا ہے۔ ہر سرحد کا سپاہی ملک کی حفاظت کی خاطر جان دیتا بھی ہے اور لیتا بھی ہے۔ انڈیا نے ہمارے سیکڑوں بیٹے شہید کیے، ہم نے بھی ان کے کئی سورماؤں کو ہلاک کیا۔ دونوں جانب سے حساب برابر رہا۔ آگے بھی ہم لڑیں گے۔ مریں گے بھی اور ماریں گے بھی، لیکن سرحد کی لڑائی کو سرحد تک محدود رہنا چاہیے۔ البتہ ظلم، سفاکی اور دہشت گردی کا بدلہ لینا ہر حال میں جائز ہے۔ اس سنگ دل نے جانے کشمیر کی کتنے بچوں کو یتیم کیا، کتنی بیٹیوں کو بیوہ کیا، کتنے بوڑھوں کے سامنے ان کے بیٹوں کو ذبح کرایا، کتنی شریف زادیوں کی عزت خراب کی، کتنے بچوں کا گلا کاٹا اس کا شمار ہی نہیں ہے۔ وزیرستان میں سیکڑوں دھماکے کروائے، دہشت گردوں کو پناہ گاہ اور اسلحہ و بارود مہیا کیا۔ میری نظر میں اسے قتل کرنے کو صرف یہ وجہ ہی کافی تھی کہ اس نے ایک باپ سے بیٹی چھینی ہوئی ہے۔ مگر اسے قتل کرنے کو تو اور بھی سیکڑوں وجوہات موجود ہیں۔ بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو وہ انڈیا کے قانون کا بھی مجرم ہے، کیوں کہ اس کے کافی کام انڈیا سرکار کی اجازت کے بغیر تکمیل پاتے ہیں، لیکن وہاں بھی قانون کی بالادستی کی صورت حال وطنِ عزیز سے مختلف نہیں کہ قانون بڑوں کے گھر کی لونڈی بن جاتا ہے۔"

میں ندامت سے بولا۔ "معذرت خواہ ہوں سر! میرا سوال ہنوز جواب طلب ہے۔"

"دھیرندر شکلا کو نہ صرف بھارتی سرکار کی جانب سے محافظ میسر ہیں بلکہ اس کے پاس زرخرید لڑاکوں کی بھی کثرت ہے۔ اس کی ہوس و لالچ پہلے سے کئی گنا بڑھ چکی ہے۔ دہشت گردوں کو اسلحہ سپلائی کرنے کا ٹھیکا اب تک اسی کے پاس ہے۔ یونہی بھارتی سپاہ کے لیے اسلحہ ساز کمپنیوں سے ہتھیاروں کی خریداری کے معاہدوں میں بھی وہ پیش پیش ہے۔ حاضر سروس جرنیلوں کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملالینا اس کے لیے بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ ایسے افراد مل کر ایک مافیا بنا لیتے ہیں جو محب وطن افسران کو آگے آنے سے روک کر اپنے ہم خیال و اپنے جیسے افراد کو سامنے لاتے ہیں۔ اسلحے کے معیار پر بے شک سمجھوتہ نہ کیا جائے لیکن دس کی چیز پچاس میں خریدنے سے بھی کروڑوں، اربوں کا منافع ہاتھ لگتا ہے۔ جس میں سے نصف کی متعلقہ عہدہ داران کو ہڈی ڈال کر بقیہ سے اپنے اکاؤنٹ بھر لیے جاتے ہیں۔ اور جس کے پاس دولت کی فراوانی ہو اس کے دشمن بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ اور جس کے دشمن زیادہ ہوں وہ اپنی حفاظت کے بندوبست میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا۔ ایسے آدمی کے خاتمے کو تم جیسا نشانہ باز ہی کام آسکتا ہے۔"

میں ہنسا۔ "ایسے آدمی کا خاتمہ تو پاک آرمی کا نقصان کرنا ہوا۔"

"شاید۔" اس نے تردید نہ کی۔ "لیکن میں بھارت سرکار کے فائدے کے بجائے اپنا الو سیدھا کررہا ہوں۔ یوں

بھی اس کی جگہ لینے کو کئی طلب گار موجود ہیں، بدی کے درخت کی جڑیں انسان کی رسائی سے دور ہیں۔ ہم صرف شاخ تراشی ہی کر سکتے ہیں، بدی کو فنا کرنا قادر مطلق کے بس میں ہے اور اس نے مہلت دی ہوئی ہے۔ کس میں طاقت کہ مہلت چھین سکے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔''جانا کب ہے؟''

وہ مسکرائے۔''پہلے رضامندی تو ظاہر کرو۔''

میں عقیدت سے بولا۔''اپنے ہیرو کے کام آنا میرے لیے باعث سعادت ہوگا۔''

''شکریہ بیٹا۔''شفقت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے انھوں نے مجھے لپٹالیا تھا۔''تمھارے ساتھ ایک اور جوان بھی جارہا ہے۔ چند دنوں میں تمھارے شناختی کاغذات تیار ہو جائیں گے۔ ہفتے کو تمھاری خصوصی تربیت شروع ہوگی جو اگلے تین دن جاری رہے گی تب تمھیں مزید تفصیلات سے آگاہ کروں گا۔''

''پھر اجازت دیں سر!''میں نے گھڑی کو دیکھا سوئیاں تین کے ہندسے کو چھو رہی تھیں۔

انھوں نے میری دل لگتی بات کہی۔''بہتر ہوگا دو تین دن گھر گزار لو، ہفتے کی شام تمھاری یونٹ میں بیٹھک ہوگی، تب تک پہنچ جانا۔''

میں شش و پنج میں پڑ گیا۔''وسیم صاحب سے اجازت لینا پڑے گی۔''

میری ہچکچاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔''ڈرائیونگ جانتے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

چابی بڑھاتے ہوئے وہ اطمینان سے بولے۔''گیراج میں سوزکی کار کھڑی ہے، لے جاؤ۔ وسیم کو میں سنبھال لوں گا۔ اب تم میرے حوالے ہو چکے ہو۔''

''شکریہ سر۔''مسرت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے ان سے الوداعی مصافحہ کیا اور باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر بعد چکلالہ کینٹ کی حدود سے نکل کر راولپنڈی کی کشادہ سڑکوں پر رواں دواں تھا۔ مجھے انصاری صاحب کی پری اور پاروتی بھول چکی تھیں، کچھ یاد تھا تو اپنی پلوشے اور اس کی ناراضی۔

صبح کی نماز تک میں گھر پہنچ گیا تھا۔ میری آمد پر رو ما کھل اٹھی تھی، مگر پلوشے کا موڈ پہلے ہی کی طرح تھا۔ اسے اکیلے میں گھیر کر میں نے انڈیا مشن کے بارے آگاہ کیا، یہ بھی کہا کہ زندگی موت کا کچھ پتا نہیں واپس آسکوں گا یا نہیں اس لیے ہو سکے تو مجھے معاف کر دے۔ مگر میرے سچ کو سفید جھوٹ خیال کرتے ہوئے اس نے اتنی اہمیت بھی نہیں دی تھی کہ میری جانب دیکھ ہی لیتی۔ منت سماجت سے اس کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی تھی۔ جب تھک کر باہر جانے لگا تب اس کی جذبات سے عاری آواز ابھری۔

''بہتر ہوتا اگر طلاق کے بارے کوئی فیصلہ کر کے آتے، کیوں کہ میں نہیں چاہتی میرے عدالت سے رجوع کرنے پر تمھارا مذاق بن جائے۔''

میں پھر کر مڑا۔''دماغ جگہ پر ہے۔ اور تم کسے کہا؟''

بے پروائی سے بولی۔''تمھیں۔''

میں آزردہ ہوا۔''پلوشے! سچ میں انڈیا جارہا ہوں، ہوسکتا چھے ماہ میں لوٹوں، ہوسکتا ہے سال لگ جائے، یہ بھی ممکن ہے لوٹ ہی نہ پاؤں۔''

وہ بے گانے پن سے بولی۔''اسے بتاؤ، جسے تمھاری پروا ہو۔''

''تمھیں نہیں ہے۔'' میں دوبارہ قریب ہوا۔ مگر میری وارفتگی بھری پیش قدمی کو اس نے سرد مہری سے ٹھکرا دیا۔

''مسٹر ذیشان! میں علیحدگی کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ بہتر ہوگا واپسی سے پہلے میرا مسئلہ حل کرتے جاؤ۔''

میرا ہاتھ گھوما۔ ''چٹاخ'' کی آواز سے کمرہ گونج اٹھا تھا۔ پھول سے رخسار پر انگلیاں ثبت ہوگئی تھیں۔ ''میرے پاس تو یہی ہے حل ہے۔'' درشتی سے کہتے ہوئے میں باہر نکل آیا۔

روما میرے جانے کا سن کر پریشان ہوگئی تھی۔ اسے میں نے اجمالاً انصاری صاحب کی کہانی بھی سنادی تھی۔

وہ مجھے چھیڑتے ہوئے بولی۔ ''تو صاف کہیں ناں جھوٹے اجنبی! مس پرما کی دید کا شوق آپ کو انڈیا لے جا رہا ہے۔''

میں وارفتگی سے بولا۔ ''کیا دنیا کی کوئی لڑکی میری روما سے خوب صورت اور پلوشے سے پیاری ہوسکتی ہے۔''

روما نے انکشاف کیا۔ ''آپ کی پلوشے دوبارہ پلو خان بننے کے چکروں میں ہے۔ کل مجھے کہہ رہی تھی اس کے بال کاٹ دوں۔''

میں ششدر رہ گیا تھا۔ ''پتا نہیں کیا مسئلہ ہے کمینی کو۔''

روما ہنسی۔ ''آپ نہیں جانتے۔''

میں نے ہدایت دی۔ ''بہ ہر حال تم اس کے بال نہ کاٹنا۔''

روما نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اگلے دن اس نے بھی پلوشہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر اس نے.....

''یہ میرا اور ذیشان کا ذاتی معاملہ ہے۔'' کہہ کر روما کو نادم کر دیا تھا۔ اس نے تو مجھے پیٹھ پیچھے بھی پیار بھرے تخاطب سے یاد کرنا چھوڑ دیا تھا۔

ہفتے کی دوپہر میں گھر والوں سے الوداع ہو کر واپس روانہ ہوا۔ نامعلوم واپسی نصیب میں لکھی بھی تھی یا انڈیا کی سرزمین میرا مدفن بننے والی تھی۔ یہ فقط میرا علیم و خبیر مالک ہی جانتا تھا۔

—— ● ——

اللہ ڈینو کا تعلق سندھ سے تھا۔ گہرا سانولا رنگ، میانہ قامت، چھریرا بدن، عام شکل وصورت کہ دیکھنے والوں کو کوئی کشش محسوس نہ ہو۔ بہ ظاہر یوں لگتا جیسے سیدھا سادھا دیہاڑی لگانے والا مزدور، مزارع یا پریشان حال بے روزگار جوان ہو۔ لہجہ بھی ٹنواروں کا سا اور پھر سندھیوں کی بول چال سے تو فوراً ان کی پہچان ہو جاتی ہے، مگر بہ باطن؛ بے ضرر و عام نظر آنے والا جوان چست و چالاک، چاق و چوبند اور ہر دم چوکنا و تیار ایسا کمانڈو تھا جس کی نظریں عقاب کی طرح شکار کو تاڑتی تھیں۔ دست بدست لڑائی میں طاق، اسلحے کا شناور، بارودی پھندوں اور آئی ای ڈیز لگانے میں ماہر، بھیس بدلنے میں مشاق، تجربے کار و منجھا ہوا کمانڈو تھا۔ اس میں مشکلیں جھیلنے اور مصائب کا سامنا کرنے کی قوت برداشت عام آدمیوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ سنیچر کی شام ہماری طویل بیٹھک ہوئی۔ اللہ ڈینو دیر سے پہنچا تھا اور تب تک انصاری صاحب اس کے بارے تفصیل سے بتا چکے تھے۔

اس کی آمد پر رسمی تعارف کے بعد کام کی بات شروع ہوئی۔ بہت سی خبریں زیر بحث لائی گئیں، لائحہ عمل طے ہوئے، ڈھیر ساری تجاویز پر غور ہوا، ممکنہ خطرات سے نبٹنے کے منصوبے بنائے گئے، ہمدردوں اور کام آنے والوں کی شناخت اور پتے ذہن نشین کیے گئے، ایسے افراد جن سے عارضی طور پر کام لیا جا سکتا تھا ان کے بارے ہدایات ملیں۔ اس کے علاوہ بھی انصاری صاحب نے اپنے تجربات کا نچوڑ اور انڈیا میں کام کرنے کے طریقوں سے واقفیت دلائی۔ ساری رات ہمارا سبق شروع رہا۔ صبح نماز پڑھ کر سونے کا وقع ملا تھا۔ اور یہ بے ضابطہ تربیت اگلے دو روز تسلسل سے جاری رہی۔ انصاری صاحب محبت، شفقت اور جاں فشانی سے ہمیں سکھاتے رہے۔ انھوں نے ضروری مشورے اور نصیحتیں بیسیوں بار دہرائیں۔ ہم اپنے ساتھ لکھا ہوا مواد نہیں لے جا سکتے تھے اس لیے متعلقہ لوگوں کے نام پتے اور فون نمبر ہمیں یاداشت میں محفوظ کرنا تھے۔ اس ضمن میں مجھے تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ انصاری صاحب کے ایک بار بتانے ہی پر میں نے ضروری معلومات ذہن نشین کر لی تھیں۔ اللہ ڈینو بھی تربیت یافتہ کمانڈو تھا تین دن کی مسلسل دہرائی کے بعد اسے بھی کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ اس دوران ہمارے شناختی کاغذات بن گئے تھے۔

اور پھر ایک دن ہم جانے کو تیار تھے۔ بدھ کو عمان کی پرواز تھی۔ ہم اپنے اصل پاسپورٹ پر عمان پہنچے تھے۔ وہاں دو دن گزار کر ہم نے انڈیا کا رخ کرنا تھا۔ اس دوران ہمارے جعلی پاسپورٹوں پر دو مختلف تواریخ درج کی گئیں۔ میرے پاسپورٹ پر ایک سال پہلے انڈیا سے عمان آمد کا اندراج ہوا، جبکہ اللہ ڈینو کے پاسپورٹ میں ڈیڑھ سال پہلے کی تاریخ لکھی گئی۔ ہفتے کو ہم ممبئی روانہ ہوئے۔ پاکستانی پاسپورٹ اور شناختی کارڈز وغیرہ ہم نے عمان ہی میں اپنے خاص آدمی کے پاس چھوڑ دیے تھے۔ اب ہم راجا ذیشان حیدر اور اللہ ڈینو کے بجائے سندیپ چوپڑا اور گوپال چند تھے۔ دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہماری سیٹیں بھی علیحدہ علیحدہ تھیں۔ جہاز نے مسقط ہوائی اڈے سے پرواز بھری۔ اور ممبئی روانہ ہوا۔ ممبئی کی حیثیت انڈیا کے لیے ایسی ہی ہے جیسے پاکستان کے لیے کراچی ہے۔ کراچی کی طرح ممبئی بھی ساحلی شہر

اور آبادی ورقبے کے لحاظ سے کراچی سے بڑا ہے۔ اگر اس کے نقشے کو غور سے دیکھیں تو یہ تین اطراف، سمندر میں گھرا ہے اور جو جگہ بچ جاتی ہے وہاں دریا نے گھیرا ہوا ہے یوں ممبئی ایک جزیرے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

دھیرندر شکلا کا پرانا ٹھکانہ آگرہ میں تھا۔ لیکن بھارت کے چند بڑے شہروں میں اس کی رہائش گاہیں موجود تھیں۔ مسلسل کام کی وجہ سے وہ شاذ و نادر ہی کسی جگہ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ گزار پاتا تھا۔ اس کا کاروبار نہایت منضبط بنیادوں پر جاری تھا۔ اس کی انتظامیہ میں قابل بھروسا اور اعلیٰ صلاحیتوں والے شامل تھے۔ اس کے محافظوں میں بڑی تعداد انڈین آرمی کے ریٹائرڈ کمانڈوز کی تھی۔ بعض تو نوکری کے اختتام سے پہلے ہی مستعفی ہو کر اس سے آن ملے تھے۔ کہ اس نے انڈین آرمی سے زیادہ مراعات اور تنخواہ کی پیش کش کی تھی۔ سچ کہیں تو وہ ایک مافیا کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ پرما انصاری کو اس نے کس شہر میں رکھا ہوا تھا اس بارے انصاری صاحب لاعلم تھے۔ شروع میں انھوں نے اپنی بیٹی کو آگرہ سے اغوا کرانے کی ناکام کوششیں کیں۔ جس کی وجہ سے دھیرندر شکلا نے نہ صرف پرما کی حفاظت بڑھا دی تھی بلکہ اسے آگرہ سے کسی نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا تھا۔ اس کی تعلیم جاری تھی، انصاری صاحب کے بہ قول وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی، یقیناً کسی اچھے میڈیکل کالج میں پڑھ رہی ہوگی۔ بدقسمتی سے انصاری صاحب کے پاس اس کی تصویر بھی موجود نہیں تھی کیوں کہ وہ افراتفری میں انڈیا سے فرار ہوئے تھے۔ حلیہ پوچھنے پر معلوم ہوا، محترمہ کے بال سنہری تھے۔ مگر وہ وقتاً فوقتاً ڈرائی کراتی رہتی تھی، اس لیے کبھی کالے ہو جاتے کبھی بھورے، کبھی نیلے تو کبھی سفید۔ اسکول دور میں کندھوں سے کافی نیچے تک پھیلے تھے اور اب جدید انداز میں ترشوانے پر صرف کندھوں کو چھوتے تھے۔ (صاف مطلب کہ بالوں کے ذریعے پہچان ناممکن تھی) آنکھیں شوخ، شرارتی جن میں ذہانت کی چمک تھی۔ زبان خاموش بھی ہوتی تو آنکھیں بولتی محسوس ہوتی تھیں۔ (ہر نوجوان شرارتی لڑکی کی آنکھیں ایسی ہی لگتی ہیں) کشادہ پیشانی، روشن و معصوم چہرہ (ہر محبت کرنے والے باپ کو بیٹی کا چہرہ ایسا ہی لگتا ہے) اس کے علاوہ بھی انھوں نے کئی خوبیاں اور نشانیاں بتلائیں مگر تمام اتنی عام تھیں کہ ہر پانچویں لڑکی پر پرما کا شبہ ہو سکتا تھا۔ میں نے جتانا مناسب نہ سمجھا۔ اب محترمہ کی پہچان بھی ہمارے لیے مسئلہ ہی تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آیا انصاری صاحب کے حوالے سے وہ ہمارے ساتھ آنے پر تیار ہو جاتی یا سچ مچ اسے اغواء کرنا پڑتا۔ انصاری صاحب کے بہ قول وہ ان پر جان دیتی تھی۔ لیکن انصاری صاحب کے جانے کے بعد دھیرندر شکلا نے کچے ذہن کی لڑکی کے دماغ میں کیا گند بھرا ہوگا اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔ اسے ٹھکانے لگانا بھی علیحدہ دردِ سر تھا۔ اگر اسے قتل کیے بغیر مسئلہ حل ہو جاتا تو زیادہ بہتر رہتا کہ ہمارے پاس انڈیا کے اندرونی معاملات کو سدھارنے کا ٹھیکا نہیں تھا۔ ہمارا مقصد تو فقط پرما کا حصول تھا۔ وہ انصاری صاحب کی اولاد تھی اور اس پر مکمل طور پر باپ کا حق تھا۔ لیکن انصاری صاحب دھیرندر شکلا کے قتل پر بہ ضد تھے۔ وہ مجسم بدی تھا اور اس کے بہت سارے گناہوں کے گواہ خود انصاری صاحب تھے۔ اس کے علاوہ انھیں یہ بھی خوف تھا کہ وہ پرما کو پاکستان سے بھی اغواء کرانے کی کوشش ضرور کرتا۔ انصاری صاحب بیٹی کو کب تک چھپا سکتے تھے۔ دھیرندر شکلا کے ہاتھ کافی لمبے تھے۔ وہ شرارت سے کبھی باز نہ آتا اور اس کا مستقل حل یہی تھا کہ دھیرندر شکلا باقی نہ رہتا۔

ہم ممبئی کے چھترپتی شیواجی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اترے۔ پاکستان ہو یا انڈیا ہر دو ممالک کی خفیہ ایجنسیوں کے افراد بین الاقوامی ہوائی اڈوں پر کثیر تعداد میں جمع رہتے ہیں۔ ان کا کام ملک دشمن عناصر کو تاڑنا، ان کا پیچھا کرنا اور ان کے گرد شکنجہ کسنا ہوتا ہے۔ کوئی بھی جاسوس صرف کاغذات کے بل بوتے پر نہیں پکڑا جاتا اور نہ بین الاقوامی ہوائی اڈوں پر اترنے والے مسافروں کی تعداد اتنی کم ہوتی ہے کہ ایجنسیاں ہر ایک کے کاغذات جانچ سکیں۔ ائرپورٹ کا عملہ کاغذات کی جانچ پڑتال باریک بینی سے کرتا ہے لیکن جعل ساز بھی کچی گولیاں نہیں کھیلتے کہ ان کے بنائے کاغذات آسان سے پکڑے

جاسکیں۔

ایجنسیوں کے پاس جاسوسوں کو پہچاننے کے مختلف گر اور طریقے ہوتے ہیں۔اس میں قیافہ شناسی، جاسوس کا اکیلا ہونا، یعنی بیوی بچوں کے بغیر سفر کرنا، ان کے پاس مختصر سامان کا ہونا، انھیں ہوائی اڈے پر وصول کرنے کو خاندان کے کسی فرد کا نہ آنا، آدمی کا خواہ مخواہ دائیں بائیں چوکنا انداز میں گھورنا۔خوف زدہ یا گھبرایا ہوا نظر آنا، مستقل ٹھکانہ نہ ہونے کے باعث اکثریت کا ہوٹلوں و مہمان خانوں میں رہنا اور بھی بہت سی وجوہ سے جاسوسوں کی پہچان ہوتی ہے۔روزانہ سیکڑوں ہزاروں افراد کی بیرون ملک سے آمد ہوتی ہے۔ایجنسیوں نے ہر ملک سے آنے والے افراد کو مختلف درجوں میں بانٹا ہوتا ہے۔جن میں کچھ ممالک سے آنے والے افراد کو زیادہ باریک بینی اور احتیاط سے جانچا جاتا ہے۔ایجنسیوں والے مشکوک افراد کا تعاقب اور دور دور سے نگرانی کر کے اپنا شبہ رفع کرتے ہیں۔

کاغذات کے مطابق ہم سال ڈیڑھ کے بعد عمان سے لوٹ رہے تھے۔اور کسی ایسے فرد کا مختصر سامان کے ساتھ سفر کرنا عجیب لگتا ہے۔تبھی میرے پاس دو تین بڑے بڑے سوٹ کیس تھے جن میں مردوں، عورتوں اور بچوں کے کپڑوں کے علاوہ مختلف قسم کے کھلونے وغیرہ بھرے تھے۔کاغذات کی جانچ پڑتال کرا کے مجھے سامان کے انتظار میں بیٹھنا گوارا نہیں تھا۔وطن عزیز کی طرح وہاں بھی کام نکلوانے کو تصویری کاغذ استعمال ہوتے ہیں۔مہاتما گاندھی کی تصویر کی پوجا رام، کرشن اور بھگوان سے زیادہ کی جاتی ہے۔پرانے مسافر ایسے چٹکلوں سے واقف ہوتے ہیں کہ کیسے تھوڑی سی نقدی خرچ کر کے انتظار سے بچا جائے۔گو بین الاقوامی مسافرت کا مجھے زیادہ تجربہ نہیں تھا، لیکن انصاری صاحب کے پرمغز وعظ یاداشت میں زندہ تھے۔چند سو کی قربانی دے کر میں اپنے سامان کے ساتھ ائرپورٹ سے باہر آ گیا۔پارکنگ میں ٹیکسی ڈرائیور سے بھاڑا (کرایہ) طے کرتے ہوئے کافی مغزماری کی کہ یہ بھی انڈین عوام کی فطرت کی عکاس ہے۔خود کو مشکوک ہونے سے بچانے کو یہ ڈراما بھی ضروری تھا۔ٹیکسی کے پارکنگ سے نکلنے سے پہلے اللہ ڈینو کندھے سے بیگ لٹکائے، ایک بڑا بیگ کھینچتا ہوا نمودار ہوا۔اس نے ہاتھ اٹھایا۔ٹیکسی ڈرائیور یقیناً نہ رکتا، مگر میرے کہنے پر بریک دبا دی۔

''بھائی، جو چندرا گاؤں جانا ہے۔''

میں نے سمندر کنارے موجود وسائی ٹاؤن کا بتایا تھا، جو چندرا اس سے پہلے آتا تھا تبھی میں سرعت سے بولا۔

''اسے بھی ساتھ لے چلتے ہیں راستے میں اتار دیں گے۔''

''پانچ سو زیادہ لگیں گے۔'' ٹیکسی ڈرائیور سودے بازی پر اتر آیا تھا۔ذرا سے مول تول پر ساڑھے تین سو زائد دینے پر معاملہ ختم ہوا۔وسائی ٹاؤن ائیرپورٹ سے پچاس ساٹھ کلومیٹر دور تھا۔

تھوڑی دیر بعد ٹیکسی وسائی ٹاؤن کی طرف روانہ تھی۔اللہ ڈینو عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔رستے میں ہم دونوں انجان مسافروں کی طرح شناسائی بڑھانے لگے۔معاشی مسائل، بہنوں کا جہیز، پردیس کی نوکری میں مشکلات، بڑھتی ہوئی مہنگائی، بچوں کے تعلیمی اخراجات وغیرہ مماثل مسئلے تھے، جن پر ہم محو گفتگو رہے۔ڈرائیور بے چارہ بھی انھی حالات کا ڈسا تھا زور و شور سے شامل گفتگو ہو گیا۔

گھنٹا ڈیڑھ بعد ہم وسائی پل سے گزر کر دریائے الہاس عبور کر چکے تھے۔آگے رش کم تھا ٹیکسی کی رفتار میں اضافہ ہوا، جو چندرا جانے کو ہمیں ہائی وے چھوڑ کر لنک روڈ پر مڑنا پڑا، جو جو چندرا گاؤں سے ہو کر وسائی پل جاتا تھا۔وہاں جا تو پہلی بار رہے تھے لیکن انصاری صاحب نے ہمیں نقشوں پر اتنی وضاحت اور تفصیل سے سڑکوں وغیرہ کے بارے آگاہی دی تھی کہ لگتا تھا کئی بار سفر کر چکے ہوں۔

لنک روڈ پر موڑ کر ہم ذرا سا آگے بڑھے تھے کہ دو چیتیں ہمیں ''اوورٹیک'' کر کے آگے بڑھیں اور پچاس ساٹھ قدم

دور جا کر رستہ روک دیا۔ جیپ سواروں کا حلیہ اور انداز ایسا نہیں تھا کہ ڈرائیور کا پسینہ نہ نکلتا۔ اس نے فوراً ٹیکسی روکی اور ہاتھ بلند کیے لرزتا ہوا باہر نکلا۔ ہمارے پیچھے دو تین کاریں آ رہی تھیں، انھوں نے دور ہی سے کاریں واپس موڑیں اور دم دبائے بھاگ پڑے۔ ممبئی کو مجرموں کی جنت کہتے ہیں، وہاں سرکار راج کے بجائے غنڈہ راج چلتا ہے۔ پولیس خود اتنی عاجز ہے کہ دم مارنے کا حوصلہ نہیں کر سکتی۔ جواء خانوں اور شراب خانوں کی تو خیر حکومتی سطح پر اجازت ہے لیکن ممنوع نشے ،اسلحے کا کاروبار، قتل و غارت و بھتہ خوری کو جرم ہونے کے باوجود کوئی روک نہیں پاتا۔ ممبئی کی غنڈہ گردی دیکھ کر کراچی امن و امان اور شرافت کا گہوارا نظر آنے لگتا ہے۔ پورا شہر غنڈوں کے ہاتھ گروی ہے۔ انھیں وزیروں اور اہم شخصیات کی پشت پناہی حاصل ہے، بلکہ اکثریت کو سامنے لانے والے سیاسی ٹولے ہی ہیں۔

ہمارا ابھی ٹیکسی میں بیٹھے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ دونوں جیپوں میں تین تین افراد سوار تھے۔ ان کا سرغنہ سانولے رنگ کا دراز قامت جوان تھا۔ لمبے گھنے بال جو اس کے شانوں پر پھیلے تھے۔ کالے پاجامے پر اس نے نصف بازوؤں کی بنیان پہنی تھی۔ بازو کی تڑپتی مچھلیاں اور فراخ چھاتی کو دیکھ کر اچھے اچھوں کا پتا پانی ہو سکتا تھا۔ ہمارے چہروں پر بھی خوف ابھر آیا تھا۔

اس نے پر رعب آواز میں پوچھا ''سکندر کون ہے؟''

میں ہکلایا۔ ''مم.....مم.....مہاراج میرا نام سندیپ ہے، آپ شناختی کارڈ دیکھ سکتے ہیں۔''

اللہ ڈینو نے بھی خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ''میں گوپال ہوں۔''

وہ اپنے آدمیوں کی طرف مڑا، ایک نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ ''دادا! ٹیکسی کا نمبر یہی بتایا گیا ہے، لگتا ہے جھوٹ بک رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ ڈرائیور کو مخاطب ہوا.....

''انھیں چترپتی انٹرنیشنل ائیر پورٹ سے اٹھایا ہے نا۔''

''جی مہاراج۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

دادا اطمینان سے بولا۔ ''دونوں کو لے چلو، وہ خود اپنا مجرم پہچان لیں گے۔''

''چلو اوئے۔'' ایک نے تڑی دی۔

اللہ ڈینو ہکلایا۔ ''مم.....مہاراج شما کر دو.....''

اس نے پستول لہراتے ہوئے دھمکایا ''چلتے ہو یا ادھر ہی ٹھوک دوں۔''

ہم لرزتے کانپتے جیپوں میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی سے ہم نے ایک ایک چھوٹے بیگ کے علاوہ کچھ نہیں لیا تھا۔

ایک غنڈہ ٹیکسی ڈرائیور کو بولا۔ ''اگر یہ کل تک نہ لوٹیں تو کبھی نہیں لوٹیں گے۔ ان کا سامان استعمال کر لینا۔''

ٹیکسی ڈرائیور ہونقوں کی طرح کھڑا ہمیں گھور رہا تھا۔ ہم پریشانی و خوف ظاہر کرتے غنڈوں کے درمیان پھنسے بیٹھے تھے۔

جیپیں واپس مڑیں اور تیز رفتاری سے چل پڑیں۔ گھنٹے بھر بعد ہم ان کے اڈے پر تھے۔ انھوں نے ایک ہوٹل کے عقبی جانب اڈہ بنایا ہوا تھا۔ وہ ایک وسیع عمارت تھی اس کی چار دیواری ہوٹل سے متصل تھی یوں کہ اسے ایک ہی عمارت سمجھا جا سکتا تھا۔ سامنے قانونی کاروبار اور عقب میں غیر قانونی سرگرمیوں کا مرکز۔

اڈے پر پہنچتے ہی دادا نرم لہجے میں بولا۔ ''پاریش ملہوترا (انصاری صاحب) کے ساتھ اتنا ہی معاہدہ ہوا تھا۔''

اللہ ڈینو نے منہ بنایا۔ ''تو کیا انھوں نے منع کیا تھا کہ ہم سے کھانے کا نہ پوچھنا۔''

دادا کا قہقہہ بلند ہوا۔ ''یار جب تک دل چاہے سلطان دادا کا اڈہ حاضر ہے۔ میں فقط معاہدے کا ذکر کر رہا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''وصولی ہوگئی ہے یا.....؟''
وہ بے نیازی سے بولا۔ ''یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔''
اللہ ڈینو نے خیال ظاہر کیا۔ ''شاید ایک دو دن ہمیں رکنا پڑے۔''
سلطان دادا نے بے فکری سے کہا۔ ''اس بارے وضاحت کر چکا ہوں۔''
''تو کوئی آرام کی جگہ دکھا دیں۔'' اللہ ڈینو نے نشست چھوڑ دی۔
''وکرم انھیں کمرہ دکھاؤ۔'' اس نے ایک آدمی رہنمائی کو ساتھ بھیج دیا۔
سلطان دادا کا اڈہ کافی وسیع تھا۔ بڑا سا صحن اور درجنوں کمرے۔ وکرم ہمیں درمیانے حجم کے کمرے میں لے آیا جہاں لوہے کی تین چار پائیاں پڑی تھیں۔
''میں بھوجن کا بندوبست کرتا ہوں۔'' وہ باہر نکل گیا۔
ہم نے چار پائیاں سنبھال لیں۔
''یہاں تک تو کام بہترین ہوگیا ہے۔'' تکیے پر سر ٹیکتے ہوئے اللہ ڈینو نے اطمینان ظاہر کیا۔
میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے پرما کی تلاش یہیں سے شروع کر دینا چاہیے۔''
اللہ ڈینو نے تائید کی۔ ''شکلا کی ممبئی میں رہائش ضرور ہوگی اور وہ کافی مشہور ہے یقیناً ڈھونڈنے میں اتنی مشکل نہ ہوگی۔''
''لیکن احتیاط کرنا پڑے گی، ایسے افراد کے مخبر بھی کثیر تعداد میں ہوتے ہیں۔ اسے ذرا بھی بھنک پڑ گئی تو مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔''
اللہ ڈینو نے منہ بنایا۔ ''پہلے کون سا کم ہیں۔''
میں پھیکے لہجے میں بولا۔ ''یقین مانو پہلی بار اتنے فضول کام سے واسطہ پڑا ہے۔ ساری زندگی لبلبی دبائی ہے، انصاری صاحب نے الٹے کام پر لگا دیا ہے۔ پہلے پرما بی بی کو ڈھونڈو، پھر اغواء کرو اور پھر پاکستان پہنچانا سمجھ میں نہیں آتا کیسے ہوگا، جبکہ یہ بھی پتا نہیں وہ باپ کے پاس جانا چاہتی ہے یا نہیں۔''
اللہ ڈینو نے کہا۔ ''تمھیں یہاں بھی لبلبی دبانے بھیجا گیا ہے، باقی ذمہ داری تو میرے سر ہے۔''
میں نے اطمینان سے کہا۔ ''پھر میں سلطان دادا کے پاس قیام پذیر ہوں، تم ذمہ داری نبھاؤ میری باری پر بلا لینا۔''
اللہ ڈینو نے سر کھجاتے ہوئے قہقہہ بلند کیا۔ ''مذاق کیا تھا یار، تم نے سنجیدہ ہی لے لیا۔''
وکرم کھانے کے برتنوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ اور ہم بحث چھوڑ کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔
''کیا پینا پسند کریں گے، وسکی، اسکاچ، شیری، دیسی سب موجود ہے۔'' برتن میز پر رکھ کر اس نے ہماری پسند پوچھی۔
اللہ ڈینو اطمینان سے بولا۔ ''وائیٹ بیئر.....''
اس نے سوالیہ لہجے میں دہرایا۔ ''وائیٹ بیئر.....؟''
اللہ ڈینو نے وضاحت کی۔ ''مطلب لسی.....اگر نہیں ہے تو چائے یا کافی بھی چل جائے گی۔ باقی جو مشروب آپ نے گنوائے ہیں انھیں پینے کا حوصلہ نہیں ہے بھائی۔''
وکرم مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔
اللہ ڈینو نے خیال ظاہر کیا۔ ''دھیرندر شکلا کی ممبئی والی رہائش گاہ کا سلطان دادا کو یقیناً معلوم ہوگا۔''
میں نے کہا۔ ''مگر پوچھ نہیں سکتے، انصاری صاحب نے صاف کہا تھا کہ سلطان دادا ہمیں اغواء کر کے انٹیلی جنس

تعاقب کے ممکنہ اندیشے سے نجات دلانے کا ذمہ دار ہے اور بس۔ اگر اس سے ہدف کے بارے کوئی معلومات لینا مناسب ہوتا تو وہ وضاحت کر دیتے۔"

وہ متفق ہوا۔ "دو تین دن تو یہاں گزارنا پڑیں گے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "احتیاط ہی میں بھلائی ہے۔"

کھانے کے اختتام تک چائے آ گئی تھی۔ پیالیاں ہمیں پکڑا کر وکرم برتن سمیٹنے لگا۔ ہم چائے پی ہی رہے تھے کہ فائر کی آواز آئی اور پھر شور سنائی دینے لگا۔ وکرم بھاگ کر باہر نکلا، ہم بھی پیچھے ہو لیے تھے۔

پانچ مسلح افراد اندرونی دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ آگے آگے چھریرے بدن اور لمبی قامت کا جوان تھا۔ جو باآواز بلند سلطان دادا کو للکار رہا تھا۔

"سلطان دادا! تم نے راجپوت کی طاقت کا اندازہ لگانے میں غلطی کی ہے۔ اگر تمھارے خیال میں راجپوت کے گروہ نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں تو لو آ گئے ہیں۔ ہماری خالی کلائیاں دیکھ کر یقین آئے نہ آئے گولی کی دلیل پر شبہ دور ہو جائے گا۔"

سلطان دادا خالی ہاتھ تھا، اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنے گرگوں کو ہتھیار نیچے کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے تحمل سے کہا۔ "تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے راجپوت! سلطان نہ معاہدے کی خلاف ورزی کرتا ہے اور نہ کسی دوسرے دادا کے علاقے میں واردات کا شوقین ہے۔"

"مجھے ملنے والی اطلاع جھوٹی نہیں ہو سکتی۔" راجپوت اس کی صفائی پر مطمئن نہیں ہوا تھا۔

سلطان ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں اپنے آدمی واپس لینے گیا تھا۔ دونوں تمھارے سامنے کھڑے ہیں۔ اطمینان سے تسلی کر لو۔"

راجپوت کے چہرے پر الجھن ابھری۔ "میں سمجھا نہیں؟"

سلطان نے وضاحت کی۔ "سندیپ اور گوپال میرے پرانے واقف کار کے جاننے والے ہیں۔ اس نے درخواست کی کہ انھیں چند دن اپنے پاس رکھوں۔ ہوائی اڈے پہنچا تو یہ وہاں سے جا چکے تھے۔ اپنے دوست سے معلومات لیں اور ان کے پیچھے پہنچ گیا۔ باقی اغواء کا ڈراما کرنا انھیں تنگ کرنے کو کیا۔ ورنہ تمھاری حدود میں کوئی واردات کرنا ضروری ہوتا تو پہلے اجازت لیتا۔"

راجپوت نے اپنا پستول جیب میں ڈالا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی خفت ابھری۔ "یقیناً تم میری جلد بازی کو شما کر دو گے۔"

سلطان دادا مسکرایا۔ "اگر میرے ہمراہ بیٹھ کر ایک پیگ وسکی پی لی تو اس بارے سوچا جا سکتا ہے۔"

راجپوت لبوں پر پھیکی مسکراہٹ سجائے اس کے ساتھ ہو لیا۔ لڑائی کا ماحول ایک دم دعوتِ شرب و طعام میں تبدیل ہو گیا تھا۔ سلطان دادا کے گرگے، راجپوت دادا کے ساتھیوں کو سنبھالنے لگے۔ ہم اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

سارا ممبئی مختلف جرائم پیشہ افراد نے بانٹا ہوا ہے۔ ہر بڑے غنڈے کا اپنا علاقہ ہے جہاں دوسرا غنڈہ کوئی واردات نہیں کر سکتا۔ اس میں جیب تراشی سے لے کر بینک ڈکیتی تک کے جرائم شامل ہیں۔ بلکہ غنڈہ گردی تو درکنار ممبئی اور کراچی جیسے بڑے شہروں میں تو بھیک مانگنے والی مافیا تک نے علاقے تقسیم کیے ہوئے ہیں۔ راجپوت دادا بھی اسی سلسلے میں سلطان دادا کے پاس حساب کتاب کرنے آیا تھا کہ اس کے تئیں سلطان دادا نے ہمیں اس کی حدود میں اغواء کر کے حد بندی کی خلاف ورزی کی تھی۔ اور سلطان دادا نے حکمت سے معاملہ سنبھال لیا تھا۔

''ان غنڈوں کا جاسوسی نظام تو حکومت سے کئی گنا تیز ہے۔'' چارپائی سنبھالتے ہی اللہ ڈینو نے حیرانی ظاہر کی تھی۔
میں ہنسا۔'' پیٹ کا معاملہ ہے بھائی۔ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں، دو ملا مرغی حرام کر دیتے ہیں۔ دو سالار فوج مروا تو سکتے ہیں لڑا نہیں سکتے، پھر ایک علاقے میں دو غنڈوں کا راج کیسے ہو سکتا ہے۔''
اللہ ڈینو نے دکھ ظاہر کیا۔'' کراچی میں تھوڑا عرصہ رہنے کا اتفاق ہوا ہے وہاں بھی یہی حالت ہے۔''
میں نے کہا۔'' اس کی بڑی وجہ ہماری گندی سیاست ہے۔ بے چاری پولیس تو وزیروں کے ہاتھ یرغمال بنی ہے، جس ڈاکو غنڈے پر ہاتھ ڈالتی ہے وہ کسی نہ کسی ایم این اے کا اپنا بندہ یا منظور نظر نکلتا ہے۔ آرمی پہلے ہی اتنے محاذوں پر منقسم ہے کہ کوئی نیا محاذ نہیں کھول سکتی۔ تو تبدیلی کیسے آئے گی۔ یقین کرو پولیس کو خود مختار کرنا اس مسئلے کا بہترین حل ہے مگر صاحب اقتدار طبقے کو یہ حل منظور نہیں۔''
اللہ ڈینو نے موضوع تبدیل کیا۔'' ویسے سلطان دادا نے کچھ زیادہ تحمل اور برداشت کا مظاہرہ نہیں کیا؟''
''غلطی کا اعتراف کرنا اس کی مجبوری تھی۔ راجپوت دادا کے علاقے میں دخل اندازی اس نے کی تھی۔ اور راجپوت کا یوں اس کے اڈے پر چڑھ دوڑنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ افرادی طاقت میں سلطان دادا سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہے۔''
''یقیناً شکلا جی کے زیر زمین افراد سے قریبی تعلقات ہوں گے۔'' اللہ ڈینو نے نیا موضوع چھیڑ دیا۔
میں نے اثبات میں سر ہلایا۔'' تبھی اس کے متعلق ان لوگوں سے کسی بھی قسم کی معلومات لینے سے گریزاں ہوں۔''
اللہ ڈینو نے خیال ظاہر کیا۔'' ہم نوکری حاصل کرنے کے بہانے زیر زمین کام کرنے والے کسی اور گروہ سے بھی یہ معلومات لے سکتے ہیں۔''
اس کا مشورہ پسند آیا تھا، میں نے اتفاق میں سر ہلا دیا۔ اور ہم اسی بارے مشورہ کرنے لگے۔ مگر وکرم نے ہمیں زیادہ دیر گپ شپ نہیں کرنے دی تھی۔ دروازہ بجا کر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر اندر آیا۔
''اپنا سامان اٹھا کر میرے ساتھ چلیں۔'' اس کے لہجے میں ہلکی سی گھبراہٹ تھی۔ اور انداز ایسا نہیں تھا کہ استفسار کے چکروں میں وقت کھوٹا کرتے۔ اپنے مختصر بیگ سنبھال کر ہم اس کی معیت میں کمرے سے نکلے۔ عمارت کے داخلی دروازے کے بجائے وہ ایک اور کمرے میں گھس گیا تھا۔ وہ خواب گاہ تھی۔ ایک کونے میں سنگل بیڈ رکھا تھا، ساتھ فوم کی تین کرسیاں پڑی تھیں اور عقبی دیوار کے ساتھ لکڑی کی منقش پٹ والی کپڑوں کی ایک چوڑی الماری رکھی تھی۔
وکرم نے الماری کے پٹ کھول کر ہینگر میں لٹکے کپڑوں کو بائیں جانب اکٹھا کیا اور کوئی مخصوص بٹن دبایا، الماری پیچھے کی جانب کھل گئی تھی۔ ایک تنگ سا دروازہ نظر آیا جس کے عقب میں سیڑھیاں تھیں۔ وکرم پہلی سیڑھی پر رک گیا۔ ہمیں نیچے اترنے کا اشارہ کر کے وہ خود دروازہ بند کرنے لگا۔
دس پندرہ سیڑھیاں اتر کر چھوٹی سی گیلری تھی۔ اس کے بعد پھر سیڑھیاں تھیں۔ وکرم ہم سے آگے بڑھ گیا۔ سیڑھیوں کا اختتام لکڑی کے دروازے پر ہوا۔ دروازہ کھول کر وکرم اندر گھسا، پہلے کمرے ہی کی طرح وہاں بھی کپڑوں کی ایک الماری رکھی ہوئی تھی۔ الماری کے رستے ہم دوسری جانب خواب گاہ میں پہنچ گئے۔
وکرم نے ایک چابی میری طرف بڑھائی۔'' دائیں جانب، تیسرے، چوتھے نمبر پر کمرہ نمبر ایک سو انیس ہے۔ وہاں ٹھہر کر اگلی ہدایت کا انتظار کرو۔''
اللہ ڈینو نے کہا۔'' ٹھیک ہے، مگر جانے سے پہلے ہماری الجھن دور کر دو۔''
وکرم نے وضاحت کی۔'' راجپوت دادا کو ہماری کارروائی کی اطلاع کرن چاولہ سے ملی۔ اور زیر زمین حلقوں میں کرن چاولہ کی شہرت را کے مخصوص کارندے کی حیثیت سے ہے۔ یقیناً اپنا شک دور کرنے کو اس نے راجپوت دادا کی

سلطان دادا تک رہنمائی کی ہے۔ اور اس صورت میں سیدھے راستے سے جانا آپ کو پھنسا سکتا تھا۔ بہ ہر حال مطمئن نہ ہونا کہ خطرہ اب تک ٹلا نہیں۔ اور سلطان دادا کی اجازت کے بغیر کہیں جانے کی کوشش نہ کرنا۔ اور نہ خود کو قیدی سمجھنا۔ سب کچھ آپ کے فائدے کو کیا جا رہا ہے۔''

ہم اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر نکلے اور خود کو گیلری میں پایا جس کے دونوں جانب کمرے بنے تھے۔ دروازوں پر کمرہ نمبرز کی تختیاں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ہوٹل میں تھے۔ ان کے اڈے کے عقبی جانب جو ہوٹل تھا یقیناً خفیہ رستے کے ذریعے ہم وہاں پہنچ گئے تھے۔

دائیں جانب چوتھا دروازہ کمرہ نمبر ایک سو انیس کا تھا۔ قفل کھول کر ہم اندر گھس گئے۔ وہ درمیانے حجم کا کمرہ تھا۔ کونے میں ڈبل بیڈ اور اس کے ساتھ شیشے کی ایک میز اور سامنے صوفہ سیٹ رکھا ہوا تھا۔ بائیں ہاتھ بیت الخلاء و غسل خانے کا دروازہ تھا۔ دائیں دیوار میں ایک بڑی کھڑکی تھی جس پر دبیز پردہ لٹک رہا تھا۔

صوفے پر نشست سنبھالتے ہوئے اللہ ڈینو بولا۔ ''یقیناً ہمارا ڈراما ناکام ہو گیا ہے۔''

''ضروری تو نہیں کہ انسان جو سوچے وہی ہو۔'' میں بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔

اس نے منہ بنایا۔ ''ناکامی برداشت کرنا اتنا بھی آسان نہیں ہوتا۔''

میں نے شکر گزاری کا اظہار کیا۔ ''خوش قسمت ہیں کہ ناکامی کی اطلاع ہمیں دشمن کی زبانی سننے کو نہیں ملی۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا اپنی آنکھ کسی عقوبت خانے میں کھلتی۔''

اللہ ڈینو نے فکر مندی ظاہر کی۔ ''کیا تمھیں لگتا ہے سلطان دادا ہمارے لیے راستے نکرلے پائے گا۔''

میں بہ ظاہر متفق ہوا۔ ''اعتبار کرنے کے علاوہ کوئی صورت ہے تو بتاؤ۔''

''اگر معاملہ بیچ میں رکا ہے تو وہ اتنی آسانی سے سلطان دادا کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ اور یہاں سے نکلنے میں جتنی سستی دکھائیں گے ہمارے گرد گھیرا تنگ ہوتا جائے گا۔''

میں معترض ہوا۔ ''مگر وکرم ہمیں کہیں جانے سے منع کر چکا ہے۔''

ڈینو معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''اور ہم اتنے بھولے ہیں ناں کہ اس کا کہنا مان لیں گے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا تمھیں سلطان دادا پر شک ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، مگر اس کا خلوص بھی شاید ہمارے کام نہ آ سکے۔ وہ سلطان دادا کی کسی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اسے مجبور بھی کر سکتے ہیں۔''

''مجھے نہیں لگتا انھوں نے ہوٹل کو نظر انداز کر دیا ہوگا۔ یقیناً ہوٹل سے سلطان دادا کے تعلق کو وہ اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ کرن چاولہ اب تک راجپوت دادا سے سلطان دادا کی واردات کی وضاحت سن چکا ہوگا اور اس کے بعد دو جمع دو چار کی طرح منطقی نتیجہ اخذ کرنا اس کے لیے مشکل نہ ہوگا۔''

اس نے زور دیا۔ ''یہی تو کہہ رہا ہوں، گھیرا مکمل ہونے سے پہلے بھاگنا مفید رہے گا۔ دوسری صورت میں پھنسنا یقینی ہو جائے گا۔''

''تو چلیں۔'' متفق ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

اللہ ڈینو نے منصوبہ پیش کیا۔ ''الگ، الگ ایک دوسرے سے فاصلہ رکھ کر چلیں گے۔ بچھڑ گئے اور موبائل فون پر بھی بات نہ ہو پائی تو میتا بس اسٹیشن پر کل اور پرسوں دن کے دس بجے سے بارہ بجے تک ایک دوسرے کا انتظار کریں گے۔'' (انڈین کنکشن کے موبائل فون ہمیں مسقط ہی میں اپنے خاص ایجنٹوں سے وصول ہو گئے تھے)

میں نے امید ظاہر کی۔ ''شاید وہ ہماری صورت سے واقف نہیں ہوں گے۔''

ڈینو بولا۔ ''جب بات مفروضوں کی ہے تو ہوائی اڈے سے پیچھا کرنے والے ایجنٹوں کو ہماری شناخت ہو سکتی۔ اور یقیناً ہوٹل کے دروازے اور سلطان دادا کے اڈے کے باہر وہ افراد موجود ہوں گے۔''

میں نے مشورہ دیا۔ ''پھر لباس تبدیل کر کے بیگ یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔''

ڈینو اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بیگ اٹھا کر غسل خانے میں گھس گیا۔ میں نے وہیں کپڑے تبدیل کر لیے۔ نیلی جینز پر پھول دار قمیص پہن کر ضروری کاغذات پتلون کی جیب میں منتقل کیے اور جانے کو تیار ہو گیا۔ ڈینو غسل خانے سے نکلا تو اس کا حلیہ بھی مجھ سے ملتا جلتا تھا۔

''دس منٹ بعد نکلنا۔'' ہاتھ لہرا کر وہ نکل گیا۔

میں اس کی خیریت کی دعا کرتا ہوا مضطرب انداز میں ٹہلنے لگا۔ اللہ ڈینو سے جذباتی لگاؤ نہ ہونے کے باوجود وہاں وہ میرا اکیلا دوست، مددگار بلکہ سب کچھ تھا۔ ہمارا مقصد، ہدف اور منزل ایک تھی۔ اس وجہ سے ہمارے دکھ درد اور غم الم بھی سانجھی ہو گئے تھے۔ انجان ہو کر بھی اتنا اپنا پن پاکستان آرمی کے ہر جوان، عہدہ دار اور آفیسر میں پایا جاتا ہے۔ ہر شہید ہونے کی لاش ہمیں اپنی لاش نظر آتی ہے۔ ہر گھائل کے زخم ہمیں اپنے بدن پر دکھائی دیتے ہیں اور ہر جنتلائے درد کی اذیت ہمیں بھی محسوس ہوتی ہے۔

ڈینو کے جانے کے بعد میں نے چند منٹ انتظار کیا اور پھر باہر نکل آیا۔ اندازے سے چلتا ہوا میں ہوٹل کے ہال میں پہنچا۔ اس وقت رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت گزر گیا تھا اور رات کے کھانے کا وقت ابھی دور تھا۔ ہم سے ذرا سی غلطی ہو گئی تھی، گھنٹے ڈیڑھ بعد نکلتے تو رش زیادہ ہو جاتا، ایسی صورت میں ہم زیادہ محفوظ رہتے۔ مگر اب قدم بڑھا دیئے تھے اور واپس لوٹنا مناسب نہیں تھا۔ یہ احتمال بھی ذہن میں جاگا کہ زیادہ دیر کرنے کی صورت میں کوئی اور افتاد بھی سر پر پڑ سکتی تھی۔

استقبالیہ پر دو تین بندے کھڑے، استقبالیئن سے کچھ استفسار کر رہے تھے۔ میں دھیمے قدموں سے داخلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اسی وقت ایک جوڑا بھی دروازے کا رخ کرتا نظر آیا۔ لڑکی نے چست جینز اور اس کے اوپر نصف بازوؤں کی بنیان پہنی تھی۔ کھلتی ہوئی سانولی رنگت، مسکراتا چہرہ اور دلفریب بدن، دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ لڑکی، لڑکے کی دوستی تو اب وطنِ عزیز میں بھی معیوب نہیں سمجھی جاتی اور نیک بیبیاں دھڑلے سے اپنے مرد دوستوں کو متعارف کراتی پھرتی ہیں۔ انڈیا تو اس معاملے میں ہم سے کئی قدم آگے ہے۔ بلکہ ہمارا رہبر و رہنما اور استاد ہے کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ انھی کی فلمیں دیکھ دیکھ کر پاکستانی قوم میں بھی یہ شعور جاگا کہ نکاح اور شادی کو ثانوی بلکہ قید و بند کا درجہ دے دیا گیا ہے۔

میں نے قدموں کی رفتار غیر محسوس انداز میں سست کی، یوں کہ وہ میرے ساتھ سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ لڑکی مرد کے بائیں جانب چل رہی تھی۔ میں قدم دو کا فاصلہ رکھ کر اس کے دائیں چلنے لگا۔ اس لڑکی کی موجودگی میں مشکل تھا کہ کوئی میرا چہرہ دیکھنا گوارا کرتا۔

داخلی دروازے سے نکل کر میں نے دائیں بائیں نگاہیں گھمائیں، البتہ چہرے کو فطری انداز میں سامنے ہی رکھا۔ ایک انسان کی آنکھیں گردن گھمائے بغیر ایک سو اسی ڈگری کا نظارہ کر سکتی ہیں۔ پارکنگ میں اکا دکا افراد گاڑی کھڑی کر کے ہوٹل کے دروازے کا رخ کرتے نظر آئے، چند ایک گاڑیوں میں بیٹھ رہے تھے۔ دو افراد موٹر سائیکل کی سیٹ پر بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے لیکن ان کی نگاہیں غیر محسوس انداز میں ہر آنے جانے والے پر گڑی تھیں اور وہی مجھے بھی مشکوک

لگے۔ایک کلین شیو، جبکہ دوسرے نے کافی بڑی مونچھیں چھوڑی ہوئی تھیں۔داڑھی دوسرے کی بھی صفاچٹ تھی۔

میں قدم بڑھا کر نوجوان جوڑے کے ساتھ یوں چلنے لگا گویا انھی کا ساتھی ہوں۔چہرے پر ہلکی مسکراہٹ طاری کیے میں ان سے ادھ قدم پیچھے چلتا رہا۔پریم پنچھی ایک دوسرے میں الجھے ہوئے تھے۔

نگرانی کرنے والوں نے ہمیں نظر بھر کر دیکھا لیکن کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔یقیناً لباس تبدیل کرنا مفید رہا تھا۔میرا اور اللہ ڈینو کا قد بھی درمیانہ تھا اور شکل وصورت بھی عام سی تھی۔اور کسی بھی جاسوس کو ایسا ہونا نہایت سودمند رہتا ہے۔غیر معمولی لمبا یا ٹھگنا ہونا انسان کی شناخت کو آسان کر دیتا ہے۔یونہی خوب صورتی اور بدصورتی بھی پہچان کو سہل کر دیتی ہیں۔نوجوان لڑکا فربہی مائل اور دراز قامت تھا۔اور اسی کی وجہ سے نگرانی کرنے والوں نے ہمیں اہمیت نہیں دی تھی، کہ ان کی نظر میں لڑکا میرا ساتھی تھا۔یقیناً انھیں ہمارا حلیہ بتایا گیا ہوگا۔اور میرا ساتھی نظر آنے والے لڑکے کی قامت ہم سے بالکل مطابقت نہیں رکھتی تھی۔اس کی وجہ سے میں بھی شک کی زد سے دور رہا تھا۔

گو معاملہ اس کے برعکس بھی ہوسکتا تھا کہ وہ دونوں حقیقت میں خفیہ ایجنسی کے افراد نہ ہوتے اور مجھے حالات کی وجہ سے ایسے لگ رہے ہوتے۔لیکن چند لمحوں بعد میرے اول الذکر اندیشے حقیقت کا روپ دھار گئے تھے۔

پارکنگ سے نکل کر پریمی جوڑا جونہی سڑک پر چڑھا، دائیں جانب سے دھیمی رفتار میں چلتی ہوئی ایک ٹیکسی نمودار ہوئی۔لڑکے نے ہاتھ لہرایا۔ڈرائیور نے ٹیکسی روکی اور دونوں عقبی نشست پر بیٹھ گئے۔میں نے مڑ کر دیکھا دونوں موٹر سائیکل سوار میری جانب ہی متوجہ تھے۔اور پریمی جوڑے نے جانے میں جس سرعت اور مجھ سے لاتعلقی کا مظاہرہ کیا تھا وہ انھیں چونکا گیا تھا۔میرا، ان کے ہمراہ یوں چلنا جیسے ان کا ساتھی ہوں اور پھر ایک دم اکیلا رہ جانا مجھے مزید مشکوک بنا رہا تھا۔

میں سڑک کے دوسری جانب یوں کھڑا ہوگیا جیسے ٹیکسی کا انتظار کر رہا ہوں۔بہ ظاہر بے پرواہ اور غیر متعلق سا، لیکن بہ باطن انھی کی طرف متوجہ رہا۔

لمحے بھر مشورے کے بعد ایک کلین شیو ٹہلنے کے انداز میں میری طرف آنے لگا۔یقیناً اس کا ارادہ مجھے مخاطب کر کے جانچنے کا تھا۔مزید ٹھہرنا مناسب نہیں تھا، لیکن حرکت کرنا ان کے شک کو تقویت دے جاتا۔میں نے نظر گھمائی اور بائیں جانب سے قریب آتے خالی رکشے کو دیکھ کر اس کے رکنے کی دعا مانگی۔

ہاتھ لہرانے پر رکشے کی رفتار کم ہوئی اور وہ میرے سامنے آرکا۔دشمن سڑک کے قریب آچکا تھا۔رکشے کو دیکھتے ہی اپنے ساتھی کو بلانے لگا۔

میں نے سیٹ سنبھالتے ہی رکشے ڈرائیور کو تیز چلنے کا کہا۔بلاشبہ رکشا، موٹر سائیکل کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔وہ جلد ہی ہمیں آلیتے۔موٹر سائیکل ایک ایسی سواری ہے جو گلیوں، سڑکوں اور ہر قسم کی جگہوں پر تیز رفتاری سے حرکت کرسکتی ہے۔میرا دماغ سرعت سے ان حالات سے جان چھڑانے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ایک جاسوس کی زندگی میں ایسے لمحات بہت نازک اور خطرناک ہوتے ہیں۔ایک غلط فیصلہ دردناک عذاب میں پھنسا سکتا ہے کہ موت بھی زندگی سے بہتر لگنے لگتی ہے۔

''سردار جی! ذرا تیز چلو۔'' میں نے سکھ ڈرائیور کو تاکید کی۔

''جانڑاں کتھے ہے باؤ.....'' (کہاں جانا ہے۔'' رفتار بڑھاتے ہوئے وہ ہلکا سا مسکرایا۔

''دائیں مڑ جاؤ۔'' اسے ہدایت دیتے ہوئے میں نے عقب میں دیکھا۔مونچھوں والا اپنے ساتھی کو بٹھا رہا تھا۔رکشے نے موڑ کاٹا۔

''یہیں روک دو۔'' میں نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

ڈرائیور نے بریک دباتے ہوئے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

میں نے پچاس کا نوٹ ڈرائیور کی گود میں پھینکا اور جواب دیئے بغیر نیچے چھلانگ لگا دی۔ فٹ پاتھ پر کافی رش تھا، میں بھیڑ میں شامل ہو گیا۔ اسی وقت موٹر سائیکل رکشے کے قریب پہنچ کر رک گئی تھی۔

میں نے غیر محسوس انداز میں رفتار بڑھا دی۔ پچاس ساٹھ قدم چلتے ہی میں ایک دم فٹ پاتھ سے اتر کر مارکیٹ میں گھس گیا۔ اسی وقت مجھے عقب سے۔ ''وہ جا رہا ہے۔'' کی آواز سنائی دی تھی۔

مارکیٹ میں گھستے ہی میں جلدی سے تنگ گلی میں گھسا اور ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں آگے بڑھنے لگا۔ وہ مارکیٹ کی بڑی گلی میں تو موٹر سائیکل دوڑا سکتے تھے لیکن تنگ گلیوں میں گھسنے کو انھیں موٹر سائیکل سے اترنا پڑتا۔

چار پانچ موڑ مسلسل کاٹنے کے بعد اچانک کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں بدکتے ہوئے مڑا اور سامنے بڑی مونچھوں والے نگران کو دیکھتے ہی حیران رہ گیا تھا۔ اس کا کلین شیو ساتھی موٹر سائیکل پر چند قدم دور بڑی گلی میں بیٹھا تھا۔ دونوں کے ہونٹوں پر استہزائی تبسم پھیلا تھا۔

''مہاراج! کاہے کی جلدی ہے۔ داس کو بھی سیوا کا موقع دیں۔''

سوچنے کا نہیں، عمل کا وقت تھا۔ ان کی تفتیش کا سامنا کرنا، بھاگنے کی توجیہ کرنا اور ممبئی میں اپنا ٹھکانا دکھانا ممکن نہیں تھا۔ میرے کاغذات سرسری باز پرس تک تو مجھے بچا سکتے تھے، باریک بینی سے جانچ ہونے پر پکڑا جانا یقینی تھا۔

''کیا میں آپ کو جانتا ہوں؟'' میں نے حیرانی بھرے لہجے میں الجھن ظاہر کی۔

وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اسی وجہ سے تو روکا ہے کہ کچھ اپنے بارے بتا سکوں اور کچھ آپ کے بارے جان سکوں۔''

''پھر کبھی سہی۔'' اطمینان بھرے لہجے میں کہتے ہوئے برقی کوندے کی طرح میرا دایاں مکہ اس کی ٹھوڑی کی طرف بڑھا۔ میرے اطمینان نے اسے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا تبھی وہ دفاع نہیں کر سکا تھا۔ عام طور پر دائروی مکا باکسر کا پسندیدہ ہوتا ہے۔ ٹھوڑی کے نچلے کنارے پر لگنے والی ضرب انسان کا جبڑا اتار دیتی ہے اور کسی کو عارضی بے ہوش کرنے کا یہ تیر بہ ہدف نسخہ ہے۔ بہ شرط مکا مارنے والے کو مہارت حاصل ہو۔

اناڑی میں بھی نہیں تھا، اس کا ثبوت منہ کے بل گرنے والا مچھڑ کا وجود تھا۔ اس کے گرنے کا نتیجہ دیکھے بغیر میں بھاگ پڑا۔ اچانک شور اور چیخ و پکار شروع ہو گئی تھی۔

''بندہ مار دیا..... وہ جا رہا ہے..... کوئی پانی لاؤ..... یہ بے ہوش ہے..... پولیس کو بلاؤ.....'' جیسے کئی جملے میری سماعتوں میں پڑے تھے، رکنے کا مطلب تھا گرفتار ہونا جس کا میں متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

مارکیٹ کی دو تین گلیاں میں نے جلدی سے عبور کیں۔ اور رفتار کم کر لی کہ بھاگنا مجھے مشکوک بنا رہا تھا۔ ایک دکان کے باہر مختلف بنیان اور قمیصیں لٹکی دیکھ کر میں اندر گھسا۔ پی کیپ اور نصف بازوؤں والی ہلکے نیلے رنگ کی ایک بنیان خرید کر میں نے فوراً پہنی اور قیمت چکا کر باہر نکل آیا۔ تعاقب کرنے والے سب سے پہلے لباس کو تاڑتے ہیں، کیوں کہ لباس انسان کی آدھی پہچان کرا دیتا ہے۔ اور بھیڑ میں شکل سے پہلے لباس پر نظر پڑتی ہے۔ پھول دار قمیص دور سے میری شناخت بن رہی تھی۔ البتہ زیادہ تر مردوں بلکہ عورتوں کی اکثریت تک نے جینز پہنی تھی اس لیے میں نے زیریں لباس تبدیل نہیں کیا تھا۔

مارکیٹ کے دوسرے دروازے سے باہر نکل کر میں نے سڑک عبور کی اور مخالف جانب موجود مارکیٹ میں گھس گیا۔ اور اس کے بھی دوسرے دروازے سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ تھوڑا پیدل چلتے ہی ایک خالی رکشا نظر آیا اور ہاتھ لہرا کر میں اندر بیٹھ گیا۔

''کسی اچھے سے ہوٹل میں لے جاؤ۔'' سیٹ سے ٹیک لگا کر میں نظریں گھماتے ہوئے دائیں بائیں کا جائزہ لینے لگا۔ نہ جانے اللہ ڈینو کا کیا ہوا تھا۔ اس کا گرفتار ہونا امکان سے باہر نہیں تھا۔ اس کی خیریت معلوم کرنے کو میں نے موبائل فون نکالا، اس کے دو پیغام آئے ہوئے تھے۔ بھاگ دوڑ میں مجھے پیغام کی گھنٹی (میسج ٹون) ہی نہیں سنائی دی تھی۔

پہلے پیغام میں..... ''بیگم سے ڈرنے والے زن مرید کو معلوم ہونا چاہیے کہ دوسالے جناب کو پھینٹی لگانے کو گھر کے سامنے موٹر سائیکل لیے بیٹھے ہیں۔'' اور دوسرے پیغام میں..... ''دوست، سالوں کے ذکر پر تمھیں سانپ کیوں سونگھ گیا ہے۔'' لکھا تھا۔

بہ ظاہر مزاحیہ پیغام کے پس پردہ اس نے مجھے نگرانی کرنے والوں کی بابت اطلاع دی تھی۔ انصاری صاحب نے ہمیں موبائل فون کے استعمال میں بہت زیادہ احتیاط برتنے کی تاکید کی تھی۔ اسی وجہ سے ڈینو نے بار بار پیغامات یا کال کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے پیغام سے اتنا تو واضح ہو گیا تھا کہ وہ بہ خیریت نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس تک اپنی خیریت پہنچانے کو میں نے ''شکریہ جناب۔'' کا پیغام بھیجنا ضروری سمجھا تھا۔

ڈرائیور نے پندرہ بیس منٹ میں رکشا ایک ہوٹل کے سامنے روکا۔ کرایہ ادا کر کے میں اتر گیا۔ رکشے کے آگے بڑھنے تک میں ہوٹل کے دروازے کی طرف چلتا رہا، مگر جیسے ہی رکشا ذرا دور ہوا میں سڑک عبور کر کے دوسری جانب پہنچ گیا۔ فرلانگ بھر چلتے ہی ایک دوسرا ہوٹل نظر آ گیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ بھاگ دوڑ میں دوپہر کا کھانا ہضم ہو چکا تھا۔ اور اس وقت اچھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں جس طرح خطرے سے بال بال بچا تھا ایسے حالات میں عام آدمیوں کی بھوک اڑ جایا کرتی ہے۔ مگر میں تربیت یافتہ سنائپر تھا اور ایک سنائپر کی زندگی میں خطرات اس تسلسل سے برستے ہیں کہ سامنا کرنا، بازار جا کر خریداری کرنے جتنی اہمیت رکھتا ہے۔ جیسے دریا میں گھسنے والے کا چھینٹوں سے ڈرنا حماقت کہلاتا ہے یونہی ایک سنائپر کا خطروں سے پہلو تہی کرنا نہ صرف بزدلی بلکہ اس کے اناڑی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ گو میرا حالیہ مشن بہت مختلف اور الجھا ہوا تھا، لیکن جان جانے کا خطرہ کسی بھی دوسرے مشن سے کم نہیں تھا۔ جنگلوں، پہاڑوں اور بیابانوں کی خاک تو میں نے بہت چھانی تھی لیکن ترقی یافتہ شہر میں دوسرا مشن تھا۔ اس سے پہلے میں انڈیا کے شہر انبالہ میں رنجیت چوپڑہ نامی دہشت گرد کا پتا صاف کر چکا تھا۔ البتہ وہ حالیہ مشن کے مقابلے میں بہت آسان ثابت ہوا تھا۔ میرا ہدف بالکل واضح اور سامنے تھا۔ جبکہ مس پرما کا دور دور تک نام نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ دھیرندر شکلا بھی رنجیت چوپڑا سے کئی گنا زیادہ اہم اور بڑی شخصیت تھا۔ انڈیا جیسے بڑی آبادی اور رقبے والے ملک میں انھیں ڈھونڈنا کافی دشوار تھا۔ اور ڈھونڈنے سے زیادہ مسئلہ اس کے خاتمے کا تھا۔ ایسے حالات میں یقیناً میری ذمہ داریاں کئی گنا بڑھ گئی تھیں۔

ہال میں بیٹھ کر میں نے دال چاول اور تلی ہوئی مچھلی منگوالی۔ کھانے کے دوران نظریں تسلسل سے ہال میں گھومتی رہیں۔ لیکن بھیڑ بہت زیادہ تھی، ہال میں کوئی میز خالی نظر نہیں آ رہی تھی۔ درمیانہ درجے کے ہوٹلوں میں عموماً یہی صورت حال نظر آتی ہے۔ ہال کی دیواروں کے ساتھ چند بڑی سکرین کی ''ایل ای ڈیز'' لگی تھیں۔ ایک ایل ای ڈی مجھ سے نزدیک تھی، بے دھیانی میں سکرین کو گھورتے ہوئے اچانک ایسی خبر چلنے لگی جس نے مجھے اچھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دو تین گھنٹے پہلے مارکیٹ میں ایجنسی کے آدمی سے میری لڑائی کا وڈیو کلپ چلایا جا رہا تھا۔ ہندی رسم الخط تو میں نہیں پڑھ سکتا تھا البتہ خبر پڑھنے والی کی گفتگو بہ خوبی سمجھ سکتا تھا۔ اس کے مطابق خطرناک پاکستانی دہشت گرد نے ایک عام آدمی کو اس بنا پر مکا مار کر قتل کر دیا کہ وہ اسے پہچان گیا تھا۔ ''سی سی ٹی'' کیمرے کی وڈیو بہت زیادہ صاف نہیں ہوتی۔ میرا چہرہ بھی زیادہ واضح نہیں تھا۔ لیکن کوئی باریک بین اور ہوشیار شخص شناخت کر سکتا تھا۔ البتہ بالائی لباس تبدیل کر کے میں نے عقل مندی

کی تھی۔

مضروب کے قتل کی افواہ بھی مجھے زیادہ خطرناک ثابت کرنے کو اڑائی جارہی تھی۔ یہ انڈین ایجنسیوں کا پرانا طریقہ کار ہے۔ یوں کسی بھی چھپنے والے کو زیادہ مشکلات درپیش ہوسکتی ہیں۔ اور دہشت گرد کے ساتھ پاکستان کا نام لینا تو ان کی فطرت ہے۔ بغیر کسی تحقیق اور ثبوت کے الزام تراشی کرنا ان کی عادت ہی نہیں مشغلہ ہے۔ اور ایک ہم ہیں کہ ان کا حقیقی جاسوس اور دہشت گرد پکڑ کر بھی آواز بلند نہیں کر سکتے۔ ہماری خارجہ پالیسی ہمیشہ کمزور، بے دست و پا اور بودی رہی ہے۔ عالمی سطح پر ہم کبھی اپنا مقدمہ صحیح طریقے سے پیش کر سکے اور نہ لڑ سکے ہیں۔

میری وہاں موجودی بہ طور جاسوس تھی نہ دہشت گردی کا ارادہ تھا۔ بلکہ ایک باپ کو بیٹی سے ملانا اور ایسے ناپاک وجود کے خاتمے کو تھی جو پاکستان سے زیادہ انڈیا کے لیے نقصان دہ تھا۔ لیکن حصولِ مقصد کو نیت کی درستی کافی نہیں ہوتی۔ طریقہ کار بھی نیت جتنا ہی اہم اور ضروری ہوتا ہے۔ اور سچ کہوں تو میرا طریقہ کار قانون کے دائرے سے بالاتر تھا۔ اس لحاظ سے انڈین ٹی وی کی خبر کو جھٹلانا دیانت داری کے منافی ہوگا۔

میں نے پی کیپ کو سر پر کچھ اور دبا دیا تاکہ چہرہ مزید چھپ جائے۔ پہلے میرا ارادہ اسی ہوٹل میں شب بسری کا تھا، مگر اب احتیاط ضروری ہوگئی تھی۔ جنگلوں اور پہاڑوں کی نسبت شہری آبادی میں رہنا مجھے دشوار لگ رہا تھا۔

کھانے کا بل چکا کر میں باہر نکل آیا۔ وڈیو میں میری داڑھی واضح نظر آرہی تھی اور حلیہ تبدیل کرنے کا آسان طریقہ یہی تھا کہ میں داڑھی صاف کر دیتا۔ بلاشبہ ایک جاسوس کو اپنے بچاؤ کو اخلاقی اقدار کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ انصاری صاحب کی کہانی میں اجمالاً بیان کر چکا ہوں۔ ان کے علاوہ بھی کئی جاسوسوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ تفصیلی بات چیت ہوئی اور پتا یہ چلا کہ اپنی پہچان چھپانے کو جاسوس کو کئی اخلاقی قدریں پامال کرنا پڑتی ہیں، اصول توڑنا پڑتے ہیں، کردار داغ دار کرنا پڑتا ہے، جھوٹ بولنا پڑتا ہے اور جواء، شراب نوشی، آبرو باختہ عورتوں سے تعلق رکھنا یہ سب بہ حالت مجبوری روا سمجھا جاتا ہے۔

ایک دکان سے میں قینچی، شیونگ ریزر اور دستی آئینہ خرید لیا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا میری نظریں کسی مناسب گوشے کی تلاش میں بھٹکنے لگیں تاکہ داڑھی صاف کر سکوں، اچانک ڈینو کی گھنٹی آنے لگی۔

گھنٹی وصول کرتے ہوئے میں نے محتاط لہجے میں ''ہیلو'' کہا۔

وہ شوخ لہجے میں بولا۔ ''کیسے ہو مہاراج! پسند کرو تو آج رات دعوت کر سکتا ہوں۔''

''اپنی بھابی کو تو جانتے ہو، یہ نہ ہو میری جان کو آجائے۔'' میں نے اشارے میں خطرے کا استفسار کیا۔

''دیدی کو سمجھا دوں گا، میری کوئی بات نہیں ٹالتیں۔'' اس نے ''سب اچھا'' رپورٹ دی۔

''تمھارے گھر آنا پڑے گا؟'' میں نے مخصوص انداز میں پتا معلوم کیا۔

وہ اطمینان سے بولا۔ ''گھر پر کہاں عیاشی ہوسکتی ہے۔ اس وقت خصوصی دوست کے ساتھ ہوں، پتا بھیج رہا ہوں، جلدی پہنچو۔'' خصوصی دوست کا مطلب مجھے یہی سمجھ آیا تھا کہ وہ اس وقت کسی لڑکی کے ساتھ تھا۔

رابطہ منقطع کرنے کے منٹ بھر بعد ہی پیغام موصول ہوا۔ نرائن نگر کالونی کا گلی اور مکان نمبر درج تھا۔ نزد شیو مندر لکھ کر پہچان کو آسان کیا گیا تھا۔

مجھے اپنی جگہ کے بارے کوئی خاص معلومات نہیں تھیں، نہ میں ممبئی کے گلی کوچوں سے واقف تھا۔ اتنے بڑے شہر سے واقف ہونے کو کم از کم چند ماہ کی آوارہ گردی ضروری تھی۔ البتہ رکشے، ٹیکسیاں وغیرہ رہنمائی کو موجود تھے۔ ایک خالی رکشا روک کر میں اسے نرائن نگر اور شیو مندر کے بارے بتانے لگا۔

اس نے کہا۔ ''ڈیڑھ سو روپے لگیں گے بابو۔''

''رام.....رام، اتنے دام۔'' میں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''دس کم دے دینا۔'' اس نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری۔

تھوڑی تکرار کے بعد ایک سو بیس روپے کرایہ طے ہوا اور میں رکشے میں بیٹھ گیا۔ خود کو مشکوک ہونے سے بچانے کو تکرار کرنا ضروری تھا۔

شیو مندر سے پچاس ساٹھ قدم آگے جا کر مطلوبہ گلی میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ میں مندر کے سامنے اتر گیا۔ رکشے والے کو فارغ کر کے میں نے چند لمحے انتظار کیا اور رکشے اوجھل ہوتے ہی گلی کی طرف بڑھ گیا۔ ڈینو نے اعتماد سے ''سب اچھا'' کی رپورٹ دی تھی لیکن میں نے احتیاط کا دامن چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اور میری یہ احتیاط کام آ گئی تھی۔

گلی کافی وسیع اور روشن تھی۔ پندرہ نمبر میرا مطلوبہ مکان تھا۔ بہ ظاہر بے پروائی لیکن بہ باطن چوکنے انداز میں گلی میں داخل ہوا۔ پہلے مکان کے دروازے پر پینتیس کا عدد چمکتا ہوا نظر آیا، چند قدم آگے مخالف جانب چونتیس عدد پڑھتے ہی مجھے پتا چل گیا کہ میں گلی کے اختتام سے آغاز کی طرف جا رہا تھا۔ گلی کی رونق اب تک بحال تھی۔ اکا دکا راہگیروں کا آنا جانا لگا تھا۔

تھوڑا سا آگے بڑھتے ہی روشنی کے کھمبے سے ٹیک لگائے ایک فقیر نظر آیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی جانے اس کے جی میں کیا سمائی کہ ''بجرنگ بلی'' کا نعرہ بلند کر کے مجھے قریب بلانے لگا۔

''بالک! جوگی کی سہائتا کرتے جاؤ۔'' (بچے جوگی کی مدد کرتے جاؤ)

اسے نظر انداز کر کے میں نے آگے بڑھنا چاہا، مگر جونہی پاس سے گزرا اس کی تیز سرگوشی ابھری۔ ''میری بات سن کر جاؤ۔'' یہ کہنے کے ساتھ اس کی بلند آواز ابھری۔ ''بالک! جوگی کو نظر انداز کرنے والے کو نرگ میں بھی جگہ نہیں ملتی۔''

اس کے نعرے سے زیادہ سرگوشی نے مجھے چونکا دیا تھا۔ میں نے بدک کر آگے پیچھے دیکھا، کوئی خطرہ موجود نہ پا کر بھکاری کا کچ نظر جاننے کو قریب ہوا۔

وہ تیز لہجے میں بولا۔ ''بالک! جوگی کو سہارا دے کر اس کے ٹھکانے تک پہنچا دو، بھگوان تمھاری رکھشا کرے گا۔''

میں متذبذب کھڑا رہا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا جواب دوں۔

اس نے سرگوشی میں میرا شناختی نام لیتے ہوئے کہا۔ ''سندیپ چوپڑا! آگے خطرہ ہے۔''

ایک دم لگا میں پھنس گیا ہوں، کیوں کہ ضروری نہیں کہ مجھے پہچاننے والا دوست ہی ہوتا۔

اس کی بلند آواز میری سوچوں میں مخل ہوئی۔ ''بالک! جوگی کو سہارا دے کر اٹھاؤ۔''

ایک بار میرا جی واپس بھاگنے کو کیا لیکن پھر یہ سوچ کہ دشمن کو مجھے للکارنے کی کیا ضرورت تھی وہ مجھے بے دھیانی میں بھی گھیر سکتے تھے۔ یوں سرگوشی کرنے والا دوست ہی ہو سکتا تھا۔ مگر یوں ایک دم کسی دوست کا مل جانا بھی عجیب لگ رہا تھا۔ میرے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ لمحے کے دسویں حصے میں فیصلہ کرتے ہوئے میں نے بھکاری کو سہارا دینے کو ہاتھ بڑھا دیا۔

دائیں ہاتھ سے میرا ہاتھ تھام کر اس نے بائیں ہاتھ میں ڈنڈا تھاما اور نقاہت کا اظہار کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ لیکن اس کے ہاتھ کی گرفت یہ باور کرانے کو کافی تھی کہ کمزوری کا اظہار نرا ڈراما ہی تھا۔

اٹھتے ہی اس نے دایاں بازو میرے کندھے پر رکھا، ساتھ ہی اس کی سرگوشی نما بڑبڑاہٹ ابھری۔

''گوپال چند خطرے میں گھرا ہے۔ اور اس کا چارہ ڈال کر تمھیں یہاں گرفتار کرنے کو بلایا گیا ہے۔'' اللہ ڈینو کے

شناختی کاغذات گوپال چند کے نام سے بنے تھے۔

میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

وہ درشت ہوا۔ ''انصاری صاحب کو تم جیسے گدھے ہی ملے تھے یہاں بھیجنے کو جنھیں یہ بھی معلوم نہیں ایسے وقت استفسار نہیں کیا جاتا۔ جب تمھارے شناختی ناموں کا ذکر کر دیا ہے تو مزید تفتیش کرنا ضروری ہے کیا؟''

میں ششدر رہ گیا تھا۔ بہ مشکل ندامت ظاہر کر سکا تھا۔ ''معذرت خواہ ہوں۔'' یقیناً وہ پاکستان کا گمنام ہیرو تھا۔ ایسے ہیروز کا ایک روپ نہیں ہوتا۔ موقع کی مناسبت سے ہر روپ دھار لیتے ہیں۔ دنیا کے ہر خطے میں جہاں وطن کو ضرورت پڑتی ہے یہ حاضر ہوتے ہیں۔ اپنے اصل چہرے، نام اور شناخت کو شاید یہ خود بھی بھول جاتے ہیں۔ ان کے پیش نظر صرف وطن کی خدمت اور حفاظت کا فریضہ رہتا ہے۔

وہ ہولے سے بڑبڑایا۔ ''ریڑھی والا اور دونوں گاہک، دشمن ہیں۔''

مکان نمبر پندرہ کے سامنے ایک شخص آئس کریم کی ریڑھی لگائے کھڑا تھا۔ ساتھ ہی لکڑی کے بینچ پر دو جوان بیٹھے خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے پرانے شناسا اچانک ملیں اور آئس کریم کھا کر حال احوال بانٹنے لگیں۔ میں نے مذکورہ افراد کی طرف دیکھ کر ہولے سے کہا۔ ''سمجھ گیا۔''

''مکان کے دوسری جانب بھی تین آدمی موجود ہیں۔ گلی کے اس سرے پر چائے کا کھوکا بنا ہے اور تینوں گاہک کے روپ میں بیٹھے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کرنا کیا ہے؟''

''انھیں بے ہوش کر کے گوپال کو ساتھ لے جانا ہوگا۔''

''تمام کو؟'' اسے سہارا دے کر میں آگے بڑھتا رہا۔

''ان تینوں کو۔'' آہستہ سے کہتے ہوئے اس نے زوردار نعرہ بلند کیا۔ ''جے بجرنگ بلی، جوگی کو آئس کریم کھلاؤ۔''

میں اسے سہارا دیے ریڑھی کے قریب پہنچا اور لکڑی کے بینچ کے ساتھ بٹھاتے ہوئے ریڑھی والے کو کہا۔ ''بھائی! جوگی بابا کو آئس کریم کا کپ دینا۔''

''جی مہاراج۔'' شائستگی سے کہتے ہوئے اس نے بکس کھولا۔ اسی اثناء میں جوگی بابا نے بیٹھے بیٹھے جیب سے بوتل نکال کر باری باری دونوں گاہکوں کے چہرے پر سپرے کر دیا۔ وہ ہڑبڑا گئے تھے، لیکن ان کے سنبھلنے سے پہلے بے ہوشی کی زود اثر دوا اپنا کام کر گئی تھی۔ اٹھتے ہی دونوں دھڑام سے نیچے گرے تھے۔

ریڑھی والے نے چونکتے ہوئے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے میں حرکت میں آ گیا تھا۔ میرا بھرپور مکا اس کی کنپٹی پر لگا۔ ''اوغ۔'' کی آواز کے ساتھ ہی وہ ڈھیر ہو گیا تھا۔

جوگی نے حفظ ماتقدم کے طور پر اس کے چہرے پر سپرے کرتے ہوئے اس کی بے ہوشی کو گہرا کر دیا تھا۔ میں نے سرعت سے تلاشی لی، اس نے نیفے میں سائلنسر لگا ''والتھر پی ٹو نائن ٹو'' پستول اڑسا ہوا تھا۔

اس اثناء میں جوگی، گاہکوں کی تلاشی لے کر ان کے لباسوں سے ہتھیار برآمد کر چکا تھا۔ تینوں کے پاس سائلنسر لگے عمدہ پستول موجود تھے۔

''وقت کم ہے، گوپال کو بلاؤ۔'' جوگی نے دونوں پستول اپنے لباس میں چھپا لیے تھے۔

میں نے فوراً ڈینو کا نمبر ڈائل کیا۔ ''کس وقت تک پہنچو گے بھائی اتنی دیر لگا دی۔'' کال وصول کرتے ہی اس نے واویلا کیا۔

''تم خطرے میں ہو محترم، اس چھپکلی کو بے ہوش کر کے فوراً دروازے پر پہنچو میں منتظر ہوں۔''

''اوہ..... ٹھیک ہے میں منتظر ہوں۔'' گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے معنی خیز لہجے میں سمجھ جانے کا اشارہ دیا۔

اگلے دو منٹ میں وہ دوڑتے ہوئے باہر نکلا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے متردد چہرے پر اطمینان کی جھلک نمودار ہوئی تھی۔

''اس طرف۔'' جوگی نے واپسی کی راہ کی طرف رہنمائی کی۔ کھلا چوغہ اور لمبے بالوں کی وگ اتار کر اس نے لپیٹے اور بنڈل بغل میں دبا لیا۔ نیچے سادہ شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس نے اسٹریٹ لائیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ''نشاتے باز کون سا ہے، بتیاں ناکارہ کر دو۔''

یقیناً انھیں میرے بارے زیادہ نہیں تو سرسری معلومات ضرور تھیں۔ اس کا مطمح نظر میں نہیں سمجھا تھا لیکن ہدایت پر عمل کر گزرا۔ سائیلنسر لگے پستول نے دو دفعہ ''ٹھک ٹھک۔'' کی اور دو بتیاں کرچی ہو کر زمین بوس ہو گئی تھیں۔ گلی میں ملگجا اندھیرا چھا گیا تھا۔ تیسری اسٹریٹ لائیٹ پستول کی مار سے ذرا دور تھی۔ چند قدم دوڑتے کر میں لمحہ بھر کو رکا ایک اور۔ ''ٹھک۔'' نے گلی کی آخری بتی توڑ دی تھی۔

جوگی سب سے آگے تھا۔ دو افراد موڑ مڑ کر گلی میں داخل ہوئے۔ ان کے انداز سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ عام لوگ تھے۔ ان کے قریب ایک لمحے کو قدم روکتے ہوئے جوگی نے دونوں کے چہرے پر بے ہوشی کا سپرے کر دیا۔ وہ دھڑام سے نیچے گرے تھے۔ جوگی تیز رفتاری سے آگے بڑھ گیا۔ گلی کے ماقبل اختتامی (سیکنڈ لاسٹ) مکان کے دروازے کے سامنے رک کر اس نے دائیں بائیں دیکھا اور لوہے کے دروازے پر بندر کی طرف پاؤں رکھتا ہوا مکان کے اندر کود گیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے ذیلی دروازہ کھول کر ہمیں اندر بلا لیا۔

ہم آگے پیچھے اندر گھسے۔ ذیلی دروازہ اندر سے کنڈی کر کے جوگی اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ وہ درمیانے حجم کا مکان تھا۔ جوگی کی معیت میں چلتے ہوئے ہم سامنے سے گھوم کر پچھواڑے میں پہنچے۔ ایک کھڑکی کو دھکیل کر وہ اچک کر اوپر چڑھا اور اندر گھس گیا۔ ہم نے تقلید کی تھی۔

اس نے کھڑکی کنڈی کر دی۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک خواب گاہ میں بیٹھے تھے۔ جوگی کا گھر کی بتیاں نہ جلانا ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کسی انجان شخص کا گھر تھا۔ یکمین کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر وہ عارضی استعمال میں لا رہا تھا۔ یقیناً مکان پہلے سے اس کی نظر میں تھا تبھی بغیر جھجکے اندر گھسا تھا۔ کھڑکے دروازے کے پردے برابر کر کے اس نے موبائل فون کی روشنی جلائی اور میز پر رکھ دیا۔

''گوپال چند تمھاری عقل گھاس چرنے گئی ہوئی تھی۔'' نشست سنبھالتے ہی وہ ڈینو پر برہم ہوا۔

ڈینو کھسیاتے ہوئے بولا۔ ''پہچان کرا کر بے عزتی کرو یار!''

جوگی نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ ''خالی لڑائی بھڑائی کی مہارت تمھیں خطرات سے نہیں بچا سکتی۔''

ڈینو نے صفائی دی۔ ''میں نے اسے بازاری لڑکی سمجھا تھا۔''

میں مخل ہوا۔ ''مجھے بھی سمجھا دو۔''

ڈینو نے مسمسے لہجے میں تفصیل بتلائی۔ ''جونھی ہوٹل کے ہال میں پہنچا ایک لڑکی استقبالیہ کے سامنے نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر اس نے دعوت آمیز تبسم اچھالا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، سوچا شاید پیشہ ور لڑکی ہے۔ اس کی مدد سے میں ہوٹل سے آسانی سے نکل سکتا تھا۔ پس جوابی مسکراہٹ اچھال کے قریب ہو گیا۔ بے حیا فوراً ہی مان گئی۔ ارادہ تھا ہوٹل سے نکل کر جان چھڑا لوں گا، مگر پھر شب بسری کا لالچ آڑے آ گیا۔ باہر نکلتے ہوئے مجھے نگرانی کرنے والے بھی نظر آئے تھے

تبھی تمھیں پیغام بھی بھیجے۔ شردھا سہنا کا مکان مجھے چھپنے کو بہتر لگا اس لیے تمھیں بھی دعوت دے دی۔ اب تمھارے کہنے پر بے چاری کو بے ہوش کر آیا ہوں۔''

جوگی نے انکشاف کیا۔ ''اس کا نام سنیتا جیسوال ہے۔ را کی خصوصی ایجنٹ ہے۔ بے خبری میں مار کھا گئی ہوگی ورنہ اتنا آسان ہدف نہیں ہے۔ باقی ہم شروع سے تم پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ سلطان دادا نے اپنا کام بہ احسن خوبی نبھایا مگر تمھاری بدقسمتی کہ را کا ایک نمائندہ بھی تمھارے تعاقب میں تھا۔ وہ خود تو سلطان دادا پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا اور نہ تصدیق کر سکتا تھا۔ اس نے کرن چاولہ تک یہ خبر پہنچا دی۔ راجپوت دادا کا پتا کرن چاولہ ہی نے کھیلا۔ راجپوت دادا کے کرن چاولہ کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں۔ گو کرن چاولہ جانتا تھا کہ سلطان دادا تک اس کا نام پہنچ جائے گا اور اس کے بعد وہ تمھیں چھپانے کی کرے گا، لیکن اس کا مطمح نظر تمھاری موجودی کی تصدیق کے ساتھ تمھاری پہچان بھی تھی۔ وہ سلطان دادا پر کچا ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ حکومتی کارندے حتی الوسع کوشش کرتے ہیں کہ زیر زمین لوگوں سے نہ بگاڑیں۔ سلطان دادا کے اڈے اور ہوٹل کی عمارت کے درمیانی ربط سے وہ بھی واقف تھے، تبھی ہوٹل پر زیادہ توجہ دی اور گوپال کو آسانی سے ورغلا لیا۔ چونکہ ان کا مطمح نظر تم دونوں کی گرفتاری تھا اور سندیپ چوپڑا ان کے ہاتھ نہیں آسکا تھا تبھی انھوں نے گوپال کو ڈھیل دیئے رکھی تاکہ گوپال کے ذریعے سندیپ کو پکڑ سکیں۔ ہم بھی ان کے تعاقب میں تھے۔ گلی کے سرے پر میں نے اور دوسری جانب ہمارے ایک اور ساتھی نے مورچہ پکڑا ہوا تھا، کیوں کہ ہمیں اندازہ تھا وہ سندیپ کو وہیں بلائیں گے۔''

جوگی کی وضاحت نے ہمارے کافی شکوک دور کر دیے تھے۔ ڈینو منہ بنا کر بولا۔ ''اگر سلطان دادا کے بجائے آپ لوگ ہی ہمیں وصول کرتے تو زیادہ مناسب رہتا۔''

وہ صاف گوئی سے بولا۔ ''اس طرح ہم خود نظر میں آجاتے۔ اور ہماری یہاں موجودی کا مقصد انصاری صاحب کی بیٹی کی بازیابی نہیں ہے۔''

میں شاکی ہوا۔ ''تو اب مدد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

جوگی اطمینان سے بولا۔ ''مجبوراً مخل ہونا پڑا۔ کیوں کہ ایک تو ہمارے بے نیازی برتنے پر تم دونوں کی گرفتاری یقینی تھی، دوسرا اب ان کی توجہ تم دونوں پر مرکوز تھی اس لیے ہم آسانی سے وار کر گئے۔''

ڈینو ممنونیت سے بولا۔ ''بہ ہر حال شکریہ۔''

''تمھارے شکریے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ تم دونوں کی جگہ کوئی بھی پاکستانی ہوتا ہم اسے بچانے کی کوشش ضرور کرتے۔ باقی انصاری صاحب کے کچھ قرض بقایا ہیں اگر خود ان کا کام نہیں کر سکتے تو اس کے مددگاروں کی تھوڑی بہت مدد ضرور کر سکتے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا یہاں محفوظ ہیں؟''

اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ ''دوران لڑائی کس کا داؤ چل جائے یہ مقدر کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارا کام کوشش کرنا ہے، سو فیصد کامیابی کا حصول کسی اور کے قبضہ قدرت میں ہے۔ البتہ دونوں اپنے موبائل فون بند کر دو، کیوں کہ تمھارے موبائل نمبران کے پاس پہنچ گئے ہوں گے۔''

ہم نے موبائل فون بند کر کے کوڑا کرکٹ کی ٹوکری میں پھینک دیے تھے۔

''ڈینو نے اندازہ ظاہر کیا۔ ''یقیناً یہ کسی انجان شخص کا مکان ہوگا اور اس کی آمد کسی بھی وقت متوقع ہو سکتی ہے۔''

جوگی نے وضاحت کی۔ ''بھاگنے کی کوشش میں پکڑے جانے کا اندیشہ تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہاں کب تک چھپیں گے؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتے۔'' بے نیازی ظاہر کرتے ہوئے جوگی نے آنکھیں بند کرلیں۔

ڈینو نے منہ بنایا۔''پھر اپنا نام ہی بتادو۔''

''دیپک۔'' وہ دھیرے سے بولا۔''اور یقیناً یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں ہوگی کہ ایک آدمی کا جاگنا ضروری ہے۔''

ڈینو مجھے اٹھنے کا اشارہ کر کے ڈرائینگ روم میں لے آیا، وہاں اندھیرا تھا۔اس لیے ہم جوگی کا موبائل فون ساتھ لے آئے تھے۔ بیٹھنے کی جگہ تلاش کر کے میں نے روشنی بجھادی۔

ڈینو شرم سار ہوا۔''سوری یار! میں نے تمھیں بھی پھنسانے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔''

میں متبسم ہوا۔''انصاری صاحب کو کم از کم دو تین ماہ تک ہمیں جاسوسی کی تربیت دینا چاہیے تھی۔''

ڈینو کو کرید ہوئی۔''بھائی کا اصل نام دیپک تو نہیں ہوگا۔''

میں نے سمجھایا۔''اس نے ہمارے اصل نام جاننے کی کوشش نہیں کی تو اپنا نام کیوں کر بتائے گا۔''

''اچھا مٹی پاؤ۔'' اس نے گہرا سانس لیا۔''یار! مجھے تو شردھا یاد آرہی ہے۔''

میں نے یاد دلایا۔''اس کا نام سنیتا ہے۔''

وہ عاشقانہ لہجے میں بولا۔''نام بھاڑ میں ڈالو، صورت اتنی موہنی ہے کہ مستقل انڈیا میں رہائش کا سوچنے لگا تھا۔سانولی ہے لیکن حواس پر چھانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔''

میں ہنسا۔''اتنی ہی پیاری ہوتی تو بے ہوش کر کے نہ آتے۔''

''مجبوری تھی یار! ورنہ ارادہ یہی تھا کہ پرما انصاری کے بجائے پہلے شردھا کو اغواء کر کے پاکستان لے جاؤں گا۔''

میں نے ٹوکا۔''تم مسلسل اس کا غلط نام لیے جارہے ہو۔''

وہ شوخی سے بولا۔''کیا کروں، اس نام میں نغمگی زیادہ ہے۔اور جب تمھیں پتا چل جاتا ہے کہ شردھا کہنے سے میری مراد سنیتا ہی ہے تو تمھی ٹوکنے سے باز آجاؤ۔''

''فضول بحث کو چھوڑو اور آگے کا سوچو۔'' میں نے موضوع تبدیل کیا۔

وہ اطمینان سے بولا۔''سوچنے کو دیپک صاحب تشریف لے آئے ہیں۔''

میں نے واویلا کیا۔''یقین مانو مجھے تو معاملے کا سر پیر نظر نہیں آرہا۔ڈور ایسی الجھی ہوئی ہے کہ کوئی سرا دکھائی نہیں دیتا۔''

''ایک مشورہ مانو گے۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔''تمھاری حالیہ بے راہروی متقاضی ہے کہ مشورہ سنے بغیر میں اثبات میں سر نہ ہلاؤں۔''

وہ عاشقانہ لہجے میں بولا۔''بے راہروی سے مراد شردھا سہنا ہے تو یہ الزام سر آنکھوں پر۔''

میں چڑ کر بولا۔''مشورہ پھوٹو۔''

''آرام سے سوجاؤ، دیپک بھائی سے مل بیٹھ کر کوئی حل سوچیں گے۔''

''تمھاری عادتیں کیسی بھی ہوں مشورہ رد کرنے کے قابل نہیں دیا۔'' طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے میں موبائل روشن کر کے خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

''تمھارے طعنے اس دل سے شردھا سہنا کی محبت کم نہیں کر سکتے۔'' میری تقلید میں اس نے بھی خواب گاہ کا رخ کیا تھا۔

دیپک ڈبل بیڈ پر پھیل کر لیٹا تھا۔ مجھے بھی ایک کونے میں جگہ مل گئی تھی۔ موبائل فون میز پر رکھ کر میں لیٹ گیا۔

عموماً سول دوستوں سے سنا ہے کہ انھیں نئی جگہ پر نیند نہیں آتی۔لیکن ایک فوجی بے چارہ اتنے علاقے گھوم چکا ہوتا ہے کہ کوئی جگہ اسے نئی معلوم نہیں ہوتی۔ایک سنائپر تو اس معاملے اور بھی سخت جان ہوتا ہے۔ پتھریلی چٹانوں، اونچے درختوں، برفیلی وادیوں اور گرم ریگزاروں میں موسم کی شدت کی پروا کیے بغیر سو جانا ایک سنائپر ہی کا خاصا ہوتا ہے۔ جب خطرات برساتی بادلوں کی طرح سر پر منڈلا رہے ہوں۔موت کے قدموں کی چاپ اونچی ایڑی کے سینڈل کی پختہ فرش پر ٹک ٹک کی طرف سنائی دے رہی ہو۔مقصد پورا کرنے کا جنون دلگن دل و دماغ پر حاوی ہو ایسے میں سو جانا کمال کہلاتا ہے۔اور ایسے کمال پاکستانی سنائپرز سے سرزد ہوتے رہتے ہیں۔علامہ اقبالؒ نے طارق بن زیادؒ کا قول مصرع میں نقل فرمایا کہ.....

ع ہر ملک ملک ماست کہ ملکِ خدائے ماست

اور بلاشبہ پاکستانی سنائپرز پر بھی یہ مصرع مکمل طور پر منطبق ہوتا ہے۔وہ تو آرام دہ بستر تھا۔گو خطرہ موجود تھا لیکن بدن کو راحت میسر تھی۔ جو جسمانی اور ذہنی اذیت میں سونے کے عادی ہوں انھیں صرف ایک دشواری جاگنے پر مجبور نہیں رکھ سکتی۔میں بھی لمحوں ہی میں گہری نیند میں ڈوب گیا تھا۔

میری آنکھ ڈینو کے جگانے پر کھلی تھی۔

''شش.....خطرہ ہے۔''اس نے دھیمی آواز میں سرگوشی کی تھی۔سنائپر کا دماغ عام آدمی سے مختلف ہوتا ہے۔جاگتے ساتھ اسے ماحول کا ادراک ہو جاتا ہے۔اور ایسا مسلسل مشقوں سے ہوتا ہے کہ آنکھ کھلتے ہی انسان حواس باختہ نہ ہو جائے۔

میں نے فوراً ڈینو سے موبائل لے کر بجھا دیا تھا۔دروازے پر کھٹر پڑ ہوئی۔میرا خیال مالک مکان کی طرف پلٹا،مگر دبے قدموں کی چاپ اور ہلکی سرگوشیاں میرے اندازے کو جھٹلا رہی تھیں۔

اچانک ہی کمرہ تیز روشنی میں نہا گیا،کسی نے ''مین سوئچ آن'' کیا تھا۔یقیناً گھر والوں نے جاتے وقت ہر کمرے کی روشنی بجھانے کے بجائے صرف ''مین سوئچ'' سے بجلی منقطع کی تھی جو بٹن کے دبتے ہی بحال ہو گئی تھی۔

روشنی ہوتے ہی دروازے کو ٹھوکر مار کر کھولا گیا۔چست لباس پہنے ہوئے دو افراد ہتھیار تانے دندناتے ہوئے اندر گھسے۔انھوں نے انساس رائفلیں پکڑی ہوئی تھیں۔(5.56 ایم ایم انساس رائفل (انڈین نیشنل سمال آرمز سسٹم) ایک اچھی رائفل ہے۔اس کا ریسیور اور پسٹل گرپ کلاشن کوف جیسا ہے۔میگزین شفاف پلاسٹک کی بنی ہے اور اس میں 22 گولیاں آتی ہیں۔خودکار ہتھیاروں کو جب چھٹے (برسٹ) پر لگایا جائے تو فائرر کی انگلی کے دباؤ سے گولیوں کی بوچھاڑ نکلتی ہے۔یعنی جتنی دیر ٹریگر دبا کر رکھا جائے گا اتنا لمبا چھٹا فائر ہوگا۔اور یوں عموماً اچھے فائرر بھی لمبے چھٹے فائر کر بیٹھتے ہیں جو کہ گولیوں کے ضیاع کے ساتھ ہدف کو بھی فائرر کی مرضی کے خلاف زیادہ نقصان پہنچا دیتے ہیں۔لیکن انساس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ سلیکٹیو میکانزم کے ذریعے سنگل شاٹ اور تین راؤنڈ کے چھٹے فائر کیے جا سکتے ہیں)

''ہاتھ اوپر۔'' کرخت لہجے میں پکارا گیا۔

مگر ڈینو اسپرنگ کی طرح اچھلا،اس کی بھرپور ٹھوکر، دائیں والے کی چھاتی میں لگی۔وہ دروازے سے باہر جا گرا۔دوسرے نے رائفل ڈینو کی طرف گھمائی،لیکن اس سے پہلے میں لبلبی (ٹریگر) دبا چکا تھا۔وہ وقت خطرہ مول لینے کا نہیں تھا کہ میں اسے زخمی کرنے کا سوچتا۔تبھی ''والتھر پی ٹونٹی ٹو'' کی گولی اس کے کان سے ایک انچ اوپر کھوپڑی میں دھنسی۔وہ مری ہوئی چھپکلی کی طرح نیچے گرا تھا۔

ڈینو فرش پر لوٹ لگاتے ہوئے دروازے سے گزرا اور اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے دشمن پر جا پڑا۔سر کی بھرپور ٹکر چھاتی میں رسید کرتے ہوئے ڈینو نے اس کے ہتھیار پر ہاتھ ڈالا۔وہ کولہوں کے بل نیچے گرا تھا۔لیکن ڈینو سے ایک غلطی ہو

گئی تھی وہ تیزی میں ورستی بھول گیا تھا۔ حملہ کرنے والے صرف دو نہیں تھے۔ کمانڈوز عموماً کمروں پر دھاوا بولتے وقت چار کی تعداد میں حملہ کرتے ہیں۔ ایک کمانڈو کو یہ اصول بھولنا نہیں چاہیے تھا۔ اور میدان جنگ میں ذرا سی غلطی، گنجائش کا موقع چھین لیا کرتی ہے۔

ڈینو، انساس چھینتے ہی پیٹھ کے بل فرش پر گرا اور دیوار کے ساتھ کھڑے دشمن پر فائر کھول دیا۔ اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ اسے بنیادی اصول نہیں بھولا تھا۔ بس جوش میں ہوش کھو بیٹھا تھا۔ دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے دو افراد میں سے ایک تو اس کی گولیوں کا نشانہ بن گیا البتہ دوسرے نے لبلبی دبا کر ڈینو کی چھاتی میں سوراخ کھول دیا تھا۔

اس حالت میں بھی ڈینو کی حرکت نہیں رکی تھی، اس کی رائفل نے دوسرا چھٹا اگلا اور اسے مارنے والا بھی چیختا ہوا نیچے گر گیا تھا۔

میں بجلی کی سی سرعت سے ڈینو کی طرف بھاگا۔ اس دوران ڈینو کی ٹکر کھا کر گرے ہوئے دشمن نے اٹھ کر ڈینو کو ٹھوکر رسید کرنے کی کوشش کی، مگر سائیلنسر لگا ''دالتھر پی ٹونٹی ٹو'' دوسری گولی اگل چکا تھا۔ بھاگتے ہوئے بھی میں دشمن کے ماتھے کو کامیابی سے داغ چکا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں باہر نکلتا، دو افراد ڈرائینگ روم کے دروازے سے اندر آئے۔ دونوں نے ہتھیار پہلے سے تانے ہوئے تھے۔ میں فوراً منہ کے بل گرا۔ ان کے ہتھیار ایک ساتھ گرجے گولیاں میرے اوپر سے گزری تھیں۔ بلاشبہ میں بال بال بچا تھا، لیکن دشمن کی گولیاں رائیگاں نہیں گئی تھیں۔ میرے کانوں میں دیپک کی زوردار کراہ پہنچی، یقیناً وہ بھی میری تقلید میں باہر نکل رہا تھا۔

میں نے لیٹے لیٹے پستول سیدھا کیا، دونوں دشمن اگلا چھٹا فائر کرنے کی حسرت لیے منہ کے بل گر گئے تھے۔

ڈینو کی حالت دیکھ کر مجھے نہیں لگتا تھا کہ اسے مدد کی ضرورت تھی۔ یقیناً اس کے سانس پورے ہو چکے تھے۔ وطن کی حفاظت کی قسم کھانے والے کے نصیب میں وطن کی مٹی بھی نہیں لکھی تھی۔

میں پیچھے مڑا، میرے دوسرے ساتھی نے بھی ڈینو کی تقلید کرنا پسند کیا تھا، دو چھٹے چہرے سے ٹکرا کر اسے ناقابل شناخت بنا چکے تھے۔ ایک ساتھ چھے گولیوں نے بے چارے کو تڑپنے کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ میں ایک لمحے کو ساکن ہوا، موجود صورت حال سے نکلنے کو دماغ کے گھوڑے دوڑائے، یقیناً جان بچانے کو ہتھیار ڈالنا ضروری ہو گیا تھا۔ انڈین کمانڈوز نے مکان کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ اور ایک پستول کے سہارے میں تربیت یافتہ کمانڈوز کا گھیرا توڑ کر بھاگ نہیں سکتا تھا۔

کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے اچانک دھماکا ہوا، میں نے فوراً خود کو نیچے گرایا، مگر اس سے پہلے ہی میری دائیں ران میں گرم سیسہ گھس کے دوسرے جانب نکل گیا تھا۔ گولی لگتے وقت درد یا تکلیف کا احساس بالکل بھی نہیں ہوتا، لیکن اس کے بعد ہر گزرتے لمحے زخم پھوڑے کی شکل اختیار کرتا جاتا ہے۔

فائر کرنے والے کا احسان تھا کہ اس نے کھوپڑی، گردن اور پیٹھ کے بجائے ران میں گولی ماری تھی۔ شاید اس کا ارادہ مجھے زندہ پکڑنے کا تھا۔ اور اللہ پاک کی منشا کے مطابق میرے چند سانس بقایا تھے، ورنہ میرا حشر اللہ ڈینو اور دیپک سے مختلف نہ ہوتا۔

نیچے گرتے ہی میں فوراً سیدھا ہوا دشمن نے چوکنے انداز میں رائفل تانی ہوئی تھی۔ میرے سیدھا ہوتے ہی اس نے رائفل ہلا کر مجھے دھمکانے کی کوشش کی، مگر اس کے ہونٹوں سے دھمکی نکلنے سے پہلے میرا پستول گولی اگل چکا تھا۔ میرا اسے زندہ پکڑنے کا ارادہ نہیں تھا کہ کھوپڑی کو نشانہ نہ بناتا۔ اور سنائپر اتنے قریب سے نشانہ خطا نہیں کرتا۔

گولی ماتھے میں لگی تھی۔اس کے نیچے گرتے ہی میں لمحے کے بیسویں حصے میں ایک فیصلے پر پہنچا۔''والتھر پی ٹونی ٹو'' کا دستہ میں نے دیپک کے دائیں ہاتھ میں پکڑایا، بیڈ پر اس کی گدڑی اور لمبے بالوں والی وگ پڑی تھی۔گدڑی کا اندرونی کپڑا پھاڑ کر میں نے سرعت سے پھوڑا اپنی ران پر کس کر لپیٹا تا کہ خون کا اخراج رک سکے۔ابتدائی طبی امداد کا پہلا اصول خون کے بہاؤ کو روکنا ہوتا ہے۔اکثر زخمی صرف خون ضائع ہونے سے ہلاک ہو جاتے ہیں ورنہ ان کے زخم بہ ذات خود جان لیوا نہیں ہوتے۔دیپک کے بالوں کی وگ اور گدڑی بیڈ کے نیچے پھینک کر خود بھی بیڈ کے نیچے کھسک گیا۔مکان کے باہر دوڑتے قدموں کی آوازیں اور احتیاط سے اندر گھسنے کی ہدایات گونج رہی تھیں۔مرنے والوں کے کانوں میں وائرلیس سیٹ کے ہینڈفری لگے ہوئے تھے اس لیے وائرلیس کی بلند آواز نہیں ابھر رہی تھی۔اور اپنے ساتھیوں کی خاموشی کی وجہ ہی سے وہ اندر گھسنے میں احتیاط برت رہے تھے۔ان کا محتاط پن ہی مجھے چند لمحوں کی مہلت دے گیا تھا اور میں بیڈ کے نیچے گھس گیا۔گو یہ جواء ہی تھا مگر اس وقت جواء کھیلنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں بچا تھا۔ڈینو جلد بازی اور جوش میں حالات کو اس نہج تک لے آیا تھا ورنہ میں گرفتاری دینے پر تیار ہو جاتا۔

میرے اندازے کے مطابق ان کی نظر میں ہم صرف دو تھے۔اور دو لاشیں ملنے کے بعد انھیں تیسرے کی تلاش کی ضرورت باقی نہیں ہونا چاہیے تھی۔خوش قسمتی سے جن افراد نے کمرے میں تین افراد کو دیکھا تھا وہ تمام ہلاک ہو چکے تھے۔باہر والوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اندر دشمنوں کی تعداد کتنی ہے۔جو ہمارے صورت آشنا تھے انھیں بھی دیپک کو دیکھ کر کوئی شک نہیں ہو سکتا تھا کیوں کہ اس کا چہرہ نا قابل شناخت ہو چکا تھا۔اس کے چہرے کو پہچاننے اور اس پر واری قربان ہونے والی نگاہیں کہیں دور پاکستان میں تھیں۔وہاں تو بس نفرت، حقارت اور ناپسندیدگی سے دیکھنے والی آنکھیں تھیں جن کی نظر میں اس کا وجود دھرتی کا بوجھ تھا۔یقیناً نفرت و محبت کا تعلق پہچان و واسطے سے ہے، صورت و کردار کے تعین سے نہیں۔

کمانڈوز کے طریقہ کار میں ہمیشہ ایسے کمرے کی تلاشی لینے کو جس میں دشمن کی موجودی یقینی ہو دستی بم (ہینڈ گرنیڈ) اندر پھینک کر رائفل کی چند گولیاں فائر کرتے ہیں تا کہ کوئی دستی بم کو اٹھا کر واپس نہ پھینک سکے۔(پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ دستی بم پن نکلنے کے تین سے چار سیکنڈ بعد پھٹتا ہے) لیکن ایسا تب کیا جاتا ہے جب دشمن کے چوکنا ہونے کا یقین ہو۔ہمیں انھوں نے بے خبری میں چھاپنے کی کوشش کی تھی جو کامیاب نہیں ہو پائی تھی۔اور اب وہ دستی بم پھینکنے کی حالت میں نہیں تھے کہ خود ان کے ساتھی اندر موجود تھے۔گو ساتھیوں کی طرف سے خاموشی چھا جانا، ساتھیوں کے ضائع ہونے کو ظاہر کرتا ہے، مگر ان کے بے ہوش ہونے کا امکان بھی نظر انداز نہیں کیا سکتا تھا۔اور وہ اسی امید پر دستی بم نہیں پھینک رہے تھے۔

''تم چاروں طرف سے گھیرے میں آ چکے ہو۔جان بچانا ہے تو ہتھیار پھینک دو۔''

اوندھے منہ لیٹ کر میں نے سر قالین پر ٹیکا ہوا تھا۔بھورے رنگ کے قالین پر خون کی سرخی واضح نظر آ رہی تھی۔لیکن اندازہ تھا کہ میرے خون کو بھی دیپک کا خون سمجھا جا سکتا تھا۔

دشمن نے زیادہ دیر انتظار نہیں کیا تھا۔ڈرائینگ روم کا دروازہ خواب گاہ کے دروازے سے ذرا تر چھا تھا۔تبھی دشمن کا داخلہ میری نظر سے اوجھل رہا۔چند لمحوں بعد دو پاؤں میری نظروں کے سامنے طلوع ہوئے اور ایک دم کمرے کے سامنے سے گزر کر دروازے کے دائیں جانب چھپ گئے۔دروازے کی بائیں جانب بھی کسی نہ کسی کو موجود ہونا چاہیے تھا۔لمحہ بھر بعد وہ دھاڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے.....

''خبردار.....ہاتھ اوپر.....حرکت نہیں۔'' جیسے فقرے با آواز بلند کہتے ہوئے انھوں نے متوقع دشمن پر رعب

ڈالا، مگر اندر انھیں اپنے ساتھی اور دیپک کی لاش کے علاوہ انھیں کچھ نہیں ملا تھا۔ دو آدمی سرعت سے غسل خانے کے دروازے تک گئے، مگر ناکام لوٹے تھے۔

''کلیئر..... کلیئر..... کلیئر.....'' وقفے وقفے سے تین مختلف آوازوں نے سب اچھا پیش کیا۔ میں دم سادھے لیٹا رہا۔

دو بوٹ میرے چہرے سے دو تین فٹ کی دوری پر آ کر رکے۔ میرے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی تھی، مگر خیریت گزری اور اس نے نیچے جھانکنے سے گریز کیا تھا۔

ان کا سرغنہ وائرلیس سیٹ پر ''سب اچھا'' دے رہا تھا۔ ''دو گھس بیٹھے ہلاک کر دیئے ہیں۔ اپنے سات ساتھی شہید ہوئے ہیں۔'' مسلمانوں کی نقل میں اب غیر مسلم اقوام بھی وطن کی خاطر لڑ کر مرنے والوں کو شہید کہنے لگے ہیں۔

ایک اور آواز ابھری۔ ''کچرادان (ڈسٹ بن) میں دو موبائل پڑے ہیں۔''

سینئر نے انھیں خبردار کیا۔ ''کرن چاولہ صاحب یہیں آ رہے ہیں، ان کی آمد تک لاشوں سے چھیڑ خانی نہیں ہوگی۔''

ایک آدمی رو دینے والے انداز میں بولا۔ ''مارے گئے، وہ تو بہت بے عزت کریں گے۔''

وہ آپس میں گفتگو کرتے ہوئے ڈرائینگ روم کی طرف بڑھ گئے تھے۔

کرن چاولہ کا نام میں نے سلطان دادا کے آدمی اور پھر دیپک سے بھی سنا تھا۔ یقیناً را کا خصوصی کارندہ تھا۔ جبھی تو کمانڈوز بھی اس کے نام سے گھبرا رہے تھے۔

ڈرائینگ روم سے ان کی گفتگو کی آواز گونجتی رہی۔ دیپک اور ڈینو کو کوستے ہوئے وہ اپنے مرنے والے ساتھیوں پر اظہار افسوس کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ کرن چاولہ کے سوالوں کے جواب تیار کر رہے تھے کہ کس طرح دو دہشت گردان کے ساتھ کمانڈوز کا کام تمام کر گئے تھے۔

میری ران میں شدید درد ہو رہا تھا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ گولی نے ہڈی نہیں توڑی تھی۔ اور ران کے کنارے کے گوشت کو چھیدتی ہوئی باہر بھی نکل گئی تھی۔ پٹی کو چھونے پر مجھے ہلکی چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ خون ہلکا ہلکا رس رہا تھا۔ میں عجیب حالات میں پھنس گیا تھا۔ اللہ ڈینو کی جدائی کو دماغ اب تک ہضم نہیں کر پایا تھا۔ اس کے ساتھ رشتہ نیا سہی مگر وہ ایک مخلص اور کارآمد ساتھی تھا۔ دلیر، نڈر اور پہل کرنے والا۔ دیپک انجان سہی مگر سچا خیر خواہ تھا۔ یقیناً اس کی وجہ سے ہمیں کافی سہولتیں میسر ہوتیں، لیکن شومئی قسمت کہ تعلقات کے آغاز کے ساتھ دو چھوڑے کی صدا گونج اٹھی تھی۔

ان کی گفتگو سے بے نیاز میں آگے کا سوچنے لگا۔ پہلا مرحلہ تو جان بچانے کا تھا۔ نامعلوم کرن چاولہ کی آمد کیا گل کھلانے والی تھی۔ ممکن تھا وہ بیڈ کے نیچے جھانکنے پر مصر ہوتا۔ اور ایسا ہونے کی صورت میری گرفتاری یقینی تھی۔ اس کے بعد کیا ہونا تھا یہ سوچنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔

سنائپر جتنا بھی سخت جان ہو ایک حد تک تکلیف برداشت کر سکتا ہے۔ اور انڈین عقوبت خانے میں پھنسنا کسی بھی پاکستان جاسوس کی اخیر درجے کی بدقسمتی کہلاتی ہے۔ انڈین ایجنسیوں کے پاس تشدد کے وہ طریقے اور حربے ہیں کہ قدم زمانے کا غیر انسانی تشدد بھی اس کے سامنے ہیچ نظر آتا ہے۔

مگر کہتے ہیں پانی میں گھسنے والے کو گیلا ہونے سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ میں نے بھی انصاری صاحب کو ہامی بھرتے وقت بدترین حالات کو مدنظر رکھا تھا۔ دشمن ملک میں گھسنے والا ہر جاسوس اس دن کے لیے ذہنی طور پر تیار رہتا ہے۔

اچانک ڈرائنگ روم میں ہلچل مچی۔ میں اس طرف متوجہ ہوا۔ معلوم ہوا کرن چاولہ پہنچ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک گمبھیر آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ بولنے والا پراعتماد و پررعب لگ رہا تھا۔ اپنے ساتھ آدمیوں کی لاشیں دیکھ کر اس نے اظہار برہمی کیا تھا لیکن اس کی درشتی میں حوصلہ و متانت چھپی تھی۔ وہ سرغنہ کے منصوبے میں پیشہ ورانہ غلطیاں اور کمیاں

اجاگر کرنے لگا۔

''محاصرے میں آئے دو دہشت گردوں سے اپنے سات کمانڈوز مروا کر انھیں ہلاک کر دینا نالائقی، کمزوری اور کس درجے کی حماقت ہے۔ اگر لڑنے کی صلاحیت نہیں تھی تو دستی بم استعمال کرتے، آنسو گیس کام میں لاتے۔ راکٹ لانچر سے حملہ کرتے، مگر اپنے آدمیوں کی بلی نہ دیتے۔ سات آدمی مروا کر تو کوئی اناڑی بھی دو آدمیوں کو قتل کر سکتے تھے۔ تم کیسے کمانڈو ہو۔ اگر دشمن کو زندہ پکڑا ہوتا پھر بھی کوئی بہانہ تو موجود ہوتا کہ انھیں زندہ پکڑتے ہوئے اپنے آدمی قتل ہوئے ہیں۔'' اس نے لمحہ بھر کو توقف کیا تبھی حملہ آوروں کے سرغنہ نے صفائی دینے کو منہ کھولا۔

''سر! ہم انھیں غافل سمجھنے کی غلطی کر بیٹھے۔ مگر وہ جوابی کارروائی کو مکمل تیار تھے۔''

''لچر بہانے بازی سے پرہیز کرو سوراج!..... کیا بھارتی کمانڈوز صرف سوئے ہوئے دشمنوں ہی پر کاری وار کر سکے ہیں۔'' کرن چاولہ برہم ہوا۔ ''اگر وہ ہوشیار تھے تو تم بھی غنودگی میں نہیں تھے۔''

سوراج نے ندامت ظاہر کی۔ ''سوری سر۔''

کرن چاولہ نے درشتی سے کہا۔ ''من کرتا ہے تمھارے بچ جانے والے ساتھیوں کو بھی مرنے والوں کے پاس بھجوا دوں۔''

سوراج کے پاس جواب ختم ہو گئے تھے۔ کسی اور کی بھی آواز نہیں ابھری تھی۔ کرن چاولہ کا عہدہ مجھے معلوم نہیں تھا، مگر انداز سے آفیسر لگ رہا تھا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کرن چاولہ کی آواز ابھری، لہجہ بدلا ہوا تھا۔ یقیناً اس نے غصے پر قابو پا لیا تھا۔ ''یہ چار لاشیں دیکھو، ہر ایک کے سر میں گولی ماری گئی ہے۔ اسے کہتے ہیں پیشہ ورانہ مہارت۔'' وہ لاشیں دیکھتا ہوا اندر گھسا۔ ''اس کے بھی سر میں گولی لگی ہے۔ اور یہ اس کا کام ہے۔'' وہ دیپک کی لاش کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ ''اس نے تمھارے کمانڈوز پر خالی ہاتھ حملہ کیا۔'' کرن چاولہ نے ڈینو کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور اس نے تیز رفتاری اور درستی سے فائر کرتے ہوئے اپنے ساتھی کی مدد کی۔ مگر سمجھ میں نہیں آ رہا اسے کیسے گولیاں لگیں.....؟'' کرن چاولہ نے عمدہ تجزیہ کرتے ہوئے الجھن ظاہر کی۔ میرے دل کی دھڑکن ایک دم بڑھ گئی تھی۔ کرن چاولہ نہایت منجھا ہوا اور شاطر دشمن لگ رہا تھا۔ بعید نہیں تھا کہ وہ تیسرے دشمن کی موجودی کا اندازہ کر لیتا۔

لیکن اس سے پہلے کہ میرے اندیشے حقیقت کا روپ دھارتے غیبی مدد آ پہنچی ایک بے وقوف بولا۔ ''سر! اسے میں نے چھلنی کیا ہے، میں سنتوش کے عقب میں تھا، جونہی اسے گولی لگی میں نے فائر کھول دیا۔ دشمن کے نیچے گرتے ہی احتیاطاً باہر نکل گیا کہ مجھے اور دشمن کی موجودی کا خدشہ تھا۔'' اس نے شاید کرن چاولہ سے شاباش چاہنے کی غرض سے جھوٹ بولا تھا۔

کرن چاولہ معترض ہوا۔ ''اس کے چہرے پر دو چھید لگے ہیں۔ اور ایک رائفل سے چلائے ہوئے دو چھید ایک شخص کو کیسے لگ سکتے ہیں؟ اصولاً اسے پہلے چھید کے ساتھ گر جانا چاہیے تھا۔''

نئی آواز ابھری۔ ''میں بھی موہن کے ساتھ تھا، ہم نے اکٹھے فائر کیا تھا۔''

''کمروں کی مکمل تلاشی لے لی تھی۔'' کرن چاولہ کے بوٹ بیڈ کے نزدیک آ کر رکے۔

سوراج پرجوش لہجے میں بولا۔ ''جی سر! باریک بینی سے دیکھ چکے ہیں۔ کوڑا کرکٹ کی ٹوکری سے دو موبائل ملے ہیں، اس کی جیب سے بھی دو پستول برآمد ہوئے ہیں۔'' یقیناً اس نے دیپک کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ''اور کوئی قابل ذکر چیز نہیں ملی، غسل خانے اور ڈریسنگ روم کی تلاشی لے لی تھی۔''

''یہ تینوں پستول ہمارے آدمیوں سے چھینے ہوئے ہیں۔'' کرن چاولہ پستولوں کو پہچان گیا تھا۔

''بالکل سر۔'' سوراج نے پرزور انداز میں تائید کی تھی۔

''لاشیں پوسٹ مارٹم کو بھجوا دو اور کرنل صاحب کے لیے تحریری رپورٹ تیار کر دو۔'' اختتامی ہدایات دیتے ہوئے کرن چاولہ کے قدم واپسی کو مڑ گئے۔

سوراج نے ایڑیاں بجا کر ''جے ہند۔'' کہا۔ اور کرن چاولہ کے غائب ہوتے ہی وہ موہن اور اس کے ساتھی کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم دونوں نے غلط بیانی کیوں کی؟''

موہن نے کہا۔ ''سوچا شاید چاولہ صاحب کی شاباش سننے کو مل جائے، مگر حسرت ہی رہی۔ کسی کو سراہنے میں موصوف اتنے ہی کنجوس ہیں جتنے پردھان منتری فوجیوں کی تنخواہ بڑھانے میں۔''

سوراج نے مطعون کیا۔ ''تم جانتے نہیں چاولہ صاحب کتنے باریک بین اور ہوشیار ہیں، اگر جھوٹ پکڑ لیتے تو کتوں والی ہو جاتی تھی۔''

موہن بے نیازی سے بولا۔ ''وہ تو پہلے ہی ہو چکی تھی۔''

''بہ ہر حال آئندہ خیال رکھنا، فضول کی چالاکیاں مجھے پسند نہیں ہیں۔'' سوراج نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اب اپنے ساتھیوں کی لاشیں اٹھاؤ۔''

تمام انتظامی امور میں لگ گئے۔ گھنٹے بھر میں تمام لاشیں لے گئے تھے۔ اس دوران میں دم سادھے لیٹا رہا۔ زخم میں درد جیسے رچ بس گیا تھا۔ مجھے مناسب طبی امداد کی سخت ضرورت تھی، لیکن یہ عیاشی فی الوقت میری قسمت میں نہیں تھی۔ بلکہ اس وقت تو مجھے کراہنے اور درد کے اظہار کی سہولت بھی میسر نہیں تھی۔ میں دانت بھینچے بے تحاشا تکلیف کو برداشت کرنے کی سعی کرتا رہا۔

کمرہ دشمنوں کے وجود سے خالی ہونے کے بعد میں نے موبائل پر وقت دیکھا، صبح کے پانچ بج چکے تھے۔ نجانے وہ کسی کو نگرانی پر مامور کر گئے تھے یا نہیں اس کی تصدیق کرنا آسان نہیں تھا۔ ٹانگ زخمی ہونے کی وجہ میں تیز رفتاری سے حرکت نہیں کر سکتا تھا اور ایسی حالت میں محفوظ کمین گاہ سے نکلنا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ جب تک مجھے خطرہ ٹلنے کا یقین نہ ہو جاتا خواب گاہ سے نکلنا بے وقوفی ہوتی۔ درد میرے لیے نیا تھا، نہ تکلیف انجانی تھی اور نہ بھوک پیاس یا بے آرامی اچھوتی تھی۔ میں بیڈ کے نیچے دبکا رہا۔

کمرے کی روشنی وہ جلتی چھوڑ گئے تھے۔ گھنٹے ڈیڑھ بعد سورج کی روشنی بھی محسوس ہونے لگی۔ گولی میری دائیں ران میں لگی تھی، مگر درد پوری ٹانگ میں محسوس ہو رہا تھا۔ گدڑی سر کے نیچے رکھ کر میں چت لیٹ گیا اور گہرے سانس لیتے ہوئے خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بیت الخلاء میں جانے کی حاجت بھی ہو رہی تھی۔ لیکن احتیاط، تقاضے کی راہ میں رکاوٹ بنی رہی۔ دوپہر تک فطری تقاضا برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ میں بیڈ کے نیچے ہی حاجت پوری کر لیتا مگر انسانی فضلے کی بدبو کسی بھی اندر آنے والے کو فوراً متوجہ کر دیتی۔ مجبوراً مجھے بیڈ کے نیچے سے نکلنے کا خطرہ مول لینا پڑا۔

میں کھسک کر باہر نکلا، اٹھنے کی کوشش پر منہ سے چیخ نکلتے رہ گئی تھی۔ بے ساختہ کراہ تو زبردستی ہونٹوں سے پھسل گئی تھی۔ زخم میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ چند لمحے میں ٹانگ لمبی کیے بیٹھا رہا اور پھر بائیں ٹانگ پر زور دے کر کھڑا ہو گیا۔ چلنے کو سہارے کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ دائیں ٹانگ پر بالکل زور نہیں دے پا رہا تھا۔ جب ایک انچ بھی آگے سرکنے میں ناکامی ہوئی تو دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر میں جھکے جھکے کھڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔

انسان بھی کتنا بے بس، کمزور اور ضعیف ہے۔ ذرا سی تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔ اور دعوے اتنے بلند بانگ کہ آسمان کو چھو لے، اکڑ جیسے پہاڑ اکھیڑ پھینکے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ طاقت وقوت کا مالک تو بس ایک ہی ہے۔ جو ہاتھی کو چیونٹی سے زیادہ بے بس کردے، شیر کو کیچوا بنادے، صحت مند کو اپاہج ومعذور کردے، شہ زور کو کمزور کردے۔ اور وہ جو چاہے کرسکتا ہے۔ یقیناً ساری بڑائیاں، بلندیاں، عزتیں، طاقتیں اسی ذات کے قبضہ قدرت میں ہیں۔

کھڑکی کے پاس پہنچ کر میں دیوار کے سہارے اٹھا، پردے لوہے کے پائپ میں پروئے گئے تھے۔ پردے کو کھینچ کر میں نے پائپ کو پردے سے باہر نکال لیا۔ جیب سے چھوٹا چاقو نکال کر میں نے پردے سے ایک چوڑی پٹی کاٹی کہ حرکت کرنے سے زخم سے خون رسنے لگا تھا۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ پورے کمرے میں خون کے قطرے پھیل جائیں۔ پٹی ران پر لپیٹی، پردے کو تہہ دے کر میں نے کھڑکی کے کنارے ہی پر رکھا اور لوہے کے پائپ کے سہارے بیت الخلاء کی طرف بڑھ گیا۔ خواب گاہ کا ملحقہ غسل خانہ (اٹیچ باتھ روم) میرے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا تھا۔ تازہ دم ہوکر میں باہر نکل آیا۔ تھوڑی بہت حرکت کرنے سے تکلیف تو کم نہیں ہوئی تھی، البتہ درد برداشت کرنے کی اہلیت بڑھ گئی تھی۔ صبح سے وہاں کسی شخص کی آمد نہیں ہوئی تھی۔ اور مجھے سخت بھوک محسوس ہورہی تھی۔ دل کیا وہاں سے نکل جاؤں، مگر سنائپر بھوک کے ہاتھوں ایک دن میں اتنا بے بس نہیں ہوجاتا کہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے۔ میں نے رات ہونے کا انتظار کرنا ضروری سمجھا کہ اندھیرا کافی غلطیوں کو ڈھانپ لیتا ہے۔

کمرے کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لے کر میں دوبارہ بیڈ کے نیچے گھس گیا۔ اور اندھیرا چھانے تک درد سے لڑتا رہا۔ کمرے کی بتی روشن تھی اس وجہ سے مجھے رات ہونے کا اندازہ موبائل فون پر وقت دیکھ کر ہوا تھا۔ اس دوران کمرے میں کسی کی آمد نہ ہوئی۔ یہ دیکھ کر میرا اطمینان مزید بڑھ گیا تھا۔ نو بجنے کو تھے جب میں بیڈ کے نیچے سے نکلا۔ گڈری کو بیڈ کے نیچے ہی چھوڑ دیا کہ وہاں پہلے بھی کسی نے نہیں جھانکا تھا۔ یوں بھی اگر بیڈ کو ہٹایا جاتا تو میرے خون کے داغ ظاہر کردیتے کہ وہاں کوئی چھپا رہا تھا۔ البتہ غالب گمان یہی تھا کہ وہاں اب ایجنسی کے کسی بندے کا آنا محال تھا۔ کیوں کہ ان کے تئیں ہدف ہلاک کرکے وہ مقصد پورا کرچکے تھے۔ اب گھر کے مکین ہی نے آکر مکان سنبھالنا تھا۔

جاتے ہوئے انھوں نے روشنی بجھانے کی زحمت کی تھی نہ کسی کمرے کے دروازے کو بند کرنا گوارا کیا تھا۔ صرف گھر کے داخلی دروازے کو قفل کرنے پر اکتفا کیا تھا۔ وہاں ڈھونڈنے پر یقیناً کچھ نہ کچھ کھانے کو مل جاتا۔ اور کچھ نہیں تو خشک راشن تو ضرور مل جاتا۔ مگر کسی کی آمد کے امکان کو رد نہیں کیا سکتا تھا۔ اور میری حالت ایسی تھی کہ صحیح طریقے سے چل نہیں سکتا تھا تو جان چھڑا کر بھاگتا کیسے۔ پائپ کے سہارے چلتا ہوا میں صحن میں پہنچا۔ داخلی سے نکلنا مجھے مناسب معلوم نہیں ہوا تھا۔

نظریں گھما کر میں نے صحن کا جائزہ لیا اور داہنی دیوار کی طرف بڑھ گیا جہاں لوہے کے فریموں میں گملے رکھے ہوئے تھے۔ ان فریموں کی شکل ریک نما تھی۔ ہر فریم کے تین خانے تھے اور ہر خانے میں چار گملے سجے ہوئے تھے۔ ان فریموں کی مدد سے میں آسانی سے دیوار عبور کرسکتا تھا۔ اگر زخمی نہ ہوتا تو ایسے سہارے ڈھونڈنے کی کبھی ضرورت نہ پڑتی، مگر تب میری ران پھوڑا بنی ہوئی تھی۔ اور دیوار چڑھنا تو کجا مجھے ہموار زمین پر چلنے میں سخت دقت ہورہی تھی۔

ایک فریم کے قریب ہوکر میں پائپ کی مدد سے کوشش کرکے فریم کے تیسرے خانے پر پہنچ گیا۔ اس مشقت میں پاؤں کے بجائے میں نے ہاتھوں کا زیادہ استعمال کیا تھا۔ دیوار کے سرے پر چڑھنے تک مجھے واقعی پسینہ آگیا تھا۔ دیوار کی اونچائی بہ مشکل آٹھ فٹ ہوگی جو میرے لیے ناقابل عبور بن گئی تھی۔ ورنہ دوران تربیت نو فٹ کی دیوار ہم بھاگتے ہوئے سر کرتے تھے۔ آرمی کی مختلف تربیتوں میں اسالٹ کورس بھی شامل ہے جسے آپ رکاوٹوں بھری دوڑ کہہ سکتے

ہیں۔ایک میل کی حدود میں مختلف رکاوٹیں بنائی جاتی ہیں جنھیں چھوٹے جھولے اور ہتھیار کے ساتھ بھاگ کر عبور کرنا پڑتا ہے۔اختتام پر ہدف پر پانچ گولیاں بھی فائر کی جاتی ہیں۔

دیوار کے اوپر لیٹ کر میں نے دوسری جانب جھانکا۔ایک مختصر صحن نظر آیا۔برآمدے میں بلب روشن تھا جس کی پیلی روشنی صحن کا اندھیرا دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ خطرہ کتے سے تھا۔گھر میں کتا ہونے کی صورت میں میں صحن میں اترتے ہی پکڑا جاتا۔مگر تھوڑی دیر انتظار کے باوجود جب کتے کے آثار نہ دکھے تو میں نے پائپ دیوار کے ساتھ کھڑا کیا اور ہاتھوں کے بل لٹک گیا۔یوں میرے پاؤں کا زمین سے فاصلہ چار پانچ انچ سے زیادہ نہیں رہا تھا۔زخمی ٹانگ کو ہلکا سا سمیٹتے ہوئے میں بائیں پاؤں پر کود گیا۔اوپر سنبھال کے رکھنے کے باوجود داہنی ٹانگ کو زوردار جھٹکا لگا تھا۔بڑی مشکل سے میں نے درد بھری کراہ کو ہونٹوں میں دبایا تھا۔

چند لمحے دیوار پر سر ٹیکے کھڑا رہا۔درد میں افاقہ ہوتے ہی میں پائپ کے سہارے اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔پچھلا مکان متمول شخص کا تھا،لیکن وہ مکان کسی سفید پوش کا دکھائی دے رہا تھا۔مکان کی بناوٹ ایسی نہیں تھی کہ گھوم کر عقبی جانب سے جائزہ لیا جا سکتا۔کمروں کی دیواریں مکان کی چار دیواری کا حصہ تھیں،اس لیے کمروں کا عقبی حصہ گلی میں آ رہا تھا۔

صحن میں گاڑی وغیرہ کا نہ ہونا مکین کی مفلسی کے ساتھ میری بے بسی کا بھی مظہر تھا۔کیوں کہ کار کی مدد سے وہاں سے نکلا جا سکتا تھا۔

برآمدے کے سامنے پہنچتے ہی میں شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔گھر والوں کو دھمکانے کو میرے پاس ہتھیار بھی موجود نہیں تھا،اگر مکین مجھے پولیس کے حوالے کرنے پر تل جاتے تو میرا جان چھڑانا ناممکن ہو جاتا۔یوں گھر میں داخلے کا میرے پاس ایک ہی جواز تھا کہ میں اپنے مجرم ہونے کا اعتراف کر لیتا۔یقیناً مکین گزشتہ شب،ساتھ والے مکان میں ہونے والی فائرنگ سے محظوظ ہو چکے تھے اور اب ایک زخمی کو گھر کے صحن میں دیکھ کر انھیں میرے بارے اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہ ہوتی۔

کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے دروازہ کھلا۔میرے پاس پیچھے ہٹنے کی مہلت نہیں تھی۔

''کون ہے؟'' ایک نسوانی آواز ابھری اگلے ہی لمحے تیس بتیس سال کی قبول صورت خاتون باہر نکلی۔آنکھوں پر سیاہ چشمہ اور ہاتھ میں چھڑی پکڑے ہونا اس کے نابینا ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔

میں خاموش کھڑا رہا۔

وہ اعتماد سے بولی۔''جواب کیوں نہیں دے رہے،میں محسوس کر سکتی ہوں۔تمھارے پاؤں کی آہٹ ہی مجھے باہر لائی ہے۔''

میں خاموش ہی رہا۔

اس کی طنزیہ ہنسی ابھری۔''ایک اندھی محتاج کے پاس تمھیں کیا ملے گا؟''

میں نے خاموشی توڑی۔''دو نوالے روٹی تو مل ہی جائے گی۔''

''تم تکلیف میں ہو۔''اس کا اندازہ مجھے حیران کر گیا تھا۔

''کیسے پتا چلا؟''میں حیرانی نہیں چھپا سکا تھا۔

''دیکھ نہیں سکتی،محسوس تو کر سکتی ہوں۔تمھاری آواز میں درد چھپا ہے۔''

میں نے اقرار کیا۔''زخمی ہوں۔''

وہ متبسم ہوئی۔ ''شاید یہ کل کی لنج کا پھل ہے۔''

''آپ کو جھٹلا نہیں سکتا۔''

وہ رکھائی سے بولی۔ ''کسی مجرم کو زیب نہیں دیتا کہ ایک معذور کو جوکھم میں ڈالے۔''

میں بے چارگی سے بولا۔ ''تھوڑا سا کھانا اور زخم کی مرہم پٹی کرنے پر شاید آپ کو زیادہ تکلیف نہ پہنچے۔''

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولی۔ ''اس کی کیا دلیل کہ مزید بوجھ نہیں ڈالا جائے گا۔ یوں بھی ایک مرد شکم سیر ہونے کے بعد اکیلی عورت کے لیے زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔''

''کیسے یقین دلا سکتا ہوں؟''

وہ اطمینان سے بولی۔ ''جو عملی تجربات سے گزر چکی ہو اسے چکنی چپڑی باتوں پر یقین نہیں آ سکتا۔''

جی چاہا پوچھوں کہ ''میرے زبردستی گھر میں گھسنے پر کیسے روکو گی۔'' مگر پھر اس کی مظلومیت پر ترس آ گیا۔ ایک جوان اندھی عورت کو مرد سے جو خطرہ ہو سکتا تھا اس نے کھل کر اظہار کر دیا تھا۔ اور اس کے پس پردہ آج کے مرد کا کردار ہے۔ یقیناً سارے مرد ایسے نہیں ہوتے، مگر حکم اکثریت کے مزاج پر لگایا جائے گا۔ اس بے چاری کا بھی کسی جنسی درندے سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا اسے یہ تجربہ ایک سے زیادہ بار ہو چکا ہو، تبھی وہ کسی مرد پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا مجھے اندر آنے کی اجازت نہیں دو گی۔''

وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔ ''بالکل نہیں دوں گی۔''

میں کہیں اور جانے کی حالت میں نہیں تھا، مگر ایک سہمی ہوئی عورت کی مرضی کے خلاف اس کے گھر میں گھسنا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ ورنہ اس کے پاس مجھے روکنے کی طاقت نہیں تھی۔

''معافی چاہتا ہوں آپ کو زحمت دی۔'' میں بیرونی دروازے کی طرف بڑھا کہ اب کوئی اور دیوار عبور کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ کافی دیر رکنے کے بعد قدم آگے بڑھاتے ہوئے میرے ہونٹوں سے ہلکی آواز میں۔ ''سی.....'' برآمد ہوا تھا۔ ہونٹ بھینچ کر میں نے کراہوں کا گلا گھونٹا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

''ٹھہریں۔'' اس کی اضطراری آواز گونجی۔ ''شاید آپ زیادہ زخمی ہیں۔'' لہجہ کافی بدلا ہوا تھا۔

وہ غیرت دکھانے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ میں رک گیا۔

''آ جائیں، کسی مجبور کو در سے دھتکارنا مناسب نہ ہوگا۔ اور بنتی کرتی ہوں وقت آنے پر تم بھی ترس کھا لینا۔'' اس کی خوف میں لپٹی ہمدردی نے مجھے ششدر کر دیا تھا۔ میری مدد کرنے سے پہلے وہ میرے شر سے پناہ مانگ رہی تھی۔ نجانے کون سے درندہ صفت مرد تھے جنھوں نے اس مظلوم کو مرد ذات سے اتنا متنفر کر دیا تھا۔ مگر وہ وقت استفسار یا اس کی کہانی سننے کا نہیں تھا۔ ٹانگ کی تکلیف میں کمی یا ٹھہراؤ کے بجائے اضافہ ہو رہا تھا۔ جب تک زخم صاف کر کے مناسب مرہم پٹی نہ ہوتی اور درد کش گولیاں نہ ملتیں یہ حالت برقرار رہنا تھی۔ ایسے زخم جن کی بروقت دیکھ بھال نہ کی جائے بعض اوقات ناسور بن جاتے ہیں۔ ایسا ہونے پر ٹانگ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔

میں زبانی کلامی وعدے کے بجائے عملی نمونہ پیش کر کے اس کے دل سے کم از کم یہ غلط فہمی دور کر سکتا تھا کہ سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ میں خاموشی سے اس کی طرف بڑھ گیا۔ ایک طرف ہو کر اس نے مجھے داخل ہونے کا رستہ دیا۔

ایک کھلا کمرہ تھا، جس کے دائیں بائیں دو اور کمروں کے دروازے تھے جبکہ عقبی جانب باورچی خانہ نظر آ رہا تھا۔ کمرے میں رکھا پرانا صوفہ سیٹ، چند کرسیاں اور دو میزیں اسے ڈرائینگ روم ظاہر کر رہی تھیں۔ میں نے بیٹھنے کو پلاسٹک کی کرسی کو ترجیح دی تھی کیوں کہ صوفہ زخمی ٹانگ کے خون سے داغ دار ہو سکتا تھا۔

''صوفے پر بیٹھیں ناں۔'' میرے نشست سنبھالنے سے اسے اندازہ ہو گیا تھا۔اس کے سننے کی حس غضب کی تھی۔اللہ پاک جس سے کوئی نعمت لیتا ہے تو بدلے میں دوسری حس میں ناقابل بیان اضافہ ہو جاتا ہے۔

میں نے وضاحت کی۔''زخمی ٹانگ سے خون رس رہا ہے،صوفہ گندا ہو جائے گا۔''

''میں طبی امداد کا سامان لاتی ہوں۔'' وہ بغلی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔اس کے اعتماد سے اٹھتے ہوئے قدم ظاہر کر رہے تھے کہ گھر کے چپے چپے سے خوب واقف ہے۔

قریب پہنچ کر اس نے چھڑی سے دروازے کی تصدیق کی اور اندر چلی گئی۔چند لمحوں بعد وہ طبی صندوقچہ (میڈیکل بکس) اٹھائے نمودار ہوئی۔چھوٹے قدم رکھتے وہ نزدیک آئی،چھڑی سے میز ٹٹول کر اس نے صندوقچہ اوپر رکھا اور کرسی گھسیٹ کر میرے پاس بیٹھ گئی۔ہونٹوں پر خوشگوار تبسم بکھیرے وہ گویا ہوئی۔

''بینائی ختم ہونے سے پہلے میں نرس تھی،آٹھ سال پرانی بات ہے لیکن کام بھولی نہیں ہوں۔اب ذرا زخم کی تفصیل بتلاؤ تاکہ مرہم پٹی کر سکوں۔''

میں نے کہا''داہنی ران میں عقبی طرف سے گولی لگی ہے۔اور سامنے سے نکل گئی ہے۔''

اس نے تسلی آمیز لہجے میں مرا حوصلہ بڑھایا۔''یقیناً ہڈی بچ گئی ہے ورنہ چل نہ سکتے۔اور گولی کا نکل جانا بھی تمھاری خوش قسمتی ہے۔''

میں ہولے سے بولا۔''آپ صحیح کہہ رہی ہیں دیدی۔''

اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔لمحہ بھر کو وہ سن ہو گئی تھی۔پھر نشست چھوڑتے ہوئے بولی۔''زخم دھونے کو گرم پانی لاتی ہوں،اگر پٹی باندھی ہے تو کھول کر زخم کو ننگا کر دو۔'' وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی اور میں پٹیاں کھولنے لگا۔چونکہ پٹیاں پتلون کے اوپر ہی باندھی تھیں اس لیے زخم سے چمٹی نہیں تھیں۔البتہ پتلون اتارتے وقت میری کراہیں نکل گئی تھیں کہ کپڑا زخم سے بری طرح چمٹا ہوا تھا۔

میرے زخم کھولنے تک وہ پانی گرم کر کے لے آئی تھی۔میں نے پتلون اتار دی تھی اور صرف جانگیہ (انڈرویئر) پہنا تھا۔اس کے اندھا ہونے کے باوجود مجھے ہلکی سی جھجک ہو رہی تھی۔مگر ران ننگا کرنا مجبوری تھی۔کہ زخم کی صفائی اس کے علاوہ ممکن نہ تھی۔گولی گوشت پھاڑتے ہوئے سامنے سے نکلی تھی۔گولی لگنے کی جگہ چھوٹا سا سوراخ تھا مگر جہاں سے گولی نکلی تھی اس جگہ کا گوشت پھٹ گیا تھا۔

چھڑی سے میز چھو کر اس نے پانی کا برتن رکھا اور کرسی گھسیٹ کر میرے قریب بیٹھ گئی۔

''میں پٹی کر لوں گا دیدی۔'' مجھے جھجک ہو رہی تھی۔

وہ اطمینان سے بولی۔''نرس تو غیروں کی مرہم پٹی فرض سمجھ کر کرتی ہے،تم نے تو دیدی بنا لیا ہے۔اور چھوٹے بھائی کی مرہم پٹی کرنے میں کیسی جھجک۔''

میں نے وضاحت کی۔''آپ کو نظر نہیں آتا تبھی کہہ رہا تھا کہ خود کر لوں گا۔''

''نابینا ہوں،انجان نہیں ہوں۔'' میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے وہ شفقت سے بولی۔''میرا ہاتھ زخم پر رکھو۔''

میں نے اس کا ہاتھ زخم پر رکھ دیا۔اس نے نرمی سے زخم کو چھوا اور ہولے ہولے ہاتھ گھما کر پورے زخم کا جائزہ لینے لگی۔زخم کو اچھی طرح ٹٹول کر وہ بڑبڑائی۔''پستول کی گولی تو نہیں لگتی۔''

مجھے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔''آپ کو کیسے اندازہ ہوا؟''

''کہاں ناں پیشہ ور نرس ہوں۔پستول کی گولی اتنا گہرا شگاف نہیں ڈالتی۔'' اس نے چھڑی سے میز کی جگہ کا اندازہ کیا

اور میز کو قریب گھسیٹ کر طبی صندوقچے کو کھولنے لگی۔ میں نے اس کی مدد کو ہاتھ بڑھائے۔ وہ شفقت سے جھڑکتے ہوئے بولی۔ ''آرام سے بیٹھے رہو، میں کر سکتی ہوں۔''

میں نے جھینپتے ہوئے ہاتھ واپس کھینچ لیے۔

اس نے روئی نکال کر پانی میں بھگوئی اور نرمی سی زخم پر پھیرنے لگی۔ انداز میں پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ بڑی بہن کی شفقت بھی جھلک رہی تھی۔

گرم پانی سے زخم کو صاف کر کے وہ پائیوڈین میں روئی بھگو کر زخم پر لگانے لگی۔ اگلے مرحلے میں اس نے چوڑی پٹی کاٹ کر اس پر ایک کریم ملی اور پٹی کو زخم کے منہ پر رکھ کر اوپر سے پٹی لپیٹ دی۔

مرہم پٹی ہوتے ہی درد کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔

وہ درد کش ٹیکہ تیار کرنے لگی۔ مجھے خاصی حیرانی ہوئی تھی۔

''دیدی، بغیر دیکھے آپ کو کیسے پتا کہ یہ کون سا ٹیکہ ہے؟''

''بدھو، مختلف ٹیکوں کی بوتلوں کا حجم یکساں نہیں ہوتا۔ اور میرے پاس چند قسم کے ٹیکے ہی پڑے ہیں۔ آسانی سے شناخت کر لیتی ہوں۔''

ٹیکہ تیار کر کے اس نے مجھے کولہے پر لگایا اور پھر اینٹی بایوٹک ٹیکہ تیار کر کے میری رگ میں لگا دیا۔ انگلیوں سے ٹٹول کر جس طرح اس نے میری رگ تلاش کی تھی میرے لیے حیران کن نظارا تھا۔ ایک اندھی مسیحا پہلی بار دیکھی تھی۔

بکس کو بند کر کے اس نے شفقت سے پوچھا۔ ''کھانا کھاؤ گے؟''

میں بے تکلفی سے بولا۔ ''سخت بھوک لگی ہے۔''

''گرم کر کے لاتی ہوں۔'' وہ اٹھنے لگی۔

میں سرعت سے بولا۔ ''پہلے کوئی چادر یا تولیہ لا دو کہ میں صرف جانگیے میں ہوں۔''

وہ شرارتی انداز میں بولی۔ ''تو یہاں ایک اندھی کے علاوہ کون ہے جو شہزادے کو دیکھنے آئے گا۔''

میں جھینپتا ہوا بولا۔ ''دیدی مجھے عجیب لگ رہا ہے۔''

وہ مسکراتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھیں۔ واپسی پر ہاتھ میں مردانہ شلوار قمیص تھی۔ ''یہ پتا جی کے کپڑے ہیں۔'' اس نے صاف لباس میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے شکریہ کہتے ہوئے کپڑے لے لیے۔ وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔

لباس تبدیل کر کے میں نے پرانے کپڑے اور خون آلود پٹیاں وغیرہ سمیٹ کر کوڑا کرکٹ کی ٹوکری میں پھینکے۔ اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کھانا گرم کر کے لے آئیں۔ آلو بھجیا اور توے کی تازہ روٹی تھی۔ مجھے کھانا پکڑا کر وہ چائے بنانے چلی گئیں۔ سخت بھوک لگی تھی۔ میرے کھانا کھانے تک وہ گرما گرم چائے لے آئی تھیں۔ اور اس وقت مجھے چائے کی سخت طلب بھی ہو رہی تھی۔ سگریٹ، نسوار جیسی لت سے قدرت نے مجھے دور رکھا ہے، لیکن چائے تو میری نظر میں قدرت کا تحفہ ہے۔

چائے اس نے دو پیالیوں میں لائی تھی۔ مجھے پیالی پکڑا کر اس نے میرے سامنے نشست سنبھالی۔ ''اب اپنی کتھا (کہانی) سناؤ۔''

میں نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا ''ضروری ہے۔''

''نہیں، لیکن مشتاق ضرور ہوں۔''

''خود کو بے گناہ کہنا تو جھوٹ ہوگا۔''

اس نے منہ بنایا۔''صفائی تو نہیں مانگی۔''

میں ہچکچاتے ہوئے بولا۔''اگر اپنے متعلق سچ بتانا مشکل ہو تو کیا کروں۔''

اس نے انکشاف کیا۔''خبروں میں سنا ہے کہ حساس ادارے کے کمانڈوز نے ملحقہ مکان پر چھاپہ مار کر دو تین دہشت گردوں کو ہلاک کیا ہے۔اور حقیقت تو یہ ہے کہ چھاپہ مار دستے کے کچھ افراد میرے گھر کی دیوار پھلانگ کر ساتھ والے مکان میں داخل ہوئے تھے۔''

میں نے جان چھڑائی۔

''جب آپ جانتی ہیں تو استفسار کا مطلب؟''

اس نے الجھن ظاہر کی۔

''کیا دہشت گرد تم جیسے ہوتے ہیں، جو اکیلی عورت کو دیدی بنالیں۔''

''اچھائی اور برائی کا احساس تو تعلق کے مرہونِ منت ہوتا ہے۔فاقوں سے مغلوب ہو کر دکان کا تالا توڑنے والا اپنے بچوں کو مسیحا اور دکان دار کو ڈکیت لگتا ہے۔''

''فلسفہ سننے کا موڈ نہیں ہے۔''

میں جز بز ہوا۔''دیدی! میرے پاس آپ کو بتانے کو کچھ نہیں ہے۔''

وہ شاکی ہوئی۔''اعتبار نہیں ہے۔''

''بے اعتباری، کسی خوف یا خطرے کے زیرِ اثر ہوتی ہے۔اور آپ جیسی نرم دل و معصوم چاہتے ہوئے بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔''

اس نے منہ بنایا۔''میں گھنٹی کر کے پولیس کو بلا لیتی ہوں تا کہ یہ غلط فہمی تو دور ہو کہ میں کچھ کر نہیں سکتی۔''

میں نے قہقہہ لگایا۔

''پولیس کے آنے سے پہلے میں نکل جاؤں گا۔''

''مل کر دکھاؤ۔''سنجیدہ لہجے میں کہتے ہوئے اس نے دایاں ہاتھ گریبان میں ڈالا واپسی پر اس میں میں لیڈیز پستول موجود تھا۔سنہری رنگ کا ننھا سا پستول منقش سانپ کی طرح مجھے گھور رہا تھا۔میرے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔

میں نے چائے کی پیالی دھیرے سے میز پر رکھی.....

ایک دم اس نے تبصرہ کیا۔

''تم نے چائے کی پیالی نیچے رکھ دی ہے۔''

مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔اتنی مدہم آواز بھی اس نے سن لی تھی۔کالے شیشوں کی عینک کو تاڑتے ہوئے مجھے لگا شاید وہ دیکھ سکتی ہے۔

اس نے میری سوچ پڑھ لی تھی، ایک دم لٹی میں سر ہلایا۔''دیکھ نہیں سکتی، صرف سن سکتی ہوں اور یقین مانو اگر پہلو بھی بدلو گے تو مجھے محسوس ہو جائے گا۔''

''کیا چاہتی ہیں۔''میں نے بے بسی کا اظہار کیا اور تب لگا کہ اسے بے بس جاننا میری حماقت تھی۔گھر داخل ہونے کی اجازت میں نے اخلاقی تقاضا پورا کرنے کو مانگی تھی۔لیکن وہ اس وقت بھی مسلح تھی اور یقیناً مجھے بہ زور روک سکتی تھی۔

وہ متبسم ہوئی۔ ''تمھاری غلط فہمی دور کرنا چاہتی تھی۔'' اس کا دایاں ہاتھ پستول غائب کرنے کو گریبان کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے نظریں جھکالی تھیں کہ اسے دیدی پکارنے کی نسبت سے وہ میرے لیے محترم و مقدس تھی۔

میں شاکی ہوا۔ ''اس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔''

اس نے خفت سے پوچھا۔ ''خفا ہو۔''

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

نشست چھوڑتے ہوئے اس نے چھڑی سے میز کو چھوا اور گھوم کر میرے پہلو میں آ گئی۔ ''دیدی سے بھی کوئی خفا ہوتا ہے بھلا۔'' میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے اس نے شفقت سے پچکارا۔

''دیدیاں ڈانٹتی ہیں، دھمکی نہیں دیتیں۔''

''سزا چاہتی ہوں۔'' اس نے ندامت ظاہر کی۔

میں خفت سے بولا۔ ''اب بے عزتی تو نہ کریں نا۔''

وہ گزشتہ موضوع کی طرف پلٹی۔ ''کیا آپ کا تعلق پڑوسی ملک سے ہے؟''

''کیوں، پڑوسی ملک والا کسی محترم خاتون کو دیدی بنانے کا مجاز نہیں ہوتا۔'' اس کی تفتیش سے جان چھڑانے کو میں نے بے موقع واویلا مچایا۔

وہ شاکی ہوئی۔ ''ایسا کب کہا ہے۔''

میں نے موضوع تبدیل کیا۔ ''آج رات کو پناہ مل سکتی ہے؟''

اس نے حکم صادر کیا۔ ''مکمل ٹھیک ہونے تک تم کہیں نہیں جا رہے۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''اگر یونہی تفتیش ہوتی رہی تو شاید آج ہی بھاگ جاؤں۔''

''مجھے مسلسل ٹال رہے ہو۔'' اس کا ہاتھ بازو پر رینگتا ہوا میرے کان کی لو تک پہنچا اور اس نے کان پکڑ کر شفقت سے کھینچا۔ ''بتا رہے ہو یا کان اکھیڑ دوں۔''

''بعض اوقات خاموش رہنا مجبوری بن جاتی ہے کہ بندہ جھوٹ بولنا نہیں چاہتا اور سچ بول نہیں سکتا۔ صرف اتنا یقین دلا سکتا ہوں کہ کسی بے گناہ کو نقصان پہنچانے نہیں آیا، نہ بھارت سرکار کی املاک کو نقصان پہنچانے کا ارادہ ہے اور نہ رازوں کے حصول کو آیا ہوں۔''

''تمھاری وضاحت نے میری ڈھارس بندھا دی، ورنہ یہی کھد بد رہتی کہ شاید میں نے کسی مجرم کو پناہ دی ہے۔''

میں نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔ ''کسی کو مجرم گردانا اخلاق نہیں مملکت کے قانون کے دائرہ کار میں آتا ہے۔ اور اس لحاظ سے مجرم ہوں۔''

میرے سر میں چپت رسید کرتے ہوئے وہ متبسم ہوئی۔ ''چھوٹے، تم فلسفے کی آڑ میں اپنے سارے راز چھپا لو۔'' میرے دیدی کہنے پر اس کے رویے میں نہ صرف بے تکلفی در آئی تھی بلکہ ایک قسم کی شفقت بھی جھلک رہی تھی۔

''مجھے اپنی دیدی کا نام تک معلوم نہیں۔'' میں نے سوالوں کا رخ اس کی جانب موڑا۔

وہ جلدی سے بولی۔ ''ممتا شنول۔''

''اور آپ کب سے اکیلی رہ رہی ہیں۔''

''پتاجی کے دیہانت (انتقال) کے بعد سے اکیلی ہوں۔'' وہ افسردہ ہو گئی تھی۔

''آپ اپنے نرس ہونے کا ذکر کر رہی تھیں، اس کا مطلب ہے آپ کی بینائی بعد میں ضائع ہوئی۔''

''انٹرویو لینے کی ضرورت نہیں میں خود سے سب کچھ بتا دیتی ہوں، بلکہ بینائی ختم ہونے کا تو پہلے بتا چکی ہوں، شاید بھول گیا ہے۔''

میں نے بات بنائی۔ ''مگر یہ تو نہیں بتایا کہ کیسے ختم ہوئی۔''

تھوڑا فاصلہ بڑھا کر انھوں نے صوفے سے ٹیک لگائی اور گہری سوچ میں کھو گئیں۔ میں نے ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ لمحہ بھر بعد وہ گویا ہوئی۔ ''پتا جی فوج میں تھے۔ بھارت ماتا سے ان کی محبت کسی تعارف کی متقاضی نہیں ہے۔ ہم دو بہن بھائی تھے۔ چھوٹا راجیو اور میں۔ ہم پر وہ جان چھڑکتے تھے، مگر دیش کی محبت پر ہمیں کبھی ترجیح نہ دی۔ ریٹائرڈ ہونے پر انھوں نے ایک دکان ڈالی، اچھی خاصی آمدن ہو جاتی تھی۔ ماتا جی، پتا جی کے ریٹائرڈ ہونے کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہی تھیں۔ راج بھی ایک حادثے میں ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ جانتے ہو مرتے وقت اس کا سر میری گود میں تھا۔'' ان کی آواز گلوگیر ہوئی۔ آنسو پینے میں انھیں چند لمحے لگے تھے۔ ایک گہرا سانس لے کر انھوں نے سلسلہ تکلم جوڑا۔ ''ماتا جی اور راج کے دیہانت (انتقال) کے بعد پتا جی کی ساری محبتیں مجھ پر نچھاور ہونے لگیں۔ ان کا ارادہ مجھے ڈاکٹر بنانے کا تھا مگر میں لکھنے پڑھنے میں واجبی سی تھی۔ ایف ایس سی بہ مشکل پاس کر سکی تھی۔ انھیں، مجھے مسیحا کے روپ میں دیکھنے کا بڑا شوق تھا، لیکن میں ڈاکٹر نہیں بن سکتی تھی۔ مجبوراً ان کی خواہش کے احترام میں نرس بن گئی۔ اسی اثناء میں روہن گجرال سے ملاقات ہوئی۔'' ایک بار پھر وہ چپ ہو گئی۔ یقیناً روہن گجرال بھی کوئی خاص شخص تھا کہ وہ جذباتی ہو گئی تھیں۔ میں صبر کیے ان کے بولنے کا منتظر رہا۔ تھوڑی دیر بعد ان کی آواز گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔

''بہت پیار جتایا کرتا تھا۔ آسمان کے تارے توڑنے کے دعوے، راج کماریوں کی سی زندگی دینے کی ڈینگیں، آسائشیں و آرام دینے کے وعدے، ہر حال میں ساتھ نبھانے کی قسمیں اور زبان اتنی میٹھی کہ یقین کیے بغیر چارہ ہی نہ تھا۔ شبہ ہی نہیں گزرتا تھا کوئی اس اعتماد سے جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ جب نبھانے کا وقت آیا تو ظالم فیصلہ سنانے بھی نہ آیا کہ کم از کم گلہ شکوہ ہی کر لیتی۔'' ایک اور گہرا سانس لے کر اس نے جذبات پر قابو پایا..... ''روزانہ اسی کے ساتھ ہسپتال جایا کرتی تھی۔ وہ موٹر سائیکل بھی اسے میں نے لے کر دی تھی۔ یہاں آ کر پہلے میرے ہاتھ سے ناشتا کرتا اور پھر ہم دونوں ہسپتال جاتے۔ مجھے ہسپتال اتار کر وہ یونیورسٹی چلا جاتا۔ اس دن اس کے ناز نخرے اٹھاتے تھوڑی دیر ہو گئی۔ تبھی اسے تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ دو جگہ ٹریفک سگنل توڑ کر وہ ہسپتال کے قریب پہنچا اور تیسرے اشارے کو توڑتے ہوئے مخالف سمت سے آنے والے موٹر سائیکل سے تصادم ہو گیا۔ ہم دونوں پختہ سڑک پر بری طرح گرے تھے۔ اس نے ہیلمٹ پہنا تھا لیکن میں بغیر ہیلمٹ کے تھی۔ ہوش آیا تو دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ کافی علاج کرایا مگر آنکھوں کی روشنی بھگوان نے واپس لے لی۔ جب تک ڈاکٹروں نے میری دید ختم ہونے کی تصدیق نہ کر دی وہ باقاعدگی سے آتا رہا۔ جونہی معلوم ہوا کہ اب میں کبھی نہیں دیکھ سکوں گی الوداع کیے بغیر غائب ہو گیا۔ اس کے بعد میری اس سے بات نہ ہوئی۔ ایک بار پتا جی کو بات کرتے سنا تھا۔ پتا جی اس کی بنتی (منت) کرتے ہوئے میرے خوشیوں کی بھیک مانگ رہے تھے۔ مگر اس نے پتا جی کی توہین کر کے رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر میں نے پتا جی کو سختی سے منع کر دیا کہ اس ظالم کے سامنے گڑگڑانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں پتا جی کو خوش نظر آنے کو بہ ظاہر ہنستی مسکراتی رہتی، لیکن جب دکان پر چلے جاتے تب جی بھر کر رو لیتی۔ اور ان کے آنے تک جی ہلکا ہو جاتا۔ مگر شاید یہ میری خوش فہمی تھی کہ پتا جی میرے غم سے ناواقف ہیں۔ انھیں میرا غم اندر ہی اندر کھا گیا۔ اور پتا ہی نہ چلا ایک دن مجھے اکیلا چھوڑ کر سورگ (جنت) کی راہ لی۔ پتا جی کے کریا کرم کے بعد مجھے مستقبل کے اندیشوں نے گھیر لیا۔ مگر یہ پریشانی عارضی ثابت ہوئی۔ بھگوان کے کرم سے پتا جی چلتی ہوئی دکان چھوڑ گئے تھے۔ ان کے دیہانت کے بعد ان کا ملازم میرے پاس دکان کا حساب کتاب لے آیا۔ وہ شروع دن سے پتا جی کے ساتھ تھا۔ میں نے

دکان کا سارا حساب کتاب اسی کے حوالے کر دیا۔ تین سال ہو گئے ہیں، بھگوان کی کرپا سے یکم کو گھر آ کر حساب کتاب دے جاتا ہے۔ اچھی گزر اوقات ہو رہی ہے۔ بس یہی میری کہانی ہے۔''

اس نے کافی تفصیل سے اپنی کہانی سنائی تھی، جو غیر ضروری تفصیلات حذف کر کے اجمالاً آپ کے سامنے بیان کر دی ہے۔

اب اس نے توپوں کا رخ میری جانب موڑنا تھا، اس سے پہلے ہی میں نشست چھوڑتا ہوا بولا۔ ''سخت تھکن محسوس ہو رہی ہے۔ آرام کی جگہ ہی دکھا دیں۔''

ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے وہ کھڑی ہو گئی۔ میرا اپنے بارے کچھ بتانے سے اعراض کرنا اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھا۔ بیٹھتے وقت وہ چھڑی لپیٹ لیتی تھی۔ جدید ساخت کی چھڑی سمٹ کر بالشت برابر رہ جاتی تھی۔ قدم بڑھانے سے پہلے اس نے چھڑی کو سیدھا کیا اور بائیں جانب کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ بلاشبہ چھڑی اندھے کے لیے آنکھ کا کام کرتی ہے۔ اور ہر قدم پر وہ چھڑی کے محتاج ہوتے ہیں۔

دروازہ دھکیلتے ہوئے وہ اندر داخل ہوئی۔ درمیانے حجم کی خواب گاہ میں مسہری، کپڑوں کی الماری، دو تین کرسیاں اور ایک میز پڑی تھی۔

''یہ میرے راج کی خواب گاہ ہے، بعد میں پتا جی یہاں منتقل ہو گئے تھے۔ الماری میں ان کے چند سوٹ بھی لٹکے ہوں گے۔ بلا تکلف پہن لینا۔''

''شکریہ دیدی۔'' میں بستر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ واپس مڑ گئیں۔

بستر کو جھاڑ کر میں بیٹھ گیا۔ ممتا و شنول کا ملنا ایک خوشگوار حادثہ لگ رہا تھا۔ نہایت باکردار، ہنس مکھ، خوش اخلاق اور نرم دل عورت تھی۔ میرا دیدی کہنا انھیں نہال کر دیتا تھا اور تبھی میرے قریب آنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ زخم کے ٹھیک ہونے تک وہاں چھپنا نہایت مفید تھا۔ اللہ پاک نے سر چھپانے کا ایسا ٹھکانہ مہیا فرما دیا تھا جہاں زخم کی دیکھ بھال بھی ہو رہی تھی، آرام بھی مل گیا تھا اور کھانے کی بھی کمی نہیں تھی۔

بوٹ کھول کر میں نے زخمی ٹانگ کو ہاتھوں میں پکڑ کر بستر پر سیدھا رکھا اور تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ گزشتہ رات نے مجھ سے قریبی ساتھی اور مددگار چھین لیے تھے۔ ڈینو کے بغیر میری طاقت آدھی رہ گئی تھی۔ ساری زندگی دہشت گردوں کے خلاف لڑنے والے مجاہد کا آخری وقت پردیس میں آنا تھا کہ جہاں اس کا جنازہ پڑھنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ زندہ دل، نڈر اور باصلاحیت جوان تھا۔ اس مشن میں اس کی حیثیت سرغنہ کی سی تھی۔ گو باقاعدہ طے نہیں ہوا تھا لیکن میں نے اس کے مشوروں کو اپنی رائے پر مقدم رکھا تھا۔ اور اب اس کے جانے پر سامنے خلا ہی نظر آ رہا تھا۔ اندھیرے میں تو ہم پہلے ہی سے تھے۔ اب تو گویا بے دست و پا بھی ہو گیا تھا۔

اس کی شہادت مجھے اس لیے کھل رہی تھی کہ میرا مددگار اور ساتھی تھا لیکن گھر والوں کا تو زندگی کا سہارا چلا گیا تھا۔ نجانے اس کے ماں باپ پر کیا بیتے گی۔ پریشان کن سوچوں میں دروازے پر ہونے والی آہٹ مخل ہوئی۔ گردن گھمانے پر ممتا دیدی نظر آئیں۔ ایک ہاتھ میں چھڑی اور دوسرے میں لڑے اٹھائی تھی۔ البتہ لباس ایسا نہیں تھا کہ میں نظر بھر کر دیکھ سکتا۔ شاید سونے کو انھوں نے شب باشی کا لباس پہنا تھا۔ ہلکا پھلکا پاجامہ اور اس پر نصف بازوؤں والی بنیان۔ میری آنکھیں جھک گئی تھیں۔ وہ سڈول و متناسب جسم کی بھرپور عورت تھیں۔ ہلکا سانولا رنگ، نین نقش تیکھے و جاذب نظر۔ ہونٹوں پر ہر وقت دھیمی مسکان کی موجودگی نے انھیں پرکشش بنا دیا تھا۔ ہلکے سانولے رنگ نے ان کی شخصیت کو مقناطیسی بنا دیا تھا۔ لیکن میرے دل میں ان کے لیے بڑی بہن جیسا احترام اور مقام تھا۔ میں نے نظریں نیچی کر

لیں، اگر چہ وہ میری نظروں کی آوارگی نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن جو دلوں کے بھید جانتا ہے، اتنا باریک بین ہے کہ سوچوں کی آلودگی جس سے چھپائی نہ جا سکے، اس کے سامنے تو جواب دہ ہونا تھا۔

''دیدی خیر تو ہے۔'' میں سیدھا ہوا۔

چھڑی سے میز کو چھو کر اس نے ٹرے رکھا جس میں دودھ کا گلاس اور چند گولیاں پڑی تھیں۔ ''بستر پر لیٹتے ہوئے خیال آیا کہ تمھیں دوائی تو کھلائی ہی نہیں ہے۔''

''آپ نے کیوں زحمت کی، مجھے آواز دی ہوتی۔''

وہ طمانیت سے بولی۔ ''تکلف کی ضرورت نہیں ہے چھوٹے! بڑی بہنیں ماں کی جگہ پر ہوتی ہیں۔ اور ماؤں کو اولاد کے کام آتے خوشی ہوتی ہے۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''خیر اتنی بھی بڑی نہیں ہیں کہ میری اماں جان بن جائیں۔ ممتا نام کا غلط فائدہ نہ اٹھائیں۔''

وہ کھلکھلاتے ہوئے بولیں۔ ''دوائی لے کر آرام کرو اور دودھ کا گلاس ختم کرنا۔'' وہ دروازے کی طرف مڑ گئیں۔

میں ٹرے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ گولیاں کھا کر میں نے دودھ کا گلاس پیا اور آرام کرنے لیٹ گیا۔

—●—

دوسرے ہی دن میں نے داڑھی، مونچھیں صاف کر کے کلین شیو کر لی تھی۔ دیپک کا موبائل فون میرے پاس تھا۔ اس میں ڈائل کیا ہوا ایک ہی نمبر تھا۔ کئی بار گھنٹی کرنے کے باوجود وہ نمبر بند ہی ملتا تھا۔ یقیناً انھوں نے مذکورہ نمبر ضائع کر دیا تھا اور اب وہ موبائل فون میرے لیے ناکارہ تھا۔

اگلے دو ہفتے گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ ممتا دیدی ایک مثالی خاتون تھیں۔ مجھے انھوں نے اتنی محبت، توجہ اور شفقت سے نوازا کہ میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئیں۔ ہم رات گئے تک کپیں ہانکتے رہتے۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی راجیو کے نام پر مجھے راج کہہ کر بلاتی تھیں۔ میں انھیں اپنے بارے قریباً سب کچھ بتا چکا تھا۔ جینی، گلگارے، ماہین کی بے وفائی، سردار کی دوستی، لی زونا کی کہانی، پلوشہ و رومانہ کے ساتھ عشق کی داستان، بیٹے عبداللہ کے بارے اور بھی کافی تفصیل، البتہ انڈیا آنے کے مقصد کے بارے چاہ کر بھی کچھ نہیں بتا سکا تھا۔ انھوں نے بھی ایک دو بار سرسری سا کریدنے کے بعد زیادہ زور نہیں دیا تھا۔ جینی کے ذکر پر اس نے پوچھا.....

''امریکہ کیا کرنے گئے تھے۔''

جواب دیا۔ ''نشانہ بازی سیکھنے۔''

وہ متبسم ہوئی۔ ''واہ چھوٹے، تم سنائپر ہو۔''

میں حیرت سے اچھل پڑا تھا، مشکوک انداز میں پوچھا۔ ''دیدی! آپ سنائپر کے بارے کیا جانتی ہیں؟''

''سنائپر پر پہلی فلم میرے خیال میں 1993 میں بنی تھی، دوسری 2002 اور تیسری 2004 میں۔ تینوں فلمیں میں نے دیکھی ہوئی ہیں۔ بلکہ ایک سے زیادہ مرتبہ دیکھی ہیں۔ اس کے بعد میرا خیال ہے 2011 میں اس موضوع پر فلم آئی تھی لیکن نہ دیکھ سکی کہ اس وقت میری آنکھیں باقی نہیں رہی تھیں۔'' ممتا دیدی کی آواز میں اداسی در آئی تھی۔

میں اچنبھے سے بولا۔ ''اچھا اتنا شوق تھا سنائپر فلم دیکھنے کا کہ فلم ریلیز ہونے کی تاریخ بھی یاد ہے۔''

''ہاں بہت زیادہ شوق تھا۔'' اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انھوں نے شوخی سے پوچھا۔ ''تم اپنا بتاؤ، کبھی ہدف پر گولی ماری بھی ہے یا ایویں ہی ہو۔''

میں نے قہقہہ لگایا۔ ''گولی چلا لیتا ہوں۔''

انھوں نے ایک دم پوچھا۔ ''میرے دیش میں بھی گولی چلانے تو نہیں آئے۔''

میں جلدی سے بولا۔ ''فکر نہ کریں کسی بے گناہ کے سر میں گولی نہیں ماروں گا۔''

ان کا ہاتھ میرے بازو کو چھوتا ہوا کان تک پہنچا۔ کان کی لو کو انگوٹھے و شہادت کی انگلی میں بھینچتے ہوئے وہ معنی خیز لہجے میں بولیں۔ ''تم نے چھاتی کے بجائے سر کا نام لیا ہے۔ گویا اچھے نشانہ باز ہو۔'' ان کا مشاہدہ غضب کا تھا کہ عام سی بات سے خاص نتیجہ اخذ کیا تھا۔

میں بات بناتا ہوا بولا۔ ''ہر آدمی اپنی صلاحیتوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے، آپ کے چھوٹے بھائی نے ڈینگ ماردی تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑی۔''

''میرا خیال ہے کافی پیتے ہیں۔'' انھوں نے نشست چھوڑ دی تھی۔

—●—

مجھے بس ان کے لباس پر اعتراض تھا جو ستر پوشی کے ضروری تقاضے پورے نہیں کرتا تھا۔ وہ شب باشی کے لباس میں بے حجابانہ میرے سامنے آجاتیں۔ کبھی کبھی نیکر بھی پہن لیتیں۔ یوگا کی مشقیں باقاعدگی سے کرتی تھیں اور اس وقت چست پاجامے میں ملبوس ہوتیں۔ یوگا کی مشقیں ہی تھیں کہ وہ اتنی سمارٹ نظر آتی تھیں۔

لباس صرف ان کا مسئلہ نہیں انڈیا میں عورتوں کی اکثریت اس معاملے میں آزاد خیال ہے۔ پاکستان میں بہت زیادہ جدت کے باوجود خواتین اس نہج تک نہیں پہنچیں۔ صرف اونچے طبقے کی نام نہاد آزادی کی علم بردار قلیل تعداد کی خواتین میں ایسی بے حیا پائی جاتی ہیں، جنھیں نہ تو مذہب و شریعت کا لحاظ ہے اور نہ روایات کا پاس۔ شوبز سے تعلق رکھنے والی مختصری جماعت بھی ایسے پہناووں کی عادی ہے۔ ورنہ اکثریت کا لباس بہت بہتر ہے، پردے کے تقاضے پورے نہ بھی کرے ستر پوشی کی ضروریات کو کافی ہے۔ ہماری دیہاتی خواتین کی شرم و حیا کے تو کیا کہنے۔ شاید ایک بی بی کے لباس سے مغرب کی درجن بھر خواتین کے لباس تیار ہو جائیں۔

میں نے ایک دو بار سرسری سا ٹوکا مگر وہ ہنس کر ٹال گئیں۔ اطمینان سے بولیں.....

''گھر میں چھوٹے بھائی کے علاوہ کون ہے کہ مجھے احتیاط کی ضرورت ہو۔''

میں ان پر زور نہیں دے سکتا تھا البتہ اپنی آنکھوں پر قابو پانا میرے بس میں تھا۔ یوں بھی وہ اول آخر میری باجی ہی تھیں۔ رنڑا گڑیا کے بعد پہلی خاتون تھیں جنھیں میری زبان نے دل کی تصدیق کے ساتھ بہن بولا تھا۔ یقیناً مرد کی فطرت میں عورت ذات کے حصول کا حرص کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ جیسے لطیفہ ہے کہ ''عورت کی زبان اور مرد کی آنکھ سب سے آخر میں مرتی ہے۔'' گورومانہ جیسی خوب صورت اور پلوشہ جیسی موہنی لڑکی کے حصول کے بعد مجھے کسی اور عورت کی احتیاج نہیں ہونا چاہیے تھی، مگر جنس مخالف کی خوب صورتی سے متاثر ہونا تو مرد کی فطرت میں شامل ہے اور میں گناہ گار سا مرد ہی ہوں۔ البتہ اس میں بھی شبہ نہیں کہ میرے دل میں کبھی پلوشہ اور رومانہ سے بے وفائی کرنے کا خیال نہیں آیا۔ جیسے ان پر میں صرف اپنا حق جتاتا تھا یونہی خود کو ان کی امانت سمجھتا تھا۔ گلگارے اور جینی جیسی پرکشش لڑکیاں بھی مجھے متزلزل نہیں کر سکی تھیں۔ گو گلگارے تو اول آخر مشرقی لڑکی تھی اور اپنی پارسائی پر دھبہ برداشت نہیں کر سکتی تھی مگر جینی جس معاشرے کی پیداوار تھی وہاں جسمانی تعلقات کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ شادی سے پہلے خواتین کا مردوں کے ساتھ ملنا (ڈیٹ کرنا) عام سی بات ہے۔

میری جس بات کا جواب نہ دینا ہوتا ممتا دیدی بڑی خوب صورتی سے ٹال دیتی تھیں۔ ایک دن پوچھا۔

''دیدی! آپ کے پاس پستول کب سے ہے۔''

''پتاجی نے لے کر دیا تھا۔ اور انھی سے چلانا بھی سکھا تھا۔''

''تو پستول کی موجودی میں کوئی آپ سے کیسے چھیڑ خانی کر سکتا ہے۔'' مجھے ان کی پہلے دن کی باتیں یاد آئیں۔

ان کا ہاتھ میرے سر تک پہنچا، بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے وہ شفقت سے بولیں۔ ''بدھو، کوئی بڑی بہن سے بھی ایسا سوال کرتا ہے۔''

''شما چاہتا ہوں.....'' مجھے ندامت کا اظہار کرتے بنی تھی۔

—●—

تین ہفتوں کے اختتام پر میرا زخم بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ اس دوران میں ایک بار بھی صحن میں نہیں نکلا تھا۔ کیوں کہ کسی پڑوسی کی نظر پڑ جاتی تو نہ صرف دیدی کا کردار داغ دار ہوتا بلکہ مجھے بھی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔

آخر ایک دن میں جانے کو تیار تھا۔ تین ہفتے بہت اچھے گزرے تھے۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ میں کسی خطرناک مشن پر ہوں۔ گھر کا سا ماحول، آرام اور سکون، اچھا کھانا، ممتا دیدی کی شفقت بھری محبت اور دیکھ بھال جی نہیں چاہتا تھا وہ ٹھکانہ چھوڑ دوں۔ مگر وہاں مستقل رہنے کو نہیں آیا تھا۔ گھر سے نکلے ہوئے مہینے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ گوفوجیوں کے لیے چند ماہ کی دوری اتنی اہمیت نہیں رکھتی، مگر اس بار معاملہ مختلف تھا۔ ایک تو میری جان سے پیاری پلوشے کی خفگی کا خیال تھا کہ اسے منانے کا مشکل مرحلہ باقی تھا۔ اور اس کے بچکانہ فیصلوں سے کوئی بھی الٹی سیدھی امید کی جا سکتی تھی۔ دوسرا گھر گھنٹی پر ملنا بھی ممکن نہیں رہا تھا کہ انصاری صاحب نے انڈیا سے گھر بات کرنے کو سختی سے منع کیا تھا۔

''جانا ضروری ہے۔'' ممتا دیدی کے لہجے میں اداسی در آئی تھی۔

میں بے بسی سے مسکرا دیا۔ ''آپ نہیں جانتیں۔''

''ایک بات مانو گے۔''

میں اعتماد سے بولا۔ ''آپ ہر بات منوا سکتی ہیں، بس میرے اختیار کے دائرہ کار میں آتی ہو۔''

''اگر میں کہوں اپنے دیش لوٹ جاؤ، کیا جواب ملے گا؟''

میں نے اطمینان سے کہا۔ ''کہا نہ ہر وہ بات جو میرے دائرہ اختیار میں آتی ہو۔''

''جانتی تھی تم یونہی ٹرخاؤ گے۔'' انھوں نے منہ پھلا لیا تھا۔

''یہ ناراض ہونے کا وقت ہے۔'' صوفے سے اتر کر میں قالین پر بیٹھا اور ان کی گود میں سر رکھ لیا۔

میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ گلوگیر ہوئی۔ ''مجھ میں بری خبر سننے کا حوصلہ نہیں ہے۔''

''موت کی آمد خطرات کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ آرام دہ بستر پر لیٹے شخص کی موت بھی اس کے اتنے نزدیک ہوتی ہے جتنی میدان جنگ میں لڑنے والے سپاہی کی۔''

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ ''مگر فکر صرف میدان جنگ والوں کی ہوتی ہے۔''

''تو میری کامیابی کی پرارتھنا (دعا) کریں، پریشان ہونے سے کیا حاصل۔''

وہ شاکی ہوئی۔ ''دیش دشمن کے لیے کیا پرارتھنا کروں۔''

''کامیابی کی نہ سہی چھوٹے بھائی کی خیریت کی پرارتھنا تو کر سکتی ہیں ناں۔''

میرا سر گود سے ہٹا کر وہ کھڑی ہوئیں اور چھڑی کے سہارے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد خواب گاہ سے برآمد ہوئیں تو ایک ہاتھ میں ڈبا اٹھائے ہوئے تھیں۔ میرے پہلو میں نشست سنبھال کر انھوں نے ڈبا کھولا، ایک خوب صورت گھڑی برآمد ہوئی تھی۔ میری گھڑی اتار کر وہ قیمتی گھڑی میری کلائی پر باندھنے لگیں۔

میں معترض ہوا۔ ''یہ کیا ہے۔''

''ہندو لڑکیاں اپنے بھائی کو راکھی باندھتی ہیں۔ میں بھی گھڑی کی شکل میں راکھی کی رسم پوری کر رہی ہوں۔''

''بہت قیمتی گھڑی لگ رہی ہے۔''

''کسی کو تحفہ دینے کی غرض سے کافی پہلے خریدی تھی۔ اب مردانہ گھڑی میرے کس کام کی سوچا چھوٹے پر احسان جتا دوں۔''

میں نے اپنا نام ذیشان بتایا تھا، مگر انھوں نے کبھی مجھے ذیشان کہہ کر نہیں پکارا تھا۔ ہمیشہ راج یا چھوٹا کہتیں۔ اور جب ڈانٹنا ہوتا تو بدھو کہتیں۔

میں ممنونیت سے بولا۔ ''پہلے تھوڑے احسان ہیں۔''

''اپنی محرومیوں وحسرتوں کی تلافی کو احسان نہیں کہتے۔ اور وچن دو اس گھڑی کو کبھی کلائی سے جدا نہیں کرو گے۔''

میں شاکی ہوا۔ ''آپ کو لگتا ہے میں ایسا کر سکتا ہوں۔''

''کبھی نہیں۔'' ان کے ہونٹوں پر خوب صورت تبسم نمودار ہوا۔ ''تھوڑی سی رقم بھی رکھ لو۔'' انھوں نے درمیانی مالیت کے نوٹوں کی ایک گڈی میری طرف بڑھائی۔

میں نے انکار میں کیا۔ ''ہمارے ہاں بہنوں کو پیسے دیئے جاتے ہیں لیے نہیں جاتے۔''

وہ بلبلا ہوئی۔ ''ادھار سمجھ کر رکھ لو، بعد میں لوٹا دینا۔''

''ضرورت ہوتی تو مانگ لیتا۔''

وہ مصر ہوئی۔ ''فالتو پڑے ہیں۔ میرا خرچ نہ ہونے کے برابر ہے اور آمدن زیادہ ہے۔''

میں نے پیسے لے کر ان کے میز پر پڑے پرس میں ڈال دیئے۔ ''اب اجازت دیں۔'' میں نے نشست چھوڑی۔

انھوں نے کھڑے ہو کر ہتھیلیوں میں میرا چہرہ تھاما اور ماتھے پر بوسا دے کر بولیں۔ ''اس گھر کے دروازے تمھارے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔''

''فی امان اللہ۔'' دھیرے سے کہہ کر میں مڑا اور تیز قدموں سے چل پڑا۔ تین ہفتوں کے بعد میں کھلے آسمان تلے آیا تھا۔ باہر جانے کو میں نے ایسے وقت کا انتخاب کیا تھا کہ رش حتی الوسع کم ہو۔ یوں کسی بھی نگرانی کرنے والے کی سن گن لینا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ ممبئی جیسے شہر میں بازاروں میں بھیڑ ختم ہونے کی آرزو کرنا حماقت ہی ہے۔ البتہ وہ مضافاتی کالونی تھی اور گرمیوں کی دوپہر میں لوگوں کی آمد ورفت خال خال ہی نظر آتی تھی۔ دروازہ کھول کر میں نے دھیرے سے باہر جھانکا، دو آدمی بڑی سڑک کی طرف جاتے دکھائی دیئے۔ باہر نکل کر میں نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا بڑی سڑک کا رخ کرنے کے بجائے میں اسی گلی میں سیدھا چلتا گیا، جہاں دیپک کے ہمراہ اس مکان کے دروازے تک گیا تھا جس میں ڈینو چھپا تھا۔ بڑی سڑک شیو مندر کی طرف جاتی تھی اور یہ دوسری جانب تھی۔

ایک نیچی چار دیواری والے مکان کے صحن میں چند بچے شور کرتے نظر آئے۔ سنیتا جیسوال (را کی ایجنٹ جس نے ڈینو کو پھانسا تھا) کے مکان کے سامنے گزرتے ہوئے میں نے طائرانہ نگاہ ڈالی، مگر دروازے کو تالا لگا تھا۔ گلی کے ایک جانب نکاسی کی نالی بنی تھی جس میں گندہ پانی بہہ رہا تھا۔ میں نے دیپک والا موبائل فون اس نالی میں پھینک دیا، کیوں کہ اس میں ممتا دیدی کا فون نمبر محفوظ تھا۔ انھوں نے بھی مجھ سے موبائل فون نمبر لیا تھا، لیکن میں ان سے رابطہ رکھنے کے حق میں نہیں تھا۔ کسی مصیبت میں پھنسنے پر موبائل فون نمبر کی وجہ سے وہ بھی دھر لی جاتیں۔ اور انڈین ایجنسیوں کی تفتیش کا جو طریقہ کار ہے اس میں پھنس کر ایک اندھی لڑکی جو بھرپور جوان اور اچھی شکل وصورت کی مالک ہو اس پر کیا بیتتی اس کا اندازہ کرنے کو عقل کل ہونا بالکل ضروری نہیں ہے۔ البتہ ان کا نمبر میری یادداشت میں محفوظ تھا جو اشد ضرورت کے وقت میں استعمال کر سکتا تھا۔

تھوڑا آگے بڑھتے ہی گلی دائیں مڑ گئی تھی۔ سامنے سے ایک جوان آرہا تھا جس کے کان سے موبائل فون لگا یا ہوا تھا۔ مجھ پر اجنبیت بھری نگاہ ڈال کر وہ آگے بڑھتا رہا۔ میرے احساس اس وقت عجیب سے ہو رہے تھے۔ ہر شخص مجھے مشکوک نظر آرہا تھا۔ ممتا دیدی کا گھر گویا ایسی پناہ تھا جس سے نکلتے ہی دشمن مجھے ہڑپنے کو تیار کھڑے تھے۔ یقیناً ڈینو اور دیپک کی موت نے مجھے اکیلا کر دیا تھا۔

جونہی مکمل موڑ مڑا کچھ فاصلے پر چار افراد گھتم گتھا نظر آئے۔ غور کرنے پر پتا چلا تین افراد مل کر ایک شخص کو زدوکوب کر رہے تھے۔ ان کے شور اور گالیاں بکنے کی آواز کافی دور تک جا رہی تھی۔ ایک اکیلا اور دو گیارہ ہوتے ہیں وہاں تو ایک کے مقابل تین تھے۔ کوئی راہگیر بھی نظر نہیں آرہا تھا جو انھیں چھڑاتا۔ میں نے چچا خواہ مخواہ بننے سے گریز کا سوچا، دوسروں کے معاملے میں ٹانگ اڑانے کہاں کی عقل مندی تھی۔ مگر ان کے قریب پہنچنے تک میں اپنے ارادے پر قائم نہ رہ سکا۔ اکیلے آدمی کو گرا کر انھوں نے ٹھوکروں رکھ لیا تھا۔ اور جس بے دردی سے اسے پیٹ رہے تھے شاید جان ہی سے مار دیتے۔

''اوئے چھوڑ وا سے۔'' میں نے ایک آدمی کو دھکا دے کر دور کیا اور دوسرے کو بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

''تیری تو.....'' تیسرا غراتا ہوا مجھے مارنے دوڑا۔ جس کی مدد کو میں آیا تھا اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے تھے اور مجھے ان تینوں کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا۔ مجھے ترنوالہ سمجھ کر وہ گالیاں بکتے ہوئے جھپٹے..... آگے والے کی چھاتی میں بائیں ٹانگ رسید کرتے ہوئے میں اچھل کر ایک قدم پیچھے ہٹا اور دائیں پاؤں پر گھومتے ہوئے بائیں پاؤں کی ایڑی اس کے پیچھے آنے والے کی گردن پر جڑ دی۔ دونوں گلی کے پختہ فرش پر گرے تھے۔ اپنے ساتھیوں کا انجام دیکھتے ہی تیسرے کے قدموں میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

''تم ہمیں جانتے نہیں، زندگی پیاری ہے تو اپنی راہ لو۔'' اس نے دھمکانے کی کوشش کی۔

''اچھا۔'' میں نے اس کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کے ساتھی بھی ڈگمگاتے ہوئے اٹھے اور تینوں ایک ساتھ دور جاتے ہوئے مجھے دھمکیاں بھی دیتے گئے۔ ایسے کردار پاکستان میں بھی کافی مل جاتے ہیں۔ کمزور کو شیر اور زور آور کے لیے بکری۔

جب جان لیا کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہے، میں مضروب کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ہوش میں تھا اور مخالفین کو فرار ہوتا دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ کھسک کر قریب کھڑی کار کی ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھے دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''شکریہ جوان۔'' یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ کوٹ کی جیب میں رینگا جو ایک چھوٹی سے بوتل کو لیے باہر نکلا۔ ڈھکن کھول کر بوتل منہ سے لگائی، دو تین گھونٹ بھر کر اس نے گہرا سانس لیا۔

''پیو گے۔'' فراخ دلی سے دعوت دیتے ہوئے اس نے بوتل میری جانب بڑھائی۔

''شکریہ۔'' میں اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے اب آپ خود کو سنبھال لیں گے۔''

وہ متبسم ہوا۔ ''آپ کا خیال غلط ہے۔''

''بتائیے کیا خدمت کروں۔''

اس نے پوچھا۔ ''ڈرائیو کر لیتے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

'مجھے ٹھکانے تک پہنچا دو، اس کے بعد جہاں کہو گے میرے آدمی پہنچا دیں گے۔''

وقت کی میرے پاس کمی نہیں تھی کہ انکار کرتا۔ اسے سہارا دے کر میں نے کار میں بٹھایا ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ قیمتی لباس اور شان دار کار دیکھتے ہوئے اس کی حیثیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔ ایسے وقت میں جب میں ڈور کٹی پتنگ کی طرح بے مقصد پھر رہا تھا اس کی مدد سے کسی متعین راہ کی طرف قدم بڑھا سکتا تھا۔

کلچ دبا کر میں گیئر لگایا اور ریس پر پاؤں کا دباؤ بڑھا کر کار آگے بڑھا دی۔

''گلی سے نکلتے ہی دائیں مڑ جانا۔'' وہ مجھے راستہ بتانے لگا۔

سڑک پر آتے ہی اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے وشال گپتا کہتے ہیں، راجپوت گپتا کا چھوٹا بھائی ہوں۔ جو راجپوت دادا کے نام سے مشہور ہیں۔''

''سندیپ چوپڑا۔''

وہ ممنونیت سے بولا۔ ''دھنے واد سندیپ! (شکریہ) آپ کی وجہ سے میری جان بچی۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ ان اچکوں کے ہاتھ کیسے چڑھ گئے؟''

اس نے دانت پیسے۔ ''اچکے نہیں، کسی دشمن کے بھیجے ہوئے مہرے تھے، بس میرے قتل کو واردات کا رنگ دینا چاہتے تھے جو آپ کی بدولت ممکن نہ ہو سکا۔ لیکن میں سالے کے قتل کو واردات کا رنگ نہیں دوں گا۔''

میں نے بھولا بنتے ہوئے پوچھا۔ ''ایسی بھی کیا دشمن کہ بندہ جان لینے پر اتر آئے۔''

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''جیسے ان کی ٹھکائی کی، مجھے نہیں لگتا آپ شریف زادے ہیں۔''

میں برا مناتے ہوئے بولا۔ ''لڑائی بھڑائی میں طاق ہونا کسی کی شرافت پر سوالیہ نشان نہیں چھوڑتا۔''

''شما چاہتا ہوں اپنی بات کی وضاحت نہیں کر سکا۔ میرا مطلب تھا عام آدمی یوں لڑنے کے ماہر نہیں ہوتے۔ البتہ سرکاری ملازم یا غلط دھندے میں ملوث افراد ہو سکتے ہیں۔''

میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''ذاتی بچاؤ (سیلف ڈیفنس) کی تربیت حاصل کرنے والے کے بارے آپ کیا کہیں گے۔''

اس کے ہونٹوں پر کھسیانی ہنسی نمودار ہوئی۔ ''یقیناً مسلسل غلط بول کر میں اپنے محسن کو ناراض کر بیٹھا ہوں۔''

''نہیں سر، میں نے صرف صفائی پیش کی ہے۔''

''تو آپ کیا کرتے ہیں؟'' اتنی آسانی سے جان چھوٹنے پر اس نے موضوع تبدیل کرنے میں دیر نہیں کی تھی۔

میں محتاط انداز میں بولا۔ ''تعلیم کے اختتام پر کوئی نوکری نہ ملی تو شوقیہ ایک کرائے کلب میں داخلہ لے لیا۔ اب بھی کوئی کام دھندہ نہیں ہے اس لیے فی الحال تو آوارہ گردی کر رہا ہوں۔''

''پتا جی کیا کرتے ہیں۔''

''پتا جی کو سورگباشی (جنت مکین) ہوئے چار سال گزر گئے ہیں۔ امی جان ان سے ایک سال پہلے چل بسی تھیں۔ ایک بڑی بہن ہے جنھیں ڈولی میں بٹھا کر پتا جی نے میرے لیے کوئی ذمہ داری باقی نہ رہنے دی۔ اب بیوہ خالہ کے ساتھ رہتا ہوں جو مجھ سے اتنا ہی تنگ ہیں جتنا کسی بھی مفت خورے سے ہوا جا سکتا ہے۔'' مختصر سے سوال کا میں نے تفصیلی جواب دیا تھا کہ اس کے اگلے سوال یہی ہونا تھے۔

''کون سا کام کر سکتے ہو؟'' اس کا سوال میری منشا کے مطابق آیا تھا اور جواب پہلے سے تیار تھا۔ اطمینان سے کہا۔

''دولت مند بننا چاہتا ہوں۔''

''میں نے کام کا پوچھا ہے۔'' اس نے سوال دہرایا۔

''بتایا نا دولت مند بننا چاہتا ہوں کام کوئی بھی ہو کرلوں گا۔''

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''قتل کرلو گے۔''

سرخ اشارے پر بریک دباتے ہوئے میں نے اس کی آنکھیں میں دیکھا۔ ''قتل کرنے کو میں کام نہیں سمجھتا۔''

اس نے قہقہہ بلند کیا۔ ''اغواء، ڈکیتی، چوری، جیب تراشی.....''

''یہ سب کرنے کو مجھے کسی کا ملازم بننے کی کیا ضرورت ہے۔''

وہ مجھے لاجواب کرتا ہوا بولا۔ ''تبھی تصدیق چاہی تھی کہ کیا کر سکتے ہو۔''

''کوئی بھی شریفانہ کام۔'' اشارہ سبز ہو گیا تھا۔ بریک سے پاؤں ہٹا کر میں نے ریس پر رکھ دیا۔

وہ استہزائی انداز میں بولا۔ ''بال کاٹنے کے بارے کیا خیال ہے۔''

میں گڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''میں بس کسی غریب کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''تو کسی غریب کو اغواء کوئی پاگل ہی کرے گا۔ اور غریب کے گھر کچھ ہوگا تو ڈاکا مارا جائے گا۔''

میں نے چپ سادھ لی۔

''چوک سے دائیں۔''

موڑ کاٹ کر میں نے گلا کھنکارا۔ ''آپ مجھے اپنے محافظوں میں بھی تو شامل کر سکتے ہیں۔ لڑائی بھڑائی جانتا ہوں، اور سکھاؤ گے تو یقیناً ہر قسم کے اسلحے کا استعمال سیکھ لوں گا۔''

وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ ''اڈے پر چل کر گپ شپ کریں گے۔'' ساتھ ہی اس نے ذیلی سڑک پر جانے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک وسیع عمارت کے چوڑے دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ کار پہچانتے ہی چوکیدار نے بغیر پوچھے دروازہ کھول دیا تھا۔

سیمنٹ کی پختہ روش پر چلتے ہوئے میں نے کھلے صحن میں پہلے سے موجود گاڑیوں کے قریب کار روک دی۔ تین چار موالی قریب آ گئے تھے۔ ان میں ایک نسبتاً بہتر لباس میں تھا۔

نیچے اترتے ہی وشال گپتا نے اس کا گریبان پکڑتے ہوئے دو تھپڑ جڑ دیئے تھے۔

''سالے حرامی تو سویا ہوا ہے۔ وہ ماں کے خصم آج اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہوتے اگر مجھے اس دلیر جوان کی مدد نہ ملی ہوتی۔''

''بب..... باس! سالے محافظوں کی جیپ کھراب (خراب) ہو گئی تھی۔ اپن نے کافی گھنٹیاں بجائیں مگر تم نے گھنٹی نہ اٹھائی۔''

وشال گپتا نے ایک اور تھپڑ کھینچ مارا۔ ''میرے ساتھ خراب جیپ بھیجی کیوں تھی؟''

وہ ہکلایا۔ ''شش..... شما کر دو باس، اپن آئندہ کھیال (خیال) رکھے گا۔''

''مجھ پر حملہ کرنے والوں میں بلی آنکھوں والا کنجر، استاد سنگھا ساتھ تھا۔ اسی سے باقی دو کا پتا چلے گا۔ صبح ہونے سے پہلے وہ تینوں مجھے ہر حالت میں چاہئیں۔''

وہ جلدی سے بولا۔ ''اپن ابھی ان کی تلاش میں بندے بھیجتا ہے۔''

''اس لڑکے کی اچھی خاطر تواضع کرو، بہترین رہائش مہیا کرو، اگر شکایت کا موقع ملا تو کھال میں بھس بھر دوں گا۔ اور میرے کمرے میں ڈاکٹر بھیج دو۔'' اسے ہدایت دے کر وشال گپتا میری طرف متوجہ ہوا۔ ''سندیپ، فی الحال آرام کرو بعد میں تفصیلی بات چیت ہوگی۔''

''جی سر۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

کتنے شیریں ہیں ترے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

کے مصداق وہ سیکرٹری نما شخص مجھے خندہ پیشانی سے ملا۔ ''شکریہ دوست، تمھاری وجہ سے اپن کی جان بچ گئی۔''

''آپ کی؟'' میں نے حیرانی ظاہر کی۔

اس نے وضاحت کی۔ ''اگر وشال صاحب کو کچھ ہو جاتا تو راجپوت دادا نے سالا بغیر صفائی مانگے اپن کی گردن اتار دینا تھی۔''

''پھر تو آپ کو جان بچنے پر مبارک ہو۔''

اس نے فوراً تعارف کرایا۔ ''اپن کا نام راجیو ورما ہے۔''

''سندیپ چوپڑا.....'' میں نے جوابی تعارف کرایا۔

''چلیں۔'' اس نے اندرونی عمارت کی طرف اشارہ کیا اور میں اس کی معیت میں چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد ہم پر تعیش مہمان خانے میں بیٹھے تھے۔ وہ کمرہ خصوصی مہمانوں کے استعمال میں رہتا ہوگا تبھی اتنا پر آسائش اور آرام دہ تھا۔ کھانا میں کھا کر آیا تھا اس لیے صرف تازہ جوس پینے پر اکتفا کیا تھا۔ اس نے چند قیمتی مشروبات کی پیش کش بھی کی تھی مگر میرے نزدیک ان کی اہمیت گٹر کے پانی جتنی تھی۔ تبھی خوب صورتی سے ٹال گیا تھا۔

—●—

رات کو پر تکلف عشائیے (ڈنر) کے بعد میں وشال گپتا کے بلاوے کا انتظار کرتے کرتے سو گیا تھا۔ گو دل کے کسی کونے میں پہچانے جانے کا ہلکا سا خوف موجود تھا کہ یہ خوف جاسوس کو ہر وقت لاحق رہتا ہے۔ لیکن یہ تسلی بھی تھی کہ وشال میرا احسان مند تھا۔ مجھے فائدہ نہ بھی پہنچاتا، نقصان پر بھی جری نہیں ہو سکتا تھا۔

رات کو جلد سونے کے باوجود صبح دیر سے آنکھ کھلی تھی۔ ناشتے کے تھوڑی دیر بعد ہی وشال گپتا کا بلاوا آ گیا تھا۔ اس عمارت کے تین بڑے حصے تھے۔ ایک وشال گپتا کے لیے مختص تھا۔ اور اس جانب کوئی نہیں جاتا تھا، دوسرا مہمان خانہ اور محافظوں کی رہائش بنی تھی۔ جبکہ کشادہ تہہ خانے میں جمنازیم، پستول شوٹنگ رینج اور لڑائی کا رنگ بنا تھا۔ اوپر کے دونوں حصوں کو ایک راہداری جدا کرتی تھی۔ اور اسی راہداری میں تہہ خانے تک جانے کا رستہ تھا۔

راجیو ورما کی معیت میں چلتے ہوئے میں وشال گپتا کے پاس پہنچا۔ وہ اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ شیشے کا نازک اور خوب صورت گلاس سنہری سیال سے آدھا لبریز اس کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر تبسم ابھرا۔ راجیو کو جانے اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ بولا۔

''سوری یار! تمھیں انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی، میں انتظام کے چکر میں پڑ گیا تھا۔''

نشست سنبھالتے ہوئے میں نے خوش دلی سے پوچھا۔ ''کوئی سمجھوتا (کامیابی) ملی؟''

خالی گلاس میں تھوڑا سا مشروب انڈیل کر اس نے میری طرف کھسکاتے ہوئے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ ''شمشان گھاٹ (ہندوؤں کا قبرستان) تک پہنچا دیا ہے، اب گھر والے کریا کرم (آخری رسومات) کر لیں گے۔''

میں نے گلاس واپس ان کی طرف دھکیلتے ہوئے حیرانی ظاہر کی۔ ''بڑی جلدی پکڑے گئے۔''

میرے شراب نہ پینے پر تبصرہ کیے بغیر وہ فلسفیانہ لہجے میں بولا۔ ''بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاشنا یقیناً ناممکن سمجھا جاتا ہے، مگر مقناطیس پاس ہو تو تھوڑی سی محنت کی ضرورت پڑتی ہے۔''

''آپ کے پاس کون سا مقناطیس تھا۔''

''دولت بہت بری چیز ہے یار! اس کے حصول کو لوگ کیا کچھ نہیں کرتے۔ یہ ایسا مقناطیس ہے کہ دلوں سے محبت و ہمدردی کھینچ لیتی ہے۔ میں نے بھی یہی مقناطیس استعمال کیا۔ ان کے گروہ کے اپنے آدمیوں نے ان کے چھپنے کی جگہ کی مخبری کی۔''

میں ہنسا۔ ''مخالفین تو سخت طیش میں ہوں گے۔''

وہ اطمینان سے بولا۔ ''دشمن کو مارنے سے زیادہ غصہ دلانے میں مزہ آتا ہے۔''

''میرے بارے کیا سوچا۔'' میں اصل موضوع پر آیا۔

''میرے محافظ کو لڑائی بھڑائی کا ماہر ہونے کے ساتھ اسلحے کا اچھا شناور ہونا چاہیے۔''

میں نے دامنِ امید دراز کیا۔ ''آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا، کمی بیشی آپ نکال دینا۔''

''جانچ بغیر فیصلہ نہیں کر سکتا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرانی ظاہر کی۔

اس نے قہقہہ لگایا۔ ''مذاق کر رہا تھا یار، تم کل سے میرے محافظوں میں شامل ہو گے۔ فی الحال راجیو کے پاس لے جاتا ہوں تاکہ تمھیں پستول وغیرہ چلانا سکھا دے۔''

''میں تیار ہوں۔'' بغیر کسی ہچکچاہٹ میں نے ہامی بھری۔ اس کا محافظ بن کر دھیرندر شکلا کو ڈھونڈنا اور ٹھکانے لگانا آسان ہو جاتا۔ زیرِ زمین گروہ اسلحے اور نشہ آور اشیاء کی اسمگلنگ میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ اور اسلحے کے ضمن میں دھیرندر شکلا بھارت کا سب سے بڑا ڈیلر تھا۔ نہ صرف انڈین آرمی کو اسلحے کی سپلائی کرتا بلکہ غنڈوں اور حکومت مخالف تنظیموں کے ساتھ بھی اس کے روابط تھے۔ مگر وہ جس مقام پر تھا اس تک عام آدمی کی رسائی دشوار ترین تھی۔ بہت زیادہ سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ پرما انصاری کو ڈھونڈنے کے بجائے دھیرندر شکلا کو ٹھکانے لگانے کی جستجو کرنا زیادہ مناسب تھا۔ اس کے بعد پرما انصاری کا حصول زیادہ دشوار نہ ہوتا۔ گو دھیرندر شکلا کی پہلی رہائش گاہ آگرہ میں تھی لیکن وہاں مستقل ٹھکانہ نہیں تھا۔ ملک کے چند بڑے شہروں میں اس کے ٹھکانے موجود تھے اور اب پہلا مرحلہ اسے ڈھونڈنے کا تھا۔ اس کی روزمرہ سے واقف ہو کر ہی آگے کا لائحہ عمل طے کیا جا سکتا تھا۔ اور اس کے لیے وشال گپتا کا محافظ بننا کافی فائدہ مند ہو سکتا تھا۔

''چلیں پھر۔'' گلاس سے آخری گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے نشست چھوڑ دی۔ ہم سٹنگ روم میں بیٹھے تھے۔ جو اس کی خواب گاہ سے متصل تھا۔ عمارت کے اندر اس کی رہائش ایک علیحدہ مکان جیسی بنی تھی۔ وہاں سے نکل کر ہم چوڑی راہداری میں داخل ہوئے جہاں سیڑھیاں نیچے اتر رہی تھیں۔ راہداری کے دوسرے پر ایک اور دروازہ تھا جو دوسری راہداری میں کھلتا جہاں محافظوں کی رہائش گاہ اور مہمان خانہ بنا تھا۔

سیڑھیوں کا اختتام ایک وسیع ہال میں ہو رہا تھا۔ ہال کے ایک کونے میں جمنازیم اور درمیان میں باکسنگ رنگ بنا تھا۔ تین جوڑیاں رنگ کے باہر مشق کر رہی تھیں اور دو جوڑیاں رنگ کے اندر ایک دوسرے پر داؤ پیچ آزما رہی تھیں۔ انھیں نظر کرتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔ اگلا دروازہ کھول کر ہم چند سیڑھیاں طے کر کے نیچے اترے۔ آگے جو ہال تھا اس کی چوڑائی کم اور لمبائی زیادہ تھی۔ وہ ایک جدید شوٹنگ رینج تھی۔ وہاں پچاس میٹر کے فاصلے تک فائر کی سہولت موجود تھی۔ اور پستول کے لیے یہ رینج کافی سے بھی زیادہ تھی۔ پستول ہمیشہ دو بدو اور قریب کی لڑائی میں استعمال ہوتا ہے۔ گو فلموں میں تو ہیرو اس سے بیلی کاپٹر بھی گرا لیتے ہیں مگر حقیقی زندگی میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ اچھے پستول کی گولی بھی چالیس پچاس میٹر کے

بعد طاقت کھونے لگتی ہے۔پستول سے نشانہ بھی پندرہ بیس میٹر کے دائرے ہی میں درست لگتا ہے۔فاصلہ بڑھنے سے جہاں گولی کی طاقت میں کمی آتی ہے وہیں نشانے کی درستی بھی غیر یقینی ہوتی جاتی ہے۔اس کے علاوہ پستول کی گولی کی بناوٹ بھی گول ہوتی ہے۔اگر چھوٹے ہتھیاروں کے ایمونیشن کی بات کی جائے تو ایک کارتوس کے تین حصے ہوتے ہیں۔پہلا کیس یا کھوکا جس میں بارود بھرا ہوتا ہے۔یہ پیتل کا بنا ہوتا ہے اور اس کے پیندے میں پرائمر لگا ہوتا ہے۔کارتوس کے اندر دھواں پیدا نہ کرنے والا بارود بھرا ہوتا ہے جو کہ دانوں کی شکل میں ہوتا ہے۔اس میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ آگ ملنے پر ایک دم اور تیزی سے جلتا ہے اور بہت ساری گیس پیدا کرتا ہے جو کہ گولی کو ساتھ اڑا کر لے جاتی ہے۔جبکہ گولی کارتوس کے اگلے سرے پر لگی ہوتی ہے اور نوکدار ہوتی ہے۔یہ سیسے کی بنی ہوتی ہے اور اس کے اوپر تانبے کا خول ہوتا ہے۔یہ شکل میں لمبی ہوتی ہے تا کہ ہوا کے خلاف اپنی رفتار قائم رکھ سکے۔البتہ پستول کی گولی جیسا کہ پہلے ذکر کر چکا ہوں ہلکی گولائی لیے ہوتی ہے،تبھی ہوا کے خلاف زیادہ مزاحمت نہیں کرتی۔یوں بھی پستول صرف قریبی لڑائی میں استعمال ہوتا ہے۔آرمی میں پستول کا استعمال تربیت یافتہ کمانڈوز یا آفیسرز کرتے ہیں۔ان کے علاوہ سنائپرز کے پاس بھی سنائپر رائفل کے علاوہ پستول موجود ہوتا ہے۔عام فوجی،رائفل ہی استعمال کرتے ہیں۔جس میں سرفہرست جی تھری اور کلاشن کوف ہیں۔

اب ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو یہ بھی یاد رکھیں کہ مختلف پستولوں کے قطر مختلف ہوتے ہیں۔جیسے تیس بور،نائین ایم ایم اور اڑتیس بور بہت مشہور ہیں۔قطر مختلف ہونے کی وجہ سے ایمونیشن بھی مختلف ہوتا ہے۔بین الاقوامی سطح پر استعمال ہونے والے اچھی ساخت کے اکثر پستولوں کا قطر 9 ایم ایم ہے۔جیسے گلاک،بریٹا،ہیکلر اینڈ کوچ،زگانا (زگانا میں 30 بور بھی دستیاب ہے) ڈزرٹ ایگل وغیرہ۔

راجیو در ماوہاں پہلے سے موجود تھا۔شوٹنگ رینج جدید سہولیات سے مزین تھی۔چار لکڑی کے کیبن بنے تھے جہاں چار فائرر بیک وقت چار ہدفوں پر فائر کر سکتے تھے۔ہدف متحرک تھے۔بٹن دبا کر ہدف کو اپنی مرضی سے آگے پیچھے کیا جا سکتا تھا۔

راجیو نے آگے بڑھ کر ہمیں خوش آمدید کہا۔

دشال بولا۔"تمھارا نیا شاگرد آ گیا ہے،اسے پستول کا استعمال مکمل سکھا دو۔"

راجیو اعتماد سے بولا۔"آپ فکر ہی نہ کریں باس،اپن ہے نا.....شام تک بابو سالے رجنی کانت (انڈین فلموں کا پرانا ہیرو) کا مافک گولیاں پھوڑنکے گا۔"

دشال سر ہلاتا ہوا ایک کیبن میں گھس گیا۔بٹن دبا کر اس نے ہدف کو مناسب فاصلے پر پیچھے دھکیلا اور جیب سے پستول نکال کر فائر کرنے لگا۔اپنے کانوں پر اس نے ایئر گارڈ (کانوں کو فائر کی آواز سے محفوظ رکھنے والے حفاظتی غلاف) چڑھا لیے تھے۔

راجیو مجھے ایک میز کے قریب لے گیا جہاں گلاک سیون ٹین سیمی آٹو میٹک رکھا ہوا تھا۔میں کئی قسم کے پستول استعمال کر چکا ہوں،مگر گلاک ہمیشہ سے میرا پسندیدہ رہا ہے۔گلاک دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔

راجیو نے پوچھا۔"کبھی پستول چلایا ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔"چند مرتبہ چلایا ہے۔"

"شاباش،پھر تو مسئلہ ہی کوئی نہیں۔اب پستول چلانے سے پہلے چند کھسوی (خصوصی) باتیں مگج (مغز) میں بٹھا لو۔کیوں کہ سالا،خالی لبلبی (ٹریگر) دبانا پستول چلانا نہیں ہوتا۔ایک فائرر سالے کو پستول کے بارے ضروری باتوں کا بھی

پتا ہونا چاہیے۔ یہ سالا بہت عمدہ اور کھاس (خاص) ساخت کا پستول ہے۔ پہلے تم کا میگزین میں گولیاں بھرنے کے بارے سیکھاؤں گا....." راجیو مجھے بنیادی باتیں بتانے لگا۔ میں پوری دلچسپی سے سیکھنے لگا۔ ایک دم تربیت کے ابتدائی دن نظر میں گھوم گئے تھے۔ ہماری تربیت کی شروعات رائفل سے ہوئی تھی۔ پستول کے بارے ہم نے بہت بعد میں سیکھا تھا۔ پستول اور رائفل کے فائر میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اگر میں تفصیل میں جاؤں تو شاید یہ ناول کے بجائے سکھلائی کی کتاب بن جائے، اس لیے موضوع کی طرف پلٹتے ہیں۔

میگزین میں گولیاں بھرنے کے بعد راجیو میگزین چڑھانے اتارنے، پستول کاک کرنے، سیفٹی لگانے، نشانہ سادھنے کے بارے سمجھانے لگا۔ اس دوران وشال گپتا وہاں سے جا چکا تھا۔

گھنٹا ڈیڑھ سکھلائی کے بعد راجیو عملی مظاہرے کو مجھے ایک کیبن میں لے گیا۔

پہلے اس نے خود فائر کیا اور دس میٹر کے فاصلے پر بہ مشکل پانچ گولیاں مار سکا تھا۔ ہدف پر اس کی بکھری ہوئی گولیاں دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ فائر کی جو تکنیکیں مجھے اپنے استاد تصور صاحب، فیاض صاحب وغیرہ نے سکھائی تھیں وہ راجیو بے چارے نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوں گی۔ جاسوس بن کر ایک اناڑی کی شاگردی اختیار کرنا پڑ گئی تھی۔ یقیناً سردار مجھے اس حالت میں دیکھ لیتا تو اس کی ہنسی نہ رکتی۔ کہاں ایس ایس اور کہاں راجیو ورما۔ اور پھر دس میٹر کے فاصلے پر گلاک سیون ٹین سے ہدف پر گولی نہ مارنے کی خبر اگر تصور صاحب تک پہنچ جاتی تو انھوں نے مجھے کچا ہی چبا جانا تھا۔

بہ ہر حال میں سکھلائی میں پوری دلچسپی اور شوق ظاہر کرتا رہا۔ تین چار باریوں کے بعد میرا نشانہ بہتر ہونا شروع ہو گیا اور ساتویں آٹھویں باری پر راجیو میری پیٹھ تھپتھپا رہا تھا۔

آخر کار اس کے ہونٹوں سے نکلا۔ "تم کا فائر تو استاد سے بھی اچھا ہو گیا ہے رے۔"

میں اسے تسلی دیتا ہوا بولا۔ "استاد تو استاد ہوتا ہے راجیو صاحب۔"

"عجیب بات ہے سالا تم نے پانچ کی پانچ گولیاں دائرے کے اندر ٹھوک دیں۔ ایسا تو شاید وشال صاحب بھی نہ کر سکیں۔ حالاں کہ ان کا فائر بہت اچھا ہے۔"

میں بے پروائی سے بولا۔ "اتفاقاً لگ گئی ہوں گی یار۔"

اس نے ہدف کا فاصلہ بڑھا کر پینتیس میٹر کر دیا۔ مجھے شرارت سوجھی اور میں نے ساری گولیاں ہدف کے سر نما ڈیڑھ انچ کے گروپ میں مار دیں۔ کیبن میں سکرین لگی تھی، جس پر ہدف کا قریبی نظارا (کلوز ویو) نظر آ رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سکرین کو گھورتے ہوئے بڑبڑایا۔

"سندیپ، سالا تم نے کمال کر دیا رے۔ یہ مظاہرہ اگر وشال صاحب کے سامنے کر دے تو اپن کا انعام تو کہیں نہیں گیا۔"

"پہلے نشانہ پکا تو لوں۔" دس گولیاں بھر کر میں نے میگزین چڑھائی اور پہلے کی طرح تمام ہدف کے سر میں ٹھوک دیں۔ راجیو نے باقاعدہ تالیاں بجا کر مجھے داد دی تھی۔

"ماں قسم، جندگی (زندگی) میں پہلی بار سالا تمھارے ماتک اچھا شاگرد ملا ہے۔"

میں نے مکھن لگایا۔ "اس میں سارا کمال آپ کی سکھلائی کو جاتا ہے استاد۔"

وہ چھاتی چوڑی کرتے ہوئے بولا۔ "چلو، باس کے پاس، سالا انھیں بھی پتا چلے اپن میں گن ہیں۔"

"پستول کی صفائی نہیں کرنا۔" اسے پستول پتلون میں اڑستے دیکھ کر بے ساختہ میرے ہونٹوں سے نکلا تھا۔

''یہ سالا کون سا کیچڑ میں گرا کہ صفائی کی ضرورت پڑے گی۔'' وہ منہ بناتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اور میں دل ہی دل میں ان گالیوں کو سوچنے لگا جو پستول کی زبان ہونے کی صورت راجیو کو پڑتا تھیں۔ ایسا بندہ تصور صاحب کے سامنے چڑھ جاتا تو اس کا زندہ بچنا ناممکنات سے تھا۔ اور بالفرض زندہ بچ بھی جاتا پاؤں پر چلنے کے قابل نہ رہتا۔

فائر کے بعد ہتھیار کی صفائی نہ کرنے کو وہ ایسا ہی سمجھتے تھے جیسے بندہ پاخانے کے بعد استنجا نہ کرے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ فائر کے بعد اگر ہتھیار کو اچھے طریقے سے صاف نہ کیا جائے تو ہتھیار جلد ہی ناکارہ ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ کسی بھی ہتھیار کی کارکردگی کا انحصار اس کی بیرل اور چال والے پرزے ہوتے ہیں۔ فائر کے بعد بیرل میں بارود اور سیسے کے ذرات چمٹ جاتے ہیں۔ اگر انھیں صحیح طریقے سے صاف نہ کیا جائے تو جلد ہی بیرل کو زنگ آلود کر دیتے ہیں۔ جس سے بیرل میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ یوں سب سے پہلے تو ہتھیار کی درست نشانے بازی میں فرق پڑتا ہے اور آہستہ آہستہ ہتھیار فائر کے قابل ہی نہیں رہتا۔ وہ پستول میری ملکیت نہیں تھا مگر ہتھیاروں سے قدرتی لگاؤ کی وجہ سے مجھ پر راجیو کے فعل کا برا اثر پڑا تھا۔ بہ ہر حال میں بحث و تکرار کی حالت میں نہیں تھا۔

وشال گپتا کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اچانک اس کی نظر اپنے آدمی پر پڑی۔

''ابے سالے گنپت تو کاہے بکری کا مافک نکما پھر رہا ہے۔''

گنپت جلدی سے بولا۔ ''استاد صفائی کروا رہا ہوں۔''

وہ پستول اس کی جانب پھینکتے ہوئے بولا۔ ''کافی فائر کیا ہے، اس سالے کو بھی جھاڑ پھونک لے۔'' اس نے میرے خیالات پڑھ لیے تھے یا شاید پہلے جلدی کی وجہ سے پستول کی صفائی کو غیر ضروری جانا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا پستول کو صاف کرنا اسے اپنی شان کے خلاف لگ رہا ہو۔ بہ ہر حال کچھ بھی تھا کم از کم میرے دل پر پڑا بوجھ کچھ کم ہوا تھا۔

گنپت نے پستول کو ہوا میں پکڑتے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں۔ ''جی استاد۔'' کہا۔

''باس کمرے میں ہے؟''

گنپت بولا۔ ''کہیں باہر گیا ہے۔''

راجیو مجھے مخاطب ہوا۔ ''تم آرام کرو، استاد کی واپسی پر بات ہو گی۔'' اور میں سر ہلاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن آرام نہ آیا اور عمارت کا جائزہ لینے نکل گیا۔ ایک جاسوس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اپنے فرار کا رستہ نگاہ میں رکھے۔ وشال گپتا کا مہمان ہونے کی وجہ سے کسی نے تعرض نہ کیا تھا۔ پوری عمارت میں گھوم کر میں نے باریک بینی سے جائزہ لیا۔ عمارت کی عقبی دیوار میں چار کوارٹر بنے تھے۔ جس میں ملازموں کی رہائش تھی۔ عقبی جانب دروازہ بھی موجود تھا جسے تالہ لگا تھا۔ اور وہاں کوئی چوکیدار وغیرہ موجود نہیں تھا۔ عمارت کے چاروں جانب گلیاں موجود تھیں۔ کوئی بھی دوسرا مکان عمارت سے متصل نہیں تھا۔ پوری عمارت میں گھومنے کے بعد میں چھت پر چڑھ گیا۔ میرا انداز ایسا تھا جیسے بوریت دور کرنے کو مٹرگشت کر رہا ہوں۔

چھت مجھے خالی نظر آئی تھی۔ وہاں سے عمارت کے چاروں جانب کی نگرانی ہو سکتی تھی، مگر وشال گپتا نے پہرے دار مقرر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یقیناً اسے کسی سے اتنی جرأت کی توقع نہیں تھی کہ وہاں ہلہ بول سکتا۔

گھنٹے ڈیڑھ کی مفید چہل قدمی کے بعد میں واپس کمرے میں آ گیا تھا۔

—●—

وشال گپتا سے شام کو ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے میری نشانہ بازی دیکھنے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ البتہ شاباش دے کر راجیو کو خوش ضرور کر دیا تھا۔ راجیو کو جانے کا اشارہ کر کے اس مجھے بیٹھنے کو کہا اور کام سمجھانے لگا۔ میرے علاوہ اس

کے تین محافظ اور بھی تھے۔ تینوں کی رہائش اسی عمارت میں تھی۔ وشال اپنے کارندوں سے زیادہ بے تکلف نہیں ہوتا تھا لیکن احسان مند ہونے کی وجہ سے مجھے زیادہ اہمیت دے رہا تھا۔ ضروری باتیں اور سینئر کارندوں کی عزت و احترام کا بھاشن دینے کے بعد وہ مجھے اپنے کوت میں لے گیا۔ (کوت کا لفظی معنی ہتھیاروں کی الماری ہے۔ آرمی میں کوت اس کمرے کو کہتے ہیں جہاں ہتھیار رکھے جاتے ہیں)

ڈرائینگ روم سے ملحق ایک چھوٹا سا کمرہ ہتھیاروں سے سجا تھا۔ وہ نت نئے ہتھیار جمع کرتا رہتا تھا۔ راجیو سے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ وشال گپتا ایک شوٹنگ کلب کا باقاعدہ ممبر تھا۔ اور ہتھیاروں کا جنون کی حد تک شیدائی تھا۔ جب جیب میں پیسہ ہو اور قانون کا خوف نہ ہو تو ایسا کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ اس کا کوت دیکھتے ہوئے مجھے راجیو کی بات پر عین الیقین حاصل ہو گیا تھا۔ دیواروں پر بیسیوں اقسام کے اعلیٰ کوالٹی کے پستول اور رائفلیں ٹنگی تھیں۔ ڈریگنوو، گلیل، بیرٹ 107، ووڈانسک یہ چار قسم کی سنائپر رائفلیں اور اس کے علاوہ چند اقسام کی یورشی رائفلیں (اسالٹ رائفلیں) تھیں جن میں انڈیا کی انساس، AK47 یعنی کلاشن کوف اور جی ٹو قابل ذکر ہیں۔ ان میں ووڈانسک انڈیا کی اپنی بنی ہوئی سنائپر اور اینٹی میٹریل رائفل ہے۔ جو آرڈننس فیکٹری ترو چراپالی کی تیار کردہ ہے۔ اس کی خاص بات یہ کہ اسے کھولے بغیر تین قسم کی بیرل 5.14، 7.12 اور 20 ایم ایم استعمال کی جاسکتی ہیں۔ مگر بیرٹ 107 کارکردگی اور درستی کے لحاظ سے اس سے کئی گنا بہتر تھی۔ ووڈانسک وزن میں بھی، بیرٹ سے کافی بھاری ہے۔ یوں اس کی اہمیت اور بھی کم ہو جاتی ہے۔ مجھے ووڈانسک استعمال کرنے موقع نہیں ملا تھا۔ البتہ باقی تینوں رائفلیں میں استعمال کر چکا تھا۔

''ان میں سے اپنی پسند کے دو پستول لے لو۔'' وشال گپتا میری محویت میں مخل ہوا۔

''جج..... جی سر۔'' میں ہکلا گیا تھا۔

اس نے پوچھا۔ ''تم تو یوں آنکھیں پھاڑ کر ہتھیاروں کو دیکھ رہے ہو جیسے پہلی بار موقع ملا ہو۔''

میں نے بات بنائی۔ ''فلموں میں کافی بار دیکھے ہیں سر۔''

وہ ہنسا۔ ''فلموں میں اصل ہتھیار نہیں ہوتے بے وقوف۔''

میں خفیف ہوتے ہوئے بولا۔ ''مجھے کیا پتا سر۔''

''مجھے سر نہیں باس بولا کرو۔'' نرم لہجے میں تنبیہ کرتے ہوئے اس نے دوبارہ دعوت دی۔ ''اپنی پسند کے پستول لے لو۔''

میں سادگی سے بولا۔ ''جس پستول کے ساتھ آج فائر کیا ہے، اسی جیسا ٹھیک رہے گا۔''

وشال گپتا نے قہقہہ بلند کیا۔ ''اچھا انتخاب ہے۔'' اور دو گلاک میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ ایک ہی کمپنی کے ہیں۔''

وہ نہ بھی بتاتا تو نیم خودکار (سیمی آٹو میٹک) گلاک سیون ٹین اور خودکار (آٹو میٹک) گلاک ایٹین کو پہچانا میرے لیے اتنا ہی آسان تھا جتنا کسان چنے و گندم کے فرق کو پہچانتا ہے۔

میں پستول پتلون میں اڑسنے لگا۔

''ٹھہرو۔'' کہہ کر اس نے مجھے روکا اور چمڑے کا نفیس و ملائم ہولسٹر پکڑوا دیا۔ جس میں دو پستول رکھے جا سکتے تھے۔ ساتھ ہی باندھنے کا طریقہ بھی سمجھا دیا۔

اگلے دن سے میری ڈیوٹی شروع ہوگئی۔اس سے پہلے ہی وشال کے کہنے پر راجیو کالے رنگ کے تین تھری پیس سوٹ میرے لیے لے آیا تھا۔کوٹ کے نیچے ہولسٹر باندھ کر میں خود کو سچ مچ محافظ محسوس کر رہا تھا۔مجھ سے پہلے وشال کے محافظوں میں اجیت سنگھ اور موہن سنگھ دو سکھ اور ایک ہندو شنکر داس شامل تھے۔تینوں لمبے تڑنگے اور کسرتی جسم کے مالک تھے۔انھوں نے تمسخرانہ نگاہوں سے میرا استقبال کیا تھا۔مگر میں نے توجہ دیئے بغیر خندہ پیشانی سے مصافحہ کیا۔ان کی جیپ، وشال گپتا کی کار کے عقب میں ہوتی تھی۔وہ اپنی کار میں کبھی اکیلا اور کبھی ڈرائیور کے ہمراہ ہوتا تھا۔میری آمد کے پہلے ہی دن اس نے ڈرائیور کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''میری کار سندیپ ہی ڈرائیو کرے گا۔''

اگلے چند دن کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا تھا۔میری کوشش تھی کہ وشال گپتا کے محافظوں سے تعلقات خوش گوار رکھوں، کیوں کہ ان سے کافی معلومات مل سکتی تھیں۔دھیرندر شکلا کے بارے معلومات لینے کو مجھے وشال کے ہاں نوکری کی ضرورت نہیں تھی۔بلکہ اس کا محافظ بننے کا مطلب ممبئی میں آزادی سے گھومنے کا پروانہ حاصل کرنا تھا۔وشال گپتا، راجپوت دادا کا چھوٹا بھائی تھا اور راجپوت دادا کی ممبئی میں خاص پہچان تھی۔

کوشش کے باوجود میں وشال گپتا کے محافظوں سے بے تکلف نہیں ہو پایا تھا۔نہ جانے انھیں مجھ سے کیا پرخاش تھی۔شاید وشال کا مجھے بہت زیادہ توجہ دینا انھیں اچھا نہیں لگا تھا یا شاید مجھے خود سے کمتر سمجھتے تھے۔کیوں کہ تینوں کے قد چھے فٹ سے نکلتے ہوئے تھے، صحت مند اور ہٹے کٹے، جبکہ میں درمیانے قد اور چھریرے بدن کا ہوں۔

اس دوران چند بار راجپوت دادا کا سامنا بھی ہوا۔مگر اس نے مجھے قابل توجہ نہیں جانا تھا۔گو اس نے مجھے سلطان دادا کے ہاں دیکھا تھا لیکن تب میری چھوٹی داڑھی، مونچھیں اور لمبے بال تھے۔اب میں نے کلین شیو کرا کے سر کے بال فوجی کٹ ترشوائے ہوئے تھے۔جس کی وجہ سے حلیہ کافی بدل گیا تھا۔چھوٹی موٹی تبدیلیاں ہی انسان کے حلیے کو بدل دیتی ہیں۔یوں جس سے سرسری ملاقات ہوئی ہو وہ شناخت نہیں کر پاتا۔البتہ دیرینہ آشنا آسانی سے پہچان لیتے ہیں۔اور وہاں مجھے بھی طرح پہچاننے والا صرف ڈینو ہی تھا جو باقی نہیں رہا تھا۔

وشال گپتا کے ہمراہ کئی اہم اور خاص شخصیتوں سے ملاقات ہوئی۔جرائم کے دھندوں کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔وہ اسلحے، نشہ آور اشیاء اور ولایتی شراب کی اسمگلنگ میں پیش پیش تھے۔بھتہ خوری، چھوٹی موٹی ڈکیتیاں، اغواء برائے تاوان کی وارداتیں نچلے درجے کے کارندے اپنے طور پر کرتے رہتے تھے۔چونکہ لوگوں کو رعب میں رکھنے کو یہ کارروائیاں ضروری سمجھی جاتی ہیں اس لیے راجپوت دادا اور وشال گپتا اپنے کارندوں کی حرکات سے آنکھیں میچے رکھتے تھے۔

ایک دن شوٹنگ کلب جانے کا اتفاق ہوا۔کلب ممبئی کے مضافات میں بنا تھا۔کلب کی عمارت کے احاطے ہی میں پارکنگ بنی ہوئی تھی۔قیمتی گاڑیوں کی بہتات دیکھ کر مجھے لگا کوئی خاص پروگرام ہے۔سیکیورٹی کا خاص انتظام بھی میرے اندازے کی تصدیق کر رہا تھا۔باقی محافظوں کو پارکنگ میں رکنے کا کہہ کر وشال مجھے ساتھ لیے کلب کی اندرونی عمارت کی طرف بڑھا۔دروازے پر ہم سے ہتھیار اور موبائل فون جمع کر کے ٹوکن دے دیئے گئے تھے۔اندر ایک بڑے ہال میں کافی رونق نظر آ رہی تھی۔قیمتی صوفہ سیٹ اور آرام دہ کرسیاں ایک ترتیب سے لگی تھیں۔سامنے ایک اسٹیج تیار کیا گیا تھا جیسے کوئی سٹیج چلنا ہو۔اسٹیج پر ایک بڑی سکرین لگی تھی ساتھ ہی روسٹرم رکھا تھا۔حاضرین میں عربی لباس میں بھی چند افراد نظر آئے۔یقیناً ان کا تعلق خلیجی ریاستوں سے تھا۔

اہم افراد کے ہمراہ آنے والے محافظوں اور ملازموں کے لیے دیوار کے ساتھ اسٹول رکھے تھے۔وشال گپتا کے اشارے پر میں ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔وہ خود وی آئی پی نشستوں کی جانب بڑھ گیا تھا۔

خوب صورت و مختصر لباس میں ملبوس لڑکیاں مختلف مشروبات اور لوازمات کے بھرے ہوئے ٹرے اٹھا کر درمیان میں گھوم رہی تھیں۔ جن میں مختلف قسم کی شرابیں، کولڈ ڈرنگ اور جوس شامل تھے۔ کھانے میں پھل، خشک میوہ جات، بھنا اور ابلا ہوا گوشت، بسکٹ، کیک وغیرہ کی بہتات تھی۔ مگر اس میں سے کچھ بھی ملازموں کے لیے نہیں تھا۔ میں خود کو زمانہ قدیم کی کسی رومی تقریب کا حصہ سمجھ رہا تھا جہاں غلاموں اپنے آقاؤں کو کھاتے پیتے دیکھ سکتے تھے، لیکن انھیں کسی نعمت کو چھونے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔ لوگوں کی آمد و رفت جاری رہی۔ میری نگاہیں کسی مطلب کے بندے کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔ عربی شیخ اپنے ترجمانوں کے ہمراہ ایک انگریز لڑکی کو گھیرے نظر آئے۔ دشال گپتا بھی پرتپاک انداز میں لڑکی کو ملا تھا۔ سنہری بالوں والی لڑکی کافی خوش شکل و پرکشش تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے جینی یاد آ گئی تھی۔ مگر جینی کا چہرہ سرخ و سفید تھا۔ اور یہ خالص گوری تھی۔ کندھے تک پھیلے بال جنھیں نفاست سے تراشا گیا تھا۔ اپنی تہذیب و ثقافت کے مطابق مردوں سے بے باکی سے مصافحہ کر کے گپ شپ کر رہی تھی۔ نصف بازوؤں کی تنگ بنیان اور چست پتلون میں جسمانی ابھار مزید اجاگر ہو رہے تھے۔ مگر مغرب کی عورت اپنے جسم کی نمائش پسند کرتی ہے۔ اور اس لیے حتی الوسع ایسے لباس کے انتخاب پر زور دیتی ہے جو.....

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

کی عملی تفسیر ہوں۔ اس کا لباس بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ اس کے علاوہ بھی حاضرین میں چند خواتین نظر آ رہی تھیں، مگر لوگوں کی زیادہ توجہ گوری پر تھی۔ پاکستان اور انڈیا کے لوگوں میں ایک عادت بالکل مماثل ہے کہ دونوں قوموں کے افراد گوروں سے خواہ مخواہ ہی مرعوب رہتے ہیں۔ آج تک بے چاروں کے خون سے گورے کی غلامی کا اثر زائل نہیں ہو سکا۔ وہ لڑکی تو اچھی خاصی حسین و پرکشش تھی، اگر معاملہ اس کے برعکس بھی ہوتا تو توجہ کا مرکز اسی نے ہونا تھا۔ جیسے مشتاق احمد یوسفی لکھتے ہیں کہ ''انگریزوں میں خال ہی بدصورت عورت پیدا ہوتی ہے اور ہمارے پاکستانی ڈھونڈ کر اسی سے شادی کرتے ہیں۔''

اچانک لوگوں میں ہلچل مچی اور تمام استقبال کو کھڑے ہو گئے۔ میری نظر آنے والی شخصیت پر پڑی اور دل جوش سے دھڑکنے لگا تھا۔ دھیرندر شکلا کی منحوس صورت پہلی بار میری آنکھوں کے سامنے آئی تھی مگر میں نے فوراً ہی پہچان لیا تھا۔ انصاری صاحب کے پاس اپنی بیٹی کی تصویر تو موجود نہیں تھی البتہ انھوں نے شکلا کی کئی تصاویر دکھائی تھیں۔ اس کا چھ فٹ دو تین انچ قد بھی اسے نمایاں کر رہا تھا۔ اس کے جسم پر گوشت نام کو نہ تھا۔ سوکھا سڑا ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ پہلی نظر میں مجھے انگریزی فلموں کا مشہور کردار ڈریکولا لگا تھا۔ چھریرا بدن ہونے کی وجہ سے وہ اور زیادہ طویل قامت لگ رہا تھا۔

اس کے عقب میں چار چاق و چوبند مسلح محافظ نظر آ رہے تھے۔ چاروں تربیت یافتہ کمانڈوز تھے۔ ان کی عقابی نگاہیں چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔

دھیرندر شکلا سیدھا گوری لڑکی کی طرف گیا تھا۔ اس نے پرتپاک انداز میں لڑکی کا ہاتھ تھاما، مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا۔ دونوں نے مدھم لہجے میں کوئی بات کی اور پھر مختلف افراد دھیرندر سے ملنے لگے۔ تین نشستی (تھری سیٹر) صوفے پر اس نے لڑکی کے ہمراہ ہی نشست سنبھال لی۔

میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا مگر کوئی ایسا طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا کہ میں دھیرندر شکلا کے گندے وجود سے دھرتی کو پاک کر سکتا۔ یقیناً تمام لوگوں سے ہتھیار اسی وجہ سے جمع کیے گئے تھے۔ لیکن میرے پاس پستول موجود بھی ہوتا تب بھی اس بھیڑ میں کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ بہرحال اس کے نظر آنے کے بعد امید کی کوئی کرن تو پیدا ہو گئی تھی۔ اب کم از کم کسی

سے اس کے متعلق سوال جواب کر سکتا تھا۔

دھیرندر شکلا کی آمد کے چند لمحوں بعد ایک سونڈ بوٹڈ شخص روسٹرم کے پیچھے کھڑے ہو کر حاضرین محفل کو متوجہ کرنے لگا۔ حساس اسپیکروں پر اس کی آواز یوں سنائی دی جیسے پہلو میں بیٹھا ہو۔ وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔

''معزز مہمانوں کو خوش آمدید، یقیناً آپ لوگوں کو آج کے اکٹھ کی غرض و غایت معلوم ہوگی۔ براہ راست مدعے پر آنے سے پہلے آپ کو خوش خبری سنانا چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان ایک ایسی شخصیت موجود ہے جو پھول سے نازک اور پتھر سے سخت ہے۔ جو بہ ظاہر صنف نازک ہے مگر حقیقت میں مردوں سے بھی کئی قدم آگے ہے۔ اس نے افغانستان جیسے محاذ پر اتنے دہشت گردوں کے سر سے گولی گزاری ہے کہ ان کی کھوپڑیوں سے مینار تعمیر ہو سکتا تھا۔ کم عمری ہی میں تجربات کی بھٹی میں تپ کر کندن بننے والی برطانیہ آرمی کی مایہ ناز سنائپر لورا براؤن جو آرمی نوکری سے مستعفی ہو کر ایک شوٹنگ کلب سے منسلک ہو گئی ہیں۔ انڈیا میں محترمہ کی آمد اپنی غرض سے ہوئی، لیکن کلب انتظامیہ کہ درخواست پر آپ نے ممبران کے لیے اپنے قیمتی وقت سے چند لمحات عنایت کرنے کی مہربانی کی ہے۔ آج ہم مس لورا براؤن کے تجربے اور فائرنگ تکنیکوں سے مستفید ہوں گے۔ آپ کی تالیوں کی گونج میں تشریف لاتی ہیں، کیپٹن لورا براؤن۔'' لیپ ٹاپ روسٹرم پر رکھ کر وہ پیچھے ہٹ گیا تھا۔

حاضرین نے پرتپاک انداز میں تالیاں بجا کر لورا کا استقبال کیا تھا۔ میں بھی گہری دلچسپی اور کسی قدر حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔ ایک دوسرے کے شکلی آشنا نہ ہونے کے باوجود ہم دونوں کافی گپ شپ کر چکے تھے۔ بلکہ جانی دشمن رہ چکے تھے۔ یقیناً اس نے افغانستان کے محاذ پر کافی مجاہدین اور کثیر تعداد میں بے گناہ لوگوں پر گولی چلا کر خاصا نام کمایا تھا۔ لیکن میرے ہاتھوں بری طرح شکست کھائی تھی۔ یوں بھی افغانستان محاذ پر ڈیوٹی سرانجام دینے والے امریکن اور گورے واپس جا کر قوم میں ہیرو گنے جاتے ہیں۔ افغانستان کا تو نام ہی ان اقوام کے لیے موت کی علامت ہے۔ تبھی ساری دنیا کے لیے پھنے خان بنا امریکہ آخر قلیل تعداد اور ناقص و ناکافی آلات جنگ رکھنے والے مجاہدین کے سامنے گھٹنے ٹیک کر مذاکرات کی میز پر آ گیا ہے۔ جسے طالبان کا وجود ہی تسلیم نہیں تھا۔ جنھیں دہشت گرد اور غاصب قرار دیتا تھا۔ جن کا نام و نشان مٹانے کو بڑے بڑے دعوے دار ادے کرتا تھا۔ جن کے خون کا پیاسا ہو کر ساری دنیا کی طاقت کو ان بے سروسانوں کے سر پر اکٹھا کر لایا تھا۔ اور اب مذاکرات کر کے اپنی شکست پر مہر تصدیق ثبت کر رہا ہے۔ اقرار کر رہا ہے کہ مجاہدین کی کوئی حیثیت ہے۔ آخر معاہدہ برابر کی سطح والوں کے درمیان ہی ہوتا ہے، انھی سے ہوتا ہے جن کا کوئی وجود ہو۔

اقبال نے فرمایا تھا.....

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یقیناً مجاہدین نے دنیا کی سب سے بڑی جنگ جیتی ہے۔ ورنہ پہلی جنگ عظیم دیکھیں، آدھی دنیا ایک جانب آدھی دنیا دوسری جانب۔ دوسری جنگ عظیم کا جائزہ لیں؛ آدھی دنیا ایک جانب، آدھی دنیا دوسری جانب اور یہاں پوری دنیا ایک جانب اور گنتی کے مجاہدین دوسری جانب۔ البتہ یہود نواز میڈیا، لبرل ذرائع ابلاغ ہمیں کبھی اپنے مجاہدین کی صحیح تصویر نہیں دکھائیں گے۔ ٹی وی شو پر بیٹھ کر بھونکنے والے یا تو مجاہدین کمیاں کوتاہیاں بیان کریں گے یا پاک فوج کی جڑیں کھودیں گے۔ یہ غدار لگے بندھے ایجنڈے و منصوبے کے تحت کام کرتے ہیں۔ اور سادہ عوام ان کی خرافات کو قران و حدیث جتنی اہمیت دینے پر تل جاتی ہے۔ بہ ہر حال یہ دکھڑے تو شاید ہمیشہ کا رونا ہیں جو اتنی آسانی سے ختم نہیں ہو سکتے۔

''شکریہ آپ لوگوں نے ناچیز کو اس قابل سمجھا.....''

تالیوں کا شور تھمتے ہی اس نے گفتگو کی ابتداء کی۔ اس کی لوچ دار آواز میری سماعتوں کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ کافی مغلظات اور بے ہودہ گوئی سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ ملازموں کی کرسیوں پر بیٹھنے والوں میں ایس ایس بھی بیٹھا ہے تو یقیناً فخر سے بلند سر جھکنے پر مجبور ہو جاتا۔ اس نے فوج کیوں چھوڑی تھی، یہ تو معلوم نہ تھا البتہ شک تھا کہ اس کے پس پردہ نک سٹیورٹ کی موت تھی۔ میں نے اس کے الفاظ پر کان دھر دیئے۔ ''اور یقیناً مجھے فخر ہے کہ میں نے انسانیت دشمن عناصر کی سرکوبی کو بڑی قربانیاں دیں۔ اپنا بہت پیارا دوست بھی کھویا۔ سپاہی نک سٹیورٹ ایک مایہ ناز اور بے مثال سنائپر تھا۔ جونیئر ہونے باوجود وہ میرا استاد تھا، مگر ایک حادثے میں اتفاقاً دشمن کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ اس سے میں نے کافی کچھ سیکھا تھا۔ ہم دونوں نے دشمن کے گھٹنے لگوا دیئے تھے۔ نک اور لورا براؤن کا نام سن کر ان کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ کیوں کہ جب آپ سنائپر رائفل کا استعمال جانتے ہوں تو اس سے نتائج بھی صحیح اخذ ہوتے ہیں۔

سنائپنگ میں جدید رجحانات نے نشانہ بازی کو سائنس کی شکل دے دی ہے۔ ایک سنائپر جتنا باریک بینی سے گولی چلائے گا اتنی ہی کامیابیاں سمیٹے گا۔ ایک فائر کو صرف یہ جاننا کافی نہیں کہ اس کا ہدف کتنے فاصلے پر ہے اور اس نے ہتھیار پر کیا رینج لگائی ہے۔ ہوا کی رفتار، موسم کی صورت حال، بلندی یا پستی اور زمین کی کشش یہ تمام عوامل فائر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جب فائر ہزار میٹر سے زیادہ لمبے فاصلے پر فائر کرتا ہے تب یہ عوامل زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ زمین کی مداری گردش کا فائر پر جو اثر پڑتا ہے اسے کیرولس افیکٹ (Coriolis Effect) کہتے ہیں۔

یہ بھی یاد رکھیں کہ جب کم اونچائی پر فائر کیا جائے تو ہوا کا دباؤ زیادہ ہوتا ہے اس وجہ سے گولی کی رفتار پر اثر پڑتا ہے اور رفتار کم ہو جاتی ہے۔ اونچے علاقے میں ہوا کا دباؤ کم ہوتا ہے اور گولی کی رفتار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ درجہ حرارت بھی فائر پر بہت اثر ڈالتا ہے۔ یونہی سامنے سے چلنے والی ہوا گولی کی رفتار پر اثر انداز ہوتی ہے اور عقب سے چلنے والی ہوا گولی کو مزید آگے لے جاتی ہے۔ ہوا کے حساب کا ایک فارمولا ہے جسے گرینرز (Greener's) فارمولا کہتے ہیں.....''

وہ شستہ انگریزی میں فائرنگ کے جدید طریقوں کی وضاحت کرنے لگی۔ عام فہم انداز میں اس نے کافی مفید اور قیمتی معلومات حاضرین کے گوش گزار کی تھی۔ گو میں اپنے استادوں سے بہت تفصیل سے یہ سب سیکھ چکا تھا۔ اس کے باوجود اس کا بھاشن (لیکچر) اچھا لگا۔ بلاشبہ وہ سنائپنگ کے بارے کافی معلومات رکھتی تھی۔ سونے پہ سہاگا اس کا لڑکی ہونا، خوب صورت و پرکشش ہونا اور اس سے بھی بڑھ کر حکمران قوم سے متعلق ہونا تھا۔ تبسم و مسکراہٹ بکھیرتے ہونٹ اور خوش اخلاقی سے لبریز لہجہ کرن میرے دماغ میں اس کے ماضی کے مغلظات اور بے ہودہ گوئی گونج اٹھی۔ انگریزی زبان کی ایسی بہت سی گالیاں تھیں جو پہلی بار اسی کے ہونٹوں سے سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ اردو زبان میں گالیوں کا ذخیرہ انگریزی زبان سے زیادہ ہونے کی غلط فہمی بھی ہوا ہوئی تھی۔ اور اب اسے قریب سے دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ وہی گالیاں اگلنے کی مشین کھڑی ہے۔

تمہید کے بعد اس نے یو ایس بی لیپ ٹاپ میں لگا کر ''پریزنٹیشن'' کھولی اور فائرنگ کے عملی مظاہرے دکھانے لگی۔ تمام وڈیوز اور تصاویر میں وہ خود ہی نظر آ رہی تھی۔ اور ایسی نظر آ رہی تھی کہ کسی کے پلے سنائپنگ پڑ رہی تھی یا نہیں، اس کے جسم کے نشیب و فراز، زاویے و قوسیں اور ابھار و گہرائیاں ازبر ہو چکی تھیں۔ کم بخت سنائپر سے زیادہ ماڈل لگ رہی تھی۔ ادھ پون گھنٹے کا درس اختتام پذیر ہوا۔ اور سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ سوالوں کے جواب نہایت اعتماد اور لیاقت سے دیتی رہی۔ اچانک ایک شناسا آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں چونک پڑا تھا۔ مہینا بھر پہلے ہی اس کی آواز سنی تھی اور ایک سنائپر کی یادداشت اتنی کمزور نہیں ہوتی کہ جلد بھول جائے۔ وہ کرن چاولہ تھا۔

''مادام! آپ نے اپنے بڈی (ساتھی) نک سٹیورٹ کی بڑی تعریف کی ہے۔ کیا بتا سکتی ہیں وہ کس کی گولی سے قتل

ہوا تھا۔ میرا مطلب، کیا اسے مارنے والا اس سے بھی اچھا سنائپر تھا۔''

لورا براؤن کی زبان میں پہلی بار رکاوٹ آئی تھی۔ گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے لمحہ بھر کو سوچا اور پھر سیاسی انداز میں بولی۔

''ضروری نہیں ہوتا کہ قاتل، مقتول سے زیادہ صلاحیتوں کا مالک ہو۔ کبھی کبھی قسمت بھی ساتھ دے جایا کرتی ہے۔''

کرن نے اگلا سوال پوچھا۔

''کیا آپ قاتل سے واقف ہیں۔''

وہ متبسم ہوئی۔ ''نام کی حد تک۔''

''اتنے اچھے دوست کے قتل کا انتقام کیوں نہیں لیا؟''

''میدان جنگ میں دو ملکوں کی دشمنی چلتی ہے انفرادی نہیں۔ اور میدانِ جنگ کے قتل کا بدلہ شہر میں جا کر لینا یقیناً نامناسب اور بہت بڑی زیادتی کہلائے گا۔ باقی تنک کی موت کے بعد مجھے واپس آنا پڑا اور دوبارہ افغان محاذ پر نہ جا سکی کہ نوکری کو خیرباد کہہ دیا تھا۔''

کرن چاولہ نے مزید سوال سے گریز کیا تھا۔ ''شکریہ مادام۔''

''اسے ایس ایس کہتے تھے اور وہ پاکی (پاکستانی) تھا۔''

لورا براؤن نے جانے کیا سوچ کے سچ اگلا۔

وشال گپتا نے پوچھا۔

''مادام! سب سے اچھی سنائپر رائفل کون سی ہے؟''

لورا متبسم ہوئی۔ ''جواب تفصیل کا متقاضی ہے۔ اور میرا اگلا سبق (پریزنٹیشن) اسی متعلق ہے۔''

کسی منچلے کی آواز آئی۔ ''مادام! ہم ہمہ تن گوش ہیں، شروع کریں۔'' یقیناً لورا براؤن جیسی استاد کے ہوتے ہوئے بوریت کس کم بخت شاگرد کو ہو سکتی تھی۔ اس کی لوچ دار آواز سماعتوں کی تسکین کا سامان کر رہی تھی تو صورت بصارتوں کو رونق بخش رہی تھی۔

''یقیناً، آپ مجھے ایک ڈرنک کا وقت دیں گے۔'' وہ مسکراتے ہوئے اسٹیج سے نیچے آئی، تب تک ویٹرس نے مختلف مشروبات سے بھری ٹرے اس کے سامنے پکڑ لی تھی۔ سنہری مشروب سے بھرا لمبوترا گلاس اٹھا کر وہ دھیرندر شکلا کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ کافی دیر سے چھائی خاموشی ہلکی بھنبھناہٹ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ویٹرسوں کو ایک بار پھر چابی لگ گئی تھی۔ حاضرین پسند کے مشروب سے دل بہلانے لگے۔ چند ایک ہال کے کونے میں بنے جدید طرز کے غسل خانوں کی طرف بڑھ گئے تھے۔

اس چھت کے نیچے کم از کم میرے دو جانی دشمن موجود تھے۔ اگر لورا براؤن کے دل میں بھی کوئی میل تھا تو دشمنوں کی تعداد تین گنی جا سکتی تھی۔ البتہ میں صرف دھیرندر شکلا کی جان کے درپے تھا۔ کرن چاولہ اور لورا براؤن سے مجھے کوئی غرض نہیں تھی۔

ہلکی ہلکی چسکیاں لے کر لورا براؤن نے گلاس خالی کیا اور دوبارہ روسٹرم کی طرف بڑھ گئی۔ حاضرین میں زیادہ تر کی نظریں اس کی چست پتلون کی سلائی پر غور کر رہی تھیں، شاید ڈیزائن زیادہ پسند آیا تھا۔ ان کی پرشوق نگاہیں دیکھ کر میں اندازہ ظاہر کر رہا ہوں، ورنہ کسی اور وجہ کا ہونا بھی ممکن ہے۔

لیپ ٹاپ کی بورڈ سے چھیڑ خانی کر کے اس نے دوسرا سبق (پریزنٹیشن) کھولا۔

''ایک معزز صاحب نے سب سے اچھی سنائپر رائفل کے بارے دریافت کیا ہے۔اور یقیناً فی زمانہ سنائپر رائفلوں میں جو جدت اور بہتری آئی ہے اس کے بعد ہتھیار بازار (وپین مارکیٹ) میں کئی عمدہ قسم کی رائفلیں نظر آرہی ہیں۔ہر ہتھیار بنانے والے ملک نے اس کار خیر میں حصہ ضرور ڈالا ہے۔جس میں فن لینڈ، کیوبا، آسٹریا، امریکہ، اسرائیل، روس اور برطانیہ وغیرہ سرفہرست ہیں۔خود آپ کا ملک بھی ووونسک جیسی عمدہ رائفل تیار کر چکا ہے۔لیکن اس میدان میں نمایاں کام امریکہ اور برطانیہ کی کمپنیوں کا ہے۔اگر میں سنائپر رائفلوں کی اقسام کی بات کروں تو انھیں قطر کے حساب سے دو قسموں میں بانٹوں گی۔یعنی 7.62 ایم ایم اور 12.7 ایم ایم۔گو اس کے علاوہ بھی چند قطر (کیلی بر) استعمال ہوئے ہیں مگر مذکورہ قطر زیادہ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ان میں 7.62 قطر کی رائفلیں زیادہ قدیم ہیں اور وزن میں ہلکا ہونے کی وجہ سے ان کا استعمال بھی زیادہ ہے۔لیکن ایسی رائفلوں کی زیادہ سے زیادہ مار (رینج) 1000 میٹر ہے۔دوسری قسم بڑے قطر (کیلی بر) کی رائفلوں کی ہے یعنی 12.7 ایم ایم قطر کی رائفلیں۔جنھیں سنائپر رائفل کے ساتھ اینٹی میٹیریل رائفل بھی گردانا جاتا ہے۔ان رائفلوں کی مار دو کلومیٹر تک ہے۔یعنی چھوٹے قطر والی سنائپر رائفلوں سے دگنی رینج۔مگر ان کی سب سے بڑی خامی زیادہ وزنی ہونا ہے۔جیسے انڈیا کی ووونسک سنائپر رائفل ہے۔اس کا وزن 25 کلوگرام ہے۔اور کارگر رینج 1800 میٹر ہے۔اب 25 کلوگرام وزنی رائفل کو اٹھا کر چلنا کتنا مشکل ہے اس بارے آپ کو اندازہ ہے یا نہیں مجھے خوب پتا ہے۔پہاڑوں میں جب اپنے وجود کو گھسیٹنا کاردار ہوتا ہے ایسی حالت میں اتنی وزنی رائفل کو اٹھانا۔اگر ایمونیشن کا وزن شامل کروں، کھانے پینے کا سامان، شب بسری کا ہلکا پھلکا بستر اور سنائپنگ کے دوسرے سامان کا حساب لگاؤں تو خود سوچیں ایک جوڑی کے پاس کتنا وزن ہو جائے گا۔کیا وقت پڑنے پر وہ بھاگ سکیں گے؟.....اس سوال کا جواب تبھی ہاں میں دیا جا سکتا ہے جب سنائپر کو ہتھیار پھینکنے کی اجازت دی جائے۔دوسری صورت میں اتنا وزن اٹھا کر چلا نہیں جاتا کوئی بھاگے گا کیسے۔یوں بھی دوسرے ممالک کی بنی ہوئی عمدہ رائفلیں بھی گو اتنی وزنی تو نہیں ہیں مگر سولہ، سترہ، اٹھارہ کلوگرام کے بہ قدر تقریباً ہر دور مار (لانگ رینج) والے ہتھیار کا وزن ضرور ہوگا۔عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد میں نے شدت سے ایک ایسی ہی سنائپر رائفل کی کمی محسوس کی جو وزن میں ہلکی ہو لیکن کارکردگی میں کسی بھی دور مار (لانگ رینج) رائفل سے کم نہ ہو۔2009 میں ہمارے ملک کے بہترین سنائپر کریگ ہیرسن نے ''59x70.8 ملی میٹر ایل 115 اے'' سے گولی چلا کر ساڑھے چوبیس سو میٹر سے بھی لمبے فاصلے پر دو دہشت گردوں کو نشانہ بنایا تھا۔رائفل کا وزن قریباً سات کلوگرام کے بہ قدر ہے۔مگر اس سے ہمیشہ اتنی رینج توقع نہیں کی جا سکتی۔نہ ہر کوئی کریگ ہیرسن جیسا ماہر سنائپر ہوتا ہے۔میرا شوق اسی رائفل متعارف کرانے کا تھا جسے استعمال کر کے ایک عام سنائپر بھی دو کلومیٹر تک ہدف کو نشانہ بنا سکے۔اور یہی تمنا مجھے فوج کی نوکری چھڑا کر WAS(World Accuracy sniper) کمپنی میں لے گئی۔گو کمپنی نئی ہے مگر عملہ ہتھیار سازی کی بہترین کمپنیوں سے اکٹھا کیا ہے۔جلد ہی آپ لوگ ڈبلیو اے ایس کو بین الاقوامی طور ایک بے نظیر و بے مثال صورت میں نمایاں دیکھو گے۔آج میں بڑے فخر سے آپ کے سامنے ڈبلیو اے ایس کی پہلی مصنوع (Product) (مصنوع کی جمع مصنوعات ہے) پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہی ہوں۔'' سکرین پر ہلکے بھورے رنگ کی ایک رائفل نظر آنے لگی۔جس کی لمبی بیرل نمایاں نظر آرہی تھی۔بیک گراؤنڈ میں WAS ''65x79.8 ملی میٹر SR1'' کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔اس کی گفتگو جاری رہی۔

''لمبے فاصلوں پر مار کرنے والے ایمونیشن میں دو متضاد خصوصیات دیکھی گئی ہیں۔گولی کی جسامت بڑی ہوتی ہے، اس وجہ سے اس پر ہوا کا اثر زیادہ پڑتا ہے۔لیکن گولی زیادہ وزنی بھی ہوتی ہے اس وجہ سے ہوا کے خلاف مزاحمت کر سکتی

ہے۔ جبکہ چھوٹے قطر کی گولی کا حجم کم ہوتا ہے اس لیے اس پر ہوا کا اثر کم پڑتا ہے لیکن وہ وزن میں ہلکی ہوتی ہے تبھی ہوا کے خلاف مزاحمت کم ہوتی ہے۔ اور لمبے فاصلے پر جب گولی کو تین چار سیکنڈ ہوا میں رہنا پڑے تو گولی کا ہدف سے دور ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ ایس آر ون کی گولی (بلٹ) میں اس الجھن کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ 7.12 ایم ایم کے مقابلے میں 165.8 ایم ایم حجم، کافی کم ہے۔ اور وزن بڑھانے کو لیڈ (سیسہ) کے بجائے لیڈ ایٹیمنی کا استعمال کیا گیا ہے۔ یوں گولی ....." وہ ٹیکنیکل باتیں دہرانے لگی۔ ایسے کئی سبق میں امریکہ میں اور اپنے استادوں سے پڑھ چکا تھا اس لیے میں وہ ساری باتیں پہلے سے جانتا تھا۔ (بے جا طوالت کے خوف سے میں پورا لیکچر درج نہیں کر رہا کہ قارئین کی اکثریت کا شوق کہانی کے ساتھ ہے۔ اور میرا بھی یہی خیال ہے ہمیں کہانی تک ہی محدود رہنا چاہیے) SR1 کی مزید خوبیاں گنوانے کے بعد اس نے آخر میں انکشاف کیا۔ "اتنی خصوصیات کی حامل رائفل کا وزن صرف ساڑھے آٹھ کلوگرام ہے۔ سترہ سے پچیس کلوگرام وزن والی رائفل کی مار دو کلومیٹر تک ہوتی ہے۔ اور SR1 کئی کلوگرام کم وزنی ہونے کے باوجود دو کلومیٹر تک آسانی سے مار کر لیتی ہے۔ اس کی ٹیلی اسکوپ سائیٹ بھی خصوصی طور پر تیار کی گئی ہے جس کی دیکھنے کی طاقت عام انسانی آنکھ سے تیس گنا زیادہ ہے۔ یقیناً اس کی خریداری کی مد میں زیادہ خرچ ہونے والی رقم کا اعتراض اس کی خوبیوں تلے دب جائے گا۔"

بھاشن کے اختتام پر حاضرین نے تالیاں بجا کر اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اگر رائفل میں واقعی وہی خوبیاں موجود تھیں جو اس نے گنوائی تھیں تو یقیناً وہ لاجواب رائفل تھی۔ وہ پیک بھی بہت چھوٹے سے جھولے میں ہو جاتی تھی کیوں کہ رائفل کی لمبی بیرل دو حصوں میں کھولی جا سکتی تھی۔ عموماً سنائپر رائفلوں کی بیرل میں جوڑ نہیں ہوتا۔ مگر SR1 اور بہت سے اختلاف کے ساتھ یہ خصوصیت بھی رکھتی تھی۔

اگلے مرحلے میں اعلان ہوا کہ لورا براؤن ایس آر ون سے فائر کا عملی مظاہرہ کرے گی۔ شوٹنگ کلب کی اپنی فائرنگ رینج موجود تھی، جہاں پندرہ سو میٹر تک فائر کیا جا سکتا تھا۔ ہال کی بغل ہی میں اس کا دروازہ تھا۔ حاضرین اس طرف بڑھ گئے۔ ایک چھوٹا سا پیک لورا براؤن نے کندھے پر لٹکایا ہوا تھا جو ایک ملازم نما شخص نے بااصرار لینے کی کوشش کی مگر لورا نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

دروازے سے نکلتے ہی جدید طرز کی لمبی رینج نظر آئی۔ جہاں ہر سو میٹر کے فاصلے پر ہدف لگے تھے، جنھیں، فائرنگ اڈوں سے کنٹرول کر کے سیدھا یا دائیں بائیں کیا جا سکتا تھا۔

ایک اڈے پر اکڑوں بیٹھ کر لورا نے جھولا کھولا اور مہارت سے رائفل کے پرزے جوڑنے لگی۔ بیرل کو درمیان سے جوڑنے کو چوڑیاں لگی تھیں اور وہ جگہ باقی بیرل سے دگنی موٹی تھی۔

رائفل کو دو پائی پر لگا کر وہ پیچھے لیٹ گئی۔ اور تب نظارا کرنے والوں کی اکثریت شش و پنج میں پڑ گئی تھی کہ رائفل کو دیکھیں یا رائفل والی کو۔ میں البتہ حسرت بھری نظروں سے ایس آر ون کو گھور رہا تھا۔ میرے ہاتھوں میں کھجلی شروع ہو گئی تھی یوں جیسے عاشق کے دل میں محبوب کو چھونے کی تمنا مچلتی ہے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ لورا کو دھکا دے کر خود رائفل کے پیچھے لیٹ جاتا۔

لورا نے میگزین میں گولیاں بھر کر ہزار میٹر پر ہدف کو سامنے کیا، ٹیلی اسکوپ سائیٹ کے ایلی ویشن ڈرم کے ساتھ چھیڑ خانی کی اور شست لے لی۔ اس کا دایاں ہاتھ پسٹل گرپ پر تھا اور دو پائی کی وجہ سے بایاں ہاتھ آگے پھیلنے کے بجائے اس نے اپنے گال سے آگے ٹیکا تھا۔ چند سیکنڈ شست لے کر اس نے لبلبی دبائی ہلکی سی "ٹھک" ہوئی جو اس کے دعوے کی تصدیق کر گئی تھی کہ رائفل کی بیرل پر عمدہ سائیلنسر جڑا ہوا ہے۔

ہدف کیمرے کی زد میں تھا اور بڑی سی سکرین پر واضح نظر آ رہا تھا۔ گولی ہدف کے درمیان، چندی میں پیوست ہوئی تھی۔ تمام نے بے ساختہ تالیاں بجائی تھیں۔ دو گولیاں اس فاصلے سے فائر کر کے لورا نے پندرہ سو میٹر تک ہدف بڑھایا، مسلسل تین گولیاں ہدف پر ہٹ کیں۔ اور زبردست داد وصول کرتے ہوئے کھڑی ہو گئی تھی۔

اس نے دعوت دی۔ ''اگر کسی کو فائر کا شوق ہو تو پورا کر سکتا ہے۔''

میرا دل آگے بڑھنے کو مچلا، مگر لورا نے یہ دعوت معززین کو دی تھی ان کے ملازموں کو نہیں۔

ایک عرب شیخ خوشی سے چہکتے ہوئے آگے بڑھا، نامعلوم حضرت کو لورا کی قربت کا شوق تھا یا سچ میں ہتھیاروں کا شیدائی تھا۔ یوں بھی شیخوں کی انگریزی بولنے کی استعداد نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ تبھی اس نے ترجمان ساتھ ہی رکھا تھا۔ اور اس کی بڑی وجہ عربی زبان پر فخر کرنا ہے۔ ان کے نزدیک عربی زبان کا مقابلہ کوئی زبان نہیں کر سکتی۔ اور یہی ہمارا بھی اعتقاد ہے۔ باقی یہ بھی حقیقت ہے کہ آزاد اقوام کی پہلی ترجیح ہمیشہ اپنی زبان ہوتی ہے۔ جتنی بڑی قومیں ہیں وہ انگریزی بولنے کو سخت معیوب سمجھتے ہوئے اپنی زبان میں گفتگو کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جن میں چائنہ، فرانس، عرب وغیرہ سرفہرست ہیں۔ اور ہماری طرح (یعنی انڈیا، پاکستان) غلام اقوام جو آج بھی برطانیہ کی قید سے ذہنی طور پر آزاد نہیں ہو سکیں۔ ہم نہ صرف انگریزی کی برتری تسلیم کرتے ہیں بلکہ جن خواتین و حضرات کو جتنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی آتی ہے وہ سینہ پھلائے اس کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں۔ ٹی وی اینکر اردو پروگراموں میں ساٹھ فیصد انگریزی بولتے ہیں۔ حد یہ کہ اردو ناول نگاروں کی اکثریت جن میں خواتین ناول نگار پیش پیش ہیں ان کی اولیں ترجیح انگریزی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور ان کی تحاریر پڑھ کر ایسی ذہنی کوفت ہوتی کہ چند سطروں سے زیادہ پڑھنا کار دار ہو جاتا ہے۔ جس طبقہ نے اردو کی خدمت کرتے ہوئے عوام میں اردو کی ترقی و ترویج کا کام کرنا تھا ان کی یہ حالت ہے تو عام لوگوں کا کیا حال ہوگا۔ اردو بے چاری کا تو حلیہ ہی بگاڑ دیا گیا ہے۔ اللہ پاک ہی ہمارے حال پر رحم کرتے ہوئے ہمیں صحیح سمجھ اور اردو سے محبت کا ذوق عطا فرمائے۔

لورا براؤن نے اس کی حالت (پوزیشن) درست کی، یقیناً اس کا وہ التفات کئی اوروں کو فائرنگ کی دعوت دینے والا تھا۔

شیخ نے چار سو میٹر سے ہدف کو نشانہ بنایا اور خوشی سے چہکتا واپس لوٹا۔ اس کے بعد کافی لوگوں نے ارادہ ظاہر کیا مگر شکلا نے وقت کی کمی کا اعلان کر کے واپس چلنے کو کہا۔

تمام ہال میں لوٹ آئے تھے۔ تب خریداری کے شوقین حضرات اپنی مانگ بتانے لگے۔ وشال گپتا کو بھی خریداروں کی صف میں دیکھ کر مجھے دلی خوشی ہوئی تھی۔

دھیرندر شکلا چند لمحے مزید گزار کر چلا گیا تھا۔ میں حسرت بھری نظروں سے اپنے شکار کو گھورتا رہ گیا۔ جو اتنے قریب آ کر لوٹ گیا تھا۔ لورا کا بھی سب سے بڑا گاہک وہی تھا، کیوں ہندوستانی فوج کے لیے اسی نے خریداری کرنا تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ لورا براؤن کے التفات کا بہاؤ اس کی جانب زیادہ رہا۔ باقی حضرات ذاتی شوق کی خاطر ایک دو رائفلوں سے زیادہ خریدنے میں دلچسپی نہ لیتے۔ البتہ ان میں اسلحے کی تجارت والے شاید چند ہتھیار خرید لیتے۔ لورا کافی دیر لوگوں میں گھری رہی۔ اس کے ہونٹوں پر تسلسل سے دل آویز مسکراہٹ کھلتی رہی۔ اسے کمپنی نے خوب تربیت دے کر بھیجا تھا کہ ایک دکان دار (سیلز وومن) کا گاہکوں سے کیا رویہ ہونا چاہیے۔ یقیناً لورا کی موجودی تک بھیڑ چھٹنے والی نہیں تھی۔ زیادہ تر لوگ اسے عشائیے (ڈنر) کی دعوت دے رہے تھے۔ اور تب انکشاف ہوا کہ اس کا آج کا عشائیہ عرب شیخوں کے ساتھ طے تھا۔

لورا براؤن جب رخصتی کے ارادے سے اٹھی تو وشال گپتا بھی اس کے ہمراہ ہولیا تھا۔ پارکنگ میں جب وہ اپنی قیمتی کار کے ساتھ رکی، تب وشال گپتا نے مجھے آنکھ کے اشارے سے دروازہ کھولنے کا حکم صادر فرمایا اور میں نے ادب سے دروازہ کھول دیا۔

مجھ پر سرسری نگاہ ڈال کر اس نے حاکمانہ انداز میں سیٹ سنبھال لی تھی۔ ظالم نے ہلکے سے تبسم کی سوغات دینا بھی گوارا نہ کیا۔ اور دیتی بھی کیسے کہ میں شکل وصورت میں انوکھا تو نہیں تھا۔ مجھ سے بہتر کئی امراء اس کے آگے پیچھے دم ہلا رہے تھے تو ایک نچلے درجے کے ملازم کو وہ خاک گھاس ڈالتی۔

وشال گپتا آخری وقت تک اس سے ملاقات طے کرنے کی کوشش میں مصروف رہا مگر وہ ہنس کر ٹال گئی تھی۔ بلاشبہ اپنی دعوتوں کا فیصلہ اس نے کاروباری فوائد کو مدنظر رکھ کر ہی کرنا تھا۔

—— ● ——

وشال گپتا کو مایوس لوٹنا پڑا۔ البتہ یہ کہہ کر اس نے مجھے خوش کر دیا تھا کہ اس نے ایس آر ون رائفل خریدنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ گو وہ اسلحے کی اسمگلنگ کرتا تھا، مگر اتنی مہنگی سنائپر رائفل وہ کاروباری نقطہ نظر سے نہیں خرید سکتا تھا۔ دہشت گردوں اور حکومت مخالف ٹولوں میں عام ہتھیاروں، خصوصاً پستول، کلاشن کوف وغیرہ کی مانگ زیادہ ہوتی ہے۔ سنائپر رائفلیں کم پسند کی جاتی ہیں۔ اس کی وجوہات میں ایک تو مہنگا ہونا ہے۔ دوسرا سنائپر رائفل ہر شخص استعمال بھی نہیں کر سکتا۔ تیسرا ان کا ایمونشن عام رائفلوں سے بہت زیادہ مہنگا ہوتا ہے۔ چوتھا یہ صرف مخصوص مقاصد کو استعمال ہوتی ہیں۔ گو آج کل صورت حال تبدیل ہو رہی ہے کہ دہشت گرد بھی جسمانی حملوں سے زیادہ دور سے فائرنگ کو زیادہ پسند کرنے لگے ہیں۔ خصوصاً پاک افغان سرحد پر تو دہشت گرد سنائپروں کی بڑی تعداد پاک آرمی کے خلاف مصروف نظر آتی ہے۔ یونہی مخصوص اہداف کے لیے ملک دشمن تنظیمیں بھی اس سے بے بہرہ نہیں ہو سکتیں۔ البتہ یورشی ہتھیاروں (اسالٹ رائفلوں) کی مانگ سنائپر رائفل سے زیادہ ہوتی ہے۔

''تم نے کبھی سنائپر رائفل استعمال کی ہے۔'' دوران گفتگو اس نے اچانک پوچھا۔

''پہلے آپ سنائپر رائفل کی وضاحت تو کریں۔'' میں نے معصومانہ لہجے میں پوچھا۔

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے تم بھاشن سننے کے بجائے گوری کے خدوخال میں گم تھے۔''

میں نادم ہوا۔ ''اس کی باتوں سے تو یہی اندازہ ہوا کہ لمبے فاصلے پر مار کرنے والی رائفل کو سنائپر رائفل کہتے ہیں۔''

''بالکل ایسا ہی ہے۔ راجیو تمھارے پستول کے فائر کی کافی تعریف کر رہا تھا، کوشش کرو شاید رائفل بھی اچھی چلا سکو۔''

''جی باس۔'' میں خوش دلی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب اسے کیا بتاتا کہ حضور سنائپر رائفلیں مجھے اتنی ہی عزیز ہیں جتنی پلوشے پیاری ہے۔ مگر وہ کم بخت نہ تو میرا مزاج آشنا تھا اور نہ پلوشے سے واقف تھا کہ دشمن جاں کیا بلا ہے۔

اس نے فراخ دلی سے ارادہ ظاہر کیا۔ ''موقع ملا تو تمھیں سکھاؤں گا۔''

میں نے حقیقی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انسان کو اپنے مشغلے کے بنا زندہ رہنا دشوار لگتا ہے۔ سنائپر رائفل سے جدائی کو کئی ہفتے گزر گئے تھے۔ اور صرف پلوشہ کی موجودگی ہی میں سنائپر رائفل سے دوری برداشت کی جا سکتی تھی۔

اگلے دن سہ پہر کو گھر لوٹتے وقت وشال نے شام کی دعوت کا بتا دیا تھا۔

''ٹھیک ہے باس۔'' میں نے خوش دلی سے سر ہلا دیا۔ ٹھکانے پر پہنچ کر میں نے اسے اندرونی عمارت کے سامنے اتارا اور کار کو گیراج میں کھڑا کرنے لے گیا۔ باقی محافظ اپنی جیپ کو براہ راست گیراج میں لے آئے تھے۔ کار کو مقفل کر کے میں ان کے پیچھے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اجیت سنگھ اور موہن سنگھ ایک کمرے رہتے تھے، جبکہ مجھے مہمان خانہ چھوڑ کر شنکر داس کے ساتھ منتقل ہونا پڑا تھا۔

چوڑی راہداری میں داخل ہوتے وقت شنکر داس با آواز بلند بولا تھا۔ ''ویسے کیا لگتا ہے، باس پر کبھی برا وقت آیا تو کوئی چڑی مار اس کی خاطر خواہ حفاظت کر سکے گا۔''

اجیت سنگھ اور موہن سنگھ نے زوردار قہقہہ بلند کر کے گویا مجھے سلگانے کی کوشش کی تھی۔

میں نے کبھی ایسی باتوں پر کان نہیں دھرے تھے، لیکن کچھ لوگ ڈنڈے کے مرید ہوتے ہیں۔ انھیں صرف طاقت کی زبان ہی سمجھ آتی ہے۔ میں شروع دن سے تعلقات بہتر کرنے کی کئی کوششیں کر چکا تھا لیکن مجھے حقیر جانتے ہوئے وہ توجہ دینے پر راضی نہیں تھے۔ اور زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے صرف وہی ایسے تھے جن سے مجھے کھلی معلومات مل سکتی تھی۔ مستریوں سے سنا ہے کہ پہلے سے ہوئے پلستر پر نیا پلستر کرنے سے پہلے ضروری ہوتا ہے کہ پرانے پلستر کو کھرچا جائے۔ اور مجھے بھی ان کی بے نیازی و حقارت پر دوستی و تعلق کا اثر جمانا تھا۔ اور یہ تبھی ممکن تھا کہ اپنے بارے ان کی غلط فہمی دور کروں۔ تبھی جوابی وار کرتے ہوئے میں اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔

''اگر زرافہ اپنے لمبے قد اور بھاری وجود کو لے کر شیر سے مقابلے کے خواب دیکھنا شروع کر دے تو اس کے انتہ (خاتمے) میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔''

شنکر کے قدم رکے پیچھے مڑتے ہوئے وہ طیش سے بولا۔ ''باس تک خبر پہنچنے سے پہلے میں تمھارا وہ حشر کر چکا ہوں گا کہ مجھے شنکر کے بجائے پتاجی بولو گے۔''

''پتاجی تو خیر تم اپنے بچوں کے بھی نہیں ہو۔'' میرے اطمینان میں فرق نہیں آیا تھا۔

وہ غصے میں بکتا جھکتا میری جانب بڑھا، میں اس کی طبیعت صاف کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔

سنائپرز کو اسلحے کے استعمال کے ساتھ خالی ہاتھوں سے لڑنا بھی ضرور سکھایا جاتا ہے، کیوں کہ عملی زندگی میں اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ البتہ نشانے بازی کی صلاحیت خالی ہاتھ لڑائی سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ جسمانی مشقوں کو میں نے کبھی غیر اہم نہیں سمجھا مگر فطری طور پر میرا جھکاؤ نشانہ بازی کی مشق کی طرف زیادہ رہتا تھا۔ سنائپر رائفلوں سے میری محبت جنون کی حد تک تھی۔ مرد اس شوق سے لڑکی کو نہیں تاڑتے ہوں گے جتنی توجہ میں سنائپر رائفل کو دیتا تھا۔ اگر نشانہ بازی کا مقابلہ ہوتا تو وہ میرے لیے طفل مکتب سے زیادہ اہمیت نہ رکھتا مگر یہ خالی ہاتھ لڑائی کا معاملہ تھا۔ مجھے سنبھل کر لڑنا تھا ورنہ لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔

خالی ہاتھ لڑنے کے مختلف طریقے متعارف ہو چکے ہیں۔ جن° میں کشتی، کراٹے، جوڈو، ججستو، تائی کمانڈو، باکسنگ، کک باکسنگ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ہر فن کے اپنے قاعدے اور قانون ہیں۔ کسی فن میں صرف لاتیں چلانے کی اجازت ہوتی ہے اور کسی میں فقط مکا مارا جا سکتا ہے۔ کسی فن میں صرف چہرہ اور چھاتی ہی ہدف ہو سکتے ہیں اور کسی میں پورا جسم تختۂ مشق بنتا ہے۔ کسی فن میں پکڑ دھکڑ منع ہوتی ہے تو کسی میں ضرب لگانے کی ممانعت۔ مگر ان فنون پر سارے قوانین اور ضابطے تب لاگو ہوتے ہیں جب مخصوص کھیل کے مقابلے جاری ہوں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی فن میں مکمل نہیں جانتا۔ ہمیں تو قواعد و ضوابط سے آزاد (فری سٹائل) لڑائی سکھائی جاتی ہے۔ جس میں جوڈو کے داؤ پیچ، باکسنگ کی مکا بازی اور کراٹے کی لاتیں ایک ساتھ استعمال کی جاتی ہیں۔ اور عملی و عام زندگی میں یہی طریقہ جنگ کارآمد ہے۔

غصے میں بادلا ہو کر وہ اچھلتا ہوا میرے قریب آیا اور بائیں قدم پر گھومتے ہوئے اس کی داہنی ایڑی میری گردن ناپنے کو بڑھی۔ میں اچھل کر ہلکا سا پیچھے ہٹا، وہ وار خطا جانے پر لڑکھڑایا نہیں تھا۔ دایاں قدم زمین پر لگتے ہی اس نے باہنی ٹانگ گھمائی۔ ایک دم نیچے بیٹھتے ہوئے میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی بائیں ٹانگ تھامی اور زمین پر لگی ٹانگ کو

زوردار ٹھوکر رسید کی۔ وہ دھڑام سے پیٹھ کے بل گرا۔ لیٹے لیٹے ہی اس نے اپنی آزاد ٹانگ پیچھے کھینچی، مجھے ایک دم اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کا کیا ارادہ ہے۔ جونہی اس کی ٹانگ دباؤ ہٹے سپرنگ کی مانند آگے بڑھی۔ میں نے فوراً اس کی دوسری ٹانگ کو گرفت سے آزاد کر کے لوٹ لگائی۔ ٹانگ کے میری گرفت میں ہونے کی وجہ سے اس نے توازن برقرار رکھا تھا۔ میرا سہارا چھوٹتے ہی وہ دوبارہ نیچے گرا اور اس سے پہلے کہ اٹھ پاتا میں نے اسے چھاپ لیا تھا، اس کی چھاتی گھٹنوں سے دباتے ہوئے میرے ہاتھ مشینی انداز میں مسلسل چلنے لگے۔ پہلے چند مکے اس نے کہنیوں پر سہارے تھے لیکن جونہی میں نے دائروی مکے گھمائے اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے تھے۔ اسی وقت اجیت سنگھ نے مجھے عقب سے تھام کر پیچھے کھینچنے کی کوشش کی، میں نے ایک دم کہنی اس کے پیٹ میں گھونپ دی۔

''اف.....'' کی آواز کے ساتھ وہ رکوع کے بل نیچے جھکا۔ اس کی گرفت میرے جسم سے ہٹ گئی تھی۔ پیچھے مڑتے ہوئے میں نے مخصوص انداز میں گھٹنا اٹھایا جو اس کی ٹھوڑی پر لگا تھا۔ کولہوں کے بل نیچے گرتے ہوئے وہ لمبا پڑ گیا۔

میں تیسرے مخالف موہن سنگھ کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔ میرے ہاتھوں اپنے ساتھی کی درگت بنتے دیکھ کر وہ مشتعل ہو کر بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح حرکت میں آچکا تھا۔ قریب پہنچتے ہی اس نے بازو گھمایا، نشانہ میری کنپٹی تھی۔

گھٹنوں میں خم دے کر میں نیچے جھکا، اس کا مکا میرے سر کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ وہ ہلکا سا لڑکھڑایا اور اس سے پہلے کہ سنبھلتا، میرا دایاں گھونسا ٹھیک اس کی پسلیوں کے نیچے بائیں جانب لگا۔ باکسنگ کی زبان میں اسے ''انڈر کٹ'' کہتے ہیں۔ باکسر کو پچھاڑنے (ناک آؤٹ) کو یہ تیر بہ ہدف مکا ہے۔ چند لمحوں کو انسان کے حواس مختل ہو جاتے ہیں۔ ٹھوڑی کے بالکل نچلے کنارے پر دائروی مکا مارنا اور پسلیوں کے نیچے بائیں جانب اندر و اوپر کی جانب مکا اٹھانے سے مخالف تھوڑی دیر کو حواس کھو دیتا ہے۔ حالاں کہ باکسنگ گلاوز بھی ہاتھوں پر چڑھے ہوتے ہیں جن میں فوم استعمال کر کے مکے کی سختی کو کم کیا جاتا ہے۔ اور اس وقت تو میرے ہاتھ ننگے تھے اس لیے اثر بھی زیادہ ہوا تھا۔

منہ سے زوردار ''اوغ.....'' نکالتے ہوئے وہ گھٹنوں کے بل گر کے دوہرا ہوگیا۔ شور سن کر راجیو اور ایک دوسرا شخص کمرے سے باہر نکلے۔

''یہ سالا کاہے کا جھگڑا شروع ہے۔'' پریشانی سے کہتے ہوئے وہ شنکر کے قریب ہوا۔ ''ابے کوئی کھلاس تو نہیں ہوگیا۔ مونے بھاگ کے باس کو بلا لا کوئی بڑی گڑبڑی چل رہی ہے۔''

مونا بھاگ پڑا تھا۔ راجیو شنکر کا چہرہ ہلا کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں اطمینان سے کھڑا رہا۔

شنکر نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور راجیو، اجیت سنگھ کی طرف بڑھ گیا۔ موہن بھی گہرے سانس لے کر خود کو سنبھالنے لگا۔ وشال گپتا کے آنے تک تینوں بیٹھ گئے تھے۔

''کیا ہو رہا ہے۔'' وشال گپتا قریباً بھاگتے ہوئے وہاں پہنچا تھا۔

میں اطمینان سے بولا۔ ''کچھ نہیں باس، انھی کوئی غلط فہمی ہوئی تھی، دور کر دی ہے۔''

مجھ پر خفگی بھری نگاہ ڈال کر اس نے شنکر سے پوچھا۔ ''تم بتاؤ، کیا ہوا۔''

''کک..... کیا بتاؤں باس؟'' وہ گڑبڑا گیا تھا۔

''تیری ماں کا سر!'' وشال دھاڑا۔

اجیت بولا۔ ''باس! سندیپ نے ہماری بے خبری میں حملہ کر کے ہمیں چوٹ پہنچائی۔''

وشال نے مجھے گھورا..... میں صفائی دینے لگا۔ ''باس یہ آپ کے التفات کو غلط نام دے رہے تھے۔ ان کے تئیں میں آپ کی حفاظت کے قابل نہیں ہوں اور آپ نے غلط میرا احسان اتارنے کو محافظ کی ذمہ داری سونپی ہے۔ تبھی میں نے

شنکر کو چنوتی دی، اس نے حملہ کیا..... باقی دو نے بھی بجائے ہمیں چھڑانے کے شنکر کا ساتھ دیا اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔"

موہن بولا۔ "باس اس نے بے خبری میں حملہ کیا۔"

وشال کے ہونٹوں پر تبسم ابھرا۔ "چلو اب لڑلو۔"

موہن نے ندامت سے سر جھکا لیا تھا۔ میرے ایک دو مکوں نے انھیں باور کرا دیا تھا کہ میرے بارے ان کے اندازے ٹھیک نہیں تھے۔

"سندیپ! آئندہ ایسی بے ہودگی برداشت نہیں کروں گا..... اور تم تینوں کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ وشال گپتا کسی کا احسان اتارنے کو اسے اپنی جان نہیں سونپ سکتا۔ سندیپ کو لڑتے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔ اس میدان میں نیا ہے لیکن لڑنے کا فن جانتا ہے۔ مخلص ہے اور احسان فراموش نہیں تبھی اس ذمہ داری کا اہل سمجھا ہے۔ کسی کو اعتراض ہے تو مجھ سے بات کرے۔ اب دفع ہو جاؤ اپنے کمروں میں۔" وہ واپس مڑ گیا۔

راجیو، موہن سنگھ کو سہارے دے کر اٹھانے لگا۔ میں نے قدم بڑھا کر شنکر کی طرف ہاتھ لمبا کیا۔

مجھے کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ دور دھکیلا۔

میں معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ "شما کر دو یار! بھائیوں میں ایسی لڑائیاں تو چلتی رہتی ہیں۔ آج میرا تکا لگ گیا، کل آپ میری پٹائی کر دیں گے..... ایک ساتھ رہتے ہوئے یہ تو چلتا رہے گا۔"

ایک دم اس کا موڈ تبدیل ہوا۔ ہلکی مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ تھاما اور کھڑا ہو گیا۔ میں نے فوراً اسے گلے سے لگایا اور پھر اجیت کی طرف مڑ کر بازو پھیلا دیئے۔

لڑائی کی ابتداء شنکر اور میرے درمیان ہوئی تھی، ہمیں راضی بہ رضا دیکھ کر ان دونوں نے خفگی ختم کر دی تھی۔ سکھ دیسے بھی یار باش قوم ہے۔ دماغ سے زیادہ دل کی سنتے ہیں۔ یقیناً کسی پر اپنی برتری ثابت کر کے عاجزی و ندامت کا اظہار کرنے پر خاطر خواہ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اب ان کے دلوں میں میری دھاک بیٹھ گئی تھی۔ پہلے مجھے کمتر سمجھ کر وہ کسی خاطر نہیں لاتے تھے اور اب ایک ساتھ تینوں کے ٹھکائی کر کے میں نے ثابت کر دیا تھا کہ ان کی جسامت اور لمبے قد میرے نزدیک کسی اہمیت کے حامل نہیں تھے۔ تبھی انھوں نے خوش دلی سے سب کچھ بھلا دیا تھا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے شنکر سے پھر معافی مانگی تھی۔ "آپ بڑے بھائی ہیں۔ اور غلطی میری تھی۔ مجھے یوں مشتعل نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"کوئی بات نہیں یار۔" شنکر نے خوش دلی سے میری پیٹھ تھپکی۔ "مجھے تو بس باس کی فکر تھی کہ جس کا دیا کھاتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو وقت آنے پر خدمت کا حق ادا نہ کر سکیں۔ اب تمھاری لڑنے کی صلاحیت دیکھ کر مجھے فکر نہیں رہی۔"

میں مزاحیہ انداز میں بولا۔ "بس تکا ہی لگ گیا تھا۔ اگر آپ کا بھاری گھونسا میری کنپٹی پر لگ گیا ہوتا تو شاید کل تک ہوش نہ آتا۔"

شنکر کھل کھلا کر ہنسا۔ "لڑائی بھڑائی میں تو بس داؤ چلنے کی بات ہوتی ہے۔"

"صحیح کہا بھائی۔" میں نے تائید میں سر ہلا دیا تھا۔ اب اتنا بچہ تو وہ بھی نہیں تھا کہ اسے معلوم نہ ہوتا کہ تکا کسی ایک شخص کے خلاف تو لگ سکتا ہے ایک ساتھ تین افراد پر اتفاقی داؤ کیسے چل سکتا ہے۔ لیکن ایسا باور کرا کے میں کیے کرائے پر پانی نہیں پھیر سکتا تھا۔

اس نے موضوع تبدیل کیا۔ "آج تو کافی دیر لگا دی۔ کوئی خاص پروگرام تھا شاید۔"

''وہ گوری دیکھی تھی نا جسے رخصت کرنے کو باس باہر آیا تھا۔''

''اس کے علاوہ دیکھنے کو تھا ہی کیا۔'' شنکر نے اوباشانہ انداز میں قہقہہ بلند کیا۔

''لمبے فاصلے تک مار کرنے والی رائفل لائی ہوئی تھی۔ اسی کے بارے انگریزی میں گٹ مٹ کرتی رہی۔ جو تھوڑا بہت میری سمجھ آیا، وہ نئے قسم کی رائفل بازار میں لانا چاہتی ہے۔''

''دھیرندر شکلا صاحب بھی اسی گوری کو ملنے آئے تھے۔'' شنکر کے استفسار نے میرے دل کی دھڑکن تیز کر دی تھی۔ انجانے میں وہ میرے دل پسند موضوع پر آ گیا تھا۔

''دھیرندر شکلا کون ہیں؟'' میں نے مصنوعی حیرانی ظاہر کی۔

''تم شکلا صاحب کو نہیں جانتے، وہ باس کا بھی باس ہے۔'' اس بار شنکر مجھے حقیقت میں حیران کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

''باس کا باس.....'' میں بوکھلا گیا تھا۔

وہ میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''راجپوت دادا، دھیرندر شکلا صاحب کے کاروباری ساتھی (بزنس پارٹنر) ہیں۔ اور راجپوت دادا تو صرف ممبئی کا بڑا دادا ہے، شکلا صاحب بین الاقوامی دادا ہیں۔ بہت بڑے اور اختیارات والے شخص ہیں۔ سرکاری طور پر بھی پہنچی ہوئی شخصیت ہیں۔ فوج سے کوئی جنرل، کرنل ریٹائرڈ ہیں۔'' بے چارہ فوجی عہدوں کو نہیں جانتا تھا تبھی جرنیل کو کرنل کے درجے تک لے آیا تھا۔ ورنہ کرنل کا عہدہ جنرل سے بہت نیچے ہوتا ہے۔

''یہ وہی موصوف ہوں گے جس کے ہمراہ چار کالے سوٹوں والے محافظ تھے۔ باقیوں سے اسلحہ جمع کر لیا گیا تھا لیکن اس کے محافظوں کے پاس گنیں موجود تھیں۔''

''بالکل وہی۔'' شنکر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے اپنی سادگی ظاہر کی۔ ''میں نے تو کوئی عام کاروباری شخص سمجھا تھا۔''

شنکر نے میری بے وقوفی پر قہقہہ بلند کیا۔ ''اپنی خوش قسمتی سمجھو کہ اسے قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اور یہ بھی باس کی وجہ سے تھا ورنہ ہم جیسے اسے دور سے بھی نہیں دیکھ سکتے۔''

''صحیح کہہ رہے ہو بھیا۔'' اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے میں دھیرندر شکلا کے بارے مزید کریدنے لگا۔ شنکر علمیت جھاڑنے کے چکر اور مجھے متاثر کرنے کے شوق میں میری معلومات میں کافی اضافہ کرتا رہا۔ بھولے پن اور انجان بننے کا ناٹک کر کے میں نے اس سے کافی کچھ اگلوا لیا تھا۔ یوں کہ دھیرندر شکلا کی ذات کے متعلق میرا شوق ظاہر ہونے کے بجائے فطری تجسس لگے۔ شنکر اس کی ممبئی میں بنی محل نما کوٹھی کو دیکھ چکا تھا۔ اس کی بیویوں اور اولاد وغیرہ کے بارے استفسار پر کوئی خاص سراغ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ خاص کر پرما انصاری کے بارے تو شنکر بالکل لاعلم تھا۔ لیکن اتنی معلومات بھی بہرحال کافی تھیں۔ اپنے اپنے بستر پر لیٹے ہم گپ شپ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ شنکر کو نیند آنے لگی۔ چوں کہ رات گئے تک جاگنا پڑتا تھا اس لیے ہم سہ پہر کو تھوڑی دیر آرام کر لیتے تھے۔ شنکر کی جان بخشی کر کے میں نے اپنی آنکھیں بھی بند کر لی تھیں۔

اٹھ کر غسل کر کے تازہ دم ہوئے۔ اور کھانا کھا لیا کہ وشال گپتا کسی بھی وقت بلا سکتا تھا۔ کھانے کے بعد ہم گپ شپ کرنے لگے۔ موہن سنگھ اور اجیت سنگھ کا رویہ بھی بہت بدلا ہوا تھا۔

پھر شنکر کے مشورے پر ہم تاش کھیلنے لگے۔ یہ ایسا کھیل ہے جو مجھے کبھی کھیلنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ لیکن ان کے ساتھ قدم ملانے کو مجھے سیکھنا پڑ گیا تھا۔ البتہ معدے کی خرابی کا بتا کر میں نے شراب پینے سے معذرت کر لی تھی۔ ورنہ وہ تینوں

بے تحاشا پینے والے تھے۔

اندھیرا گہرا ہوتے ہی وشال کا بلاوا آ گیا تھا۔ ہم باہر نکل آئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ تینوں جیپ میں اور میں باس کے ہمراہ کار میں بیٹھ کر ٹھکانے سے نکل آئے تھے۔ مجھے جانے کی سمت کا بتا کر وشال گپتا نرم لہجے میں نصیحت کرنے لگا۔

''تم اکیلے ہو اور وہ تین ہیں۔ تمھیں جھگڑا مول لینے میں احتیاط برتنا چاہیے تھی۔ دشمنی میں لوگ بہت کچھ کر جاتے ہیں، خاص کر اس وقت جب اتنی قربت ہو۔ کوشش کر کے صلح کر لو۔ یہ نہ ہو وہ میری لاعلمی میں تمھیں نقصان پہنچا دیں۔''

''جی باس۔'' میں نے سعادت مندی ظاہر کی۔ ''تینوں سے معافی مانگ لی ہے۔ اور اب ہمارے تعلقات کافی بہتر ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے میں ان سے تاش بھی سیکھتا رہا ہوں۔ بلکہ دو سو روپے ہارنے پڑے کہ یہ کھیل میرے لیے نیا ہے۔''

وشال نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''سمجھ دار ہو۔ آگے تک جاؤ گے۔''

''آپ کی آشیر باد چاہیے باس۔ بھگوان کی کرپا سے اتنی جلدی مار نہیں کھاؤں گا۔ کم عمری ہی سے ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ زندہ رہنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔''

اس نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا تھا۔

ہم گھنٹے بھر بعد ایک عالی شان کوٹھی کے دروازے پر پہنچے۔ کوٹھی کیا پورا محل تھا۔ نجانے کیوں مجھے لگا وہ دھیرندر شکلا کی کوٹھی ہے۔ لیکن میں نے وشال گپتا سے پوچھنے کی کوشش نہ کی کہ یہ مناسب نہیں تھا۔ اگر واقعی وہ شکلا کی رہائش گاہ تھی تو تھوڑی دیر بعد حقیقت سامنے آ جانا تھی۔

دعوت کا اہتمام کوٹھی کے سبزہ زار میں کیا گیا تھا۔ شکر لوگ پارکنگ ہی میں رک گئے تھے۔ میں وشال گپتا کے ہمراہ اندر پہنچ گیا۔ سرخ بجری کی روش پر سبزہ زار کے بالکل آغاز میں ''واک تھرو گیٹ'' (ایسا دروازہ جس سے گزرتے وقت اگر آدمی کے پاس دھات کی بنی اشیاء ہوں تو سیٹی بجنے لگتی ہے) رکھا ہوا تھا۔ وہیں ایک جانب بڑی میز رکھی تھی جس پر تمام مہمان اپنا اسلحہ وغیرہ رکھوا رہے تھے۔ یہ منظر بھی میرے اندازے کو تقویت دے گیا تھا کہ وہ دھیرندر شکلا ہی کی رہائش تھی۔ پستول جمع کرا کے میں نے ٹوکن لیے اور وشال گپتا کے عقب میں چلتا ہوا اندر پہنچ گیا۔ یہ ایک مخلوط تقریب تھی۔ مہمانوں کی آمد جاری تھی۔ میں عادت کے برخلاف لڑکیوں کو تاڑنے لگا۔ ممکن تھا کہ پرما انصاری دکھائی دے جاتی۔ مگر وہاں اکثریت خواتین کی تھی ایک دو لڑکیاں ہی نظر آئی تھیں، ان کی عمر بھی میرے اندازے میں پرما انصاری سے زیادہ تھی۔ اور شکل بھی انصاری صاحب کے بتائے ہوئے حلیے سے کافی مختلف تھی۔ ایک لڑکی کے بال کافی لمبے اور آنکھیں موٹی تھیں۔ دوسری گہرے سانولے رنگ کی تھی۔ جبکہ تیسری کا قد ضرورت سے زیادہ لمبا تھا۔

وشال گپتا مختلف لوگوں سے علیک سلیک کرنے لگا۔ میں آنکھوں پر کالی عینک چڑھائے اس کے عقب میں چلتا رہا۔ اس کا بڑا بھائی راجیوت دادا بھی وہاں آیا ہوا تھا۔

اچانک لوگوں میں ہلچل مچی۔ مڑ کر دیکھنے پر لورا براؤن نظر آئی۔ آج تقریب کی مناسبت سے اس نے خوب صورت لباس زیب تن کیا تھا۔ اب میں تو اس لباس کا نام ہی نہیں جانتا۔ میں صرف شلوار قمیص، ساڑھی اور پتلون کوٹ کا نام جانتا ہوں۔ سفید رنگ کا جسم سے چپکا ہوا ایسا لباس جس کا گلا اتنا کھلا ہو کہ عورت کے اندرونی لباس کی جھلک واضح نظر آئے۔ کمر پر صرف دو تسمہ نما لڑیاں جو لباس کو نیچے گرنے سے بچانے کو سہارا دیں۔ اور کمر وہاں تک برہنہ کہ اس سے آگے خطرے کی حدود شروع ہو جاتی ہو۔ ایک ٹانگ ران سے تھوڑا اوپر تک عریاں اور دوسری گھٹنے سے نیچے تک ڈھکی ہو۔ بازو کا کپڑا کلائیوں تک آئے مگر ایسا باریک اور چپکا ہوا کہ نہ تو بازو کی ہیئت چھپائے اور نہ رنگت۔ بہ ہر حال لباس کا نام نہ جاننے کی وجہ سے مجھے اتنی وضاحت کرنا پڑی۔

کافی لوگ اس کے ہاتھ کی نرمی جاننے کو قریب سمٹ گئے تھے۔ متبسم چہرے کے ساتھ ہر ملنے والے سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے ایک صوفے پر نشست سنبھال لی۔ اس اکٹھ میں چند ایسے بھی تھے جنھوں نے اسے بالکل اہمیت نہیں دی تھی۔ ان میں ایک راجپوت دادا بھی تھا کہ ایک صوفے پر بیٹھا شراب سے شغل کرتا رہا۔ وشال البتہ اس کے سامنے بچھا بچھا جا رہا تھا۔

سب سے آخر میں منحوس شکل شکلا کی آمد ہوئی تھی۔ اس کے پہلو میں چلنے والی لڑکی کو دیکھ کر میرا دل زور سے دھڑکا۔ یہ دھڑکنا خدانخواستہ محبت یا اس کی شکل سے متاثر ہونے کی وجہ سے نہیں تھا۔ بلکہ اپنا ہدف ملنے کی خوشی تھی۔ مہاراجہ قامت، سانچے میں ڈھلا متناسب بدن، کندھوں کو چھوتے سنہرے ریشمی بال، معصوم چہرہ، آنکھوں میں دنیا جہاں کی شوخی، ہونٹوں پر خوب صورت مسکراہٹ بکھیرے وہ سچ مچ پری لگ رہی تھی۔ وہ انتہا کی خوب صورت نہیں تھی، مگر بے پناہ موہنی ضرور تھی۔ ایسی لڑکی جسے دیکھ کر بے ساختہ پیار آ جائے۔ میں فوراً ہی پرما انصاری کو پہچان گیا تھا۔ اس کا لباس بھی لورا براؤن سے کم نہیں تھا۔ آدھی رانوں تک آتا ہوا اسکرٹ، کمر کا بالشت بھر کا علاقہ کپڑے سے بے نیاز اور بالائی جسم پر کھلے گلے اور بغیر بازوؤں کی چولی۔ گورے بازو بالکل عریاں تھے۔ چہرے کی سفیدی میں سرخی نمایاں تھی۔ یقیناً امارت حسن کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

شکلا کے پہلو میں چلتے ہوئے وہ یوں لگ رہی تھی جیسے زرافے کے ساتھ ہرنی۔

اس نے شکلا کے ساتھ ہی نشست سنبھالی تھی۔ لورا براؤن نے قریب آ کر شکلا سے مصافحہ کیا، پرما کو گلے سے لگا کر ماتھے اور گالوں پر پیار دیا اور ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

میں دائیں بائیں کا جائزہ لینے لگا کہ شکلا کو وہیں قتل کر کے اگر پرما کو اغواء کر لوں۔ مگر پھر مجھے اپنی سوچ پر ہنسی آئی تھی۔ پوری عمارت میں جا بہ جا مسلح کمانڈو یوں چکرا رہے تھے جیسے ایٹمی پلانٹ کی حفاظت پر چاق و چوبند فوجی دستے ہوتے ہیں۔ میں نے کوٹھی سے باہر نگاہ دوڑائی، گو رات کا وقت تھا مگر تیز روشنی کی وجہ سے دور تک عمارات کی نشان دہی ہو رہی تھی۔ البتہ رات کی وجہ سے کوئی ایسی مناسب جگہ نظر نہ آئی جہاں دور سے شکلا کو نشانہ بنانا ممکن ہوتا۔ شاید دن کو کوئی ایسی عمارت نظر آ جاتی۔

ہلکا ہلکا میوزک بج رہا تھا۔ حاضرین کے چہروں پر خوشی کی چمک تھی۔ اچانک کوئی قریب آ کر کھنکارا۔

سر گھمانے پر مجھے مضبوط جسم کا جوان نظر آیا جس کی عقابی نگاہیں مخالف کو بدن چھیدتی محسوس ہوتیں۔

''تم شاید وشال گپتا کے محافظ ہو۔'' اس نے ہاتھ مصافحے کو بڑھایا۔

اس کی گرفت میں ہاتھ تھماتے ہوئے میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

اس نے ہاتھ کی گرفت مضبوط کی۔ یقیناً اس کا ہاتھ کافی سخت اور طاقت ور تھا۔ مگر اس کی بدقسمتی کہ عملی زندگی میں سخت حالات کی چکی میں پسے ہوئے سائیکر پر دھاک بٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے جوابی زور آزمائی کے بجائے بس دفاعی انداز میں ہاتھ کو اتنا سخت کیا تاکہ اسے پتا چل جائے کسی اناڑی کا ہاتھ نہیں دبا رہا۔

اس نے زہریلے لہجے میں سرگوشی کی۔ ''وہ شکلا صاحب کی نواسی ہے۔ جانتے ہو پچھلے ہفتے میڈیکل کے ایک طالب علم کو سڑک کنارے روک کر ایک آنکھ سے محروم کر دیا گیا۔ کیوں کہ اس نے راج کماری پرما کی تجویز پر انھیں گھورنا نہیں چھوڑا تھا۔ اب سنا ہے اس نے وہ کالج ہی چھوڑ دیا ہے۔''

ایک دم میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ شکلا کی حیثیت جنگل کے بادشاہ شیر کے بجائے ڈائنوسار کی سی تھی۔ میرے جیسے معمولی حیثیت کے آدمی کا قتل تو اس نزدیک چیونٹی مسلنے سے بھی

آسان تھا۔شاید اس کی ایما پر خود وشال گپتا میری چھاتی میں گولی ٹھونکنا سعادت سمجھتا۔

میں نے فوراً شرمندی ظاہر کی۔''شکریہ دوست! یقیناً آپ میری حماقت کو معاف کرنے میں فراخ دلی سے کام لیں گے۔''

میرے مدافعانہ لہجے نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔میرا ہاتھ آزاد کرتے ہوئے وہ نرم لہجے میں بولا۔''شاباش، سمجھ دار ہو۔لمبی زندگی گزارو گے۔''

''اس گوری کو دیکھنے پر تو پابندی نہیں ہے ناں باس۔''میں نے مزاحیہ انداز اپنایا۔

وہ اطمینان سے بولا۔''جب تک راجکماری پرما کے ساتھ بیٹھی ہے صبر کرلو،اس کے بعد گھورنا تو چھوڑو، کہیں بھگا کے لے جانا۔''

''شکریہ باس۔''کہہ کر میں نے اپنا رخ پرما کی جانب سے موڑ لیا تھا۔مرد حضرات یقیناً پہلے سے پرمابی بی سے واقف تھے کہ کوئی اسے گھورنے کی ہمت نہیں جتا رہا تھا۔دھیرندر شکلا ایسی بلا کا نام نہیں تھا کہ کوئی اس سے مخاصمت مول لینے کی جرأت کرتا۔

کھانا شروع ہوا۔سب لوگ لوازمات سے سجے طویل اور وسیع وعریض دسترخواں کی طرف بڑھ گئے جو کئی میزوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔اتنے قسم کے کھانوں کی بہتات تھی کہ تمام قسموں کو چکھنے والے کا پیٹ بھی بھر جاتا۔میرے جیسے محافظ بس اپنے آقا کا دم چھلا بنے چاک وچوبند اور چوکس رہنے کی اداکاری کر رہے تھے۔ایسی محفل میں باس لوگوں کو کیا خطرہ درپیش ہوسکتا تھا۔

دعوت طعام کے بعد محفل موسیقی شروع ہوئی۔گانے کے ساتھ ناچنے والیوں کا بھی بندوبست تھا۔

لورا براؤن، دھیرندر شکلا کے پہلو میں بیٹھ کر سر جوڑے مصروف گفتگو رہی۔یقیناً اس کی آمد کا مقصد شرب وطعام سے زیادہ سودے بازی سے تھا۔دھیرندر شکلا کو راضی کر کے وہ ہتھیاروں کی بہت بڑی مانگ حاصل کرسکتی تھی۔کثیر فوج کو بڑے عدد کی گنتی کے ہتھیار درکار ہوسکتے تھے۔فوج کے علاوہ شکلا کے دہشت گردوں سے بھی تعلقات تھے۔اور فی زمانہ سنائپر رائفلیں تو دہشت گرد بھی استعمال کرنے لگے ہیں۔افغان سرحد پر پاک آرمی کے خلاف دہشت گردوں کے کافی سنائپر سرگرم عمل ہیں۔

پرما انصاری زیادہ دیر نہیں بیٹھی تھی اور شکلا سے اجازت لے کر اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گئی تھی۔ چار پانچ چست وچالاک کمانڈو تھوڑا سا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چل پڑے۔اگر گھر کے اندر اس کی حفاظت کا یہ اہتمام تھا تو گھر سے باہر کیا حالت ہوتی تھی۔انصاری صاحب نے صحیح مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔

محفل موسیقی رات گئے تک جاری رہی اس دوران شکلا اور لورا بھی سر جوڑے مصروف گفتگو نظر آئے۔میں اتنی دور تھا کہ ان کے مابین ہونے والی گفتگو کا اندازہ بھی نہیں کرسکتا تھا۔اور پھر شاید ان کے درمیان کچھ طے ہوگیا کہ شکلا نے لورا سے الوداعی مصافحہ کیا اور اندرونی عمارت کی طرف چل پڑا۔محافظوں نے اسے دائیں بائیں، عقب اور سامنے سے گھیر لیا تھا۔وہ مخصوص فاصلہ رکھے آگے بڑھتے رہے۔فوجی جرنیل یوں بھی اس پذیرائی کے عادی ہوتے ہیں۔اور وہ تو جرنیل کے ساتھ اور بھی بہت کچھ تھا۔

طاقت واختیار انسان سے بہت سے وہ کام بھی کرا دیتے ہیں جن کے بارے عام انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔یہ اختیار ہی تو تھا جس نے فرعون ونمرود سے خدائی کا دعویٰ کرایا، شداد کو خدا کے مقابلے میں جنت بنانے پر اکسایا، ابرہہ کو خانہ کعبہ پر حملے کا حوصلہ دیا، ابوجہل کو کفر پر ثابت قدم رکھا، کسریٰ پرویز کو نبی پاک ﷺ کے نامہ مبارک کو چاک کرنے کی

ترغیب دی۔ یزید بد بخت کو جگر گوشہ رسول ﷺ کا سر قلم کرانے پر جری کیا، تیمور لنگ کو مسلمان سالار بایزید رحم کے خلاف میدان میں اترنے پر مجبور کیا، سلمان بن عبدالملک سے محمد بن قاسم جیسے مجاہد کی پھانسی کا حکم نامہ جاری کروایا۔ ابو جعفر منصور سے امام ابوحنیفہ جیسے ولی اللہ کو قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کر کے زہر دینے کا گناہ کروایا، یہی تو طاقت و اختیار کی سب سے بڑی خامی ہے کہ انسان سے انسانیت چھین کر خدا بننے کی احمقانہ و حماقت بھری سوچ عطا کرتی ہے۔ اور جب مالک حقیقی ڈھیلی رسی کھینچتا ہے تو انسان کے پاس پچھتانے کی مہلت بھی نہیں ہوتی۔

لورا براؤن نے بھی دھیرندر کے اٹھتے ہی جانے کو پر تولے۔ وشال گپتا بھی شاید اسی کے انتظار میں تھا تیز قدموں سے اس کے پیچھے چل پڑا۔ میں بھاگ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

واک تھرو گیٹ پر کھڑے ایک محافظ نے اسے کوئی پیغام دیا۔ ''میں شکلا سے مل کر آتا ہوں۔'' مجھے وہیں رکنے کا اشارہ کر کے اس نے حسرت بھری نگاہ لورا براؤن کی شفاف کمر پر ڈالی اور اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔

میرا دل چاہا پستول اٹھا کر اس کے پیچھے چل دوں لیکن شکلا کے محافظوں کی کڑی نظریں مجھ پر گڑی تھیں۔ یقیناً وہ مجھے اندرونی عمارت کی طرف جانے کی اجازت نہ دیتے۔ وشال گپتا نے زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم کار میں بیٹھ کر ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔

وہ سارے رستے خاموش رہا۔ مگر جیسے ہی اسے اتارنے کو کار روکی سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''کار پارک کر کے میرے کمرے میں آ جاؤ۔''

''جی باس۔'' کہہ کر میں نے کار آگے بڑھا دی۔

وہ تینوں جیپ پارک کر کے میرے منتظر کھڑے تھے۔ ایک جھڑپ میں ہمارے فاصلے سمٹ گئے تھے۔

کار روک کے میں ان کے پاس پہنچا۔ ''آپ لوگ چلو مجھے باس نے بلایا ہے۔''

وہ سر ہلاتے ہوئے اپنے کمروں کو بڑھ گئے۔ میں وشال گپتا کی رہائش گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ڈرائینگ روم نما نظر نہ آیا۔ اس سے متصل دو خواب گاہیں تھیں۔ ایک وشال کے استعمال میں جبکہ دوسری خالی پڑی رہتی۔ یقیناً وہ کسی خصوصی مہمان کے لیے بنائی گئی تھی۔ وہ اپنی خواب گاہ میں تھا۔ دستک کے جواب میں اس کی۔ ''آ جاؤ۔'' سنائی دی گئی۔

''بیٹھو۔'' میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے دعوت دی۔

میں نے خاموشی سے نشست سنبھال لی۔ وہ کسی گہری سوچ میں کھویا گلاس سے گھونٹ گھونٹ کر کے زہر معدے میں اتارتا رہا۔ میں خاموشی سے اس کے بولنے کا منتظر تھا۔

''ایک اہم کام کو مجھے ایسے بندے کی ضرورت ہے جو رازداری برتنا جانتا ہو۔'' لمحاتی خاموشی کو توڑتے ہوئے اس کی گھمبیر آواز ابھری۔

میں محتاط انداز میں بولا۔ ''باس اصرف رازی رکھنے سے تو بات نہیں بنے گی مسئلہ تو اہم کام کی تکمیل سے حل ہوگا نا۔''

اس نے ترغیب دی۔ ''تم دولت بننا چاہتے ہو ناں..... اور خواہشات کی تکمیل قربانی مانگتی ہے۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''قربانی کا تعین کریں گے تو کچھ طے کر سکوں گا۔''

''کسی پر گولی چلانے کا کہوں تو کیا جواب ملے گا۔''

''بے گناہ آدمی کو مارنا اتنا آسان نہیں ہوتا باس۔ ایسی دولت بھلا کب سکون دے گی جو کسی کی چتا جلا کر حاصل ہو۔''

اس نے فلسفہ جھاڑا۔ ''اخلاقیات کا وزن بہت زیادہ ہوتا ہے سندیپ! انھیں اٹھا کر ترقی و بلندی کی منازل طے نہیں

کی جاسکتیں۔اور یاد رکھو ضمیر ایسی رسی ہے جو ہمیشہ تمھیں غربت کے کھونٹے سے باندھ کر رکھے گی۔ پن (نیکی) اور پاپ (گناہ) فقط کمزوروں اور نکھٹوؤں کے حیلے ہوتے ہیں۔ ورنہ انسان کی پہلی ترجیح اپنی ذات ہونا چاہیے۔"

نہ جانے وہ کیا کام لینا چاہتا تھا۔ اگر کسی بے گناہ کے قتل کا کہتا تو میں بعد میں انکار بھی کرسکتا تھا۔ میں نے کون سا ہمیشہ وہیں رہنا تھا۔ البتہ جب تک تھا اس کی ہاں میں ہاں ملانے ہی میں بہتری تھی۔ یہ بھی ممکن تھا اس کا ہدف میرا بھی دشمن ہوتا۔ میں نے دو تین لمحے سوچنے کی اداکاری کی اور پھر کام کا پوچھنے کے بجائے انعام کے بارے جاننے کی جستجو کی جو پوچھنا میرے کردار سے زیادہ میل کھاتا تھا۔ "کتنی دولت ملے گی؟"

"شاباش، یہ ہوئی نا عقل مندوں والی بات....." خوشی سے چہکتے ہوئے اس نے دائیں ہاتھ کی پانچ انگلیاں اٹھا دیں۔ "پانچ لاکھ۔"

"کسے قتل کرنا ہے۔ اور کیا گولی چلانے کے بعد میرے بچنے کی امید ہوگی؟" میں نے ایک ساتھ دو سوال پوچھے۔

"ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے سے گولی چلانے والے کو کیا خطرہ ہوسکتا ہے۔" اس نے ہدف کا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔

میں چونک گیا تھا۔ اپنے شک کو حیرانی میں ڈھالتے ہوئے پوچھا۔ "اتنے لمبے فاصلے سے میں گولی کیسے چلاؤں گا؟"

وہ ہنسا۔ "بھول گئے کل گوری حسینہ نے کتنی آسانی سے پندرہ سو میٹر کے فاصلے پر چھوٹے سے ہدف کو شانہ بنایا تھا۔"

میں نے مصنوعی بے بسی ظاہر کی۔ "باس! وہ پیشہ ور نشانے باز ہے۔ اور میں بس پستول چلا لیتا ہوں۔"

"راجیو تمھاری نشانہ بازی کی تعریف کر رہا تھا۔ یقیناً تم رائفل بھی آسانی سے چلا لو گے۔"

میں نے دلچسپی سے پوچھا۔ "سکھائے گا کون؟"

وہ چہکا۔ "سکھانے والے کا نام جان کر شاید تم خوشی سے پھٹ جاؤ۔"

الجھن آمیز انداز میں سر کھجاتے ہوئے میں اسے گھورتا رہ گیا تھا۔

مجھے خاموش پا کر اس نے تجسس ختم کیا۔ "کیپٹن لورا براؤن کا شاگرد بننے میں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔"

"وہ گوری.....؟" میں حقیقتاً اچھل پڑا تھا۔

"ہا.....ہا....." وشال گپتا نے بلند بانگ قہقہہ اچھالا۔ "گویا تم بھی گھائل ہو چکے ہو۔"

میں نفی میں سر ہلاتے ہوئے مطلب کے موضوع پر آیا۔ "باس! شکلا صاحب کے پہلو میں بیٹھی ہوئی نوجوان حسینہ کون تھی۔"

"چپ....." اس نے ایک دم ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ "دوبارہ تمھارے منہ سے ایسا کچھ نہ سنوں۔"

"شش.....شما چاہتا ہوں باس۔" میں نے ہکلانے کی اداکاری کی۔

"بے وقوف! وہ دھیرندر شکلا کی نواسی راج کماری پرماشکلا ہے۔ اسے گھورنے والے کی آنکھیں پھوڑ دی جاتی ہیں، اس کے بارے بولنے والے کی زبان کاٹ دی جاتی ہے اور اسے سوچنے والے کا سر سلامت نہیں رہتا۔ پہلی اور آخری بار تنبیہ کر رہا ہوں۔ دوبارہ تمھارے منہ سے اس کا نام نہ سنوں۔"

"معافی چاہتا ہوں باس۔" میں نے ندامت ظاہر کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

"تو تیار ہو۔" وہ موضوع کی طرف پلٹا۔

"آپ نے ہدف کا نہیں بتایا۔"

اس نے شرط پیش کی۔ ''پہلے نشانہ بازی کا امتحان تو پاس کرلو۔''

''بھگوان نے چاہا تو آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔''

اس نے فلسفہ بگھارا۔ ''ہمارے کام میں بھگوان کا نام لینا اچھا شگون نہیں ہوتا۔ ہم بس اسے مانتے ہیں۔ اس کی ماننے میں سراسر ہمارا گھاٹا ہے۔ اور گھاٹے کا سودا کون کرتا ہے۔''

''میری تربیت کب شروع ہوگی؟'' اس کی کفریہ گفتگو پر تبصرہ کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ بھگوان ہو، گاڈ ہو، خدا ہو یا اللہ سب کا اشارہ اسی طاقت ورذات کی طرف ہے جس کے ارادے اور مشیت کے سامنے نہ تو کوئی تدبیر کام آتی ہے اور نہ اختیارات وطاقت۔ یہ اور بات کہ وہ حلیم ہے۔ مہلت دیتا ہے، غفور ہے، معاف کردیتا ہے۔ صبور ہے ڈھیل دیتا ہے، کریم ہے کرم فرماتا ہے، رحیم ہے، موقع دیتا ہے۔ جذبات وغیرہ سے مغلوب نہیں ہوتا کہ اشتعال میں آکر بڑی بڑی باتیں کرنے والے کو اسی وقت پکڑ لے۔

اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ''بڑی جلدی ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کیوں کہ مزید غربت برداشت نہیں ہوتی۔''

''فکر نہ کرو بالک! اگر یہ کام کامیابی سے کردیا تو چھپڑ پھاڑنے میں کامیاب ہوجاؤ گے، اس کے بعد دولت کی بارش میں نہاتے رہو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے گہرا سانس لیا۔ ''اب آرام کرو کل یا پرسوں سے تمھاری تربیت شروع ہوجائے گی۔ اور یقیناً یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں ہوگی کہ اس گفتگو تک کسی تیسرے کی سماعتوں کی رسائی نہیں ہونا چاہیے۔''

''جی باس۔'' اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میں کمرے سے نکل آیا۔ تھوڑی دیر چہل قدمی کرکے میں کمرے میں لوٹ گیا۔ وقتاً فوقتاً میں عمارت میں گھومتا رہتا تھا۔ اب تو عمارت کا چپہ چپہ ازبر ہوگیا تھا۔ حالات کا کچھ پتا نہیں تھا کہ کب وہاں سے بھاگنا پڑتا۔ اور وشال گپتا کے پاس سنائپر رائفلیں دیکھ کر بھی میرے دل میں چور پیدا ہوگیا تھا۔ ضرورت پڑنے پر وہاں سے سنائپر رائفل حاصل کی جاسکتی تھی۔

شنکر میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ ''کافی دیر لگادی یار! کوئی خاص بات تھی کیا؟'' اس نے میرے بیٹھنے کا انتظار نہیں کیا تھا۔

بستر سنبھالتے ہوئے میں نے پہلے سے سوچا ہوا جواب اگلا۔ ''باس چاہتے ہیں میں مزید تربیت حاصل کروں۔ جسمانی داؤ پیچ کے ساتھ وہ مجھے ہر قسم کے ہتھیار چلانا بھی سکھانا چاہتے ہیں۔''

وہ سمجھ داری سے بولا۔ ''لازمی بات ہے اپنے خصوصی محافظ کی تربیت پر اس نے توجہ تو دینا ہوگی۔''

''تھک گیا ہوں یار! سوتے ہیں۔'' اس کے مزید سوالوں سے بچنے کو میں نے جمائی لیتے ہوئے کروٹ تبدیل کی۔

اس نے چپ رہ کر میری خاموش تائید کی تھی۔

اگلے دن ناشتا کرنے کے تھوڑی دیر بعد ہی وشال گپتا کا بلاوا آ گیا تھا۔ میرے پہنچنے پر بغیر تمہید باندھے مجھے کسی خاص جگہ جانے کا مژدہ سنایا۔ مزید ہدایات اس نے موبائل فون پر دینے کا عندیہ دے کر تیار ہونے کا حکم سنا دیا۔

اپنا مختصر سامان لپیٹ کر میں نے سفری جھولے (بیگ) میں ڈالا اور جانے کو تیار ہو گیا۔ شکر لوگوں کو میں نے تربیت والی کہانی دہرا کر مطمئن کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں راجیو کے ساتھ انجان منزل کی جانب گامزن ہو گیا۔ راستے میں راجیو عام گفتگو کرتا رہا۔ میرے جانے کے مقصد اور کام وغیرہ کے بارے اس نے تجسس ظاہر نہیں کیا تھا۔

گھنٹے ڈیڑھ بعد ہم زیادہ بھیڑ سے نکل کر مضافات جانے والی سڑک پر رواں دواں تھے۔ میں ممبئی شہر کے راستوں سے بالکل ناواقف تھا۔ بس جتنا کچھ انصاری صاحب نے نقشوں کی مدد سے سمجھایا تھا وہی ذہن میں تھا۔ اور نقشوں کی مدد سے کسی علاقے سے خاطر خواہ واقفیت حاصل نہیں کی جا سکتی۔ راجیو سے بھی زیادہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ اس کے تئیں میں ممبئی ہی کا باشندہ تھا۔ زیادہ مشکل مجھے بات چیت کے وقت پیش آتی تھی کہ ہندی اور اردو کی اصل ایک سہی بول چال میں کافی فرق ہے۔ روزمرہ کے عام الفاظ جو کوئی اور بولے تو ہم بڑی آسانی سے سمجھ جاتے ہیں، مگر اپنی زبانی میں روانی سے بولنا کافی دشوار تھا۔ جاسوس بننا اتنا مشکل ہوگا یہ مجھے اب پتا چل رہا تھا۔ جنگلوں بیابانوں میں بھی ایک سنائپر ہر لمحہ خطرے کی زد میں رہتا ہے مگر یہاں دگنا خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ راز فاش ہو جانے کے بعد بچنے کی امید صفر فیصد بھی نہیں تھی۔ اتفاق سے وشال گپتا کا سہارا مل گیا تھا ورنہ میں اب تک اندھیرے ہی میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوتا۔ انسان کے منصوبے اور تدابیر ہمیشہ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتیں۔ کبھی مقصد کو درمیان میں چھوڑنا پڑتا ہے اور کبھی اللہ پاک اپنی قدرت سے ایسی آسانیاں فرما دیتا ہے کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

مجھے دھیرندر شکلا اور پرما انصاری کی تلاش کے بعد سب سے مشکل کام کسی معیاری سنائپر رائفل کی تلاش کا لگ رہا تھا۔ اور اللہ پاک نے ایسی آسانی فرمائی کہ نہ صرف میں شکلا کے ٹھکانے تک پہنچ گیا بلکہ مجھے سنائپر رائفل تک بھی رسائی ہو گئی تھی۔ اور سونے پر سہاگا کہ دشمن خود میری تربیت پر کمربستہ تھا۔ میں اب جلد از جلد نشانہ بازی کی تربیت مکمل کر کے وشال گپتا کا مقصد جاننے کا خواہاں تھا۔ جہاں تک میرا اندازہ تھا اس کام کا منصوبہ ساز (ماسٹر مائنڈ) دھیرندر شکلا ہی تھا۔ البتہ بہت زیادہ سوچنے کے بعد بھی ہدف کے بارے اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا۔

مزید ادھ، پون گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ایک ڈیرے (فارم ہاؤس) کے پاس پہنچ گئے تھے۔ کافی وسیع اور کشادہ عمارت تھی۔ اردگرد سرسبز کھیت خوب صورت منظر پیش کر رہے تھے۔ ممبئی شہر کی اونچی عمارتوں شہر کی بھیڑ، چیخ و پکار وغیرہ سے دور ایک پرفضا مقام تھا۔ ممبئی آبادی کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ اور اتنی بڑی آبادی میں شہر کی فضا کا کیا حال ہوگا اس کا اندازہ کرنے کو یقیناً عقل کل ہونا ضروری نہیں ہے۔

داخلی دروازے پر کار روک کر راجیو نے کہا۔ ''آپن سالا یہاں سے واپس جائیں گا۔''

چوکیدار باہر نکل آیا تھا۔ راجیو کو دیکھ کر اس نے شناسائی کا اظہار کیا تھا۔ کار سے نکل کر راجیو نے معانقہ کرتے ہوئے میرا تعارف کرایا۔

''سندیپ بابو کے بارے تمھیں باس کا حکم مل چکا ہوگا۔''

چوکیدار نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کیا۔ اور راجیو سے کھانے پینے کی بابت پوچھنے لگا۔

راجیو نفی میں سر ہلا کر کار میں گھسا اور ہاتھ لہراتا ہوا واپس مڑ گیا۔

میں چوکیدار کی معیت میں اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گیا جو دروازے سے کافی فاصلے پر بنی تھی۔ وہاں تک خوب صورت اینٹوں کی روش بنی تھی جس کے جوانب میں پھولوں کی کیاریاں بنی تھیں۔ ڈیرے کی چاردیواری چار فٹ سے بلند نہیں تھی۔ البتہ اس کے اوپر مزید تین فٹ تک کانٹادار تار ایسے لگائی گئی تھی کہ تار کاٹے بغیر اندر داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔ ڈیرے کا احاطہ آٹھ دس ایکڑ کے بہ قدر تو ضرور ہوگا۔ ایک کونے میں خوب صورت اور جدید طرز کی رہائش گاہ بنی تھی۔ جس کے بغل میں نہانے کا تالاب (سوئمنگ پول) تھا۔ رہائشی عمارت اور بیرونی دیوار کے ساتھ چوڑا گیراج بنا تھا جس میں چھے سات کاریں ایک ساتھ کھڑی کی جاسکتی تھیں۔ گیراج میں اس وقت دو قیمتی کاریں نظر آرہی تھیں۔ رہائشی عمارت کے قریب ایک اور ملازم نظر آیا، چوکیدار مجھے اس کے حوالے کر کے واپس پلٹ گیا۔

رہائشی عمارت میں داخل ہوتے ہی ایک کھلا سا ہال نظر آیا جس کے ایک کونے میں باورچی خانی بنا تھا۔ درمیان میں چار صوفہ سیٹ آنے سامنے رکھ کر ڈرائنگ روم کی شکل دی گئی تھی۔ چاروں دیواروں کے ساتھ بڑی سکرین کی ایل ای ڈی نظر آرہی تھیں، تاکہ کسی صوفہ نشین کو دائیں بائیں دیکھنے کی زحمت نہ کرنا پڑے۔ باورچی خانے کی مخالف دیوار کے ساتھ چند کمرے بنے تھے۔ اور ان کے ساتھ دوسری منزل کے لیے اوپر سیڑھیاں جارہی تھیں۔

ڈرائینگ روم میں لورا براؤن کو میز پر پاؤں رکھ کر ٹی وی گھورتے دیکھ کر مجھے حیرانی نہیں ہوئی تھی۔ مجھ پر سرسری نظر ڈال کر وہ ٹی وی سکرین کی طرف متوجہ رہی۔ اس کے انداز و اطوار میں حکمران قوم سے ہونے کا فخر و غرور شدت سے امل رہا تھا۔ سونے پر سہاگا کہ وہ صنف نازک بھی تھی۔ اور ایسی آزاد خیال عورتوں کا ناز نخرہ نہ کرنا باعث حیرانی و تعجب تو ہوسکتا ہے۔ ناز و ادا دکھلانا عجیب نہیں ہوتا۔ ہر خوب صورت بے حجاب عورت چاہے جانے کی متمنی ہوتی ہے، بلکہ اسے پیدائشی حق سمجھتی ہے۔ اور خیر سے مرد حضرات بھی ایسے قدر ناشناس نہیں ہوتے کہ انھیں مایوس کریں۔ یہ علیحدہ بات کہ صنف نازک ہی گھاس ڈالنے پر راضی نہیں ہوتیں۔

میں نے از خود تعارف کی کوشش نہ کی کہ مجھے اس کی ضرورت تھی نہ حاجت۔ ادھیڑ عمر ملازم سے اپنے کمرے کے بارے رہنمائی لے کر میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ دوسری منزل پر ایک خوب صورت خواب گاہ میری منتظر تھی جس کی کھڑکی سے ڈیرے سے باہر کا علاقہ بھی دور دور تک نظر آتا تھا۔ جوتے اتار کر میں بستر پر لمبا پڑ گیا۔ جب تک وشال گپتا کی طرف سے کوئی ہدایت نہ ملتی مجھے از خود عقل مند بننے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں الجھن آمیز حالات کو سوچنے لگا۔ نہ جانے وشال گپتا کس کا قتل کرانا چاہتا تھا اور اس کی نظر انتخاب مجھ پر کیوں پڑی تھی۔ لورا براؤن کیسے مجھے تربیت دینے پر آمادہ ہوئی تھی۔ ایک دور رس سوچ یہ بھی ذہن میں جاگی کہ شاید ایس آر ون سائبر ہتھیاروں کی خریداری کو دھیرندر شکلا نے ایسی کوئی شرط لگائی ہو۔ بلاشبہ ہندو بنیا موقع سے فائدہ اٹھانے کا ماہر ہے۔ اگر وجہ سے لورا براؤن کے چہرے پر بھی مجھے دیکھ کر جوش یا وارفتگی نہیں ابھری تھی۔ اگر اس کا اپنا کام ہوتا تو وہ ضرور مجھے خوش آمدید کہتی اور ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتی۔ مزید غور کرنے پر مجھے اپنی سوچ حقیقت کے قریب ہی لگی تھی۔ البتہ اپنے چناؤ کے بارے مجھے کوئی قابل عمل سوچ نہیں سوجھی تھی۔ کیوں کہ وشال گپتا میری اصلیت سے تو واقف نہیں تھا۔ یونہی

میرے بہ طور سندیپ چوپڑا ہونے کے میرے ماضی سے بھی واقف نہیں تھا۔ کہ میری وفاداری وغیرہ سے متاثر ہو کر اس نے میرا چناؤ کیا ہو۔ صرف پستول کا فائر اچھا ہونے سے کوئی سنائپر نہیں بن جایا کرتا۔ بہت زیادہ سر کھپانے کے باوجود میں وشال گپتا کے فیصلے کی توجیہہ نہیں کر سکا تھا۔ کبھی کبھی انسان بغیر جانے اور پرکھے کسی پر اندھا اعتماد کرنے لگتا ہے جو میرے خیال میں وشال گپتا بھی مجھ پر کرنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ میرے انتخاب کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ ممبئی جیسے شہر میں کرائے کا قاتل ڈھونڈنا دریائے کے کنارے بیٹھ کر پانی کی بالٹی بھرنے کی فکر کرنے جیسا تھا۔

پھر مجھے خیال آیا، صرف قاتل نہیں ڈھونڈنا تھا انھیں ایک سنائپر چاہیے تھا۔ اور پھر کرائے کے قاتل قابلِ بھروسا نہیں ہوتے، جبکہ مجھ پر وشال اعتماد کر سکتا تھا۔ اور میری تربیت کو لورا براؤن میسر تھی تو انھوں نے موقع سے فائدہ اٹھانا مناسب سمجھا، اگر میں اچھا ثابت ہوتا تو آئندہ بھی ان کے کام آ سکتا تھا۔ فی زمانہ کلیدی قتل (ٹارگٹ کلنگ) کا چلن ہے۔ اور مخصوص افراد کو نشانہ بنانے کو سب سے بہترین ذریعہ سنائپنگ ہی ہے۔

شام تک میں انھی خیالوں میں الجھا رہا۔ دن کا کھانا میں نے کمرے ہی میں منگوا کر کھا لیا تھا۔ میرا ارادہ تو شام کو بھی کمرے سے نکلنے کا نہیں تھا۔ اور ملازم کو کھانا کمرے میں لانے کا کہہ دیا تھا، مگر اندھیرا چھانے کے تھوڑی دیر بعد بلاوا آ گیا تھا۔ وشال گپتا کو وہاں پا کر مجھے حیرت نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اس کے نہ آنے پر کرید ضرور ہوتی۔ لورا براؤن کے آگے پیچھے پھرنے والے کا وہاں نہ آنا حیران کن ہی ہوتا کہ وشال کی حیثیت میزبان کی تھی۔

''تم نے کیپٹن کو اپنا تعارف نہیں کرایا۔'' مجھے دیکھتے ہی وشال متبسم ہوا۔

''آپ کا منتظر تھا۔'' اس کے اشارے پر نشست سنبھالتے ہوئے میں نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

اس نے خفگی ظاہر کی۔ ''تمھیں سب کچھ بتا تو دیا تھا۔''

''باس! میں انگریزی سمجھنے کی حد تک ہی جانتا ہوں، بولنے میں دشواری محسوس کرتا ہوں اور مادام کو ہندی نہیں آتی ہے تو آپ کے بغیر کیسے کام چلتا۔'' ہم ہندی ہی میں بات کر رہے تھے۔ لورا بے پروا بیٹھی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی۔ ملازم کھانا لگا رہے تھے..... لورا کھیرے کی قاش اٹھا کر کھانے لگی۔ اس کے انداز میں ہلکی سی بیزاری تھی جو ظاہر کر رہی تھی کہ وہ مجھے تربیت دینے پر مجبوراً ہی راضی ہوئی تھی۔

وشال گپتا، لورا کی طرف متوجہ ہوا اور میرا تعارف کرانے لگا۔ ''سندیپ میرا خاص محافظ ہے۔ اس کا پستول کا فائر بہت اچھا ہے۔ امید ہے سنائپر رائفل کو بہت جلد سمجھ جائے گا۔''

''اسے انگریزی آتی ہے۔'' وہ وشال ہی کو مخاطب ہوئی تھی۔

وشال نے اسے تسلی دی۔ ''بے فکر رہو مادام، پڑھا لکھا جوان ہے۔ بھگوان کی کرپا سے ہمارا نوجوان ہندی سے زیادہ انگریزی سمجھتا ہے۔''

وہ بیزاری سے بولی۔ ''میں ایک ہفتے سے زیادہ وقت نہیں دے پاؤں گی۔ کام مکمل کرنے کی ذمہ داری تمھارے اپنے آدمی کی ہوگی، اس کی نالائقی کو میرے حساب میں نہ ڈالا جائے۔''

''میرا کام ایک باصلاحیت جوان مہیا کرنا تھا۔ باقی آپ کے اور شکلا صاحب کے مابین جو معاہدہ ہوا ہے اس سے میں لاعلم ہوں۔''

لورا طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''مسٹر شکلا موقع کا فائدہ اٹھانے کا ماہر ہے۔''

وشال پھیکے انداز میں بولا۔ ''اس بارے کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا، البتہ ڈبلیو اے ایس کمپنی کے بڑے شکلا صاحب کے ہم خیال ہیں۔''

لورا نے انکشاف کیا۔ ''میں خود ''واز'' کمپنی کے ڈائریکٹر بورڈ کا حصہ ہوں۔ بلکہ پچاس فیصد حصص کی مالک ہوں۔ فون پر شکلا صاحب نے کسی پریشانی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ یہاں شوٹنگ کلب کی انتظامیہ کے مجبور کرنے پر جب میں نے حماقت کا ارتکاب کرتے ہوئے سنائپنگ کا مظاہرہ کیا تو اسے اپنی راہ کی رکاوٹ دور کرنے کی سوجھی۔ مگر ایک معاہدے کے حصول کو میں قاتل تو نہیں بن سکتی تھی۔''

وشال مسمسے لہجے میں بولا۔ ''شکلا صاحب کے کسی فعل کی سزا مجھے تو نہ دیں۔''

لورا کھل کھلا کر ہنسی۔ ''تمھیں تو کچھ نہیں کہا۔''

وشال معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''یہی تو دکھ ہے کہ ہمیں آپ نے توجہ کے قابل ہی نہیں سمجھا۔''

لورا بے باکی سے بولی۔ ''لگتا ہے تم مسٹر شکلا سے بھی بڑا مطالبہ پورا کرانے کی فکر میں ہو۔''

وشال نے لجاجت سے کہا۔ ''غریب مطالبہ نہیں درخواست کیا کرتے ہیں۔''

وہ بے باکی سے بولی۔ ''پہلے سے کافی امراء کے مطالبے اور بیسیوں غریبوں کی درخواستیں موصول ہو چکی ہیں۔ جن میں سرفہرست مسٹر شکلا ہیں۔ باقیوں کی طرح تم بھی معذرت قبول کرلو۔''

''شروع کریں۔'' وشال گپتا نے دعوت کی آڑ میں خفت چھپائی۔

لورا اطمینان سے لوازمات سے بھری میز کی طرف متوجہ ہوگئی۔ آزاد خیال اور بے راہ رو معاشرے سے تعلق رکھنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ وہ فاحشہ تھی اور جس کی مرضی ہوتی ہاتھ بڑھا کر دبوچ لیتا۔ یورپین عورت جسم دکھانے میں فراخ دل سہی، جسمانی تعلقات کے معاملے میں اپنی پسند کے تابع ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے دھیرندر شکلا اور وشال گپتا کو خوب صورتی سے ہری جھنڈی دکھا دی تھی۔ کھانے کے بعد اس نے تھکن کا بہانہ کرتے ہوئے وشال گپتا سے معذرت کی اور مجھے صبح چھے بجے تیار ہونے کی ہدایت دے کر مٹکتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

وشال گپتا، خواب گاہ میں گم ہونے تک اس کے جینز میں مستور جسم کو حسرت بھری نظروں سے گھورتا رہا۔ دروازے کے بند ہونے کی ''کھٹک'' سن کر وہ میری طرف متوجہ ہوا اور پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ''تمھارے پلے کچھ پڑا۔''

میں معصومیت سے بولا۔ ''کچھ زیادہ نہیں، بس اتنا کہ مادام نے شکلا صاحب کو بھی گھاس نہیں ڈالی۔''

مزاحیہ انداز میں کہتے ہوئے اس نے منہ بنایا۔ ''اور مجھے تو کھیت میں کھلا چرنے کی چھوٹ دے دی ہے نا؟''

''چھوڑیں باس! اس سے کئی گنا خوب صورت لڑکیاں اپنے دیش میں دھکے کھاتی پھر رہی ہیں۔''

''تمھیں بے وقوف کہنے کے علاوہ کیا تبصرہ کرسکتا ہوں۔ پاگل، دل آنے کی وجہ خوب صورتی نہیں پسندیدگی ہوتی ہے۔''

میں نے مزاحیہ انداز میں ترغیب دی۔ ''آسان حل یہی ہے باس کہ آپ خود نشانہ بازی سیکھنا شروع کردیں۔ کم از کم ہفتے بھر کا قرب تو مل جائے گا۔''

''کیا فائدہ رال ٹپکانے کا۔ خواہ مخواہ اپنا خون ہی جلاتا رہوں گا۔'' مایوسی ظاہر کرتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔ ''تم پوری کوشش اور محنت سے سیکھو۔ یہ فن تمھیں آئندہ بھی کام آئے گا۔ ہمیشہ اپنا مقصد مقدم رکھنے والے فائدے میں رہتے ہیں۔ شیر اگر ہرن کی فکر کرنے لگے تو بھوکا مرے گا، بلی چوہوں پر ترس کھا کر اپنے ساتھ ظلم کی مرتکب ہوگی، چھپکلی کیڑے، پتنگے کھانا چھوڑ دے تو جان سے جائے گی۔ یاد رکھنا خود غرضی قانون فطرت ہے۔ سب سے پہلے انسان کا اپنا وجود ہے اس کے بعد کسی دوسرے کے بارے سوچا جاسکتا ہے۔ اخلاقیات کے علم بردار، پُن (نیکی) کمانے والے، دھرم کے ٹھیکے دار، انسانیت کی مالا جپنے والے سبھی باتوں کی حد تک مخلص ہوتے ہیں۔ کبھی اپنے منہ کا نوالہ بھوکے کے پیٹ میں نہیں

ڈالتے۔میری نصیحت پلو سے باندھ لو پھلتا (کامیابی) کوشش کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔''

اس نے واپس جانا تھا۔میں ساتھ چل پڑا۔کار تک جاتے ہوئے نصیحتیں جاری رہیں۔اسے رخصت کر کے میں کمرے میں آ گیا۔

دن کو آرام کرنے کی وجہ سے رات گئے تک کروٹیں بدلنا پڑیں۔آگے کی صورت حال واضح نہیں تھی۔جب تک وشال گپتا مجھے ہدف کے بارے مطلع نہ کر دیتا کچھ طے کرنا مشکل تھا۔گویا سوچنے کو کوئی خاص موضوع نہیں تھا اور مجھے دل پسند مشغلے کی چھوٹ تھی۔

اپنی پلوشے کو یاد کر کے جہاں میرے ہونٹوں پر تبسم آیا وہیں،اس کا ناراضی بھرا رویہ بھی دل کو اداس کر گیا۔عجیب موڑ پر آ کر اسے خفگی کی سوجھی تھی۔بلاشک وشبہ میرا قصور تھا،غلطی تھی،حماقت تھی۔لیکن اس کا اتنا شدید ردعمل ظاہر کرنا یقیناً جذباتی فیصلہ تھا۔مجھے صفائی کا موقع دینا چاہیے تھا۔نہ میں غلط ارادے یا نیت سے گلگارے پاس گیا تھا اور نہ اس ہی کا کوئی ایسا ارادہ تھا۔انسان جس سے محبت کرتا ہے،اس کے دل میں اپنی اہمیت اور قدر و قیمت دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے۔گلگارے بے چاری بھی اسی تمنا سے مغلوب ہو کر مجھ پر حق جتانے لگتی۔اس کے رویے کو شرعی لحاظ سے جائز کہا جا سکتا تھا نہ اخلاقی لحاظ سے درست سمجھا جا سکتا تھا اور نہ ہماری تہذیب وثقافت اس کی اجازت دینے پر تیار تھی،یونہی مجھ سے بھی جلد بازی میں صحیح فیصلہ نہیں ہو پایا تھا۔رات گئے ایک نامحرم لڑکی کے ساتھ کمرے میں بند ہونا بغیر کسی شک وشبے وتردد کے کھلی بے حیائی و بے شرمی تھی۔قابل مواخذہ فعل تھا۔مگر محبت کرنے والی بیوی کو کم از کم تحقیق کرنا ضروری تھا۔اس کے تیس اگر اس نے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا تو میرے گناہ کے ثبوت کو اسی وقت کھوج سکتی تھی۔شوہر کا جسم بیوی کے لیے کھلی کتاب ہوتا ہے۔اور بے حیائی کے اثرات کو موقع واردات پر چھپانا ممکن نہیں ہوتا۔مگر اس نے مجھے صفائی کا موقع دیا تھا،نہ میری منتوں پر پسیجی تھی۔میری ہر غلطی،مستی اور درشتی کو غیر اہم و بے وقعت جاننے والی کا پانسا ایک دم پلٹ گیا تھا۔ایک پل جدائی نہ سہنے والی پر میرے خطرناک مشن پر آنے کا بھی کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔حالاں کہ روما کو بھی میں نے گلگارے والے واقعے کی اطلاع دی تھی۔مگر اس نے ذرا سی بھی اہمیت نہیں دی تھی۔روما بلاشبہ مجھے بہت چاہتی تھی،مگر پلوشہ کی محبت بھی روما سے کم نہیں لگی تھی۔روما نے میری جدائی کو روگ بنا لیا تھا تو پلوشہ بھی ہر وقت جان قربان کرنے پر تیار رہتی۔البتہ وہ روما سے بڑھ کر لاڈلی اور مجھے پیاری تھی۔کیوں کہ دل پر انسان کا اختیار نہیں ہوتا۔

کافی دیر یونہی پلوشے کے رویے کو سوچتا رہا۔یہاں تک کہ نیند نے ان سوچوں سے چھٹکارا دلایا۔دیر تک جاگنے کی وجہ سے صبح جلدی آنکھ نہیں کھلی تھی۔سورج طلوع ہو چکا تھا۔گھڑی کی سوئیوں کو چھے بجے کا اعلان کرتے دیکھ کر میں اچھل پڑا تھا۔لورا براؤن نے چھے بجے ہی کا وقت دیا تھا اور ایک فوجی کو چھے بجے کا مطلب ہوتا ہے۔''پانچ منٹ کم چھے بجے۔'' گولورا کی نظر میں میں فوجی نہیں تھا لیکن وہ جس قوم سے تعلق رکھتی تھی ان میں کم از کم وقت کی پابندی پائی جاتی ہے۔اس معاملے میں پاکستان اور انڈیا کے لوگ ماشاءاللہ اتنے بے پروا ہیں کہ چھے بجے کا مطلب بغیر کسی ہچکچاہٹ یا تردد کے گیارہ بجے ہی لیتے ہیں۔اگر کسی کو شک ہو تو دعوت نامے پر درج وقت پر شادی ہال میں جا کر دیکھ لے۔

خیر تازہ دم ہو کر میں کمرے سے نکلا۔سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا۔ملازم سے استفسار کرنے پر پتا چلا مادام تالاب (سوئمنگ پول) میں تیراکی فرما رہی ہیں۔میں اسی طرف بڑھ گیا۔وہ اس وقت باہر نکل رہی تھی۔تیراکی کا لباس یوں بھی.....

ع کوئی دیکھے یہ کیا ہے تو نظر صاف آئے.....

کی عملی تفسیر ہوتا ہے۔اور اس نے تو پہنا بھی ''ٹو پیس'' لباس تھا۔یعنی ایک دھجی بالائی اور دوسری زیریں بدن پر لپٹی

تھی۔ غالب نے کہا تھا.....

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

مگر یہاں تو مکمل لباس ہی ایک گرہ بن رہا تھا۔ اور یہ عاشق کا گریبان نہیں محبوب کا سامان ڈھانپنے کو تھا۔ بلاشک و شبہ وہ چیتھڑے اپنی ذمہ داری نبھانے میں اتنے ہی ناکام لگ رہے تھے جتنا حکومت مہنگائی پر قابو پانے کی کوشش میں ناکام ہو چکی ہے۔ کیوں کہ ایک کلوگرام کے ''پیکنگ میٹریل'' میں جب ایک من پیک کیا جائے تو ایسا ہی لگے گا۔

مجھ پر توجہ دیئے بغیر وہ پیٹھ موڑے کرسیوں کی طرف بڑھی جہاں اس کا لباس اور تولیہ وغیرہ پڑا تھا۔ گورے بدن پر پانی کے قطرے یوں لگ رہے تھے جیسے سفید گلاب پر شبنم پڑی ہو۔ تجربہ تھا کہ سورج کو براہ راست دیکھنے والے کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ مجھ پر اس وقت سورج کے علاوہ بھی آنکھیں چندھیا جانے کی وجوہات کا انکشاف ہوا تھا۔

خود کو کوستے ہوئے میں نے تالاب کی جانب رخ موڑا اور شفاف پانی کو گھورنے لگا۔ تالاب کی لمبائی سو فٹ کے قدر تھی اور چوڑائی تیس فٹ۔ تیراکی نہایت عمدہ اور بہترین ورزش ہے اور آرمی میں جوانوں کو تیرنے کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔

''دیر کیوں ہوئی؟'' بولنے میں پہل اس نے کی تھی، لہجہ کافی برہم لگا تھا۔ اب یہ غصہ میرے دیر سے آنے پر ہو یا تھا یا رخ موڑ کر حسن کی خاطر خواہ پذیرائی نہ کرنے پر۔ یہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ میں اس کی طرف مڑے بغیر بولا۔

''رات گئے تک جاگتا رہا صبح آنکھ دیر سے کھلی۔''

''مخاطب کی طرف دیکھے بغیر گفتگو کرنا بدتہذیبی اور غیر اخلاقی حرکت ہے۔ تم میرے کمان دار نہیں ہو۔ یو تھ میری طرف موڑو.....'' اب کے لہجے میں غصے کا عنصر مزید بڑھ گیا تھا۔

انسان کی نگاہ ایک سو اسی ڈگری کا میدانی نظارہ (فیلڈ آف ویو) رکھتی ہے۔ ادھر دیکھے بغیر مجھے محسوس ہوا کہ اس نے تولیہ لپیٹ لیا ہے۔ میں مڑا۔ ''آپ کو گھورنا غیر اخلاقی اور بدتہذیبانہ حرکت لگ رہی تھی۔''

''گھورنے کا کس نے کہا ہے۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

''اگر آئندہ وقت پر نہ پہنچے تو نتیجے کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔'' مجھے دھمکا کر اس نے رخ موڑا اور پتلون پہننے لگی۔

''معذرت خواہ ہوں مادام!'' میں نے معافی مانگنے میں عافیت سمجھی تھی کہ وہاں میری حیثیت وشال گپتا کے ملازم کی تھی اور کسی ملازم کی گوری مالکن سے بحث وتکرار قابل گرفت ہو سکتی تھی۔

ڈھیلی ڈھالی خاکی پتلون اور نصف بازوؤں کی بنیان پہن کر اس نے موٹے تلے والے مردانہ جوتے پہنے اور بالوں پر تولیہ رگڑنے لگی۔ منٹ بھر کی رگڑائی کے بعد اس نے تولیہ کرسی پر پھینکا اور میز پر رکھا ایس آر ون کا بیگ اٹھا لیا۔ ساتھ ایک دوسرا بیگ بھی رکھا تھا جو اس نے مجھے اٹھانے کا اشارہ کیا۔

آگے پیچھے چلتے ہوئے ہم ڈیرے کی چھت پر پہنچے۔ وہاں ہم اردگرد کا علاقہ بہت اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔ اگر میں نے کسی کو تربیت دینا ہوتی تو چھت ہی کا انتخاب کرتا۔ بیگ نیچے رکھ کر اس میرے ہاتھ سے دوسرا بیگ لے کر کھولا اور ایک خاکی کپڑا نکال کر نیچے بچھا دیا۔ اس پر ایس آر ون کا بیگ کھول کر بوٹ اتارے بغیر ایک پاؤں بچھا کر اس پر تشریف ٹیک دی۔ میں بھی التحیات کی حالت میں کپڑے کے دوسرے کنارے پر ٹک گیا۔

ایس آر ون کے حصے (پارٹس) نکال کر کپڑے پر رکھتے ہوئے وہ مستفسر ہوئی۔ ''کبھی رائفل سے فائر کیا ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کلاشن کوف چلائی ہے۔''

''سب سے پہلے میں تمہیں رائفل کے حصوں کو جوڑنا سکھاؤں گی..... جہاں سمجھ نہ آئے بلا تکلف پوچھ لینا۔'' سنجیدہ انداز میں کہتے ہوئے وہ آسان اور قابل فہم انداز میں ایس آر ون کو جوڑنے کا طریقہ سکھلانے لگی۔ ایک سنائپر کے لیے کسی بھی نئی سنائپر رائفل کا کھولنا جوڑنا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے لوگوں کا نئے جوتوں کے تسمے باندھنا۔ لیکن خود کو انجان ظاہر کر کے میں دلچسپی سے سیکھنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ سکھاتے وقت لورا براؤن کے لہجے میں درشتی، برہمی کے بجائے ملائمت و نرمی جھلکنے لگی تھی۔ انداز میں نخوت و بے نیازی کے بجائے ایک معلم کا تدبر و تفکر در آیا تھا۔ مجھے تفصیل بتاتے ہوئے اس نے رائفل کو مکمل بند کر کے کھولا اور مجھے جوڑنے کی دعوت دی۔

رائفل کو جوڑنے میں کوئی الجبراء یا سائنس تو تھی نہیں کہ مجھے اداکاری کی ضرورت پیش آتی۔ میں نے آسانی سے رائفل کو جوڑ دیا۔ اس کی آنکھوں میں اطمینان جھلکا..... ''شاباش۔'' کہہ کر اس نے مجھے میگزین میں گولیاں بھرنا سکھائیں اور پھر ٹیلی اسکوپ سائیٹ کے بارے بتانے لگی۔ اس پر رینج اسی طرح ہی لگتی تھی جیسے رینج ماسٹر کی سائیٹ لیوپولڈ یا کسی دوسری جدید ٹیلی اسکوپ سائیٹ پر لگتی ہے۔ ٹیلی اسکوپ سائیٹوں میں ہر سو میٹر کی رینج کے بعد سنائپر کو ایلی ویشن ڈرم گھما کر کلک لگانے پڑتے ہیں۔ کلکوں کی بڑھوتری میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی۔ جیسے لیوپولڈ سائیٹ پر دو سو میٹر کے لیے چھے کلک لگتے ہیں تین سو میٹر کے لیے بارہ اور چار سو میٹر کے لیے اکیس۔ لورا کو ہر فاصلے کے کلک زبانی یاد تھے۔ وہ اطمینان سے میرے سامنے دہراتی گئی۔ میں ساتھ ساتھ ذہن نشین کرتا گیا کہ زیادہ تر کلک لیوپولڈ سائیٹ ہی کے مماثل تھے۔ یہ اور بات کہ کلک اگر لیوپولڈ سائیٹ سے بالکل بھی مختلف ہوتے تب بھی میں اس کے ایک بار بتانے پر یاد کر لیتا۔ اور اس میں میری یادداشت سے زیادہ شوق اور تجربے کی وجہ ہوتی۔

''واپسی پر مجھ سے کلکوں کی ترتیب کا جدول (ٹیبل) لے لینا۔ دو دن کے اندر تمہیں ساری ترتیب یاد ہونا چاہیے کہ مطلوبہ فاصلے پر کتنے کلک لگائے جائیں گے۔''

''جی مادام۔'' میں نے مودبانہ انداز میں سر ہلا دیا۔

وہ مجھے شست لینے کا طریقہ بتانے لگی۔ دھوپ تیز ہوئی تو اس نے تربیت ختم کرنے کا اعلان کیا۔ میں رائفل کو کھول کر بیگ میں منتقل کرنے لگا۔ اس نے ایس آر ون مجھے اپنے کمرے میں رکھنے کا کہہ کر خوش کر دیا تھا۔

سہ پہر کو ہم نے پھر مشق کی۔ اس نے مجھے ونڈ میٹر سے ہوا کی رفتار ناپنے اور ڈیفلیکشن ناب کا استعمال سکھایا۔

رات کا کھانا ہم نے اکھٹے بیٹھ کر کھایا۔ ''ڈیپ!'' اس نے حسب معمول سندیپ نام کی مٹی پلید کرتے ہوئے الجھن ظاہر کی۔ ''مجھے لگتا ہے، ہم پہلے بھی کہیں مل چکے ہیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جی مادام! شوٹنگ کلب میں آپ کو رخصت کرتے وقت وشال صاحب کی ہدایت پر میں نے کار کا دروازہ کھولا تھا۔''

اس کے چہرے پر تبسم نمودار ہوا۔ ''احمق ہو یا بننے کی کوشش کر رہے ہو۔''

''کیوں مادام۔'' میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ ورنہ میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ وہ سنائپر تھی اور ایک سنائپر کی یادداشت عام لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ گو ہماری بات چیت وائرلیس سیٹ پر ہوتی رہی تھی۔ اور وائرلیس پر آواز اصل لہجے سے تھوڑا مختلف ہوتی ہے۔ لیکن یہ تبدیلی اتنی زیادہ نہیں ہوتی۔ کوئی بھی باریک بین اندازہ لگا سکتا ہے۔ جیسے دہشت گردوں کے کمانڈر روشن نے میری آواز وائرلیس سیٹ پر سنی تھی اور آمنے سامنے آتے ہی اسے مجھ پر شک ہو گیا تھا۔ لورا کے ساتھ میں کافی گپ شپ کر چکا تھا اور بعید نہیں تھا کہ وہ میری اصلیت تک پہنچ جاتی۔ صرف علاقہ اور میری حالیہ شناخت ایسی تھی کہ اس کا دماغ ایس ایس کی طرف نہیں جا رہا تھا ورنہ افغانستان میں آمنا سامنا ہونے پر اسے دماغ پر زیادہ

زور نہ دینا پڑتا۔

''کوئی ایسی چیز جس کے سمجھنے میں دقت پیش آ رہی ہو۔'' وضاحت دینے کے بجائے اس نے موضوع تبدیل کر ضروری سمجھا تھا۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

خطرہ ٹلتے دیکھ کر میں نے سکون کا سانس بھرا۔ گو یہ سکون عارضی تھا۔ کسی بھی وقت اسے میری آواز و انداز پر ایس ایس کا گمان گزر سکتا تھا۔ البتہ ایک بات میرے حق میں جاتی تھی۔ اب تک میں نے بہت مختصر بات چیت کی تھی اور زیادہ تر اس کی سنتا رہا تھا۔ آگے اس گفتگو کو مزید مختصر کر کے میں اس خطرے کا تدارک کر سکتا تھا۔

''صبح دیر نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ ہدایت دے کر اٹھ گئی۔ میں چہل قدمی کو باہر نکل گیا۔

اگلی صبح میں پانچ بجے سے پہلے تیار ہو کر سبزہ زار کی طرف نکل گیا تھا۔ تھوڑی بھاگ دوڑ کر کے میں نے اٹھک بیٹھک کی، ڈنڈ پیلے، چند اور مشقیں کیں، کیوں کہ جسم کو تندرست و توانا اور قابل عمل رکھنے کو ورزش نہایت ضروری و اہم ہے۔ چھ بجے سے پہلے میں رائفل اور سنائپنگ کے سامان سمیت چھت پر پہنچ گیا تھا۔ وہ تیراکی میں مشغول تھی اور اس کا گزشتہ کل کا لباس ایسا نہیں تھا کہ مجھے وہاں جانے کی جرات ہوتی۔

تھوڑی دیر بعد وہ بھی ہلکے گیلے سنہری بال لہراتے ہوئے پہنچ گئی۔ مجھے ایس آر ون کے ساتھ مشغول دیکھ کر اس نے اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ تربیت شروع ہو گئی۔ اس دوران میں نے کافی اناڑی پن کا مظاہرہ کیا۔ کیوں کہ کل اس نے جس الجھن کا اظہار کیا تھا، مجھے محتاط ہونا پڑا تھا۔

پانچ دنوں تک تربیت کے ساتھ وہ مجھے ڈرائی ریہرسل (بغیر گولی چلائے فائر کی مشق) کرواتی رہی۔ میں نے اپنے اساتذہ سے بھی یہی سنا تھا کہ ایک نشانہ باز کے لیے ڈرائی ریہرسل بہت ضروری اور اہم ہوتی ہے۔ اور ڈرائی ریہرسل پرانے سنائپر کے لیے بھی اتنی ہی مفید ہوتی ہے جتنے نو آموز سنائپر کے لیے۔ وہاں چونکہ فائرنگ رینج نہیں تھی اس لیے چھٹے دن وشال گپتا کو کہہ کر فائر کرنے کو ہم شوٹنگ کلب پہنچ گئے تھے۔ کافی عرصے سے میرے کندھے نے سنائپر رائفل کے ہلکے کا خوشگوار اور دوستانہ لمس محسوس نہیں کیا تھا۔ پہلے ہی دن میں نے تین سو، پانسو اور پھر ہزار میٹر پر فائر کر کے لورا کو اطمینان دلا دیا تھا۔ مزید دو دن کی مشق کے بعد میں پندرہ سو میٹر پر بھی ہدف کو نشانہ بنانے لگا۔ البتہ اس دوران میں جان بوجھ کر ہدف کے درمیان یا خاص چندی پر گولی نہیں مارتا تھا ورنہ لورا کو شک ہو سکتا تھا۔ میری اُس نشانہ بازی پر بھی وہ دو تین بار اعتراف کر چکی تھی کہ میرا فائر قدرتی طور پر اچھا تھا۔ اور اس کے لیے ایسا ہونا، ناممکن یا تعجب انگیز نہیں تھا۔ بلاشبہ اچھی نشانہ بازی کی صلاحیت کسبی (کوشش سے حاصل کردہ) کے بجائے وہبی (قدرت کی طرف سے عطا کردہ) ہوتی ہے۔

ہفتے بھر کے بعد اس نے وشال گپتا کو ''سب اچھا'' دے دیا تھا۔ اسی شام وہ ہمارے پاس ڈیرے پر پہنچ گیا۔ رسمی کلمات کے بعد لورا مطلب کی بات پر آئی۔ ''میں نے تمھارے آدمی کو سکھا دیا ہے۔ بے شک امتحان لے کر جانچ لیجیے ہو۔''

''مادام! مسئلہ صرف ہمارے آدمی کی سکھلائی سے حل نہ ہوگا۔ اگر یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو بات بنے گی۔''

وہ برہم ہوئی۔ ''یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔''

وشال معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''سچ میں اتنی سادہ ہو یا شکلا صاحب نے پوری بات نہیں بتلائی تھی۔''

اس کے لہجے میں درشتی سوا ہوئی۔ ''تمھارا مطلب یہ ناکام ہو گیا تو معاہدہ نہیں ہو پائے گا۔''

وشال گپتا نے وضاحت کی۔ ''یہی عرض تو کی ہے، کہ راہ کا روڑا ہٹے بغیر معاہدہ کیسے ہو پائے گا۔''

لورا نے انکار میں سر ہلایا۔ ''میں کسی پر گولی نہیں چلا سکتی۔''

وشال چاپلوسی سے بولا۔ ''آپ بالکل ایسا نہ کریں، مگر اپنے شاگرد کی حوصلہ افزائی کو ساتھ تو جا سکتی ہیں۔ گولی سندیپ چلائے گا بس تھوڑی سی رہنمائی اور نگرانی کی ضرورت پڑے گی۔''

لورا انکار پر ڈٹی رہی۔ ''ڈیپ، ڈیڑھ کلومیٹر تک آسانی سے کسی بھی شخص کو نشانہ بنا سکتا ہے۔''

''شوٹنگ رینج پر ہدف کو نشانہ بنانے والا ضروری نہیں عملی میدان میں بھی اتنا ہی کامیاب ثابت ہو۔ آپ کے بہ قول سنائپنگ سائنس ہے اور گولی چلانے سے پہلے کئی ایک تیاریاں کی جاتی ہیں۔ بے شک آپ گولی نہ چلائیں اور نہ آخر تک وہاں موجود رہیں۔ بس سندیپ کو گولی چلانے کی مکمل تیاری کروا کر واپس آ جانا۔''

لورا نے الجھن ظاہر کی۔ ''تیاری کروا تو دی ہے۔''

وشال نے وضاحت کی۔ ''میرا مطلب ہدف کو نشانہ بنانے کی حتمی تیاری۔ ایلیویشن، ڈیفلیکشن وغیرہ کا جائزہ لے کر آ جانا کہ اس نے سب کچھ صحیح طریقے سے لگایا ہوا ہے۔ اس سے تو شاید فاصلہ بھی ٹھیک سے نہ ناپا جائے۔''

لورا ہچکچائی۔ ''میں اس کام میں اتنا زیادہ ملوث نہیں ہونا چاہتی کہ قانونی طور پر مجرم ٹھہرائی جاؤں۔''

''مادام، یہ موقع بار بار نہیں ملے گا۔ اور یہ بھی جان لیں سندیپ کی ناکامی ہم سب کی ناکامی کہلائے گی۔ ہدف صرف زخمی بھی ہوا تو کام بگڑ جائے گا۔''

وہ بگڑ کر بولی۔ ''اگر مجھے ہی سب کچھ کرنا تھا تو وقت ضائع کیوں کرایا۔''

لورا کے لہجے میں لچک دیکھتے ہوئے وشال نے تسلی دی۔ ''آپ کو صرف رہنمائی کرنا ہے۔ باقی سب کچھ سندیپ کر لے گا۔''

''کب جانا ہے۔'' لورا نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اس کے لہجے میں مجبوری و بے بسی واضح جھلک رہی تھی۔

وشال گپتا کے چہرے پر فاتحانہ تبسم ابھرا۔ ''پرسوں۔''

''منصوبہ کیا ہے؟''

''کل شام کو میں حتمی منصوبہ لے آؤں گا۔'' وشال کی گفتگو سے شک ہوا وہ ہدف سے لاعلم تھا۔ یا شاید منصوبہ لورا تک پہنچانے کو اسے کسی کی اجازت درکار تھی۔

لورا مزید سوال پوچھے بغیر اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی تھی۔

میں نے تبصرہ کیا۔ ''مادام خفا لگ رہی ہے۔''

وشال گپتا رکھائی سے بولا۔ ''اسے خوش کرنے کو ہم خطرہ نہیں مول سکتے۔''

میں شاکی ہوا۔ ''تو آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔''

وہ صاف گوئی سے بولا۔ ''اگر تم اس سے اچھے بھی ہو تو یہ ثابت کرنے کو تمہیں کافی وقت چاہیے۔''

''میں اچھائی کا دعویٰ نہیں کر رہا، لیکن اتنا گیا گزرا بھی نہیں۔''

میری شکایت کو دوسرا رخ دیتے ہوئے وہ معنی خیز لہجے میں مسکرایا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، تمہیں معاوضا پورا ملے گا۔''

''پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے اپنا شکوہ واپس لیا کہ خواہ مخواہ کی تکرار کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ نہ مجھے کوئی ایس ایس کی حیثیت سے جانتا تھا اور نہ شکلا کے دشمن کا خاتمہ کرنا ثواب کا کام تھا۔ البتہ میں یہ ضرور چاہتا تھا کہ وہاں لورا موجود نہ

ہو۔ کیوں کہ شکلا کے دشمن کو ختم کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں ایس آرون سمیت فرار کا منصوبہ سوچے ہوئے تھا۔ اور لورا میرے منصوبے کی راہ میں روڑے اٹکا سکتی تھی۔ وہ تربیت یافتہ کمانڈو تھی۔ اتنا آسان ہدف ثابت نہ ہوتی۔

اسے رخصت کر کے میں کمرے میں لوٹا۔ بہ مشکل بیٹھ ہی سکا تھا کہ دروازہ بجا کر لورا اندر داخل ہوئی میں حیران رہ گیا تھا۔

''جی مادام۔'' میں نے کھڑے ہو کر تعظیم دی۔''

مجھے بیٹھنے کا اشارہ کر کے اس نے نشست سنبھالی۔'' جانتے ہو کس پر گولی چلانا ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔'' مسٹر بکرم سنگھ پر۔''

'' بکرم سنگھ؟'' میں نے سوالیہ انداز میں دہرایا۔

''نہیں جانتے؟'' طنزیہ ہنسی استعجاب میں ڈھل گئی تھی۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

اس نے قدرے درشتی سے پوچھا۔'' جنرل بکرم سنگھ کو نہیں جانتے؟''

'' آ.....آرمی چیف.....'' میں ہکلا گیا تھا۔

''شکر ہے۔'' وہ کھل کھلائی۔

''مم.....مگر وشال جی ایسا کیوں کریں گے۔ کہیں وہ پاکستانی جاسوس تو نہیں۔''

''جاسوس بے چارے تو مفت میں بدنام ہوتے ہیں، اصل جنگ تو اندرونِ ملک اپنے مفادات کی لڑی جاتی ہے۔''

''یہ تو غداری ہے۔''

اس نے منہ بنایا۔'' میں تمھارے پاس غداری یا دیش بھگتی کا مقدمہ لے کے نہیں آئی۔''

'' مجھے اعتماد میں لینے کی وجہ؟'' میں مطلب کی بات پر آیا۔

اس نے پھلجڑی چھوڑی۔'' تمھاری ہمدردی حاصل کرنا۔''

''یقیناً بہت چھوٹا آدمی ہوں۔'' میں نے حقیقت اُگلی۔

''انسان کی اہمیت کا تعین حیثیت و مرتبہ سے نہیں ہوتا۔ دروازے پر کھڑا چپڑاسی و چوکیدار بھی بعض اوقات بہت بڑے عہدے و مرتبے والوں سے زیادہ کام کر جاتا ہے۔''

میں معنی خیز لہجے میں بولا۔'' اور یہ چپڑاسی آپ کے لیے کیا کر سکتا ہے؟''

''جانتے ہو شکلا، مسٹر سنگھ کو کیوں قتل کرانا چاہتا ہے۔'' وہ اس موضوع پر آئی جس بارے جاننے کو میں سخت بے چین تھا۔

اشتیاق دباتے ہوئے میں نے بہ ظاہر بے پروائی ظاہر کی۔'' مجھے مقتول کا نام ابھی معلوم ہوا ہے تو وجہ کیسے جان سکتا ہوں۔''

اس نے انکشاف کیا۔'' مسٹر بکرم سنگھ، شکلا کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر رہا ہے۔ ایس آرون رائفلوں کی خریداری کا معاہدہ مسٹر بکرم سنگھ کی اجازت پر منحصر ہے۔ دو تین اور ہتھیاروں کے معاہدے بھی بکرم سنگھ کی وجہ سے نہیں ہو پائے۔ اب یہ کانٹا نکال کر ہی شکلا مرضی کا چیف سامنے لا سکتا ہے۔''

ایک دم مجھے حقیقت کا ادراک ہوا، شکلا اب اتنا طاقت ور ہو گیا تھا کہ چیف آف آرمی سٹاف پر ہاتھ ڈالنے پر تلا

تھا۔لورا براؤن کی صورت میں اسے یہ تدبیر سوجھی تھی۔اور لورا براؤن اپنے ہتھیاروں کو بیچنے کی وجہ سے اس حد تک چلی گئی تھی۔انڈین آرمی سے معاہدہ ہونے پر کثیر تعداد میں ایس آرون رائفلیں کا سودا ہوسکتا تھا۔البتہ وہ خود کو آمادہ نہیں کر سکی تھی۔صرف ایک آدمی کو سنائپنگ کی تربیت دینے پر بہ مشکل تیار ہوئی تھی۔میں خود بھی اس حد تک نہیں جا سکتا تھا۔انڈین آرمی کے چیف پر حملہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔پاکستان آرمی ایسے کام کی اجازت بالکل نہ دیتی، کیوں کہ ایسا ہونے پر جوانب کی ایجنسیاں کے لیے صرف یہی کام باقی رہ جاتا کہ ایک دوسرے کے سپہ سالاروں کے قتل کی منصوبہ بندی کرتی رہ جاتیں۔عالمی سطح پر بھی پاکستان کی نہ صرف بدنامی ہوتی بلکہ جواب دہی مشکل ہو جاتی۔اس طرح کے قتل بعض اوقات اتنی لمبی جنگ چھیڑ دیتے ہیں جس کا اندازہ بھی عام آدمی نہیں کرسکتا۔اس کی چھوٹی سی مثال پہلی جنگ عظیم ہے۔جس کی وجہ آسٹریا، ہنگری کی دوہری بادشاہت کے شہزادے ولی عہد'' آرک ڈیوک فرینز فرڈیننڈ'' اور اس کی اہلیہ ''صوفیہ'' کا قتل ہے جو بلیک ہینڈ نامی دہشت گرد تنظیم کے ایک شخص گیوریلو پرنسپ نے سراجیو کے مقام پر 28 جون 1914 کو کیا۔گو اس جنگ کی در پردہ کئی وجوہات تھیں۔مگر شروعات کے لیے یہی قتل وجہ بنا۔

البتہ دھیرندر شکلا کی بات اور تھی۔وہ حکومتی عہدے دار نہیں تھا۔آرمی سے ریٹائرڈ ہو چکا تھا لیکن دہشت گردانہ کارروائیوں کا روح رواں تھا۔اس کے ساتھ ایک باپ کی شفقت و محبت کا قاتل تھا۔پاکستان آرمی یا حکومت کو اس کے قتل میں دلچسپی نہ بھی ہوتی انصاری صاحب اسے معاف کرنے پر تیار نہیں تھا۔اور اس کے مظالم کا جو نقشہ انصاری صاحب نے کھینچا تھا اس کے بعد اس کے قتل میں تاخیر کرنا خود مجھے بھی گوارا نہیں تھی۔البتہ بکرم سنگھ پر میں کسی صورت گولی نہیں چلا سکتا تھا۔بلکہ میں تو کسی عام بندے پر بھی گولی چلانے پر تیار نہیں تھا اور ذہنی طور پر فرار کے لیے تیار ہو گیا تھا۔اب لورا براؤن کی مصیبت گلے پڑ رہی تھی جو میری راہ میں روڑے اٹکا سکتی تھی۔

''کیا ہوا؟'' مجھے سوچ میں گم پا کر اس نے میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

میں چونکتے ہوئے بولا۔''آپ نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔''

''تمھیں پریشان کرنے نہیں حوصلہ بڑھانے آئی ہوں۔اور چاہتی ہوں تم مسٹر گپتا سے سن گن لینے کی کوشش کرو، کہیں شکلا مجھے دھوکے میں رکھ کر صرف اپنا الو سیدھا کرنے کے چکر میں تو نہیں ہے۔'' اس نے اپنی آمد کے راز سے پردہ ہٹایا۔

میں نے منہ بنایا۔''مادام! انھوں نے مجھے ہدف سے بے خبر رکھا ہے۔اصل منصوبے کی خاک ہوا لگنے دیں گے۔''

دل آویز تبسم ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے اس نے امید ظاہر کی۔''تم کوشش کرو تو مسٹر گپتا سے اگلوا سکتے ہو۔''

میں معنی خیز لہجے میں بولا۔''یہ کوشش آپ خود کریں تو کامیابی کا زیادہ امکان ہے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔''مسٹر گپتا بے ہودہ خواہشات کا واضح اشارہ کر چکا ہے۔اور میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔''

میں نے طنز کیا۔''حالاں کہ آپ کے لباس اور انداز میں ایسی احتیاط نظر نہیں آتی۔''

اس نے حیرانی ظاہر کی۔''لباس کا اس سے کیا تعلق۔پہناوا انسان کی خواہشات و کردار کو ظاہر نہیں کرتا۔''

اپنی تہذیب و ثقافت کے لحاظ سے اس کی سوچ صحیح تھی۔ہندو معاشرے میں بھی بدن ڈھانپنے اور عریاں لباس سے احتراز برتنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ایک ہندو کے روپ میں میں اسلامی تعلیمات کا پرچار نہیں کر سکتا تھا۔تائید میں سر ہلاتے ہوئے میں نے وضاحت کی۔

''کہنے کا مطلب ہے آپ کے ہاں ایک غیر شادی شدہ عورت کو عارضی تعلقات رکھنے پر روک ٹوک نہیں کی جاتی۔''

اس نے منہ بنایا۔''تو تعلقات پسندیدہ شخص سے رکھے جاتے ہیں، کسی معاہدے کے حصول کو بدن کا دستر خوان نہیں

سجایا جاتا۔ میں فاحشہ (کال گرل) نہیں ہوں۔ ایسا ہوتا تو مسٹر شکلا کی دعوت قبول کر لیتی۔''

میں جان چھڑاتے ہوئے بولا۔ ''وشال گپتا میرا باس ہے۔ ضروری نہیں کہ میرے استفسار پر وہ کچھ اگلنے پر تیار ہو جائے۔ البتہ اپنی سی کوشش کروں گا۔''

''کبھی کبھی لگتا ہے تم وہ نہیں ہو جو نظر آتے ہو۔'' اس نے بھول پن سے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

''ایسا کیوں؟'' اپنی بدحواسی پر پردہ ڈالتے ہوئے میں نے بہ ظاہر حیرانی ظاہر کی۔

وہ بے باکی سے بولی۔ ''تمھاری آنکھوں میں مجھے ایسی کوئی خواہش نظر نہیں آتی جو یہاں ہر مرد کی آنکھوں سے جھلک رہی ہے۔''

''کیوں کہ میں چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتا ہوں۔ ایک ملازم کی اتنی اوقات نہیں ہوتی کہ اونچے خواب دیکھے۔'' ہمیشہ گناہ کرنے پر صفائی دی جاتی ہے۔ مگر تب مجھے گناہ نہ کرنے کی وضاحت دینا پڑی۔

اس کا مترنم قہقہہ بلند ہوا۔ ''خواہشات و خواب حیثیت و مرتبے کے تابع نہیں ہوا کرتے۔''

میں نے بات بدلی۔ ''ضروری نہیں ایک لڑکی ہر مرد کے لیے باعث ترغیب ہو۔ پسند و معیار تو سب کا جدا اور مختلف ہوتا ہے۔''

''خوب صورت عورتوں کے معاملے میں تمام جوان مردوں کی پسند لگی بندھی خواہش کے گرد ہی گھومتی ہے۔''

میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ''شکر ہے آپ نے خوب صورت کہا.....''

وہ قدرے برہم ہوئی۔ ''تو میں بدصورت ہوں۔''

''سب کا وکیل نہیں ہوں کہ اپنی پسند کو بنیاد بنا کر آپ کی خوب صورتی یا بدصورتی کا پروانہ (سرٹیفکیٹ) جاری کروں۔''

اس نے موضوع تبدیل کیا۔ ''تو امید رکھوں کہ کوشش کرو گے۔''

''ایک بات پوچھوں؟''

اس کی استفہامیہ نظریں میری جانب متوجہ ہوئیں۔ میں نے کہا۔ ''زیادہ تو نہیں جانتا، مگر جہاں تک اندازہ ہے ایلی آرون بہترین رائفل ہے۔ اگر شکلا صاحب کو خریداری میں دلچسپی نہیں تھی تو آپ کہیں اور گاہک ڈھونڈ لیتیں۔ بلکہ براہ راست بکرم سنگھ سے بھی رابطہ کیا جا سکتا تھا۔''

مجھے ٹالتے ہوئے بولی۔ ''تمھاری کھوپڑی میں جو چھوٹا سا دماغ ہے، اس پر زور نہ دینا مفید رہے گا۔''

''حیرانی ہے کہ میری کم علمی سے آگاہی کے باوجود مجھے اتنی اہم ذمہ داری سونپنے چلی آئیں۔''

وہ طعنہ زن ہوئی۔ ''تمھاری استاد ہوں، میرا کام تمھاری پہلی ترجیح ہونا چاہیے۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''اس سکھلائی کے پس پردہ آپ کا ذاتی مفاد ہے۔''

گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے مجھ پر شاکی نگاہ ڈالی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''اپنی سی کوشش کروں گا۔'' میں نے بآواز بلند کہا۔ مگر وہ رکی نہیں تھی۔

میں رات گئے تک جاگتا رہا۔ لورا کی رضامندی میری سمجھ سے باہر تھی۔ آخر ایسی کون سی مجبوری تھی کہ وہ اتنا خطرہ مول لینے پر تیار ہوئی تھی۔ آرمی چیف کی موت چھوٹا معاملہ نہیں تھا۔ بعید نہیں تھا کہ ایجنسیوں کی تحقیقات کا اختتام شکلا کی شخصیت پر جا کر ہوتا۔ اس میں لورا براؤن کی کمپنی کا نام آ جاتا تو عالمی عدالت کی طرف سے نہ صرف کمپنی کا لائسنس ضبط ہو جاتا بلکہ بھاری ہرجانے کے ساتھ کڑی سزا ملنے کا بھی امکان تھا۔

مجھے اپنی فکر بھی لاحق ہوئی۔اب بھاگنے کا وقت قریب آ گیا تھا۔بس وشال گپتا کی تصدیق کا انتظار تھا۔گو جو بھی وہ ہدف کا انکشاف کرتا میں انکار میں سر ہلا سکتا تھا۔اس ضمن میں آسان بہانہ تھا کہ آرمی چیف پر گولی چلانا جرم کے علاوہ دھرتی ماتا سے غداری کرنے کے مترادف تھا۔لیکن اس راز پر مطلع ہونے کے بعد وہ مجھے زندہ جانے کی اجازت نہ دیتے۔اس لیے بہتر یہی ہوتا کہ میں دوران مشن بھاگنے کی کوشش کرتا۔اس طرح میں سنائپر رائفل بھی ساتھ لے جا سکتا تھا۔صرف لورا براؤن کا مسئلہ تھا۔اور اسے بے خبری میں بے ہوش کرنا اتنا مشکل بھی نہیں تھا۔

اگلے دن لورا سے ملاقات نہ ہوئی۔یقیناً وہ خفا تھی۔میں نے بھی اس کے کمرے کا رخ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔صبح سبزہ زار پر بھاگتے وقت میں نے دور سے اسے تیراکی کرتے دیکھا تھا۔وہ صبح کے وقت باقاعدگی سے تیراکی کرتی تھی۔میں دوپہر کو یہ شوق پورا کرتا کہ صبح کے وقت اس کی موجودی میں ایسا کرنا مناسب نہیں لگتا تھا۔دوسرا دوپہر کی گرمی میں تیراکی کا الگ ہی مزا تھا اور اس کے بعد بھوک بھی خوب کھل جاتی تھی۔

ہمارا اجتماع رات کے کھانے پر ہوا۔وشال گپتا اپنے منصوبے کے ساتھ پہنچ گیا تھا۔کھانے کے بعد ہم نے لورا کے کمرے میں بند ہو کر وشال گپتا کا منصوبہ سنا تھا۔تفصیلات سنتے ہی میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔بکرم سنگھ، دھیرندر شکلا کے ہاں کسی خاص تقریب میں شرکت کو آ رہا تھا۔وہاں اس نے ایک گھنٹا گزارنا تھا۔گھنٹے کے دوران ایک سنائپر کو اسے نشانہ بنانے کے کئی مواقع مل سکتے تھے۔حفاظت کا سخت انتظام تھا۔شکلا کی محل نما کوٹھی کے ایک کلومیٹر کی حدود میں آنے والی اونچی عمارتوں پر تو سخت پہرہ تھا۔اس سے زیادہ فاصلے کی عمارتوں کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔یوں بھی بکرم سنگھ کی آمد مخصوص افراد کے علاوہ کسی کے علم میں نہیں تھی۔''شری پتی آرکیڈ'' عمارت کا فاصلہ شکلا کی کوٹھی سے ڈیڑھ کلومیٹر کے بہ قدر تھا۔اس کی اونچائی پانچ سو فٹ یا ڈیڑھ سو میٹر تھی۔45 منزلہ عمارت کی چھت سے دکھاؤ کے عمدہ آلات کی موجودی میں دھیرندر شکلا کی کوٹھی کا سبزہ زار واضح نظر آ سکتا تھا۔منصوبہ بے داغ تھا۔ایک اچھے سنائپر کو وہاں سے نشانہ سادھتے ہوئے ذرا بھی دقت نہ ہوتی۔فائر کرنے کے بعد فرار ہونا بھی مشکل نہیں تھا۔انڈیا کی پولیس یا ایجنسیاں اتنی تیز رفتار نہیں تھیں کہ آناً فاناً عمارت کو گھیر لیتیں۔

وشال گپتا نے ایک وڈیو کے ذریعے ضروری جگہوں کی وضاحت کی۔لورا بھی سب کچھ دلچسپی سے سنتی رہی۔میں نے ایک دم اپنی حکمت عملی تبدیل کر لی تھی۔شری پتی آرکیڈ سے فرار ہونا بھی اتنا مشکل نہیں تھا۔

جتنی مشکلات میں سوچے ہوئے تھا۔شکلا کا شکار اس سے کئی گنا آسان ثابت ہو رہا تھا۔پورا منصوبہ دشمن نے خود ترتیب دیا تھا، ہتھیار بھی مہیا کر رہا تھا اور ہدف سامنے بٹھا کر نشانے بازی کی دعوت بھی دے رہا تھا۔میں اب بھی ناشکری کرتا تو یقیناً مجھ سے بڑا بدبخت کوئی نہ ہوتا۔

ہم کافی دیر منصوبے کی نوک پلک سنوارتے رہے۔کئی جزئیات زیر بحث لائیں۔اور آخر کار کارروائی کی ترتیب پر متفق ہو گئے۔لورا نے مجھے فائر کے لیے تیار کر کے واپس لوٹ آنا تھا۔

—●—

مقررہ دن سہ پہر ڈھلے ہم شری پتی آرکیڈ میں پہنچ چکے تھے۔ رہائشی فلیٹوں پر مشتمل اونچی عمارت میں لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ ہمارے لیے پینتالیسویں منزل پر ایک فلیٹ مخصوص تھا۔ جس کا مکین عاضی طور پر کہیں گیا ہوا تھا۔

لفٹ میں داخل ہو کر ہم نے آخری منزل کا بٹن دبایا، لفٹ میں دو تین اور افراد بھی موجود تھے۔ ایک ادھیڑ عمر جوڑا، کسی تکرار میں لگا تھا۔ ان کی نوک جھونک نے ہمارے لبوں پر تبسم بکھیر دیا تھا۔ لورا کی سمجھ میں ان کی گفتگو نہیں آئی تھی۔ البتہ ہمیں ہنستا دیکھ کر اس کے ہونٹوں میں بھی خوشگوار کھنچاؤ آ گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم مطلوبہ فلیٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ چابی میرے پاس موجود تھی۔ اندر گھس کر ہم نے دروازہ بند کیا۔ ایس آر ون اور سنائپنگ کے سامان کے تھیلے بیڈ پر رکھ کر کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ ہمیں چھت سے فائر کرنا تھا۔ لیکن کھڑکی سے شکلا کی کوٹھی کا جائزہ لیتے ہوئے لورا نے خیال ظاہر کیا۔ ''چھت کے بجائے کھڑکی سے یہ کام زیادہ بہتر رہے گا۔''

گو چھت سے فائر کرنا زیادہ آسان تھا۔ لیکن بہ ظاہر وہ میری استاد تھی اور میں جگہ کے انتخاب پر تکرار نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ سیکھنے کے بہانے پوچھنے میں مضائقہ نہیں تھا۔ ''چھت سے کمرا بہتر ہے؟''

اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ''سیکھ رہے ہو یا طنز کر رہے ہو۔'' کیوں کہ کوشش کے باوجود میرے لہجے میں استفسار کے بجائے معاصرانہ (ہم پیشہ، ہم رتبہ) عجب در آیا تھا۔

میں نے بات سنبھالی۔ ''کیا اتنا اچھا بن گیا ہوں کہ آپ پر طنز کر سکوں۔''

''چھت پر فائر بہتر طریقے سے کر سکیں گے، مگر وہاں مداخلت کا دھڑکا لگا رہے گا۔ اور یقیناً ہدف کی قریبی چھتوں پر تعینات محافظوں کے پاس شب دید آلات موجود ہوں گے۔'' اس نے کشادہ دلی دکھاتے ہوئے وضاحت کی۔ یہ پہلو میری نظر سے بھی اوجھل نہیں تھا۔

''کیا اتنی بلندی سے فائر کرتے ہوئے کوئی احتیاط وغیرہ نہیں رکھی جاتی۔'' میں نے بلندی و پستی (اپ ہل، ڈاؤن ہل) سے فائر کرتے وقت رینج میں ہونے والی امکانی کمی کی طرف اسے متوجہ کیا۔ شری پتی آرکیڈ کی بلندی 150 میٹر تھی۔ اور اتنی بلندی سے فائر کرتے ہوئے فارمولے کے مطابق اصل فاصلے سے کم رینج لگنا تھی۔

مجھے گھورتے ہوئے اس کی آنکھوں میں شکوک کی لہریں نمودار ہوئیں۔ ''تمھیں کیسے معلوم کہ اونچائی سے فائر کرتے ہوئے ایسی احتیاط برتی جاتی ہے۔''

''ایسا کب کہا۔'' میں گڑبڑا گیا تھا۔ ''آپ نے فائر پر اثر انداز ہونے والے امور کے بارے اتنی جزئیات کا ذکر کیا تھا۔ تبھی یہ پوچھ بیٹھا۔''

مجھے چند لمحے گھور کر اس نے گہرا سانس لیا اور بیگ سے زاویہ پیما نکال کر مجھے بلندی و پستی کا زاویہ ناپ کر رینج میں کمی

کرنے کے طریقہ کار کے بارے سکھانے لگی۔ چند الٹے سیدھے سوال کر کے میں نے سمجھ جانے کا عندیہ دے دیا۔

رات کے وقت دکھاؤ کے حالات سنائپنگ فائر کے لیے ہرگز موزوں نہیں ہوتے۔ لیکن شکلا کی کوٹھی میں اتنی تیز روشنیوں کا بندوبست کیا گیا تھا کہ دن کا سماں تھا۔ یونہی ایس آر ون کی ٹیلی اسکوپ سائیٹ کے اندرونی منظر کو روشن کرنے کو بھی سائیٹ میں خصوصی بندوبست کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ سے رات کے وقت بھی سنائپر ہدف کو نشانہ بنا سکتا تھا بشرط ہدف کسی روشن جگہ موجود ہوتا۔ اس کے باوجود وشال گپتا نے مسٹر بکرم سنگھ کی نشست کی اچھی طرح نشان دہی کر دی تھی۔ شکلا نے اپنی جگہ بکرم سنگھ سے چند نشستیں دور رکھی تھی۔ اس سے اس کی بہادری و دلیری پر روشنی پڑتی تھی۔ ویسے بھی شکلا جیسے لوگوں کو میں نے عموماً بزدل و ڈرپوک ہی پایا ہے۔

یقیناً اس کے تئیں بکرم سنگھ سے فاصلہ بڑھانے سے گولی کے اس تک پہنچنے کا امکان نہ رہتا۔ لیکن یہ احتیاط برتتے وقت وہ یہ بھول گیا تھا کہ موت و زندگی کے فیصلے ہماری تدابیر و چالوں کے مرہون منت نہیں ہوتے۔ یہ اختیار تو اس بااختیار کے قبضہ قدرت میں ہے جس کے سامنے کوئی رکاوٹ، منصوبہ بندی اور حفاظتی اقدام کامیاب نہیں ہو سکتا۔ وہ جو چاہے وہی ہوتا ہے۔ زندگی دینے پر آئے تو موت خود محافظ بن جائے۔ اور موت کا ارادہ کرے تو حفاظت کا ہر اقدام موت کا پھندہ ثابت ہو۔

شکلا نے بکرم سنگھ کے قتل کا منصوبہ سوچا ہوا تھا اور میں شکلا کی زندگی کے درپے تھا۔ جبکہ مقدر بنانے والا فیصلہ کر چکا تھا کہ کس کی چال نے کامیاب ہونا تھا۔

''تمہیں مطلوبہ کرسی پر رائفل قائم (فکس) کر دیتی ہوں۔ بس ہوا کا خیال رکھنا ہے کہ تیز ہو جائے تو ڈیفلکشن میں مناسب تبدیلی کر دینا۔ یقیناً تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔'' اس نے امید بھرے لہجے میں تصدیق چاہی۔

''فکر نہ کریں مادام۔'' میں نے اعتماد ظاہر کیا۔

مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے اس نے لکڑی کی میز کھڑکی کے سامنے رکھی۔ اور ایس آر ون کو جوڑنے لگی۔ میں بھی ہاتھ بٹانے کو قریب ہو گیا تھا۔ میرے تیزی سے چلتے ہوئے ہاتھ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مدھم تبسم ابھرا۔

''کبھی کبھی لگتا ہے تم بہت پہلے سے یہ جانتے ہو۔''

میں جلدی سے بولا۔ ''آپ نے سکھایا ہی اتنے عمدہ طریقے سے ہے کہ کوئی اشکال باقی نہیں رہا۔''

وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ ''تمہاری وضاحتیں میرے شکوک کو مزید پختہ کر دیتی ہیں۔''

میں نے تعجب ظاہر کیا۔ ''کیسا شک۔''

''یہی کہ تم پہلے سے سنائپر رائفل کا استعمال جانتے ہو۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''اور آپ سے چھپانے کی وجہ۔''

''یہی کرید تو مجھے بھی ہے۔'' وہ ہار ماننے پر تیار نہیں تھی۔

میں نے ٹیلی اسکوپ سائیٹ لگا کر گھٹنے قالین پر ٹیکے اور ایس آر ون کا بٹ کندھے میں پھنسا لیا۔ شکلا کی کوٹھی کا منظر دھم سے میری آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔ بہت سارے ملازم بندوبستی کارروائیوں میں مصروف تھے۔

لورا نے فاصلہ ناپنے والے آلے (لیزر رینج فائینڈر) سے ہدف کا فاصلہ ناپا۔ ''1475۔'' فاصلہ بتا کر اس نے زاویہ پیما اٹھا لیا۔ رائفل کا بٹ میرے کندھے میں ہونے کی وجہ سے اٹھ گیا تھا۔ اور نال (بیرل) کا رخ ہدف کی طرف تھا۔ زاویہ پیما سے اس نے پستی کا زاویہ دیکھا اور کیلکولیٹر پر انگلیاں مار کر مجھے ایلیویشن بتا دی۔

ایلی ویشن ناب گھما کر میں مطلوبہ رینج لگانے لگا۔ کھڑکی سے ہاتھ نکال کر وہ بادپیما (ونڈ میٹر) سے ہوا کی رفتار ناپنے

لگی۔

''عشاریہ پانچ کلومیٹر۔'' اس نے فی گھنٹہ ہوا کی رفتار بتائی۔ جو اتنی کم تھی کہ ڈیفلیکشن ریڈنگ پر کوئی اثر نہیں ڈال رہی تھی۔

ایلیویشن کا جائزہ لے کر اس نے مجھے پیچھے ہونے کا اشارہ کیا اور خود رائفل کے پیچھے بیٹھ کر شست سادھنے لگی۔ مطمئن ہو کر اس نے بٹ میز پر ٹکایا اور جانے کے ارادے سے کھڑی ہو گئی۔

''مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی ہے۔ گھنٹے، ادھ گھنٹے تک مسٹر بکرم سنگھ پہنچ جائے گا۔ تیزی دکھانے کی بالکل ضرورت نہیں خوب اطمینان و سکون سے لبلبی دبانا۔

''بے فکر رہیں مادام۔'' میں نے اعتماد ظاہر کیا۔

''نجانے کیوں ایسا لگ رہا ہے کہ تم بڑی آسانی سے یہ کر لو گے۔ اور اس وضاحت کی ضرورت تو یقیناً نہیں ہو گی کہ مسٹر بکرم سنگھ کی موت میرے لیے نہایت ضروری ہے۔''

''استاد کو اپنے شاگرد پر اعتماد ہونا چاہیے۔''

''تمھاری کامیابی میرے لیے بڑے معنی رکھتی ہے۔ اور سچ کہوں تو میری انگلی سیکڑوں بار لبلبی دبا کر کیمیوں کی جان لے چکی ہے۔ مگر اس قتل پر میرا ضمیر مطمئن نہیں ہو رہا تبھی جا رہی ہوں۔ ورنہ یہ نہایت آسان ہدف تھا۔''

''کہا ناں یہ مجھ پر چھوڑ دو۔'' میں نے تسلی دی۔

''مسٹر گپتا نے تمھیں کتنا معاوضہ دینے کا وعدہ کیا ہے؟''

''پانچ لاکھ۔''

اس نے فراخ دلی سے اعلان کیا۔ ''کامیاب ہو جاؤ، اتنی ہی رقم میں بھی دوں گی۔''

اس کی احتیاط کی تاکید اور انعام کی ترغیب پر میرے منہ سے نادانستگی میں نکلا۔ ''اگر انعام میں ڈیٹ پر جانے کا وعدہ بھی شامل ہو جائے تو سو فیصد کامیابی کی ضمانت دیتا ہوں۔'' ایسا میں نے بہ طور مزاح و شرارت کہا تھا ورنہ مجھے اس کے مسائل سے کوئی غرض نہیں تھی۔ نہ بکرم سنگھ پر گولی چلا کر میں حماقت کا ثبوت دے سکتا تھا۔ میرا ہدف رندھیر شکلا کا منحوس وجود تھا۔ اور اس کی ہلاکت کے بعد میں نے وقتی طور پر غائب ہونا تھا۔ جونہی معاملہ ٹھنڈا ہوتا، پرما انصاری کو اس کی مرضی سے یا زبردستی پاکستان لے جانا تھا۔

ایک دم اس کے چہرے پر تحیر ابھرا۔ آنکھوں میں گہرے شک کی پرچھائیاں نمودار ہوئیں۔ مجھے لگا تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ افغانستان میں وائرلیس پر بات کرتے ہوئے میں اسے کئی بات ڈیٹ پر جانے کا کہہ چکا تھا۔ اور انداز بھی بعینہٖ یہی ہوا کرتا تھا۔ شرارتی و مزاحیہ۔

اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ ''کون ہو تم؟''

جواب دینے سے پہلے دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ میں اس جانب متوجہ ہوا۔ دروازے میں چابی گھومنے کی آواز کے ساتھ ایک دم دروازہ کھلا اور چار افراد دندناتے ہوئے اندر آئے۔ تمام کے ہاتھوں میں کلاشن کوفیں تھیں، جن پر ''ریڈ ڈاٹ سائیٹ'' لگی ہوئی تھی۔ (ریڈ ڈاٹ ایسی سائیٹ ہے جو فائرر کو نشانہ سادھنے میں بے حد سہولت دیتی ہے۔ اس کا سرخ نقطہ ہدف سے ملا کر لبلبی دبا دو گولی ضائع نہیں جاتی)

کرخت لہجے میں کہا گیا۔ ''ذرا سی حرکت پر بدن میں اتنے سوراخ ہوں گے کہ شمار ممکن نہ ہو گا۔''

گو الفاظ لورا کی سمجھ میں نہیں آئے تھے کہ ہندی میں دھمکایا گیا تھا، لیکن کلاشن کوفوں کے خوفناک دہانے اور ان کا

انداز سب کچھ باور کرانے کو کافی تھا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟'' لورا نے دبنگ انداز اختیار کیا۔

''بے بی! حکم کی تعمیل تمھیں بہت ساری اذیتوں سے بچا سکتی ہے۔'' پانچویں شخص نے کمرے میں قدم دھرتے ہوئے انگریزی زبان میں ہدایت جاری کی۔ اس کا منحوس لہجہ اور ناپسندیدہ صورت میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ وہ را کا خصوصی ایجنٹ کرن چاولہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرے بدن میں چیونٹیاں رینگنے لگی تھیں۔

لورا پھیکے لہجے میں بولی۔ ''تمھیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اس کے چہرے پر فکرمندی و پریشانی پھیل گئی تھی۔

کرن چاولہ استہزائی لہجے میں بولا۔ ''ہماری غلط فہمی دور کرنے کو تمھیں کافی وقت دیا جائے گا۔''

لورا ہکلائی۔ ''مم..... مجھے پھانسا جا رہا ہے۔''

''نہیں بے بی! تم پھنس چکی ہو.....'' اطمینان بھرے لہجے میں کہتے ہوئے وہ لورا کے قریب ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کی مخصوص ہتھکڑی تھی۔ مجھے لگا اس نے غلطی کی ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے آدمی اور لورا کے درمیان آ گیا تھا۔ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہوتی۔ لورا جیسی سنائپر جو عملی زندگی میں رگڑا کھا چکی ہو، سے بعید تھا کہ فرار کی کوشش نہ کرتی۔ میں بھی حرکت میں آنے کو تیار ہو گیا تھا۔ ایک بار میرے ہاتھ کی رسائی اپنے پستول تک ہو جاتی اس کے بعد بازی پلٹنا مشکل نہ ہتا۔

کرن کے قریب ہوتے ہی حسب توقع لورا نے حملہ کرنے کی کوشش کی۔ میں بھی ایک دم چوکس ہو گیا تھا۔ لورا کی حرکت کے ساتھ میرے بازو نیچے ہوئے، لیکن اس سے پہلے کہ میرا ہاتھ ہولسٹر تک پہنچ پاتا لورا ہوا میں اڑتے ہوئے مجھ سے آ ٹکرائی۔ کرن نے اسے گھما کر میری طرف پھینکا تھا۔ ہم دونوں گر گئے تھے۔

وہ استہزائی انداز میں بولا۔ ''شاید تمھیں معلوم نہیں کرن چاولہ ان شعبدوں سے متاثر ہونے والوں میں سے نہیں ہے۔''

ہمارے سنبھلنے سے پہلے کلاشن کوفوں کی نالیں (بیرل) ہماری گردن سے لگ چکی تھی۔ دو آدمیوں نے ہمیں زد میں لیے رکھا جبکہ دو تلاشی لینے لگے۔

لورا کی تلاشی لینے والے نے ذرا بھی رعایت نہیں برتی تھی، بلکہ کچھ زیادہ ہی باریک بینی کا مظاہرہ کیا تھا۔ لورا کے گریبان سے ایک چھوٹا سا پستول برآمد ہوا تھا۔ میرا گلاک بھی ان کے قبضے میں آ گیا تھا۔ کلائی کی گھڑی کے علاوہ انھوں نے میرے پاس کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ گھڑی کے بچ جانے پر میں نے سکون کا سانس لیا تھا کہ وہ گھڑی ممتا باجی کی نشانی تھی۔ جو انھوں نے بہ طور راکھی میری کلائی پر باندھی تھی۔ گو مسلمانوں میں راکھی باندھنے کا رواج نہیں اور نہ میرا اس پر یقین ہے۔ لیکن اس رسم کے پیچھے جو پاکیزہ و مقدس محبت کا احساس پنہاں تھا اس کا کوئی بدل نہیں تھا۔ ہمارے ہاتھ پشت پر جکڑ دیے گئے۔

''کیا حال ہے سندیپ چوپڑا۔'' اس نے شہادت کی انگلی سے میری ٹھوڑی اٹھائی۔

''مس..... سس سر غلطی ہو گئی شما کر دیں۔'' میں نے گڑگڑانے میں تیزی دکھائی کہ موجودہ روپ اسی عاجزی کا متقاضی تھا۔

کرن چاولہ کا قہقہہ بلند ہوا۔ ''تمھاری بڑی تعریف سنی تھی۔ کیا بکری کی طرح میں میں شروع کر دی ہے۔''

''مم..... میں لالچ میں آ گیا تھا سر!'' اس کا معنی خیز انداز عجیب لگنے کے باوجود میں اداکاری پر تلا رہا۔

''کس کو نشانہ بنانے کا ارادہ تھا۔'' وہ نپے تلے قدم رکھتا ہوا ایس آر ون کے قریب پہنچا۔ اور ٹیلی اسکوپ سائیٹ

سے آنکھ لگالی۔ ہم چپ رہے۔

جائزہ لے کر وہ دوبارہ میرے سامنے آیا۔ ''شکلا صاحب کی کوٹھی تک کتنا فاصلہ ہے۔''

میں دھیرے سے بولا۔ ''پندرہ سو میٹر۔''

اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''اور تم تو دو اڑھائی کلومیٹر تک نشانہ بنانے کی اہلیت رکھتے ہو۔''

میرے چہرے پر حیرانی نمودار ہوئی۔ اس کا طنزیہ و استہزائی لہجہ اور لورا سے زیادہ مجھے اہمیت دینا شش در کرنے والا تھا۔

اس نے لمحہ بھر توقف کر کے جواب کا انتظار کیا اور پھر میرے سر پر بم پھوڑا۔ ''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں راجا زیشان حیدر؟''

''آ..... آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام سندیپ چوپڑا ہے۔'' میں نقلی شناخت پر بہ ضد رہا۔

''مجھے غلط فہمی ہو سکتی ہے شری کانت کو نہیں۔'' (یقیناً قارئین کو شری کانت یاد ہوگا جو امریکہ میں سنائپر کورس کے دوران سردار کی گولی سے زخمی ہوا تھا)

میری آنکھوں میں بے چینی ابھری۔ کرن چاولہ زہر خند ہوا۔ ''صحیح سوچ رہے ہو، تم ابتداء ہی سے ہماری نظر میں ہو۔ مجھے تبھی محسوس ہو گیا تھا کہ بیڈ کے نیچے کوئی نرگ واسی (جہنمی) چھپا ہے۔ بس کچھ سوچ کر مہلت دی تھی۔''

وہ لورا کو مخاطب ہوا۔ ''بے بی! تم کیوں کو کمینے مسلسل گھور رہی۔ بزدل پاکستانی جاسوس مجھ سے خوب صورت تو نہیں ہے۔''

یقیناً اسے لورا کے گھورنے کا اندازہ نہیں تھا۔

''میں نے کوئی جرم نہیں کیا، مجھے جانے دو ورنہ جواب دہی تمھارے لیے مشکل ہوگی۔''

کرن متبسم ہوا۔ ''ملک کے سپہ سالار کے قتل کی منصوبہ بندی کرنا اور سنائپر رائفل کے ساتھ یوں رنگے ہاتھوں گرفتار ہونا کہ رائفل سپہ سالار کی کرسی پر قائم (فکس) کی گئی ہو۔ تمھاری نظر میں کوئی جرم نہیں ہے۔''

''یہ ثابت کرنا آسان نہیں ہوگا۔ میں انڈیا میں رائفل کا سودا کرنے آئی ہوں اور بس.....''

کرن چاولہ اس کی برہمی پر محظوظ ہوا۔ ''یہاں کیا کر رہی تھیں؟''

''مسٹر گپتا نے بلوایا تھا۔'' لورا پہلے جھٹکے سے سنبھل گئی تھی۔

''پاکستانی جاسوس کی سہائتا (مدد) کرنا تمھاری مشکلات کتنی بڑھا چکا ہے اس کا اندازہ تمھاری سوچ سے بعید ہے۔''

''میں اسے نہیں جانتی۔'' لورا مجھے پہچاننے سے مکر گئی تھی۔

کرن معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔ ''تو تربیت کیوں دے رہی تھیں۔''

''کوئی ثبوت۔'' وہ انکار پر ڈٹی رہی۔

''بہت سارے ہیں۔'' اطمینان سے کہتے ہوئے وہ اپنے آدمیوں کو ہدایت دینے لگا۔ ''بھاگنے والے کی لاش پاکر بھی تم سے باز پرس نہیں ہوگی، مگر کوئی نکل گیا تو ذمہ دار کی جان بھی ضرور نکلے گی۔''

''مسٹر کرن! یقیناً تم غلطی کر رہے ہو۔'' لورا جان چھڑانے کی کوشش میں لگی رہی۔

''غلطی تو تم کر چکی ہو بے بی۔ اب خمیازہ بھگتو۔ اور یہ غلط فہمی بھی دل سے نکال دو کہ شکلا صاحب تمھاری مدد کر پائیں گے۔''

''پچھتاؤ گے۔'' لورا ہار ماننے پر تیار نہیں تھی۔

''شاید ایسا موقع نہ آئے۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں لے جانے کا کہا۔

''چلو اوئے۔'' مجھے کلاشن کوف کی نال سے ٹہوکا دیا گیا۔ یہی حرکت لورا کے ساتھ بھی دہرائی گئی تھی۔

کرن چاولہ مجھے بھی انگریزی ہی میں مخاطب کرتا رہا، انداز سے لگا وہ میرے بارے کافی کچھ جانتا تھا۔ اس کا نڈر چہرہ، بے خوف انداز، ذہانت و مکاری سے لبریز آنکھیں، سڈول جسم، چوکس پن اور بات چیت واضح کر رہی تھی کہ وہ نہایت سخت حریف ثابت ہونے والا تھا۔ تحمل و ٹھنڈا لہجہ اضافی خوبیاں تھیں۔ بھڑکیں مارنے کے بجائے وہ سلجھی ہوئی گفتگو کر رہا تھا۔

''تو میرا شک درست تھا۔'' کمرے سے نکلتے ہی لورا نے توپوں کا رخ میری جانب موڑا۔

میں ڈھٹائی سے بولا۔ ''مجھے تمھارے شک کے بارے جاننے میں ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے۔''

''بوتھا بند رکھو۔'' میری پیٹھ میں کلاشن کوف کی نال چبھوئی گئی۔ میں نے چپ سادھ لی کہ بعید نہیں تھا وہ مار کٹائی پر اتر آتے۔ حدود سے تجاوز کرنا قیدیوں کے لیے باعث نقصان ہوتا ہے۔

''تم نک کے قاتل ہو نا؟'' لورا نے تصدیق چاہی۔ آواز و انداز کی مماثلت تو اسے پہلے ہی کھٹک رہی تھی۔ اب میرا پاکستانی ہونا اور دو کلو میٹر تک ہدف کو کامیابی سے نشانہ بنانے کی صلاحیت اسے یقین دلانے کو کافی تھی۔

میں نے چپ رہنے میں عافیت سمجھی تھی۔ اس کا نِک اگر میرے ہاتھوں قتل ہوا تھا تو میرے ہاں کھانے کی دعوت پر نہیں آیا تھا کہ مجھے شرمندگی ہوتی۔ وہ میری تاڑ میں تھا۔ اگر اس کا داؤ کامیاب ہو جاتا تو آج میں آنجہانی ہوتا۔

کرن چاولہ باہر نہیں نکلا تھا۔ وہ ہمیں لفٹ کے پاس لائے۔ چاروں نہایت چوکس و محتاط تھے۔

لورا چلتے ہوئے بھی کڑی نظروں سے مجھے گھورتی رہی۔ گزشتہ دنوں میں مبتدی بن کر سنائپنگ سیکھتا رہا، حالاں کہ وہ اچھی طرح واقف تھی میں اس سے اچھا سنائپر تھا۔ بلکہ نِک کو قتل کر کے اس کا عملی ثبوت بھی پیش کر چکا تھا۔

''یقین کرو تمھاری گرفتاری میں میرا ذرا بھر قصور نہیں ہے۔'' اسے مسلسل گھورتے پا کر میں بولے بغیر نہ رہا۔

اس نے دانت پیسے۔ ''تم نہایت ذلیل و کمینے شخص ہو۔''

میں نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔ ''اس لیے کہ تمھیں زندہ چھوڑ دیا تھا۔''

''تمھاری چونچ بند نہیں ہو سکتی۔'' ایک نے مجھے گھرکا۔ اور لفٹ کے بٹنوں سے چھیڑ خانی کرنے لگا۔ ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ لفٹ نیچے جانے لگی۔

لورا اسے خاطر میں نہیں لائی تھی۔ ''میری وجہ سے تم نِک پر نشانہ نہیں سادھ سکتے تھے تبھی مجھے دھوکے سے اٹھا لیا تھا نا۔''

مجھے جھڑکنے والے نے اسے ڈانٹا۔ ''لڑکی تمھاری زبان کی کھجلی کیسے ختم ہوگی۔''

لورا کو الفاظ نہیں تو لہجے و انداز کو سمجھ جانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ اسے اہمیت دیے بغیر میری طرف متوجہ رہی۔

''تم نے بہت قیمتی و بہترین سنائپر کو قتل کیا ہے، کم از کم.....'' الفاظ اس کے منہ میں تھے کہ تنبیہ کرنے والا طیش میں آ کر بڑھا اور اسے گریبان سے پکڑ کر لفٹ کی دیوار سے لگا دیا۔

''چھوکری مجھے زبان بند کرنے کے اور بھی طریقے آتے ہیں۔''

لورا کا چہرہ غصے و توہین سے لال ٹماٹر ہو گیا تھا۔

مجھ سے حماقت سرزد ہوئی اور بے ساختہ بول پڑا۔ ''آپ کو ایک لڑکی کے ساتھ ایسا برتاؤ زیب نہیں دیتا۔''

لورا کو چھوڑ کر وہ مجھ پر پل پڑا۔ تین زناٹے دار تھپڑ مار کر مجھے گریبان سے پکڑا اور جھنجوڑتے ہوئے دھاڑا۔ ''تم مجھے

اخلاقیات سکھاؤ گے۔''

میں ہونٹ بھینچ کر خاموش ہو گیا تھا۔ کم ظرف دشمن سے اچھائی کی توقع عبث تھی۔

لفٹ کی حرکت رکنے پر میری خلاصی ہو پائی تھی۔ دروازے کی طرف دھکا دے کر اس نے میری تشریف پرلاہ رسید کی، میں بہ مشکل گرنے سے بچا تھا۔

اپنی بے عزتی اور میری ٹھکائی کرا کر لورا براؤن کے منہ پر بھی ڈھکن لگ گیا تھا۔

ہمیں لیے وہ پارکنگ میں پہنچے جہاں کالے شیشوں والی ویگن کھڑی تھی۔ اندر بٹھا کر انھوں نے ہمارے سروں پر موٹے کپڑے کے نقاب چڑھائے، یوں کہ کچھ بھی نظر آنا ممکن نہیں رہا تھا۔

ہلکے سے جھٹکے سے ویگن آگے بڑھی اور نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ ہم گھنٹا بھر سفر میں رہے، اس دوران ٹریفک کی آواز، ہارن کا شور، انسانوں کی چیخ و پکار تسلسل سے ہماری سماعتوں میں گونجتی رہی۔ ویگن رکی اور لوہے کا بھاری دروازہ کھلنے کی آواز ابھری۔ ویگن آگے بڑھی، ہلکی سی چڑھائی کے بعد تھوڑا سا رینگی اور دوبارہ رک گئی۔ کسی نے مجھے بازو سے پکڑ کر بے دردی سے باہر گھسیٹا۔ میرا گھٹنا بری طرح سیٹ سے ٹکرایا تھا۔

ایسا ہی کچھ لورا کے ساتھ بھی ہوا تھا کیوں کہ اس کا زوردار انداز میں۔ ''وحشی، جانور۔'' کہنا میری سماعتوں تک پہنچ گیا تھا۔ بے چاری کو دہری اذیت کا سامنا تھا۔ ایک جوان عورت جو خوب صورت بھی ہو، اسے قیدی بننے کے بعد کیا کچھ سہنا پڑ سکتا ہے اس کا اندازہ کرنے کو زیادہ عقل مند ہونا نہیں، صرف بالغ ہونا کافی ہے۔ اور جب قید کرنے والے اخلاقی اقدار اور شرم و حیا کے تقاضوں سے ناواقف ہوں تب تو تبصرے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

''تمھیں بدتمیزی کرنے کا کوئی حق نہیں۔'' لورا نے جھلائے ہوئے لہجے میں احتجاج کیا تھا۔ یقیناً کسی کم ظرف شہدے نے ہاتھوں کی آوارگی سے اپنی غلیظ سوچوں کو اجاگر کیا تھا۔

ہلکے سے قہقہے کے ساتھ مکروہ ارادہ ظاہر ہوا۔ جو یقیناً لورا کی سمجھ سے بالاتر تھا کہ ہندی میں کیا گیا تھا۔

''کتی کے بچے، غلیظ سؤر.....'' لورا کے ہونٹوں سے مغلظات نکلیں۔ جو ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ فراخ دلی سے اوباش فطرت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ مجھے لورا براؤن سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ دھیرندر شکلا جیسے بڑے شخص کو دھتکارنے والی نچلے درجے کے ملازموں میں پھنس گئی تھی۔ گو ان کا حوصلہ دست درازی سے آگے نہ بڑھتا، مگر ایسی گھٹیا حرکتوں کو برداشت کرنا بھی تو کسی عورت کے لیے کاری وار ہوتا ہے۔ اور ان کے بڑوں کو تو یقیناً کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی تھی۔

دو تین موڑ مڑ کر ہمیں سیڑھیاں اترنا پڑیں۔ احتیاط سے قدم لیتے ہوئے میں سیڑھیاں گنتا رہا۔ بارہ قدموں کے بعد ہموار فرش شروع ہو گیا۔ دس پندرہ قدموں کے بعد ہمیں رکنے کی ہدایت ملی، تالے میں چابی گھومی اور دروازہ کھلنے کی آواز ابھری۔ کسی نے میری ہتھکڑی کھول کر سر سے غلاف ہٹایا، اس کے ساتھ ہی دروازہ بند ہوا۔

میری آنکھوں کے سامنے قریباً چھے فٹ چوڑا اور دس فٹ لمبا کمرہ تھا۔ جس کے ایک کونے میں تین مربع فٹ کا پانچ فٹ بلند بیت الخلاء بنا تھا۔ باقی کمرہ ہر قسم کے ساز و سامان سے عاری تھا۔ میں پیچھے مڑا۔ داخلی دروازہ حوالات کی طرح لوہے کی مضبوط سلاخوں کا بنا تھا اور پوری دیوار جتنا چوڑا تھا۔ میرے محبس (قید خانہ) کے سامنے ہی لورا کا زندان تھا۔ دونوں کوٹھڑیاں ایک ہی حجم، ساخت اور ہیئت کی تھیں۔ درمیان میں تین فٹ کی گلی تھی۔ جو اتنی چوڑی تھی کہ ہم سلاخوں سے ہاتھ نکال کر ایک دوسرے کو با آسانی چھو سکتے تھے۔

وہ مجھے گھور رہی تھی۔ بھوری آنکھوں میں فکرمندی اور تشویش اس کی اندرونی حالت کا پتا دے رہی تھی۔ ہمیں لانے والے واپس جا چکے تھے۔

وہ چند لمحے ساکت کھڑی رہی اور پھر سلاخوں کے قریب کمرے کی داہنی دیوار سے ٹیک لگا کر پاؤں پسارتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ''مجھے پھانسنے کی سازش میں تم بھی شریک تھے۔''

میں ہنسا۔ ''پھانسا مجھے گیا ہے محترمہ۔''

''تو تم ایسے ایسے ہو۔'' اس کی نظریں کمرے کی چھت سے میرے چہرے پر منتقل ہوئیں۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرا نام راجا ذیشان حیدر ہے۔''

''میجر جینفر ہنڈسلے سے تمھاری بابت کافی معلومات ملی تھیں۔''

''وہ میری بہت اچھی دوست ہے۔''

وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ''صرف دوست۔''

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ایسی مخلص دوست جس پر میں آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتا ہوں۔ جس کے میری ذات پر کئی احسان ہیں۔ اور جو مجھے اتنی ہی پیاری ہے جتنا کسی کو محبوبہ ہو سکتی ہے۔''

''تم نے مجھے زندہ کیوں چھوڑا تھا، حالاں کہ تمھارے نشانے پر تھی۔'' یہ سوال اس نے مجھ سے تب بھی پوچھا تھا جب میں نک کو ٹھکانے لگا چکا تھا۔ بلکہ بہ قول جینی میرا یہ فعل لورا کے نزدیک کسی خاص احساس کے تابع تھا۔

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''کیوں کہ تم پر گولی نہ چلانے کا وعدہ کر چکا تھا۔ اور ایک مسلمان کو وعدہ خلافی زیب نہیں دیتی۔''

اس نے انکشاف کیا۔ ''مجھے تم سے نفرت ہے۔''

میں نے صفائی دی۔ ''کیا لگتا ہے، میں نک کو چھوڑ دیتا تو موقع ملنے پر وہ بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کر پاتا۔''

''یہ فلسفہ میرے دل سے تمھاری نفرت کا گراف کم نہیں کر سکتا۔''

''مجھے تمھاری نفرت سے مسئلہ ہے نا محبت سے غرض۔ اتفاقاً ایک کشتی میں سوار ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ہماری منزل بھی ایک ہے۔''

اس نے ارادہ ظاہر کیا۔ ''جب بھی موقع ملا میں نک کی موت کا بدلہ ضرور لوں گی۔''

''کوئی اور بات کرو۔'' بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے میں نے بھی دیوار سے ٹیک لگائی اور پاؤں پسار لیے۔

وہ برہم ہوئی۔ ''میری دھمکی تمھیں گیدڑ بھبکی لگ رہی ہے۔''

میں نے اسے موجودہ صورت حال کی طرف متوجہ کیا۔ ''تمھارے ساتھ آخر کیا مجبوری تھی کہ اس دلدل میں گردن پھنسالی۔''

وہ طعنہ زن ہوئی۔ ''تمھیں میری فکر میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ شاید لفٹ میں طبیعت صاف نہیں ہوئی تھی۔''

میں نے اگلا سوال کیا۔ ''فوج کی نوکری کیوں چھوڑی۔''

اس نے دانت پیسے۔ ''تا کہ تمھیں ڈھونڈ کر ٹھکانے لگا سکوں۔''

میں ہنسا۔ ''ڈھونڈا تو تمھیں میں نے ہے۔ بلکہ اپنا استاد بھی بنا لیا ہے۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''تربیت کی شروعات سے جانتی تھی کہ تم سنائپر ہو۔''

میں نے طعنہ کسا۔ ''جھوٹی۔''

''بکواس بند کرو۔''

''ٹھیک ہے مادام! اب جھگڑا چھوڑو اور اس صورت حال سے نکلنے کا حل سوچو۔''

''تمھیں چھوڑوں گی تو نہیں۔'' اس کی سوئی بدلے پر اٹکی تھی۔

میں شرارت سے بولا۔ ''کون کم بخت چاہے گا تم جیسی لڑکی اسے چھوڑ دے۔''

''موقع ملنے کی دیر ہے پھر اپنا حشر دیکھنا۔''

''سمجھتا تھا تمھیں صرف گالیاں بکنے میں مہارت ہے، آج پتا چلا دھمکیاں دینے میں بھی ثانی نہیں رکھتیں۔''

اس نے دانت پیسے ''یہ تو وقت بتائے گا۔''

میں بے زاری سے بولا۔ ''اچھا جتنی دھمکیاں یاد ہیں ایک ساتھ اگل دو تا کہ اس کے بعد کام کی بات کر سکیں۔''

اس نے آنکھیں بند کر کے خاموشی سادھ لی تھی۔ میں بھی سوچ میں کھو گیا۔ کرن چاولہ کا کہنا کہ میں شروع دن سے نظروں میں تھا مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اگر ایسا تھا تو وشال گپتا کی شخصیت بھی مشکوک ٹھہرتی تھی۔ البتہ یہ بھید سے باہر تھا کہ مجھے پہلے گرفتار کیوں نہ کیا گیا۔ اور اب ایسا کرنا کیوں ضروری تھا۔ یہ تو بالکل واضح تھا کہ بکرم سنگھ کے قتل کے منصوبے میں میری شمولیت وشال گپتا کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ ایک خیال یہ بھی ذہن میں ابھرا کہ کہیں جان بوجھ کر تو مجھے نہیں پھانسا گیا۔ ایک پاکستانی جاسوس جب انڈین آرمی چیف کو قتل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑا جائے تو عالمی برادری نے تو متوجہ ہونا تھا۔ لیکن ساتھ ہی خیال آیا کہ نہ تو ان کے پاس ایسا کوئی ثبوت تھا کہ مجھ پر یہ جرم ثابت کرتے اور نہ بکرم سنگھ کو قتل کرنے کی کوئی خاص وجہ تھی جس کے سہارے وہ پاکستان پر الزام عائد کرتے۔ ہمارا ''شری پتی آرکیڈ'' سے مع سنائپر رائفل کے پکڑے جانا کوئی ایسا ثبوت نہیں تھا جو دنیا کو قابل قبول ہوتا۔ وہ فقط میرا پاکستانی ہونا یا زیادہ سے زیادہ جاسوس ہونا ثابت کر سکتے تھے۔ اور دونوں ممالک میں آئے روز ایسے جاسوسوں کی پکڑ دھکڑ ہوتی رہتی ہے۔ اتفاق سے مجھے بکرم سنگھ کے قتل کی اصل وجہ بھی معلوم تھی۔ کہ دھیرندر شکلا اسے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔

قدموں کی چاپ نے مجھے خیالوں سے نکالا۔ وہ تین مسلح افراد تھے۔ لگا لورا براؤن کا بلاوا آ گیا ہے۔ مگر انھوں نے میرے قید خانے کا دروازہ کھولا، دو آدمیوں نے ہتھیار تانے اور تیسرا میرے ہاتھ جکڑنے لگا۔

لورا انھیں کڑی نظروں سے گھورنے لگی۔ مگر انھوں نے لورا کو کچھ نہیں کہا تھا۔ میرے سر پر سیاہ نقاب ڈال کر بصارتوں پر پردہ ڈالا اور قید خانے سے باہر لے آئے۔ میرا خیال تھا سیڑھیاں چڑھنا پڑیں گی، مگر ایک دو موڑ گھوم کر وہ مزید نیچے اترنے لگے۔ بارہ، تیرہ سیڑھیوں کے اختتام پر چند قدم ہموار فرش پر لیے اور مجھے روک دیا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' کرخت آواز میری سماعتوں میں گونجی، ساتھ ہی بازوؤں سے پکڑ کر نیچے کی طرف جھٹکا دیا گیا۔ میں دھپ سے نیچے بیٹھا۔ لوہے کی کرسی کا لمس محسوس ہوتے ہی میں نے پھریری لی۔ یقیناً وہ وقت آ گیا تھا جس کا اندیشہ ہر جاسوس کے دل میں جاگزیں ہوتا ہے۔

ہتھکڑی کھول کر میرے ہاتھ کرسی کے دستے اور پاؤں کرسی کے پایوں سے باندھ دیے گئے۔ کرسی کے پائے زمین میں گڑے ہوئے تھے۔

کسی نے نقاب کھینچا، میری نظر سب سے پہلے کرن چاولہ کی منحوس شکل پر پڑی تھی۔ یقیناً بعض اچھی صورتوں کے عقب میں بھیانک چہرے چھپے ہوتے ہیں۔ وہ اچھا خاصا پرکشش دو چہرہ مرد تھا۔ جسمانی لحاظ سے بھی مضبوط اور سڈول نظر آتا تھا۔ جس اطمینان سے اس نے لورا کا حملہ ناکام کیا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ اچھا لڑاکا تھا۔

دوسرے کے بارے دل میں پیدا ہونے والے احساسات شکل وصورت اور خوب صورتی و بدصورتی کی تمیز سے مبرا ہوتے ہیں۔ کبھی نہایت بدصورت نظر آنے والے شخص کو دیکھ کر انسان کی ساری تھکن دور ہو جاتی ہے اور دل میں خوشی کی لہریں دوڑ پڑتی ہیں، جبکہ نہایت خوش شکل وخوبرو شخص کو دیکھ کر انسان بیزاری، کوفت اور تنگی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس

کے چہرے سے ہٹا کر میں نے نظریں گھمائیں، دیواروں پر ایذاء رسانی کے مختلف آلات لٹکے ہوئے تھے۔ چھت میں لوہے کے مضبوط کڑے لگے تھے جن کے ساتھ زنجیریں لٹک رہی تھیں، جو قیدی کو لٹکانے کے لیے تھیں۔ چاروں طرف سرسری نظر دوڑا کر میں دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''کیا حال ہے جوان؟'' گفتگو کی ابتداء اس نے یوں کی گویا میرا انٹرویو لے رہا ہو۔

''الحمدللہ۔'' میں نے سندیپ چوپڑا کا نقاب اتارنا غنیمت جانا تھا۔

''لمبی چوڑی تفصیلات میں پڑنے کے بجائے بس اتنا اگل دو کہ تمہاری انڈیا آمد کا مقصد کیا ہے؟''

''بتانے کا فائدہ، جب تم نے یقین ہی نہیں کرنا۔''

وہ دوستانہ انداز میں متبسم ہوا۔ ''کوشش تو کرو۔''

''ذاتی کام سے یہاں آیا ہوں۔ جاسوسی کا ارادہ ہے، نہ دہشت گردی مقصود ہے۔''

وہ مزاحیہ لہجے میں بولا۔ ''اور ذاتی کام کی نوعیت انڈین آرمی چیف کا قتل ہے۔''

''اگر میں تمہاری نظر میں تھا تو یقیناً اصل وجہ سے بھی واقف ہو گے۔''

''بدقسمتی سے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''البتہ تمہارے مشن سے لاعلم ہوں۔''

''مجھے اپنے دشمن کی تلاش یہاں کھینچ لائی ہے۔''

''کون ہے؟''

''راج پال۔'' (راج پال امریکہ کورس میں ہمارے ساتھ تھا، بعد میں سردار کے ہاتھوں وزیرستان میں قتل ہوا۔ اب میں نے اسی کا نام استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا)

''راج پال؟'' اس نے سوالیہ انداز میں دہرایا۔

میں نے کہانی گھڑی۔ ''شری کانت کے ساتھ یہ صاحب بھی امریکہ کورس میں ہمارے ساتھ تھا۔ بعد میں افغانستان محاذ پر اس کی وجہ سے میری بیوی معذور ہوئی۔ اور اسے معلوم تھا کہ پلوشہ میری بیوی ہے تبھی اس نے گھٹیا حرکت کی۔ یقیناً بدلہ لینا میرا حق بنتا ہے۔''

مجھے گہری نظروں سے گھورتے ہوئے اس نے نشست چھوڑی اور عقوبت خانے سے باہر نکل گیا۔ چند منٹ بعد واپس آ کر اس نے نشست سنبھالی۔

''کہانی اچھی گھڑی ہے۔''

میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ''کہا تھا، یقین نہیں کرو گے۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اگر تمہارا خیال ہے، راج پال کی موت کی خبر بھارت سرکار تک نہیں پہنچی تو اسے سادگی کے علاوہ کوئی نام نہیں دے سکتا۔''

''راج پال کی موت؟؟؟'' میں نے گہرے تعجب کا اظہار کیا تھا۔

اس نے تنبیہ کی۔ ''جان بچانے کی کوشش میں خود کو مزید پھنسا رہے ہو۔ راج پال کا ذکر تمہیں اس کی موت کا ذمہ دار ٹھہرا رہا ہے۔''

میں نے ڈینگ مارتے ہوئے ارادہ ظاہر کیا۔ ''اگر مر چکا ہے تو اللہ پاک کی قسم میرے ہاتھوں قتل نہیں ہوا۔ اور زندہ ہے تو میری زندگی کی صورت میں اس کی موت میرے ہی ہاتھوں لکھی ہے۔''

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولا۔ ''برخوردار! خالی خولی قسموں کو ثبوت نہیں مانا جاتا، بلکہ تمہارے مذہب میں بھی ملزم کو قسم

کھانے کے بل بوتے پر بے گناہ تصور نہیں کیا جاتا۔"

میں نے پوچھا۔" کیسے یقین آئے گا؟"

وہ اطمینان سے بولا۔" سچ سن کر۔"

میں نے اعتماد کی مار دینا چاہی۔" سچ تو بتا دیا ہے، اب کون سا جھوٹ سننا ہے اس بارے رہنمائی کردو، بے چوں وچرا تسلیم کردوں گا۔"

"سلطان دادا سے کیا تعلق ہے؟"

"کوئی نہیں، صرف سر چھپانے کو ٹھکانہ چاہیے تھا۔"

"جانتے ہو تم نے کتنے افراد کو قتل کیا تھا۔"

"قتل میرے مرنے والی ساتھی نے کیے تھے، میں بے قصور ہوں۔"

وہ کھل کھلا کر ہنسا۔" جس کے ہاتھ میں تم نے پستول پکڑایا تھا اس کے گرنے کا انداز بتا رہا تھا کہ گولی چلانے والا وہ نہیں ہے۔ ایک نظر ڈال کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ اصل قاتل کوئی اور ہے۔ تبھی تمھیں وہاں سے نکلنے کا موقع دیا تاکہ تمھارا مشن کھل جائے۔"

"آپ جو سمجھیں، میرا بیان یہی ہے کہ گولی چلانے والا میں نہیں ہوں۔"

"عام آدمی یوں درست فائر نہیں کرسکتا، ایسا کوئی پیشہ ور سنائپر ہی کرسکتا ہے۔ جو تم ہو۔"

میں نے رد کیا۔" سنائپر مخصوص رائفل سے اچھا فائر کرسکتے ہیں، پستول سے نہیں۔"

"میں نہیں مانتا عام مجرم اتنے منضبط طریقے سے ایجنسیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتے ہیں۔ تمھیں یہاں پہلے سے موجود جاسوسوں کی مدد حاصل تھی۔ اور بہتر ہوگا تمام جاسوسوں کے ٹھکانے اگل دو۔"

"جب جاسوس پکڑا جاتا ہے تو کیا اس کے ساتھی اپنے ٹھکانوں پر ٹکے رہتے ہیں۔"

معنی خیز مسکراہٹ سے اس نے نفی میں سر ہلایا۔" یقیناً ایسا نہیں ہوتا۔ البتہ اپنے قتل ہونے والے ساتھیوں کی خبر ہر ٹھکانے تبدیل کرنے کی ضرورت کم ہی محسوس کی جاتی ہے۔"

میں نے سلطان دادا کے اڈے اور اس سے متصل ہوٹل کے بارے صاف گوئی سے اگل دیا۔ اس کے ساتھ ہی دماغ میں ممتا باجی کا معصوم چہرہ لہرایا اور میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ یقیناً میرے وہاں چھپنے سے وہ ناواقف نہیں تھے۔ اور اگر تفتیش کے نام پر وہ باجی کو بھی پکڑ لیتے تو یقیناً اس سادہ گھریلو عورت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اور اس پر یہ مصیبت میری وجہ سے ٹوٹنا تھی۔

"تمھارے اور گوپال (ڈینو) کے ٹھکانے جانتے ہیں۔ ہمیں دیپک کا ٹھکانہ بتاؤ۔" ڈینو کے ساتھ شہید ہونے والے مجاہد کا شناختی نام دیپک تھا۔ یقیناً اس کے اصل نام سے کرن بھی ناواقف تھا۔ بلکہ اسے تو ڈینو کا نام بھی معلوم نہیں تھا۔ البتہ میرا نام اسے شری کانت سے معلوم ہوگیا تھا۔ وہ منحوس جانے کہاں سے ٹپکا تھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔" معلوم ہوتا تو بتا دیتا۔"

کرن کا استفسار جاری رہا۔" تمھارے پاس ان کے رابطہ نمبر ہوں گے۔"

میں نے بے دھڑک پیش کش کی۔" میرے موبائل فون کو کھنگال سکتے ہو۔"

گردن ٹیڑھی کرکے اس نے ہاتھوں کو آپس میں مسلا، ترچھی نظر سے دیوار پر لٹکے چمڑے کے ہنٹر کو لمحہ بھر گھورا اور پھر گہرا سانس لے کر میری طرف متوجہ ہوگیا۔" تو تم نے طے کرلیا ہے۔"

میں نے بے چارگی ظاہر کی۔ ''طے تو تم نے کرنا ہے۔ مجھے تو سہنا ہوگا۔'' البتہ دلی طور مجھے اطمینان محسوس ہونے لگا تھا کہ اس نے ممتا دیدی کے ٹھکانے کا ذکر نہیں کیا تھا۔

وہ زہر خند ہوا۔ ''تم چند منٹوں میں سب کچھ اگل دیتے، مگر میں بے بس ہوں۔''

اس کی بات نے مجھے چونکا دیا تھا، لیکن بے نیازی ظاہر کیے بیٹھا رہا۔

''گوتم۔'' وہ نشست چھوڑتے ہوئے کھڑا ہوا۔

''جی سر۔'' دیوار کے ساتھ کھڑا مضبوط تن وتوش کا کرخت صورت شخص ہوشیار (اٹن شن) ہو گیا تھا۔

''یار! میرے ہاتھ تو بندھے ہیں، کبھی کسی طریقے سے اگلوا لینا۔ ہدایت یہی ہے کہ پیار محبت سے پوچھنا۔ بلکہ یہ میری درخواست سمجھو کہ اسے جسمانی اذیت نہ دینا۔ میرا مطلب میں درخواست ہی کر سکتا ہوں کہ تم میرے نہیں سرکار کے ملازم ہو۔'' وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ ''ذیشان صاحب اجازت چاہوں گا۔'' اور لمبے ڈگ رکھتا باہر نکل گیا۔

گوتم کی تیز نظریں مجھ پر گڑی تھیں۔ نپے تلے قدم رکھتا ہوا وہ میرے قریب پہنچا۔ ''پہلا مجرم دیکھا ہے جس پر کرن صاحب اتنے مہربان نظر آ رہے ہیں۔'' میں خاموش رہا کہ ان کے رویے کا سر پیر میری سمجھ سے باہر تھا۔

''خیر یہ ان کا ذاتی مسئلہ ہے۔ ان کی مجبوری میرے قدموں کی زنجیر نہیں بن سکتی۔ اس لیے ہم کھیل جاری رکھتے ہیں..... تمھارا نام۔''

میں شرافت سے بولا۔ ''ذیشان حیدر۔''

''عہدہ؟'' (ریک)

''سپاہی۔''

''انڈیا آمد کا مقصد؟'' اس کے سوال جاری رہے۔

''اپنے دشمن کا خاتمہ۔''

وہ برہم ہوا۔ ''دوبارہ پوچھ رہا ہوں۔ انڈیا آمد کا مقصد؟''

''جتنی بار پوچھو گے یہی جواب ملے گا کہ اس کے علاوہ بتانے کو کچھ نہیں ہے۔''

''اس کا ہاتھ کھولو۔'' ''چٹاخ۔'' کی آواز سے عقوبت خانہ گونج اٹھا تھا۔ ''اب بتاؤ انڈیا کیوں آئے ہو۔''

''بتا چکا ہوں۔''

''حقیقت تیرا باپ بھی اگلے گا پتر۔'' اس نے مجھے مسلسل تھپڑوں پر رکھ لیا تھا۔ میں نے سختی سے دانت بھینچ لیے تھے ورنہ خدشہ تھا کہ میرے جبڑے اتر جاتے۔ ہونٹوں کی اندرونی کھال پھٹ گئی تھی اور منہ میں نمکین ذائقہ پھیل گیا تھا۔ تھپڑوں کی بارش رکتے ہی میں نے خون ایک طرف تھوک دیا۔ ہونٹ اندر سے پھٹ گئے تھے۔

''سربن! زنجیر نیچے کرو۔'' اس نے اپنے ساتھی کو آواز دی۔

''جی استاد جی۔'' کہہ کر وہ ایک چرخی گھمانے لگا جس کے ساتھ زنجیر لپٹی تھی۔

زنجیر نیچے آتے ہی اس نے کرسی کے ہتھوں سے میری کلائیاں آزاد کر کے زنجیر کے حلقوں میں جکڑ دیں۔ چھت میں جڑے کڑے کرسی سے ہٹ کر جڑے تھے۔ میرے پاؤں بھی آزاد کر کے انھیں عین کڑوں کے نیچے کھڑا کیا اور سربن چرخی گھمانے لگا۔ جلد ہی میرے ہاتھ اوپر اٹھ گئے تھے۔

گوتم نے میری قمیص پھاڑ کر میرا بالائی جسم برہنہ کر دیا تھا۔

''روی تمھاری باری۔'' اس نے کالے ڈشکرے کو آواز دی۔

لذت بھرے انداز میں ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے دیوار پر ٹنگا چمڑے کا ہنٹر اتارا اور زوردار انداز میں لہرایا۔ ''شڑاپ.....شڑاپ۔'' کی بھیانک آواز نے مجھے آنے والے پراذیت لمحات کی آگاہی دی۔ لیکن وہ عذاب مقدر میں تھا۔ مجھے ذرا بھی یقین ہوتا کہ اصل بات اگل کر میں اپنا چمڑا ادھڑنے سے بچا سکوں گا تو بتا دیتا۔ مگر یہ خام خیالی تھی۔ بلکہ الٹا مجھے جان کے لالے پڑ سکتے تھے۔

روی کے ہنٹر پکڑنے کا انداز واضح کر رہا تھا کہ وہ اس میدان کا کھلاڑی تھا۔

گوتم کا۔ ''انتظار کس بات کا ہے۔'' سنتے ہی اس نے چند قدم دور سے ہاتھ لہرا کر میری طرف جھٹکا۔

اذیت کی شدید لہر اٹھی، کوشش کے باوجود میں اپنی کراہ نہیں روک سکا تھا۔ ہنٹر کی رسائی پیٹھ کے ساتھ پیٹ کے کچھ حصے تک پہنچی تھی۔ عقب کا تو معلوم نہیں البتہ پیٹ پر گہرے سرخ رنگ کی لکیر ثبت ہوگئی تھی۔ لگتا تھا کسی نے خنجر کی نوک سے لکیر کھینچ کر اندر سرخ مرچیں بھر دی ہوں۔

روی کا ہاتھ تسلسل سے چلنے لگا۔ ظالم کے انداز سے محسوس ہو رہا تھا مجھ سے پرانی دشمنی ہے۔ میں نے سختی سے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے، لیکن رہ رہ کر سسکی و کراہیں ہونٹوں سے پھسل جاتی تھیں۔ چند منٹوں میں میرے پیٹ پر بھی چھانٹیں (کوڑے لگنے کے نشان جو سرخ لکیروں کی صورت ظاہر ہوتے ہیں) پھیل گئی تھیں جن سے ہلکا ہلکا خون رسنے لگا تھا۔ پیٹھ کا تو جانے کیا حال تھا۔

اور پھر درد سے بے حال ہو کر میری آنکھیں بند ہوگئیں۔ لیکن مدہوشی کا یہ وقفہ بہت مختصر تھا۔ ایک دم لگا پیٹھ پر تیزاب پھینکا گیا ہو۔ درد بھری کراہ سے میری آنکھ کھلی۔ وہ میری پیٹھ پر نمک چھینک رہے تھے۔ زخموں میں پہلے مرچیں بھری تھیں اب نمک نے تکلیف کو زیادہ کر دیا تھا۔

''کچھ یاد آیا۔'' گوتم نے سامنے آ کر پرسکون انداز میں پوچھا۔

ہونٹ بھینچے ہوئے میں ناک سے گہرے سانس لے رہا تھا۔

''جوان یاد رہے، سب کچھ اگلنا پڑے گا۔ اس سے پہلے تمھیں مرنے کی اجازت بھی نہیں ہوگی۔ تو بہتر ہے اذیتیں جھیلنے کے بغیر ہی سب کچھ بک دو۔''

میں کراہتے ہوئے بولا۔ ''تم صرف اذیت رسانی کا شوق پورا کر رہے ہو۔''

وہ اطمینان سے بولا۔ ''تمھیں جھٹلا نہیں سکتا، البتہ سچ بتا دو تو تھوڑے ہی پر اکتفا کر لیں گے۔ ضروری تو نہیں ہمیشہ نشہ پورا ہو۔''

میں نے بے بسی ظاہر کی۔ ''سچ، جھوٹ کی پہچان کیسے ہوگی۔''

''اتنا تجربہ تو رکھتے ہیں بالک۔''

''سچ تو بتا چکا ہوں جو تم مان ہی نہیں رہے۔''

وہ اپنے ساتھیوں کو مخاطب ہوا۔ ''بھائیو اب تک رسی ہی نہیں جلی تو بل کیا دیکھوں۔''

سر بن زہر خند ہوا۔ ''رسی جلے نہ جلے بل ضرور نکلیں گے۔''

گوتم نے دعوت دی۔ ''تو تمھاری باری۔''

وہ الماری کی طرف بڑھا واپسی پر ہاتھ میں لوہے کا گولا تھا جس کے ساتھ دو تین فٹ زنجیر جڑی تھی۔ زنجیر کے سرے پر حلقہ بنا تھا۔

''بندش ڈھیلی کرو۔'' اس نے روی کو آواز دی۔ اور انتظار کیے بغیر میرے بالوں سے پکڑ کر بے دردی سے نیچے جھکا

دیا۔ جب تک زنجیر ڈھیلی نہ ہوئی وہ بالوں کو جھٹکے دیتا رہا۔ روی نے بس اتنی ہی زنجیر کھولی تھی کہ میں بہ مشکل رکوع کے بل جھک سکا تھا۔ میرے ہاتھ اب تک اٹھے ہوئے تھے۔

سربن نے فولادی حلقہ میرے گلے میں ڈال کر قفل کر دیا۔ اب میں سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا کہ گردن میں وزنی گولی بندھا تھا اور نیچے بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا کہ ہاتھ سختی سے چھت کے کڑوں میں جکڑے تھے۔

سربن دوبارہ الماری کی طرف بڑھا اور ایک مضبوط پلاسٹک کا لمبوترا تھیلا لے آیا جس کے پیندے میں چوکور دھات جڑی تھی۔ میرے سر پر تھیلے کا کھلا سرا چڑھایا اور تسمے کھینچ کر ہوا کی آمدورفت روک دی۔

سوچا تھیلے میں موجود ہوا جلد ہی ختم ہو جائے گی اور پھر میرا سانس گھٹنے لگے گا۔ یہ اذیت بھی کم درجہ نہیں تھی۔ مگر وہ ظالم کچھ اور سوچے ہوئے تھا۔ اس نے دھاتی پیندے میں بجلی کی تار جوڑی اور پلگ لگا دیا۔

پیندے میں پلاسٹک کے ساتھ جڑی زنجیر کھول کر اس نے تین گولیاں اندر پھینکیں اور زنجیر چڑھا دی۔ دو تین لمحوں بعد ہی گولیوں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھنے لگا۔ تب انکشاف ہوا کہ وہ آنسو گیس پیدا کرنے والی گولیاں تھیں۔ مختلف آرمی کورسوں کے دوران ہمیں کیمیائی ماحول کا ادراک کرانے کو گیس چیمبر سے بھی واسطہ پڑتا تھا جہاں یہی گولیاں جلا کر کیمیائی گیس کی تباہ کاری کے بارے سمجھایا جاتا تھا۔ مگر وہاں یہ ایک دو منٹ کا کھیل ہوا کرتا تھا۔ پہلے تو میں نے سانس روک کر دو تین لمحے اذیت کو ٹالا، مگر کب تک سانس روک پاتا۔ گولیاں تیزی سے دھواں اگل رہی تھیں۔ موی تھیلے میں گنجائش بھی کم تھی اس لیے دھواں گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ جونہی میں سانس لینے پر مجبور ہوا میرے تنفس کی نالی میں مرچیں بھر گئی تھیں۔ آنکھیں بند کرنے کے باوجود آنسو تسلسل سے بہنے لگے، جبکہ ناک سے پانی بہہ نکلا۔ میں بری طرح کھانس رہا تھا۔ جھٹکے دے کر تھیلے سے سر نکالنے کی کوشش کی مگر وزنی گولہ مجھے گردن اٹھانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ میں زیادہ دیر اس اذیت کو برداشت نہ کر سکا اور بے دم ہو کر زنجیر سے جھول گیا۔ ناک میں گھسنے والا زہریلا دھواں مدہوش بھی نہیں ہونے دے رہا تھا۔ اگر چند لمحے مزید یہ حالت رہتی تو یقیناً مر جاتا، مگر وہ یہ سہولت دینے پر بھی تیار نہیں تھے۔ میرے تڑپنے کی شدت میں کمی آتے ہی انھوں نے گردن کی بندش ڈھیلی کر کے تھیلے کو اوپر سے پکڑ لیا تاکہ دھواں کمرے کی فضا کو آلودہ نہ کر دے۔

تازہ ہوا ملتے ہی میں گہرے سانس لینے لگا۔ ناک سے رینٹ اور منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ تنفس کی نالی اور پھیپھڑوں میں جیسے مرچیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک ظالم نے میری کھال ادھیڑ کر جلد کو اذیت پہنچائی تھی تو دوسرے نے اندرونی نظام کو درہم برہم کر دیا تھا۔

اس نے مجھے زیادہ آرام کا موقع نہیں دیا تھا۔ تین چار گہرے سانس ہی لے پایا تھا کہ اس نے پھر میرے سر پر تھیلا چڑھا دیا۔ کھانس کھانس اور چھینک چھینک کر میں بے حال ہو گیا تھا۔ لگ رہا تھا صدیوں سے اس اذیت میں پھنسا ہوں۔ اور یہ کھیل تب تک شروع رہا جب تک میں زنجیر سے جھول نہیں گیا تھا۔

پانی کا جگ میرے چہرے پر انڈیل کر وہ ہوش میں لائے تھے۔ اندرونی اذیت میں مجھے جسمانی تکلیف بھول گئی تھی۔

گوتم ہنسا۔ ”بتا دے شہزادے۔ کیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو۔“

مگر میں جواب دینے کے قابل نہیں تھا۔ گہرے سانس لے کر آنسو گیس کا اثر زائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”دونوں ہی لکھے ہو مجھے خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔“

میں ذہنی طور پر نئی اذیت کا سامنا کرنے پر تیار ہو گیا تھا کہ اب یوں بھی یہی میرا مقدر تھا۔ اس نے بہت سادہ

طریقہ اپنایا تھا۔ میری کلائیوں سے بجلی کی ننگی تار لپیٹ کر کرنٹ دینا شروع کر دیے۔ پہلے جھٹکے کے ساتھ میری حلق سے تیز چیخ نکلی تھی۔ اور پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کے ہاتھ دل پسند مشغلہ آ گیا تھا۔ جس شخص کو ظلم کر کے سکون ملے وہ کب جلد سیر ہوتا ہے۔

بجلی کے جھٹکوں سے میرا بدن رعشے کے مریض کی طرح کانپ رہا تھا۔ یہ سلسلہ بھی میری بے ہوشی تک جاری رہا۔

دوبارہ آنکھ زندان میں کھلی تھی۔ میں اوندھے منہ لیٹا تھا اور سماعتوں میں لورا براؤن کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھی۔ ''ریحا..... ریحا.....'' (راجا)

میں نے سیدھا ہونا چاہا اور ہونٹوں سے بے ساختہ کراہ خارج ہوئی۔

''آرام سے..... آرام سے.....'' اس کی آواز میں فکرمندی و ہمدردی گھلی تھی۔

میرا بالائی بدن برہنہ تھا۔ اور اب تک زخموں پر نمک لگا تھا۔ حد درجے کی کمزوری و نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ گھڑی پر نگاہ دوڑائی، رات کے تین بج رہے تھے۔ آزمائشی رات کی چند گھڑیاں اب تک باقی تھیں۔

''نہا لو۔'' لورا براؤن نے میرے زخموں پر لگے نمک کی وجہ سے مشورہ دینے میں تساہل نہیں برتا تھا۔ اچھی خاصی گرمی تھی۔ بلب کی پیلی روشنی ماحول کو مزید پراسرار بنا رہی تھی۔

مجھے اس کا مشورہ مناسب لگا تھا۔ میں دیوار کے سہارے کھڑا ہوا اور آہستہ روی سے بیت الخلاء کی طرف بڑھ گیا۔ تین مربع فٹ کے بیت الخلاء کے کونے میں کموڈ لگا تھا۔ ساتھ ہی جستی لوٹا رکھا تھا۔ پتلون و زیر جامہ اتار کر میں نے دیوار پر رکھا اور پانی کا لوٹا بھر کر جسم پر بہایا۔ اذیت کی تازہ لہر جسم میں دوڑ گئی تھی۔ میں درد کو خاطر میں لائے بغیر لوٹے بھر بھر کر جسم پر بہاتا رہا۔ نہانے سے طبیعت کافی سنبھل گئی تھی۔ میں پتلون پہن کر باہر نکل آیا۔

''مجھے نہیں لگتا یہ انسان ہیں۔'' میرے بیٹھتے ہی لورا نے زبان کھولی۔ نفرت کی دعوے دار میری حالت دیکھتے ہی ہمدردی کرنے لگی تھی۔

میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ''اچھا ہوا تمھیں تو سکون پہنچا۔''

اس نے صفائی دی۔ ''اتنی ظالم نہیں ہوں۔''

''میں تو باری بھگتا چکا ہوں لگتا ہے اگلی باری تمھاری ہے۔''

''لاوارث نہیں ہوں کہ تشدد کا نشانہ بنائیں گے۔'' بہ ظاہر اس نے بے پروائی ظاہر کی تھی مگر اس کا لہجہ اعتماد سے خالی تھا۔

میں نے حقیقت اگلی۔ ''بے وقوف ان کے پاس ہمارے خلاف ثبوت موجود ہیں۔''

وہ جلدی سے بولی۔ ''مجھے کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

میرے ہونٹوں پر شرارتی مسکراہٹ ابھری۔ مجھے برہمی سے گھورتے ہوئے اس نے جلدی سے تصحیح کی۔ ''میرا مطلب انھیں سب کچھ بتا دوں گی۔''

''تمھارا کیا خیال ہے میں نے سب کچھ نہیں بتایا۔''

وہ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی۔ اسے ڈرانے کا ارادہ نہیں تھا، مگر حقیقت یہی تھی کہ اسے مجھ سے زیادہ خطرہ درپیش تھا۔ حوا کی بیٹی جب درندوں میں گھر جائے تو اس کی بے بسی سے یہ ظالم کیسے کھیل سکتے ہیں، وہ انجان نہیں تھی۔ شاید اسے اپنی کمپنی ''ڈبلیو اے ایس'' سے تھوڑی بہت امید تھی ورنہ وہ سرکاری دورے پر نہیں آئی تھی کہ برطانیہ حکومت اس معاملے میں دخیل ہوتی۔ گو بڑے ممالک اپنے شہری کو آزاد کرانے کی خاطر کافی حد تک چلے جاتے ہیں۔ لیکن ایسا تب ہوتا ہے

جب خبر میڈیا میں اٹھ جائے۔ اس بے چاری کے قیدی ہونے کی خبر جب تک صاحبان اقتدار تک پہنچتی بہت دیر ہو چکی ہوتی۔ اور تب بہت سارے حادثوں کی تلافی ممکن نہ رہتی۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس کی لجاجت بھری آواز ابھری۔ ''سچ بتاؤ، کیا تمھیں مسٹر گپتا سے کوئی ایسی سن گن ملی جس سے ظاہر ہو کہ شکلا مجھے پھانسنا چاہتا ہے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مگر تمھیں احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔ مجھے تربیت دینا کافی تھا۔ اتنا آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔''

وہ افسردگی سے بولی۔ ''ریجا، تم حقائق سے لاعلم ہو اس لیے حکمت بگھار رہے ہو۔''

میں نے اشتیاق ظاہر کیا۔ ''تو گتھی سلجھا دو۔''

''میں نے استعفیٰ نہیں دیا تھا میرا کورٹ مارشل ہوا تھا۔ دوسری نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہوئی۔ اور اس دوران ڈیوڈ سے ملاقات ہوئی جسے سنائپر رائفلوں میں جدت لانے کا شوق تھا۔ ہم دونوں نے واز (ڈبلیو اے ایس) کمپنی کی بنیاد ڈالی۔ میں نے اپنی ساری جمع پونجی یہاں تک کہ اپنا اپارٹمنٹ بھی بیچ کر کمپنی میں لگا دیا۔ ڈیوڈ نے بھی سارا سرمایہ جھونک دیا۔ لمبی تفصیل میں نہیں جاتی مختصراً یہ کہ ایس آر ون ہماری پہلی مصنوعات (پراڈکٹ) ہے۔ کسی بہتر سودے کی تلاش مجھے یہاں کھینچ لائی۔ پہلے مسٹر شکلا نے رضامندی ظاہر کی تھی، مگر بعد میں عذر پیش کیا کہ بکرم سنگھ آڑے آ رہا ہے۔ کیوں کہ انڈین آرمی کے پاس پہلے سے روس کی بنی ''ڈریگنوو'' اور انڈیا کی اپنی ایجاد کردہ ''ودوانسک'' سنائپر رائفل موجود ہے۔ اور اتنی قیمتی سنائپر رائفل کی گنجائش نہیں نکل رہی تھی۔ مسئلہ بتا کر مسٹر شکلا نے حل بھی خود پیش کیا کہ اگر میں بکرم سنگھ کو قتل کر سکوں تو وہ سودے کی منظوری دے دے گا۔ میں اس حد تک جانے پر تیار نہیں تھی۔ تب اس نے ایسا نشانے باز تیار کرنے کی شرط رکھی جو یہ کام کر سکتا ہو۔ آگے کی کہانی تمھیں معلوم ہے۔''

میں معترض ہوا۔ ''ایس آر ون اچھی رائفل ہے۔ تمھیں اتنا خطرہ مول لینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ دیر سے سہی مگر آخر اس نے مشہور رہو ہی جانا تھا۔ مختلف ممالک کے کمانڈوز یقیناً اس ہلکی اور کارآمد رائفل کو خریدنے میں دلچسپی لیتے۔''

وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولی۔ ''کہا نا تم کچھ نہیں جانتے۔''

یقیناً وہ کچھ اور بھی چھپا رہی تھی۔ میں نے کریدنا مناسب نہ سمجھا۔

''اس بارے ڈیوڈ جانتا ہے۔''

لورا نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''یقیناً شکلا اسے صورت حال سے آگاہ کر چکا ہوگا۔ اور امید ہے جلد ہی تمھارے بارے مثبت پیش رفت ہوگی۔''

اس کے چہرے پر امید کی رمق ابھری، مگر کوئی تبصرہ کیے بنا وہ کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ میں نے بھی آنکھیں موند لی تھیں۔ لورا سے گپ کرتے ہوئے میرا دھیان اپنے زخموں سے ہٹ گیا تھا، لیکن خاموش ہوتے ہی زخموں میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ آنکھیں بند کرنے پر بھی نیند نہ آئی۔ بس کبھی کبھار ہلکی سی غنودگی چھا جاتی اور جونہی کروٹ تبدیل کرتا آنکھ کھل جاتی۔

—●—

میری غنودگی قدموں کی چاپ سے ٹوٹی۔ دو افراد ناشتا لے آئے تھے۔ لورا کو بھی اچھی طرح سے نیند نہیں آئی تھی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔ ناشتے کے ٹرے انھوں نے دروازے کے نیچے سے اندر دھکیلے اور خاموشی سے واپس مڑ گئے۔

کل رات سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ تشدد یا اذیت انسان کی بھوک کو ختم نہیں کر سکتی۔ سخت بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے پہلے بیت الخلاء میں جا کر ہاتھ منہ دھویا اور پھر ناشتا کرنے لگا۔ ناشتے میں دو توس ایک ابلا ہوا انڈا اور چائے کی پیالی تھی۔ اتنی سخت بھوک کے سامنے اس ناکافی غذا کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ میں سب کچھ چٹ کر گیا تھا۔ لورا براؤن نے صرف ایک توس کو ہلکا سا کاٹ کر چھوڑ دیا تھا۔ شاید پریشانی نے اس کی بھوک ختم کر دی تھی۔

''کھاؤ گے؟'' میری پلیٹ میں جھاڑو پھرا دیکھ کر وہ مستفسر ہوئی۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے ٹرے میری طرف دھکیل دی تھی۔ دروازے کے نیچے سے ہاتھ گزار کر میں نے پلیٹ پکڑی اور اس کا ناشتا بھی چٹ کر گیا۔

بہ مشکل ناشتے سے فارغ ہوا تھا کہ چند افراد کے قدموں کی چاپ ابھری۔ لمحہ بھر بعد وہ ہمارے سامنے تھے۔ مجھ پر سرسری نظر ڈال کر انھوں نے لورا براؤن کا دروازہ کھولا۔ وہ بدک کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔''

تین ہتھیاروں کے دہانے اس کی طرف سیدھے ہوئے۔ چوتھا جس کے ہاتھ میں ہتھکڑی تھی، انگریزی میں بولا۔

''مادام جانا تو پڑے گا، چل کر نہیں جاؤ گی تو اٹھا کر لے جائیں گے۔''

''میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ خوفزدہ تھی۔

''اگر یہ حرکت کرے تو ٹانگ میں گولی مار دینا۔'' اپنے ساتھیوں کو کہہ کر اس کے قدم لورا کی طرف بڑھے۔ وہ دیوار کے ساتھ سمٹ گئی تھی۔ اس نے زبردستی لورا کو ہتھکڑی پہنا دی۔

جونھی دروازے کی طرف دھکیلا وہ مچلتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگی۔

سرغنہ نے دو آدمیوں کو اشارہ کیا۔ ہتھیار کندھے پر لٹکا کر انھوں نے لورا کو دونوں بازوؤں سے تھام لیا تھا۔

''تم زبردستی نہیں کر سکتے..... تم پچھتاؤ گے..... میں برطانیہ کی آزاد شہری ہوں بغیر کسی ثبوت کے تم مجھے زدوکوب نہیں کر سکتے۔'' لورا برہمی سے بولتے ہوئے خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر دونوں ڈشکروں کے سامنے اس کی ایک نہیں چلی تھی۔

''ریجا! مجھے بچاؤ..... ریجا.....'' اچانک وہ مجھے مدد کو پکارنے لگی۔ اسے یہ بھول گیا تھا کہ راجا بے چارہ خود کو نہیں بچا سکا اسے کیا چھڑائے گا۔ لیکن اس کے بار بار پکارنے پر میں سلاخیں پکڑ کر کھڑا ہوا۔

''سر! آپ کو ایک لڑکی کا احترام مدنظر رکھنا چاہیے۔'' میں ان کے سرغنہ کو مخاطب ہوا تھا۔

''اپنی فکر کرو بالک.....'' مجھے جھڑکتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔

مچلتی، بدکتی لورا کو وہ سیڑھیوں سے اوپر لے جانے لگے۔ یقیناً کسی سے ملوانے جا رہے تھے۔ یا کم از کم لے جانے کا مقصد تفتیش نہیں تھا، کیوں کہ عقوبت خانے میں جانے کو تو مزید نیچے اترنا پڑتا تھا۔

اگلے ایک گھنٹے میں میرا بھی بلاوا آ گیا تھا۔ مجھے لے جانے والے وہی پرانے جلاد تھے۔ تھوڑی دیر بعد میں اسی منحوس کرسی پر بندھا بیٹھا تھا۔

''جوان رات کو تم جیت گئے تھے۔ اور میں تمھیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔'' زہریلے لہجے میں کہتے ہوئے گوتم تالیاں پیٹنے لگا۔ سربن اور روی نے بھی استہزائی ہنسی سے اس کا ساتھ دیا تھا۔

''لیکن کیا ہے کہ مقابلہ ختم نہیں ہوا۔ اور اب اگلا مرحلہ آن پہنچا۔'' وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم لوگ تیار ہو دوستو۔''

''تیار ہیں استاد جی۔'' دونوں بیک زبان بولے تھے۔

''گو تمھارا جواب تو معلوم ہے، لیکن مقابلہ شروع کرنے سے پہلے پوچھنا ہماری ذمہ داری ہے۔ کچھ یاد آیا کہ نہیں۔''

''جواب تو میں شروع سے دے چکا ہوں۔ اس کے علاوہ جو سننا ہے بتادو، میں دہرادوں گا۔''

''جوان ڈٹا ہے بھئی..... کرن چاولہ صاحب کہہ رہے تھے کہ موصوف سنائپر ہے اور سنائپر بہت سخت جان ہوتے ہیں۔ یقیناً کرن صاحب نے ہماری صلاحیتوں کو للکارا ہے۔''

وہ اپنے ظلم و ستم اور شقی القلبی کو صلاحیتیں گردان رہے تھے۔ اور وقت ان کے ہاتھ میں تھا اس لیے میں بحث و تکرار نہیں کر سکتا تھا، نہ خاطر خواہ جواب دینے کی حالت میں تھا۔ ان بڑھکیں و ڈینگیں ایک بندھے ہوئے قیدی کے لیے تھیں اور یہی ان کی ہار تھی۔

مجھے خاموش پا کر وہ اپنے مشغلے کو جڑ گئے۔ ابتداء روبن سے ہوئی تھی۔ مجھے الٹا لٹکا کر پانی کے بھرے ٹب میں میرا سر بار بار ڈبویا گیا۔ جب سانس اکھڑنے لگتا تب اوپر اٹھا دیتے۔ روی نے اپنی باری پر نئی گولیاں استعمال کی تھیں جن کا اثر کل والی گولیوں سے بھی زیادہ تھا۔ میں نے صبح کا ناشتا بھی الٹی کر دیا تھا۔ وہ باری باری مختلف عذاب آزماتے رہے۔ میں کئی بار بے ہوش ہوا۔ نہ جانے کتنا وقت بیت گیا تھا۔ بے ہوشی ہی کی حالت میں وہ مجھے زندان میں پھینک گئے تھے۔

پھر مجھے پلوشہ دکھائی دی۔ میرا سر گود میں رکھ کر موہنی مسکراہٹیں نچھاور کر رہی تھی۔

''اب تک خفا ہو۔'' اس وقت بھی میرے دماغ سے اس کی خفگی کا احساس زائل نہیں ہوا تھا۔

''اپنے راجو سے خفا ہو سکتی ہوں۔'' ماتھے پر مہر محبت ثبت کرتے ہوئے اس نے مجھے خوشی سے ہمکنار کیا۔

میں شاکی ہوا۔ ''موڈ جو بنایا ہوا تھا۔''

''تنگ کر رہی تھی نا..... آپ کی لاڈلی جو ہوں۔''

''اگر تمھاری خفگی میری جان لے لیتی پھر؟'' میں نے اسے ڈرانے کی کامیاب کوشش کی۔

''ایسا تو نہ بولیں، سچ میں خفا ہو جاؤں گی۔'' وہ میرے چہرے پر جھک گئی تھی۔

''دوبارہ اذیت دو گی۔''

''کبھی نہیں۔'' اس نے منہ بسورا۔ ''مگر جلدی آئیں نا، کب سے آپ کی آواز نہیں سنی۔ ذرا سا مذاق کرنے پر اتنی بڑی سزا تو نہ دیں۔''

میں دھیرے سے مسکرایا۔ اس نے چاہت سے پوچھا۔ ''راجو، پلوشے کا ہے نا؟''

میرے دل سے آواز نکلی۔ ''اللہ پاک کی قسم ایسا ہی ہے۔''

''میرے راجو..... میرے راجو..... میرے راجو.....'' وہ وارفتگی سے پکارنے لگی۔ اور میں سرشاری کی کیفیت میں پڑا اس کے روشن چہرے کو گھورتا رہا۔ اچانک روشنی مدہم ہونے لگی، اس کا پیارا چہرہ دھندلانے لگا تھا۔ آواز و انداز بھی تبدیل ہونے لگا۔ ''ریحا..... ریحا..... ریحا.....'' میرا شعور بیدار ہوا۔ میں اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا اور سماعتوں میں لورا براؤن کی تشویش بھری آوازیں آ رہی تھی۔ بے وقوف نہیں جانتی تھی اس کی ہمدردی نے مجھ سے راحت و سکون کے کیسے لمحات چھینے تھے۔ بہت عرصے بعد جانِ حیات خواب میں آئی تھی۔ جسمانی طور پر بدحال ہونے کے باوجود روحانی طور پر میں بہت آسودگی محسوس کر رہا تھا۔ جی چاہتا تھا دوبارہ آنکھیں میچ کر اس کی گود میں پہنچ جاؤں، لیکن لورا کی ''ریحا..... ریحا'' کی گردان مجھے بے چین کر رہی تھی۔

میں نے آنکھیں کھول کر اٹھنے کی کوشش کی، ہونٹوں سے بے ساختہ کراہ خارج ہوئی تھی۔
لورا ہمدردی سے بولی۔ ''آرام سے۔''
میں نے زندہ دلی ظاہر کی۔ ''یہ نصیحت انھیں کرو نا کہ آرام سے درگت بنایا کریں۔''
اس نے مشورہ دیا۔ ''جو پوچھ رہے ہیں، انھیں بتا کیوں نہیں دیتے۔''
میں نے منہ بنایا۔ ''یہی تو معلوم نہیں کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔''
''کیا مطلب؟'' اس نے حیرانی ظاہر کی۔
میرے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''تمھاری سمجھ میں نہیں آنا۔ اس تشدد کے پسِ پردہ طویل وجوہات ہیں۔ انیس سو سینتالیس کی آزادی، اڑتالیس کی جنگِ کشمیر، پینسٹھ کا معرکہ، اکہتر کی لڑائی، کارگل کا جھگڑا اور بہت ساری سرحدی جھڑپیں ہیں۔''
''اگر سیدھے انداز میں وضاحت کر دیتے تو تمھارا کیا جاتا۔''
''چھوڑو مادام!.....
میری بات اتنی ضروری نہیں ہے
تسلی سے تم بات اپنی سنا لو
میں نے ایک دم اردو کا شعر پڑھا۔ اور ساتھ وضاحت کی۔ ''میرے مسائل تمھارے پلے نہیں پڑنا اس لیے اپنی سناؤ، کیا ہوا تھا؟''
وہ نفرت انگیز لہجے میں بولی۔ ''مسٹر شکلا سے ملاقات ہوئی ہے، بے غیرت، گھٹیا انسان بلیک میل کر رہا ہے۔''
''ذرا تفصیل سے مادام۔''
گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے دیوار سے ٹیک لگائی۔ ''سارے ڈرامے کے پسِ پردہ اس منحوس کے دو مقاصد ہیں۔ ایک تو وہ ایس آر ون کی خریداری کوڑیوں کے مول کرنا چاہتا ہے۔ ذرا سوچو پانچ ہزار پاؤنڈ کی رائفل کے پانچ سو پاؤنڈ لگا رہا ہے۔''
میں مستفسر ہوا۔ ''دوسرا مطالبہ؟''
''مجھے ایک ماہ اس کا کھلونا بننا ہوگا۔'' لورا کے چہرے پر گہری نفرت پھیل گئی تھی۔
گو دوسرا مطالبہ پورا کرنا کسی آزاد خیال یورپین لڑکی کو اتنا مشکل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مگر ہر کسی کی عزتِ نفس، انا اور خودداری ہوتی ہے۔ یورپ فریقین کی رضامندی سے جسمانی تعلقات کی آزادی کا علم بردار سہی، مگر زبردستی کرنے یا کسی عورت کو بلیک میل کرنے کی اجازت ان کا قانون بالکل بھی نہیں دیتا۔
میں نے مشورہ دیا۔ ''تم ڈیوڈ کو بیچ میں لا کر اس پر مقدمہ کر سکتی ہو۔''
''اس کے پاس کافی وڈیو کلپس موجود ہیں، جن میں میں تمھیں تربیت دے رہی ہوں۔ چند جگہوں پر یہ بھی اعتراف کیا گیا ہے کہ تمھاری تربیت کا مقصد مسٹر بکرم سنگھ کا قتل ہے شری پتی آرکیڈ کا فلیٹ جہاں سے ہم نے فائر کرنا تھا وہاں بھی خفیہ کیمرے نصب تھے۔ اور ہماری گفتگو بھی بالکل واضح ہے کہ ہم کیا کر رہے تھے۔ رائفل پر ہماری انگلیوں کے نشان ثبت ہیں۔ اس قصے میں سب سے اہم نقطہ یہ ہے کہ تم پاکستانی جاسوس ہو اور انڈیا میں تمھاری آمد غیر قانونی ہے۔ باقی اتنا تو تم اچھی طرح جانتے ہو گے کہ وڈیو میں سے ہمارے حق میں جانے والی باتیں کاٹ دی گئی ہیں۔''
میں نے حیرانی ظاہر کی۔ ''مگر ہمارا منصوبہ تو چھت سے فائر کرنے کا تھا۔ پھر انھوں نے کمرے میں کیوں کیمرے

لگائے۔"

انھوں نے چھت اور کمرہ دونوں جگہوں پر کیمرے نصب کیے تھے، کیوں کہ وہ ہماری ہر وقت کی گفتگو ریکارڈ کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ میرے خلاف زیادہ سے زیادہ ثبوت حاصل کر سکیں۔"

"اب کیا سوچا ہے؟"

وہ برہم ہوئی۔ "سوچنے کے قابل غلیظ سؤر نے چھوڑا کہاں ہے۔"

میں نے چوٹ کی۔ "سچ کہتے ہیں، لالچ بری بلا ہے۔"

وہ جیسے تڑپ اٹھی تھی۔ زخمی لہجے میں بولی۔ "ریبا!.....تم میرے حالات سے ناواقف ہو۔"

ایسا ہی کچھ ایسا وہ پہلے بھی کہہ چکی تھی۔ میں نے طعنہ زنی سے گریز کرتے ہوئے پوچھا۔ "ڈیوڈ سے مشورہ کیا ہے؟"

وہ افسردگی سے بولی۔ "اسے شکلا سب کچھ بتلا چکا ہے۔ مجھ سے بھی مختصر گفتگو ہوئی۔ پھیکے لہجے میں تسلی دینے کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔"

"اب کیا ہوگا؟" میں نے الفاظ بدل کر سوال دہرایا۔

"اس کا مطالبہ تسلیم کرنے کی صورت ہم صرف فٹ پاتھ پر نہیں آئیں گے بلکہ سلاخوں کے پیچھے جانا پڑے گا۔ ہمارے پاس پانچ ہزار تیار شدہ رائفلیں موجود ہیں اور شکلا دس ہزار رائفلوں کا مطالبہ کر رہا ہے۔ جو ناممکن ہے۔ کیوں کہ پہلی کھیپ کی تیاری ہی میں کمپنی گردن گردن قرض کی دلدل میں دھنس چکی ہے۔ مزید پانچ ہزار رائفلیں کیسے تیار ہو سکیں گی۔" لورا نے شکلا کے صرف پہلے مطالبے پر روشنی ڈالی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "ڈیوڈ تمھارے لیے کس حد تک جا سکتا ہے۔"

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولی۔ "عملی زندگی میں ماضی کے دعوں کو کم ہی پورا ہوتے دیکھا گیا ہے۔"

"پھر بھی تمھارا ساتھی ہے، یقیناً کچھ سوچ کر ہی تم نے حصے دار (پائنر) بننا قبول کیا ہوگا۔"

اس کے ہونٹوں پر مجوبانہ تبسم ابھرا۔ "محبت کا دعوے دار ہے۔"

"پھر تو اچھے کی امید رکھنا چاہیے۔"

"شکلا کا مطالبہ اس کے بس سے باہر ہے۔ وہ بے چارہ تو میری کامیابی کا منتظر تھا۔ اور ہمیں لینے کے دینے پڑ گئے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "بکرم سنگھ کے بارے اسے اعتماد میں لیا تھا۔"

لورا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پھر اس کا گلہ کرنا نہیں، نقصان میں شامل ہونا بنتا ہے۔"

وہ افسردگی سے بولی۔ "وہ انکار نہیں کر رہا، بس پریشان لگ رہا تھا۔ ہم پہلے ہی مالی پریشانی کا شکار تھے، شکلا نے نیا بم سر پر پھوڑ دیا ہے۔"

میرے منہ سے پھر حقیقت پھسلی۔ "سچ کہوں تو یہ بے صبری کا انجام ہے۔"

وہ خفگی سے بولی۔ "جب اصل بات معلوم نہ ہو تو بکواس نہیں کرنا چاہیے۔"

"مجھے سخت بھوک لگی ہے۔" میں نے موضوع تبدیل کیا۔

"میں شکلا کے ساتھ زہر مار کر آئی ہوں، مگر چند نوالے سے زیادہ نہیں لے پائی کہ بھوک ہی اڑ گئی ہے۔"

میں نے پھل جڑی چھوڑی۔ "کہیں دوسرے مطالبے پر عمل درآمد تو شروع نہیں ہو گیا۔"

اس نے آنکھیں نکالیں۔ ''سوائے بکواس کے تمھیں کچھ سوجھتا بھی ہے۔ افغانستان محاذ پر بھی تمھارے ہونٹوں سے صرف یہی بکواس نکلتی تھی، اب تو اپنی حالت پر رحم کھالو۔''

میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر اس کے علاوہ کیا سوجھ سکتا ہے۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''مجھے تیراکی کے لباس (سوئمنگ سوٹ) میں دیکھ کر تو رخ موڑ لیتے تھے۔''

''انگور رسائی سے دور ہوں تو انھیں کھٹا کہنا پڑتا ہے۔'' میں نے قہقہہ لگانے کی کوشش کی مگر جسم میں درد کی لہر دوڑ گئی تھی۔ کیوں کہ زور سے ہنسنے کی وجہ سے بالائی جسم کی جلد متحرک ہو جاتی ہے۔ میری آہ سنتے ہی اس نے مطعون کیا۔

''ہنسنے کی طاقت تو ہے نہیں اور کیا کرلو گے۔''

میرے جواب دینے سے پہلے قدموں کی چاپ ابھری۔ امید لگی کہ شاید رات کا کھانا آ گیا ہے۔ دن کا کھانا تو مار کٹائی کی نذر ہو گیا تھا۔ اور پھر بلب کی پیلی روشنی میں آنے والے کو دیکھتے ہی دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ وہ جلادوں کا ٹولہ تھا۔ کھانے سے پہلے ہی اگلی تفتیش کا وقت ہو گیا تھا۔ یا شاید وہ مجھے بھوکا رکھنا چاہتے تھے۔ اور بھوک بھی تو اذیت و تکلیف کا دوسرا نام ہے۔

بے چوں و چرا کیے میں ان کے ہمراہ چل پڑا۔ لورا ترحم آمیز نظروں سے مجھے گھورتی رہ گئی تھی۔

میرے سر پر نقاب چڑھا کر ہتھکڑی پہنائی اور دھکیلتے ہوئے عقوبت خانے کی طرف لے چلے۔

پکا پتا تو نہیں ہے، بس اندازہ ہے کہ کئی سالوں پر محیط وقت تھا۔ شاید پڑھنے والوں کو حیرانی ہو کہ ایک رات کئی سال کیسے طویل ہو سکتی ہے۔ لیکن جن پر گزری ہے وہ ضرور اتفاق کریں گے۔ واپسی اپنے قدموں پر نہیں ہوئی تھی۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب لورا کے مسلسل..... ''ریجا..... ریجا.....'' پکارنے پر آنکھ کھلی۔ جسم میں تکلیف کے ساتھ معدے میں بھی اینٹھن ہو رہی تھی۔ ناشتے کے لوازمات توقے کے ذریعے ہی خارج ہو گئے تھے۔ اب آنتیں بھوکی گائے کی طرح ڈکرا رہی تھیں۔

میں بہ مشکل سیدھا ہوا اور دیوار سے پیٹھ ٹیک دی۔

''بھوک لگی ہو گی؟'' لورا نے ہمدردی ظاہر کی۔

میرے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''جب تمھارے پاس دوا ہی نہیں ہے تو استفسار کا فائدہ؟''

''یہ لو۔'' اس نے سلاخوں سے ہاتھ گزار کر میری طرف بڑھایا۔ جس میں روٹیاں تھیں۔

میرے چہرے پر حیرانی نمودار ہوئی۔ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میرے لیے کھانا آیا تھا، بھوک نہیں تھی، تبھی تمھارے لیے چھپا لیا۔''

نجانے وہ کتنی دیر سے روٹیاں و سالن چھپائے بیٹھی تھی۔ میرے چہرے پر شکر گزاری ابھری اور سلاخوں سے ہاتھ گزار کر میں نے روٹیاں پکڑ لیں۔ سبزی کا سالن اس نے روٹیوں پر انڈیل دیا تھا۔ ٹھنڈا اٹھا رو بے مزہ کھانا بھی مجھے بہت لذیذ محسوس ہوا تھا۔

''شکریہ مادام۔'' کھانا کھا کر میں نے شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھا کہ احسان کرنے والے کا حق ہے اس کی نوازش کو سراہا جائے۔

وہ فکرمندی سے بولی۔ ''مجھے نہیں لگتا تم زیادہ دن جی پاؤ گے۔''

''اچھا ہے تمھیں بدلہ لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ خواہ مخواہ مجھے قتل کرنے کو مارا مارا پھرنا پڑتا۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔''

''مذاق کے علاوہ کیا ہی کیا جا سکتا ہے۔''

لمحہ بھر سوچ کر اس نے مشورہ دیا۔''تم بھاگنے کی کوشش کر سکتے ہو۔''

میں بے بسی سے بولا۔''میری حالت ایسی نہیں ہے کہ ایک ساتھ تین آدمیوں کا مقابلہ کر سکوں، البتہ کوئی ساتھ دے تو دوسری بات ہے۔''

میرا طنز نظر جانتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلایا۔''فی الحال مجھے تو بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''تو تم نے شکلا کی شرائط ماننے کا ارادہ کر لیا ہے۔''

وہ خفگی سے بولی۔''ایسا کب کہا۔''

میں نے حقیقت کھولی۔''کیا خیال ہے وہ تمھاری مرضی کا منتظر رہے گا، پہلے مطالبے کی تکمیل تمھارے ہاتھ میں سہی، دوسرا مطالبہ وہ بہ زور بازو پورا کر سکتا ہے۔''

وہ جلدی سے بولی۔''برطانیہ کی آزاد شہری ہوں، جواب دہی اسے مشکل میں ڈال دے گی۔''

''اگر تمھیں آزاد کرنے کا ارادہ ہوا تو تم سچ کہہ رہی ہو۔''

''کہنا کیا چاہتے ہو۔''اس کے چہرے پر تفکر ابھرا۔

میں صاف گوئی سے بولا۔''جن کے پاس ضمیر نہ ہو ان کا کچھ بھی کرنا غیر متوقع نہیں ہوتا۔''

''ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔''اس نے سختی سے جھٹلا دیا تھا۔

میں خاموش ہو گیا۔وہ بھی گہری سوچ میں کھو گئی تھی۔کھانا کھانے کی وجہ سے مجھ پر خماری چھانے لگی۔میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔پلوشہ دھم سے کود کر نگاہوں کے سامنے آئی اور میرا سر گود میں رکھ لیا۔ساتھ ہی ملائم ہاتھ میرے زخموں پر پھیرنے لگی۔اس عنایت کے بعد نیند کس کم بخت کو نہ آتی۔

—●—

صبح خلاف توقع مجھے ناشتا ملا تھا۔ شاید چوبیس گھنٹوں میں میرا راشن، دو توس اور ایک ابلا ہوا انڈا ہی مقرر ہوا تھا۔ ناشتے کے تھوڑی دیر بعد ہی میرا بلاوا آ گیا۔ شاعر نے کہا تھا.....

ع درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

مگر میرا درد شاید حد سے نہیں گزرا تھا، تبھی آئے روز تکلیف و اذیت کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ بلا ناغہ رات دن تفتیش جاری تھی۔ انھیں تیزی نہیں تھی کہ بے صبری کا مظاہرہ کرتے۔ جلد ہی وہ مرحلہ آنے والا تھا جب اذیت کی فراوانی سے میرے حواس ساتھ چھوڑ جاتے۔ تب اول فول بکتے ہوئے میں اصل مشن کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ ضرور پھوٹ دیتا۔ بلاشبہ پہلے کرن چاولہ نے مجھے اسی لیے آزاد چھوڑا تھا کہ میرے مشن کا پتا چلے اور میرے ذریعے دوسرے جاسوسوں تک بھی رسائی پا لے۔ لیکن بعد میں جانے کیوں مجھے بکرم سنگھ والے معاملے میں الجھا دیا گیا تھا۔ اس بارے میرا ذہن کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔

عقوبت خانے سے واپسی بے ہوشی کی حالت ہی میں ہوئی تھی۔ آنکھیں، لورا کے..... ''ریجا..... ریجا.....'' پکارنے پر کھلی تھیں۔ وہ مجھے کافی خوش نظر آئی، میں نقاہت سے لیٹا اس کی باتیں سننے لگا۔ وہ زور و شور سے نئے معاہدے کا بتا رہی تھی۔ شکلا نے ایس آر ون کو اس کی اصل لاگت میں خریدنے کا عندیہ دے دیا تھا۔ جو فی رائفل دو ہزار پاؤنڈ بن رہا تھا۔ اور رائفلوں کی تعداد بھی پانچ ہزار کر دی تھی۔

''اور دوسرا مطالبہ؟'' میں پوچھے بنا نہیں رہ پایا تھا۔

وہ اطمینان سے بولی۔ ''میں نے سختی سے انکار کر دیا ہے۔''

''اور وہ مان گیا؟'' مجھے حیرانی ہوئی تھی۔

''جانتے ہو، اسے سودے میں کتنا منافع مل رہا ہے۔ پانچ ہزار پاؤنڈ کی رائفل دو ہزار پاؤنڈ میں خرید رہا ہے۔ اور آرمی سے وہ پانچ ہزار پاؤنڈ ہی وصول کرے گا۔ گویا تین ہزار پاؤنڈ اسے ایک رائفل میں بچ رہے ہیں۔ پانچ ہزار رائفلوں میں کتنی بچت ہو گی۔'' بلاشبہ ہندوستانی کرنسی میں وہ معاوضا ڈیڑھ سو کروڑ سے بھی زیادہ بنتا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''ڈیوڈ سے بات ہوئی؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اصل لاگت کی وصولی ہی پر مطمئن ہے۔''

دوپہر کا کھانا وہ کھا کر آئی تھی۔ میرے نصیب میں تو صرف صبح ہی کا ناشتا لکھا تھا اس لیے پیٹ کے واویلے پر کان دھرے بغیر خاموشی سے لیٹا رہا۔

رات کے کھانے سے پہلے حسب معمول جلاد مجھے لینے پہنچ گئے تھے۔ یوں جیسے نالائق طالب علم کو ساتھی طلبہ زبردستی کتب لے جاتے ہیں۔ عقوبت خانے تک وہ ان نئی ایذاؤں کے بارے بحث و تکرار میں لگے رہے جو انھوں نے آج کے

لیے سوچی تھیں۔ میرا زخموں سے چور بدن نت نئے مصائب اور تکالیف سے آشنا ہو رہا تھا۔ مگر نہ احتجاج کا حوصلہ تھا اور نہ بچنے کی تدبیر۔ چیخنے چلانے سے بھی کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔ البتہ یہ اور بات کہ چیخ چیخ کر میرا گلا بیٹھ جاتا تھا۔ اور یہ چیخ و پکار ان کے لیے باعث سکون و اطمینان ہوتی تھی۔

دوران تفتیش میں کئی بار بے ہوش ہوتا۔ ان کے غیر انسانی تشدد نے اب میری مدافعاتی قوت نچوڑ لی تھی۔ صرف زندہ رہنے کا حوصلہ اور دوبارہ سے اپنی پلوشے کو ملنے کی امید تھی کہ میں ڈٹا ہوا تھا۔ اب وہ باقاعدگی سے خوابوں میں آنے لگی تھی۔ شاید بچھڑنے کا وقت قریب تھا یا حوصلہ بڑھانے آتی تھی۔ اس رات بھی میری واپسی ہوش و خرد سے بیگانہ حالت میں ہوئی تھی۔

پلوشے حسب معمول خوشی سے چہکتے و کھل کھلاتے میرے پاس پہنچی تھی۔ میں جسم پر چادر لپیٹے لیٹا تھا۔ تکیے پر کہنی ٹیکے وہ میرے کانوں میں رس انڈیلتی رہی۔ جانے کون کون سے پرانے قصے اسے یاد آ رہے تھے۔ دوران گپ شپ اچانک میرے جسم سے کپڑا ہٹا، میرے زخم دیکھتے ہی وہ تڑپ اٹھی تھی۔

''ی..... یہ..... کیا ہے راجو.....'' وہ ہکلا گئی تھی۔

''کچھ نہیں چندا، معمولی سے زخم ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دینا چاہی۔

''وہ اتنا ظلم کر رہے ہیں میرے راجو پر، میں انھیں چھوڑوں گی تو نہیں۔'' دانت پیسے ہوئے وہ سسک پڑی تھی۔ اور پھر اس کی سسکیاں بلند ہونے لگیں۔

''پلوشے..... پلوشے.....'' اسے پچکارتے ہوئے میں نے ہاتھ بڑھایا، نجانے کس زخم میں کھچاؤ آیا تھا کہ میرے منہ سے بلند کراہ خارج ہوئی اور آنکھ کھل گئی۔ لیکن پلوشہ کی سسکیاں اب تک کانوں میں گونج رہی تھیں۔ آج لورا کا ''ریجا ..... ریجا.....'' سنے بغیر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ شاید وہ نیند میں تھی۔

بازوؤں پر زور دے کر میں اٹھ بیٹھا، تبھی سسکیوں کی آواز زیادہ صاف سنائی دینے لگی۔ وہ لورا تھی، گھٹنوں میں سر دیئے سسک رہی تھی۔

''کیا ہوا..... رو کیوں رہی ہو؟'' سلاخوں کے قریب ہو کر میں نے آواز دی۔

اس نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر مظلومیت سے مجھے گھورا۔ میرا دل بری طرح دھڑک اٹھا تھا۔ سفید گالوں پر دانتوں کے نشان یوں ثبت تھے جیسے کسی درندے سے پالا پڑا ہو۔ یقیناً میری غیر حاضری میں اس پر قیامت بیت چکی تھی۔ میرا اندیشہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ شکلا جیسے گھٹیا انسان سے اس کے علاوہ امید بھی کوئی نہیں کی جا سکتی تھی۔

''یہ کیسے ہوا؟'' گو اس کا چہرہ چیخ چیخ کر اعلان کر رہا تھا کہ اس پر کون سی قیامت ٹوٹ چکی ہے، لیکن اس کے علاوہ مجھے کچھ سوجھا ہی نہیں تھا۔

''میں اسے چھوڑوں گی نہیں۔ کسی بھی قیمت، کسی بھی صورت اسے قتل ضرور کروں گی۔'' دانت پیستے ہوئے وہ غضب ناک ہوئی۔

اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اپنے اندازوں کی درستی پر داد طلب کر سکتا۔ میں پچکار کر اس کا حوصلہ بڑھانے لگا۔ عورت مشرقی ہو یا مغربی، مرد کی درندگی کا سامنا کرتے ہوئے بے چاری ٹوٹ، بکھر جاتی ہے۔ شکلا جیسے مرد ذہنی مریض ہوتے ہیں۔ اور اس کے مرض کی شدت مجھے لورا کے چہرے پر دکھائی دے رہی تھی۔ نجانے باقی جسم کے ساتھ درندے نے کیا کچھ سلوک کیا ہوگا۔

میرے مسلسل تسلی دینے اور حوصلہ بڑھانے پر وہ کچھ سنبھلی۔ اور جو کہانی سنائی اس کا لب لباب یہی تھا کہ میرے

جانے کے تھوڑی دیر بعد اس کا بلاوا آ گیا تھا۔ اس نے معمول کی ملاقات تصور کیا۔ مگر اسے لے جا کر ایک بیڈ پر باندھ دیا گیا۔ بعد میں نشے میں دھت شکلا آیا اس کے ماضی کا رویہ یاد دلا کر اپنی ہر من مانی پوری کی۔ اور ساتھ یہ بھی اعلان کیا کہ اگلے ایک ماہ اسے مسلسل شکلا کی درندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اب لورا کو وہاں سے بھاگنے کی سوجھ رہی تھی۔ لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ ہمارے پاس کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ قید خانے کے دروازے وہ ایک ساتھ نہیں کھولتے تھے کہ ہم مل کر محافظوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے تھے۔ لورا پھر بھی مجھ سے بہتر تھی کہ ہاتھا پائی کر سکتی تھی۔ میرے بدن میں تو مقابلے کی سکت نہ ہونے کے برابر تھی۔ بقیہ رات ہم مختلف منصوبے سوچتے اور رد کرتے رہے۔ تالے کھولنے کے ہمیں کئی طریقے سکھائے گئے تھے، لیکن اس کے لیے کم از کم ایک مضبوط تار کا حصول ضروری تھا۔ ہمارے پاس تو انھوں نے لوہے کی کوئی چیز ہی نہیں چھوڑی تھی۔ کھانا بھی پلاسٹک کے برتنوں میں آتا تھا۔

کافی دیر مغز ماری کے بعد ہم نے وقتی طور پر ہار مانی اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔ صبح کے چار بج چکے تھے۔ بھوک کی شدت، اور جسمانی تکالیف میں سونا تو محال تھا، بس ہلکی غنودی آ جاتی تھی۔ جو چند لمحوں کے لیے درد سے افاقے کا باعث بنتی۔ سونے جاگنے کی کیفیت میں ناشتا لانے والوں کے قدموں کی چاپ ابھری۔ میں اٹھ کر بیت الخلاء کی طرف بڑھ گیا۔ تازہ دم ہو کر آیا اور ناشتے کو جڑ گیا۔ لورا نے اپنی ٹرے میری طرف کھسکائی اور صرف چائے کی پیالی اٹھا کر چسکیاں لینے لگی۔ بدمزہ چائے پینا بھی اس کی مجبوری بن گئی تھی۔

پیٹ میں کچھ جانے کے بعد مجھ پر خماری چھانے لگی۔ لورا نے بھی دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد جلادوں نے آ جانا تھا۔ لیکن نہ سونے سے ان کا آنا ٹل نہیں سکتا تھا اس لیے میں نے آنکھیں میچ لی تھیں۔

قدموں کی چاپ سنتے ہی میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ شاید جلاد پہنچ گئے تھے۔ لیکن آنکھیں کھلتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ میرے اندیشے بے بنیاد ثابت نہیں ہوئے تھے۔

وہ ممتا دیدی تھی۔ تین افراد کے گھیرے میں زندان کے قریب آئی۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ درندے معصوم لڑکی تک پہنچ گئے تھے۔ یقیناً اب میں اپنی ہٹ پر قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ مظلوم لڑکی کو بچانے کو میرا سچ اگلنا ضروری ہو گیا تھا۔ اور سچ کا پتا چلتے ہی دھیرندر شکلا پہلی فرصت میں میرا عدم آباد کا ٹکٹ کٹوا دیتا۔ ایک لمحے میں، دماغ نے مستقبل کا تجزیہ کر لیا تھا۔ میں بے قرار ہو کر کھڑا ہو گیا۔

وہ سلاخوں کے سامنے آ کر رکی۔ نظریں میرے وجود پر گڑی تھیں۔ وہ کالے رنگ کے تھری پیس سوٹ میں تھی جو اس پر خوب جچ رہا تھا۔ نجانے درندے ان کا کیا حشر کرنے والے تھے۔ ایک پاکستانی جاسوس کو پناہ دینے والی کسی رعایت کی حق دار نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کی معذوری بھی ظالموں کے لیے کوئی معنی نہ رکھتی۔ میں نے دل ہی دل میں ان کی مدد کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انھیں بچانے کی خاطر میں نے کرن کے سامنے سارا راز کھولنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

''دروازہ کھولو۔'' مجھے گھورتے ہوئے اس کی پراعتماد آواز ابھری۔ میرے دماغ کو جھٹکا لگا، کیوں کہ وہ تو اندھی تھی اور اندھے یوں کسی سے نظریں نہیں ملا سکتے۔ اس کے عقب میں کھڑے افراد کا انداز بھی مودبانہ تھا۔ کسی کے ہاتھ میں نہ تو ہتھیار تھا اور نہ ممتا دیدی ان کی قیدی لگ رہی تھیں۔

ایک دم جیسے انکشاف ہوا، وہ تو اس ڈرامے کا خصوصی کردار تھیں۔ ورنہ کیسے ممکن تھا کہ اتنا عرصہ ان کے گھر گزارنا ایجنسی کی نظر سے اوجھل ہوتا۔ انھوں نے مہینا بھر مجھے نظر میں رکھا، حقیقت اگلوانے کی کوشش کی، بہن بن کر اتنا بڑا

دھوکا دیا۔ فوراً ہی میری نگاہ اپنی گھڑی پر پڑی۔ یقیناً وہ راکھی نہیں، نشان دہی کرنے کا آلہ (انڈیکیٹر) تھا۔ جس کی وجہ سے میں ہمیشہ سے ان کی نظروں میں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گھڑی مجھ سے نہ لی گئی۔ ورنہ قیدی کے پاس گھڑی کون چھوڑتا ہے۔ یہ بات کئی بار میرے دماغ میں کھٹکی تھی لیکن دھیان نہیں دے سکا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی وہ بے تابی سے اندر گھسیں۔ ''راج۔'' وارفتگی سے کہتے ہوئے اس نے میرا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر ماتھے پر بوسا دیا۔ وہ شفقت بھرا انداز میری روح تک کو گھائل کر گیا تھا۔ اتنے مقدس رشتے کی آڑ میں اتنا بڑا دھوکا دیا تھا۔ میں بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے انھیں گھورتا رہا۔

نظریں میرے جسم پر پھیلے چھالوں پر پڑیں، سیاہ آنکھوں میں اضطراب و اذیت ہلکورے لیتی محسوس ہو رہی تھی۔

''سدھیر، تفتیش کون کر رہا ہے؟'' انھوں نے مڑ کر دیکھا۔

''استاد گوتم، مادام!''

''تفتیش تو کسی اور نے کرنا تھی نا؟'' ان کے لہجے میں دکھ و اذیت بھری تھی۔

مسئول نے سر جھکا لیا تھا۔ انھوں نے ایک نمبر ملا کر موبائل فون کان سے لگا لیا۔ ''تم نے اچھا نہیں کیا۔'' لہجے میں بڑی بھرا دکھ پوشیدہ تھا۔ ''تم نے وعدہ کیا تھا۔''

نجانے دوسری طرف سے کیا کہا گیا، وہ چلائیں۔ ''تم صرف بکواس کر سکتے ہو اور کچھ نہیں۔'' اور الوداعی کلمات کہے بغیر رابطہ منقطع کر لیا۔

میری طرف رخ موڑتے ہی ان کی آنکھوں میں پشیمانی بھرا اضطراب نمودار ہوا۔ ہونٹوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے وہ دھیمے لہجے میں بولیں۔ ''تمھارے لیے کھانا لائی تھی۔ سوچا اپنے ہاتھوں سے راج کو کھلاؤں گی۔''

''ایسی گھٹیا حرکت کیوں کی۔'' مجھے اپنی آواز بے گانی لگی تھی۔

''چھوٹے! میں سب بتا دوں گی، پہلے تم کھانا کھا لو۔'' ٹفن اٹھائے شخص کو قریب آنے کا اشارہ کر کے وہ میرے نزدیک ہوئی۔

''دور رہو۔'' میں نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انھیں پیچھے دھکیلا۔

''اوئے، مادام سے بدتمیزی کرتا ہے۔'' سدھیر جھپٹنا، مگر اس کے مجھ تک پہنچنے سے پہلے ممتا جی کی ٹانگ حرکت میں آئی، بھرپور لات کھا کر وہ دیوار سے جا ٹکرایا تھا۔

وہ دھاڑیں۔ ''کسی نے چھونے کی بھی کوشش کی تو میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔ دفع ہو جاؤ تینوں۔''

وہ کان دباتے ہوئے باہر نکل گئے تھے۔

''اپنی دیدی سے بدتمیزی کرو گے۔'' شفقت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے وہ دوبارہ قریب ہوئیں۔

''پلیز مادام آپ چلی جائیں۔'' میں نے رخ موڑ لیا تھا۔

''اپنی دیدی کو رلا کر خوشی ملے گی۔'' انھوں نے مجھے بازو سے پکڑ کر زبردستی سیدھا کیا۔

''آپ نے مجھے دھوکا دیا ہے، جذباتی استحصال کیا ہے میرا۔ کم از کم بہن کر دھوکا نہ دیتیں۔''

وہ دکھی ہوئیں۔ ''دیدی تم نے بنایا تھا چھوٹے! بھول گئے۔''

''آپ حقیقت بتا سکتی تھیں۔'' کوشش کے باوجود میں انھیں تم نہیں کہہ پا رہا تھا۔ مجھے ہزاروں گلے شکوے تھے۔ ہم دو ازلی دشمن تھے۔ مگر نادانستگی میں غلط رشتہ جوڑ بیٹھے تھے۔ اور جس طرح وہ میری حالت دیکھ کر پیچ و تاب کھا رہی تھیں، صاف ظاہر تھا کہ انھیں چھوٹے بھائی کی تکلیف پر اذیت ہو رہی تھی۔ اب میری الجھن بھی دور ہو گئی تھی کہ کرن

چاولہ کس سفارش کا ذکر کر رہا تھا۔ اس کی مجبوری ممتا دیدی کی صورت میرے سامنے کھڑی تھیں۔ یقیناً ان کے درمیان کوئی خاص تعلقات تھے، تبھی تو ممتا باجی نے اسے اتنے سخت الفاظ میں برا بھلا کہا تھا۔

میں نے چپ سادھ لی۔ وہ نادم ہوئیں۔ ''اپنی دیدی کو مجبور سمجھ کر معاف کر دو۔''

میں کراہتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔''

''مجبور ہو گئی تھی۔ تمھیں دیکھنے کو دل کر رہا تھا، کسی اور کی تسلی سے مطمئن نہیں تھی تبھی چلی آئی۔''

''ٹھیک ہے، دیکھ لیا، اب چلی جائیں۔''

وہ لجاجت سے بولیں۔ ''کھانا کھالو پھر چلی جاؤں گی۔''

''بھوک نہیں ہے۔''

''نہیں۔'' انھوں نے منہ بسورا۔

''آپ ایک ناپائیدار رشتے کے قیام پر مصر ہو رہی ہیں۔'' میں نے انھیں آئینہ دکھایا۔

''زبردستی تو نہیں کر رہی، دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ جانتے ہو نا میرے راجیو نے تمھارے روپ میں دوسرا جنم لیا ہے۔'' اس نے کئی بار کی کہی بات دہرائی۔ میں اس کے چھوٹے بھائی کی تصویر دیکھ چکا تھا۔ ہلکی سی مشابہت ضرور تھی، مگر وہ بالکل میرے جیسا نہیں تھا۔ بلکہ وہ بارہ تیرہ سال کا تھا کہ ایک حادثے میں گزر گیا تھا۔ وہ آج تک اسے نہیں بھلا پائی تھی۔

''آپ اچھی طرح جانتی ہیں میں پاکستانی ہوں۔''

وہ تلخی سے بولیں۔ ''پاکستانیوں سے محبت کرنا جرم ہے کیا۔''

''دیدی سمجھنے کی کوشش کریں۔''

ان کے چہرے پر فاتحانہ تبسم ابھرا۔ ''جتنا کوشش کر لو، اپنی دیدی کی محبت کو دل سے نہیں کھرچ سکتے۔''

میں معترض ہوا۔ ''آپ میرے انجام سے واقف ہیں، پھر کیوں ایک نئے غم کو اپنا سینہ کشادہ کرنا چاہتی ہیں۔''

وہ عزم سے بولیں۔ ''تمھیں مرنے تو نہیں دوں گی۔''

میں نے حقیقت اگلی۔ ''مجھے نہیں لگتا آپ اتنی بااختیار ہیں۔''

نظریں چراتے ہوئے انھوں نے امید ظاہر کی۔ ''ماؤں، بہنوں کی پرارتھنا (دعا) میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔''

دونوں آمنے سامنے کھڑے مصروف گفتگو تھے۔ ممتا دیدی امید بھری نظروں سے مجھے گھور رہی تھیں۔ اپنے غلط فعل کی ان کے پاس کوئی توجیہہ نہیں تھی۔ لیکن رویہ چیخ چیخ کر ان کی محبت و بے بسی کا اعلان کر رہا تھا۔ ان کی شفقت کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے میں دھیرے سے بولا۔

''مجھے سخت بھوک لگی ہے۔''

وہ شفقت سے بولیں۔ ''بیٹھو نا؟، دیدی اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلائے گی۔''

میں بیٹھ گیا۔ وہ میری پسند کا کھانا بنا لائی تھیں۔ انھوں نے خود بھی میرے ساتھ ہی کھانا کھایا اور پھر درد کش گولیوں کی خوراک مجھے کھلا دی۔ ساتھ ہی بعد میں کھانے کو بھی گولیوں کا ایک پتا دے دیا تھا۔

''شکریہ دیدی۔'' میں نے رسم نبھائی۔

''شرمندہ کر رہے ہو۔'' متبسم ہو کر انھوں نے میرا کان پکڑ لیا تھا۔ ان کی پختہ عادت تھی۔ خفگی و محبت ہر دو صورت وہ میرا کان پکڑ لیتیں۔

میں منمنایا۔ ''ایسی گستاخی کر سکتا ہوں۔''

''یہ گھڑی واپس کرو۔'' کہتے ہوئے وہ میری گھڑی کھولنے لگیں۔

میں ہنسا۔''آج ہی اس گھڑی کا راز افشا ہوا ہے۔''

تبصرہ کیے بغیر وہ ایک کالا دھاگا میری کلائی پر باندھنے لگیں۔شاید ادھوری رسم کو اب پورا کر رہی تھیں۔

دھاگا باندھ کر انھوں نے خفیف انداز میں پوچھا۔''ایک بات مانو گے۔''

''آپ اچھی طرح جانتیں ہیں کیا منوا سکتی ہیں۔''

وہ مصر ہوئیں۔''جو نہیں منوا سکتی اب وہ منوانا چاہتی ہوں نا۔''

میں نے تحمل سے کہا۔''بولیں، سننے کے بعد ہی کچھ طے کر سکوں گا۔''

''سچ بتا کیوں نہیں دیتے۔وعدہ کرتی ہوں تمھیں بچالوں گی۔''

''یہ وعدہ حکومت کے ایسے عہدہ دار کا ہے جو ذاتی وعدوں کو پورا کروانے کا اختیار نہیں رکھتا۔''

''اپنی دیدی سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔''

میں تلخی سے بولا۔''حقیقت تو یہ ہے کہ میں سچ بتا چکا ہوں۔اب یہ بتائیں آپ کو کیسے یقین آئے گا میرے پاس بتانے کو کچھ اور نہیں ہے۔''

'کہا تھا نا اپنے دیش لوٹ جاؤ.....اچھی طرح سمجھایا تھا مگر تم نہ مانے۔''لگا وہ گڑے مردے اکھیڑ رہی ہیں۔

''اب پچھتانے سے گیا وقت نہیں لوٹ سکتا دیدی۔''میں نے بہ ظاہر غلطی کا اعتراف کرنا ضروری سمجھا۔

''چلتی ہوں.....اپنا بہت زیادہ خیال رکھنا۔اور میں بات کر کے تمھاری جان چھڑانے کی کوشش کرتی ہوں۔پہلی فرصت میں اپنے آدمیوں سے رابطہ کر کے پاکستان لوٹنے کی کرو۔''وہ بین السطور مجھے کریدرہی تھیں کہ اگر میرے رابطے کسی سے ہیں تو اعتراف کرلوں۔

''کرن آپ کا کیا لگتا ہے؟''میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''کچھ نہیں لگتا کمینہ.....''ان کے ہونٹوں پر مدھم تبسم ابھرا جو باور کر رہا تھا کہ وہ ان کا سب کچھ تھا۔

میں نے تصدیق چاہی۔''روہن گجرال ایک فرضی نام تھا نا؟''

''کرن کا اصل نام روہن ہی ہے۔''محجوب انداز میں کہتے ہوئے انھوں نے قریب ہو کر میرے ماتھے پر بوسا دیا اور جونہی مڑیں، میری نظر ان کے بالوں میں اڑسی لوہے کی باریک تار کی بنی چٹیوں پر پڑی۔میں ایک دم بولا۔

''ممتا دیدی!''

وہ رک کر پلٹیں۔آنکھوں میں استفسار اور چہرے پر خفت تھی، جو اعلان کر رہی تھی کہ وہ میری ہر قسم کی مدد سے قاصر تھیں۔

میں نے قریب ہو کر دونوں ہاتھ ان کے سر پر رکھے۔''پلیز، یہاں آ کر خود کو تکلیف نہ دیا کریں۔جانتا ہوں آپ بے بس ہیں۔جب تک زندگی ہے، آپ میری دیدی ہی رہیں گی۔پاکیزہ، مقدس، معصوم اور بہت زیادہ شفقت کرنے والیں۔میں چاہوں بھی تو آپ سے ناراض نہیں ہو سکتا۔اور یہ بھی جانتا ہوں میری گرفتاری میں آپ کا کوئی کردار نہیں ہے۔نہ آپ کے بس میں میری آزادی ہی ہے۔خود کو کبھی قصوروار اور دوشی نہ سمجھنا۔کیوں کہ ضروری نہیں جو آپ چاہتی تھیں، سب ویسا ہی چاہیں۔اپنا بہت سا خیال رکھنا۔''ان کے بالوں پر بوسا دے کر میں پیچھے ہو گیا۔اس دوران میرے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اپنا کام کر چکی تھیں۔

آنکھوں پر الٹا ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ ایک دم مڑیں اور باہر نکل گئیں۔یقیناً وہ دہرے احساسات کا شکار

تھیں۔ بھارت ماتا سے محبت و وفاداری ان کے خون میں شامل تھی۔ اور مجھے نادانستگی میں اس بھائی کا درجہ دے بیٹھی تھیں جس نے کبھی ان کے ہاتھوں میں دم توڑا تھا۔

جدید ساخت کی بالوں کی چمٹی میرے دائیں ہاتھ سے جیب میں منتقل ہوگئی تھی۔ چمٹی کی بناوٹ میں مضبوط فولاد کی تار استعمال ہوئی تھی۔ امید تھی اس سے قفل کھل جاتا۔

تینوں محافظ انتظار کر رہے تھے۔ ان کے نکلتے ہی ایک نے دروازہ قفل کر دیا۔ لورا پر انھوں نے سرسری نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کی تھی۔

''کیا معاملہ تھا۔'' ان کے جاتے ہی لورا نے بے صبری ظاہر کی۔ میں نے مختصر الفاظ میں ممتا دیدی کا تعارف کرا دیا۔

وہ مایوسی سے بولیں۔ ''موقع تھا، تم اسے یرغمال بنا کر بھاگنے کی کوشش کر سکتے تھے۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''انھیں اعتماد تھا تو اپنے آدمیوں باہر بھیجا، ورنہ دشمن ملک کے جاسوس کے ساتھ اکیلا بیٹھنے کا خطرہ کون مول لیتا ہے۔''

لورا وثوق سے بولی۔ ''وہ بہن بن کر تم سے راز اگلوانے آئی تھی۔ تبھی اسے تم تک آنے کی اجازت ملی۔

''یقیناً ایسا ہی ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا کہ لورا کی بات سے رتی بھر اختلاف نہیں تھا۔

''اسے نقصان پہنچائے بغیر ہم اپنا کام کر گزرتے۔'' لورا نے گہرے دکھ کا اظہار کیا۔

میں نے جیب سے چمٹی نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔ لورا کی آنکھوں میں خوشگوار حیرانی نمودار ہوئی۔ ''یہ..... یہ..... کیسے؟''

''انھیں بہن سمجھنے کا مطلب یہ نہیں کہ اپنی فکر چھوڑ دوں۔''

وہ مسکرائی۔ ''بلاشبہ تمھاری خیر خواہ نکلی۔''

''وہ دل سے چاہتی ہیں میں فرار ہو کر پاکستان لوٹ جاؤں، مگر مدد کرنے سے قاصر ہیں۔ بلکہ ان کی حب الوطنی سے لگتا ہے میرے فرار کو روکنے کو پہلی گولی انھی کے پستول سے نکلے گی۔''

وہ عزم سے بولی۔ ''تم فرار ہو کر جو چاہے کرو، مگر میں شکلا کو موت کے گھاٹ اتارے بغیر انڈیا نہیں چھوڑنے والی۔''

میں بہ ظاہر سنجیدگی سے بولا۔ ''اگر اس کام میں مددگار بنوں تو پرانا وعدہ پورا ہوگا۔''

''کون سا وعدہ۔'' اسے حیرانی ہوئی تھی۔

میں شرارتی تبسم سے بولا۔ ''وہ ڈیٹ والا.....''

اس نے دانت پیسے۔ ''ریجا..... انڈین ایجنسیوں نے تمھارے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا ہوگا جو میں کروں گی۔''

میں نے موضوع تبدیل کیا۔ ''پہلے یہاں سے نکلنے کا سوچو۔''

''صبح ناشتا لانے والے صرف دو آدمی ہوتے ہیں، اپنے ہتھیار بھی انھوں نے کندھوں پر لٹکائے ہوتے ہیں۔''

''گویا آج رات بھی تم شکلا کی میزبانی کو تیار ہو۔''

''نن..... نہیں..... تو'' وہ گھبرا گئی تھی۔ ''ہمیں ابھی کوشش کرنا ہوگی۔''

''مجھے لے جانے والے کافی بے پرواہ ہوتے ہیں جب زندان میں داخل ہوں گے، تب حملہ کر دوں گا۔ مجھ پر قابو پانے کو وہ تم سے غافل ہو جائیں گے۔ تب تم ٹوٹ پڑنا۔ ایک بار انھیں بے ہوش کر لیا تو باقی کام مشکل نہیں رہے گا۔ بیرونی دروازہ بھی کھلا ملے گا۔''

اس نے تشویش ظاہر کی۔ ''مجھے نہیں لگتا تم خاطر خواہ مزاحمت کر پاؤ گے۔''

میں اعتماد سے بولا۔ ''ایک بندے کو ناکارہ کرلوں گا، دو کا بندوبست تمھیں کرنا ہوگا۔''

''اگر ناکام ہوئے تو.....''

''تو کیا؟'' میں نے قطع کلامی کی۔ ''جو ہو چکا، اس سے زیادہ کیا کرلیں گے، زندگی کی امید میں یوں بھی کھو چکا ہوں۔''

اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور ہم منصوبے کی نوک پلک درست کرنے لگے۔

منصوبے کے مطابق لورا کو زندان کا قفل کھولنا تھا۔ وہ تجربہ کار سنائپر اور تربیت یافتہ کمانڈو تھی۔ تار کے ذریعے قفل کھولنے کا شعبدہ اس کے لیے انوکھا یا مشکل نہیں تھا۔ میں نے چمٹی اس کی طرف بڑھادی۔

''قفل کھول دو کیوں کہ وہ کسی بھی وقت ٹپک سکتے ہیں۔ دیدی کے آنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مجھے آج دن کو آرام کا موقع دینے والے ہیں۔''

وہ چمٹی کو ادھیڑ کر تار کو سیدھا کر چکی تھی۔ اجازت ملتے ہی قفل کے ساتھ مصروف ہوگئی۔ ڈیڑھ دو منٹ کی مغز ماری کے بعد اسے کامیابی ملی تھی۔

ایک بار کنڈا کھول کر اس نے دروازہ کھلنے کی تصدیق کی اور پھر کنڈے میں تالا پھنسا کر بیٹھ گئی۔ اب ہمیں ساتھیوں کا انتظار تھا۔ گو جلادوں کی ٹولی سے پہلے کوئی لورا کو لے جانے بھی آسکتا تھا۔ اور ایسا ہونے کی صورت ہمارا منصوبہ ناکام ہو جاتا کہ قفل کو کھلا ہوا دیکھ کر وہ نہ صرف چونک جاتے بلکہ ہماری نگرانی سخت کر دیتے۔ اب تو انھیں ہماری بے بسی کا یقین ہو گیا تھا۔ اور اس کے برعکس کرنے کی صورت یہ قباحت تھی کہ جلادوں کی آمد کے بعد لورا قفل کھول کر یورش نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن ایسے منصوبوں میں اتنا خطرہ تو مول لینا پڑتا ہے۔

ہم سخت بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ ذرا سی لغزش ہماری مصیبتوں میں کئی گنا اضافہ کر دیتی۔ کشیدہ اعصاب کے ساتھ ہم لمحوں کے گزرنے کا ادراک کرتے رہے۔ انتظار کے لمحات طویل ہو کر گھڑیوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مگر کسی بھی شیئے کی طوالت اس کے دوام پر دال نہیں ہے۔ وصل کے اوقات جلدی گزرتے ہیں، ہجر و انتظار طول کھینچتے ہیں، لیکن گزرنا ہر دو کا مقدر ہے۔

انتظار کا اختتام قدموں کی چاپ پر ہوا تھا۔ لورا اضطرابی انداز میں کھڑی ہوگئی تھی۔ میں نے فوراً ہاتھ سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ جس سرعت سے اٹھی اتنی ہی تیزی سے بیٹھ گئی۔

''سنا پیٹر! آج ہمیں آنے میں تھوڑی دیر ہوگئی ہے، لیکن تیرے لیے ایسا علاج سوچا ہے کہ آئندہ کم از کم باپ نہیں بن سکو گے۔'' روی استہزائی انداز میں کہتا ہوا اندر گھسا۔ اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی تھی۔ عقب میں سربن تھا جس نے کالا نقاب پکڑا ہوا تھا۔ گوتم دروازے ہی پر کھڑا ہوگیا۔ میں نقاہت کا مظاہرہ کرتے ہوئے زمین پر ہاتھ ٹیک کر اٹھنے لگا۔

''استاد سنا ہے چھک چھلو میجر اسے ملنے آئی تھی۔'' یقیناً روی نے ممتا دیدی کا ذکر کیا تھا۔

گوتم بولا۔ ''کرن صاحب نے اسے کچھ زیادہ ہی سر پر چڑھایا ہوا ہے۔''

''سر پر تو نہیں البتہ.....'' روی نے ممتا دیدی کے لیے نہایت لچر، غلیظ اور بے ہودہ الفاظ استعمال کیے تھے۔ دوسروں نے قہقہہ لگا کر اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ ان لمحات میں روی، سربن کی جانب متوجہ ہوا۔ ان پر حملہ کرنا منصوبے کا حصہ تھا۔ لیکن اس کی گھٹیا بات نے میرے دماغ میں چنگاریاں بھر دی تھیں۔ یوں لگا میری سگی بہن کے خلاف بکواس کی گئی ہو۔ پوری قوت استعمال کرتے ہوئے میں نے گھٹنا اس کی ٹانگوں کے بیچ اٹھا دیا۔

''اُلف.....'' وہ کراہتے ہوئے جھکا، اس کے ہاتھ مضروب مقام کی طرف بڑھے تھے۔

میرا گھٹنا دوبارہ اٹھا، اب نشانہ اس کی ٹھوڑی بنی تھی۔ زوردار کراہ کے ساتھ وہ لمبا لیٹ گیا تھا۔

''تم کتے.....'' سربن مغلظات بکتا ہوا بڑھا۔ جسمانی تکلیف کو خاطر میں لائے بغیر میں قدم آگے بڑھا کر اچھلا، میرا گھٹنا دنبے کے سر کی طرح اس کے پیٹ کی طرف بڑھا تھا۔

ایک تو وہ تیزی سے آگے بڑھا تھا، دوسرا میں بھی دو قدم لے کر زور سے اچھلا تھا۔ ''دھپ۔'' کی زوردار آواز ابھری۔ گھٹنا اس کی بائیں پسلیوں کے نیچے لگا تھا۔ وہ ڈکراتا ہوا نیچے گرا اور اذیت سے تڑپنے لگا۔

گوتم ہکا بکا کھڑا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی وہ صورت حال نہیں تھی۔ اس نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکالنا چاہا، لیکن اس کی بدقسمتی کہ تب تک لورا قریب پہنچ چکی تھی۔ اسے آخری لمحات میں گڑبڑ کا ادراک تو ہو گیا تھا، مگر اس کے سنبھلنے سے پہلے لورا نے کھڑی ہتھیلی کا وار گردن پر کیا، وہ لہراتا ہوا اوندھے منہ گر گیا تھا۔

تینوں ہماری توقع سے بھی نرم ہدف ثابت ہوئے تھے۔ لورا نے فوراً گوتم کے پستول پر قبضہ جما لیا تھا۔

روی اور سربن کی تلاشی لے کر میں نے دونوں کے پستول نکالے اور بیلٹ کھول کر ان کے ہاتھ پشت پر باندھنے لگا۔

گوتم کی جسامت مجھ سے ملتی تھی۔ اس کے جوتے اتار کر میں نے پاؤں میں ڈالے اور قمیص اتار کر پہن لی۔ ان کی جیبوں سے نکلنے والی تھوڑی بہت نقدی بھی اپنی جیب میں منتقل کی۔ اور گوتم کے ہاتھ بھی جکڑ دیئے۔ اتنی دیر میں کسمسا کر تینوں ہوش میں آنے لگے تھے۔

میں لورا کو مخاطب ہوا۔ ''شاید تم سے دیکھا نہ جائے، بہتر ہوگا داخلی دروازے پر چلی جاؤ۔''

''ہمیں جلدی کرنا ہوگی۔'' اس نے بے صبری ظاہر کی۔

''مقدر نے موقع دے ہی دیا ہے تو سینہ ٹھنڈا کرنے دو۔'' اپنا لہجہ مجھے بھی بیگانہ لگا تھا۔ پچھلے چند دنوں سے ان کی درندگی کا نشانہ بن رہا تھا، اب بدلہ لینا تو بنتا تھا۔

''جلدی کرنا۔'' سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ باہر نکل گئی۔

''تمہارا انجام بہت برا ہوگا۔'' ہوش میں آتے ہی گوتم نے دھمکی دی تھی۔

''اب میری باری۔'' گوتم کی جیب سے برآمد ہوئے چاقو کی تیز دھار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں زہرخند ہوا۔

گوتم نے اعتماد کا مظاہرہ کیا۔ ''تم ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔''

''ایسا بس تم سوچتے ہو۔'' میں نے اس کے بالوں کو مٹھی میں بھرتے ہوئے چاقو کی نوک اس کی آنکھ میں گھونپ دی تھی۔ اس کے حلق سے لرزا خیز چیخ برآمد ہوئی۔ ایسی ہی کئی چیخیں گزشتہ دو تین دنوں سے میرے حلق سے برآمد ہو رہی تھیں۔ چیخنے کے ساتھ اس کے منہ سے مغلظات کا چشمہ ابل پڑا تھا۔ توجہ دیئے بغیر میں نے اس کی دوسری آنکھ میں بھی چاقو گھونپ دیا۔ تکلیف کی شدت سے وہ ذبح ہوئے جانور کی طرح پھڑک رہا تھا۔ پتلون سامنے سے گیلی ہوئی اور پانی نیچے تک پھیل گیا۔

روی اور سربن کی آنکھوں میں ہراس پھیل گیا تھا۔

''بب..... بھگوان کے لیے، معاف کر دو.....'' دونوں گھگیائے۔

''اسی کے پاس بھیجنے لگا ہوں۔'' اطمینان سے کہتے ہوئے میں نے باری باری دونوں کی آنکھیں پھوڑ دی تھیں۔ مگر افسوس کہ میں زیادہ دیر ان کے تڑپنے کا دلکش منظر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تینوں مجھے گالیاں بک رہے تھے۔ خطرناک انجام کی

دھمکیاں دے رہے تھے اور ساتھ بری طرح کروٹیں بدل رہے تھے۔

میں اطمینان سے بولا۔ ''تمھارا تو پتا نہیں لیکن مجھے بہت مزا آرہا ہے۔''

''تم.....'' تینوں کے حلق سے گٹر کی گندگی کے مانند بدبودار اور گلی سڑی گالیاں برآمد ہو رہی تھیں۔

''میں چاہتا ہوں تم زیادہ سے زیادہ تکلیف کاٹو لیکن وقت کی کمی کے باعث یہ دلکش نظارا دیکھ نہیں سکتا۔'' افسوس کا اظہار کرتے ہوئے میں تینوں کی کلائیوں کی رگیں کاٹ دیں۔ خون تیزی سے فرش رنگین کرنے لگا تھا۔ ان کے لباس پر رگڑ کر میں نے دھار صاف کی اور چاقو جیب میں ڈال لیا۔ وہ کبھی گالیاں بکتے، کبھی زندگی کی بھیک مانگنے لگتے۔

میں کبھی اتنا شقی القلب اور بے رحم نہیں رہا کہ کسی کے تڑپنے پر لطف اندوز ہو سکوں، مگر ان تینوں نے مجھ پر ظلم کے پہاڑ ڈھائے تھے۔ اتنی اذیتیں دی تھیں کہ میں سرتاپا انتقام میں ڈھل گیا تھا۔ میں نے تالے کی چابی لورا والے دروازے کے قفل میں گھسیڑ کر چھوڑ دی، تاکہ تفتیش کرنے والے سمجھیں میں نے ان تینوں کو ہلاک کر کے لورا کو آزاد کرایا ہے۔ یوں ممتا دیدی پر کسی کو بھی شک نہ گزرتا۔ لورا نے ممتا دیدی کی چٹی وہیں پھینک دی تھی۔ وہ میں نے اٹھا کر جیب میں ڈال لی۔

کہتے ہیں جو عزیز ہوتے ہیں انسان ہر حال میں پہلے ان کے بھلے کا سوچتا ہے۔ اس وقت بھی میرے دماغ میں ممتا دیدی کی حفاظت کا خیال جاگزیں تھا۔ تبھی احتیاطی تدابیر پر عمل کر گزرا تھا۔ ورنہ وہ پھنس جاتیں۔ ان کا میرے ساتھ ہمدردانہ رویہ ان کے بڑوں کی نظر سے اوجھل نہیں تھا۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ انھیں ذرا بھر تکلیف پہنچے۔

لورا بے چینی سے منتظر تھی۔ ہم عمارت سے انجان تھے۔ نامعلوم وہاں کتنے افراد موجود تھے۔ اور ان کے پاس کون کون سے ہتھیار تھے۔ کیوں کہ مرنے مارنے کا مرحلہ شروع ہو گیا تھا۔ اور ان کے ہاتھ آنے کا مطلب دردناک موت کو گلے لگانا ہوتا۔

وہ برہم ہوئی۔ ''اتنی دیر لگادی۔''

اس کے واویلے کو درخور اعتناء نہ جانتے ہوئے میں نے پستول کاک کیا۔ ''کوشش کرنا کسی کی جان ضائع نہ ہو۔''

وہ طعنہ زن ہوئی۔ ''ان تینوں کے ساتھ کیا رہے تھے۔''

''وہ اسی قابل تھے، باقی کسی کے ساتھ ہماری دشمنی نہیں ہے۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''مجھے صرف شکلا کی گردن اتارنے میں دلچسپی ہے۔''

''مجھے شانہ بہ شانہ پاؤ گی۔'' اس پر احسان دھرتے ہوئے میں نے دروازے کو آہستگی سے اندر کی جانب کھینچا۔ وہ کچھ کہنے لگی تھی، مگر مجھے دروازے کھولتے دیکھ کر ہنکارا بھر کر رہ گئی تھی۔

دروازے میں جھری کر کے میں نے باہر جھانکا۔ سامنے سامان سے عاری کمرہ نظر آیا۔

''چلو۔'' میں سرعت سے باہر نکلا۔ لورا نے میری تقلید کی تھی۔ وہ تربیت یافتہ کمانڈو اور پیشہ ور سنائپر تھی۔ کوئی عام لڑکی نہیں کہ مجھ پر بوجھ ہوتی۔ کمرے کے داخلی دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے اسے داہنی جانب کا خیال رکھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے سر ہلا دیا تھا۔

ہم نے ایک ساتھ دروازے کے دونوں پٹ کھولے اور سرعت سے باہر نکلے، دونوں جانب طویل راہداری تھی۔

''اس طرف۔'' سرعت سے فیصلہ کرتے ہوئے میں بائیں جانب بڑھ گیا۔ لورا میرے پیچھے ہو لی۔ میں مکمل سامنے کی طرف متوجہ تھا، جبکہ لورا الٹے قدموں بھاگتی ہوئی آرہی تھی۔ عقب کا خیال رکھنا اس کی ذمہ داری تھی۔ ہم نے کسی بھی کمرے میں جھانکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ہماری اولیں ترجیح وہاں سے بہ خیریت نکلنا تھا۔ موڑ کے قریب پہنچتے ہی ہم دیوار سے ٹیک لگا کر رکے اور پھر ایک ساتھ سامنے ہوئے۔

چند قدموں کے فاصلے پر دو مسلح افراد خراماں خراماں تشریف لا رہے تھے۔ دونوں کے ہتھیار کندھے پر لٹکے تھے۔

''ہاتھ اوپر۔'' میں نے دھیمے مگر سخت لہجے میں کہا تھا۔ لہجے سے زیادہ میرے پستول نے انھیں ڈرایا تھا۔ قدم روکتے ہوئے دونوں نے ہاتھ بلند کر لیے تھے۔

ہم نے بجلی کی سی سرعت سے درمیانی فاصلہ طے کیا۔ زندگی و موت کا کھیل جاری تھا، ایسے حالات میں مجھے جسمانی تکلیف بھولی ہوئی تھی۔

''الٹا گھومو۔'' قریب جاتے ہی میں نے حکم دیا۔

مجھے کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے وہ مڑ گئے۔ لورا کی سوالیہ نظریں میری جانب اٹھیں۔ میں نے اوپر نیچے سر ہلاتے ہوئے پستول کو نال سے پکڑا۔ اور دستہ پوری قوت سے سامنے والے کے سر میں جڑ دیا تھا۔ لورا بھی پیچھے نہ رہی، اس نے کافی سخت وار کیا تھا۔ مضروب دھڑام سے پختہ فرش پر گر پڑے۔

دونوں نے گلے میں ''ٹائین ایم ایم کاربائن ون اے ون'' لٹکائی ہوئی تھیں۔ جس کی میگزین میں چونتیس گولیوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ وہ انڈیا کی ایجاد کردہ سب مشین گن تھی۔ اور کارکردگی میں پستول سے بہتر ہے۔ ہم نے اپنے پستول پتلون کے عقب میں اڑسے اور کاربائن قبضے میں کیں۔ ان کے فولڈنگ بٹ سیدھے کر کے ہم نے کاک کیا اور آگے بڑھ گئے۔

راہداری کا اختتام ایک کھلے ہال میں ہوا، جس ایک کونے میں آمنے سامنے صوفے رکھ کر ڈرائینگ روم کی شکل دی گئی تھی۔ وہاں دو افراد شیشے کے گلاس تھامے پینے میں مصروف تھے۔ ہم پر نظر پڑتے ہی وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے تھے۔

''ہاتھ اوپر۔'' میں نے کاربائن کی نال سے بھی اشارہ کر دیا تھا۔

ایک آدمی اعتماد سے بولا۔ ''جوان اپنی سختیوں میں اضافہ کر رہے ہو۔ اگر سوچ رہے ہو چھپ جاؤ گے تو یہ غلط فہمی دل سے نکال دو۔ ممبئی کا کوئی کونہ تمھیں پناہ نہیں دے گا۔''

میں دبنگ لہجے میں بولا۔ ''تمھارا مسئلہ اپنی جان بچانا ہے، جو تم ہاتھ اٹھا کر ہی بچا سکتے ہو۔''

انھوں نے ہاتھ اوپر کر لیے تھے۔

''آگے بڑھو۔'' ان کی پیٹھ سے کاربائن کی نالیں جوڑ کر ہم نے دروازے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

دو قدم لیتے ہی لورا کے سامنے والے نے تیزی کا مظاہرہ کیا اور ایک دم مڑ کر ہتھیار پر ہاتھ ڈال دیا۔ بیرل پر ہاتھ ڈالتے ہوئے اس نے دھانے کا رخ خود سے ہٹایا، مگر لورا کے جوابی ردعمل کا توڑ نہیں سوچا تھا۔ اس نے لورا کو کچھ زیادہ ہی ہلکا لیا تھا، وجہ یقیناً اس کا لڑکی ہونا تھا۔

لورا نے کاربائن کھینچنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جونہی مخالف نے بیرل کو پکڑا، قدم بھرتے ہوئے وہ قریب ہوئی اور ایک دم اپنا گھٹنا اٹھا دیا۔

''اوغ۔'' کی بلند آواز سے وہ جھکا، اس کی گرفت کاربائن کی نال پر ڈھیلی ہو گئی تھی۔ لورا نے کاربائن کھینچتے ہوئے، بٹ کو مضبوطی سے پکڑا اور نال پوری قوت سے اس کے سر پر رسید کر دی تھی۔

وہ لہراتے ہوئے زمین بوس ہو گیا تھا۔

اسی وقت دو افراد دندناتے اندر آئے۔ جانے کیسے انھیں خطرے کا احساس ہوا تھا کہ دونوں نے ہتھیار فائرنگ حالت میں پکڑے تھے۔

''خبردار ہاتھ اوپر۔'' ایک درشت لہجے میں چلایا۔ اس کا فقرہ بہ مشکل پورا ہوا تھا کہ میں نے گھٹنا نیچے ٹیک کر دو مرتبہ

لبلبی دبا تھی۔

اتنی تیزی سے چلائی ہوئی گولیاں رائفلوں پر لگی تھیں، ان کے ہاتھوں سے ہتھیار گر گئے تھے۔ ایک کے بازو پر ہتھیار سے اچٹ کر گولی گہری خراش ڈال گئی تھی۔

میں دھاڑا۔ ''ہاتھ اٹھا کر جان بچا سکتے ہو۔'' انھوں نے گھبرا کر ہاتھ اوپر کر لیے تھے۔

گولی چلنے پر اندرونی عمارت سے شور وغل کی آواز بلند ہوئی تھی۔ نہ جانے وہاں کتنے افراد موجود تھے۔ اگر سب اکٹھے ہو جاتے تو ہمارا بچ نکلنا ناممکن ہو جاتا۔ میں لمحے کے بیسویں حصے میں فیصلہ کیا اور کاربائن کی نال پوری قوت سے اپنے قیدی کے سر پر رسید کر دی۔ وہ تیز کراہ کے ساتھ نیچے گر گیا تھا۔

اس دوران لورا گن تانے دونوں محافظوں کے قریب پہنچ گئی تھی۔

''گنیں قبضے میں لو۔'' کاربائن سیدھی کرتے ہوئے میں لورا کو مخاطب ہوا۔

میرے چوکس ہونے کا یقین کرتے ہی لورا نے دونوں ہتھیار قبضے میں لے لیے۔ ان کے پاس کلاشن کوفیں تھیں۔

''گھوم جاؤ.....'' قریب ہوتے ہی میں دھاڑا۔ ہمیں طیش بھری نظروں سے گھورتے ہوئے انھوں نے رخ تبدیل کیا۔ لورا اور میری کاربائن ایک ساتھ حرکت میں آئی تھیں۔ ان کے سر کی سختی کا اندازہ کاربائن کی فولادی نال سے کر کے ہم نے عارضی طور پر چھٹکارا پایا۔ لورا نے ایک کلاشن کوف میری جانب بڑھا دی تھی کہ کارکردگی کے لحاظ سے کلاشن کوف کاربائن سے بہتر ہے۔ دونوں کلاشن کوفوں کے ساتھ دہری میگزینیں لگی تھیں۔ (دو میگزینوں کو ایک دوسرے کے مخالف رکھ کر درمیان سے شکنجے میں کس دیتے ہیں۔ اور پھر ایک میگزین کے خالی ہونے پر دوسری میگزین لگا لی جاتی ہے)

حفاظتی لیور کو اکیلی گولی (سنگل فائر) پر لگا کر میں نے کاک کیا۔ گن پہلے سے کاک ہو سکتی تھی اور ایسا ہونے کی صورت چیمبر میں پڑی گولی باہر نکل جاتی۔ لیکن ہتھیار کے کاک ہونے کی تصدیق کرنا ہر تربیت یافتہ کا پہلا اصول ہے۔ کاکنگ ہینڈل چھوڑتے ہی چیمبر سے گولی باہر نہیں نکلی تھی۔ جس کا صاف مطلب یہی تھا کہ ان سور ماؤں نے اب تک کلاشن کوفوں کو کاک نہیں کیا تھا۔

یہی حرکت لورا بھی دہرا چکی تھی۔ گنیں کاک کرتے ہوئے ہمارے قدم بہ ہر حال رکے نہیں تھے۔ ہال سے نکلتے ہی ہم طویل برآمدے میں پہنچے۔ لورا نے لکڑی کا دروازہ بھیڑا اور کنڈوں میں ون اے ون کاربائن کی میگزین پھنسا کر عارضی رکاوٹ کھڑی کر دی۔ میں داخلی دروازے پر کھڑے چوکیدار کی طرف متوجہ تھا، جس نے ہمیں دیکھتے ہی کلاش کوف سیدھی کر لی تھی۔

''نیچے.....'' زور سے چیختے ہوئے میں نے لورا پر چھلانگ لگائی اور اسے ساتھ لیے ڈھیر ہو گیا۔

''تڑ.....تڑ.....تڑ.....'' کی بھیانک آواز سے گولیاں لکڑی کے دروازے سے ٹکرائی تھیں۔ مجھے ایک لمحے کی دیر ہو جاتی تو لورا چھلنی ہو گئی ہوتی۔ کلاشن کوف میرے ہاتھ سے نیچے گر گئی تھی۔ پختہ زمین سے اتصال ہوتے ہی میرے منہ سے زوردار کراہ خارج ہوئی تھی۔

''ریبا.....'' لورا متوحش ہو کر چلائی۔ وہ میرے بازوؤں میں تھی۔ اسے لگا مجھے گولی لگی ہے۔

''ٹھیک ہوں۔'' اسے گرفت سے آزاد کرتے ہوئے میں لڑھک کر اپنی کلاشن کوف کے نزدیک ہوا۔ اس دوران لورا دو مرتبہ لبلبی دبا چکی تھی۔ دونوں گولیاں چوکیدار کی ٹانگوں میں لگی تھیں۔

وہ چیختا ہوا نیچے گرا۔ لیکن اس نے کلاشن کوف کو نہیں چھوڑا تھا۔ کہنی کے بل لیٹتے ہوئے اس نے کلاشن کوف کو سیدھا کرنے کی کوشش کی، مگر اس سے پہلے میری گن گولی اگل چکی تھی۔ گولی لکڑی کے فرنٹ ہینڈگارڈ سے ٹکرائی اور گن اس کے

ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔

لورا کے منہ سے بے ساختہ تحسین آمیز انداز میں برآمد ہوا۔ ''تم واقعی شارپ شوٹر ہو۔'' میرے نام ایس ایس کو اس نے خود ساختہ معنی پہنائے۔

''گاڑی لاؤ، میں دروازہ کھولتا ہوں۔'' اسے ہدایت دیتا ہوا میں بھاگ پڑا۔ چوکیدار زخموں کی پروا کیے بغیر گن کی طرف رینگ رہا تھا۔ ڈرائینگ روم کے دروازے پر بھی کھٹ پٹ شروع ہوگئی تھی۔ یقیناً لورا کا کنڈوں میں میگزین پھنسانا مفید رہا تھا۔

چوکیدار کے کلاشن کوف تک پہنچنے سے پہلے میں اس تک پہنچ گیا تھا۔ میرے پاؤں کی بھرپور ٹھوکر اس کے سر میں لگی، ماتھا پختہ فرش سے ٹکرایا اور اسے عارضی طور پر ساری تکالیف سے چھٹکارا مل گیا۔ اسے پاؤں سے گھسیٹ کر میں نے دروازے کے سامنے سے ہٹایا اور کنڈا کھول کر دروازے کے پٹ کھول دیئے۔

اندرونی عمارت کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ وہ دروازہ کھولنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ ایسا ہونے پر ہماری مشکلات میں اضافہ ہو جانا تھا۔ انھیں دروازے سے دور رکھنا نہایت ضروری تھا۔ کلاشن کوف سیدھی کر کے میں نے دروازے کے نچلے حصے پر شست سادھی، تاکہ گولی کسی کی موت کا سبب نہ بنے۔ لکڑی کا انچ دو انچ موٹا دروازہ گولی کو نہیں روک سکتا تھا۔ اس متعلق میں پہلے بھی وضاحت کر چکا ہوں کہ دو تین انچ موٹی لکڑی کلاشن کوف وغیرہ کی گولی کو نہیں روک سکتی۔

تین چار گولیاں ضائع ہوتے ہی دروازے کا دھڑ دھڑانا رک گیا تھا۔

اسی وقت نئے ماڈل کی ڈبل کیبن دروازے کی طرف بڑھتی دکھائی دی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر لورا بیٹھی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا لورا صحن میں گاڑی روکے اس لیے فوراً گلی میں نکل گیا۔ کسی بھی جانب سے گولی چل کر ہمیں نقصان پہنچا سکتی تھی۔ ہم نہ صرف عمارت کے حدود اربعہ سے انجان تھے، بلکہ وہاں موجود آدمیوں کی تعداد سے بھی ناواقف تھے۔ وہ پوش علاقہ تھا گلی کافی کشادہ اور صاف ستھری تھی۔

باہر آتے ہی اس نے ایک لمحے کو بریک دبائی اور میں سرعت سے اگلی نشست پر منتقل ہو گیا۔

لورا نے اگنیشن کی تاریں توڑ کر گاڑی کو سٹارٹ کیا تھا۔

''یہ سمت ٹھیک ہے۔'' گاڑی آگے بڑھاتے ہی اس نے تصدیق چاہی۔

''ممبئی میرے لیے بھی اتنا ہی انجان ہے جتنا تمھارے لیے۔'' میں نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے پیچھے جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''وہاں اور گاڑیاں نہیں تھیں؟''

''کھڑی تھیں۔'' گلی کا موڑ تیزی سے کاٹ کر اس نے نسبتاً کھلی گلی میں رفتار بڑھا دی تھی۔

میں برہم ہوا۔ ''ان کے ٹائروں کو پنکچر نہ کرنے کی وجہ میری سمجھ سے باہر ہے۔''

وہ نادم ہوئی۔ ''معذرت، خیال نہیں رہا۔''

میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''بے خیالیاں زیادہ عرصہ راس نہیں آیا کرتیں۔''

''معذرت کر تو دی ہے۔'' میرا طنز کرنا اسے برا لگا تھا۔

''معذرت کرنا، خطا کا اعتراف ہے۔ اور ضروری نہیں کہ غلطی کے اقرار پر معافی مل جایا کرے۔''

وہ برہم ہوئی۔ ''تمھارے زیر کمان (انڈر کمانڈ) نہیں ہوں۔''

''تمھاری غلطی سے وہ ہمارا تعاقب بھی کر سکتے تھے۔''

وہ عقبی شیشے (بیک مرر) پر نگاہ دوڑاتے ہوئے پھیکی مسکراہٹ سے بولی۔ ''کر رہے ہیں۔''

میں نے فوراً مڑ کر دیکھا۔ دو سفید کاریں نظر آئی رہی تھیں۔ دونوں کشادہ گلی میں مڑ چکی تھیں۔ ڈبل کیبن اور کاروں کے بیچ دو تین کاریں اور چند رکشے بھی تھے۔

میں نے تشویش ظاہر کی۔ ''ان کی رفتار ہم سے تیز ہے۔''

''دیکھتے جاؤ۔'' ہونٹ بھینچتے ہوئے اس نے ''ایکسی لیٹر'' پر دباؤ بڑھا دیا، ڈبل کیبن جھٹکا کھا کر تیز ہوئی۔ اس کے اسٹیرنگ ویل پر رکھے ہاتھ مسلسل سے گھوم رہے تھے۔ دو رکشوں کو مہارت سے ''اوورٹیک'' کر کے تیسرے کے عقبی حصے سے کار کا بمپر ٹکرایا، رکشا ڈگمگاتے ہوئے ریڑھی میں جا لگا تھا۔ نہ جانے کتنی چیخیں، مغلظات اور درشتی بھری آوازیں ابھری تھیں۔ گلی کے اختتام پر بڑی سڑک تھی۔ لورا دائیں مڑی کہ ٹریفک کا بہاؤ اسی جانب تھا۔ وہ مہارت سے گاڑیوں کے درمیانی خلا سے گاڑی آگے بڑھائے گئی۔ یقیناً اس مہارت سے میں گاڑی نہ چلا سکتا۔

میں لیور سے سیٹ پیچھے جھکا کر عقبی نشست پر منتقل ہو گیا۔ عقبی شیشے میں ایک مربع فٹ کی کھڑکی بنی تھی۔ عموماً ڈبل کیبن گاڑیوں میں ایسی کھڑکی ٹیل بورڈ میں بیٹھے افراد سے رابطے کا کام دیتی ہے۔ مگر اس وقت مجھے کلاشن کوف کی نال باہر نکالنے کا رستہ مل گیا تھا۔ بہ صورت دیگر فائر کرنے کو مجھے عقبی شیشہ توڑنا پڑتا۔ البتہ چلتی گاڑی سے متحرک ہدف کو نشانہ بنانا ناممکن نہیں تو دشوار ترین ضرور ہے۔ گولی اتفاق سے تو ہدف کو ٹکرا سکتی ہے۔ یقینی طور پر ہدف نشانہ نہیں بن سکتا۔ جن لوگوں نے کبھی فائر نہ کیا ہو اور ہتھیاروں کے بارے زیادہ معلومات نہ رکھتے ہوں، شاید انھیں سمجھ نہ آئے، ورنہ فوجی حضرات کی سمجھ میں میری بات آ گئی ہو گی۔

وجہ یہ ہوتی ہے کہ گاڑی کی حرکت کی وجہ سے ہتھیار کو ہدف پر مرکوز نہیں کیا جا سکتا۔ اور جب ہدف اور فائر دونوں متحرک ہوں تو یہ مشکل اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ تعاقب کرنے والی کاریں فاصلہ سمیٹنے کی تگ و دو میں تھیں، کیوں کہ فاصلہ بڑھنے کی صورت ہم ان کی نظر سے اوجھل ہو سکتے تھے۔ ڈبل کیبن دور ہی سے پہچانی جا سکتی ہے۔ گاڑی کا ماڈل بھی ان کے لیے آسانی پیدا کر رہا تھا۔

چند کاروں کو مہارت سے اوورٹیک کرتے ہوئے لورا نے فاصلہ بڑھایا۔ مجھے لگا ہم انھیں جل دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اسی وقت لورا کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔ ''مارے گئے۔''

میں سامنے متوجہ ہوا۔ پولیس ناکا لگا تھا۔ میں پولیس کی چابک دستی اور تیزی پر حیران رہ گیا تھا۔ اتنی جلدی تو فلموں میں مجرموں کو نہیں گھیرا جاتا جتنی جلدی انھوں نے ہمیں پکڑا تھا۔

رش نہ ہونے کی وجہ سے گاڑیوں کی قطار نہیں بنی تھی۔ ''کیا کریں؟'' لورا مستفسر ہوئی۔

میں نے بہ غور پولیس سپاہیوں کا جائزہ لیا۔ ان کا لاابالی انداز اور بے پروائی سے گاڑیوں کی تلاشی لینا ظاہر کر رہا تھا کہ میرا اندیشہ و گمان غلط تھا۔ وہ معمول کا، ناکا تھا۔ بلاشبہ انڈین پولیس اتنی تیز نہیں تھی کہ اس سرعت سے ہمیں گھیر سکتی۔

''چلتی رہو۔'' اسے ہدایت دے کر میں نے مڑ کر دیکھا۔ ہمارے پیچھے تین چار گاڑیاں اس کے بعد دشمن تھے۔

لورا نے کار روکی۔ آگے والی کار کو ہاتھ سے جانے کا اشارہ کر کے سپاہی نے لورا کو نظر بھر کر دیکھا۔ میں نے دونوں کلاشن کوفیں پاؤں میں لٹا دی تھیں۔

لورا بے چینی ظاہر کرتے ہوئے انگریزی میں بڑبڑائی۔ سپاہی جو دلچسپی سے اس کے چہرے کو گھور رہا تھا گڑبڑا گیا فوراً پیچھے ہو کر بولا۔

''جایئے مادام۔''

لورا نے کار آگے بڑھائی، بیرئر ہٹ چکا تھا۔ میری سماعتوں میں کسی کے چیخنے کی آواز پڑی۔ مڑ کر دیکھا تو ساتھی پیچھے گئے تھے۔ اور کاروں کا رستہ نہ ہونے کی وجہ سے باہر نکل کر دوڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ساتھ ہی وہ پولیس والوں کو ہمیں روکنے کی ہدایت کر رہے تھے۔

میں چیخا۔ ''تیز چلو۔'' لورا میری ہدایت سے پہلے ہی ایکسی لیٹر دبا چکی تھی۔ اسی وقت بیرئر نیچے کو جھکا مگر آخری لمحات میں وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

میں عقبی جانب متوجہ ہوا۔ بیرئر نیچے ہو گیا تھا۔ غالباً وہ پولیس والوں کو اپنی پہچان کرا رہے تھے۔

اس دوران ہم فرلانگ بھر آگے آ گئے تھے۔ تبھی ناکے سے تین گاڑیاں آتی دکھائی دیں۔ ان میں دو گاڑیاں تو ہمارے دشمنوں کی تھیں اور تیسری پولیس کی جیپ تھی۔

''بغلی سڑک (لنک روڈ) کو نظر میں رکھنا۔'' میری ہدایت پر اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

کلومیٹر بھر آتے ہی چوک آیا۔ لورا دائیں مڑ گئی۔ وہ سڑک مضافات کو جا رہی تھی۔ تبھی رش نسبتاً کم تھا۔ لورا نے ہونٹ بھینچتے ہوئے رفتار بڑھا دی تھی۔ مگر دشمن بھی تیز رفتاری سے تعاقب کر رہے تھے۔

میں نے عقبی شیشہ کھول کر کلاشن کوف کی نال کھڑکی پر ٹکا دی، لیکن مجھے گولی ضائع کرنے کا شوق نہیں تھا۔ اور یہ بھی خطرہ تھا کہ گولی غلطی سے کسی بے گناہ کو بھی لگ سکتی تھی۔

لورا نے مشورہ دیا۔ ''بے شک نہ لگے مگر گولی چلانا مفید رہے گا۔'' اسے عقبی شیشے (بیک مرر) میں میری کارروائی نظر آ گئی تھی۔

دشمن نے شاید اس کے الفاظ سن لیے تھے تبھی تڑتڑاہٹ کی آواز سے فضا گونج اٹھی تھی۔ انھوں نے دو تین لمبے چھٹے فائر کیے مگر ہم محفوظ رہے تھے۔

لورا کا جھلایا ہوا استفسار گونجا۔ ''ریچا! فائر کیوں نہیں کر رہے؟''

میں اطمینان سے بولا۔ ''گولی ضائع نہیں کرنا چاہتا۔''

وہ بیزاری سے بولی۔ ''گولیوں کے بہ جائے جان بچاؤ۔''

''گولی چلانے سے جان نہیں بچا کرتی مادام! گولی ہدف پر مارنے سے جان چھوٹتی ہے۔ اور ایسی حالت میں ATGM (اینٹی ٹینک گائیڈنگ میزائل) ہی سے کارآمد فائر کیا جا سکتا ہے۔'' (یہ بکتر شکن میزائل ہوتا ہے جو فائر ہونے کے بعد بھی فائرر کے قابو میں ہوتا ہے۔ اور وہ جدھر چاہے میزائل کو موڑ سکتا ہے)

''نک، ایسے ہی فائر کیا کرتا تھا کہ لگتا گولی فائر ہونے کے بعد بھی اس کے قابو میں ہے۔''

''تو میں نے کب نک سے اچھا ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔'' مجھے مرے ہوئے دشمن کے خلاف بولنا بہتر نہیں لگا تھا۔ اور یہ تو تعریف کرنے والی بھی جانتی تھی کہ اس کی بات میں کہاں تک سچائی تھی۔

دشمنوں کی جانب سے تسلسل سے فائر کیا جا رہا تھا۔ مگر درمیانی فاصلہ، متحرک ہدف اور چلتی گاڑی سے ہمیں نشانہ بنانا ممکن نہیں تھا۔ البتہ کسی بھولی بسری گولی کا ہدف تک پہنچ جانا اچنبھے کا باعث نہیں تھا۔

ایک لمبا چھٹا فائر ہوا۔ کم بخت نے پوری میگزین ہی فائر کر دی تھی۔ دو تین گولیوں نے ڈبل کیبن کی چھت بجائی۔ لورا نے رفتار بڑھا دی تھی۔ کشادہ سڑک پر گاڑی یوں فراٹے بھر رہی تھی جیسے رن وے پر جہاز دوڑتا ہے۔ دو گاڑیوں کے درمیانی خلا سے مہارت سے ڈبل کیبن آگے نکالے جا رہی تھی۔ ہاتھ اسٹیرنگ کی چرخی کو دودھ بلونے والی مدھانی کی طرح گھما رہے تھے۔ تین چار اشارے اس نے بلا جھجک توڑے تھے۔ اگر شہر کی اندرونی سڑک ہوتی تو یقیناً

اشارہ توڑنا بھی ممکن نہ رہتا، مگر یہ کشادہ سڑک شہر سے باہر جارہی تھی تبھی سرخ اشارے پر گاڑیوں کا اتنا اکٹھ نہیں ہوتا تھا کہ گاڑی آگے نہ نکالی جاسکتی۔ البتہ یہ لاقانونیت چند پولیس والوں کو متوجہ کرنے کا باعث بنی تھی۔ تبھی دو موٹر سائیکل سوار تیزی سے ہمارے قریب پہنچ رہے تھے۔

ایک موٹر سائیکل سوار نے دائیں طرف سے ہو کر آگے گزرنا چاہا، لورا کی نظر بیک وقت عقبی شیشے اور سامنے تھی۔ جونہی موٹر سائیکل کا اگلا پہیہ ڈبل کیبن کے عقبی حصے کے قریب پہنچا، اچانک ہی لورا نے اسٹیرنگ کو مہارت سے موڑتے ہوئے ایک دم بریک کھینچی۔ پہیوں کی چرچراہٹ ابھری، موٹر سائیکل کا اگلا پہیہ گاڑی سے ٹکرایا، موٹر سائیکل پھسلی اور سوار سڑک پر جا گرا تھا۔ لورا نے فوراً ہی بریک سے پاؤں ہٹا کر گاڑی آگے بڑھادی۔ دوسرا سوار باہنی جانب سے آگے نکلنے کی تگ و دو میں تھا۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے کلاشن کوف کی نال باہر نکالی۔ ایک دم موٹر سائیکل سوار نے رفتار کم کر کے جان بچانے کا سوچا تھا۔

اب دشمنوں اور ہمارے بیچ درجن بھر کاریں موجود تھیں تبھی وہ فائر نہیں کر پا رہے تھے۔

مسلسل ادھ پون گھنٹے ہم آگے پیچھے حرکت میں رہے۔ مجھے نہیں لگتا تھا کہ وہ پیچھا چھوڑنے پر آمادہ ہوں گے۔ سڑک شہر سے باہر جارہی تھی اور مجھے خطرہ تھا کسی بھی لمحے ہمارا واسطہ پولیس ناکے یا چیک پوسٹ وغیرہ سے پڑ سکتا تھا۔ یوں مسلسل ایک سڑک پر سفر کرنا مناسب نہیں تھا۔ ان کے پاس ملاپ کے ذرائع موجود تھے۔ اور اگلی چوکیوں کو با خبر نہ کرنا حماقت و بے وقوفی ہوتی۔ یقیناً دشمن ایسی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔

شاید لورا نے میری سوچ پڑھ لی تھی کہ اچانک رفتار میں کمی ہوئی، میں نے سامنے دیکھا۔ ایک بغلی سڑک دائیں جانب نکل رہی تھی۔ ایکسی لیٹر پر دباؤ ہلکا کرتے ہوئے لورا نے ایک دم موڑ کاٹا۔ ایک لمحے کو مجھے لگا گاڑی الٹ جائے گی، مگر لورا نے مہارت سے موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی کو سنبھال لیا تھا۔ سیدھا ہوتے ہی لورا نے رفتار دوبارہ بڑھادی۔ بغلی سڑک کمان کی طرح خم دار تھی۔ اور تسلسل سے دائیں اور ہلکا سا پیچھے گھوم رہی تھی۔ موڑ سے دو تین سو قدم دور آتے ہی میں چلایا۔

''بریک لگاؤ۔''

''کیا ہوا؟'' لورا نے گھبراتے ہوئے ایکسی لیٹر سے پاؤں ہٹا کر بریک دبادی تھی۔ ٹائر زوردار آواز میں چیخے، میں جھٹکے سے اگلی نشست سے ٹکرایا اور پھر سنبھل کر سرعت سے باہر نکل گیا۔

تعاقب کرنے والے موڑ کاٹ چکے تھے اور تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ گھٹنا زمین پر ٹیک کر میں نے شست لی۔

متحرک ہدف کو نشانہ بنانے کو ہمیشہ لیڈ لی جاتی ہے۔ جو ہدف کی رفتار کو مدنظر رکھ کر لی جاتی ہے۔ کیوں کہ براہ راست ہدف پر شست لی جائے تو جب تک گولی ہدف تک پہنچتی ہے، متحرک ہدف آگے نکل چکا ہوتا ہے۔ لیکن کاروں کا رخ ہماری ہی جانب تھا، اس لیے مجھے لیڈ لینے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ شست سادھنے میں مجھے ایک دو سیکنڈ سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ لبلبی دباتے ہی گولی کی آواز کے بعد ٹائر پھٹنے کا زوردار دھماکا ہوا۔ تیز رفتار کار ڈرائیور سے نہیں سنبھلی تھی۔ البتہ اس نے کار کو الٹنے سے بچالیا تھا۔ کار سڑک سے اتر کر ایک درخت سے جا ٹکرائی۔

اس دوران میں عقبی کار پر شست سادھ چکا تھا۔ جو کافی قریب آچکی تھی۔ اگلی گولی نے اس کا ٹائر پھاڑا۔ یہ ڈرائیور زیادہ ماہر نہیں تھا، تبھی کار لڑھکتے ہوئے سڑک سے دور جا گری تھی۔ سب سے آخر میں پولیس کی جیپ تھی۔ انھوں نے شاید خطرہ بھانپ لیا تھا۔ تبھی دور ہی رک گئے تھے۔

میرے پاس آنکھ مچولی کھیلنے کا وقت نہیں تھا۔ان کے رکنے کے باوجود میں نے جیپ کے اگلے دونوں ٹائروں پر ایک ایک گولی جھونک دی تھی۔کان پھاڑ دینے والے دھماکے ہوئے۔میں مڑ کر دوڑ پڑا۔دشمن کی جانب سے ایک چھناکا فائر ہوا۔گولیاں ''شاں.....شاں۔'' کی آواز سے میرے سر کے اوپر سے گزری تھیں۔دو تین گولیاں، ڈبل کیبن کی باڈی میں پیوست ہوگئی تھیں۔

میں نے اگلی سیٹ پر نشست سنبھالی، لورا تیار بیٹھی تھی۔بریک سے پاؤں ہٹاتے ہوئے اس نے ایکسی لیٹر دبا دیا۔گاڑی تیز جھٹکا کھا کر آگے بڑھی، میں بہ مشکل سرڈیش بورڈ سے ٹکرانے سے بچا سکا تھا۔ڈبل کیبن، کمان سے چھوٹے تیر کی طرح اڑنے لگی۔

مجھے لگا ہم خطرے کی حدود سے نکل آئے ہیں۔مگر اسی وقت موڑ کی جانب سے پولیس گاڑیوں کے مخصوص، بلکہ منحوس سائرن کی آواز گونجنے لگی۔

میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔''یہ کاریں عام گاڑیوں سے تیز رفتار ہوتی ہیں۔زیادہ دور نہیں جاسکیں گے۔''

وہ مستفسر ہوئی۔''بھاگنے کے بارے کیا خیال ہے، تکلیف برداشت کرلو گے؟''

میں نے سنجیدہ لہجے میں شرارت اگلی۔''تکلیف کیا چیز ہے، لوگ جان بچانے کو دشمن کا ساتھ برداشت کر لیتے ہیں۔''

''طنز کر رہے ہو؟'' وہ سچ میں سنجیدہ ہوگئی تھی۔

میں اطمینان سے بولا۔''ہاں۔''

وہ کھل کھلائی۔''ریجا! تمھیں اس حالت میں بھی مذاق سوجھ رہا ہے۔''

''ڈر انسان کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔نہ تو مناسب سوچنے کا چھوڑتا ہے اور نہ کچھ کرنے کی ہمت دیتا ہے۔سیانے کہتے ہیں ''جو ڈر گیا وہ مر گیا۔'' موت کا فیصلہ تو کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ڈرنے سے تو بچا جاسکتا ہے۔''

وہ مسکرائی۔''مرنے سے بچنے کی بھی کوشش کی جاسکتی ہے۔'' اور ایک دم کار کچے میں اتار دی۔کار ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔چھوٹے سے میدان کے بعد تعمیراتی علاقہ تھا۔لورا نے گاڑی ایک عمارت کے بغل میں موڑ کر روکی، یوں کہ اب سڑک سے گزرنے والے ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔

چند لمحوں بعد ہی پولیس کی گاڑیاں سائرن بجاتے ہوئے آگے گزر گئی تھیں۔میں نیچے اتر کر موڑ کے پاس پہنچا اور محتاط انداز میں جائزہ لینے لگا۔تین گاڑیاں تیز رفتاری سے آگے گزر گئی تھیں۔میں واپس گاڑی میں لوٹا۔لورا نے اسٹیرنگ وہیل نہیں چھوڑا تھا۔مجھے گھورتے ہوئے اس نے سوالیہ انداز میں سر ہلایا۔

تین گاڑیاں تھیں، شاید پیچھے مزید گاڑیاں بھی پہنچ جائیں۔یہاں چھپنا مناسب نہ ہوگا۔کیوں کہ سیدھی سڑک پر ہمیں نہ پا کر اس جگہ پر شک کیا جاسکتا ہے۔''

اس نے ونڈ بریک ہٹا کر گاڑی ریورس کی، کیوں وہاں سے آگے نہیں بڑھا جاسکتا تھا۔گاڑی جونہی مکان کی آڑ سے نکل کر چھوٹے میدان ہوئی، سڑک پر پولیس کی دو جیپیں نمودار ہوئیں۔بہ صورت حال امکان سے بعید تو نہ تھی، کہ ہمیں اچنبھا ہوتا۔لورا نے دائیں موڑ کاٹتے ہوئے کار آگے بڑھا دی۔پولیس کی جیپیں آگے نکل گئی تھیں، مگر ہم دیکھ لیے گئے تھے۔لورا نے گاڑی گلی میں دوڑا دی۔گلی چونکہ فرلانگ بھر لمبی تھی، کبھی پہلے یہاں نہیں گھسے تھے، ورنہ پولس کی کاروں کو جل دینے میں کامیاب نہ ہو پاتے۔

میں نے پیچھے دیکھا، جیپیں سڑک سے میدان کی طرف مڑ گئی تھیں۔

لورا نے گلی میں گاڑی بھگادی تھی۔ جب تک دشمن میدان سے گلی میں داخل ہوتے ہم گلی عبور کر چکے تھے۔ گلی کے اختتام پر نالا تھا جس پر پل موجود نہیں تھا، لورا نے دائیں جانب اسٹیئرنگ کاٹا، رستہ زیادہ کشادہ نہیں تھا مگر ڈبل کیبن آسانی سے آگے بڑھ سکتی تھی۔ عقب سے فائرنگ کا درمیانی برسٹ ابھرا مگر ہم مڑ چکے تھے۔ البتہ اس فائرنگ نے مکینوں کو ضرور ہڑبڑا دیا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں عموماً دوپہر ڈھلے تک آرام کیا جاتا ہے۔ سورج اب نیچے جھک رہا تھا۔ لورا نے تھوڑا آگے جاتے ہی دوبارہ دائیں جانب اسٹیئرنگ کاٹا اور گلی میں گھس گئی، کیوں کہ راستہ پختہ نہیں تھا۔ اور ناہموار راستے پر تیزی سے گاڑی نہیں بھگائی جاسکتی تھی۔

میں عقبی نشست پر منتقل ہوگیا تھا۔ دشمنوں کی کاریں گلی میں موڑ کاٹتی نظر آئیں۔ اکا دکا گھروں کی بالائی منزل سے متوحش سر گلی میں جھانکتے نظر آئے، مگر کسی نے داخلی دروازہ کھولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''تڑ.....تڑ.....تڑ.....'' کی بھیانک آواز ابھری، ایک دو گولیاں گاڑی کی باڈی میں گھسی تھیں۔ تبھی لورا نے ایک دم بائیں موڑ کاٹا۔ میں چیخا..... ''بریک لگاؤ۔''

میرا سابقہ اقدام اسے یاد تھا، بغیر سوال کے اس نے بریک دبادی تھی۔ نیچے اترتے ہی میں بھاگ کر موڑ کے قریب پہنچا۔ وہ پچاس ساٹھ گز دور تھے اور آندھی وطوفان کی طرح بڑھتے آرہے تھے۔

سیفٹی لیور کو سنگل راؤنڈ پر سیٹ کرتے ہوئے میں نے گھٹنا نیچے ٹیکا مسلسل دو مرتبہ لبلبی دبا کر میں نے اگلی کار کے سامنے والے ٹائر ناکارہ کردیئے تھے۔ کار بری طرح لہرائی اور ایک گھر کے دروازے سے ٹکرا کر ایک جانب آدھی الٹی ہو گئی تھی۔ دوسری کار اس سے بیس پچیس گز پیچھے تھی۔ اگلی کار کو اٹھائے بغیر اس کا وہاں سے گزرنا ممکن نہیں تھا۔ میں بھی گولی چلانے کے بعد سیکنڈ بھر سے زیادہ نہیں رکا تھا اور فوراً بھاگ کر ڈبل کیبن میں بیٹھ گیا۔ لورا تیار تھی۔ بریک سے پاؤں ہٹا کر اس نے ایکسی لیٹر دبادیا۔ پندرہ بیس آگے دائیں جانب ایک اور گلی نکل رہی تھی۔

''دائیں موڑو۔'' گلی نظر آتے ہی میں چیخا۔ کیوں کہ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ ہمیں عقب سے نشانہ بنا سکتے تھے۔

گلیاں اتنی کشادہ نہیں تھیں کہ زیادہ تیز رفتاری سے موڑ کاٹا جاسکتا، اس کے باوجود لورا کافی مہارت اور تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے موڑ کاٹنے تک عقب سے تڑتڑاہٹ کی آواز ابھر چکی تھی۔

لورا نے ہونٹ بھینچتے ہوئے ایکسی لیٹر دبایا، ڈبل کیبن غرا کر بھاگنے لگی۔ ذرا سی بے احتیاطی سے گاڑی کا پہیہ نالی وغیرہ میں پھنس سکتا تھا۔ گلی کی چوڑائی اتنی زیادہ نہیں تھی، مگر مصیبت یہ تھی کہ احتیاط برتنے میں بھی بچت نظر نہیں آرہی تھی۔ دشمن موت کے فرشتے کے روپ میں تعاقب میں تھے۔

اگلا موڑ ملنے تک دشمن گلی کے سرے پر نمودار ہو چکے تھے۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ اور فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ ہمیں نشانہ نہ بنا پاتے۔ میں تیار بیٹھا تھا، جونہی انھوں نے ساکن ہو کر کلاشن کوفیں سیدھی کیں، ان سے پہلے میں نے مسلسل تین چار بار لبلبی دبا کر انھیں حواس باختہ کردیا تھا۔ میں نے ان کی ٹانگوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ اور صرف ایک ہی گولی نشانے کو چھو پائی تھی کہ متحرک گاڑی میں نشانہ سادھنا دشوار ترین ہے۔

ایک کے گرتے ہی باقی دو بوکھلاتے ہوئے آڑ میں ہو گئے تھے۔ اس اثناء میں لورا کو موڑ مل گیا تھا۔ رفتار ہلکی سی کم کر کے اس نے دائیں جانب گاڑی موڑی اور دوبارہ رفتار بڑھادی۔ دشمنوں کی طرف سے ایک دو چھٹے فائر ہوئے، مگر وہ فقط اضطراری فائر تھا۔

گلی کشادہ تھی۔ لورا گاڑی کو سیدھا بھگائے گئی۔ میں عقب کی طرف متوجہ تھا۔ دشمن کسی بھی وقت نمودار ہو سکتے تھے۔ اچانک لورا کی متفکر آواز ابھری۔

''ریجا بری خبر ہے۔''

میں نے منہ بنایا۔''بری خبر براہ راست سنایا کرو، اطلاع دے کر دہری اذیت نہ دیا کرو۔''

وہ جھٹ سے بولی۔''فیول گیج کی سوئی منہ چڑھا رہی ہے۔''

میں منہ بناتے ہوئے بولا۔''ایسے منہ کو چڑھانے کے علاوہ کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔''

مجھے کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے اس نے دانت پیسے۔''شاید تمھیں انڈین ایجنسیوں کے بجائے میرے ہاتھ سے مرنے کا شوق ہے۔''

میں مسکرایا۔''سامنے دیکھو کہیں مروا نہ دینا۔اور مذاق برداشت کرنے کی عادت ڈالو۔''

اسی وقت ایک مکان سے کار برآمد ہوئی اور ہمارے سامنے چلنے لگی۔ چوکیدار کے دروازہ بند کرنے سے پہلے ہم قریب پہنچ چکے تھے۔ایک دم لورا نے گاڑی مکان کے داخلی دروازے کی طرف موڑی، چوکیدار ایک پٹ بند کر چکا تھا۔ پٹ کو ٹکر مار کر ڈبل کیبن اندر گھس گئی۔لورا نے فوراً بریک دبائی، چوکیدار ہکا بکا کھڑا تھا۔اس کے سنبھلنے سے پہلے میں نیچے چھلانگ لگا چکا تھا۔

''دروازہ بند کرو۔''میں نے کلاشن کوف اس کی جانب سیدھی کی۔اس کی رائفل دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔کن اکھیوں سے اپنی رائفل کو دیکھتے ہوئے اس نے تھوک نگلی۔شاید ہیرو بننے کے چکر میں تھا۔

میں نے اطمینان بھرے انداز میں مشورہ دیا۔''گولی سے زیادہ تیز رفتاری سے حرکت کر سکتے ہو تو رائفل تک پہنچنے کی کوشش کرنا مفید ہو سکتا ہے۔''

''کک.....کیا چاہتے ہو؟''وہ ہکلایا۔

''بتا تو دیا ہے کہ دروازہ بند کر دو۔''

اس نے مرے مرے انداز میں دروازہ بند کیا،اسی وقت اندرونی عمارت سے ایک جواں سال عورت برآمد ہوئی۔اس نے گود میں بچہ اٹھایا ہوا تھا۔لورا کلاشن کوف تانتے ہوئے بولی۔

''ہینڈز اپ۔''(ہاتھ اوپر)

میں نے چوکیدار کے قریب ہوتے ہوئے لورا کو جھڑکا۔''عقل کے ناخن لو، بے چاری کی گود میں بچہ نظر نہیں آ رہا۔''

لورا نے دھمکی تبدیل کی۔''غلط حرکت یا چلانے کی کوشش تمھیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔''

میں نے فوراً اسے تسلی دی۔''محترمہ! تمھیں ہم سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا البتہ تمھاری آواز پر ہمارا تعاقب کرنے والے یہاں پہنچ گئے تو ان کی گولیوں سے بچنے کی ضمانت میں نہیں دے سکتا۔''

لورا کی سمجھ میں ہندی وار دو نہیں آتی تھی تبھی خاموش رہی۔ میں نے چوکیدار کو کلاشن کوف سے ٹھوکا دیتے ہوئے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

عورت ہکلاتے ہوئے مجھے مخاطب ہوئی۔''گگ.....گھر میں کچھ ایسا موجود نہیں جسے تم لوٹ سکو۔''

''بی بی! ہم تمھیں لوٹنے نہیں آئے، دشمنوں سے بچنے کو بھاگ رہے ہیں۔اب بہتر ہوگا تم اندر گھس کر دروازہ کنڈی کر لو۔''

وہ گھبراتے ہوئے پوچھنے لگی۔''تت.....تم شمبھو کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔''یقیناً چوکیدار کا نام شمبھو تھا۔

''یہ بھی تمھارے ساتھ ہی ہوگا۔اور اب جلدی سے اندر گھسو۔''آخری الفاظ میں نے قدرے غصے سے بولے تھے۔وہ جلدی سے اندر گھس گئی۔ چوکیدار کو بھی اس کے پیچھے دھکیل کر میں نے ڈرائینگ روم کا دروازہ باہر سے کنڈی

کر دیا۔ چوکیدار کی رائفل دیوار کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔

''یہاں چھپ تو نہیں سکتے۔'' میں نے لورا کا ارادہ جاننا چاہا۔

''عقبی دروازے سے نکلتے ہیں۔'' اس نے متفق ہونے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ یقیناً اس کا وہاں گاڑی لانے کا مقصد چند لمحوں کی مہلت حاصل کرنا تھا۔ کیوں کہ گلی میں گاڑی رکنے پر دشمن جلد ہمیں تاڑ سکتے تھے۔

''چلو۔'' میں آگے بڑھ گیا۔ عقبی دروازہ کھول کر ہم دائیں بائیں کا جائزہ لیتے ہوئے باہر نکلے۔ وہ تنگ سی گلی تھی جس میں موٹر سائیکل، سائیکل کے علاوہ کسی سواری کا گزرنا دشوار تھا۔ گلی میں کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم بائیں جانب روانہ ہو گئے۔

میں نے مشورہ چاہا۔ ''کلاشن کوفیں ہمیں مشکوک بنا رہی ہیں۔''

اس نے ارادہ ظاہر کیا۔ ''دشمن سے ٹاکرا ہو گیا تو پستولوں سے جوابی کارروائی ناممکن ہو گی۔''

میں بیزاری سے بولا۔ ''ہم نے مقابلہ نہیں کرنا چھپنا ہے۔ دشمن اتنی تعداد میں ہیں کہ مقابلہ کرنا خودکشی ہی ہو گی۔''

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولی۔ ''کبھی کبھار مقابلہ مسلط کر دیا جاتا ہے دوست، بچنے کی کوشش بھی رائیگاں جاتی ہے۔''

میں حتمی لہجے میں بولا۔ ''کلاشن کوف پھینک دو۔'' اپنی کلاشن کوف کی میگزین گندی نالی میں پھینکی اور گن کھول کر فائرنگ پن نکال کر توڑ دی تا کہ کلاشن کوف عارضی طور پر ناکارہ ہو جائے۔ کلاشن کوف میں نے ایک گھر کے صحن میں اچھال دی تھی۔

وہ بھی تربیت یافتہ فوجی تھی اور جانتی تھی کہ اگر سپاہی کو اپنا ہتھیار بہ حالت مجبوری پھینکنا پڑے تو اسے ایسی حالت میں چھوڑنا چاہیے کہ دشمن فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اس ضمن میں ہمارے استاد صوبیدار صبر عباس اپنی یونٹ چھے ایف ایف رجمنٹ نشان حیدر کے ایک لانس نائیک، منشا کا واقعہ سنایا کرتے تھے کہ 1971ء کی جنگ میں دوران حملہ لانس نائیک منشا غلطی سے بارودی سرنگی قطعے (مائن فیلڈز) میں گھس گیا۔ اور بارودی سرنگ پھٹنے پر زخمی ہو کر وہیں گر گیا۔ اسے جلدی میں وہاں سے نکالنا ناممکن تھا، کیوں کہ ایک تو جب تک مائن ڈیٹکٹر اور مخصوص جوتے وغیرہ نہ ہوں بارودی سرنگی قطعے میں گھسنا ممکن نہیں ہوتا اور ایک کو بچانے میں دوسری جانیں ضائع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی خطرہ مول نہیں لیتا۔ دوسرا حملے کے دوران زخمیوں و لاشوں کو اسی جگہ پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور حملے کی کامیابی یا ناکامی کے بعد اتلافیوں کو سنبھالا جاتا ہے۔

خیر جنگ نے طول کھینچا، اسے بروقت نہ نکالا جا سکا۔ اور لانس نائیک منشا وہیں شہید ہو گیا۔ ایک دو دن بعد جب انجینئرز کی ایک یونٹ نے اسے مائن فیلڈ سے نکالا تبھی اسے اٹھانے والے متجسس ہوئے کہ منشا کی لاش کے ساتھ ایک مٹی کی ڈھیری بنی ہوئی تھی۔ جب ڈھیری کو بکھیرا تو اندر ایک ایل ایم جی دفن تھی۔ مرنے سے پہلے پاک آرمی کے جوان نے اپنا ہتھیار دشمن کے قبضے میں جانے سے بچانے کو اسے دفن کر دیا تھا۔ اسے کہتے ہیں تربیت اور اسے کہتے ہیں ملک سے وفاداری۔ جو سپاہی مرتے وقت بھی ملک کے فائدے کا سوچ رہا تھا اس کی نیت پر شک کرنا ظلم و زیادتی نہیں تو کیا ہے۔

لورا براؤن نے بھی اپنی گن ناکارہ کر کے ایک مکان کی چھت پر پھینک دی۔ اب ہمارے پاس فقط پستول تھے۔ لورا نے قدموں کی رفتار بڑھائی۔ مگر میں اس کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا۔ جسم میں پہلی سی چستی و جان نہیں رہی تھی۔ مجھے آرام و علاج کی سخت ضرورت تھی۔ ممتا دیدی نے جو درد کش گولیاں کھلائی تھیں ان کا اثر بھی ختم ہو چکا تھا۔ میں نے جیب سے گولیوں کا پتا نکال کر دو گولیاں بغیر پانی کے نگل لیں۔ لیکن صرف ان گولیوں کے بل بوتے پر میری کھوئی ہوئی جسمانی طاقت و قوت اور قدرتی صلاحیتیں نہیں لوٹ سکتی تھیں۔ جلادوں نے میرے انجر پنجر ڈھیلے کر دیے تھے۔ مجھے سنبھلنے کو چند دن، اچھی خوراک اور دوا کی ضرورت تھی۔

وہ چند قدم آگے نکل گئی تھی۔ میرا پیچھے رہنا محسوس کرتے ہی وہ قدموں میں سستی لاتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں تکلیف کو پس پشت ڈالنا پڑے گا۔''

میں تحمل سے بولا۔ ''تمہارا ساتھ دینے کی کوشش کر تو رہا ہوں۔''

وہ مصر ہوئی۔ ''جلد ہی وہ علاقے کو گھیر لیں گے۔ اور اس سے پہلے ہمیں زیادہ سے زیادہ دور جانا ہوگا۔''

میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ بہ مشکل غصے پر قابو پاتے ہوئے میں تجویز دی۔ ''ٹھیک ہے تم جا سکتی ہو۔ یقیناً علیحدگی ہی میں ہماری بچت کے امکان بڑھیں گے۔''

ایک دم قریب ہوتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ تھاما۔ ''ریجا خفگی کے بہانے مت ڈھونڈو، تم نے وعدہ کیا تھا شکار مارنے میں میری مدد کرو گے۔''

''تم میری جسمانی حالت سے واقف ہو پھر ایسی بکواس کا مقصد؟''

اس نے سرعت سے صفائی دی۔ ''جلد بازی میں دھیان نہ رکھ سکی۔''

میرے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا۔ ''اتنی بے دھیانیاں اچھی نہیں ہوتیں۔''

وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''شروع ہو گئی ریجا کی بکواس۔ یقین کرو افغانستان کے محاذ پر تم سے اتنا متاثر ہوئی تھی کہ تمہاری تلاش میں پاکستان جانے پر تل گئی تھی۔ وہ تو شکر ہے میجر جینفر ہنڈسلے سے ملاقات ہوئی اور پتا چلا تم کتنے ٹھرکی ہو۔''

میں نے قہقہہ لگایا۔ ''وہاں کئی بار تم سے گفتگو ہوئی تھی۔ اور ہر بار میں نے ڈیٹ کا وعدہ لیا تھا، تب اندازہ نہیں ہوا تھا۔''

اس نے منہ بسورا۔ ''میں نے سوچا مذاق کر رہے ہو۔''

''اور کب لگا کہ میں سنجیدہ ہوں۔'' میں اسے کریدنے پر تل گیا۔

اس نے صفائی سے موضوع تبدیل کیا۔ ''کیا یہ وقت ان باتوں کا ہے؟'' ہم گلی کے سرے پر پہنچنے والے تھے۔ وہ گلی ایک چوڑی گلی میں ضم ہو رہی تھی۔ اور چوڑی گلی آگے جا کر اس گلی سے مل رہی تھی جہاں سے ہم گھر میں گھسے تھے۔ دو لڑکے سامنے سے نمودار ہوئے۔ لورا کو اشتیاق بھری نظروں سے گھورتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے تھے۔

لورا دو قدم آگے تھی۔ جونہی اس نے چوڑی گلی میں قدم دھرے، فوراً الٹے قدموں پیچھے ہوئی۔ میں ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

وہ پریشانی سے بولی۔ ''دو مسلح پولیس والے اسی طرف آ رہے ہیں۔''

''تمہیں دیکھا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''شاید نہیں۔''

جتنی دیر گزرے گی، ان گلیوں میں دشمنوں کی نفری میں اضافہ ہوتا جائے گا۔''

وہ متفکر ہوئی۔ ''کیا کریں؟''

میں نے مشورہ دیا۔ ''قریبی مکان میں گھس کر تھوڑا انتظار کرتے ہیں، ان کے گزرنے کے بعد آگے بڑھیں گے۔'' مکان کا دروازہ بہ مشکل پانچ فٹ اونچا تھا، لورا آسانی اندر گھس کر میرے لیے دروازہ کھول سکتی تھی۔

وہ متعلق ہوتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔ ''جلدی کرنا پڑے گی۔''

مگر اس کی تیزی کام نہ آئی کہ ہم پہلے ہی دیر کر چکے تھے۔ پولیس وردی کی جھلک نظر آئی۔ وہ ہماری تلاش میں گھوم

رہے تھے اور ناممکن تھا کہ ذیلی گلیوں میں نہ جھانکتے۔ لورا کی شناخت نہایت آسان تھی اس میں چند قدموں کا فاصلہ رکاوٹ نہیں ڈال سکتا تھا۔

انھیں دیکھتے ہی میرے نے ہاتھ بجلی کی سی سرعت سے پستول کے دستے پر قبضہ جمایا، انھوں نے بھی لورا کو پہچانتے ہی کلاشن کوفیں سیدھی کرنے کی کوشش کی، لیکن اس دوران میں ہیمر کو پیچھے کھینچ کر سیفٹی ہٹا چکا تھا۔ پستول پہلے سے کاک تھا۔ دو مرتبہ لگاتار لبلبی دبا کر میں نے دو راؤنڈ فائر کیے، اتنی سرعت سے فائر ہوئی گولیاں کلاشن کوفوں کے فرنٹ ہینڈ گارڈ سے ٹکرائی تھیں۔ فائر کے جھٹکے سے ان کی کلاشن کوفیں نیچے گر گئی تھیں۔ ایک گولی اچٹ کر ایک پولیس والے کے بازو سے ٹکرائی تھی۔ مگر کلاشن کوف کے فرنٹ ہینڈ گارڈ سے ٹکرانے کی وجہ سے گولی کی طاقت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ وہ خراش ڈالنے سے زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکی تھی۔

ہلکی سی چیخ کے ساتھ مضروب نے اپنا بازو تھام لیا تھا۔

میں دھاڑا۔ ''ہاتھ اوپر۔''

زخمی تو اپنے بازو کو ہاتھ سے دبا کر ترحم آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگا البتہ دوسرے کے ہاتھ بلند ہو گئے تھے۔

لورا زقند بھرتے ہوئے ان کے قریب پہنچی، کلاشن کوفیں اٹھا کر اس نے ایک سلنگ اپ (کندھے سے لٹکانا) کی اور دوسری پولیس والوں پر تان لی۔

''چلو۔'' اس نے بچ جانے والے کی پیٹھ میں نال چبھوئی۔

دونوں تنگ گلی میں آ گئے تھے۔

''اڑا دوں۔'' لورا نے مشورہ چاہا۔ پولیس والوں کو اس کے ہونٹوں پر پھیلا شرارتی تبسم نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور اتنی انگریزی تو وہ بھی جانتے تھے کہ انھیں قتل ہونے کے مشورے ہو رہے تھے۔

زخمی گڑگڑایا۔ ''بھگوان کے لیے مت مارو، ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''

میں پستول کی نال لہراتا ہوا بولا۔ ''تمھارے بچوں کے بڑے ہونے کا انتظار نہیں کر سکتے۔''

وہ ملتجی ہوا۔ ''ہم تمھارے بارے کسی کو بھی نہیں بتائیں گے۔''

لورا نے بے صبری ظاہر کی۔ ''ریچا وقت ضائع کر رہے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''مکان کا دروازہ کھولو۔''

وہ سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھی، دروازے پر ہاتھ رکھ کر اچکی اور دروازہ عبور کر گئی۔

اچانک کسی مرد کی کرخت آواز ابھری۔ ''کون ہوا وے۔''

جواباً لورا نے انگریزی میں گٹ مٹ کی، آواز اتنی مدہم تھی کہ میرے کانوں تک مفہوم نہیں پہنچا تھا۔ للکارنے والا شاید چوکیدار تھا۔ اور چوکیدار عموماً ان پڑھ یا واجبی تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ یقیناً اس کے پلے لورا کا جواب نہیں پڑا تھا تبھی وہ دوبارہ بولا۔

''تم غیر قانونی طور پر گھر میں گھسی ہو، میں تمھیں پولیس کے حوالے..... اف.....'' فقرہ مکمل کرنے سے پہلے اس کے منہ سے زوردار کراہ خارج ہوئی۔ لمحہ بھر بعد دروازہ کھل گیا۔ پولیس والوں کو آگے لگا کر میں اندر گھس گیا۔ دروازے کے سامنے مختصر سا صحن اور اس سے ملحق گیراج بنا تھا۔ گاڑی موجود نہیں تھی، شاید صاحب خانہ دفتر وغیرہ گیا تھا۔ چوکیدار گیراج کے سامنے ہی پلاسٹک کی کرسی کے ساتھ لمبا پڑا تھا۔ ایک جدید ساخت کا ''ریپیٹر'' دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ بے چارے کو اپنا ہتھیار استعمال کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔

ہمارے اندر آتے ہی لورا نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

''اب کیا کریں؟'' لورا نے اگلے اقدام کے بارے میری رائے لی۔

سرعت سے فیصلہ کرتے ہوئے میں نے پولیس والوں کو حکم دیا۔ ''وردیاں اتارو۔''

''کک.....کیا.....؟'' وہ ہکلا گئے تھے۔

میں درشتی سے بولا۔ ''یقین کرو لاشوں سے وردیاں اتارنا مشکل نہیں مگر خون کے دھبے سے وردیوں کے خراب ہونے کا خدشہ مجھے روکے ہوئے ہے۔'' وہ کانپتے ہوئے قمیص کے بٹن کھولنے لگے۔

''جلدی کرو۔'' پستول کی نال لہراتے ہوئے میں نے ہدایت دی۔

انھوں نے فوراً سے وردیاں اتار دی تھیں۔

''گھوم جاؤ۔'' میں نے انھیں دیوار کی طرف رخ کرنے کا کہا اور ان کے مڑتے ہی لورا کو مخصوص اشارہ کیا۔

لکڑی کے بٹ والی کلاشن کوف کو نال سے پکڑتے ہوئے اس نے باری باری دونوں کے سر بجائے، وہ چوکیدار کے قریب اوندھے منہ نیچے گر گئے تھے۔

انھیں وردیاں اتارتے دیکھ کر لورا میرا منصوبہ جان گئی تھی۔ ان کے بے ہوش ہوتے ہی اس نے بے باکی سے اپنا لباس اتار دیا۔ اسے مختصر لباس میں دیکھنا، نیا یا انوکھا نہیں تھا۔ وہ کئی بار تیراکی کے مختصر لباس میں خوشنما بدن کے نشیب و فراز کا تعارف کرا چکی تھی۔ البتہ کسی عورت کو ایک سے زائد بار مختصر لباس میں دیکھنا، بدنظری کے جائز ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ بے شک اس کی تہذیب و ثقافت اسے شرم و حیا نہیں سکھا سکی تھی، لیکن میرا مذہب و معاشرت میرے لیے ایک دائرہ کار و حدود مقرر کرتا ہے۔ ہوش و خرد سے بیگانہ کرنے والے بدن سے نظریں چرا کر میں پولیس وردی اٹھانے لگا۔ اس نے میرے لیے زخمی شخص والی وردی چھوڑی تھی۔ اس کے بازو پر خون لگا تھا۔ گیراج کی دیوار کی آڑ لے کر میں نے جلدی سے لباس اتار کر وردی پہنی۔ پولیس والے کا قد مجھ سے بڑا تھا تبھی پتلون ذرا لمبی تھی۔ پائینچے اندر کی طرف موڑ کر میں نے پولیس والے کے جوتے اتار کر پہن لیے تھے۔

لورا بھی تیار ہو گئی تھی۔ اس کا قد قریباً میرے برابر ہی تھا۔ ایک ادھ انچ کا فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میرا قد پانچ فٹ نو انچ ہے۔ اور مردوں میں یہ درمیانی قامت سمجھی جاتی ہے، لیکن عورتوں کے لحاظ سے یہ لمبا قد سمجھا جاتا ہے۔ اسے پولیس والے کی وردی فٹ آئی تھی۔ جوتے البتہ اس نے اپنے ہی پہنے رکھے کیوں کہ عورتوں کے پاؤں مردوں سے کافی چھوٹے ہوتے ہیں۔

پولیس والوں اور چوکیدار کی مشکیں کس کر ہم نے اصل عمارت اور بغلی دیوار کے درمیانی خلا میں لٹا دیا۔ ان کے منہ باندھنے بھی ہمیں نہیں بھولے تھے۔ وہاں وہ آسانی سے نظر نہیں آ سکتے تھے۔ گھر کے مکین آرام سے سوئے تھے۔ بند کمرے اور اے سی کی ٹھنڈک نے انھیں اپنے چوکیدار کی حالت سے بے خبر رکھا تھا۔ یوں بھی گیراج میں گاڑی کی غیر موجودی ظاہر کر رہی تھی کہ گھر کا مالک موجود نہیں تھا۔ خاتون خانہ اور زیادہ سے زیادہ معصوم بچوں کی موجودی کا احتمال تھا۔ وہاں چھپنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کلاشن کوفیں اٹھا کر ہم محتاط انداز میں گھر سے باہر نکل آئے۔

ساری کارروائی میں چند منٹ ضائع ہو گئے تھے۔ ایک عام آدمی اور تربیت یافتہ سپاہی میں یہی بنیادی فرق ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں عام آدمی حوصلہ چھوڑ کر رونے دھونے بیٹھ جاتا ہے۔ کوئی مضبوط اعصاب کا ہو تو فرار کی کوشش تو کرتا ہے، مگر اسے دشمنوں سے بچنے، جان بچانے اور اپنی حفاظت کے طریقہ کار سے واقفیت نہیں ہوتی۔ وہ بروقت فیصلہ نہیں کر پاتا۔ جبکہ تربیت یافتہ سپاہی ہمت و حوصلے سے کام لیتا ہے۔ اسے اپنی حرکات و سکنات پر قابو ہوتا ہے۔ گو دشمنوں

سے بچنے اور نبرد آزما ہونے کے لگے بندھے اصول تو نہیں ہیں کہ ہر کسی کو ایک سے حالات پیش آئیں۔ دوران تربیت ہمیں بھی مختلف حالات سے روشناس کرایا گیا تھا۔ بے شک عملی زندگی میں تربیت میں سیکھے ہوئے مسائل سے واسطہ نہ پڑے مگر بنیادی اصولوں کو جاننے کے بعد نت نئے مسائل سے نبٹنا ناممکن نہیں رہتا۔

غربی جانب تھوڑے فاصلے پر فائرنگ کی تیز آواز ابھری۔ شاید کوئی بے چارہ ہماری تلاش میں سرگرداں ٹولی کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کوئی اور گروہ آپس میں ٹکرا گئے ہوں۔ یہ موقع بھاگنے کے لیے نہایت غنیمت تھا۔ اس سے پہلے میں نے پستول سے دو گولیاں فائر کی تھیں، پستول اتنی زیادہ آواز پیدا نہیں کرتا کہ آواز زیادہ دور تک جائے۔ یقیناً اسی وجہ سے کوئی سن گن لینے وہاں نہیں پہنچا تھا۔ مگر اب کلاشن کوفیں گرج تھیں۔ اور پانچ چھے چھٹے (برسٹ) اکٹھے فائر ہوئے تھے، ناممکن تھا ہماری تلاش میں سرگرداں ٹولیاں اس جانب کا رخ نہ کرتیں۔ لورا نے اپنی زلفوں کو لپیٹ کر ٹوپی کے اندر قید کر دیا تھا، یوں وہ دور سے مرد ہی نظر آنے لگی تھی۔ ہم نے جانے کی سمت میں تبدیلی نہیں کی تھی۔ چوڑی گلی میں نکلتے ہی بائیں جانب سے ہیوی بائیک کی مخصوص آواز ابھری۔

وہ جوش سے چلائی۔ ''ریجا!.....اسے روکو۔'' اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر سر سے ٹوپی اتار کر سنہری بال لہراتے ہوئے گلی کے درمیان میں ہو گئی۔ موٹر سائیکل پر دو لڑکے سوار تھے۔ ان کا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ویسے بھی اتنی قیمتی موٹر سائیکل خریدنا عام لوگوں کے بس سے باہر ہوتا ہے۔ ایسے بگڑے رئیس زادے کبھی پولیس کے اشارے پر نہ رکتے، مگر روکنے والی کی صورت ایسی نہیں تھی کہ کسی جوان لڑکے کا بریک پر دھرا پنجہ نیچے کو نہ دبتا۔

موٹر سائیکل چلانے والا ہیلمٹ اتارتا ہوا عاشقانہ لہجے میں بولا۔ ''ہائے، ایسی کڑک پولیس والی پہلی بار نظر آئی ہے۔''

لورا کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی تھی۔ وہ انھیں روکنے کا سبب بتانے لگی۔ ''جانتے نہیں اس موٹر سائیکل پر ڈبل سواری منع ہے۔''

موٹر سائیکل چلانے والا اوباشانہ انداز میں بولا۔ ''بے بی تم ہمارے درمیان بیٹھ جاؤ، تین افراد پر تو پابندی نہیں ہے نا۔ اور بے فکر رہو تمھیں ایسی عیش کرائیں گے کہ کبھی نہیں کی ہوگی۔'' اس نے انگریزی ہی سہارا لیا تھا۔ یوں بھی انگریزی اس طبقے کے لوگوں کی پسندیدہ زبان ہوتی ہے۔

''اچھا مشورہ ہے۔'' لورا قریب ہوئی، اس کا دایاں مکا بجلی کی سی سرعت سے موٹر سائیکل چلانے والے کی کنپٹی سے ٹکرایا، اس نے جھولتے ہوئے ہنڈل پر سر ٹیک دیا تھا۔

''تت.....تم جانتے نہیں ہم کون ہیں۔'' ساتھی کو اتنا غفیل ہوتے دیکھ کر دوسرے نے گھبرائے ہوئے انداز میں دھمکی دی۔ بدحواسی میں اسے انگریزی بولنا بھول گیا تھا۔ لورا کا دوسرا مکا اس کی گردن پر لگا تھا۔ اپنے ساتھی کو تو اس نے سہارا دیا تھا۔ لیکن اسے روک میسر نہ ہوئی۔ وہ گلی کے پختہ فرش پر جا گرا تھا۔ گود میں رکھا ہیلمٹ بھی نیچے گر کر لڑھکتا ہوا گلی کے وسط میں پہنچ گیا۔

دوسرے کو بھی نیچے دھکیل کر لورا نے ڈرائیونگ سنبھال لی۔

میرا ایسی موٹر سائیکل کی سواری کا پہلا موقع تھا۔ لیکن لورا کا جوش دیکھ کر ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ نہ صرف اچھی طرح موٹر سائیکل چلا سکتی ہے بلکہ وہ اس کی پسندیدہ سواری بھی ہے۔ اس نے ہیلمٹ پہن کر شیشہ اٹھایا۔

''بیٹھو۔'' ہینڈل پکڑتے ہی اس نے خالی ریس دی۔ انجن کی مخصوص آواز نے اس کے ہونٹوں پر خوب صورت تبسم

بکھیر دیا تھا۔

اس کی سیٹ عام موٹر سائیکلوں سے مختلف ہوتی ہے، یوں کہ عقب میں بیٹھنے والے کو آگے والے سے لپٹنا پڑتا ہے۔ مگر حالات ایسے نہیں تھے کہ میں ان باریکیوں میں پڑتا۔ مجھے خود کبھی ایسی موٹر سائیکل چلانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس لیے میں ڈرائیونگ کا تقاضا بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہیلمٹ پہن کر مجبوراً اس کے پیچھے بیٹھنا پڑا۔ ایک دم دماغ ماضی کے سفر پر روانہ ہوا جب مجھے جان حیات پلوشہ کے ساتھ بیٹھنا نصیب ہوا تھا۔ البتہ لورا اور اس کی بے باکی میں ایک واضح فرق موجود تھا۔ اس کی بے باکی و بے تکلفی صرف اپنے راجو کے لیے تھی جبکہ لورا کے لیے میرا وجود کسی اہمیت کا حامل تھا تو بس اپنے مقصد کے حصول کو تھا۔

ہم نے فائرنگ پنیں توڑ کر کلاشن کوفیں وہیں پھینک دی تھیں۔ میرے نشست سنبھالتے ہی اس نے گیئر لگاتے ہوئے ریس دی۔ موٹر سائیکل جھٹکا کھا کر آگے بڑھی۔ اس موٹر سائیکل کی درمیانی رفتار بھی ایسی تھی لگا کمان سے تیر چھوٹا ہو۔ مجھے مجبوراً اس سے چمٹنا پڑا تھا۔ موڑ موڑتے ہی پولیس کی ایک جیپ اور دو سفید کاریں نظر آئیں جو اسی جانب بڑھ رہی تھیں۔ ان کے کچھ سمجھنے تک لورا دائیں جانب سے موٹر سائیکل نکال کر آگے بڑھ گئی تھی۔

میں نے مڑ کر دیکھا پولیس جیپ رک گئی تھی، یقیناً انھیں ہم پر شک ہو گیا تھا، کیوں کہ پولیس والوں کے پاس ایسی موٹر سائیکلیں نہیں ہوتیں۔ پولیس والوں کی جیپ کے ساتھ نہ رکنا ہمیں مزید مشکوک بنا رہا تھا۔ ہیلمٹ کے نیچے سے لورا کے سنہری بال بھی جھلک رہے تھے، شاید کسی کی باریک بین نگاہوں نے انھیں بھی جانچ لیا ہو۔ جیپ کے مڑنے تک لورا دوسری گلی میں گھوم چکی تھی۔ گو جیپ اور کار والے ہم تک نہیں پہنچ سکتے تھے مگر یقیناً ان گلیوں میں بڑی تعداد میں دشمن جمع ہو چکے تھے، ان سے بچنا کافی دشوار گزار تھا۔

دوسری گلی ہی میں مجھے اپنی سوچ کی تصویر نظر آئی۔ سفید رنگ کی کار کو ترچھا کھڑا کر کے ہمارا رستہ روک دیا گیا تھا۔ لورا نے ایک دم بریک دبائی، موٹر سائیکل کے پہیے زمین میں گڑ گئے تھے۔ دایاں پاؤں نیچے ٹیکتے ہوئے اس نے ریس دے کر ایک دم کلچ چھوڑا موٹر سائیکل پیچھے گھوم گئی تھی۔ بلاشبہ وہ ماہر سوار تھی۔ ہمیں روکنے والے بے فکر کھڑے تھے، ہمیں مڑتا دیکھ کر انھوں نے ہتھیار سیدھے کیے، مگر تب تک لورا موڑ مڑ چکی تھی۔ پچاس ساٹھ قدم جاتے ہی اس نے ایک تنگ گلی میں موٹر سائیکل گھسا دی۔ وہ گلی زیادہ لمبی نہیں تھی۔ اگلی گلی میں نکلتے ہی دو مسلح افراد نظر آئے، ہمیں دیکھتے ہی انھوں نے ہتھیار سونتنے کی کوشش کی مگر ان کے سنبھلنے تک ہم سر پر پہنچ گئے تھے۔ جان بچانے کو وہ دائیں بائیں ہوئے۔ انھیں یونہی چھوڑنا مناسب نہیں تھا، عقب سے فائر کر کے وہ ہمیں نقصان پہنچا سکتے تھے۔ لورا ابھی بچی نہیں تھی کہ یہ اندازہ نہ کر پاتی۔ ان کے قریب پہنچتے ہی لورا نے بریک دبائی، تب تک میں جیب سے پستول برآمد کر چکا تھا۔ دائیں والے کی چھاتی میں لات رسید کر کے میں بائیں والے کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے دائیں ہاتھ کو نشانہ بنا کر لبلبی دبا دی۔ چیخ مارتے ہوئے اس نے دایاں ہاتھ بغل میں دبا لیا تھا۔

میں نے دوسرے کا رخ کیا، اس کے کانوں میں بھی گولی کے دھماکے اور اپنے ساتھی کی چیخ پہنچ چکی تھی۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ اٹھاتے ہوئے میرا کام آسان کر دیا تھا۔

اس کے بھی دائیں ہاتھ میں سوراخ کرتے ہوئے میں نے لورا کو چلنے کا کہا۔ ان کے دائیں ہاتھ کو نشانہ بنانے کی وجہ بھی یہی تھی کہ ہمیں عقب سے نشانہ نہ بنا سکیں۔

لورا نے ایک جھٹکے سے موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔ گلی دائیں جانب مڑی، آگے سفید کار نظر آئی۔ ایک دم ہم آمنے سامنے ہو گئے تھے۔ لورا کار کے بغیر کار کے بائیں جانب سے لہرا کر آگے بڑھ گئی۔ کار روک کر وہ نیچے اترے، مگر ان کے

فائر کرنے سے پہلے ہم دور ہو چکے تھے۔ سہ پہر ہو گئی تھی اور گلیوں میں لوگوں کا رش بڑھ رہا تھا۔ عام لوگوں کو بچانے کو وہ اندھا دھند فائر نہیں کر سکتے تھے۔ اور یہ بات ہمارے حق میں جاتی تھی۔ افراد، رکشوں اور ریڑھیوں سے موٹر سائیکل کو بچاتے ہوئے لورا کمال مہارت سے آگے بڑھتی رہی۔ اسے سڑک کی تلاش تھی۔ اور اس بار ہمیں ناکامی نہیں ہوئی تھی۔ گلی کا اختتام سڑک پر ہوا تھا۔

سڑک پر آتے ہی لورا نے رفتار خطرناک حد تک بڑھا دی تھی۔ ہمارے عقب میں دو تین کاریں بھی نمودار ہوئیں، مگر سڑک پر وہ ہیوی موٹر سائیکل کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ لورا موٹر سائیکل کو لہراتے ہوئے گاڑیوں کے درمیانی خلا سے یوں گزر رہی تھی جیسے مچھلی پانی میں تیرتی ہے۔ اور مجھے ہر لمحے یہی لگ رہا تھا کہ وہ موٹر سائیکل کسی گاڑی میں ٹھوک دے گی۔ عام موٹر سائیکل کے پچھلے سوار کو ڈر لگا رہتا ہے، وہ تو ہیوی بائیک تھی۔ مگر میرے اعصاب مضبوط تھے تبھی برداشت کیے بیٹھا رہا۔ بلاشبہ میں اس مہارت سے کبھی موٹر سائیکل نہ چلا پاتا۔ بلکہ اس موٹر سائیکل کو تو شاید چلا ہی نہ پاتا۔

وہ چند کلومیٹر سے زیادہ سڑک پر نہیں چلی تھی، کیوں کہ سڑک پر ہمیں گھیرنا زیادہ آسان ہو جاتا۔ رفتار کم کرتے ہوئے اس نے ایک گلی میں موٹر سائیکل موڑ دی۔ ہر طرف چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ لورا نے رفتار دھیمی کر لی تھی، مگر اب لباس مسئلہ پیدا کر رہا تھا۔ پولیس کی وردی لوگوں کو زیادہ متوجہ کرتی ہے۔

میں نے کہا۔ ''ہمیں کپڑے تبدیل کرنا ہوں گے۔''

اس نے تیار شدہ (ریڈی میڈ) کپڑوں کی دکان کے سامنے بریک دباتے ہوئے کہا۔ ''چلو۔''

موٹر سائیکل کھڑی کر کے ہم اندر گھس گئے۔ آج میڈیا بہت تیز ہو گیا ہے۔ اور مجھے ڈر تھا کہ شاید ہمارے بارے خبر چل رہی ہو۔ دکان میں ٹی وی کو نہ پا کر مجھے اطمینان ہوا تھا۔ ہم نے دیر کیے بغیر اپنے لیے ایک ایک لباس کا انتخاب کیا اور ''ٹرائی روم'' میں گھس گئے۔ دونوں نے جینز کی پتلون اور نصف بازو کی بنیان منتخب کی تھی۔ وردیاں ہم نے ٹرائی روم ہی میں چھوڑ دی تھیں۔ میرے پاس گوتم لوگوں کی جیب سے نکالی ہوئی نقدی موجود تھی۔ اس لیے میں نے دکان دار کا نقصان نہ ہونے دیا۔

''اب کہاں جائیں گے؟'' دکان سے نکلتے ہوئے لورا مستفسر ہوئی۔

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''میری جسمانی حالت علاج و آرام کی متقاضی ہے۔''

وہ شوخی سے ہنسی۔ ''میں ڈاکٹر تو نہیں ہوں کہ کچھ کر سکوں۔''

میں ترکی بہ ترکی بولا۔ ''جو تمھارے بس میں ہے اسی کا اقرار کر لو کافی ہے۔''

''بکواس کرنا کوئی ریجا سے سیکھے۔'' منہ بناتے ہوئے اس نے چابی میری طرف بڑھائی۔ ''ڈرائیونگ کرو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ موٹر سائیکل کبھی نہیں چلائی۔''

مجھے تیکھی نظروں سے گھورتے ہوئے وہ شکی لہجے میں بولی۔ ''جھوٹ نہ بولو۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیسے یقین آئے گا۔''

''رہنے دو۔'' وہ تلملاتے ہوئے موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی۔ میں نے بھی اپنی جگہ سنبھالی۔ اگنیشن میں چابی گھما کر اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور آگے بڑھ گئی۔

لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔ ''بتایا نہیں کدھر جانا ہے۔''

''ممبئی، ہمارے لیے ایک جیسا انجان ہے۔''

''کوئی مشورہ تو دے سکتے ہو نا۔''

''ہوٹل وغیرہ میں رہنا تو خطرے سے خالی نہ ہوگا، کوئی مکان ہی ڈھونڈنا پڑے گا۔''

اس نے مسئلہ ظاہر کیا۔ ''پیسوں کا مسئلہ بھی تو بنے گا۔''

میں نے حل پیش کیا۔ ''موٹر سائیکل بیچنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔''

وہ خفگی سے بولی۔ ''موٹر سائیکل چوری کی ہے۔''

میں ہنسا۔ ''یہاں چوری کا مال خریدنے والوں کی کمی نہیں ہے۔''

وہ متفق ہوئی۔ ''تو رہنمائی کرو، یوں بھی موٹر سائیکل کو مزید ساتھ رکھنا مناسب نہ ہوگا۔''

میں نے اسے ایک رکشے والے کے قریب رکنے کو کہا، جو رکشا گلی کی ایک جانب رو کے سواری کا منتظر تھا۔ بلکہ ایک قطار میں چند رکشے کھڑے تھے۔

ہمارے رکنے پر وہ متوجہ ہوا۔ میں نے ہیلمٹ کا شیشہ اٹھا کر کہا۔ ''مہاراج! کسی اچھی موٹر سائیکل ورکشاپ تک رہنمائی کردیں۔''

وہ لورا پر گہری نگاہ ڈال کر میری طرف متوجہ ہوا۔ ''وجے نگر جانا پڑے گا۔''

'اس کے انداز سے لگا وجے نگر تھوڑی دور ہے۔ میں نے پوچھا۔ ''نزدیک میں کوئی ورکشاپ نہیں ہے؟''

وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''تم نے اچھی ورکشاپ کا پوچھا ہے۔ ورنہ سو قدم آگے بھولے استاد کی ورکشاپ ہے، البتہ اس کی ایمان داری کی ضمانت نہیں دے سکتا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرانی ظاہر کی۔

اس نے منکشف کیا۔ ''تمھیں پتا بھی نہیں چلے گا اور نئی موٹر سائیکل سے اصل پرزہ نکال کر دوسرا جوڑ دے گا۔''

ہمیں بھی ایسے ہی استاد کی تلاش تھی۔ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے لورا کو چلنے کا کہا۔ اس نے سر سے ہیلمٹ اتارنے کی غلطی نہیں کی تھی، کیوں کہ اپنی رنگت و شباہت کی وجہ سے وہ آسانی سے پہچان لی جاتی۔ البتہ ہیلمٹ اس کے صنف نازک ہونے کو نہیں چھپا سکتا تھا۔ نصف بازوؤں کی چست بنیان فراخ دلی سے دعوت نظارہ دے رہی تھی۔ تبھی رکشے والا مخاطب مجھے اور متوجہ اس کی جانب رہا۔ البتہ انڈیا میں عورتوں کا موٹر سائیکل چلانا اتنا انوکھا یا حیران کن نہیں کہ خصوصی توجہ کا حامل بن سکے۔ آج کل تو پاکستان میں بھی خواتین موٹر سائیکل کی سواری کرتی نظر آجاتی ہیں۔ اگر ستر پوشی و پردے کا اہتمام کیا جائے تو اس پر اعتراض کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ کیوں کہ ماضی بعید میں مسلمان خواتین بڑے شوق سے گھڑسواری کیا کرتی تھیں۔ موٹر سائیکل اور گھڑسواری میں خاصی مشابہت ہے۔ البتہ کھلا لباس اور بے پردگی کی چھوٹ شریعت نہیں دیتی۔ اور نقاب میں موٹر سائیکل چلانا چنداں دشوار نہیں ہے، کہ نقاب ڈرائیونگ پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوتا۔ بلکہ ہیلمٹ بہ ذات خود بہترین نقاب ہے۔

ورکشاپ ایک بغلی گلی میں تھی جو بھولے استاد کی دکان پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ وہاں سے آگے جانے کا رستہ نہیں تھا۔

ایک پرانی موٹر سائیکل سے چھیڑ چھاڑ کرنے والے لڑکے سے رہنمائی لے کر ہم بھولے استاد کی جانب بڑھ گئے۔ تیل سے چیکٹ شلوار قمیص میں ملبوس وہ ادھیڑ عمر کا صحت مند شخص تھا۔ آنکھوں میں سفاکی و مکاری کی چمک اس کے کرتوتوں کی مظہر تھی۔

اس نے بھی لورا پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ ''کیسے آنا ہوا باؤ؟''

میں سیدھا مدعے پر آیا۔ ''موٹر سائیکل بیچنا ہے۔''

وہ رکھائی سے بولا۔ ''یہ ورکشاپ ہے بارگین نہیں ہے۔''

میں بغیر لگی لپٹی بولا۔ ''موٹر سائیکل چوری کی ہے، کسی نے آپ کا پتا بتایا تو یہاں آ گئے۔ نہیں خریدو گے تو چلے جائیں گے۔''

وہ متحیر ہوا۔ ''ہوش میں ہو۔''

میں اعتماد سے بولا۔ ''بھولے استاد! اتنے بھولے نہ بنو۔ آپ اچھی طرح جانتے میں کیا کہہ رہا ہوں۔''

وہ نظریں چراتے ہوئے مشکوک لہجے میں بولا۔ ''تمہیں شاید کسی نے غلط پتا بتا دیا ہے۔''

میں نے اسے تسلی دی۔ ''ڈرو مت، ہمارا تعلق خفیہ پولیس وغیرہ سے نہیں ہے۔ بلکہ ہم خود پولیس سے چھپتے پھر رہے ہیں۔''

اس نے چھاتی پھلائی۔ ''بھولے استاد کو ڈرانے والا اب تک پیدا نہیں ہوا۔''

اسی وقت لورا نے اپنا ہیلمٹ اتارتے ہوئے لوچ دار آواز میں کہا۔ ''باؤلا اسٹاڈ، وٹس پرابلم۔'' (بھولے استاد کیا مسئلہ ہے) یقیناً ہماری تکرار کی اسے سمجھ نہیں آئی تھی، البتہ اتنا اندازہ اسے ضرور ہو گیا تھا کہ بھولا اڑی کر رہا تھا۔

لورا براؤن کی صوررت اور بدیسی لہجے میں بھولا استاد کہنا اسے لوٹ کر گیا تھا۔ وہ ریشہ خطمی ہوتے ہوئے بولا۔

''حکم کرو میڈم۔''

وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ ''کیا بک رہا ہے؟''

''تمہاری ترجمانی کرنے کا وقت میرے پاس نہیں ہے۔ مجھے سودا کرنے دو۔'' اسے خاموش ہونے کا کہتے ہوئے میں بھولے کی طرف متوجہ ہوا۔ ''مادام کہہ رہی ہے مجھے کس ڈرپوک کے پاس لے آئے ہو۔''

وہ کڑے لہجے میں بولا۔ ''جوان، بھولے کو دھوکا دینے والا دوسرا سانس لینے کا حق دار نہیں ہوتا۔''

''بھولے استاد، عقل کو ہاتھ مارو، میں صاف گوئی سے بتا چکا ہوں کہ موٹر سائیکل چوری کی ہے۔ اس کے علاوہ کون سی دھوکا دہی ڈھونڈ رہے ہو۔''

اس نے اندیشہ واضح کیا۔ ''اگر تمہارا تعلق کسی ایجنسی یا خفیہ پولیس سے ہوا تو بھولا تمہیں نرگ میں بھیج کر ہی گرفتاری دے گا۔''

میں نے اس کی ہمت بندھائی۔ ''بے فکر رہو، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے ریس گھمائی، انجن وغیرہ کا جائزہ لیا، چند اور پرزوں کو چھیڑ کر بولی لگائی۔ ''پچاس ہزار سے زیادہ نہیں دے سکتا۔''

مجھے موٹر سائیکل کی قیمت کا سرسری اندازہ تھا تبھی برہمی ظاہر کی۔ ''سولہ، سترہ لاکھ کی موٹر سائیکل کو پچاس ہزار میں بیچنے کے بجائے آگ لگانا زیادہ بہتر رہے گا۔''

''باؤ یہ چوری کی ہے۔''

''تو چوری کا مال نصف یا تہائی میں خریدو استاد۔ اس کے پچاس ہزار تو تول کر خریدنے والا کباڑی بھی دے دے گا۔''

''زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ۔'' اس نے بہ ظاہر آخری دام بتائے۔

لورا مستفسر ہوئی۔ ''کتنے دے رہا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ایک لاکھ۔''

''اسٹاڈ باؤلا ڈبل .....ڈن۔'' لورا نے بھولے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دو لاکھ میں سودا مکمل کر دیا۔ (یعنی

بھولے کی بتائی ہوئی قیمت کے دگنے میں سودا طے ہو گیا)

بھولے کوئی اعتراض تھا بھی سہی تو لورا سے ہاتھ ملانے کی سعادت نے باقی نہ رہنے دیا تھا۔

لورا کا نازک ہاتھ، بھدے ہاتھ میں تھامتے ہوئے اس نے دانت نکوسے۔ ''ٹھیک ہے مادام۔''

لورا کی سوالیہ نظریں میری طرف اٹھیں، میں شوخی سے بولا۔ ''غلام قوم کا باشندہ، حکمراں قوم سے تکرار تو نہیں کر سکتا۔''

''چھوٹے بھاگ کر ٹھنڈی بوتل پکڑ لا۔'' بھولا شاگرد کو حکم دے کر ہماری طرف متوجہ ہوا۔ ''آئیں، بیٹھیں۔''

''استاد بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔ ہماری رقم لائیں اور اپنی چیز سنبھالیں۔''

سر ہلاتے ہوئے اس نے لورا کو میٹھی نظروں سے گھورا اور ورکشاپ کے اندر گھس گیا۔ اس کی واپسی دو ہزار والے نوٹوں کی گڈی کے ساتھ ہوئی تھی۔ (انڈیا میں، دس، بیس، پچاس، سو، دوسو، پانچ سو اور دو ہزار کے نوٹ مستعمل ہیں)

پیسے لے کر میں نے گنے بغیر جیب میں ڈالے اور ہم بھولے استاد سے الوداعی مصافحہ کر کے چل پڑے۔

لورا نے خجالت ظاہر کی۔ ''شاید ہمیں ان بے چاروں کی موٹر سائیکل نہیں بیچنا چاہیے تھی۔''

میں نے ڈھارس بندھائی۔ ''ان بے چاروں نے تمھارے بارے جو تبصرہ کیا تھا وہ بھول گیا ہے۔ ایسے اوباشوں کو سبق سکھانا ضروری ہوتا ہے۔ باقی ہمیں پیسوں کی ضرورت تھی، موٹر سائیکل کو لاوارث چھوڑ دیتے تو کسی اچکے کے ہاتھ لگ جاتی۔ اور وہ لڑکے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، یہ ان کے لیے بڑا نقصان نہیں ہوگا۔''

اس نے موضوع تبدیل کیا۔ ''اب شب بسری کا سوچو۔''

شام کا ملگجا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ''پہلے پیٹ بھرتے ہیں، بھاگ دوڑ و اچھل کود میں سب کھایا پیا ہضم ہو چکا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے ایک خالی رکشے کو اشارہ کیا۔ اندر گھستے ہی میں نے کسی درمیانہ درجے کے معیاری ہوٹل پر جانے کا کہا۔

آدھے گھنٹے بعد اس نے ایک درمیانہ درجے کے ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔ ہم نسبتاً تاریک گوشے کی طرف بڑھ گئے۔ میری نظریں ٹی وی اسکرین پر مرکوز تھیں۔ اندازہ تھا کہ ہمارا ذکر خبروں میں ضرور ہوگا۔

بیرا قریب آیا۔ لورا سے ان کی پسند پوچھ کر میں نے مچھلی کے بنے دو پکوان بتائے اور ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میرا نصف اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ میرا تعارف بہ طور دہشت گرد کرایا گیا تھا۔ تصویر بھی دکھائی جا رہی تھی۔ البتہ لورا براؤن کا ذکر تھا نہ میرا پاکستانی ہونا ظاہر کیا گیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''خبروں میں تمھارا کوئی ذکر نہیں ہے۔''

وہ بھناتے ہوئے بولی۔ ''میرا ذکر کرنے پر برطانوی حکومت متوجہ ہو جائے گی اور انھیں جواب دہی مشکل ہو گی۔''

میں نے مشورہ دیا۔ ''تمھیں برطانوی سفارت خانے جانا چاہیے۔''

''میرے خلاف ان کے پاس مضبوط ثبوت موجود ہیں۔ ایسی صورت میں سفارت خانہ زیادہ سے زیادہ مجھے برطانیہ واپس بھجوا سکتا ہے۔''

میں منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''کسی ایک نقطہ نظر پر تو قائم رہو۔''

وہ متبسم ہوئی۔ ''تمھاری سمجھ ہی میں کچھ نہیں آ رہا۔''

میں معترض ہوا۔ ''متضاد باتیں کرو گی تو کیسے سمجھ پاؤں گا۔''

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''مسٹر ایس ایس، اگر میڈیا میرا ذکر اچھالے گا تو برطانوی حکومت اپنے شہری کے

لیے میدان میں اتر آئے گی، کیوں کہ تب مسئلہ اپنی ناک کٹنے سے بچانے کا ہوگا۔ دوسری صورت میں حکومت تحفظ فراہم کرنے سے زیادہ میری مدد نہیں کرسکتی۔ کیوں کہ بہ ظاہر میں مجرم ہوں۔ اور سچ کہوں تو میں اپنی جان بچانے سے زیادہ شکار کی ہلاکت کی تمنائی ہوں۔''

''گویا تم حکومت کو بیچ میں نہیں لانا چاہتیں۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس میں اور وجوہات بھی شامل ہیں۔''

''مثلاً'' میں نے جاننے میں دلچسپی لی۔

''بعد میں بتاؤں گی۔'' وہ کھانے کی طرف متوجہ ہوگئی جو بیرا ہمارے سامنے چن رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''تم ڈیوڈ کو کال کیوں نہیں کرلیتیں۔''

''اس کا موبائل فون نمبر مجھے یاد ہے۔ فارغ ہوکر بات کرتی ہوں۔''

میں تلی ہوئی مچھلی کے پارچوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ کھانے کے دوران میں ٹی وی اسکرین کو بھی دیکھتا رہا۔ مجھ سے کافی خوفناک باتیں منسوب کر کے مشتہر کیا جارہا تھا۔ انڈین میڈیا یوں بھی رائی کو پہاڑ دکھانے کا ماہر ہے۔ میری تازہ تصویر ہی دکھائی جارہی تھی۔ مگر میرا حلیہ بالکل عام سا ہے۔ قدوقامت، رنگ، شکل وصورت میں کوئی نمایاں نشانی نہیں کہ جلد پہچانا جاسکوں۔ دوسرا لورا براؤن کا ساتھ بھی کافی فائدہ مند رہا کہ اکثریت کی نظریں کرخت صورت مرد کے بجائے خوش نما دلآئمت بھرے چہرے کی دلدادہ ہوتی ہیں۔ اور اس کی موجودی میں مجھ غریب پر سرسری اور اچٹتی ہوئی نظر ہی پڑتی تھی۔

کھانے کے بعد ہم نے چائے پی اور باہر نکل آئے۔ فی الحال تو خطرے کی حدود سے باہر تھے، البتہ آگے کا کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

اب کسی ٹھکانے کی ضرورت تھی۔ ایک رکشے میں بیٹھ کر میں نے یہ مسئلہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

''دوست! تمھاری نظر میں کوئی ایسا گھر نہیں ہے جہاں شب بسری کا ٹھکانہ مل جائے۔''

وہ خوش دلی سے بولا۔ ''ایسے کئی مکان ہیں باؤ، اچھے بھی، درمیانہ اور سستے بھی۔''

''تو بس باری باری دکھانا شروع کردو۔''

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے رکشا آگے بڑھا دیا۔ اگلے گھنٹے ڈیڑھ میں ہم نے چند مکانوں اور کھولیوں کا جائزہ لیا اور بہ ظاہر تمام کو مسترد کر کے اسے کسی اچھے ہوٹل چلنے کا کہا۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں اور رکشا والا چاہے سواری۔ ناک بھوں چڑھائے بغیر وہ ہمیں ایک اچھے سے ہوٹل میں لے آیا۔ اسے منہ مانگا کرایہ ادا کر کے رخصت کیا اور ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ داخلی دروازے تک پہنچنے تک رکشا دور جاچکا تھا۔ میں لورا کا بازو تھام کر واپس مڑ گیا۔

''کیا ہوا؟'' وہ حیران ہوئی۔

''احتیاطی تدابیر پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔'' اطمینان بھرے لہجے میں کہتے ہوئے میں نے ایک خالی ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا اور نشست سنبھالتے ہی ہدایت دی۔

''کسی اچھے میڈیکل سپیشلسٹ کے پاس لے جاؤ۔'' اپنی ناگفتہ بہ حالت کسی ڈاکٹر کو دکھانا ضروری تھا۔

ڈرائیور نے سر ہلاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ لورا کی سمجھ میں میڈیکل اسپیشلسٹ کا لفظ پڑ گیا تھا تبھی متبسم ہو کر پوچھا۔

''بڑی دیر بعد علاج کا خیال آیا ہے۔''

میں فلسفیانہ انداز میں بولا۔ دیر آید درست آید۔''

کلینک پر کافی مریض موجود تھے۔ اگر نمبر کا انتظار کرتے تو دو تین گھنٹے ضائع ہو جاتا تھے۔ استقبالیہ کو ڈاکٹر کا واقف کار ہونے کا جھانسا دے کر ہم اندر گھس گئے۔ اس ضمن میں جھوٹ سے زیادہ لورا براؤن کا غیر ملکی ہونا کام آیا تھا۔ ڈاکٹر چند منٹ پہلے ہی آیا تھا اور اب تک اس نے مریضوں کو دیکھنا شروع نہیں کیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی میں نے دروازہ کنڈی کر دیا تھا۔

ڈاکٹر نے حیرت و برہمی سے ہمیں گھورا۔ ''تم بغیر اجازت اندر کیسے آئے؟''

میں نے پستول برآمد کرتے ہوئے میز پر رکھا۔ ''ڈاکٹر صاحب! سوال و جواب کا وقت نہیں ہے۔ بہتر ہوگا اپنی توانائی و درشتی ضائع نہ کرو۔''

وہ ہکلایا۔ ''تت..... تم..... کیا چاہتے ہو؟'' پستول کی شکل نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔

میں اطمینان سے بولا۔ ''صرف اپنا بھلا، تمہارا ذرا سا بھی نقصان نہیں ہوگا۔'' اور قمیص اتارنے لگا۔

میرے زخموں کو دیکھ کر ڈاکٹر ششدر رہ گیا تھا۔ ''تشدد کا شکار ہوئے ہو۔'' اس کے خوف پر مسیحائی غالب آئی اور میرے زخموں کا جائزہ لینے لگا۔

''ہاں ڈاکٹر صاحب! چند درندوں سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ نرگ واسی (جہنمی) تین چار دن مسلسل زدوکوب کرتے رہے ہیں۔''

اس نے اچھی طرح معائنہ کر کے لمبا سا نسخہ لکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ ''لگانے کے مرہم اور کھانے کی دوائیاں لکھ دی ہیں۔ میڈیکل اسٹور والا کھانے کا طریقہ کار سمجھا دے گا۔ باقی دو تین دن چارپائی سنبھالو ان شاء اللہ ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' اس کے ان شاء اللہ سے پتا چلا اپنا مسلمان بھائی ہے۔

''شکریہ ڈاکٹر صاحب!'' نسخہ پکڑ کر میں نے قمیص ڈالی اور دو ہزار کا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اپنے رویے پر معذرت خواہ ہوں، یہ آپ کی فیس ہے۔''

اس کے لبوں پر پیشہ ورانہ تبسم ابھرا۔ ''کوئی بات نہیں۔ اور فیس استقبالیہ پر جمع کرا دیں۔''

ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کر کے ہم باہر نکل آئے۔ استقبالیہ پر فیس کے پانچ سو جمع کرا کے ہم نے میڈیکل اسٹور سے دوائیں لیں اور کلینک سے نکل آئے۔ دروازے کے قریب ہی چند ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ ہم ایک میں بیٹھ گئے۔

ڈرائیور نے پوچھا۔ ''کہاں جانا ہے باؤ۔''

رکشا ڈرائیور کے ساتھ جن مکانات کا جائزہ لیا تھا ان میں ایک عمارت مجھے اچھی لگی تھی۔ میں نے اس کے قریب واقع ایک مشہور مقام کا نام بتا دیا۔

بیس منٹ بعد ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں مطلوبہ جگہ اتار دیا تھا۔ ڈرائیور کو فارغ کر کے ہم آگے بڑھ گئے۔ بازار کھلا تھا۔ ایک دکان سے چند ضرورت کی چیزیں اور دو تین فالتو لباس خرید لیے۔ لورا کے لیے میں نے مشرقی لباس بھی خریدا تا کہ کہیں جاتے ہوئے اس کی شناخت چھپا سکوں۔ بازار سے نکل کر ہم مطلوبہ مکان کی طرف بڑھ گئے۔

رکشا ڈرائیور کے ساتھ میں نے اسی لیے مختلف مکانوں کا جائزہ لیا تھا تا کہ اپنی پسند کی جگہ تلاش کر سکوں۔ اور بہ طور احتیاط رکشا ڈرائیور کے سامنے ان مکانوں کو مسترد بھی کر دیا تا کہ پولیس یا کسی ایجنسی کے بندے کی ہم تک رہنمائی نہ کر سکے۔

دشمن ملک میں ایک جاسوس کو شناخت چھپانے اور پوشیدہ ہونے کو کئی پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ درجنوں احتیاطیں برتنا پڑتی ہیں۔ آنکھیں چار نہیں، آٹھ رکھنا پڑتی ہیں۔ کسی اجنبی پر بھروسا نہیں کیا جاتا، کسی انجان کو اعتبار کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ جیسے زخمی شیر کا تعاقب کرنے والا شکاری پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے، یونہی ایک جاسوس کو ہر قدم اٹھانے سے پہلے ہزاروں امکانات کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ بہ قول میرے..... ''عاشق و جاسوس میں ایک قدر مشترک ہے کہ دونوں کو کم ہی بچتے دیکھا گیا ہے۔''

گو میں پختہ جاسوس نہیں ہوں اور نہ میری تربیت اس نہج پر ہوئی تھی۔ ایک سنائپر اور جاسوس کے مقاصد اور ذمہ داریوں میں نمایاں فرق ہوتا ہے، مگر ایک سنائپر کی تربیت میں جاسوسی کے طریقہ کار کو زیر بحث ضرور لایا جاتا ہے۔ گو جاسوسوں کو سنائپر بننے کی نہ ضرورت پڑتی ہے اور نہ اس متعلق کچھ سکھایا جاتا ہے مگر سنائپر کا ہر فن مولا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف اچھا نشانہ باز ہوتا ہے بلکہ، جاسوس، جنگجو، کمانڈو اور اچھا لڑاکا بھی ہوتا ہے۔ اسے صرف جنگلوں، پہاڑوں اور صحراؤں کی خاک چھاننا نہیں ہوتی بلکہ شہروں اور حساس مقامات سے بھی واسطہ پڑ سکتا ہے۔ آبادی میں زندگی بچانے کے اصول دشت و بن سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ مجھے پہلے بھی چند بار جاسوس بننے کا موقع مل چکا تھا۔ اس لیے تربیت سے زیادہ میرا عملی تجربہ ہو چکا تھا۔

وہ عمارت کافی کشادہ تھی۔ دروازے پر چوکیدار موجود نہیں تھا۔ گھنٹی کے جواب میں ایک خرانٹ بڑھیا نے دروازہ کھولا۔ ہمارا مسلح نظر جان کر داخل ہونے کی اجازت ملی۔ وہ بیوہ تھی اور دو بیٹیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ بیٹیوں ہی کی وجہ سے وہاں کسی چھڑے کو رہنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ لورا کو میری بیوی سمجھی تھی۔ میں نے بھی اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہ کی۔ ہدایتوں، نصیحتوں اور مختلف احکامات سے بھرا بھاشن دے کر اس نے ایک ماہ کا پیشگی کرایہ وصول کیا اور ہمیں ایک کمرہ مل گیا، جس میں ملحقہ بیت الخلاء (انیچ باتھ) کی سہولت موجود تھی۔ کھانے پینے کے اخراجات علیحدہ تھے۔ ہمارے علاوہ وہاں تین اور کرایہ دار بلکہ کنبے بھی موجود تھے۔

رات گہری ہو گئی تھی، جسم تھکن سے چور تھا۔ ناگفتہ بہ حالت کے ساتھ دن بھر کی بھاگ دوڑ اور بے آرامی نے نڈھال کر دیا تھا۔ ایک سنائپر کی سخت جانی اور برداشت ہی تھی جو میں اب بھی قدموں پر چل رہا تھا۔ اگر جسمانی لحاظ سے تندرست ہوتا تو یہ بھاگ دوڑ مذاق سے بڑھ کر نہ لگتی۔

جلادوں نے سامنے سے زیادہ میری پشت کو تشدد کا نشانہ بنایا تھا تبھی مرہم لگوانے کو مجھے لورا کی خدمات حاصل کرنا پڑیں۔ وہ خوش دلی سے تیار ہو گئی۔ میری پیٹھ پر مرہم ملتے ہوئے وہ پوچھنے لگی۔

''خرانٹ بڑھیا نے کافی لمبی تفتیش کی ہے۔''

میں مسکراتے ہوئے اسے بڑھیا کے اندیشے بتانے لگا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ وہ ہمیں میاں بیوی سمجھ رہی ہے۔

''ریجا، سدھر جاؤ۔'' وہ میری پیٹھ پر مکا رسید کرتے ہوئے برہم ہوئی۔

''اف.....'' میری کراہ نکل گئی تھی۔ ''عقل کی دشمن، میں نے بڑھیا کی سمجھ بتائی ہے۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''تمھاری نیت کو اچھی طرح جانتی ہوں۔''

میں خاموش ہو رہا کہ فضول موضوع پر بحث کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ اور نہ کسی آزاد خیال مغربی عورت کو سمجھانا ممکن تھا۔

مرہم سے کافی فرق پڑا تھا۔ رہی سہی کسر درد کش گولیوں اور طاقت کے شربت نے پوری کر دی تھی۔ میزبان خاتون سے دودھ کا کلو بھی مل گیا تھا۔ وہاں دو سنگل بیڈ ملا کر انھیں ڈبل بیڈ کی شکل دی گئی تھی۔ میں نے ایک جانب لیٹ کر آنکھیں

بند کر لیں۔لورا بے تکلفی سے دوسرے بیڈ پر لیٹ گئی۔اس نے اپنا بیڈ دور کھینچنے کی کوشش نہیں کی تھی۔گولیوں میں شاید سکون آور دوا بھی شامل تھی تبھی، نیند کی آمد میں دیر نہیں ہوئی تھی۔

منظر ایک باغ کا تھا جہاں میں پلوشہ کے زانو پر سر ٹیکے موہنے چہرے کو تک رہا تھا۔اس کا ریشمی لمس مجھے ہوش وخرد سے بے گانہ کر رہا تھا۔ہلکی نیلی آنکھوں میں چاہت کے دیپ جلائے وہ بھی میری طرف متوجہ تھی۔آسمان پر گہرے بادل چھائے تھے۔ہلکی ہوا سکون آور مشروب کی طرح حواس چھیننے پر تلی تھی۔

اس نے ہاتھوں کے پیالے میں میرا چہرہ تھاما۔''راجو مجھے کتنا چاہتے ہو؟''

میں چاہت سے بولا۔''بہت زیادہ۔''

وہ مصر ہوئی۔''پھر بھی کتنا، کوئی حد شمار تو ہوگا ناں۔ہر شیئے کی پیائش کی کوئی نہ کوئی اکائی مقرر ہوتی ہے۔تو آپ کی چاہت کی بھی ہونا چاہیے۔''

''محبت وزن نہیں کہ تولی جائے، فاصلہ نہیں کہ ناپی جائے، گنتی نہیں کہ شمار کی جائے۔یہ تو ایک جذبہ ہے جو احساسات کے مرہون منت ہوتا اور احساس وجذبات کو ناپنے کا کوئی آلہ نہیں بنا۔''

وہ شوخی سے بولی۔''یہ تو کہہ سکتے ہیں ناں جتنے آسمان پر تارے ہیں، سمندر میں قطرے ہیں، صحرا میں ریت کے ذرے ہیں، دنیا بھر کے درختوں کے پتے ہیں، جتنا آسمان سے زمین تک فاصلہ ہے اتنی محبت کرتے ہیں۔''

''آسمان کے تارے، سمندر کے قطرے، صحرا کے ذرے، درختوں کے پتے جتنی تعداد میں بھی ہوں انھیں لامحدود نہیں کہہ سکتے۔جبکہ میری محبت کا شمار یا پیائش ممکن نہیں ہے۔''

وہ لاڈ سے بولی۔''نہیں ناں مجھے حد جاننا ہے۔''

میں ہنسا۔''جتنا مجھے تم چاہتی ہو، اس سے تھوڑی زیادہ کرتا ہوں۔''

''کھائیے قسم۔''اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھا۔

میں خلوص دل سے بولا۔''مجھے جہانوں کے پروردگار کی قسم ایسا ہی ہے۔''

خوشی ومسرت سے اس کا چہرہ جگمگا اٹھا تھا۔آنکھوں میں امڈتی بے پناہ چاہت اس سے چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔''اب آپ کو کہیں بھی نہیں جانے دوں گی۔''

''کہیں جانے کو کس بے وقوف کا دل چاہتا ہے۔''

وہ کھل کھلا کر ہنسی۔''میرے راجو کا۔''

میں نے آنکھیں نکالیں۔''پلوشے بدتمیزی کی تو مار کھاؤ گی۔''

اس نے مجھے چڑاتے ہوئے للکارا۔''دھمکیاں دیتے رہیے، کبھی ہاتھ اٹھانے کی زحمت نہ کرنا۔''

''تمھاری پٹائی کو پھول کی پتیوں سے بنی چھڑی ڈھونڈ رہا ہوں، جس دن مل گئی خوب تواضع کروں گا۔''

محبوبیت کا گہرا احساس لیے اس نے وارفتگی بھرے لہجے میں پوچھا۔''اتنا ناز کب سے رکھا ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔''اس سے بھی زیادہ۔''

وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔''اچھا کتنا۔''

ایک شاعر اپنی محبوبہ کو کہتا ہے ناں.....

اس کو باہر چھوڑ کے آؤ شہزادی

جگنو سے نہ ہاتھ جلاؤ شہزادی

تتلی کے میں کان یقیناً کھینچوں گا
پہلے پوری بات بتاؤ شہزادی
بارش کی بوندوں میں پھرنا ٹھیک نہیں
لگ جائے نہ کوئی گھاؤ شہزدی

پلوشہ کے موہنے رخ پر حیا آلود تبسم نمودار ہوا۔اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے موضوع تبدیل کیا۔
''راجو! بارش ہونے کو ہے۔'' ایک دم ہلکی پھوار شروع ہوگئی تھی۔
منظر معدوم ہوا، میں میری ساعتوں میں لورا کی آواز گونجی۔''ریجا اب اٹھ بھی جاؤ۔'' زلفیں جھٹک کر اس نے میرے چہرے پر پانی کی پھوار پھینکی تھی۔وہ نہا کر ایک دم تازہ و کھلی کھلی لگ رہی تھی۔شکلا کی درندگی کے نشانات اس کے چہرے پر سے معدوم ہو گئے تھے۔
میں انگڑائی لیتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔پلوشہ کی موہنی صورت کے خوش کن نظارے نے لورا کی اہمیت صفر کر دی تھی۔
''اب طبیعت کیسی ہے؟'' وہ بالوں پر تولیہ رگڑتے ہوئے مستفسر ہوئی۔
''الحمدللہ بہتر ہے۔''
وہ الحمدللہ کی وضاحت چاہنے لگی۔''آدھی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''
میں نے کہا۔''مسلمان ہر کام کا ہونا اللہ پاک کی منشا کے تابع سمجھتے ہیں۔''
اس نے طنزیہ لہجے میں چوٹ کی۔''تو گزشتہ چند دن تمھیں جو پھینٹی لگی، اس میں تمھارے اللہ (پاک) کی مرضی شامل تھی۔''
میں فخریہ لہجے میں بولا۔''بے شک، کوئی کام اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہوسکتا۔''
وہ بپھرتے ہوئے بولی۔''تو اللہ (پاک) اپنے بے گناہ بندے کو پھینٹی لگوانے پر کیوں خوش ہے۔اور جو بندہ اس کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا اس کی مدد کیوں کر رہا ہے۔ایک عورت کبھی اپنی تذلیل پر راضی نہیں ہوتی، تو کیوں کسی درندے کو عورت پر دسترس پانے کی ہمت دیتا ہے۔''
''تصویر کا ایک رخ دیکھو گی تو ایسے احمقانہ سوال تمھارے ذہن میں پیدا ہوں گے۔اور یاد رکھنا ایک چھوٹا سا سوال بہت بڑے اور تفصیلی جواب کا متقاضی ہوتا ہے۔زندگی گزارنے کا ڈھنگ کسی ایک فقرے میں ذہن نشین نہیں ہو سکتا۔مختصراً یہ سمجھ لو کہ دنیا دارالعمل ہے، دارالجزا نہیں ہے۔اچھائی برائی کا بدلہ ضروری نہیں کہ انسان کو زندگی ہی میں مل جائے۔البتہ ایسا ہونا ناممکن نہیں ہے۔اللہ پاک نے انسان کو دو راستے بتا دیے ہیں۔نیکی و بدی کی تمیز سمجھا دی ہے۔جو غلط کرے گا وہ ناکام و نامراد ہوگا اور جو اللہ پاک کے بتائے طریقے پر زندگی گزارے گا وہ کامیاب و کامران ہوگا۔بے شک بہ ظاہر وہ ناکام، مفلس، نادار اور ستم رسیدہ نظر آئے۔ہماری کامیابی کے معیار اور ہیں۔فتح کا حصول کامیابی کو ظاہر نہیں کرتا۔جیسے سیدنا عیسیٰؑ کو سولی پر لٹکانے والے ظاہری طور پر کامیاب نظر آ رہے ہیں تو کیا انھیں حق پر سمجھا جا سکتا ہے۔یونہی بہت ساری سزائیں انسان کو اپنے اعمال و گناہوں کی وجہ سے بھی ملتی ہیں۔بلاشبہ اللہ پاک حکیم و خبیر ہے اور اس کے ہر کام میں حکمت ہے۔''
''جب تمھارا اللہ (پاک) ہر چیز پر قادر ہے تو وہ ظالم کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑتا۔اس سے توفیق کیوں نہیں سلب کرتا۔اور تمھارے قاعدے کے مطابق تو ہم دونوں کو اپنے کیے کی سزا ملی۔شاید تم نے گناہ کیے ہوں، لیکن مجھے اپنی زندگی میں ایسا کام نظر نہیں آتا جسے میں گناہ سمجھ سکوں۔''

''دنیا کی زندگی بہ طور آزمائش ملی ہے۔ اللہ پاک نے اپنی مخلوق کا امتحان لینا ہے۔ اگر ظالم کو اسی وقت بدلہ مل جائے ،مظلوم کی دادرسی ہو جائے تو امتحان کیسا؟..... یوں تو ہر شخص ولی بن جائے گا۔ کوئی برا دنیا میں باقی نہیں رہے گا۔ جبکہ اللہ پاک کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے زندگی و موت کو اس لیے پیدا کیا کہ تمھارے اعمال و افعال جانچ سکوں کہ کون اچھائی کرتا ہے اور کون برا رستہ اختیار کرتا ہے۔ اور پھر اسی بل بوتے پر آخرت میں حساب کتاب ہوگا۔ باقی ضروری نہیں کہ ہر کسی کو گناہ کی وجہ ہی سے دنیا میں آزمائش کا سامنا ہو۔ اللہ پاک کے نیک بندوں پر زیادہ مصیبتیں اور آزمائشیں آتی ہیں۔ اور سچ کہوں تو تم جانتی ہی نہیں ہو گناہ کیا ہے تو ایسا دعویٰ کیسے کر سکتی ہو۔''

وہ للکارتے ہوئے بولی۔ ''چلو، کبھی بتا دو میں نے کیا غلط کیا ہے؟''

''تم ننگے سر، نصف بازوؤں کی بنیان میں ایک غیر مرد کے سامنے کھڑی ہو، اسلامی نقطہ نظر سے یہ گناہ ہے۔ شاید ماضی میں اپنی مرضی سے تم نے کئی مردوں سے جسمانی تعلقات قائم کیے ہوں وہ بھی بہت بڑا گناہ ہے۔ شراب پینا، خنزیر کا گوشت کھانا، جوا کھیلنا، یہ تمام وہ گناہ ہیں جو یقیناً تم کرتی رہی ہو۔''

وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ ''اپنی مرضی سے میں صرف نک کے ساتھ سوئی تھی۔ مگر وہ گناہ کیسے ہوا۔ میرا اپنا جسم ہے جسے چاہے سونپ دوں۔ تمھاری بھی دو بیویاں ہیں کیا وہ تمھارے قریب نہیں آتیں۔ شراب پینا مجھے اچھا لگتا ہے تو غلط کیسے ہوا، تم بھی تو پیپسی، سیون اپ، مرنڈا اور جانے کون کون سے مشروب پیتے ہو۔ گائے بکری کا گوشت تم بھی کھاتے ہو تو خنزیر کا گوشت کیوں گناہ ہوا۔ اور جوا کھیلنے والا فائدہ حاصل کرنے کو کھیلتا ہے، تو فائدے کے حصول میں ممانعت کیسی۔ باقی نقصان تو کاروبار میں بھی ہو جاتا ہے تو کیا تجارت بھی گناہ ہے۔''

''تم برطانوی فوج کی آفیسر رہ چکی ہو کبھی پاکستان آرمی کی وردی پہننے کا اتفاق ہوا؟''

وہ استہزائی انداز میں بولی۔ ''موضوع سے نہ بھاگو۔''

''بھاگ نہیں رہا۔ جواب ادھار ہے، پہلے تم میرے سوال کا جواب دو۔''

''پاکستان آرمی کی وردی میں کیوں پہنوں گی۔ وہ برطانوی فوج کی وردی سے بہتر تو نہیں ہے۔ باقی قانوناً بھی میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔''

''اللہ تمھارا بھلا کرے میں بھی یہی سمجھانا چاہتا تھا۔ جیسے برطانوی فوج کا سپاہی ہونے کی وجہ سے تم پر کچھ ایسے قوانین لاگو تھے جو عام آدمی پر نہیں ہوتے۔ اور ان قوانین کی مخالفت کرنے پر سزا بھی ملتی ہے۔ بلکہ تمھیں تو کورٹ مارشل کی صورت مل بھی چکی ہے۔ اور یقیناً اس کی وجہ قانون کی خلاف ورزی ہوگی۔ بعینہٖ ایک مسلمان کلمہ پڑھنے کے بعد اللہ پاک کے احکامات کے تابع ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے اللہ پاک کے ممانعات سے بچنا ضروری ہو جاتا ہے۔ گناہ و ثواب کے فلسفے کی بڑی حکمت اللہ پاک کی مرضی ہے۔ اللہ پاک نے اجازت دی کہ نکاح پڑھانے کے بعد ایک عورت تمھارے لیے حلال ہو گئی تو اب اس عورت کی قربت گناہ کے بجائے ثواب ہوگی۔ اسی طرح ہر وہ مشروب جو نشہ دے وہ حرام ہے، یونہی کچھ جانوروں کا گوشت کھانا منع ہے کچھ کی اجازت ہے۔ ایسا کیوں ہے اس کا جواب تفصیل طلب ہے۔ ایک مسلمان کے لیے اتنا جاننا کافی ہے کہ اللہ پاک نے فلاں کی اجازت دی ہے اور فلاں سے منع فرمایا ہے۔ جیسے فوج کا قانون حکم بتاتا ہے اس کی حکمت واضح نہیں کرتا۔ چند ٹکوں کے حصول کی خاطر فوج کے قانون پر اعتراض نہیں کرتی ہو اور جس نے پیدا کیا، اتنی نعمتوں سے نوازا اس کا منع کرنا تمھارے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتا۔''

وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔ ''میں اللہ (پاک) کو نہیں مانتی۔ اگر وہ واقعی موجود ہے تو مجھے سزا کیوں نہیں دیتا۔''

''اللہ پاک خود آ کر کسی کو سزا نہیں دیتا۔ وہ اپنی مخلوق میں سے کسی کو مسلط کرتا ہے، جیسے تم پر شکلا کو مسلط کیا۔'' مجھے

غصہ آیا اور جو منہ میں آیا اگل دیا۔

''بکواس بند کرو ریچا!'' اس نے تولیہ کھینچ مارا۔

اور میں مسکراتا ہوا غسل خانے میں گھس گیا۔ کسی بے دین کو سمجھانا مجھ جیسے کم علم کے لیے ممکن نہ تھا۔ اپنے تئیں میں نے پوری کوشش کی تھی کہ اس کے سوالوں کے تسلی بخش جواب دے سکوں، مگر اللہ پاک کو نہ ماننے والوں کا مرض اتنا معمولی نہیں ہوتا کہ ہلکے پھلکے وعظ سے دور ہو سکے۔ اللہ پاک کو ماننا بھی اس کی بخشی ہوئی توفیق سے ممکن ہوسکتا ہے۔ وہ جسے چاہے ہدایت دے اور جسے چاہے گمراہی پر رکھے۔ یہ اس کے اپنے فیصلے ہیں اور اس کے فیصلوں میں انبیاء کرام کے قدسی نفوس دخل نہیں ہو سکتے تو مجھ جیسے گناہ گار کی کیا اوقات۔

میں نہا کر صرف تولیہ لپیٹے باہر نکل آیا۔ وہ منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

میں نے درخواست کی۔ ''مرہم تو لگا دو۔''

وہ بدتمیزی سے بولی۔ ''اپنے اللہ (تعالیٰ) کو بلا لو۔''

میں نے درشتی سے گھورا، اس نے نظریں نہیں چرائی تھیں۔ افسوس بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے میں خود ہی مرہم لگانے لگا۔ ایک بار تو جی چاہا کہ بوڑھی مالک مکان کو کہہ دوں مگر پھر اپنے زخمی ہونے کا راز افشا کرنا مناسب نہ لگا۔

وہ چند لمحے مجھے گھورتی رہی اور پھر اٹھ کر قریب آ گئی۔ ''سوری، مجھے غصہ آ گیا تھا۔'' اس نے میرے ہاتھ سے مرہم لینے کی کوشش کی۔

''شکریہ۔'' روکھائی سے کہتے ہوئے میں نے اس کی مدد ٹھکرا دی۔

''ادھر دو ناں۔'' اس نے زبردستی مرہم چھیننے کی کوشش کی۔

''کہہ دیا ناں ضرورت نہیں۔'' اسے دور دھکیلتے ہوئے میں درشت لہجے میں بولا۔

''سوری ناں۔'' اس نے مفاہمتی لہجہ اختیار کیا۔

''مس لورا براؤن! مذہب تمہارا ذاتی مسئلہ سہی، مگر تمہیں کسی دوسرے کے عقیدے پر طنز کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھ سے خفگی ہے تو میری ذات کو طنز و تنقید کا نشانہ بناؤ، میرے رب کے بارے گندا منہ کھولو گی تو مجھے تم جیسی کسی ساتھی کی ضرورت نہیں ہے۔''

میری برہمی کو خاطر میں لائے بغیر وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''اچھا اگر ڈیٹ پر جانے کی ہامی بھروں پھر بھی صلح نہیں کرو گے۔''

''کسی غیر عورت پر میں تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا، اللہ پاک نے مجھے دو حوریں روما و پلوشہ کی شکل میں عطا فرمائی ہیں۔ جن کی صورت ہی نہیں سیرت بھی بہت اچھی ہے۔''

وہ بھناتے ہوئے بولی۔ ''افغانستان میں منتیں کرتے تھکتے نہیں تھے، یہاں بھی کئی دفعہ منت کر چکے ہو عقیدے کا مسئلہ چھڑا تو پارسا بننے کا ڈراما کر رہے ہو ڈھونگی۔ بھول گئے کل موٹر سائیکل پر کیسے چپک کر بیٹھے تھے، اس وقت تمہاری پارسائی کہاں گئی تھی۔''

''میں نے ہیوی موٹر سائیکل کبھی نہیں چلایا، ورنہ تمہیں نہ چلانے دیتا، باقی میرے مذاق کو حقیقت سمجھنا تم جیسی کوڑھ مغز کو مشکل نہیں ہے۔''

اس نے دھمکی دی۔ ''زیادہ ڈراما بازی کی ضرورت نہیں ورنہ چھوڑ کر چلی جاؤں گی، میں انتقام لینے کو تمہاری محتاج نہیں ہوں۔ شکلا جیسے غلیظ کو میں اکیلے سنبھال لوں گی۔''

میں بپھر کر بولا۔ ''رکنے کا کس بے غیرت نے کہا ہے۔ تم شوق سے تشریف لے جا سکتی ہو۔''
اس نے ڈرایا۔ ''چلی گئی تو خرانٹ بڑھیا تمہیں ایک منٹ یہاں نہیں چھوڑے گی۔''
میں اطمینان سے بولا۔ ''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔''
اس نے آخری وار کیا۔ ''موٹر سائیکل میں نے چھینا تھا۔ اس رقم پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔''
میں نے نوٹوں کی گڈی اس کی طرف پھینکی۔ ''یہ سنبھالو اور دفع ہو جاؤ۔''
وہ اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ شاید میں مذاق کر رہا ہوں۔ میرا درشتی بھرا لہجہ اور سخت الفاظ سنتے ہی اس نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ روہانسا ہوتے ہوئے بولی۔
''ریجا! تم ایسا نہیں کر سکتے۔ بھول گئے وعدہ کیا تھا کہ شکلا کو کیفر کردار تک پہنچانے میں میری مدد کرو گے۔''
میں بیزاری سے بولا۔ ''مس لورا! براہ مہربانی یہاں سے چلی جاؤ، نہیں تو مجھے جانا پڑے گا۔''
میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے وہ لجاجت سے بولی۔ ''میں وعدہ کرتی ہوں آئندہ تمہارے مذہب کے بارے مذاق نہیں کروں گی۔ پلیز معاف کر دو۔''
ہاتھ چھڑا کر میں تپائی کی طرف بڑھا اور جگ اٹھا کر منہ کو لگا لیا۔ پانی نے مجھے جذبات پر قابو پانے میں مدد دی تھی۔ بیڈ پر ٹک کر میں ٹھنڈے دماغ سے سوچنے لگا۔ کسی خدا ناشناس کے ساتھ اتنی سختی مناسب نہیں تھی۔ وہ جیسی بھی تھی ایک مظلوم لڑکی تھی۔ وہاں میرے علاوہ اس کا کوئی مددگار نہیں تھا۔ مقامی زبان سے ناواقفیت اس کی راہ کی سب سے بڑی دیوار تھی۔ اور اللہ پاک جتنا میرا تھا اس کا بھی تھا۔ وہ بھی تو اسی کی بندی، اسی کی مخلوق تھی۔ ممکن تھا میرے تلخ رویے سے وہ رحیم و کریم رب سے مزید دور ہو جاتی۔
میں مزید تکرار کیے بغیر خاموش ہو گیا۔ چند لمحے میرے بولنے کی منتظر رہ کر وہ دھیرے سے میری جانب کھسکی اور ہتھیلی پر مرہم لگا کر میری پیٹھ پر ملنے لگی۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔
چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ دھیرے سے ہنسی۔ ''قسم سے بہت کٹھور اور سنگ دل ہو۔''
میں تحمل سے بولا۔ ''مذاق کو ذاتیات تک محدود رہنا چاہیے۔ جب عقائد پر بات ہو گی تو جھگڑے ہوں گے۔''
وہ شاکی ہوئی۔ ''یار! بس بھی کرو، معذرت کر تو چکی ہوں۔''
میں نے موضوع تبدیل کیا۔ ''ناشتے کے بارے کیا خیال ہے؟''
''قسم سے سخت بھوک لگی ہے۔''
چونکہ بڑھیا نے واضح کر دیا تھا کہ ہمیں جیسا ناشتا اور کھانا درکار ہو گا ملے گا، البتہ ادائی ہمیں کرنا پڑے گی۔ اس لیے میں نے بے تکلفی سے انٹر کام اٹھا کر اسے تگڑا سا ناشتا لانے کا کہہ دیا۔ ناشتا اس کی بیٹی لائی تھی۔
ناشتا کر کے میں نے دوائی کھائی اور دوبارہ لیٹ گیا۔ لورا نے کرسی سنبھالتے ہوئے پاؤں بیڈ پر رکھے۔
''اب کیا ارادہ ہے۔''
میں اطمینان سے بولا۔ ''ظاہر ہے سوؤں گا۔''
اس نے منہ بنایا۔ ''ریجا مذاق کا وقت نہیں ہے۔''
''پہلے تم ڈیوڈ سے رابطہ کرو، تاکہ وہ ہتھیار ادھر نہ بھیجے۔''
اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ضرورت نہیں۔''
میں صاف گوئی سے بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کچھ چھپا رہی ہو۔''

وہ اطمینان سے بولی۔ ''بہت کچھ۔''

میں بیزاری سے بولا۔ ''جب مجھے اصل بات کی ہوا نہیں لگے گی تو کیسے مشورہ دوں گا۔''

وہ افسردگی سے بولی۔ ''روپے پیسے کا لالچ انسان کو کہیں کا نہیں رہنے دیتا۔ میری اچھی خاصی تنخواہ تھی، بہترین سہولیات میسر تھیں، عزت وقدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، مگر پھر ایک غلط آدمی مجھ سے آٹکرایا اور بہکاوے میں آکر اپنی ساکھ ہی نہیں زندگی بھی برباد کرڈالی۔ انسان جب کسی مصیبت میں گھرتا ہے تو نکلنے کو اندھا دھند ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ ایسے میں مزید غلطیاں ہوتی ہیں۔ اور یہی میری کہانی ہے۔''

میں منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اب فلسفے کو ایک طرف رکھ کر سیدھے وعام فہم انداز میں اپنی حماقتوں سے پردہ اٹھاؤ۔''

اس نے لمبا سانس کھینچا اور آنکھیں بند کر کے گہری سوچ میں کھو گئی۔ میں اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ شاید وہ الفاظ کو ترتیب دے رہی تھی۔ چند لمحوں بعد گویا ہوئی۔ ''افغانستان میں نک کے ساتھ میں نے کافی کارنامے سرانجام دیئے تھے۔ وطن واپسی پر بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ دو تین اخبارات میں انٹرویو بھی شائع ہوا۔ جس سے وقتی شہرت تو ملی، لیکن اس کے ساتھ ہی میری بدبختی کا بھی آغاز ہوا۔ ایک بڑے تاجر تھامس ولکنسن نے اپنے کاروباری حریف کو ٹھکانے لگانے کو میری خدمات حاصل کرنا چاہیں۔ اس کا حریف حفاظتی اقدامات کا بہت خیال رکھتا تھا۔ عام اجرتی قاتل کو اس کا قتل کرنا بہت مشکل تھا۔ تبھی اس نے میرا انتخاب کیا۔ پہلے تو میں نہ مانی مگر پھر بھاری معاوضے کو دیکھ کر متذلل ہوگئی۔ تھامسن نے فوراً معاوضے میں مزید اضافہ کر دیا اور مجھے ہامی بھرنا پڑی۔ مجھے پندرہ سو میٹر کے فاصلے سے اسے نشانہ بنانا تھا۔ تمھیں سنائپرز کے طریقہ کار سے اچھی طرح واقفیت ہے اس لیے میں قتل کرنے کے طریقے پر روشنی نہیں ڈالتی۔ مختصراً اسے کامیابی سے نشانہ بنایا اور معاوضا وصول کر کے خوش ہوگئی۔ مگر تھامسن کی بدقسمتی کہ مقتول کا بیٹا خم ٹھونک کر میدان میں آگیا۔ پولیس تھامسن کی راہ پر لگ گئی۔ تفتیشی آفیسر گیری لارنس ذہین آدمی تھا آخر وہ تھامسن تک پہنچ گیا۔ تھامسن ولکنسن گرفتار ہونے کی ذلت برداشت نہ کر سکا اور حوالات میں خودکشی کر لی۔ البتہ اپنے پہلے بیان میں اس نے قاتل کے ضمن میں میرا نام لے دیا تھا۔ تفتیشی آفیسر گیری لارنس میرے پیچھے پڑ گیا۔ لمبی تفتیش ہوئی۔ پہلے ملٹری عدالت میں کیس چلا۔ میرے خلاف بڑا ثبوت تھامسن کا بیان، وقوعے کے دن میرا چھٹی پر ہونا اور اچھا سنائپر ہونا تھا۔ یہ کوئی اتنا واضح ثبوت نہیں تھا کہ میرا قاتل ہونا ثابت ہوسکتا۔ اس کے باوجود ملٹری عدالت نے میرا کورٹ مارشل کر کے کیس سول عدالت کے حوالے کر دیا۔ سال بھر تفتیش کا سامنا رہا۔ ایک عقل مندی میں نے یہ کی تھی کہ تھامسن ولکنسن سے ملنے والی بھاری رقم سوئٹزرلینڈ کے ایک بینک میں فرضی نام سے جمع نہیں کرادی تھی۔ اور یہ احتیاط پسندی کام آگئی۔ آخر قتل کے الزام سے تو بری ہوگئی مگر ذہنی طور پر اتنی الجھ گئی تھی کہ کسی کام کے قابل نہ رہی۔ گو بری ہونے کے بعد میں واپس فوج میں جاسکتی تھی۔ اور ملٹری عدالت میں پیش ہو کر اپنا عہدہ واپس لے سکتی تھی۔ لیکن مجھے فوج میں جانا گوارا نہ ہوا۔ مختصر عرصہ گوشہ نشین رہی۔ اور مستقبل میں بھی یہی ارادہ تھا مگر پھر ڈیوڈ سے ملاقات ہوئی۔ بلکہ وہ خود ڈھونڈتے ہوئے میرے پیچھے پہنچ گیا۔ وہ سنائپر رائفل میں جدت لانا چاہتا تھا۔ اور میں تو شروع ہی سے سنائپنگ کی دیوانی تھی۔ یہ سنائپنگ ہی تھی جس کی وجہ سے میں آفیسر ہو کر بھی ایک سپاہی (نک) کو اتنا پسند کرتی تھی۔ بہرحال ڈیوڈ کی باتوں میں آکر اپنا سارا سرمایہ ایس آر ون کو بنانے میں جھونک دیا۔ پہلی رائفل بننے کے بعد رائفل کو میں نے خود جانچا تھا۔ رائفل میری توقعات سے بڑھ کر بہترین ثابت ہوئی تھی۔ خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے ہم نے بڑی تعداد میں رائفلیں تیار کر لیں۔ یہاں تک کہ سرمائے کی کمی کو قرض لے کر پورا کیا۔ اس دوران پہلی بننے والی ایس آر ون مسلسل میرے استعمال میں رہی۔ اور جب رائفلوں کی ایک بڑی کھیپ تیار ہوگئی تب ایس آر ون کی خامیوں کا انکشاف ہوا۔ پچاس گولیوں کے بعد رائفل کی کارکردگی

میں فرق آنے لگا تھا۔ جو سو گولیوں تک اتنا بڑھ گیا کہ رائفل سو میٹر پر بھی درست فائر کے قابل نہ رہی۔ مجھ سے بنیادی غلطی یہ ہوئی تھی کہ میں کبھی کبھار ہی تین چار گولیاں فائر کرتی تھی۔ ورنہ رائفل کی خامی بہت پہلے سامنے آ جاتی۔ اسلحے کے چند ماہرین کو بھاری فیس دے کر مسئلہ حل کرانا چاہا، مگر ایس آرون کی یہ خامی دور نہ ہو سکی۔ اپنی پہلی مصنوعات کے ساتھ ڈبلیو اے ایس کمپنی دھڑام سے زمین پر آ گری تھی۔ اگر شروع میں معلوم ہو جاتا تو ہم اتنی بڑی تعداد میں رائفلیں نہ بناتے۔ رائفل میں چند تکنیکی تبدیلیاں کر کے اس خامی کو دور کیا جا سکتا تھا۔ مگر ہتھیار کے تیار ہونے کے بعد تبدیلی ممکن نہ تھی۔ ہمیں بس بیرل کا جوڑ ختم کرنا تھا۔ ایمونیشن میں بارود کی مقدار گھٹانا تھی، چیمبر کو تھوڑا مضبوط کرنا تھا، گولی کا حجم بڑھانا تھا۔ یوں کہ یہ 165.8 ایم ایم کے بجائے روایتی قطر 7.12 ایم ایم کی بن جاتی۔ اصل میں رائفل میں خرابی پڑی ہی چیمبر اور بیرل کے جوڑ کی وجہ سے۔ کیوں کہ رائفل کا وزن گھٹانے کو چیمبر کی موٹائی کم رکھی گئی تھی۔ اور گولی کو دور تک پہنچانے کو کیس میں بارود کے گرین بڑھائے گئے تھے۔ تکنیکی طور پر چیمبر اتنے بارود کے دباؤ کو مسلسل برداشت نہیں کر سکتا تھا، اس لیے پچاس ساٹھ گولیاں چلنے کے بعد چیمبر اور بیرل کا قطر معیاری نہیں رہتا۔ چند اور تکنیکی خامیاں بھی سامنے آئیں، لیکن وہ اتنی بڑی نہیں تھیں کہ ہماری محنت پر پانی پھرتا۔ خیر اس افتاد سے ہم پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ ہم محل سے فٹ پاتھ پر آنے والے تھے۔ تبھی ایک دوسرے کو خطاوار کہنے لگے۔ ڈیوڈ کے تیس یہ میری وجہ سے ہوا تھا کہ میں نے رائفل استعمال کر کے پاس کی تھی۔ اور میں کہہ رہی تھی کہ اس کی وجہ سے میں اس جنجال میں پھنسی۔ قصہ مختصر آخر سوچا، جو ہو گیا سو ہو گیا اب اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا ہو۔ رائفل کی مشہوری ہو چکی تھی اور شوقین حضرات خریدنے کے بھی خواہاں تھے۔ لیکن ہم چند رائفلیں فروخت کر کے اپنا پول نہیں کھول سکتے تھے۔ کافی سوچ بچار کے بعد طے ہوا کوئی ایسا گاہک ڈھونڈا جائے جو تمام رائفلوں کو اکٹھا خرید لے۔ چند ملک زیر غور آئے اور آخر انڈیا کو منتخب کیا۔ اس کی ایک وجہ تو جنرل شکلا کا داغ دار ماضی تھا۔ امید تھی ایسے شخص سے سودا بازی آسان رہے گی۔ دوسرا انڈیا کے پاس بہت بڑی تعداد میں فوج ہے اس وجہ سے یہاں رائفلوں کی ضرورت بھی زیادہ ہوگی۔ پس میں یہاں آ گئی۔ شکلا نے پہلے دن تو آمادگی ظاہر کی، مگر جب اس کے گھر پارٹی میں جانا ہوا تب اس نے آرمی چیف کے انکار کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ وہ مصر تھا کہ میں چیف پر گولی چلاؤں۔ مجھے ہمت نہ ہوئی کیوں کہ ایک بار ایسے معاملے میں گردن پھنسا چکی تھی۔ مگر شکلا نے اس شرط کے علاوہ رائفلیں خریدنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ تب میں نے اس کے آدمی کو تربیت دینے کی پیش کش کر کے درمیانی راہ نکالی۔ اور وہ مان گیا۔ مگر اسے سودے میں مخلص سمجھنا میری بھول تھی۔ وہ صرف مجھے پھانسنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ جب پہلے دن مجھ سے بات ہوئی اس کے بعد ذلیل شخص نے لندن میں اپنے آدمیوں کے ذریعے میرے بارے معلومات حاصل کیں۔ اور میری سابقہ شہرت سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ پہلے بھی بڑی مشکل سے میری جان چھوٹی ہے۔ اور اب برطانیہ عدالت میں میرا حالیہ کارنامہ پہنچا تو پچھلا کیس بھی کھل جائے گا۔ اور یہی دھمکی اس نے مجھے قید کے پہلے دن دی تھی۔''

تفصیل سن کر مجھے لورا کی مجبوری آشکارا ہوئی۔ بلاشبہ وہ گردن تک دلدل میں دھنس چکی تھی۔ شکلا کے پاس اس کے خلاف ثبوت موجود تھے۔ شکلا نے ایک تیر سے کئی شکار کھیلے تھے۔ ایک پاکستانی جاسوس کی طرف داری نے لورا کی مشکلات میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ اس کہانی سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ مجھے سنائپنگ کی تربیت دلانا سراسر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تھا۔ اور یہ کہ وشال گپتا میری اصلیت سے واقف تھا۔ یوں شکلا کا میرے بارے جاننے میں بھی کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ البتہ وہ اس سے لاعلم تھا کہ میں اس کی نواسی کو اغواء کرنے وہاں پہنچا تھا۔ یقیناً شکلا کا آرمی چیف پر حملہ کرانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ ایک سودے کے لیے اتنا بڑا اقدم اٹھانے کے بجائے آرمی چیف کی ریٹائرمنٹ کا انتظار کرنا زیادہ بہتر سمجھتا۔ انڈین چیف، عہدہ سنبھالنے کے بعد تقریباً دو سال کمانڈ کرتا ہے۔ اور بکرم سنگھ کو عہدہ سنبھالے ڈیڑھ سال سے

زیادہ ہوگیا تھا۔ چند ماہ میں اس نے یونہی ریٹائرڈ ہو جانا تھا۔

وہ میری سوچوں میں مخل ہوئی۔ ''پریشان ہو گئے نا۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''پریشانی صرف پلوشہ کی ناراضی پر ہوتی ہے۔''

وہ حیران رہ گئی تھی۔ ''کیا؟''

''الجبراء کا کلیہ تو نہیں بتایا کہ تمھیں سمجھنے میں دشواری ہو۔''

وہ ہنسی۔ ''یہ وہی کھان لڑکی ہے نا جس نے میجر جینیفر کی پٹائی کی تھی۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''مگر وہ تو تمھاری بیوی ہے نا۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''کیا بیویاں ناراض نہیں ہو سکتیں۔''

وہ شوخی سے بولی۔ ''اگر بیوی کی ناراضی کا رونا رو کر اور اس سے خوش نہیں ہوں کا چارہ ڈال کر مجھ پر ڈورے ڈالنے کا ارادہ ہے تو تمھیں ناکامی ہوگی۔''

میں نے گہرا سانس لے کر سر کو تھاما اور کراہتے ہوئے بولا۔ ''برطانیہ کی چڑیل، آخر میری کس حماقت سے تمھیں یہ غلط فہمی ہوئی ہے۔ پلوشہ کی وجہ سے میں نے میجر جینیفر جیسی مخلص، وفادار اور پرکشش لڑکی کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا تو تم کس باغ کی مولی ہو۔''

وہ کھلا کھلا کر ہنسی۔ ''ڈرامے بازی کی ضرورت نہیں، کھل کر اظہار کرو۔''

میں مضمحل ہوا۔ ''مطلب، تم سے مذاق کرنا اتنا بڑا گناہ ہو گیا کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔''

وہ شرارت سے بولی۔ ''افغانستان میں بار بار ڈیٹ پر جانے کی منتیں کرنا، یہاں بھی وہی واویلا کرنا اگر محبت نہیں تو کیا ہے۔''

میں نے سر پکڑا۔ ''دھت تیرے کی، کیپٹن صاحب ہمارے ہاں ڈیٹ پر جانا محبت نہیں بے غیرتی کہلاتا ہے۔''

اس نے آنکھیں نکالیں۔ ''تو بے غیرتیوں کے لیے تمھیں میں ہی ملی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''تمھیں چھیڑنے میں مزا آتا تھا۔ اور سچ کہوں تو بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔''

''مثلاً۔'' اس نے اشتیاق ظاہر کیا۔

''انگریزی زبان کی وہ گالیاں، کوسنے اور لغویات سنیں جو کسی کتاب میں پڑھنے کا اتفاق ہوا نہ کسی فلم ڈرامے میں دیکھیں۔ یقین مانو اس موضوع پر تم متخصص (اسپیشلسٹ) ہو۔''

وہ تپتے ہوئے بولی۔ ''اور تم لڑکیوں کو چھیڑنے کے اسپیشلسٹ ہو۔''

میں سنجیدہ ہوا۔ ''اچھا فضول بکواس کو چھوڑو اور آگے کا لائحہ عمل بتاؤ۔''

''شکلا سے ''ایس آر ون'' کا مکمل معاوضہ وصول کر کے اس کی گردن اتارنا چاہتی ہوں۔''

میں ہنسا۔ ''ایسا بھی کیا غلط کر دیا بے چارے نے کہ تم گردن اتارنے پر تل گئیں۔''

''ریجا کہانا مزید بکواس نہیں۔''

میں نے تجویز دی۔ ''شکلا کے بارے ہمیں وشال گپتا سے کافی کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ دو تین دن آرام کر کے اس پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔''

اس نے اپنی الجھن دور کرنا چاہی۔ ''تم میرا ساتھ کیوں دے رہے ہو۔''

''تمھیں ڈیٹ پر لے جانے کے لالچ میں یہ خطرہ مول لے رہا ہوں۔''

اس نے آنکھیں نکالیں۔''تمھارے ساتھ مسئلہ کیا ہے ریچا۔''

میں متبسم ہوا۔''شکلا کے ہاں دعوت میں اس کی نواسی کو دیکھا تھا۔''

اس نے تصدیق چاہی۔''تمھاری مراد پری سے ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔''بس مجھے وہ چاہیے۔''

وہ متحیر ہوئی۔''کیوں؟''

''ایک مسلمان چار شادیاں کر سکتا ہے اور میں نے اب تک دو کی ہیں۔''

وہ بے بسی سے مسکرائی۔''تم نہیں سدھرو گے۔''

''مجھے نیند آ رہی ہے۔''میں نے تکرار ختم کرنے کا اعلان کیا۔یقیناً نسخے میں سکون آور دوا شامل تھی کہ لمبی نیند لینے کے بعد بھی مجھے نیند کی حاجت ہو رہی تھی۔

وہ اٹھتے ہوئے بولی۔''مالک مکان کی بیٹی تعلیم یافتہ ہے۔امید ہے اس کے پاس انٹرنیٹ کی سہولت موجود ہو گی۔میں ڈیوڈ کو ای میل کر کے اپنی خیریت کا بتا دوں۔''

میں نے جواب دیئے بغیر آنکھیں بند کر لیں۔

—●—

اگلا ہفتہ ہم نے وہیں گزارا تھا۔اس دوران گوشت ،مچھلی ،پھل ،جوس ،دودھ اور قیمتی دواؤں سے میری جسمانی توانائی بحال ہوگئی تھی۔اس وقفے میں ہم مختلف منصوبوں پر بات کر کے کالائحہ عمل طے کرتے رہے۔لورا کو میں نے اپنے مقصد سے آگاہ نہیں کیا تھا۔کیوں کہ اپنے راز میں کسی غیر متعلق شخص کو حصہ دار بنانا گھاٹے کا سودا ہوتا ہے۔اگر ہم دوبارہ پکڑے جاتے تو یقیناً اس نے ذرا سے تشدد پر راز اگل دینا تھا۔اس نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا تھا۔یا شاید اسے میرے جھوٹ پر یقین آ گیا تھا کہ ایک جاسوس کی ذمہ داریوں میں دشمن ملک کو نقصان پہنچانا مقدم ہوتا ہے،اس وجہ سے میں اس کا ساتھ دے رہا ہوں۔

چھے دن کے مکمل آرام کے بعد ہم جانے کو تیار ہوئے۔لورا کی شناخت چھپانے کو میں نے کالے گاؤن اور نقاب کا بندوبست کیا تھا۔ایک بار تو وہ بگڑ گئی۔مگر میرے سمجھانے پر چپ چاپ نقاب اوڑھ لیا۔خود میں نے کلین شیو کرنا چھوڑ دیا تھا۔اب تو اچھی خاصی داڑھی اور مونچھیں ہوگئی تھیں۔آنکھوں پر کالا چشمہ اور سر پر سفید ٹوپی اوڑھ کر میری شناخت کافی حد تک بدل گئی تھی۔اب مجھے وہی پہچان سکتے تھے جن سے پالا پڑ چکا ہو۔

قدآدم آئینے میں دیکھتے ہوئے اس نے منہ بسورا۔''کارٹون بنا دیا ہے مجھے۔''

اس کی نقاب سے جھانکتی بھوری آنکھوں کو دیکھتے ہوئے میں شاکی ہوا۔''ایمان سے بتاؤ،کیا ایسا ہی ہے۔''

وہ متبسم ہوئی۔''تم بتاؤ کیسی لگ رہی ہوں۔''

''عورت کی کشش نظر نہ آنے میں ہے۔بلکہ لفظ عورت کا مطلب ہی پوشیدہ چیز کے ہیں۔''

وہ اوچھے پن سے بولی۔''مسلمان عورت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تبھی ان سے جانوروں کا سا سلوک کرتے ہیں۔اور اس کی آزادی چھین لیتے ہیں۔''

میں نے پوچھا''تجوری میں جوتے رکھے جاتے ہیں یا مال وزر۔''

وہ حیرانی سے بولی۔''دولت۔''دو جمع دو چار کی طرح اس کا جواب متعین تھا۔

''پس ہمارے نزدیک عورت کی حیثیت خزانے اور مال دولت جیسی ہے۔اس لیے ہم اپنی دولت کو چھپا کر رکھتے ہیں تاکہ کسی حریص ڈکیت کی نیت میں فتور نہ آجائے۔اور تمھارے ہاں عورت کی حیثیت جوتوں جیسی بلکہ اس سے بھی کم ہے۔''

وہ فخریہ لہجے میں بولی۔''مغرب نے عورت کو آزادی دی ہے۔''

میں طنزیہ لہجے میں بولا۔''اسے آزادی نہیں غلامی کہتے ہیں۔مغرب نے عورت کو جھوٹی آزادی اور مرد کے شانہ بہ شانہ چلنے کی چوسنی (لولی پاپ) دے کر اس سے عورت ہونے کے سارے فوائد چھین لیے۔اور اس کا صرف ایک مصرف باقی رکھا۔جب تک شباب باقی رہا ہر کسی نے استعمال کیا اور جب بوڑھی ہوئی تو اولڈ ہاؤس میں پھینک دیا۔کیوں کہ ایک شو

پیس جب دل لبھانے کی صلاحیت کھو دیتا ہے تو اسے دوسرے سے تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں جب تک عورت کی شادی نہیں ہوتی اس کی کفالت باپ یا بھائی کے ذمہ ہوتی ہے، شادی کے بعد شوہر اس کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ بوڑھی ہوتی ہے تو بیٹے پالتے ہیں۔ پبلک ٹرانسپورٹ میں عورت کبھی کھڑی نظر نہیں آئے گی۔ بیٹھنے کا حق پہلے اسے دیا جائے گا، بینک میں، یوٹیلیٹی سٹور پر یا کسی بھی جگہ مردوں کی قطار میں کھڑا نہیں ہونا پڑتا، بغیر نمبر کے سب سے پہلے جا کر اپنا حاجت پوری کرے گی۔ بازار وغیرہ میں کوئی مرد یا لڑکا اسے چھیڑنے کی غلطی کر بیٹھے تو ارد گرد موجود بھی حضرات عورت ہی کی طرف داری کر کے مرد کی دھلائی کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایسی سہولتیں و آسائشیں ہیں جو مشرق کی عورت کو حاصل ہیں۔ باقی کوئی زیادتی ہوتی ہے تو اس سے مغرب کی عورت بھی بچی ہوئی نہیں ہے۔ زنا بالجبر کے واقعات مشرق سے کئی گنا زیادہ تمھارے ہاں ہوتے ہیں، جیسے خود کو دیکھ لو.....''

وہ بپھر کر بولی۔ ''ریجا تم غلیظ سؤر کا نام لیے بغیر اپنی بات پوری نہیں کر سکتے۔''

میں ہنسا۔ ''سچ بتاؤ گالیاں بکنے کی ڈگری لی ہے یا قدرتی صلاحیت ہے۔''

''مجھے اکسا رہے ہو۔'' وہ سچ مچ طیش میں آ گئی تھی۔

''چلیں۔'' اسے برہم دیکھ کر میں نے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ نقاب سے اس کی پرکشش بھوری آنکھیں جھلک رہی تھیں۔ کالے گاؤن نے اس کی کشش میں اضافہ کر دیا تھا۔ لمحہ بھر مجھے گھور کر اس نے سر جھٹکا اور قدم بڑھا دیے۔

کمرے کی چابی ہم نے پاس رکھی تھی کہ فی الحال وہ ٹھکانہ محفوظ تھا۔ البتہ وہاں کوئی قیمتی چیز نہیں چھوڑی تھی جس کے حصول کو ہمارا لوٹنا ضروری ہوتا۔

تھوڑا پیدل چلنے کے بعد ہمیں ٹیکسی مل گئی تھی۔ وشال گپتا کی رہائش گاہ کے قریب ایک مشہور مقام کا بتا کر ہم بیٹھ گئے۔ اس کی روزمرہ مجھے ازبر تھی۔ اس کی کوٹھی کے قریب بس اسٹاپ تھا جہاں بیٹھ کر کوٹھی کی نگرانی کی جا سکتی تھی۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ زنانہ انتظار گاہ میں لورا کو بٹھا کر میں دوسرے حصے میں کھڑا ہو گیا۔

ایک دو بسیں آ کر چلی گئیں۔ لوگوں کی آمد و رفت جاری رہی۔ اسی دوران وشال گپتا کی کار اپنی گلی سے برآمد ہوئی۔ اس کے عقب میں محافظوں کی جیپ موجود تھی۔ ان کے غائب ہوتے ہی میں نے لورا کو متوجہ کر کے چلنے کا اشارہ کیا۔

سڑک پار کر کے ہم چوڑی گلی میں داخل ہوئے۔ ''تمھیں یقین ہے ہمارے پکڑے جانے کا خطرہ نہیں ہے۔'' اس نے کافی بار کا دہرایا ہوا اندیشہ اگلا۔

میں جھلاتے ہوئے بولا۔ ''ڈر لگ رہا ہے تو واپس جا سکتی ہو۔''

''ریجا پکڑے گئے تو بہت برا ہو گا۔'' میری بیزاری کو اس نے خاطر میں نہیں لایا تھا۔

''ایک پیشہ ور سنائپر کو خطروں سے تسلی دینا انوکھا و عجیب لگتا ہے۔ اگر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں تب بھی موت کا خطرہ اتنا ہی ہے جتنا زندگی و موت کی جنگ لڑتے ہوئے درپیش ہوتا ہے۔''

وہ روہانسی ہوئی۔ ''میں موت سے نہیں ڈرتی۔''

اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے میں نے تسلی آمیز انداز میں سہلایا۔ ''میں ہوں نا تمھارے ساتھ، تمھیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔''

وہ ممنونیت سے بولی۔ ''تم بہت اچھے ہو۔''

میں دھیرے سے مسکرا دیا۔ مقدر بھی کیا کیا کھیل دکھاتا ہے۔ یہ وہی لورا براؤن تھی جو میرے خون کی پیاسی تھی اور

میں اسے اور اس کے ساتھی کو قتل کرنے کے درپے تھا۔ تب میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن ہم اکٹھے دشمنوں سے بھاگتے پھر رہے ہوں گے اور ہمارے فائدے نقصان ایک ہو جائیں گے۔

وشال گپتا کی کوٹھی کافی وسیع و عریض تھی۔ بنیادی طور پر وہ اس کی ذاتی رہائش گاہ سے زیادہ اڈے کی حیثیت رکھتی تھی، کیوں کہ وہاں اس کے گرگے بھی رہتے تھے۔ البتہ عمارت کے اندر اس کا ذاتی پورشن باقیوں سے علیحدہ تھا جہاں ہر کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وسعت کی وجہ سے عمارت کے چاروں جانب گلیاں لگتی تھیں۔ داخلی دروازے پر ہر وقت چوکیدار موجود رہتا تھا۔ اس کے علاوہ پہرے داری کا خاص انتظام نہیں تھا، کیوں کہ راجپوت دادا کے بھائی کے اڈے پر حملہ کرنے کی غلطی کوئی احمق ہی کر سکتا تھا۔ البتہ ناگہانی صورت حال کو وہاں ہر وقت بندے موجود رہتے۔ عمارت میں جمنازیم اور پسٹل شوٹنگ رینج بھی موجود تھے۔ باکسنگ رنگ بھی بنا ہوا تھا جہاں وہ خالی ہاتھ لڑنے کی مشق کرتے تھے۔ بنیادی طور پر دیکھا جائے تو ممبئی ایسا شہر ہے جسے حقیقی معنوں میں غنڈوں کی جنت کہا جا سکتا ہے۔ پورا ممبئی مختلف گروپوں کے درمیان یوں تقسیم ہے جیسے پرانے بادشاہ اپنے مصاحبوں میں ریاستیں تقسیم کیا کرتے تھے۔ پولیس خاموش تماشائی ہے اور صرف خانہ پری کرتی ہے۔ وطنِ عزیز کی طرح وہاں بھی غریب کا پرسان حال کوئی نہیں اور پولیس کے لیے تختہ مشق بنا رہتا ہے۔

وشال گپتا کے پاس میں نے کچھ عرصہ گزارا تھا اور اس دوران عمارت سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ سنائپر تو کسی جگہ کی ایک بار قراولی (ریکی) کر کے کچھ نہیں بھولتا، میں نے تو وہاں کافی دن گزارے تھے۔ میرے لیے وہ عمارت کھلی ہتھیلی کی طرح تھی۔ کسی بھی شخص کو سب سے آسان اپنے گھر میں گھسنا ہوتا ہے۔ اور میرے لیے وہ گھر کی حیثیت رکھتی تھی۔

عقبی گلی میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ ہم مٹر گشت کرنے لگے۔ تیسرے چکر میں گلی خالی ملی اور میں اچھل کر دیوار پر چڑھ گیا۔ اس دیوار کے ساتھ دونوں جانب چار کوارٹر بنے ہوئے تھے جہاں باورچی، خاکروب اور چوکیداروں کی رہائش تھی۔ خاکروب اور باورچی اپنے کنبے کے ساتھ رہتے تھے۔ اور مجھے سب سے زیادہ ڈر انھی کے بچوں کا تھا جو کبھی کبھار کوارٹر سے باہر کھیل رہے ہوتے تھے۔ گو اس بارے وشال گپتا نے سختی سے منع کیا ہوا تھا کہ بچے کوارٹر سے باہر نہ نکلا کریں، مگر بچے تو بچے ہوتے ہیں۔ میں خود کئی بار بچوں کو کوارٹروں سے باہر کھیلتا دیکھ چکا تھا۔ خیر چھوٹے بچوں کا کوئی خاص مسئلہ نہیں تھا کہ وہ اتنے سمجھ دار نہیں ہوتے۔ دس بارہ سال سے بڑے بچے مسئلہ پیدا کر سکتے تھے۔

دو کوارٹر ایک جانب بنے تھے اور دو دوسری جانب بیچ میں قریباً بیس فٹ جگہ خالی تھی۔ وہاں لوہے کا چھوٹا سا دروازہ بھی نصب تھا، مگر دروازہ عموماً بند ہی ہوتا تھا۔ اس دروازے کو کوارٹروں کے مکین ہی استعمال کرتے تھے۔ ایک لمحہ دیوار پر رک کر میں نے طائرانہ نگاہ دوڑائی اور اندر کود گیا۔ لورا باہر کھڑی رہی۔ دروازے کو تالا لگا ہوتا تھا، مگر چابی وہیں چھپا کر رکھی جاتی تھی۔ چابی کی جگہ مجھے معلوم تھی۔

مخصوص مقام سے چابی برآمد کر کے میں نے دروازہ کھولا، لورا فوراً اندر آ گئی تھی۔ پہلی فرصت میں اس نے گاؤن اور نقاب اتار کر سکھ بھرا سانس لیا تھا۔ ''مسلم عورتوں کا کمال ہے کہ سارا سارا دن اسے اوڑھے رکھتی ہیں۔''

دروازہ قفل کر کے میں نے چابی واپس رکھی اور طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''کسی افریقی قبیلے کی عورت کو تمھارا لباس پہنا دیا جائے تو وہ بھی گھنٹا ڈیڑھ بعد کچھ ایسا ہی کہے گی۔''

نقاب بغل میں دباتے ہوئے وہ اطمینان سے بولی۔ ''تو ٹھیک ہے نا، بغیر کپڑوں کے رہنے میں اسے سکون ملتا ہے تو یہ اس کا حق ہے۔''

میں نے قدم اندرونی عمارت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جب ہر کسی کو سکون کے حصول کی چھوٹ ہے تو شکلا

بے چارے کا کیا قصور جو تم اس کی جان کے درپے ہو۔"

وہ بپھر کر بولی۔ "ریجا....."

"تکرار کا وقت نہیں ہے۔" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے اسے ٹوکا۔ اور اس نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ کوارٹروں کے باہر تین چار کم سن بچے کھیلتے نظر آئے، مگر ان کی عمر اتنی نہیں تھی کہ کوئی خطرہ محسوس ہوتا۔ انھیں نے ہمیں دیکھ کر کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ انھیں نظر انداز کرتے ہوئے ہم اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گئے۔

اندرونی عمارت تین بڑے حصوں پر مشتمل تھی۔ تہہ خانہ، وشال گپتا کی رہائش اور مہمان خانہ و محافظوں کی رہائش۔ ایک طویل راہداری مہمان خانے اور محافظوں کی رہائش کو وشال گپتا کی رہائش سے علیحدہ کرتی تھی۔ وہ طویل راہداری عمارت کے سامنے سے شروع ہو کر عقبی طرف نکلتی تھی۔ یوں کہ وہاں عمارت کے عقب میں جانے کو چکر نہیں کاٹنا پڑتا تھا۔

عمارت کے قریب پہنچتے ہی ہم محتاط ہو گئے تھے۔ میں نے ایسے وقت کا چناؤ کیا تھا جب ملازم اپنے کاموں میں مصروف ہوتے تھے، دوسرے لوگ تہہ خانے میں مشق کر رہے ہوتے یا کام پر نکل جاتے۔ مجھے اس وقت صرف خاکروب سے خطرہ تھا۔ وشال گپتا کے نکلتے ہی وہ اس کی رہائش کی صفائی میں جت جاتا۔ گپت اپنی نگرانی میں سارا کام کرواتا تھا۔ اور پھر وشال کی رہائش کو لاک کر دیتا۔ راہداری کے قریب پہنچتے ہی تہہ خانے کی سیڑھیوں کی جانب سے دو افراد کی گفتگو کی آواز آئی۔ وہ اوپر آ رہے تھے۔ لورا کا بازو پکڑ کر میں دیوار سے لگ گیا۔

وہ شیکھر اور چندر تھے۔ دونوں گپیں ہانکتے ہوئے سیڑھیوں سے اوپر آئے اور راہداری میں آگے بڑھ گئے۔

قدموں کی چاپ معدوم ہوتے ہی میں نے جھانکا، دونوں دوسرے سرے پر پہنچ گئے تھے۔ ان کے غائب ہوتے ہی میں لورا کو پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے راہداری میں داخل ہوا۔ دائیں جانب وشال کی رہائش کا راستہ تھا۔ بائیں جانب تہہ خانے میں جانے کو سیڑھیاں نیچے اتر رہی تھیں۔ جبکہ راہداری کی ابتداء میں بائیں جانب مہمان خانے اور محافظوں کے کمرے کا راستہ تھا۔

میں وشال کی رہائش گاہ کی طرف مڑا۔ غربی دیوار سے متصل لکڑی کا منقش دروازہ تھا جس کے کھلے پٹ ظاہر کر رہے تھے کہ خاکروب صفائی میں مصروف ہے۔ اور یقیناً گپت نے بھی وہیں ہونا تھا کہ وہ اپنی نگرانی میں صفائی کرواتا تھا۔ اب سب سے مشکل مرحلہ درپیش تھا۔ ہمیں ان دونوں سے بچ کر اندر چھپنا تھا۔ کیوں کہ صفائی کے بعد گپت رہائش گاہ کو تالا کر دیتا تھا اور وشال کی آمد ہی پر کھولتا تھا۔ لورا کو یہ تفصیل پہلے سے بتا چکا تھا۔ آنکھوں میں اندیشے بھرے وہ بھی نہایت محتاط انداز میں میرے ساتھ قدم ملائے ہوئے تھی۔

لکڑی کے دروازے میں گھستے ہی چند فٹ کی راہداری تھی اس کے بعد وسیع ڈرائینگ روم، اس سے متصل پرتعیش خواب گاہ اور ایک کوٹ (ہتھیاروں کا کمرہ) بنا ہوا تھا۔ پورے پورشن میں سلیٹی رنگ کا دبیز قالین بچھا تھا۔

لورا کو وہیں رکنے کا اشارہ کر کے میں نے محتاط انداز میں ڈرائینگ روم میں جھانکا، ان کی آواز خواب گاہ کے اندر سے آ رہی تھی۔ گپت کسی بات پر غصے ہو کر بے چارے خاکروب کو جھاڑ رہا تھا۔ شاید اس نے کسی قیمتی چیز کو بے احتیاطی سے صاف کیا تھا۔ موقع غنیمت تھا۔ لورا کو اشارہ کر کے میں سرعت سے دوسری خواب گاہ کی طرف بڑھا۔ دو تین سیکنڈ کے اندر ہم نے وسیع ڈرائینگ روم عبور کیا اور خواب گاہ کا دروازہ بے آواز کھولتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ کھڑکیوں کے دبیز پردے گرے ہوئے تھے، اس لیے مناسب اندھیرا چھایا تھا۔ چھپنے کو بہترین مقام بیڈ کا نچلا حصہ تھا۔ ہم نیچے کھسک کر خاموش لیٹ گئے۔ امید تھی کہ گپت اس خواب گاہ کی بھی صفائی کروائے گا، اسی وجہ سے ہمیں بیڈ کے نیچے گھسنا پڑا تھا۔ مگر وہ اندر نہ

آئے۔ڈرائینگ روم اور کوت کی صفائی کر کے ان کی باتوں کی آواز معدوم ہوگئی تھی۔مزید چند منٹ انتظار کر کے میں نے لورا کو باہر نکلنے کا کہا۔اور خود بھی کھسک کر نکل آیا۔لورا نے اپنا برقع بیڈ کے نیچے ہی چھپا دیا تھا۔یقیناً ہمیں واپسی پر اس کی ضرورت پڑنا تھی۔برقع اوڑھنے سے بہترین میک اپ کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

صفائی ہو جانے کے بعد رہائش گاہ کا داخلی درواہ قفل کر کے گپت بے فکر ہو جایا کرتا تھا۔یہ دروازہ وشال گپتا کی واپسی ہی پر کھلتا تھا۔ہم نے ڈرائینگ روم کے صوفوں پر نشست سنبھال لی۔

لورا نے مجھے سوالیہ نظروں سے گھورا۔''کب تک لوٹے گا؟''

''مقرر وقت نہیں ہے،عموماً سہ پہر کو لوٹا کرتا تھا،گاہے شام یا پھر رات بھی ہو جاتی تھی۔مگر ایسا خال ہی ہوتا تھا۔''

اس نے کوفت ظاہر کی۔''اتنا لمبا انتظار۔''

میں نے کہا۔''چلو اس کے کوت کا جائزہ لیتے ہیں،پھر خواب گاہ کی تلاشی لیں گے۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ گئی۔ہم کوت میں گھس گئے۔

''ارے واہ۔''لورا کی آنکھوں میں تحسین ابھری۔اس نے سب سے پہلے بیرٹ 107 ایم ایم کو پکڑا تھا۔''میری پسندیدہ رائفل۔''

''ہمیں ہتھیاروں کی ضرورت پڑے گی۔اور یقیناً یہاں سے ہمیں اپنی پسند کے ہتھیار مل جائیں گے۔''

''صرف پستول ہی لے جا سکتے ہیں۔کیوں کہ رائفلوں کو ساتھ پھرانا ممکن نہ ہوگا۔البتہ ایس آر ون لے جائیں گے۔اس کی موجودگی میں ہمیں کسی بھی عمدہ سنائپر رائفل کا محتاج نہیں ہونے دے گی۔''

گلیل،ڈریگنو،ووداسک اور بیرٹ 107 کے ساتھ اب ایس آر ون بھی اس کے کوت کی رونق بنی ہوئی تھی۔

میں نے منہ بنایا۔''جب سے ایس آر ون کی خامی کا پتا چلا ہے اس سے دل ہی اٹھ گیا ہے۔''

''پچاس گولیوں تک تو اتنا درست فائر کرتی ہے کہ آپ بیرٹ 107،چنک ایم 200 اور ایکوریسی انٹرنیشنل کو بھول جائیں گے۔''اس نے اعلیٰ قسم کی سنائپر رائفلوں کا نام گنوایا۔

میں نے کہا۔''لیکن عمر نہایت کم ہے نا۔''

وہ اطمینان سے بولی۔''ہم نے کون سا مستقل اپنے پاس رکھنا ہے۔شکلا کو ہلاک کرنے کے بعد اس کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔''

میں معترض ہوا۔''اور اس دوران زیادہ گولیاں استعمال کرنا پڑیں تب کیا ہوگا۔''

''مجھے قتل و غارت کا شوق ہے نا تم اس مقصد سے انڈیا آئے ہو.....''اور پھر ایک دم مجھے مشکوک نظروں سے گھورتے ہوئے اس نے ذرا سا وقفہ لیا۔''ویسے تم کس مقصد سے انڈیا آئے ہو۔''

میں نے اطمینان سے پرانی کہانی دہرا دی۔''امریکہ میں سنائپر کورس کے دوران ایک ہندو سنائپر راج پال سے دشمنی ہوئی۔اور اس کی وجہ سے میری پلوشہ کو کمر پر اتنی سخت چوٹ لگی کہ اسے علاج کرانے کو امریکہ لے جانا پڑا۔بے چاری معذور ہوتے ہوتے بچی۔اسی سے بدلہ لینے یہاں پہنچا تھا۔لیکن کرن چاولہ کہہ رہا ہے وہ وزیرستان ہی میں ہلاک ہو گیا تھا۔اب نا معلوم جھوٹ بول رہا ہے یا مجھے بھٹکا رہا ہے۔''

''تم اتنی دور ایک چھوکری کے زخمی ہونے کا بدلہ لینے آئے ہو۔اور اس کی وجہ سے اپنا یہ حال کرا لیا ہے۔''اس کے لہجے میں افسوس تھا۔

''اللہ پاک کی قسم اتنی دور ایک چھوکری ہی کے لیے آیا ہوں۔''میں نے حقیقت اس انداز میں اُگلی کہ وہ سچ نہیں

جان پائی تھی۔ کیوں کہ میں وہاں پر ما انصاری کے لیے آیا تھا۔

اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ ''تمھیں کھان لڑکی اتنی پیاری ہے کہ اس کے لیے اتنا جوکھم ہنسی خوشی اٹھا لیا۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ پلوشے مجھے اپنی جان سے بھی عزیز ہے۔''

اس نے منہ بناتے ہوئے تبصرہ کیا۔ ''ایشیائی لوگوں کی احمقانہ محبت۔''

میں بغیر لگی لپٹی رکھے بولا۔ ''یہ احمقانہ محبت تمھاری لچر و بے ہودہ محبت سے کئی گنا اچھی ہے۔ کہ محبت کی معراج ہی جسمانی ملاپ کو سمجھ لیا گیا ہے۔'' اس دوران ہم نے اپنے پستول پھینک کر وہاں سے اعلیٰ ساخت کا ایک ایک پستول اٹھا لیا تھا۔ اس نے زگانہ نائین ایم ایم پسند کیا، جبکہ مجھے گلاک نائینٹین مل گیا تھا۔ وہاں دو سائیلنسر بھی مل گئے تھے۔

زگانہ کو پیٹھ پیچھے اپنی جینز میں اڑستے ہوئے وہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔ ''انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور اپنے جسم کے بارے ہر انسان کو آزادی حاصل ہونا چاہیے۔ جیسے بھوک لگنے پر انسان کسی بھی اچھے ہوٹل و ریستوران کھانا کھا سکتا ہے، یونہی غیر شادی شدہ ہونے پر اپنی پسندیدہ شخصیت سے جسمانی تعلق بھی بنا سکتا ہے۔''

''یہی کام تو جنگل کے جانور بھی کرتے ہیں۔ کیا انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے ان سے مختلف نہیں ہونا چاہیے۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''کیا میں نہیں جانتی تمھارے ملک میں یہ کام کتنی کثرت سے ہوتا ہے۔''

''میں کسی فرد کی صفائی نہیں دے سکتا۔ اپنے دین کا بتا سکتا ہوں کہ یہ فعل بہت بڑا گناہ ہے۔ باقی میرے ملک میں اس گندے فعل میں ملوث کافی لوگ ملیں گے تو کثیر تعداد ایسوں کی بھی ہے جو اپنی بیوی پر اکتفا کرنے والے ہیں۔ اور کسی غیر محرم کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ اور جہاں تک گناہ سرزد ہونے کا تعلق ہے تو برطانیہ میں بھی لوگ بہت سارے ایسے کام کرتے ہیں جن کی اجازت برطانیہ کا قانون نہیں دیتا۔''

وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ''اور تمھارا شمار کن افراد میں ہوتا ہے۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''اتنے دن ہو گئے ہیں اکٹھے رہتے اب تک تعین نہیں کر سکی ہو۔''

''تم عام مردوں کی طرح نہیں ہو۔'' محجوب انداز میں اعتراف کرتے ہوئے وہ دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ میں نے بھی متبسم ہو کر اس کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔

کوٹ سے نکل کر ہم نے خواب گاہ کی اچھی طرح تلاشی لی مگر کوئی مفید شیئے ہاتھ نہ لگی۔ گھنٹے ڈیڑھ کی خواری کے بعد ہم خواب گاہ میں رکھے فرج پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔ مختلف اقسام کے عمدہ جوسوں کے علاوہ فرج موسمی پھلوں سے بھرا تھا۔ ایک الماری میں مختلف شرابیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ لورا نے ایک بوتل کھول کر آدھا گلاس بھرا۔

''ریجا پیو گے۔'' شرارتی انداز میں مسکراتے ہوئے اس نے دعوت دی۔

میں ترکی بہ ترکی بولا۔ ''پی تو شاید لوں، مگر اس کے بعد خود پر قابو نہیں رہے گا اور ہو سکتا ہے کوئی ایسی حرکت کر بیٹھوں کہ تم شکلا سے پہلے میرے قتل کے درپے ہو جاؤ۔''

وہ خجالت سے بولی۔ ''تم نہیں سدھرو گے۔'' میں کھل کھلا کر ہنس دیا تھا۔

ہم کافی دیر گپ شپ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ گھڑی کی سوئیاں تین کا ہندسہ عبور کر گئی تھیں۔ اب وشال گپتا کسی وقت بھی آ سکتا تھا۔ گو اس کے استقبال کو ہم ذہنی طور پر تو پہلے ہی تیار تھے، مگر اب جسمانی طور پر بھی چوکنے ہو گئے تھے۔ اپنی موجودگی کے سارے نشان ہم نے مٹا دیے۔ جوس کے خالی ڈبے اور بوتلیں وغیرہ کوڑا کرکٹ کی ٹوکری میں

ڈالیں اور کان دروازے کی طرف لگا لیے۔ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس کی روزمرہ تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ ساڑھے تین بجے کے قریب دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اور ہم اس کی خواب گاہ میں گھس کر دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ دبیز قالین کی وجہ سے اس کے قدموں کی چاپ نہیں ابھری تھی۔ یوں لگا وہ ایک دم دروازے پر نمودار ہوا ہو۔ وہ اکیلا تھا، اندر آتے ہی کرسی پر نشست سنبھالی اور جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔

''اگر چاہو تو یہ کام میں بھی کر سکتا ہوں۔'' مزاحیہ انداز میں کہتے ہوئے میں آگے بڑھا۔

اس کے سر پر گویا پہاڑ آن گرا تھا۔ اچھل کر کھڑا ہوا۔ ہاتھ کوٹ کی جیب کی طرف بڑھا مگر میرے ہاتھ میں سائیلنسر لگا پستول دیکھتے ہی اس نے ہاتھ پہلو میں گرا لیا تھا۔

''کس..... سندیپ تم..... کیسے آنا ہوا۔'' پہلے جھٹکے سے سنبھلتے ہی اس نے بہ ظاہر نارمل لہجے میں پوچھا تھا۔

میں اطمینان سے بولا۔ ''گپ شپ کو من کر رہا تھا اور لورا براؤن کی بھی ضد تھی کہ وشال صاحب سے ملاقات کی جائے۔''

وہ ہکلایا۔ ''کک..... کیوں نہیں، آئیں تشریف رکھیں۔''

میں لورا کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''مادام تم رہائش گاہ کا داخلی دروازہ قفل کر دو۔''

وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔

میں نے ہاتھ وشال کی طرف بڑھایا۔ ''پستول میرے حوالے کرو۔ خواہ مخواہ کا وزن اٹھایا ہوا۔''

خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے مرے مرے ہاتھوں سے اپنا پستول نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔ ڈزرٹ ایگل نائن ایم ایم کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہوئے میں نے پیٹھ پیچھے پتلون میں اڑس لیا۔

''بیٹھو۔'' میں نے خود بیڈ پر نشست سنبھال لی تھی۔

''سندیپ یقین جانو میری حیثیت ایک عام سے مہرے سے بڑھ کر نہیں ہے۔''

''تم نہیں جانتے میں کون ہوں؟'' اس کے بار بار سندیپ کہنے پر میں معترض ہوا۔

وہ ہکلایا۔ ''کک..... کوئی خاص نہیں جانتا۔''

میں کھل کھلا کر ہنسا۔ ''مذاق نہ کرو یار۔''

''تمھارا نام راجا ذیشانی حیدر ہے اور پاکستانی سنائپر ہو۔ بس اتنا پتا ہے۔''

لورا اندر آئی۔ میں نے پوچھا۔ ''لورا کے بارے بھی کچھ نہیں جانتے۔''

''اتنا ہی پتا ہے جتنا شوٹنگ کلب میں اس کا تعارف کراتے ہوئے بتایا گیا تھا۔''

لورا نے اعتراض اٹھایا۔ ''ریجا، یہ انگریزی جانتا ہے۔ اور ہندی سن کر مجھے الجھن ہوتی ہے۔''

میں انگریزی میں بولا۔ ''وشال گپتا صاحب! تمھاری وجہ سے میں جتنی اذیتیں اور تکالیف جھیل چکا ہوں، اس کی تفصیل تو نہیں بتا سکتا۔ البتہ ویسا ہی تمھارے ساتھ کر کے دکھا سکتا ہوں۔ بھولے بننے کا ناٹک چھوڑو اور جتنا کچھ معلوم ہے اُگل دو۔ یقیناً اپنی چمڑی اور جان بچانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ اور تمھیں معلوم ہونا چاہیے، گزشتہ چند دنوں میں اذیت رسانی کے اتنے طریقے سیکھ چکا ہوں کہ تم چند منٹ نہیں نکال پاؤ گے۔''

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''جان بخشی کا وعدہ کرو، میں سب کچھ بتانے کو تیار ہوں۔''

میں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے نرمی سے بولا۔ ''اگر سب کچھ آرام سے اُگل دو تو تمھارا قصور معاف کیا جا سکتا ہے۔ اور خیال رہے۔ کافی باتوں کا پتا ہمیں چل چکا ہے۔ ذرا سی غلط بیانی سے ہماری ہمدردیاں کھو دو گے۔ اس لیے خوب

سوچ سمجھ کر بولنا۔ اور فکر نہ کرو وقت وافر ہے۔''

خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے وہ لجاجت سے بولا۔ ''تھوڑا پینے کو مل سکتا ہے۔''

''کیا پیو گے۔'' لورا الماری کی طرف بڑھ گئی۔

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''وسکی۔''

لورا ایک سنہرے مشروب کی بوتل اور دو گلاس اٹھا کر قریب آ گئی۔ ایک گلاس میں غلاظت انڈیل کر وشال کی طرف کھسکایا اور دوسرا اپنے لیے بھرنے لگی۔

وشال نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ لورا کی نظریں میری جانب اٹھیں۔ اپنا گلاس میز پر رکھ کر وہ فرج کی طرف بڑھ گئی۔ واپسی پر ہاتھ میں ٹھنڈا مشروب تھا۔

''شکریہ۔'' مشروب پکڑنے کو میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اسی وقت جیسے بجلی چمکتی ہے، وشال کے پاؤں کی بھرپور ٹھوکر میرے پستول پر لگی۔ پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔

اگلے ہی لمحے اس نے لورا کو چھاپ لیا، ایک بازو گلے میں ڈال کر اس نے لورا کی پشت اپنی چھاتی سے لگا لی تھی۔ یقیناً وہ پہلے ڈرنے کا ناٹک کر رہا تھا۔ اس کا بھائی زیر زمین دنیا کا نامور دادا تھا، وہ خود اس کا دست راست تھا۔ یقیناً اتنا بودا نہیں ہو سکتا تھا کہ ہاتھ پاؤں نہ مارتا۔

میں لاشعوری طور پر اس لیے بے فکر تھا کہ میری نظر میں وہ لڑائی بھڑائی کے فن سے نا آشنا تھا۔ اور اس کی وجہ اس کا پہلی ملاقات میں تین آدمیوں سے مار کھاتے ہوئے ملنا تھا۔ یقیناً تب ڈراما ہی رچایا گیا تھا۔ ممتا دیدی کا گھر چھوڑنے کے بعد وہ مجھے ایسا ٹھکانہ دینا چاہتے تھے جہاں میں ہر وقت ان کی نظر میں رہتا۔ اور اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں تھا جو انھوں نے سوچا تھا۔ مجھے وشال گپتا پر احسان کرنے کے زعم میں مبتلا کر کے انھوں نے اپنا مطلب حاصل کر لیا تھا۔

سیانے کہتے ہیں۔ ''جس کا کام اسی کو ساجے اور کرے تو ٹھینگا باجے۔'' اور بلاشبہ جاسوسی بہت مشکل اور دشوار کام ہے۔ میں جاسوس نہیں تھا کہ اتنی گہرائی میں سوچ سکتا۔ میرا دماغ سنائپنگ کے بارے زیادہ تیز تھا۔ یقیناً کوئی تربیت یافتہ جاسوس ہوتا تو مسلسل اتفاقات پر چونک جاتا۔ ممتا دیدی کا ملنا اور پھر ان کے گھر سے نکلتے ہی وشال گپتا سے ملاقات اور اس کا فوراً اپنے پاس رہنے کی پیش کش کرنا، میرے ماضی کے بارے سرسری سا پوچھ کر مطمئن ہو جانا، اپنا محافظ بنا لینا وغیرہ۔

لورا نے مچل کر اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی، مگر وشال نے اس کا ایک بازو سختی سے مروڑ کر اس کی پیٹھ سے لگایا اور اپنا دایاں بازو اس کے گلے میں ڈال کر گرفت سخت کر لی۔ لورا لڑائی بھڑائی کے فن سے آشنا تھی مگر اس وقت بے بس نظر آ رہی تھی۔

اگر قریب آنے کی کوشش کی تو اس کی گردن توڑ دوں گا۔'' لورا کو قابو کرتے ہی اس نے سخت لہجے میں دھمکی دی۔

اسے نظر انداز کرتا ہوا میں اطمینان سے پستول کی طرف بڑھا۔ گو میرے پاس وشال گپتا کا ڈزرٹ ایگل نائین ایم ایم (Desert Eagle 9mm) موجود تھا، مگر اس پر سائلنسر نہیں لگا تھا۔

گلاک اٹھا کر میں متبسم ہوا۔ ''گپتا جی، اس قتلی سے جو فائدہ اٹھانا تھا میں نے اٹھا لیا۔ اب یہ باسی کھانے جتنی اہمیت رکھتی ہے۔ اور اس کا مرنا جینا میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ تم شوق سے اس کی گردن توڑ سکتے ہو۔''

میرا پراعتماد لہجہ اور اطمینان بھرا انداز اسے چوکنا کر گیا تھا۔

''کہہ رہا ہوں پستول پھینک دو ورنہ اس کی جان جائے گی۔'' وشال کی پھیکی دھمکی اس کی بوکھلاہٹ آشکارا کر رہی

تھی۔

اچانک میں نے اس کی آنکھوں میں تیز چمک ابھرتی دیکھی۔ایک دم میں جان گیا کہ اس نے لورا کی جینز میں اڑسا ہوا پستول محسوس کرلیا ہے۔

لورا کا ہاتھ آزاد کرتے ہوئے اس نے فوراً پستول تک رسائی پائی۔اور پستول برآمد کرتے ہی نال لورا کی کنپٹی سے لگادی۔مگر یہ دھیان نہیں رکھ سکا تھا کہ پستول کا کک نہیں تھا۔اور ایک ہاتھ سے پستول کو کاک کرنا ممکن بھی نہیں تھا۔کاک کرنے کو اسے ایک ہاتھ سے پستول پر گرفت رکھتے ہوئے، دوسرے ہاتھ سے پستول کی سلائیڈ کو پیچھے کھینچ کر چھوڑنا تھا۔گو اس میں سیکنڈ بھر ہی وقت خرچ ہونا تھا مگر ایسے حالات میں سیکنڈ کی اہمیت گھنٹے سے بھی بڑھ جاتی ہے۔

''میرے تین گننے تک اگر تم نے پستول نہ پھینکا تو یہ کام سے گئی.....ایک.....''پستول حاصل کرتے ہی اس کے لہجے میں اعتماد بڑھ گیا تھا۔

''مسٹر وشال جانتے ہو، جب ہوا دائیں سے بائیں چل رہی ہو تو سنائپر اپنی شست ہدف پر کس جگہ سادھتا ہے، یقیناً سب سے پہلے وہ اسے غیر مسلح کرنا چاہے گا۔باقی رہی گنتی، تو وہ تم اپنے لیے گن رہے ہو۔''میں نے بین السطور لورا تک اپنا ارادہ پہنچایا کہ میں وشال گپتا پر فائر کرنے والا ہوں۔اور فائر بھی اس کے پستول پر کروں گا۔اور یہ بھی واضح کیا کہ اس کی گنتی میری گنتی ہے۔تاکہ اس کے تین کہتے ہی لورا اپنی گردن بائیں جھکائے، یوں مجھے زیادہ ہدف مل جاتا۔

اب معلوم نہیں اس کے بھیجے میں میری بات بیٹھی تھی کہ نہیں۔البتہ میں فائر کے لیے تیار ہوگیا تھا۔وشال چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔اور اتنے کم فاصلے پر بھی پستول کی گولی سے باریک بینی سے نشانہ سادھنا آسان نہ تھا۔مگر فائر کرتے ہوئے میں نے خطرہ مول لینے کی پروا بھی نہیں کی تھی۔صرف پلوشہ کے سر پر رکھے گلاس کو نشانہ بنانے کے علاوہ میری انگلی کبھی لبلبی پر نہیں کانپی۔

''اپنی بکواس پاس رکھو۔اور بہتر ہوگا پستول پھینک دو۔میں جانتا ہوں تمھارے دل میں اس بلبل کے لیے کیا جذبات چھپے ہیں۔اگر اس کی پروا نہ ہوتی تو مکالمہ بازی میں وقت ضائع نہ کرتے۔''

''مسٹر وشال، یہ میری محبوبہ ہے نہ بیوی۔اور گزشتہ ایک ہفتے سے میرے ساتھ ایک ہی بیڈ پر سو رہی ہے تو اب خود اندازہ کرلو اس کی کتنی اہمیت باقی رہ گئی ہوگی۔''

وہ جھلاتے ہوئے بولا۔''جھوٹ بول رہے ہو۔''اسے گنتی کرنا بھول گیا تھا۔

''تمھیں شاید ایک سے آگے گنتی نہیں آتی۔چلو میں گن لیتا ہوں۔دو.....''میں نے اس کی گنتی آگے بڑھائی کہ اس کے بغیر میں لبلبی دبانے کے لمحے سے لورا کو باخبر نہیں رکھ سکتا تھا۔

''مسلے، دھمکی نہیں دے رہا، میں سچ مچ اسے.....''

''تین.....''قطع کلامی کرتے ہوئے میں نے گنتی مکمل کی۔میرے ''تین کہتے ہی''لورا نے ایک دم اپنا سر دائیں جانب جھکایا، وشال کو لگا وہ جان چھڑانے کی کوشش کر رہی ہے۔اس نے دائیں ہاتھ کی گرفت اس کی گردن پر سخت کرنا چاہی۔مگر اس سے پہلے میں لبلبی دبا چکا تھا۔

''ٹھک۔'' کی آواز کے ساتھ اس کے منہ سے زوردار کراہ نکلی تھی۔میں نے جان بوجھ کر گولی پستول پر مارنے کے بجائے اس کے ہاتھ کی پشت پر ٹھوکی تھی۔کیوں کہ پستول پر لگنے کی صورت میں گولی اچٹ کر لورا کو نقصان پہنچا سکتی تھی۔اور میں اپنے ساتھی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔

ایک دم لورا کو گرفت سے آزاد کرتے ہوئے اس نے اپنا زخمی ہاتھ دبالیا تھا۔

گردن سے بازو ہٹتے ہی لورا مڑی، اگلے ہی لمحے اسکا بھرپور مکا وشال کی ٹھوڑی پر لگا، وہ لہرا کر نیچے گر گیا تھا۔ لورا نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

''حرامی..... غلیظ سور..... تیری ماں.....'' اس کی زبان پاؤں سے بھی تیز چل رہی تھی۔

یقیناً وشال نے اسے جکڑتے وقت نازیبا حرکات بھی کی تھیں، تبھی لورا کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ آزادی نسواں کی علم بردار اور میرا جسم میری مرضی کی دعوے دار کے جسم میں شاید کسی مشرقی لڑکی کی روح مقید تھی۔ کیوں کہ اس سے پہلے بھی چھیڑنے والوں پر وہ یونہی تپ جایا کرتی تھی۔

وشال مضروب ہاتھ کو پکڑے ہوئے درد سے کراہتا رہا۔

میں نے پستول اٹھا کر لورا کی طرف بڑھایا۔ ''یہ لو اور اسے میرے لیے چھوڑ دو۔''

پستول لیتے ہوئے وہ مجھ پر چڑھ دوڑی۔ ''کیا بکواس کر رہے تھے، تمھارے ساتھ سوتی رہی ہوں۔''

''کیا لگتا ہے یہ وقت تکرار کا ہے۔'' میرا لہجہ حد سے زیادہ خشک بلکہ اسے ڈانٹنے والا تھا۔ وہ ٹھٹک کر رکی اور پیچھے ہٹ گئی۔ میں اندازہ نہ لگا سکا کہ خفا تھی، نادم تھی، ڈر گئی تھی یا شاید غصے میں تھی۔

میں نے تیز دھار چاقو سے بستر کی قیمتی چادر سے پٹی پھاڑی اور کس کر وشال کے زخمی ہاتھ پر باندھ دی کہ خون کا اخراج روکنا ضروری تھا۔ وہ اذیت بھرے انداز میں کراہتا رہا۔

سائیلنسر لگے پستول کی نال سے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے میں زہر خند ہوا۔ ''یقیناً میری ہمدردی تمھیں نہیں چاہیے تھی، تبھی اذیتوں کا انتخاب کیا۔''

وہ منمنایا۔ ''مم..... مجھے معاف کر دو۔''

میں اردو میں بولا۔ ''شاید کر بھی دوں، مگر یہ گوری اپنی توہین معاف کرنے پر تیار نہ ہوگی۔''

وہ ندامت سے بولا۔ ''قسم سے توہین کے ارادے سے نہیں چھوا، بس خود پر قابو نہیں رہا تھا۔''

''خیر یہ بعد کا مسئلہ ہے پہلے کچھ اور باتیں ہو جائیں۔'' اطمینان بھرے انداز میں کہتے ہوئے میں نے تفتیش کا آغاز کیا۔ ''تم ایجنسی کے مخبر ہو یا تربیت یافتہ سپاہی ہو۔''

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''ہمارا را کے ساتھ معاہدہ ہے، ملک دشمن عناصر کی سرکوبی کو ہم ان کا ساتھ دیتے ہیں اور وہ ہمارے غیر قانونی دھندوں سے آنکھیں بند رکھتے ہیں۔''

میں نے اگلا سوال پوچھا۔ ''شکلا کے ساتھ کیا تعلق ہے۔''

''ہمارے کافی دھندوں کا سرپرست وہی ہے۔ اس سے ایجنسیاں بھی بے خبر نہیں ہیں، مگر شکلا کے تعلقات اعلیٰ حلقوں تک پھیلے ہیں۔ اور اس کے خلاف کچھ ثابت کرنا سمجھو ناممکن ہے۔''

اور پھر میں مسلسل سوال پوچھتا گیا۔ اس نے صاف گوئی سے سب کچھ اگل دیا تھا۔ کیوں کہ میں نے چند سوال ایسے بھی پوچھے تھے جن کے بارے مجھے پہلے سے معلوم تھا اور اس نے درست جواب دیا تھا۔ اس کی گفتگو کا لب لباب یہی تھا کہ ڈینو کی شہادت کے وقت ہی میں کرن چاولہ کی نظروں میں آ گیا تھا۔ اس نے نہ صرف میری موجودگی کا اندازہ لگا لیا تھا بلکہ بیڈ کے قریب پھیلے خون کو دیکھ کر اسے میرے زخمی ہونے کا بھی پتا چل گیا تھا۔ لیکن میرے مقامی مددگاروں کو گرفتار کرنے کے لالچ میں اس نے مجھے عارضی طور پر جانے دیا۔ میرے زخمی ہونے کی وجہ سے انھیں میرا رخ اپنی مرضی کی سمت موڑنے میں آسانی رہی تھی۔ داہنی دیوار کے ساتھ گملوں کا ریک انھوں نے خود رکھا تھا تاکہ میں اسی سمت کا رخ کروں۔ یقیناً ایک زخمی کو دیوار عبور کرنے کو سہارے کی ضرورت تھی۔ گو دیوار کی نسبت دروازے سے نکلنا زیادہ آسان

تھا، مگر دروازے کے سامنے انھوں نے پہرے دار متعین کر دیا تھا تا کہ میں دروازے سے نہ نکل سکوں۔ ممتا دیدی کے گھر سے نکلتے وقت ایک تو میری کلائی پر مخصوص گھڑی بندھی تھی جس میں آلہ نشان دہی (انڈیکیٹر) چھپا تھا۔ دوسرا انھوں نے وشال گپتا والا ڈراما کر کے ایک بار پھر مجھے اپنی نگرانی میں رکھ لیا۔ کیوں کہ میں گھڑی کسی بھی اتار سکتا تھا۔ ممتا دیدی سے میری عقیدت ان کی نظر میں کسی خاص اہمیت کی حامل نہیں ہو سکتی تھی۔ یوں بھی جاسوس جذبات و احساسات کو پس پشت رکھ کر صرف اور صرف اپنے ملک کی سلامتی کا سوچتا ہے۔ کئی بار اخلاقی ضابطوں اور کردار کو ملکی سلامتی کی خاطر قربان کرنا پڑتا ہے۔ اپنا محافظ بنانے کے بعد وشال گپتا نے مجھے کھلی چھوٹ دینا تھی تا کہ میں اطمینان سے اپنے ساتھیوں سے رابطہ کر سکتا اور کرن چاولہ ان کے ٹھکانے تک پہنچنے کے بعد مجھے بھی گرفتار کر لیتا، مگر اس منصوبے کی راہ میں شکلا آن ٹپکا۔ انھی دنوں لورا براؤن کی آمد ہوئی تھی۔ اور شکلا سنائپر رائفلوں کی خریداری میں سنجیدہ تھا، مگر لورا براؤن سے پہلی ملاقات کے بعد اس نے لندن میں اپنے کارندوں کے ذریعے لورا کے بارے معلومات لینا چاہی تب اسے لورا کے کیس تک رسائی ہوئی۔ اور یہ جانتے ہی اس کے دماغ میں لورا کے حصول کی غلیظ خواہش کے ساتھ ایس آر ون کو ہتھیانے کا شیطانی منصوبہ پیدا ہوا۔ سونے پر سہاگہ ایک پاکستانی جاسوس کی دستیابی تھی کہ میری وجہ سے لورا کے جرم کا وزن کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ اب پچھلے ایک ہفتے سے وہ پاگلوں کی طرح ہماری تلاش میں سرگرداں تھے، لیکن ان کی تلاش بار آور ثابت نہیں ہوئی تھی۔ لورا کے کہنے پر ڈیوڈ نے بھی اب تک ایس آر ون نہیں بھجوائی تھیں۔ گو شکلا کے پاس لورا کی وڈیوز موجود تھیں، مگر ہم دونوں کے فرار کی وجہ سے ان وڈیوز کی اہمیت ختم ہو گئی تھی۔ کیوں جس جرم کا منصوبہ بنا تھا وہ انجام کو نہیں پہنچا تھا۔ اب لورا کی وڈیو کے کئی احتمال ممکن تھے۔ اور وڈیو کو اس کے خلاف استعمال کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔

لورا کی سہولت کو میں وشال سے انگریزی میں محو گفتگو رہا تھا۔ وہ دوران گفتگو لاتعلق و بے پرواسی بیٹھی رہی۔ یقیناً میرے ڈانٹنے کو اس نے شدت سے محسوس کیا تھا۔

''کرن چاولہ کہاں مل سکتا ہے۔'' چونکہ میرا ارادہ اسے زندہ چھوڑنے کا تھا اس لیے میں ایسے انداز میں سوال کر رہا تھا کہ انھیں میرے اگلے اقدام کے بارے اندازہ لگانے میں آسانی نہ ہو۔

''وہ بہ ظاہر ایک کاروباری شخصیت ہے عموماً اپنی کمپنی کے دفتر میں ملتا ہے۔''

میرے پوچھنے پر اس نے کمپنی کا نام پتا بتا دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''یقیناً اپنی حفاظت کا اہتمام تو کرتا ہوگا۔''

وشال کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔ ''کرن چاولہ ایسی بلا کا نام ہے کہ لوگوں کو اس سے بچنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ روزمرہ کام کے چند بندے اس کے دائیں بائیں موجود رہتے ہیں۔''

''شکلا کا اتا پتا.....؟''

''اپنے محل کے علاوہ اس کا مخصوص ٹھکانہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ اور نہ اس کے بارے کوئی زیادہ جانتا ہے۔''

''تمھیں پتا ہونا چاہیے کہ اس کے خاص آدمی ہو۔''

''اس کا تعلق راجپوت بھائی سے ہے۔ اور مجھے بھی راجپوت بھائی کے واسطے سے کبھی کبھار شرف ملاقات بخش دیتا ہے۔ وہ بھی جب اسے مجھ سے کوئی کام ہو۔''

میں نے فوراً پوچھا۔ ''اور راجپوت دادا کہاں ملے گا۔''

اس نے نصیحت کی۔ ''بہتر ہوگا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ نہ ڈالو اور طبعی عمر تک زندگی کے مزے لوٹو۔''

میں طنزیہ انداز میں بولا۔ ''اور یہ غلط فہمی تمھیں کب سے ہے کہ راجپوت دادا پر ہاتھ ڈالنا اتنا مشکل ہے۔''

وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''شما (معذرت) چاہتا ہوں۔''

میں اگلے سوال پر آیا۔ ''ممتا دیدی کہاں ملیں گی؟''

وہ ہنسا۔ ''اس کا نام سنیتا جیسوال ہے۔ بہت چالو پرزہ ہے۔ خطرناک، چالاک اور مطلب پرست۔ سوائے کرن چاولہ کے کسی کو پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتی۔''

میرے دماغ کو جھٹکا لگا تھا۔ وہ ڈینو سے شردھا سہنا بن کر ٹکرائی تھیں۔ مجھے ممتا دشنول کے نام سے ملیں اور اصل نام سنیتا جیسوال تھا۔ یہ بھی ممکن تھا سنیتا بھی ان کا اصل نام نہ ہوتا۔ بہ ہر حال وہ کیسی بھی تھیں مجھے وشال کا انداز گفتگو اچھا نہیں لگا تھا۔ میں اس پر چڑھ دوڑا۔

''مسٹر گپتا! تمھاری پہلی غلطی جانتے ہوئے چھوڑ رہا ہوں۔ اگر اس کے بعد ممتا دیدی کے بارے بکواس کرنے کا سوچا بھی تو زندگی کی ضمانت ضبط کرا بیٹھو گے۔ ان کا نام ممتا ہے، شردھا ہے یا سنیتا، اس سے فرق نہیں پڑتا۔ بس یہ یاد رکھنا وہ میری دیدی ہیں۔''

وہ جلدی سے بولا۔ ''غلطی ہوگئی معافی چاہتا ہوں۔''

میں نے سرزنش کی۔ ''غلطیاں کرنے والوں کی زندگی عموماً مختصر ہوتی ہے۔''

اس نے ندامت ظاہر کی۔ ''دوبارہ موقع نہیں دوں گا۔''

میں زہر خند ہوا۔ ''میں بھی۔''

وشال جلدی سے ممتا دیدی کے بارے تفصیل بتانے لگا۔ ''اس کی رہائش آنند نگر میں ہے۔ مگر وہ کبھی کبھار ہی وہاں جاتی ہے۔ گاہے گاہے کرن چاولہ کے دفتر میں بھی نظر آجاتی ہے۔ را کے ہیڈ کوارٹر میں بھی اس کی رہائش رہتی ہے۔ اور دوران ڈیوٹی کسی ہوٹل، ریستوراں یا گیسٹ روم وغیرہ میں بھی رات گزار لیتی ہے۔ بہ ظاہر آوارہ مزاج، بے باک اور سہل الحصول لگتی ہے، مگر در پردہ مضبوط کردار کی ہے۔ کرن چاولہ کو پسند کرتی ہے اور وہ بھی اس پر جان دیتا ہے۔ شاید جلد ہی شادی کرلیں۔''

''سلطان دادا کیسا شخص ہے؟'' میں نے بغیر کسی مطلب کے پوچھا۔

وہ صاف گوئی سے بولا۔ ''کام سے کام رکھنے والا آدمی ہے۔''

''جنرل دلبیر سنگھ سوہاگ کے بارے کچھ جانتے ہو۔'' انھیں بھٹکانے کو میں نے انڈین آرمی کے ایک سینئر جنرل کا نام لیا۔

وشال نے نفی میں سر ہلایا۔ ''دھیرندر شکلا صاحب کے علاوہ آرمی کے کسی ریٹائرڈ یا حاضر سروس آفیسر سے تعلقات نہیں ہیں۔''

میں نے ایک اور جنرل کا نام پوچھا۔ ''پھر تو تم جنرل روات صاحب کے بارے بھی کچھ نہیں جانتے ہوگے۔''

''اس کا نام بھی نہیں سنا۔''

''کیا شکلا کو معلوم ہوگا، کشمیر کے محاذ پر اب کس جنرل نے تعینات ہونا ہے۔''

''شما چاہتا ہوں مگر آرمی سے متعلقہ معلومات آپ کو کرن چاولہ یا پھر شکلا صاحب سے معلوم ہوں گی۔ آپ کی دیدی بھی اندر کی خبریں رکھنے کی ماہر ہے۔ اس سے بھی کارآمد معلومات مل سکتی ہیں۔''

''تمھارا بھائی کوئی رہنمائی کرسکتا ہے۔''

وشال نے نفی میں سر ہلا دیا۔

میں نے چند اور بے مقصد سوال کر کے تفتیش ختم کرنے کا اعلان کیا۔ ''جان بچانے کی کتنی قیمت ادا کر سکتے ہو۔''

''آپ مانگیں۔'' اس نے گیند واپس پھینکی۔

میں نے بغیر سوچے اگلا۔ ''بیس لاکھ۔''

''منظور ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلانے میں دیر نہیں کی تھی۔

''تم نے کچھ پوچھنا ہے۔'' میں لورا کو مخاطب ہوا۔

اس نے بے رخی سے چہرہ موڑ لیا تھا۔ سخت ناراض و خفا دکھائی دے رہی تھی۔ بلاشبہ لڑکیوں کا روٹھنا لاڈ اٹھوانے اور اپنی اہمیت جتانے کو ہوتا ہے۔ مگر ایسا رویہ اپنے محبوب کے لیے روا رکھتی ہیں۔ ہر ایرے غیرے سے خفا کوئی بے وقوف ہی ہو سکتی ہے۔ اور مجھے لورا سے بے وقوفی کی توقع نہیں تھی۔ اسے اپنے حال پر چھوڑتے ہوئے میں نے وشال کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

مجھے ساتھ لیے وہ کوٹ کی سمت بڑھ گیا تھا۔ ہتھیاروں کی ایک الماری کو ہلکا سا دھکا دے کر اس نے الٹا گھمایا، گھومتے ہی الماری دائیں بائیں کھسکنے کو تیار ہو گئی تھی۔ الماری کو دائیں جانب دھکیلنے پر عقب سے مضبوط فولاد کی تجوری کی جھلک دکھائی دی۔ مخصوص نمبر ملا کر اس نے دروازہ کھولا، تجوری میں کافی دولت موجود تھی۔ مگر میں منہ مانگا مطالبہ پیش کر چکا تھا۔ اب زیادہ دولت کو دیکھ کر زبان سے پھرنا کسی طور مناسب نہیں تھا۔

اس نے گن کر بڑے نوٹوں کی دس گڈیاں میری جانب بڑھا دیں۔ تجوری قفل کی اور الماری سیدھی کر کے اسے چھپا دیا۔

موی لفافے میں لپیٹ کر میں نے پلاسٹک کے مضبوط بیگ میں رقم اور ایس آر ون کا تھیلا منتقل کیا اور بیگ کندھوں میں پہن لیا۔ خواب گاہ کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے ارادہ ظاہر کیا۔ ''ایک بات یاد رکھنا، دوبارہ یہاں آنے کا موقع ملا تو تجوری میں جھاڑو پھیر کر جاؤں گا۔''

وشال پھیکے لہجے میں سے بولا۔ ''مجھے لگا تھا آپ ابھی یہ کام کریں گے۔''

میں نے متبسم ہوا۔ ''مسلمان زبان دے کر نہیں پھرا کرتا۔''

وہ تحسین آمیز لہجے میں بولا۔ ''صرف سنتا تو کبھی یقین نہ کرتا۔''

میں نے مطالبہ کیا۔ ''ہمیں کوٹھی سے باہر چھوڑ آؤ۔''

''یقیناً آپ مجھے یرغمال بنا کر کچھ فاصلے تک ساتھ لے جائیں گے، تو کیوں نہ جانے سے پہلے میری مرہم پٹی کر دو۔ یہاں طبی امداد کا سامان موجود ہے۔''

میں نے پسندیدگی سے سر ہلا دیا۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں اس کی مرہم پٹی کر کے ہم جانے کو تیار تھے۔

''اس پر نظر رکھو، میں سامان لے آؤں۔'' لورا کی خفگی کی پروا کیے بغیر میں نے اسے ذمہ داری سونپی اور دوسری خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ لورا کا برقع بیگ میں ٹھونس کر باہر نکل آیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وشال گپتا کو لورا کے نقاب اوڑھنے کی بابت پتا چلے۔ یوں ان پکا دھیان نقاب پوش لڑکیوں پر مرکوز ہو جانا تھا۔ گو ان کے لیے یہ احتمال سوچنا مشکل نہ تھا، مگر یقین اور ظن میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اور میں ان کے گمان کو یقین میں نہیں بدلنا چاہتا تھا۔

میری واپسی تک لورا کڑے تیوروں سے وشال کو گھورتی رہی۔ مگر زخمی وشال کی حیثیت پر کٹے پرندے کی سی تھی جو اڑنا تو جانتا ہو مگر پروں کا کٹنا اس کی راہ میں رکاوٹ بن جائے۔

''یقیناً غلط حرکت کا انجام تم جانتے ہو گے۔'' باہر نکلنے سے پہلے میں نے اسے متنبہ کرنا ضروری سمجھا۔

وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ''اب غلطی نہیں ہوگی۔''

میں نے وشال کے زخمی ہاتھ پر اس کا ایک کوٹ یوں ڈال دیا تھا جیسے کوئی گرمی کی وجہ سے کوٹ اتار کر بازو پر ڈال لے۔ یوں اس کا زخمی ہاتھ چھپ گیا تھا۔ اپنا پستول پتلون میں اڑس کر میں نے لورا کو اس کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا کہا اور خود ایک قدم پیچھے چلنے لگا۔

اس کی رہائش گاہ سے باہر آ کر میں بہت زیادہ چوکنا ہو گیا تھا۔

انھیں خاموشی سے چلتے دیکھ کر میں نے ہدایت دی۔ ''دونوں مسکرا کر دوستانہ انداز میں گفتگو کرتے ہوئے چلو۔''

لورا کا موڈ آف تھا۔ مگر حالات کی نزاکت اس کی نظر سے اوجھل نہیں تھی۔ وشال کے ٹھیک بازو میں بازو ڈال کر لورا اس سے چپک کر چلنے لگی۔ وشال اس کا پرانا چاہنے والا تھا، اس عنایت پر کھل اٹھا تھا۔ گو اسے بھی لورا کی قربت کی وجہ اچھی طرح معلوم تھی، مگر چاہنے والے آم کھاتے ہیں پیڑ نہیں گنتے۔

چند ملازموں سے سامنا ہوا، مگر وہ ادب سے نمستے کہہ کر اپنے راستے چلتے رہے۔ شام کا ملگجا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ ہم نے وشال گپتا سے تفتیش میں کافی وقت گزارا تھا۔

پارکنگ میں جا کر لورا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی، وشال اس کے پہلو میں بیٹھ گیا تھا۔ میں نے عقبی نشست پر قبضہ جمایا اور ہم چل پڑے۔ چوکیدار نے کار کی روشن بتیاں دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا تھا۔

وشال کی کوٹھی سے نکل کر ہم گلی میں مڑے اور پھر سڑک پر پہنچتے ہی میں نے لورا کو کار روکنے کا کہا۔

اس نے بغیر استفسار کے بریک دبا دی۔

''مسٹر وشال! تمھارے ساتھ میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اور امید کرتا ہوں تم میرے معاملے میں ٹانگ نہیں اڑاؤ گے۔ تمھارا ہاتھ اپنی غلطی کی وجہ سے زخمی ہوا ہے، یقیناً ہمیں دوش نہیں دو گے۔ اور اب اتر جاؤ۔''

''شکریہ۔'' اتنی جلدی جان چھوٹنے پر وہ خوشی سے چہکتا ہوا نیچے اتر گیا۔ لورا نے کار آگے بڑھا دی۔ تھوڑی دور آتے ہی میں نے اسے کار روکنے کا کہہ کر برقع اس کی جانب بڑھا دیا۔

وہ بھناتے ہوئے بولی۔ ''اس کی کیا ضرورت ہے، رات کو کچھ نظر نہیں آتا۔''

''پہنو۔'' میرا لہجہ ضرورت سے زیادہ سخت تھا۔

''تم مجھ پر حکم نہیں جما سکتے۔'' وہ بگڑ گئی تھی۔

میں بے مروتی سے بولا۔ ''ایسا بس تم سوچتی ہو۔''

وہ درشتی سے بولی۔ ''تم نے وہاں بھی کافی بے ہودہ گفتگو کی، جسے میں برداشت کر گئی۔ اگر احسان جتا کر اور مجھ پر حکم چلا کر مدد کرنا چاہتے ہو تو مجھے تمھاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔''

''تم اس کے قابو میں تھیں، کیا تمھاری پاکیزگی کا قصیدہ پڑھ کر، تمھیں اپنا جانو بتلا کر اس کا پلہ بھاری کر سکتا تھا۔ تم بچی ہو، معلوم نہیں ہے کہ دشمن کو کیسے غلط فہمی میں مبتلا کیا جاتا ہے۔''

مجھے خفگی بھری نظروں سے گھورتے ہوئے وہ با آواز بلند بڑبڑائی۔ ''تم بس بکواس کر سکتے ہو۔'' اور باہر نکل کر نقاب اوڑھنے لگی۔

میں بھی باہر آ گیا۔ اس کے تیار ہوتے ہی ہم پیدل چل پڑے۔ کار کو مزید استعمال کرنا نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ پچاس ساٹھ قدم لیتے ہی خالی ٹیکسی مل گئی تھی۔ ہم رہائش سے تھوڑے فاصلے پر اترے اور اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھ گئے۔ وشال سے ملاقات کے بعد اس جگہ پر میرا اعتماد بڑھ گیا تھا۔

مالک مکان کو ہم دن کا کھانا نہ بنانے کے بارے مطلع کر گئے تھے۔ گو وشال گپتا کے فرج سے کافی کچھ کھانے کو ملا تھا، مگر اس کے باوجود سخت بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ بوڑھی مالکن کو پر تکلف کھانے کا بتا کر ہم کمرے میں چلے آئے۔ لورا مجھ سے پہلے تازہ دم ہونے غسل خانے میں گھس گئی۔ نہا کر اس نے شلوار قمیص ڈال لی تھی۔ بلاشبہ مشرقی لباس عورت کی خوب صورتی میں اضافہ کر دیتا ہے۔ مغربی لباس جذبات کو برانگیختہ تو کر سکتا ہے۔ پاکیزگی و تقدس کا احساس اس سے نہیں ہوتا۔ میرے تازہ دم ہونے تک مالک مکان کی بیٹی کھانا لے آئی تھی۔ شاید انھوں نے پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا ہوٹل سے منگوایا ہو۔

خیر سخت بھوک لگی تھی اور میں پیٹ گننے میں وقت ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ لورا براؤن بھی مشرقی کھانوں کی دلدادہ تھی۔ وہ انگریزی پھیکے کھانوں کو خاص پسند نہیں کرتی تھی۔ شاید اس کی وجہ افغانستان میں گزارا ہوا وقت تھا کہ پٹھانوں کے کھانے زیادہ لذیز و ذائقے دار ہوتے ہیں۔

کھانا کھا کر ہم نے برتن واپس کیے اور میں دروازہ کنڈی کر کے نماز پڑھنے لگا۔ اس جگہ مجھے کافی وقت ملا تھا۔ یقیناً ایک مسلمان کے لیے نماز ایسی ہی ہے جیسے مچھلی کے لیے پانی اور بلبل کے لیے باغ ہوتا ہے۔ بلاشبہ سارے دنیاوی کاموں کی تکمیل بھی جسم و روح کو پر سکون و بے فکر نہیں سکتی جب تک کہ آخرت کی تیاری نہ کی جائے۔ منکر نکیر نے مجھ سے سنائپنگ کا امتحان نہیں لینا تھا۔ اور نہ اچھی نشانہ بازی کے گر میری جان چھڑا سکتے تھے۔ ہمارے استاد اس بارے بہت سخت تھے۔ خالی تربیت پر زور نہیں دیتے تھے۔ اس کے ساتھ دین پر چلنے کی بھی بھرپور ترغیب دیتے تھے۔

لورا نے پہلی بار مجھے نماز پڑھتے دیکھ کر حیرانی ظاہر کی تھی۔ کافی سوالات بھی کیے تھے۔ لیکن اب وہ عادی ہو گئی تھی۔ میرا نماز پڑھنا اسے حیران نہیں کرتا تھا۔ وہاں میں مسافر تھا کیوں کہ میرا ممبئی میں رہنے کا عرصہ متعین نہیں تھا۔ اس وجہ سے مختصر نماز پڑھنے کی سہولت موجود تھی۔ سفر کے دوران فرائض کا نصف ہونا اور سنتوں کی چھوٹ ملنا بھی مسلمانوں کو اللہ پاک کی طرف سے بہت بڑی نعمت و سہولت ہے۔ بلاشبہ اسلام کی تعلیمات پر غور و فکر کرنے سے انسان کو اسلام کی حقانیت پر شرح صدر ہوتا ہے۔ اتنی بہترین اور فطرت کے موافق کسی بھی دین کی تعلیمات نہیں ہیں۔ بلکہ باقی ادیان پر غور کرو تو عبادتیں تو کجا ان کے عقائد واضح نہیں ہیں۔ بہ ہر حال یہ موقع اسلام کی حقانیت پر بات کرنے کا نہیں ہے، نہ میں اتنی استطاعت رکھتا ہوں۔ یہ تو علماء کرام کا کام ہے۔ جو انبیاء کرامؑ کے وارث ہیں۔ اللہ پاک علمائے حق کی استقامت و حوصلہ بڑھائے کہ انھی کی وجہ سے آج بھی اسلام اپنے اصل پر کھڑا ہے۔ سارے ادیان مسخ ہو چکے ہیں، ان میں حقیقی روح باقی نہیں رہی۔ لیکن دین اسلام کے سچے طلب گاروں کی مکمل تشفی و تسلی کو کئی در سگاہیں و مدارس اپنی آغوش وا کیے بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھانے کو موجود ہیں۔

نماز پڑھ کر میں بیڈ کی طرف بڑھا، لورا اپنا بیڈ کافی دور کھینچ کر لے گئی تھی۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ رینگی۔ پہلے دونوں بیڈوں میں فاصلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اور جو تھوڑا سا فاصلہ تھا وہ بھی میں نے پیدا کیا تھا۔ اور اب وہ مجھ پر بے اعتباری ظاہر کرتے ہوئے اپنے بیڈ کو خواب گاہ کے دوسرے کونے میں لے گئی تھی۔

میں نے شرارتی لہجے میں پوچھا۔ ''اتنا بے اعتبار کب سے ہو گیا ہوں۔''

وہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ کھولنے کی زحمت کیے بغیر برہمی سے بولی۔ ''بھول گیا، وشال گپتا کے سامنے کیا بکواس کی تھی۔''

میں نے قہقہہ بلند کیا۔ ''کیا خیال ہے وہ اس وجہ سے بولا تھا کہ ہمارے بیڈ نزدیک نزدیک پڑے تھے۔''

''مذاق اڑانے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' وہ بپھر کر اٹھ بیٹھی تھی۔ ''تمھاری محبوبہ ہوں نہ بیوی، ایک

ہفتے سے تمہارے ساتھ سو رہی ہوں اور مجھ جیسی لڑکی کا ایک ہی مصرف ہے کہ غلیظ خواہش پوری کر کے ٹھنڈا لگا دو، یہی بکواس کی تھی ناں۔"

میں نے اطمینان سے سر ہلایا۔ "اور کہا تھا یہ میرے لیے باسی کھانے جتنی اہمیت رکھتی ہے اور اس کا مرنا جینا ایک برابر ہے۔"

وہ برہمی سے بولی۔ "سارے مرد ایک جیسے ہی ہوتے ہیں، غلیظ، گھٹیا اور مطلب پرست۔"

میں سنجیدگی سے بولا۔ "اب ذرا یہ بھی وضاحت کر دو تم سے کون سا مطلب پورا کیا ہے، میری کون سی غلاظت تم پر آشکارا ہوئی ہے۔ اور گھٹیا کیوں ہوں۔"

میرے تیوروں نے اسے گڑبڑا دیا تھا، مصلحت آمیز لہجے میں بولی۔ "کیا ایسا کہنا روا تھا۔"

میں نے کڑے لہجے میں پوچھا۔ "کن حالات میں کہا تھا؟"

وہ مجھے غلط ثابت کرنے پر تلی تھی۔ "کیا حالات، گھٹیا گفتگو کی اجازت دیتے ہیں۔"

میں بگڑ کر بولا۔ "تربیت یافتہ سنائپر ہو کر تم ایک غنڈے کی آغوش میں تھیں، کیا کہتا..... اس کی منتیں شروع کر دیتا کہ میری محبوبہ کو چھوڑ دو ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔ خدا کے لیے اس معصوم، پاکیزہ و مقدس کو کچھ نہ کہو، بے شک مجھے جان سے مار دو۔"

وہ چلائی۔ "تم طنز نہیں کر سکتے۔ شکلا کتے کے زبردستی کرنے کا مطلب یہ نہیں میں جسم فروش ہوں۔"

میں جھلاتے ہوئے بولا۔ "تمہاری سمجھ میں میرا فلسفہ نہیں آ رہا کہ وشال کو غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کو میرا ایسا بولنا ضروری تھا۔"

"اپنے فلسفے پاس رکھو اور مجھے ماتحت سمجھنے کی غلطی نہ کیا کرو۔"

"محترمہ، یقیناً تمہارا ساتھ دینا میری حماقت ہے۔ جو گزر گیا اس پر معذرت، صبح براہ مہربانی جہاں مرضی ہو تشریف لے جانا۔ اور یہاں رہنا چاہو تو مجھے جانا ہوگا۔"

اس نے شاکی نظروں سے مجھے گھورا اور خاموشی سے لیٹ گئی۔ بے چاری میری محتاج ہو گئی تھی۔ اس کا سب سے بڑا مسئلہ زبان تھا۔ گو انڈیا میں انگریزی سمجھنے والے کثیر تعداد میں ہیں، مگر جسے قانون سے چھپنا ہو اس کے لیے مقامی زبان سے واقفیت ضروری ہوتی ہے۔

مجھے اس کی خفگی کی پروا نہیں تھی۔ ایک اتنی مشکل سے اس کی جان بچائی تھی اوپر سے اس کے نخرے ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ گو میرے لیے بھی اس کا سہارا غنیمت تھا۔ وہ تربیت یافتہ سنائپر تھی۔ لڑائی بھڑائی کے فن سے آشنا، عورت ہونا مزید فائدہ مند تھا کہ بہت سے مقامات پر عورت مرد سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے۔ ڈینو کی شہادت کے بعد میں بالکل تنہا رہ گیا تھا۔ کہتے ہیں ایک اکیلا دو گیارہ ہوتے ہیں۔ اور خود کو گیارہ رکھنے کو اس کا ساتھ ضروری تھا۔ اسے دھمکانا فقط ڈرانے کو تھا تاکہ اس کی فضول تکرار سے جان چھوٹ جائے۔ ورنہ شکلا کے خاتمے تک میرا اس سے علیحدہ ہونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

دن بھر کوئی خاص بھاگ دوڑ نہیں کی تھی، مگر سو بھی نہیں سکے تھے۔ اور اب سونے کو دل کر رہا تھا۔ لورا کی جانب پیٹھ موڑ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ سونے سے پہلے اپنی پلوشے کو تصور کی محفل میں بلانا، اس کے گلے شکوے سننا، موہنی صورت کا دیدار کرنا، کبھی اس کے ریشمی زانو پر سر رکھنا کبھی اس کا سر گود میں لے کر بیٹھنا۔ اسے رقص کرتا دیکھنا، اس کی میٹھی آواز میں گیت سننا اور ایسے بہت سے کام جو ماضی میں کر چکا تھا یا مستقبل میں کرنے کا ارادہ تھا سبھی کو سوچتے ہوئے سونا

تھا۔اس وقت بھی آنکھیں بند کرتے ہی وہ چھم سے سامنے آ گئی۔ بہ قول شاعر.....

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

ایک اور شاعر کہتا ہے.....

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

لیکن پلوشے سے مکالمے کی حسرت دل ہی میں رہی تھی۔اس نے شکایتوں کا پٹارہ کھولا ہی تھا کہ دروازے پر ''ٹھک.....ٹھک'' ہوئی۔

دستک دینے والے کا انداز ہ بے صبری والا تھا، کیوں کہ اس نے دروازے کو ہلکے ہلکے بجانا جاری رکھا تھا۔میری چھٹی حس کسی خطرے کا اعلان کرنے لگی۔ تکیے کے نیچے سے پستول برآمد کر کے میں دروازے کے قریب ہوا۔لورا بھی بستر چھوڑ کر چوکنے انداز میں دروازے کے ساتھ پیٹھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔پستول اس نے تیاری حالت میں پکڑا ہوا تھا۔

چابی کے سوراخ سے جھانکنے پر مجھے نسوانی لباس کی جھلک دکھائی دی۔اور وہ کپڑے مکان مالکن کی چھوٹی بیٹی نے پہنے تھے، جو ہمیں کھانا دینے آئی تھی۔

پستول نیفے میں اڑس کر میں نے بے آواز کنڈی کھولی۔''کیا بات ہے؟'' دروازے میں جھری کر کے میں نے کوفت بھرے انداز میں پوچھا۔

وہ متوحش انداز میں بولی۔''بب..... بھیا، گھر میں ڈاکو گھسے ہیں۔امی جان پولیس کو گھنٹی کر رہی ہیں۔آپ لوگوں نے اندر ہی رہنا ہے۔'' یقیناً اسے ماں نے یہ اطلاع دینے بھیجا تھا۔اندرونی عمارت رات کو بند کر دی جاتی تھی۔اور ڈاکوؤں کے دروازہ توڑنے سے پہلے انھوں نے مکینوں کو باخبر کرنا ضروری سمجھا تھا۔

''ڈاکو.....'' میں نے حیرانی ظاہر کی۔''تمھیں کیسے پتا؟''

''میں چھت پر کال کرنے گئی۔تب دیکھا، چند کالے لباس والے گھر کی دیوار کود کر اندر آ رہے ہیں۔ماتا جی کو بتایا تو انھوں نے آپ لوگوں کو مطلع کرنے کا کہا اور خود پولیس کو فون کر رہی ہیں۔'' اس نے سرعت سے تفصیل بتائی۔''آپ دروازہ بند کر دیں میں دوسرے کرایہ داروں کو بتا دوں۔'' خوش قسمتی سے وہ سب سے پہلے ہمارے پاس آئی تھی۔اور یوں وقت ضائع ہونے سے بچ گیا تھا۔اس کا نام پونم تھا۔عمر سترہ اٹھارہ سال ہو گی اور اس عمر کی لڑکی رات کو چھت پر کس سے بات کر رہی ہو گی اس بارے اندازہ لگانے کو زیادہ عقل مند ہونا ضروری نہیں۔موبائل فون نے جہاں بہت سی آسانیاں لائی ہیں وہیں جوان لڑکیوں کے والدین کے لیے بہت سی خرابیاں اور آزمائشیں بھی پیدا کی ہیں۔خیر میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ پونم صاحبہ کو نصیحتیں جھاڑ سکتا۔اس نے بروقت اطلاع دے کر ہمیں خبردار کیا تھا ورنہ وہ کمرہ ہمارے لیے چوہے دان ثابت ہوتا۔میں نے جیب سے چند بڑے نوٹ نکال کر اس کی مٹھی میں پکڑائے۔''بیٹا! کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں۔تم اپنی ماں کے پاس جاؤ۔وہ ڈاکو نہیں ہمارے دشمن ہیں۔''

اسے ہکا بکا چھوڑ کر میں بیڈ کی طرف بڑھا۔''لورا تیار ہو جاؤ چھاپہ پڑا ہے۔'' اور چپل اتار کر سپورٹس شوز پاؤں میں ڈالنے لگا۔

لورا نے بھی سرعت سے بوٹ پہنے۔ہم نے بوٹوں کے تسمے اس انداز میں باندھے ہوئے تھے کہ تسمے ڈھیلے کیے بغیر بوٹ پہن اور اتار سکتے تھے۔ایسی چھوٹی موٹی باتوں کی وضاحت اس لیے کرتا رہتا ہوں تا کہ قارئین کو ہمارے طریقہ

کار اور احتیاطوں کے بارے کچھ نہ کچھ اندازہ ہوتا رہے۔

ایس آر ون اور وشال سے حاصل کی ہوئی رقم بیگ ہی میں پڑی تھی۔ بیگ کو کندھوں پر لاد کر میں نے سائیلنسر لگا گلاک ہاتھ میں تھاما اور محتاط انداز میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ لورا ایک قدم پیچھے تھی۔

یقیناً پونم نے ہمارے دشمنوں ہی کو دیکھا تھا۔ اور ایجنسیوں کا طریقہ کار یہی ہوتا ہے کہ پہلے ہدف کو چاروں طرف سے گھیرتے ہیں پھر ہلہ بولا جاتا ہے۔ ہماری خوش قسمتی کہ جونہی انھوں نے گھیراؤ شروع کیا، پونم نے دیکھ لیا۔ اب ان کے وہم گمان میں بھی کہاں تھا کہ کوئی محبت کی ماری چھت پر چڑھی محبوب سے ہم کلام ہوگی۔

راہداری فی الحال خالی تھی، کسی بھی وقت دوستوں کی آمد متوقع تھی۔ دروازے سے باہر نکلنا کسی صورت مناسب نہ تھا۔ یقیناً اتنی دیر میں انھیں نے اندرونی عمارت کو چاروں طرف گھیر لیا ہوگا۔ میرے قدم چھت کی طرف بڑھ گئے۔ پہلے بھی کئی بار بتا چکا ہوں کہ تربیت یافتہ سپاہی کسی بھی جگہ کو ٹھکانہ بناتے وقت پہلے فرار کے راستوں کو کھوجتا ہے۔ اور دشمن کے علاقے میں تو اس کی ضرورت بہت بڑھ جاتی ہے۔

اس عمارت کے سامنے اور عقب میں گلی تھی۔ دائیں بائیں دوسرے مکانات تھے۔ بائیں طرف کے مکان کی چھت اور عمارت کی چھت کے مابین نو دس فٹ کا ہوائی فاصلہ تھا۔ عام آدمی کے لیے نو دس فٹ زیادہ فاصلہ ہو سکتا ہے سنائپر کے لیے نہیں۔

مجھے یقین تھا عقبی گلی اور دائیں بائیں کے مکانات کو بھی دشمنوں نے نظر انداز نہیں کیا ہوگا۔ ساتھ والی چھت پر اگر دشمن موجود بھی تھے تو ان کی تعداد زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ سامنے کے رخ ہمیں سخت مزاحمت کا سامنا ہونا تھا۔ اور جب لڑائی ہتھیاروں کی ہو تو جسمانی اچھل کود ثانوی رہ جاتی ہے۔ گولی تربیت یافتہ اور عام آدمی کے جسم میں تمیز نہیں کرتی۔ البتہ تربیت یافتہ سپاہی گولی سے بچنے کے کئی گر جانتا ہے اور یہی بات اسے بچنے میں مدد دیتی ہے۔

لورا بغیر استفسار کے میرے پیچھے ہولی۔ بلاشبہ اس نے بھی فرار ہونے کو راستے کی قرا ولی کی تھی۔

پونم بدحواسی میں نیچے اتری تھی اور اسے دروازہ بند کرنا یاد نہیں رہا تھا۔ سڑھیاں چڑھتے ہی میری رفتار میں کمی آئی اور نیچے جھکتے ہوئے میں چھت پر پہنچا۔

چھت پر روشنی کا انتظام نہیں تھا، مگر اطراف کے اونچے مکانات کی روشنی کی وجہ سے ملگجا اجالا پھیلا تھا۔ میں پوری طرح دروازے سے باہر نہیں ہوا تھا کہ ہلکا دھماکا سنائی دیا۔ کوئی چھت پر کودا تھا۔ یقیناً جس راستے سے میں فرار کا منصوبہ سوچے ہوئے تھا دشمن نے اسی راستے سے چھت پر اپنے آدمی اتارے تھے۔ نیچے کا گھیراؤ، یوں بھی مکمل تھا۔ ایک چھت باقی تھی اور یہاں دشمنوں کا قبضہ ہونے کے بعد ہمارے پاس صرف گرفتاری کی راہ بچتی تھی۔

اپنا چھت پر دھرا قدم واپس کھینچتے ہوئے میں رک گیا۔ لورا نے بھی دھماکا سن لیا تھا، قریب ہوتے ہو کر اس نے منہ میرے کان سے لگایا۔

''زیادہ سے زیادہ دو ہوں گے، ایک ایک گولی ضائع کر دیتے ہیں۔ نیچے ان کی تعداد زیادہ ہوگی۔''

متفق ہوتے ہوئے میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کندھوں سے بیگ نکال کر نیچے رکھ دیا تاکہ حرکت میں آسانی ہو۔

اچانک ایک اونچی سرگوشی میری سماعتوں میں گونجی۔ ''یہیں انتظار کرتے ہیں۔'' ساتھ ہی کسی نے دروازے کی طرف ٹارچ کی روشنی پھینکی۔ اگر احتیاط کی وجہ سے ہم دروازے سے ذرا پیچھے نہ ہوتے تو لازماً نظر آ جاتے۔

''بے وقوف روشنی مت کرو۔'' ساتھی نے اسے سختی سے ڈانٹا۔

روشنی بجھی ساتھ ہی اس نے صفائی دی۔ ''دروازے کو دیکھ رہا تھا، میرا خیال ہے اسے باہر سے بند کر دینا بہتر رہے گا۔''

''روشنی کیے بغیر بھی ایسا کیا جا سکتا ہے۔ جاؤ بند کر آؤ۔'' مسلسل دو آوازیں سن کر ان کی تعداد کی تصدیق ہو گئی تھی۔ مزید انتظار بے کار تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ان کا گھیرا سخت ہو جانا تھا۔ میں نے لورا کو چھو کر حرکت میں آنے کا اشارہ کیا۔ ساتھ ہی سرگوشی کی۔ ''قتل نہ کرنا بے ہوش کرنا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہم ایک ساتھ باہر نکلے۔ ''ہاتھ اوپر، حرکت کی تو جان سے جاؤ گے۔'' میں پست مگر دبنگ لہجے میں بولا۔

ان کے ہاتھ میکانکی انداز میں اٹھ گئے تھے۔ ''الٹا گھومو۔'' اگلا حکم صادر کرتے ہی ہم ان کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ان کا گھومنا اور ہمارے پستولوں کے دستے کا ان کے سر پر پڑنا ایک ساتھ ہوا تھا۔

زوردار کراہ کے ساتھ دونوں ڈھیر ہو گئے تھے۔

میں واپس مڑا اور بیگ اٹھا لیا۔ لورا ان کی تلاشی لینے لگی۔ میرے دروازہ بند کرنے تک وہ ان کے وائرلیس سیٹ پر قابض ہو چکی تھی۔ وائرلیس کی آواز کافی بلند ہوتی ہے اور دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ اسی وجہ سے عمارتی علاقے میں کارروائی کرنے والی سپاہ وائرلیس سیٹوں میں ''ہینڈ فری'' کا استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے تیز آواز نہیں ابھرتی۔

لورا نے وائرلیس اٹھا کر ''ہینڈ فری'' کان میں لگائی تھی۔

میں نے محتاط رہنے کا مشورہ دیا۔ ''خیال رکھو، دوسری چھت پر کوئی موجود نہ ہو۔''

وہ تدبر سے بولی۔ ''عمارت کو چاروں طرف گھیرنے اور چھت پر قبضہ ہونے کے بعد وہ اپنی سپاہ کو پھیلانا پسند نہیں کریں گے۔'' وہ برطانیہ فوج کی مایہ ناز کیپٹن تھی۔ بلاشبہ جنگی چالوں اور تلاشی گھیراؤ کی کارروائیوں سے اچھی طرح واقف تھی۔

''چلو پھر۔'' میں دوسری چھت کی طرف بڑھ گیا۔ اسی وقت عمارت کے اندرونی دروازے کو زور سے دھڑدھڑایا گیا۔ ساتھ ہی میگافون پر کرخت آواز بلند ہوئی۔

''عمارت چاروں طرف سے ہمارے گھیرے میں ہے۔ کسی نے بھاگنے یا غلط حرکت کی کوشش کی تو نتیجے کا ذمہ دار خود ہوگا۔''

لورا اور میں بھاگتے ہوئے چھت کے کنارے تک پہنچے اور پھر ہمارے جسم ہوا میں بلند ہوئے۔ دوسری چھت پر قدم لگتے ہی ہم نے جسم سمیٹتے ہوئے لوٹ لگائی تھی۔ ٹانگوں کی مشقت کم کرنے اور پاؤں وغیرہ کو موچ سے بچانے کو یہ بہترین طریقہ ہے۔ اونچائی سے چھلانگ لگاتے وقت یا چلتی گاڑی سے اترتے وقت بھی ایسا کرنا مفید رہتا ہے۔

خوش قسمتی سے چھت خالی تھی۔ اگلے دو تین مکانات کی چھتوں کا فاصلہ قریب قریب تھا۔ جونہی ہم نے تیسرے مکان کی چھت پھلانگی۔ لورا نے انکشاف کیا۔

''انھیں ہمارے فرار کا پتا چل گیا ہے۔''

''نیچے اترو۔'' میں سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ مگر دروازہ اندر سے قفل تھا۔ لکڑی کے دروازے نے مجھے فائر کرنے پر اکسایا اور دروازے کے قفل پر سائلنسر کی نال رکھ کر میں نے لبلبی دبا دی۔

''ٹھک۔'' کی آواز سے دروازہ کھل گیا تھا۔ دروازہ کھول کر ہم آگے پیچھے اندر گھسے۔ اسی وقت تڑتڑاہٹ کی بھیانک آواز بلند ہوئی۔ نامعلوم کسی پر نشانہ سادھا گیا تھا یا ہوائی فائر تھا۔ بدحواسی میں دشمن سے کوئی بھی احمقانہ حرکت

بعید نہیں تھی۔

پہلے میگافون کے اعلان اور پھر فائرنگ کی آواز نے یقیناً علاقہ مکینوں کو کونوں کھدروں میں دبکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ایک جواں سال عورت نے ہمیں سیڑھیاں اترتے دیکھا اور چلاتی ہوئی کمرے میں گھس کر دروازہ بند کر دیا۔ اس وقت ایک اور کمرے سے ادھیڑ عمر مرد پستول کے ساتھ برآمد ہوا۔

''اندر چلے جاؤ، ہم تمھارے دشمن نہیں ہیں۔'' میں نے چلا کر اسے واپس جانے کا کہا۔

وہ متذبذب کھڑا رہا۔ ہم اسے نظر انداز کرتے ہوئے ڈرائینگ روم کے دروازے پر پہنچے اور قفل کھول کر باہر نکل گئے۔ وہاں سے نکلنے کو گاڑی کا حصول ضروری تھا۔ اور گیراج میں ایک چھوڑ دو گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ لورا گیراج کی طرف بڑھی جبکہ میرا رخ دروازے کی طرف ہو گیا۔

دروازے پر چوکیدار موجود تھا۔ ہمیں اندرونی عمارت سے برآمد ہوتا دیکھ کر وہ شش پنج میں پڑ گیا تھا۔ میں نے سرعت سے اس کے قریب پہنچ کر اسے تردد سے نکال دیا تھا۔

''کک.....کون ہو تم؟'' کا جواب اسے کنپٹی پر لگنے والے گھونسے کی صورت ملا تھا۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑتے ہوئے وہ لمبا ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ''ریپیٹر'' تھا (اسے آٹو میٹک بارہ بور رائفل کہہ سکتے ہو) جو میرے کسی کام کا نہیں تھا۔

اس کے بے ہوش جسم کو گھسیٹ کر ایک طرف ڈالا اور دروازہ کھول دیا۔ اتنی دیر میں لورا، نسبتاً نئی کار کو گیراج سے باہر لے آئی تھی۔ میرے قریب آ کر اس نے بریک دبائی میں فوراً اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے گلی میں کار نکالی اور آگے بڑھ گئی۔

تڑتڑاہٹ کی تیز آواز نے ہمیں دشمن کی باخبری سے مطلع کیا تھا۔ دونوں گلیوں میں دشمن موجود تھے۔

پختہ و کشادہ گلی میں کم رفتار سے کار چلانا بے وقوفی تھی۔ اور لورا اتنی بھی احمق نہیں تھی۔ کالے رنگ کی دو ڈبل کیبن اسے بھی تعاقب کرتی نظر آ گئی تھیں۔ ایک دو جگہ رفتار شکن (سپیڈ بریکر) سے واسطہ پڑا، مگر کار آہستہ کرنے کا وقت نہیں تھا۔ دونوں بار کوشش کے باوجود میں اپنا سر چھت سے ٹکرانے سے نہیں روک سکا تھا۔

سامنے سے ایک گاڑی کی روشنیاں چمکیں۔ وہ موڑ مڑ کر سیدھا ہوا تھا۔ لورا نے لمبا ہارن دیا، اور عقب سے انساس رائفل کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ سامنے سے آنے والا گھبرا گیا تھا۔ بے چارے نے فوراً گاڑی روک دی تھی۔ حالاں کہ گلی کشادہ تھی اور دو کاروں کا کراس ناممکن نہیں تھا۔ میرے ذہن میں فوراً ایک تجویز آئی۔

تیز لہجے میں بولا۔ ''کار کو آڑا ترچھا کر کے روکو، دوسری کار میں بھاگیں گے۔''

لورا کی سمجھ میں میری تجویز آ گئی تھی۔ اس نے کار کے قریب پہنچتے ہی اسٹیئرنگ کاٹ کر راستہ بند کیا اور ہم باہر نکل کر دوسری کار کی طرف بھاگے۔ اس میں دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ وضاحتوں کا وقت نہیں تھا، ان کے خوف سے چلاتے وجود ہم نے گھسیٹ کر باہر پھینکے، لورا نے ڈرائیونگ سنبھال لی۔

میں نے پستول کی دو گولیاں پہلی کار کے ٹائروں میں جھونک دیں۔ زوردار دھماکوں سے لڑکیاں بے چاریاں زور زور سے چیخنے اور رونے لگیں تھیں۔

کار اسٹارٹ تھی، لورا نے ریورس گیئر لگا کر کار گلی کے موڑ تک الٹی چلائی اور موڑ میں اسٹیئرنگ کاٹ کر کار سیدھی کی اور آگے بڑھ گئی۔ اس دوران دو بار تیز فائرنگ کی آواز گونجی تھی۔ دشمن کی گاڑیاں قریب پہنچ گئی تھیں، مگر ہم نے اتنی تیزی سے کارروائی کی تھی کہ انھیں کچھ سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ گو کار کی رکاوٹ عارضی تھی۔ مگر جب تک وہ راستہ بناتے ہمیں

دور جانے کا موقع مل جاتا۔

وہ گلی دائیں مڑ کر ایک سڑک پر جا نکلی۔ سڑک پر چڑھتے ہی لورا نے رفتار میں اضافہ کر دیا۔ نئی سیڈان ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ ہم اس کار میں لمبا سفر نہیں کر سکتے تھے۔ لڑکیوں سے کار کے متعلق ضروری معلومات لے کر متعلقہ پولیس تھانوں اور ناکوں تک پہنچانا اتنا مشکل اور بعید از قیاس نہیں تھا۔

تھوڑا سے آگے آتے ہی بازار کی تیز روشنیاں نظر آئیں۔ میں نے لورا کو بازار میں گھسنے کی ہدایت کی۔

وہ معترض ہوئی۔ ''بھیڑ زیادہ ہے پھنس جائیں گے۔''

میں نے وضاحت کی۔ ''کار یہیں چھوڑ کر ٹیکسی میں جائیں گے۔''

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے کار بازار کی جانب موڑ دی۔ گھڑی کی سوئیاں گیارہ کا ہندسہ عبور کر چکی تھیں مگر بھیڑ میں کوئی خاص کمی نہیں آئی تھی۔

ایک مناسب جگہ دیکھ کر میں نے اسے کار روکنے کو کہا۔ اور ہم نیچے اتر گئے۔ ٹیکسی کی تلاش میں زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑی تھی۔ مگر رات گئے کوئی ٹھکانہ ڈھونڈنا مشکل لگ رہا تھا۔ جب بندہ سرکار سے بھاگ رہا ہو تو ممبئی ایسا وسیع شہر بھی چھوٹا سا گاؤں لگتا ہے۔ ٹیکسی میں گھنٹا بھر گھوم کر ہم ایک جگہ اتر گئے۔ پرانے ٹھکانے سے محفوظ فاصلے پر پہنچ گئے تھے۔

''برقع اوڑھ لو۔'' ٹیکسی کے آگے بڑھتے ہی میں لورا کو مخاطب ہوا۔

''سمجھ میں نہیں آتا تمھارے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔'' برقع میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس نے ناک بھوں چڑھائی۔

میں اطمینان سے بولا۔ ''میرا سب سے بڑا مسئلہ تم ہو۔ مقامی مرد کے ساتھ ایک گوری کا ہونا ہماری پکی پہچان ہے۔ اگر برقع نہیں پہننا تو اپنا تھوبڑا تبدیل کرنا پڑے گا۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ''مجھ سے زیادہ تم بھارت سرکار کو مطلوب ہو۔''

''غلط فہمی ہے تمھاری۔ شکلا کو تمھاری تلاش ہے۔ پاکستانی جاسوس تو ان کے پاس کوئی نہ کوئی موجود ہی ہوگا۔''

وہ استہزائی انداز میں بولی۔ ''انڈیا بھر میں اکیلی خوب صورت میں ہی تو ہوں کے اسے میری تلاش ہوگی۔''

''اسے تم سے نہیں ایس آر ون سے مطلب ہے۔ تم دو اڑھائی سو کروڑ کا چیک ہو۔ اتنی آسانی سے تو پیچھا نہیں چھوڑے گا۔''

''پیچھا تو اس کا میں نہیں چھوڑوں گی۔ قبر میں بھی چلا گیا تو بدلہ لینے پہنچ جاؤں گی۔'' اس نے نقاب اوڑھا۔ اور ہم نے ایک جانب قدم بڑھا دیے۔ نقاب اوڑھنا اسے میں نے سکھایا تھا۔ ایک گوری کو نقاب میں دیکھ کر کبھی کبھی دل چاہتا زور زور سے ہنسوں۔ اپنے مفاد کے حصول کو انسان کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔

سڑک پر بہت زیادہ بھیڑ نہیں تھی، کبھی کبھار ہی اکا دکا گاڑی گزرتی۔

میں نے اسے چھیڑا۔ ''اتنے خلوص اور دلجمعی سے تمھارا ساتھ دے رہا ہوں بدلے میں مجھے کیا ملے گا۔''

''مانگو..... کیا چاہیے۔'' وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی تھی۔

میں کھل کھلا کر ہنسا۔ ''مذاق کر رہا تھا یار۔''

وہ ممنونیت سے بولی۔ ''ریما! یہ تو نہیں کہتی کہ آج تک جتنے آدمی مجھے ملے تم سب سے اچھے ہو، البتہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ تم سے اچھا کوئی نہیں ملا۔''

''شاید میرے کان بج رہے ہیں۔'' میں نے بے یقینی ظاہر کی۔

وہ میرا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ خجالت سے بولی۔ ''سوری، تمھیں برا بھلا کہا، تکلیف دی۔ حالاں کہ وشال کے سامنے

تمھارا ناٹک کرنا بالکل برحق تھا۔ پتا نہیں کیوں غصہ آ گیا تھا۔ شاید بہت زیادہ اچھا آدمی جب جھوٹ موٹ بھی بداخلاق بن
ہے تو برداشت نہیں ہوتا۔ تم سے کوئی رشتہ، واسطہ نہیں۔ نہ کوئی ایسا تعلق ہے کہ حق جتا سکوں۔ نہ تم میرے احسان مند
ہو۔ اس کے باوجود نجانے کیوں تم پر بہت زیادہ اعتبار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اور تمھاری توجہ جائز حق سمجھتی ہوں۔"

کچھ زیادہ نہیں ہو گیا۔"

"جتنا تم نے ساتھ دیا اس لحاظ سے تو بہت کم اظہار کیا ہے۔"

میں شرماتے ہوئے بولا۔ "بس کرو یار! اب رلاؤ گی کیا۔"

اس نے کھل کھلاتے ہوئے موضوع تبدیل کیا۔ "سمجھ میں نہیں آ رہا انھوں نے ہمیں ڈھونڈا کیسے؟"

میں نے اندازہ ظاہر کیا۔ "ہمیں وشال کی کار چھوڑنے میں جلدی کرنا چاہیے تھی۔"

لورا متفق ہوئی۔ "شاید کار سے نکلتے وقت کسی کی نظر پڑی اور ہمارے تعاقب میں چل پڑا۔"

"قسمت اچھی تھی جو بروقت اطلاع مل گئی۔"

لورا مستفسر ہوئی۔ "اس لڑکی کو کیسے پتا چلا؟"

میں نے وجہ بیان کی، کہنے لگی۔ "آپ مشرقی لوگ ناحق محبت کو برا سمجھتے ہو، دیکھ لو اس کی محبت نے ہمیں بچا لیا۔"

میں ترکی بہ ترکی بولا۔ "اور اپنی سرکار کا کتنا نقصان کیا کہ دو مجرموں کو فرار کی راہ مل گئی۔"

وہ ہنس کر خاموش ہو گئی۔

ہم دو تین فرلانگ سڑک ہی پر چلتے رہے۔ اور پھر ایک مناسب جگہ دیکھ کر سڑک کو چھوڑ دیا۔ عجیب سا محلہ تھا، رات گئے بھی اکثر گھروں میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ گلی میں بھی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کراہت آمیز چہرے نظر آئے۔ چند ادھیڑ عمر و جوان خواتین بھی سرخی پاؤڈر کے ساتھ دکھائی دیں۔ یوں لگ رہا تھا کسی کی منتظر ہوں۔ ایک دو عورت سے۔ "آیئے ناں بابو....." سن کر مجھے ماتھے پر پسینہ آ گیا تھا۔ انھوں نے لورا کی پروا بھی نہیں کی تھی جو میرے ساتھ چل رہی تھی۔

"یہ ساری کال گرلز (طوائفیں) ہیں۔" لورا نے بھی پہچان لیا تھا۔

میں نے خیال ظاہر کیا۔ "لگتا ہی کسی ایسے ہی محلے میں آن پھنسے ہیں۔ اور شاید یہ جگہ محفوظ بھی ہے۔"

اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "ریجا! تمھاری نیت کیا ہے؟"

میں نے اسے مطعون کیا۔ "تھوڑی دیر پہلے اتنی تعریفیں کر رہی تھیں، اتنی جلدی اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔"

وہ کھل کھلائی۔ "مرد کو بگڑتے دیر تو نہیں لگتی ناں۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے۔ اور اکٹھے ہی رہیں گے۔"

وہ اطمینان سے بولی۔ "جو مناسب سمجھو۔"

اسی وقت ایک مکروہ صورت مرد دو قدم لے کر قریب ہوا۔ "شاید یہ نقاب والی تمھیں خوش نہ کر سکے۔ ہمارے پاس ہر عمر، ہر رنگ، ہر نسل کا مال دستیاب ہے بابو۔ ایک بار موقع دے کر دیکھیں۔"

میں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "بھگوان کا خوف کرو یار، اتنی مشکل سے اپنی محبت پائی ہے۔"

اس نے پہلے دانتوں کی نمائش کی۔ "کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کو باہر کا کھانا بھی چکھ لینا چاہیے۔"

"اس کے بہت مواقع ملیں گے۔ اور یہ بتاؤ رہائش کا بندوبست ہو جائے گا، جہاں میں سکون سے اپنی محبوبہ کے ساتھ رات گزار سکوں۔"

وہ مکاری سے بولا۔ "نئے نویلے جوڑے کے لائق ایک کمرہ ہے تو سہی۔ بالکل محفوظ، جہاں پولیس کیا چڑیا بھی پر

نہیں مار سکتی۔ البتہ کمرے کا کرایہ سن کر لوگ پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔''

میں ڈینگ مارنے کے انداز میں بولا۔ ''تم کرایہ بتاؤ، اپنی محبوبہ کے لیے اتنی قربانی تو دے سکتا ہوں۔''

''دو ہزار خرچ کرنا پڑیں گے۔''

میں بدکتے ہوئے بولا۔ ''اتنی زیادتی تو نہ کریں، فائیو سٹار ہوٹل تو نہیں ہے کہ ایک رات کا دو ہزار لگے۔''

''سو کم دے دینا۔'' اس نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری۔

''زیادہ سے زیادہ پندرہ سو دے سکتا ہوں۔'' میں نے جان بوجھ کر سودے بازی کی تاکہ ہم اسے مشکوک نہ لگیں۔

''ٹھیک ہے، نکالو پیسے۔'' وہ فوراً مان گیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''جگہ تو دکھاؤ۔ اگر اچھی لگی تو ہو سکتا ہے ہم شادی کے بعد بھی چند دن وہاں گزارنا پسند کریں۔''

''چلو۔'' وہ خوش دلی سے سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس کی معیت میں ہم ایک پرانے مکان میں داخل ہوئے۔ جس میں کافی کمرے تھے۔ کچھ کمروں کے دروازے اندر سے بند تھے، کچھ کے دروازوں کے پٹ کھلے تھے، غالباً وہ مہمانوں کے منتظر تھے۔ برآمدے سے گزرتے ہوئے مختلف کمروں کے اندر سے چوڑیوں کی کھنکھناہٹ اور دبی دبی ہنسی سنائی دیتی رہی۔

وہ ہمیں کونے کے ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرے کی اندرونی حالت توقع سے زیادہ بہتر تھی۔ پرانا سا ڈبل بیڈ جس پر صاف ستھری چادر بچھی تھی۔ دو تکیے جن کے غلاف نئے تو نہیں البتہ دھلے ہوئے ضرور تھے۔ دو فوم والی کرسیاں، ملحقہ بیت الخلاء و غسل خانہ۔ کھڑکی پر لٹکے رنگ دار پردے، چھت کا پنکھا، روشنی کا خاطر خواہ انتظام۔ مجموعی طور پر وہ رہنے کے قابل تھا۔

''کیسا ہے بابو۔'' اس نے داد چاہنے والے انداز میں پوچھا۔

''بہتر ہے۔'' میں نے پانسو والے تین نوٹ اس کی جاب بڑھا دیے۔

اس نے آنکھ میچی۔ ''پینے پلانے کا شوق ہے تو بندوبست ہو سکتا ہے۔''

''تمھارا کا نام کیا ہے؟''

''جگنیش۔''

میں رکھائی سے بولا۔ ''جگنیش صاب، تھوڑی تنہائی درکار ہے۔''

وہ معنی خیز قہقہہ بلند کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

دلال کے نکلتے ہی لورا نے نقاب اتارتے ہوئے کراہیت آمیز لہجے میں کہا۔ ''کتنی گندی جگہ پر لے آئے ہو۔''

میں نے پیش کش کی۔ ''تمھاری نظر میں اس سے بہتر جگہ ہے تو وہاں چلتے ہیں۔''

وہ معترض ہوئی۔ ''ایک ہی بستر پر کیسے لیٹیں گے؟''

''کمرے میں چارپائی لگانے کی گنجائش ہے، میں منگوا لیتا ہوں۔'' میں نے پیش کش کی۔

وہ بیڈ پر گرتے ہوئے بولی۔ ''خیر اتنے بے اعتبارے بھی نہیں ہو کہ چارپائی منگوانے پر زور دوں۔''

میں معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''گویا اسے ڈیٹ کی دعوت سمجھوں۔''

وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''غالباً تم چارپائی لانے جا رہے تھے۔''

میں نے عذر پیش کیا۔ ''ویسے وہ سوچے گا تو ضرور کہ دو پریم پنچھی علیحدہ علیحدہ کیوں سو رہے ہیں۔''

اس نے قہقہہ لگایا۔ ''کہہ دینا اب تک شادی نہیں ہوئی۔ اور مشرقی لڑکیاں تو شادی سے پہلے قریب نہیں آنے دیتی

ناں۔''

میں ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔ جگنیش کے علاوہ کسی سے واقفیت نہیں تھی۔ نامعلوم اس نے کہاں ملنا تھا۔ ایک لڑکا سگریٹ کے کش لگاتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اترا۔

میں نے آواز دی۔ ''لڑکے! جگنیش کہاں ملے گا؟''

وہ رکتے ہوئے بولا۔ ''جگنیش، استاد کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔''

''اور استاد کا کمرہ کہاں ہے۔''

دوسری منزل پر سڑھیوں کے دائیں جانب پہلا کمرہ ہے۔''

''شکریہ دوست۔'' کہہ کر میں سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ دوسری منزل پر پہنچتے ہی میں دائیں طرف کے پہلے کمرے کی طرف بڑھا۔ دستک کو ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ جگنیش کے الفاظ سن کر چونک گیا۔

''ماں قسم، استاد سچ کہہ رہا ہوں۔ سالے کے بیگ میں نقدی نہ بھی ہوئی زیور تو لازمی ملے گا۔ لڑکی بھی زبردست ہے۔ اتنے سفید ہاتھ ہیں سالی کہ چھونے سے میلے ہو جائیں۔ اور گھریلو مال کی تو مانگ بھی بہت زیادہ ہے۔''

ایک بھاری آواز ابھری۔ ''کسی بڑے خاندان کی ہوئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

جگنیش نے غلیظ لہجے میں استاد کی ہمت بڑھائی۔ ''آپ ڈرنے کب سے لگے ہیں استاد! اس کے یار کا گلا کاٹ کر پھینک دیں گے اور سالی نے تعاون نہ کیا تو چند بڑے گاہکوں کو پیش کرنے کے بعد یار کے پیچھے بھجوا دیں گے۔ اس دوران خود بھی مستفید ہو لیں گے۔ ایسا موقع کبھی کبھار ہی ملتا ہے۔''

استاد نے مکروہ انداز میں کہا۔ ''چلو پھر سہاگ رات اسی کمرے ہی میں منا لیتے ہیں۔''

بلاشبہ میں تیزی میں درستی بھول گیا تھا۔ اگر چارپائی کے لیے اس کے پیچھے نہ آیا ہوتا تو بے خبری میں بھاری نقصان اٹھانا بھی پڑ سکتا تھا۔ اب ان سے وہیں نبٹنا ضروری ہو گیا تھا۔ ان کے باہر نکلنے سے پہلے میں دروازے کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ سائیلنسر لگے پستول کی جھلک دیکھتے ہی ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

''کک..... کیا بات ہے بابو۔'' گفتگو کی ابتداء جگنیش نے کی تھی۔

''شاید میرے پاس جا رہے تھے، تمہیں زحمت سے بچانے کو میں خود حاضر ہو گیا ہوں۔''

''نن..... نہیں تو.....'' جگنیش نے صفائی دینا چاہی، مگر اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے میری بھرپور لات اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ وہ اچھل کر لکڑی کی کرسی پر گرا اور اسے توڑتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

استاد سنبھل کر بولا۔ ''جوان! ہمارے ساتھ پنگا لینا مہنگا پڑ سکتا ہے۔''

''پنگا نہیں لے رہا استاد، قتل کرنے آیا ہوں۔ تمہارا بوجھ دھرتی کے سینے سے ہٹانا سب سے بڑا پن (نیکی) ہے۔'' یہ کہتے ہی میں نے جگنیش کی کھوپڑی میں گولی ٹھوک دی۔

وہ اوندھے منہ گر کر ہاتھ پاؤں جھٹکنے لگا۔

استاد نے دہشت زدہ لہجے میں کچھ کہنا چاہا۔ ''تت..... تم.....''

''بحث کا وقت نہیں ہے۔'' میں نے اگلی گولی اس کے سر میں اتار کر اسے جگنیش کے پاس بھیج دیا۔ ایسے غلیظ کردار معافی کے قابل نہیں ہوتے۔ نجانے حوا کی کتنی بیٹیوں کو نشان عبرت بنا چکے تھے، کتنے بے گناہوں سے جینے کا حق چھین چکے تھے تبھی تو اللہ پاک نے ان کی ڈھیلی رسی کھینچنے کو مجھے وہاں بھیجا تھا۔ بلاشبہ قانون ہاتھ میں لینا، یا لوگوں کی زندگی موت کے فیصلے کرنے کا اختیار میرے پاس نہیں تھا۔ نہ مجھے ایسا شوق ہی تھا۔ مگر دوران مشن ایسے کسی بھی کردار سے واسطہ

پڑنے پر خود پر قابو پانا مشکل ہو جاتا تھا۔ پاکستان ہو یا انڈیا قانون بالکل بے بس اور لاچار ہے۔ پولیس کی اکثریت رشوت خور، بھتہ خور اور امراء کے گھر کی باندی ہے۔ آٹے میں نمک کے برابر جو ایمان دار ہیں ان بے چاروں کو سسٹم چلنے نہیں دیتا اور وہ خاموش تماشائی بننے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے۔ آئے روز قانون شکنی کی داستانیں، مظلوموں پر تشدد کے واقعات، صنف نازک سے زیادتی و عصمت دری کے لرزہ خیز حادثے، قتل و غارت، ڈکیتیاں اور معاشرے میں پھیلی ناانصافی سے ہر انسان کا دل و دماغ اتنا متاثر ہوا ہے کہ بس چلنے پر مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانا نیکی خیال کیا جاتا ہے۔ اور یقیناً میرا شمار بھی نچلے طبقے سے ہے میں کیسے نیکی سے محروم رہتا۔

پہلے سوچا، ان کی لاشوں کو بیڈ کے نیچے چھپا کر وہیں رات گزاری جائے، مگر پھر خیال آیا ایسا کرنا نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ نہ معلوم ان خبیثوں کی رات کی مصروفیات کیا ہوتی ہوں گی۔ اگر ان کی ڈھنڈیا پڑ جاتی تو مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ کم از کم ایک گواہ ایسا موجود تھا جسے میرے وہاں آنے کی بابت پتا تھا۔ ان کی لاشیں چھپانے کا وقت نہیں تھا۔ کمرے سے نکل کر میں نے دروازہ باہر سے بند کیا اور نیچے اتر گیا۔

لورا آنکھیں بند کیے آرام سے لیٹی تھی۔ ''جلدی کرو جانا ہے۔'' اندر داخل ہوتے ہی میں نے اعلان کیا۔

وہ اچھل کر اٹھ بیٹھی۔ ''خیر تو ہے۔''

''فی الحال تو خیر ہے، مگر جونہی لاشیں ملیں ہم مشکل میں پھنس جائیں گے۔''

''کن کی لاشیں؟'' پاؤں میں جوتے ڈالتے ہوئے اس نے حیرانی ظاہر کی۔

بیگ کندھوں میں ڈالتے ہوئے میں مزاحیہ لہجے میں بولا۔ ''جو میرے قتل اور تم پر قبضے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔''

وہ شرارتی انداز میں بولی۔ ''تمہیں غصہ اپنے قتل کے منصوبے پر آیا یا مجھ پر قبضے کی جسارت پر۔''

''اچھا سوال ہے۔'' میں نے برقع اس کی طرف پھینکا۔

''مگر یہ بالکل بھی اچھا نہیں ہے۔'' منہ بسورتے ہوئے وہ برقع ڈالنے لگی۔

دو تین منٹوں کے اندر تیار ہو کر ہم باہر آ گئے۔ عمارت کے احاطے میں چند افراد نظر آئے، مگر ہم سے کسی نے تعرض نہیں کیا تھا۔ عمارت سے نکل کر ہم تیز قدموں سے چلتے ہوئے محلے سے باہر آ گئے۔ جلد ہی خالی ٹیکسی مل گئی تھی۔ محلے سے چند کلومیٹر دور آ کر ہم نے ٹیکسی والے کو فارغ کر دیا۔

میرے ساتھ قدم ملاتے ہوئے وہ مستفسر ہوئی۔ ''اب بتاؤ کیا ہوا تھا۔''

میں نے تفصیلاً سب کچھ دہرا دیا۔

وہ طعنہ زن ہوئی۔ ''میں تو پہلے ہی وہاں جانے سے منع کر رہی تھی۔''

میں نے صفائی دی۔ ''کیا پتا تھا، ایسے خبیثوں سے واسطہ پڑے گا۔''

''مجھے نیند آ رہی ہے۔'' منہ بسورتے ہوئے اس نے موضوع تبدیل کیا۔

''کوئی ٹھکانہ مل نہیں رہا اور اتنی ہمت مجھ میں نہیں ہے کہ تمہارا سر گود میں رکھ کر سڑک پر بیٹھ جاؤں۔''

اس نے شرارتی انداز میں طنز کیا۔ ''ہر کسی کے سامنے بیوی بنانے پر تلے رہتے ہو اور گود میں نہیں سلا سکتے۔''

میں نے قہقہہ لگایا۔ ''تم بیوی کے حقوق کی بجا آوری والی بنو، گود میں سلانا مشکل نہیں ہے۔''

میری پیٹھ پر گھونسا رسید کرتے ہوئے وہ کھسیاتے ہوئے بولی۔ ''بکواس کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دینا۔''

میں نے مشورہ دیا۔ ''کسی گھر کی چھت پر چڑھ کر سوتے ہیں، باقی صبح دیکھا جائے گا۔''

کہنے لگی۔ ''کوئی خالی گھر مل جاتا تو مزہ آجاتا۔''

''خالی گھر تلاش کرنے کا وقت نہیں ہے، بھرے ہوئے گھر ہی پر اکتفا کرنا پڑے گا۔''

''چلو پھر۔'' وہ نزدیکی گلی کی جانب مڑ گئی۔ گلی کے شروع ہی میں لوہے کے بورڈ پر ''ہنومان نگر'' لکھا ہوا نظر آرہا تھا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو کسی پارک یا فٹ پاتھ پر بھی سو جاتا، مگر لورا کی وجہ سے یہ ممکن نہ تھا۔

رات دو تہائی گزر چکی تھی۔ ہم مسلسل سفر میں تھے۔ گو سنائپر جسمانی لحاظ سے مضبوط ہوتے ہیں۔ تکالیف اور سختیاں جھیلنے میں عام لوگوں سے بہت بہتر ہوتے ہیں، لیکن ہوتے تو گوشت پوست کے انسان ہی ہیں۔ اور تھکاوٹ، بے آرامی، بھاگ دوڑ، انسان کی صلاحیتوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ تازہ دم ہونے کو بھرپور نیند کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس وقت ہمیں بھی نیند چاہیے تھی۔ گلیوں میں لوگوں کی آمدورفت ختم ہو گئی تھی۔ البتہ ایک دو گھروں کے باہر چوکیدار بیٹھے نظر آئے۔ ایک دو گلیاں مڑنے کے بعد ایک مکان ہمیں مناسب لگا۔ گلی میں بھی کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ صرف کتے کا خوف تھا کہ گھر میں کتے کی موجودگی ہمارا بھانڈا پھوڑ دیتی۔ مگر خطرہ مول لینا ضروری تھا۔ بیگ لورا کے حوالے کر کے میں نے اچھل کر دیوار کا سرا پکڑا اور ہاتھوں کے بل پر اٹھ گیا۔ لمحہ بھر دیوار کے اوپر گزار کر میں نے صحن میں نگاہ دوڑائی کوئی خطرہ نظر نہ آنے پر احتیاط سے اندر کود گیا۔ نیچے اتر کر ایک دو منٹ دیوار کی جڑ میں دبکا رہا۔ کوئی ردعمل ظاہر نہ ہونے پر داخلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مگر بڑے اور ذیلی دروازے پر لٹکے تالوں نے میرا منہ چڑایا تھا۔ مجبوراً مجھے دوبارہ دیوار پر چڑھنا پڑا۔ لورا دروازہ کھلنے کی منتظر تھی۔ میں نے ''شش'' کر کے اسے متوجہ کیا۔ وہ قریب آگئی۔ اس سے بیگ لے کر میں نے دیوار کے راستے اندر آنے کا کہا اور دوبارہ اندر کود گیا۔ منٹ بھر بعد وہ میرے پاس تھی۔

بیگ کندھوں میں ڈال کر میں کھڑا ہو گیا۔ برآمدے پر لگا بلب مختصر صحن میں اجالا کر رہا تھا۔ اندرونی عمارت کی بغل کے ساتھ لوہے کی سیڑھی لگی تھی۔ ہم محتاط انداز میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئے۔ چھت کافی کشادہ تھی۔ جدید طرز کے مکان کے سارے کمروں کی ایک ہی چھت تھی۔ یہ کچے کوٹھے نہیں تھے کہ چھت پر چلنے والے کے پاؤں کی آواز اندر سنائی دیتی۔ اس کے باوجود ہم محتاط انداز میں چلتے ہوئے چھت کے درمیان میں پہنچے اور ایک دوسرے سے چند فٹ فاصلہ رکھ کر لیٹ گئے۔ بیگ میں نے لورا کے حوالے کر دیا تھا تاکہ بہ طور تکیہ سر کے نیچے رکھ سکے۔ برقع اتار کر اس نے نیچے بچھا دیا تھا۔ بلاشبہ وہ بھی تربیت یافتہ سنائپر تھی، مگر اس کا عورت پن کسی بھی سہولت پر پہلا حق اسے دیتا تھا۔ ہم دونوں کا ایک ساتھ سونا بھی مناسب نہیں تھا، اس وجہ سے میں نے آنکھیں بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لورا البتہ اطمینان سے سو گئی تھی۔ جلد ہی بھاری سانسوں کی آواز اس کے گہری نیند میں ہونے کا پتا دینے لگی۔ میری پلکیں بھی بھاری ہونے لگیں، مجبوراً مجھے اٹھ کر بیٹھنا پڑا۔ نیند بھگانے کو میں باری باری چاروں کونوں پر جا کر دائیں بائیں علاقے کا جائزہ لینے لگا۔ مکان کے دائیں اور سامنے سے گلی گزر رہی تھی۔ دو جانب دوسرے مکانوں کی دیوار ملی تھی۔ بائیں جانب کے مکان کی چھت کا فاصلہ دو تین فٹ کے بہ قدر ہوگا۔ گھنٹا بھر کے جائزے کے بعد میں لورا کے پاس لوٹ آیا۔ وہ بے سدھ لیٹی تھی۔ میں نے آلتی پالتی مار کر آنکھیں بند کیں اور اپنی پلوشے کے پاس پہنچ گیا۔

مگجا اجالا ہوتے ہی میں نے پانی کی ٹینکی کے ساتھ جا بیٹھا۔ لورا لیٹنے کی وجہ سے دور سے نظر نہیں آسکتی تھی۔
طلوع آفتاب کے ساتھ لورا نے آنکھیں کھول دیں۔ بیٹھ کر توبہ شکن انگڑائی لیتے ہوئے اس نے میری طرف سر گھمایا بیگ و برقع اٹھا کر قریب آ گئی۔

"تمھیں نیند نہیں آئی۔" میرے قریب بیٹھتے ہوئے اس نے ٹینکی کی دیوار سے ٹیک لگالی۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ مسکرائی۔ "تمھارے خیال میں ایک کا جاگنا ضروری تھا ہے نا۔"

میں طنزیہ انداز میں بولا۔ "تمھارا خیال کیا کہتا ہے۔"

وہ بگڑ کر بولی۔ "طنز کی ضرورت نہیں، نیند آئی تھی تو جگا دیتے، اتنی کمزور نہیں ہوں۔"

"شکوہ کس نے کیا ہے۔"

وہ خفگی سے بولی۔ "اپنے لہجے پر غور کرو۔"

"میں نے طنز تمھارے سونے پر نہیں، تمھارے مشورے پر دیا ہے۔ کیا تمھیں معلوم نہیں دونوں کا ایک ساتھ سونا کتنا نقصان دہ ہو سکتا تھا۔"

اس نے نرمی سے مشورہ دیا۔ "اچھا اب سو جاؤ۔ ٹینکی گھنٹا ڈیڑھ تو دھوپ سے بچائے گی نا۔"

اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہاں تک کہ دھوپ نے تیز ہو کر جاگنے پر مجبور کیا۔ گھنٹے ڈیڑھ کی نیند نے چاق و چوبند کر دیا تھا۔ ہم پانی کی ٹینکی کے غربی جانب بیٹھے تھے۔ مگر دھوپ سر پر آ گئی تھی۔ گو موسم کافی حد تک تبدیل ہو گیا تھا۔ اکتوبر میں دھوپ اتنی سخت نہیں ہوتی، پھر بھی بے آرام کر رہی تھی۔

لورا نے اطلاع دی۔ "ساتھ والے مکان کی چھت پر ایک عورت گیلے کپڑے بچھا رہی تھی۔ ہم پر نظر پڑی، کافی غور سے دیکھ رہی تھی، مگر کچھ کہے بغیر نیچے اتر گئی۔"

میں فکر مندی سے بولا۔ "کب..... میرا مطلب کتنی دیر ہو گئی ہے۔"

اس نے اندازہ لگایا۔ "اوہ، پون گھنٹا ہو گیا ہو گا۔"

"احمق عورت مجھے جگا دیا ہوتا۔" میں فوراً کھڑا ہو گیا۔

"کک..... کیوں۔" وہ سراسیمہ ہوئی۔

میں نے وضاحت کی۔ "بے شک وہ ہمیں نہ پہچان سکے، مگر اتنا اندازہ آسانی سے کر سکتی ہے کہ ہم اس گھر کے نہیں ہیں۔"

وہ معترض ہوئی۔ "دوسری چھتوں پر بھی اکا دکا افراد نظر آ رہے تھے۔"

بیگ کندھوں میں پہنتے ہوئے میں نے اسے سمجھایا۔ ''باقی کسی کام کو چھت پر چڑھے ہوں گے۔ ہماری طرح ٹینکی سے ٹیک لگائے کوئی نہیں بیٹھا ہوگا۔''

اس نے تکرار کی۔ ''ایک لڑکی اور لڑکے کو جب کوئی پہلو بہ پہلو بیٹھا دیکھے گا تو اس کا دھیان کدھر جائے گا۔''

میں جھلاتے ہوئے بولا۔ ''جب کھوپڑی میں بھیجا نہ ہو تو ایسے ہی سوالات جنم لیتے ہیں۔''

وہ معترض ہوئی۔ ''یہ میری دلیل کا جواب نہیں ہے۔''

''بے وقوف! اتنے قریبی پڑوسی کیا گھر کے مکینوں سے واقف نہیں ہوں گے۔ انجان لڑکی ولڑکے کو دیکھ کر گھر والوں سے پوچھیں گے نہیں تمہاری چھت پر دو پریم پنچھی کیا کر رہے ہیں۔ اور جب مکین پہچاننے سے لاعلمی ظاہر کریں گے تو کیا نتیجہ نکلے گا۔''

وہ نادم ہوئی۔ ''سوری، اس طرف میرا دھیان نہیں گیا تھا۔''

میں نے اندازہ لگایا۔ ''یقیناً، چند منٹ بعد وہ دوبارہ بھی اوپر آئی ہوگی۔''

لورا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''آئی تو تھی، مگر ہماری طرف دیکھے بغیر کپڑوں کو درست کیا اور لوٹ گئی۔''

سیڑھی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں تلملاتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری عقل تب بھی گھاس چرتی رہی۔''

وہ روہانسی ہوئی۔ ''اچھا اب سوری کہہ دیا ناں۔ اور میرے خیال میں.....'' وہ فقرہ مکمل نہ کر پائی پولیس گاڑیوں کے سائرن نے اسے متوحش کر دیا تھا۔ ''کک.....کیا.....؟''

''ہاں۔'' میں نے اس کی سوچ اچکی۔ ''یہ ہماری میزبانی کو آ رہے ہیں۔'' اور سیڑھیاں اترنے کے بجائے دوسرے مکان کی طرف بڑھ گیا۔ اگر پولیس واقعی اسی مکان کی طرف آ رہی تھی تو گاڑیوں کو وہاں پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ وقت نہ لگتا۔ ہم مکان سے نکل کر زیادہ دور نہیں جا سکتے تھے۔ اس کے بجائے چھتوں پر بھاگ کر دور نکلنا زیادہ مناسب رہتا۔

دو تین فٹ کا فاصلہ پھلانگ کر ہم جونہی دوسری چھت پر کودے، اسی لمحے سیڑھیوں سے ایک عورت کا سر ابھرا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ سرعت سے واپس پلٹی، یقیناً ہماری مشکلات بڑھانے والی وہی تھی۔ ایک بار تو جی کیا کم از کم اسے ڈانٹ ہی دوں، مگر پھر وقت کی کمی آڑے رہی۔ یوں بھی اس کا فعل اصولوں کے خلاف نہیں تھا۔ ہم قانون کی نظر میں مجرم تھے اور ایسے انجان لوگوں کے بارے پولیس کو مطلع کرنا اس کا فرض تھا۔

جب تک ہم دوسرے مکان سے تیسرے مکان پر منتقل ہوتے پولیس کی گاڑیاں اس گھر کے سامنے پہنچ گئی تھیں۔

ایجنسیوں اور پولیس کے طریقہ کار میں بنیادی فرق یہی ہے کہ پولیس ساز باجے کے ساتھ مجرموں کی سرکوبی کو روانہ ہوتی ہے۔ یوں جیسے اعلان کرتی آ رہی ہو کہ بھاگنا ہے تو نکل جاؤ ورنہ ہم پکڑنے آ رہے ہیں۔ جبکہ ایجنسی والے ہدف کو خاموشی سے گھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مجھے لگ رہا تھا ہماری اچھی خاصی ورزش ہونے والی ہے۔ ایس آر ون کا وزن تقریباً ساڑھے آٹھ کلوگرام تھا۔ اس کا ایمونیشن، سائیٹنگ کا دوسرا سامان، بیس لاکھ کی رقم۔ یہ سب مل کر گیارہ بارہ کلوگرام کے بہ قدر بن رہا تھا۔ اور یہ وزن تیز رفتاری سے حرکت کرنے میں رکاوٹ ڈال رہا تھا۔ تیسرے مکان کی چھت پر پلاسٹک کی دو چھوٹی ٹینکیاں پڑی تھیں۔ سرعت سے فیصلہ کرتے ہوئے میں نے ایک ٹینکی کا ڈھکن کا اٹھا کر بیگ اندر پھینک دیا۔ ایس آر ون کا اپنا بیگ ''پن روک'' (واٹر پروف) تھا۔ اور پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ پانی ہتھیار کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ رقم بھی موی لفافے میں تھی اور پھر پلاسٹک کا مضبوط بیگ بھی پانی کے خلاف بہترین ڈھال تھا۔ اور ہنومان نگر کا وہ مکان تلاش کرنا بالکل آسان تھا۔ یہ عوامل میرے فیصلہ کرنے کو آسان بنا گئے تھے۔

فی الحال جان بچانے کی ضرورت تھی سامان بعد میں وصول کیا جا سکتا تھا۔ البتہ اتفاق سے گھر والے ٹینکی کو کھول کر دیکھ لیتے تو ان کے وارے نیارے ہو جاتے۔ لورا نے میرے فعل پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ البتہ مجھے رکتے دیکھ کر اس کے قدم بھی تھم گئے تھے۔ ٹینکی کا ڈھکن برابر کر کے میں بھاگ پڑا۔ میرا ساتھ دیتے ہوئے وہ کہنے لگی۔

''کہیں ٹکنے ہی نہیں دے رہے۔''

میں طنز کرنے سے باز نہ آیا۔ ''تم بے وقوفی نہ کرتیں تو کم از کم آرام سے رخصت ہوتے۔''

وہ چپ ہو گئی۔ پولیس کی گاڑیوں کے سائرن آگے بڑھ آئے تھے۔ یقیناً انھیں ہمارے بھاگنے کی بابت اور سمت کا پتا چل چکا تھا۔

چوتھے مکان کی چھت عبور کرتے ہی آگے گلی کا خلا تھا جو پندرہ سولہ فٹ سے زیادہ تھا۔ اور کوئی ''لانگ جمپ'' کا کھلاڑی ہی اسے پھلانگنے کا حوصلہ کر سکتا تھا۔

ہم چھت سے روشندان کے چھجے اور وہاں سے کھڑکی کے چھجے پر منتقل ہوئے۔ اس کے بعد زمین پر کودنا مشکل نہ تھا۔ وہ گھر ہمارے لیے چوہے دان ثابت ہو سکتا تھا۔

''باہر نکلو۔'' لورا کی سوالیہ نظروں کا جواب دیتے ہوئے میں دیوار کی طرف بڑھا۔ اسی وقت سفید رنگ کا ایک چھوٹا سا کتا کسی کونے سے برآمد ہوا اور بھونکنے لگا۔ ایک بار تو اسے چپ کرانے کا سوچا مگر پھر یہ فالتو لگا۔ خواہ مخواہ اسے ہلاک کرنا مناسب نہ تھا۔ اس کی ذمہ داری اجنبیوں کی نشان دہی کرنا تھا اور بے چارہ وہی تو کر رہا تھا۔

دیوار کی اونچائی سات فٹ کے قریب تھی۔ ہمیں پھلانگنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ گلی میں کودتے ہی میری باچھیں کھل گئی تھیں۔ سامنے دکانوں کی قطار تھی۔ ایک متمنی سا لڑکا موٹر سائیکل کی سیٹ پر بیٹھا آئس کریم سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ مجھے وہ غائبانہ امداد ہی لگی تھی۔ وہ عام موٹر سائیکل تھی۔ میں سرعت سے آگے بڑھا۔ پولیس گاڑیوں کے سائرن گلی کی نکڑ تک پہنچ گئے تھے۔ میں نے جیب سے پستول برآمد کیا۔

''تم تھوڑی دیر پیدل چلنے کا کشٹ (تکلیف) اٹھاؤ مہاراج۔'' پستول کی نال سے میں نے لڑکے کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ فوراً اٹھ کر پیچھے ہو گیا۔ چابی اگنیشن ہی میں تھی۔ چابی گھما کر میں نے کک لگائی اور لورا کے بیٹھتے ہی گیئر لگا کر آگے بڑھ گیا۔ تبھی پولیس کی جیپ نے موڑ کاٹا۔ لوگوں کی چیخ پکار سے اندازہ ہوا کہ وہ انھیں ہماری طرف متوجہ کر رہے ہیں۔

گلی کافی کشادہ تھی اور جیپ تیز رفتاری سے ہمارے قریب پہنچ سکتی تھی۔ میں نے ''ریس'' گھما کر رفتار بڑھائی۔ چوتھے گیئر میں موٹر سائیکل خطرناک انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔ گلیوں میں زیادہ رکاوٹوں کی وجہ سے تیز رفتاری عموماً نقصان دہ ہوتی ہے۔ لیکن وہ وقت سود و زیاں کی سوچ کا نہیں تھا۔ پولیس جیپ کا سائرن اور ہارن بھی تسلسل سے بجنا شروع ہو گیا تھا۔

لورا نے فکرمندی سے مشورہ دیا۔ ''ریچارفتار بڑھاؤ۔''

میں نے سامنے سے آنے والی موٹر سائیکل کو بچایا، اچانک ماحول تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھا۔ لوگ بھاگ کر دکانوں میں گھسنے لگے۔ ایک پھیری والا، اپنی ریڑھی گلی کے وسط میں لا کر پیچھے پلٹنے کو موڑ کاٹ رہا تھا۔ فائرنگ سنتے ہی سراسیمہ ہو کر ریڑھی کو وہیں چھوڑا اور ایک دکان میں گھس گیا۔ بڑی مشکل سے میں نے موٹر سائیکل کو ریڑھی سے ٹکرانے سے بچایا تھا۔ ایک دم بریک لگانے کی وجہ سے موٹر سائیکل گرنے والی ہو گئی تھی۔ ہینڈل موڑ کر میں ریڑھی کے عقب سے نکلا، ایک بار پھر۔ ''تڑ.....تڑ'' ہوئی۔ لورا کے ہونٹوں سے زوردار کراہ خارج ہوئی تھی۔

''کیا ہوا؟'' رفتار بڑھاتے ہوئے میں متوحش ہوا۔

وہ بہ مشکل بولی۔ ''گولی لگی ہے۔''

''سنبھل کر بیٹھنا۔'' گھبراتے میں نے رفتار مزید بڑھادی۔ تڑتڑاہٹ پھر گونجی، گولیاں ''شاں.....شاں'' کی آواز سے میرے سر کے اوپر سے گزری تھیں۔ پولیس والوں کی بوکھلاہٹ پر حیرانی ہو رہی تھی، کیوں کہ سرِ بازار گولیاں چلانا احمقانہ فعل اور اختیار سے تجاوز کرنا تھا۔ وہاں عام لوگ موجود تھے، فلم کی شوٹنگ نہیں ہو رہی تھی کہ یوں فائر کھولا جاتا۔

لورا نے سر میرے کندھے پر ٹیک دیا تھا۔ اس کی آہیں آہستہ آہستہ بلند ہونا شروع ہوگئی تھیں۔

''گولی کہاں لگی ہے۔'' بغلی گلی میں موٹر سائیکل موڑتے ہوئے میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''آہ.....کمر پر۔'' وہ بہ مشکل بول پائی تھی۔

گولی لگنے کی تکلیف اور پھر موٹر سائیکل کی غیر آرام دہ سواری، وہ دہری مصیبت میں گرفتار ہوگئی تھی۔ بغلی گلی میں بازار کی نسبت بہت کم بھیڑ تھی۔ رفتار آخری حد تک بڑھاتے ہوئے میں نے ہدایت کی۔

''میری کمر کس کر پکڑے رہو۔''

اس کا بایاں ہاتھ بغل سے نیچے، میرے پیٹ پر آ گیا، جبکہ دوسرا ہاتھ غالباً زخم پر دھرا تھا۔

''زخم کو دبا کر رکھنا۔'' میں نے بھی ہدایت دینا ضروری سمجھا تھا۔

موٹر سائیکل کی نسبت جیپ کو موڑ کاٹنے میں چند لمحے لگے تھے۔ اس دوران میں ایک تنگ گلی کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔ جہاں جیپ کا داخلہ ممکن نہ تھا۔ میں فوراً اندر گھس گیا۔

دو لڑکے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے آ رہے تھے، مجھے طوفانی رفتار سے آگے بڑھتا دیکھ کر دیوار سے لگ گئے تھے۔

جونہی تنگ گلی سے ملحق پہلی گلی آئی میں نے موٹر سائیکل اس میں موڑ دی، کیوں کہ تنگ گلی کی نکڑ پر کھڑے ہو کر پولیس والے ہمیں نشانہ بنا سکتے تھے۔ اس گلی میں تھوڑا آگے بڑھتے ہی ایک نوجوان لڑکی، لڑکے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے مکلتے ہوئے آتی دکھائی دی۔ اس کے گلے میں سرخ رنگ کا دوپٹا مفلر کی طرح جھول رہا تھا۔ اور یقیناً اس کی گردن سے زیادہ لورا کے زخم کو اس دوپٹے کی احتیاج (ضرورت، حاجت) تھی۔

موٹر سائیکل روکتے ہوئے میں نے سٹینڈ پر لگایا۔ میرا سہارا ہٹتے ہی لورا نے سیٹ پر ہاتھ ٹیک دیے تھے۔ گولی اس کے دائیں پہلو میں لگی تھی۔ اس کا دایاں پہلو، کولہے اور دائیں ٹانگ خون سے لال ہو گئے تھے۔ خون مسلسل نیچے ٹپک رہا تھا۔

''معذرت بہن، مگر آپ کا دوپٹا مجھے چاہیے ہوگا۔'' میں بغیر کسی تمہید کے لڑکی کو مخاطب ہوا۔ وہ ششدر رہ گئی تھی۔ لڑکے نے غیرت کا مظاہرہ کرنا چاہا.....

''اوے تم.....''

''بحث کا وقت نہیں ہے دوست۔'' میں نے نیفے سے پستول برآمد کیا۔

''ب.....بھائی یہ لیں۔'' لڑکی نے فوراً فیشنی دوپٹا میرے طرف بڑھا دیا تھا۔

''دوبارہ معذرت چاہتا ہوں، مگر میری ساتھی زخمی ہے۔'' میں نے صفائی دینا ضروری سمجھا کہ بعد میں بے چارے کڑھ کڑھ کر اپنا آدھا خون جلا لیتے۔

''کک.....کوئی بات نہیں دوست۔'' لڑکے نے بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا کہ ہتھیار مخالف کے غصے پر ٹھنڈے پانی سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔

میں اس کی بات سننے رکا نہیں تھا۔ پستول نیفے میں اڑستے ہوئے میں لورا کے قریب ہوا۔ اپنی قمیص کا دامن سامنے سے پھاڑ کر میں نے تہہ کر کے گدی بنائی اور لورا کے زخم پر رکھ کر اوپر سے دوپٹا کس کر باندھ دیا۔ خون روکنا نہایت ضروری تھا۔ زخم کاری تھا یا نہیں، زیادہ خون بہہ جانا اسے ناکارہ کر سکتا تھا۔

وہ ہونٹ بھینچے درد بھری سسکیاں لے رہی تھی۔ درد کی شدت سے اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔

''بھائی! قریب ہی ایک کلینک ہے۔'' نوجوان جوڑا ہمارے قریب رک گیا تھا۔ یہ مشورہ لڑکی نے دیا، یقیناً اپنے دوپٹے کا صحیح مصرف دیکھ کر اس کے دل پر سے غبار دھل گیا تھا۔

میں نے سیٹ سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''شکریہ بہن۔'' ان سے کلینک کا پتا دریافت کرنے کی زحمت نہ کی کہ کلینک میں جانا اپنی گردن پھندے میں دینے کے مترادف تھا۔

لورا نے میرے کندھوں پر سر ٹیک کر میرے پیٹ پر ہاتھ باندھ لیے تھے۔ اب اس کی سسکیاں، کراہوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ سنائپر ہونے کے باوجود وہ صنف نازک ہی تھی۔ خون بہنے سے اس کا جسم نقاہت کا شکار ہو گیا تھا۔ اوپر سے درد و تکلیف اور پھر موٹر سائیکل کی بے آرام سواری۔

''ریجا، مجھے چھوڑ کر چلے کیوں نہیں جاتے۔'' نجانے مشورہ دے رہی تھی یا اس میں مزید موٹر سائیکل پر بیٹھنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔

میں جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ وہ علاقہ میرے لیے بالکل انجان تھا۔ گلیاں طلسمی عمارت کی بھول بھلیاں لگ رہی تھیں۔ سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ ایک بار خود کو پولیس کے حوالے کرنے کا بھی سوچا، مگر پھر حوصلہ نہ ہوا۔ اب میں جاسوس سے بڑھ کر قاتل تھا۔ گو جنھیں قتل کیا تھا وہ اسی قابل تھے، کہ انھوں نے مجھے بڑی بے دردی سے تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ لیکن انڈیا کا قانون مجھے ایسی اجازت نہیں دیتا تھا۔ لورا کو وہیں چھوڑ دینا بھی مسئلے کا ایک حل تھا، بلاشبہ لورا نہ تو میرے لیے ضروری تھی اور نہ اس سے کوئی جذباتی وابستگی تھی۔ مگر میری غیرت یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ زخمی ساتھی کو چھوڑ کر اپنی جان بچانے بھاگ جاؤں۔ شاید یوں جان بچ جاتی مگر ضمیر کی عدالت ہمیشہ کے پچھتاوے میرا مقدر کر دیتی۔

گاہے گاہے ساعتوں میں پولیس کی گاڑیوں کے سائرن بھی گونجنے لگتے۔ انھوں نے پورے علاقے کو گھیر لیا تھا اور یقیناً ہمیں گرفتار یا ختم کیے بغیر ٹلنے والے نہیں تھے۔ کسی بھی ملک کے حساس ادارے اور پولیس وغیرہ، غیر ملکی دشمنوں کے لیے ایسے ہی باؤلے اور متشدد ہوتے ہیں۔ ہر ایک کی ترجیحات، فوائد اور نقصان اپنے اپنے ہوتے ہیں۔ یقیناً کسی انڈین جاسوس کو پاکستان میں دیکھ کر میری بھی یہی حالت ہوتی۔

میری کوشش تھی کہ موٹر سائیکل تنگ گلیوں میں بھگائے رکھوں، لیکن وہاں اتنی زیادہ تنگ گلیاں نہیں تھیں کہ ایک کے بعد ایک ایسی گلی ملتی رہتی۔ لورا کی برداشت بھی اختتام پذیر تھی۔ اس میں درد سہنے اور موٹر سائیکل پر مزید جمے رہنے کا حوصلہ مفقود ہو چکا تھا۔ وہ لجاجت و درد بھری آواز میں رکنے کی منت کر رہی تھی۔ یہ شکر تھا کہ اس نے موٹر سائیکل سے چھلانگ لگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید درد کی شدت اسے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔

میں تنگ گلی سے کشادہ گلی میں نکلا۔ تبھی ایک مکان سے سفید کار نکل کر مخالف سمت کو بڑھ گئی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ نجانے کسے نشانہ بنایا گیا تھا۔

لورا نقاہت و بے چارگی سے بولی۔ ''ریجا میں گر جاؤں گی۔ مجھے کہیں اتار کر تم بھاگ جاؤ۔''

مجھ پر اس کی حالت مخفی نہیں تھی۔ وہ مزید موٹر سائیکل پر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ خطرہ مول لیتے ہوئے میں نے موٹر سائیکل

اس مکان کی طرف موڑ دی جہاں سے کار نکلی تھی۔ چوکیدار دروازہ بند کر چکا تھا۔
دروازے کے سامنے پہنچ کر میں نے ہلکا سا ہارن دیا۔ ذیلی دروازہ کھول کر چوکیدار نے باہر جھانکا۔
''جی کس کو ملنا ہے۔'' وہ باہر نکل آیا تھا۔ ذیلی دروازہ اتنا چوڑا ضرور تھا کہ موٹر سائیکل اندر چلی جاتی۔ جواب دیے بغیر میں نے موٹر سائیکل آگے بڑھائی۔
''اوئے کیا بدتمیزی ہے۔'' موٹر سائیکل کی ٹکر سے بچنے کو وہ ایک جانب ہوا اور میں دروازے سے اندر ہو گیا۔
چوکیدار گالی بکتے ہوئے ہمارے پیچھے اندر آیا، تبھی میں موٹر سائیکل کو سٹینڈ پر کھڑا کر کے نیچے اتر آیا تھا۔ سائیلنسر لگے گلاک کی بھیانک شکل دیکھتے ہی وہ ٹھٹک کر رکا۔ مگر آنکھوں میں خوف کے بجائے حیرانی ابھری تھی۔ کافی مضبوط اعصاب کا لگتا تھا ورنہ عموماً ایسے ملازم ہتھیار دیکھتے ہی خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔
''کیا چاہتے ہو؟'' اس کی نظریں سنہری بالوں والی لورا پر گڑ گئیں۔
''پہلے دروازہ بند کرو۔'' اس کے اطمینان بھرے انداز نے مجھے مایوس کیا تھا۔
قدم پیچھے لے کر اس نے ذیلی دروازہ بند کر دیا۔ ''اب بتاؤ۔'' اس بار لہجے میں اعتماد زیادہ تھا۔
میں نے پوچھا۔ ''گھر میں کون کون ہے؟''
وہ اطمینان سے بولا۔ ''تمھیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ اپنا مسئلہ بتاؤ۔'' اسی وقت گلی میں پولیس کی گاڑی سائرن بجاتے ہوئے گزر گئی تھی۔
''ڈر نہیں لگتا میں تمھیں نقصان پہنچاؤں گا۔'' میں نے حیرانی ظاہر کی۔ لورا کراہتے ہوئے موٹر سائیکل سے اتر کر پختہ فرش پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی حالت کافی ناگفتہ بہ لگ رہی تھی۔
اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم اچھے یا ڈکیت نہیں لگتے، نہ یہ ڈاکے ڈالنے کا وقت ہے۔ تمھاری دوست زخمی ہے۔ مجرم ہو اور یقیناً پولیس سے بھاگتے پھر رہے ہو، تبھی وقفے وقفے سے پولیس کی گاڑیوں کے سائرن اور فائرنگ کی آواز بلند ہو رہی ہے۔''
میں پستول جھکاتے ہوئے بولا۔ ''مجرم ہیں یا نہیں، مظلوم ضرور ہیں اور ہمیں مدد چاہیے۔''
اس کے لبوں پر تبسم ابھرا۔ ''مدد لینے کو مجھ پر اعتبار کرنا پڑے گا۔ اور تم پستول تان کر دشمنی کا آغاز کر چکے ہو۔''
میں فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''کبھی کبھی ایسی افتاد پڑتی ہے کہ اجنبیوں پر اعتبار کرنا، ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اور مدد کے وعدے پر اکتفا کر کے آنکھیں میچنا پڑتی ہیں۔''
''میرا نام سورج سنگھ ہے اور واہ گرو کی قسم دھوکا نہیں دوں گا۔ اب بتاؤ تمھارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''
''ہمیں چھپنے کی جگہ چاہیے۔''
وہ لورا پر نظریں جماتا ہوا بولا۔ ''کیا اتنا کافی ہوگا۔'' یقیناً لورا کی حالت اس کی نظر سے اوجھل نہیں تھی۔
میں نے دامن امید دراز کیا۔ ''پہلی ضرورت تو پناہ کی تلاش ہے۔ بعد کے مراحل بعد میں دیکھے جائیں گے۔''
اس نے اطمینان سے انکشاف کیا۔ ''صاحب دفتر چلے گئے ہیں، بچے کالج جا چکے ہیں۔ بیگم صاحب سوئی ہیں۔ کام والی کی آمد میں گھنٹہ ڈیڑھ رہتا ہے۔ اور میرے کوارٹر کی طرف کوئی نہیں آتا۔''
''ہمیں وہیں لے چلو، میری ساتھی کو آرام کی ضرورت ہے۔''
''چلو۔'' اس نے موٹر سائیکل پکڑی۔ کلچ دبا کر گیئر لگاتے ہوئے بولا۔ ''تم اپنی ساتھی کو سہارا دو۔''
مگر لورا کی ضرورت سہارے سے بڑھ گئی تھی۔ میں نے قریب ہو کر اس کے کندھوں اور ٹانگوں میں ہاتھ ڈال کر اٹھا

لیا۔

کراہتے ہوئے اس کی پلکیں وا ہوئیں، آنکھوں میں حیرت اور موہوم سا احتجاج تھا، مگر زبان خاموش رہی۔

چوکیدار کی معیت میں چلتے ہوئے ہم مکان کے عقب میں پہنچے، جہاں دو کمروں کا چھوٹا سا کوارٹر بنا تھا۔ میں نے لورا کو احتیاط سے چارپائی پر لٹایا۔ گولی جسم میں ہونے کی وجہ سے لحہ بہ لحہ اس کے زخم نے بگڑتے جانا تھا۔ اگر گولی ٹانگ یا بازو وغیرہ میں لگی ہوتی تو میں نکالنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ پہلو جیسے نازک مقام کو چھیڑ کر میں اس کے خاتمے کو یقینی بنانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

سورج سنگھ نے جانے کی اجازت چاہی۔ ''خون کے دھبے صاف کرنا پڑیں گے۔''

نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس پر اعتبار کرنے پر مجبور تھا۔ فقط اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

وہ باہر نکل گیا۔ میں لورا کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے چہرے پر زردی چھائی تھی۔ ہونٹ بالکل خشک ہو گئے تھے۔ آنکھیں بند کیے وہ ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔

اس کے کندھوں کے نیچے دو تکیے رکھ کر میں نے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

وہ غٹا غٹ پورا گلاس پی گئی۔ میں نے ایک اور گلاس بھی اسے پلایا۔ اور پھر خود پانی پینے لگا۔

''ریچا، میں نہیں بچوں گی۔'' اس کی نحیف اور مایوسی سے بھرپور آواز میری سماعتوں میں پہنچی۔

میں اس کا حوصلہ بڑھانے کو ہنسا۔ ''زندگی و موت کے فیصلے میرے رب نے کرنے ہیں۔ تم اپنی محدود سوچوں کو زحمت نہ دو۔''

''تم بھاگ کر اپنی جان بچا سکتے ہو۔''

''تمھیں چھوڑ کر چلا گیا تو ڈیٹ کا وعدہ کیسے پورا ہوگا۔''

وہ میرے مذاق پر مسکرا بھی نہیں سکی تھی۔ آنکھیں بند کیے بے تاثر چہرہ لیے لیٹی رہی۔

''اے! پریشان نہیں ہوتے۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے سہلایا۔ ''ایسی مشکلات و تکلیفات تو زندگی کا حصہ ہیں۔ تم تو تربیت یافتہ سپاہی بلکہ سنائپر ہو۔ عملی زندگی میں کتنی ہی مشکلات کا سامنا کر چکی ہو، پھر حوصلہ ہارنے کی کیا تک۔ دل بڑا رکھو اتنی آسانی سے تمھیں مرنے نہیں دوں گا۔ اللہ پاک نے چھپنے کی جگہ عطا فرما دی ہے آگے بھی رحم کا معاملہ فرمائے گا۔''

وہ پھیکے لہجے میں بولی۔ ''آپ کا اللہ مجرموں کے ساتھ بھی رحم کا معاملہ فرماتا ہے۔ جانتے ہو ناں میں قاتل ہوں۔ اجرت لے کر ایک شخص کو ختم کر چکی ہوں۔''

میں نے انکشاف کیا۔ ''اللہ پاک اپنی مخلوق سے سگی ماں سے بھی ستر گنا زیادہ محبت کرتا ہے۔''

اس نے مجھے لاجواب کرنا چاہا۔ ''وہ اکیلا میرا اللہ تو نہیں ہے ناں، اس کا بھی اللہ ہے جسے میں قتل کر چکی ہوں۔ کیا مجھے معاف کرنے سے دوسرے کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔''

میں نے لمبی بحث میں پڑنے کے بجائے عام فہم مثال بیان کی۔ ''جب ایک شخص کے دو بچوں میں سے ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی کا مرتکب ہو، تب جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہو والد اسے کبھی کبھار کوئی قیمتی چیز یا رقم وغیرہ دے کر اس پر راضی کر لیتا ہے کہ وہ اپنے زیادتی کرنے والے بھائی کو معاف کر دے۔ یوں دونوں خوش ہو جاتے ہیں۔''

وہ مایوسی سے بولی۔ ''کبھی، زیادتی کرنے والے کی پٹائی کر کے بھی دوسرے کو خوش کرتا ہوگا۔''

میں وثوق سے بولا۔ ''توبہ کرنے والے کے ساتھ کبھی کبھار نہیں ہمیشہ ہی مہربانی کا معاملہ ہوگا۔''

اس نے حیرانی ظاہر کی۔ ''توبہ کیا ہوتی ہے؟''

''کیے پر پشیمانی، غلطی کا اعتراف اور آئندہ نہ کرنے کا عہد۔''

''پشیمان بھی ہوں، آئندہ نہ کرنے کا عہد کئی بار کر چکی ہوں۔ اور یقین مانو اگر عہد نہ کیا ہوتا تو تمہیں سنائپنگ کی تربیت نہ دیتی۔''

میں نے اس کے ہاتھ کی پشت تھپتھپائی۔ ''تو بس سچے دل سے تائب ہونا کافی ہے۔'' وہ موقع مسلم اور کافر کی بحث چھیڑنے کا نہیں تھا۔ وہ پہلے ہی حوصلہ ہاری ہوئی تھی۔ اس کی دلجوئی اور ہمت بڑھانا ضروری تھا۔

اس نے موضوع تبدیل کیا۔ ''یہ ہماری مدد کرنے پر کیوں تیار ہوا ہے۔'' میری سورج سنگھ کے ساتھ ملی جلی ہندی و پنجابی میں بات ہوئی تھی تبھی اس کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔

''پتا نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تمہارا مزید موٹر سائیکل پر بیٹھنا ممکن نہ تھا مجبوراً مجھے یہاں گھسنا پڑا۔ میری دھمکی کارگر نہ ہوئی، تب مدد کی درخواست کی اور موصوف مان گیا۔''

وہ فکرمند ہوئی۔ ''کیا اعتبار کے قابل ہے۔''

میں دھیرے سے ہنسا۔ ''میرے ناں کرنے پر تمہارے پاس کوئی اور انتخاب موجود ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں تمہیں بھاگ جانے کا مشورہ دوں گی۔ تاکہ دونوں نہ پکڑے جائیں۔ یوں قید میں مجھے باہر سے مدد ملنے کی امید موجود رہے گی۔''

''جو تمہیں ابھی چھوڑ کر چلا گیا وہ بعد میں مدد کو کیسے آئے گا۔''

اس نے خفگی سے منہ پھلا لیا۔ ''تو نہ آئے منت کس نے کی ہے۔''

میں شاکی ہوا۔ ''خفا کیوں ہوتی ہو، میں تمہیں چھوڑ کر ہی نہیں جا رہا۔''

اس کے ہونٹوں پر خوب صورت تبسم ابھرا۔ ''ساری لڑکیوں کو یونہی نرمی، توجہ اور اخلاق سے پھانستے ہو۔''

''الزام لگا رہی ہو۔ تم اگر مرد ہوتیں تب بھی چھوڑ کر نہ جاتا۔''

اس نے ہنسنے کی کوشش کی مگر زخم میں درد اٹھا اور چہرے پر اذیت پھیل گئی۔

''گفتگو مت کرو بس آرام سے لیٹی رہو۔'' یہ الفاظ میرے ہونٹوں پر تھے کہ سورج سنگھ اندر داخل ہوا۔

''چند جگہوں پر خون کے دھبے لگے تھے۔ صاف کر دیے۔ اب کسی کو تمہاری یہاں موجودی کا شبہ نہیں ہو سکتا۔'' یہ کہہ کر اس نے دیوار پر نصب ''ایل ای ڈی'' آن کی۔ اور ڈھونڈ کر خبروں کا چینل لگا دیا۔

ہمارے بارے تفصیل بیان ہو رہی تھی۔ لورا کے یورپین ہونے کا ذکر نہیں کیا جا رہا تھا۔ صرف پاکستانی جاسوس جوڑے کے بارے بتایا جا رہا تھا۔

بلاشبہ سورج سنگھ کا ٹی وی لگانے کا مقصد ہمیں اپنی آگاہی سے باخبر کرنا تھا۔ چند منٹ خبرین سننے کے بعد وہ ٹی وی بند کر کے میری طرف متوجہ ہوا۔

''کیا کہتے ہو۔''

''کہنا تم نے ہے دوست۔ ہم تو مدد کی درخواست کر چکے ہیں۔ البتہ ٹی وی کے ذریعے ہمیں یہ باور کرانے کی ضرورت نہیں تھی کہ تم ہمارے بارے سب کچھ جانتے ہو۔''

اس نے صفائی دی۔ ''تمہیں تازہ صورت حال سے باخبر رکھنے کو ٹی وی چلایا تھا۔ اور کیا تم نہیں جانتے تمہیں پہچان چکا ہوں۔'' ایک لمحہ توقف کر کے بولا۔ ''باقی تمہارا مقصد اگر چھپنا ہے تو یقیناً وہ پورا ہو چکا ہے۔ مگر اپنی ساتھی کے لیے کیا

سوچا ہے۔ یہ زخمی ہے اور یہاں اس کا علاج نہیں ہو سکے گا۔ میں تمھیں کھانا کھلا سکتا ہوں، پانی و چائے پلا سکتا ہوں، کپڑے دے سکتا ہوں اور بس۔"

"پہلے تو میرے حوالے کپڑے کرو۔" مجھے پھٹی ہوئی قمیص تبدیل کرنے کا خیال آیا۔ کیوں کہ لورا کا خون روکنے کو میں نے اپنی قمیص کا دامن پھاڑ کر گدی بنائی تھی۔

اس نے لوہے کی الماری سے جینز کی پینٹ اور پھولدار قمیص میرے جانب بڑھادی۔ کمرے کے ملحقہ غسل خانے میں گھس کر میں نے کپڑے تبدیل کیے اور باہر نکل آیا۔

نشست سنبھالتے ہوئے میں مطلب کی بات پر آیا۔ "ہماری مدد کیوں کر رہے ہو، جبکہ جانتے ہو ہم بھارت سرکار کو مطلوب ہیں۔"

"میں ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ ایک بار ٹیکسی بڑے ٹرالر میں ٹھوک دی، زخمی ہوا، مگر واہ گرو کی کرپا (کرم) سے جان بچ گئی۔ علاج کے لیے جب جمع پونجی ناکافی ہوئی تو بیوی کو ٹوٹی پھوٹی ٹیکسی ہی بیچنا پڑی۔ ٹھیک ہونے پر یہاں نوکری کر لی۔ چوکیدار، ڈرائیور، مالی، خاکروب تمام ذمہ داریاں سنبھالتا ہوں اور پندرہ ہزار تنخواہ ملتی ہے۔"

اس کے خاموش ہونے پر میں بے ساختہ بولا۔ "تو....."

وہ اطمینان سے بولا۔ "مجھے ٹیکسی چاہیے۔"

میں نے پوچھا۔ "گیراج میں شاید بیگم صاحب کی کار کھڑی ہے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی ہاں۔"

میں نے پیش کش کی۔ "ہمیں ڈگی میں چھپا کر کسی ایسے کلینک پر لے جہاں غیر قانونی طور پر میری ساتھی کا علاج ہو سکے۔ پانچ لاکھ دوں گا۔"

"منظور ہے، رقم میرے حوالے کرو۔" وہ فوراً تیار ہو گیا تھا۔

"پاس تو نہیں ہے۔ البتہ وعدہ کرتا ہوں ایک دو دن میں لا دوں گا۔"

اس نے مشکوک انداز میں پوچھا۔ "کہاں سے لاؤ گے؟"

"ایک جگہ چھپائی ہوئی ہے۔"

"شاید تم مجھے ٹرخا رہے ہو۔"

میں نے کہا۔ "یہ ایک مسلمان کا وعدہ ہے۔ بس ایک دو دن انتظار کرنا پڑے گا۔"

وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "نئی گاڑی کی خریداری پر شاید مجھے سات لاکھ لگ جائیں۔"

"سات لاکھ دوں گا۔" میں نے پیش کش بڑھادی۔

اس نے بستر سے کمبل اٹھایا۔ "چلو۔"

میں نے پوچھا۔ "کمبل کو کیا کرو گے؟"

"ڈگی میں بچھاؤں گا تاکہ تمھاری ساتھی کو تکلیف نہ ہو اور اس کے خون سے ڈگی بھی خراب نہ ہو۔"

میں پسندیدگی سے سر ہلا کر لورا کی طرف بڑھا۔ جونہی اسے اٹھانے کو جھکا وہ بے چینی سے بولی۔ "مجھے بھی بتاؤ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔"

اسے اٹھا کر میں اطمینان سے بولا۔ "سودے بازی ہو رہی تھی۔ سورج سنگھ ہمیں ڈاکٹر تک لے جائے گا اور میں اسے سات لاکھ دوں گا۔"

عجیب سی نظروں سے مجھے گھور کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ البتہ میرے اٹھانے کی وجہ سے ایک بار پھر اس کی کراہیں نکلنے لگیں تھیں۔

سورج سنگھ ڈگی کھول کر اس میں کمبل بچھا چکا تھا۔ میں نے احتیاط سے لورا کو اندر لٹایا اور پھر خود بھی اندر ہو گیا۔ ہم دونوں یوں لیٹے تھے کہ من وتو کا فرق مٹ گیا تھا۔ اس بے چاری کو زخمی ہونے کی وجہ سے خاصی تکلیف کا سامنا تھا۔ البتہ میرے اتنے قریب لیٹنے پر اس کے چہرے پر انقباض یا ناپسندیدگی نہیں ابھری تھی۔ یقیناً وہ مجبوری سے ناواقف نہیں تھی۔

''کسی مناسب ڈاکٹر کا پتا معلوم کرنے کو راستے میں تھوڑی دیر ایک دوست کے پاس رکوں گا۔'' مجھے مطلع کر کے اس نے ڈگی بند کر دی۔ چند لمحوں بعد کار اسٹارٹ ہو گئی۔

داخلی دروازہ اسے خود ہی کھولنا اور بند کرنا تھا اس وجہ سے چند لمحے رکنا پڑا۔ اور پھر کار روانہ ہو گئی۔ گاڑیوں کا شور، ہارن، لوگوں کی چیخ پکار راستے بھر ہماری سماعتوں میں گونجتی رہی۔ اس کے ساتھ لورا کی کراہیں بھی تسلسل سے سنائی دیتی رہیں۔ میں نے اسے آرام پہنچانے کی پوری کوشش کی تھی۔ نجانے اس کی درد بھری کراہیں تھیں یا میرے دماغ ہی میں کوئی گرہ پڑی تھی کہ اتنی قربت کے باوجود میرے دماغ میں سفلی جذبات یا کوئی بے ہودہ خواہش پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ جس حالت میں ہم لیٹے تھے، اتنی قربت صرف زن وشو (بیوی وشوہر) ہی کو روا ہو سکتی ہے۔

راستے میں گاہے گاہے کار رکتی رہی۔ آدھے گھنٹے بعد رکنے کا نسبتاً لمبا وقفہ آیا۔ مگر دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں رکے تھے۔ دوبارہ سفر شروع ہونے کے بعد منزل تک پہنچنے میں اوہ پون گھنٹا مزید لگا تھا۔ رک کر وہ قریب آیا اور ڈگی کھولے بغیر اونچی سرگوشی میں بولا۔

''ڈاکٹر سے پوچھ کر آتا ہوں۔''

اس کی واپسی چند منٹ بعد ہوئی تھی۔ ڈگی کھلنے پر سورج سنگھ کے ہمراہ دو کالے بھجنگ افراد بھی نظر آئے، جنھوں نے اسٹریچر اٹھا رکھا تھا۔ دونوں شکل سے گنوار اور عقل سے فارغ دکھائی دے رہے تھے۔ یقیناً ڈاکٹر صاحب نے ایسے ملازم اسی وجہ سے رکھے تھے کہ وہ جائز ناجائز کی سمجھ بوجھ سے عاری تھے۔

میں نے ڈگی سے نکل کر لورا کو بانہوں میں بھرا اور اسٹریچر پر لٹا دیا۔ دونوں ملازموں کے پیچھے چلتے ہوئے ہم تھوڑی دیر بعد چھوٹے سے آپریشن تھیٹر میں پہنچ گئے۔

ایک ڈاکٹر، ادھیڑ عمر کی دو نرسوں کے ہمراہ وہاں موجود تھا۔ ڈاکٹر کا نام اشوک تھا۔ نرسوں نے لورا کو احتیاط سے آپریشن کی میز پر منتقل کیا اور ملازم اسٹریچر اٹھا کر خاموشی سے باہر نکل گئے۔

ڈاکٹر اشوک نے لورا کی پٹی کھول کر جائزہ لیا۔ ''آپریشن پر ایک لاکھ بیس ہزار خرچہ ہوگا۔ اگر دو تین دن دیکھ بھال کو یہاں رہنا ہوا تو ڈیڑھ لاکھ لگیں گے۔'' میری طرف مڑتے ہوئے اس نے جذبات سے عاری لہجے میں اعلان کیا۔

میں نے بغیر بحث وتکرار کے رقم نکالی اور ڈیڑھ لاکھ گن کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

رقم گن کر وہ بولا۔ ''آپ باہر چلے جائیں۔''

میں اور سورج سنگھ باہر آ گئے۔ وہ مزاحیہ انداز میں شانے ہلا کر بولا۔ ''ڈاکٹر کے حوالے تو فوراً مطلوبہ رقم کر دی۔ اور مجھے مستقبل پر ٹرخا دیا۔''

میں نے صفائی دی۔ ''میرے پاس اتنی ہی رقم تھی، تمھیں نہ دی کہ ڈاکٹر کے لیے بچا کر رکھی تھی۔ یقیناً ڈاکٹر رقم لیے بغیر علاج پر آمادہ نہ ہوتا۔ اور تم پرسوں دن بارہ بجے اپنی مطلوبہ رقم لے جانا۔''

''مذاق کر رہا تھا یار۔'' وہ مسکراتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ''چلتا ہوں، شاید بیگم صاحب نے گھر سر پر اٹھایا ہو۔ جب تک

پیسے نہیں مل جاتے نوکری تو نہیں چھوڑ سکتا تھا ناں۔'' وہ مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔

آپریشن گھنٹا بھر جاری رہا تھا۔ پھر ڈاکٹر اشوک نے باہر نکل کر مجھے مبارک باد دی۔ میں نے درخواست کی۔ ''ہمیں ایسا کمرہ دیا جائے جہاں پولیس یا ایجنسی کا کوئی فرد نہ پہنچ سکے۔''

وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ ''میرے پاس دو تہہ خانے ہیں۔ آپ سے عام تہہ خانے کا معاوضا لیا ہے۔ اگر مزید احتیاط برتنا چاہتے ہو تو خصوصی تہہ خانے میں منتقل ہو جاؤ، مگر بیس ہزار مزید خرچ ہوں گے۔''

''اگر مطلوبہ فیس کل صبح آپ کے حوالے کروں کوئی مضائقہ تو نہیں۔''

''کل صبح تک انتظار کر لوں گا۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے اپنے رستے ہو لیا۔

میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر یہ احتیاط برتی تھی۔ کیوں کہ ایسے ڈاکٹروں کی خبر ایجنسی والوں کو بھی ہوتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد لورا کو تہہ خانے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ وہ خفیہ کمرہ تھا جہاں ڈاکٹر کی مرضی کے بغیر کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں سیاہ فام شخص بھی ٹانگ پر پلستر چڑھائے لیٹا نظر آیا۔

لورا بے ہوش تھی۔ نرسیں اسے ڈرپ لگا گئی تھیں۔ میں نے ایک نرس کو کچھ رقم دے کر وہیں کھانا منگوا لیا تھا۔ کھانا کھا کر میں صوفے پر لیٹ گیا۔ اٹھنے پر لورا جاگتی نظر آئی۔ خوشگوار تبسم میری جانب اچھال کر وہ دھیرے سے بولی۔

''شکریہ ریچا۔''

شام ہو رہی تھی، میں نے پوچھا۔ ''کچھ کھانے کو دل کر رہا ہے۔''

''جوس پیا ہے، پھل بھی کھائے ہیں۔ البتہ پزا کھانے کا من کر رہا ہے۔''

نرس کو بلا کر میں نے پزا لانے کا کہا۔ اور خود تازہ دم ہونے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

—●—

دیر تک میں لورا سے گپیں ہانکتا رہا۔ رات گہری ہوتے ہی وہاں سے نکل آیا۔ ہنومان نگر جانے کو رکشا مل گیا تھا۔ گو وہاں خطرے کا اندیشہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ایک شب پہلے ہی وہاں واردات ہو چکی تھی۔ البتہ خفیہ اہلکاروں کی موجودی کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم ہنومان نگر سے نکل کر نہرو نگر کی حد میں داخل ہو گئے تھے۔ (سورج سنگھ کے مالک کا مکان نہرو نگر ہی میں تھا)

مجھے آسانی سے مطلوبہ مکان کی چھت اور پانی کے ٹینک تک رسائی مل گئی تھی۔ بیگ نکال کر واپس لانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ مگر جونہی واپس کلینک کے قریب پہنچا پارکنگ میں دو کالی گاڑیوں اور ان کے قریب ٹہلنے والے افراد کو دیکھتے ہی چوکنا ہو گیا تھا۔ ان کے انداز سے واضح تھا کہ وہ کون لوگ تھے۔ ان کا دھیان کلینک کی عمارت کی طرف تھا۔ میرا واپس جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اگر وہ اتفاق سے مڑ کر دیکھ لیتے تو میرا پارکنگ میں آ کر واپس جانا انھیں چونکا سکتا تھا۔

سرعت سے فیصلہ کرتے ہوئے میں نیچے بیٹھا اور ایک کار کی آڑ پکڑ لی۔ میرا دل اندیشوں سے بھر گیا تھا۔ اگر وہ کسی مخبری پر وہاں پہنچے تھے تو ڈاکٹر اشوک سے اگلوانا ان کے لیے مشکل نہ ہوتا۔

میں بیٹھے بیٹھے کونے کی طرف کھسکنے لگا۔ جینز میں اڑسا ہوا پستول میرے ہاتھ میں منتقل ہو گیا تھا۔

راستے کے قریب والی دو تین گاڑیاں چھوڑ کر میں ایک کار کے نیچے گھس گیا۔ اب قریباً میں محفوظ ہو چکا تھا۔ گو پارکنگ میں روشنی تھی، مگر جب تک کار کے قریب پہنچ کر بہ غور جائزہ نہ لیا جاتا میرا نظر آنا ممکن نہ تھا۔ وہاں اوندھے منہ لیٹ کر میں دشمنوں کا جائزہ لینے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ہسپتال سے جس شخصیت کو برآمد ہوتے دیکھا اس نے مجھے چونکا دیا تھا۔ وہ ممتا دیدی تھیں۔ کالے

رنگ کا تھری پیس سوٹ ان پر خوب سجتا تھا۔ وہ دائیں بائیں کا جائزہ لیتے ہوئے تیز قدموں سے چلتے ہوئے قیمتی گاڑی کے پاس پہنچیں۔ ایک شخص نے مؤدبانہ انداز میں کار کا دروازہ کھول دیا۔ ان کے نشست سنبھالتے ہی ڈرائیور نے کار آگے بڑھادی۔ دوسری گاڑی بھی پیچھے بڑھ گئی تھی۔ ان کے ہمراہ لورا کو نہ دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان محسوس ہوا تھا۔ یقیناوہ مشکوک جگہوں کا جائزہ لینے نکلی تھیں۔ لورا کے زخمی ہونے کی خبر یقیناان تک بھی پہنچ گئی تھی۔ اور اس کے بعد ہسپتالوں اور خصوصاً ایسے پرائیویٹ کلینکوں کا جائزہ لینا جن کی شہرت منفی ہو نہایت ضروری تھا۔ یہ خطرہ میرے دماغ میں بھی موجود تھا تبھی تو زیادہ پیسے دے کر خصوصی سے بھی خصوصی کمرہ حاصل کیا تھا۔

پارکنگ خالی ہوتے ہی میں کار کے نیچے سے نکلا، کپڑے جھاڑے، پستول کو قمیص کے نیچے اڑسا اور کلینک کی طرف بڑھ گیا۔

چوکیدار کو پہچان کرا کے اندر داخل ہوا۔ ڈاکٹر اشوک اپنے دفتر میں موجود تھا۔ اس کی اپنی رہائش کلینک سے ملحق ہی تھی۔ اور غالباً اسے نیند سے جگا کر وہاں بلایا گیا تھا۔

میں صورت حال جاننے کو اس کے دفتر کی طرف بڑھ گیا۔ دستک دی اور اجازت ملنے پر اندر داخل ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر برہمی نمودار ہوئی۔

''آپ کو باہر نہیں گھومنا چاہیے۔ چند منٹ پہلے ہی سرکاری اہلکار پوچھ تاچھ، بلکہ تلاشی لے کر گئے ہیں۔''

''میں بقیہ رقم کی ادائی کو حاضر ہوا تھا۔'' میں نے مطلوبہ رقم ان کی طرف بڑھادی۔

پیسے ایسی جادو کی چھڑی ہیں جو اپنی جھلک دکھا کر رویوں کو نرم کرنے کی خصوصیت رکھتے ہیں۔ اس کی درشتی، نرمی میں تبدیل ہوئی۔ ''احتیاط کیا کرو۔ اور کوشش کرو دو دن تک باہر نہ نکلو، آپ کو ہر سہولت وہیں مہیا کر دی جائے گی۔''

''آئندہ احتیاط برتوں گا ڈاکٹر صاحب۔'' ادب سے کہتے ہوئے میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

میرے بیٹھنے سے اس نے اندازہ لگایا۔ ''کوئی کام ہے؟''

میں نے پوچھا۔ ''ہمیں مستقل یہاں رہنے کو کتنا خرچ کرنا پڑے گا۔ میرا مطلب جب تک میری ساتھی اپنے قدموں پر کھڑی نہیں ہو جاتی۔''

اس نے حیرانی بھرے لہجے میں مشورہ دیا۔ ''ہماری مانگ سے کئی گنا کم قیمت خرچ کر کے آپ چھپنے کی عارضی جگہ تلاش کر سکتے ہیں۔''

میں بے نیازی سے بولا۔ ''مشورہ نہیں آپ کی مانگ پوچھی ہے۔''

وہ کندھے اچکاتا ہوا بولا۔ ''روزانہ کے دس ہزار خرچ ہوں گے۔ کھانے پینے کی ضروریات آپ کو اپنے پلے سے پورا کرنا پڑیں گی۔''

میں نے مطلع کیا۔ ''دو دنوں کا معاوضا ادا ہو گیا ہے، اگر مزید رکنا ہوا تو روزانہ کی بنیاد پر پیشگی رقم ادا کر دیا کروں گا۔''

وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ ''خوش آمدید۔''

''اور امید کرتا ہوں، کوئی ایسا ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آئے گا کہ انتظام لینے کو مجھے اپنے چھپے ہوئے دوستوں کو سامنے لانا پڑے۔''

اس کی آنکھوں میں ناپسندیدگی ابھری، مگر بولتے وقت لہجے میں درشتی یا ناگواری شامل نہیں تھی۔ ''آپ کا نام نہیں جانتا اور نہ جاننے کی خواہش ہے۔ البتہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں، دھرم، قومیت، رنگ، نسل، زبان، کردار اور پیشے وغیرہ

کو بالائے طاق رکھ کر مسیحائی کرتا ہوں۔ بلاشبہ میرا معاوضہ زیادہ ہے۔لیکن یہ معاوضہ خصوصی مریضوں سے لیتا ہوں کیوں کہ انھیں چھپانے کے انتظامات وغیرہ بھی مجھے کرنا پڑتے ہیں۔اور یہ بھی یاد رکھنا، جتنا معاوضہ آپ مجھے دے چکے ہیں۔اس سے دگنی رقم سنیتا جیسوال آپ کو پکڑوانے کے دے دیتی۔''

میں نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا۔''کون سنیتا؟''

''ابھی خفیہ ایجنسی کے لوگ سنیتا جیسوال کی سرکردگی میں آپ کی تلاش میں آئے تھے۔انھیں مطمئن کر کے بھیج دیا۔کہ میں راجا ذیشان نامی کسی شخص کو نہیں جانتا۔''

اس کے انداز سے لگا جیسے وہ دیدی کو پہلے سے جانتا ہے تبھی بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔''سنیتا جیسوال آپ کی واقف کار ہیں؟''

اس نے گہرا سانس لیا۔''کبھی تھی۔''

''اگر وضاحت کر دیتے۔''میں نے اشتیاق ظاہر کیا۔

اس کے خشک چہرے پر تبسم ابھرا۔''شاید آپ اسے دیکھ چکے ہیں اور اس کے نمکین وملیح چہرے کی کشش سے خود کو بچا نہیں پائے۔''

بہ مشکل اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے میں نے حقیقت اگلی۔''وہ میری دیدی ہیں۔اور اس میں ذرا بھر شبہ نہیں۔اس لیے دوبارہ ان کے متعلق کچھ بھی بولتے وقت میرے جذبات آپ کے مدنظر رہنے چاہئیں۔اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہوگی۔''

ڈاکٹر اشوک ششدر رہ گیا تھا۔''کچھ سمجھا نہیں۔راکی میجر ایک مسلم کی بہن کیسے ہو سکتی ہے۔''

''لمبی کہانی ہے کبھی فرصت میں سناؤں گا۔البتہ آپ ان کے متعلق کچھ جانتے ہیں تو سن کر مجھے خوشی ہوگی۔''

''کسی بھائی کے سامنے، اس کی بہن سے عشق ومحبت کا اعتراف کرنا یقیناً نامناسب بلکہ بے ہودہ ہے۔تو رہنے ہی دیتے ہیں۔''خشک لہجے میں کہتے ہوئے اس نے کرسی چھوڑی۔''اور میں آرام کرنا چاہوں گا۔''

''شکریہ ڈاکٹر صاحب۔''میں اس کے دفتر سے نکل آیا۔تہہ خانے میں پہنچا تو لورا خواب آور دوا کے زیر اثر نظر آئی۔میں نے ڈیوٹی نرس کے حوالے ایک بڑا نوٹ کر کے چارپائی کا بندوبست کر لیا، کیوں کہ وہاں چند دن رہنے کا سوچ لیا تھا۔ایجنسی والے تفتیش کر کے واپس جا چکے تھے اور وہ کلینک پہلے کی نسبت زیادہ محفوظ ہو گیا تھا۔ڈاکٹر اشوک بھی اصول پرست اور وضع دار شخص لگا تھا۔وہاں لورا کی بھی اچھی دیکھ بھال ہو جاتی اور اس کا زخم ٹھیک ہونے تک ہماری تلاش میں بھی پہلی سی سرگرمی باقی نہ رہتی۔

دو دن بعد سورج سنگھ معاوضا لینے پہنچ گیا تھا۔ میں کلینک سے باہر ہی اس کا منتظر تھا۔

اس نے حیرانی ظاہر کی۔ ''باہر کیوں کھڑے ہو؟''

''کیوں کہ اپنی ساتھی کا علاج ہونے کے بعد کلینک میں رہنا غیر مناسب لگتا ہے۔'' میں نے ذو معنی انداز اپنا کر اسے یہ تاثر دیا گویا ہم کلینک چھوڑ چکے ہیں۔

اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''رقم کا بندوبست ہو گیا؟''

''آؤ میرے ساتھ۔'' میں اسے پارکنگ کے ایک کونے میں لے گیا۔ آڑ میں ہوتے ہی میں نے نوٹوں کا بنڈل اس کی جانب بڑھایا۔ وصول کرتے وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ مسرت بھرے لہجے میں اس نے حقیقت اگلی۔

''یقین نہیں آ رہا، مجھے لگا تھا آپ دھوکا دیں گے۔''

''مسلمان دھوکا نہیں دیتا سردار جی! وعدہ خلافی کرنے والے کو اسلام میں منافق کہا جاتا ہے۔ اور ایسا شخص غیر مسلم سے زیادہ ناپسندیدہ ہوتا ہے۔''

''آپ کا شکریہ کس طرح ادا کر سکتا ہوں۔'' اس کے لہجے میں عزت و احترام در آیا تھا۔

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''ہماری ملاقات کو راز رکھ کر۔''

وہ عزم سے بولا۔ ''سورج سنگھ گردن کٹا دے گا، مگر آپ کا ذکر کسی سے نہیں کرے گا۔''

میں نے اسے جانے کا کہا۔ ''تم پہلے نکلو، ہمارا اکٹھا جانا مناسب نہ ہوگا۔''

الوداعی معانقہ کر کے اس نے میرے گالوں پر عقیدت بھرا بوسا دیا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا رخصت ہو گیا۔ اس کے ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر غائب ہوتے ہی میں واپس چل پڑا۔ لورا بے چینی سے میری منتظر تھی۔ یقیناً میں نے خواہ مخواہ کی مصیبت ہی اپنے سر مول لے لی تھی۔ نجانے میرے التفات اور توجہ کو وہ کیا سمجھتی تھی، مگر میرے دل و دماغ میں اس کے لیے سوائے ہمدردی کے کچھ بھی نہیں تھا۔ البتہ اسے چھوڑ کر جانا اس لیے بہتر نہ سمجھا کہ اس وقت ہماری تلاش عروج پر تھی۔ اور میں جانتا تھا کچھ دنوں زیر زمین رہنا بہتر رہے گا۔ یوں بھی ڈینو کی موت کے بعد مجھے کسی ساتھی کی ضرورت تھی اور مفت میں ایک پیشہ ور سنائپر کا مل جانا نعمت غیر مترقبہ ہی تھا۔ اس بے چاری کو معلوم نہیں تھا کہ شکلا اصل میں میرا ہدف تھا۔ گو اسے غلط فہمی میں رکھنے کا مقصد کسی فائدے کا حصول یا اس کی نظر میں اچھا بننے کی کوشش نہیں تھی۔ میں فقط اپنے مشن کی بھنک اسے نہیں لگنے دینا چاہتا تھا۔ کیوں کہ گرفتار ہونے پر تشدد کا سامنا ہوتے ہی اس نے حقیقت اگل دینا تھی۔ ممکن تھا وہ سخت جانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اذیت جھیل جاتی مگر مجھے کیا ضرورت تھی کہ خطرہ مول لیتا۔ اپنے مشن سے عارضی تعلق دار کو لاعلم رکھنا ہی احتیاط تھی۔

اگلا ہفتہ میں نے تہہ خانے میں بتایا۔ اس دوران لورا کا زخم بہتر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اچھی دوائیوں کے استعمال اور

بہترین دیکھ بھال کی بدولت امید تھی اس نے جلد ہی بستر چھوڑ دینا تھا۔

فلموں، ڈراموں میں گولی لگنے کے دس منٹ بعد ہی ہیرو صاحب بالکل ٹھیک ہو کر دشمنوں کی ٹھکائی کرتا نظر آتا ہے، جبکہ حقائق اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ کوئی بھی زخم ٹھیک ہونے میں وقت لیتا ہے۔ اور ایسی حالت میں ہیرو پن صرف فلموں ہی میں دکھانا ممکن ہے۔

ان دنوں کھلی فراغت تھی۔ میں اور لورا دیر تک گپیں ہانکتے۔ وہ افغانستان کے واقعات کئی بار دہرا چکی تھی۔ اس کا ماننا تھا کہ نک سٹیورٹ مجھ سے بے حد متاثر، بلکہ ڈرا ہوا تھا۔ لورا ابھی مجھ سے سخت نفرت کرتی تھی۔ کیوں کہ میں نے ان کی بادشاہت میں دخیل ہو کر انھیں کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ میرا نا معلوم ہونا انھیں مزید تپا رہا تھا۔ نک اسٹیورٹ مجھے افغانستان یا پاکستان کا باشندہ ماننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا میں کسی ترقی یافتہ ملک کا سنائپر تھا اور معاوضا لے کر مجاہدین کا ساتھ دے رہا تھا۔

ایک دن قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''یاد ہے جب تم نے کوبرا گرایا تھا۔ قسم سے اس دن تم جن بھوت لگے تھے۔ اور پھر ہمارے کئی آدمیوں کو تم نے جس طرح گھیرا تھا، کہ تین چار ہی جان بچا پائے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''تمھیں بھی تو زندہ چھوڑ دیا تھا۔''

وہ خجالت سے بولی۔ ''میں بھی کتنی بے وقوف تھی، تم نے کہا کھڑی ہو جاؤ اور کھڑی ہو گئی۔''

میں نے ناک بھوں چڑھائی۔ ''بے وقوفی کیسی، کیا کھڑا ہونا باعثِ نقصان ہوا تھا۔''

وہ اداسی سے بولی۔ ''سچ تو یہ ہے کہ نک نے کہا تھا کھڑی ہو جاؤ وہ تمھیں گولی نہیں مارے گا..... کیا پتا تھا اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر رہا ہے۔''

''تمھیں پسند تھا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں، ہم شادی کرنے والے تھے۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''تمھاری خوش قسمتی تھی کہ مجھے اپنی پلوشہ کی تلاش میں جانا تھا۔ ورنہ مزید دو تین ماہ وہاں ضرور گزارتا۔ اور دوسری بار موقع ملنے پر میری انگلی لبلبی دباتے ہوئے قطعاً نہ جھجکتی۔''

وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''ریجا! جھوٹ بولنے کی کوئی حد ہوتی ہے۔''

''جھوٹ کیسا۔'' میں سچ مچ حیران رہ گیا تھا۔

''میری تیمارداری میں یوں لگے ہو کہ میرا کوئی سگا بھی اتنی دیکھ بھال نہ کرتا۔''

''کہیں پڑھا تھا کہ عورت دل سے سوچتی ہے۔ اور بلاشبہ اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ بے وقوف! میں تمھاری تیمارداری نہیں کر رہا، خود چھپا ہوا ہوں۔ میں انڈیا کا شہری نہیں ہوں کہ آزادی سے گھوم پھر سکوں۔''

اس نے خفگی بھرے لہجے میں مجھے غلط ثابت کرنا چاہا۔ ''چھپنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ بھاگ جاؤ، میرے انتقام لینے سے تمھیں کیا مطلب۔''

میں ذومعنی لہجے میں بولا۔ ''کیا لگتا ہے، تمھارے انتقام کے لیے وقت ضائع کرتا پھر رہا ہوں۔''

اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ''تو کس لیے کر رہے ہو۔''

میں شرارتی لہجے بولا۔ ''صرف اس امید پر شاید ڈیٹ پر جانے کو تیار ہو جاؤ۔''

''بے ہودہ۔'' اس نے مجھے تکیہ کھینچ مارا۔ اور میں ہنستے ہوئے باہر نکل گیا۔

ساتھ والے کمرے میں ایک سیاہ رو ٹانگ پر پلستر چڑھائے موجود تھا۔ اس کا نام دھرمودا معلوم ہوا تھا۔ گو ایسے

غنڈوں کو پولیس والے نہیں چھیڑتے نہ ایجنسیاں ان سے دشمنی پالتی ہیں۔ مگر ان کی آپس کی دشمنیاں اور جھگڑے کچھ کم تباہ کن نہیں ہوتے۔ میں نے ایک دو بار گپ شپ کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کے اظہار ناگواری اور ناپسندیدگی کو دیکھ کر مجھے پیچھے ہٹنا پڑا۔ بس نرس سے سرسری سا معلوم ہوا تھا کہ وہ ممبئی کا دادا دھرمیش عرف دھرمو تھا۔ اور کسی دوسرے دادا سے جھگڑے کے بعد اس حال کو پہنچا تھا۔ عموماً ایسا بھی ہوتا ہے کہ غنڈوں کے گروہ ایک دوسرے سے یوں برسرپیکار ہوتے ہیں کہ طاقتور گروہ مخالفین کا ایک بندہ بھی باقی نہیں چھوڑتا۔ آپس کی لڑائی میں دھرمو دادا کے گروہ کی اکثریت فنا ہو چکی تھی۔ اور بچنے والے منہ چھپاتے پھر رہے تھے۔ خود دھرمو دادا بھی مرتے مرتے بچا تھا اور اب ڈاکٹر اشوک کے پاس چھپا ہوا تھا۔ ڈاکٹر اشوک میں یہ خوبی دیکھی تھی کہ بات کا کھرا اور وعدے کا پکا تھا۔ دھوکا دہی اور راز فاش کرنے کے سخت خلاف تھا۔

دھرمو دادا کے ساتھ والے کمرے میں ایک لڑکی رچنا کماری ایڈمٹ تھی۔ اس کے پیچھے بھی کوئی بااثر لوگ پڑے تھے۔ بے چاری برے حال میں وہاں تک پہنچی تھی۔ اسے وہاں پہنچانے اور فیس وغیرہ ادا کرنے والا بھی کوئی سیٹھ ہی تھا۔ اصل معاملہ نرس کو بھی معلوم نہ تھا۔ چوتھے کمرے میں ادھیڑ عمر کا ایک شخص دو دن پہلے ہی پہنچا تھا۔ اس کا نام تو آنند پٹیل معلوم ہوا تھا۔ اور اس کی وہاں موجودگی کے بارے بھی نرس کو کوئی اندازہ نہ تھا۔ بہ ظاہر وہ زخمی نہیں تھا۔ مگر مخصوص دوائیاں اسے باقاعدگی سے کھلائی جا رہی تھیں۔

نرس کا نام ریتا کور تھا۔ وہ سکھ تھی۔ کافی باتونی اور خوش مزاج تھی۔ البتہ شکل وصورت بالکل گئی گزری تھی۔ میں اس سے بھی گاہے گاہے گپ شپ کر لیتا۔ رات گئے دو تین دفعہ باہر جا کر کلینک کی مکمل عمارت کا جائزہ بھی لے آیا تھا۔ اور ایسا کیوں کیا تھا، یقیناً اس بارے کئی بار وضاحت کر چکا ہوں کہ جاسوس ہر کمین گاہ میں سب سے پہلے فرار کا رستہ ڈھونڈتا ہے۔

ریتا کے ساتھ تھوڑی دیر گپ شپ کر کے میں واپس لوٹ آیا۔ خود کو چاک وچوبند رکھنے کو میں کمرے کے اندر ہی ڈنڈ پیلتا، اٹھک بیٹھک کرتا اور ایک دو اور ایسی مشق کرتا جس کے لیے بھاگ دوڑ کی ضرورت نہ پڑتی۔

لورا اب غسل خانے و بیت الخلاء تک خود چلی جاتی۔ ابتدائی دو تین دن تک یہ خدمت مجھے ہی سرانجام دینا پڑی تھی۔

کمرے میں ٹی وی لگا ہوا تھا اب ہمارے بارے خال ہی کوئی خبر آتی تھی۔ دو تین دن ہمارا ذکر زور وشور سے ہوتا رہا تھا، نئے مسائل سامنے آتے ہی ہمارا ذکر کم ہونے لگا۔ امید تھی مہینا گزرنے تک ہم عوام کی نظر میں بھولے بسرے ہو جاتے۔ البتہ ایجنسیاں اتنی آسانی سے بھولنے پر تیار نہیں ہوتیں۔

وقت کا اندازہ گھڑی دیکھ کر ہی کرتے تھے۔ عشائیہ (ڈنر) میں نماز عشاء کے بعد ہی کرتا تھا۔ لورا بھی میرا ساتھ دینا پسند کرتی۔ کھانے کے بعد میں تہہ خانے ہی میں تھوڑی چہل قدمی کرتا۔ گاہے گاہے مفلر سے چہرہ ڈھانپ کر باہر بھی نکل جاتا۔ سائیلنسر لگا پستول تو سوتے وقت بھی میرے پاس ہی ہوتا تھا۔

اس دن بھی باہر گھومنے کو دل چاہا اور میں محتاط انداز میں چلتا ہوا تہہ خانے سے باہر آ گیا۔ تہہ خانے کا رستہ دوائیوں کی ایک الماری سے ہو کر گزرتا تھا۔ ڈاکٹر اشوک کے کلینک میں دو تہہ خانے تھے۔ ایک تہہ خانے سے اس کا سارا عملہ واقف تھا جبکہ دوسرے تہہ خانے کے بارے چیدہ چیدہ افراد ہی جانتے تھے۔

میں کلینک کے صحن سے ہو کر عقب میں پہنچا اور سیڑھیوں کے ذریعے چھت پر چڑھ گیا۔ کھلی فضا میں بہت مزا آ رہا تھا۔ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے میں چھت پر گھومتا رہا۔ میں بالکل درمیان میں ٹہل رہا تھا تاکہ دور سے دیکھا نہ جا سکوں۔

اچانک پارکنگ کی طرف سے شور ابھرا۔ میں متجسس ہو کر کنارے کے قریب ہوا۔ کسی مریض کو لانے والے تیز

رفتار رکشے نے نئی ٹویوٹا کار کی عقبی بتی توڑ دی تھی۔ کار کا مالک با آواز بلند رکشے والے کو ڈانٹ رہا تھا۔ رکشے والے کا لجاجت بھرا لہجہ اور منت اس کی نظر میں کسی اہمیت کی حامل نہ تھی۔ بیمار کے لواحقین رکشا ڈرائیور کو آگے بڑھنے کا کہہ رہے تھے۔ رکشے والے کو اپنے مسئلے میں الجھا پا کر ایک مرد نے مریض کو بازوؤں میں بھرا اور کلینک کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مریض دس بارہ سال کا بچہ تھا۔ اور یقیناً بے ہوش تھا کیوں کہ اس کے بازو بے جان انداز میں جھول رہے تھے۔

کار اور رکشے والے کا جھگڑا اتنا اہم نہیں تھا کہ میں مزید وہاں کھڑا رہتا۔ مڑنے ہی لگا تھا کہ نظر پارکنگ میں داخل ہوتی کھلی چھت والی جیپ پر پڑی۔ اس میں تین افراد سوار تھے۔ ٹویوٹا کار نے کلینک تک جانے کا رستہ بند کیا ہوا تھا۔ جیپ ڈرائیور نے تیز ہارن بجایا، کار والا جوشِ تکلم میں جیپ پر دھیان نہیں دے سکا تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر براجمان شخص نیچے اترا اور اس کا تھپڑ ''چٹاخ'' کی آواز کے ساتھ کار والے کی گدی پر لگا تھا۔

وہ غصے میں بکتا جھکتا پیچھے مڑا، مگر جیپ والوں کا حلیہ دیکھتے ہی اس کے غصے کے غبارے سے ہوا نکل گئی تھی۔

نمستے کے انداز میں ہاتھ باندھتے ہوئے اس نے شاید معذرت کہی تھی۔ اور فوراً ہی کار میں بیٹھ کر جیپ کے لیے رستہ خالی کرنے لگا۔ رکشے والے نے موقع غنیمت جانتے ہوئے بھاگنے کی سوچی تھی۔

میری نظریں جیپ والوں پر گڑی تھیں۔ داخلی دروازے سے جیپ اندر کر کے انھوں نے مختصر سے صحن میں روکی اور دندناتے ہوئے بارہ دری میں داخل ہو کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کا انداز خطرے کی نشان دہی کر رہا تھا۔ میں نے پارکنگ اور باہر کی جانب نگاہ دوڑائی مگر ان کا کوئی ساتھی نظر نہ آیا۔

میں بھاگ کر سیڑھیوں کے قریب پہنچا۔ توقع تھی انھوں نے ڈاکٹر اشوک کے دفتر میں جانا تھا۔ سیڑھیاں اتر کر میں محتاط انداز میں چلتا ہوا ڈاکٹر اشوک کے دفتر کی عقبی کھڑکی کے پاس پہنچا۔ وہاں کھیل شروع ہو چکا تھا۔ کھڑکی کے پٹ کھلے تھے۔ اور اس میں باریک جالی لگی ہوئی تھی۔ کمرے میں جاری گفتگو بڑی آسانی سے سنی جا سکتی تھی۔

میرے کانوں میں پہلی آواز ڈاکٹر اشوک کی پڑی تھی۔ ''آپ جائزہ لے سکتے ہیں جناب۔''

''تمھاری سمجھ میں شاید میری بات نہیں آ رہی۔'' کرخت لہجے میں دھمکایا گیا۔

ڈاکٹر اشوک عاجزانہ لہجے میں بولا۔ ''عرض کر چکا ہوں نا، میرے پاس صرف ایک تہہ خانہ ہے۔''

اچانک ''چٹاخ'' کی آواز ابھری، ساتھ ہی زہریلے لہجے میں پوچھا گیا۔ ''کچھ یاد آیا؟''

ڈاکٹر اشوک احتجاجی لہجے میں بولا۔ ''آپ زیادتی کر رہے ہیں۔''

ایک اور آواز ابھری۔ ''باس، اسے گولی مار کر نرگ میں بھیجو..... تہہ خانہ ڈھونڈ لیں گے۔''

''یقیناً آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' ڈاکٹر اشوک انکار پر قائم تھا۔ تب مجھے اس کی جرأت پر حیرانی ہوئی تھی۔ ہتھیاروں کے سامنے انکار پر ڈٹنا خاصا دشوار ہوتا ہے۔ اور دو نمبر کاموں میں ملوث افراد تو ہلکا سے فائدہ پا کر بھی راز اگل دیتے ہیں اور وہ راز رکھنے کو جان دینے پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ ایسے بندے ضائع ہونے کے لیے نہیں ہوتے۔ میں اس کی مدد کو ذہنی طور پر تیار ہو گیا تھا۔ البتہ حملہ آوروں کی پہچان مجھے نہیں ہو رہی تھی کہ وہ کون تھے اور کسے ڈھونڈ رہے تھے۔ آیا ان کا مسلح نظر میں اور لوراتھے یا کوئی اور تھا۔

سرغنہ مکروہ انداز میں بولا۔ ''درشن! تم ڈاکٹر کے بیٹے اور بیوی کو لے آؤ تاکہ اس کی یادداشت بہتر بنائی جا سکے۔''

''آپ ایسا نہیں کر سکتے میں.....'' ڈاکٹر نے احتجاج کرنا چاہا تھا۔ اچانک ''چٹاخ ... چٹاخ'' کی بلند آوازیں ابھریں۔ ساتھ ہی سرغنہ پھنکارا۔

''ہم کیا کر سکتے ہیں یہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہمارا روزمرہ کا کام قتل و غارت ہے۔ اور یقیناً باقی سارے جرم قتل

سے کم درجہ ہوتے ہیں۔''

''وعدہ کریں میرے دوسرے مریضوں کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔''

سرغنہ اطمینان سے بولا۔

''تمھارے بیوی اور بچے کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔''

ڈاکٹر لجاجت سے بولا۔''میں نے آج تک کسی کا راز فاش نہیں کیا۔ میری نظر میں یہاں آنے والے مجرم و بے گناہ ایک برابر ہوتے ہیں۔ پلیز مجھے اپنی نظروں میں گرنے سے بچالو۔ اگر تمھیں یقین ہے تمھارا دشمن یہاں چھپا ہے تو اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرو یہاں چند دن سے زیادہ کوئی نہیں ٹھہرتا۔''

سرغنہ دھاڑا۔''الو کے پٹھے، کیوں اپنی بیوی کی عزت اور بیٹے کی جان کے دشمن بن رہے ہو۔ بھاڑ میں گئے تمھارے اخلاقیات۔ چلو ہمیں رستہ دکھاؤ۔''اس نے شاید ڈاکٹر کو دروازے کی طرف دھکا دیا تھا۔

میں بھاگتے ہوئے سامنے پہنچا۔ بارہ دری سے گزر کر راہداری میں گھسا۔ لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ ڈاکٹر اشوک مضمحل انداز میں تہہ خانے کی طرف جارہا تھا۔ تینوں غنڈے اس کے عقب میں چل رہے تھے۔ کسی بھی ذی شعور کو اندازہ لگانا مشکل نہ ہوتا کہ ڈاکٹر ان کے تینوں کے نرغے میں تھا۔ البتہ ہسپتال وغیرہ میں پریشان لوگوں ہی کی آمد رہتی ہے۔ بے چاروں کو اپنے مریض کے بارے اتنی تشویش ہوتی ہے کہ کسی اور کے مسئلے پر توجہ ہی نہیں دے سکتے۔

میں لاابالی انداز میں ان کے پیچھے چل پڑا۔ راہداری کمروں کے اختتام پر بائیں جانب مڑ رہی تھی۔ اور مڑنے کے بعد دو کمرے چھوڑ کر سب سے آخر والا کمرہ جس کا دروازہ راہداری کے بالمقابل بنا تھا دوائیوں کا اسٹور تھا۔ وہیں ایک الماری اس مہارت سے دروازے میں ڈھالی گئی تھی کہ وہ بہ ظاہر صرف دوائیوں کی الماری نظر آتی۔ اس میں مختلف دوائیں بھری ہوئی تھیں، مگر جونہی ایک خفیہ ہینڈل دبا کر الماری کو دھکیلا جاتا، پوری الماری گھوم جاتی اور نیچے جاتی سیڑھیاں نظر آنے لگتیں۔

ان کے غائب ہوتے ہی میں اسٹور روم میں گھسا۔ الماری کو انھوں نے کھلا چھوڑ کر میرا کام آسان کر دیا تھا، ورنہ دوبارہ الماری کھلنے پر وہ چوکنا ہو جاتے۔ اب تو رستہ صاف تھا۔

میں نے محتاط انداز میں اندر جھانکا۔ ایک آدمی نے ریتا کور کے سر میں پستول کا دستہ رسید کیا تھا۔ وہ بے چاری، میز پر ہی اوندھے منہ لمبی پڑ گئی تھی۔ دو آدمی ڈاکٹر اشوک کے ہمراہ دھرمو دادا کے کمرے میں گھس گئے تھے، جبکہ ایک باہر رک گیا تھا۔ اس کی توجہ ہمارے کمرے کے دروازے کی طرف تھی۔ پھر میں نے اس کے قدم اس طرف بڑھتے دیکھے، تبھی اندر داخل ہوتے ہوئے میں نے سائیلنسر لگا گلاک سیدھا کیا۔ ہلکی سی ''ٹھک'' ابھری۔ گولی اس کی کھوپڑی کے عقب میں گھس گئی تھی۔ اگر رائفل کی گولی ہوتی تو یقیناً ماتھا پھاڑ کر نکل جاتی، مگر پستول کی گولی میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ اتنے فاصلے سے سر میں سوراخ کر کے باہر نکل جائے۔

وہ اوندھے منہ گرا، پختہ فرش پر اس کے گرنے اور پستول کے فرش سے ٹکرانے کی اچھی خاصی آواز ابھری تھی۔

سرغنہ نے پکارا۔''اوئے فضول قتل نہ کرو۔'' مگر جسے پکارا گیا تھا وہ بے چارہ خود مقتول بن چکا تھا تو کیا جواب دیتا۔

میں سرعت سے سیڑھیاں اترا اور دروازے کے قریب ہو گیا۔ ان کی باہمی گفتگو سے اصل معاملہ معلوم ہو سکتا تھا۔ ساتھی کی خاموشی پر سرغنہ نے جواب کا اصرار نہیں کیا تھا۔ وہ دھرمو دادا سے مکالمہ بازی میں مصروف تھا۔

''چچ..... چچ..... بے چارے دھرمو دادا کی تو کوئی حالت ہی نہیں رہی۔ افسوس ہوا لنگڑے دادا کو دیکھ کر۔''

دھرمو بولا۔''گھنشام! ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تمھیں صرف معاوضے سے غرض ہونا چاہیے۔ اور میں تمھیں منہ

مانگی رقم دوں گا۔''

گھنشام کا بلند بانگ قہقہہ ابھرا۔''تمھیں جرم کی دنیا کا قانون تو معلوم ہوگا۔ کہ کامیاب بے ایمانی کے لیے ایمان داری شرط ہے۔''

دھرمو نے احسان جتایا۔''میں نے ایک بار تمھاری جان بچائی تھی۔''

''بچائی نہیں بخشی تھی۔ اور میں بھی تمھیں قتل نہیں کروں گا۔ زندہ ہی راجپوت دادا کے حوالے کروں گا۔'' یہ کہتے ہوئے گھنشام نے قہقہہ لگایا۔''یوں بھی زندہ پکڑنے کا معاوضا تمھیں قتل کرنے سے دگنا ہے۔''

دھرمو نے لالچ دینا جاری رکھا۔''اگر دگنے کو میں مزید دگنا کرنا چاہوں تو.....؟''

''بتا تو دیا ہے۔'' گھنشام انکار پر ڈٹا رہا۔

دھرمو نے پوچھا۔''کیا راجپوت کو معلوم ہے تم نے مجھے ڈھونڈ لیا ہے؟''

گھنشام ہنسا۔''یہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔''

دھرمو نے پیش کش کی۔''اگر اسے نہیں پتا تو تم منہ مانگا معاوضا لے کر مجھے ایک دن کی مہلت دے سکتے ہو۔ اس کے بعد دوبارہ میری تلاش میں لگ جانا۔''

''ہا.....ہا.....ہا۔'' گھنشام کا قہقہہ بلند ہوا۔''چند ٹکوں کی خاطر اپنی کارکردگی کو سوالیہ نشان بنا دوں۔''

دھرمو نے لالچ دیا۔''تمھیں اپنا دست راست بنا دوں گا۔''

گھنشام استہزائی انداز میں بولا۔''تمھارے گروہ کے بچ جانے والے افراد ایسے کونوں کھدروں میں جا چھپے ہیں کہ انھیں اکٹھا کرنے کو سالوں لگ جائیں گے۔''

دھرمو مایوسی سے بولا۔''تو تم نے فیصلہ کر لیا ہے۔''

''درشن آ جاؤ۔ اسے چلنے کو دو بیساکھیاں چاہئیں ہوں گی۔'' گھنشام نے اپنے ہلاک ہونے والے ساتھی کو آواز دی جو جواب دینے سے بہت دور جا چکا تھا۔

''دیکھو کنجر کہاں منہ مار رہا ہے۔'' گھنشام نے دوسرے آدمی کو حکم دیا۔ میں نے فوراً اپنی پیٹھ دیوار سے جوڑ دی تھی۔

''درشن.....'' دروازے سے نکلتے وقت اس کے ساتھی نے آواز دی۔ درشن کی لاش ہمارے کمرے کے سامنے پڑی تھی۔ قدم باہر رکھتے ہی اسے لاش نظر آ گئی تھی۔ مگر اسے سنبھلنے یا گھنشام کو آگاہ کرنے مہلت میں نہیں دے سکتا تھا۔ لبلبی دبا کر میں نتیجہ دیکھے بغیر بگولے کی طرح کمرے میں گھسا۔ ڈاکٹر اشوک دھرمو دادا کے سرہانے سے دو قدم ہٹ کر کھڑا تھا۔ گھنشام پائینتی کے قریب کھڑا تھا۔ پستول ہاتھ میں تھا جو اس نے بے پرواہی سے پکڑا ہوا تھا۔ میری آمد کو اس نے اپنے ساتھیوں کی آمد پر محمول جانا تھا۔ مگر فطرتی تجسس نے اسے دروازے کی جانب دیکھنے کی ترغیب دی۔ اور مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ حیرانی و درشتی بھرے انداز میں بولا۔

''کون ہو تم؟'' ساتھ ہی اس نے پستول سیدھا کرنے کی کوشش کی تھی۔

اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی میں لبلبی دبا چکا تھا۔''ٹھک'' کی آواز کے ساتھ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

گولی نے شاید اس کی انگلی زخمی کی تھی کہ.....''سی.....'' کرتے ہوئے اس نے ہاتھ بغل میں دبا لیا تھا۔

میں نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔''کیا گپ شپ ہو رہی تھی۔''

''کتے کے.....'' گھنشام کے ہونٹوں سے مغلظات کا طوفان ابل پڑا تھا۔''تم نہیں جانتے تمھارا انجام کتنا بھیانک ہوگا۔

''اچھا ...'' کہتے ہوئے میں دوبارہ لبلبی دبائی۔ گولی اس کے گھٹنے سے آر پار ہوگئی تھی۔ چیخ مارتے ہوئے وہ کولہوں کے بل گرا۔ کرسی سنبھالتے ہوئے میں اطمینان سے بولا ''تم کچھ انکشاف کررہے تھے گھشنام جی۔'' ساتھ ہی ڈاکٹر اشوک کو کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! پلیز آپ تشریف رکھیں۔''

ڈاکٹر اشوک خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا جلدی سے بیٹھ گیا۔

''کک..... کون ہو تم اور کیوں کررہے ہو ایسا۔'' دوسری گولی نے اسے میرے ارادوں کی خبر دے دی تھی۔ اور موت کو سامنے پاکر اچھے اچھوں کی ہوا نکل جاتی ہے۔ اسے بھی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

''جلدی کاہے کی ہے، پہلے تم اچھے سے بھونک لو، پھر اپنے کتوں کو آواز دو تاکہ ایک معذور کو گھسیٹتے ہوئے تیرے باپ راجپوت تک لے جائیں، بعد میں سوال جواب ہو جائیں گے۔''

گھٹنے کو دبا کر وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔'' ڈاکٹر اشوک نے مضطرب ہو کر اٹھنے کی کوشش کی۔ یقیناً ایک ڈاکٹر مریض دیکھ کر نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔ میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور طنزیہ انداز میں گھشنام سے پوچھا۔ ''دھرمودادا کی تم سے کیا دشمنی تھی؟''

وہ فوراً صلح صفائی پر آ گیا۔ ''ٹھیک ہے جھگڑا ختم کرتے ہیں، میں دھرمودادا کو کچھ نہیں کہتا اور ہم خاموشی سے واپس چلے جاتے ہیں۔''

''جانے کی اجازت ملنے پر بھی تم اکیلے ہی واپس جا سکتے ہو، کیوں کہ تمھارے ساتھی اس سہولت سے فائدہ اٹھانے کی حالت میں نہیں رہے۔'' ایک چھوٹا سا وقفہ دے کر میں متبسم ہوا۔ ''خیر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں میں کون سا جانے کی اجازت دے رہا ہوں جو ساتھیوں کے بچھڑنے پر تمھیں دکھ ہوگا۔''

''تت..... تم نے انھیں مار دیا۔'' غم و غصے کی شدت سے اسے بولا نہیں گیا تھا۔

میں اطمینان سے بولا۔ ''اگر جلد ہی مرہم پٹی نہ کی گئی تو تم بھی ان کے پاس پہنچ جاؤ گے۔''

''سر پلیز مجھے اجازت دیں۔'' ڈاکٹر اشوک ملتجی ہوا۔

میں نے گھشنام کا ماضی قریب کا رویہ یاد دلایا۔ ''ڈاکٹر صاحب! یہ وہی کمینہ ہے جس نے آپ کے چہرے پر تھپڑ مارے تھے۔''

ڈاکٹر مصر ہوا۔ ''وہ اس کا ظرف تھا۔''

میں نے کندھے اچکائے۔ ''آپ کی مرضی۔''

ڈاکٹر اشوک مرہم پٹی کا سامان لانے باہر نکل گیا۔ دھرمودادا خاموش لیٹا میری جانب متوجہ تھا۔ اس نے دو تین بار میری پیش قدمی کو رکھائی و درشتی سے ٹھکرا دیا تھا اور اب اتنے مشکل مرحلہ میں اس کی جان بچانے کا باعث بنا تھا۔ اس کا شرمندگی محسوس کرنا بنتا تھا۔

میں گھشنام کو مخاطب ہوا۔ ''ڈاکٹر اشوک کا سراغ تمھارے ہاتھ کہاں سے لگا؟''

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''دھرمودادا کا ایک آدمی ہاتھ چڑھ گیا تھا۔ جو اسے کلینک تک لایا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمھارا یہاں آنا کسی کے علم میں ہے؟''

وہ گھگھیاتے ہوئے بولا۔ ''میری آپ سے کوئی دشمنی نہیں ہے، وعدہ کرتا ہوں کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔'' تم تمھار کہنا اسے بھول گیا تھا۔

میں مسکرایا۔ ''دھرمودادا سے کیا دشمنی تھی۔'' اسی وقت ڈاکٹر اشوک مرہم پٹی کے سامان کے ساتھ اندر آیا اور فرش پر

بیٹھ کر اس کی زخمی ٹانگ کی پتلون کاٹنے لگا۔

''ڈاکٹر پندرہ بیس منٹ میں تمھارے گھٹنے کی مرہم پٹی کرے گا اور میں ایک سیکنڈ میں دوسرے گھٹنے میں بھی سوراخ کردوں گا۔ اس لیے جو پوچھا ہے اس کا جواب اگلو۔ اور فکر نہ کرو میرے پاس تصدیق کے ذرائع موجود ہیں۔ راجپوت دادا کے چھوٹے بھائی وشال گپتا سے میری گہری واقفیت ہے۔''

یہ سن کر دھرمو دادا کی آنکھوں میں اضطراب جھلکنے لگا تھا۔ میں اسے مخاطب ہوا۔ ''دھرمو دادا! فکر نہ کرو۔ تمھیں ان کے حوالے کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

اس نے حقیقت اگلی۔ ''میں راجپوت دادا کو ''سرپرائز'' دینا چاہتا تھا۔''

میں اشوک کو مخاطب ہوا۔ ''ڈاکٹر صاحب! بات سنیں۔'' وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ ''پیچھے ہو جائیں، یہ مرہم پٹی کسی کام نہیں آنے والی۔''

''کیا مطلب؟'' وہ حیران ہو گیا تھا۔

میں نے لبلبی دبا کر گھشنام کے سر میں گولی اتاری۔ ''میرا مطلب ہے، ایک کرائے کے قاتل کو زندہ چھوڑ کر میں آپ کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔''

پاؤں فرش پر پسارتے ہوئے ڈاکٹر اشوک نے بیڈ سے ٹیک لگائی تھی۔ ''یہ بہتر نہیں ہوا۔''

''اگر سوچتے ہو کہ دھرمو کے قتل کے بعد یہ آپ کو زندہ چھوڑ دیتا تو ایسا بس آپ ہی سوچ سکتے ہیں۔''

وہ بے بسی سے بولا۔ ''ان لاشوں کا کیا کروں؟''

میں اطمینان سے بولا۔ ''ایمبولینس میں ڈال کر کسی ویران جگہ پر پھینک دیتے ہیں۔''

اس نے تجویز دی۔ ''اگر پولیس کو بلا لیں۔''

میں ہنسا۔ ''اپنی چھترول کرانے کا شوق ہے تو منع نہیں کروں گا۔''

ڈاکٹر نے تکرار کی۔ ''کیا وہ نہیں جانتے ہوں گے گھشنام کرائے کا قاتل ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''ان کے قتل کا ذمہ دار کسے ٹھہراؤ گے، ان کی آمد کس سلسلے میں ہوئی، کیا بتاؤ گے۔''

''ایمبولینس کے ڈرائیور کو رازدار بنانا بھی مناسب نہ ہوگا۔'' ڈاکٹر اشوک کا دماغ چلنا شروع ہو گیا تھا۔

''میں ایمبولینس کو لے جاؤں گا۔ البتہ تم اس کی پٹی کھول لو، کیوں کہ میں نہیں چاہتا۔ ڈاکٹر شک کی زد میں آئیں۔ گو ممبئی میں سیکڑوں، ہزاروں ڈاکٹر ہوں گے مگر اندازہ کرنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ شاید کسی کو آپ کے پٹی لپیٹنے کے انداز، گانٹھ لگانے کے طریقے، پٹی کی ساخت، زخم پر لگانے کے مرہم وغیرہ سے آپ تک پہنچنے کا سراغ مل جائے۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے گھٹنے سے پٹی کھولنے لگا۔

دھرمو مجھے مخاطب ہوا۔ ''آپ کا نام نہیں جانتا، مگر دھنے واد آپ کی وجہ سے میری جان بچی۔''

میں نے بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے پوچھا۔ ''راجپوت دادا کے ساتھ تمھاری کیا دشمنی ہے؟''

وہ نفرت سے بولا۔ ''وہ دادا نہیں سرکار کا پٹھو ہے۔ ایجنسیوں کے سر پر بدمعاشی کرتا ہے۔ را کے بڑے بڑے آفسروں سے دوستی گانٹھ رکھی ہے۔ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ ایک گھٹیا مخبر سے زیادہ حیثیت نہیں ہے اس کی۔''

میں نے پوچھا۔ ''سنا ہے تمھارے گروہ کا صفایا کر چکا ہے۔''

وہ دعوے سے بولا۔ ''ایسا بس وہ سوچتا ہے۔''

''حقیقت کیا ہے؟''

''کرائے کے قاتلوں کے سہارے وہ ڈھونڈ رہا ہے۔ اگر اتنا ہی ہمت والا تھا تو یوں نہ کرتا۔''

میں نے پہلا سوال دہرایا۔ ''دشمنی کی وجہ پوچھی تھی۔''

وہ تفصیل بتانے لگا۔ ''اس کے آدمی میرے علاقے میں ناجائز تصرف کر رہے تھے۔ متوجہ کرنے پر وہ دھمکیاں دینے لگا۔ ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہنی تھیں، کہ چپکے بیٹھے رہتے۔ سختی سے متنبہ کر دیا کہ ان کے دوبارہ ایسا کرنے پر ہم بندوبستی کارروائی کریں گے۔ اور اس گھٹیا شخص نے اچانک ہی میرے اڈوں پر ہلہ بول دیا۔ پولیس اور ایجنسیوں کی مدد بھی اسے حاصل تھی۔ سنبھلنے سے پہلے میرا ناقابل تلافی نقصان ہو چکا تھا۔ میری ذاتی رہائش پر اس نے بم بلاسٹ کروایا۔ میں براہ راست دھماکے کی زد میں تو نہیں آیا، البتہ لوہے کا مضبوط دروازہ ٹانگ پر گرنے سے پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ایک ساتھی ہمت کر کے یہاں پہنچا گیا۔ دو ماہ ہو گئے ہیں کہ یہاں چھپا ہوں۔ بھگوان کی کرپا سے ہڈی جڑ گئی ہے۔ مگر پلستر اترنے میں ابھی چند دن لگیں گے۔''

ڈاکٹر اشوک اپنا کام کر کے میرا منتظر کھڑا تھا۔

میں نشست چھوڑتا ہوا بولا۔ ''میں لاشوں کو ٹھکانے لگا دوں پھر گپ شپ کریں گے۔''

دھرمو نے خوش دلی سے سر ہلا دیا تھا۔

گھشنام کا پستول میں نے دھرمو کی طرف اچھالا۔ ''اپنے پاس رکھو کام آئے گا۔''

''دھنے واد۔'' پستول پکڑتے ہوئے اس نے شکریہ کہا۔ گھشنام کی جیبوں کی تلاشی لے کر میں نے نقدی اپنی جیبوں میں منتقل کی اس کا موبائل فون بھی بند کر کے جیب میں ڈالا اور اس کی لاش اٹھا کر چل پڑا۔

چند منٹ لگا کر میں نے تینوں لاشوں کو اسٹور روم میں لے گیا۔ اور پھر باری باری پہیوں والے اسٹریچر پر لاد کر ایمبولینس میں منتقل کر دیا۔

ڈرائیور آرام کر رہا تھا۔ ڈاکٹر سے ڈپلی کیٹ چابی لے کر میں ایمبولینس باہر لے آیا۔ گھنٹے ڈیڑھ بعد ایک ویران سڑک پر لاشیں پھینک کر میں واپس لوٹ آیا تھا۔ اس دوران ڈاکٹر اشوک نے نرس کو ہوش میں لا کر تہہ خانے سے خون وغیرہ کے نشانات صاف کرا دیے تھے۔

ڈاکٹر اشوک کو رازداری کی تاکید کر کے میں نے آرام کرنے کا مشورہ دیا اور خود دھرمو دادا سے گپ شپ کرنے لگا۔ کہتے ہیں ہاتھی زندہ لاکھ اور مر کر سوا لاکھ کا ہو جاتا ہے۔ دھرمو پر بھی یہ مثل صادق آتی تھی۔ اس لحاظ سے کہ انتقام کے جوش میں اب کسی ضابطے کو خاطر میں نہ لاتا۔ راجپوت کے ساتھ سرکاری ادارے بھی اس کے دشمن تھے اور دشمنوں کے دشمن دوست ہوا کرتے ہیں۔

صبح کی اذان تک میں اس سے گپ شپ کرتا رہا۔ اور پھر اجازت لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ لورا سکون آور دوا کے زیر اثر سوئی تھی۔ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ کتنی بڑی واردات گزر چکی تھی۔ بعض اوقات بے خبری بھی بہت بڑی نعمت ثابت ہوتی ہے۔

میں نماز فجر پڑھ کر سو گیا۔ البتہ لورا کے لیے تپائی پر پیغام چھوڑ دیا تھا کہ مجھے نہ جگائے۔ ورنہ تو اس نے اٹھ کر سب سے پہلے مجھے آواز دینا ہوتی تھی۔ اور ہوا بھی یہی..... اس کے ''ریجا..... ریجا۔'' پکارنے پر میری آنکھ کھلی۔ بہ مشکل گھنٹا ہی سویا تھا کہ کم بخت نے جگا دیا۔

''بندہ اٹھ کر پہلے دائیں بائیں بھی دیکھ لیتا ہے۔'' اسے تپائی پر رکھی چھت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے میں نے ناک بھوں چڑھائی۔

''کیا ہے یہ۔'' اوپر کھسک کر اس نے بیڈ کی ٹیک سے پیٹھ جوڑی اور چٹ کے مندرجات پر نگاہیں دوڑانے لگی۔ پڑھ کر چٹ کو کچرہ دان میں پھینکا اور اطمینان سے بولی۔

''تو ساری رات جاگنا تمھارا مسئلہ ہے۔ مجھے کیوں کوس رہے ہو۔''

میں منہ بگاڑ کر بولا۔ ''میں نے اٹھ کر تمھیں ''سُوسُو'' کرانا ہوتا ہے یا اپنے ہاتھوں سے ناشتا کراتا ہوں جو جاگتے ہی ریجا..... ریجا پکارنا شروع کر دیتی ہو۔''

میرے واویلے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے بے پروائی سے پوچھا۔ ''سوئے کیوں نہیں۔''

''فی الحال سونے دو اٹھ کر بتا دوں گا۔'' سونے کی لالچ میں مجھے تکرار کرنا مناسب نہ لگا۔

اس نے منہ بنایا۔ ''کیا لگتا ہے، ایک عورت اتنا طویل وقت تجسس میں مبتلا رہ کر گزار لے گی۔''

میں جان چھڑاتے ہوئے بولا۔ ''رات دشمنوں نے حملہ کیا تھا، تین آدمیوں کو ہلاک کر کے ٹھکانے لگایا ہے۔ اور فی الحال خطرے کی بات نہیں۔ باقی اٹھنے پر بتاؤں گا۔''

وہ بے چینی سے بولی۔ ''ریجا شرافت سے تفصیل بتاؤ، ورنہ سونے تو نہیں دوں گی۔''

ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے میں اٹھ بیٹھا۔ اسے تفصیل بتا کر تکیے پر سر ٹیکتے ہوئے بولا۔ ''اب آواز دی تو ٹینٹوا دبا دوں گا۔''

اس نے شرارتی انداز میں قہقہہ لگایا۔ ''پھر ڈیٹ پر کس کے ساتھ جاؤ گے۔''

مگر مجھے اتنی سخت نیند آئی تھی کہ ہنسی مذاق زہر لگ رہا تھا۔ وہ بھی میری جان بخشی کرتے ہوئے تازہ دم ہونے غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔

—●—

اگلے دو ہفتے سکون سے گزرے تھے۔ گھشنام کی موت کی خبر ہم نے ٹی وی پر سنی تھی، مگر دلچسپ بات یہ ہوئی کہ ان کا قتل پولیس کے کھاتے میں ڈالا گیا تھا۔ متعلقہ تھانے دار نے سخت مقابلے کے بعد کرائے کے ان قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچا کر انعام کا حق دار ٹھہرا تھا۔ میں اس کے بعد کافی چوکس رہا اور رات کا ابتدائی حصہ عموماً کلینک کی چھت پر گزارتا۔ دھرمو دادا میرا شکر گزار و احسان مند تھا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ کر بھی کافی گپ شپ کرتا رہتا۔ لورا کی کہانی میں نے اسے بتا دی تھی، البتہ اپنے مشن کی بھنک نہیں لگنے دی تھی۔ میں نے دھیرندر شکلا سے دشمنی کی وجہ لورا براؤن بتائی تھی۔ یوں بھی لورا براؤن کی صورت ایسی تھی کہ اس کی وجہ سے کسی سے دشمنی رکھنے کی بات پر سننے والے کو تعجب نہیں ہو سکتا تھا۔

دو ہفتے بعد دھرمو کا پلستر اتر گیا تھا۔ مسلسل اڑھائی تین ماہ اس نے بیڈ پر گزارے تھے۔ وہاں چھپنے کا اس نے بھاری معاوضا ڈاکٹر اشوک کو ادا کیا تھا۔ مہینے سے زیادہ عرصہ تو ہمیں بھی ہونے والا تھا۔ اور روزانہ کے دس ہزار کے حساب سے اچھی خاصی رقم بنتی تھی جو ہم ڈاکٹر اشوک کو ادا کر چکے تھے۔ وشال گپتا سے لیے بیس لاکھ نے ہماری مشکلات آسان کر دی تھیں۔ لورا کا زخم بھر گیا تھا۔ بس ذرا سی کمزوری تھی جو بتدریج ختم ہو جاتی۔

پلستر اتر جانے کے بعد بھی دھرمو دادا نے ایک دو دن وہیں گزارے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے بھی اس سے دوستی کر لی تھی، کیوں کہ وہاں ایسے مددگاروں کی سخت ضرورت تھی۔ آخر ایک دن ہم جانے کو تیار تھے۔ ڈاکٹر اشوک سے الوداعی ملاقات کر کے اس کا شکریہ ادا کیا اور رات کے آخری پہر وہاں سے نکل آئے۔ ہمیں لینے کو دھرمو دادا کے بچپن کا دوست گاڑی لے آیا تھا۔ دھرمو کے تمام آدمی اس کے زخمی ہونے کے بعد بکھر گئے تھے۔ ہر ایک نے جان بچانے کو چھپنا بہتر

سمجھا تھا۔ دھرمو دادا نے بھی اسی لیے ڈاکٹر اشوک کا کلینک نہیں چھوڑا تھا کہ وہاں وہ زیادہ محفوظ تھا اور کسی کا اس جگہ گمان نہیں جا سکتا تھا۔ رہا گھشنام تو وہ اتفاقاً دھرمو دادا کے اس کارندے سے جا ٹکرایا تھا جو اسے وہاں چھوڑ گیا تھا۔

امید تھی اب ان کی تلاش میں پہلی سی سرگرمی نہیں ہوتی تھی۔ گورا چپوت، دھرمو کی تلاش سے بالکل تو غافل نہیں ہو سکتا تھا، مگر پہلے والی بات نہیں رہی تھی۔ البتہ کرائے کے قاتلوں کا خطرہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اپنی تلاش کے بارے بھی ہمارا اندازہ یہی تھا کہ اب پہلے والی بات نہیں رہی ہوگی۔

دھرمو کے دوست کا نام وشواس سنگھ تھا۔ اس کی حویلی ممبئی کے مضافات میں تھی۔ طلوع آفتاب ہمیں راستے ہی میں ہو گیا تھا۔

اگلا دن ہم نے سو کر گزارا۔ دھرمو جاتے ساتھ اپنے کارندوں سے رابطے میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس کا ارادہ راجپوت پرہلہ بولنے کا تھا۔ اس کے کافی کارندے ہلاک ہو چکے تھے۔ کچھ حوالات میں تھے۔ اور جو کونوں کھدروں میں چھپے تھے انھیں جوں جوں اطلاع ملتی گئی، ان کی آمد شروع ہو گئی۔ دھرمو ممبئی کا مشہور دادا تھا۔ اس گئی گزری حالت میں بھی بیس پچیس آدمی اکٹھے ہو گئے تھے۔ وشواس سنگھ کی حویلی کافی وسیع تھی۔ دھرمو دادا نے اپنا اڈہ عارضی طور پر وہیں قائم کر دیا تھا۔ شام ڈھلے دھرمو دادا نے اپنے آدمیوں کے ہمراہ تھانے پر دھاوا بولنے کی منصوبہ بندی میں مصروف تھا۔ وہاں ہماری حیثیت مہمان کی سی تھی۔ ہم سے کسی نے مشورہ بھی نہیں مانگا تھا۔ اس کے باوجود میں نے دھرمو دادا کو اپنے پاس بلا کر اکیلے میں کہا۔

''گو تم اپنا کام بہت اچھی طرح جانتے ہو۔ اگر برا نہ مناؤ تو ایک مشورہ دینا چاہوں گا۔''

وہ خوش دلی سے بولا۔ ''تمہید چھوڑ یار! تم براہ راست حکم کیا کرو۔''

میں انکساری سے بولا۔ ''شکریہ دادا، تمھارا بڑا پن ہے۔ بہ ہر حال پوچھنا یہ تھا کہ اپنے ساتھیوں کو آزاد کرانے کے بعد تمھارا کیا ارادہ ہے؟''

اس نے ارادہ ظاہر کیا۔ ''راجپوت کو انجام تک پہنچانا ہی فی الحال میری زندگی کا مقصد ہے۔''

میں متبسم ہوا۔ ''جانتا تھا، کچھ ایسا ہی ارادہ ہوگا۔''

''شاید تم کوئی مشورہ دینا چاہتے ہو۔'' اس کا انداز استفسار کا عنصر لیے ہوئے تھا۔

میں نے تجویز پیش کی۔ ''تم آسانی سے اپنے ساتھیوں کو حوالات سے آزاد کرا لو گے، مگر اس کا نقصان یہ ہوگا کہ راجپوت کو چوکس ہونے کا موقع مل جائے گا۔ اگر پہلے راجپوت پرہلہ بول سکو تو بے خبری میں اسے قابو کرنا آسان ہوگا۔''

اس کی آنکھوں میں تیز چمک ابھری۔ ''بڑا سیانا ہے رے.....''

''میرا کام مشورہ دینا تھا۔'' آگے تمھاری مرضی۔''

وہ میری پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا۔ ''اتنا بہترین مشورہ کوئی احمق ہی ٹھکرائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''تو لگے ہاتھوں ایک پیش کش بھی سن لو، راجپوت کو پکڑنے میں ہم تمھاری مدد کریں گے۔ تم بس اس کی روزمرہ معلوم کرو۔ خاص کر یہ کہ وہ گھر سے نکلتے اور لوٹتے وقت کون سی سڑک استعمال کرتا ہے۔''

''اب دھرمو دادا ایک چھوکری کی مدد سے راجپوت پر قابو پائے گا۔'' شاید چھوکری کے ساتھ اس نے دل میں چھوکرا بھی بولا ہو، مگر بہ ظاہر میرا ذکر اس نے حذف کر دیا تھا۔

میں معترض ہوا۔ ''وہ چھوکری نہیں برطانوی فوج کی کیپٹن رہ چکی ہے۔''

''عہدے کی بڑائی سے عورت ہونے کی حقارت ختم نہیں ہوتی۔''

میں خفگی سے بولا۔ ''تو کیا عورت ہونا ساری خوبیوں کو ختم کر دیتا ہے۔''

وہ ہنسا۔ ''کیا تم یہ نہیں مانتے۔''

ہم برآمدے میں کھڑے تھے۔ میں نے حویلی کے داخلی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ''ستون کے اوپر لگی بتی نظر آ رہی ہے۔''

''اب تک چشمے کے استعمال کی نوبت تو نہیں آئی کہ بتی دکھائی نہ دے۔'' اس کے لبوں پر شرارتی استہزاء نمودار ہوا۔ ''ویسے میرے ہاں یا ناں کرنے میں عورت کا باصلاحیت ہونا تو مضر نہیں ہے نا۔''

اس کے طنز کو درخور اعتناء نہ جانتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ''اس بتی کو کتنی گولیوں سے نشانہ بنالو گے۔''

وہ صاف گوئی سے بولا۔ ''ایک گولی سے، شاید تین چار بھی چلانا پڑ جائیں۔ دعوے سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

میں دعوے سے بولا۔ ''وہ ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے سے اس بتی کو نشانہ بنالے گی۔ شک ہے تو شرط لگا سکتے ہو۔''

وہ غیر یقینی سے بولا۔ ''کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی سے کام لے رہے ہو۔''

میں نے اگلا دعویٰ کیا۔ ''تمھارے آدمیوں میں شاید دو تین ہی ایسے ہوں، جو خالی ہاتھ لڑائی میں اس پر قابو پالیں ورنہ اکثریت کو وہ خاک چٹا دے گی۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''تم شاید عورتوں کی بڑائی کے قائل ہو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کسی کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے وقت میں جنس کو زیر بحث نہیں لاتا۔ البتہ تمھیں ایک عورت کی مدد لینے میں عار محسوس ہو رہی ہے۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''کیا نہیں ہونا چاہیے؟''

میں برہم ہوا۔ ''کلینک میں دو تین ماہ تم ایک نرس کے محتاج بنے رہے، تب تمھاری مردانگی کہاں سوئی تھی۔''

اس نے قہقہہ بلند کیا۔ ''لڑنے پر تیار ہو گئے ہو یار۔''

''میں تمھاری مدد کرنا چاہ رہا تھا۔ راجپوت پر قابو پانے میں تمھارے زیادہ تر کارندے ضائع ہونے کا خدشہ ہے۔ جبکہ ہم، تمھارا جانی نقصان کرائے بغیر اسے پکڑوا سکتے ہیں۔''

''وہ کیسے؟'' اس نے اشتیاق ظاہر کیا۔

''شروع ہی میں بتا دیا تھا کہ اس کی روزمرہ معلوم کرو۔''

اس نے الجھن ظاہر کی۔ ''اس سے کیا ہوگا؟''

''بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' میں اسے کمرے میں لے گیا اور اپنا منصوبہ بتا دیا۔

وہ متعجب ہوا۔ ''کیا یہ قابل عمل ہے۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''آزما لو..... ہماری ناکامی پر تمھارا نقصان تو نہیں ہوگا۔''

وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔ ''ہاتھ آگے کرو۔'' میں نے ہتھیلی آگے کی۔ زوردار انداز میں میرا ہاتھ بجاتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔

لورا خاموشی سے ہماری گفتگو سنتی رہی۔ یہ علیحدہ بات کہ اس کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔ دھرمو دادا کے نکلتے ہی مجھے پوری گفتگو دہرانا پڑی۔ وہ منصوبہ میں نے اس سے مشورے کے بغیر ہی طے کیا تھا۔ تفصیل جان کر اس نے ایک دو قابل قدر مشورے دیے۔ وہ ایک اچھی سنائپر تھی اور سنائپنگ کے میدان میں اس کی رائے کو رد کرنا آسان نہ تھا۔ ہم منصوبے کی نوک پلک سنوارنے لگے۔

ڈیڑھ ہفتے بعد ہم منصوبے پر عمل کرنے کو نہ صرف تیار تھے بلکہ سہ پہر کو نسبتاً ویران سڑک کے جوانب میں گھات لگائے لیٹے تھے۔ میں سڑک سے شمالی جانب چھے سو گز دور سہ منزلہ مکان کی چھت پر لیٹا تھا۔ جبکہ لورا برادن مخالف جانب سڑک سے پانچ سو گز کے فاصلے پر ایک فارم ہاؤس کی چھت پر موجود تھی۔ میرے ساتھ دھرمو دادا خود اور لورا کے ہمراہ اس کا ایک اہم کارندہ موجود تھا۔ ہم دونوں کے پاس تھنڈر بولٹ سٹیل کور۔76 سنائپر رائفل تھی۔ انگلینڈ کی کمپنی سٹیل کور کی بنی ہوئی یہ عمدہ سنائپر رائفل ہے جس کی مار 1000 میٹر ہے۔ میں نے دھرمو دادا کو گلیل سنائپر رائفل یا ڈریگنو ولانے کا بتایا تھا۔ اپنے مخصوص اسلحہ ڈیلر کے پاس اسے دونوں رائفلیں نہیں ملیں تھیں ان کے بجائے تھنڈر بولٹ مل گئی تھی۔ یہ ڈریگنو اور گلیل سے کارکردگی میں بہتر اور جدید رائفل ہے۔ آج کل تو پاکستان آرمی کے پاس بھی موجود ہے۔ البتہ اس کا وزن ڈریگنو اور گلیل سے زیادہ ہے۔ 62x51.7 رائفل کا وزن نو کلوگرام ہونا میری نظر میں خامی ہے۔ گو یہ اتنی بڑی خامی نہیں کہ اس پر دوسری دونوں رائفلوں کو ترجیح دی جا سکے۔ البتہ لمبے فاصلوں تک اسے اٹھا کر چلنا اور ضرورت پڑنے پر دوڑنا ذرا دشوار بن جاتا ہے۔ ایس آر ون جان بوجھ کر استعمال نہیں کی تھی کہ میں اسے بچا کر رکھنا چاہ رہا تھا۔ لورا بھی مجھ سے متفق تھی۔

تھنڈر بولٹ ہمارے لیے نئی رائفل نہیں تھی کہ استعمال میں کوئی مسئلہ ہوتا۔ بلکہ اب تو ہر قسم کی سنائپر رائفل کو سمجھنے کو مجھے چند منٹ سے زیادہ نہیں لگتے۔ گزشتہ کل کو ہم اپنی رائفلوں کو صفر کر چکے تھے۔ بلاشبہ سنائپر کسی بھی مشن پر جانے سے پہلے اپنے ہتھیار کو صفر کرنا فرض سمجھتا ہے۔

تھنڈر بولٹ، بولٹ ایکشن ہتھیار ہے۔ مطلب ہر بار گولی چلانے کو اسے کاک کرنا پڑتا ہے۔ بولٹ ایکشن سنائپر رائفلوں میں درستی، نیم خودکار سنائپر رائفلوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ کیوں کہ نیم خودکار و خودکار (سیمی و فلی آٹو میٹک) ہتھیاروں سے فائر کرتے وقت جھٹکا زیادہ لگتا ہے۔ اور اس کی وجہ فائر کے علاوہ چال والے پرزوں کی حرکت ہوتی ہے۔

دھرمو کے موبائل فون پر کال وصول ہوئی۔ اس نے اسپیکر آن کر دیا تھا۔ ایک مردانہ آواز ابھری۔ ''دادا! ہم تک پہنچ گئے ہیں۔''

''ان کے آگے بڑھتے ہی سڑک بند کر دو۔'' کہہ کر دھرمو نے رابطہ منقطع کر دیا۔ وہاں دھرمو دادا کے تین چار کارندے پولیس کی وردی میں موجود تھے۔ راجپوت کی کاریں گزرتے ہی انھوں نے سڑک کو عارضی طور پر بند کر دینا تھا۔ تاکہ ہماری کارروائی میں کوئی مداخلت نہ کر سکے۔ گو جہاں فائرنگ شروع ہو اور غنڈوں کے دو گروہ برسرپیکار ہوں وہاں سے عام لوگ تو کیا پولیس والے بھی دور بھاگتے ہیں، مگر کسی ناگفتہ بہ صورت حال سے نبٹنے کو ہم نے سڑک کو دونوں جانب سے بند کرنا مناسب سمجھا تھا۔ وہ اندرون شہر کی شاہراہ نہیں تھی کہ دس پندرہ منٹوں میں گاڑیوں کی بھیڑ لگ جاتی۔

میں نے لورا کا نمبر ملایا۔ ''تیار ہو جاؤ۔''

وہ اعتماد سے بولی۔ ''تیار ہوں۔'' میں نے رابطہ منقطع نہ کیا اور ہینڈ فری کان میں لگا لی۔ تاکہ لورا ہماری باتیں سنتی رہے۔

دھرمو دادا نے ایک اور نمبر ملا کر کہا۔ ''شامو! شکار پہنچنے والا ہے سڑک بند کر دو۔'' اور جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔ شامو سڑک کے اس جانب موجود تھا جدھر راجپوت دادا کا رخ تھا۔ اور اب سڑک کا دو تین کلومیٹر کا علاقہ دونوں جانب سے بند کیا جا چکا تھا۔

سڑک کا وہ حصہ بالکل سیدھا تھا اور تقریباً کلومیٹر بھر علاقہ ایسا تھا کہ سڑک کے دونوں جانب کوئی ایسی رکاوٹ موجود نہیں تھی جہاں آڑ لے کر چھپا جا سکتا۔ سنگ میل کے ساتھ ایک بھکاری ٹیک لگائے یوں بیٹھا تھا گویا تھک کر چند لمحے ستانے کو بیٹھا ہو۔ پاؤں پسارے وہ دنیا و مافیا سے بے خبر نظر آ رہا تھا۔

کاروں نے میرے بائیں جانب سے نمودار ہونا تھا۔ راجپوت کل اسی سڑک سے گزر کر ''ناسک'' شہر گیا تھا۔ اسلحے کے بھرے چند ٹرک تھے جنھیں بہ خیریت پولیس ناکوں و چوکیوں سے گزارنا اس کا مقصد تھا۔ ان ٹرکوں نے دہلی تک جانا تھا۔ مگر راجپوت کی ذمہ داری غالباً ناسک تک حفاظت کی تھی۔ اسلحے کے ٹرکوں کے بارے خبر ملنے پر مجھے ایک خیال یہ بھی آیا تھا کہ شاید ڈیوڈ نے ایس آر ن کی کھیپ بھجوا دی ہے۔ مگر لورا نے تردید کر دی، کیوں کہ ڈیوڈ اسے بتائے بغیر ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اور لورا نے چند ہفتے پہلے ہی ڈیوڈ کو ہتھیار بھیجنے سے منع کر دیا تھا۔

آج راجپوت نے اسی سڑک سے واپس آنا تھا۔ دھرمو کے آدمی اس کے تعاقب میں تھے۔ جونھی وہ ناسک سے نکلے ہم گھات پوزیشن میں پہنچ گئے تھے۔ اور ابھی ہمیں کال آئی تھی کہ وہ دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ منٹ بھر بعد ہی مجھے کاریں نظر آنے لگیں۔ سب سے آگے سیاہ رنگ کی جیکوار تھی۔ اس کے عقب میں کھلی چھت کی دو جیپیں تھیں۔ جگہ کا انتخاب کرتے وقت میں نے کوشش کی تھی کہ کوئی ایسی جگہ ہو جہاں رفتار شکن (سپیڈ بریکر) موجود ہو یا وہاں سڑک ٹوٹی پھوٹی ہو تا کہ کاروں کی رفتار قدرتی کم ہو جائے، مگر جہاں سڑک خراب تھی یا رفتار شکن موجود تھے وہ جگہ کارروائی کے لیے مناسب نہیں تھی، مجبوراً موجودہ جگہ کا انتخاب کر کے خطرہ مول لینا پڑا تھا۔ البتہ مجھے امید تھی کہ ناکام ہونا نہیں پڑے گا۔

گاڑیاں گھات کی جگہ کے دو سو گز کے دائرے میں داخل ہوئیں۔ میں نے جیکوار کے اگلے پہیے پر شست سادھی۔ پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ حرکتی ہدف کو نشانہ بنانے کو لیڈ کی ضرورت پڑتی ہے۔

چونکہ متحرک ہدف کی رفتار مختلف ہو سکتی ہے، اور ہدف کے نظر آنے پر اگر حساب کتاب کیا جائے تو یقیناً حساب کے ختم ہونے تک ہدف سامنے سے گزر جائے گا۔ اس وجہ سے سنائپر حرکتی ہدف کے خلاف رینج ٹیبل بنا کر رکھتے ہیں۔ اس میں مختلف رفتار کے مطابق مطلوبہ لیڈ درج کر لی جاتی ہے۔ تا کہ ہدف کے نظر آتے ہی کاغذ پر ایک نظر دوڑا کر مطلوبہ لیڈ لگا لی جائے۔ ہدف کی سمت، فاصلہ تو ہمیں پہلے سے معلوم تھا۔ گاڑیوں کی رفتار میں نے دھرمو کے ان آدمیوں سے معلوم کر لی تھی جو ناسک سے نکلتے وقت راجپوت کے تعاقب میں تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں پہنچنے پر گاڑیوں کی رفتار میں انیس بیس سے زیادہ فرق نہیں ہونا تھا۔ یوں بھی چلتی گاڑی کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رفتار کتنی ہے۔ اور آج کل تو رفتار کو ناپنے والے آلے رفتار پیما بھی دستیاب ہیں۔ میں نے ڈیفلیکشن ناب کو گھما کر مطلوبہ لیڈ پہلے سے لگا دی تھی۔ اور انیس بیس کا فرق میں اندازے سے بھی دور کر سکتا تھا۔

مخصوص لیڈ لے کر میں نے سانس روکا اور لبلبی دبا دی۔ حسب معمول مجھے ناکامی نہیں ہوئی تھی۔ اور سچ کہوں تو مسلسل عملی میدان میں سنائپنگ کرنے کے بعد میں خود کو جدید سہولیات کا محتاج نہیں سمجھتا تھا۔ کبھی اندازے سے فائر کرنا پڑ جاتا تب بھی کامیابی ہی میرا مقدر لکھتا۔

تھنڈر بولٹ کی مزل پر عمدہ سائیلنسر لگا تھا، فائر کی ہلکی سی ''ٹھک'' کی آواز بلند ہوئی تھی۔ البتہ ٹائر پھٹنے کا دھماکا خاصا بلند تھا۔ ماہر ڈرائیور نے بڑی مشکل سے کار کو الٹنے سے بچایا تھا۔

''شاباش ایس ایس۔'' لورا کی تحسین آمیز آواز میرے کانوں میں ابھری۔ کہتے ہیں اہل فن ہی اپنے فن کی باریکیوں سے واقف ہوتے ہیں۔ اور اہل فن کی تعریف ہی قابل فخر ہو سکتی ہے۔ ورنہ انجان کی شاباشی لائق فخر ہوتی ہے نہ

تنقیص (نقص نکالنا) قابل توجہ۔

متحرک کار کے پہیے کو پہلی گولی سے نشانہ بنانا اتنا آسان نہیں ہے۔ اور لورا سے زیادہ یہ بات کون جان سکتا تھا۔ وہ خود پیشہ ور سنائپر تھی اور اچھی طرح جانتی تھی کہ میری کوشش میں کامیابی کا احتمال کتنے فیصد تھا۔

کار سنگ میل سے ٹیک لگائے بھکاری سے دس قدم دور رک گئی تھی۔ دونوں جیپیں بھی فوراً رک گئی تھیں۔ راجپوت کے محافظ چھلانگ لگا کر نیچے اترے اور کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر سڑک کے جوانب میں چوکس کھڑے ہو گئے تھے۔ چند لمحوں بعد جیگوار کا دروازہ کھول کر ڈرائیور باہر نکلا۔ دوسری جانب سے راجپوت بھی باہر نکل آیا تھا۔ گو اتنے فاصلے سے اس کی صورت بالکل واضح نظر نہیں آ رہی تھی، البتہ قامت وغیرہ سے آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ راجپوت ہے۔

محتاط انداز میں دائیں بائیں کا جائزہ لے کر وہ اپنے آدمیوں کو کوئی ہدایت دینے لگا۔ ایک محافظ نے بھکاری کے قریب جا کر بھی کچھ پوچھا تھا۔ اور پھر اس کی تلاشی لے کر پیچھے ہٹ گیا۔ تینوں ڈرائیور کار کا پہیہ تبدیل کرنے لگے۔ دو محافظ اس کے دائیں بائیں آ کر کھڑے ہو گئے تھے جبکہ باقیوں نے اپنی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ تین ڈرائیوروں اور راجپوت سمیت وہ بارہ افراد تھے۔

میں نے ڈیفلکشن ناب کو دوبارہ گھما کر صفر پر لگا دیا تھا کہ اب مجھے ساکن بلکہ انسانی اہداف پر فائر کرنا تھا۔ اور انسان کی حرکت کے خلاف لیڈ سنائپر کے ذاتی تجربے کے مرہون منت ہوتی ہے۔

دھرمو نے نمبر ملا کر موبائل فون میری جانب بڑھایا۔ دوسرے کان میں بھی ہینڈ فری لگا کر میں ٹیلی اسکوپ سائیٹ میں بھکاری کا جائزہ لینے لگا۔ وہ دھرمو دادا ہی کا آدمی تھا۔ اس نے موبائل فون کان سے لگا کر ''ہیلو'' کہا۔

''راجپوت کو فون دو۔'' گو اسے معلوم تھا کہ کیا کرنا ہے۔ اس کے باوجود میں نے ہدایت دینا مناسب سمجھا۔

''راجپوت دادا! آپ کی کال ہے۔'' بھکاری نے موبائل فون راجپوت کی طرف بڑھایا۔

راجپوت یقیناً ششدر ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھی محافظ بھوکے بھیڑیوں کی طرح بھکاری کی طرف بڑھے۔

''کون ہو تم، دادا کو کیسے جانتے ہو؟''

وہ اطمینان سے بولا۔ ''تمام سوالوں کا جواب راجپوت دادا کو کال وصول کرنے پر مل جائے گا۔''

راجپوت نے قدم بڑھا کر موبائل فون تھاما۔ ''ہیلو۔'' اس کی محتاط آواز میری سماعتوں میں پہنچی۔

میں نپے تلے لہجے میں بولا۔ ''راجپوت دادا! میری ہدایات غور سے سننا۔ اور جو کہوں بے چوں چرا کیے اس پر عمل کرنا کیوں کہ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔''

اس نے گردن گھما کر چاروں جانب نظر دوڑائی، ساتھ ہی میری سماعتوں میں اس کی برہم آواز پہنچی۔ ''یقیناً تم راجپوت دادا سے واقف نہیں ہو تبھی اس بھونڈے ڈرامائی انداز میں ڈرانا چاہ رہے ہو۔''

''پہلی بات، تم نے اپنی جگہ سے ہلنا نہیں ہے۔ کیوں کہ تم اس وقت ایک نہیں دو سنائپروں کے نشانے پر ہو۔ اور ہمیں جانچنے کو اپنے کسی محافظ کی بلی چڑھانا بہتر رہے گا۔''

''کیا چاہتے ہو۔'' غیر متوقع طور پر اس نے جگہ چھوڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''پہلی بات بتا چکا ہوں کہ ہلنا نہیں، دوسرا اپنے چیلوں کو کہو تم سے دور ہو جائیں، اگر میرے تین گننے تک یہ دور نہ ہوئے تو نتیجے کے ذمہ دار تم ہو گے..... ایک۔''

وہ بظاہر بے خوف لہجے میں بولا۔ ''میں ان گیدڑ بھبکیوں میں آنے والا نہیں۔'' شاید ہمیں آزمانا چاہ رہا تھا۔

''دو..... تین.....'' میں نے گنتی مکمل کی۔

''ٹھہرو۔'' وہ چیخا اور اپنے ساتھیوں کو مخاطب ہوا۔ ''دور ہٹ جاؤ۔''

ایک محافظ نے شاید احتجاج کرنا چاہا تھا۔ وہ دھاڑا۔ ''کہہ دیا نا دفع ہو جاؤ۔''

وہ محافظ جلدی سے دور ہو گیا تھا، جبکہ دوسرا کچھ زیادہ ہی وفاداری کا مظاہرہ کرتا ہوا اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔ میں خود چاہ رہا تھا کہ راجپوت کو عملی مظاہرے سے یقین دلاؤں کہ وہ ہماری مرضی کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے وہیں ڈٹا پا کر میں نے فوراً اس کی دائیں پنڈلی پر شست سادھی۔ اور سانس روک کر لبلبی دباتے ہوئے افسوس بھرے انداز میں بولا۔

''بے چارے کی پنڈلی۔''

وہ فوراً چیخ مار کر نیچے گر گیا تھا۔ محافظوں کو پہلے ہی خطرے کا اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ اندھا دھند فائر کرنے لگے۔ ایک محافظ بھاگ کر زخمی ساتھی کے پاس پہنچا اور اسے سنبھالنے لگا۔ راجپوت چیخ چیخ کر اپنے کارندوں کو فائر بند کرنے کا کہنے لگا۔

ان پر مزید رعب جمانے کو میں لورا کو مخاطب ہوا۔ ''کیپٹن! کار کے اپنی طرف والے دونوں پہیے ناکارہ کر دو۔'' اور خود اپنی جانب والے عقبی پہیے پر شست سادھ کر لبلبی دبا دی۔

دھماکے کی آواز سن کر پہیے تبدیل کرنے والے ڈرائیور جھک کر پیچھے ہو گئے تھے۔ اسی دوران وقفے وقفے سے دو اور دھماکے ہوئے۔ اب کار چاروں پہیوں سے فارغ ہو گئی تھی۔

''راجپوت دادا! یقیناً تمہیں یقین آ گیا ہو گا۔ اور جان جاؤ میں یہ گولی تمہارے محافظ کے سر میں بھی مار سکتا تھا، لیکن فی الحال میری کوشش یہی ہے کہ تمہیں جانی نقصان پہنچائے بغیر اپنا مقصد حاصل کر لوں۔''

وہ گھمبیر لہجے میں بولا۔ ''کیا چاہتے ہو؟''

میں اطمینان سے بولا۔ ''تمہارے ساتھ بیٹھ کر تھوڑی گپ شپ کروں گا، کچھ معلومات کا تبادلہ کروں گا اور پھر میری طرف سے تم فارغ ہو گے۔''

وہ فوراً بولا۔ ''ٹھیک ہے، جگہ بتاؤ میں پہنچ جاؤں گا۔''

''اتنا کشٹ (تکلیف) اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ ناک کی سیدھ میں چلتے جاؤ تمہیں لینے کو گاڑی بھیج دی ہے۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اتنا بے وقوف سمجھتے ہو کہ اپنی گردن خود پھنسا لوں۔''

میں اعتماد سے بولا۔ ''تم پھنس چکے ہو راجپوت دادا! اگر شک ہے تو میں دور کر سکتا ہوں۔ اور اگر اگلے دو منٹ کے اندر تمہارے سارے آدمیوں کے سر میں روشن دان نہ کھول سکا تو تمہیں جانے دوں گا۔ منظور ہے؟''

اس نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔ ''جو معلومات لینا ہے تم کال پر پوچھ لو، وعدہ کرتا ہوں حقیقت نہیں چھپاؤں گا۔''

میں نے کہا۔ ''تمہیں کار کی سامنے والی بتی نظر آ رہی ہے۔''

''جی۔'' حیرانی بھرے استفسار سے کہتے ہوئے اس کی گردن جیکوار کی طرف مڑی۔ اس اثناء میں میں لبلبی دبا چکا تھا۔ بتی کے شیشے ٹوٹ کر بکھر گئے تھے۔

''جیپ کے ٹائروں کو دیکھو۔'' میں نے اگلی جیپ کے اپنی طرف والے دونوں ٹائر ناکارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''شک دور ہوا کہ مزید ثبوت دوں۔''

''دیکھو دوست! میری بات سمجھنے کی.....'' مگر اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے میں عقبی جیپ کے ٹائروں کو

نشانہ بنا چکا تھا۔ دھماکوں نے اس کی زبان خاموش کر دی تھی۔

''اگلے ثبوت تمہارے آدمیوں کے جسمانی اعضاء ہوں گے۔ تمہارے پاس میرے تین تک گننے کی مہلت ہے..... ایک.....'' دھمکی دیتے ہی میں نے گنتی شروع کر دی تھی۔

''دو..... تین..... اپنے سب سے عقبی محافظ کو.....''

''ٹھہرو.....'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے چلایا۔ ''کیا ہم سودا بازی نہیں کر سکتے.....''

میں نے عقبی محافظ کی ران پر شست سادھ کر لبلبی دبا دی۔ وہ چیخ مار کر نیچے گر گیا تھا۔ قریب موجود محافظ اسے سنبھالنے لگ گیا تھا، جبکہ باقیوں نے جیپوں کے دوسری جانب آڑ لے لی تھی۔

میں لورا کو مخاطب ہوا۔ ''کیپٹن! جیپوں کے ٹائر کیوں سلامت نظر آ رہے ہیں۔'' اگلے ہی لمحے جیپ کا ایک ٹائر پھٹا اور وہاں دبکے محافظ فوراً جیپ سے دور ہو گئے تھے۔ اس کے بعد باری باری تین دھماکے ہوئے، اب وہاں تینوں گاڑیوں کا کوئی ٹائر سلامت نہیں بچا تھا۔

''اب اپنے ڈرائیور کو دیکھو.....'' میں نے جیگوار کار کے ساتھ کھڑے حیران و پریشان ڈرائیور پر شست سادھی۔

''کہاں جانا ہے؟'' راجپوت نے فوراً ہی ہتھیار پھینک دیے تھے۔

''سامنے دیکھو، سو گز دور سڑک پر سفید رنگ کی کار نظر آ رہی ہے۔ اس کی اگلی نشست پر بیٹھ جاؤ۔ اور اپنے آدمیوں کو بتا دو، اگر کسی نے بھی تمہارا پیچھا کرنے کی کوشش کی تو جان سے جائے گا۔''

اس نے اپنے محافظوں کو وہیں رکنے کا کہا اور خود آگے بڑھ گیا۔ دھرمو دوربین آنکھوں سے لگائے سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے فوراً کار والے سے رابطہ کر کے اسے پیچھے آنے کو کہا۔ کار میں عقبی نشست پر دو مسلح افراد موجود تھے۔ راجپوت کے پیچھے بھکاری نے بھی قدم بڑھا دیے تھے۔ راجپوت کے صرف ایک محافظ نے ہماری دھمکی کو قابل توجہ نہیں جانا تھا۔ ہتھیار سونتے وہ راجپوت دادا کے پیچھے دوڑا لیکن پانچواں قدم لینا اسے نصیب نہیں ہوا تھا۔ وہ اوندھے منہ گرا اور زخمی ٹانگ سنبھالنے لگا۔ باقی اپنی جگہ پر جمے رہے۔ راجپوت دادا نے گردن موڑ کر وفادار محافظ کا جائزہ لیا، اس دوران کار اس کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس کے بیٹھنے سے پہلے، بھکاری بننے والے نے قریب ہو کر مہارت سے اس کی تلاشی لی۔ اس کا پستول قبضے میں لے کر وہ عقبی نشست پر منتقل ہو گیا۔ راجپوت دادا کے بیٹھتے ہی کار تیزی رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔ میں لورا سے رابطہ منقطع کر کے سامان سمیٹنے لگا۔ راجپوت کو لے جانے والے آدمیوں کو ہم نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ دھرمو دادا سے تعلق کو ظاہر نہ کریں۔ کیوں کہ ایسا ہونے کی صورت میں ہمیں راجپوت سے تفتیش کرتے وقت دشواری پیش آ سکتی تھی۔

دھرمو دادا نے میری پیٹھ تھپتھپائی۔ ''مان گئے استاد، بلاشبہ تم بہترین نشانے باز ہو۔''

تھنڈر بولٹ کو تھیلے میں منتقل کرتے ہوئے میں مسکرایا۔ ''واپسی پر لورا براؤن کا شکریہ بھی ضرور ادا کرنا۔''

اس نے فراخ دلی دکھائی۔ ''شما چاہتا ہوں، بے شک میں نے غلط کہا تھا۔ ہر لڑکی کمزور نہیں ہوتی۔''

ہم نیچے اترے، ڈرائیور تیار بیٹھا تھا۔ ہمارے نشست سنبھالتے ہی اس نے کار آگے بڑھا دی۔ دھرمو دادا نے موبائل فون پر سڑک بند کرنے والوں کو بندش کے خاتمے کا بتایا اور میری طرف متوجہ ہوا۔

''یقین نہیں ہو رہا راجپوت اتنی آسانی سے میرے قابو میں آ گیا ہے۔''

میں سنجیدگی سے بولا۔ ''آسانی سے کہاں ہوا ہے دادا! دو سنائپروں کی موجودگی تمہاری نظر میں کوئی معنی نہیں رکھتی۔ کیا خیال ہے سنائپر ایک دن میں بن جاتا ہے۔ کبھی متحرک گاڑی کے پہیے کو چھ سو میٹر سے نشانہ بنانے کی کوشش کرنا معلوم ہو

جائے گا کہ آسان کام ہے یا مشکل۔ اتنے ہی فاصلے پر کار کے شیشے کو بھی نشانہ بنانا، آدمی کی پنڈلی میں گولی مارنا اور کامیابی کے بعد دعویٰ کرنا کہ آسان کام ہے۔''

''درست کہا۔'' اس نے متفق ہونے میں دیر نہیں کی تھی۔

''جب تک ہم راجپوت سے اپنے مطلب کی معلومات اگلوئیں تم تھانے پر دھاوا بول کر اپنے ساتھیوں کو آزاد کرا سکتے ہو۔ مزید چھپنے کی ضرورت نہیں رہی۔''

''بہت اچھے۔'' اس نے پسندیدگی سے سر ہلا دیا تھا۔

—●—

راجپوت کو وشواس سنگھ کی حویلی کے ایک اندرونی کمرے میں بند کر دیا گیا۔ دروازے پر دو پہرے دار مقرر کر کے ہم بے فکر ہو گئے تھے۔ رات کا کھانا کھا کر دھرمو دادا اپنے گروہ کے ساتھ اپنے قید ساتھیوں کو چھڑانے روانہ ہو گیا۔ جبکہ میں اور لورا راجپوت سے تفتیش کرنے پہنچ گئے۔

وہ فرشی بستر پر لمبا پڑا تھا۔ دھرمو کے آدمیوں نے اس کی مشکیں کس دی تھیں۔ ہمارے بیٹھنے کو پہرے دار دو کرسیاں لے آئے۔ ہم نے اطمینان سے نشست سنبھالی، راجپوت کینہ توز نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

''غصے میں لگ رہے ہو راجپوت دادا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے گفتگو کی ابتداء کی۔

وہ قہر آلود لہجے میں بولا۔ ''گوتم نے مقامی سہارے ڈھونڈ لیے ہیں مگر زیادہ عرصہ تک آزاد نہیں گھومو گے۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''جلد ہی جان جاؤ گے کہ میں مقامی لوگوں کو سہارا دے رہا ہوں یا لے رہا ہوں۔''

''ایک پیش کش کر رہا ہوں، ٹھنڈے دماغ سے سوچ لو..... یہ تتلی ہمارے حوالے کرو، حفاظت سے پاکستان کی سرحد عبور کرو، منہ مانگے دام وصول پاؤ۔ اور جن معلومات کے حصول کو جاسوس بن کر آئے ہو وہ بھی تمہیں مہیا کر دی جائیں گی۔'' وہ ایک دم سودے بازی پر اتر آیا۔

میں نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔ ''قہقہہ لگانے کی اجازت ہے۔''

اس نے فلسفہ بگھارا۔ ''ہنس لو، مگر یاد رہے مسکراہٹیں تادیر سلامت نہیں رہتیں۔''

''اگر چاہتے ہو تمہارے ساتھ وہ کچھ نہ ہو جو میرے ساتھ تمہارے عقوبت خانے میں ہوا تھا تو میرے سوالوں کا درست جواب دینا شرط ہے۔''

وہ بے خوفی سے بولا۔ ''راجپوت، اذیتیں جھیلنے کا عادی ہے۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''آزمانے کی دعوت دے رہے ہو یا صرف مطلع کر رہے ہو۔''

''جو سمجھو۔'' اس نے نظریں چرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''اچھا یہ بتاؤ، کسی کے پاؤں کے نیچے موم بتی جلا کر رکھ دی جائے تو کیا ایک موم بتی تلوے میں سوراخ کر پائے گی یا خون گرنے سے بجھ جائے گی۔''

''تم مجھے ڈرا نہیں سکتے۔''

میں متبسم ہوا۔ ''دھمکا تو سکتا ہوں ناں، کیا پتا ڈر جاؤ۔''

وہ عزم سے بولا۔ ''غلط فہمی ہے تمہاری۔''

''جانتے ہو اس تتلی کے کیا ارادے ہیں۔'' میں نے اسے لورا کی طرف متوجہ کیا جو بے تاثر چہرہ لیے اسے گھور رہی تھی۔

راجپوت نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے بے پروائی ظاہر کی، گویا لورا کے ارادے اس کی نظر میں کسی اہمیت کے حامل نہیں تھے۔ میں نے چھوٹا سا وقفہ دے کر انکشاف کیا۔ ''شکلا نے اسے زیادتی کا نشانہ بنایا اور ہر وہ شخص جو اس کا ذمہ دار ہے، یہ اسے اس قابل نہیں چھوڑے گی کہ آئندہ کسی غیر لڑکی تو کیا اپنی بیوی کے پاس بھی جا سکے..... ویسے آج کل سائنس کافی ترقی کر گئی ہے، لولے لنگڑوں کی طرح نامردوں کا علاج بھی ممکن ہے یا.....'' بات ادھوری چھوڑ کر میں نے کندھے اچکائے۔ راجپوت کی آنکھوں کی گہرائی میں اضطراب کی لہریں اٹھیں، مگر اس نے چہرے پر خوف ظاہر نہ ہونے دیا۔

شاید قارئین کو میری گفتگو فضول یا وہ گوئی لگے، مگر میں مذاق یا گپ شپ کے موڈ میں نہیں تھا۔ نہ میرا ارادہ وقت ضائع کرنے کا تھا۔ درحقیقت مضبوط اعصاب کے مالک افراد کی قوت ارادی توڑنے کو ایسے نفسیاتی حربوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ پوچھ گچھ کے لیے کسی کو پیٹنے اور ایک دم تشدد کا نشانہ بنانے کے بجائے اسے ذہنی اذیت پہنچانا عموماً زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ تکلیف جھیلنا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا تکلیف جھیلنے کا انتظار ہوتا ہے۔

میری بات جاری رہی۔ ''اچھا یہ بتاؤ آری سے ٹانگ کٹنے کی تکلیف زیادہ ہوتی ہے یا کلھاڑی سے۔ نہیں پتا.....'' میں نے سر کو دائیں بائیں جنبش دیتے ہوئے منہ بنایا۔ ''اور ہتھوڑے سے پنڈلی کو کچلا جائے تب بھی درد زیادہ ہوگا یا آگ میں جلانے سے..... بلکہ نہیں، آگ میں جلانے سے تو پوری ٹانگ کٹے گی نا۔ کیوں کہ کوئی ایسا طریقہ دریافت نہیں ہوا کہ صرف پنڈلی کو آگ سے جلا کر کاٹا جا سکے..... یا ایسا کوئی طریقہ ہے۔ کیا کہتے ہو؟''

''راجپوت ایسی باتوں سے خوف نہیں کھاتا۔'' بہ ظاہر اس نے بہادری دکھائی مگر اس کے لہجے میں پہلے والا دم خم باقی نہیں تھا۔

''اچھا یہ بتاؤ زبان بند رکھنے کا تمھیں کیا انعام ملے گا۔ سرکاری آدمی تو ہو نہیں کہ کوئی اعزاز، سند یا تمغا ملے۔ (اس لفظ کو عوام میں تغما پڑھتے ہیں) البتہ تمھاری کٹی پھٹی لاش پولیس والوں کے کام آئے گی کہ تمھیں پولیس مقابلے میں مردار قرار دے کر انعام و ترقی کے حق دار ٹھہریں گے۔ اور تم سے تو تمھارا چھوٹا بھائی وشال گپتا عقل مند ثابت ہوا کہ سب کچھ اگل کر اپنی کھال و جان بچالی۔''

اس کی ہٹ دھرمی میں دراڑ پڑی۔ ''میں کیسے یقین کروں کہ معلومات لے کر تم مجھے کچھ نہ کہو گے۔''

''تمھارے بھائی وشال پر قابو پانے کے باوجود اسے کچھ نہیں کہا۔ نہ تمھیں کچھ کہنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے تمھارے ساتھ ہماری کوئی دشمنی ہی نہیں ہے۔ پوچھ گچھ کے بعد تمھیں ان مقامی غنڈوں کے حوالے کر کے اپنی راہ لیں گے۔ ان سے سودا بازی کرنا، تمھاری اپنی صوابدید ہے۔ چند ہزار پر راضی ہوتے ہیں یا زیادہ کے طلب گار ہوتے ہیں۔''

وہ بے یقینی سے بولا۔ ''اپنے اللہ کی قسم کھاؤ تم مجھے کچھ نہیں کہو گے۔''

میں خلوص دل سے بولا۔ ''اللہ پاک کی قسم، میں تمھیں کچھ نہیں کہوں گا، بلکہ لورا کی ذمہ داری بھی میں لیتا ہوں۔'' اور حقیقت بھی یہی تھی، میرا اسے نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بلکہ میری حتی الوسع کوشش یہی تھی کہ انڈیا میں کسی کے ساتھ خواہ مخواہ پنگا بازی نہ ہو۔ میرا دشمن صرف دھیرندر شکلا تھا۔ البتہ دھرمو کی ذمہ داری میں قبول نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ان کا آپس کا معاملہ تھا۔ میں نے اشارتاً بول بھی دیا تھا کہ اسے غنڈوں کے حوالے کروں گا تاکہ جھوٹ و دھوکے بازی سے بچ سکوں۔

''کیا پوچھنا ہے۔'' اس نے رضامندی ظاہر کی۔

میں اطمینان سے بولا۔ ''شکلا کے بارے جو کچھ جانتے ہو اگل دو۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''یہ تتلی اتنی پسند آگئی ہے کہ اس کی خاطر شکلا سے دشمنی گانٹھ لی ہے۔''

''محبت بہت کچھ کروا دیتی ہے یار۔'' میں نے ایسے انداز میں فلسفہ بگھارا کہ اس کی غلط فہمی دور ہو نہ جھوٹ بولا جائے۔

اس نے ڈرانے کی کوشش کی۔ ''خلوص دل سے مشورہ دیتا ہوں، سر شکلا کا خیال دل سے نکال دو۔ اس بلبل کو بھی سمجھا بجھا کر واپس بھیج دو یا راضی ہے تو اپنے ساتھ پاکستان لے جاؤ، فائدے میں رہو گے۔''

میں ہنسا۔ ''تمھارے متعلق استفسار پروشال گپتا نے انکشاف کیا تھا، 'بہتر ہوگا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ نہ ڈالو اور طبعی عمر تک زندگی کے مزے لوٹو۔' اور دیکھ لو تم حقیر کیچوے کی طرح میرے سامنے بے بس لیٹے ہو۔''

اس کے چہرے پر غصہ نمودار ہوا۔ ''بے خبری میں تمھارے ہاتھ آ گیا ہوں، کبھی دوبارہ سامنا ہوا تو دیکھ لو گے۔''

''میں شکلا کو چٹھی لکھ کر اپنے حملے کے بارے پہلے سے مطلع کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اور یقیناً تم بھی زبان دو گے کہ یہاں سے جا کر اسے باخبر نہیں کرو گے۔''

اس نے جان چھڑانا چاہی۔ ''میں شکلا صاحب کا ملازم ہوں اور میرے پاس ان کے متعلق کوئی خاص معلومات نہیں ہیں۔''

''خاص و عام کا تعین میں خود کروں گا تم تفصیل بتانا شروع کرو۔ اور انگریزی جانتے ہو تو میری ساتھی بھی تمھاری زبانی سب کچھ سننا پسند کرے گی۔''

''انگریزی پر اتنا عبور نہیں ہے۔'' نفی میں سر ہلا کر وہ شکلا کے متعلق تفصیل سے بتانے لگا۔ لب لباب یہی تھا کہ شکلا بہت اونچی شیئے تھی۔ انڈیا کے پانچ چھے بڑے شہروں میں اس کی محل نما کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے پاس ذاتی ہیلی کاپٹر موجود تھا تبھی اس کے لیے دنوں کا فاصلہ گھنٹوں اور گھنٹوں کا منٹوں میں طے کرنا دشوار نہ تھا۔ مسلسل کام کی وجہ سے وہ شاذ و نادر ہی کسی جگہ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ گزار پاتا تھا۔ البتہ عموماً اس کا قیام ممبئی میں ہوتا تھا۔ اس کا کاروبار نہایت منضبط بنیادوں پر قائم تھا۔ اس کی انتظامیہ میں قابل بھروسا اور اعلیٰ صلاحیتوں والے لوگ شامل تھے۔ اس کے محافظوں میں بڑی تعداد انڈین آرمی کے ریٹائرڈ کمانڈوز کی تھی۔ جنھیں وہ بھاری تنخواہیں دیتا تھا۔ بعض تو نوکری کے اختتام سے پہلے ہی مستعفی ہو کر اس سے آن ملے تھے۔ کہ اس نے انڈین آرمی سے زیادہ مراعات اور تنخواہ کی پیش کش کی تھی۔ اس کا جائز اور ناجائز کاروبار زیادہ تر سمندر کے راستے سے ہوتا تھا۔ اس کا ایک بیٹا اور بیٹی تھی۔ بیٹی حادثے میں ہلاک ہو چکی تھی (بریگیڈیئر انصاری کی بیوی) اور اب فقط بیٹا بچا تھا۔ پرما انصاری اس کی لاڈلی نواسی تھی۔ اس کی ماں کسی حادثے میں فوت ہو چکی تھی، وہ پڑھ رہی تھی اور شکلا اس پر جان دیتا تھا۔ اس سے زیادہ معلومات وہ پرما کے متعلق نہیں رکھتا تھا۔ البتہ پرما اسے انکل کہتی تھی اور اپنے نانا کے دوست کے حوالے سے جانتی تھی۔ شکلا کا بیٹا وگنیش شکلا بہ ظاہر کاروباری شخصیت تھا مگر در پردہ باپ کے کالے کرتوتوں میں شامل تھا۔ اس کی کمزوری دولت و عورت تھی۔ حد درجہ کا عیاش تھا۔ کئی عورتوں کی عزت خراب کر چکا تھا۔ مگر اس کے گریبان تک عام آدمی کی رسائی نہیں تھی۔ اسلحے کی قانونی و غیر قانونی اسمگلنگ کے علاوہ خطرناک نشے کی اسمگلنگ میں بھی پیش پیش تھا۔ گو راجپوت اس کا خاص آدمی تھا مگر وہ اسے بھی راز دار بنانے پر تیار نہیں تھا۔ راجپوت کو وہ اتنا ہی بتاتا تھا جتنا اس سے کام لینا ہوتا تھا۔ کرن چاولہ سے بھی اس کے قریبی تعلقات تھے۔ اور کرن چاولہ اس کے بیٹے وگنیش شکلا کا گہرا دوست تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ رندھیر شکلا اپنے لباس کے نیچے بہترین قسم کی بلٹ پروف جیکٹ پہنے رہتا تھا۔ خصوصی طور پر تیار شدہ جیکٹ وزن میں بہت ہلکی مگر کارکردگی میں عمدہ ترین تھی۔ اس کی کار بلکہ اس کے محافظوں کی کاریں بھی بلٹ پروف تھیں۔ میں کرید کرید کر راجپوت سے شکلا کے متعلق پوچھتا رہا۔ کچھ باتیں تو انصاری

صاحب سے مجھے معلوم ہوئی تھیں ان کی تصدیق ہوئی، بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔اس دوران لورا خاموش تماشائی بنی رہی۔راجپوت کو اچھی طرح نچوڑنے کے بعد میں نشست چھوڑتے ہوئے اٹھا۔

''شکریہ راجپوت دادا! ہماری طرف سے آزاد ہو۔اب تم جانو اور ہمارے مقامی مددگار۔ہم تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔''

راجپوت کے چہرے پر اطمینان ابھرا۔''تم سے اسی سلوک کی توقع تھی۔

''اور مجھ سے کس سلوک کی توقع ہے۔'' دھرمو دادا کی آواز نہیں ایٹم بم کا دھماکا تھا جو راجپوت کو سر سے پاؤں تک لرزا گیا تھا۔اس کے چہرے کی رونق پھیکی پڑ گئی تھی۔خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے وہ شاکی ہوا۔

''تم نے مجھے دھوکا دیا۔'' اس کا مخاطب میں تھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔''اسے دھوکا دینا نہیں کہتے۔نہ مسلمان دھوکا دیا کرتے ہیں۔زیادہ سے زیادہ غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا الزام دھر سکتے ہو۔اور غلط فہمی کا سبب تمہاری اپنی سوچ ہے۔میں نے تو وضاحت کر دی تھی کہ تم جانو اور تمہارے مقامی دوست۔''

''پہلے سے وضاحت کرنا چاہیے تھی کہ تم دھرمو کے آدمی ہو۔''

میں نے صفائی دی۔''ہم بس ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں کہ خوش قسمتی سے ہمارا ہدف ایک ہی تھا۔اور دھرمو دادا کا ذکر شروع میں نہ کرنے کا مقصد تمہیں تشدد اور خود کو بے جا کوفت سے بچانا تھا۔ورنہ جو کچھ تم آرام سے بتا چکے ہو یہ سب تمہارے حلق میں ہاتھ ڈال کر اگلوانا بالکل مشکل نہ ہوتا۔اگر شک ہے تو کوئی معلومات چھپانے کا دعویٰ کر کے جانچ سکتے ہو۔''

دھرمو مجھے مخاطب ہوا۔''ساتھی، میرا خیال ہے تمہارا کام ہو گیا ہے۔''

میں نے خوش دلی سے سر ہلایا۔''بالکل۔ہماری طرف سے راجپوت دادا فارغ ہے۔''

''اس کی بندشیں کھول دو۔'' نشست سنبھالتے ہوئے دھرمو دادا نے اپنے ایک چیلے کو حکم دیا۔

''جی دادا۔'' ادب سے کہہ کر اس نے چاقو نکالا اور راجپوت کی بندشیں کاٹ دیں۔دھرمو دادا کا یہ حکم اس کے خود پر اعتماد کو ظاہر کر رہا تھا۔یقیناً وہ لڑائی بھڑائی کا ماہر تھا تبھی تو فوراً ہی راجپوت کی مشکیں کھولنے کا کہا تھا۔راجپوت بیٹھ کر کلائیاں اور پنڈلیاں مسلنے لگا۔

میں نے چند لمحوں کو قدم روکے کہ ان گفتگو سنوں، مگر لورا نے بیزاری سے پوچھا۔''تمہاری تفتیش اب تک باقی ہے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو چلو.....'' میرے ہاتھ سے پکڑ کر اس نے دروازے کی طرف کھینچا۔یقیناً اسے راجپوت کی بتائی ہوئی تفصیل سننے کی بے صبری تھی۔

میں نے ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کرایا۔''تم چلو میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

''مگر.....'' اس نے منہ بسورا۔

''کہا ناں تم چلو۔'' اسے پچکارتا ہوا میں مڑا اور دھرمو کے ساتھ نشست سنبھال لی۔لورا پیر پٹختے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔

دھرمو نے میری موجودگی کو قابل اعتنا نہیں جانا تھا، وہ راجپوت سے حساب کتاب مانگ رہا تھا۔راجپوت کا جرم

دھرمو کے علاقے پر قبضہ نہیں بلکہ دھرمو کو مروانے کی کوشش تھا۔ آپس کی لڑائی میں چیلوں چمچوں کی ہلاکت قابلِ معافی تھی مگر کسی دادا پر حملہ کرنے کا رواج نہ تھا۔ اور راجپوت کی یہی غلطی تھی جس پر دھرمو دادا سرخ انگارہ بنا ہوا تھا۔ راجپوت کا جرم بالکل واضح اور ثابت تھا۔ اور بہ ظاہر اس کے پاس سوائے معذرت کرنے کے کوئی جواب نہ تھا۔ مگر وہ مختلف حجتیں اور دلائل اپنی صفائی میں پیش کرتا رہا۔ دھرمو دادا نے اس کے تمام اعتراضات کا رد دلائل سے کیا تھا۔ ان کی طویل گفتگو میں قارئین کے مطلب کی کوئی بات نہیں تبھی لکھنے سے احتراز برتا ہے۔ گفتگو کا اختتام راجپوت کی شکست کی صورت ظاہر ہوا تھا۔

دھرمو دادا نے تصدیق چاہی۔ ''یقیناً اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے تمھیں سزا کاٹنے پر اعتراض نہ ہوگا۔''

گہرا سانس لے کر راجپوت نے آنکھیں بند کیں، لمحہ بھر توقف کیا اور پھر اطمینان سے بولا۔ ''قتل کرو گے؟''

''ہاں۔'' دھرمو دادا نے دوٹوک فیصلہ سنایا۔

''کوئی اور صورت۔'' راجپوت نے دامن امید دراز کیا۔

دھرمو دادا نے نفی میں سر ہلایا۔

راجپوت برہم ہوا۔ ''تو پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے، تمھارا قیدی ہوں مارنا کون سا مشکل ہے کہ عدالت قائم کیے بیٹھے ہو۔''

دھرمو نے کہا۔ ''تمھاری موت کو فلماؤں گا اور ممبئی کے ہر گروہ کے دادا تک وہ وڈیو پہنچے گی۔ تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے دھرمو نے زیادتی کی۔''

راجپوت طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تمھارا خیال ہے میں کیمرے کے سامنے اقرار جرم کرلوں گا۔''

دھرمو نے انکشاف کیا ''تم کر چکے ہو۔ یہ ساری گفتگو ریکارڈ ہو چکی ہے۔ فیصلہ بھی ہو چکا ہے، بس عمل کرنا باقی ہے۔''

راجپوت دادا نے فیصلہ قبول کرنے کا عندیہ دیا۔ ''مرنے سے پہلے اپنی بیوی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد سزا پر عمل کر سکتے ہو۔''

دھرمو نے اپنا موبائل فون اس کی جانب پھینکا۔ راجپوت نے بیوی کا نمبر ملا کر موبائل فون کان سے لگا لیا۔

''میں بول رہا ہوں۔'' اس نے تعارف کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

چند لمحے بیوی کی گفتگو سن کر وہ حوصلے سے بولا۔ ''سمرن! بات سنو، میرے پاس زیادہ مہلت نہیں ہے۔ یاد ہے نا، کہا تھا تم دھرتی کی ہر شے، ہر فرد اور ہر رشتے سے مجھے زیادہ پیاری ہو۔ یقیناً اس قول کو سچا ثابت کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ شاید چند لمحوں بعد میں باقی نہ رہوں۔ میں نے دھرمو دادا کو مروانے کی سازش کی، اس کے لیے کرائے کے قاتل مقرر کیے مگر ناکام رہا اور اب بھگوان نے مجھے اس کے قدموں میں لا پھینکا ہے۔ اس کی مہربانی کہ اس نے میری آخری خواہش کو پورا کیا۔ مجھے یاد رکھنا سمرن اپنے راجپوت کو بھول نہ جانا۔ بھگوان تمھاری رکھشا کرے.....''

دو تین لمحے خاموش رہ کر اس نے بیوی کی بات سنی اور پھر بولا۔ ''یہ ممکن نہیں ہے سمرن، مجھے اپنا جرم قبول ہے۔ اصولوں سے انحراف میں نے کیا تھا۔ اب سزا کا حق دار بھی میں ہوں۔ میرے لیے پرارتھنا کرنا۔'' جواب سنے بغیر اس نے رابطہ منقطع کیا اور موبائل فون دھرمو کی جانب پھینک دیا۔

''میں تیار ہوں۔'' اس کے لہجے کی لرزش واضح تھی۔ چہرے پر پسینہ نمودار ہو گیا تھا اور چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اپنی موت کو قبولنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ موت کے لمحے کا نگاہوں سے اوجھل ہونا بھی اللہ پاک کی بہت بڑی نعمت ہے ورنہ دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ راجپوت کی ہمت تھی کہ وہ گڑگڑایا نہیں تھا۔

دھرمو دادا نے پستول نکالا، اس کی میگزین اتار کر خالی کی اور صرف ایک گولی اندر رہنے دی۔

دھرمو کے علاقے پر قبضہ نہیں بلکہ دھرمو کو مروانے کی کوشش تھا۔ آپس کی لڑائی میں چیلوں چمچوں کی ہلاکت قابلِ معافی تھی مگر کسی دادا پر حملہ کرنے کا رواج نہ تھا۔ اور راجپوت کی یہی غلطی تھی جس پر دھرمو دادا سرخ انگارہ بنا ہوا تھا۔ راجپوت کا جرم بالکل واضح اور ثابت تھا۔ اور بہ ظاہر اس کے پاس سوائے معذرت کرنے کے کوئی جواب نہ تھا۔ مگر وہ مختلف حجتیں اور دلائل اپنی صفائی میں پیش کرتا رہا۔ دھرمو دادا نے اس کے تمام اعتراضات کا ردّ دلائل سے کیا تھا۔ ان کی طویل گفتگو میں قارئین کے مطلب کی کوئی بات نہیں تبھی لکھنے سے احتراز برتا ہے۔ گفتگو کا اختتام راجپوت کی شکست کی صورت ظاہر ہوا تھا۔

دھرمو دادا نے تصدیق چاہی۔ ''یقیناً اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے تمھیں سزا کاٹنے پر اعتراض نہ ہوگا۔''

گہرا سانس لے کر راجپوت نے آنکھیں بند کیں، لمحہ بھر توقف کیا اور پھر اطمینان سے بولا۔ ''قتل کرو گے؟''

''ہاں۔'' دھرمو دادا نے دوٹوک فیصلہ سنایا۔

''کوئی اور صورت۔'' راجپوت نے دامن امید دراز کیا۔

دھرمو دادا نے نفی میں سر ہلایا۔

راجپوت برہم ہوا۔ ''تو پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے، تمھارا قیدی ہوں مارنا کون سا مشکل ہے کہ عدالت قائم کیے بیٹھے ہو۔''

دھرمو نے کہا۔ ''تمھاری موت کو فلماؤں گا اور ممبئی کے ہر گروہ کے دادا تک وہ وڈیو پہنچے گی۔ تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے دھرمو نے زیادتی کی۔''

راجپوت طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تمھارا خیال ہے میں کیمرے کے سامنے اقرارِ جرم کرلوں گا۔''

دھرمو نے انکشاف کیا ''تم کر چکے ہو۔ یہ ساری گفتگو ریکارڈ ہو چکی ہے۔ فیصلہ بھی ہو چکا ہے، بس عمل کرنا باقی ہے۔''

راجپوت دادا نے فیصلہ قبول کرنے کا عندیہ دیا۔ ''مرنے سے پہلے اپنی بیوی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد سزا پر عمل کر سکتے ہو۔''

دھرمو نے اپنا موبائل فون اس کی جانب پھینکا۔ راجپوت نے بیوی کا نمبر ملا کر موبائل فون کان سے لگا لیا۔

''میں بول رہا ہوں۔'' اس نے تعارف کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

چند لمحے بیوی کی گفتگو سن کر وہ حوصلے سے بولا۔ ''سمرن! بات سنو، میرے پاس زیادہ مہلت نہیں ہے۔ یاد ہے نا، کہا تھا تم دھرتی کی ہر شے، ہر فرد اور ہر رشتے سے مجھے زیادہ پیاری ہو۔ یقیناً اس قول کو سچا ثابت کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ شاید چند لمحوں بعد میں باقی نہ رہوں۔ میں نے دھرمو دادا کو مروانے کی سازش کی، اس کے لیے کرائے کے قاتل مقرر کیے مگر ناکام رہا اور اب بھگوان نے مجھے اس کے قدموں میں لا پھینکا ہے۔ اس کی مہربانی کہ اس نے میری آخری خواہش کو پورا کیا۔ مجھے یاد رکھنا سمرن اپنے راجپوت کو بھول نہ جانا۔ بھگوان تمھاری رکھشا کرے.....''

دو تین لمحے خاموش رہ کر اس نے بیوی کی بات سنی اور پھر بولا۔ ''یہ ممکن نہیں ہے سمرن، مجھے اپنا جرم قبول ہے۔ اصولوں سے انحراف میں نے کیا تھا۔ اب سزا کا حق دار بھی میں ہوں۔ میرے لیے پرارتھنا کرنا۔'' جواب سنے بغیر اس نے رابطہ منقطع کیا اور موبائل فون دھرمو کی جانب پھینک دیا۔

''میں تیار ہوں۔'' اس کے لہجے کی لرزش واضح تھی۔ چہرے پر پسینہ نمودار ہو گیا تھا اور چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اپنی موت کو قبولنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ موت کے لمحے کا نگاہوں سے اوجھل ہونا بھی اللہ پاک کی بہت بڑی نعمت ہے ورنہ دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ راجپوت کی ہمت تھی کہ وہ گڑگڑایا نہیں تھا۔

دھرمو دادا نے پستول نکالا، اس کی میگزین اتار کر خالی کی اور صرف ایک گولی اندر رہنے دی۔

میگزین دوبارہ چڑھا کر اس نے پستول کاک کیا۔ اس کی آنکھوں میں سرد مہری و سفاکی چھلک رہی تھی۔ اس کے پستول سیدھا کرتے ہی راجپوت نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

''ایک منٹ دھرمو دادا۔'' میں نے اسے مخاطب کیا۔

وہ بے گانگی سے میری طرف متوجہ ہوا۔

میں اطمینان سے بولا۔ ''تم غلط کر رہے ہو۔''

وہ درشتی سے بولا۔ ''میں تمھارے معاملے میں مخل نہیں ہوا تھا۔''

''وہاں تمھاری دخل اندازی کو تھا کیا؟..... ایک آدمی سے پوچھ گچھ کر رہے تھے تم نے کیا مداخلت کرنا تھی۔''

''راجپوت کی موت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ کہنا ہے تو بولو.....''

''راجپوت دادا کی موت کا فیصلہ تم کیسے کر سکتے ہو؟..... مانا اس نے غلط کیا اور وہی غلطی تم بھی دہرا رہے ہو۔ جب کسی بھی دادا کا قتل تمھاری پر میرا (ریت، روایت) میں جرم ہے۔ تو راجپوت دادا کا قتل بھی جرم ہوگا۔ اور اس کی موت کے بعد کسی دوسرے کو تمھیں قتل کرنا جائز ہو جائے گا۔ البتہ تم ممبئی کے تمام دادوں کی بیٹھک بلا کر راجپوت دادا کو عام غنڈا تسلیم کراؤ، اس کے بعد قتل کر دو۔''

''ایسی بیٹھک کا رواج ہمارے ہاں نہیں ہے۔ کسی دادا کو اس کی موت میں دلچسپی نہیں ہوگی۔''

''شاید ایسا ہی ہو، مگر تمھارے ایک دوسرے کے قتل سے انحراف کرنے کی روایت ٹوٹ جائے گی۔ راجپوت نے غلطی کی، اسے کامیابی نہ ملی۔ تمھاری کامیابی میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں ہے۔ لیکن یاد رکھنا راجپوت دادا کے قتل کے بعد یہ سلسلہ رکے گا نہیں۔ کوئی بھی راجپوت دادا کے قتل کی وجوہات جاننے کی کوشش نہیں کرے گا۔ ایک روایت کے خلاف جب کوئی عمل ہوتا ہے تو وہ ہر اس شخص کو ترغیب دیتا ہے جس کے دل میں اس روایت کے خلاف کچھ کرنے کا داعیہ موجود ہوتا ہے۔ پھر ہر منحرف کی دلیل روایت توڑنے والا بنتا ہے۔ یقین مانو راجپوت دادا کا قتل ایک نئی جنگ کو جنم دے گا، ایک ایسی آگ کو بھڑکا دے گا جس کے شعلے تمھارے دامن تک بھی پہنچیں گے۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''تم اس کی وکالت کر رہے ہو کہ اسے زبان دے چکے ہو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایسا کچھ نہیں ہے، راجپوت سے وعدہ کیا تھا کہ میں یا لورا براؤن اسے قتل نہیں کریں گے۔ اور تمھارا اسے قتل کرنا میرے وعدے کو نہیں توڑتا۔ باقی میرا مقصد فقط سمجھانا ہے، کیوں کہ میں تمھارا بھلا چاہتا ہوں۔ اور اگر میرے دلائل تمھارے نزدیک غلط ہیں تو، کون سا تمھیں بہ زور بازو روک رہا ہوں۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''تم نے میری جان بچائی تھی، راجپوت بھی تمھاری وجہ سے میرے ہاتھ آیا ہے۔ پھر میں اپنے محسن کی خواہش کو کیسے ٹھکرا سکتا ہوں۔''

''اللہ پاک کی قسم، راجپوت دادا کے قتل پر میں ناخن برابر بھی تم سے خفا نہیں ہوں گا۔ میں اب بھی تمھارا فائدہ چاہتا ہوں۔ یہاں میرا قیام نہایت مختصر ہے۔ اور تم نے ساری زندگی یہیں رہنا ہے۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے میگزین اتار کر بقیہ گولیاں بھریں، میگزین چڑھائی اور پستول ہولسٹر میں رکھ لیا۔ یہ اعلان تھا کہ اس نے راجپوت دادا کے قتل کا ارادہ تبدیل کر دیا تھا۔

وہ طنزیہ انداز میں مستفسر ہوا۔ ''اب اس کا کیا کروں؟''

میں نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔ ''تمھارا ذاتی معاملہ ہے۔''

''بکواس بند کرو اور مناسب مشورہ دو۔'' اس کے لہجے میں بے تکلفی و اپنائیت بھری تھی۔

میں متبسم ہوا۔ ''تمھارا جتنا نقصان ہوا ہے، وصول کر کے چھوڑ دو۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''یہ جرمانہ تو نہ ہوا۔''

''میں دگنا دوں گا۔'' موت کو ٹلتا دیکھ کر راجپوت کے چہرے پر رونق لوٹ آئی تھی۔

''میں چلتا ہوں باقی تفصیلات تم خود طے کر لینا۔'' میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''ذیشان صاحب!'' راجپوت نے بے ساختہ آواز دی۔ میں رک کر مڑا۔

وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''معلوم نہیں تمھیں میری وکالت کی ضرورت کیوں کر پیش آئی۔ بہ ہر حال بہت بہت شکریہ۔''

میں نے متبسم ہو کر اوپر نیچے سر ہلایا اور باہر نکل آیا۔ لورا میرے کمرے میں بے چینی سے منتظر تھی۔ وشواس سنگھ کی کوٹھی میں ہم علیحدہ علیحدہ کمرے میں رہ رہے تھے۔ کیوں کہ ایک کمرے میں رہنے کی کوئی وجہ نہیں بنتی تھی۔ مجبوری کی حالت میں ہم ایک چارپائی پر بھی لیٹے رہے تھے اور اب ایسی مجبوری نہیں تھی تو ہمارا علیحدہ لیٹنا ہی مناسب تھا۔ اس معاملے میں لورا بھی میری ہم خیال تھی۔ بلاشبہ پہناوے اور گفتگو کے لحاظ سے اس میں یورپین لڑکیوں والی بے باکی پائی جاتی تھی، مگر عورت و مرد کی ممنوعہ حدود کو پھلانگنے والی بے حیائی اس میں بالکل موجود نہیں تھی۔ اس معاملے میں اس کے خیالات مشرقی لڑکیوں جیسے تھے۔ اپنے ماضی میں بھی وہ صرف نک اسٹیورٹ کی قربت کا برملا اعتراف کرتی تھی، اس کے علاوہ بہ قول اس کے اس کا ماضی صاف تھا۔

''اتنی دیر لگا دی۔'' مجھے دیکھتے ہی وہ بے تابانہ انداز میں کھڑی ہوئی۔

میں رکھائی سے بولا۔ ''تمھیں انتظار کرنے کو کس نے کہا تھا۔ اتنی رات گزر گئی ہے سو جاتیں۔''

''سو جاتیں.....'' اس نے منہ بگاڑ کر میری نقل اتاری۔

میں جھلاتے ہوئے بولا۔ ''کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا، صبح بھی بات ہو سکتی تھی۔''

وہ چڑچڑاتے ہوئے بولی۔ ''منہ بند اور تفصیل شروع۔''

میں ہنسا۔ ''بند منہ سے تفصیل بتانے کا طریقہ مجھے نہیں معلوم۔''

وہ روہانسا ہوئی۔ ''ریجا تنگ نہ کرو۔''

''اچھا بیٹھ جاؤ۔'' مسہری پر نشست سنبھال کر میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ کرسی سنبھال کر پراشتیاق نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔ میں نے راجپوت سے سنی ہوئی تمام تفصیل دہرا دی تھی۔ بیچ بیچ میں وہ ضروری باتوں کی وضاحت مانگتی رہی۔ آخر میں اس نے راجپوت اور دھرمو کے درمیان ہونے والے معاہدے کی بھی تفصیل جانی اور پھر کرسی چھوڑ کر اٹھتے ہوئے بولی۔ ''اب آرام کر سکتے ہو۔''

''شکریہ۔'' طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے میں لیٹ گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے باہر نکل گئی۔

مگر سونا میری قسمت میں نہیں تھا۔ ایک آدمی دھرمو دادا کا بلاوا لیے آ پہنچا۔ معلوم ہوا وہ راجپوت کو رہا کر رہا تھا اور جانے سے پہلے راجپوت نے مجھ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میں کوفت بھرے انداز میں ادھر بڑھ گیا۔ مجھے یقین تھا راجپوت نے ایک بات پھر میرا شکریہ ادا کرنے کو ملنے کی تمنا کی تھی۔

دونوں دادا خوش گوار موڈ میں شراب نوشی میں مصروف تھے۔ راجپوت اٹھ کر مجھ سے بغلگیر ہوا۔

''راجا ذیشان! ایک بار پھر دھنے واد۔ اور رندھیر شکلا کو بلیک میل کرنے کا اہم مواد تمھیں کرن چاولہ سے ملے گا، اس نے شکلا کے بارے ایسی ایسی دستاویزات اکٹھی کر رکھی ہیں جنھیں شکلا صاحب کبھی منظر عام پر نہیں آنے دے گا۔ تمام

معلومات اس کے دفتر کی تجوری میں محفوظ ہیں۔ یہ اطلاع چند دن پہلے مجھے کرن چاولہ کے خاص الخاص آدمی سے ملی ہیں۔ ارادہ تھا شکلا صاحب کو مطلع کروں گا مگر موقع نہ مل سکا۔ اور ان سے ملاقات سے پہلے یہ حادثہ ہو گیا۔''

میں نے امید ظاہر کی۔ ''کیا اب بھی یہ خبر اپنے تک محدود رکھو گے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس بارے کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

میں طعنہ زن ہوا۔ ''گویا شکلا کے سچے خیر خواہ ہو۔''

''اسے نہ بتانے میں تمھارا کیا فائدہ؟..... یا تم کرن چاولہ پر ہاتھ ڈالنے کا سوچے ہوئے ہو۔''

''وہ میرا دردسر ہے۔''

اس نے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔ ''ڈر رہے ہو کہیں کرن کو آگاہ نہ کر دوں۔''

میں متبسم ہوا۔ ''اگر ایسا ہوتا تو تمھیں بچانے کو دھرمو دادا سے ٹکرا نہ کرتا۔ تمھارے بھائی وشال گپتا کی گردن اتار دیتا اور تمھارے محافظوں میں ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑتا۔ یاد رکھنا میں اصولوں پر سودا بازی نہیں کیا کرتا۔ کسی بے گناہ کی جان لینا میرے نزدیک سب سے بڑا گناہ ہے۔ اور احسان کر کے بدلہ چاہنے والا تاجر ہے جو اپنی نیکی کا بھاؤ چاہتا ہے۔''

''یاد رہے، کرن چاولہ کے دفتر کی تجوری کھولنا عام آدمی کے لیے بالکل ناممکن ہے۔ کوئی ماہر قفل شکن ڈھونڈ کے ہی ادھر کا رخ کرنا ورنہ پکڑے جاؤ گے۔'' اس نے میری پیٹھ تھپکی۔ ''بھگوان تمھاری رکھشا کرے۔'' اور دھرمو کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ''چلنا چاہیے۔''

دھرمو دادا نے اپنے دو ساتھیوں کو راجپوت کے ساتھ جانے کی ہدایت کی۔ باہر نکلنے سے پہلے انھوں نے راجپوت کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ اسے چھوڑنے کا مقصد اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا ہرگز نہیں تھا۔ البتہ امید یہی تھی کہ اب ان کے درمیان پہلے والی دشمنی نہ رہتی۔

میں اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ پورا دن اور آدھی سے زیادہ رات بے آرامی میں گزر گئی تھی۔ اب جسم آرام کا طلب گار تھا۔ مخصوص حالات میں میں اڑتالیس، اڑتالیس گھنٹے مسلسل جاگ کر اور حرکت میں رہ کر گزار چکا تھا۔ ضبط و برداشت کرنا ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔ موقع ملنے پر آرام نہ کرنا؛ کسی قاعدہ قانون میں آتا ہے نہ اس کی سکھلائی یا ترغیب دی جاتی ہے۔

بستر پر لیٹتے ہوئے حسب معمول پلوشے اپنے ناز و ادا کے جلوؤں کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آ دھمکی۔ کبھی کبھار دل میں شدت سے خواہش اٹھتی کہ اسے گھنٹی کروں، اس کی آواز سنوں آیا اب بھی خفا ہے یا تین چار مہینوں کی دوری نے سرد مہری کو حرارت میں تبدیل کر دیا ہے۔ مگر پھر انصاری صاحب کا حکم یاد آ جاتا، انھوں نے سختی سے اور بار بار تاکید کر کے گھر گھنٹی کرنے سے منع کیا تھا۔

''تم دونوں نے کسی بھی صورت، کسی بھی حالت، کسی بھی وجہ سے پاکستان کال نہیں کرنا۔ صرف ایک صورت میں گھنٹی کر سکتے ہو کہ اپنی موت کا سو فیصد یقین ہو جائے تب مضائقہ نہیں۔ اگر عشاریہ ایک فیصد بھی بچنے کا امکان ہو تو یہ غلطی نہ کرنا۔''

اب دونوں میں سے ایک ہی بچا تھا۔ دوسرا خالق حقیقی کے پاس پہنچ گیا تھا۔ رابطے کا ذریعہ ہونے کے باوجود بات نہ کرنا بھی بہت بڑی آزمائش تھی۔ اپنی مثال مجھے صاحب حیثیت روزہ دار کی سی لگتی کہ جس کے پاس شرب و طعام (کھانے پینے) کی ہر نعمت موجود ہونے کے باوجود وہ اذان مغرب کا منتظر ہوتا ہے۔ نجانے میری افطاری کب ہونا تھی کہ سماعتیں اپنی پلوشے کی مدھر، رس بھری اور موہنی آواز سننے کی سعادت حاصل کرتیں۔ وہ دل کی گہرائیوں سے مجھے چاہتی تھی۔ اور

یقیناانڈیا آنے کواس نے میرا جھوٹ اور اسے ورغلانے کی جذباتی دھونس سمجھا تھا۔ ورنہ ممکن ہی نہ تھا کہ اس کا دل نہ پسیجتا۔

اسے یاد کرتے ہوئے آہستہ آہستہ میرا دماغ غنودگی میں ڈوب گیا اور میں ایسی دنیا میں پہنچ گیا جہاں وہ اب تک میرے ہمراہ تھی۔ نجانے محبوب کا پھولوں سے کون سا قریبی تعلق ونسبت ہے کہ وہ اکثر سبزہ زار اور پھولوں کے درمیان ہی متحرک نظر آتی۔ اس کے خوب صوت رقص اور ناز وادا سے میں زیادہ دیر محظوظ نہیں ہو سکا تھا۔ دروازے پر زوردار دستک ہوئی، ایک سنائپر کی نیند اتنی گہری نہیں ہوتی کہ پہلی دستک پر نہ جاگے۔ میری چھٹی حس نے کسی نامعلوم خطرے کی نشان دہی کی، وہ خیر کی دستک نہیں لگ رہی تھی۔

میرے مسہری سے اترنے سے پہلے دروازہ دوبارہ بجنے لگا، ساتھ ہی دھرموداادا کے آدمی وناش مہتا کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔ ''ذیشان صاحب..... ذیشان صاحب۔''

میں نے زقند بھر کر دروازہ کھولا اور بے تابی سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ تیز لہجے میں بولا۔ ''فی الفور یہ ٹھکانہ چھوڑنا ہوگا۔ دھرموداادا صحن میں آپ لوگوں کا منتظر ہے۔''

میں سوال جواب میں وقت ضائع کرنے کے بجائے لورا کے کمرے کی طرف بھاگا، اسے مطلع کر کے میں نے تیار ہونے میں تین چار منٹ سے زیادہ دیر نہ لگائی۔ یوں بھی ہمارے پاس ایس آر ون کے بیگ اور دو تین جوڑے کپڑوں کے علاوہ سمیٹنے کو کچھ نہ تھا۔

میں اور لورا قریباً ایک ساتھ اپنے کمروں سے برآمد ہوئے۔ حویلی کے صحن میں کھلی چھت کی دو جیپیں اور ایک کار اسٹارٹ حالت میں تیار کھڑی تھیں۔ ہم کار میں بیٹھ گئے۔ میں درمیان میں تھا، دھرموداادا اور لورا میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ گاڑیاں تیز رفتاری سے حویلی سے نکل آئیں۔

''کیا ہوا؟'' حویلی سے نکلتے ہی میں دھرموداادا کی طرف متوجہ ہوا۔

دھرمو بولا۔ ''راجپوت دادا نے اطلاع دی ہے کہ یہاں ایجنسی کا چھاپہ پڑنے والا ہے۔''

میں متعجب ہوا۔ ''مگر کیسے؟..... راجپوت دادا کی تو آنکھیں بند کر کے یہاں سے لے گئے تھے۔''

دھرموداادا نے منہ بنایا۔ ''میں نے کب کہا ہے راجپوت دادا نے مخبری کی ہے۔''

''پھر ایجنسی والوں کو یہاں کا پتا کیسے چلا؟'' میری حیرانی برقرار رہی۔

دھرمو تفصیل بتانے لگا جس کا لب لباب یہ تھا کہ..... راجپوت دادا کی بیوی نے اپنے دیور وشال گپتا کو شوہر سے ہونے والی آخری گفتگو سے مطلع کیا، وشال گپتا نے شکلا اور کرن چاولہ سے بات کی۔ تبھی دھرمو کے موبائل فون نمبر کا تذکرہ ہوا اور انھوں نے موبائل فون نمبر کے ذریعے ہمیں تلاش کر لیا۔ دھرمو کو اندازہ نہیں تھا کہ دشمن ہماری تلاش میں اس حد تک جا سکتے تھے۔ چونکہ عام غنڈوں کی آپس کی لڑائیوں میں موبائل فون نمبر کے ذریعے دشمن کو ڈھونڈنے کا نہ تو رواج ہے اور نہ غنڈوں کے پاس ایسی سہولیات موجود ہیں۔ مگر وہاں روایتی غنڈوں کی جگہ ''را'' نے لے لی تھی۔ اور ان کے پاس انڈیا کی حد تک لامحدود وسائل تھے۔ شکلا کا براہ راست ''را'' سے تعلق نہیں تھا، مگر اس کے روابط بہت اونچی سطح تک تھے۔ اور بلاشبہ شکلا اور کرن چاولہ اتنی تگ ودو، میرے اور لورا کے لیے کر رہے تھے۔ بلکہ اصل ہدف لورا براؤن تھی۔ شکلا جیسے جنسی بھیڑیے کے لیے لورا نہ صرف عیش وعشرت کا سامان تھی بلکہ دولت کے پجاری کو ایس آر ون رائفلیں بھی چاہیے تھیں۔ ایک پاکستانی جس پر جاسوس ہونے کا الزام تھا اس کی اہمیت بھی کوئی کم نہ تھی مگر پہلا نمبر تو دولت کا ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے جاسوس تو دونوں ممالک آئے روز پکڑتے رہتے ہیں۔

ہمارا رخ ممبئی کے بجائے کسی اور جانب تھا۔ کیوں کہ ممبئی کا رخ کرنے پر راستے میں دشمن سے ٹکراؤ ممکن تھا۔ سفر گھنٹا

بھر جاری رہا۔ علاقہ ان دیکھا تھا، اس لیے کوئی اندازہ نہ تھا کہ رخ کدھر کو ہے۔ سفر کا اختتام ایک آبادی پر ہوا۔ خیر ممبئی کا مضافاتی علاقہ دور دور تک مختلف قانونی وغیر قانونی آبادیوں سے اٹا پڑا ہے۔ خالی جگہ کم ہی نظر پڑتی ہے۔ غیر ترقی یافتہ گاؤں کے بیچوں بیچ ایک درمیانہ سا مکان تھا جس میں تین ہی کمرے تھے۔ وہ دھرمو دادا کے ایک کارندے منیش کا مکان تھا جہاں اس کی بیوی اپنے دو بچوں کے ساتھ موجود تھی۔ اس کی بیوی، بچوں اور لورا کو ایک کمرے میں کر دیا اور باقی دو کمروں میں ہم برابر تقسیم ہو کر ٹھہر گئے۔ اتنی چارپائیاں موجود نہیں تھیں کہ تمام کو کافی ہوتیں، فرش پر چٹائیاں بچھا کر سبھی نیچے ہی لیٹ گئے تھے۔ ہم طلوع آفتاب سے چند لمحے پہلے ہی وہاں پہنچے تھے۔ دوپہر تک بے خبر سوئے رہے۔ اٹھ کر باری باری تازہ دم ہوئے، اتنی دیر میں کھانا تیار ہو گیا تھا۔

کھانے کے بعد وہ کسی مستقل رہائش کا بندوبست کرنے کا سوچنے لگے۔ کیوں کہ دھرمو دادا کے سبھی اڈے تو ایجنسیوں کی نظر میں تھے۔ اور اس چھوٹے سے مکان میں بھی مستقل قیام ممکن نہ تھا۔

میں ان کی گفتگو میں مخل ہوا۔

''دھرمو دادا! بہتر ہوگا ''را'' سے ٹکر نہ لو۔ انڈیا میں رہ کر را کے مفادات سے ٹکرانا ایسا ہے گویا پانی میں مگرمچھوں کے جھنڈ سے مقابلہ کرنا۔ پولیس، فوج، ایجنسیاں، نیم سرکاری، سول ادارے یہاں تک کہ راجپوت جیسے دادا بھی تمھارے خلاف صف آراء ہو جائیں گے۔''

وہ مستفسر ہوا۔ ''کہنا کیا چاہتے ہو؟''

میں نے وضاحت کی۔ ''ہمارا ساتھ یہیں تک تھا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم نے دھرمو کے ظرف کا غلط اندازہ لگایا ہے۔''

میں متبسم ہوا۔ ''میں اپنی حفاظت کو تم سے علیحدہ ہو رہا ہوں جناب! تمھارا ساتھ محفوظ نہیں رہا۔ کیوں کہ تمھارے ایک کارندے کا پکڑا جانا ہماری شامت لا سکتا ہے۔''

مجھے سوچتی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے وہ مصر ہوا۔ ''یقین مانو صرف مسلم ہی مخلص نہیں ہوتے، ہندوؤں میں بھی قربانی دینے والوں کی کمی نہیں ہے۔''

''اگر تمھارے جان دینے سے ہم بچ جاتے تو میں علیحدہ ہونے کا فیصلہ کبھی نہ کرتا۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ ''را'' تمھاری راہ پر لگ گئی ہے۔ اور صرف تمھارا مخلص ہونا کافی نہیں ہے۔ اپنے ہر آدمی کے خلوص کی یقین دہانی تم نہیں کرا سکتے۔ اور بالفرض تمھارے سارے ساتھیوں کو مخلص مان بھی لیا جائے تو صرف ہمارے لیے یہ تمام کیوں پولیس و ایجنسیوں سے چھپتے پھریں۔''

وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''جرم کی دنیا اپنانے والے کو سب سے پہلے روپوشی کی تربیت لینا پڑتی ہے۔''

''عام جرم اور دیش دروہی (وطن سے غداری) میں فرق ہے۔ عام مجرم تھانے میں بیٹھ کر پولیس والوں سے گپ شپ کرتے ہیں اور پولیس کو مطلوب بھی ہوتے ہیں۔''

وہ شاکی ہوا۔ ''تو کیا تم جاسوس ہو۔''

میں نے کہا۔ ''تمھاری سرکار یہی سمجھتی ہے۔ اور بھارتی ناگر (بھارتی شہری) ہونے کے ناتے تمھارا بھی یہی فرض بنتا ہے کہ جو تمھاری سرکار سمجھتی ہے، تم بھی وہی مانو۔''

اس نے متنبہ کیا۔ ''کیوں اپنی مشکلات بڑھانا چاہتے ہو۔''

''یقین مانو تم سے علیحدہ ہو کر ہماری مشکلات میں کمی آئے گی۔ ہمیں چھپنا بھی آتا ہے اور اپنی حفاظت بھی کر سکتے

ہیں۔ باقی کبھی تمھاری مدد کی ضرورت پڑی تو تکلف نہیں کریں گے۔''

چند لمحے گہری سوچ میں کھوئے رہنے کے بعد اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جیسا تم چاہو۔''

میں نے بے تکلفی سے مطالبہ کیا۔ ''ہمیں ایک برقع، کوئی ایسی کار جو تمھارے کسی مشہور بندے کے نام پر نہ ہو اور تھنڈر بولٹ چاہیے۔''

اس نے تصدیق چاہی۔ ''تھنڈر بولٹ، وہی دور مار رائفل ہے نا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس نے مشورہ دیا۔ ''اگر اپنی ساتھی کو چھپانے کی غرض سے برقع درکار ہے، تو بہتر ہوگا اس کا حلیہ تبدیل کر دو۔''

میں نے خوشگوار حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا یہ ممکن ہے؟''

وہ خوش دلی سے بولا۔ ''تمھارے گمان سے بھی بڑھ کر۔ بھگوان کی کرپا سے روپ بدلنے کا ماہر (میک اپ والا) یہیں پر موجود ہے۔''

میں مسرت سے بولا۔ ''پھر نئی شکلوں کے مطابق ہمیں شناختی کاغذات بھی چاہیے ہوں گے۔''

''بے فکر رہیں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

—●—

شام تک ہمارا حلیہ تبدیل ہو چکا تھا لیکن شناختی کارڈ وغیرہ بننے کو ایک دن چاہیے تھا۔ پاکستان کی طرح انڈیا میں بھی جعلی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ بنانا نہایت آسان ہے بہ شرط جیب میں رقم اور تھوڑا بہت اثر رسوخ ہو۔ بلکہ رقم اثر رسوخ سے بھی کئی گنا بڑھ کر ہے۔

لورا اب کالے بالوں والی، سانولے رنگ کی دوشیزہ کا روپ دھار چکی تھی۔ اس کی ستواں ناک میں مخصوص سپرنگ ڈال کر نسبتاً موٹا کر دیا تھا۔ بھوری آنکھیں لینز سے سیاہ ہو گئی تھیں۔ بالوں میں سرسوں کا تیل چپڑ کر چوٹی باندھی گئی۔ کھلی شلوار قمیص اور سر پر دوپٹا اوڑھ کر جب اس نے آئینے میں اپنی ہیئت کذائی دیکھی تو خوب قہقہے لگائے تھے۔ اگر اس کے آئینہ دیکھنے سے پہلے تصویر نکال کر اسے دکھائی جاتی تو وہ خود کو نہ پہچانتی۔ میرے حلیے میں بھی مناسب تبدیلی ہو گئی تھی۔

بہروپ کے ماہر سے ہم نے جلد کا رنگ تبدیل کرنے والے دو تین اقسام کے لوشن، مختلف رنگ کے آنکھوں کے عدسے، دو تین وگیں، نقلی داڑھی مونچھ، ناک میں ڈالنے کے مخصوص اسپرنگ، مصنوعی جبڑے اور چند دوسری چیزیں لے لیں جو ہم خود استعمال کر کے اپنا حلیہ تبدیل کر سکتے تھے۔ اس ماہر نے گھنٹے ڈیڑھ میں ہمیں اس قابل کر دیا تھا کہ اپنے چہرے میں مناسب تبدیلیاں لا کر اصلیت چھپا لیتے۔ ان لوازمات کے نام وغیرہ بھی میں نے ذہن نشین کر لیے کہ یہ چیزیں جاسوس کی زندگی کے لیے جزو لاینفک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نہ جانے انصاری صاحب نے اس متعلق کیوں دھیان نہیں دیا تھا۔ شاید ان کے نزدیک ہم اس کام سے پہلے سے واقف تھے۔

دھرمو نے میری تمام ضروریات پوری کر دی تھیں اور آئندہ رابطے کو چند نمبر بھی بتلائے جو میں نے ذہن نشین کر لیے تھے۔ شناختی کاغذات کے مطابق میرا نام انوپ مشرا اور لورا براؤن کاکو بتایا گیا تھا۔

جانے سے پہلے میں نے تاکید کی۔

''اب چھپنا چھوڑو اور کسی اڈے پر چلے جانا۔ ہماری شناخت سے لاعلمی کا اظہار کرنا بہتر رہے گا۔ کہنا ہم خود تمھارے پاس آئے تھے اور راجپوت دادا کو پکڑنے کی شرط پر تم سے معاہدہ ہوا تھا۔ مقابلے کی کوشش کرنا بے وقوفی ہو گی۔ تمھارے ساتھی ہماری اصلیت سے یوں بھی ناواقف ہیں۔ امید ہے چند دن کی تفتیش کے بعد تمھیں چھوڑ دیں

گے۔ خواہ مخواہ کا دردِ سر مول لینا یقیناً انھیں گوارا نہ ہوگا۔''

وہ مسکرایا۔ ''پتاجی (ابوجان) بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں ان ایجنسیوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ تم سے جان چھوٹنے پر انھیں سنبھالنا مشکل نہ ہوگا۔''

میں جوابی قہقہے کے ساتھ بغلگیر ہوا۔ طلوع آفتاب کے ساتھ ہم نکل آئے۔ دھرمو دادا نے ایک پرانی ٹیکسی ہمارے حوالے کی تھی۔ جو اسی گاؤں میں کسی سے خریدی تھی۔ ڈگی میں اپنا سامان بھر کر ہم چل پڑے۔ میں نے لورا کو خاموش رہنے کی تاکید کی تھی کہ اب اس کی پہچان زبان کھولنے سے ہونا تھی ورنہ اس کی شکل بالکل ہی تبدیل ہوگئی تھی۔

ممبئی زیادہ دور نہیں تھا، لیکن اس شہر کی آبادی اتنی گنجان ہے اور شہر نے اتنا پھیلاؤ اختیار کرلیا ہے کہ اندرون شہر ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ تک جانے پر گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔ وقت کی کمی نہیں تھی کہ تیزی کرتے۔ حلیہ ہمارا ایسا تھا کہ نگاہوں کا مرکز نہیں بن سکتے تھے۔ دو تین جگہوں پر پولیس والوں نے روکا مگر بابا قائداعظم کی طرح ان کے عینک والے بابا، مہاتما گاندھی کی تصویر میں بھی بڑی طاقت چھپی ہے۔ سو روپے کے نوٹ نے پولیس والے کی درشتی خوشگوار مسکراہٹ میں تبدیل کردی تھی۔ ٹیکسی کے کاغذات جانچنا تو درکنار انھوں نے ہمارا نام پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

اس بار رہائش کو میں نے ایک ساحلی بستی میں چھوٹی سے کھولی ڈھونڈی تھی۔ ایک کمرہ، بیت الخلاء، مختصر سا صحن اسی میں رسوئی (باورچی خانہ) بنی تھی۔ وہ ایسا علاقہ تھا جہاں ننگ دھڑنگ بچے بچیوں کی بہتات تھی۔ جگہ جگہ گندا پانی کھڑا تھا، غلاظت پھیلی تھی۔ لورا نے ناک بھوں چڑھائی۔ مجھے اس کی طبیعت صاف کرنا پڑی۔

''اگر زیادہ ہی عیش و آرام اور سہولتوں کا شوق ہے تو شکلا کی خواب گاہ بہتر رہے گی۔''

وہ برہم ہوئی۔ ''ریجا کے منہ سے بکواس نہ نکلے، ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔''

میں نے جھڑکا۔ ''انڈیا میں اپنی موجودگی کی وجہ پر غور کرنے کے بعد ہی منہ کھولا کرو۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''اس غلیظ جگہ کے علاوہ بھی چھپنے کو کئی مقام ہوں گے۔''

میں نے کھولی میں نظریں دوڑاتے ہوئے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ ''تو ڈھونڈ لو۔''

وہ دھمکانے والے انداز میں بولی۔ ''تمھارے بار بار کے طعنوں سے تنگ آکر میں کسی دن سچ مچ علیحدہ ہوجاؤں گی۔''

میرا قہقہہ بلند ہوا۔ ''کیا لگتا ہے مجھے کوئی فرق پڑے گا۔''

زبان نکال کر میرا منہ چڑاتے ہوئے اس نے بدبودار و میلے کچیلے بستر کو لپیٹ کر نیچے پھینکا۔ ''اس غلاظت پر سونے سے بہتر ہے میں گرفتاری دے دوں۔''

''روکا کس نے ہے۔''

وہ شاکی ہوئی۔ ''تم نئے بستر بھی نہیں خرید سکتے؟''

میں اطمینان سے بولا۔ ''سارا پیسا تمھارے علاج پر خرچ ہوگیا ہے۔''

وہ طعنہ زن ہوئی۔ ''شاید احسان جتانے کے علاوہ تمھیں کچھ نہیں آتا۔''

میں ترکی بہ ترکی بولا۔ ''اور تمھاری زبان شکوے شکایت کے علاوہ کچھ نہیں بول سکتی۔''

وہ تلملاتے ہوئے بولی۔ ''نئے بستر لانے ہیں کہ نہیں۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''بستر تو لے دوں گا، البتہ یہ ناز نخرے ہونے والے شوہر کو دکھانا۔''

وہ مجھے برہمی سے گھور کر رہ گئی تھی۔ میں مسکراتے ہوئے باہر نکل آیا۔ ایس آر ون اور تھنڈر بولٹ میں نے ٹیکسی کی

ڈگی میں قفل کر دی تھیں، تا کہ حادثاتی طور پر بھاگنے کی صورت میں انھیں نہ سنبھالنا پڑے۔ ٹیکسی کی ظاہری حالت اتنی گئی گزری تھی کہ کوئی اسے چرانے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔

بازار قریب ہی تھا آدھے گھنٹے میں میں نئے کمبل، بستر کی چادریں اور تکیے اور ٹی وی وغیرہ خرید لایا تھا۔ دو چارپائیوں پر نئے بستر بچھا کر ہم دروازہ اندر سے کنڈی کر کے لیٹ گئے۔ اب اگلا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ میں شکلا کو ڈھونڈ کر قتل کرنے پر مصر تھا اور لورا پہلے اس سے رقم بٹورنے کی متمنی تھی۔

''ریجا، مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔ اس سؤر کی سزا صرف موت نہیں بنتی۔ اسے میری بربادی کا بھی حساب دینا ہوگا۔''

''تمھاری بربادی کی سزا تو اس کی موت ہوگئی اور رقم کس خوشی میں وصول کرو گی۔''

''کیوں کہ مجھے اس نے سودے کو بلایا تھا اور مکر گیا۔''

میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''تم کون سا ایمان داری سے سودا کرنے آئی تھیں۔''

وہ بپھرتے ہوئے بولی۔ ''تم میرے ساتھ ہو یا شکلا کے۔''

''میں عدل کے ساتھ ہوں۔''

وہ استہزائی انداز میں بولی۔ ''ایک ملک کی سرحد غیر قانونی طور پر عبور کر کے اس کے رازوں کو چرانا عدل و انصاف کی کون سی قسم ہے۔''

''گو میں راز چرانے نہیں آیا، اگر آیا ہوتا تب بھی عدل کے منافی نہ تھا کہ ایسا اپنے ملک کی خاطر کیا جاتا ہے۔ ورنہ سرکاری رازوں کا کسی عام بندے نے اچار تھوڑی ڈالنا ہوتا ہے۔''

وہ خفگی سے بولی۔ ''روزانہ کی چوں..... چوں سے بہتر ہے مجھے اکیلا ہی چھوڑ دو۔''

میں شرارتی لہجے میں بولا۔ ''چھوڑ دیتا، بس ڈیٹ کا لالچ روکے ہوئے ہے۔''

وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔ ''ریجا ایک بات یقینی ہے، تم نے مرنا میرے ہی ہاتھوں ہے۔''

''شکلا کے بعد ہی نمبر لگانا ورنہ اکیلی رہ جاؤ گی۔''

وہ برجستہ بولی۔ ''تمھارے رویے سے تو ایسا نہیں لگتا کہ شکلا کی باری پہلے آئے گی۔''

—●—

اگلے تین چار دن ہم نے اسی کھولی میں گزارے۔ حالات حاضرہ سے باخبر رہنے کو میں نے ٹی وی سیٹ کر کے لگا دیا تھا۔ تین چار دن بعد ہم نے کرن چاولہ کے دفتر کی نگرانی شروع کر دی۔ ٹیکسی کی ڈگی میں سنائپر رائفلیں لے کر پھرنا خطرے سے خالی نہ تھا، مگر ہمارا حلیہ ایسا تھا کہ کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا۔ یوں بھی ہماری کوشش یہی ہوتی تھی کہ ٹیکسی کسی پارکنگ میں کھڑی کر کے نگرانی کریں۔ ہم لمبے مباحثے کے بعد لائحہ عمل طے کر چکے تھے۔ کرن شکلا مشکل ہدف تھا۔ اس پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہ تھا۔ تبھی ہم کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرنا چاہتے تھے۔

کرن چاولہ بہ ظاہر درآمدات، برآمدات (امپورٹ ایکسپورٹ) کے کاروبار سے منسلک تھا۔ کمپنی دفتر میں اس کی آمد بھی گاہے گاہے ہوتی اور وہ زیادہ دیر بیٹھتا بھی نہیں تھا۔ صبح نو بجے اس کی آمد ہوتی۔ گھنٹا ادھ وہاں بیٹھ کر غائب ہو جاتا۔ میں نے اس کا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی کیوں کہ بعید نہ تھا وہ تعاقب سے باخبر ہو جاتا، یوں ہمیں لینے کے دینے پڑ جاتے۔ ممتا دیدی بھی دو تین بار نظر آئی تھیں۔

منصوبہ سوچنے کے بعد ہم عمل کو تیار تھے۔ پہلے مرحلے میں کرن چاولہ کے دفتر کے سامنے کوئی بلند مقام ڈھونڈنے کی

ضرورت تھی۔ اور اس کے لیے ہمیں زیادہ تگ و دو نہ کرنا پڑی کیوں کہ اس کے جوانب میں چند سو میٹر کے دائرے میں کئی اونچی عمارات موجود تھیں۔ ہم نے کئی عمارتوں کی قراولی (فوجی مقاصد میں کارروائی سے پہلے ہدف کی دیکھ بھال اور جائزہ لیا جاتا ہے تاکہ منصوبے میں موجود کمیوں، کجیوں اور خامیوں کو درست کیا جا سکے) کے بعد دو جگہوں کا چناؤ کیا تھا۔ ایک چھے منزلہ رہائشی عمارت تھی اس کی چھت سے ہم کامیاب کارروائی کر سکتے تھے۔ دوسرا ہوٹل تھا اس کی چوتھی، پانچویں، چھٹی منزل اور چھت سے ہدف صحیح نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ عمارات کی چھتیں قابل استعمال تھیں مگر ہوٹل سب سے مناسب تھا کہ وہاں کسی مداخلت کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ اور ایک سنائپر کو سب سے زیادہ یکسوئی کی ضرورت رہتی ہے۔ تبھی باہم مشورے سے ہم نے ہوٹل کو چنا۔ خالی کمرہ ہمیں چھٹی منزل پر مل سکا تھا۔ اگلے دن ہم کارروائی کو تیار اور ایس آر ون کے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں موجود تھے۔ رائفل جوڑ کر میں نے کھڑکی پر لگائی اور شیشہ کھول کر بیٹھ گیا۔ میں نے زمین پر لیٹنے کے بجائے کرسی پر بیٹھنے کو ترجیح دی تھی۔ کیوں کہ کھڑکی فرش سے بلند تھی۔ کرن چاولہ کو ہم نے پارکنگ میں گھیرنے کا منصوبہ بنایا تھا کیوں کہ دفتر میں جانے کے بعد میں اس کی بے خبری میں اسے نشانہ بنا سکتا تھا لیکن اس پر دھونس نہیں جما سکتا تھا۔ البتہ پارکنگ کم از کم اتنی وسیع ضرور تھی کہ وہ بھاگ نہیں سکتا تھا۔ پارکنگ کا ہوائی فاصلہ ساڑھے سات سو میٹر تھا۔ اور اتنے فاصلے پر ایس آر ون کے ساتھ میں کسی بھی شخص کی کھوپڑی تو کجا آنکھ کو بھی نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

مکمل تیاری کے بعد لورا براؤن دوربین سے کرن چاولہ کے دفتر کا جائزہ لینے لگی۔ میں نے سپاٹر اسکوپ اٹھا لی۔ (سپاٹر اسکوپ کو بھی ایک طرح کی دوربین سمجھ لو)

لورا بڑبڑانے کے انداز میں بولی۔ ''آدھا گھنٹا باقی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''وقت کا بڑا پابند ہے کم بخت۔''

وہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔ ''یہ پابندی کبھی کبھار نقصان دہ بھی ثابت ہوتی ہے۔ کیوں کہ دشمنوں کو منصوبہ بنانے میں آسانی ہوتی ہے۔''

میں ہنسا۔ ''وقت کی پابندی نہ کرنے والا بھی دشمنوں سے بچ نہیں سکتا۔ منصوبہ بنانے والے سب سے پہلے ہدف کی عادات و روزمرہ جانچتے ہیں اور اسی کے مطابق منصوبہ ترتیب دیتے ہیں۔''

اس نے کہا۔ ''تمھیں خواہ مخواہ نشانہ بازی کا شوق چڑھا ہے ورنہ رات کو اس کے دفتر کی تلاشی لی جا سکتی تھی۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''پہرے داروں سے بٹ لیتے مگر تجوری کھولنا اتنا آسان نہیں ہے، تبھی مجھے یہ منصوبہ سوچنا پڑا۔''

لورا نے شرارت سے کہا۔ ''خطرے کا سامنا تو مجھے ہی کرنا پڑے گا نا۔''

میں نے پیش کش کی۔ ''یہ ذمہ داری سنبھالو، تمھاری جگہ میں چلا جاؤں گا۔''

''شاید خود کو مجھ سے بہتر سنائپر سمجھ رہے ہو اور میں تمھاری غلط فہمی دور کر سکتی ہوں۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''میرا خیال ہے ذمہ داریاں ہم نے مل کر بانٹی تھیں۔''

تکرار سمیٹتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ ''پندرہ منٹ رہ گئے ہیں اور میرا خیال ہے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔''

اس کے باہر نکلتے ہی میں نے دروازہ اندر سے قفل کیا اور اپنی جگہ سنبھال لی۔ سنائپروں میں ایک یکساں عادت یہ ہوتی ہے کہ شکار کی آمد سے بہت پہلے مورچہ سنبھال لیتے ہیں۔ کسی مجبوری کی وجہ سے گھات میں بیٹھنے میں دیر ہو جائے تو

علیحدہ بات ہے ورنہ کئی کئی گھنٹے ہدف کے انتظار میں لیٹے گزار دیتے ہیں۔ کیوں کہ ہدف کی ذرا سی بے قاعدگی سے سارا منصوبہ چوپٹ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ یوں بھی سنائپر کا ہدف ہمیشہ خصوصی شخصیت ہوتی ہے۔ اور ایسے اہم افراد کے خلاف کارروائی کا موقع بار بار نہیں ملتا۔

جلد ہی لورا پارکنگ کے قریب پہنچتی نظر آئی۔ اس وقت اس نے عارضی طور پر بہروپ ختم کر دیا تھا کیوں کہ ہم نہیں چاہتے کرن چاولہ کو اس کے بدلے ہوئے حلیے سے واقفیت ہو۔ البتہ چہرے پر اس نے ماسک ضرور پہن لیا تھا۔ لیکن ماسک کی وجہ سے بہ مشکل آدھا چہرہ ہی چھپ رہا تھا اور بعید نہ تھا کہ کرن چاولہ جیسا شاطر اسے پہلی نظر میں نہ پہچان پاتا۔ مگر اسے چھپنے کی ضرورت ہوتی تو وہ اصل حلیے میں نہ آتی۔

میں شرارت سے بولا۔ ''دور سے کافی پرکشش دکھتی ہو۔''

''کیا یہ وقت ایسی باتوں کا ہے۔'' اس کی خفگی بھری آواز میرے کانوں میں پہنچی۔ ہمارا رابطہ وائرلیس سیٹ کے ذریعے قائم تھا۔ وائرلیس کی بلند آواز کو چھپانے کو ہم نے ''ایئرفون'' لگائے ہوئے تھے۔ متبادل ذریعہ ہمارے موبائل فون تھے۔

میں ہنسا۔ ''چلو تمھی بتا دو ایسی باتوں کا وقت کون سا ہوتا ہے۔''

وہ تپتے ہوئے بولی۔ ''ابھی تمھارے قریب موجود تھی تب بکواس کرتے ناں، تاکہ اچھی طرح طبیعت صاف کرتی۔''

''کہا تو ہے دور سے اچھی لگ رہی ہو، قریب سے تو بھوتنی لگتی ہو۔''

وہ برہم ہوئی۔ ''تمھیں ایسے موقعوں پر اتنی بکواس کیسے سوجھ جاتی ہے۔''

میں سپاٹر سائیٹ سے اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ پارکنگ کے دروازے پر پہنچ چکی تھی۔ وہ کالے رنگ کے تھری پیس سوٹ میں تھی۔ اس کے چلنے کا انداز اور رکھ رکھاؤ ایسا نہیں تھا کہ چوکیدار تعرض کرتا۔ اور پھر اس کا یورپین ہونا تو سونے پر سہاگا تھا۔

دروازے میں داخل ہوتے وقت اس نے گھڑی دیکھی، غیر ارادی طور پر میری نظریں بھی اپنی کلائی کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ کرن چاولہ کی آمد میں ایک دو منٹ ہی باقی تھے۔ وہ ٹھیک نو بجے یا ایک دو منٹ کے فرق سے وہاں پہنچ جاتا تھا۔

لورا دھیمے قدموں سے چلتے ہوئے پارکنگ سے دفتر کی عمارت کو جانے والے رستے پر چلتے ہوئے سیڑھیوں تک پہنچی اور پھر واپس مڑ گئی۔ اسی دم کرن چاولہ کی کالے رنگ کی کار پارکنگ میں داخل ہوئی۔

سپاٹر اسکوپ نیچے رکھ کر میں ایس آر ون کے پیچھے بیٹھ گیا تھا۔ رائفل کا بٹ دائیں کندھے میں دبا کر میں ٹیلی اسکوپ سائیٹ کے عدسوں سے غلاف (کور) ہٹائے، ایک نظر ایلیویشن اور ڈیفلیکشن ناب کا جائزہ لے کر رینج کی درستی کی تصدیق کی اور پھر بائیں آنکھ بند کر کے دائیں گال کو بٹ پر ٹیک دیا۔ اب میں فائر کرنے کو تیار تھا۔ لورا کی کال میرے موبائل فون پر موصول ہوئی۔ کال وصول کر کے میں نے ''ہینڈ فری'' کان میں لگا لیا۔ وائرلیس سیٹ پر بات کرنے والے کو بٹن دبانے کی زحمت کرنا پڑتی ہے تبھی اس نے موبائل فون پر کال کی تھی۔

کار پارک کر کے وہ باہر نکلا۔ مخصوص ''کی چین'' کا بٹن دبا کر اس نے کار قفل کی۔ اور دفتر کی طرف بڑھا۔ لورا اس کے انتظار میں تھوڑا دور رک گئی تھی۔ چند قدم لیتے ہی اس کی نظریں لورا کی طرف اٹھیں، وہ ٹھٹک کر رکا اور ایک دم ہولسٹر سے پستول اس کے ہاتھوں میں منتقل ہو گیا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں چیتے کی سی پھرتی اور عقاب کی سی تیزی تھی۔ بلاشبہ وہ سخت حریف تھا۔

اس کا استہزائی قہقہہ بلند ہوا۔ ''واہ! جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں، زمینوں میں..... وہ تو خود چل کر میرے

پاس پہنچ گئی۔'' یہ اس نے با آواز بلند کہا تھا۔ بالکل ہلکی سی آواز میرے کانوں تک پہنچی تھی۔

میں کسی ایسے ہی لمحے کا منتظر تھا۔ بغیر وقت ضائع کیے اس کے پستول پر شست سادھی اور لبلبی دبادی۔ گولی نے ہدف کو چھونے میں ایک لمحہ نہیں لگایا تھا۔ زوردار جھٹکے سے پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔

لورا ہنسی۔ ''مسٹر! تم اس وقت ایس ایس کے نشانے پر ہو۔ ایک قدم بھی آگے، پیچھے کیا تو وہ زندگی کی آخری حرکت ہوسکتی ہے۔''

کرن کا سر گھوما اور نظریں ہوٹل کی عمارت کی طرف اٹھیں۔ اس نے اطمینان بھرے انداز میں کچھ پوچھا، مگر آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔

''یہ جان کاری تمھارے کس کام کی۔'' لورا کی آواز مجھے واضح سنائی دی تھی۔

اسی وقت ایک کار پارکنگ میں داخل ہوئی۔ مگر میرا پورا دھیان کرن پر تھا۔ وہ شاطر کوئی چال بھی چل سکتا تھا۔ میں نے لورا براؤن کو اس سے فاصلہ رکھنے کی تاکید کی تھی کیوں کہ وہ اسے یرغمال بنانے کی کوشش کرسکتا تھا۔

کرن نے پھر کچھ پوچھا۔ مگر مجھے آواز سنائی نہیں دی تھی۔ لورا نے موبائل فون اس کی جانب اچھالا۔

''یہ لو خود بات کرلو۔''

موبائل ہوا میں پکڑتے ہوئے اس نے کان سے لگایا اور بغیر کسی تمہید کے بولا۔ ''تمھیں اپنی دیدی کے مشورے پر عمل کرلینا چاہیے تھا۔''

''کرن چاولہ! تم چند لمحوں کے مہمان ہو، کوئی آخری خواہش۔'' میں نے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔ مگر وہ شاطر اتنی جلدی سے میرے جال میں نہیں آسکتا تھا اطمینان سے بولا۔

''یہی بتانے کو اپنی محبوبہ کو خطرے میں جھونکا ہے۔''

''ہاں کیوں کہ مارنے سے پہلے باور بھی کرانا تھا کہ تم کس کے ہاتھوں انجام کو پہنچ رہے ہو۔''

وہ بے خوفی سے بولا۔ ''تمھاری دیدی تمھیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔''

میں نے صفائی سے جھوٹ بولا۔ ''کون سی دیدی اور کہاں کی بہن۔ ایک مطلب پرست، خودغرض لڑکی میری بہن نہیں ہوسکتی۔''

''احسان فراموش اس کی وجہ سے تمھیں فرار کا موقع ملا ہے۔''

''اس کی وجہ سے کیسے؟'' میں نے حیرانی ظاہر کی۔

''مورکھ (نادان) تمھاری محبت میں اتنی اندھی تھی کہ اسے پتا ہی نہ چلا تم نے کب اس کے بالوں سے چمٹی نکال لی۔ اس کی خوش قسمتی کہ اس بات سے صرف میں واقف ہوں ورنہ اب تک اپنے کیریئر کو تباہ کرچکی ہوتی۔'' کرن چاولہ یقیناً ہمارے فرار کی وجہ تک پہنچ گیا تھا۔

میں ہنسا۔ ''گویا تم تسلیم کرتے ہو کہ ایسا اس کی لاعلمی میں ہوا۔ پھر احسان کا ہے کا؟''

''ریجا کام خراب ہوگیا ہے۔'' وائرلیس سیٹ سے لورا کی گھبرائی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

''کیا ہوا۔'' میں نے فون کا رابطہ کاٹے بغیر پوچھا، کیوں کہ کرن چاولہ تک لورا کی آواز نہیں پہنچ سکتی تھی۔ لیکن لورا کے جواب دینے سے پہلے میرے کانوں میں ایک اور آواز پڑی۔

''راہی! یہاں کیوں رکے ہو۔'' اچانک ہی میرے سر پر بم پھوٹا تھا۔ وہ ممتا دیدی کی آواز تھی۔ کرن چاولہ کا اصل نام روہن تھا۔ عام لوگوں کے لیے وہ کرن چاولہ اور ممتا دیدی کے لیے روہن گجرال تھا۔

کرن چاولہ پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ''تمھارے راج کے نشانے پر ہوں۔''

''کبھی نہیں۔'' انھوں نے حیرانی سے کہا۔ وہ بالکل کرن کے قریب کھڑی تھیں تبھی ان کی آواز میری سماعتوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ اسی دوران ان کی نظر چند قدموں کے فاصلے پر موجود لورا پر پڑی۔

''اوہ تو یہ بھگوڑی بھی یہاں موجود ہے۔''

''سنی! تمھارا راج ہوٹل میں بیٹھ کر مجھ پر نشانہ سادھے ہوئے ہے۔'' یقیناً کرن نے اس کے نام سنیتا کا اختصار کیا تھا۔

''کیا؟'' کرن کی نگاہوں کے تعاقب میں اس نے گردن ہوٹل کی کھڑکی کی جانب موڑی اور فوراً اسے اپنی آڑ میں لے لیا۔ ساتھ ہی اس کے ہاتھ سے فون جھپٹ کر کان سے لگایا۔ ''راج سچ میں تم ہو؟''

میں نے پھیکے لہجے میں دھمکی دی۔ ''دیدی، بہتر ہوگا یہاں سے چلی جائیں۔ یہ نہ ہو مجھے غلط فیصلہ کرنا پڑے۔'' ممتا دیدی کی آمد ہمارے منصوبے پر پانی پھیرنے والی تھی۔

ان کی برہم آواز میرے کانوں میں پہنچی۔ ''گولی چلاؤ چھوٹے، دھمکیاں کسے دے رہے ہو۔''

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''دیدی! آخری بار تنبیہ کر رہا ہوں، میرے دشمن کے سامنے سے ہٹ جاؤ، ورنہ پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔''

''اوے! بے حیا، بے شرم، کمینے اپنی دیدی کو دھمکیاں دیتا ہے۔ سامنے ہوتے تو چمائیں مار مار تمھارا تھوبڑا لال کر دیتی۔ وڈا سنائپر..... چلاؤ گولی، میں بھی دیکھوں کتنے نشانہ باز ہو۔''

''سنی، مجھے بات کرنے دو۔'' کرن چاولہ نے اس سے موبائل لینے کی کوشش کی۔

''چھوڑو بات چیت کو، اسے گولی چلانے دو۔'' ممتا دیدی بپھر گئی تھیں۔ یہ ان کا غصہ نہیں مجھ پر اندھا اعتماد بول رہا تھا کہ میں ان پر گولی چلانے کا حوصلہ نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے رابطہ منقطع کرتے ہوئے لورا کو کہا۔ ''وہاں سے نکلنے کی کرو۔''

''کیا ہوا؟'' وہ حیران رہ گئی تھی۔ اسی دم موبائل فون پر کال آنے لگی۔ ممتا دیدی، لورا کے موبائل فون سے کال کر رہی تھیں۔ میں نے ٹیلی اسکوپ سائیٹ سے اس کے چہرے پر نظریں دوڑاتے ہوئے کال وصول کی۔

''راج، فوراً میرے پاس پہنچو۔ تمھیں حکم دے رہی ہوں گرفتاری دے دو۔ میں تمھیں بہ حفاظت پاکستان پہنچاؤں گی۔ اس گوری چڑیل کا ساتھ دینا چھوڑ دو.....''

''دیدی! آپ کب تک کرن چاولہ کو بچائیں گی۔ اور یاد رہے اگلی بار میں آپ پر بھی گولی چلانے سے نہیں رکوں گا۔''

''فضول کی بکواس بند کرو اور جو کہہ رہی ہوں اس پر عمل کرو۔'' اس کے نزدیک میری دھمکی کسی قابل نہیں تھی۔ میں نے کرن چاولہ کو موبائل فون کان سے لگاتے دیکھا۔ یقیناً یہ خطرے کی علامت تھی۔ لورا براؤن پارکنگ سے باہر آ گئی تھی۔ کرن چاولہ اسے روکنے کو ممتا دیدی کی آڑ سے نہیں نکل سکتا تھا۔ نہ ممتا دیدی اسے چھوڑ کر لورا کو پکڑنے کی کوشش کر سکتی تھیں۔ میں رابطہ منقطع کیے بغیر سرعت سے رائفل کو سمیٹنے لگا۔ وہاں رکنا خطرناک تھا۔ گو ممتا دیدی کی موجودگی کے باوجود میں کوشش کرتا تو کرن چاولہ کے کسی نہ کسی عضو کو نشانہ بنا لیتا، مگر ایسا کرنے کی صورت میں ممتا دیدی کو گولی لگنے کا خطرہ بہ ہر حال موجود تھا۔ منہ بولی سہی، بہن تو تھی۔ اور بہنوں پر گولی چلانے والے انسان نہیں ہوا کرتے۔ یوں بھی ہمارا مقصد کرن چاولہ کی ہلاکت نہیں تھی۔ وہ را کا مخلص ایجنٹ تھا۔ اور ہم دہشت گرد نہیں تھے کہ شہر میں جا کر قتل و غارت کرتے پھرتے۔ ہم تو گن پوائنٹ پر اس سے شکلا کے خلاف دستاویزات لینا چاہتے تھے۔ اور ممتا دیدی نہ آتیں تو تقریباً کامیاب ہو ہی گئے تھے۔

''دیدی! آپ ہمارے بیچ سے ہٹ کیوں نہیں جاتیں۔''

وہ شفقت بھرے لہجے میں بولیں۔ ''اچھا تم کمرہ نمبر بتاؤ، میں وہیں آرہی ہوں۔ اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھائیں گے اور مل کر کوئی لائحہ عمل طے کرتے ہیں۔ اپنے راج کو میں اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے آجائیں۔ میں کمرہ نمبر 195 میں ہوں۔'' اس وقت میں سامان سمیٹ کر کمرے سے نکل رہا تھا۔ دیدی کو ایسے انداز میں کہا گویا اسے کرن کے سامنے سے ہٹنے کی ترغیب دے رہا ہوں۔

''کھاؤ میرے سر کی قسم کہ میرے سامنے سے ہٹنے پر گولی نہیں چلاؤ گے۔''

''دیدی! یہ بحث وتکرار کا وقت نہیں ہے۔ ادھر آنا ہے تو جلدی کریں۔'' میں نے لفٹ میں داخل ہو کر فرشی منزل کا بٹن دبا دیا۔

''مجھے ٹیکسی مل گئی ہے۔'' لورا کی آواز میرے کانوں میں پہنچی۔ یقیناً وہ جلدی میں وہاں سے نکلنا چاہتی تھی تبھی میرے پاس آنے کی زحمت نہیں کر رہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' انگریزی کے دو حرف (OK) میں نے اس انداز میں بولے کہ ممتا دیدی کو معلوم ہی نہ ہوا میں کسی اور کو مخاطب ہوں۔ انھیں لگا میں ان سے تصدیق چاہ رہا ہوں۔

''راج، مجھے دکھ دے کر تمھیں خوشی ملے گی۔ کیا بہنوں کے سہاگ، بھائیوں کے ہاتھوں اجڑا کرتے ہیں۔''

میں نے فضول تکرار کی۔ ''وہ آپ کا شوہر نہیں ہے۔ اس سے کئی گنا اچھے رشتے آپ کو مل جائیں گے۔ میری دیدی لاکھوں کروڑوں میں ایک ہے۔ ایسے ٹٹ پونجیے کی حیثیت ہی کیا ہے۔''

وہ روہانسی ہوئیں۔ ''رام قسم، بہت پچھتاؤ گے راج۔''

لفٹ سے نکل کر میں نے سرعت سے ہوٹل کا ہال عبور کیا اور پارکنگ میں پہنچ کر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ کرن چاولہ کے بندوں نے کب تک وہاں پہنچنا تھا۔ اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے میں دھیرے سے ہنسا۔

''دیدی، اپنا بہت سا خیال رکھنا اور کرن کو بتا دو خواہ مخواہ وقت ضائع نہ کرے، آپ کی آمد کے ساتھ ہی میں ہوٹل کے کمرے سے نکل آیا تھا۔ کیوں کہ جانتا تھا آپ ایسا ہی کچھ کریں گی۔''

''راج! بات سنو.....'' وہ رابطہ قائم رکھنے پر مصر ہوئیں مگر میں نے موبائل فون کار سے باہر پھینک کر رفتار بڑھا دی۔ وہاں سے جلد از جلد دور نکلنے کی ضرورت تھی۔

''ہیلو۔'' میں نے لورا براؤں کو آواز دی، مگر اس کی جوابی آواز سنائی نہیں دی تھی۔

''لورا۔'' میں نے بٹن صحیح طریقے سے دبا کر اسے دوبارہ پکارا۔ مگر جواب ندارد۔ یقیناً وہ وائرلیس کے ملاپ کی حد سے باہر تھی۔ اچانک ایک اور انکشاف ہوا کہ مجھے یہ معلوم نہیں تھا لورا کی ٹیکسی کا رخ کس جانب تھا۔ اب اپنے ٹھکانے پر جا کر ہی ملاقات ہو سکتی تھی۔ کیوں کہ اس کا موبائل فون ممتا دیدی کے پاس رہ گیا تھا اور اپنا موبائل فون میں نے خطرے سے بچنے کو پھینک دیا تھا۔

دو تین کلو میٹر تک تو میں چوکنے انداز میں اپنے تعاقب اور اطراف پر نظر رکھے رہا، مگر کوئی مشکوک گاڑی یا موٹر سائیکل وغیرہ نظر نہ آنے پر مطمئن ہو گیا تھا۔

ہدف کی ہر طرح سے نگرانی کر کے ہم نے کامیاب منصوبہ ترتیب دیا تھا، مگر ممتا دیدی کی مداخلت کا خطرہ منصوبے میں شامل نہیں کر سکے تھے۔ امید ہی نہ تھی کہ وہ یوں اچانک ٹپک پڑیں گی۔ کرن چاولہ کے لیے اس کی آمد نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی تھی۔

گھنٹا ڈیڑھ بعد میں جگہ پر پہنچ گیا تھا۔ کار کو مخصوص مقام پر کھڑا کر کے میں کھولی میں داخل ہوا، لورا اب تک نہیں پہنچی تھی۔ میں بستر پر لیٹ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ معلوم ہی نہ ہوا کب آنکھ لگی۔

جاگنے پر گھڑی دیکھی، سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ اتنی دیر لورا کا غائب رہنا حیرانی کے ساتھ خطرے کا بھی باعث تھا۔ ایک سنائپر کو اپنا ٹھکانہ ڈھونڈنے میں مسئلہ نہیں ہو سکتا۔ یقیناً وہ ایجنسی کے ہتھے چڑھ گئی تھی یا کسی مشکل میں پھنسی تھی۔

اب کھولی میں پڑے رہنا خطرے سے خالی نہ تھا، کیوں کہ اس کے پکڑے جانے کی صورت میں یہاں کا پتا اگلوانا مشکل نہ ہوتا۔ یہ بھی ممکن تھا اب تک میں گھیرے میں آ چکا ہوتا۔ تربیت یافتہ ہونے کے باوجود ایک بنیادی غلطی یہ ہوئی تھی کہ ہم نے ملاپ کا متبادل ذریعہ پاس نہیں رکھا تھا۔ ایسی صورت حال ہمارے گمان میں بھی نہ تھی۔ سارا کام مستعدی کی وجہ سے خراب ہوا تھا کہ لورا اپنا موبائل فون بھی واپس نہیں لے سکی تھی۔ اور اسی وجہ سے مجھے بھی اپنا موبائل فون پھینکنا پڑ گیا تھا کہ میرا نمبر پتا چل جانے کے بعد ان کے لیے میری تلاش مشکل نہ رہتی۔

اپنا بیگ لے کر میں محتاط انداز میں کھولی سے نکلا۔ میری نظریں کسی مشکوک شخص کی کھوج میں سرگرداں تھیں۔ مگر پوری کوشش کے باوجود مجھے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ لورا اب تک آزاد تھی۔ اور بالفرض پکڑی جا چکی تھی تو وہ اس سے کچھ بھی اگلوانے میں کامیاب نہیں ہو پائے تھے۔

میں چوکنے انداز میں چلتا ہوا اپنی کار کے پاس پہنچا، مگر کوئی خطرے کی بات نظر نہیں آئی تھی۔ کار میں بیٹھ کر میں پارکنگ سے نکلا اور ایسی جگہ کار پارک کر دی جہاں خطرے کی صورت میں فرار ہونا آسان تھا۔ وہاں سے کھولی پر بھی نظر رکھی جا سکتی تھی۔

میں ذہنی طور پر سخت الجھا ہوا تھا۔ احتیاط کا تقاضا تھا کہ فوراً سے پہلے وہاں سے دور نکل جاتا، لیکن لورا کی آمد کا لالچ مجھے وہیں رکنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ بہترین ساتھی تھی۔ بلاشبہ اس کی وجہ سے مجھے کافی سہولت میسر تھی۔ سنائپریوں بھی جوڑیوں میں کام کرنے کے عادی ہوتے ہیں، لیکن میری قسمت ایسی ہے کہ زیادہ تر مجھے اکیلا ہی کام کرنا پڑ جاتا ہے۔ ڈینو کے بعد لورا براؤن کا ملنا غیبی امداد کے مترادف تھا۔ عام لڑاکے سے سنائپر کا ساتھ کئی گنا زیادہ مفید ہوتا ہے۔ کیوں کہ سنائپر عام لڑاکے کی جگہ سنبھالنے کے ساتھ سنائپنگ کی اضافی خوبی بھی رکھتا ہے۔

وہاں میں نے چند گھنٹے گزارے آخر لورا کی آمد سے مایوس ہو کر جگہ چھوڑنا پڑی۔ لیکن اس سے پہلے کھولی میں جا کر دو کمبل اٹھا لایا تھا کہ میرا ارادہ کار ہی میں رات گزارنے کا تھا۔

ایک دم لورا کے غائب ہونے میں کئی احتمال متوقع تھے۔ وہ کسی حادثے کا شکار بھی ہو سکتی تھی، ممکن تھا اسے رستہ بھول گیا ہو کیوں کہ پہلے وہ بالکل مجھ پر تکیہ کیے ہوتی تھی۔ گو ایک سنائپر کے بارے رستہ بھول جانے کا گمان کرنا کچھ جچتا نہیں مگر امکان کے زمرے میں تو ہر احتمال آیا کرتا ہے۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ شاید شکلا کے خلاف کارروائی کا ارادہ اس نے ختم کر دیا ہو اور میرا سامنا ندامت کی وجہ سے نہ کرنا چاہتی ہو۔ اس کے پکڑے جانے کا اندیشہ بھی قرین قیاس تھا۔ کیوں کہ شکلا کو مجھ سے زیادہ اس کی ضرورت تھی۔ وہ ایس آر ون کی خامی سے واقف نہیں تھے اور ایسی بہترین رائفل کوڑیوں کے مول خریدنے میں پرجوش تھے۔ اور اسی وجہ سے شاید کرن جاولہ نے میرے تعاقب کے بجائے اس کا تعاقب کرنا ضروری جانا ہو۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ اچکوں کے ہاتھ چڑھ گئی ہو۔ اس کی پرکشش صورت اور جاذب نظر جسمانی خال و خد کسی کو بھی ورغلا سکتے تھے۔ جس ٹیکسی میں آ رہی تھی اس کے ایکسیڈنٹ ہونے کا خطرہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اب مجھے نیا ٹھکانہ ڈھونڈنے کی ضرورت تھی۔ لورا کو تلاش کرنے کا وقت نہیں تھا کیوں کہ ایسی صورت میں مجھے اپنے

مقصد سے ہٹنا پڑتا۔ نہ تو میری اس سے جذباتی وابستگی تھی، نہ اس کی حفاظت کا ذمہ دار تھا۔ بس کچھ عرصہ اکٹھا گزارنے کی وجہ سے ہمدردی تھی۔ شکلا کے خلاف ہمارا اکٹھا ہونا، لازم نہیں کرتا تھا کہ میں اصل مشن کو چھوڑ اس کی تلاش میں لگ جاتا۔ البتہ اس کے بارے معلومات حاصل ہو جاتیں تو یقیناً اسے آزاد کرانے کی کوشش کی جا سکتی تھی، لیکن اس کی کھوج کو مقصد بنانا ممکن نہ تھا۔ کچھ عرصہ اکٹھا گزارنے کی وجہ سے اس سے اندازہ یہی تھا کہ اب مجھے اکیلا ہی کام کرنا پڑتا۔

اصولی طور پر تو اب اس کار کا استعمال بھی خطرناک تھا۔ اگر لورا براؤن گرفتار ہو چکی تھی تو اغلوانے والے مکمل معلومات نچوڑ کر ہی اس کی جان بخشی کرتے۔ اور صنف نازک کا انکار پر ڈٹے رہنا اتنا آسان نہ تھا۔ گھٹیا کردار مردوں کا مردانگی دکھانے کا شوق کسی بے بس حوا زادی کو کس نہج تک لے جا سکتا ہے اس بارے اندازہ کرنے کو زیادہ عقل مند ہونا ضروری نہیں۔ وہ بے چاری ایک شکلا کی درندگی سے ٹوٹ گئی تھی، پورے گروہ کا سامنا کیسے کرتی۔ مجھے اس پر شدت سے ترس آیا، اگر بچ میں پکڑی گئی تھی تو بے چاری بدلہ لینے کی خواہش میں اپنا سب کچھ گنوا چکی تھی۔ اس سے بہت زیادہ ہمدردی کے باوجود میں اس کی مدد سے قاصر تھا۔ کار غیر معروف پارکنگ میں کار روک کر میں نے دروازے اندر سے قفل کیے اور سیٹ سے ٹیک لگا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ارادہ یہی تھا کہ صبح کار بیچ کر اسی حالت کی کوئی دوسری کار خرید لوں گا۔ اور اس کے لیے بھولے استاد کے پاس بھی جایا جا سکتا تھا۔ اس سے اتنی شناسائی بہ ہر حال تھی۔ کیوں کہ اس پر ایک بار موٹر سائیکل بیچ چکے تھے۔ لیکن کم بخت کو چوری کا سامان خریدنے کا چسکا لگا تھا اور یہ کار بہ ہر حال چوری کی نہیں تھی۔

خیر اس بارے میں نے زیادہ سر کھپانا مناسب نہ سمجھا اور کبنی میں ہو تیا کہ اب موسم تبدیل ہو گیا تھا۔ نیند آنے تک میں شکلا کو ڈھونڈنے کا منصوبہ سوچتا رہا۔ اسے ٹھکانے لگانے کے بعد ہی پرما انصاری کو لے جانے کا مرحلہ آتا۔

رات کو وقفے وقفے سے آنکھ کھلتی رہی مگر کسی مداخلت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ صبح کی اذان سن کر آنکھ کھلی۔ کسی قریبی مسجد سے بلند ہونے والی اذان کار کے شیشے بند ہونے کے باوجود واضح انداز میں سنائی دے رہی تھی۔ الحمدللہ میں اس حالت میں تھا کہ نماز پڑھ سکتا۔ انڈیا میں مسلمانوں کی کثیر تعداد موجود ہے اور میرے نماز پڑھنے پر کسی کا مشکوک ہونا نہیں بنتا تھا۔ کمبل سے سر نکال کر میں نے انگڑائی لی اور جونہی ونڈ اسکرین پر نگاہ پڑی حیران رہ گیا، کیوں کہ ملگجے اجالے میں اس پر کاغذ چپکا نظر آ رہا تھا۔ کیبن کی بتی جلا کر دیکھا اور اچھل پڑا، کیوں کہ وہ میرے لیے پیغام تھا۔

''سنگم نگر، تیسری گلی مکان نمبر سات میں تمھاری ساتھی قید ہے۔''

ایسا پیغام بھیجنے والا یقیناً کوئی دوست ہی تھا۔ اور انڈیا میں میرے دوست صرف پاکستانی جاسوس ہی ہو سکتے تھے۔ باہر نکل کر میں نے ونڈ اسکرین سے کاغذ کھینچا۔ ساتھ ایک چھوٹا سا رقعہ اور بھی نظر آیا۔ جس پر مزید تفصیل موجود تھی۔ مکان میں اس وقت تین سے چار افراد موجود تھے۔ دروازے پر چوکیدار بھی متعین تھا۔ چوکیدار کے پاس رائفل اور اندر موجود افراد کے پاس پستول موجود تھے۔ ایسی چند ضروری باتیں تحریر کر کے سب سے نیچے آپ کا خیر خواہ لکھا تھا۔

ایک لمحے کو لگا یہ دشمن کی طرف سے مجھے جال میں پھانسنے کی کوشش بھی ہو سکتی ہے، مگر فوراً ہی یہ خیال رد کرنا پڑا کہ انھیں اتنا لمبا کھٹ راگ پھیلانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جب انھوں نے مجھے پہچان لیا تھا تو گھیر کر پکڑ لیتے۔ یقیناً یہ میرے خیر خواہوں ہی کا کام تھا۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ میں ان کی نظر میں بہت پہلے سے تھا لیکن میرے قریب آنے پر انھیں پکڑے جانے کا اندیشہ تھا۔

کوئی یہ گمان بھی کر سکتا ہے کہ وہ مجھے بتانے کے بجائے لورا کو خود بھی چھڑا سکتے تھے۔ لیکن ایک حقیقت جان لیں کہ جاسوس لڑائی بھڑائی کے معاملے میں عموماً کچے گزرے ہوتے ہیں۔ بس اسلحے کا واجبی سا استعمال اور تھوڑی بہت ہاتھا پائی کرنے کی اہلیت ہوتی ہے۔ شاذ ہی کوئی جاسوس اچھا لڑاکا اور اسلحے کا بہترین شناور ہوتا ہے۔ ورنہ ان کا کام لڑنا بھڑنا نہیں

دشمن ملک کے خلاف خبریں حاصل کرنا ہوتا ہے۔ البتہ دہشت گردانہ کارروائیوں اور کسی کو ٹھکانے لگانے یا چھاپہ گھات لگانے کو جو افراد سرحد پار کرتے ہیں وہ اچھے کمانڈو ہوتے ہیں۔ لوگ عموماً کمانڈو اور جاسوس ہی میں فرق نہیں کر پاتے۔ بلکہ بعض تو ایسے ہیں جو ہر فوجی کو کمانڈو، جاسوس، اور سنائپر سمجھتے ہیں۔ زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا بس اتنا سمجھ لیں یہ تمام علیحدہ علیحدہ شعبے ہیں اور ان تمام میں سنائپر ہر فن مولا ہوتا ہے۔ کیوں کہ اسے جاسوسی بھی کرنا پڑ جاتی ہے، کمانڈو کی طرح لڑائی بھڑائی بھی سکھلائی جاتی ہے اور نشانے بازی تو یوں بھی اس کا اصل کام ہوتا ہے۔

پانی کی بوتل سے وضو کر کے میں نے وہیں پارکنگ میں کپڑا بچھا کر نماز فجر ادا کی، اللہ پاک سے کامیابی کی دعا کر کے سنگم نگر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب ممبئی کو گہرائی میں نہیں تو تھوڑا بہت تو جان گیا تھا۔ مزید معلومات ایک رکشا ڈرائیور سے لے لی تھیں۔

وہاں پہنچتے تک آفتاب طلوع ہو چکا تھا۔ اور ممبئی جاگ گیا تھا۔ اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں جانے والے طلبہ و طالبات، دفاتر جانے والے ملازم پیشہ خواتین و حضرات اور مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کا جم غفیر گھروں کو چھوڑ کر سڑکوں پر رواں دواں تھا۔ ایک ایسی دوڑ شروع ہو گئی تھی جو ہر شہر کی روزمرہ ہوتی ہے۔

میں مکان کے سامنے سے گزرا اور سرسری نظر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر کار پارک کرنے کی مناسب جگہ نظر آئی اور میں کار قفل کر کے نیچے اتر آیا۔ سائیلنسر لگا گلاک کوٹ کی جیب میں تھا۔ رات ہونے کے انتظار کرنا مناسب نہیں تھا، کیوں مجھے لورا کی حالت معلوم نہیں تھی۔ اس بارے میرے خیر خواہ نے بھی تفصیل نہیں بتائی تھی۔ اس نے صرف افراد کی تعداد اور دفاعی لحاظ سے چند باتیں بتائی تھیں۔ سادے الفاظ میں کہیں تو اندر گھسنے کو مجھے چوکیدار پر قابو پانا ضروری تھا۔ درمیانے حجم کے اس مکان کے دائیں اور سامنے کی جانب گلی لگتی تھی۔ بائیں اور عقبی جانب اور مکان موجود تھے۔ گلی میں لوگوں کی آمدورفت اجازت نہیں دیتی تھی کہ میں دیوار عبور کرتا۔ بالفرض لوگوں کی آمدورفت نہ ہوتی تب بھی سب سے بڑا خطرہ تو دروازے پر موجود چوکیدار کا تھا۔ اور مجھے دیوار پر نمودار ہوتے دیکھ کر گولی چلانے کے ساتھ اس کے پاس شور مچانے کا انتخاب بھی موجود تھا۔ اور اس کے بعد میرے پاس صرف بھاگنے کا چناؤ ہی بچتا۔

چند لمحے سوچ کر میں نے سامنے سے داخل ہونا مناسب سمجھا۔ خطرہ مول لینا مجبوری تھی۔ لورا براؤن کے متعلق معلومات نہ ہونے پر تو میرے پاس بہانہ موجود ہوتا، لیکن جب اس کے بارے اتنا کچھ پتا چل گیا تھا تو مدد نہ کرنا زیادتی ہوتا۔ عارضی ہی سہی وہ میری ساتھی تو تھی۔ اور شکلا کی ہلاکت تک ہمارا فائدہ نقصان سانجھا تھا۔

لوگوں کی آمدورفت جاری تھی، لیکن یہ آنا جانا تو پورے دن لگا رہتا۔ مناسب لمحے کا انتخاب کر کے میں نے ہولے سے دروازہ بجایا۔

''کون؟'' کہتے ہوئے چوکیدار نے ذیلی کھڑکی کھول دی تھی۔

بجلی کی سی سرعت سے میں نے پستول اس کی چھاتی پر رکھا۔ ''ذرا سی غلط حرکت تمہارے سینے میں چھید بنا دے گی۔''

''کک..... کون ہو تم.....؟'' وہ خوف سے ہکلایا۔

اس کی چھاتی پر پستول کا دباؤ بڑھا کر میں نے پیچھے دھکیلا۔ اور اندر گھس گیا۔ ذیلی کھڑکی کو پاؤں سے بند کرتے ہوئے میں اطمینان سے بولا۔ ''ہاتھ اٹھا کر الٹے گھوم جاؤ۔''

''تم جانتے نہیں کہاں گھسنے کی غلطی کر بیٹھے ہو۔'' وہ ابتدائی جھٹکے سے سنبھل گیا تھا۔

''اچھا.....'' استہزائی انداز میں کہتے ہوئے میں نے پستول جیب میں منتقل کیا اور جھپٹ کر اس کی گردن دائیں بازو

کی گرفت میں لیتے ہوئے مخصوص جھٹکا دیا۔

گردن چھڑانے کو وہ زور سے تڑپا اور پھر ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ امید تھی اس نے گھنٹے ڈیڑھ تک ہوش میں نہیں آنا تھا، لیکن میں اسے یونہی چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اسی کی قمیص سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ کر میں نے ازار بند سے پاؤں باندھے اور شلوار اس کے منہ پر باندھ دی۔

فارغ ہو کر میں نے ذیلی دروازہ کنڈی کیا اور محتاط انداز میں اندرونی عمارت کی طرف بڑھا۔ دروازے کے دائیں جانب گیراج تھا جس میں دو کاریں کھڑی تھیں۔ چھوٹا سا صحن اور پھر ڈرائینگ روم کا دروازہ تھا۔ لکڑی کا منقش دروازہ کھول کر میں پستول تانے اندر داخل ہوا مگر ڈرائینگ روم خالی پڑا تھا۔ بائیں جانب غالباً باورچی خانہ تھا۔ وہاں کسی کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔ باورچی خانے سے ملحق کھانے کا کمرہ تھا، اس کے ساتھ ایک خواب گاہ بنی تھی جس کا دروازہ بند تھا۔ خواب گاہ اور کھانے کے کمرے کے درمیان سیڑھیاں اوپر کو جا رہی تھیں۔

میرے قدم باورچی خانے کی جانب اٹھ گئے۔ وہ چولھے کی جانب متوجہ تھا اور دروازے کی جانب اس کی پیٹھ تھی، دروازے سے اندر ہوتے ہی میں نے زقند بھری، اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا یا کچھ سمجھنے کے قابل ہوتا میں نے پستول کو سائیلنسر سے پکڑ کر مضبوط دستے سے اس کے سر کی سختی کا اندازہ کیا۔

''اوغ۔'' کی آواز سے وہ لہرا کر نیچے گرنے لگا مگر اسے فرش پر گرنے سے پہلے میں نے تھام لیا تھا۔ وہ انڈہ فرائی کر رہا تھا۔ توے کو چولھے سے اتار کر میں نے نیچے رکھ دیا کہ انڈہ جل کر بدبو پیدا کر سکتا تھا۔ کچھ لوگوں کی قوت شامہ بہت تیز ہوتی ہے۔ ایسا کوئی نمونہ، جائزہ لینے کو ادھر جھانک سکتا تھا۔ پلیٹ میں ایک دو اور انڈے بھی تیار پڑے تھے۔ یقیناً وہ تمام کا ناشتا تیار کر رہا تھا۔

اسے بھی چوکیدار کی طرح باندھ کر میں نے باورچی خانے کا دروازہ باہر سے بند کیا اور خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ خوش قسمتی سے دروازہ مجھے کھلا ملا مگر اندر کوئی موجود نہیں تھا۔

باہر نکل کر میں محتاط انداز میں سڑھیوں کی طرف بڑھا اور دبے قدم اوپر چڑھنے لگا، نصف سیڑھیاں ہی طے کر سکا تھا کہ ایک شخص پکارتا ہوا سیڑھیوں کے سرے پر نمودار ہوا۔ ''سنیل، کتنے گھنٹے لگ جائیں گے۔''

اس کے نیچے جھانکتے ہی میں سامنے تھا۔

''کون ہو تم۔'' با آواز بلند کہتے ہوئے اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ہتھیار نکالنا چاہا۔

ہلکی سی ''ٹھک۔'' کے ساتھ اس کے سر میں روشندان کھل گیا تھا۔ اسے زخمی کرنے پر اکتفا کر کے میں خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

دھڑام سے نیچے گرتے ہوئے وہ ایڑیاں رگڑنے لگا۔

''سریش! کیا بات ہے۔'' ایک اور آواز ابھری۔ میں زقند بھر کر اوپر پہنچا۔ اسی وقت ایک شخص دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے پیچھے مڑ کر چھلانگ لگانا چاہی مگر گلاک کی گولی اسے مہلت دینے پر تیار نہیں تھی۔ ایک اور ''ٹھک'' نے اسے اوندھے منہ گرا دیا تھا۔ اس منزل پر تین کمرے ایک گولائی میں بنے تھے۔ درمیان میں ہال نما خالی جگہ ڈرائینگ روم اور ٹی لاؤنج وغیرہ کا کام دے سکتی تھی۔ وہاں گہرے سبز رنگ کا قالین بچھا کر صوفہ سیٹ رکھے گئے تھے۔

میں بھاگ کر کھلے دروازے کی طرف بڑھا۔ ایک لمحہ دروازے پر ٹھہر کر میں نے سماعتوں سے اندر کی سن گن لی اور پھر ایک دم سامنے ہو کر دوبارہ دیوار سے ٹیک لگا لی۔ مگر اس سرسری نظر میں کمرہ خالی نظر آیا تھا۔

لمحہ بھر ٹھہر کر میں زقند بھر کر اندر گھسا اور چابک دستی سے گھوم کر پورے کمرے کا جائزہ لے ڈالا۔ مگر کمرہ خالی

تھا۔غسل خانے میں بھی جھانکا مگر کوئی نظر نہ آیا۔

میں چوکیدار سمیت چار بندوں کو ناکارہ کر چکا تھا۔اور میرے خیر خواہ کے بہ قول وہاں تین سے چار افراد ہی موجود تھے۔

باہر نکل کر میں نے بقیہ دو کمروں کا جائزہ لیا۔دونوں کا دروازہ باہر سے قفل تھا۔میں سیڑھیاں چڑھ کر مزید اوپر پہنچا۔چھت پر صرف ایک کمرہ بنا تھا۔اس کے سامنے تھوڑا سا برآمدہ اور باقی چھت خالی تھی۔البتہ چوکنڈی (مکان کی چھت کی تین چار فٹ کی چار دیواری) بنی تھی۔چھت والے کمرے کو بھی باہر سے کنڈی کیا گیا تھا۔میں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکنا مناسب سمجھا،مگر کمرہ خالی نظر آیا۔

میں نیچے اترا،مقفل دروازوں کی چابیاں مجھے ایک لاش کی جیب سے مل گئی تھیں۔

پہلا کمرہ خالی پڑا تھا،البتہ اس کی سجاوٹ وآرائش میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔یقینا کمرہ کسی خصوصی شخصیت کے لیے تھا۔گو سامان تو وہی تھا جیسا کسی بھی اچھی خواب گاہ کا ہوسکتا ہے۔لیکن سامان کا معیار بہت عمدہ تھا۔جہازی حجم کا ڈبل بیڈ جو خصوصی طور پر بنوایا گیا تھا۔قیمتی صوفہ سیٹ،اعلیٰ معیار کے دروازے و کھڑکیوں کے پردے،اے سی،فرج،دبیز قالین جس میں پاؤں دھنستے ہوئے محسوس ہوں۔دروازے کی بغل میں لگی سنگھار میز پر خوشبو،کریم،لوشن،باڈی سپرے وغیرہ درجنوں کی تعداد میں دھرے تھے۔چھت کی عمدہ سیلنگ کر کے خوب صورت نقش کاری کی گئی تھی۔

سرسری نظر دوڑا کر میں باہر نکل آیا۔اب آخری کمرہ باقی تھا۔اور لورا براؤن کو وہی ہونا چاہیے تھا۔اندر قدم رکھتے ہی میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا تھا۔کمرہ ہر قسم کے سامان سے عاری تھا۔بس فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور اس پر لورا براؤن بندی ہوئی پڑی تھی۔دروازہ کھلنے کی آواز پر اس طرف متوجہ ہوئی۔مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے ہونٹوں سے مسرت بھرا۔"ریجا۔" نکلا تھا۔

"کیسی ہو کیپٹن۔" مسکراتے ہوئے میں قریب ہوا اور چاقو سے اس کی بندشیں کاٹنے لگا۔

"مجھے کیسے ڈھونڈا؟" اس کے چہکتے لہجے میں جستجو پوشیدہ تھی۔

"اگر سوچتی ہو ڈیٹ کا وعدہ کر کے چھپ جاؤ گی تو ایسا ممکن نہیں ہے۔" شرارتی لہجے میں کہتے ہوئے میں اس کی بندشیں کاٹ کر پیچھے ہٹا۔

وہ اٹھتے ہوئے ایک دم مجھے لپٹی اور وارفتگی بھرے لہجے میں مستفسر ہوئی۔"سچ میں میرے ساتھ ڈیٹ پر جانا چاہتے ہو۔"

"نن.....نہیں تو.....مذاق کر رہا تھا۔" میں گھبراتے ہوئے اس کی گرفت سے نکلا۔

اس کا نقرئی قہقہہ بلند ہوا۔"جانتی تھی ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔"

میں نے اسے خطرے سے آگاہ کیا۔"گپ شپ بعد میں ہوتی رہے گی فی الحال ہم خطرے کی حدود میں ہیں،بلکہ سچ کہوں تو مجھے معلوم ہی نہیں تمہیں پکڑنے والے کون ہیں۔"

"یہاں تک کیسے پہنچے۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی تھی۔

"کسی خیر خواہ نے رہنمائی کی ہے۔" کہتے ہوئے میں نے جیب سے رقعہ نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

"کیسے پڑھوں؟" اردو میں لکھے رقعے کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے اس نے حیرانی ظاہر کی۔

"معذرت خیال نہیں رہا تھا۔" نادم انداز میں کہتے ہوئے میں نے چٹھی واپس لے لی۔

اس نے اشتیاق ظاہر کیا۔"آپ خود پڑھ کر سنا دیں۔"

''کچھ لوگ چھپ کر میری نقل وحرکت پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔اپنی حفاظت کے خیال سے وہ سامنے نہیں آنا چاہتے،البتہ پیغام بھیج کر میری رہنمائی کردی۔اور میرے خیال میں اتنا کافی ہے۔''

''مگر وہ ہیں کون؟''لورا کی حیرانی برقرار رہی۔

دروازے کی طرف مڑتے ہوئے میں نے منہ بنایا۔''تمھیں اندازہ نہیں ہے۔''

وہ میرے پیچھے قدم بڑھاتے ہوئے بولی۔''گویا ممبئی میں پاکستانی جاسوس موجود ہیں۔''

میں اطمینان سے بولا۔''ممبئی میں اسرائیل کی موساد،امریکہ کی سی آئی اے،روس کی کے جی بی وغیرہ بھی موجود ہوں گے۔''

''شاید میرا سوال برا لگا۔''وہ افسردگی سے بولی۔

تیزی واحتیاط سے سیڑھیاں اترتے ہوئے میں ہنسا۔''احمقانہ سوال کا اور کیا جواب دیتا۔''

''غلطی سے کام تو آجاتے ہو،مگر احسان اتنے جتلاتے ہو کہ آئندہ کو تمھاری مدد لینے سے توبہ کرنے کو دل چاہتا ہے۔''

اسے جواب دیے بغیر میں باورچی خانے میں گھسا۔سنیل نامی شخص اب تک بے ہوش تھا۔اس کے سر پر میں نے پانی کا جگ الٹایا۔

ہڑبڑاتے ہوئے اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

تبھی لورا براؤن کی نگاہ اس کے چہرے پر پڑی۔طیش بھرے انداز میں قریب ہوئی اور ہونٹوں پر پھول بکھیرتے ہوئے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔گالیاں بکنے میں وہ یوں بھی ماہر تھی۔مجھے اندازہ کرنے میں دیر نہ ہوئی کہ سنیل،لورا براؤن کے ساتھ نازیبا حرکات کا مرتکب ہو چکا تھا تبھی وہ شعلہ بنی ہوئی تھی۔نہ معلوم سنیل کو انگریزی کی اتنی گہری و دقیق گالیوں کا ادراک ہو بھی رہا تھا یا نہیں،البتہ لورا براؤن کی ٹھوکریں گالیوں کی عمدہ تشریح کو کافی تھیں۔

وہ بے چارہ بھی کیا کرتا جب اتنی خوب صورت و پرکشش لڑکی قابو میں آئے تو کمزور کردار مردوں کا ہاتھوں پر اختیار نہیں رہتا۔

''اس کی خاطر مدارت کرو میں دوسرے کو لے آؤں۔''لورا براؤن کی اشتعال انگیزی میری نظر میں جائز تھی اس لیے اسے کھلی چھوٹ دے کر باہر نکل آیا۔

چوکیدار کو ہوش آچکا تھا۔جسم کو جھٹکے دیتے ہوئے وہ خود کو آزاد کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔مجھے دیکھتے ہی۔''اوں .....اوں۔''کر کے باضابطہ احتجاج کرنے لگا۔

میں نے پاؤں کھول کر،آزار بند اس کے جکڑے ہوئے ہاتھوں پر باندھا اور قمیص کھول کر اس کا لنگوٹ باندھ دیا ورنہ پہلے تو وہ مادرزاد برہنہ پڑا تھا۔

''اب بغیر چوں وچرا کیے آگے بڑھو،ذرا سی غلط حرکت تمھیں ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتی ہے۔''پستول کی نال سے میں نے اسے اندر کی طرف ٹہوکا دیا۔

وہ مرے مرے قدموں سے چل پڑا۔لورا سنیل کو گھسیٹ کر ڈرائینگ روم میں لے آئی تھی۔اس کے چہرے پر خوف وہراس چھایا ہوا تھا۔سامنے کے دو تین دانت ٹوٹے ہوئے نظر آرہے تھے۔ناک سے بھی خون بہہ رہا تھا،یقیناً لورا نے اس کی اچھی خبر لی تھی۔میں نے چوکیدار کے منہ سے کپڑا کھولا اور دونوں کو اکٹھا بٹھا دیا۔

''شروع ہو جاؤ۔''نشست سنبھالتے ہوئے میں نے پستول کی نال لہرا کر حکم دیا۔

سنیل ہکلا کر بولا۔ ''کک.....کیا؟''

''تم اچھا نہیں کر رہے، جانتے نہیں ہم کون ہیں۔'' چوکیدار نے دھمکی دی۔

''اس نے تمھیں نہیں چھیڑا تھا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے لورا کو دعوت دی۔

''چھیڑنا معنی نہیں رکھتا۔'' نشست چھوڑتے ہوئے وہ چیل کی طرح جھپٹی اور چوکیدار کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ دو تین لمحوں میں چوکیدار کی اکڑفوں غائب ہو چکی تھی۔ لرزتے ہوئے بولا۔

''معاف کر دو پلیز، میں نے تمھیں اغواء نہیں کیا، میں تو ملازم ہوں۔''

لورا کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی تھی۔ میں فوراً بولا۔ ''رکو مادام، اگر انھوں نے تفصیل بتانے سے انکار کیا تو پھر تمھیں زحمت دوں گا۔''

پھولے ہوئے سانس لیے وہ بیٹھ گئی۔ میں سنیل کو مخاطب ہوا۔

''بغیر کچھ چھپائے سب کچھ اگل دو کہ تم نے کیوں میری ساتھی کو اغواء کیا۔

اس نے تھوڑی اڑی کی، لیکن لورا جلد ہی اسے راہ راست پر لے آئی تھی۔ اس کی بند زبان کھلی اور ساری گتھی سلجھ گئی۔ اس نے جو تفصیل بتائی اس کا لب لباب یہ تھا کہ ان کا تعلق ایک مجرم ٹولے سے تھا۔ اور دلچسپ بات یہ کہ ٹولے کا سرغنہ پولیس کا حاضر سروس تھانے دار تھا۔ اس گروہ کے زیادہ تر افراد جیب تراشی، ڈکیتی، اسمگلنگ، نشہ آور ادویات، موٹر سائیکل و گاڑی چوری جیسی وارداتوں میں ملوث تھے۔ گزشتہ کل لورا براؤن جس ٹیکسی میں بیٹھی وہ راستے میں خراب ہو گئی تھی۔ مجبوراً اسے ٹیکسی تبدیل کرنا پڑی۔ بدقسمتی سے اس نے ٹیکسی میں بیٹھتے وقت ماسک چہرے سے ہٹایا ہوا تھا۔ تبھی اس پر سنیل کی نظر پڑی اور اس نے فوراً پہچان لیا کیوں کہ شکلا کے حکم پر لورا براؤن کی تصویر تمام تھانوں میں پہنچائی گئی تھی تاکہ میرے ساتھ پولیس والوں کو لورا براؤن کو بھی پہچاننے میں آسانی رہے۔ میری تصاویر اور وڈیو تو خیر ٹی چینلز پر دکھائی گئی تھیں، البتہ لورا براؤن کا سرسری سا ذکر ہوا تھا بغیر نام اور تصویر کے ساتھ۔ تھانے دار ریوندر مترا نے تصویر کی کاپی پولیس والوں کے ساتھ اپنے گروہ کے کارندوں کو بھی دی تھی۔ کیوں کہ لورا براؤن کی تصویر دیکھتے ہی خبیث لٹو ہو گیا تھا۔ وہ ایک عیاش شخص تھا۔ یہ مکان بھی اس کی عیاشی کا اڈہ تھا۔ اس نے اپنے کارندوں کو سارے کام چھوڑ کر لورا کی تلاش پر لگا دیا۔ جونہی سنیل کی نظر لورا پر پڑی وہ ٹیکسی کے تعاقب میں چل پڑا۔ ساتھ ہی اپنے قریبی ساتھیوں کو بھی بلا لیا۔ ساتھی زیادہ دور نہیں تھے۔ اور موٹر سائیکل ان کے پاس تھی، انھوں نے سنیل تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ انھیں لورا براؤن کے بارے ضروری معلومات معلوم تھیں تبھی منصوبہ بندی سے اسے شکار بنایا۔ ممبئی کی بھیڑ میں جب تک لورا اپنے ٹھکانے تک پہنچتی وہ موٹر سائیکل کی سواری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ایک سرخ اشارے پر جب ٹیکسی رکی سنیل نے عقبی شیشے کے کھلے ہونے کا فائدہ اٹھا کر ایک دم زوداثر بے ہوشی کا سپرے لورا کے چہرے پر کیا اور لورا بغیر مزاحمت کے بے ہوش ہو گئی۔ جب تک ڈرائیور احتجاجی آواز بلند کرتا، سنیل کا ساتھی سریش عقبی سیٹ پر بیٹھ کر ڈرائیور کی پیٹھ پر پستول کی نال ٹیک چکا تھا۔ اس کے بعد وہ آسانی سے لورا براؤن کو اس مکان میں لے آئے تھے۔ اب لورا کی خوش قسمتی تھی کہ تھانے دار ریوندر مترا عارضی طور پر ممبئی سے باہر تھا۔ لورا کے ہاتھ آنے کی خبر سنتے ہی ریوندر نے اسے قید رکھنے کی ہدایت کی۔ اس کی آمد شام تک متوقع تھی۔ آج کی رات وہ لورا براؤن سے اپنی ہوس پوری کرتا اور پھر اسے راکے حوالے کیا جاتا۔ یہ بھی ممکن تھا وہ خبیث ایک رات کافی نہ سمجھتا اور لورا کو چند راتیں مسلسل عذاب کاٹنا پڑتا۔ سنیل اور اس کے ساتھی ریوندر کے شکار پر ہاتھ تو صاف نہیں کر سکتے تھے، البتہ تھوڑی بہت بے ہودگی سے باز نہیں آئے تھے۔ اسی وجہ سے لورا ان پر تپی ہوئی تھی۔ بے چاری یہ نہیں جانتی تھی کہ اصل اذیت سے بچ گئی تھی، جو ریوندر مترا جیسے ذہنی مریض کے ہتھے چڑھ کر

اسے پہنچنا تھی۔

میں لورا کی طرف متوجہ ہوا۔ ''معلومات تو نچوڑ لیں، اب ان کا کیا کریں؟''

اس نے منہ بنایا۔ ''میرے پلے تو کچھ نہیں پڑا۔''

میں نے تفصیل کا نچوڑ اسے بھی بتا دیا۔

نشست چھوڑ کر وہ سنیل کے قریب پہنچی، ایک ہاتھ اس کے سر پر اور دوسرا ٹھوڑی پر رکھ کر مخصوص جھٹکا دیا۔ سنیل اذیت سے ہاتھ پاؤں جھٹکنے لگا تھا۔

وہ نشست سنبھالتے ہوئے اطمینان سے بولی۔ ''دو آدمی ہیں، ایک کا فیصلہ میں نے کر دیا ہے دوسرا تمھارے ذمہ۔''

چوکیدار کا رنگ خوف سے زرد پڑ گیا تھا۔ تھر تھر کانپتا ہوا بولا۔ ''بھگوان کا واسطہ مجھے چھوڑ دو۔''

میں نے پوچھا۔ ''رنوندر مترا کو کیا بتاؤ گے، یہاں کیا ہوا تھا۔''

''بھگوان کی سوگندھ، جو آپ کہیں گے وہی بتاؤں گا۔'' وہ قسمیں کھانے لگا۔

لورا کی طرف مڑتے ہوئے میں نے الجھن ظاہر کی۔ ''مجھے اس کی ہلاکت کی وجہ نہیں مل رہی۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا چھوڑنا نقصان دہ ہوگا؟''

''تبھی تو مشورہ کیا ہے۔''

اس نے خیال ظاہر کیا۔ ''یہ اپنے سرغنہ کو زیادہ سے زیادہ اس واقعے کی تفصیل ہی بتا سکتا ہے۔ اور میرا نہیں خیال اس میں ہمیں نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔''

''تو پھر اس بے چارے کو کیوں مارا۔'' سنیل کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے منہ بنایا۔ ''تمھارے جسم کو چھونے کی اتنا کڑی سزا تو نہیں بنتی تھی۔''

اس نے سنجیدگی سے دلیل دی۔ ''مجھے چھونے کی سزا یہ پہلے ہی کاٹ چکا تھا، لیکن ایسے افراد معاشرے کا ناسور ہوتے ہیں۔ جن کا علاج کاٹنے کے علاوہ نہیں ہو سکتا۔ جبکہ چوکیدار ایک عام ملازم ہے۔ وہ براہ راست جرائم میں ملوث نہیں ہے۔''

میں نے متفق ہوتے ہوئے کہا۔ ''پھر تلاشی لے کر نکلتے ہیں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا

چوکیدار کی مشکیں کس کر وہیں پھینکا اور سرعت سے تلاشی لینے لگے۔ رنوندر مترا کی خواب گاہ میں مضبوط لوہے کی تجوری نظر آئی، پستول کی دو گولیاں ضائع کرنے پر قفل کھل گیا تھا۔ وہاں نوٹوں کی چند گڈیوں کے علاوہ اس کے کافی کالے کرتوتوں کے ثبوت موجود تھے۔ ہم نے رقم قبضے میں کی، ساری دستاویزات ڈرائینگ روم میں لا کر رکھیں اور وہاں موجود شراب کی بوتلیں توڑ کر خواب گاہ کے سامان کو آگ لگا دی۔ الکوحل کی وجہ سے آگ بھڑک اٹھی تھی۔ امید یہی تھی کہ دھواں اور شعلے دیکھتے ہی لوگ متوجہ ہوتے اور آگ بجھانے آتے۔ ایسے حادثات پر میڈیا کے نمائندے سرعت سے موقع پر پہنچتے ہیں۔ اور یوں ڈرائینگ کی میز پر موجود رنوندر کے کالے کرتوتوں کی دستاویزات کسی ایسے پاس جانے کی امید موجود تھی جو اسے کھڑے لائن لگا دیتا۔

ہم تیزی سے باہر نکل کر اپنی کار کے پاس پہنچے اگلے چند منٹ میں ہم کھولی کی جانب روانہ ہو گئے تھے۔ لورا عقبی نشست پر بیٹھنے کے بجائے لیٹ گئی تھی۔ ڈیڑھ دو گھنٹوں میں ہم اپنے ٹھکانے پر موجود تھے جسے گزشتہ کل میں نے غیر محفوظ سمجھتے ہوئے چھوڑ دیا تھا۔ مگر لورا کی بازیابی کے بعد وہاں رہنے میں بہ ظاہر کوئی خطرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

اطمینان حاصل ہوتے ہی میں لورا کو ڈانٹنے لگا۔ ''تم اتنی غیر ذمہ داری اور حماقت کا مظاہرہ کیسے کر سکتی ہو۔ بہروپ نہ

ہونے کے باوجود ماسک اتار کر بیٹھی تھیں۔ اور اتنی آسانی سے دو تین اچکوں کے ہاتھ چڑھ گئیں گویا گھریلو خاتون ہو۔''

ندامت سے سر جھکاتے ہوئے وہ دھیرے سے بولی۔ ''غلطی ہوگئی۔''

میں تپتے ہوئے بولا۔ ''شکر کرو مجھے تمہارے نسبس (قید خانے) کا پتا چل گیا تھا ورنہ آج رات جو کچھ ہوتا تم شکلا کی درندگی کو بھول جاتیں۔''

وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے خاموش رہی۔ اور ایسا پہلی بار ہو رہا تھا کہ وہ ندامت کے اظہار کے ساتھ جوابی طنز سے باز رہی تھی۔

''تمہاری شکل ایسی ہے کہ لاکھوں میں بھی پہچانی جاؤ گی۔ مقامی زبان سے بھی ناواقف ہو، ایسے میں زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔'' اسے نادم پا کر میں نے چند نصیحتیں جھاڑنا ضروری سمجھا۔

مجھے گہری نظروں سے گھورتے ہوئے اس نے قریب آ کر نشست سنبھالی اور میرا ہاتھ تھامتے ہوئے ممنونیت سے بولی۔

''شکریہ ریجا، تمہاری وجہ سے میری جان اور عزت بچی۔ آئندہ ایسی بے پروائی کا مظاہر نہیں کروں گی۔''

''سب سے پہلے تو تمہارا حلیہ تبدیل کرنا ہوگا۔'' نرمی سے اس کی گرفت سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے میں بیگ کی طرف بڑھا اور میک اپ بکس نکال لایا۔

اسے رنگ تبدیل کرنے والی لوشن کی بوتل پکڑا کر میں دوسرا ضروری سامان نکالنے لگا۔ بغیر چوں چرا کیے اس نے لوشن کی شیشی پکڑی اور کہنیوں تک ملنے لگی۔ پھر چہرے، گردن اور گردن سے نیچے کا علاقہ جو قمیص سے نظر آ سکتا تھا کو بھی سانولا کر دیا۔ میں نے سیاہ لینز اس کی آنکھوں پر چڑھائے، ستواں ناک کو موٹا کرنے کو مخصوص اسپرنگ اندر ڈالے۔ بالوں کو لوشن سے سیاہ کیا اور لورا نے ایک بار پھر مقامی دوشیزہ کا روپ دھار لیا۔ وہ لوشن اسپرٹ کے استعمال ہی سے صاف ہوتا تھا۔ پانی، صابن وغیرہ کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔

حلیہ تبدیل کر کے اس نے آئینے میں صورت دیکھی اور شرارت سے مسکرائی۔ ''ریجا، سچ بتاؤ اس حالت میں خوب صورت لگتی ہوں یا اصل شکل میں۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''دونوں حالتوں میں نہایت بدصورت۔''

اس نے برہمی ظاہر کی۔ ''لڑکیوں کو ایسے مذاق بالکل اچھے نہیں لگتے۔''

میں ہنسا۔ ''مذاق کون کم بخت کر رہا ہے۔''

اس نے ہونٹ سکیڑے۔ ''کسی بے ہودہ سے پوچھنا ہی غلط ہے۔''

''تو دھریندر شکلا یا ریوندر مترا سے پوچھ لیتیں۔''

''بکواس بند کرو۔'' تکیہ پھینکتے ہوئے وہ چلائی۔

میں نے فوراً موضوع تبدیل کیا۔ ''اچھا مذاق چھوڑو اور آگے کا لائحہ عمل بتاؤ۔''

''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے، ہمارا منصوبہ نوے فیصد مکمل ہو گیا تھا۔ نہ تم اس دھوکے باز میجر کی رعایت رکھتے اور نہ یہ سب کچھ ہوتا۔''

میں تلخ ہوا۔ ''بکواس نہ کرو وہ میری بہن ہے۔''

اس نے استہزائی انداز میں کہا۔ ''منہ بولی، بلکہ نقلی بہن ہے جسے صرف اپنے فائدے، نقصان سے غرض ہے۔''

میں بگڑ گیا۔ ''اس کا خلوص پرکھنے کو تمہیں کس نے قاضی بنایا۔''

وہ اپنی لے میں شروع رہی۔ ''مشرق کی احمقانہ روایات دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔''

میں تپ کر بولا۔ ''اور اپنے گریبان میں جھانکنے کو کسی نے منع کیا ہے۔''

وہ اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔ ''ہم تمھاری طرح بے وقوف نہیں ہیں کہ فضول اخلاقیات میں اپنے فائدے نقصان کو نہ جانچ سکیں۔''

''ان فضول اخلاقیات ہی کی بدولت تم عزت و جان بچا پائی ہو۔

وہ بپھر کر بولی۔ ''اسے اخلاق نہیں اصول کہتے ہیں، اگر تم پکڑے جاتے تو میں بھی تمھیں چھڑانے کی کوشش کرتی۔ ہمارا مشن ایک ہے۔ میں تمھارے شانہ بہ شانہ لڑ رہی ہوں۔ را کی میجر اور میرا موازنہ کرنا تمھاری غلط و احمقانہ سوچ ہے۔''

میں طنزیہ انداز میں بولا۔ ''شکلا کو مارنا میرا مشن کب سے ہو گیا۔ اور حب الوطنی کا تقاضا اور اپنے پیشے سے ایمان داری کا تقاضا یہی ہے جو ممتا دیدی کر رہی ہیں۔ اگر انھوں نے پاکستان کو نقصان پہنچانے کی نیت سے سرحد عبور کی تو ان کی راہ میں پہلی رکاوٹ میں بنوں گا۔ باقی تمھارا اور ان کا موازنہ نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہ تمھارے مقابلے میں میرا ووٹ ہمیشہ ممتا دیدی کو جائے گا۔''

اس کے چہرے پر غم و غصہ نمودار ہوا۔ ''تم میری توہین کر رہے ہو۔''

''تم خود مجھے اس نہج تک لائیں۔ میری بہن کے متعلق بکواس کرو گی تو.....

ع میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں۔''

وہ شاکی ہوئی۔ ''تو تمھارے نزدیک میری یہ اہمیت ہے۔''

''جب تمھارے نزدیک میرے پیاروں کی کوئی اہمیت نہیں تو مجھ سے کیوں امید رکھتی ہو۔''

''ہاں رکھتی تھی امید، کیوں کہ بغیر کسی لالچ و غرض کے تم نے میرا ساتھ دیا، مجھے اتنی اہمیت دی۔ خیال رکھا، مان دیا، عزت دی۔ میری خاطر جان خطرے میں ڈالی۔ نہ کوئی تقاضا کیا، نہ مطلب ظاہر کیا، نہ مجھ پر ہوس بھری نگاہ ڈالی۔ مجھے لگی تھی کہ مجھ سے محبت کرتے ہو۔ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی تھی کہ مجھے چاہتے ہو۔ بے شک میں تمھیں نہیں چاہتی لیکن تمھاری اچھائی اور ہمدردی نے میرے دل میں بھی تمھاری عزت، وقار و پسندیدگی بھر دی تھی۔ شکریہ کہ میری آنکھیں کھول دیں۔ پہلے ہی دن واضح کر دیتے تو تمھیں زحمت نہ دیتی۔ سوچا تھا مشن کے اختتام پر تمھارے ساتھ ڈیٹ پر جانا تمھاری خدمت کا معاوضا ہو گا۔ مگر میں بے وقوف تھی۔ معذرت ریحا صاحب، آئندہ اپنی جنگ خود لڑوں گی۔ زیادہ سے زیادہ بار ہی مقدر بنے گی ناں، یوں بھی اپنی عزت، دولت و مقام تو گنوا چکی ہوں، اکیلی جان کا کیا کروں گی۔'' اس کی آنکھوں میں نمی نمودار ہوئی۔ اور نشست چھوڑ کر وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

میرا ماتھا ٹھنکا، یقیناً اسے لاعلمی میں رکھنا میری حماقت تھی۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ شکلا کے خلاف اس کی مدد میں اپنی غرض سے کر رہا ہوں تو وہ دل میں کبھی غلط فہمیاں نہ پالتی۔ انڈیا میں اس کی حیثیت بے یار و مددگار لڑکی کی تھی۔ اور میری مدد کو کوئی دوسرا رنگ دینا اتنا بھی غلط نہ تھا۔ یوں بھی عورت کی فطرت میں ہے کہ کوئی اسے توجہ کے قابل جانے اور مدد پر کمربستہ رہے تو اس کے لیے دل میں لطیف جذبات پال لیتی ہے۔ یہ تو شکر تھا اس نے اپنی محبت کا اعتراف نہیں کیا تھا۔

''ایک منٹ لورا۔'' سرعت سے قریب پہنچ کر میں نے اس کی کلائی تھامی۔ ''میری آخری بات سن لو پھر چلی جانا۔''

''کوئی ضرورت نہیں۔'' گلوگیر لہجے میں کہتے ہوئے اس نے کلائی چھڑانا چاہی۔

''میری طرف دیکھو۔'' میں نے کندھوں سے پکڑ کر رخ اپنی جانب موڑا۔ اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی نکلنے کو بے تاب تھی۔

''سچ بتاؤ، کیا دو بیویوں کے ہوتے ہوئے میرے پاس کسی سے محبت کی گنجائش ہے۔'' میں نے مزاحیہ انداز اپناتے ہوئے اسے ہنسانا چاہا۔

زخمی نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے اس نے سر جھکا لیا تھا۔

''آؤ تمہیں حقیقت بتاؤں کہ شکلا کے خلاف کیوں تمہاری مدد کی۔'' اس کے کندھوں پر بازو رکھ میں دوستانہ انداز میں چلاتے ہوئے چارپائی تک لایا، ساتھ بٹھا کر اس کا ہاتھ تھاما اور پیار سے سہلاتے ہوئے بولا۔

''میری انڈیا آمد کا مقصد شکلا کو انجام تک پہنچانا ہے۔ قدرت نے ہمیں اکٹھا کر دیا، بلاشبہ تمہارا ساتھ بہت قیمتی اور مفید تھا۔ ایک سنائپر کا بغیر کسی معاوضے و اجرت کے میسر آ جانا نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ تبھی تمہیں اتنی اہمیت دی، عزت دی اور خیال رکھا۔ اس میں تمہارے لڑکی ہونے یا خوب صورت و پرکشش ہونے کی کوئی وجہ شامل نہ تھی۔ البتہ تمہیں چھیڑنے کو کبھی کبھار مذاق کر لیتا کہ دو دوستوں کے بیچ ایسی گپ شپ چلتی رہتی ہے۔ ورنہ ایمان سے بتاؤ کبھی میرے اطوار سے کوئی ایسی خواہش جھلکتی نظر آئی جس سے شبہ پڑے کہ تم سے جسمانی تعلقات کا تمنائی ہوں۔''

وہ غیر یقینی سے بولی۔ ''جھوٹ نہ بولو، شکلا سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟''

''شکلا کے کردار پر بات کرنا یقیناً وقت کا زیاں ہوگا، تم اسے قریب سے دیکھ و پرکھ چکی ہو۔ یہ خبیث کافی عرصہ کشمیر کے محاذ پر تعینات رہ چکا ہے۔ وہاں اس کے مظالم کی فہرست بہت طویل ہے۔ اور مجھے ایک مجاہد ہی نے اس کے خلاف کام کرنے کی درخواست کی ہے۔ میری یہاں آمد میں پاکستانی سرکار کی منشا یا ضرورت شامل نہیں ہے۔ بلکہ اسے تم کسی کا ذاتی بدلہ لینے کی خواہش سمجھ سکتی ہو۔ میرے ساتھ ایک مددگار بھی آیا تھا جو ایک حملے میں شہید ہو گیا اس کے بعد میں اکیلا تھا۔ تمہارے ساتھ کو خوش قسمتی جانا۔ بس اپنا مشن خفیہ رکھنے کو حقیقت چھپائے رکھی، کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا پکڑے جانے پر تم ذرا سے تشدد پر سب کچھ اگل دو۔''

''اپنے اللہ کی قسم کھاؤ کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔''

میں خلوص دل سے بولا۔ ''اللہ پاک کی قسم میری انڈیا آمد میں شکلا کا خاتمہ بھی شامل ہے۔''

وہ مشکوک لہجے میں بولی۔ ''بھی کا کیا مطلب؟''

''شکلا کی موت کے بعد ایک اور کام بھی کرنا ہے، مگر اس کے بارے جاننا تمہارے لیے ضروری نہیں۔''

اس کے چہرے پر مسرت ابھری۔ میری پیٹھ میں مکا مارتے ہوئے وہ چلائی۔ ''دھوکے باز، مجھے الو بنائے رکھا۔''

میں نے شرارتی لہجے میں کہنا چاہا۔ ''وجہ تمہیں پتا ہے، میرا مطلب ڈیٹ.....''

میرا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ ممنونیت سے بولی۔ ''اعتماد کرنے کا شکریہ ریجا۔ اور وعدہ کرتی ہوں شکلا کی موت کے بعد تم دوسرے مشن میں مجھے شانہ بہ شانہ پاؤ گے۔ اور ہاں مجھے تمہاری دوستی پر ہمیشہ فخر رہے گا۔''

''تو اب اگلا لائحہ عمل طے کرتے ہیں۔'' میں نے اسے موضوع کی طرف گھسیٹا۔

وہ اپنی چارپائی کی طرف بڑھ گئی۔ کمبل لپیٹ کر اس نے تکیے پر کہنی ٹیکی۔ ''کرن چاولہ کو دوبارہ گھیرنے کے بارے کیا خیال ہے۔ تمہاری باجی ہر وقت تو اس کے ہمراہ نہیں ہوتی۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اب دفتر کے علاقے میں اسے گھیرنے کا خیال ایسے ہی بھول جاؤ جیسے ایس آر ون کی درستی کا خیال دماغ سے نکال چکی ہو۔ کرن چاولہ جیسا خبیث بار بار قابو نہیں آیا کرتا۔ باقی اس سے کوئی دشمنی تو ہے نہیں کہ قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جائے۔''

لورا پوچھنے لگی۔ ''کیا اسے ہمارے مقصد کی سن گن ہو گئی تھی۔''

''نہیں، اب تک ہم نے دستاویزات کی بات نہیں چھیڑی تھی۔''

''کوئی ماہر قفل شکن ڈھونڈ کر اس کی تجوری کھولنے کی کوشش کرنے کے بارے کیا خیال ہے۔''

''ایسا ماہر کہاں سے ڈھونڈیں گے۔ اور پھر اس کے دفتر کا رخ کرنا بھی تو خطرے سے خالی نہیں۔ اگر تجوری میں شکلا کے خلاف ثبوت موجود ہیں تو یقیناً تجوری کی حفاظت سے وہ غافل نہیں ہوگا۔''

لورا نے احتجاج کیا۔ ''تم مفروضوں پر بات کر رہے ہو۔''

''ایسا بس تمہیں لگتا ہے مادام! ورنہ یقین کرو شکلا کے خلاف ثبوت جمع کرنے کے بارے کرن چاولہ نے ہزار بار سوچا ہوگا۔ اور اکٹھے کرنے کے بعد ان کی حفاظت کا خاطر خواہ بندوبست بھی ضرور کیا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ پہلے بھی میں نے اسے دور سے گھیرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔''

وہ پرخیال لہجے میں بولی۔ ''ایک اور منصوبہ میرے ذہن میں شروع دن سے ہے، مگر ڈرتی ہوں تمہارے اخلاقیات نہ آڑے آجائیں۔''

میں نے اسے اکسایا۔ ''مقصد کے حصول کو کئی اخلاقی قدروں کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ اس لیے تم بے فکر ہو کر پھوٹو۔ زیادہ سے زیادہ انکار ہی کروں گا ناں۔''

''انڈیا آمد سے پہلے میں نے اس کے بارے معلومات اکٹھی کی تھیں۔ شکلا کی ایک کمزوری ایسی ہے جس پر عام لوگوں کی نظر نہیں جاتی یا اس کے ڈر سے کوئی اس طرح توجہ نہیں دیتا۔''

''بولتی رہو۔'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے شہہ دی۔

وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد بولی۔ ''اپنی نواسی پری اسے جان سے پیاری ہے۔ سنا ہے اپنی سگی بیٹی کو اس خبیث نے خود قتل کرایا تھا۔ بعد میں پچھتاوں کی لپیٹ میں آگیا اور کفارے میں بیٹی کی محبت نواسی کی طرف منتقل ہوگئی۔ اگر اسے اغواء کرلیں تو تمام مطالبات منوا سکتے ہیں۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ لورا براؤن کا منصوبہ میرے لیے بہت فائدہ مند تھا۔ نجانے پہلے میرا دھیان اس طرف کیوں نہیں گیا تھا۔

وہ شرارتی انداز میں ہنسی۔ ''تم نے بھی اس سے شادی کی خواہش ظاہر کی تھی۔ شادی نہ سہی شکلا سے بدلہ لینے کو تمہیں پورا موقع دوں گی۔''

میں بپھر کر بولا۔ ''کیا تمہارے دماغ میں اتنا گند اور غلاظت بھری ہے۔''

وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ ''مذاق کر رہی تھی یار!''

میں چارپائی پر لیٹ کر کمبل میں گم ہوگیا۔ لورا براؤن کا منصوبہ مجھے پسند آیا تھا۔

وہ ندامت سے بولی۔ ''اچھا سوری ناں، آئندہ ایسا نہیں کہوں گی۔ اور تم نے خود ہی منصوبہ سننے میں دلچسپی ظاہر کی تھی، اب خفا تو نہ ہو جاؤ۔''

میں نے وضاحت کی۔ ''اس منصوبے سے کون احمق اختلاف کر رہا ہے۔ تمہاری بکواس پر غصہ آگیا تھا۔''

''چ۔'' اس کے لہجے میں تعجب انگیز مسرت تھی۔

''تمہیں بہت پہلے یہ تجویز بتانا چاہیے تھی، خواہ مخواہ اتنا وقت ضائع کرایا۔''

وہ پرجوش لہجے میں بولی۔ ''اب آئے گا مزا۔''

رات کو کھانے کے بعد ہم پرما انصاری کو ڈھونڈنے کا لائحہ عمل طے کرنے لگے۔ شکلا کی کوٹھی ہم دیکھ چکے تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ وہاں پرما موجود تھی۔ مگر کوٹھی میں داخل ہو کر پرما کو اغواء کرنے کی کوشش کرنا خودکشی کہلائی جاتی۔ بیس پچیس جنگجو اکٹھے کر لیتے تب بھی حتمی کامیابی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔ سب سے بہترین طریقہ ہمیں تعاقب کا لگا۔ پرما زیر تعلیم تھی اور لازماً کالج جاتی ہوگی۔ یہ علیحدہ بات کہ درجن بھر محافظوں کی موجودی یقینی تھی۔

منصوبہ بنا کر ہم جلد ہی سو گئے تھے۔ اگلے دن صبح سویرے کھولی چھوڑ کر قریبی ہوٹل میں پہنچے اور ناشتا کر کے شکلا کی کوٹھی کی طرف چل پڑے۔ صبح سویرے ٹریفک بھی کم تھی تبھی شکلا کی کوٹھی تک زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

کوٹھی کے قریب کوئی ایسی جگہ موجود نہیں تھی جہاں رک کر ہم نگرانی کر سکتے۔ قلعہ نما کوٹھی کی اونچی دیواروں پر چاروں طرف کیمرے نصب تھے۔ کسی بھی کیمرے میں ہماری مشکوک نقل حرکت دیکھے جانے پر لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔ کوٹھی ایسی جگہ واقع تھی جہاں تین سڑکیں لگ رہی تھیں۔ اگر کوٹھی کے داخلی دروازے کی طرف جانے والی روش کو چوتھی سڑک تسلیم کیا جائے تو وہ چوراہا بن رہا تھا۔ ہم ایک جگہ رک نہیں سکتے تھے۔ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ پرما صاحب نے کوٹھی سے نکل کر کس جانب کا رخ کرنا تھا۔ مجبوراً ہم چکر کاٹنے لگے۔ گو ایسا کرنا بھی خطرناک تھا کہ بار بار ایک کار جب کوٹھی کے سامنے سے گزرتی تو کسی کو بھی شک ہو سکتا تھا لیکن امید تھی ٹریفک کی کثرت نے ہمیں اس خطرے سے محفوظ رکھا۔ کیوں کہ لمحہ بہ لمحہ ٹریفک میں اضافہ ہو رہا تھا۔

وہ تیسرا چکر تھا جب کوٹھی کے سامنے گزرتے ہوئے اس کا بڑا دروازہ کھلا ایک جیپ برآمد ہوئی جس میں چار افراد سوار تھے۔ اس کے پیچھے سرخ رنگ و کالے شیشوں والی کار تھی۔ اور اس کے عقب میں ایک اور جیپ تھی اس میں چھے افراد بیٹھے تھے۔ ان کا رخ ہم سے مخالف جانب تھا۔ میں نے رفتار بڑھا کر جلد سے جلد یوٹرن تک پہنچنے کی کوشش کی مگر ٹریفک اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ میری کوشش کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ جب تک یوٹرن سے چکر کاٹ کر آتے مطلوبہ گاڑیاں غائب ہو چکی تھیں۔ ہم اندازے سے چلتے رہے۔ بار بار اشاروں پر رکنے کی وجہ سے ہماری رفتار سست تھی۔ آگے جا کر دو سڑکیں دائیں، بائیں نکل رہی تھیں جبکہ سڑک سیدھا آگے بھی جا رہی تھی۔

''میرا خیال ہے سیدھے چلتے جاؤ۔'' لورا کے مشورے پر میں سیدھا نکلتا گیا۔ اگلے چوک پر سرخ بتی پر کار جونہی روکی، لورا پرجوش انداز میں چلائی۔ ''وہ رہے، دائیں طرف مڑ رہے ہیں۔''

میں نے فوراً دایاں اشارہ جلانا شروع کر دیا۔ بتی سبز ہوتے ہی میں نے کوشش کر کے رفتار بڑھائی، تھوڑا آگے جاتے ہی عقبی جیپ کے قریب ہو گئے تھے۔ پہچانے جانے کا ڈر نہیں تھا کہ ہمارا حلیہ کافی بدلا ہوا تھا۔ لورا تو بالکل ہی نہیں پہچانی جا رہی تھی جبکہ مجھے کوئی بہت قریبی ہی پہچان پاتا۔

مزید دس منٹ بعد گاڑیاں بڑی سڑک سے اتر کر ایک بڑی عمارت کی پختہ روش پر چڑھ گئیں۔ وہ ایک بہت

بڑا پرائیویٹ ہسپتال اور ریسرچ سنٹر تھا۔ اسی کے ساتھ میڈیکل کالج بھی تھا۔ میں سیدھا نکلتا گیا کہ اندر جانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ کیوں کہ ایک تو ہم نے پرما کو باہر ہی سے اغواء کرنے کا ارادہ کیا ہوا تھا، دوسرا اس وقت ان کے پیچھے کوئی دوسری کار نہیں مڑی تھی اور میں مڑ کر خود کو ان کی نظروں میں نہیں لانا چاہتا تھا۔

ایک ہوٹل کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے پارکنگ کی طرف کار موڑی، تھوڑی دیر بعد ہم ''فیملی کیبن'' میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ کافی کے ہمراہ کچھ کھانے پینے کے لوازمات کا بتا کر میں مطلب کی بات پر آیا۔

''اگلی جیپ میں چار، عقبی میں چھے اور تین ڈرائیور یہ ہوئے تیرہ افراد، شاید پرما کے ہمراہ کوئی خصوصی محافظ بھی موجود ہو یوں ہدف کا دفاع کرنے والوں کی افرادی قوت چودہ افراد ہوگی۔''

لورا نے کہا۔ ''رہائش سے میڈیکل کالج تک کوئی ایسی سڑک نظر نہیں آئی جہاں انھیں سنائپر رائفل کی مدد سے گھیرا جا سکے۔''

میں نے لقمہ دیا۔ ''کوٹھی سے نکلتے وقت حملہ کرنا بالکل بے کار جائے گا، کیوں کہ انھیں آسانی سے مدد مل جائے گی۔''

لورا نے تجویز پیش کی۔ ''چھٹی کے وقت پارکنگ میں انھیں گھیرا جا سکتا ہے، لیکن ایسی صورت میں چند آدمیوں کی مدد درکار ہوگی جو میرے خیال میں دھرمو دادا سے مل جائے گی۔''

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ''دھرمو دادا کو اس جنگ میں گھسیٹنے کا مطلب اسے دردناک انجام سے دوچار کرنا ہوگا۔ کیوں کہ اس سے ہماری واقفیت کوئی ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ پہلے اگر اس کے پاس ہم سے ناواقفیت کا بہانہ تھا جواب نہیں رہے گا۔ اور شکلا سے ٹکر لینا اس کے بس سے باہر ہے۔ شکلا کے پاس ذاتی، سرکاری اور زیر زمین حلقوں کی طاقت موجود ہے۔''

لورا نے دلیل دی۔ ''ضروری نہیں کہ وہ خود آئے اس کے آدمی بھی مدد کر سکتے ہیں۔''

''کسی ایک آدمی کی شناخت دھرمو دادا کا انکشاف کر دے گی۔ اور پھر اس طرح بہت زیادہ ہلاکتوں کا بھی اندیشہ ہے۔ گولی قصوروار و بے گناہ میں تمیز نہیں کیا کرتی۔ اگر یہ سوچ رہی ہو کہ راج کماری پرما کے محافظ جوابی فائرنگ میں لاغرضی برتیں گے تو میں تمھاری کم فہمی پر افسوس کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا۔''

لورا اپنی تجویز پر ڈٹی رہی۔ ''دھرمو دادا نہ سہی، ممبئی تو مجرموں سے بھرا پڑا ہے۔ رقم خرچ کرنے پر کئی مددگار ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔''

''شکلا کی نواسی کو اغواء کرنے کی جرأت کوئی نہیں کرے گا۔'' میں متفق نہ ہوا۔

بیرا چائے اور لوازمات کی ٹرے کے ساتھ اندر آیا لورا ہونٹ بھینچ کر خاموش ہو گئی۔ ہم نہایت دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے یوں جیسے دو پریمی سرگوشیاں کرتے ہیں۔ یقیناً بیرے نے بھی ہمارے جڑے سر دیکھ کر یہی سمجھا ہوگا کہ گوشۂ تنہائی میسر آتے ہی دو محبت کرنے والے باتوں کی تشنگی مٹا رہے ہیں۔ ہمارے سامنے ٹرے رکھ کر وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔

''اگر انھیں اغواء ہونے والی کے بارے آگاہ نہ کریں تب تو ممکن ہے۔'' لورا اپنے موقف سے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔

''ممبئی شہر میں انجان افراد پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر دھرمو دادا کو بیچ میں لا کر کسی کو ڈھونڈیں تب بھی دھرمو دادا تو ملوث ہو جائے گا ناں۔ کوئی عام معاملہ ہوتا تو خطرہ مول لیتا، مگر یہاں پرما کا معاملہ ہے، شکلا سے کوئی بعید نہیں کہ پاگل پن میں کیا کچھ کر گزرے۔''

''تو کیا کریں۔'' اس نے گیند میرے کورٹ میں پھینکی۔

''پہلے قراولی پوری کرلیں پھر کچھ سوچتے ہیں۔اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ محافظ اس کے اہمراہ کالج کے اندر جاتے ہیں، پارکنگ میں رک جاتے ہیں یا کچھ ساتھ ہوتے ہیں اور بقیہ باہر بیٹھ جاتے ہیں۔''

لورا اثبات میں سر ہلا کر کافی کی چسکی لینے لگی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد تجویز پیش کی ''ہدف کافی مشکل لگتا ہے۔ میرے خیال میں کرن شکلا کے دفتر پر دھاوا بولنا آسان رہے گا۔''

میں پرما کو اغواء کرنے کے منصوبے سے نہیں ہٹ سکتا تھا کہ یہ میرا اصل مشن تھا۔فوراً دلیل کا سہارا لے کر میدان میں اتر آیا۔''کرن چاولہ کے پاس ایسی دستاویزات کا ہونا جن کے مل بوتے شکلا کو آسانی سے دھونس میں لیا جاسکے ایک ایسی اطلاع ہے جو تصدیق شدہ نہیں ہے۔کیوں کہ راجپوت دادا نے وہ دستاویزات اپنے آنکھوں سے نہیں دیکھیں۔بالفرض ایسی دستاویزات کا وجود تسلیم بھی کرلیں تو ان کا کرن چاولہ کے دفتر میں ہونا یقینی نہیں ہے۔ہوسکتا ہے کرن چاولہ نے بعد میں وہاں سے ہٹادی ہوں۔جبکہ پرما بی کے ذریعے شکلا کو آسانی سے قابو کیا جاسکتا ہے۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔''پہلے تو کرن چاولہ پر حملے کے حق میں اچھل رہے تھے،اب پری کا ذکر آتے ہی ان دستاویزات کے وجود اور اثر ہی کے منکر ہوگئے ہو۔''

''پرما والی تجویز تم نے بعد میں پیش کی، پہلے پتا ہوتا کہ پرما کے ذریعے شکلا پر دھونس جمانا آسان رہے گا،تو میں کبھی بھی کرن چاولہ پر ہاتھ نہ ڈالتا۔''

وہ شرارتی انداز میں بولی۔''تم سچ مچ تو اس چھوکری پر لٹو نہیں ہو۔''

میں خفگی سے بولا۔''اتنے لمبے ساتھ کے بعد بھی میرا کردار تمھاری نظر میں سوالیہ نشان بنا ہے تو تمھاری ذہنیت پر سوائے افسوس کے کیا کرسکتا ہوں۔''

وہ نادم ہوئی۔''اے ریما! مذاق کررہی تھی یار۔''

میں برہم ہوا۔''بے ہودہ مذاق کو تمھیں میں ہی ملا ہوں۔''

اس نے آنکھیں نکالیں۔''اور تم..... جو بھی بکواس کرو اجازت ہے۔کبھی ڈیٹ کی پیش کش، کبھی حقوق زوجیت کی بجا آوری کی باتیں، کبھی شکلا اور ریوندر مترا کے طعنے۔''

میں نے فوراً چپ سادھ لی کہ لورا کا احتجاج بجا تھا۔مگر وہ میرے جذبات سے ناواقف تھی۔اصل میں پرما انصاری اپنے والد کی وجہ سے میرے لیے بہت زیادہ مکرم ومعزز تھی۔لیکن شروعات میں بہ طور مذاق پرما کو اپنی بیوی بنانے کا کہہ چکا تھا یقیناً میری وہی بکواس اس کی یاداشت میں محفوظ تھی۔تبھی پرما کا ذکر لے بیٹھتی تھی۔

''سوری کہو۔'' مجھے چپ دیکھ کر اس نے حکم صادر کیا۔

میں نے برجستہ کہا۔''سوری۔'' وہ کھل کھلا کر ہنس دی تھی۔

''چلیں۔'' میں نے نشست چھوڑی۔وہ سر ہلاتے ہوئے کھڑی ہوگی۔بل چکا کر ہم ہوٹل سے نکل آئے۔تھوڑی دیر بعد ہم واپس روانہ تھے۔

''کے ایچ نارینہ ہسپتال اینڈ ریسرچ سنٹر'' کی عمارت پانچ چھے منزلہ اور کافی بڑی تھی۔سڑک کے جنوب کی طرف دو رویہ روش ہسپتال کی عمارت کی طرف جارہی تھی۔جس میں آنے اور جانے کی راہ الگ الگ تھی۔شرقی جانب بہت بڑا کھیل کا میدان تھا۔غربی جانب پارکنگ بنی تھی۔ساتھ ہی سبزہ زار تھا۔وہاں پرما کی کار اور اس کے محافظوں کی جیپیں نظر آگئی تھیں۔

جیپوں میں کوئی بھی موجود نہیں تھا، نہ ڈرائیور، نہ کوئی محافظ۔میڈیکل کالج کی عمارت ہسپتال سے ملحق ہی تھی۔لوگوں

کی آمد و رفت جاری تھی۔ ہم مدہم لہجے میں گفتگو کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

میں نے کہا۔ ''میرے اندازے میں محافظوں کو ہسپتال یا کالج کی کنٹین میں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ پرما کا انتظامیہ وہ پارکنگ میں بیٹھ کر نہیں کر سکتے اور نہ کالج میں اس کے ہمراہ بیٹھنے کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اکیلا محافظ اندر جا سکتا ہے اور وہ بھی یقیناً کلاس روم سے باہر ہوگا۔''

وہ متبسم ہوئی۔ ''پیش گوئیاں کب سے شروع کر دیں۔''

''اسے پیشن گوئی نہیں تجربہ کہتے ہیں۔''

وہ مزاحیہ لہجے میں بولی۔ ''اپنے پھٹیچر تجربے سے تم برٹش آرمی کی آفیسر کو متاثر نہیں کر سکتے۔''

میں ترکی بہ ترکی بولا۔ ''آفیسر کسی قابل ہوتی تو اس کا کورٹ مارشل نہ ہوا ہوتا۔''

اس نے طنز کیا۔ ''تم سے ضرور اختلاف کرتی مگر میرا اپنا اندازہ یہی ہے۔ مشرقی لوگوں نے محافظ بس خانہ پری اور دکھاوے کو رکھے ہوتے ہیں۔''

میں انتظامیہ کے ایک فرد سے کنٹین کا رستہ پوچھنے لگا۔ چار پانچ منٹ بعد ہم کنٹین میں تھے۔ اندر پرما کے مسلح محافظوں کو دیکھتے ہی میرے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

وہ جل کر بولی۔ ''میں نے بھی یہی کہا تھا۔''

میں فخر سے بولا۔ ''مگر میرے کہنے کے بعد، الحمدللہ اب میں دعویٰ کر سکتا ہوں کہ ہمارے سپاہی تمھارے افسروں کے برابر ہوتے ہیں۔''

وہ نخوت سے بولی۔ ''تمھارے آفیسر بھی ہمارے آفیسرز کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتے کجا جوان۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''شواہد کو دیکھو، ہوا میں تیر نہ چلاؤ۔''

''تین ڈرائیور اور دس محافظ، تمام یہیں پر موجود ہیں۔'' ان سے تھوڑے فاصلے پر نشست سنبھالتے ہوئے وہ دبے لہجے میں بولی۔

میں نے اندازہ لگایا۔ ''مطلب اس کے ساتھ کوئی خصوصی محافظ موجود ہے یا وہ اکیلی ہے۔''

لورا نے مشورہ دیا۔ ''بہتر ہوگا میڈیکل کالج کے اندر جا کر جائزہ لے لیں۔''

''چلو۔'' میں کھڑا ہو گیا۔

ہم باہر نکل آئے۔ ایک کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ تیزی سے بولی۔ ''رکو۔'' اور غڑاپ سے اندر گھس گئی۔ دروازے پر ڈاکٹر وردان سنگھ کا نام اور آگے ڈگریوں کی لمبی قطار لکھی تھی۔ کھڑکی کے شیشے سے چیمبر خالی نظر آ رہا تھا۔ لورا کا اندر گھسنا مجھے حیران کر رہا تھا۔ سوچا شاید ڈاکٹر اس کا واقف کار ہے۔

کھڑکی کے شیشے سے لورا ڈاکٹر کی کرسی کی طرف بڑھتی نظر آئی۔ اور پھر کرسی کی پشت پر لٹکا ڈاکٹروں کا سفید کوٹ اور میز پر رکھا ''اسٹیتھو سکوپ'' اٹھا کر وہ سرعت سے باہر نکلی۔ دروازے سے باہر آنے تک وہ کوٹ پہن کر اسٹیتھو سکوپ گلے میں لٹکا چکی تھی۔

میرے ساتھ قدم ملاتے ہوئے وہ مسکرائی۔ ''امید ہے اب پہرے داروں کے سوالوں سے جان چھوٹ جائے گی۔''

''اگر اصل حلیے میں آ جاؤ تو ویسے ہی کوئی کچھ نہیں پوچھے گا۔ کیوں کہ ہماری طرف حکمران قوم سے کچھ پوچھنا گستاخی کے زمرے میں آتا ہے۔''

''یہی سمجھانے کی کوشش تو کر رہی تھی کہ تم لوگ، ہم جیسی ذہانت وعقل نہیں رکھتے۔''

میں طنزیہ انداز میں بولا۔''ذہانت یا چالاکی ومکاری۔''

وہ کھلکھلائی۔''جو سمجھو، لیکن یاد رہے چالاکی ومکاری بھی ذہانت کے بل بوتے ہی پر آتی ہے۔''

''مکاری کے پیچھے دھوکا وفریب کارفرما ہوتا ہے اور ایسی ذہانت تمھیں ہی مبارک۔''

ہم کالج کے قریب پہنچ گئے تھے۔ کے ایچ نارینہ ہسپتال اینڈ ریسرچ سنٹر کے کالج اور ہسپتال کی عمارت اکٹھی ہی تھی۔ وہ دروازے پر موجود پہرے دار کی طرف متوجہ ہوئی۔''فائنل کے طلبہ آپریشن تھیٹر میں مصروف ہوں تو تمھیں وہاں جانے کی اجازت ہوتی ہے۔''اس کا فصیح انگریزی میں پوچھا ہوا فضول سوال پہرے دار کے سر پر سے گزر گیا تھا۔

وہ ہکلایا۔''جج.....جی میم.....''

میں نے طنزیہ انداز اپنایا۔''اس بے چارے کو کیا پتا کسی ذمہ دار سے پوچھو۔''

''تو چلیں۔''وہ کندھے اچکاتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ ہمارا مقصد بس پہرے دار کے استفسار سے بچنا تھا۔ یوں بھی ہم پاکستان وانڈیا میں نچلے طبقے پر رعب جھاڑنے کو انگریزی بولنے سے عمدہ کوئی طریقہ نہیں۔

جدید سہولیات سے مزین میڈیکل کالج میں کثیر تعداد میں طلبہ موجود تھے۔ وہاں پرما کو ڈھونڈنا مشکل تھا کہ ہمیں اس کی کلاس ہی معلوم نہ تھی۔ دوسروں سے معلومات لینے میں بھی کئی قباحتیں تھیں۔ ہم دائیں بائیں دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ایک کلاس روم کے باہر مجھے کالے تھری پیس سوٹ میں ملبوس، مضبوط بدن کا جوان چوکس کھڑا نظر آیا۔ میں نے لورا کی طرف دیکھا، وہ بھی فوراً میری طرف متوجہ ہوئی تھی۔ لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ یہ اسی کا محافظ ہی لگتا ہے۔

کمرے سے آگے بڑھتے ہی میں نے کہا۔''میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے۔''

''کیا؟''اس کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

اور میں دھیمے لہجے میں اپنا منصوبہ بتانے لگا۔ تفصیل کے اختتام پر اس کی آنکھوں کی چمک سوا ہو گئی تھی۔''میرا خیال ہے انتظار کرنا فضول ہوگا۔''اس نے متفق ہونے میں دیر نہیں کی تھی۔

''چلیں۔''میں نے واپسی کا اشارہ کیا۔ مختلف راہداریوں سے گزرتے ہم واپس اسی محافظ کے پاس پہنچے۔ اب وہ ایک بینچ پر بیٹھا تھا، مگر یوں کہ اسے کھڑا ہونے کو دیر نہ لگتی۔

''کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟''اس کے قریب قدم روکتے ہوئے لورا نے قدرے درشت لہجے میں پوچھا تھا۔

نشست چھوڑتے ہوئے اس نے فوراً تعارف کرایا۔''مادام، میں راج کماری پرما کا محافظ ہوں۔''

''کون راج کماری۔ اور کسی طالب علم کو اپنے ساتھ محافظ لانے کی اجازت کس نے دی۔''برہمی سے کہتے ہوئے وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔''مسٹر مہتہ! کیا تمھارے علم میں یہ تھا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔''نہیں مادام۔''

لورا اسے مخاطب ہوئی۔''مسٹر، تمھیں ہمارے ساتھ جانا ہوگا۔''

محافظ دلیری سے بولا۔''میں راج کماری کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ البتہ جنرل رندھیر شکلا سے آپ کی بات کروا سکتا ہوں۔''

میں اردو میں بولا۔''اتنی تگ ودو کی ضرورت نہیں، مادام نے کون سا تمھیں پورا دن روکنا ہے۔ ان کے آفس میں

بیٹھ کر جنرل صاحب سے بات کرلیں گے، بلکہ مادام کی بات کروالیں گے تاکہ اپنی آنکھوں سے محترمہ کی بے عزتی بھی سن سکیں۔ نئی نئی آئی ہے اور کچھ زیادہ ہی پر پرزے نکال رہی ہے۔'' میرا انداز کسی مجبور ماتحت کا سا تھا جسے اپنے دیس میں بدیسی آقا سے واسطہ پڑا ہوا ہو۔

لورا بھر کے توقف کے بعد وہ کندھے اچکاتا ہوا ہمارے ساتھ چل پڑا۔ ایک خالی کمرہ ہم پہلے تاڑ آئے تھے۔ اسے لیے ہم سیدھا وہیں گھسے۔ میں سب سے پیچھے تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی میں نے دروازہ بھیڑا ساتھ ہی سائیلنسر لگا گلاک ،کوٹ کی جیب سے میرے ہاتھوں میں منتقل ہو گیا تھا۔

دروازے کے بند ہونے کی ''کلک'' ہوتے ہی وہ پھرتی سے پیچھے مڑا۔ اس کا کسرتی بدن اور پر اعتماد چہرہ واضح کر رہا تھا کہ وہ مشکل ہدف تھا تبھی میں نے ہتھیار کا استعمال ضروری سمجھا تھا۔ مجھے پستول بکف دیکھ کر اس کے چہرے پر غصہ ابھرا۔ وہ مجھ سے تین چار قدم دور تھا۔ اسے جارحانہ موڈ میں دیکھتے ہی میں اطمینان سے بولا۔

''یقین کرو اپنے ہاتھ اٹھا کر جان بچانا گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔''

وہ برہمی سے بولا۔ ''تم جانتے نہیں کتنی بڑی غلط.....اوغ۔'' سر پر لگنے والی ضرب سے وہ بات مکمل نہیں کر سکا تھا۔ لورا اچھی طرح جانتی تھی کہ ہمارے پاس مکالمے بازی میں ضائع کرنے کا وقت نہیں تھا۔ تبھی اس نے پستول کے دستے سے اس کا سر بجانے میں خاصی قوت صرف کی تھی۔

ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑتے ہوئے وہ لمبا پڑ گیا تھا۔ میں نے سرعت سے اس کی ٹائی کھول کر ہاتھ جکڑے اور بوٹوں کے تسموں کو آپس میں باندھ کر پاؤں جکڑ دیئے۔ ٹخنوں تک آتے بوٹ بغیر ہاتھ استعمال کیے اتارنا ممکن نہ تھا۔

اسے گھسیٹ کر ایک میز کے نیچے چھپایا اور باہر نکل آئے۔ پرما کے کلاس روم تک ہم جیسے اڑ کر پہنچے تھے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ میں باہر رک گیا، لورا نے اندر گھستے ہی پوچھا۔

''راج کماری پرما.....''

''یس مادام۔'' پرما کی سریلی آواز آسانی سے مجھ تک پہنچی تھی۔

لورا نے آواز میں پریشانی و بے چینی سموتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں قریب آ کر میری بات سننا چاہیے۔''

اسٹیتھو سکوپ، سفید کوٹ اور فصیح انگریزی نے کسی کو استفسار کی جرأت نہیں دی تھی۔

''خیریت تو ہے ڈاکٹر۔'' پرما کی آواز میں اندیشے تھے۔

''بے بی پریشان نہ ہو، ڈاکٹر سنبھال لیں گے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ایسے حادثے معمول کی بات ہیں۔''

''آپ پہلے ہی ہمیں بہت زیادہ ڈرا چکی ہیں۔'' پریشان کن لہجے میں کہتے ہوئے وہ دروازے تک پہنچی۔

''شکلا صاحب کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ اور انھوں نے آپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔'' تیز لہجے میں کہتے ہوئے لورا باہر نکلی۔

پرما نے باہر آتے ہی دائیں بائیں دیکھا۔ ''چندن کہاں گیا؟''

''کون چندن؟'' لورا انجان بن گئی تھی۔

''ہمارا محافظ ہے۔'' پرما سخت گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ میں چند قدم دور انجان بنا کھڑا رہا۔ دو آدمیوں کو دیکھ کر وہ بدک سکتی تھی۔

''بے شک اسے کال کر لو مگر خدارا دیر نہ کرو، شکلا صاحب کی حالت خاصی مخدوش ہے۔'' بہ ظاہر لورا نے اسے مرضی کرنے کی اجازت دی مگر شکلا کی ناگفتہ بہ حالت کا ذکر کر کے جلدی کرنے کی ترغیب بھی دے ڈالی تھی۔

لورا کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے پرمانے پوچھا۔ ''گرینڈ پا کو کس وقت دورہ پڑا ہے۔''

لورا نے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے ہی انھیں یہاں لایا گیا ہے، فی الحال ''آئی سی یو'' میں ہیں۔''

میں چند قدم کے وقفے سے ان کے عقب میں چلنے لگا۔ پرما خود میڈیکل کی طالبہ تھی اور لورا اچھی خاصی تضاد بیانی کر چکی تھی، مگر پرما دھیان نہیں دے سکی تھی۔ لورا ایک طرف شکلا کی حالت کو مخدوش اور اس کا آئی سی یو میں داخل ہونا بتا رہی تھی، ساتھ ہی اس کا پرما سے ملنے کی خواہش ظاہر کرنا بتا رہی تھی۔

کالج سے نکلتے ہی میں چوکنا ہو گیا تھا۔ لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ ہمارے عقب میں دو آدمی آ رہے تھے، جونہی وہ ایک وارڈ میں گھسے، میں نے پیچھے دیکھ کر عقب کے محفوظ ہونے کو یقینی بنایا اور پرما کے قریب ہو کر ایک دم اس کے سر پر پستول کا دستہ رسید کرتے ہوئے پستول جیب میں ڈال لیا۔

وہ گہری کراہ کے ساتھ زمین بوس ہو گئی تھی۔ سامنے کچھ فاصلے پر چند بندے آ رہے تھے، مگر کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔

''کیا ہوا۔'' تشویش بھری آواز میں کہتے ہوئے میں جھکا اور اسے بازوؤں میں بھر کر اٹھا لیا۔

''شاید دورہ پڑا ہے، اسے ایمرجنسی میں لے جانا پڑے گا۔'' لورا بدحواسی میں کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ دو کمرے چھوڑ کر سرجیکل وارڈ تھا۔ وہاں اسٹریچر نظر آئے۔ لورا نے ایک اسٹریچر سیدھا کیا اور میں نے فوراً پرما کو اوپر لٹا کر اپنا کوٹ اس کے چہرے و چھاتی پر ڈال دیا تھا۔

ہسپتال میں اکثر افراتفری ہی مچی رہتی ہے۔ مریضوں کا آنا جانا تسلسل سے جاری ہوتا ہے۔ اس لیے ہماری حرکت مشکوک نہیں لگ رہی تھی۔ سونے پر سہاگا لورا براؤن کا ڈاکٹروں والا حلیہ تھا۔

داخلی دروازے سے نکل کر ہم پارکنگ کی طرف بڑھے۔ میرے دل میں اس کے محافظوں کا خطرہ موجود تھا۔ گو پہلے تمام کینٹین میں بیٹھے تھے، مگر ان کی پارکنگ میں واپسی غیر یقینی نہیں تھی۔ ہماری قراولی ادھوری تھی۔ پوری معلومات حاصل کیے بغیر ہم نے ہدف پر ہاتھ ڈالا تھا اور قریباً کامیابی کے نزدیک تھے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو جاتی تو بھاگنا مشکل ہو جاتا۔ شکلا ہر چوک پر، ناکے لگوا سکتا تھا۔ ہماری کار کی حالت بھی اتنی اچھی نہیں تھی کہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کر سکتے۔ اور سب سے بڑھ کر ہمیں مغوی کو ٹھکانے تک لے جانا تھا، اپنی ذات تک ہمیں بھاگنے میں کوئی مسئلہ نہ ہوتا لیکن پرما کو ساتھ پھرانا تبھی ممکن تھا کہ ہم چپکے سے کام کر جاتے۔

یہی خیال شاید لورا براؤن کے دماغ میں بھی اٹھا تھا۔ پختہ روش کے ساتھ مجھے اسٹریچر روکنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ بولی۔ ''کار پارکنگ سے باہر لے آؤ۔''

اس کی احتیاط مجھے پسند آئی تھی۔ میں لمبے ڈگ رکھتا ہوا پارکنگ کی طرف بڑھ گیا۔ ایک جیپ کی عقبی نشست پر چار محافظ بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ ہماری احتیاط پسندی کام آ گئی تھی۔ میں نے تو کار بھی ان کی جیپ کی بغل میں کھڑی کی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر میں نے ان پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور کار پارکنگ سے باہر لے آیا۔ لورا بے چینی سے منتظر تھی۔ ہم نے فوراً اسے عقبی نشست پر منتقل کیا، لورا اس کا سر گود میں لے کر بیٹھ گئی تھی۔ ڈرائیونگ سنبھالتے ہوئے میں نے کار آگے بڑھا دی۔ اسٹریچر سنبھالنے کا وقت نہیں تھا۔ ویسے بھی پارکنگ کے قریب چند اسٹریچر رکھے ہوئے نظر آئے تھے، جو یقیناً خستہ حال مریضوں کو اندر لے جانے کو رکھے گئے تھے۔

جونہی بڑی سڑک پر چڑھے، پرما با آواز بلند کراہی۔ میں نے عقبی شیشے میں جھانکا وہ اٹھنے کی کوشش کرتی نظر آئی تھی۔ مگر لورا نے اس کی گردن کی رگ مسلتے ہوئے دوبارہ بے ہوش کر دیا تھا۔

میں درمیانی رفتار سے چلتا گیا کہ تیز رفتاری لوگوں کو متوجہ کرتی ہے۔ ہمیں چلتے ہوئے آدھا گھنٹا ہوا تھا کہ پرما کا موبائل فون بجنے لگا۔ لورا نے اس کے ''شولڈر بیگ'' سے فون نکال کر بند کر دیا کہ آن ہونے کی حالت میں ہمیں موبائل فون کے ذریعے ڈھونڈا جا سکتا تھا۔

میں نے مشورہ دیا۔ ''بہتر ہوگا اپنا کوٹ اتار دو اور پرما کو بھی سیٹ سے ٹیک لگا کر بٹھا دو۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' لورا نے عمل کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس نے اپنا کوٹ اور اسٹیتھو اسکوپ کار کے فرش پر پھینکا اور پرما کو سیٹ سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔ اب بہ ظاہر یوں لگتا تھا جیسے وہ نیند میں ہو۔

مجھے معلوم تھا کہ جلد ہی ہماری تلاش میں تیزی آنے والی تھی اور اس سے پہلے اپنے ٹھکانے پر پہنچنا ضروری تھا۔ مزید گھنٹے بھر کی ڈرائیونگ کے بعد ہم بہ خیریت منزل پر پہنچ گئے تھے۔ کھولی کے سامنے کار روک کر ہم نے احتیاط سے پرما کو اندر منتقل کیا۔ اور پھر میں نے کار مخصوص جگہ پر کھڑی کر دی۔ کار کا رنگ، ماڈل اور حالت ایسی تھی کہ اس جیسی ہزاروں کاریں ممبئی میں موجود تھیں۔ اس لیے کار تبدیل کرنے کی بہ ظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

لورا، پرما کے ہاتھ پاؤں ہتھکڑیوں میں جکڑ کر اس کے منہ پر ٹیپ چپکا چکی تھی۔ مجھ سے زیادہ وہ پرجوش تھی۔ گو پرما کو تکلیف دہ حالت میں دیکھ کر مجھے دکھ ہوا تھا، مگر کیا کرتا کہ مجبوری تھی۔ انصاری صاحب کی شہزادی کو میں شہزادیوں کی طرح نہیں رکھ سکتا تھا۔ اگر وہ تعاون کرنے پر آمادہ ہو جاتی تو اسے مکمل آرام و سہولت میسر کرنے کی کوشش کرتا مگر اب ایسا ممکن نہ تھا۔ اڑتی اڑتی جو خبریں مجھ تک پہنچی تھیں ان کے مطابق اپنی بیٹی اور انصاری صاحب کی بیوی پاروتی شکلا کو شکلا ہی نے قتل کرایا تھا۔ اس شقی القلب سے بیٹی کی شوہر سے وفاداری برداشت نہیں کی گئی تھی۔ ایک پاکستانی جاسوس کو بہ حفاظت فرار کرانے والی اس کی نظر میں ملک دشمن تھی۔ تبھی اسے گھر پہنچنے سے پہلے ہی ایکسیڈنٹ میں مروا دیا تھا۔ اور پھر بیٹی کی موت کے بعد اس کی محبت کا بہاؤ نواسی کی طرف مڑ گیا تھا۔ پرما کو ساتھ رکھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پاکستان و مسلمانوں سے نفرت کی وجہ سے وہ انصاری صاحب کو سخت ناپسند کرتا تھا تبھی باپ سے اس کی پیاری اولاد چھین لی تھی۔ اور ناممکن تھا کہ اس نے پرما کے ذہن میں والد کے خلاف زہر نہ بھرا ہو ورنہ پرما انصاری صاحب سے رابطے کی کوشش ضرور کرتی۔ اسے نانا کے پاس مطمئن دیکھ کر اور اس کی بیماری کا سن کر پرما کی پریشانی دیکھ کر یقین ہو جاتا تھا کہ وہ پاکستان جانے پر کسی صورت آمادہ نہ ہوتی۔

لورا نے پوچھا۔ ''اب کیا کریں؟''

''سب سے پہلے حلیہ تبدیل کرتے ہیں۔ ہسپتال و کالج میں کیمرے لگے ہیں اور یقیناً اب تک شکلا کیمروں کی وڈیو دیکھ چکا ہوگا۔''

لورا نے اشتیاق ظاہر کیا۔ ''کیا لگتا ہے اس نے مجھے پہچان لیا ہوگا یا نہیں۔''

میک اپ بکس کھولتے ہوئے میں نے کندھے اچکائے۔ ''کیا فرق پڑتا ہے۔''

''فرق تو پڑتا ہے، میں چاہتی ہوں اس کی نیندیں اڑ جائیں۔''

میں نے کہا۔ ''وہ تو تمہیں نہ پہچاننے پر بھی اڑ جائیں گی۔ کیوں کہ نیند اڑنے کا سبب پرما کا اغواء ہے۔ کس نے اغواء کیا یہ ثانوی رہ جاتا ہے۔''

وہ غصے سے بولی۔ ''دوسروں کی عزت خراب کرنے والے کی جب اپنی عزت پر بنے گی تو اسے دوسروں کی تکلیف کا احساس ہوگا۔ میں اس کی نواسی کا وہ حشر کروں گی کہ یہ درندہ قبر میں بھی اپنے کیے پر پچھتائے گا۔''

میں نے مطعون کیا۔ ''مجھے نہیں لگتا، کیپٹن لورا براؤن اتنی ظالم و ناانصاف ہوگی کہ ایک درندے کا بدلہ معصوم لڑکی

سے لینا چاہے گی۔"

اس نے کہا۔"سانڈوں کی لڑائی میں گھاس کا کچلا جانا قانون قدرت ہے۔"

میں طنزیہ انداز میں بولا۔"تم سانڈ نہیں، ہرنی ہو۔"

وہ بے پروائی سے بولی۔"بکرے کو چارہ بنا کر شیر کا شکار کرنے والے کا مطمح نظر بکرے کی زندگی نہیں شیر کی موت ہوتی ہے۔"

"پرما کا کوئی بال بانکا بھی نہیں کر سکتا۔تم شکلا کو دھمکانے کو جتنی لفظی گولہ باری کرنا چاہو پروا نہیں۔لیکن پرما کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گی۔"

مجھے گھورتے ہوئے اس نے طنز کیا۔"کیوں کھان لڑکی سے بھی زیادہ پیاری لگنے لگی ہے۔"

"میں بے گناہ کی صوت دیکھ کر مدد کرنے کا قائل نہیں ہوں۔اگر پرما تمھاری طرح بدصورت ہوتی پھر بھی اسے کچھ نہ ہونے دیتا۔"

"ریجا اور بکواس نہ کرے۔"اس نے آنکھیں نکالیں۔

"ہوش سے کام لو،لورا۔پرما بے قصور و بے گناہ ہے۔ایک معصوم پر ظلم کرتے ہوئے ترس نہیں آئے گا۔"

"اس کے نانا کو ظلم ڈھاتے وقت مجھ پر ترس آیا تھا۔کیا میں بے قصور نہ تھی۔"وہ حجت بازی پر اتر آئی۔

میں نے فضول دماغ کھپائی کے بجائے ٹی وی آن کیا اور چہرے کی مرمت کرنے لگا۔دھرمودا کی مہربانی سے اب ہم اپنا حلیہ تبدیل کرنے پر قادر ہو گئے تھے۔لورا نے بھی سانولی رنگت ختم کر کے گندمی رنگ اپنایا۔آنکھوں پر نیلے لینز چڑھائے۔بالوں کو بھورا کیا۔مصنوعی جبڑے ڈال کر گالوں کی ہڈی کو مزید ابھارا اور نئی لورا بن گئی۔میں بھی نئے حلیے میں آ گیا تھا۔

مختلف چینل کھنگالنے کے باوجود ٹی وی پر ہمارے متعلق کوئی خبر نہیں چلی تھی۔یقیناً شکلا خاموشی سے کام میں لگا تھا۔

ہم بہ مشکل شکل تبدیل کر پائے تھے کہ پرما زور سے کراہی اور پھر آنکھیں کھول دیں۔اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر صرف کسمسا کر رہ گئی تھی۔

"تمھارا منہ کھول رہی ہوں،اگر چیخنے چلانے کی کوشش کی تو بھیجا اڑا دوں گی۔سمجھ میں آیا کہ نہیں۔"اس کی آنکھوں کے سامنے زگانہ ٹائین ایم ایم لہراتے ہوئے لورا سفاک لہجے میں بولی تھی۔

پرما کی آنکھوں میں خوف چھلکا اور اس نے زور سے سر ہلا کر سمجھنے کا عندیہ دیا تھا۔

اس کے ہونٹوں سے ٹیپ اتار کر لورا کرسی گھسیٹ کر قریب ہوئی۔

"میں کیپٹن لورا براؤن ہوں۔ذرا حلیہ بدلا ہوا ہے ورنہ تم میرے نام سے اچھی طرح واقف ہو۔ہڈیوں سے چمڑا اتارنا مجھے اچھی طرح آتا ہے۔اور تمھارا چمڑا اتارنے سے پہلے تو لباس اترے گا۔اور اس کے بعد.....خیر بچی نہیں ہو تمھیں پتا ہو گا ایک جوان لڑکی کو دشمن کی قید میں کون سی اذیتوں سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔"

وہ ہکلائی۔"مم.....مگر ہمارا قصور.....؟"خوب صورت شوخ آنکھوں میں خوف ابھر آیا تھا۔

لورا غرائی۔"کیوں کہ تم ایک درندے کی اولاد ہو....."

"اپنے باپ سے ہم بھی اتنی نفرت کرتے ہیں جتنی آپ.....جب اس کے ظلم سے اپنی بچی اور بیوی محفوظ نہ رہیں تو آپ کس شمار میں ہیں۔مگر اس کے مظالم ہمارے کھاتے میں تو نہ ڈالیں۔"وہ لورا کی بات کو سمجھ نہیں پائی تھی۔لورا نے اسے شکلا کی اولاد پکارا تھا اور اس نے سگا باپ سمجھ لیا تھا۔پرما کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ انصاری صاحب کے خلاف شکلا

نے اس کے دل میں کتنا زہر بھر دیا تھا۔

لورا نے دانت پیسے۔ ''باپ نہیں، تمھاری ماں کے باپ کا ذکر کر رہی ہوں۔ میرا دشمن رندھیر شکلا ہے۔''

''گرینڈ پا..... مم..... مگر وہ تو آپ کے کاروباری ساتھی ہیں ناں۔'' یقیناً پرما کو لورا اچھی طرح یاد تھی۔

''وہ سؤر، میرا ساتھی نہیں؛ میری انا، خودداری و عزت کا قاتل ہے۔ اور جو ظلم اس نے مجھ پر ڈھایا، تم پر ٹوٹے گا۔ جتنی اذیت اس نے مجھے دی، تمھیں اتنی ہی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جو حال میرا اس نے کیا ویسا ہی حشر تمھارا کیا جائے گا۔ تمھیں کئی مردوں کے سامنے نہ پھینکا تو کہنا۔''

پرما گڑگڑائی۔ ''پپ..... پلیز..... ہمیں کیوں سزا دے رہی ہیں۔ آپ کے ساتھ زیادتی کرنے پر ہم نے تو گرینڈ پا کو نہیں اکسایا۔ ہم تو آپ کو جانتے بھی نہیں، بس ایک ہی سرسری سی ملاقات ہوئی تھی.....''

لورا نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ ''تمھاری بے گناہی میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔''

میں مخل ہوا۔ ''لورا شکلا کا فون نمبر لے کر اس سے بات کرو، اس بے چاری کو دھمکانے سے کیا ہوگا۔''

مجھے گھورتے ہوئے وہ غرائی۔ ''ریجا! تم بیچ میں نہ آؤ تو بہتر ہوگا۔''

میں اردو میں پرما کو مخاطب ہوا۔ ''فکر نہ کرو، میری موجودگی میں کوئی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

اس کے چہرے پر چمک ابھری اور وہ لجاجت سے بولی۔ ''تت..... تو آپ ہمیں چھوڑ دیں..... گرینڈ پا آپ کو مالا مال کر دیں گے۔''

''صرف یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ آپ کی جان اور عزت پر ہلکی سی آنچ بھی نہیں آنے دوں گا۔ باقی شکلا کے کرتوتوں سے آپ واقف نہیں ہو، ورنہ اس کے پاس جانے کے بجائے کنوئیں میں چھلانگ لگانا بہتر سمجھتیں۔''

لورا طیش میں آ کر بولی۔ ''ریجا انگریزی میں بات کرو۔''

میں مسکرایا۔ ''ہمیں اپنی زبان میں بات کرنا اچھا لگتا ہے۔''

''اے لڑکی تم میری بات سنو۔'' لورا کا ہاتھ اس کی ریشمی زلفوں کی طرف بڑھا۔ میں نے ایک دم لورا کا ہاتھ پکڑ کر دور جھٹک دیا تھا۔

''ہوش میں ہو۔''

''تت..... تم، ریجا.....'' لورا ششدر رہ گئی تھی۔

میں نے قطع کلامی کی۔ ''جو سلوک شکلا سے کرنا ہے اس کا نشانہ پرما کو نہ بناؤ۔ میں نے کسی بے گناہ کے خلاف تمھارا ساتھ نہیں دیا تھا۔''

وہ چلائی۔ ''دفع ہو جاؤ، مجھے تمھاری مدد کی کوئی ضرورت نہیں۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''پرما میرے ساتھ جائے گی۔''

''اور میں تمھارے بھیجے میں گولی اتار دوں تب.....؟'' لورا نے ایک دم سائلنسر لگا زگانہ مجھ پر تان لیا تھا۔

میں بے پروائی سے بولا۔ ''گولی چلانے کی جرأت ہے۔''

وہ اعتماد سے بولی۔ ''تم کے قاتل کے لیے میرے دل میں ذرا برابر ہمدردی نہیں ہے۔''

''اپنا یہ شوق بھی پورا کر لو، مگر میری زندگی میں پرما پر ہاتھ اٹھانا تو کجا کوئی ٹیڑھی نگاہ سے بھی نہیں دیکھ سکتا۔''

وہ بپھر کر بولی۔ ''آخر کیوں؟''

''کیوں کہ تمھارا ساتھ میں نے انصاف کے حصول کو دیا تھا۔ اور اب پرما سے شکلا کا نمبر معلوم کرو تاکہ اپنا مقصد پورا

کر سکیں۔''

''ریجا تم نہیں جانتے شکلا کے خلاف میرے دل میں کیا الاؤ روشن ہے۔ میں اس سے تعلق رکھنے والی ہر چیز، ہر انسان بلکہ جانور تک کو نیست و نابود کرنا چاہتی ہوں۔ جس اذیت سے میں گزری ہوں وہ صرف میں جانتی ہوں.....یا۔'' لمحہ بھر توقف کر کے اس نے فقرہ مکمل کیا۔ ''تمھارا خدا۔''

''میں نے قریب ہوا، اس کے ہاتھ سے پستول لے کر اس کی جیب میں ڈالا اور بازو سے پکڑ کر باہر لے آیا۔ داخلی دروازے کے ساتھ کھڑے ہو کر میں نے کمرے سے تھوڑا فاصلہ پیدا کیا اور معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ''تم میرے مشن کے بارے جاننے کی خواہش مند تھیں ناں؟''

اس کے چہرے پر تعجب ابھرا۔ ''مگر اس لڑکی کا تمھارے مشن سے کیا تعلق.....؟''

میں نے انکشاف کیا۔ ''اسی کا حصول تو میرا مشن تھا۔''

وہ بوکھلاتے ہوئے بولی۔ ''کک.....کیا مطلب؟ لگتا ہے اس کی صورت دیکھ کر ریجھ گئے ہو۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''بلاشبہ تم سے خوب صورت نہیں ہے۔''

وہ الجھن آمیز لہجے میں بولی۔ ''ریجا! صاف صاف بتاؤ کیا چاہتے ہو۔''

''یہ پرما شکلا نہیں، پرما ملہوترا، بلکہ پرما انصاری ہے۔ اس کے باپ کا نام بریگیڈیئر فہیم اسلم انصاری ہے۔ وہ بھارت میں طویل عرصے تک جاسوس بن کر رہے۔ پرما کی ماں سے ان کی شادی پیشہ ورانہ مجبوری کے تحت ہوئی مگر وہ بیوی سے بہت محبت کرتے تھے۔ پرما بھی انھیں جان سے پیاری تھی۔ شاید وہ ساری زندگی بھارت میں گزار دیتے، مگر بدقسمتی سے ان کا راز فاش ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ گرفتاری عمل میں آتی، بیوی کے ذریعے انھیں اپنا بھانڈا پھوٹنے کی خبر پہنچ گئی۔ اور بیوی ہی کی مدد سے وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔ شکلا کو جونھی بیٹی کے کارنامے کی خبر ملی اس نے پاروتی کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔ اور پرما کی ماں بے چاری گھر زندہ نہ لوٹ سکی۔ بیٹی کی موت کے بعد شکلا، نواسی کو اپنے پاس لے گیا۔ انصاری صاحب نے بہت کوششیں کیں کہ اپنی بیٹی کو پا سکیں، مگر ان کی راہ میں شکلا کا منحوس وجود رکاوٹ بنا رہا۔ شکلا نے نہ صرف باپ کو بیٹی سے ملنے سے روکے رکھا بلکہ پرما کے ذہن میں ایسا زہر بھرا کہ آج اس معصوم کو اپنا باپ ایک قاتل اور ظالم شخص دکھائی دیتا ہے۔ جب انصاری صاحب کی دو تین کوششوں کے باوجود کامیابی نہ ہوئی تو انھوں نے مجھے شکلا کے خاتمے اور پرما کی بازیابی کو بھیجا۔ میرے ساتھ ایک کمانڈو بھی آیا تھا جو ایک معرکے میں شہید ہو گیا۔ پھر تم ملیں اور باقی کہانی تمھیں معلوم ہے۔''

گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ تھاما۔ ''ویسے اس بارے اجمالاً تو مجھے بھی پتا تھا، بہ ہر حال اب کیا چاہتے ہو؟''

''تم شکلا سے رابطہ کر کے اپنا کام نکلواؤ، پھر اسے قتل کر کے پرما کو ساتھ لے جاؤں گا۔ امید ہے اس کی ہلاکت کے بعد زیادہ رکاوٹوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''

لور اصاف گوئی سے بولی۔ ''میں چاہتی تھی پرما پر تشدد کی وڈیو اسے بھیجوں تاکہ وہ مزاحمت نہ کر سکے۔''

''اسے پرما کی بندھی ہوئی حالت کی تصویر دکھانا کافی ہوگا۔''

اس نے تھکے تھکے لہجے میں متفق ہونے کا اعلان کیا۔ ''کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔''

''تو چلو۔'' میں نے کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔

''اے ریجا! خفا تو نہیں ہو تم پر پستول تانا.....'' میرا ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے ندامت ظاہر کی۔

میں مسکرایا۔ ''کسی بے وقوف کی بات پر غصہ کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔''

وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''تم سے معذرت کرنا ہی فضول ہے۔''

میں کھل کھلاتے ہوئے اندر گھس گیا۔ پرما منتظر نظروں سے دروازے کی جانب متوجہ تھی۔

کرسی سنبھالتے ہی لورا نے کہا۔ ''اپنے نانا کا نمبر بتاؤ۔''

اس نے بے بسی ظاہر کی۔ ''ہمیں یاد نہیں ہے، ہمارے موبائل فون میں لکھا ہوگا۔''

''موبائل فون پر پاس ورڈ لگا ہوا ہے۔''

''پاروتی.....'' اس نے اداس لہجے میں اپنی ماں کا نام لیا تھا۔

''ریچا بات سنو۔'' لورا دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ صحن میں نکل کر وہ دبے لہجے میں بولی۔

''یہاں سے بات کی تو منکشف (لوکیٹ) ہو جائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''بات چیت تم نے کرنا ہے اور تمہیں اکیلا جانے نہیں دے سکتا۔''

''بالکل، پرما کی نگرانی بھی تو ضروری ہے۔''

میں نے مشورہ دیا۔ ''ہاتھ پاؤں جکڑے ہیں، منہ پر ٹیپ چپکا کر نکل جاتے ہیں۔ البتہ اسے یہی باور کرائیں گے کہ ایک آدمی یہیں ہے۔''

اس نے اتفاق کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہم واپس پرما کے پاس پہنچ گئے۔

''تمہارا نانا اس وقت کہاں ہوگا؟'' لورا نے دوبارہ تفتیش شروع کر دی۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہمیں نہیں پتا۔''

لورا نے پوچھا۔ ''مستقل ممبئی میں ہوتا ہے یا کسی اور شہر میں ٹھکانہ بنا رکھا ہے۔''

جواب ملا۔ ''عموماً سفر میں رہتے ہیں، یہاں بھی آنا جانا لگا رہتا ہے، البتہ دوسرے شہروں کی نسبت یہاں زیادہ وقت گزارتے ہیں۔''

''یہاں اس کی کیا روزمرہ ہوتی ہے؟''

پرما نے کہا۔ ''باہر کا تو پتا نہیں، البتہ گھر میں ہمیں وقت دیتے ہیں، لائبریری میں گھسے رہتے ہیں یا آرام کرتے ہیں۔''

لورا چند ضروری و غیر ضروری سوال پوچھ کر میری طرف متوجہ ہوئی۔ ''ریچا! بہتر ہوگا تم شکلا سے بات کرنے چلو جاؤ۔''

''ٹھیک ہے۔'' اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''پرما کا موبائل فون مجھے پکڑاؤ۔''

موبائل فون میری طرف بڑھا کر اس نے پرما سے پوچھا۔ ''لڑکی، میرا آرام کا موڈ ہے۔ تمہیں کوئی حاجت ہے تو پوری کر لو، بعد میں ذرا سی آواز آئی تو یاد رہے تمہیں چھڑانے کو ریچا یہاں نہیں ہوگا۔''

وہ منمنائی۔ ''ہمیں تازہ دم ہونا ہے۔''

لورا نے اس کی ہتھکڑیاں کھول کر کہا۔ ''تمہارے پاس پانچ منٹ ہیں۔''

کلائیوں کو مسلتے ہوئے وہ بیت الخلاء میں گھس گئی۔ بیت الخلاء اور غسل خانہ اکٹھے ہی تھے۔ روشندان موجود تھا، مگر اس سے بہ مشکل بلی ہی گزر سکتی تھی۔

پرما کے غسل خانے میں گھستے ہی میں باہر نکل آیا تاکہ اسے لگے میں چلا گیا ہوں۔ میں پارکنگ کی طرف بڑھ

گیا۔ جب تک کار اسٹارٹ کر کے کھولی کے سامنے پہنچتا لورا باہر آ گئی تھی۔ کھولی کا بیرونی دروازہ بھی تالا کر کے اس نے میرے ساتھ نشست سنبھال لی۔

کار آگے بڑھتے ہی اس نے پوچھا۔ ''کیا ترتیب ہوگی؟''

''تم بات کرو گی، طویل گفتگو نہ کرنا۔ چند دھمکیاں دے کر مطالبہ پیش کرنا اور پھر نکل بھاگیں گے۔''

''جانا کہاں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ایسی جگہ جہاں بھیڑ زیادہ ہو، تاکہ ہمیں آسانی سے نہ ڈھونڈا جا سکے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سہ پہر ہو گئی تھی۔ گھنٹے بھر کے سفر کے بعد میں نے ایک بڑے شاپنگ پلازا کی پارکنگ میں کار روکی اور ہم اندر گھس گئے۔ ایک دکان میں زیر لباس نسوانی استعمال (انڈر گارمنٹس) کی چند چیزیں لے کر لورا ''ٹرائی روم'' میں گھس گئی۔ میں دروازے پر کھڑا ہو گیا تاکہ وہ آسانی سے بات کر سکے۔

اس نے پرما کا موبائل فون آن کر کے شکلا کو کال ملا لی۔ میرے کانوں میں اس کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ اور جس طرح وہ طیش میں بات کر رہی تھی یقیناً شکلا کے اندیشے مزید بڑھ جاتے تھے۔

دس منٹ بات کر کے اس نے رابطہ ختم کیا اور موبائل فون بند کر کے نکل آئی۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ خریداری کر سکتے۔ تمام چیزیں وہیں چھوڑ کر ہم باہر نکل آئے۔ اگلے پانچ منٹ میں کار میں بیٹھ کر ہم پارکنگ سے نکل آئے تھے۔ بازار سے نکلنے میں، میں نے سرعت کا مظاہرہ کیا تھا۔ بڑی سڑک پر چڑھتے ہی لورا کی طرف متوجہ ہوا۔

''کیا رہا؟''

وہ طمانیت سے بولی۔ ''گڑگڑا رہا تھا۔ یقین مانو ریجا، اس فرعون کا لجاجت بھرا لہجہ سن کر سینے میں ٹھنڈ پڑ گئی ہے۔''

میں منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''تفصیل بتاؤ۔''

''پہلے تو خبیث نے خوشی کا اظہار کیا کہ شاید نواسی کی کال ہے۔ میری آواز سنتے ہی سانپ سونگھ گیا تھا۔ اسے کھری کھری سنا کر میں نے اپنا سوئٹزرلینڈ بینک کا اکاؤنٹ نمبر بتایا اور بیس ملین پاؤنڈ کا ہرجانہ طلب کیا ہے، دوسری صورت میں پرما کے ساتھ جو کچھ ہو سکتا ہے اس کی دو تین مثالیں دیں۔ تاکہ سور کے ہوش ٹھکانے لگیں۔ منتیں کرنے لگا کہ اتنی رقم اس کے اکاؤنٹ میں بھی نہ ہوگی۔ مگر میں جانتی ہوں جھوٹ بک رہا تھا۔ قریباً اتنی رقم تو اسے ہمارے سودے میں بچ رہی تھی۔ اس سے پہلے بھی جانے کتنے سودے کر چکا ہوگا۔ ایسے بدکرداروں کے سوئٹزرلینڈ کے بینک اکاؤنٹ پیسوں سے لبالب بھرے پڑے ہیں.....''

میں نے قطع کلامی کی۔ ''راضی ہوا کہ نہیں۔''

''منتوں کے بعد دھمکیوں پر اتر آیا کہ اگر میں نے اتنے پیسے نکلوا بھی لیے تو وہ بعد میں میرے خلاف کارروائی کر سکتا ہے۔'' لورا کا قہقہہ بلند ہوا۔ ''بے وقوف کو کیا معلوم کہ بچے گا تو کچھ کرنے کے قابل ہوگا ناں۔''

میں نے بے چینی ظاہر کی۔ ''طے کیا ہوا؟''

''پانچ دن کی مہلت مانگ رہا تھا۔ تین دن کی مہلت دی ہے اس کے بعد لیت ولعل کی تو پرما کی پہلی وڈیو ارسال کروں گی۔''

میں نے کہا۔ ''پرما پر تشدد کا خواب بھول جاؤ۔''

وہ اطمینان سے بولی۔ ''تشدد بھی نہیں کروں گی اور وڈیو بھی ایسی بنے گی کہ شکلا کا سکون و آرام غارت ہو جائے گا۔''

میں نے خیال ظاہر کیا۔ ''مجھے لگتا ہے وہ خبیث اپنا نقصان نہیں ہونے دے گا۔''

''اگر اسے پرما کی فکر نہیں ہے تو ایسا سوچا جا سکتا ہے۔''

''تمھاری سمجھ میں میری بات نہیں آئی۔ وہ رقم ایس آر ون رائفلوں کو خریدنے کی مد میں ادا کرے گا تا کہ اپنا نقصان انڈین حکومت کے خزانے سے پورا کر سکے اور تمھارا مطالبہ بھی پورا ہو۔''

''ویری گڈ، اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ ایس آر ون رائفلیں میرے کس کام کی، اگر یوں وہ منہ مانگی رقم ادا کرنے پر تیار ہو جائے تو بہتر ہوگا۔ بلکہ اس نے ایسا نہ کہا تو میں خود یہ تجویز سامنے رکھوں گی۔ سچ میں تم بہت ہوشیار ہو۔'' اس نے پرجوش انداز میں میری پیٹھ تھپتھپائی۔

''تو مانتی ہو نا پاکستانی سپاہی کی سوچ برطانوی فوج کے آفیسر سے زیادہ ہوتی ہے۔''

وہ کشادہ دلی سے بولی۔ ''صرف تمھارے بارے یہ دعویٰ تسلیم کر سکتی ہوں۔''

میں نے موضوع تبدیل کیا۔ ''شکلا، پرما کو تلاش کرنے کو پوری طاقت استعمال کرے گا۔ تمام میسر ذرائع ہماری تلاش میں جھونک دے گا، اس لیے ہمیں بہت زیادہ احتیاط و چوکسی کی ضرورت پڑے گی۔''

وہ مسکرائی۔ ''اپنے تئیں تو کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے، باقی تمھارے اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیتے ہیں۔''

اب اللہ پاک کا بابرکت نام وہ عقیدت سے لینے لگی تھی۔ البتہ اللہ پاک کو پکارتی میری نسبت سے تھی۔

واپسی پر پرما ہمیں بہ خیریت ہی ملی تھی۔ قریبی مارکیٹ سے میں نے لورا کے لیے ایک نیا بستر خریدنا ضروری سمجھا تھا کہ اس کے بستر پر پرما قابض ہو گئی تھی۔

پرما جاگ رہی تھی ممکن ہی نہ تھا اسے نیند آ جاتی۔ کھولی میں تین ہی چارپائیاں دستیاب تھیں اور تیسری چارپائی جھلنگا بنی تھی اس کی نوار بھی دو تین جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔

''راج کماری صاحب اس پر آرام کریں گی۔'' لورا نے جھلنگا چارپائی پر سونے سے انکار کر دیا تھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ میرے لیے رہنے دو۔''

وہ بپھر کر بولی۔ ''تم کیوں جھلنگا چارپائی پر سوؤ گے۔''

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔ ''کیا تم نہیں جانتیں۔''

''زہر لگتی ہے تمھاری ہنسی۔'' بیویوں کے سے انداز میں مجھے کوستے ہوئے وہ جھلنگا چارپائی کی طرف بڑھی۔

میں نے اسے بازو سے پکڑا۔ ''سختیاں برداشت کرنا مرد کا کام ہوتا ہے عورت کا نہیں۔''

وہ برہم ہوئی۔ ''تمھاری عورتیں گھر بیٹھی ہیں۔''

''اچھا پانچ منٹ صبر کرو میں نئی چارپائی خرید لاتا ہوں تا کہ وجہ ہی کو قتل کر دوں۔''

پرما پر قہر آلود نظر ڈال کر وہ غرائی۔ ''وجہ پرانی چارپائی نہیں ہے۔''

''اور وجہ ایک معصوم لڑکی بھی نہیں ہے۔'' اسے اپنی چارپائی پر دھکیل کر میں باہر نکل آیا۔ چارپائی اور رات کا کھانا خریدنے میں مجھے دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

واپسی پر لورا، پرما کو دھمکاتی ہوئی ملی تھی۔ نجانے کیوں وہ پرما پر برہم تھی۔ حالاں کہ اچھی طرح جانتی تھی کہ شکلا کے کرتوتوں کی جوابدہ پرما نہیں ہو سکتی تھی۔

پرانی چارپائی صحن میں پھینک کر میں نے نئی چارپائی پر بستر لگایا۔ لورا خاموش ہو گئی تھی۔ پرما کی آنکھوں میں مجھے ہلکی نمی تیرتی نظر آئی۔ میں نے کڑی نظر سے لورا کو گھورا۔ اس نے ڈھیلوں کے انداز میں کندھے اچکا دیے تھے۔

میں نے پرما کی ہتھکڑیاں کھول کر اسے ہاتھ منہ دھونے کا کہا تا کہ کھانا کھا سکیں۔

وہ منمنائی۔ ''ہمیں بھوک نہیں ہے۔''

اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے میں اردو میں بولا۔ ''کہا ناں آپ کو کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ نہ عزت، نہ جان کو۔ ہماری دشمنی شکلا سے ہے۔ آپ بالکل بے گناہ و بے قصور ہو۔ اب اٹھو اور تازہ دم ہو جاؤ۔''

مجھ پر ممنونیت بھری نظر ڈال کر وہ غسل خانے میں گھس گئی۔ میں نے دو چار پائیاں ملا کر ان پر کھانا چن دیا۔

''آجاؤ۔'' میں نے لورا کو آواز دی۔

وہ قریب آئی۔ ''تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے۔''

مجھے حیرانی ہوئی۔ ''کیا ہوا؟''

وہ پست آواز میں بولی۔ ''اسے کیا تسلیاں دے رہے تھے۔ جب کہہ دیا کچھ نہیں کہوں گی تو زبانی کلامی دھمکانے پر تمھیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔''

میں طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تمھیں کیا معلوم میں اسے تسلیاں دے رہا تھا یا کوئی اور بات کر رہا تھا۔''

''اردو نہیں جانتی، تمھاری حرکتیں دیکھ کر اندازہ تو کر سکتی ہوں۔''

''کیا سہمی ہوئی لڑکی کو تسلی دینا غلط ہے، جبکہ لڑکی کے بے گناہ و بے قصور ہونے کا یقین ہو۔''

وہ بے پروائی سے بولی۔ ''اولاد کو والدین کا بویا کاٹنا پڑتا ہے۔''

''وہ ایک عظیم مجاہد کی بیٹی ہے، شکلا کی نہیں ہے۔ بلکہ شکلا تو اس کی ماں کا قاتل ہے۔''

''تم نرا سر درد ہو۔ اگر مجبور نہ ہوتی تو تمھارے ساتھ ایک پل نہ ٹھہرتی۔''

میں بیزاری سے بولا۔ ''مجبوری کیسی، دفع ہو جاؤ۔ شکلا کو پرما کے نام پر بلیک میل کر کے جو لینا ہے حاصل کرو۔ پرما کی فکر نہ کرو میں اسے سنبھال لوں گا اور ان شاء اللہ اب شکلا اس کی صورت نہیں دیکھ سکے گا۔''

وہ استہزائی انداز میں بولی۔ ''اوے ہوئے..... اتنی پسند آ گئی ہے کہ کیپٹن لورا براؤن بھی کباب میں ہڈی لگنے لگی ہے۔ اور یہ بھول گئے کیسے لجاتے ہوئے ندیدے پن سے ڈیٹ پر جانے کی درخواست کیا کرتے تھے۔''

چٹخنی کھلنے کی آواز پر میں دبے لہجے میں بولا۔ ''کوڑھ مغز اس کے سامنے ایسی بکواس نہ کر دینا۔''

ہونٹوں پر استہزائی مسکراہٹ بکھیرے وہ خاموش ہو گئی۔

پرما باہر آئی۔ سرخ و سفید چہرے پر پانی کے قطرے پھول پر پڑی شبنم کی طرح لگ رہے تھے۔ اس نے تولیہ استعمال نہیں کیا تھا۔ یقیناً نفیس سیٹھ زادی کو کسی دوسرے کا تولیہ استعمال کرنا قباحت لگ رہی تھی۔ بلکہ وہ عام سا بستر، غریبوں کا غسل خانہ و بیت الخلاء، مرمت کی متقاضی دیواروں والی کھولی جس کے فرش کا ناقص پلستر جگہ جگہ سے اُکھڑا تھا۔ یقیناً وہ مقام اس کے لیے کسی عقوبت خانے سے کم نہ تھا۔ لورا جیسی تربیت یافتہ اور عملی زندگی گزارنے والی سنا پر وہاں آ کر چیخ پڑی تھی۔ پرما تو نازوں میں پلی شہزادی تھی۔ جسے نہ گرمی سے پالا پڑا تھا نہ سردی سے واسطہ۔ گرمیوں میں ہر جگہ اے سی میسر ہوتا تو سردیوں میں ہیٹر۔ اس کھولی سے تو اس کے ملازموں کی رہائش بھی کئی گنا بہتر ہو گی۔

وہ قریب آ کر بیٹھ گئی۔ مجھے دکھانے کو اس نے دو تین نوالے زہر مار کیے، بلاشبہ پریشانی نے اس کی بھوک اڑا دی تھی۔ میں نے زیادہ اصرار نہ کیا کہ اس کی حالت سے بھی واقف تھا اور یہ اندیشہ بھی تھا کہ میرے اصرار کو فکر مندی جانتے ہوئے لورا بکواس نہ شروع کر دے۔

وہ پرما کو گھٹیا درجے کے قیدی سے زیادہ اہمیت دینے پر تیار نہ تھی۔ جبکہ انصاری صاحب سے عقیدت کی وجہ سے مجھے پرما کی فکر تھی۔ میں اسے ہلکی سی تکلیف پہنچانے پر راضی نہ تھا کجا اسے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا یا اس کی ہتک کی جاتی۔

بیٹی انصاری صاحب کو جان سے عزیز تھی۔ پرما کا ذکر کرتے وقت ان کے ہونٹوں پر شفقت بھرے تبسم کا ابھرنا، آنکھوں میں پرما کی جدائی پر نمی کا چھلکنا، چہرے کا حسرت و یاس کی تصویر بن جانا ظاہر کرتا تھا کہ پرما انھیں کتنی پیاری تھی۔ پرما کی محبت ہی تھی کہ وہ شکلا جیسے ڈائنوسار سے ہار ماننے کو تیار نہیں تھے۔

''ہمیں ہتھکڑیوں میں تکلیف ہو رہی ہے۔شاید سو نہ سکیں۔''لورا جونھی برتن سمیٹ کر اٹھی، پرما ہولے سے منمنائی۔ بے چاری لورا کے رویے کی وجہ سے خوفزدہ تھی۔ حالاں کہ ہم جنس ہونے کے ناتے اسے لورا کا سہارا لینے کی ضرورت تھی، مگر لورا کے بار بار جھڑکنے، دھمکانے اور اظہار نفرت کے بعد اس کا میرے ہمدردی بھرے رویے پر میری طرف متوجہ ہونا اچنبھے کی بات نہ تھی۔

لورا برتن دھونے صحن میں نکل گئی۔

میں نے ندامت ظاہر کی۔''یہ ہماری مجبوری ہے ورنہ آپ کو کبھی تکلیف نہ پہنچائی جاتی۔''

وہ لجاجت سے بولی۔''جب تک آپ موجود ہیں تب تک تو یونھی رہ سکتے ہیں ناں۔ بے شک آپ دروازے کو اندر سے تالا کر دیں۔''

میں متبسم ہوا۔''وعدہ کرتی ہو کہ بھاگنے کی کوشش نہیں کرو گی۔''

سر جھکا کر وہ اٹکتے ہوئے بولی۔''جج..... جی ہم وعدہ کرتے ہیں نہیں بھاگیں گے۔''شاید پہلی بار جھوٹ بولنا پڑا تھا جو ہکلا گئی تھی۔

اسے کرید کر نادم کرنے میں دلچسپی نہ تھی۔ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''اچھا سو جاؤ، میں جاگ رہا ہوں۔''

چہرے پر شکر گزاری کا گہرا اثر لیے وہ لیٹ گئی۔

لورا نے اندر آتے ہی برتن ایک طرف رکھے اور اسے کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے ہتھکڑی اٹھالی۔

میں جلدی سے بولا۔''فی الحال رہنے دو کیپٹن۔''

''سچ میں۔''اس کے چہرے پر بے یقینی ابھری۔

''میں جاگ رہا ہوں۔''

وہ برہمی سے بولی۔''اس کے لیے کب تک جاگو گے۔''

میں اطمینان سے بولا۔''آرام کرو یہ تمھارا ڈرمر نہیں ہے۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔''تم ہو نا میرا ڈرمر۔''

''ایک آدمی کا جاگنا ضروری ہے۔''

اس نے منہ بگاڑا۔''تمھارے جاگنے پر نہیں، لڑکی کے نہ بندھے ہونے پر معترض ہوں۔''

''کیا خیال ہے تمھارے اعتراض کی مجھے پروا ہو گی۔''

وہ استہزائی انداز میں بولی۔''ایک بریگیڈئر کا ایسے سپاہی کو اپنی ڈاکٹر بیٹی کا رشتہ دینا جو پہلے سے دو بیویوں کا شوہر ہو ،یقیناً احمقانہ اور لچر سوچ ہے۔''

میں نے تیز لہجے میں اسے ٹوکا۔''بکواس کی ضرورت نہیں، شکلا بریگیڈئر نہیں جنرل ہے۔''ساتھ ہی آنکھ مار کر اسے انصاری صاحب کا ذکر نہ کرنے کا اشارہ کر دیا۔

اس نے تپتے ہوئے کہا۔''کوئی انہونی ہو گئی تو تمھیں گولی مارنے سے بھی نہیں چوکوں گی۔''

میں نے اس کے اندیشے کو درخور اعتنا نہیں جانا تھا۔ میرا مطمح نظر پرما کو حتی الوسع آرام پہنچانا تھا۔ میں صبح بھی سو سکتا

تھا۔ یوں بھی دو تین دن ہم نے باہر نہیں نکلنا تھا۔ ٹی وی کی میز اپنی چار پائی کے قریب کر کے میں نے آواز دھیمی کی اور خبریں دیکھنے لگا۔ نامعلوم دہشت گردوں کی وجہ سے پولیس جگہ جگہ پر چھاپے مار رہی تھی۔ مختلف سڑکوں پر پولیس کے ناکے اور چیک پوائنٹ قائم ہو گئے تھے۔ پرما کے اغواء کی خبر کسی چینل پر نہیں آئی تھی، البتہ میڈیکل کی ایک نامعلوم طالبہ کی پراسرار گمشدگی کا ذکر دو تین چینلوں نے کیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی لورا کے گہرے سانس میری سماعتوں میں گونجنے لگے۔ پرما کی آنکھیں بھی بند تھیں۔ خبروں کا تکرار اور بار بار گھوم پھر کر پرانی گفتگو کا دہرایا جانا زیادہ دیر برداشت نہ ہو سکا مجبوراً مجھے چینل تبدیل کرنا پڑا۔ اور میں نے ایک دستاویزی فلم لگالی۔ رات دبے پاؤں سرکنے لگی۔ اسی دوران غنودگی کا ہلکا سا جھٹکا لگا، آرام دہ بستر پر مسلسل جاگنا بھی کار دار بن جاتا ہے۔ میں پرما کے ہاتھ پاؤں جکڑنے کے ارادے سے اٹھا۔ تاکہ تھوڑی نیند لے لوں وہ کمبل میں غائب تھی صرف موہنا چہرہ ہی باہر نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر اتنی معصومیت اور الہڑ پن چھایا تھا کہ میں اسے نیند سے جگانے کا حوصلہ نہ کر سکا۔

دروازے کو صرف باہر سے تالا کیا جا سکتا تھا کیوں کہ اندر زنجیر کے بجائے چٹخنی لگی تھی۔ مجھے اور کچھ نہ سوجھا اور حفظ ماتقدم کے طور پر اپنی چار پائی کو دروازے کے سامنے بچھا دیا۔

میری نیند ایسی نہ تھی کہ پرما میرے اوپر سے گزر کر دروازے سے باہر چلی جاتی اور میں سویا رہتا۔ اس کے باوجود میں نے لمبا پڑنے کے بجائے گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھنا ضروری سمجھا تھا کیوں میں خطرہ مول لینے کے حق میں نہ تھا۔ پرما کے حصول کے بعد میرا مشن تقریباً مکمل ہو گا تھا، بس اب شکلا کے خاتمے کا منصوبہ بنانا تھا تاکہ بھارت سے فرار ہونے میں آسانی ہوتی۔ پرما کے ماموں کو یقیناً اس کی اتنی پروا نہ ہوتی جتنی نانا کو تھی۔

بیٹھے بیٹھے ہی میں اپنی پلوشے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کی یاد چھاتی کا پھوڑا بنتی جا رہی تھی۔ انڈیا آمد کے بعد مجھے آرام کے اوقات کم ہی میسر رہے تھے۔ اور یہ میرے لیے بہتر تھا کہ مصروفیت اس کی جان لیوا یادوں سے چھٹکارے کا باعث بنتی تھی۔ اب تو جدائی کے ساتھ اس کی خفگی کا احساس بھی دل و دماغ پر کچوکے لگاتا رہتا تھا۔

آنکھیں بند کرنے کے بعد میں اس کے تصورات میں کھو جاتا، گزری باتیں دہراتا، اس کی اداؤں میں ڈوب جاتا، اس کے روٹھنے منانے سے لطف اندوز ہوتا، اس کی کھنکتی، گنگناتی ہنسی دھیان میں لاتا، دبی دبی سرگوشیوں کے لیے سماعتوں کو وا کرتا، اس کے گرم مہکتے سانسوں کی پھوار کو محسوس کرتا، اس کا میری انگلیوں کو چٹخانا یاد کرتا۔ میرے ہاتھ اس کی ناک، کان، ریشمی زلفوں کے لمس کا احساس کرتے، یہاں تک کہ میں نیند میں ڈوب کر ایسے جہان میں پہنچ جاتا جہاں نہ اس کی خفگی موجود تھی اور نہ جدائی سے واسطہ تھا۔

اس کی سب سے بڑی کمزوری گدگدی تھی۔ بغل یا پیٹ میں انگلی چبھونے سے وہ یوں اچھلتی تھی جیسے بجلی کا کرنٹ یا بچھو کا ڈنک لگا ہو۔ چھوٹی موٹی خفگی کو دور کرنے کا یہ تیر بہ ہدف نسخہ تھا۔ میں پوچھتا..... ''موڈ ٹھیک کرتی ہو یا کروں گدگدی۔'' اور وہ فوراً خفگی ختم کر دیتی تھی۔

سپنوں کی دنیا ایسی جگہ ہے جہاں غم کم اور خوشیاں بے بہا ہوتی ہیں۔ انسان کی بہت سی تشنہ خواہشات خواب نگر میں پوری ہوتی ہیں۔ میری آنکھیں بھی نیند میں پلوشے کی دید سے بہرہ مند ہوتیں، قوت شامہ اس کی خوشبو سے فیض یاب ہوتی اور سماعتیں میٹھی سرگوشیوں سے متمتع ہوتیں۔ بیٹھے بیٹھے میں بھی سپنوں کی دلکش دنیا میں پہنچ گیا۔ پلوشے میرا سر گود میں رکھے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اس کے لبوں پر پشتو زبان کا گیت مچل رہا تھا۔ اچانک اس نے پوچھا.....

''راجو پانی پیو گے۔''

''نہیں۔''

''مجھے تو پیاس لگی ہے۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر میز پر سے جگ اٹھایا اور جونہی گلاس بھرنے لگی، جگ اس کے ہاتھ سے پھسلا..... ایک دم میں نے کہنیاں سامنے کر کے جگ کو روکنے کی کوشش کی اور اسی وقت میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ شیشے کا جگ سر کے عقبی حصے سے ٹکرایا۔ ''اوغ۔'' کی زوردار آواز سے میں دائیں جانب جھکا اور چارپائی سے نیچے گر گیا۔ میری آنکھیں وا ہوئیں، وہ پرما تھی۔ مجھے جگ رسید کر کے اس نے جگ چارپائی پر پھینکا، چارپائی کو ایک جانب ہٹا کر چٹخنی کھولنے لگی۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھا مگر زور کا چکر آیا اور دوبارہ گر گیا۔ سر پر ہاتھ پھیرا تو خون بہہ رہا تھا۔ مگر پرما کا بھاگ جانا ہمارے سارے منصوبے پر پانی پھیر دیتا۔ لورا براؤن کی عادت تھی کہ وہ چہرہ کمبل میں چھپا کر سوتی تھی۔ اسی وجہ سے ہلکی پھلکی کھٹ پٹ اسے سنائی نہیں دی تھی۔ یا جاگی بھی تھی تو میری پہرے داری پر بھروسا کرتے ہوئے چہرے سے کمبل نہیں ہٹایا تھا۔

پرما چٹخنی کھول کر باہر کو بھاگی۔ میں کوشش کر کے ڈگمگاتا ہوا اٹھا، پہلے لورا کو اٹھانے کا سوچا، مگر اس کے سنبھلنے تک پرما کے دور نکلنے کا خطرہ تھا، اس لیے خود ہی اس کے پیچھے بھاگ پڑا۔ سر میں دھماکے ہو رہے تھے اور تیزی سے حرکت کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔

پرما بیرونی دروازہ کھول کر باہر جا چکی تھی۔ میں ننگے قدم ہی بھاگا تھا، دروازے سے باہر کوئی نوکیلی چیز پاؤں کے تلوے میں چبھی مگر وہ وقت ایسی باتوں پر دھیان کا نہیں تھا۔ قدم روک کر میں نے پاؤں پر ہاتھ پھیرا وہ کیل تھی۔ کیل نکال کر دور پھینکی اور دوبارہ بھاگ پڑا۔

''سٹیریٹ لامپ'' کی روشنی میں وہ ہوا کے جھونکے کی طرح اڑتی نظر آئی۔ اس نے کالی جینز پر سفید کرتا اور اس پر کالے ہی رنگ کا عمدہ کوٹ پہنا ہوا تھا۔

بھاگتے ہوئے اس نے چند بار ''مدد..... مدد.....'' کی آواز بلند کی مگر وہ محلہ ایسا نہیں تھا جہاں رات کے اس وقت جاگنے کا رواج ہوتا۔ غریب، مزدور طبقہ لوگ تھے جو سردی سے بچنے کو بستروں میں چھپے تھے۔

میں بھی زخمی پاؤں کی پروا کیے بغیر بھاگا، سر کی چوٹ کو بھی میں نے پس پشت ڈال دیا تھا۔ حالانکہ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی باکسنگ دستانے پہن کر میرے سر میں مسلسل مکے مار رہا ہو۔ پاؤں میں بھی کیل چبھنے سے سخت جلن اور درد ہو رہا تھا۔

مختصر گلی عبور کر کے وہ سڑک پر نکلی اور شاید اس کی قسمت عروج پر تھی کہ جیسے سڑک پر چڑھی، گاڑی کی تیز روشنی میں نہا گئی۔ وہ سرخ رنگ کی آلٹو تھی۔

''پلیز مدد کرو.....'' با آواز بلند کہتے ہوئے پرما ہاتھ اٹھا کر کار کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔

کار رکی، عقبی دروازہ کھلا اور وہ سرعت سے اندر گھس گئی۔

اس کے کار کے سامنے رکتے ہی میں پارکنگ کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ کیوں کہ کسی نوجوان لڑکی کا لفٹ کو اٹھا ہوا ہاتھ کم ہی مایوس لوٹتا ہے۔ اور لڑکی جب پرما کی طرح بھرپور جوان اور معصوم و من موہنے رخ کی مالک ہو تو ''لفٹ'' نہ ملنے کا گمان صفر فیصد رہ جاتا ہے۔

گلی میں دو گھروں کے درمیان خالی جگہ تھی جہاں تین چار کاریں پارک تھیں۔ وہ کاریں دن بھر بہ طور ٹیکسی چلائی جاتیں۔ کچھ ٹیکسیاں دن بھر پارک رہتیں اور رات کو نکالی جاتیں۔ میں اپنی کار ہمیشہ ایسی جگہ پارک کرتا جہاں ناگہانی

صورت میں جلدی بھاگا جا سکے اور میری یہ احتیاط کام آ گئی تھی۔ کار اسٹارٹ کر کے میں باہر لایا اور سڑک پر چڑھتے ہی رفتار بڑھا دی۔ مقام شکر تھا کہ سڑک خالی پڑی تھی۔ یہ سڑک ساحل سمندر کی طرف جاتی تھی۔ جلد ہی کار کی عقبی بتیاں نظر آئیں، لیکن قریب پہنچنے سے پہلے کار سڑک سے اتر کر عمارتی سلسلے میں گھس گئی تھی۔ اس کے گلی میں داخل ہوتے ہی میں نے رفتار مزید بڑھا دی تھی، کیوں کہ میرے پہنچنے سے پہلے کار کسی مکان میں گھس جاتی تو تلاش کرنا مسئلہ بن جاتا۔

مطلوبہ جگہ پہنچ کر میں نے بھی کار سڑک سے اتاری، سامنے طویل گلی خالی نظر آ رہی تھی۔ گلی کافی کشادہ تھی۔ میں تیز رفتاری سے آگے بڑھتا گیا، مگر موڑ مڑتے ہی رکنا پڑا کہ دور دور تک کار کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ کار ایک جانب لگا کر میں نیچے اترا۔ اندازہ یہی تھا کہ کار گلی موڑ سے پہلے ہی کسی مکان کے اندر گئی تھی۔

زیادہ تر مکانوں کے صحن میں بلب روشن تھے۔ اگر سارے مکانوں کا جائزہ لیتا تو شاید صبح ہو جاتی۔ مجھے سخت پریشانی ہو رہی تھی۔ اگر پرما کو لانے والا پولیس کو فون کر دیتا تو میری وہاں موجودی سخت خطرناک ہو سکتی تھی۔

''اگر اس کی نیت پرما پر بگڑ گئی پھر؟'' ایک روح فرسا خیال میرے دماغ میں جاگا۔ ایسا ہو جاتا تو میں ساری زندگی خود سے نظریں نہ ملا پاتا۔ پرما جیسی لڑکی پر کسی کی نیت کا بگڑنا بعید از قیاس نہ تھا۔ اپنے اول الذکر اندیشے پر کہ وہاں پولیس نہ پہنچ جائے، مجھے واپسی کا خیال آیا تھا۔ مگر پرما کی عزت خطرے میں محسوس کرتے ہی میری ساری حسیں بیدار ہو گئی تھیں۔ میں پیدل ہی پیچھے چل پڑا۔ ہر مکان کے دروازے سے جھانک کر میں صحن میں نظریں دوڑاتا اور دوسرے مکان کی طرف بڑھ جاتا۔ کار گیراج ہی میں پارک ہوتی ہے اور عموماً گیراج کا دروازہ نہیں ہوتا۔

پانچ چھے مکان ہی دیکھ پایا تھا کہ اچانک میرے حساس کانوں میں کسی لڑکی کے چیخنے کی آواز آئی۔ میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ اندازے کے مطابق میری جگہ سے دوسرا مکان تھا۔ میں بھاگ کر اس مکان کے سامنے پہنچا، اس کا گیٹ لوہے کا تھا۔ اچھل کر میں نے دیوار کا اوپری سرا پکڑا اور بازوؤں کے زور سے اوپر اٹھ کر صحن میں جھانکا۔ وہاں سفید رنگ کی ٹویوٹا میرا منہ چڑا رہی تھی۔ نیچے اتر کر میں ساتھ والے مکان کی دیوار سے جھانکا۔ صحن میں کھڑی سرخ آلٹو دیکھتے ہی میرا دل خوشی سے بھر گیا تھا۔ احتیاط بلائے طاق رکھتے ہوئے، میں بازوؤں کے زور پر اوپر اٹھ گیا۔ نیچے اترتے ہی گلاک کی تلاش میں میرا ہاتھ جیب میں رینگا، مگر یاد آیا پستول تو تکیے کے نیچے رہ گیا تھا۔ کار کی ڈگی میں دو سنائپر رائفلیں موجود تھیں، مگر اتنا وقت نہیں تھا کہ واپس جا کر رائفل لا سکتا۔ پرما کی چیخ نے میرے اندیشے بڑھا دیے تھے اور ضائع کرنے کو ایک سیکنڈ بھی نہیں تھا۔ میں تیز رفتاری سے اندرونی عمارت کی طرف بڑھا۔ پاؤں ننگے ہونے کی وجہ سے چاپ دب گئی تھی۔

وہ درمیانے حجم کا مکان تھا۔ اندرونی عمارت کے دروازے پر چھوٹی سی بارہ دری بنی تھی، جس کا مقصد لکڑی کے دروازے کو بارش کے پانی سے محفوظ رکھنا تھا۔ دروازے کے دائیں بائیں دو کھڑکیاں تھیں جن میں جالی لگی تھی۔ دروازے کے قریب ایسی آواز آئی جیسے کسی کا منہ بند کیا جائے اور وہ ناک سے ''اوں..... اوں۔'' کی آواز نکالے۔ اب میرا اندیشہ حقیقت کا روپ دھار چکا تھا۔ یقیناً اس بدبخت سے پرما کا حسن گلوسوز برداشت نہیں ہو سکا تھا۔

البتہ ایک بات حیرانی میں ڈال رہی تھی کہ آخر گھر میں اس کے علاوہ کوئی نہ تھا جو اسے ٹوکنے کی کوشش کرتا۔ بہ ہر حال وہ وقت سوچوں میں کھونے کا نہیں تھا۔ دروازے پر دستک دینے سے وہ کبھی دروازہ نہ کھولتا۔ دروازے کو توڑنا بھی آسان نہ تھا۔ میری جیب میں تیز دھار چاقو موجود تھا، میں نے بغیر کسی تاخیر کے چاقو کھول کر کھڑکی کی جالی پر لگی پٹی اتاری اور دو تین جھٹکے دے کر جالی کھینچ لی۔ عقب میں شیشے کی کھڑکی تھی۔ مکا مار کر اوپر والا شیشہ توڑا اور ہاتھ اندر ڈال کر چٹخنی کھول دی۔ شیشے کے ٹوٹنے کی آواز پر اندرونی دروازہ کھولا جانے لگا، تب تک میں اندر داخل ہو گیا تھا۔ شیشے کی کرچیوں نے

میرے پاؤں کا بوسا لیا، مگر وہ چھوٹے موٹے زخموں پر دھیان دینے کا وقت نہ تھا۔ ڈرائینگ روم میں روشنی ہو رہی تھی۔ دروازے سے برآمد ہونے والا چہرہ ایک نوجوان کا تھا۔ نیچے کالی چست پتلون اور بالائی بدن برہنہ تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں حیرانی کے ساتھ وحشیانہ چمک ابھری۔

وہ دھاڑا۔ ''کون ہو تم۔''

جواب دیے بغیر میں زقند بھر کر قریب ہوا، میرے سر کی ٹکر اس کی چھاتی میں لگی اور وہ اچھل کر اندر جا گرا۔

میرے داخل ہونے تک وہ کھڑا ہو گیا تھا۔ مگر اندر صورت حال دیکھتے ہی مجھے ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے دو ساتھی اور بھی تھے۔ ایک میز پر شراب کی کھلی ہوئی بوتل پڑی تھی۔ اور اس کے دونوں ساتھی زیر جامے میں بیٹھے شراب نوشی کر رہے تھے۔ پرما بیڈ پر بندھی پڑی تھی، یوں کہ اس کا بالائی بدن برہنہ تھا اور نیچے صرف زیر جامہ رہ گیا تھا جو شاید چند سیکنڈ ہی کا مہمان تھا۔ اگر میں بروقت نہ پہنچتا تو وہ بھی اتر گیا ہوتا۔ پرما کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی وہ۔ ''اوں.....اوں.....'' کر کے زور زور سے مچلنے لگی۔ اس کے منہ پر رومال بندھا تھا تبھی بے چاری چیخ نہیں پا رہی تھی۔

میں نے سرسری نظر اندر دوڑائی۔ نیچے گرا ہوا لڑکا کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ انداز سے باقی دونوں کا سرغنہ لگتا تھا، تبھی تو پرما پر پہلا حق اس کا تسلیم کیا گیا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ میرے جارحانہ تیوران کی نظر میں غیر اہم تھے۔

سرغنہ بولا۔ ''بہتر ہوگا جان بچا کر بھاگ جا۔ ورنہ ٹکڑے کر گٹر میں بہا دوں گا۔''

پرما کی حالت دیکھتے ہی میرے دماغ پر سرخ چادر چھا گئی تھی۔ کسی مظلوم لڑکی کو بے حرمت کرنے والے درندوں پر مجھے کبھی ترس نہیں آیا۔ میں جواب دیے بغیر اس کی طرف بڑھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا گریبان تھامنے کی کوشش کی، میں نے اسے ایسا کرنے دیا، جونہی اس کی گرفت مضبوط ہوئی، دائیں ہاتھ سے میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بایاں ہاتھ زور سے کہنی پر مارا، وہ گھومنے پر مجبور ہو گیا تھا، ساتھ ہی میں نے زوردار جھٹکا دیا۔ اس کے ہونٹوں سے بلند چیخ نکلی، جوڑ سے اس کا کندھا نکل گیا تھا۔

وہ چیختے ہوئے گھٹنوں کے بل بیٹھا، سرعت سے ایک ہاتھ اس کی ٹھوڑی پر اور دوسرا سر پر رکھ کر میں نے دونوں ہاتھ مخالف اطراف میں کھینچے۔ اور اس کا چہرہ پشت کی طرف موڑ دیا۔

''کھٹاک۔'' کی زوردار آواز سے اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ فرش پر گر کر وہ اذیت سے ہاتھ پاؤں جھٹکنے لگا۔

اس کے ساتھیوں میں سے ایک نے شراب کی بوتل اٹھا کر آدھی توڑی اور بقیہ بوتل خنجر کی طرح میری طرف تان لی۔ ان کے چہرے پر خوف نمودار ہو گیا تھا، لیکن اتنی جلدی ہار ماننے کو تیار نہ تھے۔

پہلے کو انجام تک پہنچاتے ہی میں ان دونوں کی طرف بڑھا۔ بوتل والا بھی اناڑی انداز میں آگے ہوا۔ جونہی اس کا بوتل والا ہاتھ میری پہنچ میں آیا، میں نے جھپٹ کر ایک ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑی اور دوسرا ہاتھ اس کی کہنی کے قریب رکھ کر مخصوص انداز میں موڑا، اسے معلوم ہی نہیں ہوا تھا کہ بوتل کا ٹوٹا ہوا سرا کیسے اس کے پیٹ کی جانب مڑ چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے زوردار جھٹکے سے میں نے بوتل اس کے پیٹ میں اتار دی۔

زوردار انداز میں چیختے ہوئے وہ دہرا ہوا، اسی وقت میرا گھٹنا زور سے اٹھ کر اس کے ماتھے سے ٹکرایا۔

دوسری چیخ کے ساتھ وہ کولہوں کے بل نیچے گرا اور لمبا لیٹ گیا۔ میں نے اپنی ایڑی پوری قوت سے بوتل پر ماری اور

مکمل بوتل اس کے پیٹ میں چلی گئی۔ اسی دوران تیسرا لڑکا مجھ پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ میں نے اس کے وار کو کہنی پر روکا اور ایک دم قریب ہوتے ہوئے اس کی ٹانگوں کے بیچ گھٹنا اٹھا دیا۔

زوردار۔ ''اوغ'' کے ساتھ وہ رکوع کے بل جھکا، میرا بازو فوراً ہی اس کی گردن سے لپٹ گیا تھا۔ دوسرے بازو سے اپنی کہنی تھامتے ہوئے میں نے زوردار جھٹکا دیا اور۔ ''کڑکڑکڑ.....'' کی بھیانک آواز کے ساتھ اس کا جسم بھی اذیت سے تھرتھرانے لگا تھا۔

گہرا سانس لیتے ہوئے میں اٹھا، پر امیری طرف متوجہ تھی اس کی آنکھوں میں دہشت ثبت ہو چکی تھی۔ وہ ایسی حالت میں نہیں تھی کہ اسے دیکھ سکتا۔ خبیثوں نے اس کی قمیص پھاڑ کر بدن سے علیحدہ کی تھی۔ اس کا کوٹ اٹھا کر میں نے اس کا بالائی بدن ڈھانپا اور چاقو سے اس کی ہاتھ پاؤں کی بندشیں کاٹ دیں۔

آزاد ہوتے ہی اس نے منہ پر بندھا رومال کھولا اور وہ گلوگیر آواز میں۔ ''شکریہ ..... بہت بہت شکریہ..... سوری..... سوری.....'' کہتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

کوٹ نیچے گرا اور میں نے جلدی سے رخ موڑ لیا۔

میرے دونوں پاؤں سے خون بہہ رہا تھا۔ سر سے بہنے والا خون اب رک گیا تھا۔ اس کی پھٹی ہوئی قمیص بیڈ سے نیچے پڑی تھی۔ میں نے قمیص سے پٹیاں پھاڑ کر دونوں پاؤں پر لپیٹ لیں۔ جائزہ لینے پر اندازہ ہوا ان کے سرغنہ کے جوتے مجھے فٹ آ سکتے تھے۔ جوتے پہن کر میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ ''تیار ہو۔''

وہ منمنائی۔ ''جج..... جی جی۔''

میں اس کی طرف مڑا۔ پتلون و جیکٹ پہن کر اس نے کندن بدن ڈھانپ لیا تھا۔ میرے دیکھنے پر وہ سر جھکا کر یوں کھڑی ہو گئی جیسے اسکول کی بچی کو سخت گیر استاد کا سامنا کرنا پڑ جائے۔

تینوں مقتولوں کے لباس کی تلاشی لے کر میں نے ان کے موبائل فون نکالے اور بند کر کے جیب میں ڈال لیے کہ شکلا سے بات چیت کو ہمیں ان موبائل فون کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

''چلو۔'' میں نے اسے دروازے کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔

اس نے جھجکتے ہوئے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ میں اس کے ساتھ لگ کر چل پڑا کہ دوبارہ بھاگ نہ سکے۔ اعتبار کے قابل تو وہ پہلے بھی نہیں تھی اور نہ کوئی قیدی اعتبار کے قابل ہوتا ہے۔ البتہ مجھے اب خاطر خواہ سبق مل گیا تھا۔

یقیناً نشے میں دھت تین نوجوانوں کو جب اتنی خوب صورت لڑکی ایسی بے بسی کی حالت میں ملی تو انھیں اخلاقیات وغیرہ بھول گئے تھے۔ اور پہلی فرصت میں انھوں نے بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے چاہے۔ اب ان کی بدقسمتی کہ حیوانی جذبات میں وہ لڑکی کو پکڑنے والوں سے غافل ہو گئے تھے۔ ان کے گمان میں بھی نہ تھا کہ میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔

''ادھر۔'' گلی میں نکلتے ہی میں نے اسے ہدایت دی۔

وہ خاموشی سے کار کی طرف بڑھ گئی۔ میں بالکل چوکس تھا، لیکن وہ جس حادثے سے گزر چکی تھی یقیناً وقتی طور پر بھاگنے کا نہیں سوچ سکتی تھی۔

بدقسمتی سے جونھی ہم کار کے نزدیک پہنچے، گلی کے موڑ سے چوکیدار نمودار ہوا۔

''پپ..... پلیز مدد کرو، یہ ہمیں زبردستی لے جا رہا ہے۔'' پرما نے مدد مانگنے میں دیر نہیں کی تھی۔

اگر وہ رائفل تان لیتا تو میں مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ جونھی پرما ملتجی ہوئی، میں نے لحظہ ضائع کیے بغیر ایک قدم آگے لیا

،میرے دائیں ہاتھ کا دائروی مکا پوری قوت سے چوکیدار کی ٹھوڑی کی طرف بڑھا۔

''اوغ۔'' زوردار کراہ کے ساتھ وہ منہ کے بل گرا تھا۔

پرما ایک دم مڑ کر بھاگی، مگر میں نے زقند بھر کر اسے چھاپ لیا تھا۔

''پلیز ہمیں چھوڑ دو۔'' میرے بازوؤں میں آتے ہی وہ مچلتے ہوئے دہائیاں دینے لگی۔

''خاموش۔'' میں نے اسے ڈانٹا۔

''اگر ہمیں گرینڈ پا تک لے جاؤ تو وعدہ کرتی ہوں تمھیں منہ مانگا انعام دلواؤں گی۔'' رونے سے کام نہ بنتا دیکھ کر وہ لالچ دینے پر اتر آئی تھی۔

وہ جان بوجھ کر یا انجانے میں کافی زور زور سے بول رہی تھی۔ اگر سوچ سمجھ کر اونچا بول رہی تھی تو اس کی چالاکی میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا تھا۔ یقیناً وہ لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوشش میں تھی۔ کار میں بیٹھ کر وہ راستے میں بھی میرے لیے مسئلہ کھڑا کر سکتی تھی۔ مجبوراً مجھے اس کی زبان خاموش کرنا پڑی۔ گردن پر بازو کا مخصوص دباؤ ڈال کر اسے عارضی طور پر خاموش کر دیا تھا۔ اسے پیچھے بٹھانے کے بجائے، اگلی نشست پر بٹھایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر چل پڑا۔ ہم دو تین کلومیٹر سے زیادہ نہیں آئے تھے۔ اس سڑک پر رات کے وقت ٹریفک نہ ہونے کے برابر ہوتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ مجھے پرما کے حصول میں کامیابی ہوئی تھی۔

کھولی کے سامنے میں نے جونھی کار روکی، لورا متوحش سی باہر نکلی۔ ''کہاں گئے تھے، پرما ملی کہ نہیں۔ تمھیں آوازیں دی تھیں کم از کم مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔'' ایک ہی سانس میں کئی سوالات پوچھتے ہوئے اس نے قریب ہو کر کار کے اندر جھانکا۔ چونکہ کیبن کی بتی بجھی ہوئی تھی اس لیے اسے دور سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ پرما کو دیکھتے ہی اس نے اطمینان بھرا سانس لیا۔

میں نے پہلے والے سوالوں نظر انداز کر دیا تھا وہ مزید سوالوں پر جری ہوئی۔ ''کیسے پکڑا؟.....اور اتنی دیر کیوں لگا دی۔''

''اگر دو منٹ صبر کر لو تو سب کچھ بتا دوں گا۔'' بیزاری سے کہتے ہوئے میں نے پرما کو بازوؤں میں بھر لیا۔

اس نے کہا۔ ''میں کار پارک کرتی ہوں۔''

میں جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اسے بستر پر لٹا کر میں اپنی چارپائی پر بیٹھا اور بوٹ اتار کر پٹیاں کھولنے لگا۔ اطمینان ہوتے ہی زخموں کا درد بڑھ گیا تھا۔ میرے بوٹ اتارنے تک لورا لوٹ آئی تھی۔

''دیکھ لیا ہمدردی کا انجام، پڑی گئی ہے سینے میں ٹھنڈ۔ اور اچھا بننے کا ناٹک کرو۔ سچ کہتے ہیں سپاہیوں میں عقل ہوتی تو فوج میں عہدہ دار نہ بنائے جاتے۔'' بآواز بلند مجھے کوستے ہوئے اس نے پرما کے ایک ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال کر دوسرا سرا چارپائی کے فریم کو لگا دیا۔

میں خاموش رہا کہ لورا حق بہ جانب تھی۔ اسے جکڑ کر وہ طبی بکس اٹھا لائی۔ سنائپر ابتدائی طبی امداد کا سامان جنگلوں، پہاڑوں صحراؤں میں ساتھ پھراتے ہیں، وہاں تو سامان اٹھانے کی کوئی دقت نہ تھی۔

اسپرٹ سے میرے سر کا زخم کا صاف کرتے ہوئے وہ ہنسی۔ ''نشانہ تو کافی اچھا ہے راج کماری کا اور ہاتھوں میں جان بھی ہے، بس ریجا ہی کچھ زیادہ ڈھیٹ تھا کہ بے ہوش نہ ہوا۔''

''معذرت یار اغلطی ہو گئی۔'' میں نے ندامت ظاہر کرنے میں حرج نہیں سمجھا تھا۔

ایک نظر پرما پر ڈالتے ہوئے وہ شرارتی لہجے میں بولی۔ ''اتنی خوب صورت تو نہیں ہے کہ تم ہوش حواس ہی گم کر

بیٹھو۔''

میں شاکی ہوا۔''واقعی، ایسا ہی سمجھتی ہو۔''

لورا کا قہقہہ بلند ہوا۔''اندازہ ہی لگا سکتی ہوں، اصل وجہ تمھیں معلوم ہوگی کہ کیوں اتنا خطرہ مول لیا۔''

میں چڑ کر بولا۔''حالاں کہ وضاحت کر چکا ہوں۔''

اس نے قینچی سے زخم کے منہ کے بال کاٹے اور پائیوڈین سے صفائی کرنے لگی۔''تم نے بتایا نہیں کیا ہوا تھا۔''

میں نے مختصراً واقعہ دہرا دیا۔

''میں جاگ گئی تھی۔ جب کھولی سے نکلی تو تم کار میں بیٹھ چکے تھے۔ میرے آوازیں دینے پر بھی نہ رکے۔ مجبوراً لوٹنا پڑا۔ اور سچ کہوں تو سخت پریشان اور دل گرفتہ تھی۔ تم پر بھی اتنا غصہ آیا ہوا تھا کہ اگر پرما کے بغیر لوٹتے تو پٹائی سے بھی باز نہ آتی۔''

''میں خود بہت پشیمان تھا۔ کیوں کہ پرما اگر شکلا کے ہاتھ چڑھ جاتی پھر اس کا حصول ممکن نہ رہتا۔''

لورا نے منہ بنایا۔''پرما کا ٹھکانہ معلوم ہونے کے بعد تمھیں تھوڑی دیر کرنا چاہیے تھی، کم از کم اسے بھاگنے کا پھل تو وصول ہو جاتا۔ تم تو ایسے باولے ہوئے تھے جیسے تمھاری محبوبہ ہو۔ سر وہ زخمی کر گئی تھی اور پاؤں تم نے خود کرا لیے۔''

میں بھناتے ہوئے بولا۔''احمقوں کو کیا سمجھانا۔''

لورا کی کھنکتی ہنسی ابھری۔''سچ کہہ رہی ہوں، تم سے تو کچھ ہو نہیں سکتا، ان بے چاروں کو مرنے سے پہلے اپنی حسرت ہی پوری کرنے دیتے۔''

میں طنزیہ لہجے میں بولا۔''تمھارے لیے بھی کافی لوگوں کے دل میں حسرتیں پلتی رہی ہیں، کبھی انھیں نوازنے کا سوچا؟.....الٹا شکلا بے چارے کی چھوٹی سی جسارت پر اس کی جان کے درپے ہوئی ہو۔''

وہ ڈھٹائی سے بولی۔''انھیں مارنے پر تو معترض نہیں ہوں۔ میرا نقطہ نظر انھیں وجہ قتل مہیا کرنے کا تھا۔''

میں نے کہا۔''سرائیکی کہاوت ہے۔'ماری تے الہاری، بک برابر ہے۔''

اسے اردو کی سمجھ نہیں آتی تھی سرائیکی خاک پلے پڑتی۔ سوالیہ انداز میں بولی۔''کیا؟''

''مطلب، کسی کو تھپڑ مارنے کو ہاتھ بلند کرنا اور تھپڑ مارنا ایک جیسا ہی ہے۔ اس لیے ایسے درندوں کا قتل ان کی مذموم خواہش پوری ہونے کے بعد جائز ہے تو ایسا کرنے کی کوشش کے بعد بھی ناجائز نہیں ہونا چاہیے۔''

میرے سر پر پٹی باندھ کر وہ پاؤں کے تلوؤں کو اسپرٹ سے صاف کرنے لگی۔''بہ ہر حال اب میرے اور پرما کے بیچ دیوار نہ بننا۔ ایسی لڑکی کو سدھانے کو مجھے سختی کرنا پڑے گی۔''

''پاگل نہ بنو، بے گناہ اسیر بھاگنے کی کوشش سے مجرم نہیں بنتا۔''

''ریہا دماغ خراب نہ کرو۔'' ایک پاؤں پر پٹی لپیٹ کر وہ دوسرے پاؤں کی طرف متوجہ ہوئی۔

میں ہنسا۔''خراب چیز کو ٹھیک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور میں ہمت نہیں ہاروں گا۔''

وہ درشتی سے بولی۔''بے ہودہ سپاہی۔ بہتر ہوگا مجھے چند دن اپنے نانا کی لاڈلی کے ساتھ اکیلا چھوڑ دو۔''

میں نے شرارتی قہقہہ بلند کیا۔''تمھارے بنا چند دن کیسے رہ پاؤں گا۔''

''شروع ہو گئی ریہا کی بکواس۔'' طبی بکس سے درد کش اور سکون آور گولیاں نکال کر اس نے میری جانب بڑھا دیں۔

پانی سے گولیاں لے کر میں آرام کو لیٹ گیا۔ پرما کو سنبھالنے کو لورا موجود تھی۔

اگلے دو دن سکون سے گزرے۔ بس پرما کی وجہ سے کبھی کبھار میری اور لورا کی لڑائی ہو جاتی۔ وہ اسے ہلکی پھلکی پھینٹی لگانے پر تلی رہتی اور میں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ سر پر بندھی پٹی دیکھ کر پرما پہلے دن مجھ سے بات کرنے پر جھجکتی رہی، مگر جب میں نے مطعون نہ کیا تو نارمل ہو گئی۔

اس دوران ٹی وی پر میرے ہاتھوں مرنے والے تینوں کی پراسرار موت کی خبر بھی چلی۔ پھٹی ہوئی زنانہ قمیص، کٹی ہوئی رسیاں، کھڑکی کا ٹوٹا شیشہ اور بکھرا ہوا خون۔ ان کے جرم سے پردہ اٹھا رہا تھا۔ ان کے قتل کے پس پردہ جو کہانی بیان کی جا رہی تھی وہ حقیقت سے اتنی بھی دور نہیں تھی۔ بس یہ فرق تھا کہ وجہ پرما کے بجائے وہ لورا کو سمجھ رہے تھے۔ خون کے نمونے سے مجھے پہچان لیا گیا تھا۔ ان کے تینوں لڑکوں نے میری ساتھی کو اغواء کیا اور باندھ کر بے حرمت کرنا چاہا جبکہ میں نے اچانک وہاں پہنچ کر انھیں قتل کر دیا۔ لیکن چوکیدار کے بیان کے مطابق میرے ساتھ موجود لڑکی نے اس سے مدد مانگی تھی، جو ظاہر کرتا تھا کہ لڑکی میری ساتھی نہیں تھی۔ اگر شکلا نے پرما کے اغواء کو میڈیا پر اچھالا ہوتا تو انھیں اندازہ کرنے میں دشواری نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ بھی واقعے میں چند کڑیاں غائب تھیں جن کے بارے طرح طرح کے اندازے لگائے جا رہے تھے۔ میں خبریں عموماً پرما کے سونے کے بعد دیکھا کرتا۔ کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا پاکستان کا نام سن کر اس کا دماغ اپنے باپ کی طرف متوجہ ہو اور وہ مجھے ان کا آدمی سمجھے۔ میری حتی الوسع کوشش یہی تھی کہ اسے اپنے بارے بے خبر رکھوں۔

اب پرما کے ہونٹوں پر بھی لورا ٹیپ چپکائے رکھتی۔ میرے زخم اتنے کاری نہیں تھے کہ ٹھیک ہونے میں زیادہ وقت لیتے۔

تیسرے دن ہمیں پھر شکلا سے بات کرنے کی ضرورت تھی۔ میں جانتا تھا پرما کے موبائل فون نمبر پر ایجنسی کی گہری نظر ہوتی تھی۔ جونہی موبائل آن ہوتا ہماری جگہ کا پتا چل جاتا۔ مگر اس کا حل میں نے سوچا ہوا تھا۔

پرما کو سکون آور دوائی کھلا کر اس کے ہاتھ پاؤں جھگڑی میں جکڑے اور ہم باہر نکل آئے۔ اس دن اپنی کار کے بجائے ہم رکشے میں بیٹھ گئے۔ گھنٹے بھر کے سفر کے بعد میں نے لورا کو ایک بھیڑ والی جگہ پر اتارا اور خود آگے بڑھ گیا۔ پندرہ منٹ بعد میں دوسرے بازار میں اترا اور تھوڑی تلاش کے بعد ایک عوامی بیت الخلاء میں گھس گیا۔ پرما کا موبائل فون آن کر کے میں نے بیت الخلاء ہی میں چھپایا اور باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر بعد میں دوسرا رکشا پکڑ کر واپس جا رہا تھا۔ لورا ایک ہوٹل میں کونے والی میز پر بیٹھی میری منتظر تھی۔ ہوٹل میں اکا دکا ہی گاہک نظر آ رہے تھے۔ میرے پہنچتے ہی لورا نے میرے لائے ہوئے تینوں موبائل میں سے ایک آن کیا اور شکلا کا نمبر ملانے لگی۔ دوسری گھنٹی پر کال وصول کر لی گئی تھی۔ بغیر کسی تمہید کے وہ مطلب کی بات پر آئی۔

''کیا سوچا ہے۔'' اس کا جواب سنتے ہی وہ دبے لہجے میں غرائی۔

''شاید تمھیں نواسی عزیز نہیں ہے۔''

''رقم کم نہیں ہو سکتی مسٹر۔ اگر تم نے زیادہ آہیں بھریں کی تو تمھاری نواسی کی ایسی وڈیوز مارکیٹ میں لے آؤں گی کہ راتوں رات شہرت کی بلندی پر پہنچ جائے گی۔ اتنی شہرت شاید کسی پورن اداکارہ کو بھی نہ ملی ہو گی جو تمھاری نواسی چند دنوں میں کما لے گی۔''

لمحہ بھر کے توقف کے بعد بولی۔ ''بہانے نہیں چاہئیں۔'' اور اس کی بات سننے لگی۔

''پانچ ملین پاؤنڈ میرے اکاؤنٹ میں جمع کراؤ، باقی ایس آر ون تمھیں اسی قیمت پر ملے گی جس پر ہمارا معاملہ طے ہوا تھا۔''

''گھٹیا انسان دو ہزار پاؤنڈ تم دھونس جما کر لے رہے تھے۔ رائفل کی اصل قیمت پانچ ہزار پاؤنڈ ہے۔''

چند لمحے اسے سننے کے بعد وہ حتمی لہجے میں بولی۔ ''پانچ ملین میرے اکاؤنٹ میں جمع کراؤ اور فی رائفل چار ہزار پاؤنڈ ڈیوڈ کو بھجوا دو۔ رائفلیں وہ بھجوا دے گا۔ اگر وہیں سے خود وصولنا چاہو تو بھی کوئی اعتراض نہیں۔ اور یاد رکھنا اب تمھارے پاس مہلت نہیں رہی۔''

ذرا سے توقف کے بعد بولی۔ ''فی الحال تو وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اگر تعاون کرو گے تو اسے خراش بھی نہیں آئے گی۔ دو دن پہلے اسے میں نے جس مکان میں رکھا تھا وہاں چند اوباش لڑکے پہنچ گئے۔ انھوں نے پرما کو چھونے کی کوشش کی، بلکہ اس کی قمیص پھاڑی اور نتیجے میں جان سے گئے۔ آئندہ بھی اس کی طرف اٹھنے والا ہاتھ توڑ دیا جائے گا، اگر تم تعاون کرو گے تو.....ورنہ میں خود گروہ در گروہ لڑکے اس کی تنہائی میں بھیجوں گی اور.....'' ہلکا سا وقفہ لے کر اس نے فقرہ مکمل کیا۔ ''خیر اس کا تمھیں خوب تجربہ ہے کہ بندھی ہوئی بے بس لڑکی کے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا ہے۔''

لمحہ بھر اس کی بات سن کر وہ نفرت سے بولی۔ ''تمھاری گھٹیا آہ وزاری سننے کا موڈ نہیں ہے۔ تم جیسے حرامی صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ہماری [illegible] کرکری ختم کرنے میں تمھاری بھلائی ہے۔ اور اب ڈیوڈ کے ذریعہ گفتگو ہو گی۔'' شکلا کا جواب سنے بغیر اس نے رابطہ منقطع کیا۔ دو سو کا نوٹ نکال کر میز پر رکھا، موبائل فون بھی وہیں چھوڑا اور ہم دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ وہاں مزید ٹھہرنا خطرناک ہو سکتا تھا۔

واپسی پر پرما سوتی ہوئی ملی تھی۔

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے ممبئی چھوڑنے کا وقت آ گیا ہے''

''کیوں؟'' لورا چونکی۔

''اسے شکلا کے حوالے تو نہیں کر سکتا اور جہاں تک میرا خیال ہے رقم کی ادائی کے بعد اگر اسے پرمانہ ملی تو جنون میں آ کر کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

وہ ہنسی۔ ''اب کون سا جنون میں نہیں ہے۔ اور یہ ٹھکانہ کافی مفید رہا ہے، میرا نہیں خیال یہاں سے جانا عقل مندی ہو گی۔''

''ہم نے شکلا کا شکار کرنے کو مارا مارا پھرنا ہے۔ اور اس کھولی میں پرما کو مستقل نہیں رکھا جا سکتا۔ مسلسل نشہ آور ادویات کے زیر اثر رکھنا بھی نقصان دہ ہو گا۔ اگلے مرحلے سے پہلے ہمیں پرما کا مناسب بندوبست کرنا ہو گا۔''

وہ شرارتی انداز میں بولی۔ ''گولی مار کر جان چھڑاؤ۔''

''مشورہ مانگا ہے، بکواس کرنے کا نہیں کہا۔''

''پتا نہیں مردوں پر لڑکیوں کا خیال رکھنے کا بھوت کیوں سوار رہتا ہے۔'' وہ مجھے چھیڑنے سے باز نہیں آ رہی تھی۔

اچانک پرما بڑبڑائی، پھر کروٹ بدلنے کی کوشش کی مگر ہتھکڑی کی وجہ سے ناکام ہوئی اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ نیند کے خمار سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''پانی۔''

میں نے سرعت سے پانی کا گلاس بھرا اور اسے پکڑا دیا۔

''شکریہ۔'' کہہ کر اس نے گلاس منہ سے لگا لیا۔

اس کے گلاس واپس کرنے پر میں نے پوچھا۔ ''اور۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''آدھا گلاس دے دیں۔''

پانی پلا کر میں نے اس کی ہتھکڑی کھولی تا کہ تازہ دم ہو جائے۔ وہ غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔

اس کی واپسی تک میں نے کھانا چن دیا تھا۔ عموماً ہم اکٹھے ہی کھانا کھاتے تھے۔ اب پرما بھی ٹھیک ٹھاک کھانے لگی تھی۔ بلکہ ناشتے وغیرہ کو اس نے چند فرمائشی چیزوں کا بھی تقاضا کیا تھا جو لورا کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود میں خرید لایا تھا۔ شہد، مکھن، بریڈ، پنیر، جیم، امپورٹڈ بسکٹ و پیسٹریاں، مخصوص برانڈ کے جوس اور اسی طرح کے کچھ اور لوازم اتنے مہنگے بھی نہیں تھے کہ انصاری صاحب کی بیٹی کی خواہش کو ٹھکرا دیتا۔ وہ اپنی اہمیت سے ناواقف تھی ورنہ بہت زیادہ حکم چلاتی۔

کھانے کے بعد لورا نے اسے جکڑ دیا تھا۔ اب وہ ذرا سا بھی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھی۔ اور اس معاملے میں میری نرمی کو کسی خاطر نہیں لاتی تھی۔ چونکہ پرما کے بھاگنے کی قباحتیں میرے لیے بھی انجان و ناقابل فہم نہ تھیں تبھی اس معاملے میں لورا سے اختلاف نہیں کر سکتا تھا۔

کھانے کے بعد وہ چائے یا کافی ضرور پیتی تھی۔ کھانا گرم کرنے اور چائے وغیرہ بنانے کو میں چھوٹا سا گیس سلنڈر خرید لایا تھا۔ کافی بنا کر میں نے ایک مگ لورا اور دوسرا اس کی جانب بڑھا دیا۔

کافی کی چسکی لیتے ہوئے وہ مستفسر ہوئی۔ ''آپ کہاں گئے تھے؟''

میں نے ذومعنی انداز میں پوچھا۔ ''کس نے کہا ہم کہیں گئے تھے۔''

اس نے بہترین تجزیہ کیا۔ ''ناشتے کے بعد ہمارا اتنا گہری نیند سونا اور بہ مشکل کھانے کے وقت آنکھ کھلنا۔ ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے ہمیں چائے میں سکون آور دوائی پلائی تھی۔ اور ایسا تبھی کیا جائے گا جب ہمیں اکیلا چھوڑ کر کہیں جانا ہو۔''

لورا نے آنکھیں نکالیں۔ ''ریکا کیا پوچھ رہی ہے، مجھے بتاؤ تا کہ اس کی طبیعت صاف کروں۔''

لورا کو گھورتے ہوئے میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تمہارا آرام کرنا زیادہ مناسب رہے گا۔''

پرما متعجب ہوئی۔ ''یہ ہر وقت مرچیں کیوں چبائے رکھتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کے نانا نے جو سلوک اس کے ساتھ کیا اس کے بعد یہ پوچھنا عجیب لگتا ہے۔'' ہمیں اردو میں مصروف گفتگو دیکھ کر لورا لیٹ گئی تھی۔

وہ استہزائی انداز میں بولی۔ ''ایسا بھی کیا کر دیا کہ اس کا غصہ اترنے میں نہیں آ رہا۔''

حالاں کہ لورا سے اچھی طرح شکلا کی درندگی سے آگاہ کر چکی تھی۔ اس کا لہجہ و انداز مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ اسے گھورتے ہوئے میں تیکھے لہجے میں بولا۔ ''اس نے وہی کیا ہے جو اس دن تین لڑکے آپ کے ساتھ کرنا چاہتے تھے۔ آپ کی قسمت اچھی تھی کہ میں بروقت پہنچ گیا ورنہ آپ کو عملی ثبوت بھی مل چکا ہوتا۔''

اس نے غیر یقینی ظاہر کی۔ ''آپ بس گرینڈ پاپا پر الزام تراشی کر رہے ہیں۔''

میں غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''تصور کرو اگر پامال ہونے کے بعد کچھ ایسے ہی تبصرے آپ کو ان لڑکوں کی قریبی رشتہ داروں سے سننا پڑ جاتے۔''

''لاوارث نہیں ہیں ہم۔ اور ایسوں کی گرینڈ پا وہ درگت بناتے کہ شمشان گھاٹ میں بھی پناہ نہ ملتی۔''

میں طنزیہ انداز میں بولا۔ ''زیادہ لاوارث آپ کو کیپٹن لورا برادن لگ رہی ہے۔''

اس نے ٹون بدلی۔ ''تو گرینڈ پا سے بدلہ لے لو، ہمارا کیا قصور ہے۔''

میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''ہماری فوج میں محاورہ مشہور ہے کہ سوکھی کے ساتھ گیلی کو بھی جلنا پڑتا ہے۔ مطلب جب ایک غلطی کرتا ہے تو اس کے قریب رہنے والے بھی سزا کے حق دار ٹھہرتے ہیں۔''

وہ متعجب ہوئی۔ ''آپ فوجی ہیں۔''

میرا سر پیٹنے کو جی چاہا، کیوں کہ خود کو چھپائے رکھنے کو میں شکلا تک سے بات نہیں کر رہا تھا۔ نہ پرما کو بتانے کا ارادہ تھا کہ میں انصاری صاحب کا بندہ ہوں، کیوں کہ میری بات پر وہ کبھی یقین نہ کرتی۔ اسے پاکستان لے جانا کافی مشکل ثابت ہونے والا تھا۔

میں نے بات سنبھالی۔ ''فوجی ہونا بہت برا ہے کیا؟''

نفی میں سر ہلاتے ہوئے دل گرفتگی سے بولی۔ ''بھارت ماتا کے سپوت سے یہ توقع نہیں تھی کہ مجرموں کا ساتھ دے گا۔''

''اپنے نانا کے کرتوت دیکھو، ایک لڑکی کی عزت خراب کی بلکہ جو رائفلیں بیچنے آئی تھی وہ بھی اس سے ہتھیانا چاہیں کیا ایسے بدکار کے خلاف مظلوم لڑکی کا ساتھ دینا جرم ہے۔''

وہ مدلل انداز میں بولی۔ ''آپ قانونی جنگ لڑ کر اسے حق دلا سکتے تھے۔ ایک مظلوم لڑکی کی خاطر دوسری مظلوم پر زیادتی کرنا کہاں کا انصاف ہے۔''

بلاشبہ اس کی دلیل برحق تھی لیکن وہ پوری حقیقت سے آگاہ نہیں تھی۔ اس کے اغواء کا اصل مقصد شکلا سے انتقام لینا نہیں اسے باپ تک پہنچانا تھا۔ البتہ اسے فی الحال یہ بتانا ممکن نہ تھا۔ اور خاموش ہونا ہار ماننے کی علامت تھا۔ میں بات بناتے ہوئے بولا۔

''قانونی جنگ کا لطیفہ آپ نے کافی اچھا سنایا ہے۔ باقی آپ کو قید کرنے کے علاوہ یہاں کیا زیادتی کی ہے۔''

''قید ہونا تھوڑی زیادتی ہے۔'' وہ گلوگیر ہوئی۔ ''کیا آپ نہیں جانتے ہمارے ہاں لڑکی کا اغواء ہونا اس کے کردار پر کتنے سوالیہ نشان اٹھاتا ہے۔ اور پھر ہمارا تعلق جس اونچے طبقے سے ہے کیا ایسی جگہ پر رہنا ہمارے لیے اذیت سے کم ہوگا۔''

اس کے سوالوں کا جواب میرے پاس نہ تھا، لیکن خاموش رہنا مناسب نہ لگا۔ ''ہم سے جتنا ہو سکتا ہے آپ کو آرام پہنچا رہے ہیں۔ باقی آپ کے طبقے میں ایسی باتوں کو اہمیت نہیں دی جاتی۔''

وہ بیزاری سے بولی۔ ''کافی کا ایک اور مگ مل سکتا ہے۔''

اور میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ گیا۔

—●—

رات کے کھانے کے بعد لورا نے باہر جا کر ڈیوڈ سے بات کی، اسے ساری صورت حال سے آگاہ کر کے شکلا کا نمبر دیا اور اس سے بات چیت کرنے کا کہا۔ دو تین دن کے اندر سارے معاملات طے پا گئے تھے۔

میں کھولی کے صحن میں ایک پرانی سی کرسی پر بیٹھا تھا جب لورا رقم ملنے کی خوش خبری لیے تمتماتے چہرے کے ساتھ اندر پہنچی۔

''تھوڑی سی جگہ دو۔'' مجھے دھکیل کر وہ ساتھ ہی جڑ کر بیٹھنے لگی۔

''دوسری کرسی لاتا ہوں۔'' میں کمرے میں گھس گیا، ایسی بے باکی و بے تکلفی مجھے گوارا نہ تھی۔ وہ لڑکا تھی نہ میں نامرد کہ یوں جڑ کر بیٹھنے میں قباحت نہ ہوتی۔ اس کی معاشرت اسے یہ اجازت دے سکتی تھی، میرا مذہب ایسی بے ہودگی کی اجازت دینے پر تیار نہ تھا۔

''لڑکی تم ہو یا میں۔'' جونہی کرسی لا کر سامنے بیٹھا اس نے ناک بھوں چڑھائی۔ ''تمھاری ایسی حرکتیں دماغ خراب کر

دیتی ہیں۔"

"میرے افعال کو دردِ سر بنانے کے بجائے مطلب کی بات پر آؤ۔ اور بتاؤ اتنی خوش کیوں ہو۔"

ایک دم اس کا موڈ ٹھیک ہوا، کرسی آگے کھسکا کر اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مسرت بھرے لہجے میں بولی۔ "شکلا نے ادائی کر دی ہے۔"

میں نے خوشی ظاہر کی۔ "مبارک ہو۔"

وہ تفصیل بتانے لگی جس کا لب لباب یہ تھا کہ:

لورا کے اکاؤنٹ میں اس نے صرف ایک ملین پاؤنڈ بھیجے تھے۔ لورا کے لیے وہ رقم بھی غنیمت تھی۔ ڈیوڈ کو فی رائفل ساڑھے تین ہزار پاؤنڈ کی ادائی ہوئی تھی۔ اور ایک رائفل پر ڈیڑھ دو ہزار پاؤنڈ کا منافع کافی تھا۔ یوں بھی رائفلیں ان کے لیے نرا سر درد ہی تھیں۔

جونہی ادائی ہوئی، لورا نے ڈیوڈ کو غائب ہو جانے کا کہا۔ چھپنے کا مقام انھوں نے پہلے سے چنا ہوا تھا۔ اسی دن ڈیوڈ برطانیہ سے رفو چکر ہو گیا تھا۔ لورا البتہ شکلا کو انجام تک پہنچانے کی متمنی تھی۔

تفصیل بتا کر اس نے خلوص سے پوچھا۔ "بتاؤ کتنی رقم چاہیے۔"

"کس لیے؟" میں نے حیرانی ظاہر کی۔

"بلاشبہ تمھارا ساتھ نہ ہوتا تو کامیاب نہ ہو پاتی۔ مجھے ملنے والی رقم پر تمھارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا میرا۔ اور سچ کہوں تو سوئٹزرلینڈ والے اکاؤنٹ میں رقم تمھارے لیے رکھوائی ہے۔"

"ہم دونوں کا مقصد ایک تھا اس لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ تمھیں رقم چاہیے تھی اور مجھے پرما۔ دونوں نے جو چاہا پا لیا۔ اب دونوں کو شکلا کی موت درکار ہے اس لیے اگلا لائحہ عمل سوچو۔"

"نصف ملین پاؤنڈ تمھیں خوشی سے دے رہی ہوں۔"

"جائز سمجھتا تو یقیناً خوشی سے وصول کرتا۔"

وہ معترض ہوئی۔ "شکلا نے بھی تو ظلم و زیادتی سے یہ رقم اکٹھی کی تھی تو ہمارے لیے کیوں جائز نہیں۔ ڈکیت سے چھیننا ڈاکا نہیں کہلاتا۔"

"تمھارا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آئے گا اور میری مذہبی تعلیمات تمھارے سر پر سے گزر جائیں گی تو کیوں نہ اس موضوع کو ترک کر دیں۔ شکریہ کہ تم نے خلوص دل سے میرا حصہ دینا چاہا۔ اور میں اسی خوشی اپنے حق سے دستبردار ہوتا ہوں۔"

"تم کبھی کبھی مجھے بہت زیادہ الجھا دیتے ہو، بھلا اتنی رقم کو کون ٹھکرا سکتا ہے۔"

"تمھیں حرام حلال کا فلسفہ نہیں سمجھا سکتا۔"

وہ بے باکی سے بولی۔ "ریجا میں بہت خوش ہوں اور تم فائدہ اٹھا سکتے ہو۔"

اس کے ہاتھ کی پشت کو تھپتھپا کر میں خلوص سے بولا۔ "تمھیں خوش دیکھ کر جو خوشی ہو رہی ہے وہ کافی ہے۔"

اس نے شرارتی قہقہہ بلند کیا۔ "ایسی باتیں کر کے مجھے پھنسا نہیں سکتے۔ بہتر ہو گا اپنی دو بیویوں پر قانع رہو۔ بلکہ یہ مشورہ بھی دوں گی کہ پرما کے آگے پیچھے پھرنا بند کر دو۔"

"سچ کہوں تو میری دونوں بیویاں بہت پیاری ہیں، میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔ اور مجھ سے اتنی محبت کرتی ہیں جس کا میں حق دار نہیں ہوں۔"

اس نے اشتیاق سے پوچھا۔ ''ایک ساتھ دو بیویاں کیسے مل گئیں۔ تم دھوکے باز نہیں لگتے پھر اپنی پہلی بیوی کو دھوکا دے کر دوسری شادی کیسے کی۔ اگر دھوکا نہیں دیا تو پہلی بیوی راضی کیسے ہوئی جبکہ وہ تم سے محبت کی دعوے دار بھی تھی۔''

میں نے جان چھڑانا چاہی۔ ''لمبی کہانی ہے۔''

وہ بے پروائی سے بولی۔ ''پھر بھی سننا چاہوں گی۔''

گہرا سانس لے کر میں اسے روما سے ملنے، بچھڑنے پھر پلوشہ سے ٹکرانے ایک ساتھ قبیل خان کا مقابلہ، پلوشہ سے شادی، اپنی گرفتاری، پلوشے کی فرضی موت، روما کا دوبارہ ملنا اور پلوشہ کی واپسی تک کی کہانی جزوی تفصیل سے سنادی۔ وہ مسحور بیٹھی سنتی رہی۔ میرے چپ ہوتے ہی پوچھا۔

''اب آپس میں لڑتی نہیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''روما بہت اچھی، صابر اور پرخلوص لڑکی ہے۔ پلوشے کو چھوٹی بہن سمجھتی ہے۔ اگر روما بھی پلوشے کی طرح ہوتی تو یقیناً میں مشکل میں پڑ جاتا۔ مگر وہ پلوشے کی کسی بات کا برا ہی نہیں مناتی اس وجہ سے پلوشے کو بھی اس کا وجود برداشت کرنا آسان ہو گیا ہے۔''

وہ شرارتی لہجے میں بولی۔ ''مگر یاد رکھنا، پرما بالکل بھی ایسی نہیں ہے۔ اور یہاں اس لیے بچ گئے تھے کہ اسے بھاگنے کی جلدی تھی، تبھی دوبارہ جگ نہ اٹھایا۔''

میں ترکی بہ ترکی بولا۔ ''چھوڑو پرما کو اپنی بات کرو۔''

''یہ انگور کھٹے ہیں۔'' زبان نکال کر مجھے چڑاتے ہوئے وہ کمرے میں گھس گئی تھی۔

—●—

اگلے دن دوپہر کا کھانا کھا کر میں لورا کو پرما کے پاس چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ کار میں نے وہیں چھوڑ دی تھی۔ رکشا لے کر میں موٹر سائیکل بارگین پر پہنچا اور ایک پرانی موٹر سائیکل خرید لی کہ بعض اوقات کار سے موٹر سائیکل زیادہ مفید رہتی ہے۔

دھرمو دادا کی تلاش کا آغاز میں نے وشواس سنگھ کی حویلی سے کیا تھا۔ دھرمو دادا کے سبھی کارندوں میں میری سب سے زیادہ گپ شپ و بے تکلفی اسی کے ساتھ تھی۔ اور وہ دھرمو دادا کا خاص آدمی ہونے کے ساتھ اس کا قریبی دوست بھی تھا۔ وہاں پہنچنے تک اندھیرا ہو گیا تھا، اس کے باوجود حویلی میں گھسنے کو میں نے عقبی دیوار کا استعمال کیا تھا۔ اس کی خواب گاہ تک میں اچانک ہی پہنچا تھا۔

دستک کے جواب میں دروازہ کھولتے ہی وہ حیرت سے اچھل پڑا تھا۔

''کک.....کون ہو تم؟''

''نہیں پہچانا۔'' اس کا ہاتھ پکڑ کر میں نے باہر کھینچا کہ خواب گاہ میں اس کی دھرم پتنی (بیوی) موجود تھی۔ گو سکھوں اور ہندوؤں میں پردے وغیرہ کا کوئی تصور موجود نہیں، مگر مجھے مناسب نہیں لگا تھا۔

بازو پھیلا کر اس نے مجھے گرفت میں لیا۔ ''ابے سیدھے راستے سے کیوں نہیں آیا۔''

''نگرانی کا ڈر تھا، اس لیے عقبی دیوار سے آنا پڑا۔''

وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ ''اور کوئی بلونگڑا تمہیں ٹھوک دیتا پھر دادا کو کیا جواب دیتا۔'' اپنے کارندوں اور دوسرے غنڈوں کو وہ مذاق میں بلونگڑے کہا کرتا تھا۔

میں مزاحیہ انداز میں بولا۔ ''خیر اتنا آسان شکار بھی نہیں ہوں کہ کسی سکھ کے ہاتھوں ضائع ہو جاؤں۔''

''لگتا ہے تم نے کھانا نہیں کھایا تبھی الٹی سیدھی ہانک رہے ہو۔'' خوش دلی سے ہنستے ہوئے اس نے پتنی کو آواز دی۔ ''پریتو! میرا بیلی آیا ہے اور یقین مانو پھر سے بھوکا ہو گیا ہوں۔''

مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی اس لیے تکلفاً بھی انکار نہیں کیا تھا۔

پریت کور ایک خوش شکل سکھ لڑکی تھی۔ ان کی شادی کو دو تین سال ہی ہوئے تھے۔ وہ عمر میں وشواس سنگھ سے کافی چھوٹی تھی۔ دوران تعلیم ایک امیر زادے نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر اسے اغواء کیا کہ پریت کور نے اس کے چھیڑنے پر یونیورسٹی کی کینٹین میں اسے تھپڑ جڑ دیا تھا۔ ان کا ارادہ پریت کور کے ساتھ زبردستی رنگ رلیاں منا کر رات رنگین بنانے کا تھا۔ ان کی بدقسمتی کہ وشواس سنگھ اپنے کسی دشمن کے تعاقب میں ساحل سمندر کے ویران کالج کی طرف جا نکلا جہاں وہ پریت کور کو بے لباس کر چکے تھے۔ وشواس سنگھ ایک روایتی ڈاکو تھا۔ جو لوٹ مار کو جائز لیکن عورت کے ساتھ زبردستی کو گناہ عظیم سمجھتا تھا۔ امیر زادے اور اس کے ساتھیوں کی رات رنگین ہونے کے بجائے بدن رنگین ہو گئے تھے۔ وشواس سنگھ

نے انھیں زخمی کرنے پر اکتفا کرنے کے بجائے انجام تک پہنچانا ضروری سمجھا تھا۔ پریت کور کو اس نے اسی وقت گھر پہنچا دیا تھا۔ گھر والے اس کی گمشدگی پر سخت پریشان تھے۔ اور بدنامی کے خوف سے ایف آئی آر کٹوانے بھی نہیں گئے تھے۔ پریت کو زندہ سلامت پا کر وہ دشواس سنگھ کے حد درجہ ممنون و شکر گزار ہوئے۔ دشواس سنگھ نے انھیں، پریت کور کے غائب ہونے کی خبر اپنے تک محدود رکھنے کی ہدایت کی اور وہاں سے نکل آیا۔ البتہ پریت کور کے والد کے اصرار پر اپنا موبائل فون نمبر انھیں دے دیا تھا۔ بہ ظاہر کہانی یہیں ختم ہو گئی تھی۔ لیکن یونیورسٹی کا طالبہ کا دل دشواس سنگھ کی دلیری اور عورت کا احترام کرنے والی صلاحیت پر مر مٹا تھا۔ دشواس سنگھ کا حال احوال پوچھنے کے بہانے اس کی کالیں آنا شروع ہو گئیں۔ دشواس سنگھ بھی بچہ نہ تھا۔ لیکن ایک شریف لڑکی کو دھوکا بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے بغیر لگی لپٹی رکھے پریت کور کو اپنے بارے سب کچھ بتا دیا تھا۔ پر کہتے ہیں لڑکی کا دل جب کسی پر آ جاتا ہے تو فائدے نقصان کی بات اسے کم ہی سمجھ میں آتی ہے۔ اس کے پاگل پن کے سامنے بھی دشواس سنگھ نہ ٹک سکا اور اب وہ اس کی دھرم پتنی تھی۔

پر تکلف کھانا کھاتے ہوئے میں مطلب کی بات پر آیا۔ ''دھرمودا کہاں ملے گا؟''

وہ متبسم ہوا۔ ''تمھارے حالیہ کارنامے کی وجہ سے اس کی سخت نگرانی ہو رہی ہے۔ مجھ پر بھی چند دن گہری نگاہ رکھی گئی، مگر ہمارا دامن صاف تھا اس لیے کسی نے چھیڑنے کی کوشش نہ کی۔ اور اب دوسرا دن ہے نگرانی بھی ختم کر دی گئی ہے۔ البتہ دھرمودا کا پیچھا وہ اتنی آسانی سے نہیں چھوڑیں گے۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''اس معاملے میں تمھیں گھسیٹنا نہیں چاہتا تھا مگر اب مجبوری آن پڑی ہے۔''

وہ خلوص دل سے بولا۔ ''تم بغیر مجبوری کے بھی ہماری مدد کے حق دار ہو۔''

میں نے اطمینان ظاہر کیا۔ ''جانتا ہوں، اسی لیے تو ادھر کا رخ کیا ہے۔''

وہ تحسین آمیز انداز میں بولا۔ ''ویسے شکلا جیسے بندے سے ٹکر لینا متعجب کرنے والا ہے۔''

میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''تم تک کیا خبر پہنچی ہے۔''

''اڑتی اڑتی خبر یہی پہنچی ہے کہ تم نے اس کی نواسی کو اغواء کیا ہے۔ جسے ڈھونڈنے کو کتے، بلے اور سور متحرک ہیں۔ کیا سچ میں تم ایسا کر چکے ہو۔'' (کتے وہ ایجنسی والوں کو کہتا تھا، سور پولیس والوں کو اور بلونگڑے ڈاکوؤں کو)

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس خبر کو جھٹلا نہیں سکتا۔''

''صاف کہوں تو اس خبر سے مجھے خوشی نہیں ہوئی۔ مردوں کی لڑائی میں مظلوم لڑکی کو گھسیٹنے کو میں مردانگی نہیں سمجھتا۔''

میں متبسم ہوا۔ ''بالکل صحیح سمجھتے ہو۔''

وہ الجھن آمیز لہجے میں بولا۔ ''تمھارے قول و فعل کے تضاد کو کیا نام دوں جبکہ تم خبر کی تصدیق بھی کر رہے ہو۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''میں نے خبر کے سچے ہونے کا اعتراف کیا ہے، یہ کب کہا ہے کہ تم تک مکمل خبر پہنچی ہے۔ اور ادھوری بات سے غلط نتیجہ تو نکلے گا نا۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''پھر کبھی خبر و نتیجے میں مطابقت پیدا کر دو۔''

میں نے مثال دیتے ہوئے پوچھا۔ ''اگر اللہ پاک تمھیں بیٹی کی رحمت سے نوازے اور پھر انڈیا سرکار تمھیں کسی جرم کی وجہ سے پکڑنا چاہے، مگر تم پریت کور بھابی کی مدد سے انڈیا سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ تمھارا سسرا اپنی بیٹی کے قتل کو شوہر سے وفاداری کے بجائے ملک سے غداری گردانتے ہوئے اسے قتل کرا دے اور تمھاری بیٹی کو اپنی سرپرستی میں لے کر اس کے دل و دماغ میں یہ غلط فہمی بھر دے کہ اس کی ماں کو تم نے قتل کیا ہے۔ ساتھ ہی اسے سکھ کے بجائے ہندو بنا دے، تم بیٹی کی واپسی کا مطالبہ کرو اور وہ تمھیں کھری کھری سنا دے تب تم کیا کرو گے؟''

''سکھ اگر اتنے عقل مند ہوتے تو ان پر اتنے لطیفے نہ بنتے۔ اس لیے بجھارتوں کے بجائے صاف صاف بتاؤ کہنا کیا چاہتے ہو۔''

''کوئی بجھارت نہیں ہے، جو تمثیل دی ہے اس پر اپنا ردعمل بیان کرو۔''

''میری بیوی کو قتل کرنے والا چاہے اس کا باپ کیوں نہ ہو میرے ہاتھوں انجام کو پہنچے گا۔ اور میری بیٹی کی پرورش میرا حق ہے جو میں بیوی کے علاوہ کسی کو تفویض نہیں کر سکتا اس لیے اس کے حصول کو کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا۔ باقی اس کے مذہب پر ڈاکا ڈالنا اور اسے، مجھے ملنے سے روکنا ہر فعل ایسا ہے کہ ذمہ دار کا قتل ہونا بنتا ہے۔''

میں نے نتیجہ نکالا۔ ''اللہ تمھیں ہدایت دے، یہی کام میں نے کیا ہے۔''

وہ متعجب ہوا۔ ''شکلا تمھارا سسر تو نہیں ہو سکتا ہے۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''شکلا جس کا سسر ہے میں اس کا نمائندہ ہوں۔ باقی لڑکی بالکل محفوظ ہے، اس پر قید ہونے کے علاوہ کوئی ظلم زیادتی نہیں ہوئی۔ اور اسے قید میں رکھنا میری مجبوری ہے۔ تاکہ بہ حفاظت اسے والدتک لے جاؤں۔''

اس کے چہرے پر مسرت بھری چمک ابھری۔ ''یقین مانو چند دن کے ساتھ میں تمھیں غیور، حوصلہ منداور جری پایا تھا۔ لیکن ایک لڑکی کے اغواء پر مجھے سخت اعتراض تھا۔ اب تم نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تو کام کی بات کریں۔''

''جو کام دھرمو دادا کے ذمہ لگا نا ہے، مجھے بتا دو۔ اسے ملنا مناسب نہ ہوگا۔''

''پرما کو چند دن سنبھالنا ہوگا۔ کوئی ایسی جگہ جہاں شکلا کے آدمی و مددگار نہ پہنچ سکیں۔''

وہ مستفسر ہوا۔ ''پرما مغویہ کا نام ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں۔''

''سمجھو یہ کام تو ہو گیا۔ اور کچھ؟''

''اچھی سی چائے پلا دو۔''

وہ ہنسا۔ ''اس کام میں تمھاری بھابی سے بہتر کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔'' اور پھر بیوی کو آواز دینے لگا۔ ''اوئے پریتو! پھر تمھاری ضرورت پڑ گئی ہے۔''

چائے پینے کے دوران اور بعد میں ہماری گفتگو جاری رہی۔ ساری تفصیلات طے کر کے میں نے واپسی کو پر تولے۔

''رات یہیں کر لیتے، یقین مانو تمھاری بھابی دیسی گھی کے پراٹھے بہت اچھے بناتی ہے۔ جب گھر کی لسی اور ساگ بھی مل جائے تو کیا ہی کہنے۔''

''ایسے لالچ نہ دو وشواس سنگھ، یہ نہ ہو مشن پس پشت ڈال کر یہیں پکے ڈیرے ڈال لوں۔''

وہ خلوص سے بولا۔ ''اس سے بڑی خوشی کیا ہو سکتی ہے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہاں رہنا مناسب نہیں۔ تم بس کوئی خفیہ رابطہ نمبر دے دو، کیوں کہ میں نہیں چاہتا تمھارا موبائل فون نمبرز زیر نگرانی (انڈر آبزرویشن) ہو اور ہم پھنس جائیں۔

وہ بے تکلفی سے بولا۔ ''پریتو کا نمبر دے دیتا ہوں۔''

''تم ہر وقت اس کے پاس تو نہیں ہوتے۔''

وہ اطمینان سے بولا۔ ''وہ کال کر کے مجھے مطلع کر سکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے، کل کا دن تم انتظام و انصرام کا جائزہ لو پرسوں ان شاء اللہ ہم وہیں پہنچ جائیں گے۔'' میں پریت کور

بھابی کا موبائل فون نمبر لے کر اس سے الوداعی معانقہ کر کے نکل آیا۔ باہر نکلنے کو بھی میں نے دروازہ استعمال نہیں کیا تھا۔

—— ● ——

واپسی پر پرما مجھے نیند میں نظر آئی۔ لورا ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ نقلی داڑھی، بڑی مونچھیں وغیرہ اتار کر میں اصل حلیے میں آیا کہ میک اپ میں مسلسل رہنا بے چینی و کوفت بھرا تھا۔

دن بھر کی کارگزاری مختصراً سنا کر میں نے پرما کو وشواس سنگھ کے پاس پہنچانے کا پوچھا۔

لورا بے نیازی سے بولی۔ ''اب میرے لیے مس پرما کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔ اسے آزاد کرتے ہو، بیچتے ہوئے یا کہیں چھپاتے ہو یہ تمھارا دردِ سر ہے۔''

میں بھناتے ہوئے بولا۔ ''قرض نہیں مشورہ مانگا ہے۔''

وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ ''شکلا کے خلاف میدان میں اترنے کو ضروری ہے کہ پرما کا دم چھلہ ہمارے ساتھ نہ لگا ہو۔''

دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ ہم حیرانی سے اچھل پڑے تھے۔ پستول کے جیب میں ہونے کی تسلی کر کے میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ لورا بھی میرے ساتھ ہی تھی۔ اس کی نظر دیواروں پر تھی۔

میں نے دروازے کے قریب جا کر پوچھا۔ ''کون؟''

جواب نہ ملنے پر میرے اعصاب تن گئے تھے۔ ''کون ہے؟'' میں نے دوبارہ زبان کھولی۔

اچانک موبائل فون کی گھنٹی نے متوجہ کیا۔ ایک بار تو اچھل کر میں پیچھے ہٹا تھا۔ موبائل فون دروازے کی نچلی درز سے کسی نے اندر کھسکایا تھا اور اب اسی پر کال آ رہی تھی۔

''ہیلو۔'' محتاط انداز میں موبائل فون اٹھا کر میں نے کان سے لگا لیا۔

ایک سرد لہجہ میری سماعتوں میں گونجا ''تمھیں ڈھونڈ لیا گیا ہے۔ اور تمھارے پاس بھاگنے کو پانچ دس منٹ سے زیادہ وقت نہیں ہے۔ موبائل فون گندے نالے میں پھینک دینا۔'' ایک ہی سانس میں اطلاع، منصوبہ اور ہدایت سنا کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اطلاع ایسی نہ تھی کہ میں تفصیل پوچھنے میں وقت ضائع کرتا۔ میرے خفیہ خیر خواہوں کے پاس وضاحتوں کا وقت تھا نہ میرے پاس سننے کی مہلت۔

''کیپٹن پانچ منٹ میں نکلنا ہے، کار یہیں لے آؤ۔'' میں بھاگ کر اندر گھسا۔ لورا وضاحت چاہے بغیر باہر نکل گئی تھی۔ وہ موقع محل اور صورت حال کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اور ایسے مواقع پر وقت ضائع کرنے کی عادی نہیں تھی۔

سب سے پہلے میں نے پرما کے سر سے کمبل کھینچا۔ اس نے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی، مگر میں نے اس کی گردن بازو کے شکنجے میں کس کر مخصوص دباؤ ڈالا۔ وہ زور سے تڑپی اور پھر ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔

میں نے ہتھکڑی چارپائی سے کھول کر اس کے ہاتھ پاؤں جکڑے اور منہ پر کپڑا باندھ دیا۔ پھر ضروری سامان کا بیگ کندھے میں ڈال کر اسے کمبل سمیت بازوؤں میں بھرا اور سرسری نظر اندر دوڑا کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میرے دروازے تک پہنچنے تک لورا کار لے آئی تھی۔

بیگ اور پرما کو ڈگی میں ڈال کر میں نے ڈگی قفل کی۔ گلی میں دو کاریں سڑک کی طرف روانہ دکھائی دیں۔ ایک کار کی روشنیاں عقب میں بھی نظر آ رہی تھیں، مگر ان کی رفتار دیکھ کر مجھے خطرے کی کوئی بات نظر نہ آئی۔

''گاڑی ان کاروں کے بیچ لگا لو، اب کال پر بات ہوگی۔'' لورا کو ہدایت دے کر میں اندر گھس گیا۔

موٹر سائیکل صحن میں کھڑی تھی۔ میں دوبارہ کمرے میں گھس گیا۔ سامان کو آگ لگائے بغیر جانا مناسب نہ تھا گو وقت کی کمی تھی اور سامان میں ایسی اشیاء موجود نہ تھیں جنھیں جلانا ناگزیر ہوتا۔ بستر، جوتوں اور کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ کوئی

قابل ذکر چیز موجود نہیں تھی۔ سنائپر رائفلیں اور ضروری سامان پہلے سے کار کی ڈگی میں بند ہوتا تھا۔ صرف چھوٹا سا بیگ ہم پاس رکھتے جس میں رقم اور میک اپ کا سامان ہوتا تھا۔

جلدی سے چار پائیوں کو گھسیٹ کر ایک دوسرے پر پھینکا، اندر موجود تمام چیزوں کو ایک جگہ ڈھیر کیا، گیس سلنڈر کو آگ لگا کر چار پائی کے نیچے رکھا اور باہر نکل آیا۔

موٹر سائیکل پکڑتے وقت خفیہ مددگاروں کے موبائل فون کا خیال آیا جو انھوں نے نالے میں پھینکنے کا کہا تھا۔ میں نے دوبارہ اندر گھس کر موبائل فون بھی آگ میں پھینکا اور موٹر سائیکل کو پکڑ کر دروازے سے نکلنے لگا۔ غیر ارادی طور پر نگاہ گلی سڑک ملاپ کی طرف اٹھی۔ تیز رفتاری سے آتی تیز روشنیوں نے میری ٹانگوں میں بجلی بھر دی تھی۔ لیکن جتنی بھی تیزی کرتا تیز رفتار گاڑیوں سے بچنا ممکن نہیں رہا تھا۔

کک مار کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور گیئر لگا کر چل پڑا۔ سامان ضائع کرنے کی احمقانہ احتیاط پسندی اور جاسوسوں کے نقش قدم پر چلنے کا شوق میری گردن پھنسانے والا تھا۔ مسلسل گیئر لگا کر میں چوتھے گیئر میں موٹر سائیکل بھگانے لگا۔ مگر عقب میں پھیلی تیز روشنی ظاہر کر رہی تھی کہ کم از کم ایک کار نے کھولی کے سامنے رکنے کی غلطی نہیں کی تھی۔

موٹر سائیکل اس قابل نہ تھی کہ میں کار کا مقابلہ کر پاتا، روشنیاں لحہ بہ لحہ قریب آ رہی تھیں اور میری بدقسمتی سے وہ گلی کافی طویل اور بالکل سیدھی تھی۔ میری جان تبھی بچ سکتی تھی کہ کوئی تنگ گلی نظر آتی جس میں کار نہ چل پاتی۔ ایجنسی والوں کے پاس یوں بھی نئی اور عمدہ کاریں ہوتی ہیں۔ اور میں ایک ایسی ہی کار سے مقابلے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

کار قریب پہنچ گئی تھی۔ ڈرائیور کا ارادہ بالکل واضح تھا۔ وہ مجھے ٹکر مار کر روکنے کی تگ و دو میں تھا۔ میرے پاس موٹر سائیکل روکنے کا موقع بھی نہیں رہا تھا، ایک دم بریک لگانے سے بچت نظر آ رہی تھی نہ رفتار آہستہ کرنے کی گنجائش تھی۔

اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ کار موٹر سائیکل کے عقبی پہیے سے ٹکرائی، میں ذہنی طور پر اس حادثے کے لیے تیار تھا۔ ہینڈل چھوڑ کر اچھلا اور جونہی زمین سے قدم ٹکرائے لوٹ لگا کر خود کو زخمی ہونے سے بچانے کی تگ و دو کرنے لگا۔ موٹر سائیکل پھسلتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائی تھی۔ ڈرائیور نے زوردار بریک لگا کر کار روکی اور میرے سنبھلنے سے پہلے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے اندھی و طوفان کی طرح برآمد ہوا۔ میرے پاس ہاتھا پائی کا وقت نہیں تھا۔ دوسرے لوگوں کے پہنچنے سے پہلے مجھے کار میں موجود لوگوں کو ناکارہ کر کے بھاگنا تھا۔

میرا ہاتھ فوراً جیب میں رینگا، مگر کار سے برآمد ہونے والا شخص یقیناً چھلاوہ تھا۔ ہاتھ کوٹ سے باہر آنے سے پہلے اس کی زوردار ٹکر میری چھاتی میں لگی اور میں کولہوں کے بل نیچے گر گیا۔

الٹی قلابازی لگا کر میں فوراً اٹھا، ساتھ ہی جیب سے سائیلنسر لگا گلاک برآمد کیا، مگر ہاتھ سیدھا بھی نہیں کر پایا تھا کہ ڈرائیور نے لات گھمائی۔ اس کے بوٹ کی ایڑی میرے دائیں ہاتھ سے ٹکرائی، پستول اڑ کر دور جا گرا تھا۔

''میں نے سنی سے تمھیں زندہ چھوڑنے کا وعدہ کیا ہے، اپاہج نہ بنانے کی کوئی شق معاہدے کا حصہ نہیں ہے۔'' ایک منحوس آواز نے میری سماعتوں میں زہر انڈیلا۔ کار کی تیز روشنی کی وجہ سے اس کی شکل واضح نہیں دکھائی دے رہی تھی، تبھی اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ وہ اکیلا ہی تھا اور حقیقت تو یہ تھی کہ کار سے چار افراد کے برآمد ہونے پر مجھے اتنی پریشانی کا سامنا نہ ہوتا جو اس اکیلے شخص کے ٹکرانے سے ہونے والا تھا۔ وہ انتہائی، نڈر، مکار، پھرتیلا اور بہترین لڑاکا تھا۔ کچھ دشمن ایسے ہوتے ہیں جن سے خالی ہاتھ لڑنا سراسر گھاٹے و نقصان کا باعث بنتا ہے۔ اور کرن چاولہ کا شمار انھی دشمنوں میں ہوتا تھا۔ ممتا دیدی کی وجہ سے وہ ایک بار بچ نکلا تھا اور آج اسی دن کا بدلہ چکانے پہنچ گیا تھا۔

میری حقیقی صلاحیت اچھا نشانے باز ہونا ہے۔ جسمانی داؤ پیچ میں ناقابل شکست ہونے کا دعوے دار میں کبھی نہیں

رہا۔ گو خود کو موم کا پتلا بھی نہیں سمجھتا اور الحمد اللہ تب تک خالی ہاتھ بھی کسی سے مار نہیں کھائی تھی۔ لیکن کرن چاولہ معافی دینے کے چکر میں نہیں تھا۔ اس سے ہاتھا پائی کرتے وقت جیت کا پلڑا جھکانا کافی دشوار تھا۔

چند گاڑیوں کی روشنی بھی اس طرف آنے لگی تھی جو یقیناً کرن چاولہ کے ساتھی تھے۔ اگر وہ پہنچ جاتے تو میرے بچنے کی جو چند فیصد امید تھی وہ بھی دم توڑ جاتی۔

وہ بہ مشکل بات ختم کر پایا تھا کہ میں نے پہل کرتے ہوئے اس پر چھلانگ لگائی، میرا گھٹنا خطرناک انداز میں اس کی پسلیوں کی طرف بڑھا۔

کہنیوں کا کراس بنا کر اس نے وار سہارا اور پھر ایک دم میرے گریبان میں ہاتھ ڈال کر، خود کو زمین پر گراتے ہوئے اس نے میرے پیٹ میں دایاں پاؤں لگایا اور میں اڑتے ہوئے قریبی مکان کے دروازے سے جا ٹکرایا تھا۔

نسوانی چیخ بلند ہوئی اور میں دروازہ کھولنے والی عورت کو لیے نیچے گر گیا تھا۔ بے چاری شاید ہنگامے کی وجہ معلوم کرنے نکل رہی تھی۔ عورت کو سنبھالنے اور اس کی خیریت دریافت کرنے کی مہلت نہیں تھی۔ اس کی ''ہائے وائے'' سے کان بند کرتے ہوئے میں نے ایک دم اٹھ کر دروازے کو اندر سے کنڈی کیا اور بھاگ کر دائیں جانب کی دیوار پر چڑھ گیا۔

کرن چاولہ نے لات مار کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی اور ناکام ہو کر دیوار پھلانگ کر اندر گھسا۔ تب تک میں دیوار سے ہو کر برآمدے کے چھجے سے چمٹا، اور چھت پر چڑھ گیا۔

مڑ کر دیکھنے پر کرن چاولہ اسی دیوار پر نظر آیا۔ منڈیر سے اینٹ اٹھا کر میں نے زور سے گھمائی، نشانہ اس کا سر تھا، مگر خالی ہاتھ کا نشانہ، رائفل کی طرح درست نہیں نکلا تھا۔ اینٹ اس کی چھاتی سے ٹکرائی اور وہ سنبھلنے کی کوشش میں نیچے گر گیا، اس کا انجام دیکھنے کو میں نہیں رکا تھا۔ وہ غریبوں کی بستی تھی زیادہ تر مکانوں کی چھتیں ایک دوسرے سے جڑی تھیں۔ میں اوپر ہی اوپر بھاگ پڑا تھا۔

اگلی چھت پر پہنچتے ہی میں نے بھاگتے بھاگتے مڑ کر دیکھا کرن پہلی چھت پر پہنچ گیا تھا۔ دونوں کی دوڑ شروع ہوئی۔ کہتے ہیں چیتا، ہرن سے تیز رفتار ہوتا ہے۔ لیکن جب جان پر بن آتی ہے تو اکثر اوقات ہرن، چیتے کو جل دے کر نکل جاتا ہے۔ بلاشبہ کرن چاولہ کو چیتا گرادن کے میں خود کو ہرن نہیں کہہ رہا۔ لیکن اس کے پیچھے ایجنسی کے درجن بھر منجھے ہوئے ایجنٹ تھے۔ اور چودہ پندرہ دشمن مل کر میرے لیے اس سے کہیں زیادہ خطرناک تھے جتنا ایک چیتا، ہرن کے لیے ہو سکتا ہے۔

سات آٹھ چھتوں کو عبور کرنے کے بعد مجھے خلا نظر آیا جو گلی کا تھا۔ جب گلی کی ضرورت تھی تو نظر نہیں آ رہی تھی اور اب نقصان دہ تھی تو ایک دم ظاہر ہو گئی تھی۔

اس علاقے کا سرسری جائزہ میں نے لیا ہوا تھا۔ اور بڑی گلی کے علاوہ باقی گلیاں نو دس فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں تھیں۔ اب نامعلوم وہ گلی نو دس فٹ ہی تھی یا زیادہ چوڑی تھی، میں رفتار کم کیے بغیر آگے بڑھتا گیا۔ آخری قدم منڈیر پر پڑا اور گلی کا خلا ہوا میں تیرتے ہوئے میرے قدم دوسری چھت سے ٹکرائے، گرتے ساتھ جسم کی حرکت کو جاری رکھتے ہوئے میرے دونوں ہاتھ آگے بڑھے اور چھت پر لوٹ لگاتا ہوا میں دوبارہ کھڑا ہو کر دوڑ پڑا۔ اگلی چھت پر کودتے وقت مجھے عقبی چھت پر ''دھپ'' کی زوردار آواز سنائی دے گئی تھی۔

چند مزید چھتیں پھلانگنے کے بعد کرن چاولہ کے پاؤں کی آواز نزدیک سنائی دینے لگی تھی۔ تبھی آگے مجھے ایک اور خلا نظر آیا اور اس بار گلی نہیں خالی پلاٹ تھا۔ میں نے قدموں کی رفتار دھیمی کی اور پھر ایک دم مڑ کر گھٹنا اٹھا دیا۔

تیز رفتاری کے باوجود اس نے قدم روک کر میرے گھٹنے کے سامنے ہاتھ کرنے کی کوشش کی مگر اچٹتا ہوا وار اس کے پیٹ میں لگ گیا تھا۔

تکلیف برداشت کرتے ہوئے اس نے اچھل کر مجھے ٹکر مارنا چاہی، میں ایک دم سامنے سے ہٹا وہ اپنی جھونک میں آگے بڑھا، تبھی میری لات اس کی تشریف سے ٹکرائی۔ وہ اوندھے منہ گرنے لگا۔ مگر ایک دم ہاتھ نیچے ٹیک کر وہ لڑھکتا ہوا اٹھ گیا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے میں نے اچھل کر اس کے پیٹ میں لات مارنے کی کوشش کی، مگر وہ سنبھل چکا تھا۔ جسم کو دہرا کرتے ہوئے اس نے میری ضرب کو ہلکا کیا ساتھ ہی اس کے ہاتھوں نے برق رفتاری سے میری پنڈلی پر گرفت جمائی اور مجھے گھما کر اچھال دیا۔ میں لڑھکتا ہوا منڈیر کے قریب پہنچا اور کنارے پر ہاتھ جما کر نیچے لٹکتے ہوئے کود گیا۔

زمین پر پاؤں لگتے ہی میں پھر بھاگا۔ مگر قدم دو لیتے ہی کرن کے نیچے کودنے کا دھماکا سنائی دے گیا تھا۔ شاید دو تین قدم دوڑ کر اس نے لمبی چھلانگ لگائی تھی۔ شاید اس لیے کہا کہ مجھے نظر نہیں آیا تھا، البتہ کمر پر اس کے سر کی بھرپور ٹکر لگی تھی، جس سے اندازہ یہی ہوا کہ اس نے ہوا میں تیرتے ہوئے وار کیا تھا۔

میں اوندھے منہ گرا، ایک دم کروٹ تبدیل کر کے میں نے دائیں ٹانگ سکیڑی اور جونہی وہ مجھے چھاپنے کو جھکا اس کی چھاتی پر رسید کر دی۔ وہ پیٹھ کے بل گرا، اس کی چھاتی پر سوار ہوتے ہوئے میں نے زوردار مکا اس کے چہرے پر رسید کیا، مگر اس نے کہنی سامنے لا کر چہرے کو بچا لیا تھا۔ میں نے تابڑ توڑ چند وار کیے، مگر اس کے چہرے کو نشانہ نہ بنا سکا۔ اور پھر اچانک ہی میرے بازو کو گرفت میں لیتے ہوئے اس نے دوسرے بازو کے زور سے مجھے نیچے پھینکا۔ اب وہ اوپر تھا۔ اس کا پہلا مکا خاصی قوت سے میرے جبڑے سے ٹکرایا، میرے منہ میں خون بھر گیا تھا۔ لیکن اس کے دوسرے وار کو میں نے کہنی پر سہار لیا تھا۔ اگر دوسرا مکا بھی لگ گیا ہوتا تو میری مدافعت دم توڑ جاتی۔

اس کے مسلسل مکوں کو کہنیوں اور بازو پر سہار کر میں نے گھٹنے اکٹھے کیے اور ایک دم اس کے دونوں ہاتھوں کو گرفت میں لیتے ہوئے زوردار ٹکر اس کی ناک پر رسید کر دی۔ اس کے ہونٹوں سے ہلکی سی سسکی برآمد ہوئی، تیزی میں سستی کا دخول ہوا اور میں نے اسے گھما کر نیچے پھینکا اور دوبارہ سواری گانٹھ لی۔ مگر میرے مکا مارنے سے پہلے اس نے ٹانگوں اور نچلے دھڑ کو جھٹکا دے کر الٹی قلابازی کھائی، میں اس کے سر کے اوپر سے ہو کر عقبی جانب جا گرا۔ وہ میرے اوپر سے ہوتا ہوا سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔

میں نے تیزی سے اٹھنے کی کوشش کی مگر اتنی دیر میں اس نے سنبھل کر میرے چہرے کو نشانہ بنانے کی کوشش کی، اٹھنے کی وجہ سے اس کی لات میری چھاتی سے ٹکرائی۔ میں کولہوں کے بل گرا اور اس کی اگلی ٹھوکر لگنے سے پہلے الٹی قلابازی کھا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

تب تک وہ میرے پیٹ میں مارنے کو لات گھما چکا تھا۔ کہنیوں کا کراس بنا کر میں نے اس کی زوردار ضرب کو سہارا اور اس سے پہلے کہ وہ پیچھے کھینچ پاتا اس کی ٹانگ پر دونوں بازوؤں کی گرفت بنا کر اسے زمین پر دے مارا۔ لیکن جونہی اسے چھاپنے کو جھکا، اس نے اپنی ٹانگیں آکٹوپس کی طرح میری گردن سے لپٹ دی تھیں۔ میں نے فوراً دایاں بازو اس کی ٹانگوں سے گزار کر گردن کو بے پناہ دباؤ سے چھٹکارا دیا اور پھر گھٹنوں پر زور دے کر اسے اوپر اٹھایا اور ایک دم اس کی پیٹھ زمین پر دے ماری۔

اسی وقت ہم تیز روشنی میں نہا گئے تھے۔ مگر روشنی نے ہماری لڑائی کو انجام تک نہیں پہنچایا تھا۔ میں نے دوبارہ پہلے والی حرکت دہرا کر اس کی پیٹھ زمین سے ٹکرائی۔ اس کے پاؤں کی گرفت خود بہ خود میری گردن پر ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ ایک دم سر کو اس کی ٹانگوں سے نکالتے ہوئے میں پیچھے ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ اٹھ پاتا اسے چھاپ لیا۔ مگر گرفت جمانے سے

پہلے اس نے بازوؤں سے پکڑ کر مجھے گھما کر نیچے کرلیا تھا۔

''رک جاؤ، ورنہ گولی ماردوں گی۔'' وہ ممتا دیدی کی آواز تھی۔ بہ ظاہر وہ وقت آن پہنچا تھا کہ ایک بہن کے سامنے ایک جانب بھائی اور دوسری جانب وطن اور محبوب کے چناؤ کا مرحلہ تھا۔ اگر بات صرف میری اور کرن چاولہ کی ہوتی تو وہ ضرور مخمصے میں پڑتی، مگر دیش کی محبت اس کی نس نس میں بھری تھی۔ مجھے ذرا بھر بھی امید نہیں تھی کہ وہ گولی چلاتے ہوئے جھجکے گی۔

البتہ ہم دونوں گتھم گتھا تھے۔ کرن چاولہ سخت جان حریف تھا اور امید یہی تھی کہ میرے مقابلے کو اسے کسی مدد نہ لینا پڑتی۔ جیت کا ہما اس کے سر پر چکرا رہا تھا۔ میں خاطر خواہ مزاحمت کر رہا تھا، لیکن میری جنگ جارحانہ کے بجائے مدافعاتی تھی۔ کیوں کہ میری ترجیح لڑائی کے بجائے فرار ہونا تھا۔

ممتا دیدی چلائیں۔ ''راج!..... راہی..... پیچھے ہو جاؤ دونوں۔'' مگر اس وقت لڑائی چھوڑنا، کرن چاولہ کے لیے نہیں میرے لیے نقصان دہ تھا۔

لڑھکیاں کھاتے ہوئے میں اوپر ہوا، میرا زوردار گھونسا نشانے پر لگا تھا، کرن کا سر زمین سے ٹکرایا، میرا اگلا گھونسا بھی اسی رفتار سے نیچے آیا، مگر اس نے کہنی آگے کرلی۔ دو تین مکے کہنیوں پر روک کر اس نے میرے ہاتھ تھام لیے تھے۔ اس کی کوشش مجھے دور اچھالنے کی تھی۔

تبھی ہمیں علیحدہ نہ ہوتے دیکھ کر ممتا دیدی ذرا قریب ہوئیں۔ ایک اور گاڑی نزدیک پہنچ گئی تھی۔ میں نے سرعت سے فیصلہ کرتے ہوئے زور لگا کر کرن چاولہ کا سر ممتا دیدی کی جانب موڑا، اس کی ٹانگوں پر سے جسم کا دباؤ کم کر کے اسے موقع دیا کہ مجھے پیچھے اچھالے۔ اور میری تدبیر کامیاب رہی تھی۔ کرن چاولہ نے بجلی کی سی سرعت سے میرے پیٹ پر پاؤں لگایا اور مجھے پیچھے اچھال دیا۔

زمین پر لوٹ لگاتے ہوئے میں ممتا دیدی کے قریب ہوا، اس وقت وہ چاہتیں تو مجھے گولی مار سکتی تھیں، مگر ان کی حتی الوسع کوشش یہی تھی کہ مجھے زخمی نہ ہونا پڑے، تبھی نظر انداز کر گئیں اور یہ شفقت انھیں مہنگی پڑی تھی۔

ایک دم جھپٹتے ہوئے میں نے پستول چھینا اور اچھل کر ان سے دور ہٹا کہ وہ مجھے لپٹ کر قابو کرنے کی کوشش کر سکتی تھیں۔ اتنا تو انھیں بھی یقین تھا کہ میں کم از کم ان پر گولی نہیں چلاؤں گا۔

وہاں پہنچنے والی نئی کار سے دو افراد برآمد ہوئے، دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔

''خبردار.....'' وہ زوردار انداز میں دھاڑے، مگر ان کے منہ سے الفاظ اور میرے پستول کی نال سے گولی ایک ساتھ نکلی تھی۔ مسلسل دو مرتبہ لبلبی دبا کر میں نے ان کے پستول والے ہاتھوں کو کامیابی سے نشانہ بنایا۔ اور جان بوجھ کر پستول کے بجائے ہاتھوں پر گولی ماری تاکہ وہ عارضی طور پر ناکارہ ہو جائیں۔ مجھے ناکامی نہیں ہوئی تھی۔

تیز کراہوں سے انھوں نے زخمی ہاتھ کو بغل میں دبا لیا تھا۔

''راج نہیں۔'' ممتا دیدی میری جانب دوڑیں۔

جھکائی دے کر میں نے جان بچائی، ساتھ ہی میری نظروں نے کرن چاولہ کو ڈھونڈا۔ میرے ہاتھوں میں پستول آتے ہی اس نے دیوار کی آڑ لینے کو چھلانگ لگائی تھی۔ اور جب میں اس کی طرف متوجہ ہوا تب تک وہ آڑ لے چکا تھا۔ اسے نشانہ بنانے کی کوشش فضول تھی۔ نئی آنے والی کار کے اگلے پہیوں پر ایک ایک گولی گولی ضائع کر کے میں فوراً ممتا دیدی کی کار کی طرف بھاگا کہ فرار ہونے کا اس سے سنہری موقع نہیں مل سکتا تھا۔ ممتا دیدی بھی مجھے پکڑنے کو دوڑیں، مگر ان کے قریب آنے سے پہلے میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ افراتفری میں وہ کار کو چلتا چھوڑ کر نیچے اتری تھیں۔ کاریں

کی بتیاں روشن تھیں۔

پستول جیب میں ڈال کر میں نے ہینڈ بریک آزاد کی اور گیئر لگاتے ہوئے ایکسی لیٹر پر پاؤں دبا دیا۔ مگر تب تک ممتا دیدی دوڑ کر اندر گھس آئی تھیں۔

''راج! کار روکو..... تمھیں کہہ رہی ہوں روکو کار ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' میرے ہاتھوں سے اسٹیئرنگ چھیننے کی کوشش کرتے ان کی دھمکیاں بھی جاری رہیں۔

میں نے انھیں جواب دینے کے بجائے کار کو تیسرے گیئر میں ڈالا اور ایکسی لیٹر مکمل دبا دیا۔ سڑک قریب ہی تھی۔ لیکن میں اطمینان سے ڈرائیو نہیں کر پا رہا تھا۔ ممتا دیدی کی کوشش سے کار لہرائی۔ انھیں لگا میں کہیں ٹھوک دوں گا۔ اسٹیئرنگ چھوڑ کر وہ پیچھے ہٹیں، ساتھ ہی ان کا زوردار تھپڑ میرے چہرے پر لگا۔

''راج!..... بے شرم، بے حیا کار رکو۔'' غصے سے مارے ہوئے تھپڑ میں بھی چاہت پنہاں تھی ورنہ وہ تربیت یافتہ تھیں، تھپڑ کے بجائے کراٹے کا داؤ پیچ بھی آزما سکتی تھیں۔ مسلسل دو تین تھپڑ کھا کر بھی جب میں نے کم کرنے کے بجائے رفتار بڑھا دی تو وہ دوبارہ اسٹیئرنگ پر جھپٹیں اور پھر کار کو ڈگمگاتا پا کر مجھے بازوؤں میں بھرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ تاکہ اسٹیئرنگ سے ہاتھ چھوٹنے پر میں رکنے پر مجبور ہو جاؤں۔ ہم سڑک پر چڑھ کر فرلانگ بھر آگے آ گئے تھے۔ اگر فوری طور پر ممتا دیدی کا حل نہ کرتا تو انھوں نے مجھے گرفتار کرا دینا تھا۔

ایکسی لیٹر سے پاؤں ہٹا کر میں نے بریک دبائی اور ہینڈ بریک کھینچ کر ممتا دیدی کے ہاتھوں کو تھام لیا۔

''راج، تمھیں میرے سر کی قسم، بھاگنا چھوڑو اور نیچے اترو۔ وعدہ کرتی ہوں تمھیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ ہم نے بس برطانوی چڑیل کو پکڑنا ہے۔ یقین کرو میرا۔'' ہاتھوں کو میری گرفت سے آزاد کرانے کی جدوجہد کرتے ہوئے وہ مسلسل بول رہی تھیں۔ وہ لڑائی بھڑائی کی ماہر تھیں مگر مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھا رہی تھیں۔ نہ میں انھیں چوٹ پہنچانا چاہتا تھا۔ اور چوٹ پہنچائے بغیر ان سے جان چھڑانا ناممکن لگ رہا تھا۔ گو میرے پاس تو پستول بھی موجود تھا۔ لیکن ممتا دیدی کے خلاف پستول نکالنے کا مطلب اپنی گردن پھنسانا تھا۔ میں تو ان پر گولی نہ چلا سکتا، شاید وہ دیش کی محبت ایسا کر گزرتیں۔

اسی چھینا جھپٹی میں اچانک ایک ترکیب ذہن میں آئی۔ میں نے فوراً انھیں بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔ بلاشبہ وہ بہت زیادہ پرکشش اور خوب صورت جسم کی مالک تھیں، مگر ان سے لپٹتے وقت مجھے ہمیشہ یونہی لگتا تھا جیسے پھوپھو جان یا امی جان کے گلے لگنے پر احساس ہوتا ہے۔

''دیدی، آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں.....'' ان کے ذہن کو بھٹکانے کی خاطر میں نے گفتگو جاری رکھی تاکہ انھیں پتا نہ لگے کیا کر رہا ہوں۔ ''کوئی آپ کی بات نہیں سنے گا۔ انڈیا سرکار آپ کی ملازم نہیں مالک ہے اور.....'' میرے بولنے سے ان کی مزاحمت ہلکی ہوئی، انھیں لگا ایک بھائی، بہن کو گلے لگا کر جذباتی دھونس جمانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر میرا منصوبہ کوئی اور تھا۔ ہلکا سا اچک کر میں نے کمر سے ان کے کوٹ کو پکڑا اور ایک دم کوٹ کو اوپر کی طرف کھینچا اور ان کے سر سے گزار کر کوٹ سامنے لے آیا، ساتھ ہی کوٹ کو چکر دے کر اس کے ہاتھوں کو مزید جکڑ دیا۔ یوں کہ اس کے بازوؤں سے کوٹ نہیں اترا تھا۔ بالکل آخری لمحے میں انھوں نے مچل کر میری گرفت سے نکلنا چاہا مگر دیر ہو گئی تھی۔

وہ میرے بازوؤں کے گھیرے میں تھی اس لیے کوٹ کو اتار یا پہن نہیں سکتی تھیں۔ ''فیشن ایبل فٹ کوٹ'' کو اتارنے، پہننے میں ویسے بھی ذرا سی دقت ہوتی ہے۔ اور اس وقت تو کوٹ نے ہتھکڑی کی طرح ان کے ہاتھوں کو جکڑ لیا تھا۔ اور میں انھیں موقع نہیں دے رہا تھا کہ وہ کوٹ اتار پھینکیں یا پہن کر ہاتھوں کو آزاد کرا لیں۔ انھیں بازوؤں ہی میں

جکڑے ہوئے میں دروازے کی جانب کھسکا۔اور دروازہ کھول کر انھیں ساتھ لیے نیچے اتر گیا۔وہ جان چھڑانے کو زور زور سے مچل رہی تھیں، ساتھ ہی روہانسا ہو کر بولنے لگیں.....

''راج! بے شرم، بے حیا بہت پٹو گے، اب مجھ سے رعایت کی توقع نہ رکھنا۔ میں تمھیں چھوڑوں گی نہیں۔ بہتر ہوگا شرافت سے میرے ساتھ چلو.....''

انھیں آرام سے سڑک پر بٹھا کر میں برق رفتاری سے کار میں گھسا اور دروازہ فوراً قفل کر دیا۔کوٹ زیادہ سے زیادہ دو تین سیکنڈ ہی انھیں الجھا سکا تھا۔اور وہ قلیل وقت میرے لیے کافی تھا۔وہ دروازے کے ہینڈل سے پکڑ کر مسلسل جھٹکے دیتے ہوئے مجھے پکار رہی تھیں۔

''راج، رکو..... میں تمھیں کہہ رہی ہوں رک جاؤ۔پلیز مان جاؤ تمھاری جان خطرے میں ہے۔'' وہ باؤلی ہو کر دروازے سے چمٹی تھیں، اچانک انھیں خیال آیا اور کار کو سامنے سے روکنے کو وہ آگے بڑھیں، اگر یہ خیال انھیں پہلے آجاتا تو میرے لیے مسئلہ کھڑا کر سکتی تھیں۔

مگر تب تک میں اسٹیئرنگ پر بیٹھ کر ہینڈ بریک کو آزاد کر کے کار آگے بڑھا چکا تھا۔چند قدم ساتھ دوڑ کر انھیں نے آخری حد تک کوشش کی اور پھر کار آگے نکل گئی۔اس کے بعد بھی وہ مجھے آواز دے کر چیختے ہوئے بھاگتی رہیں۔آگے سڑک صاف تھی اور وہاں سے جلد از جلد دور جانا ہی مجھے بچا سکتا تھا۔

شاید ان کی دوسری کاروں نے گلی کے دوسرے سرے کو غلاف (کور) کیا ہوا تھا تاکہ میں اس جانب سے نہ بھاگ سکوں۔یہ بھی ممکن تھا وہ ان کھولیوں میں لوٹ اور اوٹن کی تلاش میں لگے ہوتے۔آگ بجھانے کی کوششوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔بہ ہر حال کچھ بھی تھا ان کا اکٹھ میرے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا۔کرن چاولہ کو خود پر اعتماد تھا۔بلاشبہ اس کا اعتماد بے جا نہ تھا۔اگر ممتا دیدی حماقت نہ کرتیں اور اپنے ساتھیوں کا انتظار کر کے انھیں مجھے جکڑنے کا موقع دیتیں تو میں اب تک حراست میں ہوتا۔

سڑک پر مسلسل آگے بڑھنا کسی طور مناسب نہ تھا۔ان کے لیے سڑک پر تعاقب کرنا اور ناکا لگا کر میری حرکت کو روکنا نہایت آسان تھا۔اس لیے جتنی جلدی میں سڑک چھوڑ دیتا بہتر تھا۔ڈیڑھ دو کلومیٹر آگے آتے ہی میں سڑک سے اتر کر چوڑی گلی میں گھس گیا۔لیکن صرف سڑک سے اترنا بھی مسئلے کا حل نہیں تھا۔وہ ''را'' کی کار تھی اور اس میں آلہ نشاندہی (انڈیکیٹر) کی موجودی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔البتہ میری کوشش صرف جلدی سے اس علاقے سے باہر نکلنا تھا۔تین چار گلیوں سے گزرنے کے بعد بھی کوئی سفر کا متبادل ذریعہ نہیں ملا تھا۔رات چونکہ کافی بیت چکی تھی اس لیے گلیوں میں نقل و حرکت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔میری کوشش کسی موٹر سائیکل سوار کو شکار کرنے کی تھی، مگر موٹر سائیکل والا کوئی نہ ملا البتہ ایک کار کو دیکھ کر میں نے قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔اور اپنی کار چوڑی گلی کے ایک طرف کرتے ہوئے نیچے اترا۔سامنے سے آنے والی کار قریب پہنچ گئی تھی۔میرے ہاتھ اٹھانے پر اس نے فوراً بریک لگائی تھی۔وجہ یہی تھی کہ میں جس شاندار کار سے اترا تھا اس کا مالک اچکا یا نچلے درجے کا ڈکیت نہیں ہو سکتا تھا۔

شیشہ نیچے کر کے اس نے باہر جھانکا۔وہ ایک خوش شکل لڑکی تھی۔سفید کوٹ دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دیر نہ ہوئی کہ وہ ڈاکٹر تھی اور اپنی شفٹ ختم کر کے آرہی تھی۔اس نے سر پر کالے رنگ کی گرم ٹوپی رکھی ہوئی تھی جبکہ اسی رنگ کا مفلر نما دوپٹا اس کے گلے میں پڑا تھا۔''جی۔'' وہ مستفسر ہوئی۔

''تھوڑا سا پٹرول مل جائے گا جو مجھے پٹرول پمپ تک پہنچا دے۔'' میں نے یہ تاثر دیا گویا میری کار میں پٹرول ختم ہو گیا ہے۔میں براہ راست پٹرول ختم ہونے کا بھی کہہ سکتا تھا لیکن حتی الوسع میری کوشش یہی ہوتی کہ جھوٹ نہ بولوں۔گو

عام زندگی میں جھوٹ ایک لعنت اور غیر اخلاقی و گری ہوئی حرکت ہے، مگر جاسوس کی زندگی میں ہر دم ایسے مسائل جنم لیتے ہیں کہ جھوٹ بولنا اس کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسے حالات میں بھی میں الفاظ کے چناؤ پر دھیان دیتا تھا کہ جھوٹ بولنے کے بجائے مخاطب کے دماغ میں من چاہا مطلب گھسیڑوں۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''معذرت خواہ ہوں بھائی۔''

میں درخواست گزار ہوا۔ ''کسی قریبی پٹرول پمپ تک لے جا سکتی ہیں۔''

اس کے یاقوتی ہونٹوں پر رسمی مسکراہٹ ابھری۔ ''بھائی! ڈیوٹی ختم کر کے آ رہی ہوں اور سخت تھکی ہوئی ہوں۔ آپ تھوڑا آگے چلے جائیں سڑک زیادہ دور نہیں ہے وہاں سے ٹیکسی یا لفٹ مل جائے گی۔''

مجھے پہلے سے یہی امید تھی۔ کسی عورت کا اجنبی مرد کو لفٹ دینا کافی مشکل تھا۔ قیمتی کار کی وجہ سے رکی ضرور تھی، لیکن اس سے زیادہ اعتبار وہ نہیں کر سکتی تھی۔

''شما چاہتا ہوں بہن جی، لیکن مجبوری ہے۔'' میں نے ایک دم پستول نکال کر اس پر تان لیا۔

''کک..... کیا چاہتے ہو؟'' اس کی آنکھوں میں خوف ابھرا۔

میں اطمینان سے بولا۔ ''صرف لفٹ۔''

وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔ ''بب..... بھائی میں ایک ڈاکٹر ہوں..... عوام کی خدمت گار۔ ڈیوٹی سے آ رہی ہوں۔ کیا اپنے خدمت گاروں کو یوں تکلیف دی جاتی ہے۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''لفٹ لینا کون سی تکلیف ہے۔ آپ عوام کی خدمت گار ہیں اور میں تھوڑی سی خدمت ہی کا متقاضی ہوں۔''

وہ لرزتے ہوئے بولی۔ ''آ..... آپ بے شک کار لے جائیں..... مم..... مگر.....''

''وعدہ کرتا ہوں ذرا سی بھی تکلیف نہیں دوں گا۔ آپ میرے لیے بہن کی طرح قابل احترام ہیں۔ بھائی کے لیے چند کلومیٹر سفر کی زحمت کر لیں۔''

وہ گڑگڑائی۔ ''پپ..... پلیز.....'' یقیناً اس لمحے کو کوس رہی ہو گی جب میرے لیے کار روکی تھی۔

''سنا نہیں۔'' پستول کی نال سے میں نے اسے ڈرائیونگ سیٹ چھوڑنے کا اشارہ کیا۔

وہ جلدی سے دوسری سیٹ پر منتقل ہو گئی۔

''مجھے معاف کر دینا۔'' ندامت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور کار آگے بڑھا دی۔ وہ اپنے ہاتھ اضطراری انداز میں مروڑ رہی تھی۔

''یقین کرو، مجبور نہ ہوتا تو آپ کو کبھی تکلیف نہ پہنچاتا۔ درحقیقت میری جان کو خطرہ ہے۔ میری کار کو دشمن پہچانتے ہیں اس لیے آپ کی کار میں بیٹھنا پڑا۔ اور جونہی کوئی ٹیکسی وغیرہ نظر آئی آپ کو جانے دوں گا۔''

گہرا سانس لیتے ہوئے وہ خاموش رہی۔ شک ہونے کے باوجود وہ یقین کرنے پر مجبور تھی۔

تھوڑا آگے جاتے ہی میں دوسری گلی میں مڑا جو آگے جا کر سڑک سے مل رہی تھی۔

''آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔'' اسے مانوس کرنے اور جھجک دور کرنے کو میں نے خود ہی بات چیت شروع کی۔ دوستانہ انداز میں بات چیت سے اس کا خوف کسی حد تک دور کیا جا سکتا تھا۔ مناسب نہیں تھا کہ جب تک ٹیکسی نہ ملتی وہ بے چاری اذیت میں مبتلا رہتی۔ یہ بھی ممکن تھا چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دیتی۔ یا پولیس وغیرہ کی جیپ دیکھ کر مدد کو پکارنا شروع کر دیتی۔

وہ دھیرے سے بولی۔ ''ڈاکٹر سُجاتا کھرجی۔''

میں نے اگلا سوال پوچھا۔ ''کس چیز کی ڈاکٹر ہیں۔''

وہ سادگی سے بولی۔ ''انسانوں کی۔''

میں بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ وہ جھینپتے ہوئے بولی۔ ''میرا مطلب میڈیکل اسپیشلسٹ ہوں۔''

میں نے بہ ظاہر سنجیدگی سے کہا۔ ''آج کل طب کے شعبے نے بہت ترقی کر لی ہے، تو کیا کوئی ایسی دوائی بھی ایجاد ہوئی ہے جو کسی کی یادوں کو بالکل ختم نہیں تو کم از کم مدہم کر سکے۔''

اس کے ہونٹوں سے حیرانی بھرا ''جی'' نکلا تھا۔

میں نے وضاحت کی۔ ''مجھے اپنی بیوی بہت پیاری ہے اور آج کل بہ حالت مجبوری ہمارے درمیان عارضی دوری پیدا ہو گئی ہے۔ کیا کوئی ایسا طریقہ ہے کہ چند ماہ کے لیے اسے بھلا سکوں؟''

اس کے لبوں پر مدہم سی مسکراہٹ ابھری۔ ''یقیناً آپ کو ماہر نفسیات (سائیکاٹرسٹ) کی ضرورت ہے۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''بیزاری بھرے بھاشن سننے سے بہتر ہے، حالات سے سمجھوتہ کر لوں۔''

وہ صاف گوئی سے بولی۔ ''میں بھی تو سکون آور دوائی کے علاوہ کوئی سہائتا نہیں کر سکتی۔''

چونکہ میرا مقصد اسے اذیت بھری سوچوں سے چھٹکارا دلانا تھا اس لیے لایعنی و بے کار موضوع پر گفتگو جاری رکھی۔ اس دوران ہم نے تین چار کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ ایک بس اسٹاپ پر دو ٹیکسیاں کھڑی نظر آئیں۔

میں نے رفتار دھیمی کر کے کار سڑک سے اتاری اور ان سے کچھ آگے جا کر روک دی۔

اترنے سے پہلے میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ''کیا اپنی گرم ٹوپی اور دوپٹا مجھے دے سکتی ہیں۔''

وہ حیرانی سے ہکلائی۔ ''کک..... کس لیے؟''

میں متبسم ہوا۔ ''یقیناً نشانی نہیں مانگ رہا۔ باہر سردی زیادہ ہے اور امید ہے ایک ڈاکٹر کو کنٹوپ خریدنے میں دقت نہ ہو گی۔''

''سیدھا کہیں چہرہ چھپانے کو درکار ہے۔'' معنی خیز انداز میں کہتے ہوئے اس نے گرم ٹوپی اور مفلر نما دوپٹا میری طرف بڑھا دیا۔ میرے نرم اور دوستانہ لہجے میں باتیں کرنے سے اس کی جھجک اور پریشانی دور ہو گئی تھی۔

ٹوپی سر پر رکھ کر میں نے دوپٹا مفلر کے انداز میں چہرے کے گرد لپیٹا۔ ''ڈاکٹر صاحب! ہو سکے تو معاف کر دینا۔ آپ کا قیمتی وقت لیا بہت بہت شکریہ۔ اب ٹیکسی نظر آ گئی ہے تو آپ کو مزید تنگ کرنا نہیں بنتا۔'' میں نے اترنے کو پر تولے۔

''بات سنیں۔'' میرے دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے آواز دی۔

''جی۔'' میں حیرانی سے مڑا۔ کیبن بتی بند ہونے کی وجہ سے اس کا چہرہ واضح نظر نہیں آ رہا تھا۔

''یادوں سے چھٹکارے کی دوا تو نہیں بنی البتہ خود کو مصروف رکھنے سے وقتی طور پر افاقہ ضرور ہو جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے آپ نے مسلسل باتوں سے نہ صرف میرا خوف دور کیا، بلکہ مجھے چوٹ لگنے سے بھی محفوظ رکھا۔ اور یقیناً یہ دریافت آپ خود پر بھی آزما رہے ہوں گے۔'' ایک لمحہ توقف کر کے اس نے گہرا سانس لیا..... ''اور آپ بالکل صحیح سوچ رہے ہیں، میں دروازہ کھول کر چھلانگ لگانے کا فیصلہ تقریباً کر چکی تھی۔''

''ڈاکٹر صاحب! میں نے بہ حالت مجبوری آپ کو تکلیف دی ورنہ کسی عوامی خدمت گار کو زحمت دینے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ کا عورت ہونا مجھے مزید نادم کرنے والا تھا اور بے شک مجھے خدشہ تھا کہیں آپ چلتی کار سے کود نہ جائیں۔''

اسے کرید ہوئی۔ ''مجھے نہیں لگتا کوئی دہشت گرد اتنا سلجھا ہوا اور خیال رکھنے والا ہو سکتا ہے۔ میڈیا جھوٹ بول رہا ہے یا آپ ناتجربے کار دہشت گرد ہیں۔'' وہ مجھے پہچان گئی تھی۔ میڈیا نے میری تشہیر ہی اتنی کی تھی کہ اصل حلیے میں کسی کے ساتھ بھی تھوڑا وقت گزار لیتا اس نے پہچان لینا تھا۔

میں ہنسا۔ ''یہ وہ سوال ہیں جو آپ کو پہلے پوچھنا چاہئیں تھے۔ اب تو علیحدہ ہونے کا وقت آ گیا ہے۔''

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولی۔ ''کسی کے بارے جاننے کا اشتیاق اور اس سے استفسار کا حوصلہ تبھی ہوتا ہے جب اجنبیت کی دیوار گرنے کے ساتھ بے تکلفی کا داعیہ بھی پیدا ہو جائے۔''

''خیر اجنبیت کی دیوار گرانے میں آپ کو ذرا سی دیر ہو گئی ہے۔ اس لیے باقی باتیں اگلی ملاقات کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔

''مجھے لگتا ہے آپ کو چند منٹ مزید کار سے نہیں نکلنا چاہیے۔'' سڑک کی طرف میری پیٹھ تھی۔ اس کا انداز ایسا نہیں تھا کہ میں مڑ کر نہ دیکھتا۔ سڑک پر دو کالی کاریں اور ان کے عقب میں پولیس کی تین جیپیں گزر رہی تھیں۔ کاریں اور ایک جیپ رکے بغیر آگے نکل گئیں البتہ پولیس کی دو جیپیں ٹیکسی کے قریب رک گئی تھیں۔

ایک پولیس والا ٹیکسی ڈرائیوروں سے بات کرنے لگا، دوسرے کا رخ ہماری کار کی طرف ہو گیا تھا۔ میرا ہاتھ جیب میں رینگا۔ انھیں قتل یا زخمی کیے بغیر بھاگنا ممکن نہیں تھا۔ ان کی تعداد دس تھی۔ اور مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ پستول میں کتنی گولیاں باقی بچی ہیں۔

سجاتا سرعت سے بولی۔ ''ہمیں باہر نکلے بغیر سیٹ بدلنا ہو گی۔''

سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں فوراً ڈیش بورڈ کو پکڑ کر دوسری طرف پہنچا اور وہ نیچے سے کھسک کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گئی۔ اس دوران ہمارے اجسام کا لمحے بھر کو اتصال ہوا تھا، لیکن حالات کی نزاکت دماغ پر قابض تھی۔ پولیس کے ردعمل پر کیا کرنا تھا اس بارے کچھ بہتر نہیں سوچ رہا تھا۔ امکان، غالب یہی تھا کہ میری ورزش کا دوسرا راؤنڈ شروع ہونے والا تھا۔ پولیس، را ایجنسی کے ساتھ مددگار بنی تھی اور یقیناً ہنگامہ شروع ہوتے ہی وہ انھیں فوراً سے پہلے مطلع کرتے۔

''تم دل کے مریض ہو اور ہم ایمبولینس کے لیے رکے ہوئے ہیں۔'' دوسری سیٹ پر منتقل ہوتے ہی ڈاکٹر سجاتا دھیمے مگر تیز لہجے میں بولی اور اپنی جانب کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔ اس کا باہر نکلنا میرے لیے نقصان دہ تھا۔ کیوں میں اسے یرغمال بنا کر بھاگ سکتا تھا۔ مجھ سے دور جا کر وہ با آسانی مجھے پکڑا سکتی تھی۔ ہماری مخبری پر اچھے خاصے انعام کا وعدہ انڈیا سرکار نے کر رکھا تھا۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ڈاکٹر سجاتا کے ردعمل سے پہلے حرکت کرنا مناسب نہ ہوتا۔

''بھگوان کا شکر ہے آپ آ گئے۔'' ڈاکٹر سجاتا وارفتگی سے کہتے ہوئے دو قدم بھر کر سپاہی کے قریب ہوئی۔ ''دیش کے محافظوں کو دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی ہے یہ آج پتا چلا..... ویسے میں 'سیون ہائیٹ ہسپتال' کی ڈاکٹر سجاتا کھرجی ہوں۔'' مسلسل بولتے ہوئے اس نے بے تکلفی سے مصافحے کو ہاتھ بڑھا دیا۔

اس کا لڑکی ہونا، ڈاکٹر ہونا، پولیس والے کی تعریف کرنا، اس کی آمد پر شکر گزاری کے کلمات ادا کرنا اور پھر اس سے مصافحہ کرنا یہ تمام ایسے تیر تھے کہ ایک بھی ہدف سے خطا نہیں گیا تھا۔ یہ نوازشات پولیس سپاہی کے دماغ میں پیوست ہو کر اس کی سوچ پر قابض ہو گئی تھیں۔ کار کا جائزہ لینا اسے بھول چکا تھا۔ وہ خوش دلی سے بولا۔

''خیریت ڈاکٹر صاحب آپ یہاں کیوں رکی ہیں۔''

ڈاکٹر سجاتا تفصیل بتاتے ہوئے بولی۔ ''میرے ساتھ ایک دل کا مریض ہے۔ اسے 'آشروا دہارٹ ہاسپٹل' پہنچانا ہے۔ ہسپتال سے نکلتے وقت جلدی کی خواہش میں ایمبولینس کا انتظار نہ کر پائی کہ وہ دوسرے مریض کو چھوڑنے گئی ہو گی

تھی۔اب راستے میں مریض کو زیادہ تکلیف ہونے لگی تو مجھے رکنا پڑا، کیوں کہ خصوصی ایمبولینس کے علاوہ اسے حرکت دینا مناسب نہ ہوگا۔اب ایمبولینس کو گھنٹی کر کے اس کا انتظار کر رہی تھی۔''

''ہمارے لائق کیا خدمت ہے۔'' شاید سپاہی اس کی مکمل سہائتا کیے بغیر نہیں لوٹنا چاہتا تھا۔

''میں بس ان ٹیکسی ڈرائیوروں سے ڈری ہوئی تھی۔آپ تو جانتے ہیں اکیلی لڑکی کے لیے یہ کتنے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔تبھی آپ کو دیکھ کر مسرت ہوئی۔امید ہے آپ یہاں گھنٹا ادھ ضرور رکیں گے۔''

''مہاراج کتنی تفتیش بقایا ہے۔'' یقیناً پولیس والے کے ساتھیوں کو جلدی تھی۔''ہم پریمی جوڑوں کو تنگ کرنے نہیں نکلے، یہ فضولیات بعد میں ہوتی رہیں گی۔فی الحال نکلنے کی کوشش کرو۔''

وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔''ڈاکٹر صاحب! معذرت، مگر ہمارے پاس رکنے کا وقت نہیں ہے۔کسی مجرم کا پیچھا کر رہے ہیں۔البتہ فکر نہ کرو میں ٹیکسی ڈرائیوروں کو تنبیہ کر کے جاؤں گا۔کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ شریف ڈاکٹر کو چھیڑ سکے۔''

''اپنا موبائل فون نمبر بتاتے جاؤ تاکہ میں ضرورت پڑنے پر گھنٹی کر سکوں۔'' سجاتا اپنے ڈرامے کو حقیقت کا روپ دینے پر تلی تھی۔

کرخت لہجے میں پکارا گیا۔''مکیش کے بچے، وقت ضائع نہ کرو۔''

''آ گیا سر۔'' اپنے سینئر کو کہہ کر وہ جلدی جلدی اپنا موبائل فون نمبر سجاتا کو لکھوانے لگا۔''کال کر کے اپنی خیریت سے آگاہ کرتی رہنا، کوئی پریشانی نہ ہو پھر بھی۔'' اپنے ساتھیوں کی طرف جاتے ہوئے بھی اس کی ہدایات جاری رہیں۔

اس کے جیپ میں بیٹھنے تک سجاتا وہیں کھڑی رہی۔اور پھر واپس کار میں آ گئی۔

میں تحسین آمیز لہجے میں بولا۔''آپ تو اچھی خاصی اداکارہ ہیں۔''

وہ خوش دلی سے بولی۔''ممبئی میں ہر لڑکی، پہلے اداکارہ اور پھر کسی اور شعبے سے تعلق رکھتی ہے۔ہیروئین بننے کا شوق بچپن ہی سے ہمارے دماغ میں کلبلانے لگتا ہے۔البتہ کامیابی خال ہی کسی کے نصیب میں لکھی ہوتی ہے۔''

میں متعجب ہوا۔''ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہو کر آپ ایک گھٹیا پیشے کو افضل جان رہی ہیں۔''

وہ حسرت سے بولی۔''کامیابی کی معراج، دولت، شہرت اور عزت سمجھی جاتی ہے۔جسے تینوں حاصل ہو جائیں اس کی خوش قسمتی و بلند بختی میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔اور ہماری فلم انڈسٹری کے ستاروں کے سر پر ان تینوں دیویوں کا سایہ ہے۔''

میں نے فضول موضوع سے جان چھڑائی کہ ایک غیر مسلم پر اسلامی تعلیمات ٹھونسنا اتنا بھی آسان نہیں ہوتا۔''آپ کو ڈھیر سارا دھنے واد کہہ کر مجھے جانا ہوگا۔''

وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔''اگر راستے میں دوبارہ پولیس سے ٹکراؤ ہو گیا پھر؟''

گو میں کہہ سکتا تھا کہ انڈیا میں گزشتہ چند ماہ سے مجھے پولیس، ایجنسیوں اور شکلا کے کتوں سے بچانے والی ڈاکٹر سجاتا نہیں تھی۔لیکن یہ بہت سخت الفاظ تھے اور کسی ایسے شخص کو جو خلوص دل سے میرے کام آ چکا ہو یہ کہنا سراسر زیادتی تھی۔میں نے اسے زبردستی بے آرام کیا تھا بلکہ خطرے میں ڈالا تھا۔اس کی وجہ سے پولیس والوں سے جان چھوٹی تھی۔ذرا سی تعریف یا حوصلہ افزائی سے میری عزت میں کمی نہ آتی۔

انکساری سے بولا۔''کوئی اور ڈاکٹر سجاتا مل جائے گی۔انڈیا میں کافی اصل ہیرو، ہیروئینوں سے واسطہ پڑ چکا ہے۔''

میری تعریف نے اسے خوش کرنے کے بجائے اداس کر دیا تھا۔''کاش میں سچ مچ کی ہیروئین ہوتی۔مگر حقیقت تو یہ

ہے کہ میری پاس خود پر فخر کرنے کو کوئی وجہ موجود نہیں ہے، البتہ.....'' گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور پھر بات بدلتے ہوئے پیش کش کی۔ ''کہاں جانا ہے۔ چاہو تو میں چھوڑ آتی ہوں۔''

''آپ کو زحمت ہوگی۔'' میں نے رسمی انکار مناسب سمجھا کہ پہلے ہی اس کا کافی وقت ضائع کر چکا تھا۔ ''اور ویسے بھی میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے کہ آپ مجھے جلدی سے چھوڑ کر لوٹ آئیں گی۔''

اس نے خیال ظاہر کیا۔ ''گویا آپ کا مقصد وقتی طور پر چھپنے کا ٹھکانہ ڈھونڈنا ہے۔''

''ایسا ہی ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ اعتماد سے بولی۔ ''چند دن کے لیے ٹھکانہ دے سکتی ہوں۔''

میں ششدر رہ گیا تھا۔ ''مگر آپ ایک ایسے شخص کو کیوں ٹھکانہ دیں گی جو انڈیا سرکار کا مجرم ہے۔ اور پکڑا گیا تو آپ کو جواب دہی مشکل ہو جائے گی۔''

وہ ہلکے سے طنز سے بولی۔ ''تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ کو پولیس سے بھی تو بچایا ہے۔ اور تب بھی پکڑی جاتی تو مشکل میں پھنس سکتی تھی۔''

اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے میں نے نادم لہجے میں کہا۔ ''میں آپ پر شک نہیں کر رہا۔''

وہ اعتماد سے بولی۔ ''شک کی کوئی وجہ بھی نہیں بنتی۔''

''گھر والوں سے کیا کہیں گی؟''

وہ اطمینان سے بولی۔ ''وہ میرا مسئلہ ہے۔''

میں ہنسا۔ ''مسئلہ تو خیر میرا ہے۔''

''میرے بڑے بھیا اپنی نئی نویلی دلھن کے ساتھ ہنی مون منانے شملہ گئے ہوئے ہیں۔ مہینے کے لیے گئے تھے اب تک انھیں دو ہفتے بھی نہیں ہوئے۔ گھر کو تالے لگے ہیں کیوں کہ میں اپنے فلیٹ میں رہتی ہوں۔''

میں رسمی تکلف سے بولا۔ ''آپ کا پہلا احسان بھی کافی بڑا ہے اور آپ مزید مقروض کرنے کے چکر میں ہیں۔''

''بس جب احسان چکانے کا موقع ملے تو قدم پیچھے نہ ہٹانا۔'' معنی خیز انداز میں کہتے ہوئے اس نے کار اسٹارٹ کی اور ریورس کر کے سڑک پر چڑھا دی۔ مجھے اچنبھا ہوا تھا لیکن مزید سوال سے گریز کرتے ہوئے میں لورا کو گھنٹی کرنے کو موبائل فون ٹٹولنے لگا۔ جو تین حصوں کی شکل میں جیب سے باہر نکلا۔ موبائل فون الگ، بیٹری الگ اور ڈھکن الگ۔ کرن چاولہ سے لڑتے وقت ہی اس کی یہ حالت ہوئی تھی۔ اور اس کے بعد مجھے موقع ہی نہیں مل سکا تھا کہ لورا کو گھنٹی کرنے کا سوچتا۔ اطمینان ہوتے ہی اس کا خیال آیا تھا۔

بیٹری جوڑ کر ڈھکن بند کیا اور بٹن دبانے سے موبائل فون کی اسکرین روشن ہو گئی۔ لورا کا نمبر ڈائل کر کے فون کان پر رکھ لیا۔ دو تین گھنٹیوں کے بعد اس کی محتاط ''ہیلو'' ابھری۔

میں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''کہاں ہو؟''

''بھاڑ میں۔'' وہ سخت تپی ہوئی تھی۔

میں اطمینان سے بولا۔ ''وہاں تمھیں مرنے کے بعد ٹھکانہ ملے گا فی الحال کہاں ہو۔''

وہ روہانسی ہوئی۔ ''کمینے آدمی، صبح سے جان سولی پر لٹکی ہے۔ کم از کم تسلی کا ایک پیغام ہی بھیج دیتے۔''

میں نے چھیڑا ''کیپٹن جھوٹ نہ بولو، آدھی رات تک تمھارے ساتھ تھا تو صبح سے کیسے جان سولی پر لٹک سکتی ہے۔''

وہ چیخی۔ ''بکواس بند کرو میں نے محاورتاً کہا ہے۔''

''میرے لیے پریشان ہونے والی دو گھر میں بیٹھی ہیں، تمھیں خون جلانے کی ضرورت نہیں۔''

وہ چڑ کر بولی۔ ''ٹھیک ہے تو انھی کو گھنٹی کرو، میرا دماغ کیوں خراب کر رہے ہو۔''

''تفصیلات سننے کے بعد بک بک کر لینا، فی الحال یہ بتاؤ محفوظ ٹھکانہ ملا یا نہیں۔''

وہ جلے کٹے لہجے میں بولی۔ ''تمھاری لاڈلی کو بے ہوشی کا ٹیکہ ٹھوک کر ایک ہسپتال کی پارکنگ میں بیٹھی ہوں۔ تمھیں کئی بار گھنٹی کی کوشش کی مگر نمبر بند جا رہا تھا۔ اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ تم نے کچھ بتایا بھی تو نہیں تھا۔''

میں طعنہ زن ہوا۔ ''سینئر تم ہو یا میں۔''

وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولی۔ ''ریجا! افغانستان میں تمھیں جتنی گالیاں بکیں تھیں ساری یاد ہیں۔ دہرانے پر مجبور نہ کرو۔''

میں کھل کھلا کر ہنسا۔ ''اچھا غصہ تھوکو اور پارکنگ سے باہر آؤ۔ میں تمھیں جگہ بتاتا ہوں۔'' اسے ہولڈ پر رکھ کر میں سجاتا کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ڈاکٹر صاحب! اپنی ساتھی کو کہاں بلاؤں؟''

''اسے کہو ہند نگر میں پہنچے۔''

''ہند نگر پہنچو۔''

وہ بے بسی سے بولی۔ ''مجھے سمتوں کا ادراک ہو رہا ہے نہ کسی کی بولی سمجھ میں آ رہی ہے۔ ڈرتی ہوں کسی کو انگریزی میں مخاطب کیا تو پہچانی نہ جاؤں۔''

میں نے پوچھا ''تم ہو کہاں؟''

اس نے ہسپتال کا نام بتایا۔ ''ڈی این اے ہسپتال۔'' جو میں نے ڈاکٹر سجاتا کو بتا دیا۔

سجاتا نے تفصیل سے سمجھایا۔ ''اسے کہو ہسپتال کی شمالی جانب موجود سڑک پر چڑھے اور مغرب کو مڑ جائے۔ یہ دہری سڑک آگے ویسٹرن ایکسپریس ہائی وے سے مل جائے گی۔ یہ ویسٹرن ہائی وے پر جنوب کی جانب مڑ جائے، راستے میں سائن بورڈ پڑھتی رہے تقریباً اڑھائی تین کلومیٹر آگے سڑک کے مغربی جانب ہند نگر آتا ہے۔ بلکہ 'او یو فلیگ شپ' ہوٹل کے قریب مغرب کو مڑ جائے۔ آگے ہند نگر کا علاقہ ہے۔''

میرے بتانے پر لورا تسلی سے بولی۔ ''ٹھیک ہے۔''

''وہاں پہنچتے ہی گھنٹی کرنا۔'' اسے ضروری ہدایت دے کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

سجاتا تحسین آمیز لہجے میں بولی۔ ''خاصے تعلیم یافتہ لگتے ہیں۔''

میں طعنہ زن ہوا۔ ''انگریزی بولنا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی علامت ہے تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔''

وہ وثوق سے بولی۔ ''ہمارے ہاں تو تعلیم یافتہ افراد ہی انگریزی بولتے ہیں۔ اور سچ کہوں تو جس روانی سے آپ بات کر رہے تھے شاید میں بھی نہ کر پاؤں۔''

میں منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے ہاں جو آدمی ویزا لگوا کر کسی یورپی ملک پہنچ جائے اور وہاں بے شک بیرا، خاکروب، باورچی یا ٹیکسی ڈرائیور وغیرہ بن کر معاش کمائے واپسی پر بہت اچھی انگریزی بولتا ہے۔''

وہ کھل کھلائی۔ ''تو آپ یورپ میں بیرا گیری کرتے رہے ہیں، ٹیکسی چلائی ہے یا شیف (باورچی) رہے ہیں۔''

میں نے وضاحت کی۔ ''میرے کہنے کا مقصد ہے انگریزی فقط ایک زبان ہے۔ اور اس کا اعلیٰ تعلیم اور ذہانت سے کوئی تعلق نہیں۔''

اس نے ہلکی سی خفگی ظاہر کی۔ ''اگر اپنے بارے کچھ نہیں بتانا چاہتے تو آپ کی مرضی۔''

اس کی کریدفوراً میری سوچ کو ممتا دیدی کی طرف لے گئی۔ وہ بھی مجھے ہمدرد بن کر ٹکرائی تھیں، اگر ایجنسی کی کار میں سچ مچ آلہ نشاندہی لگا تھا تو ڈاکٹر سجاتا کا مجھ سے ٹکرانا اتفاق کے بجائے سوچا سمجھا منصوبہ ہوسکتا تھا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اس کا سامنے آنا یہ لازم تو نہیں کرتا کہ میں اپنی کار چھوڑ کر اسے روکوں گا۔ اور پھر جن حالات میں میں کرن چاولہ سے جان چھڑا کر بھاگا تھا اس کے بعد ایسا سوچنا ہی حماقت تھی۔

مجھے خاموش پا کر اس نے بھی چپ سادھ لی تھی۔ لگا وہ خفا ہوگئی ہے، میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! میرے بارے آپ کا میڈیا بڑی تفصیل سے سب کچھ بتا چکا ہے۔ بلکہ روزانہ نئی سے نئی خبر چلا دیتا ہے۔''

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ ''تو آپ تسلیم کرتے ہیں کہ میڈیا درست کہہ رہا ہے تاکہ میں کار تھانے کی طرف موڑ سکوں۔''

میں سرعت سے بولا۔ ''آپ کی مہربانی۔'' وہ کھل کھلا دی تھی۔

مختلف سڑکوں سے گزرتے، موڑ کاٹتے ہم جب مطلوبہ کالونی میں پہنچے تو صبح کی اذان ہو رہی تھی۔ ساری رات ہنگامے کی نذر ہوگئی تھی۔ خوش قسمتی سے لورا ہم سے پہلے وہاں پہنچ گئی تھی۔ سجاتا سے رہنمائی لے کر میں نے اسے ایک مخصوص جگہ رکنے کو کہا تھا۔ قریب پہنچنے پر میں نے کار سے ہاتھ نکال کر لہرایا اور وہ ہمارے پیچھے چل پڑی۔

اس نے ایک چھوٹے مگر خوب صورت سے مکان کے سامنے کار روک دی۔ ڈیش بورڈ سے چابیوں کا گچھا نکال کر اس نے دروازہ کھولا اور لورا کو کار اندر لانے کا اشارہ کیا۔ گیراج میں صرف ایک کار کھڑی کرنے کی جگہ تھی۔

ڈاکٹر سجاتا میرے قریب آئی، چابیاں مجھے پکڑاتے ہوئے کہنے لگی۔ ''یہ تمام کمروں کی چابیاں ہیں۔ دروازہ اندر سے قفل کر دینا۔ کوشش کرنا کوئی آواز وغیرہ پیدا نہ ہو۔ دستک وغیرہ کے جواب میں بھی دروازہ نہ کھولنا۔ مجھے کوئی مسئلہ نہ ہوگا کیوں کہ میرے پاس چابیوں کا دوسرا سیٹ موجود ہے۔ اور اپنا موبائل فون نمبر بھی دے دیں تاکہ میں آتے وقت گھنٹی کر دیا کروں گی۔''

''آپ واپس جا رہی ہیں۔'' مجھے اس کا لوٹنا اچھا نہیں لگا تھا۔ گو اس کا رویہ دیکھ کر اعتبار نہ کرنے کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر بھی میرا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔

وہ اعتماد سے بولی۔ ''پانچ لاکھ اتنی بڑی رقم نہیں ہے کہ مجھے لبھا کر دھوکا دہی پر مائل سکے۔'' ہمارے متعلق اطلاع دینے پر پانچ لاکھ انعام کا وعدہ کیا گیا تھا۔

میں نے بات بنائی۔ ''نن..... نہیں، میرا مطلب تھا ہم اکیلے یہاں کیسے رہیں گے۔''

وہ صاف گوئی سے بولی۔ ''مجھے بھی آپ سے لالچ ہے۔ اتنی ستی ساوتری نہیں ہوں کہ ایک دہشت گرد کو نہ صرف پولیس سے بچانے کی تگ و دو کروں بلکہ اسے ٹھکانہ بھی مہیا کروں۔''

''مجھے نہیں لگتا آپ کے کسی آسکوں گا۔'' میں نے جھوٹے وعدے سے گریز کیا تھا۔

''میری کہانی سن کر انکار کریں گے تو اصرار نہیں کروں گی۔ باقی کھانے پکانے کی اشیاء گھر میں موجود ہیں، مزید کچھ ضرورت ہو تو گھنٹی کر لینا۔ اب اجازت دو، سہ پہر یا رات کو ملاقات ہوگی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ملاقاتی (وزٹنگ) کارڈ میری جانب بڑھا دیا تھا۔

کارڈ لے کر میں نے اسے اپنا موبائل نمبر لکھوایا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مزید تکرار کرنا مناسب نہیں لگا تھا۔ لورا کار کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔ داخلی دروازہ بند کر کے میں اس کے قریب ہوا۔ وہ بے صبری سے مستفسر ہوئی۔

''یہ کون تھی۔ اعتبار کے قابل ہے یا مزید آزمائش میں ڈالے گی۔''

میں الجھے ہوئے لہجے میں بولا ''ڈاکٹر سجاتا نام ہے، اتفاق سے ٹکرائی اور خود ہی ٹھکانے کی پیش کش کر دی۔''

لورا نے پوچھا۔ ''تمھیں جانتی ہے، میرا مطلب اسے معلوم ہے نا تم پولیس کو مطلوب ہو۔''

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس نے اندیشہ اگلا۔ ''تمھیں نہیں لگتا ہم اپنی گردن پھنسا رہے ہیں۔''

''اندر بیٹھ کر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔'' میں نے چابیوں کا گچھا اس کی جانب بڑھایا۔ ''دروازہ کھولو میں پرما کو اندر لاتا ہوں۔''

''اسے بانہوں میں بھرنے کے موقع کی تمھیں ہر وقت تلاش ہوتی ہے۔'' شرارتی انداز میں کہتے ہوئے اس نے چابیاں پکڑیں اور ڈگی کی چابی میری طرف بڑھا دی۔

میں جلے بھنے انداز میں بولا۔ ''یہ سعادت تمھیں مبارک، میں دروازہ کھول لیتا ہوں۔''

''یہ ہٹی کٹی بھینس مجھ سے کہاں اٹھے گی۔ اور پھر تمھاری بددعائیں سننے کا بھی حوصلہ نہیں ہے نا۔'' مجھے چڑاتے ہوئے وہ اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گئی۔

افسوس بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے میں نے ڈگی کھولی، پرما کا جسم کمبل میں لپٹا تھا۔ صرف چہرہ کمبل سے باہر تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ وہ موٹی بھینس ہرگز نہیں تھی۔ بلکہ اس کے مقابلے میں لورا زیادہ فربہ تھی۔ سچ کہوں تو جسمانی ساخت میں وہ میری پلوشے جیسی تھی۔ لیکن اس کا موہنا چہرہ اور جسمانی کشش میرے لیے بے معنی تھی۔

الحمدللہ مجھے اپنے جذبات پر قابو حاصل تھا۔ ورنہ جن حالات سے میں گزر رہا تھا کہ مختلف لڑکیوں سے اختلاط وجسمانی اتصال کے کثیر مواقع ملتے تھے۔ وہاں پھسلنے کے امکانات سیکڑوں تھے۔ لیکن میں نے کبھی آنکھوں یا ہاتھوں کو سستے پن کی اجازت نہیں دی تھی۔ بلاشبہ قعرِ مذلت میں گرنے کو کئی دلائل، برہان اور بہانے مل جاتے ہیں۔ پرما مشرقی لڑکی سہی، لورا تو یورپین تھی۔ ان کی تہذیب وثقافت میں گرل فرینڈ اور بوائے فرینڈ کو وہی درجہ حاصل ہے جو ہمارے ہاں میاں بیوی کا ہوتا ہے۔ اور خیر سے اب تو پاکیزہ، مقدس وعمدہ رشتا پاک وہند میں بھی شروع ہو گیا ہے۔ اونچے طبقے کے لبرل افراد کے ہاں گرل فرینڈ، بوائے فرینڈ کی اصطلاح اتنی عام بلکہ ضروری ہو چکی ہے کہ روزمرہ لگتی ہے۔ ٹک ٹاک، لائیگی جیسی حیاسوز وبے باک سائٹوں نے بڑے پیمانے پر اس بول وبراز کو اعلیٰ وارفع دوستی کا مقام عطا کیا ہوا ہے۔ اور ایسا ہی چلتا رہا تو جلد ہی وہ وقت آنے والا ہے جب نکاح نرا بوجھ اور فالتو کی ذمہ داری لگے گی۔ جب ایک اہم جسمانی ضرورت بغیر پابندیوں میں جکڑے پوری ہو رہی ہو تو کوئی بے وقوف ہے جو ہتھکڑیاں پہننے پر تیار ہوگا۔ اور جب مشرق میں اس بے حیائی کے فروغ کی اتنی کوشش کی جا رہی ہے تو مغرب میں کیا حال ہوگا۔ جہاں غیر مرد سے جسمانی تعلقات تب تک غلط وناجائز سمجھے جاتے ہیں جب کسی ایک فریق پر یہ فعل مسلط کیا گیا ہو۔ وہاں شادی سے پہلے ہی لڑکی کھلے عام بلکہ ببانگ دہل زن وشو کا وظیفہ ادا کر چکی ہوتی ہے۔ کنواری یا غیر شادی شدہ ماں کی اصطلاح انوکھی یا قابل حیرت نہیں ہے۔ ایسی تہذیب کی پروردہ لڑکی جو حسن وجمال میں بھی خاص مقام رکھتی ہو۔ اس کے ساتھ تنہائی میں رہتے ہوئے اگر میں اپنے کسی فعل پر نادم یا شرمندہ نہیں تھا تو اللہ پاک کا کرم ہی تھا۔

پرما کو کمبل سمیت اٹھا کر میں نے ڈگی قفل کی اور اندر کو بڑھ گیا۔ لورا ڈرائینگ روم کا قفل کھول کر اندر جا چکی تھی۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے وقت ڈرائینگ روم کی دائیں جانب باورچی خانہ پڑتا تھا۔ اس کے دروازے کے ساتھ ایک گول میز اور اس کے گرد چار کرسیاں دسترخواں کی ضرورت پوری کر رہی تھیں۔ ڈرائینگ روم اور کھانے کی میز کے درمیان خوب صورت پردہ لٹکا کر بٹوارا (پارٹیشن) کیا گیا تھا۔ سامنے خواب گاہ تھی۔ بائیں دیوار کے ساتھ سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ جن کے نیچے سٹور بنا ہوا تھا۔

لورا خواب گاہ میں تھی۔ میں پرما کو اٹھائے اس کے پیچھے پہنچا۔ مکان کی نسبت خواب گاہ کافی وسیع تھی۔ عقبی دیوار کے ساتھ جہازی حجم کا ڈبل بیڈ پڑا تھا۔ بیڈ شیٹ، تکیوں کے غلاف اور کمبل ہلکے بھورے رنگ کے تھے۔ داہنی دیوار پر شادی شدہ جوڑے کی بڑی سی تصویر لگی تھی۔ مرد کے خدوخال میں ڈاکٹر سجاتا کی شباہت جھلک رہی تھی۔ لڑکی گہرے سرخ رنگ کے لہنگے میں تھی۔ قیمتی زیورات سے لدی پھندی، سر پر چھوٹا سا تاج ٹکائے وہ مشرقی دلھن کی عکاسی کر رہی تھی۔ لورا تصویر کے آگے کھڑی مسلسل گھورے جا رہی تھی۔ خواب گاہ کے ایک کونے میں کمپیوٹر رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دیوار پر انٹرنیٹ کا روٹر نظر آ رہا تھا۔

میں نے پرما کو بیڈ پر لٹا کر کمبل صحیح طریقے سے اوڑھا دیا۔ بیڈ کے داہنی جانب تین نشستی صوفہ رکھا تھا۔ میں نے صوفے پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اچھی خاصی تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ کل دوپہر کے بعد سے آرام نصیب نہیں ہوا تھا۔ وشواس سنگھ سے ملنے جانا اور واپسی پر ہنگامے کی شروعات جو اذان فجر کے ساتھ اختتام پذیر ہو رہا تھا۔ وشواس سنگھ کے ہاں کھایا پر تکلف کھانا بھی کب کا ہضم ہو چکا تھا۔ سکون ملتے ہی نیند کی خواہش اور فریاد معدہ کی شنوائی کے علاوہ کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ مگر اس سے پہلے اپنے محفوظ ہونے کی یقین دہانی باقی تھی۔ ڈاکٹر سجاتا کا کردار عجیب اور انوکھا تھا۔ کہاں تو وہ کار میرے حوالے کر کے بھاگنے کو تیار تھی اور اب اپنے گھر لے آئی تھی۔ اسے ممتا دیدی کی طرح را کی ایجنٹ سمجھنا بھی کسی طرح نہیں جچ رہا تھا۔ ہمارے ٹھکانے تک را کیسے پہنچی یہ سوچ علیحدہ سر درد تھی۔ میرے خفیہ مددگار بہترین ساتھ دے رہے تھے۔ مگر بالمشافہ ملاقات سے گریز کر رہے تھے۔ ہمارے ٹھکانے تک را کا پہنچنا بھی حل طلب تھا۔ آیا وشواس سنگھ کی اب تک نگرانی ہو رہی تھی اور اس کی وجہ سے میں نظروں میں آ گیا تھا، لورا سے کوئی غلطی ہوئی تھی، ہمارے پڑوسی وغیرہ میں کسی کو شک ہوا اور اس نے مخبری کی یا اس کے علاوہ کوئی وجہ تھی۔ اس بارے میرے خفیہ مددگار ہی وضاحت کر سکتے تھے۔

لورا میری سوچوں میں مخل ہوئی۔ ''ریجا، تمھاری کھان بیوی اس سے بھی خوب صورت ہے۔'' میرے متوجہ ہونے پر اس نے ڈاکٹر سجاتا کی بھابی کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

میں ہنسا۔ ''اس کی طرح سج سنور کر تم بھی اس سے خوب صورت لگو گی۔''

اس نے نتیجہ گھڑا۔ ''تمھارے کہنے کا مطلب ہے تمھاری بیوی مجھ سے بھی خوب صورت ہے۔''

''بات خوب صورت ہونے کی نہیں، خوب صورت لگنے کی ہوتی ہے۔ پیار و محبت کی بنیاد خوب صورتی پر نہیں پسندیدگی پر قائم ہے۔ اگر خوب صورتی کو معیار مقرر کر دیا جائے تو ساری دنیا کا ایک ہی محبوب بن جائے گا۔ جو سب سے خوب صورت ہوگا۔''

میرے قریب نشست سنبھالتے ہوئے وہ کام کی بات پر آئی۔۔ ''کہیں ڈاکٹر سجاتا کا تعلق تمھارے خفیہ مددگاروں سے تو نہیں ہے۔''

میرے دماغ میں جھماکا ہوا، لگا لورا کا اندازہ درست ہے۔ مگر پھر خیال آیا کہ میرے مددگار کسی صورت میرے سامنے آنے کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔ ان کی بہتری مجھ سے دور رہنے میں تھی۔ میری انڈیا آمد مختصر وقت کے لیے تھی۔ انھوں نے مستقل وہیں رہنا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا میرے خفیہ دوست میرے کسی ہمدرد یا خیر خواہ کی منشا کے تابع ہوتے۔ وہ دھرمودا کے کارندے یا انصاری صاحب کے چاہنے والے بھی ہو سکتے تھے، جن کا مطمح نظر بس مجھ پر نظر رکھنا ہوتا کہ ضرورت پڑنے پر مدد کر سکیں۔ اور یہ مدد بھی مطلع کرنے اور خبر دینے تک محدود تھی ورنہ کرن چاولہ کے ساتھ جو سخت لڑائی ہوئی تھی اس میں کسی نہ کسی مددگار کو سامنے آنا چاہیے تھا۔

لمحے بھر کے توقف کے بعد میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''وہ مجھ سے کوئی کام لینا چاہتی ہے۔ جیسے سورج سنگھ رقم کی

خاطر ہماری مدد پر آمادہ ہوا تھا، یونہی ڈاکٹر سجاتا کو بھی کوئی غرض ہے۔''

وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔ ''یہ غرض، وہ رقم نہ ہو جو ہمیں پکڑوانے پر سرکار کی طرف سے انعام دینے کا اعلان کیا جا رہا ہے۔''

''راستے میں اس کی وجہ سے میں پولیس سے بچنے میں کامیاب ہوا ہوں۔''

اس نے اندیشہ اگلا۔ ''شاید ہم دونوں کی گرفتاری اس کا مطمح نظر ہو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایسا ہوتا تو اب تک بھائی لوگ پہنچ چکے ہوتے۔''

وہ الجھن امیز لہجے میں بولی۔ ''کیا کرنا چاہیے؟''

میں نے کہا۔ ''کچھ سجھائی نہ دے تو انتظار کرنا زیادہ بہتر رہتا ہے۔''

وہ پرما کو گھورتے ہوئے تلخی سے بولی۔ ''یہ مصیبت ساتھ نہ ہوتی تو خطرہ مول لینے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ ہم آسانی سے شکلا کے خلاف میدان میں اتر سکتے تھے۔''

میں نے برہمی ظاہر کی۔ ''اس مصیبت کو میرے پاس چھوڑ کر تم جہاں چاہے دفع ہو سکتی ہو۔''

اس نے ناک بھوں چڑھائی۔ ''یہ تمھیں اتنی عزیز ہے کہ اس کی خاطر مجھ سے جھگڑ پڑتے ہوئے۔''

''ٹھیک ہی کیا ہے۔'' میں نے اسے جھٹلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''اس میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ تم ہوش وخرد سے بیگانہ ہو چکے ہو۔'' وہ سچ مچ تپ گئی تھی۔

میں درشتی سے بولا۔ ''اس کی خاطر میں گھر بار اور وطن چھوڑ کر پچھلے چند ماہ سے پردیس میں دربدر ہو رہا ہوں، میرا ساتھی شہید ہو چکا ہے۔ را کے عقوبت خانے میں طرح طرح کے عذاب جھیل چکا ہوں۔ جبکہ اس کا حصول میرا مشن ہے۔ اس کی حفاظت میری ذمہ داری ہے۔ اسے پاکستان لے جانا میرا فخر ہے۔ البتہ اپنے بارے کہہ سکتی ہو کہ تم میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں جو اصل مشن کو پس پشت ڈال کر تمھارے اشاروں پر ناچتا رہوں۔''

وہ بپھرتے ہوئے بولی۔ ''تم جیسا گھٹیا شاید ہی نظر سے گزرا ہوگا جو ہر تکرار میں احسان جتلانے لگتا ہے۔ تم پر تھوکنا بھی گوارا نہ کرتی مگر افسوس مقامی بولی سے ناواقف ہوں۔''

''احسان نہیں جتاتا تمھاری حیثیت یاد دلاتا ہوں۔ خود غرض و مطلب پرست تم ہو میں نہیں۔ ایک ٹیم ہونے کے ناطے ہمارے پیش نظر تین مقاصد تھے۔ تمھارے لیے رقم حاصل کرنا، میرے لیے پرما کو اغواء کرنا اور ہم دونوں کے لیے شکلا کا قتل۔ اب اس معاہدے سے انحراف کون کر رہا ہے۔ کسے پرما کا وجود گراں گزر رہا ہے؟''

''اس کا حصول فقط شکلا پر دھونس جمانے کو کیا تھا۔ لیکن تم اس کے حسن پر مرمٹے اور جھوٹی کہانی گھڑ کر اسے ساتھ رکھنے پر بہ ضد ہو، کیوں کہ دو بیویوں پر بھی قناعت نہیں کر سکتے۔''

میں نے دانت پیسے۔ ''کیا زبردستی کسی لڑکی کو اپنایا جا سکتا ہے یا اس کی محبت حاصل کی جا سکتی ہے۔''

''تم جیسوں کی غرض محبت نہیں ہوس ہوتی ہے۔ اور اس کے لیے لڑکی کی رضامندی نہیں بے بسی درکار ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے جب ہم نے اسے اغواء کر لیا تھا تب تمھیں اپنا مشن یاد آیا۔ کیوں کہ اسے دیکھتے ہی تمھیں سب کچھ بھول گیا تھا۔ اگر اسے اغواء کرنا تمھارا مشن ہوتا تو یہ مشورہ مجھے دینے کی ضرورت نہ پڑتی۔''

اسے صفائیاں دینا وقت کا ضیاع تھا۔ میں کوفت بھرے لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک کہا، لیکن حیرانی اس پر ہے کہ مجھ جیسے کے ساتھ رہنے کی تمھیں کیوں ضرورت پیش آئی۔ تمھارا مشن پورا ہو چکا ہے اپنا رستہ ناپو۔''

''میرا مشن شکلا کو برباد کرنا ہے۔ اس نے مجھے جس عذاب میں مبتلا کیا اس کا نتیجہ اس کی نواسی کو بھگتنا پڑے گا۔ میں

پرما سے اس کا فخر و غرور ایسے چھینوں گی جیسے اس کے نانا نے میری عصمت چھینی۔ اور پھر اس کی تشہیر کر کے شکلا کو اس کی اوقات یاد دلاؤں گی۔''

میں ٹھنڈے دماغ سے بولا۔ ''اور پھر کیا ہوگا؟''

اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ ''واپس لوٹ جاؤں گی۔''

''ایک لڑکی، یقیناً دوسری لڑکی کی عصمت دری نہیں کر سکتی۔ اور میں ٹھہرا پرما کا عاشق تو اپنے منصوبے پر کیسے عمل کرو گی۔''

''انڈیا میں مردوں کی کمی نہیں ہے۔''

''پرما کے نانا نے تمہیں قتل تو نہیں کیا تھا ناں۔''

''میں بھی اسے زندہ چھوڑ دوں گی۔''

''ٹھیک ہے جو کرنا ہے کر لو۔ مگر مجھے یہ زندہ چاہیے۔ جب تمہارا بدلہ پورا ہو جائے تو اسے میرے لیے چھوڑ دینا۔ تمہارے پاس آج کا دن اور آنے والی رات ہے۔ اس کے بعد میں اسے یہاں سے لے جاؤں گا۔ اور براہ مہربانی آج کے بعد مجھے مخاطب کرنے کی ضرورت نہیں۔'' بے نیازی سے کہتے ہوئے میں نے نشست چھوڑی اور باہر نکل آیا۔ سخت بھوک محسوس ہو رہی تھی اور لورا سے فضول بحث کے بعد سر بھی درد کرنے لگا تھا۔ باورچی خانے میں گھس کر میں الماریاں کھنگالنے لگا۔ ضرورت کی قریباً تمام اشیاء پڑی تھیں۔ ڈیپ فریزر بھی مختلف اقسام کے جوسوں، بوتلوں اور ملک پیک کے ڈبوں سے بھرا تھا۔ چولھا جلا کر میں نے کیتلی میں چائے کا پانی رکھا اور پراٹ میں آٹا گوندنے لگا۔

آٹا گوندنے تک چائے تیار ہو چکی تھی۔

''جلدی کرو سخت بھوک لگی ہے۔'' لورا اندر آئی۔

میں خاموشی سے کام میں لگا رہا۔ کیتلی اتار کر چولھے پر توا رکھا اور پیڑا بنانے لگا۔ فوج کی نوکری نے ہر فن مولا کر دیا تھا۔

لورا نے چائے کی پیالی بھری اور وہیں ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

''خفا ہو۔'' ہلکی سی چسکی لیتے ہوئے وہ متبسم ہوئی۔

میں چپ رہا۔

وہ شرارتی انداز میں بولی۔ ''مجھے غصہ آ گیا تھا، کیوں تم اسے مجھ سے زیادہ توجہ دینے لگے ہو اور یہ میں برداشت نہیں کر سکتی، آخر تمہاری بیویوں کے بعد میں ہی سب سے زیادہ تمہارے قریب ہوں۔''

میں پیڑا بیلنے لگا۔

''اچھا سوری ناں، بس تمہیں تنگ کر رہی تھی۔'' پیالی رکھ کر اس نے میرے ہاتھ تھام لیے۔

ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے میں نے اسے پیچھے دھکا دیا اور روٹی اٹھا کر توے پر ڈال دی۔

مجھے لمحہ بھر گھور کر وہ پیچھے مڑی اور باہر نکل گئی۔

پانچ چھے پراٹھے بنا کر میں نے چائے گرم کی اور تھرماس میں ڈال کر باہر نکل آیا۔ لورا ڈرائینگ روم میں بیٹھی تھی۔ اسے نظر انداز کرتا ہوا میں خواب گاہ میں گھس گیا۔ پرما کی آنکھیں بند تھیں۔ پانی کے چھینٹے مار کر اسے ہوش میں لایا۔ ہتھکڑی میں بندھے ہاتھ اٹھا کر اس نے توبہ شکن انگڑائی لی، میں نے فوراً نظریں جھکا لیں۔

''ہماری گردن کیوں دبائی تھی۔'' اسے بے ہوش ہونا یاد تھا۔ اور حواسوں میں آتے ہی اس نے پہلا سوال یہی کیا

تھا۔

''وہاں چھاپہ پڑا تھا۔ جلدی میں بھاگنا پڑا۔ گردن نہ دباتا تو سر میں کچھ مار کر بے ہوش کرنا پڑتا اور مجھے پہلا طریقہ زیادہ موزوں لگا۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''ہمیں وہیں چھوڑ دیتے۔ کیا ساتھ لانا ضروری تھا۔''

اس کی ہتھکڑی کھولتے ہوئے میں اطمینان سے بولا۔ ''ضروری نہ ہوتا تو یقیناً فالتو بوجھ ساتھ پھرانے کا ہمیں قطعاً شوق نہیں ہے۔''

وہ مجھے تیکھی نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔ ''اور ہماری سزا کب پوری ہو رہی۔''

سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا اس لیے گول کر گیا۔ ''غسل خانہ سامنے ہے تازہ دم ہو جاؤ کہ ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے خواب گاہ میں نظر دوڑائی۔ ''نئی جگہ نظر آ رہی ہے۔'' اس نے پرتعیش خواب گاہ کو پسندیدگی سے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''سوچا قیدی کے شایانِ شان جگہ ڈھونڈنا چاہیے۔''

وہ استہزائی انداز میں ہنسی۔ ''ہماری خواب گاہ دیکھ لیتے تو ایسا کہنے کا حوصلہ نہ کر پاتے۔''

میں نے ڈانٹا۔ ''آپ کو دلھن یا مہمان بنا کر نہیں قیدی بنا کر لائے ہیں۔''

وہ بدتمیزی سے بولی۔ ''تم جیسے، ہمیں دلھن بنانے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے، کجا جاگتے میں ایسا سوچ سکیں۔''

پہلی بار اس نے یوں بدتمیزی سے بات کی تھی۔ مجھے برا تو لگا مگر برداشت کرنا پڑا۔ پہلے بھی وہ بہ ظاہر مہذبانہ انداز میں گفتگو کرتی تھی ورنہ اپنے اغواء کرنے والے شخص کو عزت دینا کسی طرح نہیں جچتا۔ میرے لیے بھی اس کی اہمیت انصاری صاحب کی لاڈلی ہونے کی وجہ سے تھی۔ ورنہ اس کا حسن و امارت مجھے متاثر کر سکتے تھے نہ شکلا کی طاقت و اختیار ڈرا سکتے تھے۔

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ غسل خانے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ میں نے شیشے کی خوب صورت میز بیڈ کے قریب رکھی اور اس پر ناشتا چن دیا۔

وہ تھوڑی دیر بعد برآمد ہوئی چہرہ دھو کر وہ تولیہ استعمال نہیں کرتی تھی۔ یقیناً چند دنوں کی قید سے اس کی نوابانہ عادات نہیں چھوٹ سکتی تھیں۔ آرمی آفیسر کی بیٹی ہونے کے ناتے شروع دن سے اسے کسی چیز کی کمی نہیں آئی تھی۔ اور اب تو اس کے سر پر شکلا کا سایہ تھا۔ حرام کی دولت سے اس نے اتنی آسائشیں اور سامانِ عیاشی اکٹھا کر رکھا تھا کہ اپنی دنیا ہی کو جنت بنا ڈالا تھا۔

پراٹھوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے چائے کی پیالی اٹھائی اور بیڈ ریسٹ سے ٹیک لگا کر ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگی۔

میں نرمی سے بولا۔ ''پراٹھا کھالو۔''

''تم نہیں جانتے ناشتے میں کیا لیتے ہیں۔'' اس کا لہجہ پہلے کی طرح بدتمیزی بھرا تھا۔

دل چاہا لورا کو بلا کر اس کی طبیعت صاف کرالوں، مگر پھر انصاری صاحب کا مشفق چہرہ میری نظروں کے سامنے نمودار ہوا۔ ان کی حسرت بھری آواز میری سماعتوں میں نوحہ بن کر گونجی۔ ''پر ملہوترا میری بیٹی ہے، میری ننھی شہزادی، جان سے پیاری پری ہے۔''

میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''جب تک انڈے، مکھن، پنیر، شہد اور ڈبل روٹی وغیرہ نہیں آجاتی بھوکی رہو گی یا خیالی پلاؤ بنانے کی ترکیب سیکھ لی ہے۔''

اس نے میرے سر پر بم پھوڑا۔ ''امید ہے جلد ہی گرینڈ پا ہمیں ڈھونڈ لیں گے تب ایک پاکی گھس بیٹھے کی کیا درگت بنتی ہے یہ اپنی آنکھوں سے ضرور دیکھیں گے۔'' شاید اسے لورا نے بتایا تھا کہ میں پاکستانی جاسوس ہوں۔ مگر پھر خیال آیا اس نے ٹی وی پر سنا ہوگا۔ گزشتہ کل میں وشواس سنگھ کو ملنے گیا تھا تب شاید لورا کے چینل وغیرہ تبدیل کرتے وقت اس کی نظر پڑی تھی۔ بے چاری کے پلے اردو یا ہندی نہیں پڑتی تھی تو انڈین خبریں کیسے سنتی۔

''شاید انگریزی چینل لگایا ہو۔'' ایک اور خیال میرے دماغ میں پیدا ہوا۔ پاکستان اور انڈیا میں انگریزی میں بھی خبریں پیش کرنے کا رواج ہے۔ غلامی سے آزاد ہوئے پون صدی ہونے کو ہے لیکن انگریزی زبان کی غلامی سے ہم جان نہیں چھڑا سکے۔ بلکہ اب تو انگریزی اردو، ہندی اور دوسری مقامی زبانوں کو یوں نگلتی جا رہی ہے جیسے اژدھا اپنے شکار کو زندہ نگلتا ہے۔ اردو کی ترویج و ترقی کی خاطر اٹھنے والی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز محسوس ہوتی ہے۔ صاحبانِ اقتدار، میڈیا، عدالتیں، سرکاری دفاتر الغرض تشہیر و ترقی کا ہر زینہ انگریزی کے قبضے میں ہے۔ جب اردو کو قومی و دفتری زبان قرار دینے کا فیصلہ ہی انگریزی میں لکھا گیا ہے تو اس سے بڑھ کر اردو کی خدمت سے کیا کھلواڑ ہوگا۔ اور اس لحاظ سے ہندوستانی ہم سے بھی کئی قدم آگے ہیں۔

مجھے سوچتا دیکھ کر وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''تمھیں کیا لگا ہم ایک مسلے کو نہیں پہچان پائیں گے۔''

میں اچنبھے سے بولا۔ ''میرے پاکستانی یا انڈین ہونے سے تمھیں کیا فرق پڑتا ہے۔''

وہ زہر خند ہوئی۔ ''بھارت ماتا کا سپوت اتنا گھٹیا، بزدل و بے غیرت نہیں ہو سکتا کہ مظلوم لڑکی کو حبس بے جا میں رکھ کر ظلم ڈھائے۔'' آگے جھک کر اس نے خالی پیالی میز پر رکھ دی تھی۔

میں ترکی بہ ترکی بولا۔ ''بھارت ماتا کے سپوت کیا کچھ کر سکتے ہیں اس کے لیے کبھی کشمیر جا کر وہاں کی عورتوں کے دکھڑے سن لو، امید ہے افاقہ ہوگا۔''

''ہونہہ!'' اس نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔ ''تم کہو گے اور ہم مان لیں گے۔''

شاید میرا دن ہی برا تھا کہ لورا کے بعد پرما کی بھی ہرزہ سرائی سننا پڑ رہی تھی۔ گو لورا کی بکواس میرے نزدیک کسی اہمیت کی حامل نہیں تھی لیکن پرما کی بدگمانی اور نفرت خاصی دشواری لانے والی تھی۔ میں نے اس کا دل انصاری صاحب کی طرف سے صاف کرنا تھا یہاں میں ہی بے اعتبار و قابلِ نفرت ہو گیا تھا۔

''اور چائے ڈالوں؟'' مجھے اس کے علاوہ کچھ نہ سوجھا تھا۔

میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ دلیری سے بولی۔ ''اور اب تم سے ڈر نہیں لگتا، جو کر سکتے ہو کر لو۔''

''شاید سمجھتی ہو کہ پاکستانی فوجی کسی لڑکی کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔''

وہ نفرت سے بولی۔ ''نہیں بلکہ گھٹیا دشمن سے رحم کی بھیک مانگنا ہمیں نہیں سکھایا گیا۔'' بلاشبہ شکلا کے زیرِ سایہ پرورش پانے والی کے دل میں پاک فوج کے بارے ایسی نفرت کا ہونا حیران کن نہیں تھا۔

اس دوران میں تین پراٹھے ہڑپ گیا تھا۔ بقیہ پراٹھے اور چائے کا تھرماس اٹھا کر میں باہر نکلا، لورا ڈرائینگ روم کے صوفے پر لیٹی تھی۔ ناشتے کے برتن میز پر رکھ کر میں خاموشی سے مڑ گیا۔ خواب گاہ کی عقبی کھڑکی جدید طرز کی بنی تھی۔ جس میں مکمل شیشے کا استعمال ہوا تھا۔ اور وہاں سے بھاگنا آسان تھا۔ اس لیے پرما کو کھلا چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

میں نے ہتھکڑی اٹھا کر اس کے ہاتھ پشت کی طرف جکڑے، کیوں کہ سامنے سے ہتھکڑی لگاتا تو وہ پھر بھی شیشہ کھول لیتی۔

وہ نفرت سے بولی۔ ''تم جیسے ڈرپوک، فقط کمزور لڑکی ہی کو دلیری دکھا سکتے ہیں۔''

گو میری بہادری و دلیری وہ اس وقت دیکھ چکی تھی جب میں نے اس کی عزت بچائی تھی۔ لیکن اسے یہ باور کرا کے مجھے کیا ملتا۔ کسی کی نفرت کو بحث و تکرار سے کم نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں قدرے برہمی سے بولا۔ ''میری دلیری و بہادری کو چھوڑو، البتہ اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ تاکہ کسی بری صورت حال کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے۔''

وہ حقارت سے بولی۔ ''ہمیں تم سے نفرت ہے، کیوں کہ تم ہو ہی اس قابل؛ احمق، بے ہودہ، واہیات، گھٹیا، ذلیل اور سخت قسم کے برے شخص ہو۔''

میں بے پروائی سے بولا۔ ''سوچا تھا کچھ نیا بتاؤ گی۔''

''نیا یہ ہے کہ جونہی گریڈ پا ہمیں ڈھونڈ لیں گے، تمھارے سر میں گولی ہم ہی اتاریں گے۔''

میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''سوچ لو ابھی میرے قبضے میں ہو۔''

وہ بپھر گئی۔ ''تم ہمارا کیا بگاڑ لو گے۔''

یقیناً میں اس کے دل میں اپنی عزت پیدا نہیں کر سکتا تھا، لیکن اس کی زبان کو تمیز سے گفتگو کرنا ضرور سکھا سکتا تھا۔

میں نے استہزائی لہجے میں پوچھا۔ ''کیا واقعی ایسا ہی ہے جیسا آپ کہہ رہی ہیں؟'' اس کی بدتمیزی کے باوجود میں احترام ہی سے مخاطب کر رہا تھا۔

''شک ہے کیا۔'' اس نے بہ ظاہر اعتماد سے کہا مگر لہجے کا کھوکھلا پن واضح تھا۔

''ٹھیک ہے، اگر آپ کی نظر میں اتنا گندا، گھٹیا اور اوباش ہوں تو اچھا بننے کی اداکاری کی کیا ضرورت ہے۔'' میں نے آگے بڑھ کر دروازہ قفل کیا، اپنا کوٹ اتار کر صوفے پر پھینکا اور قمیص کے بٹن کھولنے لگا۔

وہ گڑبڑاتے ہوئے ہکلائی۔ ''دد..... دروازہ کیوں قفل کیا..... کک..... کیا کرنا چاہتے ہیں آپ؟؟؟'' تم، تمھارا کہنا اسے فوراً بھول گیا تھا۔

''بچی نہیں ہو، آپ کو اندازہ ہونا چاہیے میں کیا کرنے والا ہوں۔'' اطمینان بھرے انداز میں کہتے ہوئے میں نے قمیص بھی اتار دی تھی۔ اب بالائی بدن پر صرف بنیان رہ گئی تھی۔

''آ..... آپ..... ایسا نہیں کر سکتے۔ آپ نے وعدہ کیا تھا ہماری عزت و جان محفوظ رہے گی۔ آپ تو مسلمان ہیں ناں اور مسلمان وعدہ خلافی تو نہیں کرتے۔'' مجھے جارحانہ موڈ میں دیکھتے ہی اس کی تیزی طراری ہوا ہو گئی تھی۔ چند منٹ پہلے اکڑ خانی دکھانے والی منتوں، ترلوں پر آ گئی تھی۔ اب ایک دم مسلمان کی وعدہ ایفائی بھی اسے یاد آ گئی تھی۔ بلاشبہ کسی بھی شریف لڑکی کے لیے سب سے بڑی دھمکی یہی ہو سکتی تھی۔ شاید مار پیٹ اور تشدد وہ برداشت کر لیتی، مگر عزت گنوانا اتنا آسان نہیں ہے۔

''میرے وعدے کی اہمیت تب ہوتی جب آپ کے نزدیک میری کوئی اہمیت ہوتی۔'' سکون سے کہتے ہوئے میں بیڈ کی طرف بڑھا۔

وہ جلدی سے دوسری جانب اتر کر گلوگیر ہوئی۔ ''پلیز معاف کر دیں۔ ہم تو بس اپنی حد جانچ رہے تھے، کہ آپ کہاں تک ہماری باتوں کو برداشت کر سکتے ہیں۔ شاید غلطی ہو گئی۔ آئندہ آپ کو موقع نہیں دیں گے۔'' شوخ آنکھوں

میں نمی بھر گئی تھی۔ اگر ہاتھ پشت پر نہ بندھے ہوتے تو اس نے جوڑ لینے تھے۔

انصاری صاحب کے ناتے بلاشبہ وہ میرے لیے بہت اہم تھی۔ ویسے بھی دیکھا جائے تو وہ مظلوم اور میں ظالم کے روپ میں تھا۔ ایک معصوم اور بے بس حوا زادی کو دھمکانے اور رعب میں رکھنے کا میں کبھی قائل نہیں رہا۔ مگر اس کی زبان کی گرہ کچھ زیادہ ہی ڈھیلی پڑ گئی تھی اس وجہ سے چھوٹا سا ناٹک کرنا پڑ گیا تھا۔ ورنہ حقیقت تو یہی تھی کہ میں اسے خراش لگنے بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اور بہ ظاہر میں ظالم سہی مگر اصل میں اس کا سچا خیر خواہ تھا۔ اسے معلوم ہی نہ تھا کتنی بڑی غلط فہمی میں مبتلا تھی۔

گہرا سانس لے کر میں نے مصنوعی برہمی پر قابو پانے کا عندیہ دیا۔ اس کی نم آنکھوں اور لرزتے ہونٹوں کو دیکھتے ہوئے میرا دل ہمدردی سے بھر گیا تھا۔ لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے میں بولا۔

"بے شک عزت دل میں ہوتی ہے۔ اور میں چاہتا بھی نہیں ہوں آپ کے نزدیک معزز و مکرم ٹھہروں۔ لیکن ظاہری گفتگو میں سنبھل کر بولنا مفید رہتا ہے۔ اچھی طرح جانتی ہو اس قید میں آپ کا تھوڑا بہت خیر خواہ صرف میں ہوں۔ کیپٹن لورا براؤن میری بہترین دوست ہے مگر آپ کی وجہ سے خفا ہے۔ وہ اپنی توہین کا بدلہ ویسے ہی لینا چاہتی ہے جیسے اس پر بیتی، ہدف آپ ہیں۔ اور اس کے راستے کی دیوار فقط میں ہوں۔"

وہ ہکلائی۔ "آ.....آپ بہت اچھے ہیں۔"

میں صاف گوئی سے بولا۔ "آپ کی اس بات میں اتنی ہی سچائی ہے جتنی نہیں بھاگوں گی کے وعدے میں تھی۔"

وہ سر جھکاتے ہوئے منمنائی۔ "آپ کو دوبارہ موقع نہیں دیں گے۔"

"یہی مناسب ہوگا۔" میں نے قمیص اور کوٹ پہن لیا تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان نمودار ہوا اور وہ دوبارہ بیٹھ گئی۔

وہ کمرہ اس کے لیے مناسب نہیں تھا۔ میں کسی ایسے کمرے کی تلاش میں باہر نکلا جس میں کھڑکی موجود نہ ہوتی۔ یوں اسے ہتھکڑی لگانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ کیوں کہ میں نے محسوس کیا تھا اسے ہتھکڑی میں سخت الجھن ہوتی تھی۔ بلکہ ہتھکڑی تو ایسی آفت کا نام ہے کہ عادی مجرم بھی اس سے تنگ پڑ جاتے ہیں وہ بے چاری تو نرم نازک لڑکی تھی۔ ایسی کلائیاں گجروں کے لیے بنی ہوتی ہیں نہ کہ ہتھکڑی کے لیے۔

میں دروازہ کھول کر باہر نکلا، لورا براؤن ناشتے کو جڑی تھی۔ مجھ پر سرسری نظر ڈال کر وہ بے نیازی سے چائے کی پیالی کی طرف متوجہ ہوگئی۔ میں بھی اسے نظر انداز کر کے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

دوسری منزل پر آمنے سامنے دو خواب گاہیں بنی تھیں۔ ان کے درمیان ہال نما جگہ بن رہی تھی جسے ڈرائینگ روم کی شکل دی گئی تھی۔ انگریزی حرف یو کی شکل میں تین صوفہ سیٹ پڑے تھے، ان کے سامنے شیشے کی خوب صورت میزیں سجی تھیں۔ صوفوں کے پہلوؤں میں نازک تپائیاں رکھی گئی تھیں، سامنے کی دیوار پر بڑی اسکرین کی ایل ای ڈی لگی تھی۔ فرش پر سلیٹی رنگ کا عمدہ قالین بچھا تھا۔ عقبی دیوار میں شیشے کی بڑی کھڑکی تھی۔ کھڑکی پر دبیز پردے لٹکے تھے اور دائیں بائیں گملا سٹینڈر رکھے ہوئے تھے۔ گملوں میں گہرے سبز رنگ کے ہاتھ بھر اونچے پودے لگے تھے۔ جن کا نام بہ ہر حال میں بالکل نہیں جانتا۔

وہاں چھت پر جانے کو سیڑھیاں موجود تھیں۔ سیڑھیوں پر رہتے ہوئے میں نے چھت کا جائزہ لیا۔ اور واپس دوسری منزل پر آ گیا۔

خواب گاہوں میں کوئی کھڑکی موجود نہ تھی۔ دونوں میں ایک سنگل بیڈ، دو فوم والی کرسیاں رکھی تھیں۔ کمرے کے فرش پر قالین بھی بچھے تھے۔ غسل خانہ بھی منسلک تھا۔ بلاشبہ پرما کو قید رکھنے کو دونوں کمرے بہترین تھے۔

میں نیچے پہنچا، لورا نے بیڈ سنبھال لیا تھا۔ پرما خفیف سی صوفے پر بیٹھی تھی۔ یقیناً لورا نے اسے ڈانٹ پلائی تھی۔

میں نے پرما کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''چلو میرے ساتھ۔''

''کک..... کہاں؟'' نظریں چراتے ہوئے وہ ہکلائی۔

میں نرمی سے بولا۔ ''اپنی خواب گاہ میں۔''

وہ سر جھکائے میرے ساتھ چل پڑی۔ خواب گاہ میں لے جا کر اس کی ہتھکڑی کھولی۔ ''یہاں آرام کرو۔ میں باہر لیٹا ہوں، کچھ ضرورت پڑے تو دروازہ کھٹکھٹا دینا۔''

وہ دھیرے سے بولی۔ ''نئے کپڑے اور گرم پانی چاہیے ہوگا۔ نجانے کتنے دن ہو گئے ہمیں نہائے ہوئے، اب تو بدن سے بو آنے لگی ہے۔''

''غسل خانے میں گیزر لگا ہے آن کر لو، تھوڑی دیر میں پانی گرم ہو جائے گا۔ میں کپڑے لاتا ہوں۔'' دروازہ باہر سے بند کر کے میں نیچے آ گیا۔

لورا اطمینان سے سو گئی تھی۔ غسل خانے کے سامنے ڈریسنگ روم بنا تھا۔ جس کی مکمل دیوار تین الماریوں پر مشتمل تھی۔ الماریوں کے نیچے جوتوں کے ریک تھے۔ دو الماریاں زنانہ لباس اور ایک مردانہ کپڑوں سے بھری ہوئی تھی۔ زنانہ لباسوں میں ساڑھیاں، تھری پیس سوٹ، زنانہ جینز، پاجامے، شلوار سوٹ۔ اور نجانے کیا کیا اقسام موجود تھیں۔

پرما پہلی مرتبہ اسکرٹ میں نظر آئی تھی۔ اور دوسری مرتبہ اسے اغواء کرتے دیکھ پایا جب وہ جینز میں تھی۔ اندازہ یہی تھا کہ اسے مغربی لباس پسند تھا۔ مگر میں نے اس کے لیے شلوار قمیص پسند کی تھی کیوں کہ یہ ایسا لباس ہے جس میں ناپ کی کافی گنجائش نکل آتی ہے۔ جبکہ مغربی لباس میں ایسی گنجائش نہیں ملتی۔ اس میں درست پیمائش زیادہ ضروری خیال کی جاتی ہے۔

''اتنا بے ہودہ رنگ ہم نے کبھی نہیں پہنا۔'' بینگنی رنگ کے کپڑے دیکھتے ہی اس نے ناک بھوں چڑھائی تھی۔

''تحفہ نہیں دے رہا ضرورت پوری کر رہا ہوں۔ اور آپ بھی قیدی ہیں دعوت میں نہیں جا رہیں۔'' لباس بیڈ پر پھینک کر میں باہر نکلنے کو مڑا۔

وہ سرعت سے بولی۔ ''دو تین جوڑے کپڑے لے دینے سے آپ غریب نہیں ہوں جائیں گے۔ اور فکر نہ کریں، جتنا ہم پر خرچ کرو گے، گرینڈ پا سے ملتے ہی سارا سود سمیت لوٹا دیں گے۔ باقی یہ کپڑے کسی کے استعمال شدہ لگتے ہیں۔ ہم کسی اور کے کپڑے نہیں پہن سکتے۔'' اس نے کپڑے کرسی پر پھینک دیے تھے۔

میں نرمی سے بولا۔ ''پھر انتظار کرو۔''

''تولیہ بھی منگوا لینا۔ اور کچھ کھانے لائق بھی۔'' اس نے بے تکلفی سے فرمائش کی۔ میں جواب دیے بغیر باہر نکل آیا۔

دروازہ باہر سے بند کر کے میں کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر باہر کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں سے داخلی دروازے اور سامنے کی گلی پر نظر رکھی جا سکتی تھی۔ جب تک ڈاکٹر سجاتا کی طرف سے اطمینان حاصل نہ ہو جاتا مجھے چین نہیں آ سکتا تھا۔ تھکن کے باوجود میں لورا کے اٹھنے سے پہلے سو نہیں سکتا تھا۔

تھوڑی دیر کھڑکی کے سامنے گزار کر میں چھت پر چڑھ گیا۔ مگر کھلے عام پھرنا مناسب نہیں تھا اس لیے سڑھیوں کے ساتھ پانی کی ٹینکی کی آڑ لے کر دائیں بائیں کا جائزہ لیا۔ فرار ہونے کے مناسب رستے کا تعین کیا اور دوسری منزل پر اتر آیا۔ وہ ڈرائینگ روم پرما کی نگرانی کے لیے بہترین تھا۔

میں ٹی وی لگا کر خبریں دیکھنے لگا۔ گزشتہ رات کے ہنگامے کے بارے کوئی واضح خبر نہیں چلی تھی۔ بس پولیس کا

شہریوں کو تنگ کرنے کا ذکر ہو رہا تھا۔ یقیناً ہمیں ڈھونڈنے کو پولیس جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی، گاڑیوں کی تلاشی لے رہی تھی، پیدل چلنے سے باز پرس کر رہی تھی۔ اور پولیس کی ایسی کارروائیاں بلاشبہ عوام کے لیے مفید ہوتی ہیں، کیوں کہ اسی طرح ہی دہشت گردی اور دوسرے غیر قانونی دھندوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ لیکن پولیس کی یہ چوکسی اور ایمانداری نہ پاکستان کے عوام کو راس آتی ہے نہ ہمارے پڑوسی اس سرگرمی کو پسند کرتے ہیں۔

پونے بارہ بجے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ ڈاکٹر سجاتا کی کال تھی۔ ہیلو ہائے کے بعد پوچھنے لگی۔

''کوئی چیز چاہیے ہو تو آپ کی طرف ہی آ رہی ہوں۔''

میں بے تکلفی سے بولا۔ ''کافی سامان چاہیے۔'' اور پھر اسے ناشتے کے ضروری سامان کے علاوہ پرما کے لیے دو سوٹ اور تولیہ لانے کا بتا دیا۔ کپڑوں کے ناپ کے بارے استفسار پر اعتماد سے اپنی جانِ حیات پلوشے کا ناپ بتا دیا تھا۔

ڈاکٹر سجاتا دو بجے کے قریب وہاں پہنچی تھی۔ میں نے داخلی دروازہ کھولا۔ وہ کار اندر لے آئی۔ گیراج میں تو جگہ نہیں تھی اس نے کار مختصر سے صحن ہی میں پارک کر دی۔

عقبی نشست سامان سے بھری ہوئی تھی۔ سامان اندر منتقل کر کے ہم نچلے ڈرائینگ روم میں بیٹھ گئے۔ اب تک میں نے اسے پرما کے بارے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اور چونکہ خبروں میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا تھا اس لیے ڈاکٹر سجاتا خود سے بھی اس کے بارے کچھ نہیں جانتی تھی۔

''جگہ پسند آئی۔'' رسمی کلمات کی ادائی کے بعد اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''آپ کے رویے نے الجھایا ہوا ہے، ورنہ جگہ بہت عمدہ ہے۔''

اس کے چہرے کی رونق ماند ہوئی۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے اس نے چپ سادھ لی تھی۔ تب وہ کافی دکھی دکھائی دے رہی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب! یاد رہے پولیس اور ایجنسیاں مسلسل ہماری تلاش میں ہیں۔ اور معلوم نہیں کس وقت ہم تک پہنچ جائیں۔ ایسے حالات میں اندھا دھند بھاگنا ہماری مجبوری بن جاتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ کسی مناسب موقع کے انتظار کے بجائے جو کچھ کہنا ہے اگل دو۔ ہاں یا ناں کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔''

''آپ کی ساتھی سوئی ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں، اگر جاگ رہی ہوتی تب بھی پروا نہیں تھی کہ بے چاری ہندی سے بالکل نابلد ہے۔''

وہ مستفسر ہوئی۔ ''کیا میرا کام کرنے کو اس کی اجازت کی ضرورت پڑے گی؟''

میں نے اسے تسلی دی۔ ''اس کا انحصار آپ کے کام پر ہے۔ اگر اکیلا میزے کرنے کا ہے تو اسے بتانے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئے گی، ورنہ بے فکر رہو وہ میرے ساتھ ہے۔''

وہ الجھن آمیز لہجے میں بولی۔ ''مجھے نہیں پتا آپ اکیلا کریں گے یا دونوں کی ضرورت پڑے گی۔''

''آپ یہ سر درد میرے لیے رہنے دیں اور کام بتائیں۔''

لمحہ بھر سوچ کر وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''سیون ہائیٹ ہسپتال کا ایک سینئر ڈاکٹر مجھے بلیک میل کر رہا ہے۔ اس کے پاس میری ایسی وڈیو ہے جو یوٹیوب پر چڑھا دی تو میرے پاس آتما ہتھیا (خودکشی) کے علاوہ کوئی چناؤ نہیں بچے گا۔''

میں نے دل ہی دل میں اپنے پاس موجود پیسوں کا حساب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کتنی رقم کا تقاضا کر رہا ہے۔''

وہ سرخ ہوتے ہوئے بولی۔ ''اسے رقم نہیں چاہیے۔''

میں نے اس کے محجوب چہرے سے نظریں ہٹائیں اور صوفے کی پشت پر سر ٹیکتے ہوئے پوچھا۔ ''کہیں اس کا مطالبہ مان تو نہیں لیا۔''

وہ شرم، غصے اور دکھ بھرے لہجے میں کراہی۔ ''گزشتہ دو اتوار کی راتیں اذیت سہہ چکی ہوں۔''

میں شاکی ہوا۔ ''اس کا مطالبہ پورا کرنے کے بعد باقی کیا بچا۔''

''اب وہ زور دے رہا ہے مجھے اس کے دوستوں کو راضی کرنا پڑے گا۔ اور درحقیقت وہ اس کے دوست نہیں گاہک ہیں۔ جن سے بھاری معاوضا لے کر مجھے پیش کرے گا۔ میرے علاوہ بھی چند لیڈی ڈاکٹر اس کے چنگل میں پھنسی ہیں۔ جو کوشش کے باوجود جان نہیں چھڑا پا رہیں۔ ایک بار اس کے ہتھے چڑھ جانے والی اس دلدل سے نکلنے کی کوشش میں مزید دھنستی چلی جاتی ہے۔ پہلے اس کے پاس میرا ایک وڈیو کلپ تھا۔ اب دو تین فلمیں بنا چکا ہے۔''

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''آپ پھنسیں کیسے۔''

وہ رکھے لہجے میں گویا ہوئی۔ ''ڈاکٹر آدیتی ورما کافی عرصے سے اس کے چنگل میں پھنسی تھی۔ اس بے غیرت نے آدیتی سے وعدہ کیا کہ اگر مجھے ورغلا کر اس کے چنگل میں پھنسا دے تو آدیتی کی جان چھوڑ دے گا۔ آدیتی لالچ میں آ گئی۔ مجھ سے تعلقات بڑھائے، دوستی و بے تکلفی پیدا کی۔ یہاں تک کہ دو تین ہفتوں میں ہماری گاڑھی چھننے لگی تھی۔ پھر ایک رات اپنے ہاں تقریب میں بلا لیا۔ دوستی نبھانے کو مجھے جانا پڑا۔ کیا خبر تھی کہ اپنی گردن میں پھندہ ڈال رہی ہوں۔ تقریب میں اس کی گنی چنی سہیلیاں اور چند دوست ہی آئے تھے۔ دوسروں کی ہمراہی میں میں نے بھی دو تین جام چڑھا لیے۔ اس سے بے خبر کہ آدیتی میری شراب میں جذبات کو برانگیختہ کرنے والی دوائی کی اچھی خاصی مقدار شامل کر چکی تھی۔ جونہی میں بہکنے لگی آدیتی مجھے کھینچ کر اپنی خواب گاہ میں لے گئی۔ مجھے اپنے افعال پر قابو نہیں رہا تھا۔ خواب گاہ میں بند کر کے پہلے تو وہ خود میرے جذبات کو مزید ابھارتی رہی، جونہی میں ہوش و خرد سے بے گانہ ہوئی اس نے اپنے خصوصی ملازم کو گھنٹی کر کے وہیں بلا لیا۔ اور تب تک میں فائدے نقصان کے احساس سے کوسوں دور جا چکی تھی۔ تب میری طلب میں ذلت و غلاظت کے علاوہ کچھ شامل نہ تھا۔ جب حواسوں میں آئی تو لٹ چکی تھی۔ لیکن افسوس کرنے اور پشیمان ہونے سے میری عصمت یا فخر واپس نہیں آ سکتا تھا۔ رو دھو کر گھر آ گئی۔ دو دن نوکری پر بھی نہیں جا سکی تھی۔ اور جس دن کام پر لوٹی تب پتا چلا کہ میرے پاؤں کے نیچے زمین نہیں رہی تھی۔ ڈاکٹر دیوا شش کمار کے مطالبے سے بچنے کا ایک ہی رستہ بچا تھا اور وہ تھا آتما ہتھیا کرنا۔ کوشش تو کی مگر زندگی کی محبت غالب رہی۔ سوچا جب ایک بار برباد ہو چکی ہوں تو دوسری بار کڑوا گھونٹ پینے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ پہلے لاعلمی وجہ بنی دوسری بار بے بسی۔ مگر یہ میری بھول تھی کہ دیوا شش جیسے درندے کے چنگل سے جان چھڑانا ممکن ہوتا ہے۔'' اس کی خوب صورت آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔

''پانی لو۔'' نجانے لورا کس وقت پہنچی تھی۔ اسے روتے دیکھ کر پانی گلاس بڑھاتے ہوئے نرم لہجے میں بولی۔

وہ گلاس تھام کر ایک ہی سانس میں خالی کر گئی۔ لورا باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

میں مطلب کی بات پر آیا۔ ''اب بتاؤ میں کر سکتا ہوں۔''

وہ آزردگی سے بولی۔ ''ساری کہانی بتا تو دی ہے۔''

میں نرمی سے بولا۔ ''تفصیل بتائی ہے، صحیح نظر بیان نہیں کیا۔''

وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔ ''دیوا شش کمار کو قتل کر سکتے ہو۔''

''یہ کام تو آپ خود بھی کر سکتی تھیں۔''

وہ استہزائی انداز میں بولی۔ ''کیا آپ کو اتنی ہمت و حوصلے والی لگتی ہوں۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''کرائے کے کئی قاتل مل جاتے ہیں۔''

''اگر وہ قاتل پکڑا جاتا تو میری عزت تو خیر کیا بچتی جیل کی سیر بھی کرنا پڑتی۔''

میرے مشورے جاری رہے۔ ''اپنے بھائی کو سب کچھ بتا دیتیں۔ ایک مرد ایسے معاملے کو اچھی طرح سنبھال سکتا ہے۔'' اسی وقت لورا مگ میں چمچ گھماتی ہوئی میرے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔ وہ شاید کافی کے لیے پیسٹ بنا رہی تھی۔

سجاتا نے گہرے طنز سے تصدیق چاہی۔ ''یقیناً آپ کے ہاں ایسے حادثے کے بعد بہن فوراً اپنے بھائی کو اعتماد میں لیتی ہوگی ہے ناں۔''

''غلطی کا اعتراف کر لیتیں تو گناہ سے بچ جاتیں۔''

وہ ندامت سے بولی۔ ''اپنی غلطی و حماقت پر پردہ ڈالنے کو گناہ کا سہارا لینا چاہا تھا، مگر نہیں جانتی تھی کہ پستی میں لڑھکنے والا تہہ میں پہنچنے سے پہلے نہیں سنبھل سکتا۔ یقیناً میری نجات بھی شمشان گھاٹ میں جا کر ہی ہوگی۔ لیکن بدنامی سے نہیں بھاگ سکتی کیوں کہ دیوا شش جیسا موذی میری موت کے بعد میری نازیبا وڈیوز کو بیچ کر پیسہ کمائے گا۔''

''میرے لیے دیوا شش کے سر میں گولی اتارنا چنداں دشوار نہیں ہے۔ لیکن دیوا شش کی موت کے بعد بھی خطرہ آپ کے سر پر منڈلاتا رہے گا۔ نجانے اس نے وڈیوز کہاں چھپائی ہوں گی۔ اس کی موت کی وجوہات ڈھونڈنے والوں کی ان وڈیوز تک رسائی مشکل نہیں ہوگی۔ اور تفتیش کرنے والوں میں کوئی بدخصلت شامل ہوا تھا تو آپ کا واسطہ کسی نئے دیوا شش سے پڑ جائے گا۔''

وہ پھیکے لہجے میں بولی۔ ''اندازہ کر سکتی ہوں۔''

لورا لاتعلقی سے مگ میں چمچ گھمائے جا رہی تھی۔ سر درد کے لیے پیسٹ والی کافی، اچھی رہتی ہے۔ لیکن کافی کا پیسٹ بنانا بھی اچھا خاصا سر درد ہے۔ بہ قول شاعر.....

دردِ سر کے واسطے صندل لگانا ہے مفید
اس کا گھسنا اور لگانا دردِ سر یہ بھی تو ہے

لورا نیند سے جاگ کر اپنی کسلمندی دور کرنے کو کافی پینا چاہ رہی تھی اور اس کی کسل مندی پیسٹ بنانے ہی سے دور ہو گئی تھی۔

میں سجاتا کی طرف متوجہ ہوا۔ ''اب بتاؤ آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''

گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے ماتھے پر سر ٹیکا۔ ''آپ کا نرم لہجہ، خوش اخلاقی اور بات کرنے کا ڈھنگ ایسا تھا کہ میں جوا کھیلنے پر آمادہ ہو گئی۔ سوچا آپ کے کام آ کر اپنا بگڑا نصیب سدھار لوں گی۔''

لورا باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

میں نے جھک کر سجاتا کے ہاتھ کی پشت کو تھپتھپایا۔ ''نصیب سدھارنا ربِّ کائنات کا کام ہے۔ البتہ کوشش کی جا سکتی ہے۔ اور بے فکر رہو ان شاء اللہ تمھیں مایوس نہیں کروں گا۔''

مجھے عقیدت سے دیکھتے ہوئے وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔ ''آپ کا تم کہنا مجھے اچھا لگا۔''

لورا ٹرے میں تین مگ سجائے نمودار ہوئی۔ ہمارے سامنے ایک ایک مگ رکھ کر اس نے اپنا مگ اٹھا لیا۔

''شکریہ۔'' ڈاکٹر سجاتا کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے لورا کو مخاطب ہوئی۔

گردن میں ہلکا سا خم لاتے ہوئے لورا نے پھلجڑی چھوڑی۔ ''ربجا کی تسلیوں اور وعدوں کو سنجیدگی سے نہ لینا کہ

خوب صورت لڑکیوں کو چکنی چپڑی باتوں سے بہلانا اس کی عادت ہے۔"

"کک.....کیا مطلب۔" ڈاکٹر سجاتا بوکھلا گئی تھی۔

لورا نے منہ بنایا۔ "الجبرے کا کلیہ یا جیومیٹری کا مسئلہ تو بتایا نہیں کہ وضاحت کی ضرورت پڑے۔"

ڈاکٹر سجاتا ششدر سی میری طرف متوجہ ہوئی۔ میں اطمینان سے بولا "اسے پوچھو نا، میرے ساتھ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہی ہے۔ کہیں دفع ہو جائے۔"

لورا کا مترنم قہقہہ گونجا۔ "اکیلے میں منتیں کرنے اور ہاتھ جوڑنے سے بھی نہیں کتراتا، دوسروں کے سامنے اس کے ڈرامے دیکھو۔"

ڈاکٹر سجاتا ہونق بنی ہمیں گھور رہی تھی۔ پھر اس سے رہا نہ گیا ہندی میں بولی۔ "مادام کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"اندیشہ نہ کرو، اس کی بے ہودہ گوئی اور بکواس کی عادت بہت پرانی ہے۔"

لورا شرارتی انداز میں بولی۔ "جھوٹا، اسی لیے اردو بول رہا ہے تاکہ مجھے اس کی بات سمجھ نہ آئے۔"

ڈاکٹر سجاتا کے چہرے پر پریشانی ابھری۔ لورا نشست چھوڑ کر اس کے پہلو میں جا بیٹھی۔ "بہ ہر حال پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں ہوں ناں۔ اور بتاؤ کیا مسئلہ ہے۔"

ڈاکٹر سجاتا بولی۔ "آپ کے ساتھی کو تفصیل بتا دی ہے۔"

"تو کیا سوچا ہے؟" لورا براہ راست مجھے مخاطب ہوئی۔

میں نے کہا۔ "مشورہ کرتے ہیں۔"

لورا مسرت سے چہکی۔ "شکر ہے مجھ سے بات تو کی۔ میں نے سوچا کہ خفا ہو گئے ہو۔"

"تمھاری حرکتیں تو ایسی نہیں کہ بندہ بات کرے۔"

"اچھا اب تو معافی تلافی ہو گئی ہے، تو کیوں نا، کام کی بات کی جائے۔ پہلے مجھے ڈاکٹر سجاتا کا مسئلہ بتاؤ پھر کوئی حل سوچتے ہیں۔"

میں نے اجمالاً بیان کیا۔ "تمھارے والا مسئلہ ہے۔ اسے بھی ایک شکا ٹکرا گیا ہے۔ جو ان لمحات کو فلما کر بے چاری کو بلیک میل کر رہا ہے۔ بس اس درندے سے جان چھڑانا چاہتی ہے۔"

وہ سکون سے بولی۔ "سوچنا کیا ہے، سر میں گولی اتارو تاکہ اپنے ادھورے کام کی طرف متوجہ ہو سکیں۔"

"اور اس کے قبضے میں جو ڈیوہے اس کا کیا؟"

وہ ڈاکٹر سجاتا کی طرف متوجہ ہوئی۔ "ذرا اس کا حدود اربعہ بیان کرو۔ کہاں رہتا ہے، کس وقت چھٹی کرتا ہے، محافظ کتنے ہیں وغیرہ وغیرہ۔"

سجاتا نے تفصیل بتائی۔ "صبح نو بجے ہسپتال پہنچتا ہے اور شام چار بجے چھٹی کرتا ہے۔ سیون ہائیٹ ہسپتال سے تھوڑے ہی فاصلے پر شیواجی نگر میں اس کی بڑی سی کوٹھی ہے۔ غیر شادی شدہ ہے۔ گھر میں دو چوکیدار، ایک مالی، ایک باورچی ہر وقت موجود ہوتے ہیں۔ ایک ذاتی محافظ اور ایک ڈرائیور بھی ہے جو ہسپتال کی طرف سے اسے ملے ہوئے ہیں۔"

لورا نے بے باکی سے پوچھا۔ "عورتوں کے بارے اس کی کوئی خاص پسند؟"

ڈاکٹر سجاتا نفرت بھرے لہجے میں بولی۔ "خود تو کالا بھجنگ ہے، مگر گوری سفید عورتوں کا شیدائی ہے۔ اسی لیے

سانولی اور کالی رنگت والی عموماً اس کے شر سے محفوظ رہتی ہیں۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ حسرت سے بولی۔'' کاش میری رنگت بھی سانولی ہوتی۔''

''کس چیز کا اسپیشلسٹ ہے؟''

''ماہر امراض قلب وجگر (Cardiologist) ہے۔''

وہ اطمینان سے بولی۔'' ریجا اپنے رویے کی معافی مانگے باقی کام میں سنبھال لوں گی۔''

''ضرورت ہی نہیں ہے، تم آرام کرو۔''

''ذلیل ہو جاؤ گے لیکن اپنی انا نہیں چھوڑو گے۔'' ناک بھوں چڑھاتے ہوئے وہ سجاتا کو مخاطب ہوئی۔'' مجھے سفید کوٹ اور نئی کار چاہیے ہوگی۔ تم میرے ساتھ چلو گی، دور سے اس کی کوٹھی دکھا کر واپس آ جانا۔ باقی ایسے کردار کو میں آسانی سے سنبھال لوں گی۔''

میں نے پوچھا۔'' مجھے بتاؤ تم کیا کرنا چاہتی ہو۔''

''تمھیں تو بالکل نہیں بتاؤں گی، البتہ معافی مانگتے ہو تو غور کر سکتی ہوں۔''

میں بھناتے ہوئے بولا۔'' بھاڑ میں جاؤ۔''

وہ کھل کھلا کر ہنسی۔'' چلو بتا دیتی ہوں، تم بھی کیا یاد کرو گے۔''

—●—

ایک عالی شان کوٹھی کے داخلی دروازے کے سامنے میں نے کار روکی۔ چوکیدار ذیلی کھڑکی کھول کر باہر نکلا۔

میں چوکیدار کو مخاطب ہوا'' ڈاکٹر جینفر ہنڈسلے، ڈاکٹر دیوا شش صاحب کو ملنے آئی ہیں۔''

''میں پتا کر لوں۔'' وہ اندر گھس گیا۔

لورا نے مجھے چھیڑا۔'' تمھیں جینی بھولی نہیں۔''

''بہتر ہوگا کار سے نکل کر کھڑی ہو جاؤ تا کہ ڈاکٹر دیوا شش تمھیں اچھی طرح دیکھ سکے۔'' میں نے اسے سیکیورٹی کیمرے کی طرف متوجہ کیا۔

''تم جیسے کھڑوس کے ساتھ اتنا عرصہ رہ کر بھی متاثر نہ کر پائی تو وہ خبیث وڈیو کیمرے میں دیکھ کر کیسے متاثر ہو جائے گا۔'' طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے وہ نیچے اتر گئی۔ کالے رنگ کے تھری پیس سوٹ میں وہ صحیح دمک رہی تھی۔ بالوں کو اچھی طرح سنوار کر اس نے بکھیر دیا تھا تا کہ یوں لگے کام چھوڑ کر آئی ہے۔ سفید کوٹ نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ آنکھوں میں نیلے لینز اور اس پر سفید بڑے شیشوں کی عینک جس نے اس کا آدھا چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔ عینک نے اس کی معصومیت میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ وہ اپنے اصل حلیے میں تھی۔ کیوں ہمیں امید تھی ڈاکٹر دیوا شش اسے شکل سے نہیں پہچانتا ہوگا۔ یوں بھی ٹی وی پر صرف میری تصویر دکھائی گئی تھی۔ لورا کی تصاویر پولیس اور ایجنسی والوں کو خفیہ طور پر تقسیم کی گئی تھیں۔

میں خاموش بیٹھا رہا۔ توقع کے مطابق منٹ بھر بعد ہی گیٹ کھل گیا تھا۔ لورا اندر آ گئی۔

میں نے کار آگے بڑھائی اور وسیع صحن میں پہلے سے موجود دو کاروں کے ساتھ پارک کی۔ اور دوسری طرف گھوم کر اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔

نزاکت سے نیچے اتر وہ اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گئی۔ میں اس سے ایک قدم پیچھے مودبانہ انداز میں چلنے لگا۔

ڈرائینگ روم میں درمیانے قد کا کالا سانڈ کھڑا تھا۔ ڈاکٹر کے بجائے وہ کسی گروہ کا دادا لگ رہا تھا۔

''یقین نہیں آ رہا انڈیا میں اتنی خوب صورت ڈاکٹر بھی موجود ہو سکتی ہے۔'' کریہہ ہونٹوں پر ندیدے پن سے زبان

پھیرتے ہوئے اس نے لورا کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

''یقیناً میں معزز دیواشش سے ملنے کی سعادت حاصل کر رہی ہوں۔'' لورا نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھاما۔ اس کے ہاتھ میں لورا کا گورا چٹا ہاتھ یوں لگ رہا تھا جیسے کوکا کولا کے مشروب سے بھرے گلاس میں انڈا ڈال دیا جائے۔

بڑی مشکل سے لورا نے ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کرایا اور میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ میرے ڈرائیور، محافظ اور دوست ریچاجی ہیں۔''

''دوست؟'' دیواشش نے حیرانی ظاہر کی۔ میں نے بھی اپنے چہرے پر خوب کالک ملی ہوئی تھی۔ سمجھ لیں دو رو سیاہ آنے سامنے آ گئے تھے۔

لورا بے باکی سے بولی۔ ''کیوں کہ مجھے اس کا رنگ بہت پسند ہے۔''

دیواشش کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ ''یہ تو میرے لیے فخر کی بات ہے۔'' اور گرم جوشی سے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ ''یہ اپنے ہم رتبہ کے ساتھ زیادہ آرام دہ رہے گا، کیوں کہ دو ڈاکٹروں کی ثقیل گفتگو اس کے پلے کہاں پڑے گی۔''

اس کا محافظ بھی وہیں موجود تھا۔ چھے فٹ جسامت کا لمبا تڑنگا، سڈول بدن کا جوان گہری نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

لورا معنی خیز انداز میں بولی۔ ''ہم آپ کے مطالعے کے کمرہ میں چلے جاتے ہیں، یہ ادھر ہی بیٹھ جائیں گے۔ یقین مانو مجھے معلوم نہیں تھا آپ اتنے دلکش ہوں گے ورنہ فارغ وقت میں آتی۔''

''آپ اپنے فارغ اوقات بتا دیں میں انتظار کر لوں گا۔'' دیواشش اضطراری انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے بے صبری سے بولا تھا۔ لورا جیسی پُرکشش لڑکی کا محبوبانہ انداز اس بے چارے نے کہاں دیکھا تھا۔

لورا پکے پھل کی طرح اس کی جھولی میں گری۔ ''میرے ساتھی ڈاکٹر کو گھنٹی پر سمجھا دو تو چند گھنٹے ابھی بھی نکال سکتی ہوں۔''

دیواشش کمینے پن سے بولا۔ ''ویسے میرا مطالعے کا کمرہ اور خواب گاہ ایک ساتھ ہیں۔''

لورا کے ہونٹوں پر محبوبانہ تبسم ابھرا۔ ''آپ جیسی شخصیت سے مجھے اسی عقل مندی کی توقع تھی۔''

''اجیت، تم مہمان کی سیوا کرو، میں ڈاکٹر جینفر ہنڈ سلے کا مسئلہ سن لوں۔'' اپنے محافظ کو ہندی میں ہدایت دے کر اس نے چھاتی پر ہاتھ رکھ کر لورا کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

لورا نزاکت سے چلتے ہوئے مطلوبہ سمت کو بڑھ گئی۔ میں انھی کی سمت متوجہ رہا۔

صوفے پر نشست سنبھالتے ہوئے اجیت نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''بیٹھو دوست، لگتا ہے ہمیں کافی دیر گپ شپ کا موقع ملے گا۔''

جیب سے سائیلنسر لگا گلاک برآمد کرتے ہوئے میں اطمینان سے بولا۔ ''ایسا بس تم سمجھتے ہو۔''

''یہ کیا مذاق ہے؟'' اس نے اٹھنے کو پر تولے۔

میں پراعتماد لہجے میں بولا۔ ''یقین کرو دوست، تم کتنی ہی تیزی دکھا لو بہ ہر حال گولی سے ہار جاؤ گے۔ جان بچانے کا موقع دے رہا ہوں۔ ہاتھ گردن کے پیچھے باندھ کر الٹے گھوم جاؤ۔''

وہ اعتماد سے بولا ''اور تم اجیت کے نام سے واقف نہیں اس لیے معاف کرتے ہوئے دفع ہونے کا موقع دے رہا ہوں۔'' البتہ اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''جیسے تمھاری مرضی۔'' کندھے اچکاتے ہوئے میں نے ایک دم لبلبی دبائی، گولی اس کے کان کی لو کو ساتھ لے گئی تھی۔

''اف.....'' اس کے ہونٹوں سے تیز سسکی کے ساتھ واہیات گالی برآمد ہوئی اور اس نے کان پر ہاتھ رکھ لیا۔ میں چونکہ اسے قتل نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے گالی برداشت کرنا پڑی۔ وہ دیواشش کا محافظ تھا۔ معلوم نہیں اس کی کاروائیوں میں شریک تھا یا نہیں۔ صرف شبے کی بنا پر اسے ٹھکانے لگانا مناسب نہیں تھا۔

''یہ گولی تمھاری کھوپڑی میں بھی چھید کر سکتی تھی۔ تب اجیت نام پر اترانے والی زبان کی حرکت نے رک جانا تھا۔ ایک اور موقع دے رہا ہوں۔ اور یقین کرو مجھے بار بار موقع دینے کی عادت نہیں ہے۔''

اس نے بازو اوپر اٹھا دیئے تھے۔ آنکھوں میں غیظ و غضب لیے وہ کینہ توز نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ کان کی لو سے خون کے قطرے ٹپک کر اس کی سفید قمیص کو رنگین کر رہے تھے۔

میں نے حکم دیا۔ ''ہاتھ گردن کے پیچھے باندھو اور صوفے سے اتر کر الٹا گھومتے ہوئے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ۔''

اس نے لمحہ بھر کے توقف کے بعد میری ہدایت پر من و عن عمل کیا۔

قریب جا کر میں نے ایک دم پستول کو نال سے پکڑ کر اس کی کھوپڑی کی سختی کا اندازہ کیا۔

''اوغ'' کی آواز کے ساتھ وہ اوندھے منہ صوفے پر گرا تھا۔ اس کی بے ہوشی کو یقینی بنانے کو میں نے دوسرا وار بھی کیا اور پھر جیب سے باریک ریشمی رسی نکال کر اس کی مشکیں کسنے لگا۔

اسے سختی سے جکڑ کر میں نے گھسیٹ کر قریبی کمرے میں پھینکا۔ اور خود دیواشش کی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ دھکیلنے پر کھلا ملا۔ اندر کا منظر میری توقع کے مطابق تھا۔ دیواشش اوندھے منہ بیڈ پر لیٹا تھا اور لورا اس کی مشکیں کس رہی تھی۔

وہ تیز لہجے میں بولی۔ ''میرا خیال ہے تمھارا باہر رہنا زیادہ بہتر رہے گا۔''

میں نے کہا۔ ''شاید تم جلدی نہ نمٹ سکو۔''

وہ اعتماد سے بولی۔ ''ایسے سؤروں کو سدھانے کو لورا براؤن سے اچھا استاد تمھیں نہیں ملے گا۔''

''ٹھیک ہے، میں باقی لوگوں کو سنبھالتا ہوں۔'' میں خواب گاہ سے نکل آیا۔ ملازمہ مجھے باورچی خانے میں ملی تھی۔ اس کے دوپٹے سے اس کی مشکیں کس کر میں نے باورچی خانے میں بند کر دیا۔ باقی ملازم وہاں موجود نہیں تھے۔ فیملی کوارٹر کوٹھی کے عقب میں بنے تھے۔ اور وہاں جانا وقت کا ضیاع تھا۔ میں ڈرائینگ روم کے دروازے کو اندر سے مقفل کر کے دوبارہ دیواشش کی خواب گاہ میں پلٹ آیا۔ دیواشش کی حالت کافی خستہ نظر آ رہی تھی۔ ایک کان اور ناک کٹا کروہ مزید بھیانک لگنے لگا تھا۔ اپنی شلوار وہ گیلی کر چکا تھا۔ منہ بندھا تھا، بس ناک سے ''اوں اوں'' کی قابل رحم آواز نکل رہی تھی۔ یقیناً کمرہ ساؤنڈ پروف تھا۔ تبھی تو اس کی ہلکی سی آواز بھی میرے کانوں میں نہیں پڑی تھی۔

''باہر والے ساروں کو قتل کر دیا ہے۔'' اندر داخل ہوتے ہی میں نے دیواشش کی امیدوں کا ناس کیا تاکہ اس کا رہا سہا دم خم بھی ٹوٹ جائے۔

''پھر تو اس کے ہونٹ آزاد کر دینے چاہئیں۔'' لورا نے کپڑا کھول دیا۔

وہ گھگیاتے ہوئے بولا۔ ''پپ..... پلیز..... تم جو چاہتی ہو لے لو، مگر مجھ میں مزید سہنے کا حوصلہ نہیں ہے۔''

''لڑکیوں کو بلیک میل کرنے کا مواد کہاں رکھا ہے۔''

وہ ہکلایا۔ ''کک..... کون سا..... مواد؟''

ایک دم اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے لورا نے اس کے بازو میں چاقو گھونپ دیا۔
اس کا جسم زور سے لرزا اور پھر مسلسل کانپنے لگا۔
''اگلی باری تمھاری آنکھ کی آئے گی۔'' لورا نے بے رحمی سے اس کی آنکھوں کے سامنے چاقو لہراتے ہوئے اس کے ہونٹ آزاد کیے۔
''اُف..... آہ.....'' کرتے ہوئے وہ گڑگڑایا۔ ''پلیز رحم کرو۔''
''معصوم لڑکیوں کو درندگی کا نشانہ بنانے والے پر رحم کرنا مظلوم لڑکیوں پر ظلم کرنے کے مترادف ہے اور لورا اتنی ظالم نہیں ہے۔''
''مم..... میں.....'' اس نے صفائی دینے کی کوشش کی۔
لورا قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ''تمھارے سارے کرتوت مجھے پتا ہیں سؤر۔ اور ہر جھوٹ پر یہ چاقو تمھارے جسم کا بوسا لے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ جو پوچھوں سچ سچ اگل دو۔ سمجھ میں آیا۔''
وہ چپ رہا۔ لورا نے ہلکا سا توقف کر کے سوال دہرایا۔ ''اب بتاؤ بلیک میلنگ کا مواد کہاں چھپایا ہے۔''
وہ اٹکتے ہوئے بولا۔ ''تت..... تجوری میں۔''
''اور تجوری کہاں ہے۔''
وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ''وہ اس کوٹھی میں نہیں ہے۔''
''ایسے نہیں سدھرو گے۔'' اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے لورا نے چاقو اس کی آنکھ میں گھونپ دیا تھا۔
وہ زور سے اچھلا اور ''غوں..... غوں.....'' کی بھیانک آوازیں نکالتے ہوئے بن جل کے مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ لورا نے اس کے ہونٹوں کو سختی سے دبائے رکھا ورنہ کمرہ اس کی چیخوں سے گونج اٹھتا۔
میں نے کہا۔ ''کمرہ ساؤنڈ پروف ہے کیپٹن۔ اس لیے احتیاط بے کار ہے۔''
''جانتی ہوں، مگر میری سماعتیں اس کی کریہہ چیخوں کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔'' نفرت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے لورا نے اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹا دیے۔
وہ با آواز بلند کراہنے لگا۔ لورا نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ پے در پے حملوں نے دیواشش کی مزاحمت ختم کر دی تھی۔ تیز بدبو ظاہر کر رہی تھی کہ دیواشش اپنے اعصاب پر قابو کھو چکا تھا۔ اور بنت حوا کو درندگی بنانے والے پر ذرا سی تکلیف آئی تو پتلون میں پانی ویکیچر چھوڑ دیا تھا۔
میں نے مغلر ناک پر لپیٹ لیا، لورا نے بھی ناک پر ماسک چڑھا لیا تھا۔
''تو میں پوچھ رہی تھی تجوری کہاں ہے؟'' اس کی کراہیں تھمنے سے پہلے لورا نے اپنی طرف متوجہ کیا۔
''تت..... تم، فاحشہ..... رنڈی..... میرے ..... پر..... میں، تیری..... تجھے چھوڑوں گا تو نہیں۔'' دیواشش کے ہونٹوں سے گالیوں و مغلظات کا طوفان ابل پڑا تھا۔
''مطلب اب تک ڈٹے ہو..... مان گئی تمھاری برداشت کو۔ باقی اپنے جس عضو پر اترا رہے ہو اب وہ تیرے پاس نہیں رہے گا۔'' لورا نے بے باکی سے اس کی ٹانگوں کے بیچ ہاتھ ڈالا۔
''بب..... بھگوان کے لیے، معاف کر دو..... بتاتا ہوں..... سب کچھ بتاتا ہوں.....'' دیواشش کی ہمت پہلے ہی باقی نہیں رہی تھی۔ نامرد بننے کا حوصلہ وہ نہیں کر سکتا تھا اور فوراً ہتھیار پھینک دیے۔
''بھونکتے رہو..... تمھارے پاس چپ رہنے کو ایک سیکنڈ بھی نہیں ہے۔''

دیواشش، پیٹ میں موجود مواد پہلے ہی اگل چکا تھا۔اب دماغ میں چھپائے راز باہر نکالنے لگا۔

تجوری خواب گاہ کے اندر ہی کپڑوں کی الماری میں بنی تھی۔ میں نے الماری کے پٹ کھول کر کپڑے ایک جانب ہٹانے کے بجائے باہر نکال کر پھینکے۔اندر چوڑا تختہ دائیں جانب دھکیلنے سے آسانی سے ہٹ گیا۔اس کے عقب میں فولاد کی تجوری نظر آرہی تھی۔

دیواشش کے بتائے کوڈ سے قفل کھول کر میں نے اکلوتا پٹ کھینچ لیا۔لورا بھی قریب آگئی تھی۔اندر دس بارہ یو ایس بی، ایک لیپ ٹاپ، ایک ایکسٹرنل ہارڈ ڈسک، ڈالروں کی چند گڈیاں، آٹھ تو سادہ موبائل فون اور کچھ دستاویزات پڑی تھیں۔یقیناً حفظ ماتقدم کے طور پر وہ لڑکیوں کو اپنے اصل نمبر سے گھنٹی نہیں کرتا تھا۔

دیواشش سے پاس ورڈ پوچھ کر لورا نے لیپ ٹاپ آن کیا۔ساری ہارڈ ڈسک گندی فلموں سے بھری ہوئی تھی۔اور وہ فلمیں اس کی اپنی تیار کردہ تھیں۔لیڈی ڈاکٹروں کے علاوہ، نرسوں اور چند دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کی فلمیں بھی موجود تھیں۔نجانے وہ درندہ کب سے اس کام میں لگا تھا۔ہر لڑکی کے نام کا فولڈر بنا ہوا تھا۔کچھ کے فولڈر کیساتھ مردہ لکھا تھا جس کا مطلب یہی تھا کہ چند ایک نے خودکشی میں راہ فرار تلاش کرنا چاہی تھی۔ڈاکٹر سجاتا کے نام کا فولڈر بھی موجود تھا۔اس میں چار ڈیوز پڑی تھیں۔لورا نے ایک وڈیو چلائی۔ڈاکٹر سجاتا کو بے لباس دیکھنا کوئی اچھا تجربہ نہ تھا۔میں نے رخ موڑ لیا۔اتنی بداخلاق لورا بھی نہیں تھی کہ مسلسل دیکھتی رہتی۔وہ بس دیواشش کی درندگی کی تصدیق کر رہی تھی تاکہ اسے اپنے تشدد کا پکا جواز مل جائے۔مطمئن ہوتے ہی وہ مجھے مخاطب ہوئی۔

''سب کچھ سمیٹ لو۔''اور خود دیواشش کی طرف بڑھ گئی۔

میں نے ایک بیگ ڈھونڈ کر تجوری میں جھاڑو پھیر دیا۔ڈالروں کی گڈیاں بھی نہیں چھوڑی تھیں۔انڈیا میں اپنی ضروریات پورا کرنے کو وہ رقم کام آسکتی تھی۔

''اس کے علاوہ مواد کہاں چھپایا ہے، سچ اگل دو ورنہ.....''لورا چاقو کھول کر دوبارہ تیار ہوگئی تھی۔ایک عورت ہونے کے ناطے مجھ سے زیادہ وہ جانتی تھی کہ متاثر ہونے والی بے چاری لڑکیاں کس اذیت سے گزری ہوں گی۔ہر وقت بھانڈا پھوٹنے کا ڈر، وڈیوز کے یوٹیوب پر چڑھنے کا خوف، آئے روز نئے درندوں کے سامنے جسم کا دسترخوان سجانے کی اذیت، پورے خاندان کی بدنامی کا وبال اور بھی جانے کون کون سے احساسات بے چاریوں کے دل و دماغ کوڈستے رہے ہوں گے۔یقیناً خوف و اندیشوں کے سائے میں زندگی گزارنا بہت مشکل و اذیت بھرا ہے۔اور لورا تو خود شکلا کی درندگی کا شکار ہو چکی تھی۔

وہ رو دینے والے لہجے میں بولا۔''بھگوان کی قسم سب کچھ اسی تجوری میں چھپایا ہے۔''

''تو پھر چھٹی کرو، تم جیسے غلظ کا وجود زمین کے اوپر نہیں اندر بہتر رہتا ہے۔''اس نے مسلسل دو بار اس کی گردن میں چاقو گھسیڑا۔دیواشش خرخراتے ہوئے تڑپنے لگا تھا۔

لورا نے ایک کاغذ پر لکھا۔''اس درندے کی موت پر کسی کو افسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔یہ حیوان نہ جانے کتنی لڑکیوں کی زندگی برباد کر چکا تھا۔میں میڈیا سے درخواست کرتی ہوں کہ میرے ان الفاظ کو ٹی وی پر ضرور چلائے کہ تمام لڑکیوں کے خلاف بلیک میلنگ کا مواد میں نے ضائع کر دیا ہے۔اب ہر وہ لڑکی آزاد ہے جو اس موذی کے چنگل میں پھنسی تھی۔''

یہ کاغذ اس کی چھاتی پر رکھ کر لورا کھڑی ہوگئی۔میں نے بیگ کندھے میں ڈال لیا تھا۔لورا کے کوٹ پر خون کے چھینٹے نظر آرہے تھے، اس نے کوٹ وہیں اتار کر پھینکا اور ہم باہر نکل آئے۔

چوکیدار لکڑی کے بینچ پر بیٹھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی، کار موڑنے تک چوکیدار داخلی دروازہ کھول چکا تھا۔

ہم دیواشش کے گھر سے نکل کر تھوڑی دور آئے۔ ایک عوامی پارک کی پارکنگ میں ڈاکٹر سجاتا ہماری منتظر تھی۔ اپنی چوری کی کار پارکنگ میں چھوڑ کر ہم اس کی کار میں منتقل ہو گئے۔

سجاتا کے اسٹیئرنگ ویل پر رکھے ہاتھ اضطراری انداز میں کانپ رہے تھے۔ ہماری بیٹھنے کے بعد بھی اسے کچھ پوچھنے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا۔

لورا نے کہا۔ ''چلو۔''

تھوک نگلتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھوں سے اسٹیئرنگ ویل تھپتھپایا۔ ''کک..... کیا رہا۔''

لورا اطمینان سے بولی۔ ''دیواشش کا تو کچھ نہیں رہا اور بلیک میلنگ کا تمام مواد ہمیں مل گیا ہے۔''

سجاتا نے گہرا سانس لیا اور پھر ایک دم لورا کے گلے میں بانہیں ڈال کر وہ رو دی تھی۔

لورا کے چہرے پر تبسم ابھرا اور اس کی پیٹھ تھپتھپانے لگی۔ ''سب کچھ ٹھیک ہو گیا میری جان۔ اب تم آزاد ہو۔''

اس نے لورا کے چہرے کو مسلسل چومتے ہوئے مسرت سے بھرپور لہجے میں کہا۔ ''بہت..... بہت..... بہت شکریہ۔''

لورا نے قہقہہ لگاتے ہوئے مجھ پر چوٹ کی۔ ''کچھ بوسے ریجا کے لیے بھی بچا لو بے چارہ للچا رہا ہو گا۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''کوئی بات نہیں میں تم سے وصول کر لوں گا۔''

لورا نے مڑ کر مجھے گھورا۔ ''دیواشش کا انجام دیکھ کر بھی مجھ سے ڈر نہیں لگ رہا۔'' سجاتا نے مسکراتے ہوئے کار آگے بڑھا دی۔

''ڈرے وہ جس کے کرتوت دیواشش کی طرح ہوں۔'' اطمینان سے کہتے ہوئے میں نے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

لورا، سجاتا کو تفصیل بتانے لگی۔ دیواشش کے انجام پر سجاتا کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ گھنٹے، پون گھنٹے میں ہم واپس پہنچ گئے تھے۔

لورا نے تمام یو ایس بی، ہارڈ ڈسک، دستاویزات اور لیپ ٹاپ سجاتا کو دکھائے۔ ڈالروں کی گڈیاں اور موبائل فون میں نے اپنے پاس رکھ لیے تھے۔

خوب تسلی کر لینے کے بعد انھوں نے ساری اشیاء کو ہتھوڑی سے کوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کیا اور کیاری میں گڑھا کھود کر دفنا دیا۔

سجاتا کو رخصت کر کے میں نے پرما کو کھانا کھلایا۔ اور پھر اسے بند کر کے لورا کے پاس آ گیا۔ سجاتا کی وجہ سے ہمارا پورا دن ضائع ہو گیا تھا۔ اور اب جلد از جلد شکلا کا حساب کتاب برابر کر کے ہمیں انڈیا چھوڑنا تھا۔ وہاں ہم رابن ہڈ بننے نہیں آئے تھے کہ لوگوں کی مدد پر کمربستہ رہتے، البتہ ڈاکٹر سجاتا ہمیں چھپنے کا ٹھکانہ دے کر ہمارے کام آئی تھی، مجبوراً اس کی دل جوئی کرنا پڑی۔

کافی پیتے ہوئے ہم ٹی وی دیکھنے لگے، مگر اب تک دیواشش کی موت ظاہر نہیں ہوئی تھی۔

لورا نے تبصرہ کیا۔ ''اگر شکلا بھی اسی طرح ہتھے چڑھ جائے تو لطف آ جائے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اسے دور سے نشانہ بنانے کے علاوہ مارنا آسان نہ ہو گا۔''

لورا بولی۔ ''یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ خبیث یہیں ہے یا ممبئی سے باہر ہے۔''
میں نے اندازہ ظاہر کیا۔ ''تو اسی کے ملنے سے پہلے اس کا کہیں جانا دشوار لگتا ہے۔''
لورا نے مشورہ چاہا۔ ''کیوں ناں گھنٹی کر کے تصدیق کر لیں۔ شاید کچھ اور بھی معلوم ہو جائے۔''
میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔ ''ہمارا بار بار گھر سے باہر جانا مناسب نہ ہوگا۔''
لورا نے کہا۔ ''میں اکیلی چلی جاتی ہوں۔''
''میرا خیال ہے مجھے جانا چاہیے، شاید اس کا خیر خواہ بن کر بات کرنے سے کچھ اگلوانے میں کامیاب ہو جاؤں۔''
لورا متفق ہوئی۔ ''ٹھیک کہہ رہے ہو انجان خیر خواہ بن کر بات کرنے سے شاید کوئی مفید خبر ہاتھ لگ جائے۔''
ہم دونوں بات چیت کا مضمون طے کرنے لگے۔ ایک بات پر متفق ہونے کے بعد، دیوانشش سے حاصل ہوئے موبائل فون میں سے ایک اٹھا کر میں نے جیب میں ڈالا اور باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر پیدل چلنے کے بعد رکشا مل گیا تھا۔ پارک کے ساتھ بنی فٹ پاتھ پر تین سنگی بنچ رکھے تھے۔ پہلے بنچ پر کوئی گداگر سویا تھا۔ درمیان والی بنچ چھوڑ کر میں آخری پر بیٹھ گیا۔ رات اتنی زیادہ نہیں بیتی تھی۔ ٹریفک میں کمی ضرور آئی تھی مگر اتنی نہیں کہ سڑک خالی ہو جاتی۔ اور ممبئی میں تو رات بھر ہی سڑک خالی نہیں ہوتی۔ رہائشی محلّوں اور دور دراز کی بستیوں میں تو رات کے وقت سرگرمیاں ماند پڑتی ہیں۔ بڑی سڑکوں، ہوٹلوں، بس اڈوں، ریلوے اسٹیشن، ائر پورٹ وغیرہ میں ہلچل جاری رہتی ہے۔ اور جوا خانوں، شراب خانوں، کوٹھوں وغیرہ کی رونق تو رات کے زیادہ ہو جاتی ہے۔
دائیں بائیں کا دھیان رکھ کر میں نے شکلا کا نمبر جو مجھے زبانی یاد تھا۔ ملا دیا۔
شکلا جیسے بڑے آدمی انجان نمبر کی کال وصول نہیں کرتے۔ لیکن نواسی کی گم شدگی اور لورا کے مختلف نمبروں سے کال کرنے کی وجہ سے اس نے میری گھنٹی اٹھانے میں سستی نہیں کی تھی۔
''ہیلو۔'' اس کی آواز میں بے چینی تھی۔ وہ کرخت آواز میری سنی ہوئی تھی اس لیے فوراً پہچان گیا تھا۔
''رندھیر شکلا صاحب بات کر رہے ہیں۔'' میں نے تصدیق چاہنا ضروری سمجھا تا کہ اسے یہ نہ لگے میں اسے پہلے سے جانتا ہوں۔
اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کون ہو۔ اور رندھیر شکلا سے کیوں بات کرنا چاہتے ہو۔''
میں فوراً بولا۔ ''میں جنرل صاحب کا خیر خواہ ہوں اور انھیں کوئی خاص اطلاع دینا چاہتا ہوں۔''
وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''میرے خیر خواہ کو کم از کم میری آواز تو پہچاننا چاہیے۔''
میں نے لہجے میں ندامت سموئی۔ ''سر پہلی بار بات کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں اس لیے تصدیق کرنا چاہی تھی۔''
وہ بیزاری سے بولا۔ ''مدعے پر آؤ۔''
''میں آج کل مادام کرسٹینا کے ساتھ بہ طور ترجمان کام کر رہا ہوں۔ اور مجھے لگتا ہے وہ آپ کی دشمن ہے۔''
''کیا؟'' اس کی آواز سے بیزاری کا عنصر کافور ہو گیا تھا۔ ''تم ابھی مجھے مل سکتے ہو؟''
''نہیں سر!'' میں نے صاف انکار کیا۔ ''وہ بہت خطرناک لڑکی ہے، بندے کو یوں ذبح کرتی ہے گویا سبزی یا مرغی کاٹ رہی ہو۔ آج ہی اس نے ڈاکٹر دیوانشش کمار کی وہ حالت کی ہے کہ دیکھ کر انسان کی روح کانپ اٹھے۔ اس کی پشت پناہی ایک عالمی مجرم تنظیم کر رہی ہے۔ آپ بڑے آدمی ہیں یقیناً چند دن مجھے حفاظت دے دیں گے۔ لیکن اس کے بعد میرا کیا ہوگا۔ وہ ایسی بدفطرت ہے کہ بدلہ لینا نہیں بھولتی۔''

اس نے پوچھا۔ ''یہ ڈاکٹر کون ہے۔ اور اسے کیوں قتل کیا؟''

''سیون ہائیٹ ہسپتال، کا ماہر امراض قلب ہے۔ اس کے حوالے اس نے کوئی جوان چھوکری کی تھی۔ لڑکی کافی خوب صورت تھی، دیوا شش کمار خود پر قابو نہ رکھ سکا اور اس نے لڑکی کی عزت خراب کر دی۔ پس مادام کرسٹینا نے اسے عبرت کا نمونہ بنا دیا۔''

وہ دھاڑا۔ ''تم بکواس کر رہے ہو۔''

میں نے اگلا وار کیا۔ ''سر میں بالکل بھی بکواس نہیں کر رہا۔ میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ مادام کرسٹینا نے آپ پر جو رائفلیں بیچی ہیں ان میں بہت بڑی خامی ہے۔ وہ آپ کی ساکھ کو تباہ کرنا چاہتی ہے۔ کیوں کہ جیسے ہی رائفلوں کی خامی سامنے آئی سارا ملبہ آپ پر گرے گا۔ بہت سے سوال اٹھیں گے، جن کی جواب دہی مشکل ہو جائے گی۔ اتنا مہنگا سودا کرنے کے بعد اگر رائفل ہی کسی کام کی نہ ہوئی تو سوچیں اعلیٰ عہدا داران کی رائے آپ کے بارے کیا ہوگی۔ کیا آئندہ اسلحے کی خرید و فرخت میں آپ کی رائے کسی قابل سمجھی جائے گی۔ ہر آدمی کے درجنوں دشمن ہوتے ہیں۔ آپ کے بھی ہوں گے۔ اور یقیناً ایسی صورت حال میں انھیں آپ کو نیچا دکھانے کا موقع ہاتھ آ جائے گا۔''

اس کی آواز میں تعجب آمیز تجسس ابھرا۔ ''کیا خامی ہے رائفل میں۔''

''اگر آپ کے پاس کوئی رائفل موجود ہے تو اس سے فائر کروا کر جانچ سکتے ہیں۔ پچاس ساٹھ گولیاں فائر ہونے کے بعد رائفل کا فائر نشانے سے دور ہونے لگتا ہے۔ اور سو گولیوں کے بعد تو ہدف اور شست میں کوئی مطابقت ہی نہیں رہتی۔ ویسے میں رائفلوں کے بارے زیادہ نہیں جانتا، البتہ مادام کی اس کے ساتھی سے ہونے والی گفتگو اتفاق سے سن لی تب پتا چلا، مزید آپ تصدیق کر کے جانچ سکتے ہیں۔''

''دیوا شش کے حوالے اس نے کوئی مقامی لڑکی کی تھی۔'' شکلا کے لہجے میں لرزاں اندیشے میرے لیے انوکھے نہیں تھے۔

''جی سر! میرا خیال ہے پری یا کوئی ایسا ہی نام ہے۔ سترہ اٹھارہ سال کی نوجوان دوشیزہ ہے۔ بہت پیاری ہے۔ مادام بہت سختی سے پیش آتی ہے بے چاری کے ساتھ۔''

اس کی آواز میں وحشت و درندگی بھری تھی۔ ''اس کافاحشہ کا وہ حشر کروں گا کہ شمشان گھاٹ میں بھی پناہ نہیں ملے گی۔''

میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ ''کون فاحشہ سر! اور ایک دم غصہ کیوں کر گئے ہیں۔''

''تمھیں میرا خیر خواہ ہونے کا دعویٰ ہے اور اتنا بھی نہیں جانتے کہ وہ لڑکی میری کیا لگتی ہے۔'' شکلا کے لہجے میں دکھ بھری تلخی چھپی تھی۔

میں صفائی دیتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کا خیر خواہ صرف اس لیے ہوں کہ آپ بھارت ماتا کے سیوک رہ چکے ہیں۔ انڈین آرمی کے جنرل کی میرے دل میں عزت و قدر نہیں ہوگی تو کس کے دل میں ہوگی۔ باقی مجھے آپ کے بارے زیادہ تفصیل معلوم نہیں ہے۔ میں ذاتی طور پر کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں۔ یوں سمجھ لیں چور اچکا اور چھوٹا موٹا ڈکیت ہوں۔ اسی وجہ سے تو مادام نے مجھے ساتھ رکھا ہے۔ ممبئی میں اس کے اور بھی کافی کارندے ہیں۔ ان تمام سے رابطہ میرے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ کیوں کہ زیادہ تر انگریزی سے نابلد ہیں۔ باقی مادام کی اس کے دوست سے ہونے والی گفتگو کبھی کبھار کانوں میں پڑ جاتی ہے، اسی سے آپ کے بارے معلوم ہوا۔ اور سچ کہوں تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ جو کچھ آپ کو بتا چکا ہوں کیا آپ کے کسی کام کا ہے بھی سہی یا نہیں۔''

''قیدی لڑکی کی کیا مدد کر سکتے ہو؟''

''صرف اتنا کہ مادام سے چھپ کر اسے کچھ کھلا دوں۔''

شکلا چیخ پڑا تھا۔''کیا وہ اسے کھانے پینے کو کچھ نہیں دیتی۔''

میں نے اس کے دل پر چھری چلائی۔''اسے چوبیس گھنٹے میں دو روٹیاں اور دو گلاس پانی سے زیادہ میسر نہیں۔ پتا نہیں مادام اس سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہے۔ حالاں کہ وہ لڑکی اتنی معصوم ہے کہ بے اختیار پیار آجائے۔ یقین کرو، اگر ڈاکٹر دیوا شش نے اسے گندہ نہ کیا ہوتا تو میں اس سے شادی کرنے پر تیار ہو جاتا۔''

''بکواس بند کرو، وہ رندھیر شکلا کی نواسی ہے۔ تم جیسوں کو ملازم بھی نہیں رکھے گی۔''

میں نے ہکلانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔''کک .....کیا؟.....سوری سر، مم.....میری گستاخی کو نظر انداز کر دینا میں ناواقف تھا۔''

شکلا نے نرم ہوتے ہوئے پیش کش کی۔''اس فاحشہ، لورا براؤن کا پتا بتا دو، میں تمھیں مالا مال کر دوں گا۔''

میں نے حیرانی ظاہر کی۔''کون لورا براؤن سر؟''

وہ غصے سے بولا۔''جس طوائف کا نام تم کرسٹینا بتا رہے ہو، اس کا اصل نام لورا براؤن ہے۔''

''سر میں طبعی عمر تک زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اس لیے پہلے ہی معذرت کر چکا ہوں۔ یقین کریں میں مادام سے بہت ڈرتا ہوں۔ پرسوں دو کارندوں نے اس کے حکم کے برخلاف من مانی کی کوشش کی۔ آدھے گھنٹے بعد ان کے سر اور دھڑ علیحدہ علیحدہ دریائے لہاس میں تیر رہے تھے۔ سر آپ نہیں جانتے، بہ ظاہر پرکشش و خوب صورت نظر آنے والی لڑکی کس آفت کا نام ہے۔ میں تو اسے موت کی دیوی سمجھتا ہوں۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔''شاید تم نے مجھے ڈرانے کو کال کی ہے۔''

''نہیں سر میں نے صرف یہ بتانے کو گھنٹی کی ہے کہ مادام کرسٹینا آپ کی دشمن ہے۔ تاکہ آپ اپنی حفاظت کا بندوبست کر سکیں۔ آپ سرحد پر تو لڑائی کر سکتے ہیں، جرائم پیشہ افراد سے واقف نہیں کہ یہ کیسے چھپ کر اور پیٹھ پر وار کرتے ہیں۔ بلاشبہ آپ بہادر ہوں گے اور انڈین آرمی کے کسی سپوت پر بزدلی کا گمان ہی حماقت ہے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ آپ اوچھی چال بازیوں سے ناواقف ہوں گے۔ اب کم از کم مجھے یہ تسلی ہوگئی کہ میں نے اپنے وطن کے محافظ کو پہلے سے چوکنا کر دیا ہے۔''

اس نے اشتیاق سے پوچھا۔''تم نے نام کیا بتایا تھا۔''

''میں نے کوئی نام نہیں بتایا سر! اور نہ تعارف کرانے کا متحمل ہو سکتا ہوں۔ آپ کو کال بھی چوری کے موبائل فون سے کر رہا ہوں کیوں کہ میرے نمبر کے ذریعے مجھے تلاش کرنا آپ کے لیے مشکل نہ ہوتا۔''

''لورا کے ہمراہ ایک پاکستانی جاسوس بھی تھا اس کا کوئی اتا پتا۔''

''میں نے تو کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا۔''

''آخری سوال، کیسے یقین کروں کہ تم سچ بول رہے ہو۔''

''سر آپ پہلے میری خبروں کی تصدیق کر لیں، میں دوبارہ کال کروں گا، بے ہند۔'' کہتے ہوئے میں نے بغیر اجازت لیے رابطہ منقطع کیا اور موبائل فون کو پارک کی طرف اچھال دیا۔ مزید وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے شکار کے سامنے دانہ پھینک دیا تھا۔ دیوا شش کی موت اور ایس آر ون کی خامی کی اطلاع ایسی خبریں تھیں کہ اسے مجھ پر کچھ نہ کچھ یقین آجاتا۔ میں بھی پہلے مرحلے میں اس کا اعتماد جیتنا چاہتا تھا۔

تھوڑا سا پیدل چلتے ہی مجھے ٹیکسی مل گئی تھی۔ اویو فلیگ شپ ہوٹل کا بتا کر میں بیٹھ گیا۔ ہوٹل کے سامنے اتر کر میں نے کرایہ ادا کیا اور جب تک ٹیکسی دور نہ چلی گئی وہیں کھڑا رہا۔ ٹیکسی کے غائب ہوتے ہی میں ہنڈنگر کی طرف بڑھ گیا۔ آدھے پون گھنٹے کے پیدل سفر کے بعد میں اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ لورا میری منتظر تھی۔

تفصیل سنتے ہی منہ بنا کر بولی۔ ''شکلا کو اذیت میں مبتلا کر کے خوشی ہوئی، لیکن ذرا وضاحت کریں کب سے راج کماری پرما کو چوبیس گھنٹے میں دو روٹیاں اور دو گلاس پانی دیتی ہوں۔''

میں ہنسا۔ ''میں نے کہا اسے دو گلاس پانی اور دو روٹیاں میسر ہیں۔ اور سچ میں بے چاری اتنا ہی کھا پاتی ہے۔''

وہ بھناتے ہوئے بولی۔ ''اور انڈے، مکھن، ملک شیک، پنیر، شہد، ڈبل روٹی، جیم، پھل ان سب کا کیا؟..... یا ان سے پیٹ نہیں بھرتا محترمہ کا۔''

میں اسے چڑاتا ہوا۔ ''وہ تو اسے میں کھلاتا ہوں، کیوں کہ میرے کمانڈر کی بیٹی ہے۔ البتہ تمھارے بس میں ہوتا تو دو روٹیوں سے زیادہ کچھ نہ دیتیں۔''

''وہ دو روٹیوں کے قابل بھی نہیں ہے۔'' حقارت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے لورا خواب گاہ کی طرف بڑھی۔

میں نے آواز دی۔ ''او مادام، اب پہرے داری کی ذمہ داری تمھاری ہے۔ صبح تم نے آرام کیا تھا۔ اب میری باری ہے۔''

''پہرہ دیتی ہے میری جوتی، اپنی لاڈلی کو بٹھا لو پہرے پر۔'' بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے وہ اندر گھس گئی۔

میں مسکراتا ہوا دوسری منزل کے ڈرائینگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں دو صوفوں کو ملا کر میں نے بیڈ کی شکل دی ہوئی تھی۔ پرما کی خواب گاہ کے باہر سونا زیادہ مناسب تھا کہ برے وقت کا کوئی پتا نہیں چلتا۔ آزاد پنچھی کو قید کر دیا جائے تو مانوس ہونے تک وہ نچلا نہیں بیٹھتا، پنجرے کی دیواروں سے سر ٹکراتا رہتا ہے۔ اور کبھی اتفاق سے کوئی رخنہ کھلا مل جائے تو پھر ہونے میں دیر نہیں کرتا۔ پرما کی بھی وہی حالت تھی۔ اسے بھاگنے کا خیال اس کے دل سے نہیں نکل سکتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس پر قابو پانے سے زیادہ فکر اسے پاکستان پہنچانے کی تھی۔ کسی شخص کی مرضی کے بغیر اسے دوسرے ملک لے جانا اتنا آسان نہیں تھا۔

اب ڈاکٹر سجاتا ہمارے لیے مشکوک نہیں رہی تھی۔ اس لیے مجھے سونے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔

—●—

صبح ناشتے کرتے ہوئے ہم ٹی وی دیکھتے رہے۔ دیوا شش کی پرما سے بدسلوکی کی جھوٹی خبر کی وجہ سے اس کا کٹا چٹھا تفصیل سے خبروں کی زینت بنا تھا۔ لورا کی لکھی ہوئی تحریر بھی میڈیا پر دکھائی گئی تھی۔ یقیناً اس تحریر نے کئی لڑکیوں کے دل سے بھاری بوجھ ہٹا دیا ہوگا۔ ایسی اچانک خوش خبری پا کر ہی اللہ پاک کی ذات بابرکات پر انسان کا یقین مستحکم ہوتا ہے کہ نظام عالم کو چلانے والا کوئی طاقتور، بااختیار مشکل کشا موجود ہے۔

دیوا شش کا قتل کسی ایسی ہی لڑکی کے کھاتے میں ڈالا جا رہا تھا جو اس کی ڈسی ہوئی تھی۔ اس کے محافظ، چوکیدار اور ملازمہ وغیرہ کے بیانات میں سوائے انگریز لڑکی کے ذکر کے باقی سب کچھ بتایا گیا تھا۔

اگلے دو دن میں نے شکلا کو انتظار کی زحمت میں مبتلا رکھنے کے ساتھ سوچنے کا بھی موقع دیا۔ اس دوران میری اور لورا کی گاہے گاہے اس موضوع پر بات ہوتی رہی۔ تیسرے دن ارادہ تھا کہ شکلا سے بات چیت کو دوپہر کے وقت نکلوں گا۔ مگر اسی دن ممبئی میں دہشت گردی کا بڑا حادثہ پیش آیا۔ ایک خودکش بمبار نے حساس عمارت کو دھماکے سے اڑا دیا تھا۔ جس میں

تین چار محافظ بھی ہلاک ہو گئے تھے۔ پولیس جگہ جگہ پر چھاپے مارنے لگی۔ مشکوک افراد سے ممبئی کے حوالات بھر گئے تھے۔ ایسے حالات میں باہر نکلنا مناسب معلوم نہ ہوا۔ اور ایک دو دن مزید انتظار کرنا پڑا۔ اس دوران تین چار مرتبہ ڈاکٹر سجاتا سے گھنٹی پر بات ہوئی۔ وہ ہمیں ملنے آنا چاہتی تھی، مگر میں نے منع کر دیا تھا۔ اس کی عقیدت اپنی جگہ اور ہماری احتیاط اپنی جگہ۔

میں عموماً نماز فجر پڑھ کر لیٹ جایا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ لورا ناشتے پر بلا لیتی۔ ہم اکٹھے ناشتا کرتے اور پھر میں پرما کے لیے ناشتا لے جاتا۔ پرما کی وجہ سے ہمیں بھی پر تکلف ناشتا مل جاتا تھا ورنہ ہم دونوں کھانے پینے کے معاملے میں درویش تھے۔ لورا کو بھی جو مل جاتا کھا لیتی اور میرا تو تعلق ہی چھوٹے طبقے سے ہے جو صبح ناشتے میں رات کی باسی روٹی چائے کے ساتھ کھانے کے عادی ہوتے ہیں۔ جب ہمارے آقا ﷺ ''مل جائے تو روزی نہ ملا تو روزہ'' پر ساری زندگی کاربند رہے، تو امتیوں کو بھی کھانے پینے میں زیادہ نخرے سے کام نہیں لینا چاہیے۔ البتہ استطاعت ہونے پر کوئی ممانعت نہیں۔ اللہ پاک کی نعمتوں پر رسائی پانا خوش قسمتی کا اعلیٰ درجہ ہی کہلایا جا سکتا ہے۔

اس دن بھی میں نے ناشتا کر کے پرما کی پسند کا ناشتا ٹرے میں ڈالا اور اوپری منزل کا رخ کیا۔ میری موجودی میں لورا اسے گھاس ڈالنے پر بھی آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ جبکہ مجھے ایسے لگتا جیسے پرما میری قریبی عزیز یا خصوصی مہمان ہو۔ اس کی ہر خواہش میں خوش دلی سے پوری کرتا تھا۔ وہ بھی بڑے مان و یقین سے مجھے کام بتایا کرتی تھی۔

''کافی کا موڈ ہے، چائے بنا دو گے، جوس تو لے آؤ، سوتے وقت ہلکا گرم دودھ لازمی پیتے ہیں، سلیپنگ سوٹ منگوا دو، نیچے خواب گاہ میں چند ناول پڑے تھے وہ لا دو، ہمیں ٹی وی دیکھنا ہے، فلاں برانڈ کا مکھن منگوایا کرو، ڈبل روٹی فلاں بیکری سے لاؤ وغیرہ وغیرہ۔'' ان میں کوئی بھی کام ایسا نہیں تھا جس کی تکمیل میں مجھے قباحت ہوتی۔

میں اسے اپنی نگرانی میں ٹی وی دکھانے کو ڈرائینگ روم میں بٹھا دیتا۔ پھر وہ خود اکتا کر چلی جاتی یا میں تھکن کا بہانہ کر کے جانے کا کہہ دیتا۔ اب ہمارے بیچ ایک خاموش معاہدہ ہو چکا تھا۔ وہ سلجھے ہوئے انداز میں گفتگو کرتی اور میں اسے حتی الوسع آرام مہیا کرنے کی کوشش کرتا۔ لورا اور اس کا سامنا نہ ہونے کے برابر تھا۔ ہندوؤں میں شراب نوشی عام ہے۔ شکلا کے ہاں تقریب میں میں نے اسے شراب پیتے ہوئے بھی دیکھا تھا، لیکن مجھ سے کبھی اس نے شراب کا تقاضا نہیں کیا تھا۔ شاید وہ عادی نہیں تھی۔ بہ ہر حال اس کی شراب نوشی مستحسن فعل نہ تھی کہ مجھے اس کے شراب نہ منگوانے کی کرید ہوتی۔

دروازے کے سامنے پہنچ کر میں نے دستک دی کیوں کہ نامحرم لڑکی کی خواب گاہ میں منہ اٹھائے گھس جانا نہایت غلط تھا۔

دستک دے کر میں نے لمحہ بھر انتظار کیا اور پھر دروازے کو دھکیلتا ہوا اندر گھس گیا۔ خواب گاہ خالی نظر آئی۔ میری نظر غسل خانے کے دروازے کی طرف اٹھ گئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر ناشتے کی ٹرے شیشے کی میز پر رکھی۔ اسی وقت ہلکی سی ''کلک'' ہوئی اور وہ ریشمی بالوں پر تولیہ رگڑتے ہوئے غسل خانے سے برآمد ہوئی۔ کالے رنگ کے سپورٹس پاجامے کے اوپر اس نے نصف بازو کی بنیان پہنی تھی۔ مجھ پر سرسری نظر ڈال کر وہ اپنے کام میں لگی رہی۔ میں نے باہر نکلنے کو پر تولے۔

''بات سنیں۔''

میں نے رک کر سوالیہ نظروں سے گھورا۔

تولیہ بیڈ پر پھینک کر اس نے گرم جرسی اٹھائی۔ ''دوپہر کو رمشا بیکری سے پیزہ منگوا دینا۔''

اور میں اوپر نیچے سر ہلاتے ہوئے باہر نکل آیا۔

دوپہر کو جب اسے پیزہ دینے گیا، وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے انگریزی ناول کے مطالعے میں غرق تھی۔ پیزے کا

ڈبہ دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ پیزہ رکھ کر میں مڑ گیا کیوں کہ حتی الوسع کوشش یہی ہوتی تھی اس کے ہمراہ نہ بیٹھوں۔

اس نے عقب سے آواز دی۔ ''کہاں چل دیئے؟..... پورا پیزہ ہم سے تھوڑی کھایا جائے گا۔ آپ بھی ہمارا ساتھ دیں۔''

''بعد میں کھالوں گا۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''ملازم تو ہو نہیں کہ بچا کھچا کھاؤ گے۔''

میں نے مڑ کر نشست سنبھالی اور اسے مطعون کرتا ہوا بولا۔ ''کسی ایسے شخص کی ہمراہی میں بیٹھ کر کھانا پینا مناسب نہیں لگتا جس کے دل میں میرے بارے نفرت بھری ہو۔''

وہ متبسم ہوئی۔ ''اب پہلے جتنی نفرت باقی نہیں رہی۔ کیوں کہ آپ ہمارا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے ڈبے کا ڈھکن اٹھا کر اس کی طرف دھکیلا۔

پیزا آٹھ ٹکڑوں میں کٹا ہوا تھا۔ ایک ٹکڑا اٹھا کر اس نے دانتوں سے ہلکا سا کاٹا اور نزاکت سے چباتے ہوئے کہنے لگی۔ ''ایک بات پوچھیں۔''

ہاتھ پیزے کی طرف بڑھاتے ہوئے میں نے سوالیہ ہنکارا بھرا۔ ''ہونہہ؟''

وہ دھیرے سے بولی۔ ''سچ بتاؤ اتنا خیال کیوں رکھتے ہو۔ کیپٹن لورا نے تو ہر وقت مرچیں چباتی ہیں۔ ہٹلر کی پوتی نہ ہو تو۔''

میں نے برجستہ پوچھا۔ ''خیال رکھنے پر اعتراض ہے، شکایت ہے یا تجسس؟''

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولی۔ ''کوئی عزت دے تو اس پر اعتراض یا شکایت تو نہیں بچتی۔ خاص کر جب بندہ قیدی ہو۔ البتہ جس کی قید میں ہو اس کے التفات کی کھوج عین فطرت ہے اور اس پر حیرانی کا اظہار بھی انوکھا نہیں ہے۔''

میں نے جواب گول مول کیا۔ ''فی الحال تو کوئی جواب دینے کی حالت میں نہیں ہوں۔ بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ممی میں اپنے سچے خیر خواہوں کی گنتی میں ایک عدد کا اضافہ کر لیں۔''

''سچ بتاؤ، کہیں ہم سے پریم وریم تو نہیں ہو گیا۔'' پیزے کا دوسرا ٹکڑا اٹھاتے ہوئے اس نے عام انداز میں پوچھا۔ یوں جیسے میری خیریت دریافت کر رہی ہو۔ گو وہ مشرقی لڑکی تھی، مگر جس کلچر پر اس کی تربیت ہوئی تھی، ایسی بے باکی، انوکھی یا حیران کن نہیں تھی۔ انڈیا میں اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں مغرب کی تقلید میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ اور بوائے فرینڈ، گرل فرینڈ تہذیب کی پرچارک دولدادہ ہیں۔

پرما کے لہجے میں مجھے شرارت یا طنز وغیرہ نظر نہیں آیا تھا۔ البتہ میرے سر پر بم ضرور پھوٹا تھا۔ مگر اپنے برتاؤ پر غور کیا تو لگا پرما سوال میں بحق بہ جانب تھی۔ لورا اسے جوتے کی نوک پر رکھتی، اس کی توہین، بے عزتی اور ڈانٹنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی۔ جبکہ میں آپ سے مخاطب کرتا۔ اس کی ضروریات کا خیال ایسے کرتا جیسے شہزادیوں کا خصوصی ملازم ہر وقت ان کی خدمت پر کمربستہ رہتا ہے۔ کھانے، پینے، پہننے کو جو مانگتی حاضر کر دیتا۔ اور بہ ظاہر اس کے ساتھ کوئی رشتہ بھی نہیں تھا۔ ایک جوان لڑکی، کسی مرد کے ایسے التفات کو چاہت کے علاوہ کوئی نام دے ہی نہیں سکتی تھی۔

اور بلاشبہ مرد کی زندگی میں ایک سے زیادہ عورتوں کی گنجائش رہتی ہے۔ اللہ پاک نے اس کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ ایک عورت پر قناعت کرنے کے بجائے مزید کا متلاشی رہتا ہے۔ لیکن میرے ساتھ ایک اور مسئلہ تھا، جس کا نام پلوشہ خان وزیر ہے۔ وہ میرے دل میں اس قدر گہرائی میں اتری ہوئی ہے کہ اس کے علاوہ کسی لڑکی سے محبت کرنا ممکن نہ تھا۔

رومانہ جیسی لڑکی کو بھی تبھی میری زندگی میں دخول کا موقع ملا جب میرے تیس پلوشے باقی نہیں رہی تھی۔ اور اب جبکہ وہ پوری آب تاب سے میری زندگی میں اجالے بکھیر رہی تھی تو پرما کیا اس سے کئی گنا خوب صورت لڑکی بھی مجھے متاثر نہیں کر سکتی تھی۔

البتہ صنفِ نازک سے ہمدردی، غلط یا بری نہیں ہے، اگر نفسانی جذبے سے پاک ہو۔ اور پرما کی اہمیت کے پس پردہ تو انصاری صاحب کا وجود تھا۔ وطن کی خاطر اپنی زندگی کا بہترین حصہ دشمن ملک میں گزارنے والا مجاہد اگر آفیسر کے بجائے کوئی عام جوان بھی ہوتا تو میرے لیے اتنا ہی مکرم و معزز ہوتا۔ شاید عام لوگوں کو گھر والوں سے بچھڑنے اور پردیس میں زندگی گزارنے کا تجربہ نہ ہو۔ انھیں یہ باور کرانا مشکل ہو کہ اپنے بچوں کی قلقاریاں سننے کو انسان کتنا بے چین رہتا ہے۔ والدین کی محبت اور ان کے چہروں کی زیارت کی کتنی حاجت ہوتی ہے۔ ان کی شفقت بھری ڈانٹ کھانے کو بندہ کیسے ترستا ہے۔ بیوی کے ہاتھ پکا ہوا کھانا جس میں خلوص، چاہت، الفت اور مٹھاس لبالب بھری ہوتی ہے کتنا شیریں، لذیز اور پاکیزہ ہوتا ہے۔ گاؤں کی گرد آلود آب ہوا کے مقابلے میں کشمیر و شمالی علاقہ جات کے پرفضا مقام بھی ہیچ نظر آتے ہیں۔ اور جب انسان بہ رضا و رغبت ان سے جدائی پر آمادہ ہو جائے تو ایسے شخص کی ہمت، حوصلے اور مجاہدے کو داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ عارضی طور پر گھر والوں اور علاقے سے جدائی مجھے اتنی گراں گزرتی تھی تو جس سے واپسی کی امید ہی چھین لی جائے اس پر کیا گزرے گی۔ تنخواہ کی مد میں ملنے والے کاغذ کے چند نوٹ اس کا نعم البدل کبھی نہیں ہو سکتے۔

لاریب اپنے وطن سے محبت اور اس کی خاطر قربانی دینا ہر شہری کا فرض ہے، جسے ادا کرنے والے گنے چنے ہی ہیں۔ کروڑوں کی آبادی میں چند لاکھ کا ہندسہ اتنی قلیل تعداد کی طرف اشارہ کرتا ہے جسے سمجھنا صاحب عقل کے لیے چنداں دشوار نہیں۔ ان چند لاکھ میں چند سو ہی ایسے ہیں جنھیں پاکستانی ہونے کی زیادہ قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ لیکن ملک کو نوچنے، کھسوٹنے اور اپنی تجوریوں کو لبالب بھرنے والوں کو یہ محافظ بہت برے لگتے ہیں۔ قانون فطرت ہے کہ چوروں اور لٹیروں کو چوکیدار ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ اور جو پاکستان کی سلامتی میں نقب لگانے کے خواہاں ہیں انھیں پاک آرمی سے بغض و عداوت ہے کہ پاکستان کی سلامتی کی ضامن اللہ پاک کی ذات بابرکات کے بعد پاک آرمی ہی ہے۔ خیر بحث کوئی اور رخ اختیار کر گئی ہے۔ اور ایسی کوتاہی مجھ سے اکثر سرزد ہو جاتی ہے۔ امید ہے قارئین درگزر کریں گے۔

پرما کے استفسار پر حیران ہونے کے بعد مجھے ہنسی آئی تھی۔ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''میری دوست کیپٹن لورا براؤن اتنی بدصورت تو نہیں کہ مجھے محبوبہ ڈھونڈنے کو دائیں بائیں متوجہ ہونا پڑے۔''

''پہلے ہمارا بھی یہی خیال تھا۔ اور آپ کے لورا براؤن کی مدد کرنے کے پس پردہ ہمیں یہی وجہ کارفرما نظر آئی تھی۔ لیکن اپنی ذات پر آپ کے مسلسل التفات نے اس سوال پر مجبور کیا۔ تاکہ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو آپ کو سمجھا سکیں۔''

''کیا سمجھاؤ گی۔'' میرے لہجے میں خوشگوار اشتیاق بھرا تھا۔

وہ صاف گوئی سے بولی۔ ''ہم میں جو طبقاتی فرق ہے اگر اسے نظر انداز بھی کر دیا جائے تو بھارت ماتا کا دشمن ایک پاکی جاسوس ہمارے کسی نازک جذبے کا حق دار کیسے ہو سکتا ہے۔ بے شک ایسا سوچنے والے کی عقل پر ماتم ہی کیا جا سکتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر آپ کی شکل اس قابل ہی نہیں ہے کہ ہمارے دل میں کوئی جگہ پا سکو۔''

''ہونہہ!'' چہرے پر اداسی لاتے ہوئے میں نے ہنکارا بھرا۔ ''یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔''

اس نے مدبرانہ انداز میں کندھے اچکائے۔ ''ہمارا کام تھا سمجھانا۔''

میں بہ ظاہر دکھی لہجے میں بولا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ کیپٹن لورا ابھی گھاس ڈالنے پر تیار نہیں۔ حالاں کہ اس کی خاطر میں

نے اپنا مشن ادھورا چھوڑ دیا ہے اور اس کے آگے پیچھے پھرنے لگا۔ جب مایوس ہو کر جانے کا سوچا تو وہ آپ کو اغواء کر کے لے آئی اور مجھے یہاں رہنے کو نئی امید مل گئی۔ آپ تو اس سے بھی سنگ دل نکلیں، کیوں کہ اس نے کبھی واشگاف انداز میں انکار نہیں کیا تھا۔''

اس نے سرعت سے صفائی پیش کی۔ ''ہمیں دوش نہ دینا، ہماری حیثیت ایک بے بس قیدی کی سی ہے۔ اور ہم نے آپ کو غلط فہمی میں بھی نہیں رکھا، جونہی محسوس ہوا آپ کی نوازشات کسی مقصد کے تحت ہو سکتی ہیں فوراً اپنے جذبات کا اظہار کر دیا۔''

میں نے اداسی سے لبریز گہری آہ بھری۔ ''درست کہا، آپ سے کوئی گلہ نہیں۔ جب بنانے والے نے صورت ہی ایسی بنائی ہے کہ کسی عورت کے دل میں جگہ نہ پا سکوں تو اس میں کسی دوسرے کو ذمہ دار ٹھہرانا کہاں کا انصاف ہے۔''

اس نے ترحم آمیز نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ''سفید پوش طبقے میں کافی خوب صورت اور آزاد خیال لڑکیاں مل جاتی ہیں جن کا مسلح نظر کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا ڈھونڈنا ہوتا ہے۔ اگر.....'' فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے وہ مجھے سوالیہ نظروں سے گھورنے لگی گویا بات مکمل کرنے کو اجازت چاہ رہی ہو۔

''کیا اگر؟'' بے تابی ظاہر کرتے ہوئے میں نے اسے مایوس نہیں کیا تھا۔

''ہمیں گرینڈ پا کے پاس لے جاؤ، آپ کا دامن مال و دولت سے بھر دیں گے۔ وہ پیسے بینک میں رکھوا دینا۔ بقیہ زندگی ان کے منافع پر گزر جائے گی۔ اچھا کھانے پینے لگو گے تو لڑکیاں بھی مل جائیں گی۔''

میں نے اپنے مسئلے کی گھمبیرتا واضح کی۔ ''لڑکیاں تو اب بھی ملتی ہیں، بات تو دل پسند لڑکی کے حصول کی ہے نا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہمارا خیال دل سے نکال دو۔''

میں نے مایوسی ظاہر کی۔ ''لورا نے بھی سبز جھنڈی دکھا دی ہے۔ آپ کو بھی یہ تھوبڑا ناپسند ہے تو یہاں سے چلے جانا ہی بہتر رہے گا۔'' میں نے دکھ بھرا ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''یقیناً میرے جانے کا تو آپ کو کوئی دکھ نہیں ہوگا، البتہ میرے بعد کیپٹن لورا کے ساتھ تھوڑا سنبھل کر رہنا۔ وہ آپ کے نانا سے سخت نفرت کرتی ہے۔ کہیں کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر دے۔ گو آپ کے نانا کا کردار میرے لیے بھی بہت گھناؤنا اور غلیظ ہے مگر آپ کو معصوم اور بے گناہ سمجھتا ہوں۔ مجھے اجازت دو اور اپنا خیال رکھنا پرماجی۔''

''کک.....کیا مطلب؟.....آپ چلے جائیں گے۔'' لورا کا سامنا کرنے کے خیال ہی سے اسے جھرجھری آ گئی تھی۔

میں بے چارگی سے بولا۔ ''تو کیا کروں، کس امید پر بدیسی مادام کی جھڑکیاں سنوں، پاکستان آرمی تک بھی میری ان حرکتوں کی خبر پہنچ گئی ہوگی کہ اپنی ذمہ داری چھوڑ کر کسی انگریز لڑکی کا غلام بنا پھر رہا ہوں۔ شاید اب تک میرا کورٹ مارشل بھی ہو چکا ہو۔''

وہ لجاجت سے بولی۔ ''اگر جانا ہے تو ہمیں آزاد کر کے جاؤ۔''

میں نے خوفزدہ ہونے کی اداکاری کی۔ ''شاید آپ مجھے کیپٹن لورا کے ہاتھوں مروانا چاہتی ہیں۔''

''ایک لڑکی آپ کا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ اس دن تین غنڈوں کو آپ نے چند لمحوں میں دھول چٹا دی تھی یہ تو پھر ایک نازک لڑکی ہے۔'' مجھے بزدل اور پاک آرمی کو ناکارہ کہنے والی کی اپنی غرض آئی تو پچھلی باتیں بھول گئی۔

میں نے کہا۔ ''نازک لڑکی کہاں، تربیت یافتہ کمانڈو ہے۔''

وہ رکھی ہوئی۔ ''آپ نے ہماری حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔ جب تک لورا اور گرینڈ پا کی صلح نہیں ہو جاتی ہم آپ

کو جانے نہیں دیں گے۔"

"ٹھیک ہے نہیں جاتا، مگر سوال تو ہنوز باقی ہے۔"

اس نے اضطرابی انداز میں ہاتھ مروڑے، یقیناً اپنی حماقت پر پچھتا رہی تھی۔ اس کے تئیں اگر وہ یہ موضوع نہ چھیڑتی تو میں چپ چاپ بغیر کسی تقاضے اور وعدے وعید کے اس کی سیوا کرتا رہتا۔ جبکہ اب میں امید بھری خبر سننے کا خواہاں تھا۔ اور بالفرض وہ جھوٹا وعدہ کر لیتی تب بھی اسے چھیڑنے اور اظہار محبت کا بہانہ ہاتھ آ جاتا۔ جو خواہ مخواہ کا دردسر مول لینے والی بات تھی۔ لمحہ بھر سوچ کر وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔

"نن..... نہیں..... آپ کہیں نہیں جانے والے اور نہ ہم کوئی امید دلا سکتے ہیں..... ہمارے درمیان طبقاتی فرق موجود ہے۔ آپ ہماری ضروریات ہی کو پورا نہیں کر سکیں گے۔"

"کیوں نہیں کر سکوں گا۔ اب پونڈوں میں تنخواہ لے رہا ہوں۔ بلکہ ہفتے بھر سے ضروریات پوری کر بھی رہا ہوں۔"

آنکھوں میں نمی بھرتے ہوئے وہ لجاجت سے بولی۔ "پلیز....."

میں نے بلند بانگ قہقہہ لگایا۔ "پاگل۔"

وہ متعجب ہوئی۔ "پاگل کیوں بولا۔ اور ہنس کیوں رہے ہو۔"

"اور کیا کہوں۔ اتنا احمق لگتا ہوں کہ جنرل رندھیر شکلا کی نواسی سے شادی کے خواب دیکھنے لگوں۔ میں عام سا سپاہی ہوں محترمہ، اتنے اونچے خواب دیکھنے کی جرأت بھلا کہاں کر سکتا ہوں۔ بے فکر رہو آپ کا خیال کسی لالچ کی وجہ سے نہیں رکھتا۔ اور اتنا اندازہ تو اب تک ہو جانا چاہیے تھا۔"

"کک..... کیا..... سچ میں۔" اس کے ہونٹوں پر مجوبانہ تبسم ابھرا۔ "آپ سچ کہہ رہے ہیں؟..... مطلب واقعی میں آپ ہم سے محبت نہیں کرتے....." اور پھر خود کلامی کرتے ہوئے تصدیق چاہی۔ "بالکل ایسا ہی ہوگا، آخر کیپٹن لورا براؤن اتنی خوب صورت لڑکی ہے۔ ہم تو بس واجبی شکل وصورت کے ہیں، ہے نا؟"

پیزے کا ڈبہ اٹھاتے ہوئے میں کھڑا ہوا۔ "خیر خواہ مخواہ جھوٹ بولنے پر مجبور مت کرو کہ لورا آپ سے خوب صورت ہے۔ البتہ جسے میں چاہتا ہوں بلاشبہ وہ آپ سے بہت زیادہ پیاری ہے۔"

اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔ "کون ہے وہ؟"

"ان شاء اللہ کبھی ضرور ملواؤں گا۔ اور تب آپ تسلیم کریں گی کہ میں نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔" میری آنکھوں کے سامنے پلوشہ کا موہنا چہرہ نمودار ہوا، سماعتوں میں پشتو کی خوب صورت دھن گونجی اور اس کا پرکشش بدن تیز ہوا کی زد میں آئی لچکیلی شاخ کی طرح لہرانے لگا۔

—●—

رات کے کھانے کے بعد میں ایک بار پھر اپنے ٹھکانے سے نکل آیا تھا۔ ممبئی کی تیز زندگی میں خودکش دھماکے سے جو عارضی تموج پیدا ہوا تھا اسے ختم ہونے میں بہ مشکل دو تین دن لگے تھے۔ اب بس ٹی وی پر تبصروں کی صورت وہ خبر سنائی دے جاتی ورنہ کئی نئے حادثوں نے اسے پرانا کر دیا تھا۔

ٹیکسی پر بیٹھ کر میں اپنے ٹھکانے سے مناسب فاصلے پر اتر گیا۔ آج میں اس دن والی جگہ سے مخالف سمت آیا تھا۔ درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں کونے کی میز پر بیٹھ کر میں نے چائے منگوائی اور شکلا کو کال ملا دی۔ جو دوسری گھنٹی پر وصول ہو گئی تھی۔

"نمستے سر! کیسے ہیں آپ۔"

''جوان، تمھیں ملنا چاہتا ہوں۔'' اس نے چھوٹتے ہی تقاضا کیا۔

''کیا آپ کو لگتا ہے میں اس ملاقات کا متحمل ہو سکتا ہوں۔''

اس نے یقین دہانی کی کوشش کی۔ ''تمھیں ہر طرح کی حفاظت مہیا کی جائے گی، پچاس لاکھ روپے انعام دوں گا۔ باقی تمھاری مادام اور اس کی تنظیم کی ذمہ داری بھی میں سنبھالتا ہوں۔ اور یاد رہے میں اکیلا نہیں را کی پوری قوت و طاقت میرے ساتھ ہے۔''

''سر ایسا ہی ہے۔ لیکن میں اپنے اندیشوں کو کیسے جھٹلاؤں۔ فائدہ نقصان روپے پیسے کا ہو تو خطرہ مول لینا مشکل نہیں ہوتا، لیکن جب جان پر بنی ہو تو کسی تسلی اور دلاسے پر یقین کرنے کو دل نہیں کرتا۔''

اس نے بڑھک ماری۔ ''بالک! تم کسی ایرے غیرے سے نہیں انڈین آرمی کے جنرل سے بات کر رہے ہو۔''

''بھارت ماتا کے سپوت کی عزت و وقار سر آنکھوں پر، پر تو شما چاہتا ہوں مہاراج! یہ میدان جنگ نہیں کہ آپ دشمن کو پاؤں تلے روند دیں گے۔ یہ تو چالاکی، عیاری، دھوکے بازی کی جنگ ہے۔ اور اس میدان میں ہمارے فوجی آفیسر سادہ لوح اور بھولے بھالے ہوتے ہیں۔ جرائم پیشہ افراد کے پیش نظر کوئی ضابطہ یا اصول نہیں ہوتا۔ اور آپ ٹھہرے اصول پرست، خوددار اور سیدھی سچی بات کرنے والے۔'' میں اسے بانس پر چڑھاتے ہوئے انکار پر ڈٹا رہا۔

''تم ایک سمجھ دار اور بہادر جوان ہو۔ اور بالکل صحیح کہہ رہے ہو، میں جرائم پیشہ افراد کی چالبازیوں سے واقف نہیں ہوں گا۔ لیکن یہ کیوں بھول جاتے ہو میری پشت پر را جیسی تنظیم ہے۔ جن کا کام ہی دشمن ملک کے عیار جاسوسوں اور دھرتی ماں سے غداری کرنے والے مکاروں کو پکڑ کر انجام تک پہنچانا ہے۔''

''سر میں اب آپ کی نواسی کو پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیتا ہوں۔ اور کوشش کروں گا کہ اسے جلد از جلد بھاگنے کا موقع مل جائے، یوں کہ میری ذات بھی شک کی زد میں نہ آئے۔ لیکن آپ سے مل نہیں سکتا۔ بھگوان میری رکھشا کرے، بہت بری جگہ پر پھنس گیا ہوں۔''

وہ پر ملامت لہجے میں بولا۔ ''یار سمجھنے کی کوشش کرو، تمھیں ایک عورت ہمارے مقابلے میں ناقابل شکست لگ رہی ہے۔ اب اس سے زیادہ ہماری کیا توہین کرو گے۔''

میں رنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''سر وہ ایک عورت نہیں ہے۔ اس کی پشت پناہی بھی کوئی بین الاقوامی دہشت گرد تنظیم کر رہی ہے۔ اور اس نے واضح بتایا ہوا ہے کہ، اگر کسی نے اس کی مخبری کی تو وہ تفتیش کے چکر میں نہیں پڑے گی اور تمام مقامی افراد کو ختم کر دے گی۔''

''تم اس کی لاعلمی میں مجھے کال بھی تو کر لیتے ہو۔ اسی طرح چوری چھپے ملنے بھی آ جاؤ۔ بے شک اپنی مادام کا پتا نہ بتانا۔ میں بس رائفلوں کے موضوع پر گفتگو کروں گا۔ شاید تمھیں معلوم نہ ہو اس دن ایک خودکش بمبار کی وجہ سے ہمارا وہ گودام ہی دھماکے سے اڑ گیا ہے جس میں نئی رائفلیں ذخیرہ تھیں۔ مجھے رائفلیں جانچنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ اب مزید رائفلیں منگوانے سے پہلے میں آپ سے پوری تفصیل سننے کا خواہاں ہوں۔ کیوں کہ میں نہیں چاہتا دوبارہ کوئی ایسا سودا کر بیٹھوں جس میں پھنسنے کا امکان ہو۔ پہلے تو بھگوان کی کرپا سے بچت ہو گئی، بار بار ایسے اتفاق نہیں ہوتے۔''

دل چاہا زوردار قہقہہ لگاؤں۔ اس مطلب پرست خودغرض نے جب اپنی گردن پھنستی دیکھی تو وہ گودام ہی دھماکے سے اڑا دیا جس میں ایس آر ون رائفلیں ذخیرہ تھیں۔ یقیناً اس نے ایک دو رائفلوں کی جانچ کرا کر میری خبر کی تصدیق کی ہو گی۔ یوں بھی کسی رائفل سے پچاس ساٹھ گولیاں چلانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ اور جانچنے کے بعد اس کے پاس رائفلوں سے جان چھڑانے کے علاوہ چارہ نہیں رہا ہو گا۔ لازماً وہ نئی رائفلوں کو ذخیرہ کر کے تو نہیں رکھ سکتا تھا۔ کیوں کہ نئے اسلحے کی

آمد کے ایک دو دن کے اندر ٹیکنیکل ٹیم اس کی جانچ پڑتال کو تشکیل دی جاتی ہے۔جس میں فائرر، پرزوں کی جانکاری رکھنے والے، ایمونیشن جانچنے والے اور اسلحہ سازی کے ماہر موجود ہوتے ہیں۔اور ٹیم جیسے ہی ہتھیار کو پاس کرتی ہے۔ہتھیار مختلف فارمیشنوں کی اسلحے سے متعلق شاخوں کو تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔جو وہ ہتھیار فارمیشن کے ماتحت آنے والی یونٹوں کو بانٹ دیتی ہیں۔

ایسی ہی ٹیکنیکل ٹیم اسلحہ منگوانے سے پہلے بھی مقرر کی جاتی ہے۔لیکن شکلا نے پرما کی خاطر کچھ زیادہ ہی تیزی دکھائی تھی۔یہ بھی ممکن تھا ایس آر ون خریدنے کی تیاری پہلے سے مکمل ہو۔کیوں جب ہم قید میں تھے تب بھی ایس آر ون کا سودا تو ہو چکا تھا۔البتہ معاہدے پر عمل درآمد سے پہلے ہمیں بھاگنے کا موقع مل گیا تھا۔تب شکلا نہایت سستے داموں رائفل خرید رہا تھا اور اب لورانے اچھی خاصی قیمت وصول کی تھی۔

اس کے گھناؤنے فعل پر مجھے حیرت نہیں ہوئی تھی۔بھارت کی سیاست پاکستانی سیاست سے بھی کئی گنا زیادہ گھٹیا ہے۔یوں بھی ہندو سیاست کی بنیاد کوٹلیہ عرف چانکیہ کے بتائے ہوئے مکروفریب کے طریقوں پر رکھی گئی ہے۔مؤرخین اس کی پیدائش چوتھی صدی قبل مسیح کا نصف اول بتلاتے ہیں یہ پاکستان کے عظیم شہر ٹیکسلا میں پیدا ہوا تھا جو مختلف تہذیبوں اور بادشاہتوں کا مسکن رہا ہے۔کوٹلیہ ذات کا برہمن تھا لیکن بہت زیادہ بدصورت تھا اور اپنی بدصورتی پر اس نے علم و دانش کا پردہ ڈالے رکھا۔اس نے 150 ابواب پر مشتمل ''ارتھ شاستر'' نامی کتاب اس وقت کے راجہ کی رہنمائی کو لکھی۔کوٹلیہ عرف چانکیہ کے (لفظی معنی مکار ہیں)۔معتدل مزاج ہندو ادیب تسلیم کرتے ہیں کہ،کوٹلیہ کی کتاب ایسی سیاست کی تعلیم دیتی ہے جو بے رحمی اور ظلم کی علمبردار ہے اور جس میں حکومت کے وزراء کو دھوکہ دہی کی تعلیم دی گئی ہے۔ایسی کتاب جس میں محبت کے رشتے خونریزی میں بدل جاتے ہیں۔

میں نے چانکیہ کو دیکھا نہ اس کی کتاب ارتھ شاستر تک رسائی ہے۔البتہ میری سماعتیں چانکیہ کے ایسے ہی چیلے کی آواز سن رہی تھیں،جس نے ذاتی فائدے کے لیے وطن کی پروا کی اور نہ بے چارے پہرہ داروں کی جان کی۔یقیناً ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔اپنے مفاد کی خاطر نہ جانے کتنی بار پاکستان،نامعلوم دہشت گرد اور بے گناہ مجاہد مودر الزام ٹھہرائے جا چکے تھے۔بھارتی سیاست دانوں اور آرمی کے لیے کسی بھی دہشت گردی کی وجہ پاک آرمی اور آئی ایس آئی کو ٹھہرانا آسان ساحل ہے۔اور آفرین ہے بھارتی عوام پر جو اسے ایسے ہی حقیقت مانتے ہیں جیسے ایک کروڑ دیوتاؤں کو سچا مانتے ہیں۔اس موضوع پر کافی دلائل اور شہادتیں دی جاسکتی ہیں مگر میرے پیش نظر بھارتی سیاست یا ہندو کی پاکستان دشمنی نہیں ہے۔ایک تفریحی ناول میں ثقیل و پرمغز ابحاث کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔بس عادت سے مجبور ہو کر چند باتیں کہہ جاتا ہوں۔

میں نے گویا بادل نخواستہ ہامی بھرنے کا عندیہ دیا۔''اچھا سر! میں آپ سے اکیلے میں کیسے مل سکتا ہوں۔جہاں بس میں اور آپ ہوں،کوئی تیسرا موجود نہ ہو۔''

''یہ ہوئی نہ جوانوں والی بات۔''اس نے مکھن لگانے میں فراخ دلی کا مظاہرہ کیا تھا۔''یقیناً تم کسی بھی طرح سرحد پر پہرہ دینے والے سپوت سے کم نہیں ہو۔سیدھا میری کوٹھی میں چلے آؤ۔اور پختہ رہو ہم دونوں ہی ہوں گے،کوئی تیسرا وہاں نہیں ہوگا۔''

''ناممکن۔''میں انکار کرنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔''ہم کہیں باہر ملیں گے۔میں اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد ہی آپ کے قریب آؤں گا۔''

شکلا مجھے سمجھانے لگا۔''جو لوگ تمہیں میری کوٹھی میں دیکھ لیں گے ان کے لیے کسی اور جگہ ہماری ملاقات کا پتا لگانا کون سا مشکل ہوگا۔''

میں فوراً بدکتے ہوئے بولا۔ ''یہی تو میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں سر! کہ ہمارا ملاقات کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے رہنے دیں۔''

اس نے فوراً پینترا بدلا۔ ''افوہ، میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔ بہ ہر حال کہو کس جگہ ملنا چاہتے ہو میں پہنچ جاؤں گا۔''

اس سے بات کرتے ہوئے اتنی دیر ہو گئی تھی، کہ اب مزید بیٹھنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ چائے کی خالی پیالی کے نیچے پچاس روپے کا نوٹ رکھ کر میں بیرونی دروازے کی طرف چل پڑا۔ ہوٹل سے باہر نکلتے ہی میں نے محتاط انداز میں دائیں بائیں کا جائزہ لیا اور پھر سڑک کے کنارے چلنے لگا۔ اس دوران شکلا سے بات چیت جاری رکھی۔

''سر جگہ کے بارے تو میں نے کچھ سوچا ہی نہیں ہے۔''

اس نے دوبارہ مشورہ دیا۔ ''بالک میری مانو تو میری کوٹھی سے بہترین جگہ کوئی نہیں ہے۔''

میں جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''سر! آپ ساحل سمندر پر آ سکتے ہیں۔''

اس نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''اس سے کیا ہو گا؟''

''میرا جی چاہتا ہے کسی بھیڑ والی جگہ پر ملاقات ہو۔ یوں مجھے اطمینان رہے گا۔''

اس نے کسی نئی سوچ کے زیر اثر، اشتیاق سے پوچھا۔ ''کیا تمھاری میڈم نے میرے ساتھ اپنی دشمنی کا تمھیں بتایا ہوا ہے؟''

''سر آپ کو بتایا تو تھا، مجھے اتفاق ہی سے اس کی گفتگو سننے کا موقع ملا اور تبھی آپ کے نام تک رسائی ہوئی۔ اور مزید کھوج کے بعد چھپ کر آپ سے گفتگو کرنے پر تیار ہو گیا۔ اگر آپ فوجی نہ ہوتے تو کبھی بات نہ کرتا۔ بس بھارت ماتا کے ایسے سپوت جس نے ساری جوانی دیش کی خدمت کرتے ہوئے بتائی ہو اسے ہوشیار کیے بنا نہیں رہا گیا۔''

''میرا نمبر کس سے ملا؟'' اس نے ایک دم سوال کیا، شاید مجھے گڑبڑانا چاہتا تھا۔

''مادام نے آپ سے گفتگو کو کئی موبائل فون پاس رکھے ہوئے ہیں اور تمام میں آپ کا نمبر درج ہے۔'' میں نے بے جھجکے جواب دے کر اسے مایوس کیا تھا۔

''اچھا پرسوں میرے پوتے کی سالگرہ ہے۔ جسے منانے کا اہتمام بڑے پیمانے پر نہیں کیا جاتا۔ اگر چاہو تو خصوصی تقریب کا انتظام کر سکتا ہوں۔ تمھاری بھیڑ میں ملنے کی تمنا بھی پوری ہو جائے گی۔ اور کوئی دیکھ لے تو میرے کسی محافظ کو اپنا دوست بتا کر کہہ دینا اس سے ملنے گیا تھا۔''

اس کے مشورے نے میرے خون کی گردش تیز کر دی تھی۔ دل چاہا فوراً سے پہلے ہامی بھر لوں۔ لیکن پھر بے صبری دکھانا مناسب معلوم نہ ہوا۔ اور سوچنے کی اداکاری کرتا ہوا بولا۔ ''سر! میں.....'' کہہ کر خاموش ہو گیا۔

''یار اپنا نام ہی بتا دو تا کہ مخاطب کرنے میں آسانی ہو۔''

میں جھجکتے ہوئے بولا۔ ''بلرام کولونکر۔''

اس نے جذباتی دھونس جمانا چاہی۔ ''بلرام! تم اپنی مایہ ناز آرمی کے جنرل کی یقین دہانی پر اعتماد نہیں کر رہے۔ کیا اپنی فوج کی اتنی ہی عزت تمھارے دل میں ہے۔''

میں لہجے میں عقیدت سموتے ہوئے بولا۔ ''سر، کیسی بات کر رہے ہیں۔ جان پر کھیل کر آپ کو اتنی اہم خبریں اسی لیے بتائی ہیں کہ آپ فوجی ہیں۔ دوسرا کوئی کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہوتا میں ایسا سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہ کرتا۔''

اس نے لہجے میں مایوسی پیدا کی۔ ''تمھارے قول و فعل کا تضاد، میرے یقین کی راہ میں حائل ہو رہا ہے۔''

اس کی کوشش مجھے ہر حال میں ملاقات پر تیار کرنے کی تھی۔ ایک بار میں اس کے ہاتھ آ جاتا پھر مجھ سے سب کچھ اگلوانا مشکل نہیں تھا۔ اس کی نواسی بھی مل جاتی اور لورا بھی ہاتھ آ جاتی۔ اور لورا کی گرفتاری سے وہ اپنی رقم بھی واپس لے سکتا تھا۔ گو نقصان بھارت سرکار کا ہوا تھا۔ لیکن یوں کسی اور کا اتنی دولت اس سے نکلوا لینا بھی اسے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ میری شروع سے یہی کوشش رہی تھی کہ اس کے سامنے اپنی شخصیت کا ایسا نقشہ کھینچوں گویا اپنے دیش اور فوج کی محبت میرے نزدیک بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اور اس میں کافی حد تک کامیاب بھی ہو چکا تھا۔ وہ میرے بچھائے ہوئے جال میں قدم دھر چکا تھا، بس فوراً ہاں کر کے اسے شیشے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اور اب اس کا اصرار اور جذباتی دھونس جمانا کافی بڑھ گیا تھا تو مجھے طوہن و کرہن ہامی بھرنے کا موقع مل گیا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔ لیکن میں دوران تقریب ہی آپ کو ملوں گا۔ تقریب کے خاتمے سے پہلے مجھے واپس آنا ہوگا۔''

اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اس نے مجھے لالچ دی۔ ''تمھارے دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لوں گا اور یاد رکھنا ان دس پندرہ منٹ میں تم لکھ پتی بننے والے ہو۔ جنرل رندھیر شکلا اتنا کم ظرف نہیں کہ خود سے عقیدت و محبت رکھنے والے کی مالی سہائتا نہ کر سکے۔''

میں نے بھولے پن سے اپنی خواہش ظاہر کی۔ ''سر مجھے اپنی کار لینے کا شوق ہے۔''

اس نے لالچ دینا جاری رکھا۔ ''پرسوں تم ایک نئی اور قیمتی کار کے مالک بن جاؤ گے۔''

اس کے بعد ہم نے دو تین منٹ باتیں جاری رکھتے ہوئے ملاقات کی مزید تفصیلات طے کیں اور پھر میں نے اجازت لے کر جے ہند کا نعرہ لگایا اور رابطہ منقطع کر کے موبائل فون بند کر دیا۔ ایک مشکل مرحلہ طے ہو گیا تھا۔ مجھے امید تھی میں ایسا موقع تلاش کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا کہ شکلا پر کامیاب وار کر سکتا۔

کسی خالی رکشے یا ٹیکسی کی تلاش میں نظریں گھماتے ہوئے میرے دماغ میں وشواس سنگھ کا خیال در آیا۔ میں وعدے کے مطابق اس سے گفتگو نہیں کر پایا تھا۔ یقیناً میرے کال نہ کرنے پر اسے حیرانی اور میرے بارے پریشانی ہوگی۔ ڈاکٹر سجاتا کے بھائی کا گھر زیادہ محفوظ سمجھتے ہوئے میں نے فی الحال اس کے پاس جانا مؤخر کیا تھا۔ لیکن اس بارے بتا نہیں سکا تھا۔

اپنا ذاتی موبائل فون نکال کر میں پریتو بھابی کا نمبر ملانے لگا۔ دو گھنٹیوں کے بعد ہی نسوانی۔ ''ہیلو'' میرے کانوں میں پڑی۔

میں نے فوراً اپنا تعارف کرایا۔ ''پریتو بھابی! راجا بول رہا ہوں۔''

اس نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''ست سری اکال ویر جی! اور کہاں غائب ہیں۔ وشو نے تو آپ کے بارے پوچھ پوچھ کر میرے دماغ کی لسی بنائی ہوئی ہے۔''

''کہاں ہے وہ۔''

''لیں بات کریں۔'' لمحہ بھر بعد وشواس سنگھ کی آواز آئی۔ ''ابے کدھر چھپا ہے۔ ایک دن کا بتا کر گئے تھے اور ہفتہ ہونے والا ہے۔''

''کچھ نہ پوچھو یار، اس دن پھنستے پھنستے بچا ہوں۔ دشمنوں نے میرے ٹھکانے پر چھاپہ مارا تھا۔ قسمت اچھی تھی جو فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ بہ ہر حال میں چند دنوں تک تمھارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ اور فکر نہ کرو اب بالکل خیریت سے ہوں۔''

''تمھاری آمد کا سخت سے منتظر ہوں۔ دادا بھی پرنام کہہ رہے تھے۔''

''انھیں میرا آداب کہہ دینا۔ فی الحال وقت نہیں ہے۔ ملنے پر لمبی گپیں ہانکیں گے۔'' میں نے اجازت لے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد خالی ٹیکسی مل گئی تھی۔ اوبیرائے شپ ہوٹل کے پاس اتر کر میں نے ٹیکسی فارغ کی اور پیدل چل پڑا۔

لورا بڑی شدت سے میری منتظر تھی۔ چھوٹتے ہی پوچھنے لگی۔ ''کیا رہا۔''

''کامیابی۔''

اس نے بے صبری ظاہر کی۔ ''تفصیل بتاؤ۔''

''پرسوں شام کو اس کی کوٹھی کے سبزہ زار میں اس کے پوتے کی سالگرہ کی تقریب کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ وہیں اپنی ملاقات طے ہوئی ہے۔''

''کیا؟'' لورا کی آنکھوں میں مسرت بھری چمک پیدا ہوئی۔ ''وہ احمق جانتا نہیں اس کے مخالفین سناپر ہیں۔''

میں نے تجزیہ کیا۔ ''شکار کو جب شکاری ہونے کی غلط فہمی میں مبتلا کیا جائے تو وہ بہت سی احتیاطوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اپنے تئیں وہ مخالف کو پھانس رہا ہوتا ہے اور انجانے میں خود پھنستا جاتا ہے۔ میں نے تقریب کا مشورہ دیا، نہ ملاقات کا اور نہ آسانی سے ہامی بھری۔ باقی اسے یہ بھی لگ رہا ہے کہ تمھارا بدلہ پورا ہو گیا ہے۔ کیوں کہ رقم بھی مل گئی اور تم نے اس کی نواسی کی عزت بھی خراب کر دی ہے۔ اور اب بہ ظاہر بدلہ لینے کی باری اس کی بن رہی ہے۔ اس کی مسلسل یہی کوشش تھی کہ میں کسی طرح اس سے ملنے پر آمادہ ہو جاؤں۔ یوں مجھ پر قابو پا کر وہ تمھارے بارے سب کچھ اگلوا لے گا۔''

وہ متبسم ہوئی۔ ''لگتا ہے انڈیا میں اپنا دانہ پانی پورا ہو گیا ہے۔''

میں نے متفق ہوتے ہوئے کہا۔ ''جانتی ہو دو تین دن پہلے ممبئی میں جو دہشت گردی کی کارروائی ہے اس کے پس پردہ شکلا کا منحوس وجود ہی تھا۔''

لورا متعجب ہوئی۔ ''بھلا وہ کیسے؟''

اور میں نے تفصیل بتا دی۔

لورا کے چہرے پر مسرت ابھری۔ ''ریجا یہ تو بہت بڑی خوش خبری سنائی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''بھلا وہ کیسے؟''

''یار، ایس آر ون رائفلوں کے ضائع ہونے کے بعد وہ ہماری کمپنی پر دھوکا دہی کا مقدمہ ہی دائر نہیں کر سکتا۔ خبیث نے اپنی جان بچانے کے چکر میں ہمارے لیے بھی سہولت پیدا کر دی ہے۔ اب اس کے مردار ہونے کے بعد تو کسی کو معلوم ہی نہیں ہو گا کہ ایس آر ون رائفل میں کیا خامی پائی جاتی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''گویا دوبارہ اپنی رقم اسی کاروبار میں جھونکنا چاہتی ہو۔''

وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔ ''بالکل نہیں، بس شادی کر کے دنیا کی سیر کو نکلیں گے۔''

میں ہنسا۔ ''تو تمھاری شادی سے پہلے شکلا کی موت کا منصوبہ نہ سوچ لیں۔''

اس نے مشورہ دیا۔ ''میرا خیال ہے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈنے کے لیے گوگل کا سہارا لیتے ہیں۔''

''چلو۔'' میں خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ کمپیوٹر آن کر کے ہم انٹرنیٹ پر ممبئی کا نقشہ دیکھنے لگے۔ اور پھر کافی دیر کسی ہوٹل کی تلاش کرتے رہے۔ اس سے پہلے بھی ہم شکلا کی کوٹھی کو ہدف بنانے کی کوشش کر چکے تھے۔ تب ہم نے وشال گپتا

کی فرمائش پر ''شری پتی آرکیڈ'' کو کمین گاہ چنا تھا۔لیکن اب وہ جگہ مناسب نہیں تھی۔اگر شکلا کے دل میں رائی برابر بھی شک ہوتا تو اس نے 'شری پتی آرکیڈ' کی نگرانی ضرور کرانا تھی۔

دو تین مقامات کا انتخاب کر کے ہم نے اگلے دن وہاں کی تفصیلی قراولی کا منصوبہ بنایا اور آرام کرنے لیٹ گئے۔

—●—

دس بجے ہم جانے کو تیار تھے۔پرما کو ناشتے میں خواب آور دوائی پلا دی تھی۔کیوں کہ ہمارا کام کافی طویل تھا۔شام تک بہ مشکل ہی واپسی ہو پاتی۔

لورا اسے ہتھکڑی لگانے پر بہ ضد ہوئی لیکن مجھے مناسب نہ لگا۔ہم نے رات کو لوٹنا تھا۔اور انسان فطرتی حاجتوں کے سامنے بے بس ہوتا ہے۔بندھے ہونے کی حالت میں بے چاری کیا کرتی۔کوئی جانور تو تھی نہیں کہ اپنی غلاظت اس کے لیے بے معنی ہوتی۔ویسے بھی لکڑی کا دروازہ اتنا مضبوط تھا کہ پرما جیسی نرم و نازک لڑکی اسے توڑنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

جانے سے پہلے میں نے ایک نظر پرما کو دیکھنا ضروری سمجھا تھا۔وہ بغیر کمبل اوڑھے سو گئی تھی۔سردی کی وجہ سے گھٹنے چھاتی تک سکیڑے وہ چھوٹی سی بچی ہی لگ رہی تھی۔

اسے کمبل اوڑھا کر میں باہر نکلا۔اور دروازہ باہر سے بند کر کے نیچے آ گیا۔لورا ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے میری منتظر تھی۔ممبئی میں بلند و بالا عمارات کی کمی نہیں ہے۔زیادہ تر اچھے ہوٹل کئی منزلہ ہیں۔(ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ میں عموماً مقامات اور افراد کے اصل نام لکھنے سے گریز کرتا ہوں۔کیوں کہ یہ کوئی تاریخی دستاویز نہیں ہے۔اور قارئین کو بھی واقعات سے غرض ہوتی ہے نہ کہ مقامات یا افراد کے ناموں سے)

دو ہوٹلوں کی تفصیلی قراولی کے بعد ہم ''بی ایس رائلز ممبئی'' کے اندر موجود تھے۔یہ ایک چالیس منزلہ بہترین ہوٹل تھا۔پہلے ہوٹلوں کو ہم متفقہ رائے سے مسترد کر چکے تھے،کیوں کہ شکلا کی کوٹھی اور ان ہوٹلوں کے بیچ ایسی عمارتیں حائل تھیں جن کی وجہ سے کوٹھی کے سبزہ زار تک دکھاؤ میسر نہیں آ رہا تھا۔بی ایس رائلز ممبئی پہلے والوں سے بلند بھی تھا اس کے اور شکلا کی کوٹھی کے درمیان کوئی اونچی عمارت بھی موجود نہیں تھی۔اور ہوٹل کی کھڑکیاں بھی ایسی بنی ہوئی تھیں جہاں سے فائر ریٹ کر فائر کر سکتا تھا۔لورا نے چھت سے فائر کرنے کا مشورہ دیا لیکن میں کسی کمرے کو کمین گاہ بنانے پر مصر تھا۔چھت پر ہر دم کسی نہ کسی کی آمد کا شبہ رہتا،جبکہ کمرے میں ہم بالکل اطمینان سے فائر کر سکتے تھے۔

لورا نے منہ بنایا۔''بالائی منزل پر کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔''

میں اطمینان سے بولا۔''عارضی طور پر کسی بھی کمرے کے مکینوں کو یرغمال بنانا مشکل نہیں ہوگا۔''

وہ متفق ہوئی۔''ٹھیک ہے،لیکن فی الحال چھت ہی سے جائزہ لے لیتے ہیں۔''

ہم چھت پر چڑھ گئے۔شمالی جانب کی منڈیر کے ساتھ اوندھے لیٹ کر میں نے آنکھوں کے ساتھ دوربین لگا لی۔لورا نے بھی میرے پہلو میں جگہ سنبھال لی تھی۔

میرا موبائل فون بجا۔دوربین لورا کی طرف بڑھا کر اسکرین پر نگاہ دوڑائی تو ڈاکٹر سجاتا کا نام چمکتا نظر آیا۔اس کی کال عموماً آتی رہتی تھی۔وہ وقت اس سے گپیں ہانکنے کا نہیں تھا۔کال منقطع کرتے ہوئے میں نے پیغام بھیج دیا۔

''فی الحال مصروف ہوں،بعد میں کال کرتا ہوں۔''

موبائل جیب میں ڈال کر میں بیگ سے ''لیزر رینج فائینڈر'' (فاصلہ ناپنے کا آلہ) نکالنے لگا۔اسے مختصراً ایل آر ایف کہتے ہیں۔اسی وقت جوابی پیغام کی گھنٹی بجی۔یقیناً سجاتا نے۔''ٹھیک ہے۔'' کا پیغام بھیجا تھا۔مگر اتنا وقت کہاں تھا کہ

پیغام پڑھ پاتا۔ ''میسج ٹون'' کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے ایل آر ایف آنکھوں پر لگا کر کوٹھی کی اندرونی عمارت پر مرتکز کیا۔ اور ٹریگر بٹن کو ایک سیکنڈ دبا کر چھوڑ دیا۔ اگلے ہی لمحے ایل آر ایف کی اندرونی اسکرین پر 2079 کا ہندسہ چمکا جو عمارت کا فاصلہ تھا۔ ایک دو شوٹ لے کر میں نے فاصلے کی تصدیق کی اور پھر ایل آر ایف لورا کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے بھی فاصلہ ناپا۔ اور ساتھ ہی فکر مندی ظاہر کی۔

''یار! کچھ زیادہ نہیں ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کتنا ہے؟''

وہ مایوسی سے بولی۔ ''2080، میرا خیال ہے شری پتی آرکیڈ سے فائر کرنا ہی بہتر رہے گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''ایس آر ون کی رینج کتنی ہے؟''

''دو کلومیٹر۔''

میں متبسم ہوا۔ ''پھر فکر مندی کاہے کی۔''

وہ مدبرانہ لہجے میں بولی۔ ''موقع ضائع کرنے والی بات ہے، اتنے فاصلے پر غلطی کی گنجائش موجود رہتی ہے۔ جب قریب سے فائر کرنے کی سہولت موجود ہے تو کیوں خطرہ مول لیا جائے۔''

''ایس ایس پر سچ میں اعتبار نہیں رہا یا جان بوجھ کر توہین پر تلی ہو۔'' پر اعتماد لہجے میں کہتے ہوئے میں نے اس کی پرکشش آنکھوں میں گھورا جو شوخ نیلے لینز کی وجہ سے گلگارے کی آنکھوں جیسی لگ رہی تھیں۔

میرا ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے صفائی پیش کی۔ ''چاہتی تھی لبلبی میں دباؤں اور بس۔''

''اور میں چاہتا ہوں اپنی دوست کی توہین کا بدلہ میں لوں تاکہ جب وہ بہت زیادہ دور چلی جائے تب بھی مجھے بھلا نہ سکے۔''

اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی نمودار ہوئی۔ اور وہ جذباتی ہوتے ہوئے بولی۔ ''اتنا آسان ہے نا تمہیں بھلانا۔''

میں نے فوراً موضوع تبدیل کیا ''چلیں، دو ہوٹلوں کی قراولی اب تک باقی ہے اور سہ پہر ڈھلنے کو ہے۔ اندھیرا ہونے پر اطمینان بخش دیکھ بھال نہیں ہو سکے گی۔''

''چلو۔'' دلفریب مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے وہ کھڑی ہو گئی۔

نیچے اتر کر ہم اگلے ہوٹل کی طرف بڑھ گئے، پارکنگ میں کار کھڑی نہیں کر پائے تھے کہ موبائل فون بجنے لگا۔ ڈاکٹر سجاتا کی کال آ رہی تھی۔

رابطہ منقطع کر کے میں نے، گیئر پر ہاتھ رکھا، لیکن گھنٹی دوبارہ بجنے لگی۔

''اسے کیا مسئلہ ہے۔'' ناگواری سے کہتے ہوئے میں کار ریورس کرنے لگا۔ موبائل کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔

لورا نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''ڈاکٹر سجاتا۔'' کوفت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے میں نے کار مناسب جگہ لگا دی۔

لورا مسکرائی۔ ''ہماری معتقد ہو گئی ہے نا، اس لیے حال احوال پوچھنے کو کال کر لیتی ہے بے چاری۔ اس میں غصہ کاہے کا۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''موقع محل بھی دیکھا جاتا ہے، میں بار بار کال کاٹ رہا ہوں اور وہ گھنٹی کیے جا رہی ہے۔''

لورا معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''خوب صورت لڑکیوں کو نظر انداز ہونا اچھا نہیں لگتا جناب۔ اور اب کال وصول کر ہی لو، کہیں مشکل میں نہ پھنسی ہو بے چاری۔''

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے موبائل فون کان سے لگالیا۔ ''کال کیوں نہیں اٹھا رہے۔'' وہ چیخ پڑی تھی۔
میں نرمی سے بولا۔ ''حوصلے سے ڈاکٹر صاحب! کیا ہوگیا ہے جو ہانپ رہی ہو۔''
اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ ''بالائی منزل کے کمرے میں ایک لڑکی بند تھی۔''
ہم نے اسے پرما کے بارے بالکل سن گن نہیں لگنے دی تھی۔ یوں بھی وہاں وہ صرف ایک دن آئی تھی۔ پھر میں نے منع کر دیا تھا اس لیے کال پر بات کر لیتی تھی۔
''پریشان نہ ہوں میں آ کر وضاحت کر دیتا ہوں۔''
''وہ بھاگ گئی ہے۔'' ڈاکٹر سجاتا نے میرے سر پر بم پھوڑا۔
''کک..... کیا..... کیسے؟..... ہوش میں تو ہو۔'' میں چیخ پڑا تھا۔
وہ گھبراتے ہوئے بولی۔ ''مم..... میں آپ کو لینے آئی تھی۔ گھنٹا ڈیڑھ پہلے ہی بھیا کی کال وصول ہوئی۔ وہ واپس آ رہے ہیں۔ سوچا آپ کو اپنے ہاں لے جاؤں۔''
میں غم و غصے سے دھاڑا۔ ''مگرتا کا جھانکی کا کس نے کہا تھا۔''
''سس..... سوری..... مم..... مجھے کوئی پتا نہیں یہ کیسے ہوا۔ میں تو بس آپ کی آمد سے پہلے کمروں کی حالت درست کرنا چاہتی تھی۔ تاکہ وہاں آپ کی موجودگی کے نشان مٹا دوں۔ او..... اوپر پہنچی تو کمرے میں ایک لڑکی سوئی نظر آئی۔ میں نے تجسس کے ہاتھوں اسے جگا دیا۔ حالانکہ مجھے بند دروازے کو دیکھ کر اندازہ کر لینا چاہیے تھا..... پلیز راجا مجھے معاف کر دو۔''
موبائل فون ڈیش بورڈ پر پھینکتے ہوئے میں نے سر پکڑ لیا تھا۔ لورا ابھی میری حالت دیکھ کر پریشان تھی۔ اور بار بار۔
''ریجا کیا ہوا..... کیوں غصہ کر رہے ہو..... ٹھنڈے ہو جاؤ۔'' کہہ رہی تھی۔
میں نے جیسے ہی موبائل فون ڈیش بورڈ پر پھینکا، لورا نے جھپٹ کر اٹھایا اور ایک نظر اسکرین پر ڈال کر کال جاری ہونے کا یقین کر کے موبائل فون کان سے لگالیا۔
''ہیلو..... ڈاکٹر کیا بات ہے۔''
اور سجاتا کا جواب سنتے ہی اس کی بھی بولتی بند ہوگئی تھی۔ پرما کے معاملے میں میری لاکھ مخالفت کے باوجود وہ اسے بھاگنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ وہ بغیر کسی تردد اور شبے کے جانتی تھی کہ پرما کا حصول ہی میرا اصل مشن تھا۔ اور اب اسے دوبارہ اغواء کرنا یقیناً بہت دشوار ہونے والا تھا۔ مجھے سب سے بڑا مسئلہ ہی دیر سے تھا۔ پلوشہ کی جدائی مجھے بہت کھل رہی تھی۔ اور میری بہ قول شاعر وہ حالت تھی کہ.....

ادھیڑ ڈالے ہیں بخیے میرے جدائی نے
کہ کھا گیا ہے تیرا غم کتر کتر کے مجھے

دوسروں کی محبت و چاہت کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں اپنے جانان کے لیے ترس رہا تھا۔ بلاشبہ میرا تجربہ ہے کہ.....

چیت، بہار دا ایوں ناں ہے
جس آندی ہے ڈھولڑن نال

لیکن ذمہ داریوں نے کہیں کا نہیں رہنے دیا تھا۔ وہ صرف جدا ہی نہیں خفا بھی تھی۔ میرے احساسات سے بے خبر لورا، ڈاکٹر سجاتا کو کچھ سمجھا رہی تھی۔
''ڈاکٹر رونے کی ضرورت نہیں، ریجا تم سے خفا نہیں ہے۔ بس وقتی طور پر جذبات میں آ گیا تھا۔ اس لیے ڈانٹ

دیا۔اور اب دھیان سے میری بات سنو۔وہ لڑکی ایک بہت بڑے آرمی آفیسر کی بیٹی ہے۔جونہی گھر پہنچی پولیس اور ایجنسیوں نے مکان پر دھاوا بول دینا ہے۔اور اس سے پہلے کہ ایسا کچھ ہو تم فوراً پولیس کو بلالو۔ہم سے بالکل لاتعلق ہو جاؤ۔صاف بتادو بھیا بھابی ہنی مون سے لوٹ رہے ہیں اور تم ان کے مکان کا جائزہ لینے آئی تھیں۔آگے سے کمرے میں بند لڑکی ملی جو تمھارے دروازہ کھولتے ہی بھاگ نکلی۔گھر کے دوسرے کمروں میں بھی ایسے آثار موجود ہیں جیسے وہاں کئی دنوں سے لوگ رہ رہے ہوں۔ہمارے پیغام نمبر اور یہ کال کی یاداشت وغیرہ اپنے موبائل فون سے مٹادو۔سمجھ میں آگئی میری بات۔'' چھوٹے سے وقفے کے بعد وہ بولی۔

''بتادیا نا ریجا خفا نہیں ہے۔خود کو سنبھالو، وقت ضائع نہ کرو اور جو کہا ہے اس پر فوراً عمل کرو۔''

تھوڑا اور سمجھانے کے بعد اس نے رابطہ منقطع کیا اور احتیاط کی بنا پر اپنا اور میرا موبائل فون بند کردیا۔

میں اسٹیئرنگ پر سر ٹیکے بیٹھا تھا۔میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ تسلی دینے لگی۔

''ریجا پریشان کیوں ہوتے ہو، میں ہوں ناں تمھارے ساتھ۔جب تک پری نہیں ملے گی واپس نہیں لوٹوں گی۔فی الحال اس خبیث کے قتل پر توجہ مرکوز کرو۔امید ہے اس کی ہلاکت کے بعد پری کا اغواء زیادہ دشوار نہیں رہے گا۔''

سیدھا ہو کر میں نے سیٹ سے ٹیک لگائی اور اطمینان بھرے لہجے میں پوچھا۔''چلیں؟''

وہ خفگی سے بولی۔''تمھارا سنبھلنا حیران کن نہیں لگ رہا، البتہ تمھاری پریشانی نے ضرور متعجب کیا تھا۔''

میں ندامت سے بولا۔''سوری یار! جذباتی ہوگیا تھا۔''

''ڈاکٹر سجاتا بے چاری اتنا رو رہی تھی، کوئی ایسے بھی ڈانٹتا ہے۔اس نے کون سا جان بوجھ کر بھگایا۔بدقسمتی ہماری ہے کہ قراولی میں ضرورت سے زیادہ وقت صرف ہوگیا۔پری صبح سے سوئی تھی، ڈاکٹر نے ذرا سا ہلایا تو اٹھ گئی۔اور جب ڈاکٹر نے پوچھا تم کون ہو؟..... چالاک لڑکی نے فوراً اندازہ کرلیا کہ ہم موجود نہیں ہیں۔پس سجاتا کو دھکا دے کر ننگے پاؤں بھاگ پڑی۔ڈاکٹر پہلے تو ششدر رہ گئی تھی، پھر وہ بھی اس کے پیچھے باہر نکلی، مگر تب تک پرما گھر سے نکل کر گلی میں پہنچ چکی تھی۔سجاتا نے باہر جھانکا تو وہ بھاگتے ہوئے سڑک کی طرف جارہی تھی۔سجاتا میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ اس کا پیچھا کرکے گرفتار کرسکتی۔وہ بے چاری بس اندازہ لگا رہی تھی کہ اس سے بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے۔اور تمھارا برتاؤ دیکھ کر مزید پریشان ہوگئی۔اگر میں اسے نہ سنبھالتی تو بری طرح پھنس جاتی۔''

''جس طرح پرما بھاگی ہے، میرے خیال میں ڈاکٹر سجاتا ذرا سا بھی مشکوک نہیں ٹھہرتی۔کیوں کہ اس نے پرما کو جگا کر اس سے تعارف پوچھا۔اور پرما نے بھاگنے میں ذرا سی دیر بھی نہ لگائی۔''

اس نے میری توجہ بٹائی۔''اب چھوڑو اس موضوع کو اور مشن پر توجہ مرکوز کرو۔''

میں نے گہرا سانس لیا۔''مجھے نہیں لگتا اب اس کی ضرورت باقی ہے۔بس کہیں چل کر آرام کرتے ہیں۔میرا سونے کو دل کررہا ہے۔''

وہ برہم ہوئی۔''ذرا مجھے بھی سمجھادو کہ ضرورت کیوں نہیں ہے۔''

میں نے خیال ظاہر کیا۔''اب تک پرما گھر پہنچ گئی ہوگی۔اس سے تفصیل جان کر شکلا کو میرا جھوٹا ہونا واضح ہوجائے گا۔یقیناً اس کے بعد تقریب وغیرہ کا اہتمام ثانوی رہ جاتا ہے۔''

لورا نے کھل کر اختلاف کیا۔''تقریب کا اہتمام فقط تمھاری ملاقات کو نہیں تھا۔اس کے پوتے کی سالگرہ ہے۔اور امید یہی ہے کہ اب تک دعوت نامے اہم افراد تک پہنچ گئے ہوں گے۔مجھے نہیں لگتا تمھاری سوچ کے مطابق ہوگا۔''

میں ڈٹا رہا۔''وہ مکار شخص بدک جائے گا اور مجھے نہیں امید وہ ہدف بننے کا خطرہ مول لے گا۔''

وہ حتمی لہجے میں بولی۔ ''تمھارے اندیشے تخمینی ہیں۔ اور فقط احتمال کی بنیاد پر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتے۔ 'بی ایس رائلز' میں ایک دو دن کے لیے کسی کا زبردستی مہمان بننا اتنا مہنگا سودا نہیں ہے کہ تمھیں لیت ولعل کرنے کی ضرورت ہو۔''

بلاشبہ اس کا تجزیہ مجھ سے بہتر تھا۔ پرما کے بھاگ جانے کی فکر نے مجھے قنوطی کر دیا تھا۔ ورنہ شکلا سے ملاقات کا طے ہونا لازم نہیں کرتا تھا کہ ہم اسے دور مار رائفل سے قتل کرنے والے تھے۔ یوں بھی اس ملاقات کا اصرار شکلا کی طرف سے ہوا تھا۔ اور بالفرض تقریب نہ بھی ہوتی، ہمارا تیاری کرنا نقصان کا باعث تو نہیں بن سکتا تھا۔ البتہ اس کے برعکس ہونے کی صورت میں موقع ضائع ہونے کا قلق ہمیشہ رہتا۔

اس سے اتفاق کرتے ہوئے میں نے چپکے سے کار پارکنگ سے نکالی اور بی ایس رائلز ممبئی کی جانب بڑھ گیا۔ ان ہوٹلوں کا فضائی فاصلہ ایک دوسرے سے اتنا زیادہ نہیں تھا۔ البتہ عمارتوں کی کثرت، بے تحاشا ٹریفک، لوگوں کا ہجوم ایسے عوامل تھے جس کی وجہ سے تیزی سے حرکت کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ راستے میں ہم رہائش کے حصول کا منصوبہ تشکیل دے چکے تھے۔ اور پھر بی ایس رائلز سے ذرا فاصلے پر تھے کہ اچانک میرے دماغ میں ایک تجویز آئی۔ اور میں نے فوراً لورا کے گوش گزار کر دی۔

''کبھی کبھی تم مجھے حیران کر دیتے ہو۔'' اس نے میری تعریف میں بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ اور پھر ایک موبائل فون نکال کر شکلا کا نمبر ڈائل کر کے اسپیکر آن کر دیا۔ دو تین گھنٹیوں کے بعد کال وصول ہوئی۔

''ہیلو۔'' شکلا کی کرخت آواز ابھری۔

لورا اطمینان سے بولی۔ ''امید ہے تمھیں نواسی مل گئی ہوگی۔''

شکلا نے پوچھا۔ ''مگر اتنی دیر سے واپس کرنا میری سمجھ سے باہر ہے۔''

''ارادہ بدل گیا تھا، مگر پھر ایک دوست کے سمجھانے پر کڑوا گھونٹ پینا پڑا۔ سوچا پری بے قصور ہے اور تمھارے گناہ کی سزا اسے دینا مناسب نہ ہوگا۔''

شکلا نے دانت پیسے۔ ''تم نے رائفلوں کے بارے بھی خیانت کی۔ اور یقیناً تم پہلے ہی سے مجھے دھوکا دینے آئی تھیں۔''

''ایسا ہی ہے۔ اور اب بہ ظاہر تو ہماری دشمنی کو ختم ہو جانا چاہیے۔''

وہ خوش دلی سے بولا۔ ''بالکل اور اس کا ثبوت تم میری تقریب میں شامل ہو کر دے سکتی ہو۔''

وہ زہر خند ہوئی۔ ''شکلا تم ٹھیا گئے ہو، فوج نے تمھیں دفع کر دیا ہے تو اب بہتر ہوگا جرم کی دنیا سے بھی کنارا کش ہو جاؤ۔''

شکلا نے قہقہہ بلند کیا۔ ''یاد ہے پہلی بار رائفلوں کے سودے کے ساتھ یہ بھی طے ہوا تھا تم ایک مہینا میری میزبانی کرو گی۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے انتیس دن اب بھی بقایا ہیں۔''

لورا کا چہرہ شرم، ذلت و غصے سے گلنار ہو گیا تھا۔ بہ مشکل خود پر قابو پاتے ہوئے وہ نارمل لہجے میں بولی۔ ''یہ یاد دہانی تب کرانی تھی نا جب پرما میرے پاس تھی۔ اب تو اسے آزاد کر دیا ہے پھر بکواس کرنے کا مطلب۔''

شکلا نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ ''سچ میں بے بی، تم جیسی بہت کم ہی ملی ہیں۔''

لورا نے یہ وار بھی سہہ لیا۔ ''امید کرتی ہوں میرا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ آدھے گھنٹے تک میں ممبئی سے نکل جاؤں گی۔ کبھی دوبارہ ملاقات ہوئی تو میزبانی کا حساب بھی برابر کر دوں گی۔ اور ہاں بھونک اچھا لیتے ہو۔'' جوابی بات سنے

بغیر اس نے رابطہ منقطع کیا اور موبائل فون بند کر کے کار سے باہر اچھال دیا۔ ایسے کئی موبائل فون ڈاکٹر دیوانشش کے ہاں سے ہمارے ہاتھ لگے تھے۔

لمحہ بھر غصے پر قابو پانے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ ''کیسا رہا؟''

''بہترین۔'' میں نے تحسین آمیز انداز میں سر ہلا دیا تھا۔

بی ایس رائلز پہنچنے تک شام کا ملگجا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ سائن بورڈوں، کھمبوں، دیواروں اور چھتوں کے کناروں پر لگی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ کار پارکنگ کے کونے میں کھڑی کر کے ہم باہر نکلے۔ میں نے ایس آر ون کا بیگ ڈگی سے نکال لیا تھا۔ تھنڈر بولٹ کی ضرورت پیش نہیں آسکتی تھی کہ اس کی رینج ہزار میٹر تھی اور ہمیں دو کلومیٹر کے فاصلے پر فائر کرنا تھا۔

لفٹ کے ذریعے ہم بالائی منزل پر پہنچے۔ ہمارے مطلب کے کمرے وہ تھے جن کی کھڑکیاں شمال کی جانب کھلتی تھیں۔ ان میں بھی سب سے بہتر کونے والے دو کمرے تھے۔ کونے سے پہلے والے کمرے کے سامنے رک کر لورا نے دستک دی۔ میں ساتھ والے کمرے کے سامنے یوں کھڑا ہو گیا جیسے اندر جانے کو دروازہ کھول رہا ہوں۔

دو تین لمحے بعد دروازہ کھلا۔ ''جی؟'' میرے کانوں میں سوالیہ مردانہ آواز گونجی۔

لورا اعتماد سے بولی۔ ''مسٹر شکلا سے ملاقات طے تھی۔ غالباً کمرے کا نمبر 390 ہی بتایا گیا تھا۔''

وہ اوباشانہ انداز میں بولا۔ ''مس یہاں کوئی شکلا نہیں رہتا۔ البتہ چاہو تو نادر خان تمھیں اس کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گا۔'' لورا کا انداز کسی پیشہ ورانہ طوائف کا سا تھا۔ انڈیا میں جسم فروشی کا دھندہ عروج پر ہے خاص کر ممبئی تو اس کا گڑھ ہے۔ زیادہ جدید قحبہ خانے ایسے ہیں جہاں لڑکیاں ایک فون کال پر مطلوبہ مقام پر پہنچ جاتی ہیں۔

لورا نے بے باکی سے جواب دیا۔ ''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں اپنی جیب سے مشورہ کر لو۔''

وہ باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''تمھاری شکل دیکھنے کے بعد کون کم بخت جیب سے مشوروں کرنے کے چکر میں پڑے گا۔''

لورا نے اس کے اکیلے ہونے کی تصدیق کرنا چاہی۔ ''ایک سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔''

''اکیلا ہی ہوں جانِ من۔'' اس نے لورا کو پکڑنے کو ہاتھ بڑھایا۔

بائیں ہاتھ سے اس کی پیش قدمی کو روکتے ہوئے لورا نے دائیں ہاتھ سے سائیلنسر لگا زگانہ نائین ایم ایم اس کی چھاتی پر رکھ دیا۔ ''اتنی بھی کیا جلدی ہے دوست۔''

''یہ کیا ہے؟'' نادر خان کے لہجے میں ڈر سے زیادہ طنز تھا۔

''تمھیں اتنا انجان نہیں ہونا چاہیے۔'' قریب پہنچتے ہوئے میں نے لقمہ دیا۔ چونکہ وہ دونوں انگریزی میں بات کر رہے تھے اس لیے مجھے بھی انگریزی ہی بولنا پڑی تھی۔

''غلط بندے پر ہاتھ ڈال رہے ہو۔'' نادر خان گھبرایا نہیں تھا۔ اس کا اعتماد بھرا انداز ظاہر کر رہا تھا وہ جرائم پیشہ شخص تھا۔ کوئی عام بندہ مسلح افراد کا سامنا یوں بے خوفی سے نہیں کر سکتا۔ مگر ہم ایک بار ظاہر ہو گئے تھے تو پیچھے ہٹنا مناسب نہیں تھا۔

میں نے اس کی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''اس کا فیصلہ تمھاری صوابدید پر نہیں چھوڑ سکتے۔ انٹرویو لینے کے بعد ہی طے کریں گے۔''

وہ دو تین قدم پیچھے ہوا۔ ہم اندر گھس گئے، لورا دروازہ بند کرنے لگی۔ اس کا غافل ہونا نادر خان کو غلط فیصلے پر مجبور کر

گیا تھا۔ مجھے نظر انداز کرتے ہوئے اس نے لورا کے ہاتھ پر لات رسید کرنا چاہی۔ مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کن کے قبضے میں ہے۔ اس کے تیس ہم عام سے اچکے تھے۔ اور اتنے بودے تھے کہ جن پر قابو پانے کو اسے صرف لورا کو غیر مسلح کرنے کی ضرورت تھی۔

اس کی ٹانگ کے حرکت میں آتے ہی میرا ایک ہاتھ اس کی متحرک ران کے نیچے گھسا اور دوسرا ہاتھ اس کی پیٹھ کے پیچھے ڈال کر میں نے گھما کر دیوار پر دے مارا۔

''اوغ.....'' اس کے ہونٹوں سے درد بھری کراہ نکلی اور اس نے کمر ہاتھ رکھ لیا۔

لورا نے استہزائی قہقہہ بلند کیا۔ ''اسے کیا ہوا جو دیواروں کو ٹکریں مار رہا ہے۔''

''اسی سے پوچھ لو۔'' اطمینان بھرے انداز میں کہتے ہوئے میں اس کے قریب ہوا۔ تب تک وہ لڑکھڑاتے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا۔

''اور ورزش کرنی ہے یا میں تلاشی لے لوں۔'' اس بار میں اردو میں بولا تھا۔

ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ چپ رہا۔ ایک ہی ضرب نے اسے جتا دیا تھا کہ اچھل کود بے سود تھی۔

میں نے ماہرانہ انداز میں اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا۔ پنڈلی سے بندھے باریک دھار کے خنجر نے میرے یقین کو تقویت دی تھی۔ خنجر اور اس کا موبائل فون اپنے قبضے میں کر کے میں پیچھے ہو گیا۔

لورا نے بیڈ کے قریب پہنچ کر تکیہ اٹھایا، نیچے زستاد اتیس بور پستول اور اس کا بٹوا پڑا تھا۔

پستول کو اپنی پتلون میں اڑستے ہوئے لورا بولی۔ ''اپنا رشتہ دار لگتا ہے۔'' ساتھ ہی بٹوا اٹھا کر اندر سرسری نظر دوڑائی اور واپس رکھ دیا۔

''بیٹھو۔'' بیڈ پر نشست سنبھال کر میں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے تشریف ٹیکنے کی اجازت دی۔

کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ اطمینان سے بولا۔ ''مجھے قتل کرنے کے علاوہ کچھ حاصل نہ کر سکو گے۔''

میں ہنسا۔ ''یہ کم ہے کیا۔''

لورا درشتی سے بولی۔ ''ریجا انگریزی میں بات کرو۔''

میں نے وضاحت کی۔ ''بھائی کہہ رہا ہے ہمارے پاس فقط اسے قتل کرنے کا انتخاب موجود ہے۔ اور کچھ نہیں کر سکتے۔''

نادر خان جلدی سے بولا۔ ''میں نے سارا مال دوسری پارٹی کے حوالے کر دیا ہے۔''

لورا نے پوچھا۔ ''کون سا مال؟''

نادر خان نے حیرانی بھرے انداز میں تصدیق چاہی۔ ''تم منوج جوشی کے آدمی ہو نا؟''

لورا ہنسی۔ ''تمھیں ایسا لگتا ہے تو تمھاری مرضی۔''

میں کھڑکی کے نزدیک پہنچا اور پردے ہٹا کر سامنے دیکھنے لگا۔ بلاشبہ وہ جگہ نہایت مناسب تھی۔ شکلا کی کوٹھی کی روشنیاں جل گئی تھیں۔ محل نما کوٹھی اندھیرے میں بھی اپنی آب و تاب کی وجہ سے پہچانی جا رہی تھی۔

نادر خان سنبھل کر بولا۔ ''کیا چاہتے ہو؟''

''کیا دے سکتے ہو۔'' لورا اسے چھیڑنے پر تلی تھی۔

اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ ''تم میرے بٹوے میں جھانک چکی ہو۔ اس کے علاوہ تو کچھ نہیں ہے۔''

لورا نے درشتی ظاہر کی۔ ''پھر تو مرنا پڑے گا۔''

وہ حیران ہوا۔ ''میرے پاس رقم کا نہ ہونا کوئی ایسا قصور نہیں کہ موت کی سزا سنائی جائے۔''

لورا نے مجھے مخاطب کیا۔ ''ریجا! اس کی بات میں وزن ہے۔''

میں کھڑکی کا پردہ برابر کر کے ان کے نزدیک آیا۔ ''تم مسلمان ہو؟''

وہ فخر سے بولا۔ ''الحمدللہ۔''

میرا تجربہ ہے کہ گناہ گار سے گناہ مسلمان بھی اپنے مذہب سے بیزار یا شاکی نہیں ہوتا۔ انجانے میں اللہ پاک کی ذات بابرکات سے شاکی ہو سکتا ہے، لیکن یہ نہیں کہ اسے مسلمان ہونے پر ندامت ہو۔ اسلام کے برعکس کسی بھی مذہب کے پیروکار کا اپنے مذہب کے بارے بتانے کا یہ طریقہ نہیں ہوتا۔ وہ خالی اقرار کرتے ہیں کہ ہاں ہم ہندو، سکھ، عیسائی، یہودی وغیرہ ہیں۔ یعنی بھگوان کی کرپا سے ہندو ہوں، واہ گرو کا شکر ہے سکھ ہوں، تھینکس گاڈ کہ عیسائی ہوں وغیرہ سننے کو نہیں ملتا۔ یہ میرا تجربہ ہے، کوئی طے شدہ کلیہ یا اصول نہیں ہے۔

میں نے اگلا سوال پوچھا۔ ''کیا کرتے ہو؟''

وہ گھمبیر لہجے میں بولا۔ ''اسے باضابطہ تفتیش سمجھوں یا تجسس۔''

''اچھا رہنے دو۔'' جیب سے باریک ریشمی ڈوری نکال کر میں اس کی طرف بڑھا۔ ''البتہ تمھارے ہاتھ باندھنا پڑیں گے۔''

اس نے الجھن ظاہر کی۔ ''ایسا کرنا ضروری ہے۔''

''پتا نہیں، مگر کھلا نہیں چھوڑ سکتے۔''

''اگر میرے ساتھ دشمنی نہیں ہے تو مجھے جانے دو۔ کمرے کا ایک ہفتے کا کرایہ ادا کر چکا ہوں، کہتے ہو تو دو آدمیوں کے کھانے وغیرہ کی ادائی بھی پیشگی کر دیتا ہوں۔''

میں خاموشی سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھنے لگا۔ کسی مجرم کے ہاتھ باندھنے کو بھی مہارت چاہیے۔ کیوں کہ عام قسم کی گانٹھیں ایسے افراد آسانی سے کھول لیتے ہیں۔ ہمیں دوران کورس گانٹھوں کی اٹھارہ اقسام پڑھائی گئی تھیں۔ اور وہ گانٹھیں عملی زندگی میں بہت سے مواقع پر کام آتی رہیں ہیں۔

''ہاں، ناں تو کر دیں بھائی۔'' اس نے جواب پر اصرار کیا۔

''اپنی کہانی سنا دیتے تو شاید میں سوچنے کی زحمت گوارا کر بھی لیتا۔'' خشک لہجے میں کہہ کر میں نے گانٹھ کے ختمے لگائے جو رسی کو سرکنے سے روکتے ہیں۔ ورنہ ریشمی ڈوری آسانی سے کھولی جا سکتی ہے۔

''بیڈ اکیلا ہے اور ہم تین۔'' کرسی چھوڑ کر لورا نے بیڈ پر قبضہ جمایا۔ ''اور یقیناً ''لیڈیز فرسٹ'' کا اصول تمھیں بھی ازبر ہوگا۔''

''نہیں مجھے تو ''جینٹس مسٹ'' کا اصول پڑھایا گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ آدھے بیڈ کی قربانی دے سکتا ہوں۔''

وہ شوخ لہجے میں بولی۔ ''اب اتنے بھروسے لائق بھی نہیں ہو کہ اپنے ساتھ سلا لوں۔''

میں ترکی بہ ترکی بولا۔ ''یہ تمھارا مسئلہ ہے۔ اور میرا مسئلہ ہے بیڈ پر سونا۔ تم اپنا مسئلہ حل کرو جس کا متبادل فرش پر بچھا بہترین قالین ہے۔''

اس نے آنکھیں نکالیں۔ ''ریجا باز آ جاؤ۔''

''میں یاتم۔'' اطمینان سے کہتے ہوئے میں نے بھی بیڈ پر نشست سنبھال لی۔

اس نے مزاحیہ انداز میں دھمکی دی۔ ''میں پیلا دشہ کو گھنٹی کر کے بتا دوں گی کہ تم میرے ساتھ سوتے ہو۔''

دل کی دھڑکن ہلکا سا گڑبڑائی، کم بخت نے کس کا نام لیا تھا۔ میرے ہونٹوں پر تبسم ابھرا، اپنی شہزادی کا مکھڑا آنکھوں کے سامنے نمودار ہوا اور میں کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ''اس کا نمبر کہاں سے ڈھونڈو گی۔''

''کبھی تو مل ہی جائے گا، بلکہ میجر جینی سے مانگ لوں گی۔''

''پھر تو مجبوری ہے۔'' میں بیڈ چھوڑ کر کرسی پر آ بیٹھا۔

لورا کے چہرے پر تعجب نمودار ہوا، ہنستے ہوئے بولی۔ ''یار مذاق کر رہی تھی۔''

''شاید، مگر میں سچ میں ڈر گیا ہوں۔ یقین مانو محبت کرنے والی بیوی ایسی باتوں پر فوراً سے پہلے یقین کرتی ہے۔ ہمارے ہاں مثل مشہور ہے، سانپ کا ڈسا رسی سے بھی ڈرتا ہے اور دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک مار کر پیتا ہے۔''

ہم نے نادر خان کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ یوں بھی اس کے بارے تفصیل جاننا ہمارے کسی کام کا نہیں تھا۔ آنے والے کل کی شام تک کا وقت اتنا طویل نہیں تھا کہ اس کے ساتھ مغز کھپاتے۔ سیانے کہتے ہیں جس گاؤں نہ جانا ہو اس کا پتا دریافت کرنا حماقت ہے۔

وہ شوخ لہجے میں بولی۔ ''پتا ہوتا اس سے اتنا ڈرتے ہو تو دھونس جما کر کئی کام نکلوا لیتی، کم از کم پری کی پٹائی تو کہیں نہیں گئی تھی۔''

میں مسوس کر رہ گیا تھا۔ ''احمق ڈاکٹر نے کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ دوبارہ جانے کتنی محنت کرنا پڑے۔''

وہ اعتماد سے بولی۔ ''ریجا جانے بھی دو۔ اس موذی سے جان چھوٹنے دو پری کو لانا میری ذمہ داری ہے۔''

میں نے مطعون کیا۔ ''تم کب سے اتنی اچھی بن گئی ہو۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''ہاں تمھارے نزدیک تو اچھا ہونا خوب صورت لڑکیوں کی خدمت گزاری ہے نا۔''

''کب تمھاری خدمت کی ہے یا خود کو خوب صورت نہیں سمجھتی ہو۔''

اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ ''کافی عرصے سے خدمت کر رہے ہو، بلکہ تھوڑی دیر پہلے ہی آرام دہ بیڈ سے دست بردار ہوئے ہو۔''

میں نے بھناتے ہوئے بولا۔ ''دھونس جما کر لیا ہے محترمہ۔''

''اچھا سچ بتاؤ، کیا پری ہوتی تو اسے نیچے سلاتے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، البتہ اس کی خوب صورتی میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ بلکہ کسی بھی لڑکی شکل وصورت میرے لیے لائق اہمیت نہیں ہے۔''

نادر خان مخل ہوا۔ ''اگر میری الجھن بھی سلجھا دو تو یقیناً دعائیں دوں گا۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''تم غیر ضروری حرکت نہ کر کے اپنی زندگی اور کھال بچا سکتے ہو۔ باقی جب تم کیپٹن پر حملہ کر رہے تھے تو میں نے اپنا تعارف تو کرا دیا تھا، مادام کی شناخت باقی ہے۔ شوق ہو تو موقع دے سکتا ہوں۔''

''دھمکانے کے بجائے اگر اپنا تعارف اور صحیح نظر ہی بتا دیتے تو احسان ہوتا۔''

لورا نے کہا۔ ''ہمیں عارضی استعمال کو یہ کمرہ چاہیے تھا اور بس۔''

وہ لجاجت سے بولا۔ ''میرے لیے تمھارا کمرے پر قابض ہونا قابل اعتراض نہیں ہے، البتہ اپنی درگت پر ضرور شاکی ہوں۔ جب میرے دشمن نہیں ہو اور میں بھی تمھیں نہیں جانتا تو کیوں نہ اچھے ماحول میں بات کی جائے۔''

''تم چھوٹی سی حماقت سے اپنی جان گنواؤ گے ہی، ہمارے لیے بھی مشکل کھڑی کر دو گے۔ اس لیے خطرہ مول لینے کا بالکل من نہیں کر رہا۔ البتہ خاموش بیٹھتے ہوئے بیزاری یا الجھن محسوس کر رہے ہو تو اپنی کہانی سنانا شروع کر دو۔ تم پر احسان

جھاڑتے ہوئے ہم سن لیں گے۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔''کافی نیک آدمی لگتے ہو، ورنہ اتنے بڑے احسان کرنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔''

لورا کھل کھلائی۔''خوش قسمت ہو جو اتنے نیک لٹیروں سے واسطہ پڑا ہے۔''

''مادام تم نام سے عیسائی لگتی ہو، بھائی کا نام شاید راجا ہے جسے ریجا پکارنا یقیناً تمہارے انگریزی لب و لہجے کا کمال ہے۔ باقی راجا نام، ہندو و مسلم دونوں قوموں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن غالباً ان کی بیوی کا نام پلوشہ ہے جس سے اندازہ کر سکتا ہوں کہ یہ مسلمان ہوں گے۔''

میں مصنوعی گھمبرتا سے بولا۔''ہمارے بارے اتنی جانکاری رکھنے والا اگر یہ سمجھتا ہے کہ زندہ چھوڑ دیا جائے گا تو یقیناً احمق ہے۔''

وہ ہکلایا۔''ق..... قسم سے..... میں اندازہ لگا رہا ہوں۔ تصدیق تو نہیں ہوئی۔''

لورا نے قہقہہ لگایا۔''ڈرا دیا بے چارے کو۔''

لورا کے قہقہے نے اس کے چہرے کی رونق لوٹائی اور وہ بغیر استفسار کے اپنے بارے بتانے لگا۔''میرا نام نادر خان ہے۔ عموماً اکیلے ہی کام کرتا ہوں۔ ہر قسم کی اسمگلنگ، مخصوص افراد کا اغواء، اندرون ملک غیر قانونی مال کی ترسیل، مخصوص اشیاء کی چوری وغیرہ میرے دھندے ہیں۔ اصول ہمیشہ یہی رکھا ہے کہ پیسہ کمانا ہے۔ البتہ معاوضا لے کر قتل کرنا اپنے اصولوں سے خارج ہے۔ نجو چکر باز کے نام سے مشہور ہوں۔ چند دن پہلے ایک نامی گرامی اسمگلر منوج جوشی کے آدمی سے کلو بھر کوکین خریدی جو اس نے پندرہ لاکھ کی قلیل رقم وصول کر کے میرے حوالے کی۔ بعد میں کم بخت پکڑا گیا۔ منوج جوشی کے جلادوں کے سامنے اس نے سب کچھ اگل دیا۔ اب منوج جوشی میرے درپے ہے کہ اس کا مال واپس کروں اور وہ میری رقم لوٹا دے گا۔ جبکہ میں کوکین آگے بیچ چکا ہوں یہ ہے میری گم بیتی۔''

میں نے کہا۔''اگر کبھی کبھار ٹی وی دیکھنے کا اتفاق رہتا ہو تو ہماری آپ بیتی روزانہ مرچ مسالہ لگا کر پیش کی جاتی ہے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔''مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا، بس چہرے دیکھ کر الجھن ہو رہی تھی۔''

''اگر الجھن سلجھ گئی ہے تو آرام سے کسی کونے میں لیٹ جاؤ کہ اب میں تمہارے پاؤں بھی جکڑنے والا ہوں۔''

وہ شاکی ہوا۔''مجھ پر اعتماد کیوں نہیں کر رہے۔''

میں اطمینان سے بولا۔''کیوں کہ اپنی جان پیاری ہے۔''

لورا کمبل میں گھستے ہوئے بولی۔''ریجا میں سو رہی ہوں، پہرے داری کا شوق خود ہی پورا کرتے رہنا۔ مجھے جگایا تو بغیر دیر کیے پیلا دشہ کو گھنٹی کروں گی۔''

میں نے پریشانی ظاہر کی۔''ایک اور مسئلہ بھی ہے مادام، کمبل صرف ایک ہے۔''

کمبل سے چہرہ باہر کر کے اس نے آنکھیں نکالیں۔''ایسا سوچنا بھی مت کہ اس کمبل میں جگہ مل جائے گی۔''

''کھانا نہیں کھانا۔'' مجھے اچانک ہی خیال آیا تھا۔

وہ اٹھ بیٹھی۔''بھوک تو لگی ہے، مگر باہر جانے کا بالکل موڈ نہیں ہے۔''

میں نے نادر خان سے باورچی خانے کا نمبر پوچھ کر ڈائل کیا اور انٹر کام کا رسیور کان سے لگا لیا۔

نسوانی آواز میں پوچھا گیا۔''روم سروس پلیز؟''

اور میں نے کمرہ نمبر بتا کر پر تکلف عشائیہ نوٹ کرا دیا۔

کھانے کی آمد میں ادھ پون گھنٹا لگ گیا تھا۔اس سے پہلے میں نے نادر خان و عارضی طور پر رہا کر دیا کہ عموماً ہر کمرے کی خدمت گزاری پر مخصوص ویٹریس مقرر ہوتی ہے جوان کمروں کے مکینوں کو اچھی طرح پہچانتی ہیں۔اور نادر خان کو نہ پا کر ویٹریس چونک سکتی تھی۔

''نجو چکر باز! یاد رکھنا میں نے زندگی میں صرف ایک کام ڈھنگ سے کیا ہے اور وہ ہے سر میں روشن دان کھولنا۔بہتر یہی ہوگا کہ مجھے نہ آزمانا، ورنہ تمہیں یقین لازمی آجائے گا، لیکن تم چلے جاؤ گے۔'' میں نے اسے دھمکانا ضروری سمجھا تھا۔

وہ اطمینان سے بولا۔''ضرور ڈرتا ،اگر کچھ کرنے کا ارادہ ہوتا۔باقی تمہارے بارے پہلے سے جانتا ہوں۔گورا جیوت دادا کے اغواء کی خبر ٹی وی پر نہیں چلی تھی مگر زیر زمین حلقوں میں اس کے کافی چرچے ہیں۔اور تم دونوں کو سراہنے والے کثیر تعداد میں ہیں۔ان میں میرا نام بھی شامل ہے۔''

میں نے قہقہہ لگایا۔''موخر الذکر فقرہ ظاہر کرتا ہے کہ تمہاری چکر بازی کی حس جاگ اٹھی ہے۔''

وہ ڈھٹائی سے بولا۔''خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔اور مادام کو دیکھنے کی خواہش رکھنے پر تو قسم کھا سکتا ہوں۔''

''کیوں؟'' لورا متعجب ہوئی۔

وہ کھسیاتے ہوئے بولا۔''ویسے ہی نشانہ باز لڑکیاں کم ہی نظر سے گزری ہیں ناں۔''

میں نے لورا کو چھیڑا۔''یہ تمہارے نینوں کے تیروں کا ذکر کر رہا ہے۔''

وہ برہمی سے بولی۔''مردوں کی رگ رگ سے واقف ہوں اسی لیے تو کبھی لبلبی دباتے ہوئے جھجک محسوس نہیں ہوئی۔''

نادر نادم ہوا۔''مادام میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔''

لورا تیکھے لہجے میں بولی۔''ذرا کہہ تو دیتے۔''

اسی گپ شپ کے دوران ہی دروازہ بجا، میں جلدی سے پردے کے پیچھے ہو گیا۔لورا نے دروازہ کھولا۔کالے رنگ کے تھری پیس سوٹ میں ملبوس خوش شکل ویٹریس ٹرالی کو دھکیلتے ہوئے اندر آئی۔اور میز پر کھانا چننے لگی۔اس نے لورا کی موجودی پر حیرانی ظاہر نہیں کی تھی، کیوں کہ وہاں رات رنگین کرنے کو ایسے مہمان کو بلانا انوکھا نہ تھا۔

کھانا لگا کر وہ ٹرالی دھکیلتے ہوئے باہر نکل گئی۔اس دوران لورا بہ ظاہر بے پروائی سے مگر بہ باطن چوکنے انداز میں ویٹریس پر نظر رکھے رہی۔اس کا دایاں ہاتھ جیب میں تھا۔اور یہ تو نادر خان اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کیا ہے۔

ویٹریس کے جاتے ہی لورا نے دروازہ قفل کیا، میں بھی باہر آ گیا۔کھانا کھا کر میں نے نادر خان کو کافی اور کمبل منگوانے کو کہا۔اس نے ساتھ وسکی کی بوتل بھی منگوالی۔لورا نے بھی کافی کے بجائے وسکی پینے کو ترجیح دی تھی۔وہ خال ہی شراب پیتی تھی۔بلکہ اپنے ٹھکانے پر اس نے کبھی شراب کی بوتل نہیں رکھی تھی۔البتہ ہوٹل وغیرہ میں کھانا کھاتے ہوئے کبھی کبھار ایک ادھ پیگ منگوا لیتی تھی۔

لورا نے پوچھا۔''ریجا! تم کیوں نہیں پیتے، نادر بھی تو مسلم ہے؟''

میں طنزیہ انداز میں بولا۔''نادر تو غیر عورتوں سے تعلقات بھی رکھتا ہے، اسمگلر بھی ہے، چوری ڈکیتی کرتے بھی نہیں جھجکتا لوگوں کو اغواء بھی کرتا ہے تو کیا مجھے بھی یہ سب کرنا چاہیے۔''

لورا ترکی بہ ترکی بولی۔''میں تمہاری بیوی ہوں جو ایک کمبل میں گھسنے پر تلے رہتے ہو۔پری کے آگے پیچھے بھی ایسے

گھومتے تھے جیسے تمھاری منکوحہ ہو۔تم نے راجپوت دادا اور پری،کو اغواء بھی کیا تھا،وشال گپتا کے ہاں ڈکیتی بھی کی،قاتل تو پکے ہو پھر صرف شراب نہ پینے میں تمھاری کون سی مسلمانی اٹکی ہے۔''

میں اطمینان سے بولا۔''میرے ہر عمل کے پس پردہ تکمیل مشن کی تحریک ہے۔میں نے اپنی ذات کے لیے کوئی جرم نہیں کیا۔''

وہ شرارت سے بولی۔''پری کو پھانسنا کون سا مشن تھا۔''

میں ریشمی ڈوری اٹھا کر نادر کے قریب ہوا۔''ناگوار نہ گزرے تو ہاتھ پیچھے کرنے کی زحمت کر لیں مہاراج! مادام کی بکواس تو اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوگی۔''

وہ لجاجت سے بولا۔''گنجائش نہیں ہو سکتی۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔''چکر باز کے ساتھ گنجائش کی تو اپنا بیڑا ڈبوئیں گے۔''

''کوئی ایسا طریقہ کہ میں ہاتھ پاؤں بندھوانے سے بچ جاؤں۔''

''غسل خانے میں سو سکتے ہو تو گنجائش نکال لیتا ہوں۔''

وہ ہاتھ پیچھے کرتا ہوا بولا۔''کس کے باندھنا،رسی کم پڑے تو الماری میں بھی رسی رکھی ہے۔''

لورا نے بے ساختہ قہقہہ بلند کیا۔''ریجا،پری کو تو بندش کی تکلیف سے بچانے کو رت جگا منا لیتے تھے۔اس بے چارے پر ترس کیوں نہیں آ رہا۔''

میں بھناتے ہوئے بولا۔''بھول گیا ہے اس عفیفہ نے کیا کیا تھا۔سر کا زخم ٹھیک ہونے میں ہفتہ لگ گیا تھا۔''

اس نے اپنے گلاس سے آخری گھونٹ بھر کر ایک اور قہقہہ بلند کیا۔''بہ ہر حال مجبور نہیں کرتی کہ یہ تمھاری ذمہ داری ہے۔اور اس کا پستول بھی سنبھالو''زستاوا میری جانب اچھال کر وہ کمبل میں گم ہو گئی۔

میں نے پستول پکڑ کر جیب میں ڈالا۔اور نادر سے پوچھا۔''اگر بیت الخلاء وغیرہ کی حاجت ہے تو پوری کر لو۔میں سو گیا تو پھر امید نہ رکھنا کہ تمھارے واویلے پر دھیان دوں گا۔''

''پھر چند منٹ رک جاؤ۔''وہ غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

میں اس کے پستول کا جائزہ لینے لگا۔عمدہ ساخت کا زستاوا تیس بور پستول (Zastava) جس کا بٹ بھورے رنگ کا تھا۔میں نے میگزین اتاری جو گولیوں سے بھری ہوئی تھی۔پستول کو کاک کر کے میں نے خالی ہونے کی تصدیق کی۔میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ ہر تربیت یافتہ آدمی جب بھی اسلحہ ہاتھ میں لے گا اس کے بھرے یا خالی ہونے کی تصدیق ضرور کرے گا۔میں ایک بار پہلے بھی زستاوا استعمال کر چکا تھا۔مگر میری اپنی پسند ہمیشہ سے گلاک رہا ہے۔بریٹا بھی بہترین پستول ہے۔اور میرے گلاک کو بریٹا پر ترجیح دینے کی کوئی ٹیکنکل وجہ بھی نہیں ہے۔عام طور پر تو جو پستول میسر ہو کام چلا لیتا ہوں مگر چناؤ کا موقع ملے تو میرا انتخاب گلاک ہی ہوتا ہے۔

غسل خانے کے دروازے پر آہٹ ہوئی اور میں نے میگزین لگا کر زستاوا جیب میں ڈال لیا۔

نادر خان نے کرسی پر نشست سنبھالی اور ہاتھ پشت پر باندھ لیے۔گویا وہ بندھنے کو تیار تھا۔اس کا تعاون آمیز رویہ مجھے ترغیب دے رہا تھا کہ اس پر اعتبار کروں۔

''کیا ہمیں تم سے کوئی خطرہ ہے؟''لورا کمبل میں گم تھی اس لیے میں نے اردو بولنے میں حرج نہیں سمجھی تھی۔

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔''تمھاری ساتھی کو ہو سکتا تھا اگر تعارف نہ ہوا ہوتا۔''

''ویسے کبھی کبھار دھوکا کھا لینا چاہیے۔''رسی جیب میں ڈال کر میں نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

وہ مسمسے لہجے میں بولا۔ ''میرا تو خیال ہے ایسا نہ کرنا بہتر رہے گا، کہیں تمھاری ستاتھی کی ترغیب آمیز مسکراہٹ مجھے بھٹکا نہ دے۔''

میں نے ڈانٹا۔ ''بے غیرتا! گندی موت مرو گے۔ اس معاملے میں اس کے اندر کسی مشرقی لڑکی کی روح حلول کیے ہوئے ہے۔''

وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''مذاق کر رہا تھا یار۔''

''چل سوتے ہیں..... اور یہ بھی پاس رکھو۔'' میں نے زستاوا بھی اس کی جانب بڑھا دیا۔

اس کے چہرے پر حیرانی ابھری۔

میں متبسم ہوا۔ ''کہتے ہیں جب اعتبار کرو تو پورا کرو۔'' کمبل اور دو تکیے اٹھا کر میں کونے کی طرف بڑھ گیا۔ فرش پر عمدہ قالین بچھا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی کمبل اوڑھ کر سو سکتے تھے۔

''بات سنو۔'' میں نے کمبل نیچے رکھا ہی تھا کہ اس نے عجیب سے لہجے میں پکارا۔

''ہونہہ!'' کہتے ہوئے میں پیچھے مڑا۔ زستاوا کی خوف ناک نال کا رخ میری جانب تھا۔

''بی..... یہ کیا ہے؟'' میں ہکلا گیا تھا۔

''معذرت یار، مگر اس چھوکری نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ دیکھو کمبل میں بھی اس کا شباب کیسے ابل رہا ہے۔ اب موقع مل ہی رہا ہے تو فائدہ نہ اٹھانا زیادتی ہوگی۔'' یہ کہتے ہی اس نے کمبل کے کونے سے پکڑ کر گھسیٹ کر نیچے پھینک دیا۔

لورا پہلو کے بل لیٹی تھی۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ''کک..... کیا ہوا؟'' شاید اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ اگر جاگ رہی ہوتی تب بھی اردو اس کے خاک پلے پڑنا تھی، کہ صورت حال کا جائزہ لیے بغیر سمجھ سکتی۔

پستول کا رخ باری باری دونوں کی جانب کرتے ہوئے اس نے دھمکی دی۔ ''تم دونوں اپنے ہاتھ گردن کے پیچھے باندھ لو..... ذرا سی غلط حرکت مجھے گولی چلانے پر مجبور کر دے گی۔''

''ریجا! یہ کیا ہے؟'' ہاتھ گردن کے پیچھے باندھتے ہوئے لورا برہم ہوئی۔

''غلطی ہوگئی۔'' ہاتھ گردن کے پیچھے باندھتے ہوئے میں نادم ہوا۔

''کیا چاہتے ہو۔'' لورا نے ہونٹ چباتے ہوئے اسے گھورا۔

''تمھیں چاہتا ہوں۔ اور تجھ جو چاہتا ہے ضرور حاصل کرتا ہے۔''

لورا نے مشورہ دیا۔ ''ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے، بہتر ہوگا چھوٹ لو۔''

وہ مکروہ لہجے میں بولا۔ ''تمھارا گھنٹا ادھ لوں گا اور پھر دفع ہو جاؤں گا۔ سچ بتاؤں جب سے تمھاری تعریف سنی ہے پاگل ہوا پھر رہا ہوں۔ معلوم ہی نہ تھا آسمان والا ایک دم یوں مہربان ہو جائے گا۔''

''اتنی سی بات پر اتنا کھٹ راگ پھیلانے کی کیا ضرورت تھی۔ آجاؤ میں نے کون سا اعتراض کیا ہے۔'' لورا نے اطمینان بھرے لہجے میں کہتے ہوئے ہاتھ نیچے کرنا چاہے۔

''خبردار، حرکت نہیں۔ میں گولی چلا دوں گا۔'' اس نے اضطراری انداز میں پستول کی نال کو حرکت دی۔

لورا کے ہونٹوں پر ترغیب آمیز ہنسی نمودار ہوئی۔ ''گولی مارو گے تو عیاشی کس کے ساتھ کرو گے۔''

نادر غلیظ انداز میں بولا۔ ''فکر نہ کرو اپنی حاجت تو میں تمھارے زخمی جسم سے بھی پوری کر لوں گا۔''

لورا نے منہ بنایا۔ ''تم خواہ مخواہ ڈر رہے ہو، ریجا نے شاید الٹی سیدھی پٹی پڑھائی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں یہ فعل کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر پہلے کہہ دیتے تب بھی مان جاتی، ریجا تو خود دور بھاگتا ہے۔''

''نجو لوگوں کو چکر دیتا ہے بے بی، تمھاری چال میں نہیں آسکتا۔ اور اگر سچی ہو تو اپنے کپڑے اتار دو تا کہ مجھے یقین آجائے۔''

لورا نے گہرا سانس لیتے ہوئے غصہ ضبط کرنے کی کوشش کی۔ میں بھی برہم ہوا۔ ''نادر خان تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ اب بھی وقت ہے چلے جاؤ۔ یہ نہ ہو بعد میں پچھتانے کا موقع بھی نہ ملے۔''

''ہونہہ۔'' اس نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔ ''سنا ئپر صاحب، ایک قدم ہلا کر دکھاؤ۔ اور میرا نشانہ دیکھو۔ اگر شاگردی کی درخواست نہ کرنے لگے تو مجھو نہ کہنا۔''

میں نے اسے مطعون کیا۔ ''میرے احسان کا یہ بدلہ دے رہے ہو۔''

''تو کیا کروں، ایسے شباب سے دست بردار ہو جاؤں۔ حالاں کہ اس کے حصول کو میں کوئی بھی قیمت ادا کر سکتا ہوں۔ احمق آدمی تم نے صرف اس کا رنگ چھپایا ہے۔ اور میں رنگ سے زیادہ انگ پر نظر رکھتا ہوں۔''

میں درشتی سے بولا ''بس مجھ میں اتنی ہی برداشت تھی۔'' اور ایک دم ہاتھ نیچے کرتے ہوئے اس کی طرف قدم بڑھائے۔

''خبردار.....'' گڑبڑاتے ہوئے اس نے تنبیہ کی اور پھر فوراً لبلبی دبا دی۔

''ٹرنچ۔'' کی آواز سنتے ہی اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر زستاوا کی گولیاں نکالیں۔ اور مٹھی اس کے سامنے کھولتے ہوئے بولا۔ ''پتر! تم جس مدرسے میں پڑھے ہو اس کے استاد خاکسار کو ابا کہتے ہیں۔ میں بس جانچنا چاہتا تھا کہ تم پر کتنا اعتبار کر سکتا ہوں۔'' میں نے گولیاں بیڈ پر پھینکیں اور گلاک اس کی طرف سیدھا کیا۔

اس نے پستول پھینکتے ہوئے ایک دم ہاتھ بلند کیے۔ ''مم..... میں تو بس مذاق کر رہا تھا..... سس..... سچ میں، ورنہ .....''

''ریجا ہٹو سامنے سے۔'' لورا مجھے ایک جانب دھکیلتی ہوئی اس پر جا پڑی تھی۔ نادر کو جب تک سمجھ آتی اس نے اپنا گھٹنا، نادر کی ٹانگوں کے بیچ اٹھا دیا تھا۔

''افففف.....'' وہ درد کی شدت سے دہرا ہو گیا تھا۔ لورا کا دوسرا گھٹنا اس کے ماتھے پر لگا، وہ کولہوں کے بل نیچے گرا اور لورا نے اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

میں نے کہا۔ ''پتر! بہت سمجھایا تھا، مگر تیری..... میں جو کیڑا تھا اس کا علاج کیپٹن ہی کے پاس ہے۔''

چند لمحوں میں لورا نے اسے روئی کی طرح دھُنک دیا تھا۔ باتوں کی حد تک بے شک وہ بے باک و آزاد خیال تھی، مگر میں نے مشاہدہ کیا تھا کہ جب کوئی مرد بیچ میں اس کی طرف غلط نیت سے بڑھتا وہ بہت طیش کھاتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی نادر نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔ میں نے لورا کا بازو تھام کر پیچھے کھینچا۔ ''بس کرو لورا۔''

وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ ''اسے اچھی طرح ٹھنڈا تو کر لوں۔''

''کافی ہو گیا ہے۔'' اسے بیڈ کی طرف دھکیل کر میں نادر کی مُشکیں کسنے لگا۔ ہاتھ پاؤں جکڑ کر اس کے منہ پر بھی کپڑا باندھ دیا تھا تا کہ شور نہ کر سکے۔

اتنی دیر میں لورا نے زستاوا کی میگزین اٹھا کر دوبارہ بھر دی تھی۔ میں نے جونھی نادر کو گھسیٹ کر ایک کونے میں پھینکا، اس نے تعجب ظاہر کیا۔

''کیا ہوا تھا؟..... اور گولیاں میگزین سے کب نکالیں۔''

''اسے خواہ مخواہ قیدی بنا کر رکھنے نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اسے پرکھنے کا یہی طریقہ تھا۔ یہ غسل خانے میں گیا تو میں نے میگزین خالی کر دی۔ اور پستول اس کے حوالے کر دیا۔ پستول ہاتھ میں آتے ہی کم بخت نے چند لمحے بھی صبر نہیں کیا۔'' یہ کہتے ہوئے میں لمحہ بھر توقف کر کے شرارتی لہجے میں بولا۔ ''ویسے دھیان رہے انڈیا میں کافی چاہنے والے پیدا ہو گئے ہیں تمھارے۔''

وہ بگڑ کر بولی۔ ''شاید تم بھی اس کے پہلو میں لیٹنا چاہتے ہو۔''

''اس کے تو نہیں..... البتہ.....'' اس کے نتھنے پھولتے پچکتے دیکھ کر میں نے فوراً بات تبدیل کی۔ ''بلکہ کسی کے بھی نہیں۔''

''لوفر، لفنگا.....'' با آواز بلند بڑبڑاتے ہوئے وہ کمبل میں روپوش ہو گئی۔ میں بھی مسکراتے ہوئے اپنی جگہ لیٹ گیا تھا۔ لورا کا چڑنا اور غصہ کرنا ہی تھا جو مجھے مذاق کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔ ورنہ جینی سے میں نے کبھی اس قسم کا مذاق نہیں کیا تھا۔

—— ● ——

اگلا دن ہم نے کمرے کے اندر ہی گزارا تھا۔ ناشتے اور کھانے کے وقت نادر کو غسل خانے میں بند کر کے میں خود کمبل میں روپوش ہو گیا، ویٹریس کو لورا نے وصول کیا تھا۔ نادر ہوش میں آنے کے بعد چپ چاپ لیٹا رہا۔ یوں بھی وہ زیادہ سے زیادہ ''غوں غاں'' ہی کر سکتا تھا کہ میں نے اس کا منہ بھی باندھا ہوا تھا۔

لورا نے کھانا کھاتے ہوئے نادر کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کا کیا کریں گے؟''

''دھوکا دینے والے کو معاف کرنے کا میں قائل نہیں۔ اگر یہ ہم سے تعرض نہ کر کے جانے کا سوچتا تو اسے کچھ نہ کہتا، مگر اس نے بہت گھٹیا سوچا ہے۔ اور ایک لڑکی کی توہین کے مرتکب کو معاف کرنا تو انسانیت کی تذلیل ہے۔''

وہ شوخی سے بولی۔ ''اگر سوچ رہے ہو ایسی باتوں سے مجھے متاثر کر لو گے تو فضول کوشش ہے۔ ڈیوڈ تم سے زیادہ خوب صورت اور میرا خیال رکھنے والا ہے۔''

میں بھناتے ہوئے بولا۔ ''تمھیں متاثر کرنے والے پر اللہ کی لعنت۔''

''ہا..... ہا..... ہا۔'' اس کا مترنم قہقہہ گونجا۔ ''صفائیاں دینے کی ضرورت نہیں، اپنی نیت درست کرو۔''

''فضول عورت۔'' بیزاری سے کہتے ہوئے میں ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا جہاں بریکنگ نیوز میں ایک خالی مکان میں ہمارے چھپنے کی بابت انکشاف کیا جا رہا تھا۔ میڈیا کو کافی دیر سے خبر دی گئی تھی۔ کہانی تقریباً وہی تھی جو لورا نے ڈاکٹر سجاتا کو فون پر بتا دی تھی۔ وہاں سے فرار ہونے والی لڑکی کی شناخت نہیں ہو سکی تھی۔ پولیس لڑکی کی تلاش میں تھی۔ نیوز کاسٹر نے نامعلوم لڑکی کو پولیس کے پاس پیش ہونے کی درخواست کرتے ہوئے تحفظ کی یقین دہانی کرائی تھی۔

لورا بھی اسکرین کی طرف متوجہ تھی مگر اس کی سمجھ میں تفصیل نہیں آ رہی تھی۔

وہ مجھ سے استفسار کرنے لگی۔ ''کیا کہہ رہے ہیں؟''

''ہمارے گزشتہ ٹھکانے کو زیر بحث لائے ہوئے ہیں۔ سب کچھ وہی جیسا ہم نے سوچا تھا۔'' میں نے ڈاکٹر سجاتا کے ذکر سے احتراز برتا تھا کہ نادر خان کو قتل کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ البتہ اسے سبق سکھانے کا عہد کر چکا تھا۔ لورا نے بھی میرے گول مول جواب پر اثبات میں سر ہلا دیا۔ کیوں کہ اس معاملے میں اس کا دماغ بھی خوب کام کرتا تھا۔ میری بہت سی باتوں کو وہ بغیر وضاحت جان جاتی تھی۔ ہم میں پیشہ ورانہ یکسانیت پائی جاتی تھی۔ اور دوسنا پر بے شک مختلف ممالک و جنس سے تعلق رکھتے ہوں لیکن میدان عمل میں ان کے سوچنے کا انداز قریباً ایک ہی جیسا ہو گا۔

خود کھا کر میں نے نادر خان کے ہاتھ کھولے اور سامنے کھانا رکھ دیا۔

اس نے بے چینی سے پوچھا۔ ''آپ لوگ میرے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

میں اطمینان سے بولا ''کم از کم قتل نہیں کریں گے۔''

اس کے چہرے پر بشاشت نمودار ہوئی۔ ''جانتا تھا کہ کوئی مسلمان اتنا ظالم نہیں ہوسکتا۔''

میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''ظالم نہیں ہوسکتا، دھوکے باز تو ہوسکتا ہے نا۔''

اس نے سر جھکایا۔ ''شرمندہ ہوں۔''

''ہونا بھی چاہیے، مگر اظہارِ ندامت پر معاف کر دینا شانِ ربوبیت کا خاصا ہے، تم ہم جیسے گناہ گاروں سے غلط امیدیں نہ باندھ لینا۔''

نادر خان کو چپ لگ گئی تھی۔ میں وشواس سنگھ سے بات کرنے کو اپنا موبائل فون آن کرنے لگا۔

موبائل فون کے آن ہوتے ہی پیغامات کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ میں نے متجسس ہو کر پیغام کھولے، تمام ڈاکٹر سجاتا کے تھے۔ معذرت اور ندامت ظاہر کرنے کے ساتھ اس نے اپنی خیریت کا بتایا تھا۔ کال کرنے کی بھی درخواست کی تھی۔

پیغامات کی مسلسل گھنٹیاں سن کر لورا بھی سوالیہ نظروں سے مجھے گھورنے لگی تھی۔

''ڈاکٹر اپنی خیریت کا بتا رہی ہے۔ اور بات کرنا چاہتی ہے۔''

لورا تدبر سے بولی۔ ''ضرور کرو، ورنہ اس کی پشیمانی میں اضافہ ہوتا جائے گا۔''

''پہلے اس کا بندوبست کرلوں۔'' میں نے نادر کی طرف اشارہ کر کے پریتو بھابی کو کال ملا دی۔

پریتو بھابی سے ہیلو ہائے کر کے میں وشواس سنگھ سے بات کرنے لگا۔ رسمی کلمات کی ادائی کے بعد میں مطلب کی بات پر آیا۔ ''شاید آج رات تمھارے ہاں آنا پڑے۔''

وہ خوش دلی سے بولا۔ ''ایسی خوش خبری سننے کو بے تاب تھا۔''

''خوش خبری سن لی ہے تو اب کام کی بات بھی سن لو..... کیا منوج جوشی نامی کسی اسمگلر سے واقف ہو؟''

وہ بغیر لمحہ ضائع کیے بولا۔ ''اس کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے اس کا ایک مطلوبہ شخص میرے قبضے میں ہے، کیا اس سے تصدیق کرا سکتے ہو۔''

وشواس سنگھ نے تسلی دی۔ ''ادھ، پون گھنٹا لگ جائے گا۔ تم بندے کا نام بتاؤ میں پتا کرا لیتا ہوں۔ اور یہ بھی بتاؤ اس کے بدلے کیا درکار ہے۔''

میں نے انکشاف کیا۔ ''نادر خان عرف تجو چکر باز نام ہے غالباً۔''

''کیا.....'' وشواس سنگھ حیران رہ گیا تھا۔ ''یہ بلونگڑا تمھارے ہاتھ کیسے چڑھا۔ اور اسے منوج جوشی کے حوالے کیوں کر رہے ہو۔''

میں نے جان چھڑانا چاہی۔ ''تفصیل بتانے کا وقت نہیں ہے۔''

اس نے اشتیاق سے پوچھا۔ ''تجو ہے کہاں؟''

''میرے سامنے بیٹھا ہے۔''

وشواس سنگھ نے کہا۔ ''اسے فون دو۔''

میں نے بادل نخواستہ موبائل فون نادر خان کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی مترشح تھی۔ گو اسے یہ معلوم نہ تھا کہ میں کس سے بات کر رہا ہوں البتہ میری یک طرفہ گفتگو بھی اس کی گھگی بندھانے کو کافی تھی۔ وہ کھانے سے بھی

دو تین نوالوں سے زیادہ نہیں لے سکا تھا۔ لورا بہ ظاہر ٹی وی کی طرف متوجہ تھی مگر در پردہ نادر خان پر نظر رکھے ہوئے تھی۔

نادر خان وشواس سنگھ کی آواز سنتے ہی خوشی سے ہکلایا۔ ''استاد جی ی ی ی ی! پرنام، ست سری اکال، پائے لاگوں، نمستے، آداب..... آپ کی آواز سننے کو کان ترس گئے تھے۔'' ''جی'' کی ''یا'' کو لمبا کھینچتے ہوئے وہ ایک ہی سانس میں مختلف مذاہب کا سلام کہتا گیا۔ اور پھر وشواس سنگھ کا جواب سن کر رنکھا ہوا۔

''استاد جی! غلطی میری ہے۔ بس ایک بار معافی دلا دیں میرے ابے، دادے، پردادے بلکہ استاد کی بھی توبہ جو اس عفیفہ پر بری نظر بھی ڈالی۔''

شاید وشواس سنگھ نے واقعہ جاننے میں دلچسپی ظاہر کی تھی کہ وہ تفصیل بتانے لگا۔ حیران کن طور پر اس نے ذرا بھی ہیرا پھیری نہیں کی تھی۔ شاید میری وجہ سے چکر بازی سے باز رہا تھا۔ تفصیل بتا کر اس نے وشواس سنگھ کی بات سنی اور پھر موبائل فون میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے موبائل فون کان سے لگایا۔ ''جناب۔''

وشواس ہنسی ہوا۔ ''راجا بھائی کیا میری سفارش کوئی کام کر سکتی ہے؟''

میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''کیا اس قابل ہے کہ اس کی سفارش کی جا سکے۔''

''کنجر کا مقروض ہوں۔ دھرمو دادا کے اڈے پر جب چھاپہ پڑا تھا تب اسی کی وجہ سے مجھے فرار کا موقع ملا تھا۔ ویسے بھی کافی دفعہ کام آیا ہے۔ اگر زیادہ غصہ نہیں ہو تو گنجائش کر دو۔ ورنہ میں سفارش ہی کر سکتا ہوں۔''

میں متبسم ہوا۔ ''یہ تو تمھاری غلط فہمی ہے کہ تم صرف سفارش کر سکتے ہو۔ بہ ہر حال اس کا کیا کروں؟''

وشواس سنگھ اعتماد سے بولا۔ ''جانے دو۔ اور بے فکر رہو یہ تمھاری جگہ کے بارے کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔ اس کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔''

''جیسا تمھاری مرضی۔'' کہہ کر میں نے الوداعی کلمات کہے اور رابطہ منقطع کر دیا۔

لورا بھناتے ہوئے بولی۔ ''اب مجھے بھی بتا دو کہ کیا چل رہا ہے۔''

میں نے مختصراً کہا۔ ''وشواس سنگھ اسے چھوڑنے کی سفارش کر رہا ہے۔''

لورا برہم ہوئی۔ ''میں اسے سزا دیے بغیر نہیں بخشنے والی۔''

''میں وشواس سنگھ کو زبان دے چکا ہوں۔''

''مجھ سے مشورہ کیے بغیر.....'' وہ بپھر گئی۔

''کیا یہ خفا ہونے کی بات ہے۔'' میں نے بیزاری ظاہر کی۔

وہ شاکی ہوئی۔ ''اور اب بھی بتانے کی کیا ضرورت تھی۔''

میں جھلاتا ہوا بولا۔ ''وشواس سنگھ نے کہا ہے اسے چھوڑ دو، میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ اگر تمھیں کوئی اعتراض ہے تو جو مرضی آئے کرو۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''چند لمحے پہلے تمھارا کوئی اور ارادہ تھا۔ یا وشواس سنگھ کے کہنے پر اس کا گناہ ہلکا ہو گیا۔''

میں نے صفائی دی۔ ''دنیا کا کوئی بھی قانون ارادے پر سزا نہیں سناتا۔ اگر یوں ہوتا تو مجھے منوج جوشی کا سہارا نہ ڈھونڈنا پڑتا۔''

''تمھاری بکواس نہیں سننا۔'' ناراضی سے کہتے ہوئے اس نے تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

نادر خان کے ہاتھ کھانا کھانے کو آزاد کیے تھے۔ میں نے اسے پاؤں کی رسی کھولنے کا اشارہ کیا۔

اس نے جلدی سے پاؤں آزاد کیے اور پنڈلیوں کو مسل کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے زستاواتیس بوراس کی جانب اچھالا۔ ''تم آزاد ہو۔ اپنا سامان اٹھاؤ اور غائب ہو جاؤ۔''

''شکریہ راجا صاحب! اور ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔'' پستول پکڑ کے اس نے جیب میں ڈالا، تپائی پر رکھا بٹوہ اٹھایا اور ایک الماری سے چھوٹا سا بیگ نکال کر باہر نکل گیا۔ گو وشواس سنگھ کی یقین دہانی کے باوجود مجھے نادر خان کو اپنا کام پورا ہونے سے پہلے چھوڑنا مناسب نہیں لگ رہا تھا لیکن مجبوراً کڑوا گھونٹ لینا پڑا۔ کبھی کبھار دوستوں کی خاطر ایسے خطرے مول لینا پڑتے ہیں۔

نادر خان کے رخصت ہوتے ہی میں ڈاکٹر سجاتا کو کال کرنے لگا۔ پہلی گھنٹی پر اس نے کال وصول کر لی تھی۔ وہ سخت شرمندہ تھی۔ بار بار معذرت چاہ رہی تھی۔ میں نے خوشگوار موڈ میں اسے تسلی دی۔ اور مسئلہ حل ہونے کا بتا کر رابطہ منقطع کر دیا۔ خواہ مخواہ اسے ذہنی اذیت اور خود ساختہ گناہ میں مبتلا رکھنا کہاں کا انصاف تھا۔ اگر ہم اس کے محسن تھے تو اس نے بھی ہمارے لیے خطرہ مول لیا تھا اور مجھے تو ایک بار پولیس سے بھی بچایا تھا۔

لورا گھنٹا ادھ گھنٹا لیٹنے کے بعد اٹھ گئی تھی۔ نادر خان کا ذکر چھیڑے بغیر وہ کھڑکی کے قریب پہنچی۔ اور پھر ایس آر ون کا بیگ کھول کر رائفل جوڑنے لگی۔ میں بھی اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

ہم ہدف سے بلندی پر تھے اس لیے براہ راست رینج کے بجائے افقی رینج کا فارمولا لگنا تھی۔ میں اس بارے پہلے بھی وضاحت کر چکا ہوں کہ بلندی سے پستی یا نشیب سے اونچائی پر فائر کرتے وقت ایک ہی فارمولا لگتا ہے۔ ہر زاویے کا مخصوص کوسائن ہوتا ہے۔ نشیب یا بلندی پر موجود ہدف کا جو زاویہ ہو گا اس کا کوسائن معلوم کر کے اسے رینج سے ضرب دینے پر اصل رینج معلوم ہو جاتی ہے۔ ہم دونوں نے علیحدہ علیحدہ حساب کیا تھا تاکہ غلطی کی گنجائش نہ رہے۔ دونوں کی پیمائش ایک جیسی نکلنے پر ہمیں اطمینان ہوا تھا۔

گو یہ ہمارے لیے نیا کام نہ تھا، لیکن شکلا کا قتل اتنا پر جوش کرنے والا تھا کہ ہم کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتے تھے۔

سہ پہر کو ہمیں شکلا کی کوٹھی میں چہل پہل نظر آنے لگی۔ پرما کے مل جانے کے بعد بھی تقریب ملتوی نہیں ہوئی تھی۔ جس کا صاف مطلب یہی تھا کہ بیچ میں اس کے پوتے کی سالگرہ تھی۔ اس کے علاوہ لورا کی اختتامی گفتگو نے بھی اسے بھٹکایا تھا۔

اصل رینج 2080 میٹر تھی جو افقی فرق نکال کر 1955 میٹر بن رہی تھی۔

''تمھیں یقین ہے کر لو گے؟'' لورا کے لہجے میں الجھن پنہاں تھی۔

میں اعتماد سے بولا۔ ''میں اس سے زیادہ فاصلے پر بھی فائر کر چکا ہوں۔''

''پتا ہے جب تم ہمارے مخالف آئے تھے۔ میں اور نک بہ ظاہر تمھیں کوئی اہمیت دینے پر تیار نہ تھے، مگر دل میں ڈرتے تھے۔ تب تم ناقابل شکست لگتے تھے۔ اور اب میری جانب ہو تو تشویش ہو رہی ہے۔''

''سرائیکی کی کہاوت ہے: آپڑیں گھاں دا چڈا چھوٹا نظر آندا ہیے۔''

وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''کوئی انسانوں والی بولی بولو۔''

''انسانوں والی ہی بول رہا ہوں، اب سامنے ہی انسان نہ ہو تو میرا کیا قصور۔''

''اب مطلب بھی سمجھاؤ گے یا اس کے لیے پاکستان جا کر ساری زبانیں سیکھنا پڑیں گی۔''

میں نے وضاحت کی۔ ''مطلب، اپنی گائے کے تھن چھوٹے نظر آتے ہیں۔ عرف عام میں گھر کی مرغی دال برابر۔''

وہ فکرمندی سے بولی۔ ''ریجا! یہ موذی بچ گیا تو پھر مشکل ہے ہاتھ آئے۔ میں آج ہی اس کا کانٹا نکالنا چاہتی

ہوں، تاکہ واپس جا کر بقیہ زندگی سکون سے گزار سکوں۔ ڈیوڈ کے ساتھ بڑے لمبے پروگرام سوچے ہوئے ہیں۔''

میں ہنسا۔ ''تم نے پرما کے اغواء تک میرے ساتھ رہنے کا بھی وعدہ کیا ہے۔''

وہ خلوص سے بولی۔ ''تمھارے ساتھ تب تک رہوں گی جب تک تم خود نہیں کہہ دیتے کہ میری جان چھوڑو۔''

میں ہنسا۔ ''اگر ایسا ہے تو صبح تمھیں الوداع کروں گا۔''

اس نے آنکھیں نکالیں۔ ''اتنے تنگ آئے ہو۔''

''جتنا تم سوچ رہی ہو اس سے کہیں زیادہ۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''پیلاوشہ کھان یاد آ رہی ہوگی ناں۔''

میں نے حقیقت اُگلی۔ ''وہ بھولی کب ہے جو یاد آئے گی۔''

اس نے منہ بنایا ''مکالمے کے علاوہ بھی کچھ آتا ہے۔''

میں ترکی بہ ترکی بولا۔ ''جو نہ مانے اس سے زبردستی کچھ تسلیم کرانا حماقت کہلاتی ہے۔''

ہماری نوک جھوک کے دوران اندھیرا چھا گیا تھا۔ کوٹھی کے وسیع سبزہ زار پر چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ موسموں کا تغیر و تبدل اللہ پاک کی مرضی و منشا کے تحت کام کرتا ہے۔ لیکن دولت والے اپنے لیے گرم کو سرد اور ٹھنڈ کو حدت میں تبدیل کر لینے کا ہنر جانتے ہیں۔ ایک خوب صورت رنگ کا بڑا سا شامیانہ لگا کر عارضی چھت قائم کی گئی تھی۔ پہلے تو شامیانہ لگنے پر ہمارے دل دھڑکے کہ شامیانہ گولی کی نہ سہی نظری آڑ پیدا کر سکتا تھا۔ اور جب ہدف نظر ہی نہ آتا تو میں فائر کیسے کرتا۔

مگر خیریت رہی کہ شامیانے کی بلندی کافی زیادہ تھی اس لیے دیوار کے اوپر اور شامیانے کی چھت کے درمیان بہ ہر حال اتنی جگہ خالی تھی کہ آدھے سے زیادہ سبزہ زار نظر آ رہا تھا۔

ادھ پون گھنٹے میں کافی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اور پھر تقریب کا آغاز ہوا۔ اتنے فاصلے سے بالکل واضح تو نظر نہیں آ رہا تھا البتہ وہ ہمارا دیکھا بھالا تھا اس لیے پہچاننا اتنا مشکل بھی ثابت نہیں ہوا تھا۔ سوکھا سڑا، اونچا لمبا قد اس کی پہچان کو آسان بنا رہا تھا۔

پنڈال بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ رنگ برنگے آنچل لہراتے نظر آ رہے تھے۔ پھر شاید کیک کاٹا جا رہا تھا کہ تمام ایک بڑی سی میز کے گرد کھڑے ہو گئے تھے۔

لورا سیاٹر سائیٹ آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے نہیں لگتا ہم کامیاب ہو پائیں گے۔''

شکلا جمگھٹے کے اندر تھا، اگر وہاں میں اسے کامیابی سے نشانہ بنا بھی لیتا، تب بھی گولی اس کے سر سے گزر کر پیچھے کھڑے ہوئے کسی بے گناہ کو نشانہ بنا سکتی تھی۔ اس وجہ سے مجھے لورا سے اتفاق کرتے ہی بنی۔

کیک کٹنے کے بعد لوگ کھانے میں مشغول ہو گئے۔ چند آدمی صوفوں پر بیٹھ گئے تھے۔ جن میں شکلا بھی شامل تھا۔ تمام کے رخ ہماری ہی جانب تھے۔ وہ وقت بالکل مناسب تھا۔ بس ہمیں لوگوں کی احتیاط رکھنا تھی جو دائیں بائیں گھوم رہے تھے۔ کیوں کہ اتنے طویل فاصلے پر فائر کرنے سے گولی کو رستا طے کرنے میں قریباً اڑھائی، تین سیکنڈ لگتے ہیں۔ اور تین سیکنڈ کے وقفے کو اتنا معمولی بھی نہیں سمجھا جا سکتا، کوئی بھی عجلت پسند سامنے آ کر اس کی جان بچا سکتا تھا۔ یا از خود پہلو تبدیل کر کے وہ کاری وار کو بے کار کر سکتا تھا۔

''کیا خیال ہے۔'' میں نے لورا کی رائے مانگی۔

''زیادہ فاصلہ مجھے کھل رہا ہے ورنہ ہدف تو سنائپر کی پسندیدہ حالت میں آ گیا ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے اندیشہ بیان کیا۔

میں نے ایس آرون کا بٹ دائیں کندھے میں پھنساتے ہوئے بٹ پر گال ٹیکا۔ بائیں آنکھ بند کی، دائیں آنکھ وآئی گلاس سے مخصوص فاصلے پر رکھ کر ٹیلی اسکوپ کے کراس کو شکلا کے چہرے پر شست کیا اور لورا کو بولا۔ ''آخری بار ایلیویشن اور ڈیفلیکشن ناب کا جائزہ لے لو۔''

''سب کچھ ٹھیک ہے۔ لیکن ایک منٹ رکو، میں نے شکلا سے بات کرنا ہے۔'' اس نے موبائل فون نکال کر شکلا کا نمبر ڈائل کیا اور موبائل فون کان سے لگالیا۔

شکلا نے موبائل فون نکال کر سکرین پر نگاہ دوڑائی اور پھر موبائل فون کان سے لگالیا۔ ''ہیلو۔'' اس کی منحوس آواز میری سماعتوں تک بھی پہنچی کہ لورا نے اسپیکر آن کر دیا تھا۔

گو شکلا جیسے بڑے آدمی انجان نمبر سے کال نہیں اٹھاتے مگر میں اور لورا چونکہ مسلسل اسے انجان نمبروں سے کال کر رہے تھے اس لیے اسے کال وصول کرنا پڑ رہی تھی۔

لورا بغیر تمہید کے مطلب کی بات پر آئی۔ ''شکلا جانتے ہو میں رقم وصول ہونے کے بعد بھی انڈیا میں کیوں رکی ہوں۔''

وہ غلیظ انداز میں بولا۔ ''یقیناً رندھیر شکلا کی قربت کی چاہ تمھارے پاؤں کی بیڑی بنی ہوگی۔''

وہ نفرت سے بولی۔ ''نہیں بلکہ میں تمھارے گندے وجود سے دھرتی کا سینہ پاک کرنا چاہتی تھی۔ الوداع سؤر... تم نے لاعلمی میں غلط لڑکی سے پنگا لے لیا تھا۔''

لورا کا الوداع سنتے ہی میں نے لبلبی دبا دی تھی۔ کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا لورا کی بات مکمل ہوتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کرے۔

''اچھا بھونک لیتی ہو مگر.....'' یہ آخری الفاظ تھے جو اس کے مکروہ ہونٹوں سے ادا ہوئے، اس کے بعد ایس آرون کی گولی نے اسے موقع نہیں دیا تھا۔ طاقتور گولی نے پیچھے دھکا دیا، صوفے کی ٹیک سے ٹکرا کر وہ پھڑکنے لگا۔ اسپیکر سے ایک نسوانی چیخ برآمد ہوئی، شکلا کے موبائل کو گزند نہیں پہنچی تھی اور رابطہ نہیں ٹوٹا تھا۔ اس کے بعد ہڑبونگ مچ گئی تھی۔ عورتوں اور بچوں کی چیخ وپکار زیادہ واضح تھی۔ ایسے موقعوں پر عورتیں زیادہ ہی ڈر جاتی ہیں۔

لورا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے لیٹے لیٹے بھینچا۔ ''یار! تم لاجواب ہو۔ نہ چاہتے ہوئے بھی تمھاری تعریف کرنا پڑ جاتی ہے۔ بے شک ایس ایس کا لقب تمھارے ساتھ جچتا ہے۔'' (وہ ایس ایس کا مطلب ''شارپ شوٹر'' سمجھتی تھی)

میں شرارتی لہجے میں بولا۔ ''خالی تعریف پر نہ ٹرخاؤ۔''

اس نے موبائل فون کھڑکی سے باہر اچھالا اور ایس آرون کو کھولتے ہوئے بولی۔ ''اگر تمھیں بکواس کی عادت نہ ہوتی تو بہت قیمتی آدمی تھے۔ اور اب جلدی کرو یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔

واقعی بحث وتکرار اور گپ شپ کا وقت نہیں تھا۔ میں بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اگلے دو تین منٹ میں ہم کمرے سے باہر نکل رہے تھے۔ لفٹ کے ذریعے ہم نیچے پہنچے، ہوٹل کا ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

ہم اطمینان سے چلتے ہوئے ہال اور پھر ہوٹل سے نکل آئے۔ ایس آرون کا بیگ ڈگی میں ڈال کر میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور سڑک پر آ گیا۔ جتنا جلدی دور نکل جاتے بہتر ہوتا۔ وشواس سنگھ کی حویلی ممبئی کے مضافات میں تھی اور جتنا جلدی وہاں پہنچ جاتے مناسب رہتا۔

سڑکوں پر ٹریفک کا ازدحام دن کی طرح ہی تھا۔ سات ساڑھے بجے کا وقت ایسا نہیں ہوتا کہ سڑکیں خالی

ہوتیں۔ میری کوشش جلد از جلد وشواس سنگھ کے پاس پہنچنے کی تھی۔ شکلا کی موت خبر ایجنسیوں اور پولیس محکمے تک لمحوں میں پہنچنا تھی۔ شکلا کو جس نمبر سے آخری کال کی گئی تھی اس کی ''لوکیشن'' تلاش کرنا چنداں دشوار نہ تھا۔ پولیس اور ایجنسیوں نے حتی الوسع تیزی سے اس علاقے کو گھیرنا تھا، ہمیں گھیراؤ سے پہلے وہاں سے غائب ہونا تھا۔

مجرم، تکمیل جرم کے بعد پوری کوشش سے جائے حادثہ سے دور بھاگتے ہیں، لیکن تفتیش کرنے والے حادثے کے مقام کے گرد ہی چکراتے رہتے ہیں۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہی ہوتی ہے کہ تفتیشی پارٹیوں کو سراغ وغیرہ جائے حادثہ ہی سے ملتا ہے۔

پہلے پولیس ناکے پر ہمیں کسی خاص مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ لیکن دوسرے ناکے پر گاڑیوں کی قطار کو دیکھ کر مجھے پریشانی ہوئی تھی۔ جب تک میں مڑنے کا فیصلہ کرتا میرے عقب میں ایک کار آ کر رک گئی تھی۔

لورا نے تشویش ظاہر کی۔ ''تفصیلی چیکنگ ہو رہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی اتر کر بھاگے تو مصیبت میں پڑ جائیں گے۔ اور میں سنائپر رائفلوں سے بھی دست بردار نہیں ہونا چاہتا۔''

لورا کا اندیشہ کم نہیں ہوا تھا۔ ''ڈگی کھلوا کر دیکھ رہے ہیں۔''

میں نے تسلی دی۔ ''امید ہے سنبھال لوں گا، نہیں تو بھاگنا پڑے گا۔ چار پانچ پولیس والوں کو سنبھالنا اتنا مشکل نہ ہوگا۔''

ہمارے سامنے قریباً دس بارہ کاریں تھیں، ان کے بعد ہمارا نمبر تھا۔ ہیرئر کے ساتھ دو جوان کھڑے تھے۔ ڈگی کی تلاشی صرف ایک جوان لے رہا تھا۔ دو پولیس والے اپنے سینئر کے دائیں بائیں یوں کھڑے تھے جیسے اس کی حفاظت پر مامور ہوں۔ ایک سب انسپکٹر چھوٹی سی میز کے عقب میں براجمان کال پر بات کر رہا تھا۔

''چل اوئے ڈگی کھول۔'' پولیس سپاہی براہ راست کار کی ڈگی کی طرف چلا گیا تھا۔

''تیار رہنا۔'' لورا کو اشارہ کر کے میں اتر گیا۔ جھک کر ڈگی میں چابی لگاتے ہوئے میں نے دو ہزار والے تین نوٹ سپاہی کے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔

گلا کھنکارتے ہوئے اس نے اپنے سینئر پر نظر ڈالی۔ پیسے جیب میں منتقل کرتے ہوئے وہ با آواز بلند بولا۔ ''ٹھیک ہے جاؤ۔''

بلاشبہ چھے ہزار اس کی توقع سے بھی زیادہ تھے۔ اس کی بلا سے ڈگی میں کیا تھا۔ وہ پکڑ لیتا تو سب کچھ سب انسپکٹر کی جیب میں جاتا اور اسے چند سو سے زیادہ وصول نہ ہوتا۔ میں واپس آیا، لورا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دوبارہ اپنی سیٹ پر منتقل ہو گئی۔

''اتنی جلدی جان چھوٹ گئی۔''

میں نے فلسفہ بگھارا۔ ''واقفیت ہونا چاہیے، دیر نہیں لگتی۔''

اس نے حیرانی ظاہر کی۔ ''پولیس والا تمہارا واقف کار تھا۔''

میں ہنسا ''میرا تو نہیں، البتہ مہاتما گاندھی کا پرانا واقف کار ہے۔ ان کی تصویر دیکھتے ہی نرم پڑ گیا۔ پاکستان میں بابائے قوم حضرت قائداعظم محمد علی جناح کی تصویر کا احترام کرنے والے کروڑوں ملیں گے اور انڈیا میں جناب مہاتما گاندھی کے۔''

لورا نے قہقہہ لگایا۔ ''سیدھی طرح کہو ناں، رشوت دی ہے۔'' اور میں کندھے اچکا کر رہ گیا تھا۔

گھنٹے ڈیڑھ بعد ہم مصروف سڑکوں سے نکل آئے تھے۔ سوا نو ہونے کو تھے جب ہم وشواس سنگھ کی حویلی کے قریب پہنچے۔ میں نے اسے راستے ہی میں کال کر کے مطلع کر دیا تھا۔ وہ اپنی حویلی کے باہر ہمارے استقبال کو موجود تھا۔ مصافحے اور رسمی کلمات کی ادائی کے بعد کہنے لگا۔

''جگر، تمھارے لیے ایک واقف کار کے فارم ہاؤس پر جگہ تیار کر دی ہے۔ وہاں پرتاپ سنگھ تمھاری خدمت کرے گا۔'' اس نے قریب کھڑے ہوئے ایک مضبوط جثے کے سکھ کا تعارف کرایا۔

''تو اجازت دیں۔'' میں نے الوداعی مصافحے کو ہاتھ آگے کیا کہ وہاں ٹھہرنا مجھے بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

مجھے بازوؤں میں بھر کر وہ بشاشت سے بولا۔ ''کوئی پریشانی ہوتی ہے تو اپنی بھابی کے نمبر پر اطلاع کر دینا۔''

''بے فکر رہو۔'' میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پرتاپ سنگھ کے پاس اپنی جیپ تھی۔ وہ ہمارے آگے آگے چل پڑا۔ مزید گھنٹا پون گھنٹا پکی سڑک پر چلنے کے بعد ہم کچے راستے پر اتر گئے۔ بیس منٹ کچے راستے پر بھی لگ گئے تھے۔

آخر ہم ایک فارم ہاؤس کے سامنے پہنچے۔ چوکیدار نے پہچان کر دروازہ کھول دیا تھا۔

گاڑیاں وسیع احاطے میں کھڑی کر کے ہم نیچے اتر آئے۔ رہائشی عمارت کی تعمیر میں پختہ اینٹیں استعمال ہوئی تھیں۔ طرز تعمیر جدید تھا، عمارت کا رنگ و روغن بھی نہایت عمدہ تھا۔ پرتاپ سنگھ کی معیت میں چل کر ہم اندر داخل ہوئے۔ ہمارے لیے علیحدہ علیحدہ کمرے تیار کیے گئے تھے۔ شاید اس بارے وشواس سنگھ پہلے سے ہدایات دے چکا تھا۔ تازہ دم ہو کر ہم کھانا کھانے لگے۔

لورا بولی۔ ''تمھاری لاڈلی کا بکھیڑا نہ ہوتا تو میرا کام تو مکمل ہو گیا تھا۔''

میں رکھائی سے بولا۔ ''میری لاڈلی کے لیے تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

وہ استہزائی انداز میں بولی۔ ''چچ..... چچ..... اس کے بارے تو ذرا سی بات برداشت نہیں ہوتی بے چارے ریجا سے۔''

میں اس کی رائے معلوم کرنے کو بولا۔ ''کیا لگتا ہے سچ میں پرما کا اغواء ہی میرا مشن ہے۔''

وہ خوشگوار بے یقینی سے بولی۔ ''سچ بتاؤ، مذاق مت کرو۔''

اس کی مسرت نے مجھے اچنبھے میں ڈال دیا تھا۔ لگا وہ انڈیا سے نکلنے کو بے چین ہے۔ لیکن مجھ سے پرما کے اغواء تک رکنے کا وعدہ اس کے پاؤں کی زنجیر بنا تھا۔ بلاشبہ وہ قیمتی اور اہم ساتھی تھی۔ مگر اس کی دلی خوشی کے بغیر اسے رکنے پر مجبور کرنا مناسب نہ تھا۔ ہمارا ساتھ اپنا اپنا مطلب پورا کرنے کو تھا۔ میں نے اسے قید سے چھڑانے کو زور لگایا تھا تو صرف اس لیے کہ وہ میرے ساتھ مل کر کام کر سکے۔ اب اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ جذباتی دھونس جما کر اسے روکنا یقیناً مناسب نہ ہوتا۔ اگر کہتا کہ میں پرما کو اکیلے اغواء کر لوں گا تو وہ کبھی واپس جانے کو راضی نہ ہوتی۔ اتنا عرصہ اکٹھے گزار کر اب کم از کم میں یہ دعویٰ ضرور کر سکتا تھا کہ لورا کی فطرت کو گہرائی تک جانتا ہوں۔ وہ نہ صرف میری ممنون و احسان مند تھی بلکہ خاص قسم کا لگاؤ بھی رکھتی تھی۔ اس پسندیدگی میں مرد و عورت کے مابین رشتے جیسا کچھ نہ تھا۔ یہ تعلق تو ایسا تھا جیسا قریبی دوستوں میں ہوتا ہے۔ سردار خان، تصور صاحب، الیاس، شہزاد، اویس وغیرہ میرے ایسے دوست ہیں جنھیں ہمیشہ میری فکر ہوتی ہے۔ وہ میری خوشی میں خوش اور غم میں اداس ہو جاتے ہیں۔ اب ان میں لورا کا اضافہ ہو گیا تھا۔

میں بھی لورا کے بارے ایسے ہی جذبات محسوس کرتا تھا۔ کبھی اسے چھو کر ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا تھا جو ایک جوان اور پرکشش لڑکی کے لمس سے محسوس ہوتا ہے۔ وہ میرے جذبات اور احساسات سے اسی طرح آگاہ تھی جیسے میں اس کے بارے جانتا تھا۔

میں نے اس کی غلط فہمی برقرار رکھی۔ ''جانتی ہو جاسوس کبھی اپنے مقصد کی خبر کسی کو بھی نہیں لگنے دیتا۔''

اس نے ناراض ہونے کو پر تولے۔ ''گویا اعتراف کر رہے ہو کہ تم نے بہت کچھ چھپایا ہے۔''

میں نے گول مول انداز میں کہا۔ ''اگر تم دشمن کے ہاتھ لگ جاتیں تو کیا میرا راز رکھ پاتیں۔ یاد ہے نا جلادوں نے میری کیا درگت بنائی تھی۔ اور تم تو عورت ہو۔ ان کے سامنے گھنٹا بھر بھی نہ ٹھہر پاتیں۔''

وہ تلملائی۔ ''اب مجھے غصہ دلا رہے ہو۔''

''حقیقت سے نظریں چرانے والے احمق ہوتے ہیں۔ ہمارے ملاپ کی وجہ فقط اتنی تھی کہ، دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے اور بس، ورنہ لورا براؤن کی مشکلات میرے لیے کیا معنی رکھتی تھیں۔ اور راجا ذیشان حیدر کے مسائل تمھارے لیے کیوں اہم ہوتے۔''

ملامت بھری نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے اس نے چاولوں کا بھرا چمچ پلیٹ میں پھینکا۔ ''ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' کہتے ہوئے وہ کرسی کھسکا کر اٹھی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

مجھے ہلکی سی ندامت ہوئی۔ بلاشبہ میں نے تلخ باتیں کی تھیں مگر اسے واپس جانے پر مجبور کرنے کو اس کے علاوہ چارہ بھی نہیں تھا۔ اس کے جانے کا انداز ایسا تھا گویا میں کھل کھلا کر اسے آواز دوں گا کہ۔

''کیا ہے یار لورا! مذاق بھی برداشت نہیں کر سکتی ہو۔'' مگر میں خاموشی سے کھانا کھاتا رہا ہے۔ اسے بعد میں بھی حقیقت بتلائی جا سکتی تھی۔ اس کا ای میل ایڈریس مجھے یاد تھا۔ ویسے بھی ہمارے درمیان کوئی ایسے لطیف جذبات نہیں پائے جاتے تھے کہ اسے میری بے رخی زیادہ تکلیف دہ محسوس ہوتی۔

کھانا کھا کر میں خواب گاہ میں آ گیا۔ اب مجھے پرما کے اغواء کا منصوبہ دوبارہ سے سوچنا تھا۔ پہلے والی ترکیب بروئے کار لانا ویسے بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ مگر اس حقیقت کو بھی نہیں جھٹلایا جا سکتا تھا کہ شکلا باقی نہیں رہا تھا۔ اب اپنے ماموں وگنیش شکلا کے لیے وہ کتنی اہم تھی۔ اور وہ اس کے لیے کس حد تک جا سکتا تھا اس بارے معلوم ہونے کے بعد ہی اگلا قدم اٹھایا جا سکتا تھا۔

بستر پر لیٹتے ہوئے میں نے ٹی وی چلایا۔ اور خبروں کا چینل لگا لیا۔ سیاسی مذاکرہ شروع تھا۔ اسکرین کے نیچے خبروں کی پٹیاں چل رہی تھیں، مگر وہ ہندی رسم الخط میں ظاہر ہو رہی تھیں اس لیے میرے سر پر سے گزر گئیں۔ ایک دو اور چینل پر بھی یہی صورت حال نظر آئی مجبوراً دس منٹ انتظار کرنا پڑا۔ گھنٹا پورا ہوتے ہی تازہ خبریں آنے لگیں۔ سب سے پہلی خبر ہی جنرل ریٹائرڈ رندھیر شکلا کے قتل کے متعلق تھی۔ اسے گولی لگنے والی تصویر تو شائع نہیں کی جا رہی تھی البتہ یہ بتایا جا رہا تھا کہ گولی اس کے منہ میں گھس کر باہر نکلی تھی۔ آخری تقریب کی ہلکی سی وڈیو جھلک بھی دکھائی گئی جس میں وہ پوتے کے ہاتھ سے کیک کا ٹکڑا کھا رہا تھا۔ پرما اس کے دائیں بائیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ قتل کا ذمہ دار بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے پاکستانی دہشت گرد کے سر منڈھا جا رہا تھا۔ گو وہ حقیقت بیان کر رہے تھے، مگر اس بیان کے پیچھے مصدقہ اطلاعات یا تصدیقی تفتیش کے بجائے وہ پرانا عناد اور پاکستان دشمنی کارفرما تھی جو ان کی خون میں شامل تھی۔ قتل کی اصل وجہ ان کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھی۔ قتل کی کڑیاں کشمیر کے محاذ سے ملائی جا رہی تھیں۔ شکلا کے بھارتی سرکار کے لیے انجام دینے والے کارناموں کا ذکر کر کے اس کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بلند بانگ دعوے دہرائے جا رہے تھے۔

مختلف چینلوں پر اسی سے ملتی جلتی تفصیل دہرائی جا رہی تھی۔ ایل ای ڈی بند کر کے میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔

—●—

ناشتا میں نے اپنے کمرے میں کیا تھا۔ اس کے بعد بھی میں کمرے سے نہ نکلا اور ٹی وی دیکھنے میں مشغول

رہا۔ پولیس کا جگہ جگہ چھاپے مارنا جاری تھا۔ خبروں کی مسلسل تکرار سے تنگ آ کر میں دستاویزی فلم دیکھنے لگا۔

ناشتا دیر سے کرنے کی وجہ سے مجھے دوپہر کو کوئی خاص بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے باورچی کو کافی کے ساتھ کچھ ہلکا پھلکا تیار کرنے کا کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ برگر بنا کر لے آیا۔

برگر اٹھاتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ''مادام نے کھانا کھالیا ہے؟''

باورچی بولا۔ ''انھوں نے تھوڑی ہی دیر پہلے ناشتا کیا ہے۔''

میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے برگر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کافی پی کر میں لورا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر اس کی مترنم۔ ''یس۔'' سنائی دی۔

میں اندر گیا۔ وہ کمبل میں گھسی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں ابھرا تھا۔ سنجیدہ و بے تعلق چہرہ لیے وہ چھت کو گھورنے لگی۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے مادام۔'' میں کرسی گھسیٹ کر بیڈ کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''کسی اجنبی کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کی مرضی پوچھ لینا اخلاقیات کے زمرے میں آتا ہے۔''

میں بے نیازی سے بولا۔ ''خیر اتنے اجنبی بھی نہیں ہیں کہ حال احوال پوچھنے کو اجازت کی ضرورت پڑے۔''

وہ برہم ہوئی۔ ''بہتر تو یہی ہوگا کہ فوراً سے پہلے یہاں سے دفع ہو جاؤ۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''یہ میرے دوست کا گھر ہے۔ گویا تمھارے لیے میری حیثیت میزبان کی سی ہے۔ اور میزبان پر یوں حکم جمانا اصول ہی کے نہیں عقل کے بھی منافی ہے۔''

''تو میں جا رہی ہوں۔'' وہ بپھرتے ہوئے اٹھی اور جوتے پہننے لگی۔

میں نے جھپٹ کر جوتے پکڑے اور کمرے کے کونے کی طرف اچھال دیئے۔ ''لورا آرام سے لیٹو۔ ایک آفیسر ہو کر بچکانہ حرکتوں سے گریز کرو۔''

وہ حلق کے بل چیخی۔ ''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

میں بے پروائی سے بولا۔ ''نہیں جاتا۔ اور نہ تمھیں جانے دوں گا۔''

اس نے دھمکایا۔ ''مجبور نہ کرو کہ تم پر ہاتھ اٹھالوں۔''

''کوشش کر کے دیکھ لو۔''

''گھٹیا انسان۔'' بستر پر لیٹ کر اس نے سر پر کمبل لے لیا تھا۔

میں ترکی بہ ترکی بولا۔ ''احمق کپتان۔'' وہ خاموش لیٹی رہی۔

لمحہ بھر انتظار کے بعد میں بولا۔ ''اچھا جانے کے بارے کیا سوچا ہے۔ تمھارا اصل پاسپورٹ تو گم ہو گیا ہے۔''

چھوٹا سا وقفہ دے کر میں بولا۔ ''اگر اپنے سفارت خانے سے رابطہ کر لو تو کیسا رہے گا۔''

وہ خاموش لیٹی رہی۔ میں نے گفتگو جاری رکھی۔ ''لیکن انڈیا سرکار کے پاس تمھارے بارے کافی ثبوت موجود ہیں۔ اس لیے گڑبڑ کی گنجائش موجود ہے۔ تو بہتر ہوگا تم حلیہ تبدیل کر کے انڈین پاسپورٹ بناؤ اور برطانیہ جا کر نیا پاسپورٹ بنوا کر ڈیوڈ کے پاس چلی جانا۔ کیسا ہے؟'' میں نے تصدیق چاہی۔

''آخر تم دفع کیوں نہیں ہو جاتے۔'' کمبل اتارتے ہوئے وہ روہانسا ہو کر اٹھ بیٹھی۔

میں نے کرسی چھوڑ کر بیڈ پر اس کے سامنے نشست سنبھالی اور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے نرمی سے بولا۔ ''دوست

سے کوئی یوں بدتمیزی سے بات کرتا ہے۔''

وہ حلق کے بل چیخی۔ ''تم نہیں ہو میرے دوست۔''

''اگر سوچ رہی ہو میں گزشتہ رات کے رویے پر معذرت کہوں گا تو تمھیں مایوسی ہوگی۔ تمھیں اہمیت دیتی ہے میری جوتی۔''

''آخر تمھیں مسئلہ کیا ہے۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں، تمھیں ہی کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ''تم ہو نا شہزادہ چارلس کہ مجھے غلط فہمی ہوگی۔''

میں برجستہ بولا۔ ''اس بندر کے ساتھ تو میری شکل نہ ملاؤ یار۔ اتنا بھی بدصورت نہیں ہوں۔''

''مجھے پتا ہے۔''

میں حقیقت کو گول مول کرتا ہوا بولا۔ ''سچ یہ ہے کہ تمھاری وجہ سے میری مشکلات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ تم مقامی لوگوں میں گھل مل نہیں سکتی ہو اور آسانی سے پہچانی جاتی ہو۔ میرے خفیہ مددگار اور دھرمو دادا کے کارندے مجھے کافی ہیں۔ شکلا کی موت کے بعد پرماکا اغواء اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے کہ تمھیں خواہ مخواہ روک کر احسان لوں۔ اس لیے جتنا جلدی ہو سکے تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔''

''ہونہہ'' اس نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔ ''تو میں تمھارے لیے مسائل پیدا کر رہی ہوں۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''کل رات سے یہی بکواس تو کر رہا ہوں اور کیا لکھ کر دوں۔''

''شکلا کی موت تک میں مفید تھی اور اب ناکارہ..... واہ۔''

''شکلا کی ہلاکت اور پیسے کا حصول تمھاری چاہت تھی میں نے فقط ساتھ دیا۔''

وہ اطمینان سے بولی ''اور اب میں ساتھ دوں گی۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کہاں ضرورت نہیں ہے۔ میری مشکلات میں اضافے کا شوق ہے تو نکی رہو۔''

گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے غصہ ضبط کیا۔ ''پاسپورٹ کا کیسے بتاؤ گے۔''

''امید ہے وشواس سنگھ کو مشکل پیش نہیں آئے گی۔ پیسے ہمارے پاس کافی پڑے ہیں، انھیں منہ مانگے دام دے سکتے ہیں۔''

وہ بے مروتی سے بولی۔ ''ایس آر ون میں ساتھ لے کر جاؤں گی۔''

میں نے اطمینان سے کہا۔ ''ایسا بس تم سوچتی ہو۔''

وہ مصر ہوئی۔ ''وہ میری ہے۔''

میں نے وضاحت کی۔ ''وشال گپتا کے ہاں سے چوری کی تھی۔ اور جتنی رقم وہاں سے چوری ہوئی تمام تمھارے علاج پر صرف ہو گئی۔ اب بتاؤ رائفل کس کی ہوئی، البتہ تھنڈر بولٹ چاہیے تو لے جا سکتی ہو۔''

وہ تلخی سے بولی۔ ''بھاڑ میں جاؤ۔''

میں جانتا تھا کہ اس سے اپنی توہین برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اسی وجہ سے فضول اور احمقانہ ابحاث میں الجھ رہی تھی۔

میں نے موضوع تبدیل کیا۔ ''چائے یا کافی.....''

اس نے دانت پیسے۔ ''تمھارا خون پینے کو دل کر رہا ہے۔''

میں نے جلتی پر تیل چھڑکا۔ ''تم خیر خیریت سے یہاں سے دفع ہو جاؤ، یہی میری سب سے بڑی مدد ہوگی۔ ایک وقت میں ایک لڑکی کا دھیان رکھ سکتا ہوں اور فی الحال پرما اہم ہے۔''

''اچھی طرح جانتی ہوں کل سے کیوں بکواس کر رہے ہو۔ تمھاری لاڈلی مجھے سخت ناپسند ہے اس لیے مجھے بھگانا چاہتے ہو تا کہ اسے کچھ کہہ نہ سکوں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جب جانتی ہو تو تکرار کیوں کرتی ہو۔''

''تمھارا ساتھ دینا چاہتی ہے میری جوتی۔ تمھاری لاڈلی پر تھوکنا بھی گوارا نہیں کرتی۔ کیپٹن لورا براؤن کوئی عام لڑکی نہیں کہ کسی تھرڈ کلاس لڑکی کو اغواء کرنے کو بھاگتی پھرے۔''

''شکر ہے تمھارا چھوٹا سا دماغ کام کرنے لگا ہے۔ اب یہ بتاؤ چائے یا کافی؟''

وہ پرسکون ہوئی۔ ''شاید کافی سے غصہ قابو کرنے میں مدد ملے۔'' اور میں انٹر کام اٹھا کر کافی کا بتانے لگا۔

—●—

شکلا کی ہلاکت کا چرچا جاری تھا۔ ہم وہیں ٹکے رہے۔ تھنڈر بولٹ میں نے وشواس سنگھ کے حوالے کر دی تھی کہ میرے لیے ایس آر اون کافی تھی۔ دوسری رائفل سنبھالے رکھنا فضول تھا۔ لورا کا مسئلہ میں نے وشواس سنگھ کو بتا دیا تھا۔ اگلے تین چار دنوں میں لورا کا نیا پاسپورٹ بن گیا تھا۔ اس کا نام شمسہ عزیز تھا۔ وہ مسلم طالبہ تھی جو میڈیکل کی تعلیم کو برطانیہ جا رہی تھی۔ اس کی لشکارے مارتی سفید رنگت کو ہلکا گندمی کر کے آنکھوں میں کالے لینز ڈالے تھے۔ آدھے چہرے کو ڈھانپنے والی گول شیشوں کی بڑی عینک، سر پر اسکارف، ناک کے نتھنوں میں اسپرنگ ڈال کر باریک ستواں ناک کو پھلا دیا تھا۔ دانتوں میں گم شیٹ سے جبڑوں کو ابھارا گیا تھا۔ یوں اس کی صورت یکلخت تبدیل ہو گئی تھی۔ میرے بہت زیادہ اصرار کے باوجود وشواس سنگھ نے پاسپورٹ پر ہونے والا خرچ لینا گوارا نہیں کیا تھا۔

ہزار ڈالر کے بہ قدر رقم میں نے لورا کے پرس میں ڈال دی تھی کہ اپنے اصل حلیے میں آنے تک اسے ضرورت پڑ سکتی تھی۔ ریوندر مترا اور ڈکٹر دیوا شش کے ہاں سے ہمیں کافی رقم ہاتھ لگی تھی جو بہت کم ہی خرچ کر پائے تھے۔

اس وقت ہم چترپتی شیواجی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ رخصت ہونے سے پہلے وہ بے ساختہ بانہیں پھیلا کر مجھے لپٹ گئی تھی۔ ''آج بہت خوش ہوں، کچھ بھی منوا سکتے ہو۔ یہاں تک کہ ڈیٹ پر جانے کی درخواست بھی رد نہیں کروں گی۔''

میں ہنسا۔ ''تمھارے گلے لگنے کی خبر بھی اگر پلوشہ تک پہنچ گئی تو میری خیر نہیں۔''

''ایسا بھی کیا ہے؟.....'' اس نے منہ بنایا۔ ''ہم اچھے دوست ہیں اور دوستوں کا معانقہ کرنا عام رواج ہے۔''

اسے نرمی سے علیحدہ کر کے میں مسکرایا۔ ''تمھارا رواج ہوگا، ہمارے ہاں عورت سے مصافحہ کرنا بھی گناہ ہے۔''

اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔ ''پھر بھی میری پیش کش برقرار ہے۔ کل بھی جا سکتی ہوں۔''

میں سنجیدہ ہوا۔ ''وعدہ کرتی ہو، جو کہوں گا مانو گی۔''

اس کے لبوں پر مدھر مسکان ابھری۔ ''امید تو ہے کہ پیچھے نہیں ہٹوں گی۔''

''انٹرنیٹ پر روزانہ پانچ منٹ قرآن مجید کی تلاوت سننا اور کسی اسلامک سنٹر میں جا کر اسلام کے بارے مکمل تحقیق کرنا۔ لیکن یہ تحقیق مسلمانوں کی کتابیں پڑھ کر کرنا، کسی مستشرق (علوم اسلامیہ کا غیر مسلم ماہر) کی کتابیں نہیں۔''

وہ متعجب ہوئی۔ ''کیا ایسا کرنے سے اسلام قبول کر لوں گی۔''

میں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔ ''وہ اس کی مرضی ہے کہ یہ سعادت تمھاری قسمت میں لکھتا ہے یا نہیں۔''

اس نے شرارتی قہقہہ لگایا۔ ''اگر اسلام قبول کرلیا تمھاری بیوی پھر بھی نہیں بنوں گی۔ البتہ پہلے والی دونوں کو طلاق دے دو تو شاید تمھاری درخواست پر غور کرلوں، وعدہ پھر بھی نہیں کرتی۔''

میں ہنسنے میں اس کا ساتھ دیتے ہوئے بولا۔ ''وہ بعد کا مسئلہ ہے۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا جینی کو بھی اسلام قبول کرنے کی ترغیب دی تھی۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس نے کبھی اسلام مخالف بات نہیں کی تھی۔ تمھیں بھی اسلام قبول کرنے کا نہیں کہا صرف اسلام کو جاننے کی ترغیب دی ہے۔''

''یار! بہت یاد آؤ گے۔ انڈیا سے جو کچھ لے جارہی ہوں اس میں سب سے قیمتی تمھاری دوستی ہے۔ اگر تم نہ ہوتے تو شاید اب تک سب کچھ ہار کر خودکشی کرچکی ہوتی۔''

''ایسا بس تم سوچتی ہو۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''اگر کبھی کال کروں تو وصول کر لینا۔ یا گھنٹی پر بات کرنے کو بھی پیلاوشے کی اجازت درکار ہوگی۔''

''اور ڈیوڈ کا کیا؟''

وہ اطمینان سے بولی۔ ''اس کے سامنے تمھارے ساتھ ڈیٹ پر بھی جاسکتی ہوں۔''

میں ہنسا۔ ''اسے تم پر اعتماد ہے یا تمھیں اس کی پروا نہیں۔''

وہ خلوص دل سے بولی۔ ''نہیں بلکہ میرے لیے ریجا بہت خصوصی ہے۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''مجھے نہیں لگتا تھا کہ جینی جیسی مخلص کوئی اور دوست بھی مل جائے گی۔''

''بہت بہت شکریہ ریجا۔'' میرے ہاتھ کو بوسا دیکھ کر اس نے رخ موڑ لیا۔ جب تک نظر آتی رہی میں تکتا رہا۔ وہ مضبوط کردار کی حوصلہ منداور بہادر لڑکی تھی۔ ڈینو کی شہادت کے بعد میری طاقت آدھی رہ گئی تھی جو اس کے ملنے پر بحال ہوئی۔ نہ صرف جسمانی بلکہ دماغی طور پر بھی بہترین کمانڈو تھی۔ بلاشبہ اس کی وجہ سے میں کافی مشکلات سے بچا تھا۔ ایک اکیلا اور دو گیارہ تبھی ہوتے ہیں جب دوسرا بھی برابر کا ہو۔

گو وہ پرما کے اغواء تک رکنا چاہتی تھی لیکن میں چاہتا تھا کم از کم ایک کے مسائل تو اختتام پذیر ہوں۔ اس کے جاتے ہی جہاں طمانیت محسوس ہورہی تھی وہیں ہلکا سا افسوس بھی ہورہا تھا۔ اس کی معیت میں بہترین وقت گزرا تھا۔ بلاشبہ وہ بہترین دوست ثابت ہوئی تھی۔ اور ایسے دوست بھلانے کے نہیں ہوتے۔

—— ● ——

لورا کے جانے کے بعد ایک دو دن میں نے آرام سے گزارے کہ پرما کے اغواء کا کوئی مناسب طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا۔ اس بار ارادہ تھا کہ اسے اغواء کرتے ہی ممبئی چھوڑنے کی کوشش کروں گا۔ گویا دو مسئلے ایک ساتھ درپیش تھے۔ پرما کو اغواء کرنا اور اسے پاکستان پہنچانا۔

انڈیا میں کافی وقت گزار لیا تھا۔ اب تو وطن کی فضائیں سپنا لگنے لگی تھیں۔ بلاشبہ باقی تکالیف اور مشکلات ایک جانب اور وطن سے دوری دوسری جانب رکھیں تو اذیت کے پلڑے کو جدائی و دوری کا دکھ جھکا دے گا۔

رات گئے انجان نمبر سے کال وصول ہوئی، انڈیا کا نمبر نہیں تھا۔ مجھے شک گزرا وہ لورا کی کال ہے۔

میں نے محتاط انداز میں۔ ''ہیلو۔'' کہا۔

''ریجا! میں بول رہی ہوں۔'' لورا کی چہکتی آواز سن کر مجھے اچھا لگا تھا۔

میں شاکی ہوا۔'' حالاں کہ تمھیں اسی دن پہنچتے ہی خیریت کا بتانا چاہیے تھا۔''

اس کی مترنم ہنسی ابھری۔'' تم سے ناراض تھی تبھی کال نہ کرسکی۔''

میں شرارتی لہجے میں بولا۔'' ناراض تو مجھے ہونا چاہیے کہ ڈیٹ کا وعدہ ایفاء کیے بغیر تم بھاگ گئیں۔''

وہ سنجیدہ ہوئی۔'' ریجا! معذرت چاہتی ہوں یار! تمھاری توقعات پر پورا نہ اتر سکی۔ اچھی طرح جانتی ہوں تمھیں میری ضرورت تھی، مگر میری سہولت اور آرام کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ہوئے تم نے نہ صرف مجھے جانے کی اجازت دی بلکہ ایسا ڈراما کیا گویا میرا جانا تمھارے لیے زیادہ مفید ہے۔ حالاں کہ.....''

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے موضوع تبدیل کرنا چاہا۔'' بکواس کے بجائے، کوئی کام کی بات کرو۔''

وہ گلوگیر ہوئی۔'' بکواس تم کرتے ہو میں نہیں۔ مجھے وہ پل اچھی طرح یاد ہیں جب ایک درندے کی وحشت کے بعد میں موت کو گلے لگانے کا سوچ رہی تھی، مگر تم نے نہ صرف مجھے سنبھالا بلکہ قید سے نکلنے کا بھی حل ڈھونڈ لیا۔ اور جب مجھے گولی لگی تو کسی محبوبہ کی طرح گلے سے لگائے بھاگتے رہے، حالاں کہ میری وجہ سے تم پکڑے جاسکتے تھے۔ تب مجھے اپنی موت کا یقین ہوگیا تھا لیکن تم مجھے موت کے فرشتے سے چھین لائے۔ میری تیمارداری کی، وہ رقم جو تم اپنے مشن کی ضروریات پر خرچ کرسکتے تھے، میری آسائش پر خرچ کرتے رہے۔ پھر مجھے ہوس پرست ٹولے سے بچانے پہنچ گئے۔ تم نہ آتے تو جانے وہ میرے ساتھ کیا کرتے۔ سوچا تھا شاید تمھاری بھی اس خبیث کی دولت پر نظر ہے، مگر وہ رقم بھی تم نے میرے منہ پر دے ماری۔ میری بکواس، ناز نخرے اور موڈ برداشت کرتے رہے۔ تم بہت اچھے ہو ریجا۔ بہت زیادہ۔ شروع میں میں حیران ہوتی تھی کہ تم نے دو لڑکیوں سے کیسے شادی کرلی۔ حالاں کہ تمھاری صورت ایسی انوکھی بھی نہیں ہے کہ دو بیویوں کے ساتھ جینی جیسی لڑکی بھی تمھیں چاہے۔ مگر قریب رہ کر محسوس ہوا کہ تم کتنا خیال رکھنے والے، عورت کو اہمیت دینے والے، توجہ اور عزت دینے والے ہو۔ قسم سے بہت یاد آؤ گے۔ دو دن ندامت کی وجہ سے گھنٹی نہ کر سکی۔ اگر سمجھتے ہو میں جانتی نہیں کہ تمھیں میری ضرورت تھی۔ تو یقیناً تمھاری خوش فہمی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ تمھارے بچکانہ دلائل مجھے تب دھوکا دے سکتے تھے کہ تمھاری فطرت سے انجان ہوتی۔ اب تو تمھاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ اپنے بارے اندازہ لگانے میں شاید غلطی کرجاؤں تمھارے بارے غلطی کا امکان نہیں ہے۔''

میں نے اسے جذباتی کیفیت سے نکالنے کی کوشش کی۔'' سچ بتاؤ کتنی بوتلیں چڑھائی ہیں۔''

وہ پھیکے لہجے میں بولی۔'' تم جانتے ہو زیادہ نہیں پیتی۔''

'' وطن پہنچنے کی خوشی میں شاید حساب نہ رکھا جاسکا ہو۔''

'' خفا تو نہیں ہو۔'' وہ اسی موضوع کو چمٹی رہی۔

میں نے اسے تسلی دی۔'' پاگل نہ بنو، حقیقت میں تمھاری ضرورت نہیں تھی۔ اب کسی کو قتل تو کرنا نہیں تھا کہ ضرورت ہوتی۔ اور پھر پری کے حصول کے بعد میرے پاس اتنا وقت نہ ہوتا کہ تمھیں واپس بھجوانے کے بکھیڑے میں پڑسکتا۔ شاید تمھیں معلوم نہ ہو مگر تمھارے پیچھے کافی لوگ پڑے تھے۔ اور میں پری پر قبضہ جماتے ہی ایک منٹ ضائع کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ اس لیے یہ خیال ہی ذہن میں نہ لاؤ کہ اپنی ضرورت کو تمھاری سہولت کی وجہ سے نظرانداز کردیا۔''

وہ ہنسی۔'' فطرت کبھی نہیں تبدیل ہوتی۔''

میں بیزاری سے بولا۔'' کوئی اور موضوع ہے یا کال بند کردوں۔''

وہ شرارتی انداز میں ہنسی۔'' گویا چاہتے ہو صرف پری کی باتیں کروں۔''

میں نے کہا۔'' نہیں ڈیوڈ کا بتاؤ کیسا ہے، تمھاری واپسی پر خوش تو ہوا ہوگا۔''

''اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پاسپورٹ بننے کا انتظار کر رہی ہوں.....'' وہ تفصیل بتانے لگی۔ پندرہ بیس منٹ گپ شپ کر کے ہم نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اگلے دن میں بدلے ہوئے حلیے کے ساتھ شکلا کی کوٹھی کے سامنے موجود تھا۔ کار کے بجائے میں نے موٹر سائیکل کی سواری کو ترجیح دی تھی۔ موٹر سائیکل خریدنا میرے لیے مسئلہ نہیں تھا۔

دو دن مسلسل نگرانی کے بعد بھی پرما کی شکل نظر نہیں آئی تھی۔ تیسرے دن میری امید بر آئی کالے رنگ کی مرسڈیز کے عقب میں دو جیپوں کو دیکھ کر مجھے اندازہ کرنے میں دیر نہیں ہوئی تھی کہ کار میں کون ہو سکتا تھا۔ کار کو مطلوبہ ہسپتال و کالج کا رخ کرتے دیکھ کر میرا گمان یقین میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ٹریفک اتنی زیادہ تھی کہ انھیں تعاقب کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔

پارکنگ میں کار روک کر وہ نیچے اترے۔ پرما کے چہرے پر مجھے اداسی نظر آئی تھی۔ اس کے عقب میں نیا محافظ نظر آ رہا تھا۔ باقی محافظ اس کے پیچھے چل پڑے تھے۔

چونکہ لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی اس لیے میں بھی تھوڑے سے وقفے سے ان کے پیچھے ہو لیا۔ پرما کے محافظوں کو دیکھ کر میری یہ غلط فہمی تو دور ہو گئی تھی کہ شکلا کے بعد اس کی اہمیت میں کوئی کمی آئی تھی۔ کالج میں اس کے ہمراہ دو محافظ گئے تھے۔ باقی محافظ کنٹین میں چلے گئے تھے۔ ان کی روزمرہ میں بس یہی تبدیلی آئی تھی کہ اب کالج میں پرما کے ساتھ دو محافظ جانے لگے تھے۔

اس کی واپسی تک کا وقت میں نے وہیں دائیں بائیں گھوم کر گزارا تھا۔ اور پھر اسے گھر تک چھوڑ کر میں اپنے ٹھکانے پر لوٹ آیا۔ آج کے لیے اتنا کافی تھا۔ میں جلد بازی میں کوئی ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا کہ انھیں معلوم ہوتا میں پرما کو اغواء کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے والا اغواء ان کے نزدیک شکلا کی دشمنی کی وجہ سے ہوا تھا۔ اور پھر پرما کا ڈرامائی فرار اس کی مزید تائید کرتا تھا۔

شام کے کھانے پر بیٹھنے لگا تھا کہ موبائل فون بجا، اسکرین پر پریتو بھابی کا نام دیکھ کر میں نے کال وصول کی۔ دوسری جانب وشواس سنگھ تھا۔ بغیر کسی تمہید کے بولا۔

''ایک ضروری بات کرنا تھی، میرے پاس آؤ گے یا آ جاؤں۔''

میں نے فوراً فیصلہ کیا۔ ''منتظر ہوں۔''

''تمھاری بھابی نے ساگ بنایا ہے۔ مکئی کی روٹی، تازہ مکھن اور لسی..... تو کیا خیال ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی کھانا ہی کھانے لگا تھا۔ اور اگر اس کے بعد تمھاری گھنٹی آئی ہوتی تو اس استفسار پر تمھیں بہت گالیاں پڑنے والی تھیں۔ اب بچ گئے ہو۔ اور بہنوں کے ہاتھ کا بنا کھانا تو قسمت والوں کے نصیب میں لکھا ہوتا ہے۔''

زوردار قہقہہ لگا کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ میں نے باورچی کو کھانا لے جانے کا اشارہ کیا۔ اور اس کی حیرانی بھری سوالیہ نظروں کو دیکھ کر کہا۔ ''وشواس سنگھ گھر سے کھانا بنوا کر لا رہا ہے۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے برتن سمیٹنے لگا۔ وشواس سنگھ کے لیے تھوڑا انتظار کرنا پڑا تھا لیکن ساگ واقعی کمال کا بنا تھا۔ اور پھر دیسی مکھن، مکئی کی روٹی اور لسی نے لطف دوبالا کر دیا تھا۔

میں پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے چہل قدمی کرتے ہوئے گپ شپ مناسب رہے گی۔''

وشواس سنگھ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ گیا۔ دو تین رسمی باتوں کے بعد وہ مطلب کی بات پر آیا۔

''کوئی لمبے فاصلے سے ایک بندہ مروانے کا تمنائی ہے۔ اور اس مقصد کو دس پندرہ لاکھ خرچ کر سکتا ہے۔''

''دن کے بارہ بھی نہیں بجے کہ مجھے لگے تمھارا دماغ جگہ پر نہیں ہے۔'' میں نے سکھوں کے بارے مشہور مقولہ کہ

بارہ بجے ان کا دماغ کام نہیں کرتا ہے۔زیر بحث لایا۔''میں تمھیں کرائے کا قاتل لگتا ہوں۔'' میں نے خفگی نہیں چھپائی تھی۔

وشواس سنگھ نے صفائی دی۔''تم تک پیش کش پہنچائی ہے جگر، ترغیب نہیں دی۔''

میں بیزاری سے بولا۔''میں ایسی پیش کش پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا۔''

وہ متبسم ہوا۔''پوچھو گے نہیں پیش کش کرنے والا کون ہے۔''

''بھاڑ میں جائے۔اب کوئی اور موضوع چھیڑو۔''

''شکلا سے تمھاری کیا دشمنی تھی۔'' مجھے لگا اس نے موضوع تبدیل کر دیا ہے۔

میں نفرت سے بولا۔''شکلا، انسان کے روپ میں وہ درندہ تھا جس نے وادی کشمیر کے مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھائے۔ایسے آدمی کی تو نسل مٹا دینا چاہیے۔''

وشواس نے کہا۔''بس جو خواہش تمھارے دل میں ہے، اسی کو کوئی عملی شکل میں ڈھالنا چاہتا ہے۔''

''سمجھا نہیں۔'' میں نے حیرانی ہوتے ہوئے وضاحت چاہی۔

وہ ہنسا۔''شکلا کی نسل کو مٹانے کا مفت میں موقع مل رہا ہے، بلکہ معاوضا بھی ملے گا۔''

میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوا۔''شکلا کا کون دشمن پیدا ہو گیا؟''

''یہ تو معلوم نہیں بس اتنا معلوم ہوا ہے کہ کوئی شکلا کی نواسی پرما کے قتل کا خواہاں ہے۔اور شاید اس کے محافظوں کی وجہ سے سنائپر کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔''

''کیا.....؟؟؟'' میں ششدر رہ گیا تھا۔''تمھیں کس نے بتایا۔''

''راجپوت دادا تم سے ملنا چاہتا ہے، اسے لگا دھرمو دادا ملاقات کا بندوبست کر لے گا۔دھرمو دادا نے اسے میرا نمبر دیا۔میں نے تمھارے بارے لاعلمی ظاہر کی، البتہ تم تک راجپوت کی بات پہنچانے کی ہامی بھر لی۔تب اس نے رازداری رکھنے کی تاکید کے ساتھ صرف اتنا بتایا کہ جو میں اگل چکا ہوں۔مزید تفصیلات راجپوت خود بتائے گا۔''

میرا دماغ فوراً جوڑ توڑ میں مصروف ہو گیا تھا۔راجپوت دادا کو ملنا ضروری ہو گیا تھا۔آیا پرما کا دشمن کون ہو سکتا تھا۔اور راجپوت دادا کے لیے پرما کو ٹھکانے لگانا کون سا مشکل تھا کہ ایک سنائپر کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔مجھے یہ پرما کی ہلاکت سے زیادہ اپنے گرد بنا جانے والا جال لگ رہا تھا۔لیکن یہ سچ ہوتا تو میرے انکار پر راجپوت کوئی اور قدم بھی اٹھا سکتا تھا۔اور میں نہیں چاہتا تھا کہ پرما کو کوئی ٹھیس پہنچے۔اچانک یاد آنے پر میں مستفسر ہوا۔

''شکلا کی نواسی کے بارے میں نے تمھیں جو کچھ بتایا تھا وہ تو راجپوت کے سامنے نہیں اگلا۔'' کیوں کہ میں نے اسے پرما کے بارے اجمالاً بتایا تھا کہ اسے اس کے والد تک پہنچانا چاہتا ہوں۔

وہ فخریہ لہجے میں بولا۔''وشواس سنگھ کی چھاتی دوستوں کے رازوں کا قبرستان ہے۔''

میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔''تمھیں یقین ہے وہ مجھے پھانسنے کا خواہش مند نہیں ہے۔''

وہ سکھوں کی ازلی حماقت سے بولا۔''یقین مجھے اس کا بھی نہیں ہے کہ آیا پریتو کی کوکھ میں میرا بچہ ہے یا کسی اور بھائی کی محنت ہے۔''

میں نے کہا۔''وہ تمھارا ذاتی مسئلہ ہے۔اور یہاں میری جان جا سکتی ہے۔''

وہ اعتماد سے بولا۔''ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ملاقات کا مقام میرے آدمیوں کی نظر میں ہوگا۔راجپوت کو اکیلا آنا پڑے گا اور اس کی آمد کے بعد جب ہمیں یقین ہو جائے گا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں تب تمھیں اس تک پہنچا دیا جائے

گا۔''

میں نے رضامندی ظاہر کی۔''تو ملاقات کرادو۔''

''ضرور، البتہ یہ پھانس نکال دو کہ تم نے مجھے اس لڑکی کے بارے کوئی اور کہانی سنائی تھی۔ اور بعد میں اسے آزاد کر دیا۔'' یہ سوال اسے بہت پہلے پوچھنا چاہیے تھا۔ نجانے اتنے دن صبر کیسے کیے رکھا۔ یہ بھی ممکن ہے وہ میرے اندرونی معاملات میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا اور اب پرما کا تذکرہ ہوا تو وہ اپنے اشتیاق کو نہ دبا سکا۔

میں نے وضاحت کی۔''چھوڑا نہیں وہ بھاگ گئی تھی۔ اور اب یہاں اس لڑکی کے اغواء کی خاطر ہی رکا ہوں۔ اور اس بارے صرف تمھیں پتا ہے۔ میں راجپوت سے مل کر اس کے قتل کی وجوہات جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیوں کہ میرے انکار پر وہ کسی اور سے بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔ دنیا میں میں اکیلا سنائپر نہیں ہوں۔ جبکہ میں اس لڑکی کو خراش بھی نہیں لگنے دے سکتا۔''

وشواس سنگھ نے سمجھ جانے کا عندیہ دیتے ہوئے کہا۔''کل دوپہر کو تیار رہنا۔''

اس کے بعد ہم تھوڑی دیر فضول گپیں ہانکتے رہے۔ اور پھر وشواس سنگھ اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔

—— ● ——

راجپوت سے ملاقات کو مجھے گھنٹا بھر کا سفر کرنا پڑا تھا۔ میں وشواس سنگھ کے آدمی کے ہمراہ جیپ پر روانہ ہوا تھا۔ وشواس سنگھ کی طرف سے سب اچھا کا اشارہ ملتے ہی میں ایک گاؤں کے مضافات میں موجود چھوٹے سے مکان پر پہنچا۔ دھرمو دادا کے کارندوں نے دور سے اس مکان پر نظر رکھی تھی۔ کوئی مشکوک حرکت نظر آتے ہی انھوں نے مجھے آگاہ کرنا تھا۔ مکان میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اپنے موبائل فون کی آڈیو ریکارڈنگ چالو کر دی تھی۔

راجپوت دادا ایک چارپائی پر پھیل کر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ہلکی سی الجھن نمودار ہوئی، کیوں کہ میں میک اپ میں تھا۔ لیکن جونہی اسے مخاطب کیا۔ وہ مسکراتا ہوا اٹھا اور معانقے کو بازو پھیلا دیئے۔

رسمی کلمات کی ادائی کے بعد ہم آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ فوراً مدعے پر آیا۔

''وشواس سنگھ آپ کو ملاقات کی غرض و غایت سے تو مطلع کر چکا ہوگا۔''

میں اطمینان سے بولا۔''مگر میں سب کچھ آپ سے سننا چاہتا ہوں۔''

اس نے فوراً پیش کش کی۔''شکلا کی نواسی پرما کو نشانہ بنانا ہے۔ دس لاکھ کنتہ سے پہلے اور پانچ لاکھ کام کی تکمیل پر۔''

میں نے بے تابی سے پوچھا۔''اسے کون مروانا چاہتا ہے اور کیوں؟''

''آم کھاؤ پیڑ گننے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یوں بھی اپنے دشمن کی نسل کو ختم کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔''

میں نے حیرانی ظاہر کی۔''آپ کو کس نے کہا شکلا میرا دشمن ہے۔''

وہ متبسم ہوا۔''زیرزمین طبقے کا بچہ بچہ جانتا ہے، شکلا کے حلق میں گولی اتارنے والا کون ہے۔''

''میں صرف لورا کی وجہ سے اس کا مخالف تھا۔ لورا اپنا بدلہ لے کر چلی گئی، اب مجھے شکلا کے خاندان سے دشمنی پالنے کی کیا ضرورت ہے۔''

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔''کسی کو گولی مارنے کو پندرہ لاکھ کی رقم آپ کی نظر میں کم ہے۔''

میں نے چابک دستی سے اپنا پتا پھینکا۔''مجھے تو لگتا ہے پندرہ لاکھ کا چارہ مجھے گرفتار کرنے کو پھینکا جا رہا ہے۔ اور آپ جان بوجھ کر یا نادانستگی میں ان کے آلہ کار بن گئے ہیں۔''

وہ خلوص سے بولا۔ ''آپ کو محسن سمجھتا ہوں۔ احسان نہ بھی چکا سکا، دھوکا نہیں دوں گا۔''

''میرے دماغ میں چند شبہات ہیں، اگر جواب دے کر مطمئن کر سکتے ہو تو ہامی بھر لوں گا کہ پندرہ لاکھ کی خطیر رقم چھوڑنا واقعی نادانی ہوگی۔ مگر اپنی جان کا خطرہ ہو تب پندرہ لاکھ کیا پندرہ کروڑ کی بھی اہمیت باقی نہیں رہتی۔''

وہ جلدی سے بولا۔ ''میں بھگوان کی سوگندھ کھا کر یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو پھانسنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''یہ شیطان کا راستہ ہے دوست، یہاں بھگوان کا ذکر رہنے دو۔ ہم ایک بے گناہ کے قتل کا سودا کر رہے ہیں اور اس میں بھگوان کی منشا شامل نہیں ہے تو اس کے نام کی قسم کی کیا اہمیت ہوگی۔''

''آپ کو کیسے یقین آئے گا۔'' وہ آہستہ آہستہ میرے ڈھب پر آ رہا تھا۔

میں اطمینان سے بولا۔ ''حقیقت جان کر۔ راجکماری پرما کا دشمن کون ہے، اسے قتل کرنے کی وجہ کیا ہے اور اسے قتل کرنے کو میرا انتخاب کیوں کیا جا رہا ہے۔ کیوں کہ ممبئی کا طاقتور دادا اگر ایک لڑکی کے چند محافظوں سے ڈر کر سنائپر کے بندوبست میں مصروف ہو جائے گا تو عجیب تو لگے گا۔''

اس نے میرے سر پر بم پھوڑا۔ ''وگنیش شکلا اپنی بھانجی کو قتل کرانا چاہتا ہے۔''

''کیا.....؟؟؟'' میں حقیقت میں اچھل پڑا تھا۔

وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''دولت بہت بری چیز ہے دوست! اور یہ ایسی نحوست ہے کہ جتنا اس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، ہوس بڑھتی جاتی ہے۔ شکلا نے اپنی دولت و جائیداد کا دو تہائی اپنی نواسی کے نام لکھا ہے۔ اور یہ وگنیش سے ہضم نہیں ہو رہا۔ گو فی الحال تو پرما اس کی سرپرستی میں ہے۔ مگر جلد ہی کسی کو جیون ساتھی چن کر اپنا رستہ الگ کرنے کا سوچے گی۔ تب وگنیش کی یہ حیثیت نہیں رہے گی جو اس وقت ہے۔ اور وہ وقت آنے سے پہلے وگنیش اس کانٹے کو نکالنا چاہتا ہے۔''

''میرے انتخاب کی وجہ کیا ہے؟ جبکہ یہ کام آپ آسانی سے کر سکتے ہیں۔''

اس نے وضاحت کی۔ ''وہ چاہتا ہے پرما کا قتل اس کے ذمے نہ لگے، کیوں کہ پرما کا کوئی دشمن نہیں ہے اور اس کے مرتے ہی فوراً وگنیش کی ذات شبے کی زد میں آئے گی۔''

میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''سنائپر کی گولی پر کیا تفصیل لکھی ہوگی کہ وگنیش بے گناہ ہے۔''

''شکلا کا قتل آپ کی اس سے دشمنی کو ظاہر کرتا ہے اور پرما کو جب ایک سنائپر کی گولی نشانہ بنائے گی تو دھیان فوراً آپ کی طرف جائے گا۔ وگنیش دعویٰ کر سکتا ہے کہ آپ ان کے خاندان کے خاتمے کے درپے ہیں۔''

میں نے الجھن ظاہر کی۔ ''تو میں ہی کیوں؟ کوئی بھی سنائپر اس سے کم قیمت میں یہ کام کر سکتا ہے۔''

اس نے الجھن سلجھائی۔ ''دو کلومیٹر سے صرف راجا ہی یہ کر سکتا ہے۔ اور پرما کو بھی دو کلومیٹر کے فاصلے سے نشانہ بنانا ہے تاکہ آپ کے علاوہ کسی پر شبہ ہی نہ کیا جا سکے۔''

میں نے اور شبہ اٹھایا۔ ''پچھلے دنوں ہم نے پرما کو اغواء کیا تھا اور اپنا کام نکلوا کر چھوڑ دیا۔ اگر ہم چاہتے تبھی اسے قتل کر سکتے تھے۔ کیا اب یہ سوال نہیں اٹھے گا۔''

اس نے شبے کا قلع قمع کیا۔ ''پرما کے اغواء کے بارے چند قریبی لوگوں کے علاوہ کوئی واقف نہیں۔ کیا آپ نے ٹی وی پر کوئی ایسی خبر سنی تھی؟''

میں نے اگلا نکتہ اٹھایا۔ ''شکلا اور پرما کے قتل کے بعد خاندان کے باقی افراد پر حملہ نہ کرنا کس کھاتے میں جائے گا۔''

اس نے اطمینان بھرے انداز میں انکشاف کیا۔ ''کیوں کہ پرما کے قتل کے بعد آپ مارے جائیں گے۔''

میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''ماشاءاللہ، اچھی بات ہے کہ میں اپنے قتل کے منصوبے میں برابر کا شریک ہوں۔''

''قتل کوئی اور ہوگا جسے آپ کی پہچان دی جائے گی۔ جب چہرہ دھماکے سے اڑ جائے تو باقی جسم کی شناخت چند ماہرین کرتے ہیں اور ان بے چاروں تک جو خون پہنچایا جائے گا وہ آپ ہی کا ہوگا۔ یوں دو جمع دو چار ہو جائیں گے۔''

منصوبہ ہر لحاظ سے مکمل اور جامع تھا۔ کوئی جھول، رخنہ، کمی یا کجی بہ ظاہر نظر نہیں آ رہی تھی۔ اور جہاں تک میرا دماغ کام کرتا تھا میری جگہ کسی دوسرے کا قتل مجھے حوصلہ دینے کو بیان کیا گیا تھا۔ ورنہ لگتا یہی تھا کہ پرما کے فوراً بعد میرا ہی نمبر لگنا تھا۔

میں نے اچانک پوچھا۔ ''پرما کی ماں کا قتل بھی شکلا نے آپ سے کرایا تھا۔''

اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ ''آپ کو کیسے معلوم کہ شکلا نے بیٹی کا قتل کرایا تھا۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''ایسی باتیں چھپی نہیں رہتیں دوست! اور سچ پوچھو تو مجھے یہ بات لورا براؤن سے معلوم ہوئی تھی۔''

''میں ممبئی میں رہتا ہوں، پاروتی شکلا کا قتل انبالہ سے آگرہ آتے ہوئے ہوا تھا۔ البتہ اس کا قاتل جو شکلا کا خاص آدمی تھا اسے شکلا نے ممبئی میں چھپنے کی ہدایت کی تھی اور اس کے قتل پر مجھے مامور کیا تھا۔ اسے قتل کرنے سے پہلے میں نے فطری تجسس کے تحت اس وجہ پوچھ لی تھی۔ اور جیسے ہی اسے معلوم ہوا کہ اس کے قتل کے پس پردہ شکلا ہے تب غصے سے بے قابو ہو کر اس نے سب کچھ اگل دیا تھا کہ کس طرح اس شقی القلب نے بیٹی کو اپنے شوہر سے محبت کرنے کی کڑی سزا دی۔ گو بعد میں اسے پشیمانی نے گھیر لیا تھا، تبھی وہ پرما سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ البتہ اس محبت میں بھی اس نے یہ ڈنڈی ضرور ماری کہ پرما بے چاری کی ماں کا قتل اس کے باپ کے کھاتے میں ڈال دیا یوں اسے ماں کے ساتھ باپ کی شفقت سے بھی محروم کر دیا۔'' اس نے گہرا سانس لیا۔ ''خیر یہ غیر متعلق بات ہے، آپ اپنا فیصلہ سنائیں۔''

''ایک بے گناہ لڑکی کے قتل پر آپ کا ضمیر مطمئن ہے۔'' میں نے اسے جانچنا چاہا۔

اس نے سنگ دلی سے فلسفہ بگھارا ''شیر کے شکار کو بکرے کی بلی دینے والے شکاری کے مدنظر بکرے کی زندگی نہیں اپنا فائدہ ہوتا ہے۔ بلی چوہے کی فکر میں پڑ جائے گی تو اپنا پیٹ کیسے بھرے گی۔ پیدل چلنے والے کو کیڑوں مکوڑوں کو بچانے کی فکر لاحق ہوگی تو اپنی منزل کھوٹی کرے گا۔''

اس کی مثالیں پرما کی جان لینے کے مسئلے پر بالکل منطبق نہیں ہو رہی تھیں، لیکن میں پرما کا وکیل بن کر نہیں بیٹھا تھا کہ فضول کی بحث کرتا۔ میرا مقصد اپنے مشن کی تکمیل تھی۔ میرا دماغ اس تگ و دو میں تھا کہ اس ملاقات کو اپنے لیے کیسے مفید بنایا جا سکتا ہے۔

میں نے پوچھا۔ ''پرما کا والد زندہ ہے یا اسے بھی سورگ باشی (جنت مکانی) کر دیا گیا ہے۔''

راجپوت نے منہ بنایا۔ ''اس سوال کا ہمارے معاملے سے کیا تعلق۔''

میں نے بہ ظاہر بے نیازی و بے پروائی سے اس کے سامنے تجویز رکھی۔ ''بس یونہی خیال آ گیا تھا کہ اگر، وگنیش شکلا اپنی بھانجی کو کسی طریقے سے باپ کے پاس بھجوا دے تو اس پر الزام بھی نہیں آئے گا اور بھانجی سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔''

''وہ اپنے خاندان کی سبکی کہاں کرانا چاہے گا۔ اس کی بھانجی مسلمان بن کر پاکستان میں پرورش پائے۔ یہ اس سے برداشت نہ ہوگا۔ مخالفین کے ہاتھ اسے نیچا دکھانے کا موقع ہاتھ آ جائے گا۔ شکلا کی زندگی میں پرما پاکستان نہیں گئی تھی اب کیوں چلی گئی..... اس کا جواب اگلے خود ہی فرض کر لیں گے جو شکلا کی دولت و جائیداد کا حصول ہوگا۔ اور سب سے بڑھ

کر پرما ہمیشہ اس کے سر پر تلوار کی صورت لٹکتی رہے گی، کیوں کہ وہ کسی بھی وقت بھارت لوٹ کر اپنی جائیداد کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ اس لیے سوچا جائے تو پرما کے قتل سے بہتر اس مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔''

میں لالچی انداز میں بولا۔ ''مجھے جاننا ہے کہ، وگنیش شکلا نے پرما کے قتل کے بدلے کتنے انعام کا اعلان کیا ہے۔''

راجپوت جلدی سے بولا۔ ''آپ کو پندرہ لاکھ کم لگ رہا ہے تو ایک دو لاکھ کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔''

میں حریص بن کر بولا۔ ''میری یہاں آمد کا مقصد تو کوئی اور ہے لیکن آپ کی پیش کش کچھ زیادہ ہی پرکشش اور ڈگمگانے والی ہے۔ مجھے دو دن سوچنے کا موقع دو، پرسوں شام کو یہیں ملاقات ہوگی۔''

وہ بولا۔ ''مجھے نہیں لگتا اس میں مشورہ لینے جیسا کچھ ہے۔ بلکہ میں مخلصانہ مشورہ دے دیتا ہوں کہ اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ پندرہ لاکھ کوئی کم رقم نہیں ہوتی، آپ کی خاطر میں سولہ، سترہ لاکھ کر دیتا ہوں۔ اتنی زیادہ رقم ساری زندگی سرکار کی نوکری میں ناک رگڑ کر حاصل نہیں کر سکو گے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کب اختلاف کیا ہے۔''

''پھر مشورہ چاہنے اور ایک دو دن سوچنے کا کیا مطلب ہوا۔''

میں لالچی انداز میں بولا۔ ''آپ سے کیا پردہ، سیانے کہتے ہیں سوچنے کی مہلت طلب کرنا، مشورہ کرنے کا جھانسا دینا اور فوراً ہامی نہ بھرنے سے بندہ اپنا بھاؤ بڑھا سکتا ہے۔ کیا پتا وگنیش شکلا میرے سوچنے کا سن کر معاوضا دگنا کر دے۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''وگنیش شکلا اس پر بھی بڑی مشکل سے راضی ہوا ہے۔''

میں نے معصومیت سے اسے چھیڑا۔ ''ویسے اس سودے میں آپ کو کیا ملے گا۔''

گلا کھنکارتے ہوئے اس نے ہلکا سا توقف کیا اور پھر بات گول مول کرتا ہوا بولا۔ ''میں تو اس کا خاص آدمی ہوں۔ اور اسے مجھ سے کوئی ایک کام تو نہیں ہوتا کہ واضح بتا سکوں۔''

''پرسوں ملاقات ہوگی۔ اور کوشش کرنا بیس لاکھ دینے پر تیار ہو جائے۔ پندرہ کام سے پہلے پانچ بعد میں۔''

کوشش تھی کہ میری لالچ دیکھتے ہوئے وہ سوچے میں بالکل بھی انکار نہیں کروں گا۔

وہ مصر ہوا۔ ''یار بیس لاکھ معاوضے کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔ اب سوچنے وغیرہ کا ڈراما چھوڑو اور ہامی بھرو۔''

میں ذومعنی لہجے میں بولا۔ ''دیکھ لیا ناں، تھوڑی سی لیت ولعل دکھانے سے پندرہ سے بیس لاکھ ہو گیا ہے۔ بہ ہر حال ٹھیک ہے، بیس لاکھ کے بدلے میں وگنیش جی کی جان اس مصیبت سے چھڑا دوں گا۔''

''تو آپ تیار ہیں۔'' اس نے خوش گوار حیرانی ظاہر کی۔

میں مسمسے لہجے میں بولا۔ ''آپ نے انکار کے قابل چھوڑا ہی کہاں ہے۔''

''ہا.....ہا.....ہا۔'' راجپوت کھل کھلا کر ہنسا۔ ''اب سمجھ داری دکھائی ہے۔'' کوٹ کی اندرونی جیب سے بڑے نوٹوں کی پانچ گڈیاں نکال کر اس نے میز پر رکھیں۔ ''یہ دس لاکھ ہیں، پانچ لاکھ کل مل جائیں گے۔''

حریصانہ انداز میں نوٹوں کی گڈیاں جھپٹتے ہوئے میں مستفسر ہوا۔ ''کب قتل کرنا ہے؟''

وہ بے صبری سے بولا۔ ''کل جمعہ ہے اور اتوار سے پہلے کام ہو جانا چاہیے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جمعہ کے دن مسلمان صرف نیکی کا کام کرتے ہیں، کاروبار کی باتیں اگلے دن پر۔ البتہ آپ کل شام تک رقم پہنچا دینا تاکہ دلجمعی سے کام کر سکوں۔''

''رقم کل صبح ہی وشواس سنگھ کے حوالے کر دی جائے گی۔''

میں جلدی سے بولا۔ ''ایسا بھول کر بھی نہ کرنا۔ وشواس سنگھ ایجنسی کی نظروں میں ہے۔ یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ

میرا نمبر اس کے پاس محفوظ تھا، ورنہ یہاں میرا خیر خوہ کوئی نہیں ہے۔ دھرمودا اور اس کے آدمیوں سے میرا کوئی واسطہ تعلق نہیں۔ اس کے ساتھ فقط آپ کو پکڑنے کی بات ہوئی تھی اور اب یہاں سے جاتے ہی میں اپنا موبائل فون پھینک دوں گا۔ کیوں کہ اس کے ذریعے دشمن آسانی سے مجھ تک پہنچ سکتے ہیں۔ کرن چاولہ میرے پیچھے پڑا ہے اور میں دوبارہ پکڑا گیا تو گیا کام سے۔''

وہ کہنے لگا۔ ''جانتا ہوں، کرن چاولہ اور اتھری حسینہ.....''

''ایک منٹ راجپوت دادا۔'' میں نے سرعت سے قطع کلامی کی، کیوں کہ مجھے لگا وہ ممتا دیدی کے متعلق کوئی بکواس کرنے والا ہے۔ ''سنیتا جیسوال کے متعلق سوچ سمجھ کر کچھ بولنا۔ وہ میری دیدی ہیں۔''

راجپوت پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ''وہ مضبوط کردار کی لڑکی ہے۔ اور ایسی لڑکیوں کو دو نمبر لوگ یونہی بے ہودگی سے پکارا کرتے ہیں۔ بہ ہر حال آپ نے پہلے سے مطلع کر کے اچھا کیا۔ میں بس یہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ بھی آپ کی تلاش میں سرگرم ہے۔ بہت چالاک و ہوشیار ہے۔''

میں نے فقط سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

اس نے پوچھا۔ ''تو رقم آپ تک کیسے پہنچائی جائے۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''اپنے چھوٹے بھائی وشال گپتا کے پاس رکھوا دینا، میں وصول کر لوں گا۔''

وہ ہنسا۔ ''ویسے وشال گپتا کے ساتھ آپ کی آخری ملاقات کوئی بہتر حالات میں نہیں ہوئی تھی۔''

میں سنجیدگی سے بولا۔ ''اگر اپنی زندگی کو وہ میرا احسان نہیں مانتا، تو اس سے بڑا احسان فراموش کوئی نہ ہوگا۔''

اس نے جلدی سے تردید کی۔ ''ایسی بات نہیں ہے، وہ آپ کی بڑی تعریف کر رہا تھا۔''

''اسے بتا دینا اچھا سا بندوبست کر لے، کل دوپہر کا کھانا ان شاء اللہ اس کے ہمراہ کھاؤں گا۔''

''ضرور۔'' اس نے نشست چھوڑ دی۔ الوداعی مصافحہ کر کے میں باہر نکل آیا۔ ڈرائیور جیپ کے پاس تیار کھڑا تھا۔ موبائل فون کی ریکارڈنگ آف کرتے ہوئے میں نے نشست سنبھالی۔

گاڑی مکان سے باہر نکالتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ''واپس جائیں گے۔''

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میں آڈیو ریکارڈنگ لورا کے ای میل ایڈریس پر بھیجنے لگا۔ کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا کسی حادثے کی وجہ سے اتنی قیمتی ریکارڈنگ ضائع ہو جائے۔ ساتھ ہی میں نے لورا کو بھی وضاحت لکھ دی تھی تاکہ خواہ مخواہ سر نہ کھپاتی رہے۔

ایک نہر کے پل پر سے گزرتے وقت میں نے اپنا موبائل فون اندر اچھال دیا، کیوں کہ اب وشواس سنگھ کے پاس میرے نمبر موجود ہونے کی خبر نے پھیل جانا تھا۔ اور میں خطرہ مول لینے کے حق میں بالکل نہیں تھا۔

وشواس سنگھ میری رہائش پر بے چینی سے منتظر تھا۔ میں نے راجپوت سے ہونے والی گفتگو تفصیل سے اسے بتا دی تھی۔

اس نے پوچھا ''اب کیا ارادہ ہے؟''

میں نے کہا۔ ''پرما کو اغواء کرنے کو میرے پاس کل کا دن ہے۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے اگر ان کے دل میں مجھے قتل کرنے کا منصوبہ پل رہا ہے تو کل وشال گپتا کے ہاں میری گرفتاری کی تیاری مکمل ہوگی۔ ایسا نہ ہوا تب بھی کل تعاقب کر کے میرا ٹھکانہ ضرور ڈھونڈیں گے، تاکہ جب میں پرما کو نشانہ بنا لوں تو اس کے بعد مجھے قتل کرنے کو انھیں زیادہ تگ و دو نہ کرنا پڑے۔''

وہ خلوص دل سے بولا۔ ''اغواء کے بارے کچھ سوچا بھی ہے یا مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔''

''تمھاری شمولیت، تمھارا بیڑا غرق کردے گی۔ وگنیش شکلا اپنے باپ سے کم درجہ کمینہ نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے میں نے اپنے تعلق کی آخری کڑی یعنی موبائل فون نہر میں پھینک دیا ہے۔''

وہ تپتے ہوئے بولا۔ ''ایسی کی تیسی شکلا خاندان کی.....''

میں قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ میں کرلوں گا۔ تم بھروسے کے دو تین آدمی ڈھونڈ کر دو۔ جن کا تعلق تمھارے گروہ سے نہ ہو۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''اب اتنی احتیاط بھی ضروری نہیں ہے۔''

اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے میں مسکرایا۔ ''تمھارے لیے نہیں کر رہا یار! اپنی بھابی پریتو کے لیے فکر مند ہوں۔''

وشواس سنگھ نے گہرا سانس لیتے ہوئے شکست کا اعلان کیا۔ ''نجو چکر باز بہترین بلونگرا ہے۔ مزید آدمیوں کا بندوبست بھی وہ کردے گا۔''

بلاشبہ عورت، انسان کو کمزور کرتی ہے۔ وشواس سنگھ کوئی عام آدمی نہیں دھرمو دادا کا دست راست تھا۔ لیکن جب بیوی کی بات آئی تو اسے پیچھے ہٹنا پڑا۔ شکلا خاندان سے ٹکر لینے کی اسے ذرا بھی پروا نہیں تھی، مگر پریتو کی تھی۔ اور یقیناً وہ پریتو پر آنچ آتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''کہاں ملے گا؟''

اس نے موبائل فون نکالا۔ ''پوچھ لیتا ہوں۔''

میں نے جیب سے ایک نیا موبائل فون نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔ ''اس موبائل فون سے بات کرو۔ تمھارا نمبر قابل اعتماد نہیں رہا۔ مجھے شک ہے 'آبزرویشن' پر نہ لگا ہو۔''

ڈاکٹر دیوا شش کی تجوری سے ہمارے ہاتھ دس بارہ موبائل فون لگے تھے، جن میں سے دو تین اب تک میرے پاس موجود تھے۔ اس نے اپنے موبائل فون سے نمبر ڈھونڈ کر دوسرے میں ڈائل کیا اور موبائل فون کان سے لگا لیا۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔

نجو کے استفسار پر وہ بولا۔ ''اپنا ٹھکانہ بتاؤ میرا آدمی گھنٹے دو میں وہیں پہنچ جائے گا، اس دوران دو قابل اعتماد ساتھی بھی ڈھونڈ لو۔ کیونکہ کم از کم تین آدمیوں کی ضرورت پڑے گی۔''

نجو چکر باز نے اپنا پتا بتا کر رابطہ منقطع کر دیا۔

وشواس سنگھ نے پوچھا ''منصوبہ کیا ہے؟ یا مجھ سے مخفی رکھو گے۔''

وہ ایسا شخص نہیں تھا کہ کچھ چھپایا جاتا، میں صاف گوئی سے بولا۔ ''کچھ بہتر نہیں سوچ سکا ہوں۔ مگر اتنی جلد بازی میں اور کوئی سوجھ بھی نہیں رہا۔ میرا ارادہ پرما کو ہسپتال کی پارکنگ میں گھیرنے کا ہے۔ میں سنائپر رائفل سے اس کے محافظوں سے نبٹوں گا۔ اس دوران نجو اور اس کے ساتھی پرما کو اغواء کرلیں گے۔''

وشواس نے خیال ظاہر کیا۔ ''منصوبہ بالکل سادہ ہے اور خطرہ موجود ہے۔''

''جلدی میں یہی سوچا جاسکا، تمھارے پاس کوئی بہتر رائے موجود ہے تو بتاؤ۔''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''ممبئی سے نکلنے کا کوئی بندوبست کرسکتے ہو۔''

''دوسرے ملک یا شہر؟''

میں نے کہا۔ ''جو آسان لگے۔''

''ہو جائے گا، تم لڑکی پر قبضہ جماؤ۔ میں بندوبست کرتا ہوں۔''

میں نے تاکید کی۔ ''بہت احتیاط سے اور خود سامنے نہ آنا۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''بچہ نہیں ہوں یار! تم پتاجی بننے کی کوشش نہ کرو۔''

میں نے قہقہہ لگایا۔ ''جس کے نام کا لاحقہ سنگھ ہو اس سے سمجھ داری اور بخیل سے خیرات ملنے کی توقع ایک برابر ہے۔''

وہ اطمینان سے بولا۔ ''تمھاری بے تکی جگتیں اس قابل بھی نہیں کہ مجھے ذرا سا غصہ دلا دیں۔''

میں نے موضوع تبدیل کیا۔ ''نجو کا پتا میرے حوالے کرو تاکہ میں رخصت لوں۔''

اس نے مشورہ دیا۔ ''کھانا کھا کر چلے جانا۔''

اور مجھے اثبات میں سر ہلانا پڑا۔

—●—

کھانا کھا کر میں فارم ہاؤس سے نکل آیا، ایک موبائل فون اس کے پاس چھوڑ آیا تھا، تاکہ اس سے بے دھڑک ہو کر رابطہ کر سکوں۔ اپنی موٹر سائیکل میں نے وہیں چھوڑ دی تھی کہ آگے کار کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ راجپوت دادا سے وصول کیے دس لاکھ میں نے وشواس سنگھ کے حوالے کر دیئے تھے کہ کل شام کو انھیں راجپوت دادا تک پہنچا دے۔ بے اصولی میں بھی اصول کا دھیان رکھنا میری فطرت ہے۔ جب اس سے کیے معاہدے پر عمل نہیں کرنا تھا تو اس سے وصول کی ہوئی رقم کو استعمال میں لانا قطعی درست نہ ہوتا۔

اندھیرا چھا گیا تھا۔ نجو کی رہائش تک پہنچتے ہوئے دو گھنٹے لگے تھے۔ عجیب اتفاق تھا کہ اس نے رہائش کو وہی علاقہ چنا تھا جہاں کچھ عرصہ پہلے میں لورا کے ساتھ رہ چکا تھا۔ وہ مفلسوں کی بستی تھی۔ چھوٹے چھوٹے تنگ و تاریک کمرے، ہر طرف پھیلی غلاظت و گندگی، ننگ دھڑنگ بچے اور بنیادی ضرورتوں سے محروم علاقہ۔

گلی میں کار کا رستہ موجود تھا لیکن گلی میں کار پارک کی جاتی تو رستہ بند ہو جاتا۔ اس لیے کار میں نے گلی کی نکڑ پر ایک مناسب جگہ پارک کر دی تھی۔

تھوڑی سی تگ و دو کے بعد مطلوبہ کھولی مل گئی تھی۔ لوہے کا سفید دروازہ جس پر سرخ رنگ سے دل بنا تھا اور دل میں پیوست تیر اور نوک سے ٹپکتے قطرے کسی سستے عاشق کے جذبات کی عکاسی کر رہے تھے۔

دستک کے جواب میں قدموں کی آواز ابھری اور پھر نجو کی محتاط آواز سنائی دی۔ ''کون؟''

میں اطمینان سے بولا۔ ''وہی جس نے تمھیں ایک لڑکی سے پٹتے دیکھا ہے۔''

ایک دم دروازہ کھلا نجو کا چہرہ نظر آیا، بازو پھیلاتے ہوئے وہ رنگھے لہجے میں بولا۔ ''آہ باس! کس کٹھور کا نام لے دیا۔ جب سے بچھڑی ہے سالی مسلسل خواب میں آ رہی ہے۔''

معانقہ کرتے ہوئے میں ہنسا۔ ''کیوں پہلی مار کے اثرات معدوم ہو گئے ہیں۔''

علیحدہ ہوتے ہوئے اس نے مجھے اندر آنے کا رستہ دیا۔ ''جسمانی چوٹوں کی کوئی اہمیت نہیں باس، البتہ دل پر جو زخم آئے ہیں وہ جلدی ٹھیک ہوتے دکھائی نہیں دیتے۔''

میں نے انکشاف کیا۔ ''بہرحال اب ان زخموں کے ساتھ ہی جینا سیکھو کہ وہ واپس چلی گئی ہے۔''

اس نے دہائی دی۔ ''جانتا تھا، سالی محبت وجبت اپنی قسمت میں نہیں ہے، پھولن دیوی ڈاکو بن گئی، انوشکا شرما نے

کرکٹر ڈھونڈ لیا، کرینہ کپور کو نواب خاندان مل گیا، کترینہ کیف لفٹ نہیں کراتی اور اب لورا براؤن اتنی دور چلی گئی جہاں غریب نجو کی چیخیں بھی نہیں پہنچیں گی۔''

میں ہنسا۔''پھولن دیوی تو تمھارے دادے کی ہم عمر تھی، اس سے کیسے عشق کر بیٹھے۔''

اس نے منہ بنایا۔''سپنوں میں کسی سے بھی عشق ہو سکتا ہے۔ انوشکا، کرینہ اور کترینہ سے بھلا کب ملا ہوں۔''

''ہاں، صرف ایک سے ملے ہو اور اس نے بھی وہ دھلائی کی ہے کہ کافی عرصے تک صابن و سرف کی ضرورت سے بے نیاز رہو گے۔''

''زخموں پر نمک چھڑکنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔ بہ ہر حال عاجز کو کیسے یاد کیا۔'' لکڑی کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ مدعے پر آیا۔

میں بغیر لگی لپٹی رکھے بولا۔''ایک لڑکی اغواء کرنی ہے، جس کے ہمراہ آٹھ دس محافظ ہر وقت ہوتے ہیں۔''

اس نے اندازہ لگایا۔''شاید وہی لڑکی ہے، جس کا نام لورا، پری لے رہی تھی۔'' کم بخت کا دماغ کافی تیز تھا۔ لورا کی گفتگو اسے بھولی نہیں تھی۔ اور بغیر تفصیل جانے پرماتک پہنچ گیا تھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔''بالکل وہی لڑکی ہے۔''

اس نے دوبارہ اندازہ لگایا۔''شاید رندھیر شکلا کی کوئی رشتہ دار ہے جس کا کریا کرم آپ لوگوں نے اس دن کیا تھا۔''

میں نے کچھ کہے بغیر اوپر نیچے سر ہلا دیا۔

اس نے دیر کیے بغیر فیصلہ سنایا۔''کافی مشکل کام ہے باس، تین لاکھ لگیں گے۔''

''منظور ہے۔'' میں نے بھی دیر نہیں لگائی تھی۔

اس نے پوچھا۔''کب۔''

میں نے کہا۔''کل۔''

وہ اطمینان سے بولا۔''کام خطرناک ہے لیکن آپ کو مایوس نہیں کروں گا باس۔''

میں نے تنبیہ کرنا ضروری سمجھا۔''ایک بات دھیان میں رہے، لڑکی کو خراش بھی نہیں آنا چاہیے۔ ورنہ یاد رکھنا اس بار معافی کی گنجائش نہیں ہو گی۔''

اس نے منہ بسورا۔''کیا ہے باس! خوب صورت لڑکیوں کو سامنے لا کر آزمائش میں ڈالتے ہوئے آپ اپنے کس جذبے کی تسکین کرنا چاہتے ہیں۔''

''نجو! میں تاکید کر رہا ہوں، لڑکی کے ساتھ ذرا سی بھی چھیڑ خانی سے پہلے یہ سوچ لینا کہ انجام صرف دردناک موت ہو گا۔''

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔''کیا بہت زیادہ خوب صورت ہے۔''

میں نے کہا۔''زندگی سے خوب صورت نہیں ہے۔''

اس نے مجھے تسلی دلائی۔''بے فکر رہیں باس، نجو کو صرف لورا براؤن سے عشق ہوا تھا، کوئی انڈین لڑکی نجو کو متاثر نہیں کر سکتی۔''

میں اطمینان سے بولا۔''فکر کی ضرورت تمھیں ہے، کیوں کہ سنائپر رائفل میرے ہاتھ میں ہو گی۔ اور میرے لیے سر میں گولی اتارنا ایسا ہی ہے جیسے تمھارے لیے نوالہ منہ تک لے جانا۔''

وہ طعنہ زن ہوا۔''کیا لگتا ہے، میں یوں ٹھیک طرح سے کام کر لوں گا۔''

میں نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ ''پتا نہیں، البتہ یوں تم محتاط ضرور رہو گے۔ اور مجھے تمھاری زندگی سے زیادہ پری کی عزت مطلوب ہے۔''

اس نے قہقہہ لگایا۔ ''تو مس لورا براؤن کی باتیں صحیح تھیں، آپ کو پری بی بی سے محبت ہے۔''

''مطلب کی بات بتادی کہ محتاط رہنا ہے اور کس سے رہنا ہے۔ البتہ کیوں رہنا ہے یہ جاننا تمھارے کس کام کا۔''

اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے دہائی دی۔ ''ایسا ہی ہوگا میرے باپ، اب منصوبے پر روشنی ڈالو تا کہ اس کے مطابق بندوں کا انتظام کرسکوں۔''

میں نے کہا۔ ''کارروائی' کے ایچ نارینہ ہسپتال اینڈ ریسرچ سنٹر' کی پارکنگ میں ہوگی۔ پارکنگ ہسپتال کے غربی جانب بنی ہے۔ میں شمالی جانب، سڑک کے پار بلڈنگ کی چھت پر موجود ہوں گا۔ جو 'گنیش جی مہاراج پارک' اور کے ایچ نارینہ ہسپتال کی پارکنگ کے درمیان میں پڑتی ہے۔'' میں نے موبائل فون پر نقشہ کھول کر اسے دکھایا۔ ''اس رہائشی بلڈنگ کی چھت پر جانا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ اور اندازے کے مطابق یہاں سے پارکنگ کا ہوائی فاصلہ چھے سات سو میٹر سے زیادہ نہ ہوگا۔ اور اتنے کم فاصلے سے میرے لیے بندوں کا سنبھالنا مشکل نہ ہوگا۔''

وہ مخل ہوا۔ ''چھے سات سو کم فاصلہ ہے؟''

''وضاحتوں کو رہنے دو اور جو کہہ رہا ہوں یقین کے ساتھ سنتے رہو۔'' اسے جھڑکتے ہوئے میں مطلب کی گفتگو پر آیا۔ ''پرما سے پہلے محافظ باہر نکل کر اس کے لیے دروازہ کھولتا ہے۔ جیسے ہی وہ باہر نکلے گی میں اس کے محافظ کو ناکارہ کر دوں گا۔ باقی محافظوں میں سے جو جیپ سے اتر کر آگے آنے کی کوشش کریں گے وہ سلامت نہیں بچیں گے۔ جونہی فائرنگ شروع ہو تم پرما کو یرغمال بنا کر اسی کی کار میں بیٹھ جانا۔ ڈرائیور کو باہر نکال کر تمھارا ساتھی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لے گا۔ ان کی جیپوں کو میں تعاقب کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔ تم لوگوں کا تیسرا ساتھی اپنی کار لے کر راستے میں کھڑا ہونا چاہیے۔ وہاں پرما کی کار کو چھوڑ کر اپنی کار میں بیٹھ کر یہیں پہنچ جانا۔ پرما کو پہلی فرصت میں بے ہوش کر دینا۔ باقی اس کے محافظ پرما کی وجہ سے تم پر گولی چلانے سے گریز کریں گے۔ کوئی اعتراض.....؟'' میں نے بات ختم کرنے کا اعلان کیا۔

وہ اطمینان سے بولا۔ ''بالکل ہے، بس یہ بتادو مجھے جو دھمکیاں دی ہیں ان میں کتنی حقیقت ہے۔''

میں نے تصحیح کی۔ ''اسے دھمکیاں دینا نہیں برے انجام سے بچانے کی کوشش کرنا کہہ سکتے ہو۔''

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''مارے گئے۔'' اور موبائل فون پر کسی کا نمبر ڈائل کر کے کان سے لگا لیا۔ ''سلام دعا رہنے دو اور بیس ہزار کمانے ہیں تو جمی کے ساتھ فوراً میرے پاس پہنچو۔''

لمحہ بھر خاموش رہ کر اس نے دوسرے کی بات سنی اور پھر وضاحت کرتا ہوا بولا۔ ''دونوں کو بیس بیس ہزار ملیں گے۔ اور اب پہنچنے کی کرو۔'' اپنا پتا بتا کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے طنز کیا۔ ''مجھ سے تین لاکھ لے رہے ہو اور اپنے ساتھیوں کو بیس بیس ہزار پر ٹرخا رہے ہو۔''

وہ بے نیازی سے بولا۔ ''باس! آپ کو کام سے غرض ہونا چاہیے۔''

''جائز بات۔'' برا منائے بغیر میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور جیب سے بڑے نوٹوں کی گڈی نکال کر اس کی جانب پھینکی۔ ''یہ دو لاکھ ہیں۔ ایک لاکھ کام کے بعد۔ اور کام اچھا پایا تو ساتھ انعام بھی ملے گا۔''

اس نے ڈھیٹوں کے انداز میں دانتوں کی نمائش کی۔ ''شکریہ مجھے تقاضے سے بچا لیا۔''

میں بستر سنبھالتے ہوئے بولا۔ ''تھوڑی دیر آرام کروں گا۔ بہتر ہوگا اپنے دوستوں کو باہر ہی وصول کر کے کسی کھوکے پر چائے وغیرہ پلا دو۔''

وہ چاپلوسی سے بولا۔ ''کل تک تو تجو آپ کا ملازم ہے باس! اس کے بعد بھی خادم ہی سمجھو۔'' یقیناً دو لاکھ کی خطیر رقم پا کر اس نے تابعداری تو دکھانا تھی۔

اس کے باہر جانے کے بعد میں بستر میں ہو گیا۔ کل کا دن بہت اہم تھا۔ اور مجھے بغیر تیاری کے میدان میں اترنا تھا۔

—— ● ——

صبح سویرے اٹھ کر میں نے نماز پڑھی اور تیار ہو گیا۔ تجو اور اس کے دو ساتھی فرش پر چٹائی بچھا کر لیٹے تھے۔ انہیں جگا کر میں نے وقت سے 'کے ایچ نارینہ ہسپتال اینڈ ریسرچ سنٹر' کی پارکنگ میں پہنچنے کا کہا۔

سنائپر ہمیشہ منصوبہ بنا کر اور ہدف وغیرہ کی مکمل قراولی کر کے میدان میں اترتے ہیں۔ لیکن یہ ایسا مشن تھا کہ نہ تو میرے پاس تیاری کا وقت تھا۔ اور نہ میں مشن کو مؤخر کر سکتا تھا۔ انصاری صاحب کی لاڈلی کی زندگی خطرے میں تھی۔ جوشقی القلب ماموں دولت و جائیداد کی خاطر اپنی بھانجی کو قتل کرا سکتا تھا، اس سے بعید نہ تھا کہ پرما کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر ساری قباحتوں کو پس پشت رکھ کر کسی احتیاط کو خاطر میں نہ لاتا۔ انسان کی فطرت ایسی ہے کہ پہلے خود کو بے گناہ، بے قصور اور لوگوں کی نظر میں صاف ستھرا بننے کے لالچ میں کئی قسم کی احتیاطیں مدنظر رکھتا ہے۔ خود کو شک سے بچانے کو خطیر رقم بھی خرچ کرتا ہے۔ لیکن کام بنتا ہوا نظر نہ آئے یا شکار ہاتھ سے نکلتا دیکھے تو پھر انجام سے بے پروا ہو کر اندھی کھائی میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔

آخرت کی فکر اور اللہ تعالیٰ کا خوف جب دل میں نہ ہو تو انسان کو دھن دولت اور جائیداد ہر خوشی، آسائش اور سکون سے بڑھ کر لگتے ہیں۔ ان کے سامنے خون کے رشتے بھی اپنی پہچان کھو بیٹھتے ہیں۔ اخلاقی اقدار کوئی حیثیت نہیں رکھتے، رحم دلی، ہمدردی اور انسانیت کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اور پرما بے چاری کا واسطہ بھی ایسے ہی خانوادے سے پڑا تھا۔ نانا نے اپنی انا، جھوٹی غیرت اور اسلام و پاکستان دشمنی کی وجہ بیٹی کا بلیدان دیا تھا، نواسی کو اس کے باپ کی شفقت سے محروم رکھا تھا تو ماموں دولت کی خاطر اس کی جان کے درپے تھا۔

کھولی سے نکل کر میں کار کے پاس پہنچا۔ ڈگی کا قفل کھول کر ایس آر ون کے بیگ کا جائزہ لیا اور 'گنیش جی مہاراج پارک' کو چل پڑا۔ طلوع آفتاب کے تھوڑی دیر بعد میں مطلوبہ رہائشی بلڈنگ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ وہ عمارت میں ایک دو بار پہلے سڑک سے گزرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اور اس کی بلندی سے کے ایچ نارینہ ہسپتال کی پارکنگ میں فائر کرنا مشکل نہ تھا۔ شوبھا منزل کی پانچ چھے منزلہ عمارت میں بہت سے رہائشی فلیٹ بنے تھے۔ پارکنگ میں کار کھڑی کر کے میں نے ایس آر ون کا بیگ نکالا اور سیڑھیوں کے ذریعے آخری منزل پر پہنچ گیا۔ چھت پر جانے کو لوہے کی ایک پتلی سی سیڑھی لگی تھی۔ جس پر لوہے کا ایک پٹ والا دروازہ بنا تھا۔ دروازہ کھولنے کو اوپر اٹھانا پڑتا۔ چھت پر پہنچ کر میں نے سیڑھی بھی اوپر کھینچی اور دروازہ گرا دیا۔ سردیوں کی صبح کو کسی کا آٹھ نو بجے اوپر آنا متوقع نہ تھا۔ لیکن احتیاط لازمی تھی۔ سیڑھی کی غیر موجودی پر اتنا واویلا نہ اٹھتا، لیکن کوئی میرے سر پر آ کر کھڑا ہو جاتا تو یقیناً مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔

چھت پر چاروں کونوں میں سیمنٹ کی چار بڑی ٹینکیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں مطلوبہ پارکنگ کی شمالی جانب موجود تھا۔ گویا پارکنگ میرے جنوب کی طرف آ رہی تھی۔ درمیان میں 'ایسٹرن ایکسپریس ہائی وے روڈ' گزر رہا تھا۔ لیزر رینج فائینڈر سے فاصلہ ناپنے پر 710 میٹر بنا تھا۔ میں عمارت کی جنوب مغربی کونے والی ٹینکی کی چھت پر چڑھ گیا۔ ضروری کاروائی کر کے میں نے ایلی ویشن وغیرہ لگائی، رائفل کے پیچھے لیٹ کر اپنی پوزیشن درست کی۔ اور پھر ہدف ہی پر نظر جمائے رکھی۔ لیٹا ہونے کی وجہ سے میں لوگوں کی نظروں میں آنے سے محفوظ تھا۔

تجو کا اپنی جگہ پر پہنچ جانے کا پیغام مل گیا تھا۔ پرما کی آمد سے تقریباً گھنٹا سوا گھنٹا باقی تھا۔ اور سنائپر کے لیے گھنٹوں

کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ہم تو وہ مخلوق ہیں کہ ہدف کے لیے ڈیڑھ دو دن تک ایک ہی جگہ پر چھپ کر بیٹھ سکتے ہیں، یہاں تو ایک دو گھنٹے کی بات تھی۔ اور بیٹھنا نہیں لیٹنا تھا۔

ایس آر ون کی ٹیلی اسکوپ سائیٹ کے دیکھنے کی صلاحیت عام آنکھ کی نسبت تیس گنا زیادہ تھی۔ مطلوبہ پارکنگ بالکل واضح اور صاف نظر آ رہی تھی۔ پرما کی آمد کا وقت قریب آیا تو میں نجو کو کال کرنے لگا۔

اس کی چہکتی ہوئی آواز ابھری۔ ''ہم تیار ہیں باس۔'' ایسی حالت میں اس کا پراعتماد لہجہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اس کام کے لیے موزوں شخص تھا۔ اگر لورا براؤن موجود ہوتی تو اسے سنائپنگ پر بٹھا کر میں خود پرما اغواء کرتا، مگر اب وہ چلی گئی تھی۔ اور منجھے ہوئے سنائپر کے علاوہ کوئی آدمی اتنے فاصلے سے حالات کو قابو میں نہیں کر سکتا تھا۔ کسی ایک آدمی کو نشانہ بنانا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا بہت سے لوگوں پر نشانہ سادھنا ہوتا ہے۔ مسلسل شست تبدیل کرنا، ایک ہدف سے دوسرے ہدف پر جانا یوں کہ کوئی گولی خطا نہ جائے۔ اور خاص کر جب لوگوں کو قتل کرنے کے بجائے وہاں اپنے آدمیوں کی حفاظت ملحوظ ہو۔

امید یہی تھی کہ پرما کا کوئی محافظ اسے نشانہ بنانے کی کوشش نہ کرتا۔ مگر گولی میں عقل و شعور ہوتا ہے نہ اس کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ اندھا دھند فائر کے نتیجے میں کوئی اچٹتی ہوئی گولی اسے نشانہ بنا سکتی تھی۔ اور ایسا ہونے کی صورت پچھلے کئی ماہ کی تپسیا خاک میں مل جاتی۔ بلاشبہ زندگی و موت اللہ پاک کے قبضہ قدرت میں ہے۔ حاثاتی موت کا ذمہ دار کسی انسان کو ٹھہرانا زیادتی و کم عقلی کے زمرے میں آتا ہے۔ مگر جس کا پیارا کھو جائے اسے غصے کی نکاسی اور جذبات کے اظہار کو کسی ہدف کی تلاش ضرور ہوتی ہے۔ اور میں انصاری صاحب کی شکوہ کرتی آنکھوں کی تاب لانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے نجو کو محتاط رہنے کی تاکید کرتے ہوئے کہا۔ ''بس چند لمحوں میں وہ پہنچ جائے گی۔ اور ایک بار پھر تاکید کر رہا ہوں، اس کی جان بہت قیمتی ہے۔ میں اس کے کسی محافظ کو قتل نہیں کرنا چاہتا لیکن پری کی جان کو خطرے میں دیکھ کر تم بالکل لحاظ نہ رکھنا۔''

وہ مزاحیہ انداز میں بولا۔ ''باس! کچھ زیادہ ہی پیاری ہے آپ کو۔''

میں نے تکرار ختم کی۔ ''تمھیں سمجھا نہیں سکتا، اس لیے جو بکواس سوچنا ہے کھلی اجازت ہے، بس پرما کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔''

''بے فکر رہیں باس، نجو جب پیشگی وصول کر لے تو جان لڑا دیتا ہے۔ چکر بازی صرف چکر بازوں کے ساتھ کرتا ہے۔''

اس دوران میری نظریں 'ایسٹرن ایکسپریس ہائی وے روڈ' سے منسلک اس طویل روش پر گھوم رہی تھیں جو ہسپتال کی بڑی عمارت کے پاس جا کر دائیں طرف مڑ جاتی تھی۔

کالی مرسڈیز اور اس کے آگے پیچھے دو جیپوں کو دیکھتے ہی میرا دل بری طرح دھڑکا۔ میں سرعت سے بولا۔

''نجو وہ پہنچ گئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے باس۔ رابطے میں رہنا۔''

''ہونہہ!'' میں نے ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا اور نظریں جانی پہچانی مرسڈیز پر گاڑ دیں۔

سبک روی سے چلتے ہوئے تینوں گاڑیاں پارکنگ کے اندر داخل ہوئیں۔ پارکنگ کافی وسیع تھی۔ ڈرائیور نے مرسڈیز شمالی جانب موڑ کر ریورس کر کے جنوبی کونے میں لگائی یوں کہ کار کے بونٹ کا رخ شمالی جانب ہو گیا جدھر میں موجود تھا۔ جیپیں مغربی کونے کی طرف بڑھیں، ڈرائیوروں نے جیپیں گھما کر ان کی پشت مغرب کی طرف کرتے ہوئے بونٹ کا رخ مشرقی جانب کر دیا تھا۔ مرسڈیز کے رکتے ہی مجھے نجو کی آواز سنائی دی۔

''باس! میں قریب جارہا ہوں۔''

''تیار رہنا، پری کے باہر نکلتے ہی میں کام کر جاؤں گا۔'' اسے ہدایت دیتے ہوئے میں نے محافظ پر شست باندھ لی۔ دروازہ کھول کر وہ سرعت سے باہر نکلا اور عقبی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

پرما نے نزاکت سے پاؤں باہر دھرا، محافظ نے ایک طرف ہو کر پرما کو گزرنے کا راستہ دیا، تب اس کا چہرہ میری جانب تھا۔ میں نے اس کے دائیں کندھے پر شست سادھی ہوئی تھی، کیوں ایک تو پرما اس کے بائیں جانب موجود تھی، یوں پرما کو گولی لگنے کا خطرہ بالکل نہ ہوتا، دوسرا دایاں ہاتھ ناکارہ ہو جانے پر وہ مزاحمت کے قابل نہ رہتا۔

جیسے ہی محافظ کی حرکت رکی، میں نے لبلبی دبا دی۔ سات سو میٹر کے فاصلے پر ایس آر ون کی طاقتور گولی نے اسے کولہوں کے بل گرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پرما کے ہونٹوں سے تیز چیخ نکلی تھی..... میں فوراً محافظوں کی جیپ کی طرف متوجہ ہوا۔ سب سے پہلے دو محافظ جیپ سے اتر کر اس طرف بھاگے، مگر دونوں تین چار قدم سے زیادہ نہ لے سکے اور اپنی اپنی ران پر ہاتھ رکھتے ہوئے لمبے لیٹ گئے تھے۔ ان کے پیچھے ایک اور محافظ نے بھی فرض شناسی کی کوشش کی۔ اگلی گولی نے اس کی ران میں شگاف ڈال دیا تھا۔

گولی کی ایک خاصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ جس جانب سے اندر گھستی ہے وہاں بالشت چھوٹا سا سوراخ ہوتا ہے۔ مگر جب دوسری جانب نکلتی ہے تو گوشت پھاڑ کر چوڑا شگاف چھوڑ جاتی ہے اور مضروب عضو کا کافی گوشت ساتھ لے جاتی ہے۔

تیسرے آدمی کے گرتے ہی باقی محافظوں نے گاڑیوں کی پناہ لے لی تھی۔

اس دوران نجو اور اس کا ساتھی ان کے قریب پہنچ گئے تھے۔ پارکنگ میں موجود لوگوں میں افراتفری مچ گئی تھی اور جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ پڑا تھا۔ پرما کا ڈرائیور باہر نکلا، پرما محافظ کے پاس ہی ششدر کھڑی تھی۔

نجو نے ایک دم پرما کے بازو پر گرفت جمائی اور چلایا۔ ''پلیز مس! کار کے اندر ہو جاؤ، گولیاں چل رہی ہیں۔''

''جج..... جی بھائی۔'' وہ ہکلا گئی تھی۔ اسی وقت میری رائفل نے پانچویں گولی اگلی اور محافظ کو سنبھالنے والا ڈرائیور کولہے پر گولی کھا کر اس کے اوپر ہی اوندھے منہ گر پڑا۔

''یہاں سے نکلنا پڑے گا ورنہ راجکماری ماری جائے گی۔'' نجو پر تشویش آواز میں کہتا ہوا عقبی نشست میں پرما کے ساتھ بیٹھا، جبکہ اس کے ساتھی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

''کک..... کون ہیں آپ.....؟'' پرما ہکلا گئی تھی۔

''فکر نہ کرو ہم آپ کو بچانے آئے ہیں۔'' نجو نے اسے تسلی دینا چاہی۔ اس دوران اس کے ساتھی نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

''کار روکو، ہمارے محافظ موجود ہیں، ہم تمہیں نہیں پہچانتے..... مدد..... کوئی ہے.....'' پرما کی تیز ابھری۔ اور پھر۔

''کک..... کک..... اوں اوں'' کی آواز آئی جیسے پرما کے ہونٹوں پر کچھ رکھا گیا ہو۔

نجو کی شرارتی آواز ابھری۔ ''لیں باس آپ کی شہزادی کو اپنی جراب سنگھا دی، اب ایک ہفتے تک آنکھ نہیں کھولے گی۔''

یقیناً اس نے پرما کو نشہ آور دوائی سنگھائی تھی۔ یا گردن کی رگ وغیرہ دبا کر بے ہوش کیا تھا۔ پھر بھی میں نے جھڑکنا ضروری سمجھا تھا۔ ''در فٹے منہ تیرا۔'' اسے کہتے ہوئے میں نے شست جیپوں پر مرکوز کر دی، جیپ ڈرائیوروں نے کار کا پیچھا کرنے کی کوشش کی تھی۔ جیپ کا پہیہ گھومتے ہی میں نے مسلسل دو بار لبلبی دبائی، ٹائر پھٹنے کے دھماکے مجھے بھی سنائی دیے تھے۔

ایک محافظ نے تیزی دکھاتے ہوئے ایک موٹر سائیکل سوار کے قریب ہوا جو وہاں سے بھاگنے کی تگ و دو میں تھا۔ اسے نیچے گرا کر محافظ نے موٹر سائیکل چھینی اور سوار ہوا مگر آگے بڑھنے سے پہلے گولی اس کے بازو کے آر پار ہو گئی تھی۔ گولی کھا کر وہ نیچے گر گیا تھا۔ اس کے بعد کسی بھی محافظ کو تیزی دکھانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

ان بے وقوفوں کو علم نہیں تھا کہ ایس ایس کے نشانے پر تھے۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ میں نے ان کے سروں میں روشندان نہیں کھولے تھے۔ پرما کی کار پارکنگ گیٹ سے نکل کر طویل روش پر دوڑ رہی تھی۔ محافظوں نے آڑ میں رہتے ہوئے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے علاوہ فرض شناسی کا انھیں کوئی طریقہ سمجھ نہیں آیا تھا۔ میری گولیوں کی آواز نہیں آ رہی تھی صرف نتیجہ سامنے آ رہا تھا اور پارکنگ سے باہر لوگوں کو خطرے کا احساس نہیں تھا۔ لیکن جونہی پرما کے محافظوں نے ہوائی فائرنگ شروع کی ہر طرف سراسیمگی پھیل گئی تھی۔

پرما کی کار جونہی سڑک پر چڑھی، میں نے رابطہ منقطع کیا اور ایس آر ون کو کھول کر بیگ میں منتقل کرنے لگا۔ اس میں دو منٹ سے زیادہ خرچ نہیں ہوئے تھے۔ تیسرے منٹ کے آغاز میں بیگ پشت پر لٹکا کر میں ٹینکی سے اتر رہا تھا۔ چھت کے دروازے تک میں بھاگتے ہوئے پہنچا۔ سیڑھی نیچے لٹکاتے ہوئے مجھے تین آدمی نیچے کھڑے نظر آئے۔ وہ غالباً سیڑھی کے غائب ہونے پر تبصرہ کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی حیران رہ گئے تھے۔

''کون ہو اوئے..... اوپر کیا کر رہے تھے..... سیڑھی کیوں اٹھائی۔'' تینوں کے ہونٹوں سے ایک ساتھ تین مختلف سوال برآمد ہوئے۔ لہجہ کافی سخت اور انداز باز پرس والا تھا۔

میں جواب دیئے بغیر نیچے اترنے لگا۔

''یہ دیکھا بھالا تو نہیں لگتا۔'' مجھے خاموش پا کر ایک باقیوں سے تصدیق چاہنے لگا۔

ان کے جواب سے پہلے میں نیچے اتر چکا تھا۔ قدم فرش پر دھرتے ہی میرا دایاں ہاتھ جیب میں داخل ہوا۔ اور واپسی پر اس میں سائیلنسر لگا پستول موجود تھا۔

ان کے جارحانہ تیور اور ترشی و تندی ایک دم ہوا ہو گئی تھی، نسبتاً بڑی عمر والا ہکلایا۔ ''ب..... بھائی سس..... صاب، شما چاہتے ہیں شاید آپ کو ہمارا پوچھنا برا لگا۔''

''میرے اپنے فلیٹ میں پہنچنے تک کوئی بھی یہاں سے ہلا تو نتیجے کا ذمہ دار خود ہوگا۔'' انھیں دھمکاتے ہوئے بھی میں نے رکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سیڑھیوں کے قریب پہنچتے ہی ایک قدم میں دو دو تین تین سیڑھیاں عبور کرتے ہوئے میں نیچے اترنے لگا۔ لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ کافی لوگوں نے مجھے حیرت سے دیکھا تھا لیکن میں نے توجہ دیئے بغیر رفتار میں کمی نہ آنے دی۔

نیچے اتر کر میں تیز قدموں سے چل پڑا۔ بیگ کو ڈگی میں مقفل کر کے میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ تھوڑی دیر بعد میں ٹریفک کے ہجوم میں شامل ہو چکا تھا۔

نجو کی رہائش تک میں تیز رفتاری سے پہنچا تھا۔ اس کی بہت زیادہ یقین دہانی کے باوجود میں اسے زیادہ دیر پرما کے ساتھ اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ کار کو مخصوص جگہ پارک کر کے جب کھولی کے دروازے کے سامنے پہنچا، تبھی اندر سے پرما کی ہلکی سی چیخ سنائی دی تھی۔ میں نے بے تابی سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

منٹ بھر بعد ہی دروازہ کھل گیا تھا۔ کھولنے والا نجو کا ساتھی جمی تھا۔

''لڑکی کیوں چیخ رہی ہے۔'' درشت انداز میں کہتے ہوئے میں اندر داخل ہوا۔

جمی نے بے نیازی سے کہا۔ ''نجو استاد نے تھپڑ مارا ہے۔''

میں نے اس کی بات سننے تک مختصر صحن عبور کرلیا تھا۔ پرما گال پر ہاتھ رکھے ہلکی ہلکی سسکیاں لیتے ہوئے رو رہی تھی۔ میں نے استفسار کے بغیر ہی ہاتھ گھمایا۔ ''چٹاخ'' کی زوردار آواز سے کمرہ گونج اٹھا تھا۔ نجو گال پر ہاتھ رکھتے ہوئے دو تین قدم لڑکھرا کر پیچھے ہٹا تھا۔

میں غرایا۔ ''کہا تھا کہ لڑکی کو ہلکی سی خراش بھی نہ پہنچے۔''

''تمھاری یہ جرأت.....؟'' رتنیش نے پستول نکال کر تانا۔

''نہیں رتنیش۔'' نجو نے اسے روکا، لیکن اس دوران میں پستول نکال کر لبلبی دبا چکا تھا۔ اتنی تیزی سے چلنے والی گولی بھی اس کے پستول پر لگی تھی۔

''اف۔'' کرتے ہوئے اس نے ہاتھ بغل میں دبا لیا تھا۔ میں نے پستول کا رخ جمی کی طرف کرتے ہوئے دھاڑا۔ ''تمام ہاتھ اٹھالو ورنہ تمھیں دھرتی سے اٹھانے لگا ہوں۔''

''باس! اتنا غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔'' مجھے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے نجو اپنے ساتھی پر چلایا۔ ''رتنیش، ہوش میں رہ کر کام کیا کرو۔''

''غلطی ہوئی استاد۔'' رتنیش نے اعتراف کرنے میں دیر نہیں کی تھی۔

نجو نے خفگی بھرے لہجے میں احتجاج کیا تھا۔ ''یار! پوچھ تو لو مارا کیوں ہے۔''

میں بے پروائی سے بولا۔ ''یہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ تمھیں تنبیہ کی تھی، اس کی خلاف ورزی کرنے پر تھپڑ تو معمولی بات ہے، میں گولی چلانے کا بھی استحقاق رکھتا تھا۔''

''سوری راجکماری! ان سے غلطی ہوئی۔ اور بے فکر رہو آپ یہاں بالکل محفوظ ہو۔''

''آ.....آپ راجا ہیں نا؟'' وہ میری آواز و انداز سے پہچان گئی تھی، ورنہ میری شکل کافی بدلی ہوئی تھی۔

''ہاں۔'' اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میں نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال کر نجو کی طرف پھینکی۔ ''شاباش، اچھا کام کیا ہے۔''

نجو نے گال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''آپ نے بھی۔''

''غلطی تمھاری ہے۔''

وہ مُسمُسے انداز میں بولا۔ ''نجو تو پیدا ہی غلط ہوا ہے۔'' دو لاکھ کی دوسری گڈی پا کر اس کے لہجے میں خفگی و رنجش دور ہو گئی تھی۔ کم بخت نوٹوں کا نشہ ہی ایسا مدہوش کن ہے کہ اچھائی برائی کی تمیز اور غیرت و خودداری پر عمل مشکل کر دیتا ہے۔ میرے پاس رونددر مترا اور ڈاکٹر دیوا شش سے حاصل کی ہوئی بڑی رقم موجود تھی۔ اور وہ میں نے انھی مقاصد میں استعمال کرنا تھی۔

''مجھے جانا ہوگا، نکڑ پر میری کار کھڑی ہے یہاں لے آؤ۔'' میں نے چابی نجو کی طرف اچھالی۔

''ٹھیک ہے باس!'' چابی پکڑتا ہوا وہ باہر نکل گیا۔

پرما نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''ہمیں کیوں اغوا کیا۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کی بہتری کے لیے، وہاں آپ کی جان کو خطرہ تھا۔''

اس کا لہجہ گلوگیر ہوا۔ ''کیا لگتا ہے ہم یقین کرلیں گے۔''

میں نے ہلکی سی دھوکا دہی جائز جانی تھی۔ ''تفصیل بتانے کا وقت نہیں، مجھے تھوڑی سی مہلت دو۔ اگر خود کو سچا ثابت نہ کرسکا تو آپ کو چھوڑ دوں گا۔ پہلے بھی تو چھوڑ دیا تھا۔''

وہ صاف گوئی سے بولی۔ ''گرینڈ پا کے قاتل پر اعتبار کرنے کی حماقت ہم نہیں کر سکتے۔''

''درست کہا۔'' تکرار میں الجھے بغیر میں نے جیب سے بے ہوش کرنے والا سپرے نکالا اور سانس روکتے ہوئے اس کے چہرے پر ہلکا سا اسپرے کر دیا۔

آنکھوں میں حیرانی بھرے وہ لہراتے ہوئے پیچھے کو گر گئی تھی۔ فی الحال اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر منہ پر ٹیپ چپکا دی۔

ہارن کی آواز سن کر میں نے اسے بانہوں میں بھرتے ہوئے جمی کا کار کی ڈگی کھولنے کا بتایا۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میرے آگے آگے بھاگ پڑا تھا۔

داخلی دروازے سے نکلنے سے پہلے میں نے گلی میں جھانکنا ضروری سمجھا تھا۔ تین چار آدمی سڑک کی طرف روانہ تھے، لیکن ان کی ہماری طرف پیٹھ تھی، اس لیے میں نے سرعت سے باہر نکل کر پرما کو ڈگی میں منتقل کر دیا۔

نجو نے کہا۔ ''باس اس کا پرس بھی ساتھ لیتے جاؤ۔'' ساتھ ہی اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ بھاگ کر پرما کا شولڈر بیگ لے آیا۔

نجو اور اس کے دونوں ساتھیوں سے الوداعی مصافحہ کر کے میں نے ایک بار پھر شکریہ کہا اور وہاں سے نکل آیا۔ میرے دماغ میں کوئی مناسب ٹھکانہ نہیں تھا۔ وشواس سنگھ کی طرف بھی میں فی الحال نہیں جانا چاہتا تھا۔ کیوں کہ معاملہ گرم تھا اور وگنیش شکلا کے بندوں اور ایجنسیوں نے پرما کی تلاش میں پہلی فرصت میں میرے ہمدردوں کے ٹھکانوں پر دھاوا بولنا تھا۔ ممبئی سے نکلنے والے راستوں کی بھی نگرانی بڑھانے کا انتظام کرنا تھا۔ اس لیے چند دن کہیں چھپ کر رہنا مناسب تھا۔ پرما کے دوبارہ حصول کے بعد اسے دوبارہ کھونے کا حوصلہ مجھ میں نہیں تھا۔ جہاں اتنا انتظار کیا تھا وہیں چند دن کسی محفوظ کمین گاہ میں گزارنا اتنا مشکل نہ ہوتا، لیکن پرما چھن جاتی تو بہت بڑی مصیبت میں پڑ جاتا۔

کسی مناسب ٹھکانے کا سوچتے ہوئے اچانک دماغ میں ڈاکٹر سجاتا کا خیال آیا۔ اس کا وجود شک کی زد میں نہیں آیا تھا، کیوں کہ اتفاق سے واقعات کا تسلسل ایسے بنا تھا کہ وہ سراسر بے گناہ اور لاتعلق دکھائی دی تھی۔

اس کا موبائل فون نمبر میری یادداشت میں محفوظ تھا۔ الحمدللہ اس معاملے نے میری یادداشت نے کبھی دھوکا نہیں دیا۔

نمبر ڈائل کر کے میں نے موبائل فون کان سے لگا لیا۔ گھنٹیاں جانے کے باوجود اس نے کال وصول نہیں کی تھی۔ شاید انجان نمبر کی وجہ سے وہ اٹینڈ نہیں کر رہی تھی۔

میں نے دوبارہ کوشش کی اور اس مرتبہ اس نے کال وصول کر لی۔ ''ہیلو.....'' اس نے روکھے لہجے میں پوچھا۔

''راجابات کر رہا ہوں۔''

''آپ.....؟ کیسے ہیں.....؟ دوسرے نمبر سے کیوں کال کی؟'' وہ پرجوش لہجے میں ایک ساتھ دو تین سوال پوچھ گئی تھی۔

میں مطلب کی بات پر آیا۔ ''چند دن تمہارا مہمان بننا چاہتا ہوں۔''

وہ خلوص دل سے بولی۔ ''مجھے خوشی سے کچھ ہو نہ جائے۔''

''تو کہاں پہنچوں؟''

وہ خوشی سے چہکی۔ ''میں ڈیوٹی پر ہوں۔ لیکن ابھی چھٹی لے کر نکلتی ہوں۔ آپ اسی جگہ پہنچیں جہاں پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس سے دو گلیاں آگے ہنومان جی ٹاور میں میرا فلیٹ ہے۔''

میں نے مسئلہ بتایا۔ ''میری کار کی ڈگی میں بے ہوشی کی حالت میں ایک مہمان موجود ہے۔ اسے بھی فلیٹ تک لے

جانا ہوگا۔''

''کے ایچ نارینہ ہسپتال اینڈ ریسرچ سنٹر کے باہر ہونے والے ہنگامے کی خبر ٹی وی پر چل رہی ہے۔ کسی بڑے خاندان کی لڑکی کا نام.....'' اچانک خیال آنے پر اس نے ہیجان بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''کہیں یہ وہی تو نہیں۔''

میں ہنسا۔ ''وہی ہے۔''

''بھگوان کا شکر ہے آپ کامیاب ہوئے ورنہ میں خود کو کبھی معاف نہ کر پاتی۔''

''باقی باتیں ملنے پر ہوں گی۔'' کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میرا رخ قدرتی طور پر اس جانب تھا۔ پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد میں ہنومان جی ٹاور کی عمارت کی پارکنگ میں پہنچ گیا تھا۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں ڈاکٹر سجاتا کی کار وہاں پہنچ گئی تھی۔ اس نے میری کار پہچان لی تھی۔ نزدیک ہی کار پارک کرتے ہوئے وہ نیچے اتری۔ میں بھی باہر آ گیا۔ اور وارفتگی سے مصافحہ کرتے ہوئے بولی۔

''شکریہ آپ نے سیوا کا موقع دیا۔ سچ کہوں تو اب تک اپنی حماقت پر پچھتا رہی ہوں۔ آپ اور لورا براؤن نے مجھے نئی زندگی دی۔ اور یہ احسان میں کبھی نہیں بھلاؤں گی۔''

میں انکساری سے بولا۔ ''ہم نے تمھارے احسان کا بدلہ چکایا تھا اور بس۔''

کار کی عقبی نشست پر نظر دوڑاتے ہوئے وہ پوچھنے لگی۔ ''لورا کہاں ہے؟''

''چلی گئی۔''

اس نے اداسی سے پوچھا۔ ''مجھ سے خفا ہوگی، یقیناً اسی لیے مل کر نہیں گئی۔''

میں نے تسلی دی۔ ''وہ بالکل خفا نہیں تھی اور مل کر اس لیے نہیں گئی کہ اسے تمھاری سلامتی عزیز تھی۔''

وہ ہنسی۔ ''مہمان اب تک ڈگی میں ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیسے لے جائیں گے؟''

''پکا بندوبست کر کے آئی ہوں۔'' کار کی عقبی نشست سے فولڈنگ ویل چیئر نکال کر اس نے درست کی۔ اور گہرے سبز رنگ کا کمبل کرسی پر بچھاتے ہوئے بولی۔ ''اس پر بٹھاؤ۔''

میں نے ڈگی کھولی، پرما اب تک بے ہوش پڑی تھی۔ اس کی بندشیں کھول کر میں نے دائیں بائیں کا جائزہ لیا اور برقی کوندے کی سی لپک سے پرما کو اٹھا کر کرسی پر بٹھا دیا۔

ڈاکٹر سجاتا نے کمبل اس کے گرد یوں لپیٹا جیسے بیمار کے گرد لپیٹتے ہیں۔ یوں پرما کا لباس اور چہرہ بھی چھپ گیا تھا۔ وہ مجھے ہدایت دیتے ہوئے بولی۔ ''دوسری منزل، کمرہ نمبر انیس اے کے پاس پہنچو۔ اسے میں لاتی ہوں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تمھارے پیچھے پیچھے آ رہا ہوں۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ مناسب فاصلہ رکھ کر میں بھی لاابالی انداز میں قدم اٹھاتا ہوا اس کے پیچھے ہو لیا۔

وہ ہنومان جی ٹاور کی مستقل رہائشی تھی۔ اور ڈاکٹر بھی تھی۔ دروازے پر متعین چوکیدار اور کسی اور دیکھنے والے نے اس کے ویل چیئر کو دھکیلنے پر حیرانی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ایک دو عورتوں نے استفسار ضرور کیا تھا اور اس نے بھابی کی بہن کا بتا کر جان چھڑائی تھی۔

سیڑھیوں کے بجائے وہ لفٹ سے اوپر پہنچی۔ جب تک وہ اوپر پہنچتی میں سیڑھیوں کے ذریعے دوسری منزل پر پہنچ گیا تھا۔ ہم ایک ساتھ فلیٹ نمبر انیس اے کے دروازے پر پہنچے۔ دائیں بائیں کا جائزہ لے کر اس نے دروازہ کھولا اور ہم

اندر گھس گئے۔ درمیانے حجم کا فلیٹ چھوٹے سے کنبے کی ضروریات کو کافی تھا۔ دو خواب گاہیں، ایک سٹور روم، ڈرائینگ روم، کھانے کا کمرہ اور ٹی وی لاؤنج وغیرہ کو ایک ہی ہال تھا۔ جو داخلی دروازے کے آغاز ہی میں بنا تھا۔ اندر گھستے وقت باورچی خانہ دائیں ہاتھ پڑتا تھا۔ اس کا حجم چھوٹا تھا مگر سامان کے ریک اس ترتیب سے بنے تھے کہ مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔

دروازہ قفل کر کے وہ ایک کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ درمیانے حجم کی خواب گاہ تھی۔ اس میں کھڑکی موجود نہیں تھی، اس لیے مجھے پسند آئی تھی۔ کیوں کہ پرما کو جکڑ کر رکھنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔

ہم دونوں نے مل کر اسے کرسی سے بیڈ پر منتقل کیا۔ سجاتا نے اس کے جوتے اتار کر کمبل اوڑھایا اور ہم باہر آ گئے۔

میں نے دروازہ باہر سے کنڈی کر دیا تھا کہ ذرا سی بے احتیاطی ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتی تھی۔

ڈرائینگ روم میں پہنچ کر ڈاکٹر سجاتا میری طرف متوجہ ہوئی۔ ''چائے یا کافی۔''

میں بے تکلفی سے بولا۔ ''کھانا کھاؤں گا۔''

دوسرے صوفے پر نشست سنبھالتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ''کیا کھانا پسند کرو گے۔''

میں نے انتخاب کی ذمہ داری اسی پر ڈالی۔ ''کوئی بھی حلال کھانا چل جائے گا۔''

وہ قریبی ہوٹل کا نمبر ملا کر پر تکلف کھانے کا آرڈر نوٹ کرانے لگی۔ اپنے فلیٹ کا نمبر بتا کر اس نے رابطہ منقطع کیا اور میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے متبسم ہوئی۔

''اب اس لڑکی کا قصور بھی بتا دو کہ جسے آپ جیسے آدمی نے حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے۔''

میں تھکے تھکے لہجے میں بولا۔ ''کافی لمبی کہانی ہے ڈاکٹر! مختصر یہ کہ میں نے لڑکی کے فائدے کو اسے اغواء کیا ہے ورنہ دو تین دنوں کے اندر اس پر جان لیوا حملہ ہونے والا تھا۔''

وہ تدبر سے بولی۔ ''یہ اطلاع اس کے گھر والوں تک پہنچانا کافی ہوتا۔ ایک جوان لڑکی کو اغواء کرنے سے اس کی زندگی بہت سے سوالات اور اس کا کردار شبہات کی زد میں آ جاتا ہے۔''

میں ذو معنی لہجے میں بولا۔ ''جسے خطرہ ہی اس کے گھر والوں سے ہو۔''

اس نے منہ بسورا۔ ''بہتر ہوگا آپ ساری تفصیل بتائیں ورنہ میرے دماغ کو خود ساختہ شکوک سے لڑنے کو ہٹ دھرمی کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔''

میں نے اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ضروری باتوں سے پردہ اٹھا دیا تا کہ اس کے شبہات کا قلع قمع ہو۔ ورنہ وہ مجھ سے بہت عقیدت رکھنے لگی تھی اور بعید نہ تھا کہ آئیڈیل کا ایسا فعل اسے الجھن میں مبتلا رکھتا۔

وہ پر اعتماد لہجے میں بولی۔ ''جانتی تھی میں نے آپ کا جو خاکہ بنایا ہوا ہے آپ اس کے برعکس ہو ہی نہیں سکتے۔''

دروازے کی گھنٹی سن کر میں خواب گاہ میں چلا گیا۔ ڈاکٹر سجاتا نے کھانا وصول کر کے بل ادا کیا اور دروازہ بند کر دیا۔ پرما کے لیے کھانا علیحدہ کر کے ہم اکٹھے کھانے لگے۔ کھانے کے بعد ڈاکٹر سجاتا باورچی خانے میں کافی بنانے گھس گئی۔ میں نے ٹی وی لگانے کو ریموٹ اٹھایا مگر اسی وقت خواب گاہ کا دروازہ بجنے لگا۔ یقیناً پرما کو ہوش آ گیا تھا۔

ریموٹ واپس رکھ کر میں خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھولنے پر وہ سامنے ہی نظر آئی۔ آنکھوں میں برہمی و درشتی لیے مجھے گھور رہی تھی۔

میں خوش دلی سے مسکرایا۔ ''آپ جاگ گئیں راجکماری۔''

وہ تپتے ہوئے بولی۔ ''ہم نہیں ہیں راجکماری اور نہ ان ڈھکوسلوں سے آپ ہمیں بہلا سکتے ہیں۔''

''بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' میں نے اسے بازو سے پکڑنے کی کوشش کی۔

میرا ہاتھ جھٹکتے ہوئے وہ نخوت سے بولی۔ ''ہمیں ہاتھ نہ لگائیں۔''

''اچھا نہیں لگاتا، مگر بیٹھ تو جائیں۔''

وہ موڈ بناتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ میں نے کرسی پر نشست سنبھالی۔ ''بھوک لگی ہے، کھانا لاؤں۔''

وہ معترض ہوئی۔ ''اغواء ہونے والی لڑکی کو اتنی جلدی بھوک لگ سکتی ہے۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''اغواء نہیں کیا، آپ کی جان بچائی ہے۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''آپ دوسری بار ہماری جان بچا رہے ہیں، کیا جان سکتے ہیں آپ کے احسان کب تک سہنا پڑیں گے۔''

اس کے طنز کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے میں بدستور نرمی سے بولا۔ ''ایک سوال پوچھ سکتا ہوں۔''

وہ بیزاری سے بولی۔ ''یہ نرمی، اخلاق اور انسانیت کا ڈھونگ رہنے دیں۔ صاف صاف اپنے مقصد پر آئیں۔ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ اور اگر دماغ میں کوئی فتور ہے تو براہ مہربانی اپنے تک رکھنا۔ بلکہ مشورہ دیں گے کہ ایسی فلمیں نہ دیکھا کرو جن میں محبت کو غربت و امارت کے تصور سے بے نیاز دکھایا جاتا ہے۔''

میں نے ایک دم پوچھا۔ ''آپ کو اپنا والد یاد نہیں آتا۔''

اسے جھٹکا لگا یوں جیسے میں نے اس کے سر پر ڈنڈا رسید کیا ہو۔ گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے غصہ ضبط کیا۔ ''آپ کو ہماری ذاتیات پر سوال اٹھانے کا کوئی حق نہیں۔''

میں اطمینان سے بولا، ''تبھی تو سوال کی اجازت لی تھی اور آپ اپنے حسن کے قصیدے گانے لگیں۔ یہ بھول گئیں کہ عشق و محبت کا تعلق شکل و صورت سے ہوتا ہے، مال و دولت سے نہیں۔ میں یقین سے کہتا ہوں اگر آپ کی کلاس فیلو بیس لڑکیاں ہیں تو ان میں سے اٹھارہ آپ سے زیادہ خوب صورت و پرکشش ہوں گی۔ آپ جیسی مغرور اور مال و دولت سے لوگوں کی حیثیت کا تعین کرنے والی کو کوئی احمق ہی دل دے سکتا ہے۔''

اس نے احتجاج کیا۔ ''کیا ہمارا دھن اور گھمنڈ لازم کرتا ہے کہ ہمیں حبس بے جا میں رکھا جائے۔''

شروع میں اس کے محافظ سے پتا چلا تھا کہ پرما کو گھورنے والے طالب علم کو ایک آنکھ سے محروم کیا گیا تھا۔ میں نے اسی واقعے کی طرح اشارہ کیا۔ ''کسی گھورنے والے کی آنکھ نکلوا دینے کو بھی جرم مانتی ہو یا جس کی لاٹھی اس کی بھینس، والی کہاوت رٹ رکھی ہے۔''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر صفائی دینے لگی۔ ''ایسے کسی بھی حادثے میں ہماری مرضی و منشا کو مدنظر نہیں رکھا گیا۔ جس کا حکم تھا اس بے چارے کو پوتے کی سال گرہ منانے کی بھی مہلت نہیں دی گئی۔''

میں نے کہا۔ ''خیر یہ وجہ تو نہیں تھی اسے تو قتل کے بدلے قتل ہونا پڑا۔''

''آپ کو کس نے جج بنایا ہے کہ لوگوں پر فرد جرم عائد کر کے نہ صرف سزا سنا رہے ہو بلکہ بغیر صفائی کا موقع دیئے بغیر عمل درآمد بھی کر رہے ہو۔'' اس کا مجھے آپ کہنا بہ حالت مجبوری تھا۔ ورنہ لہجے کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ ہوتا تھا کہ کتنا تپی ہوئی تھی۔

میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''پوچھا نہیں کس کے قتل کی وجہ سے اسے ہلاک ہونا پڑا۔''

وہ استہزائی انداز میں بولی۔ ''نہیں، کیوں کہ جانتے ہیں ایک اور جھوٹ سننے کو ملے گا۔''

اس کے انکار کے باوجود میں نے بتانا ضروری سمجھا۔ ''شکلا کے جرائم کی فہرست تو بہت طویل ہے، اس پر روشنی ڈالنے کو کافی وقت چاہیے۔ البتہ میں نے اسے پاروتی ملہوترا کے قتل کے جرم میں مارا ہے۔''

''تمھیں ہمارے خاندانی معاملات میں دخل اندازی کا کوئی ادھیکار نہیں۔'' غصے میں اسے آپ کہنا بھی یاد نہیں رہا تھا۔

''وکیل کا کسی کے خاندانی معاملات میں بولنا خاندان کے کسی فرد کی اجازت کے مرہون منت ہوتا ہے۔ اور میں بریگیڈیئر فہیم اسلم انصاری کا وکیل ہوں، جس کی محبت کرنے والی بیوی کو شکلا جیسے درندے نے اس لیے قتل کیا کہ اس بے چاری نے اپنے محبوب شوہر کو بھاگنے میں مدد دی تھی۔''

''شٹ اپ..... جھوٹے..... جھوٹے..... جھوٹے.....'' اس کی آنکھیں نم اور آواز پھٹ گئی تھی۔ جسم یوں کانپ رہا تھا جیسے رعشے کی مریض ہو۔ ''اس ظالم کی طرف داری کر رہے ہو جس نے اپنے مفاد کو محبت کا ڈرامار چایا، اپنے ملک کے لیے جاسوسی کرتا رہا اور جب بھانڈا پھوٹا تو نہ صرف بیوی کو یرغمال بنا کر بھاگ گیا۔ بلکہ محفوظ جگہ پر پہنچتے ہی بے چاری کو قتل کر دیا۔ گرینڈ پا سے دشمنی تھی، اس کی بے گناہ و معصوم بیٹی کا کیا قصور تھا۔ ہمارا کیا قصور تھا کہ ہمیں ماں کی شفقت و محبت سے محروم کر دیا۔''

''کہانی تو شکلا نے اچھی گھڑی ہے۔ آخر پاکستانی جاسوس کو اذیت دینا تو بنتا تھا۔ ظالم نے اس کی بیوی کو قتل کرتے وقت اتنا بھی نہ سوچا کہ اپنی بیٹی کا خاتمہ کر رہا ہے۔ کیوں کہ خبیث اچھی طرح جانتا تھا پاروتی زیادہ عرصہ اپنے محبوب شوہر سے دور نہ رہتی اور جلد ہی وہ وقت آنا تھا کہ اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر پاکستان کا رخ کرنے پر مجبور ہو جاتی۔''

وہ بپھرتے ہوئے بھاگی اور قریب پہنچتے ہی مجھے گریبان سے پکڑ کر چلائی۔ ''ہم تمھیں جان سے مار دیں گے جھوٹے..... تم سارے پاکستانی وحشی درندے ہوتے ہو۔ جھوٹی، مکار، دہشت گرد قوم ایک باپ پر اس کی بیٹی کے قتل کا الزام لگاتے ہوئے تمھیں شرم و حیا نہیں آتی۔ اور اس کی وکالت کرتے ہو جس میں بیٹی سے بات کرنے اور اس کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں ہے۔ جو بزدلوں کی طرح پاکستان میں چھپا ہے۔''

میں نے گریبان چھڑانے کی کوشش نہ کی، کیوں کہ اس کے جذبات اور غصہ میرے لیے نہ تھا۔ نہ وہ شکلا کے قتل پر سیخ پا تھی، اس کی حالت تو حیرانی و لاعلمی کی گہری کھائی میں گرنے والے اس شخص کی سی تھی جو نہ تہہ تک پہنچ پایا تھا اور نہ اس کے ہاتھ میں کھائی کا کوئی کنارا آ رہا تھا کہ اسے پکڑ کر گرنے سے بچ سکے۔

''آپ بھی ایک محبت کرنے والے شوہر پر اس کی محبوب بیوی کے قتل کا الزام اس کے دشمن کے کہنے پر دھر رہی ہیں۔ اور بیٹی سے سامنا نہ کرنے کی تہمت لگا رہی ہیں۔''

میری چھاتی میں دو ہتڑ رسید کرتے ہوئے اس نے دھمکایا۔ ''تم سے بات ہی نہیں کرنا چاہتے جھوٹے! ہم ابھی ابھی یہاں سے جا رہے ہیں روکنے کی کوشش کی تو جان سے مار دیں گے..... سمجھے تم، ہم جا رہے ہیں۔ روکنے کا سوچنا بھی مت ..... تم گرینڈ پا کے قاتل ہو، ہم تمھیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

چہرے کو ہاتھوں سے ڈھانپتے ہوئے وہ بیڈ پر بیٹھ کر ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ اس نے باہر جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میں نے اسے رونے دیا۔ جذبات کو قابو کرنے کا سب سے بہتر طریقہ آنسو بہانا ہے۔ آنکھوں سے نمکین پانی کا خروج بہت سے صدمات، اذیتوں اور پریشانیوں کو بہا کر لے جاتا ہے یا کم از کم انسان میں ان مسائل کا سامنا کرنے کا حوصلہ بھر دیتا ہے۔

اس کی سسکیوں میں کمی آتے ہی میں نے گفتگو آگے بڑھائی۔ ''کیا باپ کے بھاگنے کے بعد کبھی ان سے رابطے کی ہمت کی۔ کبھی ان سے جواب جاننے کی کوشش یا بازپرس کا حوصلہ کیا؟''

چہرے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے وہ دھاڑی۔ ''کیا وہ اس قابل تھا کہ بات کرتے۔'' گال آنسوؤں سے گیلے ہو گئے تھے، لیکن آنکھوں کے چشمے خشک نہیں ہو رہے تھے۔

میں نے ایک اور وار کیا۔ ''میں نے رندھیر شکلا کا جرم بتایا، مگر آپ اس کے دفاع میں میدان میں اتر آئی ہیں۔ کیا باپ کا دفاع کرنے کی بھی تھوڑی سی کوشش کی تھی یا جو کچھ شکلا کہتا گیا، آپ مانتی گئیں۔ انھیں صفائی کا موقع دیا؟..... ان کا غم اور دکھ جاننے کی زحمت گوارا کی؟..... بے شک وہ بھارت سرکار کا مجرم تھا، مگر حکومت کا مجرم ہونا بیوی بچوں سے نفرت کی دلیل نہیں ہے۔ آپ کو پندرہ سولہ سال گود میں کھلایا، محبت دی، شفقت سے نوازا کیا وہ سب ڈراما تھا۔ کیا آپ میں دکھاوے کی محبت اور حقیقی محبت کی پہچان کا شعور نہیں ہے۔ بناوٹی و جھوٹی محبت کو بے زبان جانور بھی جان جاتے ہیں، آپ اور آپ کی امی جان اتنی کم عقل و ناسمجھ تھیں کہ اتنے سال دو غلے شخص کو نہ پرکھ سکیں۔ گو پاروتی کے بارے یہ کہنا غلط ہے۔ اسے بالکل شعور تھا، وہ شوہر کی محبت کو نہ صرف اچھی طرح جانتی تھی بلکہ جب موقع آیا تو وطن کی محبت پر شوہر کی محبت کو ترجیح دی اور اسے اپنی کار میں چھپا کر اگرہ سے انبالہ لے گئیں اور وہاں سے واپس آتے ہوئے بے چاری ظالم باپ کی شقی القلبی کا شکار ہو گئی۔''

وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ''تمھیں جھوٹ بولتے ہوئے ذرا بھی جھجک نہیں ہوتی۔ اپنے اللہ (تعالیٰ) ہی سے شرم کرلو جسے ہر جگہ موجود مانتے ہو۔ مما اسے چھوڑنے نہیں گئی تھیں، وہ انھیں یرغمال بنا کر لے گئے تھے۔''

''اتنا تو آپ بھی جانتی ہوں گی کہ کسی کو یرغمال تب بنایا جاتا ہے جب مجرم گھیرے میں آجاتا ہے۔ ایسی حالت میں بے شک اسے جانے دیا جاتا ہے، مگر گھیرنے والے پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اور وہ جسے یرغمال بنا کر لے جاتا ہے کم از کم اسے قتل نہیں کر سکتا، کیوں کہ ایسا کرنے پر اس کا پکڑا جانا یقینی ہو جاتا ہے۔ پھر وہ بیوی کو قتل کر کے زندہ سلامت بھاگنے میں کیسے کامیاب ہوا۔ سوچنے پر دال میں کالا ضرور نظر آئے گا۔ اور یقین کرو آپ کی ماں کا قاتل کون ہے اس بارے کافی لوگ جانتے ہیں صرف آپ بے خبر ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں.....

ع جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے۔''

اس نے ایک اور دلیل پیش کی۔ ''اور ہم پر دو مرتبہ قاتلانہ حملہ کیوں کرایا، یہاں تک کہ ہمیں آگرہ چھوڑ کر ممبئی منتقل ہونا پڑا۔ اس کے تو ہم خود گواہ ہیں۔''

''چلیں آپ کے والد کی مکمل کہانی سنا دیتا ہوں، یوں ٹکڑوں میں بات کر کے ہماری بحث زیادہ ہی طول کھینچنے لگی ہے۔'' میری تمہید پر اس نے بے اعتنائی سے منہ موڑ لیا گویا اسے جاننے کا کوئی شوق نہ تھا۔ لیکن مجھے معلوم تھا اس کا رواں رواں باپ کی بے گناہی سننے کا خواہاں تھا۔ میں گویا ہوا۔ ''انصاری صاحب نوجوانی میں انڈیا آئے۔ وہ خوبرو، پرکشش اور وجیہہ مرد تھے۔ ان کے ذمہ پاروتی شکلا کو محبت کے جال میں پھانس کر اس سے ناجائز تعلقات استوار رکھتے ہوئے شکلا تک پہنچنا تھا۔ اس کے بعد وہ مطلب کی معلومات حاصل کر کے واپس لوٹ جاتے۔ مگر پاروتی سے پہلا مکالمہ ہوتے ہی انصاری صاحب اس کی معصوم شکل پر ایسے لٹو ہوئے کہ اس کام سے ہاتھ کھینچ لیا۔ تب بڑوں نے انھیں اجازت دی کہ وہ چاہیں تو اس لڑکی سے شادی کر سکتے ہیں۔ اور یہ یقین دہانی بھی کرائی گئی کہ لڑکی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس کے بعد بھی وہ پاروتی کو دھوکا دینے پر تیار نہ تھے مگر برا ہو محبت کا کہ پاروتی ایک دم ان کے دل پر قابض ہو گئی۔ تب وطن کی محبت اور کام سے ایمانداری سے زیادہ وہ پاروتی کی محبت میں پھنس کر شادی کر بیٹھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ جلد ہی بیوی کو طلاق دے کر واپس پاکستان لوٹ جائیں گے جہاں ان کا پورا خاندان موجود تھا۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ آپ کی پیدائش بھی ان کی مرضی کے خلاف ہوئی اور پھر بیوی و بیٹی کی محبت میں انھوں نے اپنے وطن اور خون کے رشتوں کو بھلا دیا۔ شاید وہ ساری زندگی

ہندو بن کر انڈیا ہی میں گزار دیتے کہ نہ بیوی کو چھوڑ سکتے تھے اور نہ بیٹی کے بغیر رہ سکتے تھے لیکن تقدیر کے سامنے کس کی چلی ہے۔ان کے جاسوس ہونے کا راز فاش ہو گیا۔اور شاید آپ کو حیرانی ہو کہ ان کی مخبر پاروتی تھی۔اسے یہ خبر تب پتا چلی جب شکلا کو خفیہ ایجنسی کا ایجنٹ یہ راز بتا رہا تھا۔وہ شوہر کو اطلاع دینے بھاگی اور نہ صرف اسے مطلع کیا بلکہ اپنی گاڑی میں چھپا کر انبالہ تک بھی چھوڑ آئی۔اگر پاروتی انھیں نہ نکالتی تو وہ پھنس چکے تھے۔کیوں کہ ان کی باقاعدہ نگرانی ہو رہی تھی۔شکلا کو بیٹی کی یہ جسارت ناگوار گزری اور اس نے فوراً ہی بیٹی کو قتل کرا دیا۔آپ کو اپنے قبضے میں لے کر جھوٹی اور خلاف واقعہ کہانی سنائی۔اس کے جھوٹا ہونے کو فقط یہ دلیل ہی کافی ہے کہ اس نے آپ کا باپ سے رابطے کا اکیلا ذریعہ ہی ختم کر دیا۔میری مراد آپ کے موبائل فون سے ہے جو شکلا نے انصاری صاحب کے جانے کے بعد تبدیل کر دیا تھا۔وہ کیسے رابطہ کرتا۔اور جسے آپ قاتلانہ حملے گردان رہی ہیں وہ اپنی بیٹی کو واپس لینے کی کوششیں تھیں۔مظلوم باپ بیٹی کی محبت میں تڑپ تڑپ کر شکلا سے رحم کی بھیک مانگتا رہا مگر اس ظالم کے مدنظر جھوٹی انا،قوم پرستی اور دیش بھگتی کے بلند بانگ دعوے تھے۔شکلا صاحب حیثیت اور طاقتور شخص تھا۔سرکاری ذرائع کے ساتھ ساتھ اس کے پاس اپنے کارندوں کی بھی فوج تھی۔حکومتی سطح پر بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔تب بے چارہ انصاری صاحب کیا کرتا.....''

''محبت کرنے والے ہار نہیں مانتے،کوشش کرتے رہتے ہیں۔'' وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔

میں اطمینان سے بولا۔''تو کوششوں سے کب رکے ہیں وہ۔کیا خیال ہے آپ کو اغواء کرنے کے پس پردہ کیا وجہ ہو سکتی ہے۔آپ کو عزت سے مخاطب کرنا،کوئی گزند نہ پہنچنے دینا،ہر قسم کی آسائش پہنچانے کی کوشش کرنا یہ سب آپ کے حسن سے متاثر ہو کر یا محبت میں پھنس کر نہیں کیا گیا۔''

وہ بپھر کر بولی۔''تھوکتے بھی نہیں ہیں تمھاری بخشی ہوئی عزت اور آسائشوں پر۔نہ تمھاری جھوٹی کہانی اس لائق ہے کہ اعتبار کیا جائے۔بہتر ہو گا ہمیں فوراً رہا کر دو۔''

''ایسا کر دیتا،مگر آپ کی جان کو خطرہ ہے۔''

وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔''ہماری جان کو صرف تم سے اور پاکستان میں موجود ہمارے نام نہاد باپ سے خطرہ ہے۔''

میں دروازے کی طرف متوجہ ہوا۔''ڈاکٹر اندر آ جاؤ۔'' میرا اندازہ تھا کہ اس نے ہماری باتوں پر کان دھرے ہوں گے۔

''جج.....جی۔'' وہ بوکھلائے ہوئے اندر آئی۔میرے پکارنے کو اس نے میری ناراضی پر محمول جانا تھا۔

میں نے پوچھا۔''انٹرنیٹ کا کنکشن مل جائے گا۔''

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کہا۔''اپنا لیپ ٹاپ لے آؤ۔''

انٹرنیٹ کا روٹر آن کر کے وہ لیپ ٹاپ لے آئی۔اپنا ای میل کھول کر میں نے لورا کو بھیجی ہوئی آڈیو ریکارڈنگ ڈاؤن لوڈ کی اور پرما کی طرف متوجہ ہوا۔

''اس گفتگو کو غور سے سننا۔'' یہ کہہ کر میں نے آڈیو کلپ چلا دیا۔راجپوت کے ساتھ میری تفصیلی گفتگو سنتے ہوئے اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے تھے۔گفتگو کے اختتام پر اس کی گلوگیر آواز ابھری۔

''جھوٹوں کے بیچ پھنس گئے ہیں،کہاں جائیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے کمبل اپنے اوپر کھینچا۔''اس دنیا میں ہمارا کوئی بھی نہیں ہے،کوئی بھی نہیں ہے۔''

''ایسا نہیں کہتے گڑیا۔'' ڈاکٹر سجاتا نے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔''تمھیں بس دھیان

دینے کی ضرورت ہے۔ایک باپ کبھی اتنا ظالم نہیں ہوسکتا کہ بغیر کسی وجہ کے اپنی بیٹی پر قاتلانہ حملہ کرائے اور بے گناہ بیوی کو قتل کردے۔''

وہ ہچکی لیتے ہوئے بولی۔''مما بھی گرینڈ پا کی بیٹی تھیں ناں۔''

''تمھارے نانا کا کردار ٹھیک نہیں تھا میری جان! اتنے بڑے ثبوت کے بعد اور کیا رہ جاتا ہے۔لورا براؤن کے ساتھ بھی تمھارے نانا نے بہت گھٹیا سلوک کیا تھا۔اس نے اپنی ساری کہانی مجھے سنائی تھی۔اور یقین کرو میں مان ہی نہیں سکتی کہ راجا جیسا شخص کسی مظلوم کو قتل کرسکتا ہے۔''

پرما بدتمیزی سے بولی۔''آپ اس کی دوست ہیں، طرف داری تو کریں گی۔''

سجاتا نے کہا۔''میں نہ تو راجا کی دوست ہوں اور نہ اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔بس راجا کی عقیدت مند ہوں۔ کیوں کہ اس نے بغیر کسی لالچ کے میرے لیے وہ کیا جو شاید میرا سگا بھائی بھی نہ کر پاتا۔اور اب تم دونوں کی بات سن کر میں بغیر کسی کی طرف داری کیے بھگوان کی سوگندھ کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ تم غلطی پر ہو۔راجا کے دلائل بھی عقل تسلیم کرتی ہے اور اس کے پاس ثبوت بھی ہے۔ریکارڈنگ میں اس کے ساتھ محو گفتگو آدمی کا تعلق اگر واقعی تمھارے ماموں جان سے ہے تو پھر تمھیں تردد نہیں ہونا چاہیے۔''

وہ رنکھی ہوئی۔''آپ لوگ ہمیں اکیلا چھوڑ سکتے ہیں۔''

''تم سوچو اور خوب اچھی طرح سوچو، بھوک لگے تو اپنی دیدی کو آواز دے دینا۔''ڈاکٹر سجاتا نے اسے ماتھے پر پیار دیا اور ہم باہر نکل آئے۔

''کافی گرم کرلوں ٹھنڈی ہوگئی ہے۔''اس نے بھرے ہوئے مگ اٹھائے اور باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

میں نے صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی لگا دیا۔پرما کے غائب ہونے پر پتا نہیں کتنا ہنگامہ مچا ہوا تھا۔تین بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ٹی وی پر کرشل چل رہی تھیں۔سجاتا کے آنے تک خبروں کی سرخیاں شروع ہوگئی تھیں۔سب سے پہلی خبر ہی پرما کے اغواء کی تھی۔جنرل رندھیر شکلا کی نواسی کو'' کے ایچ نارینہ ہسپتال اینڈ ریسرچ سنٹر کی پارکنگ سے اغواء کیا گیا تھا۔اغواء کرنے والے دو جوان تھے جن کے چہرے شناخت نہیں ہو سکے تھے۔ان کا سنائپر ساتھی شوبھا منزل کی چھت پر موجود تھا۔تفصیل بعد میں بتائی جاتی تھی۔

ڈاکٹر سجاتا کافی لے آئی۔کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے میں خبر کی تفصیل سنتا رہا۔نیوز کاسٹر کا لہجہ کافی بدلا ہوا تھا۔وہ شکلا خاندان کے ساتھ میری دشمنی کو اجاگر کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی اور ممبئی میں مجھ سے جتنے بھی سچے جھوٹے واقعات منسوب تھے تمام کے ڈانڈے میری شکلا خاندان سے دشمنی سے جوڑ رہی تھی۔اس کی وجہ تو بلاشبہ وگنیش کی ڈالی ہوئی ہڈی تھی۔

پاکستان کی طرح بھارت کا میڈیا بھی بکاؤ اور دولت والوں کا پالتو کتا ہے۔آزاد صحافت اور بغیر لگی لپٹی کہنے کا شوق صرف کمزور، مفلس اور نچلے درجے کے طبقے کے لوگوں کی خامیاں وغلطیاں اجاگر کر کے پورا کیا جاتا ہے۔ایک اندازہ یہ بھی لگایا جارہا تھا کہ پرما کو اغواء کرنے کے پس پردہ وجہ قتل سے پہلے اس کی عصمت دری کرنا تھی، تاکہ شکلا خاندان کی سبکی کی جاسکے۔پرما کے زخمی محافظوں کے اجسام سے ایس آر ون کی گولیاں برآمد ہوئی تھیں۔اب ماہرین یہ جانچ رہے تھے کہ آیا شکلا کے جسم سے برآمد ہونے والی اور محافظوں کے جسم سے نکلنے والی گولیاں ایک رائفل سے چلائی گئی ہیں یا مختلف رائفلیں استعمال ہوئیں۔اس سے پہلے ممبئی کی ایک کاروباری شخصیت راجیش گپتا عرف راجپوت کو اغواء کرتے وقت بھی اس کے محافظوں پر اسی رائفل سے گولیاں چلائی گئی تھیں۔رندھیر شکلا سے میری دشمنی کی وجہ بیان کرتے ہوئے رندھیر شکلا

کی کشمیر کے محاذ پر خدمات اور وہاں دہشت گردوں کی صفیں درہم برہم کرنے کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے مجھے انھی دہشت گردوں کا ساتھی قرار دیا گیا تھا جو حکومت پاکستان کی ایما پر بھارت میں موجود تھا۔ وگنیش شکلا نے بھی اپنی بھانجی کی بہ خیریت واپسی کا مطالبہ کرتے ہوئے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ اسے میرے ارادے خطرناک لگتے تھے اور یقین تھا کہ میں پرما کو نقصان پہنچاؤں گا، کیوں کہ رندھیر شکلا کو کال پر اس کی نواسی کے بارے دھمکا بھی چکا تھا۔ وگنیش نے یہ بھی بتایا کہ میری دھمکی کی وجہ سے اس نے کئی بار پرما کو کالج جانے سے منع کیا مگر پرما کم سن و نادان تھی اس وجہ سے ماموں کی بات کو اہمیت نہیں دے رہی تھی۔ وگنیش چونکہ اپنی یتیم بھانجی سے از حد محبت کرتا تھا اس وجہ سے اس کی خواہش کے راستے میں دیوار نہ بنا البتہ اس کی حفاظت کا انتظام محافظوں کی تعداد دگنی کر کے کیا۔ تاکہ پرما کی حفاظت کو یقینی بنایا جا سکے۔ مگر دہشت گردوں نے بڑی تعداد میں حملہ کیا اور انھیں سنائپر کی مدد بھی حاصل تھی اس وجہ سے پرما کے محافظ اسے اغواء ہونے سے نہ بچا سکے۔

پرما کے اغواء پر کافی تفصیل سے روشنی ڈالی جا رہی تھی۔ اور اس کی وجہ وگنیش شکلا کی مظلومیت کو اجاگر کرنا تھا۔ یقیناً ایک طرف یہ چرچا کر کے دوسری جانب وگنیش شکلا نے اپنے پالتو کتوں کے ذریعے پرما کی تلاش میں سر دھڑ کی بازی لگا دینا تھی۔

ایک غلطی بلاشبہ مجھ سے ہو گئی تھی کہ پرما کے اغواء کے وقت ایس آر ون کو استعمال نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ رائفل استعمال کر کے میں نے نادانستگی میں وگنیش شکلا کے موقف کی تاکید کی تھی کہ پرما کے اغواء کے پیچھے میں چھپا ہوں۔ ایس آر ون کا ہلکا ہونا، دور مار ہونا اور چھوٹے بیگ میں پیک ہونے کی اضافی خوبیوں کی وجہ سے یہ غلطی سرزد ہوئی تھی۔ گو ایس آر ون اور میرا ساتھ زیادہ عرصہ نہیں چل سکتا تھا کہ پچاس گولیوں کے بعد یہ رائفل میرے کام کی نہ رہتی۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ میں دو تین معرکوں میں بیس سے زیادہ گولیاں نہیں چلا سکا تھا گویا اب تک تیس گولیوں کی مہلت باقی تھی۔

میں وشواس سنگھ سے رابطہ کرنے لگا۔ اس مقصد کو میں اس کے پاس ایک نیا موبائل فون چھوڑ آیا تھا۔

ایک دو گھنٹیوں کے بعد موبائل مصروف کر دیا گیا۔ سوچا ''میرا نمبر اس کے پاس موجود نہیں تھا شاید اس وجہ سے کال نہیں اٹھا رہا۔'' مگر اسی دوران پیغام کی گھنٹی بجی، لکھا تھا۔ ''کون؟''

''راجا۔'' میں نے جوابی پیغام بھیجا۔ اور دوبارہ کال کی مگر آگے سے نمبر مصروف کر دیا گیا۔ تعارف کے بعد بھی اس کا کال کاٹنا حیران کن تھا۔ مجھے لگا کوئی مسئلہ ہے۔

منٹ بھر بعد اس کا اگلا پیغام آیا۔ ''ویر جی، میں پریتو ہوں۔ کال پر بات نہیں کر سکتی۔ وہ وشو کو پوچھ گچھ کو لے گئے ہیں۔ وشو نے مخصوص ہدایت دے کر نیا موبائل پہلے سے میرے پاس رکھوا دیا تھا۔ الحال وشو نے آپ کو رابطہ ختم کرنے کی تاکید کی ہے۔ میں بھی آپ کی کال کے انتظار میں تھی۔ اب یہ موبائل آپ کو وشو کی آمد تک بند ملے گا۔ جو بولے سو نہال، ست سری اکال۔''

''ربّ راکھا بھابی۔'' میں نے بھی آخری پیغام دے کر صوفے سے ٹیک لگا لی۔

''کیا ہوا۔'' ڈاکٹر سجاتا میرے چہرے پر تفکر دیکھتے ہوئے پوچھے بنا نہیں رہ سکی تھی۔

میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ''کوئی ایک مسئلہ نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔''

وہ متبسم ہوئی۔ ''ایسا ہی ہوگا، مگر آپ کے چہرے پر پریشانی نہیں جچتی۔''

میں نے سمجھایا۔ ''یہ تو فطرتی عمل ہے، بس میں تھوڑی ہوتا ہے۔''

وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''آپ میرے آئیڈیل ہیں، کم از کم میرے سامنے جھوٹ موٹ ہی سہی مگر خود کو ہشاش

بشاش ظاہر کریں۔ ورنہ میں بھی مشکلات و مسائل سے ہمت ہارنے کو فطرت مان لوں گی۔''

میں نے قہقہہ لگایا۔ ''تفکر ظاہر کرنے اور ہمت ہارنے میں فرق ہے پگلی! حوصلہ بزدل ہارتے ہیں اور تفکر جرأت مندوں کو بھی لاحق ہوتا ہے۔''

میرے قہقہے پر اس نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''اب خوش ہوں۔''

''ایک کال کرلوں۔'' میں موبائل نکال کر ذہن پر زور دینے لگا۔ نادر خان عرف نجو چکر باز کا نمبر یاد کر کے نمبر ڈائل کیا اور موبائل فون کان سے لگالیا۔ چونکہ پہلے والا موبائل فون میں وہیں پھینک کر آ گیا تھا اس لیے نمبر یاد کرنے کی ضرورت پڑ رہی تھی۔

دوسری تیسری گھنٹی پر اس نے کال اٹھالی تھی۔

''نجو میں راجا بول رہا ہوں، اس وقت کہاں ہو؟''

وہ جمائی لیتا ہوا بولا۔ ''وہیں ہوں باس جہاں چھوڑ گئے تھے۔'' یقیناً وہ نیند سے جاگا تھا۔

''بیس ہزار ڈالر کمانے ہیں۔''

''بب..... باس مذاق کرنے کو میں ہی ملا ہوں۔''

''مجھے ممبئی سے نکلنا ہے، انتظام کر سکتے ہو۔''

''اکیلے یا وہ چھمک چھلو بھی ساتھ ہوگی۔''

مجھے تپ چڑھا۔ ''پہلے صرف تھپڑ مارا تھا ناں، اب تمھارے سر میں گولی اتار دوں گا۔''

وہ احمقانہ انداز میں بولا۔ ''بب..... باس! بیس ہزار ڈالر دینے کے بعد ہی گولی چلانا۔''

میں جھلاتے ہوئے بولا۔ ''یار تم نادر خان ہو، نادر سنگھ تو نہیں ہو، پھر احمقانہ گفتگو سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو۔''

''باس آپ میرا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ مطلب کی بات کریں تاکہ انتظامی امور کی طرف متوجہ ہو سکوں۔''

''ہم دو آدمی ہیں، لیکن یہ ذہن میں رہے تمام ایجنسیاں، وگنیش کے کتے اور پولیس وغیرہ شدت سے ہماری تلاش میں ہیں۔ اور ہمیں دیکھتے ہی قتل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔''

وہ اعتماد سے بولا۔ ''میں مکمل جائزہ لے کر آپ سے رابطہ کرتا ہوں۔''

ڈاکٹر سجاتا امید بھری نظروں سے مجھے گھور رہی تھی، پوچھنے لگی۔ ''کام بنا؟''

میں خوش دلی سے بولا۔ ''پہلا مرحلہ تو شروعات کا ہوتا ہے نا۔ بننے، بگڑنے کی باری بعد میں آتی ہے۔''

''میں کسی کام آ سکتی ہوں۔'' اس نے خلوص دل سے پیش کش کی۔

میں اطمینان سے بولا۔ ''تمھاری جتنی مدد چاہیے تھی بغیر کسی تکلف کے لے لی۔''

وہ چہکی۔ ''اسی وجہ سے تو خوش ہوں''

''ذرا اس کی حالت بھی دیکھ لوں۔'' میں اٹھ کر پرما کی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھٹکھٹا کر لمحہ بھر انتظار کیا اور پھر اندر چلا گیا۔ وہ گھٹنوں کے گرد ہاتھ لپیٹے جانے کس سوچ میں کھوئی تھی۔

میں نے کرسی بیڈ کے قریب کھینچی اور نشست سنبھال لی۔

میرے بولنے کا انتظار کیے بغیر اس نے زبان کھولی۔ ''وہ جھوٹ بول رہے تھے۔''

میں نے بے ساختہ تصحیح کی۔ ''وہ سے میں مراد ہوں تو یہاں، تم یا آپ کے تخاطب سے پکارا جاؤں گا۔''

وہ اداسی سے بولی۔ ''وگنیش ماموں جھوٹ کہہ رہے تھے۔ نہ تو انھوں نے محافظوں کی تعداد بڑھائی اور نہ ہمیں کالج

جانے سے روکا۔ بلکہ ہمارا دل پڑھنے سے اچاٹ ہو گیا تھا وہ با اصرار زور دیتے رہے کہ ہمیں پڑھنا چاہیے اور اسی مصروفیت میں کھو کر ہم ذہنی تناؤ اور فکرمندی سے چھٹکارا پا سکتے ہیں۔ ہمارے پہلے اغواء اور واپسی کی خبر کو بھی وہ پی گئے۔ ہم نے گرینڈ پا اور ان سے صاف کہا تھا کہ دورانِ قید ہمیں نہ تو اذیت پہنچائی گئی اور نہ ہماری حرمت پر ہاتھ اٹھایا گیا۔ جبکہ وہ ہماری عصمت دری کا ذکر کر رہے ہیں۔'' یقیناً اس نے خبروں کی آواز پر کان دھرے تھے۔ ممکن تھا دروازے کے قریب کھڑے ہو کر تفصیل سنی ہو۔

میں نے کہا۔ ''اب تو یقین آ گیا کہ میں درست کہہ رہا ہوں۔''

گھٹنوں سے سر اٹھا کر اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے مجھے گھورا۔ اور پھر گلوگیر لہجے میں بولی۔ ''ہمیں پاپا سے بات کرنا ہے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ پاکستان میں ہیں۔ اور یہاں سے انھیں کال کرنا مناسب نہ ہوگا۔ کیوں کہ انھوں نے کال کرنے کو سختی سے منع کیا تھا۔''

وہ مچلی۔ ''تو ہمیں پاکستان لے چلیں۔''

''اسی کوشش میں لگا ہوں۔ ہمارے پیچھے بہت سے لوگ پڑے ہیں۔ وگنیش صرف اپنے آدمیوں پر اکتفا نہیں کرے گا، کرائے کے قاتل اور بھاڑے کے غنڈوں کی خدمات حاصل کرنا اس کے لیے چنداں دشوار نہ ہوگا۔ مجھ سے زیادہ آپ کی جان کو خطرہ ہے۔''

اس کے چہرے پر زخمی تبسم ابھرا۔ ''پہلے یقین نہیں آ رہا تھا۔ بے وقوف ہیں ناں..... پاپا سے بات چیت کیے بغیر، انھیں اپنی آنکھوں سے جرم کرتا دیکھے بغیر اتنا عرصہ مصنوعی نفرت کی آگ میں جلتے رہے۔ دل کہتا وہ ایسے نہیں ہو سکتے اور ہم کہتے ایسا ہی ہوگا کیوں کہ سارے مسلمان ظالم ہوتے ہیں اور پاکستانی تو ہیں ہی بے حس و ظالم قوم۔ یاداشت ان کی شفقتوں اور محبتوں کی تصویر دکھاتی اور ہم ان کے دشمنوں کی پیش کی ہوئی صورت آنکھوں کے سامنے رکھتے۔'' گہرا سانس لے کر وہ میری طرف متوجہ ہوئی، چند شفاف قطرے ملائم گالوں پر لڑھکے۔ انھیں صاف کیے بغیر وہ ممنونیت سے بولی۔

''شکریہ، ہمیں مرنے سے پہلے حقائق سے روشناس کر دیا۔ آپ بہت اچھے ہیں۔''

میں مزاحیہ انداز میں بولا۔ ''آپ مجھ پر ڈورے ڈال رہی ہیں، لیکن سوری اب میں نے آپ سے شادی کا خیال دل سے نکال لیا ہے۔''

بے ساختہ اس کا مترنم قہقہہ ابھرا، آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر تبسم یقیناً دیکھنے کے قابل نظارا تھا۔ ''پھر اغواء کیوں کیا، اب ہمیں محبت ہوئی تو آپ بھاگنے کی فکر میں ہیں۔'' وہ میرے مذاق پر محظوظ ہوئی تھی۔

''بس ایسے ہی ہنستی رہو۔ انصاری صاحب نے کہا تھا ان کی پری جب ہنستی ہے تو فضا مسکرانے لگتی ہے۔ یقین مانو پہلی بار پورے ماحول کو مسکراتا دیکھ رہا ہوں۔''

وہ زندہ دلی سے بولی۔ ''اوپر اوپر سے نظر انداز کرنے کا دکھاوا اور اندر سے متاثر کرنے کی کوشش، یہ نہیں چلے گا بھئی۔''

میں نے قہقہہ لگایا۔ ''بھول گئیں کیا کہا تھا میری زندگی میں کوئی اور ہے۔''

وہ اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ''پاپا کا اصل نام فہیم اسلم انصاری ہے؟''

''ہاں۔''

''ہمیں یاد کرتے تھے۔'' پرما کے لہجے میں حسرت ہلکورے لے رہی تھی۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پگلی یادانھیں کیا جاتا ہے جو بھول جائیں۔ان کی حالت تو بہ قول شاعر یہ ہے کہ.....

میں ایک پل بھی جو بھولوں تمھیں تو مر جاؤں

تمھاری یاد کا پہرہ ہے میرے سانسوں پر

یقین مانو اس عہدے کے آفیسر کو پہلی بار آنسو بہاتے دیکھا ہے۔ پاروتی اور پرمادو ایسے نام ہیں جو وہ بار بار جپتے رہتے ہیں۔اب ان کی گپ شپ،ان کی گفتگو کا موضوع،ان کی معلومات،ان کی ترجیحات،ان کی سوچیں کا محوراوران کا سب کچھ پاروتی اور پرما کی یادیں ہیں۔آپ کے نانا کے سامنے وہ گڑگڑائے،منتیں کیں،معافیاں مانگیں مگر شکلا صاحب کو ترس نہ آیا۔آپ کے حصول کی تین چار کوششیں وہ پہلے بھی کر چکے تھے جو ناکام گئیں۔آخران کی نظرانتخاب مجھ پر پڑی اور مجھے قسمت آزمانے آنا پڑا۔ان شاءاللہ ان کی پری کو ان تک پہچانے کا سہرا میرے سر بندھے گا۔''

باپ کے ذکر پر وہ محویت میں کھو گئی تھی۔لبوں پر ملکوتی تبسم اور آنکھوں میں ستارے جھلملانے لگے تھے۔بے تابی سے پوچھنے لگی۔''صبر نہیں ہو رہا،کب پہنچیں گے۔''

''اسی کام میں لگا ہوں،وگنیش ماموں آپ کی محبت میں پاگلوں طرح پوری ممبئی کو چھان رہا ہے۔''

وہ ملتجی ہوئی۔''پلیز انھیں گولی نہ مارنا۔''

میں نے تسلی دلائی۔''کوشش تو یہی ہے۔''

وہ پوچھنے لگی۔''آپ بہت ہی اچھے نشانہ باز ہیں۔کیا سارے پاکستانی فوجی ایسے ہی ہوتے ہیں۔''

میں نفی میں سر ہلایا۔''عام فوجیوں اور سنائپروں میں فرق ہوتا ہے۔البتہ یہ کہہ سکتی ہو کہ پاکستانی سنائپر ایسے ہوتے ہیں۔''

''ہونہہ!'' ہنکارا بھرتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔''پاپا کے بارے کچھ اور بتاؤ نا؟'' وہ ایک دم تبدیل ہو گئی تھی۔جس باپ کا نام لینا اسے گوارا نہ تھا اب اس کے علاوہ کچھ سننا نہیں چاہ رہی تھی۔بلاشبہ رندھیر شکلا نے بے چاری پر بہت ظلم ڈھایا تھا کہ نہ صرف اس کی ماں کو قتل کیا بلکہ باپ کو بھی چھین لیا تھا۔اور محبتیں جب نفرتوں کا روپ دھار لیں تو بہت تباہی لاتی ہیں۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔''پہلے کچھ کھا پی لو ورنہ انصاری صاحب نے میری کلاس لے لینا ہے کہ اس کی پری کو کمزور کر کے لے آیا ہوں۔''

وہ کھل کھلا کر ہنسی۔''جب ہم پہلے قید میں تھے تب،سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آپ ہمارا اتنا خیال کیوں رکھتے ہیں،اتنی عزت کیوں دیتے ہیں اور کوئی بات بھی نہیں ٹھکراتے۔آپ کی مہربانیاں کسی نچلے درجے کے عاشق کی کوششیں لگتی تھیں جو وہ اپنی امیر محبوبہ کا دل جیتنے کو کر رہا ہو۔''

''اگر اصل بات بتا دیتا تو آپ نے بدک جانا تھا۔میرے پاس اپنی سچائی میں کوئی ثبوت موجود نہیں تھا۔اور بغیر ثبوت کے یہ موضوع چھیڑنا آپ کو مزید متنفر کر سکتا تھا۔اب اپنی خوش قسمتی سمجھو کہ آپ کے قتل کو وگنیش کی نظر مجھ پر پڑی اور کام آسان ہو گیا۔''

''سوری آپ کو بہت زیادہ تنگ کیا،برا بھلا بھی کہا اور نفرت تو دل کھول کر کی۔''ذرا سا توقف کر کے اس نے آنکھیں نکالیں۔''کمی تو خیر آپ نے بھی نہیں چھوڑی تھی۔سچ میں اتنا ڈرا دیا تھا کہ ہم مصنوعی طور پر عزت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔''

میں ترکی بہ ترکی بولا۔''اور میرے سر میں جگ مارنے کا کارنامہ بھول گئیں۔''

وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ ''اس کے لیے بھی سوری۔ اب کافی کے ساتھ برگر اور چکن سینڈوچز منگوالیں، بہت بھوک محسوس ہو رہی ہے۔''

اور میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ڈاکٹر سجاتا کو آواز دے دی۔

—— ● ——

رات کو میں نے ڈرائینگ روم میں سونا پسند کیا تھا۔ ڈاکٹر سجاتا نے کافی کوشش کی کہ میں خواب گاہ میں لیٹ جاؤں مگر میں نے انکار کر دیا۔ پرما اکیلے سونے کی عادی تھی اس لیے اس کے ساتھ ڈاکٹر سجاتا کو سلانا نہیں بنتا تھا۔ اور میں نہ تو ڈاکٹر کے ساتھ ایک خواب گاہ میں سو سکتا تھا نہ اسے ڈرائینگ میں سلانا مناسب تھا کہ صنف نازک کے بجائے خود جو کھم اٹھا لینا شیوہ مردانگی ہے۔

رات گئے نجو کی کال ملی، اس نے مشورہ چاہنے کے انداز میں پوچھا۔ ''باس! پرسوں کی فلائیٹ کیسی رہے گی۔''

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''جہاز کی سیٹیں کرا رہے ہو؟''

وہ مسمسے انداز میں بولا۔ ''ڈرائیور کہہ رہا تھا کہ وہ جہاز کا مافق ٹرک اڑائے گا۔''

میں نے ڈانٹا۔ ''بے شرم انسان سیدھی طرح کیوں نہیں بتاتے۔''

وہ مسکنت سے بولا۔ ''سوچا آپ کو تھوڑا سا خوش کر دوں۔''

میں نے دانت پیسے۔ ''مجھے خوش کرنا ہے تو صبح کا ناشتا منوج جوشی کے ساتھ مل بیٹھ کر کرو۔''

وہ احتجاجی انداز میں بولا۔ ''باس! میں تو آپ کو اپنا خیر خواہ سمجھ رہا تھا۔ اور آپ میرے دشمنوں کا کام آسان کرنے پر تلے ہیں۔''

''اچھا فضول بکواس چھوڑو اور مطلب کی بات پر آؤ۔''

وہ تفصیل بتاتا ہوا بولا۔ ''ایک فوجی میجر کی ممبئی سے تبدیلی ہوئی ہے۔ اس کے گھر کا سامان ممبئی سے پٹنہ جا رہا ہے۔ پانڈے گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کا ٹرک کرائے پر لیا گیا ہے جس نے آج شام کو نکلنا تھا، مگر اب کل شام کو نکلے گا۔ سامان لوڈ کرنے والے فوجی ہوں گے مگر میں اپنے آدمی مزدوروں کے بھیس میں لے جاؤں گا تاکہ اپنی مرضی سے سامان کو ترتیب دے کر رکھوا سکوں۔ اور یقیناً مفت کے مزدور ملنے پر وہ شکر کا کلمہ پڑھتے ہوئے آرام کرنے کو ترجیح دیں گے..... باقی آپ کی مرضی ہے کہ پٹنہ تک ٹرک میں سفر کرنا چاہتے ہیں یا راستے میں اترنے کو ترجیح دیتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اس کا فیصلہ بعد میں کروں گا، پہلے ممبئی سے نکلا جائے۔''

اس نے مجھے معاوضے کی طرف متوجہ کیا۔ ''یقیناً اب نجو انعام کا حقدار بن گیا ہے۔''

''کام کی تکمیل سے پہلے ہی تمہیں معاوضے کی پڑ گئی ہے۔ صبح ہنومان جی ٹاور کی پارکنگ میں پہنچ جانا طے شدہ معاوضا مل جائے گا۔''

وہ صاف گوئی سے بولا۔ ''نجو اعتبار تو کسی پر نہیں کرتا، مگر آپ کو آزما چکا ہے۔''

میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''بس خود چکر بازیاں کرنے والا دوسروں کو بھی ایسا ہی سمجھتا ہے۔''

وہ شاکی ہوا۔ ''باس! نجو کی چکر بازی مطلب کے حصول کو ہوتی ہے نہ کہ اپنے گاہکوں کو دھوکا دینے کو۔ معاملات میں بالکل کھرا ہوں۔ ورنہ آپ کی خبر دینے کا انعام پچاس لاکھ تک پہنچ گیا ہے اور بتانے والے کا نام بھی صیغہ راز میں رکھنے کا وعدہ کیا جا رہا ہے۔''

مجھے اچھا خاصا جھٹکا لگا تھا۔ بلاشبہ انعام کی یہ رقم میرے لیے نہیں پرما کے حصول کی خاطر اعلان کی گئی تھی۔ وگنیش شکلا

دولت و جائیداد کے لالچ میں اندھا ہو گیا تھا۔ پرما کی خوش قسمتی تھی یا شاید انصاری صاحب کی مناجاتیں تھیں کہ مجھے نہ صرف بروقت پتا چل گیا تھا بلکہ اسے قتل کرانے کو میری ہی خدمات لینے کی کوشش کی گئی تھی۔ بلاشبہ یہ فائدہ اپنا راز چھپانے کی وجہ سے حاصل ہوا تھا۔ امیر المومنین سیدنا عمرؓ کا ارشاد ہے ''من کتمہ سرہ بلغ مرادہ'' (جس نے اپنا راز چھپایا وہ مراد کو پہنچ گیا)

میں نے طنز کیا۔ ''تو احسان جتا رہے ہو۔''

وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ''پچاس لاکھ کو ٹھوکر مار رہا ہوں پھر بھی احسان نہیں مان رہے، حالاں کہ بدلہ چکانا بالکل آسان ہے۔ بس مجھے مس بھوری کا رابطہ نمبر عنایت کر دو۔'' اس نے لورا براؤن کو یاد کیا۔

میں ہنسا۔ ''شاید اس کی پہلی تواضع کے اثرات معدوم ہو چکے ہیں۔''

وہ عاشقانہ لہجے میں بولا۔ ''باس! قسم سے سالی دل چھین کر لے گئی ہے۔''

''میرے پاس فضول بک بک کا وقت نہیں ہے یار۔''

وہ تیزی سے بولا۔ ''کل بات ہوگی۔ اپنی راجکماری کو سلام کہہ دینا۔'' اور بغیر میرا جواب سنے رابطہ منقطع کر دیا۔

ممبئی سے باہر نکلنا ہی بہتر تھا۔ گو ہفتے ڈیڑھ تک وشواس سنگھ میرے بھاگنے کا بندوبست کر دیتا، مگر اتنے دن وہاں گزارنا مجھے مناسب معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ کیوں کہ وگنیش شکلا کو اگر اتفاق سے میرا ٹھکانہ معلوم ہو جاتا تو ہمیں مرنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی تھی۔ کرن چاولہ کے خطرے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جبکہ پورے انڈیا میں ہمیں تلاش کر لینا بھوسے کے ڈھیر سے سوئی ڈھونڈنے کے مترادف تھا۔ کافی دیر میں اسی مسئلے میں سر کھپاتا رہا اور پھر نیند نے ان خیالات سے جان چھڑا دی۔

—●—

دوسرے دن صبح سویرے ہی نے نجو کی کال آ گئی تھی۔ وہ پارکنگ میں میرا منتظر تھا۔ اسے مل کر معاوضے کی ادائی کی۔ وہیں کھڑے کھڑے چند ضروری باتیں ہوئیں اور میں واپس آ گیا۔ واپسی پر ڈاکٹر سجاتا جاگتی ہوئی ملی تھی۔ ناشتا وغیرہ اکٹھے کر کے میں نے اسے زبردستی ہسپتال بھیج دیا تھا تاکہ اس کی روزمرہ متاثر نہ ہو۔ فلیٹ بھی باہر سے قفل کرنے کا کہہ دیا تھا۔

پرما، ڈاکٹر سجاتا کے لیپ ٹاپ پر رات گئے تک فلمیں دیکھتی رہی تھی، اس لیے کافی دیر سے اٹھی۔ تازہ دم ہو کر وہ خود باورچی خانے میں گھس گئی تھی۔ میں بھی پیچھے چلا گیا کہ نازوں پلی امیر زادی کو جانے ناشتا بنانا آتا بھی تھا یا نہیں۔

مجھے دیکھ کر وہ خوش دلی سے بولی۔ ''شکر یہ کہ آپ آ گئے، ورنہ ہمارا کافی نہ بنانے کا ریکارڈ ٹوٹ جاتا۔''

میں ہنسا۔ ''ریکارڈ تو خیر ضرور ٹوٹے گا کیوں کہ میں چائے یا کافی بنانے کا طریقہ سکھاؤں گا۔ بنا کر نہیں دوں گا۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''ہم بچے نہیں کہ طریقہ نہیں پتا۔''

''پھر بھی پہلی بار کوئی کام کرتے وقت رہنما کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔''

وہ اداس ہو گئی تھی۔ ''مذاق کر رہے تھے، ورنہ پاپا صرف ہمارے ہاتھ کی بنی کافی پیتے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ آج بھی اپنی پری کے ہاتھ کی بنی کافی کو ترس رہے ہیں۔ اور ان شاء اللہ جلد ہی ان کا سپنا تعبیر کا چولا پہننے کو ہے۔''

''پتا نہیں کب وہ لمحے آئیں گے۔'' حسرت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے الیکٹرک کیتلی میں دودھ ڈال کر بٹن آن کر دیا۔ میں فرج کھول کر دوسرے لوازمات نکالنے لگا۔

پر تکلف ناشتے کرا کر میں اسے ممبئی سے نکلنے کی تفصیلات بتانے لگا۔
اس کی آنکھوں میں پریشانی جھلکی۔ ''ہم ٹرک میں کیسے سفر کریں گے۔''
میں اطمینان سے بولا۔ ''ٹرک کی بھی سیٹ پر نہیں، باڈی میں سفر کرنا پڑے گا۔ اور براہ مہربانی پاکستان پہنچنے تک عیش و آرام کو بھول جاؤ۔ راستے میں کافی مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ بہتر ہوگا میرے لیے زیادہ پریشانیاں پیدا نہ کرنا۔''
اس نے منہ پھلایا۔ ''جب ہم ساتھ نہیں جا رہے تھے تو منتیں کر رہے تھے، اب طعنے دینا شروع کر دیے۔''
میں نرمی سے بولا۔ ''طعنے نہیں دے رہا، سمجھا رہا ہوں۔ ہم سیر و تفریح کو نہیں جا رہے دشمنوں سے بچ کر بھاگ رہے ہیں اس لیے عارضی طور پر آرام و آسائشوں کو بھولنا ہوگا۔''
وہ شوخی سے بولی۔ ''خیال رہے جتنے نظر آتے ہیں نا، اس سے تھوڑا زیادہ ہی نازک ہیں۔''
''آپ کی نزاکت و کمزوری تو تب مدنظر رکھتا جب مستقبل کے واقعات میری منشا کے مطابق پیش آتے۔ مگر مقدر لکھنے والا کوئی اور ہے۔''
منہ بناتے ہوئے کہنے لگی۔ ''بھگوان، خدا اور اللہ (تعالیٰ) کا وجود بس اپنی کجیوں، کمزوریوں اور نالائقیوں پر پردہ ڈالنے کو انسان نے ایجاد کر لیا ہے۔ براہ مہربانی سب کچھ اپنے اللہ (تعالیٰ) پر چھوڑ کر حفاظتی تدابیر سے لاغرضی نہ برتنا۔''
''ہر تخلیق، خالق کی متقاضی ہوتی ہے۔ برتن، کپڑے، مکانات، گاڑیاں، ہوائی جہاز، راکٹ الغرض ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز کے بنانے والے کا وجود تسلیم کرتی ہو اور چاند، ستارے، انسان، جانور، درخت، پھل، پھول، پانی اور کائنات کی کروڑہا مکمل تخلیقات کے وجود کو بغیر خالق کے تسلیم کرتی ہو۔ یقیناً اللہ پاک ستار، ہے کہ اس نے احمقوں کے سینگ نہیں بنائے ورنہ کسی کو پہچاننے کو اس کی زبان کا سہارا نہ لینا پڑتا، سینگ دیکھتے ہی بندہ کنارا کرتا کہ اس سے بحث نہ کرنا احمق ہے۔''
وہ اطمینان سے بولی۔ ''سب مادے کا کھیل ہے جناب۔''
''جانتی ہو آپ کی سائنس کے جتنے اصول، ضوابط اور نظریے ہیں یہ ایک ''کیوں'' کا جواب نہیں دے سکتے۔ زمین کو بے جان کہتے ہو اور گندم کے بیج ڈالتے وقت ذرا بھی اندیشہ نہیں کرتے کہ چنا اگے گا، کیوں؟ ایک ہی بیج سے اگنے والے پودے، کے تنے کا رنگ اور ہوتا ہے، پتے سبز ہوتے ہیں اور پھول سرخ، سفید، نیلا، پیلا..... جب جڑ کو پانی و خوراک تو ایک جیسی مل رہی ہے پھر تخلیق میں اختلاف کیوں؟ بلکہ بعض اوقات ایک پھول کی آدھی کلی سفید اور آدھی سرخ ہوتی ہے۔ کیوں؟..... انسان کی زبان ہے، جانوروں کی بھی زبان ہے انسان بول سکتے ہیں جانور نہیں بول سکتے کیوں؟..... ستارے و سیارے اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں یہ ایک دوسرے سے کبھی نہیں ٹکراتے..... کیوں؟..... ڈیزل و پٹرول سے مشینیں چلتی ہیں، پانی سے نہیں چلتی کیوں؟..... آپ ڈاکٹر بن رہی ہیں اور مجھ سے کئی گنا بہتر جانتی ہوں گی کہ ایک انسان کے جسم میں لاکھوں کیوں مقید ہیں۔ انسان کو سانس لینے کو آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے کاربن ڈائی آکسائیڈ کی کیوں نہیں، آنکھوں سے کیوں دکھائی دیتا ہے۔ کان کیوں کر سن سکتے ہیں..... سردی گرمی کا احساس کیوں ہوتا ہے..... ایک لمبی فہرست ہے.....''
وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ''اور ہمارے پاس آپ کے ہر ''کیوں'' کا جواب موجود ہے بس تفصیل کا متقاضی ہے۔''
میرے چہرے پر للکارتی ہوئی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''ایسا بس آپ سمجھتی ہیں۔ کیوں کہ آپ کی لمبی تفصیل کا اختتام جس نقطے پر ہوگا اس کے آگے ایک کیوں سوالیہ نشان کی صورت آپ کے علم کو للکار رہا ہوگا۔''

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔''اور ایسا بس آپ سمجھتے ہیں۔''

میں اعتماد سے بولا۔''اچھا انسان جب مر جاتا ہے تو میڈیکل سائنس کہتی ہے کہ اس کے بعد بھی اس کے اعضاء کچھ دیر زندہ رہتے ہیں۔اور یہی وجہ ہے کہ آج کل تبدیلی قلب، نئی آنکھیں لگنا، اور گردوں وغیرہ کی پیوند کاری ممکن ہو سکی ہے۔میرا سوال یہ ہے کہ انسان کے جسم سے کیا چیز نکلی ہے جو وہ مر گیا۔دل خون پمپ کر رہا ہے، آنکھوں کی پتلیوں میں دیکھنے کی صلاحیت موجود ہے، ہاتھ پاؤں سلامت ہیں، ذرہ برابر کمی نہیں ہوئی تو مر کیسے گیا؟.....کون سی چیز اس کے جسم سے نکلی کہ اب وہ نہ حرکت کر سکتا ہے اور نہ بول سکتا ہے اور اگر ویسے ہی اس کا جسم پڑا رہے تو ایک دن بعد بدبو پیدا ہونا شروع ہو جائے اور دو تین دنوں کے اندر گل سڑ کر سارا گوشت ہڈیاں علیحدہ علیحدہ ہو جائیں۔جبکہ کوما میں پڑا ہوا شخص سالہا سال بستر پر پڑا رہتا ہے مگر اس کا گوشت گل سڑ کر بدن سے علیحدہ نہیں ہوتا۔حالاں کہ اس میں اور مردے میں بس سانس لینے کا فرق ہوتا ہے۔''

وہ گلا کھنکارتے ہوئے بولی۔''دیکھیں میڈیکل سائنس اس کی تحقیق میں لگی ہے۔جلد ہی جواب ڈھونڈ لے گی.....''

میں طنزیہ انداز میں بولا۔''اور ایسا لاکھوں کروڑوں احمق سمجھتے ہیں۔جن میں کئی خود قبر کی آغوش میں پہنچ گئے ہیں۔''

وہ للکارتے ہوئے بولی۔''تو آپ دے دیں جواب۔آپ کے پاس بھی تو کوئی جواب نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں ہے.....صاف جواب ہے کہ اس کی روح نکل گئی ہے۔''

''اور روح کیا ہے؟''طنزیہ انداز برقرار رہا۔

''یہ وہ سوال ہے جو ہمارے نبی پاک ﷺ سے بھی پوچھا گیا۔اور جواب احکم الحاکمین نے ارشاد فرمایا کہ [روح اللہ کا حکم ہے] اور یہی ہر کیوں کا جواب ہے۔اس کے علاوہ لاکھ سر پھوڑ لو، تحقیقات کر لو، چاند پر پہنچ جاؤ، سمندر کی تہہ کھنگال لو، پاتال کا رستہ دریافت کر لو ایک کیوں سے سامنا رہے گا۔اور اس کیوں کے بوتھے پر جب تک اللہ پاک کے احسن الخالقین ہونے کا جھانپڑ رسید نہیں کرو گے وہ نہیں سدھرے گی یونہی آنکھیں دکھاتی رہے گی۔سائنس کے اصول و ضوابط، قوانین اور دریافتوں کی پہنچ ''کیسے'' تک ہی ہے۔''کیوں'' تک نہیں ہے۔''

وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔''جتنی تگ و دو اپنے خالق کے وجود کو ثابت کرنے کو کر رہے ہیں، اس سے آدھی کوشش بھی آگے کے سفر کو آسان کرنے کی کرتے تو آپ کے پیارے کمانڈر کی لاڈلی بیٹی یعنی مابدولت جو ھم اٹھانے سے بچ جاتے۔''

''ایک بات یاد رہے، حقیقی مسلمان دنیاوی اسباب کو کبھی بھی غیر اہم یا فضول نہیں جانتا۔اپنے مقصد کے حصول کو پوری کوشش کرتا ہے۔چاہے دنیا ہو یا آخرت اس کے لیے تقدیر پر بھروسا کرنے پر اکتفا نہیں کرتا۔بلکہ اپنی مکمل طاقت، وسائل اور صلاحیتیں استعمال کرنے کے بعد نتائج اللہ پاک پر چھوڑ دیتا ہے۔ہمارے قرآن میں بالکل واضح ارشاد ہوا [لیس للانسان الا ما سعی] (انسان کو اتنا ہی ملتا ہے جتنی وہ کوشش کرتا ہے) اس لیے بے فکر رہو اپنی کوشش مکمل کروں گا۔''

وہ جان چھڑاتے ہوئے بولی۔''ہمارا قد پانچ فٹ دو انچ ہے اور آپ کی باتوں کی اونچائی کم از کم ساڑھے پانچ فٹ ہوگی۔صاف کہیں تو ساری باتیں ہمارے سر کے بہت اوپر سے گزر رہی ہیں۔''

میں نے قہقہہ لگایا۔''اگر میز پر کھڑے ہو کر سن لیتیں تو ساری باتیں سمجھ میں آ جاتیں۔''

اس نے پیش کش کی۔''اگر پیسوں کی کمی آڑے آ رہی ہے تو ہمارے اکاؤنٹ میں کافی رقم موجود ہوگی۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔''تمھارے بینک اکاؤنٹ پر ان کی گہری نظر ہوگی۔''

کہنے لگی۔''ہمارے پاس کریڈٹ کارڈ بھی موجود ہے۔''

''جہاں بھی استعمال کیا، ہماری جگہ ظاہر ہو جائے گی۔ کیوں کہ وکنیش شکلا کی اس پر سختی سے نظر ہوگی۔''

اس نے تشویش ظاہر کی۔ ''پھر کیا کیا جائے۔''

میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''فکر نہ کرو میں سنبھال لوں گا۔''

اس نے فراخ دلی سے پیش کش کی۔ ''ہمارا بریسلٹ (کنگن) ٹاپس اور لاکٹ بہت قیمتی ہیں۔ گرینڈ پا نے تحفے میں دیے تھے، کہیں رقم کی رکاوٹ پیدا ہو تو بتانا ہم بیچ دیں گے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کہا نا پیسوں کا مسئلہ نہیں ہے۔''

وہ بھولپن سے بولی۔ ''پھر کار وغیرہ کرائے پر لے لو نا۔''

''میرا خیال ہے ہوائی جہاز زیادہ مناسب رہے گا۔''

''یہ ٹھیک ہے۔'' وہ خوشی سے چہکی۔ ''اور خرچے کی فکر نہ کرو ہم پاپا سے لے کر ایک ایک پائی ادا کر دیں گے۔''

''نہ بھئی، ادھار نہیں چلے گا۔'' خود کو سنجیدہ ظاہر کرتے ہوئے میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پہلے بھی آپ پر کافی خرچ کر چکا ہوں۔ جس کی واپسی کا بھی وعدہ ہوا تھا۔ وہ رقم ملی نہیں اور مزید خرچا۔''

وہ تنک مزاجی سے بولی۔ ''وہ بھی دے دیں گے، کہیں بھاگے نہیں جا رہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو ہمارا لاکٹ گروی رکھ لو۔''

میں متبسم ہوا۔ ''جانتی ہو ٹرک کے انتظام پر کتنے پیسے خرچ کر رہا ہوں۔''

اس نے منہ بسورا۔ ''ہزار، پندرہ سو ہی لیے ہوں گے نا؟''

میں نے دھماکا کیا۔ ''بیس ہزار ڈالر۔''

''کک.....کیا۔'' وہ ہکلائی۔ ''اتنے کی تو بہترین کار خریدی جا سکتی ہے۔''

''مسئلہ کرائے کا نہیں چھپ کر نکلنے کا ہے محترمہ۔''

''پھر بھی یہ بہت زیادہ ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اور آپ کی جان کتنی قیمتی ہے، اس بارے انصاری صاحب ہی بتا سکتے ہیں''

اس نے پوچھا۔ ''یہ پیسے پاپا نے دیئے تھے؟''

میں اطمینان سے بولا۔ ''مجرموں کا مال ہے جو مجرموں کو لوٹا رہا ہوں۔''

—●—

شام کو نجو کی کال موصول ہوئی۔ رسمی کلام کے بعد وہ مطلب کی بات پر آیا۔ ''باس سات بجے ٹرک ڈرائیور اپنے ٹھکانے سے نکلے گا اور امید ہے آٹھ بجے ہنومان جی ٹاور اور سوامی وویک نندر روڈ جنکشن پر پہنچ جائے گا۔ بہتر ہوگا آپ پہلے سے وہاں منتظر ہوں، کیوں کہ ٹرک کو چھوٹی سڑک اور گلیوں میں لانا مناسب نہ ہوگا۔ ڈرائیور کو آپ کا نمبر لکھوا دیا ہے آپ بھی اس کا نمبر درج کر لیں۔'' وہ ڈرائیور کا موبائل فون نمبر بتانے لگا۔

نمبر نوٹ کر کے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے، ہم پہنچ جائیں گے۔''

''اپنا خیال رکھنا باس! اور مس بھوری کا نمبر یاد سے میسج کر دینا۔'' یہ کہتے ہی اس نے میری ڈانٹ سے بچنے کو سرعت سے کال کاٹ دی۔ میں نے مسکراتے ہوئے موبائل فون جیب میں ڈال لیا۔

ڈاکٹر سجاتا نے پھیکے لہجے میں پوچھا۔ ''گویا تیاری مکمل ہو گئی ہے۔''

میں اسے جھڑکتے ہوئے بولا ''تم میرے حالات پر غور کیے بغیر خفا ہونے پر تلی بیٹھی ہو۔ بھول گیا جب ضرورت تھی تو

میں نے خود کال کر کے ٹھکانہ مانگا تھا۔''

وہ خلوص سے بولی۔ ''خفا تو نہیں ہوں، پریشان تھی کہ کہیں باہر جانا آپ کے لیے نقصان دہ نہ ہو۔ بہتر ہوتا چند دن میرے فلیٹ میں چھپے رہتے۔ یوں بھی جانے کب دوبارہ ملاقات ہو۔''

میں ہنستے ہوئے بولا۔ ''اپنی شادی کا دعوت نامہ بھیجنا امید ہے پہنچ جاؤں گا۔''

''وچن دو۔'' وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔

میں نے جان چھڑانا چاہی۔ ''کوشش تو پوری کروں گا۔''

وہ شرماتے ہوئے بولی۔ ''آپ کی اطلاع کو عرض ہے کہ میری شادی میں رکاوٹ اس خبیث کی وجہ سے پڑی تھی۔ ورنہ ڈاکٹر سدارتھ کافی عرصے سے تقاضا کر رہا ہے۔ اور اب تو میں نے بھی ہامی بھر لی ہے۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''ابھی جن حالات سے گزر رہا ہوں تو آپ کی شادی تک رکنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔''

وہ پھیکے لہجے میں بولی۔ ''جانتی ہوں۔ اور بے فکر رہیں خفا نہیں ہوں۔''

میں نے فلسفہ بگھارا۔ ''ایک بھائی موجود ہو تو دوسرے کے موجودی ثانوی رہ جاتی ہے۔''

وہ عقیدت سے بولی۔ ''بھگوان میرے بھائیوں کی رکھشا کرے، دونوں جہاں رہیں خوش و خرم رہیں۔ مگر سچ یہی ہے کہ ایک کا ہونا دوسرے کی کمی کو پورا نہیں کر سکتا۔''

میں نے کہا۔ ''تمھاری دعاؤں کی سخت ضرورت ہے۔''

پرما خواب گاہ سے برآمد ہوئی۔ ''بڑی دعائیں دی جا رہی ہیں۔''

گھڑی دیکھتے ہوئے میں سجاتا کو مخاطب ہوا۔ ''کھانا لگاؤ، ہم سات بجے نکلیں گے۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

سوئیاں پانچ کے عدد پر جمع ہو گئی تھیں۔ شام کی اذان کی ہلکی ہلکی آواز سماعتوں میں پڑی اور میں صاف چادر بچھا کر ڈرائینگ روم کے کونے میں نماز پڑھنے لگا۔ پرما، ڈاکٹر سجاتا کے پیچھے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

ڈاکٹر سجاتا نے پر تکلف کھانے کا بندوبست کیا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے پرما کو احتیاطی تدابیر کے متعلق سمجھایا۔ ڈاکٹر سجاتا کو کہہ کر کالا گاؤن پہلے سے منگوا لیا تھا تاکہ ٹرک تک بہ خیریت پہنچا جا سکے۔

سات بجنے میں دو تین منٹ باقی تھے کہ میں ایس آر ون کا بیگ کندھے پر لٹکا کر چلنے کو تیار ہو گیا۔ پرما نے جینز، قمیص اور ہلکے گلابی رنگ کی جرسی پہنی ہوئی تھی۔ میرے کہنے پر اس نے اوپر گاؤن پہن لیا تھا۔ مغربی لباس کی دلدادہ کو گاؤن میں الجھن تو ہو رہی تھی، مگر مجبوری تھی۔ اس کے ناک بھوں چڑھانے پر میں نے سختی سے تنبیہ کی تھی۔

''صحیح سلامت پاکستان پہنچنے کے لیے اپنی پسند اور طبعی عادات کو پس پشت ڈالنا ہوگا۔ من مانی وہاں کی جاتی ہے جہاں انتخاب کا اختیار موجود ہو۔''

وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔ ''آپ ہمیں مسلسل ڈرا رہے ہیں اور ڈانٹ بھی رہے ہیں۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''کیوں فی الحال آپ میری ذمہ داری ہیں۔ ان شاء اللہ خیریت سے پاکستان پہنچ گئے تو اپنے رویے پر معذرت کر لوں گا۔''

وہ برجستہ بولی۔ ''اور ہم جیسے معاف کر دیں گے۔'' ڈاکٹر سجاتا قہقہہ لگا کر ہنس دی تھی۔

اچانک میری نظر اس کے پاؤں کی طرف اٹھی۔ فیشن ایبل جوتے دیکھ کر میں نے ناک بھوں چڑھائی۔ ''بی بی آپ شاپنگ کرنے یا کسی تقریب میں نہیں جا رہیں۔ اگر پیدل چلنا یا بھاگنا پڑ گیا تو ان سینڈلوں کے ساتھ کیسے کر پاؤ گی۔''

وہ چونکی۔ ''کک کیا مطلب بھاگنے کا۔ ہم تو ٹرک میں سفر کرنے والے ہیں ناں؟''

''ٹرک میں سفر کرنا ہمارا منصوبہ ہے۔ اور مستقبل کے حالات ہماری منشا نہیں اللہ پاک کی مرضی کے محتاج ہوتے ہیں۔''

وہ بگڑ کر بولی۔ ''تو کیا پہنوں۔''

میں ڈاکٹر سجاتا کی طرف متوجہ ہوا۔ ''آپ کے پاس سپورٹس شوز یا کوئی بند جوتے ہوں گے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

پرما نے ناک بھوں چڑھائی ''ہم کسی اور کے جوتے نہیں پہنیں گے۔''

ڈاکٹر سجاتا کے چہرے پر انقباض پھیل گیا تھا۔

میں پرما کے اعتراض کو نظر انداز کرتا ہوا سجاتا کو بولا۔ ''لے آؤ۔''

وہ جوتوں کے ریک سے دو جوڑے بوٹ اٹھا لائی۔ سفید رنگ کے تسموں والے سپورٹس شوز تھے اور بغیر تسموں والے مضبوط کینوس کے بوٹ جن کا تلوا ہموار، لچکدار اور مضبوط تھا۔ مجھے بغیر تسموں کے بوٹ بہت پسند آئے تھے۔ کیوں کہ ان کا پہننا، اتارنا، بھی آسان تھا۔ اور ان میں دوڑنا، بھاگنا، چلنا بھی سہل تھا۔

میں نے وہ بوٹ پرما کی طرف بڑھائے۔ ''یہ پہن لو ان میں پاؤں بھی گرم رہیں گے اور.....''

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بے پروائی سے بولی۔ ''ضرورت پڑنے پر ننگے پاؤں بھاگ لیں گے، مگر یہ نہیں پہن سکتے۔'' اور پھر ڈاکٹر سجاتا کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''شما چاہتے ہیں دیدی! ہمارا مقصد ہرگز آپ کی توہین نہیں ہے۔ لیکن ہم کسی اور کی چیز استعمال نہیں کر سکتے۔''

جوتے فرش پر اچھالتے ہوئے میں نے بڑی مشکل سے غصہ قابو کیا۔ اور گہرا سانس لیتے ہوئے انھیں آگے کا لائحہ عمل بتانے لگا۔ ''پارکنگ تک دونوں گپ شپ کرتے ہوئے جاؤ..... اور ڈاکٹر کی کار میں بیٹھ کر نکل جاؤ۔ آپ دونوں ڈاکٹر کی کار میں ٹرک تک جاؤ گی۔ اور میں پیچھے اپنی کار میں اکیلا آؤں گا۔''

وہ سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔ تبھی میں نے بغیر تسموں والے جوتے اٹھا کر ایس آر ون کے بیگ میں گھسیڑ دیئے تھے۔ کیوں وہ کم عقل تھی، ایک دم حالات سے ناواقف و انجان۔ جبکہ میں طویل عرصے سے عملی میدان میں رگڑا کھا رہا تھا۔ اور اچھی طرح جانتا تھا کہ حادثات کیسے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

لمحہ بھر انتظار کر کے میں باہر نکلا، وہ لفٹ کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ اسی وقت لفٹ وہاں آ کر رکی اور وہ اندر گھس گئیں۔ میں سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ میرے نیچے پہنچنے تک وہ لفٹ سے نکل کر لوہے کی سلاخوں سے بنی عمارت کے داخلی دروازے سے باہر جا چکی تھیں۔

دروازے پر ایک چوکیدار ہر وقت موجود ہوتا تھا۔ اور آنے جانے والوں سے وہ کم ہی تعرض کرتا تھا۔ اس وقت چوکیدار کے ساتھ جینز والے دو جوان بھی کھڑے تھے۔ میری چھٹی حس نے انھیں دیکھ کر خطرے کا سگنل دیا لیکن، میں واپس مڑنے کا موقع کھو چکا تھا۔ میرے دائیں ہاتھ کی انگلیاں جیکٹ کی جیب میں گلاک ناینٹین کے دستے کے گرد لپٹ گئی تھیں۔

چوکیدار مجھے دیکھ کر ہلکے سے کچھ بڑبڑایا۔ تبھی ایک جوان نے ہاتھ اٹھا کر مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک دم میں نتیجے پر پہنچ گیا تھا۔ وہ داخلی دروازے پر کھڑے ہو کر چوکیدار سے ہر آنے جانے والے کی شناخت پوچھ رہے تھے۔ یقیناً عمارت کے مکینوں کو چوکیدار اچھی طرح سے پہچانتا تھا تبھی ان سے تعرض نہیں کیا جا رہا تھا۔ اور نئی شکل دیکھتے ہی

چوکیدار اسے مطلع کر دیتا تھا۔

میں پراعتماد انداز میں چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ ایک نے جیب سے ایجنسی کا مخصوص کارڈ نکال کر میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

''اسپیشل ایجنٹ ونود کمار..... آپ کی شناخت جان سکتا ہوں؟''

میں اطمینان سے بولا۔ ''انوپ مشرا۔'' اور اپنا نقلی شناختی کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا جو دھرمو دادا نے تیار کرا کے دیا تھا۔

شناختی کارڈ کے مندرجات پر نظریں دوڑا کر اس نے کارڈ واپس کیا۔ ''آپ کی یہاں آمد کا مقصد پوچھ سکتا ہوں۔''

''مس پاربتی سے ملاقات کو آیا تھا۔''

ونود نے سوالیہ نظروں سے چوکیدار کو گھورا۔ اس نے بے بسی سے کندھے اچکائے۔ ''سر میں تمام رہائشیوں کے نام نہیں جانتا، البتہ شکل سے پہچانتا ہوں۔''

ونود نے رسمی ندامت ظاہر کی۔ ''زحمت کے لیے شما چاہتا ہوں، لیکن کیا آپ مس پاربتی سے تصدیق کرا سکتے ہیں۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''بالکل کرا سکتا ہوں سر! آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

وہ اپنے ساتھی کو مخاطب ہوا۔ ''تم یہیں رکو۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''سر کیا وجہ جان سکتا ہوں؟'' خوش دلی سے کہتے ہوئے میں پیچھے مڑا۔

میرے اعتماد نے اسے شش و پنج میں ڈال دیا تھا۔ میرے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے وہ نرم لہجے میں بولا۔ ''روزمرہ کی چیکنگ ہے۔''

میں نے مشورہ دیا۔ ''پانچویں منزل پر جانے کو لفٹ کا انتظار بہتر رہے گا۔''

''ہونہہ!'' اس نے ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا۔

لفٹ میں ایک ادھیڑ عمر جوڑا بھی ہمارے ساتھ سوار ہوا جو دوسری منزل پر اتر گئے۔ دروازہ بند ہو کر جونہی لفٹ نے حرکت کی ایک دم میرا ہاتھ جیکٹ کی جیب سے باہر آیا، سائیلنسر لگے گلاک کی نال ونود کی طرف اٹھی تھی۔

وہ زہریلے تبسم سے بولا۔ ''بڑی جلدی ظاہر ہو گئے مہاراج!''

میں اطمینان سے بولا۔ ''ظاہر ہونا پڑتا ہے بالک! البتہ تم تلاشی کی وجہ سے پردہ اٹھا کر جان بچا سکتے ہو۔''

''تمھاری کار کے ماڈل، رنگ اور نمبر کو شوبھا منزل کے دو تین مکینوں نے یاد رکھا۔ آج سہ پہر کو تمھاری کار کو تلاش کر لیا گیا۔ اور تب سے عمارت خفیہ اہلکاروں کے گھیرے میں ہے۔ مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ گرفتاری دے کر جان بچا لو۔''

لفٹ پانچویں منزل پر رک گئی تھی۔ دروازہ کھلنے سے پہلے میں نے اس کے کندھے کے گرد بازو گھما کر پستول کی نال اس کی پسلیوں میں چبھو دی تھی۔ ''اور میرا مشورہ ہے اپنی جان بچانے پر دھیان دو۔''

لفٹ سے باہر دو تین آدمی موجود تھے۔ میں ونود کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے باہر آیا۔ لفٹ کے روانہ ہوتے ہی میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور سرعت سے پستول کی نال سے پکڑتے ہوئے دستہ اس کے سر پر رسید کر دیا۔

''اوغ۔'' کی دردناک کراہ کے ساتھ وہ لمبا پڑ گیا تھا۔ اسے گھسیٹ کر ایک کونے میں ڈالا اور دوڑتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگا۔ ساتھ ہی موبائل نکال کر ڈاکٹر سجاتا کا نمبر ملا دیا تھا۔

اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''آپ کہاں رہ گئے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم پارکنگ سے نکل گئی ہو؟''

وہ فوراً بولی۔ ''چار پانچ منٹ ہو گئے ہیں۔''

میں نے سرعت سے منصوبہ بتایا۔ ''میرا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں پری کو ٹرک میں سوار کرادو۔ میں فی الحال پھنس گیا ہوں، اگر وقت پر پہنچ گیا تو ٹھیک ہے ورنہ ٹرک کو روانہ کر دینا، مجھے راستے کا پتا ہے، اس کے پیچھے پہنچ جاؤں گا۔''

''ہوا کیا ہے؟'' سجاتا نے پریشانی ظاہر کی۔

''تفصیل بتانے کا وقت نہیں ہے ٹی وی پر دیکھ لینا۔'' کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

نچلی منزل پر پہنچتے ہی بجائے دروازے کا رخ کرنے کے میں دائیں طرف مڑ گیا۔ عمارت کی چار دیواری، تین فٹ پختہ اینٹوں کی دیوار اور اس کے اوپر لوہے کی تین تین فٹ لمبی سلاخیں لگی تھی۔ سلاخوں کا عمودی سرا تیر کی انی کی طرح بنایا گیا تھا۔ مگر وہ صرف نمونہ تھا، اصل تیر کی طرح نوک دار ہرگز نہ تھے۔ اس لیے سلاخوں کے اوپر سے گزرنا چنداں دشوار نہ تھا۔ فرار کی سمت کا چناؤ تو وہاں آمد کے ساتھ ہی میں نے کر لیا تھا اور اس متعلق پہلے کئی بار وضاحت کر چکا ہوں بار بار دہرانا اچھا نہیں لگتا۔

سنائپر کے خطرے کا سدباب میں کوشش کے باوجود نہیں کر سکا تھا۔ کیوں کہ اگر ہنومان جی ٹاور ہی کی چھت پر کوئی سنائپر بٹھا دیا جاتا تو وہ چاروں اطراف کا دھیان رکھ سکتا تھا۔

دنود کے بہ قول میں چاروں طرف سے گھیرا جا چکا تھا۔ ایسا جانے ڈرانے کو کہا تھا یا حقیقت یہی تھی یہ چند لمحوں میں پتا چل جانا تھا۔

بھاگتے ہوئے میرے دائیں ہاتھ نے جیکٹ کی جیب میں پستول کے دستے کو جکڑا ہوا تھا۔

ہنومان جی ٹاور جس کالونی میں تھا، اس کے چاروں جانب سڑک موجود تھی۔ پارکنگ عمارت کے شرقی جانب بنی تھی، جہاں سے سمودڑ روش، لنک روڈ تک چلی گئی تھی۔ یہ لنک روڈ ہنومان جی ٹاور کے چاروں اطراف پھیلا تھا، مگر باقی جوانب درمیان میں دوسری عمارتیں موجود تھیں۔ شمالی سڑک جنگلے سے پندرہ بیس گز سے زیادہ دور نہ تھی۔ اور سڑک کے دوسری جانب بھی مکانات موجود تھے۔ شمال ہی کی جانب ہنومان جی ٹاور کے قریب کسی کا چھوٹا سا مکان تھا۔ ایک راستہ ہنومان ٹاور اور اس مکان کے درمیان سے ہو کر مغربی جانب جاتا تھا۔ اس مکان کے بعد غربی جانب چند اور عمارات بھی تھیں۔

جنگلا عبور کرنے کو میں نے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں پر داخلی دروازے سے نظر نہیں ڈالی جا سکتی تھی۔ ارادہ یہی تھا کہ سڑک عبور کر کے شرقی کالونی میں گھسا جائے۔ عمارت سے باہر آتے ہی میں بہ مشکل چند قدم لے پایا تھا کہ اچانک ایک استہزائیہ آواز نے مجھے ٹھٹک کر رکنے پر مجبور کر دیا۔

''ایسی بھی کیا جلدی ہے مہاراج! جل پان، بھوجن، کوئی اور سیوا، آخر ہم آپ ہی کے منتظر تھے۔''

قدم روکتے ہوئے میں گھوما، دو جوان ہاتھوں میں انساس رائفل پکڑے کھڑے تھے۔ (اس رائفل بارے پہلے تفصیل سے بتا چکا ہوں) ایک کی چھوٹی چھوٹی داڑھی اور گھنی مونچھیں تھیں، جبکہ دوسرا کلین شیو تھا۔ کلین شیو عمر میں بڑا لگ رہا تھا۔ کلین شیو کے ہونٹ ہلانے پر اندازہ ہوا کہ پہلے بھی اسی نے بات کی تھی۔

''یقیناً ہاتھ اٹھانے کے فوائد پر بھاشن دینا وقت کا ضیاع ہوگا۔''

ہاتھ اٹھانے کی صورت میں میں نے پھنس جانا تھا۔ ایک فائدہ یہ تھا کہ پستول کا دستہ میرے ہاتھ میں تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ پستول جیب میں ہونے کی وجہ سے سو فیصد درست نشانہ سادھنا مشکل تھا۔ حالات ایسے نہیں تھے کہ سوچوں میں

زیادہ دیر گزاری جاسکتی۔

شطرنج کی بساط پر موجود مہرے کو چلانے کو وقت کی کمی نہیں ہوتی، جواری کو تاش کا پتا پھینکنے کو منہ مانگا وقت میسر ہوتا ہے۔ چوسر کی گوٹ کو حرکت دینے کو تیزی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن عملی زندگی میں موت سر پر دوپہر کے سورج کی طرح منڈلا رہی ہوتی ہے اور فیصلہ سیکنڈ کے دسویں، بیسویں حصے میں کر کے عمل کر گزرنا ہوتا ہے۔ اگر میں اپنی گزشتہ زندگی کا تجزیہ کرنے بیٹھوں تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ مقدر اسی کا ساتھ دیتا ہے جو پہل پن اور کوشش کا دامن نہیں چھوڑتا۔ کامیابی اسی کا نصیب بنتی ہے جس نے ہاتھ پاؤں ہلائے۔ خطرے سے محفوظ رہنے کو خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔ حادثہ ٹالنے کو حادثہ کر گزرنا ہوتا ہے۔ گولی سے بچنے کو گولی چلانا پڑتی ہے۔ مرنا نہیں چاہتے تو مارنا پڑتا ہے۔

گو پستول کے جیب کے اندر ہونے کی وجہ سے درست نشانہ سادھنا مشکل تھا اور گولی کا ہدف سے چوکنا ان کی زندگی کو خطرے میں ڈال سکتا تھا۔ مگر یہ ان کا مسئلہ تھا، میرا مسئلہ جان بچا کر بھاگنا تھا۔ دوران کورس انسٹرکٹر کہا کرتے تھے ''سوچو اور کر دو۔'' میں نے بھی سوچنے کے ساتھ ہی دو مرتبہ لبلبی دبا دی تھی۔

ہمیشہ نشانہ سادھنے کو پستول کی بیرل کو ہدف کی سیدھ میں کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور جیب میں پڑے پستول کی نال کو ہدف سیدھ میں تاننا اندازے ہی سے ہو سکتا تھا۔ اور اندازے کی درستی اتفاق کے مرہون منت ہوا کرتی ہے۔ گو یہ اندازہ بھی ایک سنائپر کا تھا، مگر تھا تو اندازہ..... گولی کلین شیو کی رائفل سے ٹکرانے کے بجائے کندھے پر، جبکہ داڑھی والے کے پیٹ میں لگی تھی۔ کلین شیو کے ہاتھ سے رائفل نیچے گر گئی تھی۔ البتہ داڑھی والا بے ساختہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر نیچے جھکا، لیکن رائفل اس کے ہاتھ میں موجود تھی۔ میں نے پستول جیب سے نکال کر تیسری گولی چلائی، جو رائفل کے فرنٹ ہینڈ گارڈ پر لگی۔ وہ بھی رائفل سے محروم ہو گیا تھا۔

''معذرت کہ ہاتھ اٹھانے کا وقت نہیں ہے۔ تمھاری سیوا میں کر دیتا ہوں اور مشورہ یہ دوں گا کہ میرا پیچھا کرنے کے بجائے اپنی جان بچانا زیادہ ضروری ہوگا۔'' ان کی طنزیہ گفتگو کا خاطر خواہ جواب دیتا ہوا میں مڑ کر بھاگ پڑا۔

سڑک پر چڑھتے ہی، ہنومان جی ٹاور کی جانب سے ایک تیز رفتار کار قریب آتی نظر آئی۔ میں نے بھاگ کر سڑک عبور کی اور دوسری جانب ہلکی سی ڈھلان سے اترا ہی تھا کہ بریکوں کی اونچی چیخ کے ساتھ کار رکی، لگا اب دوڑنا بے کار ہے۔ کیوں کہ میں گولی سے زیادہ تیز رفتار نہیں تھا۔ انساس رائفل کی اچھی خاصی رینج ہے، اگر صرف پستول کا خطرہ ہوتا تو میں رکنے کی کوشش نہ کرتا۔

''پیٹھ پر گولی کھانے کے بجائے مجھے مقابلہ کرنا مناسب لگا۔ ہتھیار میرے ہاتھ میں بھی موجود تھا اور گولی ان سے بہتر طریقے سے چلا سکتا تھا۔

گھومتے ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکلا تھا۔ ممتا دیدی کار سے نکل کر مجھ پر پستول تان چکی تھیں۔

دھمکی آمیز لہجے میں بولیں۔ ''راج بھاگنے کی کوشش کی تو رام قسم گولی چلا دوں گی۔''

میں نے کہا۔ ''پستول میرے پاس بھی ہے۔''

وہ دھاڑیں۔ ''بے غیرت، دیدی کو پستول دکھاتا ہے۔ چلاؤ گولی، روکا کس نے ہے۔''

مگر اتنا تو وہ بھی جانتی تھیں کہ میں صرف دھمکا سکتا تھا ان پر گولی نہیں چلا سکتا تھا۔ جبکہ میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بھارت ماتا کی خاطر گولی چلانے سے کبھی دریغ نہ کرتیں۔

وہ آگے بڑھتے ہوئے با آواز بلند بولیں۔ ''بہتر ہوگا گرفتاری دے دو۔'' ساتھ ہی آنکھ میچتے ہوئے ان کی سرگوشی ابھری۔ ''بدھو! پیچھے نہ ہٹو، مجھے یرغمال بنا کر نکلنے کی کوشش کرو۔ تم گھیرے میں آ چکے ہو۔''

میرے دماغ کو حیرانی کا جھٹکا لگا تھا، شاید وہ مجھے دھوکے سے پکڑنا چاہتی تھیں۔ کیوں کہ مجھ پر گولی چلاتے ہوئے انھیں بھی جھجک ہو رہی تھی۔

''راج، میں کہتی ہوں گرفتاری دے دو ورنہ میں گولی چلانے لگی ہوں۔'' چلا کر کہتے ہوئے وہ تھوڑا نزدیک ہوئیں اور تیز سرگوشی میں بولیں۔ ''عقل گھاس چرنے گئی ہے بدھو۔''

وہ اتنے قریب آ گئی تھیں کہ میری لات کی حدود میں تھیں۔ میں نے ایک دم جسم کو بائیں جھکاتے ہوئے دائیں پاؤں سے ان کے پستول والے ہاتھ کو نشانہ بنایا۔ جھکنے اور لات چلانے میں میں نے سرعت سے کام لیا تھا مگر یہ دھیان ضرور رکھا تھا کہ ان کے ہاتھ پر زور سے چوٹ نہ لگے۔

پاؤں کا ہاتھ سے اتصال ہوتے ہی انھوں نے اس مہارت سے پستول کو دور پھینکا جیسے وہ سچ میں پاؤں لگنے سے دور جا گرا ہو۔ ممتا دیدی کے عقب میں چند مسلح افراد برآمد ہو گئے تھے۔ میں نے ایک دم ممتا دیدی کا بازو پکڑ کر مروڑا اور ان کی پیٹھ کو چھاتی سے لگا لیا۔ ساتھ ہی پستول کی نال ان کنپٹی پر رکھ کر دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

''اگر حرکت کی تو گولی چلا دوں گا۔''

''تم اتنے بے غیرت نکلو گے، ذلیل کمینے..... اپنی دیدی پر گولی چلاؤ گے۔'' وہ مصنوعی غم و غصے سے چلائیں۔ ان کا انداز دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ وہ دھوکا نہیں دے رہی تھیں۔

میں اطمینان سے بولا۔ ''زندگی و موت کی لڑائی میں مخالف کوئی بھی ہو جیت اپنی سلامتی کی کوشش کے حصے میں آتی ہے۔''

وہ تھوڑا سا مچلیں، مگر ان جیسی تربیت یافتہ ایجنٹ کا اناڑی پن سے خود کو چھڑانے کی کوشش کرنا واضح کر رہا تھا کہ وہ میری گرفت سے نہیں نکلنا چاہتی تھیں۔ ''چھوڑ مجھے، میں کہہ رہی ہوں چھوڑو.....'' مگر ان کا بازو مروڑ کر ایک ہاتھ سے بازو پر گرفت جما کر میں نے پستول کی نال ان کی کنپٹی سے لگائی ہوئی تھی۔

''محترمہ زیادہ حرکت کی تو بھیجا اڑا دوں گا، گرفتار ہونے سے پہلے آپ کو انجام تک پہنچا دوں گا۔''

وہ روہانسا ہوتے ہوئے بولیں۔ ''تم جیسے بے غیرت، بھائی کے نام پر دھبہ ہوتے ہیں۔''

''اگر ان کی زندگی چاہتے ہو تو ہتھیار پھینک دو۔'' میں ان کے آدمیوں کو مخاطب ہوا جو میرے سامنے آدھے چاند کی شکل میں رک گئے تھے۔

ایک بولا۔ ''تم گھیرے میں ہو، بہتر ہوگا خود کو ہمارے حوالے کر دو۔''

میں نے کہا۔ ''میرے تین گننے تک اگر تم نے پیچھے نہ ہٹے تو نتیجے کے ذمہ دار خود ہو گے۔ ایک.....''

''وقت ضائع نہ کرو، کار میں بیٹھو بدھو.....'' ممتا دیدی بہ ظاہر غصے میں بڑبڑائیں جیسے مجھے کوس رہی ہوں۔

میں نے فوراً انھیں آگے دھکیلا اور گنتی گننا جاری رکھا۔ ''دو..... تین.....'' وہ الٹے قدم پیچھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ کار چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اگلی نشست کا ڈرائیونگ سائیڈ کے بجائے دوسری جانب کا دروازہ کھول کر میں نے ممتا دیدی کو اندر دھکیلا اور خود بھی اندر ہو گیا۔

''کار چلاؤ۔'' میں زور سے دھاڑا، مگر ممتا دیدی اس سے پہلے ہی ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کھسک گئی تھیں۔ میں دوبارہ دھاڑا۔ ''جلدی کرو ورنہ کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔''

کار پہلے سے سٹارٹ کھڑی تھی، ہنڈ بریک چھوڑ کر انھوں نے کار آگے بڑھا دی۔ ان کے آدمی مڑ کر ہنومان جی ٹاور کی پارکنگ کی طرف بھاگ پڑے، یقیناً اپنی کاروں کی طرف جا رہے تھے۔ ممتا دیدی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے

ہوئے دور جانے لگیں، ایک گلی میں گھستے ہی انھوں نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے میرا کان پکڑا۔

''کیا بکواس کر رہے تھے..... میں محترمہ ہوں۔''

پستول گود میں رکھتے ہوئے میں ندامت سے بولا۔''سوری دیدی، جلدی میں بول دیا۔''

وہ سنجیدہ ہوئیں۔''اب وقت نہیں ہے جلدی جلدی بھارت آمد کا مقصد بھوٹو۔''

میں اپنا مشن مکمل کر چکا تھا، بغیر ہچکچائے بتایا۔''رندھیر شکلا کی نواسی پرما کو اغواء کرنے آیا تھا جو ہمارے بریگیڈئر صاحب کی بیٹی ہے۔ قسم لے لیں دیدی! بھارت سرکار کو نقصان پہنچانے یا کسی راز وغیرہ کی تلاش میں بالکل نہیں آیا تھا۔''

وہ تشویش سے بولیں۔''دیدی کی جان! تمھاری جان کو خطرہ ہے۔ وگنیش شکلا تمھیں اور پرما کو قتل کرانے کو پوری قوت استعمال کر رہا ہے۔ کرن چاولہ بھی اس کا ساتھ دے رہا ہے۔ تمھیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

میں متبسم ہوا۔''آپ کے لیے تو کرن چاولہ، راہی تھا نا۔''

ان کی آنکھوں میں نمی نمودار ہوئی۔''اب نہیں رہا۔ میرے راج کا دشمن میرے کسی جذبے کا امین نہیں ہو سکتا۔''

میں شاکی ہوا۔''دیدی میرا دشمن تو وہ شروع سے ہے۔ تب آپ نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔''

انھوں نے نفی میں سر ہلایا۔''تب اس کی دشمنی بھارت سرکار کے مجرم کے لیے تھی۔ اب کھل گیا ہے کہ تم شکلا کے دشمن تھے۔ اور را کی ذمہ داری دیش کی حفاظت ہے رندھیر شکلا جیسے غلیظ کی حفاظت نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ پولیس کیس ہے تو انھیں سنبھالنے دیا جائے۔ یہی بات میں نے کرن کو سمجھانے کی کوشش کی، مگر اس کی آنکھوں پر وگنیش شکلا نے بیس کروڑ کی دبیز پٹی باندھ دی ہے۔ بہ ظاہر اس نے میری ہاں میں ہاں ملائی اور در پردہ وگنیش سے گٹھ جوڑ کر لیا۔ مگر یہ نہیں جانتا کہ سنیتا جیسوال اتنی گئی گزری نہیں ہے۔ اگر وہ را کا میجر ہے تو سنیتا بھی را کی میجر ہے۔ اور اس سے کم روابط نہیں رکھتی۔ اگر تم شروع دن سے اپنی دیدی پر اعتماد کر لیتے تو کم از کم مجھے اپنے دل پر جبر کر کے اذیت نہ سہنا پڑتی۔ رندھیر شکلا جیسے خبیث کو بچانے کی خاطر میں اپنے راج کو کبھی جلادوں کے حوالے نہ ہونے دیتی۔ اس خبیث نے تو تمھاری دیدی پر بھی گندی نظریں گاڑے رکھیں۔ البتہ میں اتنی گری پڑی نہیں تھی کہ ہاتھ ڈال سکتا۔''

''دیدی آپ دکھی لگ رہی ہیں۔'' نیچے جھک کر میں نے ان کے اسٹیئرنگ پر رکھے ہاتھ کو عقیدت سے بوسا دیا۔

میرا سوال نظر انداز کرتے ہوئے وہ مطلب کی بات پر آئیں۔''میری کار میں ٹریکر لگا ہوا ہے۔ اور وہ کلومیٹر بھر کا فاصلہ رکھ کر ہمارے پیچھے آئیں گے۔ دوسرا ٹریکر تمھارے کوٹ کے عقب میں چمٹا ہے۔ اس لیے میری کار سے اترنے کے بعد بھی تم ان کی نظر میں رہو گے۔ وہ بس اس انتظار میں ہیں کہ تم پرما تک ان کی رہنمائی کرو تا کہ وہ ایک ساتھ دونوں کو انجام تک پہنچا دیں۔''

میں حیرانی سے ہکلایا۔''مم..... میرے کوٹ میں ٹریکر.....''

وہ اطمینان سے بولیں۔''وہ کرن کی چال تھی اور یہ تمھاری دیدی کی تجویز ہے۔ میں بہ ظاہر تمھیں پکڑنے پر زور دے رہی تھی۔ مگر اصل مقصد تمھیں بھگانا تھا۔ اگر ویسے ہی جانے دیتی تو خطرے سے آگاہ کیسے کرتی۔ اور تمھارے دوست نادر خان عرف نجو کی تلاش بھی جاری ہے۔ کرن اپنے تئیں میری بے خبری میں منصوبے بنا رہا ہے، لیکن سنیتا اتنی بھی گئی گزری نہیں کہ اس کے منصوبوں سے لاعلم رہے۔''

میں تاسف سے بولا۔ ''وہ بے چارہ پہلے ہی منوج جوشی جیسے اسمگلر سے بھاگا پھر رہا ہے اب نئی مصیبت اس کے گلے پڑ رہی ہے۔''

''نئی نہیں پرانی مصیبت ہی ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ منوج جوشی کی حیثیت ہاتھی کے ان دانتوں کی سی ہے جو سب کی نظر میں رہتے ہیں۔ اصل کرتا دھرتا وگنیش شکلا ہے۔''

میں فکرمندی سے بولا۔ ''اب کیا کروں۔'' ایک دم لگا کہ میں شدید خطروں میں گھرا ہوں۔ اگر ممتا دیدی اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر درمیان میں نہ آئی ہوتیں تو کرن چاولہ کا پرما اور مجھے ڈھونڈنا ذرا بھی مشکل نہ ہوتا۔ گو خطرہ اب بھی موجود تھا۔ کیوں کہ نجو کے کرن کے ہاتھ میں آتے ہی پرما کے ٹرک تک رسائی مشکل نہ رہتی۔ اب مجھے جلد از جلد ٹرک تک پہنچ کر پرما کو قبضے میں لینا تھا۔

''مجھے بے ہوش کر کے نکلنے کی کرو۔ لباس تبدیل کرنے کے بہانے کوٹ اتار دینا۔ اور سوری کہ تمھیں انڈیا سے نکلنے میں مدد نہیں دے سکتی۔ کرن مجھ پر شک کر رہا ہے اور میری سرگرمیوں پر نظر رکھتا ہے۔ اسے بھول گیا ہے کہ ایس ایس کی گولی سے اسے کس نے بچایا تھا۔''

میں محجوب ہوا۔ ''اسے قتل کرنے کا ارادہ نہیں تھا دیدی! بھارت سرکار کے کسی بھی شہری اور سرکاری ملازم کو نقصان پہنچانا نہ تو میرا مطمح نظر ہے اور نہ میرے ملک کا قانون اس کی اجازت دیتا ہے۔ یہاں پر میں دفاعی جنگ لڑا ہوں اور حتی الوسع کوشش کی ہے کہ کسی کی جان نہ لوں۔''

انھوں نے حقیقت اگلی۔ ''جان نہ لیتے ناکارہ تو کر دیتے۔ سنائپر کی گولی تو بعض اوقات ہمیشہ کی معذوری مقدر کر جاتی ہے۔ اور رہی تمھاری اتفاقی جنگ کا بہانہ تو بدھو، رندھیر شکلا کو کس نے گولی ماری تھی۔''

''وہ لورا براؤن کی دشمنی بھینٹ چڑھا، کیوں کہ اس نے لورا کے ساتھ زبردستی کی۔ اور اسے بلیک میل کر کے ہتھیار ہتھیانے کی کوشش کی۔ اور آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اسلحے کے گودام میں جو دھماکا ہوا تھا وہ رندھیر شکلا نے خود کروایا تھا تاکہ اپنی نالائقی پر پردا ڈال سکے۔''

انھوں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''میں سمجھی نہیں۔''

میں نے اجمالاً پرما کے اغواء کے بعد لورا براؤن کا مطالبہ اور ایس آر ون کی خریداری کا واقعہ دہرا دیا۔

''ہونہہ!'' انھوں نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔ ''ایسا پہلی مرتبہ نہیں ہوا۔ را کا چیف بھی اس کے سامنے بے بس تھا۔ بہ ہرحال، اب میرے سر میں پستول کا دستہ مار کر بھاگنے کی کرو۔ اور اپنا بہت زیادہ خیال رکھنا۔'' یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ کر وہ شفقت سے سہلانے لگیں۔

میں نے کہا ''اپنا موبائل فون نمبر بتائیں۔''

انھوں نے اپنا موبائل نمبر بتا دیا۔ میں نے کہا۔ ''پرما کو کسی مقصد سے اغواء کر رہا ہوں اس بارے کسی کو کچھ نہ بتانا۔''

''بے فکر رہو۔'' انھوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں اگلی ہدایت دی۔ ''ہمارے عقب میں ایک موٹر سائیکل کی بتی نظر آ رہی ہے۔ اسے روکیں۔''

ممتا دیدی نے کار کی رفتار مدھم کرتے ہوئے ہاتھ لہرانا شروع کر دیا۔ ان کے کار روکنے تک موٹر سائیکل سوار بھی رک گیا تھا۔ ممتا دیدی بولیں۔

''میں تمھیں روکنے کا ڈراما جاری رکھوں گی۔ تم ایک دم پستول کا دستہ میرے سر میں مار کر نکل جانا۔''

میں ہنسا۔ ''اپنی دیدی کو تکلیف پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ کو بے ہوش کرنے کا طریقہ میرے پاس

ہے۔'' یہ کہہ کر میں پستول تھامے نیچے اترا۔ موٹر سائیکل سوار کو اندازہ نہیں تھا کہ اسے کیوں روکا گیا ہے۔

ممتا دیدی چلائیں۔ ''راج، ایسا نہ کرو گرفتاری دے دو..... دیکھو میں تمھیں کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ میں وچن دیتی ہوں.....''

بیگ سے بے ہوشی کا اسپرے نکال کر میں دیدی کے قریب ہوا جو مسلسل مجھے رکنے کی ترغیب دے رہی تھیں۔

''سوری دیدی، آپ کے مشورے قابل قبول نہیں۔ اپنا بہت خیال کرنا۔'' یہ کہتے ہی میں نے بے ہوشی کا سپرے ان کے چہرے پر کیا۔ انھوں نے اسٹیئرنگ ویل پر سر ٹیک دیا تھا۔

مجھے پستول بدست دیکھ کر موٹر سوار گھگیایا۔ ''پپ..... پلیز میں بہت غریب آدمی ہوں۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔''

''مجھے بس تمھارا موٹر سائیکل اور گرم جیکٹ چاہیے۔''

''بب..... بھگوان کے لیے دیا کرو، بڑی مشکل سے پائی پائی جمع کر کے موٹر سائیکل خریدا ہے۔'' وہ رونے پر تیار ہو گیا تھا۔

''کتنے کا خریدا ہے؟''

وہ ہکلایا۔ ''سس..... ستّر ہزار۔''

میں نے سو سو ڈالر کے بیس نوٹ اس کی جانب بڑھائے۔ ''یہ دو ہزار ڈالر ہیں۔ امید ہے ان سے دو موٹر سائیکل خرید سکو گے۔ اور اب وقت ضائع نہ کرو جلدی کرو۔''

مجھے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے وہ ہکلایا۔ ''جج..... جی.....''

''جلدی کرو۔'' میں دھاڑا۔

''جی جی جی۔'' نوٹ پکڑتے ہوئے اس نے سرعت سے کوٹ اتار کر میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے اپنا کوٹ اتار کر موٹر سائیکل کے ہینڈل پر رکھا۔ اس کا کوٹ پہن کر ہیلمٹ سر پر رکھا اور اسے ہدایت دیتا ہوا بولا۔

''جوان یہ پولیس کی بڑی آفیسر ہے۔ اور تمھارے لیے یہاں سے بھاگ جانا زیادہ مفید رہے گا۔ فی الحال موٹر سائیکل چھننے کا ذکر بھول کر بھی کسی سے نہ کرنا ورنہ تفتیش کرنے والے تمھیں ان دو ہزار ڈالر سے محروم کر دیں گے۔ صبح موٹر سائیکل چھیننے کی رپورٹ تھانے میں جا کر کرا دینا، لیکن ان پیسوں کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔''

یہ کہتے ہی میں نے کک لگا کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کیا اور گیئر تبدیل کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

پہلے ممتا دیدی کی کار کا ٹریکر اور میرے کوٹ کا ٹریکر اکٹھے تھے۔ اب ان کی کار کا ٹریکر ایک جگہ رک گیا تھا جبکہ میرے کوٹ پر چپکا ٹریکر حرکت میں تھا۔ بلاشبہ تعاقب کرنے والوں کو معلوم ہو جانا تھا کہ میں کار سے نکل گیا تھا۔ انھوں نے ممتا دیدی تک پہنچنے میں دو تین منٹ سے زیادہ نہیں لگانے تھے۔

میں پوری رفتار سے موٹر سائیکل کو دوڑائے جا رہا تھا۔ سرد ہوا میرا امتحان لے رہی تھی۔ کار میں ہیٹر آن تھا اور ایک دم ہوا کا سامنا کرنا کافی دشوار لگ رہا تھا۔ لڑکے کی جیکٹ گرم تھی لیکن موٹر سائیکل پر بیٹھ کر تیز ہوا کا سامنا کرتے ہوئے وہ جیکٹ اپنی ذمہ داری نبھانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔

فرلانگ بھر جاتے ہی ایک لنک روڈ بائیں مڑتا نظر آیا۔ مجھ سے تین چار گز آگے جانے والے ٹرک نے بایاں انڈیکیٹر جلا کر مڑنے کا عندیہ دیا۔ ٹرک کی باڈی خالی نظر آ رہی تھی۔ رفتار مزید بڑھا کر میں اس کے بالکل قریب پہنچا اور اپنا

کوٹ اس کی باڈی میں اچھال دیا۔تعاقب کرنے والوں کو میں نے نیا ہدف دے دیا تھا۔

میں اس وقت ایسٹرن ایکسپریس ہائی وے پر محوِ سفر تھا جو آگے جا کر ممبئی، آگرہ روڈ سے مل جاتی ہے۔اگر ممبئی کو نقشے پر دیکھا جائے تو تقریباً ایسی چوکور کی شکل میں نظر آئے گا جس کے شرقی و غربی اضلاع طویل ہیں۔شمال کی سمت ان دو اضلاع کی نسبت کم طویل ہے اور جنوب کی سمت بالکل چھوٹی رہ جاتی ہے۔اتنی کم کہ شہر کو ایک بے ڈھنگی مثلث سمجھا جا سکتا ہے۔ ایسٹرن ایکسپریس ہائی وے جو شہر کے مغرب کی جانب جا کر ویسٹرن ایکسپریس ہائی پکاری جاتی ہے۔اس سڑک نے شہر کو چاروں اطراف سے گھیرا ہوا ہے۔ممبئی کو باقی انڈیا سے ملانے کو دو بڑی سڑکیں نکل رہی ہیں۔ایک ''ممبئی آگرہ نیشنل ہائی وے'' اور دوسری ممبئی دہلی ہائی وے ہے۔آگے جا کر ان سڑکوں سے اور کئی سڑکیں نکل کر مختلف شہروں کو جاتی ہیں۔تجو نے مجھے ممبئی آگرہ نیشنل ہائی وے کا بتایا تھا۔جبکہ میں اسے پیچھے چھوڑ کر آگے آگرہ روڈ کی طرف بڑھ گیا تھا۔آگرہ روڈ اور آگرہ نیشنل ہائی وے، ممبئی سے نکلنے والی دو علیحدہ سڑکیں ہیں جو بیس پچیس کلومیٹر آگے جا کر مل جاتی ہیں۔اور اس سے آگے یہ ممبئی آگرہ نیشنل ہائی وے کہلاتی ہے۔

ایسٹرن ایکسپریس ہائی وے سے میں آگرہ روڈ پر چڑھ گیا۔موڑ کاٹتے ہوئے دائیں ہاتھ بڑے پلازے نظر آئے۔میں سڑک سے اتر کر ''لیک سٹی مال'' میں گھس گیا۔چند لمحوں ہی میں بڑا اوورکوٹ، گرم دستانے، مفلر، کنٹوپ وغیرہ خرید کر دوبارہ چل پڑا تھا۔

مجھے جلد از جلد ٹرک تک پہنچنا تھا۔ٹرک کو نکلے کافی دیر گزر گئی تھی۔میں نے تجو کا نمبر ملا کر موبائل فون ہیلمٹ کے اندر اڑس لیا۔

کال وصول کرتے ہی اس کی بکواس شروع ہو گئی۔''ہیلو باس! یقیناً سفر اچھا گزر رہا ہوگا۔دیکھ لو کیسے صوفے جوڑ کر لیٹنے کی جگہ تیار کی ہے، سارے راستے راجکماری کے پہلو میں لیٹنے کا موقع ملے گا۔اب تو تجو کی تعریف کر دو، ایسی رومانوی جگہ بنانے کا انعام مس بھوری کا موبائل فون نمبر تو بنتا ہے.....''

اس کی بکواس نہ رکتے دیکھ کر مجھے قطع کلامی کرنا پڑی۔''سنو احمق آدمی، کرن چاولہ کے آدمی تمھاری تلاش میں نکلے ہوئے ہیں، بہتر ہوگا چند دنوں کے لیے چھپ جاؤ۔''

''ب.....باس آپ کا میرا، غالباً ایسا مذاق تو نہیں ہے۔''

''یہ سچ ہے۔اور یہ بتاؤ تمھارا موبائل فون کنکشن اپنے نام پر ہے۔''

''نہیں باس، ایسی غلطی نہیں کیا کرتا۔''

''رابطہ ختم ہوتے ہی موبائل فون سے چھٹکارا حاصل کرو۔''

''کوئی اور حکم باس۔'' وہ پریشان نظر آ رہا تھا۔

میں نے ہدایت دی ''اگر پکڑے جاؤ تو وشواس سنگھ کا ذکر بھولے سے بھی نہ کرنا۔البتہ میرے بارے کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہیں۔پرما کو پہچاننے سے انکار کر دینا۔اس کے بجائے کہنا کہ تم لورا براؤن کو میری ساتھی لڑکی سمجھ رہے تھے۔''

وہ مرے مرے لہجے میں بولا۔''ٹھیک ہے باس! اور جنازے میں شامل ہونے کی پوری کوشش کرنا۔کہیں یہ نہ ہو کہ.....

ع مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے۔

کے مصداق جنازے ہی میں شامل نہ ہو پاؤ۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''دعا ہی کر سکتا ہوں دوست کہ تمھاری آتما کو شانتی ملے۔'' اور اس کا جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کیا اور سجاتا کا نمبر ملانے لگا۔ اس نے پہلی ہی گھنٹی پر کال اٹھالی تھی۔

تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''ہیلو، آپ ٹھیک تو ہیں؟''

''الحمدللہ ٹھیک ہوں۔ اور سناؤ پرما کو تو بٹھا دیا تھا۔''

اس نے اقرار کیا۔ ''ہاں اسے سوار کرا کے لوٹی ہوں۔ کافی پریشان تھی، میں نے تسلی دی کہ بے فکر رہو راجا پہنچ جائے گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''ٹرک ڈرائیور سے بات ہوئی تھی؟''

''جی اسے بھی سمجھا دیا تھا کہ آپ راستے میں بیٹھ جائیں گے۔''

''ٹرک پر ترپال وغیرہ بندھا تھا۔''

ڈاکٹر نے واضح نشانی بتائی۔ ''تیز آتشی رنگ کا ترپال، ٹرک کی پوری باڈی کو ڈھانپے ہوئے تھا۔''

مطلب کی بات معلوم کر کے میں اسے سمجھانے لگا۔ ''اب اپنے فلیٹ سے ہمارے رہنے کے سارے نشانات مٹا دینا۔ اور کسی کے سامنے بھولے سے بھی پرما یا میرا ذکر نہ کرنا۔ سگے بھائی کو بھی اعتماد میں لینے کی ضرورت نہیں۔ سمجھیں جیسے ہم آپ کی زندگی میں آئے ہی نہیں تھے۔''

وہ ہنسی۔ ''میری فکر چھوڑو، اپنا خیال رکھنا۔''

اور میں نے رسمی کلمات کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کے بعد ایک دو بار ٹرک ڈرائیور کا نمبر ڈائل کیا مگر اس نے کال نہیں اٹھائی تھی۔

میرے دشمن یقیناً اس ٹرک کے پیچھے لگے تھے، جس میں میں نے کوٹ پھینکا تھا۔ پہلے ایک دو ناکوں کو میں نے سڑک سے اتر کر گلیوں سے گزرتے ہوئے بائی پاس کیا تھا، لیکن دریائے الہاس کے پل پر لگے ناکے سے گزرنا مجبوری تھی۔ البتہ خیریت گزری کہ مجھے زیادہ توجہ کے قابل نہیں سمجھا گیا تھا۔ کیوں کہ ایک تو اکیلا تھا۔ دوسرا موٹر سائیکل پر تھا۔

پولیس کے ہمراہ کچھ منحوس صورتیں بھی نظر آئی تھیں۔ دریائے الہاس کا پل عبور کر کے میں ٹول پلازا سے گزرا۔ بھیڑ اتنی زیادہ نہیں تھی۔ ایک بوتھ کے پاس رک کر نوجوان لڑکے کے سامنے میں نے مطلوبہ ٹرک کا نمبر لکھ کر رکھا۔ ''کیا آپ بتا سکتے ہیں اس نمبر کا ٹرک کس وقت یہاں سے گزرا ہے۔''

اس نے جان چھڑانا چاہی۔ ''پتا نہیں بھائی، میں تھوڑی دیر پہلے ہی ڈیوٹی پر آیا ہوں۔''

''یار، ساتھ والے سے پوچھ لیں شاید اسے معلوم ہو۔'' اس بار میرے ہاتھ میں پانسو کا نوٹ بھی موجود تھا۔

''آپ لوگ بھی نہ بس پیچھے پڑ جاتے ہیں۔'' نوٹ جھپٹتے ہوئے اس نے کمپیوٹر کی بورڈ پر چند انگلیاں ماریں۔ ''اس نمبر کی گاڑی یہاں سے نہیں گزری۔''

میں پریشان ہو کر بولا۔ ''یہ ممبئی آگرہ نیشنل ہائی وے ہے نا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ آگرہ روڈ ہے۔''

میں تشویش سے بولا۔ ''تو مجھے پیچھے مڑنا پڑے گا۔''

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے تسلی دی۔ ''قریباً اٹھارہ انیس کلومیٹر آگے جا کر یہ ممبئی آگرہ نیشنل ہائی وے سے مل جائے گا۔''

میں ''شکریہ۔'' کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ تھوڑا فاصلہ طے کر کے میں نے ایک پٹرول پمپ سے موٹر سائیکل کی ٹینکی

بھر وائی اور چل پڑا۔ سردی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ لیکن گرم لباس نے کافی بچت کر لی تھی۔ بمبئی کی آبادی کافی دور دور تک پھیلی ہے۔ مضافاتی گاؤں بھی اب شہر کا حصہ ہی لگتے ہیں۔ درمیان میں خالی جگہ ہی نہیں ہے۔ کہ شہر اور گاؤں کی آبادی میں تمیز کی جا سکے۔ دو مضافاتی شہر، نوی ممبی اور تھانے تو اب ممبئی میں ضم ہو چکے ہیں اور ان کی علیحدہ علیحدہ پہچان ہی ممکن نہیں رہی۔

دریائے الہاس کا پل عبور کرنے کے بعد ٹریفک کافی کم ہو گئی تھی۔ میں نے رفتار اتنی بڑھا لی کہ جتنا تیز موٹر سائیکل کو چلا سکتا تھا۔ ٹرک ڈرائیور کا کال نہ اٹھانا مجھے زیادہ پریشان کر رہا تھا۔ دو مردوں کے درمیان اکیلی لڑکی کا ہونا کسی انہونی کا باعث بھی بن سکتا تھا۔ مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ میں ڈاکٹر سجاتا ہی کو کہتا کہ وہ ٹرک کے پیچھے پیچھے اپنی کار لے کر چلتی رہے اور جونھی میں ایجنسی سے جان چھڑا لیتا، سجاتا سے رابطہ کرتا۔ اور میرے پہنچنے پر ہم ایک ساتھ ٹرک میں سوار ہو جاتے۔ مگر بعض اوقات تیزی میں درستی بھول جاتی ہے۔ تب میں خود پھنسا ہوا تھا اور بروقت یہی سوجھا کہ پرما نکل جائے تو مجھے اکیلے ممبئی سے نکلنے میں کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔

کبھی ڈرائیور سے اس جرأت کی توقع عبث نظر آتی کہ وہ پرما پر ہاتھ ڈالے گا۔ کیوں کہ وہ کمپنی کا ٹرک تھا۔ اور پرما کی حیثیت ایک سواری جیسی تھی۔ وہ پرما کی اصلیت سے واقف تھا یا نہیں، اسے امیر لڑکی سمجھتا تھا یا مفلس، یہ بحث بے فائدہ تھی۔ مختصر یہی کہ انھیں پرما کو چھیڑنے کی صورت جواب دینا پڑ جاتا۔ اور جب انسان کے دل میں اندیشہ چھپا ہو تو وہ گناہ پر جری نہیں ہوتا۔

ایک اور پریشان کن سوچ نے میرے تجزیے کی نفی کی۔ ''مگر اکیلی خوب صورت لڑکی پر گنوار ڈرائیور اور اس کے ساتھی کا رال ٹپکانا بھی بعید از قیاس نہیں ہے۔ عورت کا حسن و شباب جب دماغ پر سوار ہو جائے تو مرد عموماً برے بھلے کی تمیز نہیں کر سکتے۔ اگر کچھ ایسا ہو جاتا تو میں ساری زندگی انصاری صاحب یا پرما کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ کیوں کہ ٹرک کا انتظام میری صواب دید پر ہوا تھا۔ پرما میری ضمانت پر ٹرک میں اکیلے سوار ہونے پر راضی ہوئی تھی اور اسے پیش آنے والے کسی بھی حادثے کی جواب داری میرے کھاتے میں جانا تھی۔

موٹر سائیکل تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی اور اس سے زیادہ تیز رفتاری سے میری سوچیں محو پرواز تھیں۔ دماغ جب متضاد خیالات کی آماجگاہ بن جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

موبائل فون پر کسی کی کال آنے لگی۔ موبائل فون اگر ''وائبریشن'' پر نہ لگا ہوتا تو مجھے گھنٹی نہ سنائی دی ہوتی۔ رفتار کم کرتے ہوئے میں نے موبائل فون جیب سے نکالا، اسکرین پر جگن ناتھ ٹرک ڈرائیور لکھا دیکھ کر اطمینان بھری لہر میرے جسم میں دوڑ گئی تھی۔

''مہاراج، آپ کہاں ہیں۔''

''مجھے چھوڑو، اپنا بتاؤ کہ کہاں ہو اور کال کیوں نہیں اٹھا رہے تھے۔''

اس نے کہا۔ ''میں اٹ گاؤں ریلوے اسٹیشن سے تین چار کلومیٹر آگے ہوٹل ڈھابے پر رکا ہوا ہوں۔ اور معذرت آپ کی گھنٹی نہیں سن سکا تھا۔''

''پیچھے شاہ پور گاؤں کا سائن بورڈ پڑھا ہے۔ اب کسی سے معلوم کر کے بتاتا ہوں کہاں پہنچ گیا ہوں۔'' اتنی دیر میں میں ایک ہوٹل کے قریب پہنچ گیا تھا، فوراً پوچھا۔ ''یہ ہوٹل راج کرن ہے۔ نام سنا ہوا ہے؟''

''قریب ہی آ گئے ہو، ہم نو دس کلومیٹر آگے ہوں گے۔ اور ایک چھوٹا سا مسئلہ بھی بن گیا ہے۔''

میں نے بے صبری ظاہر کی۔ ''کیا ہوا؟..... لڑکی تو ٹھیک ہے نا۔''

وہ جلدی سے بولا۔ ''جی مہاراج وہ بالکل ٹھیک ہے، ہمارا اپنا مسئلہ ہے۔ یہاں آجائیں میں سمجھاتا ہوں۔ ہوٹل مڈوے سڑک کے بائیں یعنی غربی جانب واقع ہے۔''

رابطہ منقطع کر کے میں نے دوبارہ رفتار بڑھادی۔ نو دس کلومیٹر کا فاصلہ دس بارہ منٹ میں طے ہو گیا تھا۔ اٹ گاؤں ریلوے اسٹیشن سے گزر کر میں سڑک کے بائیں جانب متوجہ ہو گیا۔ ریلوے اسٹیشن سڑک کے ساتھ ساتھ ہی جا رہی تھی۔ جلد ہی ہوٹل مڈوے کا بورڈ نظر آ گیا۔ وہاں چند کاریں اور تین ٹرک کھڑے تھے۔ گہرے آتشی رنگ کا ترپال مجھے دور ہی سے نظر آ گیا تھا۔ ٹرک کے قریب میں نے موٹر سائیکل روکی۔ ایک دم سکون سا محسوس ہوا تھا۔ سردیوں میں موٹر سائیکل کی سواری بلائے جان ہی ہے۔ سڑک کی جانب دو اور آدمی گرم چادریں اوڑھے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ یوں لگا جیسے پارکنگ کی نگرانی کر رہے ہوں۔ ایک آدمی ٹرک کے ساتھ کھڑا تھا۔ مجھے لگا شاید وہ ڈرائیور یا اس کا مددگار ہے۔ بولنے میں پہل اسی نے کی تھی۔

''انوپ مشرا.....؟'' میرا نام پکارتے ہوئے اس نے تصدیق چاہی۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''لڑکی کہاں ہے؟''

اس نے ٹرک کی طرف اشارہ کیا۔ ''اندر ہی ہے۔''

''مسئلہ کیا ہے؟'' میں نے ہوٹل کی طرف قدم بڑھانے سے گریز کیا تھا۔

اس نے تیز لہجے میں تفصیل بتائی جس کا لب لباب یہی تھا کہ، ہوٹل کے مالک کا پانڈے گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کے مالک بھوشن پانڈے کے ساتھ رقم کا کوئی تنازعہ تھا۔ اور جب تک پانڈے ہوٹل کے مالک سے بات کر کے مسئلہ حل نہیں کراتا وہ ٹرک کو آگے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اپنے دو آدمی اس نے ٹرک روکنے ہی کو بٹھائے ہوئے تھے۔

میں مستفسر ہوا۔ ''اس مسئلے میں میں کیا کر سکتا ہوں۔''

وہ صاف گوئی سے بولا۔ ''اگر آپ کو جلدی ہے تو ہوٹل کے مالک یا پانڈے جی سے آپ کو خود بات کرنا ہوگی۔ استاد جگن نے تو چادر اوڑھ کر چارپائی سنبھال لی ہے۔''

میں ایسا کچھ ضرور کرتا اگر میرا ٹرک پر مزید سفر کرنے کا ارادہ ہوتا۔ کرن چاولہ سے کچھ بعید نہ تھا کہ کب مجھ کو گردن دبوچ لیتا۔ اور اس کے بعد اس ٹرک کو تلاشنا ذرا بھی مشکل نہ ہوتا۔ ڈرائیور کا نمبر لے کر فوراً سے پہلے اس کی جگہ کے بارے معلوم ہو جاتا۔

میں بے پروائی سے بولا۔ ''ذرا سی زحمت کر کے لڑکی کو نیچے اتارو اور اپنے مسائل خود حل کرو۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے حیرانی ظاہر کی۔

میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''جناب میرے پاس پانڈے جی کے معاملات کو دیکھنے کا وقت نہیں ہے تو بہتر ہوگا میں کوئی اور ذریعہ ڈھونڈوں۔''

اس نے خوشگوار حیرانی سے پوچھا۔ ''یعنی آپ لڑکی کو ساتھ لے جا رہے ہیں۔ اور آپ ٹرک پر سفر نہیں کریں گے۔''

''ارادہ تو یہی ہے۔ اب مہربانی کریں۔'' میں نے ٹرک کی طرف اشارہ کیا۔

بے نیازی سے کندھے اچکاتا ہوا وہ ڈرائیور کیبن کے ساتھ جڑی لوہے کی سیڑھی پر پاؤں رکھتا ہوا اوپر چڑھا۔ اور ایک کونے سے ترپال ہٹا کر اس نے پھلجڑی چھوڑی۔ ''بی بی! نیچے آجاؤ تمھارے شوہر آ گئے ہیں۔''

''دماغ تو خراب نہیں ہے، کون شوہر۔'' پرما کی تیکھی آواز سن کر میرے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

وہ بیزاری سے بولا۔ ''بی بی، مجھے کیا پتا شوہر ہے یا کچھ اور ہے، لیکن تمہارا ہی کچھ لگتا تمہیں نیچے بلا رہا ہے۔''

''بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے۔'' وہ پھنکارتے ہوئے باہر آنے لگی۔

''اب مجھے کیا پتا، شوہر کے ساتھ جا رہی ہو یا کسی یار کے ہمراہ بھاگ رہی ہو۔'' گنوار کنڈیکٹر نے پرما کے غصے کا بھرپور جواب دیا تھا۔ یقیناً کسی لڑکی کو ایسا جواب دینا نامناسب ہی نہیں بے ہودہ بھی تھا۔ میں پہلے ان کی نوک جھونک سے محظوظ ہو رہا تھا، کنڈیکٹر کا بدتمیزی بھرا فقرہ سنتے ہی مجھے طیش آ گیا تھا۔

اس کے نیچے اترتے ہی میں نے آگے بڑھ کر غصے سے پوچھا۔ ''تمہیں لڑکیوں سے بات کرنے کا طریقہ کسی نے نہیں سکھایا۔''

وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تو لڑکیوں سے بات کرنے کا طریقہ تم سے سیکھنا پڑے گا۔''

میرا ہاتھ پوری قوت سے گھوما۔ ''چٹاخ'' کی آواز سے ماحول گونج اٹھا تھا۔ پتا نہیں میرے تھپڑ میں کون سی قوت در آئی تھی کہ اچھا خاصا صحت مند ہونے کے باوجود وہ ٹرک کی باڈی سے جا ٹکرایا تھا۔

ساتھ ہی میری اطمینان بھری آواز ابھری۔ ''جواب ہے ہاں۔''

''تیری تو.....'' منہ سے مغلظات اگلتا ہوا وہ قریب ہوا۔ اور پھر اسے معلوم ہی نہ ہوا کہ کیسے دوبارہ اڑتا ہوا ٹرک کی باڈی سے جا ٹکرایا، منہ سے زوردار ''اوغ'' نکالتے ہوئے وہ لمبا ہو گیا تھا۔

دو قدم لے کر میں قریب ہوا اور گریبان سے پکڑ کر اسے ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا لیا۔ ساتھ ہی میرا دایاں ہاتھ گلاک کو لیے جیب سے نمودار ہوا۔ سائیلنسر جڑی نال اس کے ماتھے میں چبھوتے ہوئے میں پھنکارا۔ ''اب بتاؤ، اپنی دیدی سے کس لہجے میں بات کر رہے تھے؟''

''ششش..... شما چاہتا ہوں مہاراج.....'' اس کی ٹانگیں تھرتھرانے لگیں تھیں۔

''وہ اپنی دیدی سے مانگو۔'' اسے جھٹکا دے کر میں نے پرما کی طرف دھکیلا جو سیڑھی کے سہارے احتیاط سے نیچے اتر آئی تھی۔ ''بولو، دیدی معاف کر دو۔''

وہ گڑگڑایا۔ ''مم..... مادام غلطی ہو گئی معاف کر دیں۔''

میں پستول لہراتے ہوئے دھاڑا۔ ''دیدی بولو۔''

اس نے فوراً میرے الفاظ دہرائے۔ ''دیدی معاف کر دو۔''

پرما کے چہرے پر تبسم نمودار ہوا۔ یقیناً اس کی بے ہودگی پر وہ سخت تپی ہوئی تھی۔ لیکن جو درگت میں اس کی بنا چکا تھا اس کے بعد شکوہ باقی نہیں بچتا تھا۔

''اتنی دیر کیوں کر دی۔'' اسے نظر انداز کرتے ہوئے وہ مجھے مخاطب ہوئی۔

''لمبی کہانی ہے اطمینان سے بتاؤں گا۔''

وہ مستفسر ہوئی۔ ''تو کیا کرنا ہے؟''

اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے میں کنڈیکٹر کو مخاطب ہوا۔ ''تمہیں شرم و حیا آنا چاہیے۔ یہ تمہاری بیٹی نہیں تو چھوٹی بہن کی ہم عمر ہو گی۔ یہ جانے بغیر کہ بے چاری کو کیوں چھپ کر سفر کرنا پڑ رہا ہے تم اپنے دماغ کی غلاظت اگلنے لگے۔ ہمیں پٹنہ پہنچانے کی ذمہ داری تم لوگوں کی تھی اور اس کا معاوضہ وصول کر چکے ہو۔ پانڈے کے جھگڑوں سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ لیکن تمہاری مجبوری جانتے ہوئے ہم خاموشی سے اپنی راہ لے رہے ہیں اور تم یہ رویہ دکھا رہے ہو۔''

وہ شرافت کا مظاہرہ کرتا ہوا بولا۔ ''مہاراج شما کردیں..... سالا دماغ سٹک گیا تھا، ہوٹل کے مالک کا غصہ بچی پر اتار دیا۔''

''اب بھاگنے کی کرو۔'' میں نے اسے غائب ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ تیز قدموں سے ہوٹل کی جانب بڑھ گیا تھا۔ ٹرک پر نظر رکھنے والے دونوں محافظ شور سن کر قریب آ گئے تھے۔ لیکن صلح صفائی کی نوبت نہیں آئی تھی اس لیے دور کھڑے دیکھتے رہے۔

''ہمیں چلنا ہوگا۔'' میں موٹر سائیکل کی طرف بڑھا۔

وہ شدومد سے بولی۔ ''ٹرک ہی ٹھیک تھا، قسم سے بڑے مزے کی نیند آ رہی تھی۔ آرام دہ صوفوں پر لیٹے ہوئے لگ رہا تھا فرسٹ کلاس کی برتھ پر لیٹے ہیں۔''

''جو میں کہا کروں اس پر دھیان دیا کرو۔ فی الحال مشورے اور تجاویز اپنے پاس رکھو۔'' موٹر سائیکل کے قریب پہنچ کر میں ہیلمٹ سر پر رکھنے لگا۔

اس نے حیرانی سے آنکھیں پھیلائیں۔ ''اس پر سفر کریں گے؟''

میں طنزیہ انداز میں بولا۔ ''آپ کے پاس کوئی اور سواری ہے تو بالکل نہیں۔''

پاؤں پٹختے ہوئے اس نے ٹرک کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ ٹھیک تھا نا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایسا بس آپ سمجھتی ہیں۔''

اس نے منہ بسورا۔ ''ہم آج تک موٹر سائیکل پر نہیں بیٹھے۔''

میں مزاحیہ انداز میں بولا۔ ''بہت آسان ہے، ایک ٹانگ دائیں، دوسری بائیں کر کے اپنے پاؤں پائیدانوں پر رکھ لینے ہیں۔ ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر سہارا لے لینا ہے اور باقی میرا کام ہے۔''

اس نے آنکھیں نکالیں۔ ''اگر یہ مذاق ہے تو بہت بے ہودہ ہے۔ ہم راجکماری ہیں اس پھٹ پھٹی پر بیٹھیں گے۔''

دونوں محافظ ہماری ہی طرف متوجہ تھے۔ میں بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''منہ بند رکھو اور بولتے وقت سوچنے کی زحمت کر لیا کرو۔''

میری ڈانٹ کھا کر وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ تنفس تیز ہوا، آنکھوں میں نمی ابھری اور نتھنے پھلاتے ہوئے گلوگیر ہوئی۔ ''تمھارے ساتھ سفر کرتی ہے ہماری جوتی۔ ہم راج.....''

''خاموش.....'' قطع کلامی کرتے ہوئے میں دھاڑا۔ وہ سہم گئی تھی۔ دو قدم لے کر میں اس کے قریب ہوا۔ اور دبے مگر قہر آلود لہجے میں بولا۔ ''جانتی ہو کتنی مشکل سے جان بچا کر بھاگتے ہوئے یہاں پہنچ رہا ہوں۔ اور معلوم ہے دشمن کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتے ہوئے چاروں طرف پھیلے ہیں۔ نواب زادی، راجکماری، مہارانی اور سیٹھ زادی بننے کا شوق گھر جا کر پورا کر لینا۔ اس وقت آپ دشمنوں میں گھری ایک بے کس، کمزور اور بے یار و مددگار لڑکی ہیں۔ نانا کی دولت پر ماموں قابض ہے اور باپ کی دولت تک رسائی نہیں ہے۔ تو جب تک وہاں نہیں پہنچ جاتیں جو آپ کا مقام و مرتبہ ہے؛ زبان کو تالا لگا لو، خواہشات کو پیٹھ پیچھے پھینک دو، تمناؤں کا گلا گھونٹ دو، آسائشوں کو بھول جاؤ اور من مانی کرنے کا خیال دماغ سے نکال دو۔ اس وقت آپ ایک مفلس لڑکی سے بھی گئی گزری ہیں کہ کم از کم اسے جان کا خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔''

اس کی آنکھوں میں نمی سے بھر گئی تھی۔ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ''ہم پاپا کو بتائیں گے، تم نے بدتمیزی کی اور ہم تمھیں تم کہیں گے تم..... تم ہو اسی قابل۔ کنڈیکٹر کو تو لڑکیوں سے بولنے کا طریقہ سمجھا رہے تھے اپنا لہجہ نظر نہیں آ رہا۔ خود میاں فضیحت دوسروں کو نصیحت۔''

میں نے دوٹوک لہجے میں پوچھا۔ ''چلنا ہے کہ نہیں۔''

وہ چلا کر بولی۔ ''بات مت کرو، ہمیں مخاطب کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور ہم خود سفر کر سکتے ہیں بچی نہیں ہیں ہم۔''

''آپ کی مرضی۔'' میں موٹر سائیکل کی طرف متوجہ ہوا۔ اسی وقت ایک تیز رفتار جیپ نمودار ہوئی اس میں چار افراد سوار تھے۔ سڑک سے نیچے اترتے وقت جیپ کی بریکیں زور سے چیخی تھیں۔

میں نے گھبراتے ہوئے کہا۔ ''نقاب اوڑھ لو۔''

اس نے سردی کی وجہ سے اب تک کالا گاؤن نہیں اتارا تھا۔ مگر نقاب اتار دیا تھا۔ جو دوپٹے کی طرح اس کے گلے میں جھول رہا تھا۔ ساری زندگی نقاب نہ اوڑھنے والی چہرہ چھپانے کی ایسی ماہر نہیں ہو سکتی تھی کہ تیزی کر پاتی۔ ہیلمٹ سر پر رکھ کر میں نے دایاں ہاتھ جیب میں ڈالا اور پستول کے دستے کو قبضے میں لے لیا۔ چاروں افراد کی بگڑی ہوئی شکلیں ان کے پیشے کا اعلان کر رہی تھیں۔

''ٹرک ڈرائیور کہاں ہے؟'' جیپ سے چھلانگ لگا کر نیچے اترتے ہوئے ایک شخص نے کرسیوں پر بیٹھے دونوں افراد سے دریافت کیا۔ ڈرائیور کے علاوہ باقی دو بھی نیچے آ گئے تھے۔

''ہوٹل میں ہوگا مہاراج۔'' وہ نشست چھوڑتے ہوئے جلدی سے بولے۔

پرما ان کی طرف پیٹھ موڑے اپنے نقاب سے الجھی تھی۔ میرے لہجے کا اثر تھا یا جیپ والوں کی شکلوں کا خوف کہ بغیر تکرار کیے وہ میری ہدایت پر عمل کر رہی تھی۔ مجھے اس کے ہاتھوں میں ہلکی ہلکی لرزش نظر آئی۔ بلاشبہ موت کا سامنا کرنا بہت مشکل ہے۔ وہ نازوں میں پلی ہوئی نواب زادی تھی۔ ایسے حالات سے بے چاری کا کب واسطہ پڑا تھا۔ اور میں نے بھی اسے سمجھانے کو ڈانٹا تھا ورنہ انصاری صاحب کی لاڈلی کو یوں مخاطب کرنا مجھے کب گوارا تھا۔

جیپ والوں کا انداز، لہجہ اور ٹرک کے بارے پوچھنا ظاہر کر رہا تھا کہ وہ ہماری ہی تلاش میں تھے۔ اور ٹرک کے بارے استفسار کا مطلب اس کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا کہ نجو، کرن چاولہ کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اب اس معاملے سے نبٹنے کو دو حل تھے۔ یا تو میں کھسکنے کی کرتا کہ انھوں نے ہمیں قابل توجہ نہیں جانا تھا اور ہم موٹر سائیکل پر بیٹھ کر نکل سکتے تھے۔ لیکن اس صورت میں ٹرک ڈرائیور سے بات کرتے ہی انھیں ہمارے بارے معلوم ہو جاتا اور وہ تعاقب کر کے مسائل پیدا کر سکتے تھے۔ ان کے پاس جیپ تھی جس کی رفتار بہ ہر حال موٹر سائیکل سے زیادہ تھی۔

دوسری صورت یہ تھی کہ ان کا معاملہ نبٹا کر ہم آگے بڑھتے۔ یوں کم از کم عارضی طور پر تعاقب سے چھٹکارا مل جاتا۔ ہمارے باکسنگ کے استاد صوبیدار نذیر کہا کرتے تھے کہ ''باکسنگ رنگ کی سب سے خوب صورت بات یہ ہوتی ہے کہ ہمیں اپنا مخالف نظر آ رہا ہوتا ہے۔ اور جب دو مقابل آمنے سامنے آتے ہیں تو جیت عموماً پہل کرنے والے کے حصے میں آتی ہے۔ کیوں حملہ نہ کرنے والے کو دفاع کرنا پڑتا ہے اور یوں اسے مسلسل دفاع کی حکمت عملی اپنا پڑ جاتی ہے جبکہ حملہ کرنے والے کو یورش کا موقع ملتا رہتا ہے۔ میں بھی پہل پن ہاتھ میں رکھ کر نہ صرف دشمنوں کو دفاعی حکمت عملی اپنانے پر مجبور کر سکتا تھا، بلکہ ہمیں تر نوالہ سمجھنے کی غلطی بھی ان کے بھیجے سے نکال سکتا تھا۔ اس طرح وہ نڈر و بے خوف ہو کر حملہ آور نہ ہوتے۔ باقی ہماری موت کا فیصلہ وہ یوں بھی کر چکے تھے۔

البتہ ایک مبہم سا شبہ میرے دل میں چھپا تھا کہ کہیں وہ ٹرک کمپنی کے مالک پانڈے کے بھیجے ہوئے تو نہیں تھے۔ میں نے دفاع کے بجائے جارحانہ حکمت عملی اپنانا بہتر سمجھا کہ ہم موٹر سائیکل پر ان سے بھاگ نہیں سکتے تھے۔ یہ تمام سوچیں ایک لمحے سے بھی قلیل وقت میں میرے دماغ سے گزریں، میں اپنا شبہ دور کرنے کو فوراً ان کی طرف متوجہ ہوا۔

''مہاراج، ٹرک ڈرائیور ایک نوجوان لڑکی کو کسی کے گھر چھوڑنے گیا ہے۔''

''کیا..... کس طرف؟'' ایک نے فوراً پوچھا۔

دوسرا بولا۔ ''استاد وہی کتیا ہے، جس کی اپن کو تلاش ہے۔''

ڈرائیور نے غلاظت اگلی۔ ''جلدی کرو، کہیں ٹرک ڈرائیور اسے بھگا نہ دے۔ اور یاد رکھنا مارنے سے پہلے چھوکری سے تفتیش ضروری ہے۔ سب سے پہلے میں پوچھ گچھ کروں گا اس کے بعد باقیوں کی باری آئے گی۔''

تیسرا جو سب سے پہلے جیپ سے اترا تھا مجھے مخاطب ہوتے ہوئے مشکوک لہجے میں بولا۔ ''ابے سالے تو کون ہے۔ اور کس رنڈی کو بھگا کر لے جا رہا ہے۔''

''زمین پر لیٹ جاؤ۔'' تیز سرگوشی پرما تک پہنچاتے ہوئے میں نے ایک دم پستول نکالتے ہوئے خود کو مخاطب کرنے والے کے پستول والے ہاتھ پر گولی داغی اور پھر باقیوں کی طرف نال کا رخ پھیرتے ہوئے مسلسل لبلبی دباتا گیا۔ تینوں کے سر میں گولیاں لگی تھیں۔ اس سرعت اور تیزی سے فائر کر کے اپنے دشمنوں کو ناکارہ کرنا بہترین نشانہ بازی کا مظاہرہ تھا، لیکن مجھے سراہنے والا کوئی نہ تھا۔ اگر لورا براؤن ساتھ ہوتی تو بے ساختہ پکارتی۔ ''تم واقعی ایس ایس ہو۔''

پرما، میری ہدایت سنتے ہی لیٹ گئی تھی۔ اس کی سرعت پر مجھے ہنسنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

زخمی ہونے والا بائیں ہاتھ سے پستول اٹھا رہا تھا۔ اس کا پستول پکڑنا اور میرا پانچویں بار لبلبی دبانا ایک ساتھ ہوا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر پستول کے بجائے اس کے دوسرے ہاتھ کو بھی نشانہ بنا دیا تھا۔

ہلکی سی چیخ مارتے ہوئے وہ اذیت سے کراہنے لگا تھا۔ میں مزاحیہ انداز میں بولا۔

''تم غلط کہہ رہے تھے، غور سے دیکھو میں سالا نہیں بہنوئی ہوں، اپنی دیدی کو بھی تم نے گھٹیا تخاطب سے پکارا ہے۔ آئندہ خیال رکھنا۔ اور تمہاری گھٹیا بات تمہارے ساتھیوں کے بھیجے سے نکالنے کو مجھے ان کی کھوپڑیوں میں سوراخ کرنا پڑے۔''

اذیت برداشت کرتے ہوئے وہ برہم ہوا۔ ''تت..... تم بچو گے نہیں۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''یہ میرا مسئلہ ہے، تمہارا مسئلہ ہے اپنی جان بچانا ہے اور اس کا بہترین گر ہے سب کچھ پھوٹ دو۔ ورنہ اگلوانے کے طریقے مجھے آتے ہیں۔'' یہ کہتے ہی میں ہوٹل مالک کے مقرر کیے ہوئے دونوں آدمیوں کی طرف متوجہ ہوا جو تیز بخار میں مبتلا شخص کی طرح لرز رہے تھے۔

''فوراً سے پہلے غائب ہو جاؤ۔ اور ہوٹل کا رخ نہ کرنا۔''

''دھنے واد مہاراج.....'' بیک زبان کہتے ہوئے وہ سڑک کی طرف سرپٹ بھاگ پڑے۔

''آپ بھی اٹھ جائیں۔'' میں نے پاؤں سے پرما کو ٹہوکا دیا جو سر کے گرد بازو لپیٹے اوندھے منہ لیٹی تھی۔

وہ فوراً اٹھ کر کپڑے جھاڑنے لگی۔

میں زخمی کی طرف متوجہ ہوا جو مسلسل کراہ رہا تھا۔ ''کس کے آدمی ہو؟''

''منوج جوشی۔'' اس نے جواب میں تاخیر نہیں کی تھی۔

''کہاں سے آ رہے ہو؟''

''شاہ پور میں باس کا اڈہ ہے وہاں سے۔''

منوج جوشی اسمگلنگ کی دنیا میں تناور درخت کی حیثیت رکھتا تھا، جس کا تنا تو ممبئی میں تھا لیکن شاخیں پورے انڈیا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ چونکہ کاروبار کا اصل کرتا دھرتا وگنیش شکلا تھا اس لیے انھیں رندھیر شکلا کی شکل میں سرکاری مدد بھی حاصل تھی۔ اور کبھی کبھار بھارت سرکار کی سخت کارروائی پر درخت کی شاخ تراشی تو ہو جاتی تھی، مگر درخت کا تنا اور جڑیں

بدستور محفوظ رہتی تھیں۔ نشہ آور اشیاء کی اسمگلنگ میں لاکھوں کروڑوں نہیں اربوں کھربوں کمائے جاتے ہیں۔ اور اتنی دولت ہونے کے باوجود اس شقی القلب شخص کا دولت کے لیے اپنی معصوم بھانجی کی جان کے درپے ہونا عجیب لگتا تھا۔ یقیناً رندھیر شکلا کی حرام کی کمائی اتنی زیادہ تھی کہ اس کی دولت و جائیداد سے دست بردار ہونا وگنیش شکلا کو مشکل لگ رہا تھا۔ اور اب تو رندھیر شکلا کا سایہ بھی اس کے سر سے اٹھ گیا تھا۔ گویا اس کی مشکلات میں اضافہ ہوا تھا۔

میں نے اگلا سوال پوچھا۔ ''کیا احکامات ملے تھے؟''

''ٹرک کا نمبر اور جگہ بتا کر حکم دیا گیا کہ اس میں ایک لڑکی اور لڑکا چھپے ہوں گے دونوں کو موت کے گھاٹ اتارنا ہے اور قتل کرنے سے پہلے لڑکی پر تشدد کر کے آبروریزی بھی کرنی ہے تاکہ یہ خاندانی دشمنی کا شاخسانہ لگے۔''

''اتنے اچھے کام کو آنے والے کی پذیرائی نہ کرنا زیادتی ہوگی۔'' زہریلے لہجے میں کہتے ہوئے میں نے لبلبی دبائی، گولی اس کے ماتھے میں لگی تھی۔

میں نے سرعت سے ان کے ہتھیاروں کا جائزہ لیا۔ دو کے پاس تیس بور پستول، ایک کے پاس ویبلے ریوالور اور ڈرائیور خالی تھا۔ تیس بور کی گولیاں نائن ایم ایم قطر کے پستول میں استعمال نہیں کی جاسکتی تھیں۔ ورنہ ان کی میگزینیں ضرور اٹھاتا۔ میں نے ویبلے (Weblay) ریوالور اٹھانے پر اکتفا کیا کہ گلاک کی گولیاں ختم ہونے پر کام آسکتا تھا۔ ریوالور بردار کی جیب سے چھے چھے گولیوں کی پلاسٹک کی دو ڈبیاں بھی برآمد ہوئیں جو میں نے اپنی جیب میں ڈال لیں۔ (کچھ قارئین کو شاید ریوالور اور پستول کا فرق نہ پتا ہو۔ ان میں بنیادی فرق میگزین اور سلنڈر یعنی چرخی کا ہوتا ہے۔ ریوالور میں صرف چھے گولیاں آتی ہیں جو اس کے گول سلنڈر میں بھری جاتی ہیں۔ اور باری باری ایک ایک گولی سامنے آکر فائر ہوتی جاتی ہے۔ اگر سلنڈر کے پانچ خانے خالی چھوڑ کر صرف ایک گولی ڈالی جائے اور سلنڈر کو گھما دیا جائے تو ممکن ہے کہ خالی خانہ سامنے آنے کی وجہ سے ہتھیار فائر نہ کرے جبکہ پستول میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی میگزین میں اگر ایک بھی گولی ہو تو وہی فائر ہوگی)

ریوالور بیلٹ میں اڑس کر میں مؤدبانہ لہجے میں بولا۔ ''راجکماری پرملہوترا صاحب! آپ میرے موٹر سائیکل کو اپنی تشریف کی سعادت بخشیں گی یا اپنے لیے مرسڈیز یا ہیلی وغیرہ منگوانا پسند کریں گی۔''

وہ برہم ہوئی۔ ''اڑالو مذاق، ایک ایک بات پاپا کو بتائیں گے۔ تمہارا کورٹ مارشل نہ کروایا تو ہمارا نام بدل دینا۔''

میں نے کندھوں میں بیگ ڈالتے ہوئے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر کک لگائی۔ ''وہ مرحلہ بعد میں آنا ہے فی الحال اپنے ارادوں سے آگاہ کریں۔''

وہ خاموشی سے قریب آئی۔ بیگ کی وجہ سے سیٹ پر اس کے بیٹھنے کی جگہ کم بچ رہی تھی۔ بھناتے ہوئے بولی۔ ''بیگ کو تو اپنی گود میں رکھو۔''

''سوری۔'' میں نے بیگ اتار کر اپنے سامنے رکھ لیا تھا۔

پیچھے بیٹھتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ لیے تھے۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اس کے موٹر سائیکل پر پہلی بار بیٹھنے کی بات سچ تھی۔

گیئر تبدیل کرتے ہوئے میں آگے بڑھا اور سڑک پر چڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی موٹر سائیکل ہوا میں اڑ رہی تھی۔

''ہمیں سردی لگ رہی ہے۔'' کلومیٹر بھر آتے ہی وہ منمنائی۔

رفتار کم کر کے میں نے بریک دبائی اور موٹر سائیکل روک کر اپنا کوٹ اتارنے لگا۔

''یہ پہن لو۔'' کوٹ اس کے حوالے کر کے میں نے ہیلمٹ اتارا اور نیچے پہنی گرم ٹوپی اتار کر وہ بھی اس کی جانب

بڑھادی۔

بغیر شکریے یا رسمی انکار کے اس نے کوٹ پہن کر ٹوپی بھی اوڑھ لی۔ اس کے انداز سے یوں لگتا تھا جیسے اس کی تمام ضرورتوں کا خیال رکھنا، اسے آرام پہنچانا اور اس کے منہ سے نکلی ہر بات کو پورا کرنا میری ذمہ داری ہو۔ بچپن سے آج تک اس کا ایسے ہی ماحول سے واسطہ پڑا تھا۔ خاص کر جب سے وہ رندھیر شکلا کے پاس پہنچی تب سے ملازموں کی فوج پر حکم چلانے کے اتنے مواقع ملے تھے کہ اب وہ عادی ہو چکی تھی۔ میں بھی انصاری صاحب کی وجہ سے اسے عزت احترام دے رہا تھا اور اس نے اپنا حق سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ جبکہ جسے وہ میرا کام سمجھ رہی تھی۔ یہ اس کا اپنا کام تھا۔ نہ تو میں انصاری صاحب کا ملازم تھا اور نہ پرما سے کوئی تعلق یا اس کی میرے نزدیک کوئی اہمیت تھی۔ اس کام کا میری نوکری سے بھی کوئی واسطہ نہ تھا کہ ذاتی اغراض و مقاصد کا ملکی سلامتی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ ہاں کسی شخص کے ذاتی کام میں اس وجہ سے دلچسپی لینا کہ اس نے وطن کی خاطر بہت قربانیاں دی ہوں یقیناً اچھی بات ہے۔ اور میرا، پرما کا خیال رکھنے کی یہی سب سے بڑی وجہ تھی۔ اس کے بے ہودہ اعتراضات کو بھی اسی لیے نظر انداز کر جاتا تھا کہ اس کی سوچ و سمجھ پختہ نہیں تھی۔

میں زیادہ سر اس لیے بھی نہیں کھپاتا تھا کہ وہ ایک کمزور لڑکی ہی تھی۔ مجھ میں الحمدللہ اتنی برداشت موجود تھی کہ دوسرا کوٹ بھی اتار دیتا تو اسی رفتار سے بے فکر ہو کر موٹر سائیکل چلا سکتا تھا۔ پاکستانی سنائپروں کی تربیت میں موسمی حالات سے لڑنے کی باری سب سے پہلے آتی ہے۔ گرمی، سردی سے گھبرانے والا سنائپر عملی زندگی میں صفر ہوتا ہے۔ تربیت کے دوران ہمیں سخت سردیوں میں بہتے نالے سے رینگتے ہوئے گزر کر دوسری جانب کئی کئی گھنٹے ہدف کے انتظار میں لیٹنا ہوتا تھا۔ یوں کہ آسمان پر بادل چھائے ہوتے اور پورا دن لباس خشک نہیں ہوتا تھا۔ کوئٹہ ایسا شہر ہے جہاں ہر وقت ہوا چلتی رہتی ہے۔ جہاں گرمیوں میں یہ ہوا موسم کو معتدل رکھتی ہے وہیں سردیوں میں ٹھنڈ کو بڑھانے کی وجہ بنتی ہے۔

میں دوبارہ چل پڑا۔ فی الحال میرے پاس کوئی لائحہ عمل نہیں رہا تھا۔ موٹر سائیکل پر پٹنہ، آگرہ یا دہلی وغیرہ پہنچنا ناممکن نہیں تو دشوار ترین ضرور تھا۔ آگرہ تیرہ چودہ سو کلومیٹر دور تھا اس سے آگے دہلی دو سو کلومیٹر کے بہ قدر تھا۔ مگر وہاں جا کر بھی انڈیا سے نکلنا اتنا آسان نہ ہوتا، کیوں کہ رندھیر شکلا کی اصل رہائش آگرہ میں تھی۔ اور اس علاقے میں اس کا اچھا خاصا اثر رسوخ تھا۔ اس کے ناتے وگنیش کی بھی اچھی جان پہچان ہوتی تھی۔ البتہ اس جانب مزید آگے سفر کر کے میں مقبوضہ کشمیر کے راستے پاکستان جا سکتا تھا۔ پہاڑی علاقے میں کئی ایسے خلا مل جاتے ہیں جن سے نفوذ و خروج کرنا آسان ہوتا ہے۔ (فوجی اصطلاح میں نفوذ کہتے ہیں دشمن کے دفاع میں سے چھپ کر گزرتے ہوئے کسی فوجی آپریشن کو دشمن کے عقب میں پہنچانا اور خروج کہتے ہیں تکمیل مشن کے بعد دشمن کی دفاعی لائن سے چھپ کر گزرتے ہوئے واپس آنا) لیکن نازوں میں پلی نرم و نازک لڑکی کا کشمیر کے بلند و بالا پہاڑوں میں سفر کرنا ناممکن تھا۔ اور سردیوں میں تو وہ پہاڑ برف کی چادر اوڑھ کر فوجی جوانوں کے گھٹنے لگوا دیتے ہیں تو کوئی عام سی لڑکی انھیں کیسے عبور کر پاتی وہ بھی ان حالات میں کہ دشمن کی نگاہوں سے بچنے کو راستوں سے ہٹ کر چلنا پڑے۔

پٹنہ کا ممبئی سے فاصلہ اٹھارہ سو کلومیٹر ہے۔ اگر وہاں تک ٹرک میں محفوظ چلے جاتے تو آگے کا سفر اتنا مشکل نہ ہوتا۔ پٹنہ سے نیپال اور بھوٹان کی سرحد قریب تھی۔ اور امید ہے گاڑی وغیرہ مل جاتی۔ کسی بڑے شہر میں جا کر ہوائی راستے سے پاکستان یا کسی ایسے ملک میں جہاں سے پاکستان جانا آسان ہوتا پہنچا جا سکتا تھا۔

پرما پہلے پیچھے ہٹ کر بیٹھی تھی، مگر رفتہ رفتہ سمٹتے ہوئے بالکل جڑ گئی تھی۔ ٹھنڈی ہوا نے فاصلوں کو سمیٹ دیا تھا۔ کوٹ اتارنے کے بعد ٹھنڈ میرا مزاج بھی پوچھنے لگی تھی۔

ہم بیس پچیس کلومیٹر ہی آئے ہوں گے کہ سڑک پر رکاوٹ دیکھ میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ پولیس چوکی تھی۔ لیکن دو رویہ

سڑک (ڈبل روڈ) میں رکاوٹ صرف ہماری جانب لگائی گئی تھی۔ ممبئی جانے والی سڑک پر رکاوٹ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اور یہی وجہ مجھے پہلے سے چوکنا کر گئی تھی۔ گو میں ''ہوٹل مڈوے'' جہاں میں چند دشمنوں کا خاتمہ کر کے آ رہا تھا سے فاصلہ پیدا کر کے بڑی سڑک چھوڑنا چاہتا تھا۔ کہ اسی میں بہتری تھی۔ مگر زیادہ دوری پیدا کرنے کے لالچ نے جلدی سڑک نہ چھوڑنے دی اور اب ایک دم پولیس کا نظر آنا اور وہ بھی یوں کہ جیسے میرے انتظار میں بیٹھے ہوں۔ مجھے چونکا گیا تھا۔ رات کی وجہ سے میں انھیں دور سے نہیں دیکھ سکا تھا۔ ہم سے آگے ایک سوزکی وین جا رہی تھی۔ اس کو رکتے دیکھ کر مجھے خطرہ محسوس ہوا۔

میں نے موٹر سائیکل روک کر پرما کو کہا۔ ''مجھے مضبوطی سے پکڑ لو بھاگنا پڑے گا۔''

اس نے میری کمر کے گرد بازو لپیٹ لیے تھے۔ میں نے بایاں پاؤں نیچے ٹکاتے ہوئے ایک جھٹکے سے کلچ چھوڑا اور اپنی جگہ پر موٹر سائیکل موڑ لیا تھا۔ یوں کرتے وقت ٹھیک ٹھاک جھٹکا لگتا ہے۔ مگر پرما نے مجھے مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ اس لیے گرنے سے بچ گئی تھی البتہ اس کے ہونٹوں سے غیر ارادی طور پر چیخ ضرور نکلی تھی۔

''رک جاؤ۔'' ایک کرخت آواز ابھری ساتھ ہی ہوائی فائر کی آواز سے ماحول گونج اٹھا تھا۔ وہ بھی ہمیں بروقت نہیں دیکھ سکے تھے۔ مگر اب رکنا اپنی جان گنوانے کے مترادف تھا۔ ریس دے کر میں موٹر سائیکل کو زگ زیگ کے انداز میں دوڑانے لگا۔

پرما ہکلائی۔ ''ہم..... گر جائیں گے۔'' وہ سختی سے مجھے چمٹی ہوئی تھی۔ جیسے کہاوت ہے کہ..... ''سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے۔'' وہ بے چاری بھی پہلی بار موٹر سائیکل پر بیٹھی تھی اور ایسے حالات پیش آ گئے تھے۔ مگر اس کے لیے میں آہستگی سے موٹر سائیکل چلاتا تو نہ وہ بچتی نہ میں۔ البتہ جس طرح وہ مجھے چمٹی ہوئی تھی اس حالت میں، میرے گرنے ہی پر اس کے گرنے کا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا اس کے علاوہ نہیں۔ میرے پاس اسے تسلی دینے کا وقت نہیں تھا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری، میں نے رفتار مکمل بڑھا دی تھی۔

زور زور سے سیٹی بجنے لگی۔ ساتھ ہی کوئی چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ ''زندہ یا مردہ انھیں ہر حالت میں پکڑنا ہے۔''

اچانک سامنے سے تیز روشنیاں میری آنکھوں میں پڑیں۔ پرما نے زور سے چیختے ہوئے میری بغل میں سر گھسیڑ دیا۔ اس کا شدت سے کانپنا مجھے محسوس ہو رہا تھا۔

رات کے وقت سامنے سے آنے والی تیز روشنی آنکھوں میں پڑنے پر یوں لگتا ہے جیسے گاڑی ہم سے ٹکرا رہی ہو۔ اسے بھی کچھ ایسا ہی لگا تھا تبھی ڈر گئی تھی۔ وہ ایک ٹرک تھا۔ میں اس کے پاس سے گزرا، آگے ہلکا سا موڑ تھا۔ کلاشن کوفوں کی تڑتڑاہٹ دوبارہ ابھری مگر اس بار گولیوں کا رخ ہمارے بجائے آسمان کی طرف تھا۔

میں اندھا دھند موٹر سائیکل دوڑائے جا رہا تھا۔ عقبی فائرنگ ٹانک کا کام دے رہی تھی۔ دو تین کلومیٹر پیچھے ایک برساتی نالے کا پل عبور کرتے ہوئے مجھے بائیں ہاتھ یعنی غربی جانب لنک روڈ نظر آیا تھا۔ شاید اس طرف کوئی گاؤں وغیرہ بھی تھا۔ لنک روڈ کے قریب میں دو اڑھائی منٹوں میں پہنچ گیا تھا۔ رفتار میں کمی لائے بغیر میں نے دائیں طرف موٹر سائیکل موڑ دی۔ موٹر سائیکل کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ اس پر تیز رفتاری سے حرکت کرنا آسان ہوتا ہے۔ لنک روڈ کا بھی نالے پر علیحدہ پل بنا ہوا تھا۔ حالاں کہ بڑی سڑک کے پل سے پہلے لنک روڈ نکالا ہوتا تو دوسرے پل کی ضرورت نہ پڑتی۔ سڑک ملاپ پر ہندی میں گاؤں کا نام لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جو میں نہیں پڑھ سکتا تھا۔ انڈیا میں اردو، ہندی اور رومن انگریزی خط مستعمل ہیں۔ اور سائن بورڈوں پر عموماً ہندی یا رومن انگریزی میں لکھا نظر آتا ہے۔

لنک روڈ پر چڑھتے ہی عقب سے گولیوں کی ایک اور بوچھاڑ آئی۔ یوں اندھا دھند گولیاں چلنے پر اتفاقاً گولی لگ

جانا قرین قیاس تھا۔ کلاشن کوف کی کارگر رینج تین سو میٹر ہے لیکن اس کی گولی بغیر نشانہ سادھے کافی دور تک مار کرتی ہے۔ لنک روڈ، بڑی سڑک سے ہلکا نشیب میں تھا۔ چھوٹا پل عبور کرتے ہی میں آبادی میں گھس گیا تھا۔ سڑک مغرب کو جا رہی تھی۔ میں گلیوں میں گھسنے کے بجائے سڑک ہی پر بڑھتا رہا کہ گلیوں میں پھنسنے کا زیادہ خطرہ تھا۔ آگے جا کر سڑک جنوب کو مڑ رہی تھی اور میرا اندازہ تھا کہ چکر کاٹ کر سڑک نے دوبارہ بڑی سڑک سے مل جانا تھا۔ ایک راستہ شمال مغرب کو جا رہا تھا، جس پر ''کسارا ریلوے اسٹیشن'' اور رہنمائی کو تیر کا نشان بنا نظر آیا۔ میں اسی راستے پر بڑھ گیا۔ عقب میں دو تین گاڑیوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

ریلوے اسٹیشن میں گھسنے کے بجائے میں ریلوے لائن کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ اس راستے پر کم از کم یہ تسلی ضرور تھی کہ گاڑیاں تیز رفتاری سے پیچھا نہیں کر سکتی تھیں۔

''ریل گاڑی میں چڑھ جاتے ہیں۔'' پرما نے احمقانہ مشورہ دیا۔

میں چلا کر بولا۔ ''بے وقوف، اس کا موقع کس نے دینا ہے۔''

میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ سامنے ایک ریل کی تیز چنگھاڑ سنائی دینے لگی۔ میں ساتھ سے گزرتا گیا۔ راستہ ناہموار ہونے کی وجہ سے رفتار زیادہ تیز نہیں کی جا سکتی تھی۔ عقب میں گاڑیوں کی روشنیاں ہنوز دکھائی دے رہی تھیں جس کا صاف مطلب یہی تھا کہ ہم ان کی نظروں میں تھے۔

آگے ڈھلوان شروع ہو گئی تھی۔ ساتھ جھاڑیاں اور درخت بھی نظر آنے لگے۔ موٹر سائیکل کی ہیڈ لائیٹ میں دور دور تک درختوں کا نظر آنا ظاہر کر رہا تھا کہ ہم جنگل کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اور یہ درخت ہمارے لیے زیادہ مفید تھے کہ دشمن گاڑیوں میں صحیح طریقے سے آگے نہ بڑھ پاتے۔ ایسے علاقے میں موٹر سائیکل کی افادیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

اچانک موٹر سائیکل بری طرح ڈگمگائی، پرما کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے ہینڈل کو قابو میں کر کے موٹر سائیکل کو گرنے سے بچایا تھا۔ اس کے لہرانے کی وجہ پچھلے پہیے کا پنکچر ہونا تھا۔

''حسرت ان غنچوں پر جو بن کھلے مرجھا گئے۔'' کے مصداق میں مکمل خوش بھی نہیں ہو پایا تھا کہ نئی مصیبت ''حاضر جناب'' کے نعرے کے ساتھ بن بلائے مہمان کی طرح نازل ہو گئی تھی۔

ایسی جگہ پر موٹر سائیکل کا دھوکا دینا پریشان کرنے والا تھا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو زیادہ فرق نہ پڑتا۔ پلوشے، لورا براؤن، جینی وغیرہ جیسی کسی لڑکی کا ساتھ ہونا بھی تقویت ہی کا باعث بنتا۔ مگر پرما نری مصیبت، مسائل کی جڑ اور بھاری بوجھ تھی۔ میری مدد تو خیر کیا کرتی، الٹا اس کی وجہ سے نہ صرف میری رفتار میں کمی آتی بلکہ صحیح طریقے سے جوابی کارروائی بھی نہ کر سکتا۔ ایسی صورت حال سے میرا پہلی بار واسطہ پڑ رہا تھا۔ ماضی قریب و بعید میں اس سے کئی گنا زیادہ دگرگوں حالات میں بھی اتنی پریشانی نہ ہوئی جو آج ہو رہی تھی۔ اکثر حادثات کا مقابلہ میں نے اکیلے کیا تھا، گاہے سردار خان اور پلوشہ وغیرہ کا بھی ساتھ رہا۔ انڈیا میں پہلے ڈینو اور بعد میں لورا براؤن میرے شانہ بہ شانہ رہے۔ لیکن وہ تمام تربیت یافتہ و سخت جان تھے۔ ان کی موجودی سے مدد ملتی تھی۔ جبکہ پرما بی بی کے ساتھ تو ایسے جنگل بیابان میں خالی چلنا کارِ دارد تھا کجا تعاقب میں جانی دشمن ہوتے۔

مجھے موٹر سائیکل سے نیچے اترتا دیکھ کر وہ ہکلائی۔ ''کک..... کیا ہوا؟''

میں نے ایس آر ون کے بیگ کو کندھے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''موٹر سائیکل پنکچر ہو گئی ہے۔ آگے پیدل جانا ہوگا۔''

''پپ..... پیدل.....'' وہ پریشانی سے بولی۔ ''ناہموار زمین پر ہم ان میں کیسے حرکت کر پائیں گے۔'' یقیناً اس

نے اونچی ایڑی کے سینڈلوں کی طرف اشارہ کیا تھا جو اندھیرے کے باعث نظر نہیں آ رہے تھے۔

میں نے بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے ایک جانب قدم بڑھائے۔ ''اس بارے تو آپ کو پتا ہوگا۔ میں نے تو ڈاکٹر سجاتا کے ہاں سے چلتے وقت آگاہ کر دیا تھا۔ تب فرمایا تھا کہ ایسی صورت حال میں آپ ننگے پاؤں بھی بھاگ لیں گی۔ اب عمل کریں، کہ دشمن سر پر پہنچنے والے ہیں اور ضائع کرنے کو ایک منٹ بھی نہیں ہے۔''

اس نے رونے کو پر تولے۔ ''ہمیں کیا پتا تھا ایسی صورت حال سے واسطہ پڑے گا۔''

میں نے اسے جھٹلایا۔ ''غلط، میں نے واضح طور پر تنبیہ کی تھی۔''

قدم ملانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ لجاجت سے بولی۔ ''آپ تو کمانڈو ہیں، ننگے پاؤں بھی دوڑ لیں گے۔ اپنے بوٹ ہمیں دے دیں ناں، ہم پاپا سے کوئی شکایت نہیں کریں گے۔'' سر پر افتاد پڑی تھی تو اسے ادب و آداب بھی یاد آ گئے تھے اور پرانے مقدمے بھی واپس لینے پر تیار ہو گئی تھی۔

میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے طعنہ زن ہوا۔ ''ٹھیک ہے مگر آپ کسی دوسرے کی چیز استعمال جو نہیں کرتیں۔''

وہ سرعت سے بولی۔ ''آپ کی کر لیں گے۔'' تبھی تھوڑے فاصلے پر تڑتڑاہٹ کی آواز ابھری۔ وہ ہلکی سی چیخ مار کر میرے بازو سے لگ گئی تھی۔

میں نے سختی سے ڈانٹا۔ ''دوبارہ ڈر کر چیخ ماری تو منہ پر کپڑا باندھ دوں گا۔ اب سانس بھی آہستہ لینا ہے۔''

وہ روہانسا ہوئی۔ ''سس.....سوری۔''

موٹر سائیکل کے بند ہونے کی وجہ سے گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ تعاقب کرنے والوں کی گاڑیوں کی روشنی اب اور زیادہ واضح ہو گئی تھی۔ دو گاڑیوں کی روشنی دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کم از کم آٹھ سے دس افراد ہونے تھے۔

میں نے قدم روک کر بیگ سے بوٹ برآمد کیے جو ایسے ہی موقع کے لیے ڈاکٹر سجاتا کے ہاں سے چلتے وقت رکھ لیے تھے۔ یہ وہی بوٹ تھے جنھیں وہ ٹھکرا آئی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا میں کیا کر رہا ہوں وہ بس سہمی ہوئی سی میرا بازو پکڑ کر کھڑی تھی۔ نظریں بار بار عقب میں جلتی روشنیوں کی طرف اٹھ جاتیں جن کا فاصلہ لحہ بہ لحہ سمٹتا جا رہا تھا۔ دونوں گاڑیاں اب پھیل کر آگے بڑھ رہی تھیں۔

''یہ جلدی سے پہنو۔'' اسے بوٹ پکڑا کر میں نے پستول کی پہلی والی میگزین اتاری اور بھری ہوئی میگزین چڑھا دی۔ پہلی والی میگزین میں چار پانچ گولیاں ہی باقی تھیں۔ گلاک نائینٹین کے ساتھ عموماً تو پندرہ راؤنڈ والی میگزین ملتی ہے۔ مگر اس میں دس، سترہ، انیس اور تینتیس راؤنڈ والی میگزینیں بھی دستیاب ہیں۔ میرے پاس پندرہ راؤنڈ والی دو میگزینیں تھیں۔ ایک بھری ہوئی اور دوسری میں چار پانچ گولیاں ہی بچی تھیں۔ اس کے علاوہ دیہلے ریوالور تھا۔ جس کی اٹھارہ گولیاں میرے پاس تھیں۔ گو کلاشن کوفوں کے مقابلے میں یہ ناکافی ہتھیار تھے۔ کیوں کہ ہم عمارتی لڑائی نہیں لڑ رہے تھے۔ البتہ ایس آر ون جیسی سنائپر رائفل کی وجہ سے مجھے کافی تقویت حاصل تھی۔

پرمانے جلدی سے سینڈل اتار کر جوتے پاؤں میں ڈالے اور ہم چل پڑے۔

دو تین قدم چلتے ہی اس نے تبصرہ کیا۔ ''کافی آرام دہ جوتے ہیں۔''

''یہ وہی جوتے ہیں جو آپ نے پہننے سے انکار کیا تھا۔''

وہ بھناتے ہوئے بولی۔ ''جانتے ہیں، طعنہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور شوق سے نہیں بہ حالت مجبوری پہنے ہیں۔''

''اس وقت بھی یہی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔'' کہتے ہوئے میں نے رخ شمال مغرب کی جانب موڑ لیا تھا۔ کیوں

شمال مشرق کی جانب جانے میں یہ خطرہ تھا کہ کہیں دوبارہ سڑک پر نہ جا نکلیں۔ بڑی سڑک بالکل غیر محفوظ ہو چکی تھی۔ اب سڑک پر جگہ جگہ وگنیش شکلا کے غنڈے، کرن چاولہ کے ایجنٹ اور پولیس کے اہلکاروں سے واسطہ پڑنا تھا۔

آگے ڈھلانی علاقہ تھا۔ گو زمین کی ہلکی پھلکی اٹھان تو پہلے سے محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اب اس میں اضافہ ہو گیا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر پہاڑیوں کے ہیولے ظاہر کر رہے تھے گویا آگے کوہستانی علاقہ تھا۔ ایسے علاقے میں جہاں حرکت میں مشکلات پیش آسکتی تھیں وہیں چھپنے کو بھی زیادہ جگہیں مل جاتی ہیں۔ مگر یہ مسئلہ بھی تھا کہ ایک بار ہمارے چھپنے کی جگہ منظر عام پر آتے ہی وہاں دشمنوں کی بڑی تعداد اکٹھا ہو جاتی۔ موٹر سائیکل کا خراب ہونا ہمیں بڑی مصیبت میں پھنسانے والا تھا۔

''ہم اس علاقے کو جانتے ہیں۔'' میرے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کرتے ہوئے پرمانے انکشاف کیا۔

میں طنزیہ انداز میں بولا۔ ''مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔''

وہ میرے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے تفصیل بتانے لگی۔ ''یہاں سے تھوڑی دور آگے لطیف واڑی گاؤں ہے۔ نہایت پسماندہ اور مفلسوں کا مسکن ہے۔ لوگ گھاس پھونس اور لکڑیوں سے بنی جھونپڑوں میں رہتے ہیں۔ لطیف واڑی آگرہ روڈ کے قریب ہی واقع ہے۔ ہم دوستوں کے ساتھ دو بار آؤٹنگ پر آچکے ہیں۔ شمال مغربی جانب موڈک ساگر ڈیم ہے، اسے لوئر ویترنا بھی کہتے ہیں۔ شمال کی جانب اپر ویترنا ہے۔ دونوں کے درمیان دریائے ویترنا بہتا ہے۔ آگے سارا جنگل اور پہاڑی علاقہ ہے۔''

میں نے چڑایا۔ ''لڑکیوں کی سہیلیاں ہوتی ہیں دوست نہیں۔''

وہ صاف گوئی سے بولی۔ ''یہ دردسر پاپا یا ہمارے ہونے والے شوہر کے لیے رہنے دو۔ باقی مشورہ یہ ہے کہ لطیف واڑی میں چھپنا بہتر رہے گا۔ کیوں کہ ہمیں ابھی سے سانس چڑھ گیا ہے۔''

میں نے لہجہ سخت کرتے ہوئے کہا۔ ''عقل کے ناخن لو، لطیف واڑی کو جاننے والی آپ اکیلی نہیں ہیں۔ وہ چپے چپے کی تلاشی لیں گے۔ اور کسی گھر میں پناہ لینا اپنا سر اوکھلی میں دینے کے مترادف ہے۔''

اس نے رو دینے والے لہجے میں پوچھا۔ ''آخر پیدل کتنا چلیں گے؟''

میں ہنسا۔ ''اس بارے مسئول، سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔''

وہ حیرانی سے بولی۔ ''تو ہم کس سے پوچھیں؟''

میں نے پست آواز میں مشورہ دیا۔ ''بس اب آواز نہیں آنا چاہیے۔''

اس نے چپ سادھ لی۔ گاڑیاں رک گئی تھیں۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری، ساتھ ہی کوئی با آواز بلند لبلبی دبانے والے کو ڈانٹ کر منع کرنے لگا۔

ہمارے بیچ فرلانگ سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ وہ بعینہ موٹر سائیکل کے ساتھ پہنچ کر رکے ہوئے تھے۔ انھیں ہمارے جانے کی سمت معلوم نہ تھی۔ اور ہماری تلاش میں بکھرنے کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ یوں ان کی طاقت تقسیم ہو جاتی۔ علاقے کی مناسبت سے ان سے بچ کر نکل بھاگنا یا مقابلہ کرنا نہایت آسان تھا۔ بہ شرط میرے ہمراہ پرمانہ ہوتی۔ وہ نیک بخت نہ تو مجھے تیز رفتاری سے بھاگنے دے رہی تھی اور نہ مقابلے کا حوصلہ کرنے دے رہی تھی۔ درختوں کی وجہ سے اندھیرا زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ جنگلوں و پہاڑوں میں اندھیرے کے اندر حرکت کرنا بہت زیادہ تربیت کا متقاضی ہے۔ مقامی لوگ اندھیرے میں آسانی سے سفر کر سکتے ہیں۔ یا ہم جیسے سنائپر جن کی زندگی کا بیش تر حصہ ہی انھی جنگلوں، پہاڑوں بیابانوں میں گزرا ہو۔

سب سے بڑا مسئلہ علاقے سے ناواقفیت کا ہوتا ہے۔ بہ قول پرما کے وہ دو بار وہاں آ چکی تھی۔ لیکن حرکت کرتے ہوئے اسے سخت دشواری پیش آ رہی تھی۔ دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں حرکت کرنے کا فن بے چاری کو کہاں آتا تھا۔ صحیح کہتے ہیں زرداروں کی زندگی سے دولت منفی کر دو تو باقی تکالیف، سختیاں اور اذیتیں ہی بچتی ہیں۔ جبکہ غریبوں کی زندگی پہلے ہی دولت سے تہی ہوتی ہے۔ اور پیسے کے بغیر خوشیاں کشید کرنے کا عمل انھیں آتا ہے۔

اچانک پرما کے ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی، پتھر سے ٹھوکر کھا کر وہ نیچے گری۔ اور گرنے پر بلند بانگ چیخ اس کے ہونٹوں سے برآمد ہوئی تھی۔ کیوں کہ ایک کانٹے دار جھاڑی کی شاخوں نے اس کے ہاتھوں کی ملائمت و نزاکت کا خیال رکھے بغیر اپنا کام کر دیا تھا۔

''خاموش۔'' دبے لہجے میں کہتے ہوئے میں سرعت سے نیچے بیٹھا۔ ''دشمن عقب میں ہے بے وقوف۔''

اس نے کراہتے ہوئے گویا انکشاف کیا۔ ''ہمارے ہاتھوں میں کانٹے چبھ گئے ہیں۔''

میں نے درشتی سے کہا۔ ''تو.....''

وہ روہانسا ہو کر چلائی۔ ''تو یہ کہ چیخ خود بہ خود نکل.....''

میں نے ایک دم اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا۔ ''آپ کو مرنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہو چلا ہے۔''

ٹارچ کی روشنی اس طرف آئی۔ یقیناً پہلے اس کا چیخنا اور پھر چلانا دشمنوں کے کانوں تک پہنچ گیا تھا۔ ''نظر آ رہا ہے۔''

اسے ٹارچ کی طرف متوجہ کر کے میں نے بازو سے کھینچا۔ ''اب اٹھو، وہ اسی طرف چل پڑے ہیں۔''

وہ اٹھ کر میرے ساتھ قدم ملانے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ٹارچ کی روشنی لحہ بہ لحہ قریب آ رہی تھی۔ میں نے رفتار بڑھا دی۔ پرما کو سانس چڑھ گیا تھا۔ ہانپتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''کب تک بھاگنا ہوگا؟''

میں اطمینان سے بولا۔ ''اس بارے صرف اللہ پاک ہی جانتا ہے۔''

وہ چڑ کر بولی۔ ''آپ تعاقب کرنے والوں کو قتل کیوں نہیں کر دیتے۔''

''رکے تو گھر جائیں گے۔ میں اکیلا ہوں، ان کی تعداد آٹھ دس افراد سے کم نہ ہوگی۔ اور وہ رائفلوں سے مسلح ہیں جبکہ میرے پاس پستول ہے۔''

اس نے تشویش ظاہر کی۔ ''ہم زیادہ دیر نہیں بھاگ سکیں گے۔''

''جب ہرن یا خرگوش کے پیچھے درندہ دوڑتا ہے تو انھیں آرام و سکون کا خیال تبھی آتا ہے جب کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں۔''

اس نے شگوفہ چھوڑا۔ ''بھاگ دوڑ میں ہمیں خرگوش، ہرن کے بجائے بھینس سمجھو۔''

مجھے ہنسی آ گئی تھی۔

''ہنسومت، اکٹھے ہی مریں گے۔''

میں نے حیرانی ظاہر کی۔ ''میرا نہیں خیال ہم نے کبھی ساتھ مرنے جینے کی قسم کھائی ہو۔''

وہ ہانپتے ہوئے غصے سے بولی۔ ''تو ہمیں مرنے کو اکیلا چھوڑ جاؤ گے۔''

اچانک ہمارے عقب سے تڑتڑاہٹ کی آواز ابھری۔ گولیاں کافی قریب سے چلائی گئی تھیں۔ ایک گولی تو ''شوں'' کی آواز سے میرے سر کے اوپر سے گزری تھی۔ میرے قدموں میں تیزی آئی۔ پرما کے پیروں میں بھی جان پڑ گئی تھی۔ تھوڑا سا آگے جاتے ہی ہم چٹان کے قریب پہنچے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بڑا سا پتھر پڑا تھا۔

گولیوں کی اگلی تڑتڑاہٹ سے پہلے پتھر کی آڑ لیتے ہوئے میں نے پرما کو بھی کھینچ کر بٹھا دیا تھا۔ اس کا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ اور دل کی دھڑکن اتنی بلند تھی کہ مجھے واضح سنائی دے رہی تھی۔ وہ لیٹنے کے انداز میں ڈھیر ہوگئی۔

اس کے پیروں سے پکڑ کر میں نے اس کا مکمل جسم پتھر کی آڑ میں کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ڈر لگ رہا ہے۔''

وہ برجستہ بولی۔ ''کیا نہیں ڈرنا چاہیے۔''

''ڈرنے سے بچت ہوتی تو معترض نہ ہوتا۔'' اطمینان بھرے لہجے میں کہتے ہوئے میں نے پستول ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

وہ ہانپتے ہوئے تلخ ہوئی۔ ''آپ کی تعریفیں سن کر سوچنے لگے تھے کہ شاید ہمیں مکھن سے بال کی طرح انڈیا سے نکال کر لے جاؤ گے۔''

میں نے جواب دیے بغیر قریب آتی روشنی پر نشانہ سادھا۔ ٹارچ کی حرکت سے اندازہ ہوا وہ بھاگتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اچانک وہ رکے اور نیچے جھک کر دیکھنے لگے۔ یقیناً کسی نشانی سے ہمارے جانے کی سمت کا تعین کر رہے تھے۔ میرے اندازے میں اب تک وہ پستول کی رینج میں نہیں آئے تھے۔

مجھے جتانے کو وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔ ''کہتے ہیں دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ پاکستانی کمانڈوز سے اتنے کارنامے منسوب کر دیئے جاتے ہیں کہ سچ مچ کے ہیرو لگتے ہیں، مگر قریب سے دیکھو تو؛ 'تھوتھا چنا باجے گھنا' کی کہاوت پر یقین آجاتا ہے۔''

اس کے کوسنوں پر مجھے ہنسی آئی۔ ''آپ کو کس نے کہا میں کمانڈو ہوں۔''

وہ بیزاری سے بولی۔ ''اتنے دنوں سے میڈیا پر یہی تو سننے کو مل رہا ہے۔''

''یار! میں سنائپر ہوں۔''

وہ بدتمیزی سے بولی۔ ''تمہارا یار، بنتی ہے ہماری جوتی۔''

''معذرت۔'' دبے لہجے میں کہتے ہوئے میں نے سب سے آگے والے پر شست سادھی۔ دو تین ٹارچوں کی روشنی میری معاون و مددگار ثابت ہو رہی تھی۔ گلاک کی کارگر رینج پچاس میٹر ہے اور جب میرا تجربہ پکارا کہ اب وہ رینج میں ہیں۔ میں نے مسلسل تین بار لبلبی دبا دی۔

''ٹھک..... ٹھک..... ٹھک'' کی آواز میں تین کراہوں کی آواز شامل ہوگئی تھی۔ روشنی ساکت ہوئی اور پھر جیسے بھونچال آگیا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے گرنے پر انھوں نے ایک دم کلاشن کوف کا فائر کھول دیا تھا۔ دو گنیں مسلسل گرج رہی تھیں۔ مجھے پہلے سے اندازہ تھا اس لیے فائر کرنے کے ساتھ ہی پتھر کی آڑ میں دبک گیا تھا۔ پرما پہلے سے سکڑی سمٹی میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی تھی۔ گولیوں کے پتھر سے ٹکراتے ہی اس کے حلق سے چیخ نکلی۔

میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ کانپتے ہوئے ہکلائی۔ ''کک..... کچھ نہیں۔''

''فائرنگ روکو اوے لڑکی کو مار دیا۔'' پرما کی چیخنے پر کسی کو غلط فہمی ہوئی تھی۔

جونہی فائرنگ میں وقفہ آیا، میں نے آڑ سے سر نکال کر دشمنوں کی طرف نظر مرکوز کی۔ مگر اب انھوں نے ٹارچیں بجھا دی تھیں۔

یقیناً ہمیں گھیرنے یا مارنے کی منصوبہ بندی ہو رہی تھی۔

اچانک ٹارچ روشن ہوئی۔ ''ٹارچ بجھاؤ۔'' کرخت آواز میں روشنی کرنے والے کو ڈانٹا گیا، شاید ان کے سرغنہ کی

آواز تھی۔ مگر اسے نصیحت کرنے میں دیر ہوگئی تھی۔ کیوں روشنی کی جھلک دیکھتے ہی میں لبلبی دبا چکا تھا۔

نصیحت پر عمل کرنے سے پہلے گلاک کی گولی اس کا مزاج پوچھ چکی تھی۔ تیز چیخ کے ساتھ گالیوں اور گولیوں کی بوچھاڑ ایک ساتھ ہم تک پہنچی تھی۔ فائر جاری رہنے تک میں نے انتظار کیا اور جونہی فائر رکا میں نے پرما کے کان میں سرگوشی کی۔ ''آہستہ سے پیچھے کھسکو۔ آواز نکالی تو اپنے ساتھ مجھے بھی مروادو گی۔''

جواب دیئے بغیر وہ کہنیوں پر زور دے کر پیچھے کھسکنے لگی۔ گولیوں کی دہشت اور موت کے خوف نے اسے حرکت کرنے کا طریقہ سمجھا دیا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جو سبق کتابیں، اساتذہ اور ماں باپ نہ سکھا سکیں وہ عملی زندگی کے چند لمحے سکھا دیتے ہیں۔

دو تین میٹر پیچھے ہوتے ہی ہمیں چٹان کی آڑ میسر آ گئی تھی۔ پرما کو بازو سے پکڑ اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے میں کھڑا ہوا اور ہم دبے قدموں دور ہٹنے لگے۔ چند قدموں کے بعد ہم نے رفتار بڑھا دی تھی۔

دوبار ''ٹخ ٹخ'' ہوئی۔ شاید ہمیں جانچنے کو فائر کیا گیا تھا، مگر ہمارے اور ان کے درمیان بڑی چٹان تھی۔ فرلانگ بھر بھاگنے کے بعد ہلکی سی ڈھلان آئی۔ اور پچاس ساٹھ قدم نشیب کے بعد چڑھائی آ گئی تھی۔

تھوڑا سا بلند ہوتے ہی پرما ہانپنا شروع ہوگئی تھی۔

وہ زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکی تھی۔ رنجیدہ لہجے میں بولی۔ ''ہم تھک گئے ہیں۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''اس مسئلے کا حل کم از کم میرے پاس نہیں ہے۔''

وہ تپتے ہوئے بولی۔ ''پتا نہیں تم جیسے نکمے سنائپروں کو پاکستان آرمی میں بھرتی کیوں کیا جاتا ہے۔ اور سچ کہوں تو اسی لیے تم ہمیشہ انڈین آرمی سے مار کھاتے ہو۔''

''میں یہ تو نہیں کہتا کہ انڈین چینلز کی خبریں نہ سنا کرو، البتہ اتنی نصیحت ضرور کرنا چاہوں گا کہ ہر خبر اعتبار کرنے کو نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی حقائق کا سامنا بھی کر لینا چاہیے۔''

''اور حقائق کیا ہیں۔'' وہ ہانپتے ہوئے رک گئی تھی۔

''حقیقت یہ ہے کہ یہاں رک نہیں سکتے۔'' فضول بحث سے پہلو تہی کرتے ہوئے میں نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

وہ روہانسا ہوئی۔ ''ہم سے نہیں چلا جاتا۔''

''بے وقوف مجھے بھی مرواؤ گی۔'' اسے ڈانٹتے ہوئے میں نے جھک کر اسے کندھے پر اٹھا لیا تھا۔ اس کا جسم اور قد و قامت بالکل پلوشہ کے مماثل تھا۔ پلوشہ کو کندھوں پر اٹھا کر میں کئی کلومیٹر چلتا رہا تھا۔ لیکن تب ہمارے تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ اور اب دشمن بھوکے درندوں کی طرح تعاقب میں تھے۔ میرے کندھوں پر ایس آر ون کا جھولا لدا تھا جس کا مجموعی وزن نو دس کلوگرام کے بہ قدر تو ہوگا۔ اس کے ساتھ پینتالیس پچاس کلوگرام کے بہ قدر پرما کا وزن ملا کر پہاڑی پر تیز رفتاری سے چلنا ٹارزن یا ہرکولیس کے لیے تو ممکن تھا میری یہ اوقات نہیں تھی۔ البتہ ہم رکنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اس لیے رینگ رینگ کر چلنا بھی رکنے سے بدرجہا بہتر تھا۔

پرما معترض نہیں ہوئی تھی۔ اور ہوتی بھی کیسے کہ حالات اسے بھی نظر آ رہے تھے۔ اس کی قربت یا نزدیکی میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ اور جن حالات میں ہم پھنسے تھے، ایسے میں تو جان بچانے کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے۔ نفسانی خواہشات میں ماحول اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جب جان کے لالے پڑے ہوں تو شیطان بھی پیچھا چھوڑ دیتا ہے۔

اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اور اب میری حالت غیر ہونے لگی تھی۔ حسینوں کو گلفام و گل بدن لکھا و پڑھا تو جا سکتا ہے لیکن حقیقت میں جب پھول سا بدن رکھنے والی کو اٹھانا پڑے تو پتا چلتا ہے کہ پھولوں کا بھی وزن ہوتا ہے۔ اور پینتالیس کلو کا پھول ہو چاہے بوری، کندھوں پر ایک سا دباؤ ڈالتے ہیں۔

سوڈیڑھ سو فٹ چڑھائی کے بعد میری ہمت جواب دے گئی تھی۔ اسے آرام سے نیچے اتار کر میں گہرے سانس لینے لگا۔ مشرق کی جانب صبح صادق کی سفیدی نمودار ہو گئی تھی۔ دور کسی جگہ سے صبح کی اذان کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دینے لگی۔ میں نے عقب کا جائزہ لیا، اب تک ٹارچوں کی روشنی نے بلندیوں کے سفر کا آغاز نہیں کیا تھا۔ شاید وہ کمک کا انتظار کر رہے تھے یا ہمیں گھیرنے کے کسی منصوبے پر عمل پیرا تھے۔ یہ بھی ممکن تھا روشنی ہونے کا انتظار کر رہے ہوں۔ کیوں کہ عددی برتری کا صحیح فائدہ وہ روشنی ہونے کی صورت ہی میں اٹھا سکتے تھے۔

پرما کی دلگرفتہ آواز ابھری۔ ''ہمیں اٹھا کر کب تک چلو گے۔''

میں ہنسا۔ ''میرا خیال ہے کافی آرام ہو گیا ہے، اب آپ کو خود چلنا چاہیے۔''

وہ تلخ ہوئی۔ ''تمھیں لگتا ہے ہم چل سکتے ہیں۔''

''نہیں چل سکتیں تو مرنا پڑے گا۔''

''اگر پاکستان زندہ پہنچ گئے تو تمھاری ساری بدتمیزیاں پاپا کے سامنے کھول کر بیان کریں گے۔''

میں متبسم ہوا۔ ''بدتمیزی تو آپ کر رہی ہیں۔ میں تو عزت دے رہا ہوں۔''

اس نے مشورہ دیا۔ ''ہمیں کہیں چھپا کر بھی تو ان کا مقابلہ کر سکتے ہو۔''

''گولیوں کے دودھما کے سنتے ہی آپ نے چیخنا شروع کر دینا ہے۔'' چڑھائی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں نے اس کا بازو تھام لیا تھا۔

وہ بادل نخواستہ قدم بڑھاتے ہوئے ملتجی ہوئی۔ ''وعدہ کرتے ہیں نہیں چیخیں گے۔'' یقیناً اس کی کوشش تھی کہ اسے آرام کرنے کا موقع مل جائے۔

میں نے حقیقت اگلی۔ ''بے وقوف یہاں جتنی دیر گزرے گی ہمارے لیے خطرہ بڑھتا جائے گا۔ ابھی ان کی تعداد کم ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ ایک پستول اور چند گولیوں کے سہارے آخر میں کتنے آدمیوں سے مقابلہ کر پاؤں گا۔''

وہ زیر لب کچھ بڑبڑا کر رہ گئی تھی۔ میں اسے گھسیٹتا ہوا اوپر لے جانے لگا۔

وہ منمنائی۔ ''ہمیں گرمی لگ رہی ہے اور سردی بھی۔'' بھاری کوٹ اس نے پہنا ہوا تھا۔ اور مسلسل بھاگ دوڑ کی وجہ سے اسے گرمی تو لگنا تھی۔ خود میں پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ سردی کے باوجود مشقت ہمیں اس نہج تک لائی تھی۔ اور پسینے کی وجہ سے جونہی رکتے سردی لگنے لگتی۔ اور حرکت کرنے پر گرمی محسوس ہوتی۔

چند قدم مزید لیتے ہی اس نے کوٹ اتار کر میری طرف بڑھایا۔ ''یہ کوٹ پکڑو جب ضرورت ہو گی ہم لے لیں گے۔''

میں ہنسا۔ ''پہننا آپ نے ہے اور اٹھاؤں میں۔''

وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''تھوڑی دیر پہلے ہمیں بھی اٹھایا ہوا تھا، کوٹ کا وزن ہم سے تو کم ہی ہو گا۔''

میں نے کوٹ کندھے پر رکھ لیا کہ چوں چرا کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ حکم دینے کی عادت سے مجبور تھی یا مجھ پر اپنا کوئی خصوصی استحقاق سمجھ رہی تھی۔ اس سے مجھے کوئی غرض نہیں ہونا چاہیے تھی۔ بلکہ شکر کرنا چاہیے تھا کہ کم از کم وہ ساتھ چلنے پر تو

تیار تھی اور استطاعت و حوصلے سے زیادہ ساتھ دے رہی تھی۔ اگر باپ کے پاس نہ لوٹنا چاہتی تو میں کیا کر لیتا۔ میرے نزدیک تو انصاری صاحب کی خوشنودی معنی رکھتی تھی۔

کوٹ مجھے پکڑا کر اس نے گاؤن اتار کر پھینک دیا تھا۔ میں نے اعتراض کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

پہاڑی کی بلندی تک پہنچنے تک ملگجا اجالا ہو گیا تھا، جو بتدریج روشنی میں تبدیل ہونے لگا۔ پرما نے گرم ٹوپی سر سے اتار کر ہاتھ میں پکڑی لی تھی۔ اس کی نیلی جینز، سرخ پھولدار قمیص اور جرسی مٹی مٹی ہو گئی تھی۔ جھاڑیوں میں گرنے کی وجہ سے ہاتھوں میں کانٹے چبھنے کے ساتھ چہرے پر ایک دو ہلکی خراشیں آئی تھیں۔ دائیں گال پر سرخ لکیر جیسی بن گئی تھی۔ ماتھے پر بھی ہلکا سا خون لگا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ مضمحل اور تھکی تھکی لگ رہی تھی۔ چوٹی پر پہنچتے ہی لمبا پڑتے ہوئے اس نے اعلان کیا۔

''ہم سے مزید چلنے کی توقع کرنا عبث ہوگا۔''

اسے پہاڑی کے دامن میں نظر آنے والے دشمنوں کی طرف متوجہ کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ''پہلے نیچے دیکھ لو، پھر کوئی دعویٰ کرنا۔''

وہ روہانسا ہوئی۔ ''یہ کب ہمارا پیچھا چھوڑیں گے۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''جب آپ دنیا چھوڑ دیں گی تب۔''

وہ بددلی سے بولی۔ ''اب تو لگتا ہے موت کے دامن ہی میں پناہ لینا پڑے گی۔''

میں بیگ کھول کر ایس آر ون کو جوڑتے ہوئے اعتماد سے بولا۔ ''جب تک میں زندہ ہوں آپ کو کوئی اور سہارا ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔''

وہ سرعت سے بولی۔ ''سچ میں۔'' نجانے کیوں اس کا لہجہ مجھے معنی خیز لگا تھا۔

میں نے اپنے خلوص کا یقین دلایا۔ ''ان شاء اللہ۔'' اس دوران میرے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ چند لمحوں میں ایس آر ون اپنے اصل روپ میں آ گئی تھی۔ میگزین بھر کر میں نے رائفل پر چڑھائی اور پیچھے لیٹ گیا۔ دشمنوں کی پیش قدمی میں رکاوٹ ڈالنے کو ان کے دل میں خوف ڈالنا ضروری تھا۔ ورنہ ہمیں بے دست و پا سمجھ کر ان کی جرأت و حوصلہ بڑھ جاتا۔

اس نے سادگی سے پوچھا۔ ''اتنی دور سے انھیں نشانہ بنا لو گے۔''

میں انکساری سے بولا۔ ''کوشش تو کرنا پڑے گی۔''

''گرینڈ پاپر گولی آپ نے چلائی تھی یا لورا براؤن نے۔''

میں نے جواب گول مول کیا۔ ''کسی ایک نے تو چلانا تھی۔''

اس نے تصدیق چاہی۔ ''کیا سچ میں اڑھائی کلومیٹر کے فاصلے سے گولی چلائی گئی تھی۔''

میں نے اصل فاصلہ بتایا۔ ''دو کلومیٹر۔''

وہ اطمینان سے بولی۔ ''پھر تو یہ فاصلہ کم ہے۔''

ضروری کارروائی کے بعد میں نے رائفل کا بٹ کندھے میں دبایا اور سب سے آگے والے پر شست سادھ لی۔ وہ غیر منظم انداز میں چلتے ہوئے جھاڑیاں کھنگالتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہم ایک کم بلند پہاڑ پر موجود تھے۔ لیکن یہ پڑاؤ عارضی تھا۔ بدقسمتی سے ہم کمین گاہ منتخب کرنے کی حالت میں نہیں تھے۔ ہمیں تعاقب کرنے والوں کی پیش قدمی میں رکاوٹ ڈال کر آگے بڑھنا تھا۔ وہ پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ یقیناً بندوں کے زخمی ہونے کے بعد انھوں نے اندھیرے میں آگے بڑھنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ ممکن تھا وہ کمک منگوا چکے ہوں، جو ان کے پاس پہنچنے والی ہو۔ یہ گمان بھی

بعید از قیاس نہیں تھا کہ سڑک کے ذریعے وہ آگے کا گھیراؤ کر چکے ہوں۔ وہ چند غنڈوں کی ٹولی نہیں تھی کہ ان کے پاس وسائل کی کمی ہوتی۔ وگنیش شکلا یعنی منوج جوشی جرم کی دنیا کا نامی گرامی شخص تھا۔ وہ پوری طاقت کے ساتھ ہمارے خلاف میدان میں اتر چکا تھا۔ بلاواسطہ انھیں را کی مدد بھی حاصل تھی۔ گومتا دیدی کی وجہ سے رامیں میرے بھی ہمدرد پیدا ہو گئے تھے لیکن وہ کھل کر سامنے نہیں آسکتے تھے۔ جبکہ پولیس تو یوں بھی وگنیش کی زرخرید تھی۔

وہ اکیلی ٹیکری نہیں تھی جسے وہ گھیر لیتے۔ ہمیں دوسری جانب گھیرنے کو بھی انھیں پہاڑی کی بلندی ضرور عبور کرنا پڑتی۔

''ایک گولی چلانے کو اتنی دیر لگا دی۔'' مجھے سوچ میں کھویا دیکھ کر وہ استفسار کرنے لگی۔

میں نے وضاحت کی۔ ''سوچ میں نہیں کھویا، ان کے مناسب جگہ پر آنے کا منتظر ہوں۔ اگر یہیں گولی چلا دی تو صرف ایک ہی کو زخمی کر سکوں گا، جبکہ جھاڑیوں سے نکل کر نشیب میں اتر آئے تو تین چار کو نشانہ بنالوں گا۔''

''زخمی کیوں؟ جان سے مار دو ان خبیثوں کو۔'' وہ اپنے متعلق ان کے ارادے سن چکی تھی، تبھی صحیح تپی ہوئی تھی۔

میں ہنسا۔ ''کبھی کبھار دشمن کو زخمی کرنا، ہلاک کرنے سے زیادہ کارآمد رہتا ہے۔''

اس نے حیرانی کا اظہار کیا۔ ''کیسے؟''

میں نے وضاحت کی۔ ''قتل ہونے والے کی لاش کو پھینک کر آگے بڑھنا مشکل نہیں ہوتا، لیکن زخمی سنبھالنے کو ایک دو آدمی ساتھ چھوڑنا پڑتے ہیں۔ اسی طرح زخمیوں کی چیخ و پکار بھی مورال پر برا اثر ڈالتی ہے۔''

نشیب میں بھی جھاڑیاں موجود تھیں مگر زیادہ گھنی نہیں تھیں۔ میں نے آگے والے کی دائیں ٹانگ پر نشانہ سادھتے ہوئے لبلبی دبا دی۔

وہ نیچے گرا اور پھر ٹانگ کو پکڑ کر دہرا ہو گیا۔ اس کی چیخ تو سنائی نہیں دی تھی البتہ کھلا منہ ٹیلی اسکوپ سائیٹ میں نظر آرہا تھا۔

''شاباش، ایک تو گیا۔'' پرما کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ تب تک میں رائفل کاک کر کے لبلبی دبا چکا تھا۔

وہ چہکی۔ ''دوسرا بھی۔''

تیسری بار لبلبی دبانے پر باقی جھاڑیوں میں روپوش ہو چکے تھے اور وہاں تین زخمی ہی پڑے تھے۔

پرما نے فیصلہ صادر کیا۔ ''آپ تو بہت اچھے فائر ہیں، بس تمام کو کھلا اس کر دیتا کہ سفر تو اطمینان سے کر سکیں۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''کوئی نظر آرہا ہے کہ گولی چلا سکوں۔''

وہ جلدی سے بولی۔ ''کب تک چھپیں گے۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''بے وقوف ہمارے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہے کہ ان کے دوبارہ سامنے آنے کا انتظار کر سکیں۔''

وہ دلگرفتگی سے بولی۔ ''کیا ارادہ ہے۔''

میں ایس آر ون کو سرعت سے بیگ میں منتقل کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ تھوڑی دیر دیکھے رہیں گے۔ اس اثناء میں ہمیں ان سے زیادہ سے زیادہ فاصلہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ جلد ہی انھیں کمک مل جانا ہے۔ اور اتنی تعداد میں دشمن پہنچ جائیں گے کہ مقابلہ کرنا ممکن ہی نہیں رہے گا۔''

اس نے منہ بسورا۔ ''آپ ہمیں مسلسل ڈرا رہے ہیں۔''

''ہمیں چند قدم رینگ کر عقبی ڈھلان تک پہنچنا ہوگا۔ اگر چل کر گئے اور دشمن نے دیکھ لیا تو انھیں ہمارے فرار کا پتا چل جائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے بیگ کندھوں میں ڈالا اور رینگتے ہوئے عقبی ڈھلان کے پاس پہنچ گیا۔ پرما کو

کرالنگ کرنا نہیں آتا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل پر چوپائیوں کی طرح چلتے ہوئے میرے پیچھے پہنچ گئی تھی۔ محفوظ آڑ میں آتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈھلان اترنا اتنا مشکل نہ تھا۔ البتہ اسے پھسلنے سے بچانے کو مجھے اس کا ہاتھ تھامنا پڑا۔

روشنی میں سفر کرنا آسان تھا۔ ڈھلان میں یوں بھی تیزی سے سفر کیا جا سکتا ہے۔ وہ بلندی جس پر ہم گھنٹے سے بھی زیادہ وقت لگا کر چڑھے تھے، چند منٹ میں طے کر کے نیچے پہنچ گئے۔

اس نے انکشاف کیا۔ ''ہمیں پیاس لگی ہے اور بھوک بھی محسوس ہو رہی ہے۔''

''صبر کرو۔'' اطمینان سے کہتے ہوئے میں آگے بڑھ گیا۔ وہ میرے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''کیا مطلب صبر کرو۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''جب کھانے پینے کو کچھ میسر نہ ہو تو ہمارے ہاں بھوکے پیاسے لوگ جو کرتے ہیں، اسے صبر کہتے ہیں۔''

وہ تلخی سے بولی۔ ''کبھی اچھے الفاظ بھی منہ سے نکال لیا کرو، ہر وقت خون جلانے اور دماغ خراب کرنے میں لگے رہتے ہو۔''

میں برہم ہوا۔ ''ہم بازار میں نہیں پھر رہے، نہ آپ کے ڈرائینگ روم میں براجمان ہیں، پھر ایسا تقاضا کرنے کی کوئی تک بنتی ہے۔''

وہ نادم ہوئی۔ ''ہم نے سوچا شاید بیگ میں کچھ کھانے کو رکھا ہو۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''اچھا مذاق ہے۔''

وہ خاموش ہو گئی تھی۔ لیکن اسے خاموش کرانا مسئلے کا حل نہیں تھا۔ لامحالہ وہ زیادہ دیر بھوکی پیاسی نہ رہ پاتی۔ گو پانی ملنے امید قوی تھی، البتہ کھانے کو کچھ ڈھونڈنا کافی دشوار تھا۔

''ہم تھک گئے ہیں۔'' وہ زیادہ مسافت طے نہیں کر سکی تھی۔ ایک بار پھر تھکن کا اعلان کرنے لگی۔ بلاشبہ جتنا سوچا تھا اس سے کئی گنا زیادہ مشکلات پیدا کر رہی تھی۔

میں شاکی ہوا۔ ''آپ سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کر رہیں۔ جانتا ہوں ایسے حالات سے آپ کا پہلی بار واسطہ پڑ رہا ہے۔ لیکن یقین مانو رونے پیٹنے اور واویلا کرنے سے بچت نہیں ہو سکتی۔ ہماری پہلی ترجیح جان بچانا ہے۔ اس لیے تھوڑا برداشت کرو۔ میں بھی تو آپ کے ساتھ ہوں۔''

اس نے منہ بسورا۔ ''آپ فوجی ہیں اور ہم نرم و نازک لڑکی ہیں۔''

میں متبسم ہوا۔ ''میں نے اتنا وزن بھی تو اٹھایا ہوا ہے۔''

''پلیز ہم سے اور نہیں چلا جاتا۔ تھوڑی دیر بیٹھ جاتے ہیں ناں۔'' ملتجی ہوتے ہوئے اس نے قدم روکے اور پھر بغیر میری اجازت کے پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔

میں نے اسے تھوڑی دیر بیٹھنے دیا۔ وہ گہرے سانس لے کر تھکن اتارنے لگی۔

''پاؤں کے تلوے، جل رہے ہیں اور درد کر رہے ہیں۔'' اس نے بوٹ اتارنے کو ہاتھ بڑھایا۔

''بوٹ مت اتارو۔'' میں نے فوراً منع کر دیا تھا کیوں کہ ایک بار وہ بوٹ اتار دیتی تو دوبارہ پہننا دشوار ہو جاتا۔ ممکن تھا اس کے پاؤں پر چھالے بنے ہوتے۔ سخت پتھریلی زمین پر اتنا زیادہ پیدل چلنے کی وجہ سے چھالوں کا بننا حیران کن نہیں تھا۔ ایسا شخص جو کبھی اتنا زیادہ پیدل نہ چلا ہو اس کے پاؤں کا جلنا، پنڈلیوں میں درد ہونا اور پاؤں کے تلوؤں پر چھالے بننا عام سی بات ہے۔ وہ تو کچھ زیادہ ہی نرم، ملائم و نازک تھی۔ امراء کی تو ورزش بھی آرام و آسائش اور مزے والی

ہوتی ہے۔موسم کی مناسبت سے جم کا درجہ حرارت ہوتا ہے۔ٹریڈمل پر دوڑتے ہیں،فوم پر لیٹ کر ہلکا پھلکا مل جل لینا ہی ان کے نزدیک کافی ہوتا ہے۔جنھیں سردیوں میں ہیٹر اور گرمیوں میں اے سی کی سہولت ہر دم، ہر گھڑی میسر ہو وہ موسم سے لڑنے کی صلاحیت بالکل نہیں رکھتے۔آرام طلبی اور جسمانی آسائشیں انسان کو ناکارہ کر دیتی ہیں۔سونے پہ سہاگا، ڈبوں کی غذاء، مصنوعی مشروبات اور منرل واٹر کر دیتے ہیں۔یوں انسان کے مدافعاتی نظام کی صلاحیت صفر رہ جاتی ہے۔

مگر میرے منع کرنے کے باوجود وہ نہ رکی اور بوٹ اتار دیے۔باریک جرابیں اتار کر وہ سرخ ہوتے تلوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے رنکھی ہوئی۔

''چھالے بن گئے ہیں۔''

میں اطمینان سے بولا''کوئی انہونی بات نہیں ہے، پہاڑی علاقے میں زیادہ چلنے پر چھالے بن جایا کرتے ہیں۔''

وہ تشویش سے بولی۔''اب ہم چلیں گے کیسے۔''

میں نے درخت کی شاخ سے کانٹا توڑا اور جونہی نیچے بیٹھ کر اس کے پاؤں کو ہاتھ لگایا، اس نے جلدی سے پاؤں کھینچنے کی کوشش کی، یقیناوہ میرا ارادہ جان گئی تھی۔

''کچھ نہیں ہوتا، اتنی نزاکت مت دکھاؤ کہ مجھے اٹھنا پڑے۔''

اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔''ہم خود چھوئیں گے۔''

''چھالے کا پانی نہ نکالا تو زخم بن جائے گا۔اور بے فکر رہو، چھالے کی جلد بے جان ہوتی ہے۔''

''جانتے ہیں، مگر پھر بھی ڈر لگ رہا ہے۔''

''کچھ نہیں ہوتا۔''اس کی پنڈلی پر گرفت بڑھاتے ہوئے میں نے کانٹے کی نوک چھالے میں اتار دی۔

جھرجھری لیتے ہوئے اس نے زور سے۔''سی.....سی۔''کیا، لیکن زیادہ درد نہ ہوتا دیکھ کر چپ سادھ لی۔

کانٹے کو چھالے کے آر پار گزار کر میں نے چند لمحے اندر رہنے دیا تا کہ چھالے کا فاسد پانی جلد سے باہر نکل جائے۔پھر بیگ سے نئی سوتی جرابیں نکال کر اسے پہننے کو دیں۔

جرابیں ڈال کر اس نے بڑی مشکل سے بوٹ پہنے۔ہم نے چار پانچ منٹ آرام کر لیا تھا۔مزید وہاں بیٹھنا مناسب نہیں تھا۔

''اب اٹھ جاؤ۔''میں کھڑا ہو گیا۔

زمین پر ہاتھ ٹیک کر وہ بڑی مشکل سے کھڑی ہوئی۔چہرے پر بارہ بج رہے تھے۔حالات کی نزاکت اس کی نظر سے بھی اوجھل نہیں تھی۔

چند قدم لیتے ہی اس نے مجوبانہ انداز میں ایک انگلی اٹھائی۔

''ایک منٹ، ہم ابھی آئے۔''اور ایک گھنی جھاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

موقع غنیمت جانتے ہوئے میں نے بیگ نیچے رکھا اور اس سے مخالف جانب ایک اور جھاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

فطری تقاضے انسان کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔اور یہی کمزوریاں ہیں جو انسان کو اس کی حیثیت یاد دلاتی رہتی ہیں۔انسان نہ بھوک پیاس برداشت کر سکتا ہے اور نہ خوراک کو زیادہ دیر پیٹ کے اندر رکھ سکتا ہے۔

تازہ دم ہو کر ہم دونوں جانے کو تیار ہو گئے۔مگر وہاں سے آگے بڑھنا شاید ہماری قسمت میں نہ تھا۔میں نے جونہی ایس آر ون کا بیگ کندھوں میں ڈال کر پرما کو چلنے کا اشارہ کیا، اچانک جھاڑیوں کی اوٹ سے دو مسلح افراد برآمد ہوئے۔

''راجا۔''پرما سراسیمگی سے چیخی تھی۔یقیناً دشمنوں کی کمک پہنچ گئی تھی۔

''خبردار۔'' ایک نے چیختے ہوئے پستول والا ہاتھ سیدھا کرنے کی کوشش کی، مگر میں اسے خبردار کیے بغیر جارحانہ قدم اٹھا چکا تھا۔ میری انگلی نے سرعت سے دو مرتبہ لبلبی دبائی دونوں مردہ چھپکلیوں کی طرح نیچے گرے تھے۔

میں پرما کا ہاتھ تھام کر واپس بھاگ پڑا۔ وہاں دم بہ دم خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اور میرے لیے پرمادہ کمبل ثابت ہو رہی تھی جسے نہ چھوڑا جا سکے اور نہ اوڑھا جا سکے۔ وہ ایسا بھاری بوجھ تھی جسے کندھوں سے اتارنا ممکن نہ تھا۔

خطرے کو دیکھتے ہی پرما کی ٹانگوں میں بھی بجلی بھر گئی تھی۔ وہ میرے ساتھ قدم ملانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ جھاڑیاں جہاں ہماری مددگار تھیں وہیں دکھاؤ کو بھی محدود کر رہی تھیں۔

ہم ڈیڑھ دو سو قدم سے زیادہ فاصلہ طے نہیں کر سکے تھے کہ ایک اور قیامت ٹوٹ پڑی۔ ایک جھاڑی کی اوٹ سے نکلتے وقت کوئی پوری قوت سے مجھ سے ٹکرایا تھا۔ میں منہ کے بل گرنے لگا۔ بڑی مشکل سے چہرے کے سامنے ہاتھ ٹیک کر میں نے تھوبڑے کا بچاؤ کیا۔ پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

جب تک سنبھل کر اٹھتا دو رائفلیں ہم پر تن چکی تھیں۔ ایک میرے سامنے کھڑا تھا۔ بھاری جثے اور لمبی قامت کا دیو نما شخص، جبکہ عقب میں چھریرے بدن کا جوان تھا۔

بھاری جثے والے نے کرخت لہجے میں دھمکایا۔ ''ذرا سی غلطی تمہیں نرگ میں پہنچا دے گی۔''

میں گہرا سانس لے کر رہ گیا تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں، اپنے اور سامنے والے کا درمیانی فاصلہ ناپا، مگر اس پر حملہ کرنے سے کامیابی ملنے کی امید نہ ہونے کے برابر تھی۔ کیوں کہ اس کا دوسرا ساتھی جو میرے عقب میں کھڑا تھا وہ اس اثناء میں مجھے آسانی سے نشانہ بنا سکتا تھا۔

بھاری جثے والے نے حکم دیا۔ ''بیگ اتار دو بالک۔'' میں نے بیگ نیچے پھینک دیا۔

اگلا حکم ملا۔ ''پستول کو میری طرف ٹھوکر مارو۔''

میں نے بے چوں و چرا اس کے کہنے پر عمل کیا کہ اب تک گیند اس کے کورٹ میں تھی۔

اس کے لبوں پر تمسخرانہ تبسم ابھرا۔ ''کیا سوچا تھا، اس بلبل کے ساتھ بھاگنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔''

میں خاموش رہا۔

''بے فکر رہو، آسان موت تمہارے نصیب میں نہیں ہے۔ تم نے میرے بہت سے قیمتی بندے ناکارہ و ضائع کر دیئے ہیں ایک ایک کا پورا انتقام لوں گا۔ البتہ تھوڑا صبر کرنا پڑے گا کہ تم سے پہلے اس بلبل کا نمبر ہے جس کی تصویر دیکھ کر میری راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں اور تمہاری تلاش کو کارندوں کی صوابدید پر چھوڑے بغیر مجھے خود ساتھ آنا پڑا۔''

پرما سخت متوحش اور خوفزدہ لگ رہی تھی۔ اس کی سہمی ہوئی نظریں غنڈوں کا دیدار کر کے مجھ پر گڑی تھیں۔ کیوں کہ شعوری و لاشعوری طور پر وہ مجھے اپنا محافظ سمجھتی تھی۔ اور یہ سمجھنا کچھ غلط بھی نہ تھا کہ میں مسلسل ایسے محافظ کے روپ میں سامنے آ رہا تھا، جو نہ صرف اس کی جان بچا رہا تھا بلکہ ہر ضرورت و تقاضے کا بھی خیال رکھ رہا تھا۔

میرے عقب میں موجود دشمن نے مشورہ دیا۔ ''باس! نکلنا چاہیے، ورنہ پولیس پہنچ گئی تو صرف انعام کی رقم ہی مل پائے گی، یہ پھول رسائی سے دور ہو جائے گا۔''

باس مکروہ انداز میں بولا۔ ''یار سنیل! کہیں جانے کا وقت ہے نا مجھ میں اتنا صبر۔ جو کچھ ہوگا، یہیں ہوگا۔ پولیس آ گئی تو انھیں بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کا موقع مل جائے گا۔ یوں بھی اس معاملے میں پولیس اور ایجنسیوں کی مدد ہمارے ساتھ ہے۔''

''پھر جلدی کرو باس۔'' سنیل نے اتفاق کرتے ہوئے میری طرف اشارہ کیا۔ ''میرا خیال ہے اسے گولی مار دیتے

ہیں۔"

باس زہر خند ہوا۔"اتنی آسان موت اس کی قسمت میں کہاں۔یہ پہلے اپنی محبوبہ کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔پھر ہمارے زخمی و مرنے ساتھیوں کا حساب کتاب دے گا۔

میں نے مہلت کے حصول کو انھیں باتوں میں لگانا چاہا۔"میں تمھیں دگنی رقم دے سکتا ہوں۔"

پرما کی جانب اشارہ کرتے ہوئے باس نے کریہہ قہقہہ بلند کیا۔"کیا لگتا ہے، پورن سنگھ پیسوں کی خاطر اس بلبل سے دست بردار ہو جائے گا۔"

میں نے جلدی سے صفائی پیش کی۔"منوج جوشی کو لڑکی چاہیے اور تمھیں رقم۔اپنی حاجت پوری کر کے اسے منوج جوشی کے حوالے کرنا اور رقم بٹور لینا۔اور جتنی رقم منوج جوشی دے گا اس سے دگنی رقم مجھ سے لے لینا۔بلکہ اس لڑکی نے بھی کروڑوں کا زیور پہنا ہے، وہ بھی تمھارا ہوا۔"

پورن سنگھ طنزیہ لہجے میں بولا۔"سالے موت کو سامنے پا کر اپنی محبوبہ ہی سے دست بردار ہو گیا ہے۔"

میں نے بات بنائی۔"میری محبوبہ ہے نہ اس سے کوئی اور رشتا ہے۔ایک شخص نے اسے لانے پر بھاری رقم کی ادائی کا وعدہ کیا تھا۔اگر نا کام ہوا تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑے گا۔"

پرما بے بسی سے چلائی۔"آپ ایسا نہیں کر سکتے۔بھول گئے ہماری حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔"

میں اطمینان سے بولا۔"محترمہ، پہلے اپنی جان ہوتی ہے۔اور پھر کسی اور کا نمبر لگتا ہے۔"

"تف ہے تمھاری یہ مردانگی پر۔ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تم اتنے بودے، کمزور و بزدل نکلو گے۔ذلیل انسان حفاظت نہیں کر سکتے تھے تو وعدہ کیوں کیا تھا۔"

پورن سنگھ نے قہقہہ لگایا۔سنیل نے اس کا ساتھ دیا تھا۔"واہ، یہاں تو وعدے و قسمیں یاد دلائی جا رہی ہیں۔ارے میری بلبل، پورن سنگھ کو سامنے پا کر بڑے بڑوں کی شلوار گیلی ہو جاتی ہے اس لونڈے کی حیثیت ہی کیا ہے۔"

پرما طیش میں چلائی۔"ایسے غلیظ اور خبیث شخص سے قول و قرار باندھتی ہے ہماری جوتی۔"

"بکواس بند کرو گھٹیا عورت۔"میں جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

"ٹھہرو، رکو....."پورن سنگھ چلایا۔

میں نے ان سنا کرتے ہوئے پرما کی طرف پیش قدمی جاری رکھی۔وہ سہم کر الٹے قدم پیچھے ہٹنے لگی۔شوخ آنکھوں میں بے یقینی و خوف ابھر آیا۔لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے مجھے زوردار ٹھوکر لگی۔جس میں میری منشا کا گہرا عمل دخل تھا۔میں منہ کے بل نیچے گرنے لگا، کہ کبھی کبھار جیتنے کو گرنا پڑتا ہے۔

زمین سے ٹکرانے تک میرا دایاں ہاتھ ویبلے (Weblay) ریوالور کو قبضے میں کر چکا تھا۔میرا زیادہ دھیان چونکہ ریوالور کی طرف تھا اس لیے زمین سے ٹکرانے پر اچھی خاصی چوٹ لگی تھی۔میرے منہ سے زوردار کراہ نکلی۔

پورن سنگھ اور سنیل نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔میری درگت پر انھیں خوشی ہوئی تھی۔

ریوالور میرے دائیں ہاتھ کی گرفت میں چھاتی کے نیچے دبا تھا۔میرے انگوٹھے نے مہارت سے سیفٹی ہٹائی۔اور بایاں ہاتھ زمین پر ٹیک کر میں نے اٹھنے کی اداکاری کی، جسم کے تھوڑا سا اوپر ہوتے ہی میں زوردار جھٹکے سے یوں پلٹا کہ میری پیٹھ زمین سے ٹکرائی اور ریوالور کو دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے میری پہلی گولی نے سنیل کی کھوپڑی کو بوسا دیا اور پھر برقی کوندے کی طرح نال کو پورن سنگھ کی طرف موڑ کر دو بار لبلبی دبا دی۔

میں نے پورن سنگھ کے دائیں ہاتھ کو نشانہ بنایا تھا۔کیوں کہ اس نے سرعت سے رائفل سیدھی کی تھی۔اگر اس کے سر

میں گولی مارتا تو اندیشہ تھا، وہ گولی چلانے میں کامیاب رہتا۔ اور بیرل کا رخ میری جانب ہونے کی وجہ سے رائفل کی گولیاں اپنا کام کر جاتیں۔ کیوں کہ اس کا دماغ ختم ہونے سے پہلے انگلی کو ٹریگر پر دباؤ بڑھانے کا حکم جاری کر چکا ہوتا۔ یوں مرتے مرتے بھی اس کی رائفل میرا کام کر جاتی۔

میری تجویز کے نصیب میں آدھی کامیابی لکھی تھی۔ کیوں کہ گولیوں کے جھٹکے سے بیرل کا رخ تو تبدیل ہو گیا تھا، البتہ لبلبی دبانے میں وہ کامیاب رہا تھا۔ ''تڑتڑتڑ'' کی آواز سے گولیوں کا چھنا برآمد ہوا، لیکن دوبارہ فائر کرنے کے قابل وہ نہیں رہا تھا۔ گولیاں اس کی ہاتھ کی پشت میں گھسی تھیں۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نیچے گری۔ وہ بے ساختہ دایاں ہاتھ بغل میں داب کر خون روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ گٹر کی مانند غلاظت اگلنے والے ہونٹوں سے کراہیں خارج ہونے لگیں۔

''اب بتاؤ بالک! تم راجکماری کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔''

وہ ہکلایا۔ ''ہم معاہدہ کر سکتے ہیں۔''

میں نے اٹھتے ہوئے استہزائی قہقہہ بلند کیا۔ ''سچ میں ایسا ہی سوچتے ہو۔'' ساتھ ہی ریوالور والا ہاتھ سیدھا کیا۔

''نن..... نہیں..... پلیز بھگوان کے لیے.....'' اس نے گڑگڑا کر جان بچانے کی کوشش کی، مگر وہ ایسا کردار نہ تھا جسے زندہ چھوڑنے کی بابت غور کیا جا سکتا۔ لبلبی دبا کر میں دھرتی کا سینہ اس کے گندے وجود سے پاک کیا۔ وہ جھٹکا لگنے سے پشت کے بل گرا تھا۔

''آپ بہت برے ہیں۔'' میں جیسے ہی مڑا، وہ آنکھیں نم کرتے ہوئے قریب آئی اور میری چھاتی پر مکا رسید کرتے ہوئے بولی۔ ''ایسے بکواس کی جاتی ہے۔''

میں شاکی ہوا۔ ''تو آپ سچ جھوٹ میں تمیز نہیں کر سکتیں۔''

وہ محجوب ہوئی۔ ''آپ کے انداز نے ہمیں چکرا دیا تھا۔ لگا آپ سچ میں ہمیں ان کے حوالے کرنے والے ہیں۔''

''وہ مسلح تھے۔ انھیں قابو کرنے کو کوئی ترکیب تو کرنا تھی۔ اور اب تیاری پکڑو گپ شپ کا وقت نہیں ہے۔'' میں بیگ اٹھانے کو بڑھا۔ مگر جیسے ہی جھکا اچانک دوڑتے قدموں کی آواز سماعتوں میں پہنچی۔ میں جھٹکے سے کھڑا ہوا۔ وہ دو افراد تھے۔ دونوں ہی مسلح تھے۔

''خبردار۔'' آگے والے نے بھاگتے ہوئے پستول سیدھا کرنا چاہا۔ مگر میں اس کے دھمکانے سے پہلے لبلبی دبا چکا تھا۔ وہ تیز رفتاری سے دوڑتا ہوا میرے کافی قریب پہنچ چکا تھا۔ گولی کھانے کے بعد بھی ایک دو قدم لے کر گرا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں دوبارہ لبلبی دباتا اس کے عقب میں بھاگنے والا میرا پرانا دشمن توپ سے نکلے گولے کی طرح اڑتا ہوا مجھے ٹکرایا اور ساتھ لیتا ہوا نیچے گر گیا۔ یقیناً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ پرانے دشمن سے میری کیا مراد ہے۔ وہ کرن چاولہ تھا۔ اس کا اپنے ساتھی کو آگے رکھنے کا مقصد بھی میری گولی سے بچنا تھا۔

ریوالور میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ میں نے، گرتے ہوئے حواسوں کو خیرباد نہیں کہا تھا۔ کیوں کہ ذرا سی سستی میرے ہاتھ میں عدم آباد کا ٹکٹ پکڑا سکتی تھی۔ کرن چاولہ سخت جان حریف تھا۔ اس کے خالی ہاتھ ہونے پر بھی اس پر قابو پانا مشکل تھا تو مسلح ہو کر تو بلاشبہ سوا سیر ہو جاتا۔

میں نے فوراً اس کے پستول والے ہاتھ پر قبضہ جمانے کی کوشش کی۔ مگر اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا اور لوٹ لگاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

میں نے بھی سستی نہ دکھائی اور جیسے ہی کھڑے ہوتے ہوئے اس نے پستول والا ہاتھ سیدھا کیا، تب تک، نصف اٹھتے ہوئے میں نے زور سے ٹانگ چلائی۔ میرا دایاں پاؤں اس کے پستول والے ہاتھ سے ٹکرایا اور میں دوبارہ پیچھے گر

گیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا تھا۔

میں الٹی قلابازی لے کر اس سے دو قدم دور کھڑا ہو گیا۔ ہونٹوں پر تمسخرانہ تبسم لیے وہ مجھے حقارت سے دیکھ رہا تھا۔ لحظہ بھر کے انتظار کے بعد اس کے لبوں سے نکلا۔

''تمھیں سالا کہوں یا برادر نسبتی۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''منہ بولا رشتا ہے، پتا جی یا جیجا جی بھی چل جائے گا۔''

''وہ تو تھوڑی دیر بعد تم کہو گے۔ باقی تمھاری دیدی نے بڑی منتیں کی ہیں کہ تمھاری جان بخشی کر دوں۔ اور دیکھ لو اس کے کہنے پر تم پر دور سے گولی نہیں چلائی۔ البتہ ہاتھ پاؤں توڑنے سے اس نے منع نہیں کیا تھا اس لیے یہ تکلیف برداشت کرنا پڑے گی سالا جی۔''

میں نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔ ''خواب دیکھنے پر پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔''

اس نے پیش کش کی۔ ''تمھارا مشن مکمل ہو گیا ہے، اب اس بلبل کو چھوڑ دو، جانے کی اجازت دے دوں گا۔''

پرما افسردگی سے بولی۔ ''آپ تو گرینڈ پا کے دوست تھے۔''

''دشمن تو تمھارا بھی نہیں ہوں بے بی! اتنی خوب صورت لڑکی سے دشمنی کون کر سکتا ہے۔''

وہ ملتجی ہوئی۔ ''پلیز ہمیں جانے دو، ورنہ ماما ہمیں قتل کر دے گا۔''

وہ زہر خند ہوا۔ ''نہیں بے بی! وہ قتل نہیں کرے گا، کیوں کہ اس کے پاس تمھاری کئی پھٹی اور زیادتی کا شکار لاش جائے گی۔ باقی پاکستانی کمانڈو سے عشق لڑانے کی سزا تو تمھیں کاٹنا پڑے گی۔''

میں نے حیرانی ظاہر کی۔ ''تم سے اس گھٹیا پن کی توقع نہیں تھی۔''

وہ اوچھے پن سے بولا۔ ''خود دن رات مزے لوٹ رہے ہو، ہماری باری پر اعتراض کیوں۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''سچ کہو کیا کسی لڑکی کی مرضی کے بغیر میں ایسا کر سکتا ہوں۔''

اس نے قہقہہ بلند کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ''جو شخص سنی جیسی لڑکی کو اندھا سمجھتے ہوئے تنہائی میں بھی شرافت کا مظاہرہ کر سکتا ہے اس کے کردار پر چوٹ نہیں کر سکتا۔ البتہ مس شکلا پر کافی عرصے سے دل آیا ہوا ہے اور دل تو دل ہی ہوتا ہے نا۔ باقی تم نے لورا براؤن کے ساتھ بھی گل چھرے اڑائے ہیں، کوئی تو ہمارے لیے بھی چھوڑ دو یار۔''

''لورا براؤن اور میرے اکھ کے پس پردہ رندھیر شکلا کا قتل تھا۔ اور راجکماری کو بے گناہ و معصوم سمجھنے کی وجہ سے اس کی مدد کر رہا ہوں کہ بے چاری کا ماموں اس کے قتل پر تلا ہے۔''

کرن چاولہ کے ہونٹوں سے بلند بانگ قہقہہ ابلا۔ ''مجھے بے وقوف بنانے کی ضرورت نہیں۔ وگنیش شکلا تمھاری حقیقت سے انجان ہو سکتا ہے میں نہیں۔ میں اس لڑکی کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ ایک جاسوس کی بیٹی ہے۔ اس کا باپ بچ نکلا تھا اُس کی خوش قسمتی۔ یہ اس کے جرائم کا حساب دیے بغیر کہیں نہیں جا سکتی۔''

میں نے کہا۔ ''ہمارا ایک دوسرے سے تعرض کیے بغیر رخصت لینا مناسب ہوگا۔ اب تمھیں واضح ہو گیا ہے کہ میں بھارت سرکار کا دشمن نہیں ہوں۔ اس لیے میرا کیس تمھاری عمل داری میں نہیں آتا۔''

وہ اطمینان سے بولا۔ ''قبول ہے۔ چھوکری کو چھوڑ کر جا سکتے ہو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مسٹر چاولہ جب تم اچھی طرح جانتے ہو یہ چھوری میرا مشن ہے۔ پھر یہ توقع کیسے کر رہے ہو کہ پاکستانی سائیکر مشن ادھورا چھوڑ دے گا۔''

اس نے کوٹ اتار کر دور پھینکا۔ ''لڑکی سے دست بردار تو ہونا پڑے گا، کیوں کہ مقابل کرن چاولہ ہے۔''

''یاد رہے پہلے میں ممتا دیدی کی وجہ سے ہاتھ روک لیا کرتا تھا۔''

اس نے دانت پیسے۔''ہماری لڑائی کی خبر تم تک پہنچنے کا مطلب ہے میرا شک صحیح تھا۔سنی ہی نے تمھیں فرار ہونے میں مدد دی تھی۔''

''یہ معلومات تمھارے کس کام کی۔''میں نے ایک دم گلاک کی طرف چھلانگ لگائی جو چند قدم ہی دور پڑا تھا۔مگر وہ مجھے ایسا موقع دینے کے حق میں بالکل بھی نہیں تھا۔میرے حرکت کرتے ہی وہ برقی کوندے کی طرح اچھلا اور میرے پستول تک پہنچنے سے پہلے اس کی زوردار ٹکر میرے پہلو میں لگی، میں نیچے گرا۔اس کے سر کی ٹکر میرے پہلو میں ہتھوڑے کی طرح لگی تھی،لیکن آرام کا وقت نہیں تھا۔کیوں کہ وہ پستول اٹھانے جھک گیا تھا۔تکلیف برداشت کرتے ہوئے میں اسپرنگ کی طرح اچھلا اور میری جوابی ٹکر نے اسے بھی زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

گرتے ہی اس نے کروٹ تبدیل کر کے میرے نیچے سے نکلنے کی کوشش کی لیکن اس کے گھومتے ہی میں ہلکا سا اچھل کر اس پر سوار ہوا،ساتھ ہی میرا زوردار مکا اس کے چہرے کی طرف بڑھا۔جسے اس نے کہنی پر روک لیا۔اور پھر مسلسل میرے دو تین مکے کہنی پر روک کر اس نے میرے دونوں ہاتھ گرفت میں کیے اور اچانک سر کی بھرپور ٹکر میرے چہرے پر رسید کر دی۔میرے ہونٹ پھٹ گئے تھے،خون کے نمکین ذائقے نے مجھے ہونٹ پھٹنے کا احساس دلایا،ساتھ ہی میری جوابی ٹکر نے حساب برابر کر دیا تھا۔

میری دوسری ٹکر سے پہلے اس نے پاؤں سمیٹ کر میرے پیٹ میں ٹیکے اور مجھے پیچھے اچھال دیا۔

نیچے گرتے ہی میں اچھل کر اٹھا،اس نے بھی اٹھنے میں سستی نہیں دکھائی تھی۔ایک دم گھومتے ہوئے اس کی دائیں ایڑی میری گردن کی طرف بڑھی جسے میں نے بہ مشکل داہنی کہنی پر روکا تھا۔وار کر کے وہ رکا نہیں تھا۔دایاں پاؤں نیچے لگا کر بائیں پاؤں پر گھوم گیا۔

میں نے قریب ہو کر اس لات کی قوت کو کم کیا اور ران پر گرفت سخت کرتے ہوئے اسے گھما کر دور اچھال دیا۔

ہاتھ نیچے ٹیک کر زمین پر لوٹ لگاتا ہوا وہ کھڑا ہو گیا۔بلاشبہ سخت حریف تھا اور اس پر قابو پانا آسان نہ تھا۔مقابلے کے طول کھینچنے کا بھی اسے فائدہ تھا کیوں اس کے مددگاروں کے پہنچنے کا امکان زیادہ تھا۔لڑائی بھڑائی کے معاملے میں پرما بالکل نکمی تھی ورنہ اس کا ہتھیار پر رسائی پانا مشکل نہ تھا۔وہاں دو انساس رائفلیں ،ایک ریوالور اور تین پستول بکھرے پڑے تھے۔مگر وہ ہکا بکا سہمی ہوئی کھڑی تھی۔

میں متوجہ کرتا تو کرن چاولہ اسے فوراً بے ہوش کر سکتا تھا۔اس کے لیے تو کرن چاولہ کا ایک مکا ہی کافی رہتا۔

وہ مجھے دھمکانے لگا۔''اب بھی وقت ہے راجے! چھوکری سے دست بردار ہو کر چلے جاؤ۔تمھیں کرن چاولہ کی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں ہے۔''

میں اطمینان سے بولا۔''تمھیں مضبوط کردار کا اور بھارت سرکار کا خادم سمجھ کر پہلے واقعی متاثر تھا،مگر پری کے بارے تمھاری گھٹیا گفتگو سن کر محسوس ہوا،تم بھی دوسروں جیسے ہی نیچ، کمینے و کم ظرف ہو۔''

''تمھیں سبق سکھانا ہی پڑے گا۔''غضب ناک ہوتے ہوئے وہ زقند بھر کر قریب ہوا،میں بھی قدم اس کی طرف بڑھا چکا تھا۔اس مرتبہ کا ٹکراؤ پہلے سے شدید تھا۔میں جلد از جلد اسے ختم کر کے بھاگنے کے چکر میں تھا،تاکہ تلاشی لینے والوں سے دور نکلا جا سکے تو وہ مجھے ناکارہ کر کے پری کے حصول کی کوشش میں تھا۔اور پری کو پانے کے ساتھ جہاں اس کی مذموم خواہشات کی تکمیل ہوتی وہیں اسے بے بہا دولت بھی ملتی۔

ہم ایک دوسرے کو سختی سے رگید رہے تھے۔لاتیں ،مکے،گھونسے،سر کی ٹکریں،گھٹنے ،کہنیاں ،پاؤں کے

پنجے، ایڑیاں الغرض جسم کا ہر وہ عضو حرکت میں لا رہے تھے جس سے مخالف کو چوٹ پہنچائی جا سکتی ہے۔ اس کا پلا آہستہ آہستہ بھاری پڑنے لگا۔ میری برداشت ہی تھی کہ اس کی چوٹیں سہہ کر جوابی وار کر رہا تھا۔

بنیادی طور پر میں ایک سنائپر ہوں۔ لڑائی بھڑائی کا طریقہ کار جانتا ہوں، مگر میری بہترین صلاحیت اچھی نشانہ بازی ہے۔ نشانہ بازی پر زیادہ توجہ دینے کی وجہ سے ہاتھا پائی کو وقت نہیں دے پاتا۔ اور لڑائی کی مشق سے دوری آج شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ رتجگا اور مسلسل بھاگ دوڑ نے بھی مجھے تھکایا ہوا تھا، جبکہ وہ تازہ دم تھا۔

میرے ہونٹوں، ناک اور جسم کے کھلے حصوں سے خون بہہ رہا تھا۔ پسلیوں پر بھی اچھی خاصی چوٹ لگی تھی۔ اس کی مسلسل ٹھوکروں سے بچنے کو کہنیاں استعمال کرنے کی وجہ سے کہنیوں پر خراشیں بھی آئی تھیں اور درد بھی کر رہی تھیں۔ میرے جوابی حملوں کا اثر اس کے جسم سے بھی جھلک رہا تھا۔ مگر مجموعی طور پر اس کا پلہ بھاری پڑ رہا تھا۔ شروع ہی سے کسی ہتھیار پر قبضہ جمانے کی کوشش دونوں نے کی تھی، مگر ہر ایسی کوشش دوسرے کی مداخلت سے ناکام ہوئی تھی۔

جب میرے اعصاب مضمحل ہونے لگے اور محسوس ہوا کہ زیادہ دیر لڑائی جاری نہیں رکھ سکوں گا، تب میں نے جواء کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ اگر کرن چاولہ کو میرے منصوبے کی بھنک پڑ جاتی تو میرا بے ہوش ہونا یقینی تھا۔ دوسری صورت میں میں لڑائی کا اختتام کر سکتا تھا۔ اس وقت ہم آمنے سامنے کھڑے گہرے سانس لے کر توانائی بحال کرنے کی کوشش میں تھے۔ تھک وہ بھی گیا تھا، مگر اسے مقابلہ کرنے کی جلدی نہ تھی۔ وہ جان بوجھ کر لڑائی کو طول دے رہا تھا تاکہ کوئی تلاشی ٹولی ادھر کا رخ کر لے۔ مگر اس کی بدقسمتی کہ اب تک کوئی بھی نہیں پہنچا تھا۔

میں نے ایک قدم بڑھاتے ہوئے ٹانگ لہرائی۔ گو میں زیادہ تیزی سے اس کی چھاتی میں ٹھوکر مار سکتا، مگر میں نے جان بوجھ کر اسے ٹانگ پکڑنے کا موقع دیا۔ کیوں کہ اس سے پہلے بھی وہ دو بار میری ٹانگ پکڑنے میں کامیاب ہوا تھا اور ہر مرتبہ اس نے مجھے گھما کر عقبی جانب پھینکا تھا۔ اس وقت وہ ایسی جگہ کھڑا تھا کہ مجھے عقبی جانب اچھالتا تو میں گلاک کے قریب ہو سکتا تھا۔ اور اگر اسے میری ترکیب سے واقفیت ہو جاتی تو وہ کوئی اور چوٹ پہنچا سکتا تھا۔ ڈھیلے انداز میں حملہ کرنا مجھے ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتا تھا۔

میں نے چونکہ ایک قدم آگے لے کر گھوم کر لات چلائی تھی، تبھی اسے حملے کی نوعیت آسانی سے معلوم ہو گئی تھی۔ اور میرا توضیح نظر یہی تھا کہ اسے پہلے سے اندازہ ہو جائے کہ میں اس کی چھاتی میں ایڑی کی ٹھوکر مارنے والا ہوں۔

اس وقت تو نہیں مگر لمحہ بھر بعد پتا چلا کہ وہ بھی ہتھیار پر قبضہ کرنے کے چکر میں تھا۔ اور میں نے اسے یہ موقع فراہم کر دیا تھا۔ میری ران پر گرفت جماتے ہوئے اس نے مجھے پوری قوت سے عقب میں اچھالا اور میرے گرنے کا انتظار کیے بغیر اپنے پستول کی طرف بھاگ پڑا جو پرما سے چند قدم دور ہی پڑا تھا۔ اور مجھے دور پھینکنے کی وجہ بھی پستول پر قبضہ جمانا ہی تھی۔ البتہ اسے یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ وہ میری چال میں آ گیا ہے۔ میں چونکہ پھینکے جانے کو پہلے سے تیار تھا، اس لیے جیسے ہی اس نے مجھے گھما کر عقب میں پھینکا، ہوا ہی میں گھومتے ہوئے میں نے دایاں ہاتھ کہنی سمیت زمین پر ٹیکا اور لوٹ لگاتے ہوئے گلاک کے قریب پہنچ گیا۔

وہ پستول اٹھانے کو جھک رہا تھا جب کہ میں گلاک پر قبضہ جما چکا تھا۔ اس کا ہاتھ گز بھر کا فاصلہ اتنی تیزی سے طے نہیں کر سکا تھا، جتنی سرعت سے دس پندرہ گز کا فاصلہ، بیرل سے نکل کر بے آواز گولی نے طے کر لیا تھا۔ گولی کا ہدف پستول تھا اور گولی نے مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ پستول دو تین گز دور جا گرا۔

وہ ٹھٹک کر رکا۔ ساتھ ہی میری اطمینان بھری آواز گونجی۔ ''یقیناً ہاتھ اٹھانا تمھارے چند سانس بڑھا دے گا۔''

گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے کن انکھیوں سے پرما کی جانب دیکھا۔

میں اس کا ارادہ جان گیا تھا۔ فوراً تنبیہ کی۔ ''ایسا سوچنا بھی مت۔'' اور پرما کو ہدایت کی۔ ''پری، اس سے دور ہٹ جاؤ۔''

وہ جھرجھری لیتے ہوئے حواسوں میں آئی اور بجائے دور جانے کے بھاگ کر میرے قریب آ گئی۔

کرن بولا۔ ''تم بچ کر نہیں جا سکتے۔''

میں ہنسا۔ ''مگر ہم سے پہلے تمھارا نمبر پڑ گیا ہے برخوردار۔''

اس نے تاؤ دلانے والے انداز میں کہا۔ ''ہمت ہے تو پستول پھینک کر لڑو۔''

میں استہزائی انداز میں بولا۔ ''ہتھیار کی طرف بڑھنے کی شروعات تم نے کی ہے۔''

اس نے جذباتی دھونس جمائی۔ ''اپنی دیدی کے ہونے والے شوہر کو قتل کر دو گے۔''

میں نے کہا۔ ''خود ہی طے کر دکس ٹانگ پر گولی کھانا ہے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں..... آہ.....'' اس کے بات مکمل ہونے سے پہلے ''ٹھک۔'' کی آواز سے گلاک کی گولی اس کی بائیں ران میں داخل ہو گئی تھی۔ وہ تیز کراہ کے ساتھ اپنی ٹانگ کو پکڑ کر گر گیا تھا۔

''تبادلہ خیال کا وقت نہیں ہے جناب! اور بلاشبہ میں ممتا دیدی کا دل نہیں دکھانا چاہتا ورنہ ایک غنڈے موالی کو قتل کرنے میں مجھے کوئی جھجک نہیں ہو گی۔''

ہونٹ بھینچتے ہوئے وہ غرایا۔ ''میں غنڈہ نہیں میجر کرن چاولہ ہوں۔''

''منوج جوشی جیسے غنڈے کا کارندہ بن کر تم اپنی حیثیت کھو چکے ہو۔ چند سانسوں کی بھیک ممتا دیدی کے نام پر بخش رہا ہوں۔''

وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ''اپنی فطرت کا احسان منہ بولی بہن پر نہ تھوپو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں تم ہر کسی کو زخمی کرنے پر اکتفا کرتے ہو۔''

''زخمی صرف بھارتی ایجنسیوں کے افراد کو کرتا رہا ہوں کیوں کہ میرے خلاف ان کی کارروائیاں برحق تھیں۔ کسی غنڈے کو قتل کرنا میرے لیے چنداں دشوار نہیں ہے۔ شک ہے تو اپنے ساتھیوں کی لاشوں کو دیکھ لو۔'' اسے حقیقت جتلاتے ہوئے میں نے سرعت سے انسان رائفلوں کی فائرنگ پن توڑ کر انھیں عارضی طور پر ناکارہ کیا۔ اپنا ریوالور جیب میں ڈالا کرن چاولہ کا پستول پرما کے حوالے کیا اور بھاگنے کو تیار ہو گیا۔

''اس لڑکی کے دس کروڑ دے سکتا ہوں، تمھیں بھی بہ حفاظت سرحد پار کرا دوں گا۔'' کرن چاولہ ران کے زخم پر اپنا کوٹ لپیٹتے ہوئے ہوئے سودے بازی پر اتر آیا تھا۔

''سچ میں.....'' میں نے مصنوعی حیرانی ظاہر کی۔

وہ جلدی سے بولا۔ ''بھگوان کی سوگندھ کھا کر وچن دیتا ہوں کہ دس کروڑ دوں گا اور سرحد پار کرانے کی ذمہ داری بھی میری۔''

''کیا کہتی ہو۔'' میں پرما کی طرف متوجہ ہوا۔

وہ بپھر کر بولی۔ ''آپ اسے گولی کیوں نہیں مار رہے۔''

میں ہنسا۔ ''اپنی دیدی کی خفگی سے ڈرتا ہوں، البتہ تم کوشش کر سکتی ہو۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے پستول کا رخ کرن چاولہ کی طرف موڑا۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ البتہ میں اطمینان سے کھڑا رہا کہ پستول کا کک نہیں تھا۔ پرما نے انا ڑی پن سے ٹریگر دبایا، مگر پستول کا کک ہوتا تو گولی چلتی۔

''یہ چل نہیں رہا، اپنے والا پستول ہمیں دو۔'' وہ گلاک لینے کو میری طرف بڑھی۔

''دفع کرو میں اس کا بندوبست کرتا ہوں۔'' کرن کے قریب ہو کر اس کی پشت کی جانب پھرا۔

''اس کے بدلے تم خاص شخص کی جان بچا.....'' جانے وہ کیا پیش کش کرنے جا رہا تھا، مگر میں نے سنے بغیر گلاک کو نال سے پکڑا اور دستہ پوری قوت سے اس کے سر پر دے مارا۔

''اوغ۔'' کی آواز سے وہ لڑھک گیا تھا۔ اسے عارضی طور پر بے ہوش کرنا ضروری تھا۔ اپنی ران کا خون وہ کوٹ لپیٹ کر روک چکا تھا۔ اب خون ضائع ہونے سے وہ مر نہیں سکتا تھا۔ امید یہی تھی کہ جلد ہی اسے مدد مل جاتی یا وہ خود ہوش میں آ کر کسی کو بلا لیتا۔ میں نے سرعت سے تمام لاشوں کی تلاشی لے کر نقدی قبضے میں کی اور پرما کو کہا۔

''چلیں۔'' میں نے وہی سمت اختیار کی تھی جدھر سے کرن چاولہ اور اس کے ساتھی نمودار ہوئے تھے۔ البتہ رخ ذرا ترچھا موڑ لیا تھا۔

میرے ساتھ قدم ملاتے ہوئے وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ''آپ کو لاشوں کی جیب سے پیسے نہیں نکالنا چاہیے تھے۔''

میں جھلاتے ہوئے بولا۔ ''جب کھوپڑی میں بھیجا نہ ہو تو سوچنے کی زحمت کرنا بہتر نہیں ہوتا۔ آپ اپنی محدود عقل پر زور نہ دیں تو مناسب رہے گا۔''

''ہم نے کہا ناں پاکستان جا کر آپ کو ساری رقم واپس کر دیں گے بلکہ انعام بھی دیں گے۔''

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اور پاکستان پہنچنے تک جو رقم خرچ ہو گی وہ آئے گی کہاں سے؟''

وہ الجھن آمیز لہجے میں بولی۔ ''آپ کے پاس پیسے موجود تو تھے، اگر ختم ہو گئے ہیں تو میرا لاکٹ بیچ دو۔''

''محترمہ یہاں قدم قدم پر کام نکلوانے کو پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ صرف ممبئی سے نکلنے کو بیس ہزار ڈالر خرچ ہوئے ہیں اور اتنی رقم خرچ کرنے کے باوجود منصوبہ ناکام رہا۔ آپ کو اغواء کرانے کو چار لاکھ معاوضہ دیا تھا۔ آگے بھی رقم کی ضرورت پڑے گی۔ میری جیب ATM مشین نہیں ہے کہ بٹن دبانے پر نوٹ باہر نکلیں گے۔ ایسے حالات میں نہ اخلاقیات کا دھیان رہتا ہے اور نہ شریعت کی حدود مدنظر رکھی جا سکتی ہیں۔ باقی آپ کے زیور بیچنے کس صرافہ بازار میں جاؤں؟..... کیا ہم اس حالت میں ہیں کہ خرید و فروخت کر سکیں۔'' گہرا سانس لے کر میں نے غصے پر قابو پایا اور نسبتاً نرم آواز میں بولا۔ ''اب براہ مہربانی کسی فضول تکرار کے پیچھے نہ پڑ جانا۔ ہم اب تک خطرے کی حدود میں ہیں۔ یہ بحث کسی اور وقت کو اٹھا رکھو۔''

وہ ہونٹ بھینچ کر خاموش ہو گئی تھی۔ کرن چاولہ سے ٹاکرے نے مجھے صحیح معنوں میں تھکا دیا تھا۔ پورے جسم میں درد ہو رہا تھا۔ مگر آرام کرنے کا وقت نہیں تھا۔

ہاتھا پائی کے متعلق ایک بات آپ کے ذہن میں رہے کہ چوٹ لگنے سے انسان کے عضلات اور پٹھوں وغیرہ کا گوشت اندر سے بھی پھٹ جاتا ہے۔ اور مرہم پٹی و علاج معالجے کے بعد بھی ٹھیک ہونے میں مہینا ڈیڑھ لگا لیتا ہے۔ مگر ایسا عام آدمیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ لڑائی بھڑائی کی تربیت حاصل کرنے والوں کے جسمانی اعضاء چوٹیں سہنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اور کڑی تربیت سے عضلات و پٹھوں کو اس قابل بنایا جاتا ہے کہ اچھی خاصی ضربات کو برداشت کر سکیں۔

چلنے کی وجہ سے جسم گرم ہی رہا اور تکلیف کا احساس زیادہ نہ ہوا۔

وہ زیادہ دیر خاموش نہیں رہ پائی تھی۔ کہنے لگی۔ ''چہرے پر لگا خون ہی صاف کر دیتے۔''

میں بے پروائی سے بولا۔ ''کہیں پانی مل گیا تو دھو لوں گا۔''

''یہ لو۔'' اس نے جیب سے ہلکے گلابی رنگ کا مخملیں رومال نکال کر میری طرف بڑھایا۔

''شکریہ۔'' رومال پکڑ کر میں چہرے پر پھیرنے لگا۔ ماتھے پر خراش آئی تھی۔ نچلے ہونٹ پر بھی چوٹ لگی تھی اور ہونٹ اندر سے پھٹ گیا تھا۔ دائیں نتھنے کی سوزش بھی کسی ہلکے پھلکے زخم کی نشان دہی کر رہی تھی۔

خون صاف کر کے میں نے رومال پھینک دیا تھا۔

''بدتمیز۔'' خفگی بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے رومال اٹھالیا۔ ''ہم نے پھینکنے کو تو نہیں دیا تھا۔''

میں نے صفائی دی۔ ''گندا ہو گیا تھا۔''

رومال جیب میں ڈالتے ہوئے اس نے منہ بنایا۔ ''ایسا ہی ہے، مگر ہم سے اجازت تو لینا تھی۔ یہ کوئی عام رومال نہیں ہے بہت خاص ہے۔''

''اچھا۔'' میں نے اسے معنی خیز نظروں سے گھورا۔

''جی۔'' مجھے بے باکی سے گھورتے ہوئے اس نے منہ چڑا دیا۔

میں نے کہا۔ ''خاص چیز، عام آدمی کو گندہ کرنے کو نہیں دینا چاہیے تھی۔''

وہ متبسم ہوئی۔ ''ہماری خاطر آپ نے دس کروڑ ٹھکرا دیے اس لیے تھوڑا جذباتی ہو گئے تھے ناں۔ باقی دھونے سے صاف ہو جائے گا کون سا ہمیشہ کے لیے گندا ہو گیا ہے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آپ کے لیے نہیں انصاری صاحب کے لیے رقم ٹھکرائی ہے۔''

وہ ترشی سے بولی۔ ''مطلب جو کچھ کر رہے ہو اس کے پس پردہ پاپا ہیں۔''

میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ ''آپ کو کیا لگتا ہے؟'' وہ مجھے کڑی نظروں سے گھور کر رہ گئی تھی۔

میں بے پروائی سے کندھے اچکا کر دائیں بائیں کا جائزہ لینے میں معروف رہا۔ دشمنوں کی آمد کی کوئی سمت متعین نہیں تھی۔ اصولاً کرن جاولہ کے ہمراہ اور بندے ہونا چاہیے تھے۔ مگر ریوالور کی چار پانچ گولیاں چلانے کے باوجود کسی کا بھی نہ آنا ظاہر کر رہا تھا کہ اس کے ہمراہ وہی تین افراد ہی تھے۔ جنھیں میں قتل کر چکا تھا۔ شاید باقی گولیاں کسی اور سمت نکل گئی تھیں۔ ویسے ریوالور چلنے کا دھماکا اتنا زیادہ بھی نہیں ہوتا کہ طویل فاصلے تک جائے۔ فرلانگ بھر سے دور آواز نہیں جاتی۔

ایک جھاڑیوں کے جھنڈ سے نکلتے ہوئے میری نظر تھوڑے فاصلے پر موجود چند جھونپڑوں پر پڑی۔ لگتا تھا باقی جھونپڑے بھی آگے بنے ہوں گے۔ مگر وہاں سے تھوڑے نظر آ رہے تھے۔ پر مابھی وہ آبادی دیکھ چکی تھی۔

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''ان سے کھانے پینے کو کچھ ضرور مل جائے گا۔''

میں نے خیال ظاہر کیا۔ ''یہاں دشمن کی موجودی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''

''دشمن کا تو پتا نہیں، لیکن تھوڑی دیر مزید کھانے پینے کو کچھ نہ ملا تو ہمیں مارنے کو دشمن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

میں نے چوٹ کی۔ ''ان بے چاروں کے پاس، پیزا، برگر، چکن سینڈوچ، پنیر، مکھن، شہد، ڈبل روٹی، جیم وغیرہ کہاں ملے گا۔''

وہ برہم ہوئی۔ ''جتنے برے ہو نا، اس سے کئی گنا زیادہ بری آپ کی زبان ہے۔''

''سچ ہضم کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔'' میں نے اس کے ہاتھ سے پستول لے لیا تھا۔ وہ جرمنی کا ٹائین ایم ایم والتھر P99 تھا۔ جو ایک بہترین پستول ہے۔ اس میں مختلف قطر کے پستول دستیاب ہیں البتہ اس کی ٹائین ایم ایم کی میگزین میں سولہ گولیوں کی گنجائش ہوتی ہے۔

وہ ترشی سے مستفسر ہوئی۔ ''کیا مجبوری میں بھی ہمیں اپنی پسند کا خیال رکھنا پڑے گا۔''

''پستول چلانے سے پہلے اسے کاک کرنا ضروری ہوتا ہے اور یہ ایسے کاک ہوتا ہے۔'' میں فضول بحث ترک کرتے ہوئے ضروری کام کی طرف متوجہ ہوا کہ کم از کم اسے پستول کا استعمال آنا چاہیے تھا۔ آج کی جدید عورت پستول چلانا جانتی ہے۔ وہ عجیب لڑکی تھی کہ اس بارے بالکل انجان تھی۔ حالانکہ اس کے گرد تو ہر وقت مسلح محافظوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ اور نشانے کی پختگی مشکل کہی جاسکتی ہے پستول کو چلانا اتنا مشکل یا انوکھا نہیں ہے کہ اسے سیکھنے میں دقت ہوتی۔

میری غلط فہمی دور کرتے ہوئے اس نے منہ بنایا۔ ''رہنے دو، ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔''

میں بھناتے ہوئے بولا۔ ''جب میں کرن چاولہ کے ساتھ لڑ رہا تھا، تب یہ جاننا کہاں گیا تھا؟..... پھر کہتی ہو میری زبان تلخ ہے۔''

وہ ندامت سے بولی۔ ''ہم ڈر گئے تھے۔''

''یہ اپنے پاس رکھو، ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' میں نے پستول اس کی جانب بڑھا دیا۔

وہ نزاکت سے بولی۔ ''اتنا وزنی پستول ہم کیسے اٹھائیں گے۔ پاس رکھو ضرورت ہوئی تو لے لیں گے۔''

''یہ چونچلے اپنے پاپا کے پاس جا کر پورے کرنا۔ اور ہتھیار کی ضرورت اچانک پڑتی ہے۔ کیوں کہ مصیبت بتا کر نہیں آیا کرتی۔''

اس نے منہ بسورا۔ ''پہلے آپ اتنے ترش نہیں تھے، اب تو ذرا ذرا سی بات پر بگڑنے لگے ہیں۔''

میں نرم لہجے میں بولا۔ ''آپ حالات کو سنجیدگی سے نہیں لے رہیں۔ ہم چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ اور دشمن بھی ایسے جو ہماری جان کے درپے ہیں۔ اور یاد رکھو کہ موڈ میں ماحول کا گہرا عمل دخل ہوتا ہے۔ میں آپ کو بچانے کی کوشش کر رہا ہوں، مجھے فرار ہونے میں دقت و دشواری آپ کی وجہ سے آ رہی ہے۔ اور آپ ہیں کہ ایک پستول کا وزن اٹھانے کو تیار نہیں۔ باقی موت معین وقت سے پہلے نہیں آسکتی پھر اتنا ڈرنے کی کیا تک تھی کہ زمین پر پڑا پستول تک آپ سے نہ اٹھایا گیا۔''

وہ حیرانی سے بولی۔ ''عجیب منطق ہے۔ ایک دن مرنا ہے، اس حقیقت کو جاننے سے موت کا خوف دل سے کیسے نکل سکتا ہے۔''

میں چڑتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کہا موت کا وقت مقرر ہے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہم ایسا نہیں سمجھتے۔ ہمارے مطابق انسان اپنی بے وقوفی، حماقت اور غلط منصوبہ بندی کی وجہ سے مرتا ہے۔''

بحث کا رخ ایسے موضوع کی طرف مڑ گیا تھا جس پر ان حالات میں بات نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ کسی مذہب ہی کو نہیں مانتی تھی تو اسے یہ مسئلہ کیسے سمجھایا جا سکتا تھا۔ ہم جھونپڑوں کے قریب پہنچ کر ایک جھاڑی کے عقب میں رک گئے تھے۔ جھونپڑے لکڑی و گھاس پھونس سے بنائے گئے تھے اور اوپر مٹی و گارا لیپ کر سوراخ وغیرہ بند کر دیئے گئے تھے۔ یوں گھاس پھونس و شاخوں کی باڑ نے دیوار کی شکل اختیار کر لی تھی۔ میرا اندازہ صحیح تھا آگے بھی جہاں تک دکھاؤ ممکن تھا جھونپڑے نظر آ رہے تھے۔ اور لوگوں کی نقل و حرکت بھی۔

اسے جھاڑیوں کے عقب میں رکنے کا اشارہ کر کے میں محتاط انداز میں جھونپڑوں کی طرف بڑھا۔ چند قدم لیتے ہی ایک ادھیڑ عمر باریش شخص کی نظر میری طرف اٹھی، قریب آتے ہوئے اس نے نامانوس زبان میں کچھ کہا تھا۔

جواباً میں ہندی میں بولا۔ ''مہاراج کوئی جل پان (تھوڑا کھانا پینا) کا بندوبست ہو جائے گا۔''

''بابو، بھوجن تو مل جائے گا مگر کیا آپ اکیلے ہیں۔'' ٹوٹی پھوٹی ہندی میں بولتے ہوئے اس نے میرے عقب میں

جھانکا۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں رک گیا تھا تا کہ دوسرے لوگوں کی نظر سے اوجھل رہوں۔ اس کے استفسار نے مجھے چونکا دیا تھا۔ یقیناً اسے ہمارے بارے سن گن تھی۔

میں نے ذومعنی انداز میں پوچھا۔ ''کیا میرے ساتھ کوئی نظر آ رہا ہے۔''

دائیں بائیں دیکھ کر وہ دھیرے سے بولا۔ ''گھنٹا ڈیڑھ پہلے چند آدمی ایک نوجوان جوڑے کی بابت معلومات لیتے ہوئے گزرے ہیں۔ اور شکل وصورت سے وہ اچھے لوگ نہیں لگ رہے تھے۔ سارے گھروں کی انھوں نے زبردستی تلاشی بھی لی۔ اور دھمکی بھی دی کہ اگر کسی نے انھیں پناہ دی تو ایسا کرنے والے انجام کے ذمہ دار خود ہوں گے۔''

اس کے انداز سے لگا تلاشی لینے والوں کا فعل اسے برا لگا تھا۔ غریبوں کی بھی عزت نفس ہوتی ہے۔ اور ان کی مرضی کے بغیر ان کے گھروں میں تا کا جھانکی کرنا، زبردستی تلاشی لینا یقیناً انھیں غصہ دلانے کو کافی تھا۔ مگر مسلح افراد کے سامنے بے چارے احتجاج نہیں کر سکتے تھے۔ بس دل ہی دل میں کڑھ کر رہ گئے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس نے پہلی فرصت میں مجھے مطلع کرنے میں دلچسپی لی تھی۔

تلاشی لینے والے کے خلاف اس کے لہجے کی بغاوت محسوس کرتے ہی میں نے کھل کر سامنے آنے کا فیصلہ کیا۔ ''اگر اعتراف کروں کہ میں وہی شخص ہوں تو کیا سہائتا کی آشا رکھ سکتا ہوں۔''

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''آپ نہ بتائیں تب بھی میں پہچان گیا تھا کیوں کہ ان کے پاس آپ دونوں کی تصاویر موجود تھیں جو انھوں نے تمام بستی والوں کو دکھائیں۔''

''میرے پاس دو دو ہزار کے پانچ نوٹ ہیں۔ ہمیں چھپنے میں مدد دے کر ان پر قبضہ کر سکتے ہو۔'' اس بستی کی حالت دیکھتے ہوئے میں نے جان بوجھ کر بہت تھوڑی رقم پیش کش کی تھی۔ مگر رقم سنتے ہی اس کے چہرے پر جو تحیر نمودار ہوا، لگا کہ رقم اس کے اندازے سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

''مم..... میں نے آج تک دو ہزار کا نوٹ ہاتھ میں نہیں پکڑا۔''

میں نے دوبارہ ترغیب دی۔ ''تو ایسے پانچ نوٹوں کا مالک بننے کے بارے کیا ارادہ ہے؟''

خوفزدہ انداز میں دائیں بائیں کا جائزہ لیتے ہوئے وہ میرے مزید قریب آیا۔ ''مہاراج وہ بہت خطرناک لوگ تھے۔''

میں نے کہا۔ ''ضرور ہوں گے، مگر ایک بار تلاشی لے گئے ہیں، امید ہے بار بار تلاشی نہیں لیں گے۔ باقی جب تک تم کسی سے ذکر نہیں کرو گے تو انھیں کیسے پتا چلے گا کہ تم نے ہماری مدد کی؟''

اس نے خشک لبوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کی استری (بیوی) کہاں ہے۔''

میں نے پچاس ساٹھ قدم دور جھاڑیوں کی جانب اشارہ کیا۔ ''وہاں چھپی ہے۔'' البتہ پرماسے اپنے رشتے کی وضاحت کرنا میں نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔

وہ لمحہ بھر سوچ کر بولا ''ایک اور بندے کو رازدار بنانا پڑے گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''اعتماد والا ہے۔''

وہ احمقانہ انداز میں بولا۔ ''پتا نہیں، مگر اس کے پاس چھپنے کی جگہ موجود ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہمیں چھپانے کے بجائے کسی طرح یہاں سے نکلنے کا بندوبست کر دو تو انعام کی رقم بڑھا سکتا ہوں۔''

چند لمحے سوچتے ہوئے اس کی آنکھوں میں تیز چمک ابھری ''ایک طریقہ ہے تو سہی.....''

''بولو۔'' میں ہمہ تن گوش ہو گیا تھا۔

''کسارا گاؤں سے سبزی والا ٹرک آتا ہے۔اس میں چھپ کر نکلا جا سکتا ہے۔''

میں نے جلدی سے پوچھا۔''ٹرک کس وقت آتا ہے۔''

وہ جوش سے بولا۔''گھنٹے ڈیڑھ تک پہنچ جائے گا۔''

میں نے تصدیق چاہی۔''ٹرک والا تمھارا دوست ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔''واقف کار ہے۔میں جانتا ہوں سبزی کی آڑ میں غیر قانونی اشیاء کی بھی ترسیل کرتا رہتا ہے۔پیسے لے کر آپ کی مدد پر آمادہ ہو جائے گا۔''

چند لمحے سوچ کر میں نے اثبات میں سر ہلایا۔''ٹھیک ہے۔تمھیں دس ہزار دوں گا اور اسے علیحدہ پیسے دوں گا،تم نے بس ہمارا سودا کرانا ہے۔''

اس کی آنکھوں میں تیز چمک پیدا ہوئی۔ہم نے چند منٹ میں سارا منصوبہ طے کیا۔اور میں نے اسے دو ہزار پیشگی ادا کر دیئے۔اس کے بعد وہ گھر سے پانی کی بھری ہوئی بوتل اور شاپر میں تین چار روٹیاں لے آیا جن پر ماش کی تھوڑی سی دال چپڑی ہوئی تھی۔

اس سے الوداعی مصافحہ کر کے میں پرما کی طرف بڑھ گیا۔وہ واپس مڑ گیا تھا۔

پرما جھاڑی کے عقب میں پتھریلی زمین پر ڈھیر تھی۔بے چاری اتنی تھکی ہوئی تھی کہ مجھ پر نظر رکھنے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔تبھی قدموں کی چاپ سن کر ایک مرتبہ تو کانپ گئی تھی۔مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے لبوں سے گہرا سانس خارج ہوا تھا۔

میں متبسم ہوا۔''چلیں۔''

خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ ملتجی ہوئی۔''کچھ کھا پی تو لیں۔''

میں نے پانی کی بوتل اور روٹی کا شاپر اس کی طرف بڑھا دیا۔بے صبری سے بوتل کو منہ لگا کر اس نے چند بڑے بڑے گھونٹ لیے اور پھر دال سے چپڑی روٹیوں کو جڑ گئی۔اس اشتہاء سے تو کبھی اسے پیزہ،برگر وغیرہ بھی کھاتے نہیں دیکھا تھا۔سچ کہتے ہیں بھوک،معیار و کوالٹی سے بے پرواہوتی ہے۔منرل واٹر پینے والی نوابزادی نے پانی پیتے وقت پوچھا تک نہیں تھا کہ پانی کہاں سے آیا ہے اور صاف ہے بھی یا نہیں۔

میں نے چند گھونٹ پانی پی لیا البتہ کھانے کو ہاتھ نہ بڑھایا کہ بھوک برداشت کر سکتا تھا۔جبکہ اس کی توانائی بالکل نچڑ گئی تھی۔امید تھی کھانے کے بعد اس کی حالت کچھ بہتر ہو جاتی۔البتہ سیر ہونے کے بعد غنودگی و کسلمندی حملہ آور ہوتی اور وہ پہلے ہی ہر جگہ ڈھیر ہو رہی تھی،کھانے کے بعد شاید حرکت کے قابل ہی نہ رہتی۔گویا صرف بہتری کی امید ہی کی جا سکتی تھی۔

''آپ بھی کھائیں ناں۔''دو روٹیاں چٹ کرنے کے بعد اسے میرا خیال آیا تھا۔

میں اطمینان سے بولا۔''میں بھوک برداشت کر لوں گا۔''

''ایک کمانڈو کو بھلا بھوک پیاس کی کیا فکر،لیکن پھر بھی تھوڑا سا کھا لو۔''خوب صورت تبسم ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے اس نے تیسری اور آخری روٹی میری جانب بڑھا دی۔

''میرے لیے یہ کافی ہے۔''میں نے آدھی روٹی لے کر باقی اسے واپس کر دی تھی۔

عجیب سی نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے اس نے روٹی پکڑ لی تھی۔

میں نے دو تین نوالوں سے روٹی کو پیٹ میں منتقل کیا اور''الحمدللہ۔''کہہ کر پانی پینے لگا۔

بوتل لینے کو ہاتھ بڑھاتے ہوئے وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔''کیا کہا۔''

میں نے بوتل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اللہ پاک کا شکر ادا کیا ہے کہ اس نے اس حال میں بھی کھانے ، پینے سے محروم نہیں رکھا۔''

وہ معترض ہوئی۔ ''خشک ٹھنڈی ٹھار باسی روٹیاں اور ابلی ہوئی دال کھا کر شکریہ کرنا بنتا ہے یا گلہ۔''

''تھوڑی دیر پہلے آپ بھوک پیاس سے مرنے کے قریب تھیں۔ اور جب کھانا مل گیا تو دو روٹیاں کھانے تک تو آپ کو اپنے ساتھی کا خیال بھی نہیں رہا تھا۔ اگر اچھا نہیں تھا تو کھایا کیوں۔ اگر کھالیا تو اعتراض کیسا۔ باقی شکر تو اس لیے کیا کہ وہ ہمارا کھانا مستقل طور پر بند کر سکتا تھا مگر اس نے صرف چند گھنٹے روک کر دوبارہ رزق عطا کر دیا۔ شکریہ تو خود بہ خود دل سے نکلنا چاہیے۔''

اس کی مترنم ہنسی ابھری۔ ''یار! آپ بات گھما پھرا کر اپنے ڈھب پر لے آتے ہیں۔''

میں رکھائی سے بولا۔ ''میں آپ کا یار نہیں ہوں۔''

بوتل منہ سے لگاتے ہوئے اس نے خفت چھپائی۔ ''بڑی جلدی موقع مل گیا ہے بدلہ لینے کا۔''

میں نے بوتل اس کے ہاتھ سے جھپٹتے ہوئے موضوع تبدیل کیا۔ ''زیادہ پانی پی لیا تو چلنا دوبھر ہو جائے گا۔''

وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''وہ تو پہلے سے بنا ہوا ہے۔''

میں نے کھڑے ہو کر اسے اٹھنے میں مدد دینے کو ہاتھ بڑھایا۔ ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے چوٹ کی۔ ''دوست بننے سے انکار کرتے ہو تو ہر لحہ خیال کیوں رکھتے ہو۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''میں انصاری صاحب کی بیٹی کا خیال رکھ رہا ہوں۔ اس لیے آپ کے اخلاق سے بولنے یا طنز و تشنیع کے تیر چلانے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پاکستان پہنچنے تک میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ آپ کی آسائش و آرام کا خیال رکھ سکوں۔ اس کے بعد شاید ہی کبھی سامنا ہو۔''

اس نے موضوع سے بھاگنا پسند کیا۔ ''یہاں تھوڑی دیر آرام کرنے سے کون سا آسمان ٹوٹ پڑتا۔''

''زیادہ دور نہیں جانا۔'' میں بھی مطلب کی بات کرتا ہوا احتیاط سے آگے بڑھنے لگا۔ دو تین سو قدم کا چکر کاٹ کر ہم نسبتاً نشیب میں پہنچے۔

وہاں ایک درخت کا خشک ٹنڈ منڈ تنا کھڑا تھا اور ساتھ ہی جھاڑیوں کا جھنڈ تھا۔ میں پرما کے ساتھ انھی جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر سڑک گزر رہی تھی جو پیچ کھاتے ہوئے پہاڑی سلسلے میں آگے تک چلی گئی تھی۔ بلند ڈھلان کی جانب جھونپڑیوں کی بستی تھی۔ جس کا پہلا جھونپڑا زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ جھونپڑا بستی کی واحد دکان تھا۔ اسی میں سبزی وغیرہ دستیاب تھی اور اشیائے خورد و نوش کا دوسرا سامان بھی میسر تھا۔

ہمیں نصف گھنٹے کے بہ قدر انتظار کرنا پڑا تھا۔ اس کے بعد ایک پرانا سا ٹرک سڑک سے کچے راستے پر اترا اور دکان کی طرف بڑھنے لگا۔ اس سے پہلے کافی ٹریفک وہاں سے گزر چکی تھی۔ دو جیپوں میں تو مجھے ایسے لوگ نظر آئے تھے جنھیں دیکھتے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ خالص ہمارے دشمن ہیں۔ ایک مرتبہ تو میرے جی میں آیا کہ کسی کار یا موٹر سائیکل سوار کو روک کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر پھر رک گیا کیوں کہ شک تھا کہ آگے سڑک پر انھوں نے مورچہ لگایا ہوگا۔ ممبئی کی طرف واپس جانے میں بھی بہ ہر حال خطرہ نظر آتا تھا۔

میں نے اونگھتی ہوئی پرما کو متوجہ کیا۔ ''یہاں سے آگے اس ٹرک پر سفر کریں گے۔''

''کیا۔'' اس کی غنودی بھاپ بن گئی تھی۔ پرجوش لہجے میں پوچھا۔ ''آپ نے سچ مچ وہی کہانی جو ہم سمجھے ہیں۔''

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''دعا کرو گنپت رائے اسے منالے۔''

''کون گنپت؟''

میں نے ادھیڑ عمر گنپت کی طرف اشارہ کیا جو ٹرک کی آواز سن کر دکان کی طرف روانہ تھا۔''اس شخص کی بات کر رہا ہوں۔ ہمارے لیے کھانے کا بندوبست بھی اسی نے کیا ہے۔''

اس نے سہم کر پوچھا۔''سڑک پر تو ہمارے دشمن بھی موجود ہوں گے۔''

میں نے تسلی دینے کے بجائے اثبات میں سر ہلایا۔''خطرہ تو مول لینا پڑے گا۔'' وہ گہرا سانس لے کر رہ گئی تھی۔

میں گنپت رائے کی طرف متوجہ ہو گیا جو ٹرک ڈرائیور کو دکاندار سے دور لے جا کر بات کر رہا تھا۔

دکاندار اور اس کا مددگار ٹرک سے سبزی کی بوری اور پیٹیاں اتار رہے تھے۔ ان کے سامان اتارنے تک ڈرائیور اور گنپت کسی نتیجے پر متفق ہو چکے تھے۔ ڈرائیور ٹرک میں بیٹھ گیا جبکہ گنپت پیدل ہماری طرف آنے لگا۔

ٹرک کے موڑ کاٹ کر سڑک کے قریب پہنچنے تک گنپت ہمارے پاس پہنچ چکا تھا۔ دکان دار اور اس کا مددگار بڑے جھونپڑے میں غائب ہو چکے تھے۔ ڈرائیور نے ٹرک کچے راستے پر کھڑا کیا اور نیچے اتر کر ہمارے قریب آ گیا۔

''بابو! دس ہزار مجھے اور دس ہزار ڈرائیور کو دینے ہوں گے۔'' گنپت رائے نے قریب آ کر بغیر کسی تمہید کے اپنی مانگ بتائی۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے فوراً قبول کیا کہ وہاں سے نکلنے کو اس سے زیادہ رقم بھی قربان کر سکتا تھا۔ پرما سخت تھکی ہوئی تھی اور اسے مزید گھسیٹنے کے بجائے کسی سواری کا بندوبست مناسب رہتا۔

اسی اثناء میں پختہ عمر کا ڈرائیور بھی قریب آ گیا تھا۔ اس کا نام بنسی لال تھا۔ پرما کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے مجھ سے مصافحہ کیا۔

میری جیب میں کرن چادلہ وغیرہ کی جیب سے نکالے ہوئے تیرہ چودہ ہزار کے بہ قدر روپے موجود تھے۔ گنپت رائے کی جانب آٹھ ہزار بڑھاتے ہوئے میں ڈرائیور کو مخاطب ہوا۔

''تمھیں منزل پر پہنچتے ہی اپنا معاوضا مل جائے گا۔''

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے رکھائی سے بولا۔''پیسے پیشگی دینا ہوں گے۔''

اچانک سڑک کی جانب سے تیز ہارن کی آواز سنائی دی۔ ہم جھاڑیوں کی آڑ میں تھے۔

پرما کی خوفزدہ آواز ابھری۔''دشمن پہنچ گئے ہیں۔''

''فوراً ٹرک کی طرف جاؤ اور ایسے ظاہر کرو کہ دکان کی جانب سے آ رہے ہو۔'' انھیں ہدایت دیتا ہوا میں جھاڑی کی آڑ میں دبک گیا تھا۔ انھیں میری بات سمجھ میں آئی تھی یا نہیں، البتہ وہ جلدی سے سڑک کی جانب بڑھ گئے تھے۔

اوندھے منہ لیٹ کر میں سڑک کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ایک جیپ سڑک پر رکی ہوئی تھی۔ ڈرائیور اور اس کے ہمراہ ایک اور شخص جیپ کے اندر بیٹھا تھا، جبکہ دو مسلح افراد ٹرک کے ساتھ کھڑے تھے۔ بنسی لال اور گنپت کو دیکھتے ہی وہ اس طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''یہاں ٹرک کیوں روکا ہوا ہے اور تم لوگ جھاڑیوں میں کیا کر رہے تھے۔'' ان کے قریب آنے کا انتظار کیے بغیر ایک شخص نے درشت لہجے میں پوچھا تھا۔

گنپت رائے نے ہکلاتے ہوئے کہا۔''کک..... کچھ نہیں مہاراج۔ ہم تو بس آ رہے تھے۔'' اس نے باقاعدہ کانپنا شروع کر دیا تھا۔ یقیناً وہ سادہ لوح دیہاتی تھا۔ بے چارے کا واسطہ کبھی غنڈوں وغیرہ سے نہیں پڑا تھا۔ ہتھیار بردار شخص کو دیکھتے ہی اس کی سٹی گم ہو گئی تھی۔

ڈرائیور کے ساتھ براجمان شخص نے کہا۔ ''ٹرک کی تلاشی لو۔''
دونوں مسلح افراد اوپر چڑھ کر سامان کو الٹ پلٹ کرنے لگے۔
''کچھ نہیں ہے باس۔'' چند لمحوں بعد وہ ناکام ہو کر نیچے آ گئے تھے۔
باس نے نیچے اتر کر گنپت کو انگلی کے اشارے سے قریب بلاتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہارا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے؟''
''کک..... کچھ نہیں مہاراج۔ یہ ٹرک میرا تو نہیں ہے۔ یہ تو بنسی لال کا ہے۔'' گنپت سخت خوفزدہ ہو گیا تھا۔
اس کے برعکس بنسی لال پر اعتماد تھا۔ بات سنبھالتے ہوئے بولا۔ ''مہاراج! یہ سادہ سا شخص ہے، آپ کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا ہے۔''
باس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بنسی لال کو خاموش ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے گنپت رائے سے پوچھا۔ ''سچ سچ بتا دو جھاڑیوں میں کیا کر رہے تھے۔''
''کک..... کچھ نہیں..... سرکار.....'' گنپت نے ہکلاتے ہوئے انکار میں سر ہلانا چاہا، مگر اس کی بات پوری ہونے سے پہلے باس کا ہاتھ گھوما۔ ''چٹاخ'' کی زوردار آواز ابھری، گنپت رائے کولہوں کے بل نیچے گر گیا تھا۔ باس پستول سیدھا کرتے ہوئے غرایا۔ ''سچ بکتے ہو یا ٹھوک دوں۔''
''بھگوان کے لیے مہاراج! میں بے قصور ہوں۔'' گنپت باس کے پاؤں سے لپٹ گیا تھا۔ ''اس نے زبردستی پیسے دیے تھے۔ میں نہیں لے رہا تھا۔'' گنپت نے جیب سے تمام نوٹ نکال کر باس کے قدموں میں رکھ دیے تھے۔
''مارے گئے۔'' خود کلامی کرتے ہوئے میں پرما کی طرف متوجہ ہوا۔ ''بغیر آواز نکالے وہاں نشیب میں لیٹ جاؤ، گولیاں چلنے کو ہیں۔ اور یہ جگہ غیر محفوظ ہے۔'' جھاڑیوں سے چند قدم کے فاصلے پر نشیبی گڑھا تھا۔ جھاڑیاں گولی کو نہیں روک سکتی تھیں اس لیے میں نے یورش کرنے سے پہلے پرما کو محفوظ کرنے کا سوچا۔
بغیر کوئی سوال کیے وہ سرعت سے اٹھی اور جھاڑی کی آڑ میں رہتے ہوئے مذکورہ گڑھے کی طرف بڑھ گئی۔ مسلسل معرکہ آرائی سے واسطے کی بدولت اس میں تھوڑی بہت سمجھ داری تو آ ہی گئی تھی۔
میں باس اور گنپت رائے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ گنپت رائے نے راز اگلنے میں کچھ زیادہ ہی جلد بازی دکھائی تھی۔ یہ تو اللہ کا شکر تھا کہ اب تک بازی میرے ہاتھ میں تھی۔
باس ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے اُکڑوں بیٹھ گیا تھا۔ اس کا ہاتھ گنپت کے سر پر پہنچا۔ ''بھگوان نے منش (انسان) کے بھاگ (قسمت) میں پتا (مصیبت) نہیں لکھی ہوتی، مگر لوبھ (لالچ) اسے نرگ (جہنم) کے دوارے (دروازے تک) لے جاتی ہے۔''
باس کے انداز سے لگ رہا تھا وہ گنپت کے ڈر تک پہنچ چکا تھا۔ مزید دیر کرنا خود کو پھنسانے کے مترادف تھا۔ سائلنسر لگا پستول کافی دیر سے جیب سے نکل کر میرے دائیں ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا۔ ان چاروں کو ہلاک کیے بغیر بھاگنا ممکن نہ تھا۔ فاصلہ اتنا زیادہ نہ تھا کہ پستول کی گولی کے ضائع جانے کا خدشہ ہوتا۔ میں نے سب سے پہلے باس پر نشانہ سادھا تھا۔ وہ گنپت رائے کی بزدلی پر محظوظ ہو رہا تھا۔ اور یقیناً اس کا ارادہ بنسی اور گنپت رائے کو پوچھ گچھ کے بعد ہلاک کرنے کا تھا۔ کسی مظلوم کی ذرا سی غلطی بھی وہ کہاں برداشت کر سکتے تھے۔
یہ بھی ممکن تھا وہ معلومات اگلوا کر ان سے تعرض نہ کرتا۔ مگر اس کی امید چند فیصد ہی تھی۔
باس کے گنپت رائے کے بالوں کو سہلاتے ہوئے ہاتھ نے جیسے ہی یکجا ہو کر اس کے پراگندہ بالوں کو مٹھی میں جکڑا، میں نے لبلبی دبا دی۔

وہ اکڑوں بیٹھا تھا۔ ماتھے پر لگنے والی گولی نے اسے کولہوں کے بل نیچے گرایا اور زمین پر لمبا ہوتے ہوئے اس کا جسم اذیت سے تڑپنے لگا۔ میں اس کا انجام دیکھنے کو رکا نہیں تھا۔ فوراً ہی اپنی شست دوسرے اور پھر تیسرے کی طرف موڑ کر مسلسل لبلبی دباتا گیا۔

ڈرائیور نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مخالف جانب اترنے کی کوشش کی تھی مگر اس کے نیچے اترنے سے پہلے مجھے گولی چلانے کا موقع مل گیا تھا۔ البتہ اس کے جھکے ہونے کی وجہ سے سر کے بجائے اس کی پشت نشانہ بنی تھی۔ پہلی گولی اس کی پیٹھ میں لگی، وہ تڑپ کر سیدھا ہوا اور اگلی گولی نے گردن سے پار ہو کر اسے اوندھے منہ گرا دیا تھا۔

بنسی رام ٹرک کی آڑ میں ہو گیا تھا، جبکہ گنپت رائے گھٹے گھٹے انداز میں چیخ رہا تھا۔

میں بھاگ کر جھاڑی سے نکلا اور اس کے قریب پہنچتے ہوئے غرایا۔ ''چپ کرو بے وقوف، تمھاری وجہ سے انھیں قتل کرنا پڑا۔''

''مم..... مہاراج! بھگوان کے لیے شما کر دو۔'' گنپت کی حالت پتلی تھی۔ اور دھوتی سے بہتا پانی ظاہر کر رہا تھا کہ معاملہ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔

میں برہم ہوا۔ ''یہ پیسے اٹھاؤ اور فوراً سے پہلے یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ اور اگر کسی سے بھی ذکر کیا تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

پیسے مٹھی میں دبا کر وہ بھاگ پڑا تھا۔ اتنا خوف زدہ ہونے کے باوجود اس نے پیسوں سے دست برداری گوارا نہیں کی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ لوگوں کے لیے دولت کتنی اہمیت کی حامل ہے۔

میں نے پرما کو آواز دی۔ ''راجکماری آ جاؤ۔'' اور ڈرائیور کی لاش اٹھا کر جیپ سے نیچے پھینک دی۔ اس نے چہرے پر مفلر لپیٹا ہوا تھا جو افراتفری میں سیٹ پر گر گیا تھا۔ مفلر اٹھا کر میں نے گلے میں ڈال لیا تھا۔ سردی کے موسم میں مفلر کا استعمال عام ہو جاتا ہے۔ اور شناخت چھپانے کو یہ کارآمد چیز ہے۔

بنسی لال نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''مہاراج اگر اجازت دو تو میں چلا جاؤں۔'' اس کا چہرہ بھی خوف سے زرد پڑا تھا۔

''بھاگو۔'' اسے جانے کا اشارہ کر کے میں دشمنوں کا اسلحہ سنبھالنے لگا۔ ایک کے پاس کلاشن کوف جبکہ تین کے پاس پستول تھے۔ کلاشن کوف جیپ میں رکھ کر میں نے تیس بور پستول جھاڑیوں میں اچھال دیے۔ ایک پستول نائین ایم ایم تھا اس کی میگزین اتار کر جیب میں ڈالی اور اسے بھی پھینک دیا۔ اس کی گولیاں میں گلاک میں چلائی جا سکتی تھیں۔

پرما بھاگتے ہوئے قریب پہنچ گئی تھی۔ تمتمائے ہوئے چہرے کے ساتھ اس نے لاشوں کو ایک نظر دیکھا۔ اور میری طرف متوجہ ہوئی۔

''باڈی میں لیٹ جاؤ۔'' اسے ہدایت دے کر میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اگنیشن میں چابی گھما کر جیپ اسٹارٹ کرنے لگا۔

اس نے بے چوں چرا کیے میری ہدایت پر عمل کیا تھا۔ میں نے جیپ ممبئی کی جانب موڑ دی، کیوں کہ آگے جانے میں زیادہ خطرہ تھا۔ دشمنوں کا زور پیچھے کی جانب نہیں تھا۔ اب مجھے کوئی لنک روڈ تلاش کر کے اس علاقے سے دور جانا تھا۔ کلاشن کوف میں نے گود میں رکھ لی تھی۔ پرما کو پیچھے لیٹنے کا اس لیے کہا تھا تاکہ وہ دور سے نظر آ کر میری شناخت کی تصدیق نہ کرتی رہے۔

''کنگلے، ان کی جیبوں کی تلاشی کیوں نہیں لی۔'' جیپ کے تھوڑا سا آگے بڑھتے ہی میری سماعتوں میں پرما کی شوخی

بھری آواز گونجی۔

عقبی شیشے میں دیکھا، وہ دونوں سیٹوں کے درمیان بیٹھی میری پیٹھ کو گھور رہی تھی۔

میں جھلاتے ہوئے بولا۔ ''باڈی میں اس لیے بیٹھنے کا نہیں کہا کہ سیٹیں گندی ہوتی ہیں۔''

''اچھا، ہم تو یہی سمجھے تھے۔'' وہ مجھے چڑانے کو ہنسی۔

''نیچے لیٹ جاؤ تا کہ دور سے کسی کو نظر نہ آسکو۔'' درشتی سے کہتے ہوئے میں نے بریک پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر رفتار کم کرتے ہوئے موڑ کاٹا اور جیپ کے سیدھا ہوتے ہی رفتار بڑھا دی۔

''آپ کے اندیشوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کم بخت سچ ہی نکلتے ہیں۔'' وہ منہ بناتے ہوئے لیٹ گئی تھی۔

میں نے ڈرائیور کا مفلر چہرے کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ دشمنوں کی لاشیں میں سڑک کنارے ہی چھوڑ آیا تھا۔ عام شہریوں سے بعید تھا کہ پولیس کے چکروں میں پڑتے۔ میں نے بھی لاشیں چھپانے میں وقت ضائع نہیں کیا تھا کہ اس کا کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک تربیت یافتہ شخص تیز رفتاری میں بھی درستی کا خیال رکھتا ہے۔ ایک عام آدمی اور ہم میں سوچنے ہی کا فرق ہوتا ہے۔ مختلف حوادث و واقعات کا سامنا کر کر کے ہم میں حوصلے و جرأت کے ساتھ بروقت فیصلہ کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

چند کلومیٹر کے بعد میرے قریب سے کالے رنگ کی تین کاریں تیز رفتاری سے گزریں۔ مجھے لگا ان میں ایجنسی کے لوگ سوار ہیں۔ وہ ہم سے تعرض کیے بغیر آگے نکل گئے تھے۔ مزید چند کلومیٹر جانے کے بعد وہی چوکی آگئی جہاں سے ہم واپس بھاگے تھے۔ وہاں چیک پوسٹ قائم تھی۔ پولیس کی وردی کے علاوہ تین سول کپڑوں والے بھی نظر آئے۔ جب میں قریب پہنچا، تب وہ ممبئی سے آنے والی ایک مسافر بس کی تلاشی کی طرف متوجہ تھے۔ میں ان پر سرسری نظر ڈال کر آگے نکل گیا۔ وہاں سے بہ خیریت گزرنے پر میں نے بے ساختہ گہرا سانس لیا تھا۔ امید نہ تھی کہ اتنی آسانی سے ان کے گھیرے سے نکل جائیں گے۔ مگر انھوں نے بنیادی غلطی یہ کی تھی کہ ساری توجہ آگے کی طرف مرکوز رکھی تھی۔ ان کے تئیں ہم نے اسی سڑک پر آگے بڑھنا تھا۔ یقیناً آگے سڑک پر خاطر خواہ رکاوٹوں نے موجود ہونا تھا۔ اس علاقے میں بھی اب بہت زیادہ ٹولیوں نے مٹر گشت شروع کر دی ہوگی۔ گمان ہی غالب یہی تھا کہ وہ جلد ہی گنپت رائے تک پہنچ جاتے، مگر اس سے کام کی بات نہیں اگلوا سکتے تھے۔ بنسی رام سے بھی رابطہ رکھنا بعید تھا۔ اگر وہ دونوں نہ بھی بتاتے تب بھی سڑک کنارے پڑی چار لاشیں زیادہ دیر چھپ نہیں سکتی تھیں۔ جن گاڑیوں پر مجھے ایجنسی والوں کا شبہ گزرا تھا اگر وہ حقیقت میں ایجنسی ہی کی گاڑیاں تھیں تو اب تک انھیں میرے پیچھے روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔ اس لحاظ سے اس سڑک پر مزید چلنا مناسب نہ تھا۔ میں کسارا گاؤں سے ممبئی کی طرف آگیا تھا۔ اور تیز رفتاری سے جیپ بھگائے جا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ میری نگاہیں کسی مناسب مقام کی تلاش میں بھی سرگرداں تھیں۔ دائیں جانب ایک لنک روڈ نظر آیا میں جیپ کی رفتار کم کرتے ہوئے لنک روڈ پر چڑھ گیا۔ جانے کس وقت تعاقب والی گاڑیاں پیچھے پہنچ جاتیں اس لیے احتیاط رکھنا ضروری تھا۔

سڑک کے جوانب میں آبادی موجود تھی۔ میں تیز رفتاری سے آگے بڑھتا رہا۔ مسلسل جاگتے ہوئے چوبیس گھنٹوں سے زیادہ ہو گئے تھے میری تو خیر تھی پرما کا مسئلہ گمبھیر تھا۔ میں کوئی ایسی جگہ ڈھونڈنا چاہ رہا تھا جہاں کم از کم وہ اپنی نیند پوری کر لے۔

سڑک پر ٹریفک کو دیکھ کر مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ جیپ اکیلی ہونے کی وجہ سے لوگوں کی نگاہ کا مرکز نہیں بن سکتی تھی۔ ورنہ اکیلی گاڑی کا گزرنا کئی لوگوں کی یادداشت میں ثبت ہو جاتا ہے اور تفتیش کرنے والوں کو اندازہ لگانے میں آسانی رہتی ہے۔ اس کے برعکس گاڑیوں کی آمد و رفت جاری ہو تو جیپ کا گزرنا اتنا عام ہو جاتا ہے کہ مشکل ہی سے کسی کو

یاد رہتا ہے۔

ایک جنرل سٹور کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے کھانے پینے کی اشیاء خریدنے کی نیت سے بریک لگائی۔ عقبی جانب دیکھنے پر مجھے ہنسی آ گئی تھی۔ پرما سیٹوں کے درمیان سکڑی سمٹی گہرے سانس لے رہی تھی۔ نیند بھی عجیب چیز ہے کہ سولی پر بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی تھی اس کا یوں جیپ کی باڈی میں سونا ایک عجوبہ ہی تو تھا۔

اسے جگائے بغیر میں سٹور کی طرف بڑھ گیا۔ پانی کی تین چار بوتلیں، بسکٹ کے پیکٹ، پیسٹری، نمکو، کیک اور ایسی چند اشیاء خرید کر میں واپس مڑ آیا۔ آگے کی صورت حال کا کوئی پتا نہیں تھا۔ پرما کے لیے بھوکا پیاسا رہنا بہت مشکل تھا۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ خوراک کی کمی کے باعث وہ چلنے ہی سے رہ جائے۔

سامان کے شاپر میں نے ایس آر ون کے بیگ کے ساتھ اگلی سیٹ پر رکھے اور اگنیشن میں چابی گھمانے لگا۔

پرما زور سے بڑبڑائی، کروٹ لینے کی کوشش میں اس کا ہاتھ سیٹ سے ٹکرایا اور وہ اٹھ بیٹھی۔

انگڑائی لیتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ''یہ کون سی جگہ ہے۔''

''کوئی پتا نہیں۔'' جوس اس کی جانب بڑھا کر میں نے جیپ آگے بڑھا دی۔

جوس پکڑتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ''اب ہم سیٹ پر بیٹھ سکتے ہیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''سامان عقبی سیٹ پر رکھ کر آگے آ جاؤ۔''

''شکریہ۔'' شوخی سے کہتے ہوئے اس نے ایس آر ون کا بیگ اور خوراک کے شاپر عقبی نشست پر رکھے اور خود آگے بیٹھ گئی۔ میں بسکٹ کا ایک بڑا پیکٹ کھول کر معدے کی دلجوئی میں مصروف تھا۔

''برگر وغیرہ نہیں تھے ان کے پاس۔'' جنرل سٹور کے سائن بورڈ پر نظر دوڑاتے ہوئے اس نے بسکٹوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''پیسٹری، کیک، چپس وغیرہ بھی لیے ہیں۔''

''اچھا۔'' دلچسپی سے کہتے ہوئے وہ شاپروں کی تلاشی لینے لگی۔ تمام شاپر کھنگال کر اس نے چپس کا ایک پیکٹ کھولا، دونوں پاؤں ڈیش بورڈ پر رکھے اور سیٹ سے ٹیک لگا کر بائیں ہاتھ سے کھانے لگی۔ گاہے گاہے جوس کا گھونٹ بھی بھر لیتی۔ اس طبقے کے لوگ ڈبہ پیک غذاؤں کے زیادہ عادی ہوتے ہیں۔ اور ہم جیسے سفید پوش و مفلس کو جب تک گندم کی روٹی نہ ملے ہماری آنت ہی گیلی نہیں ہوتی۔

بسکٹ کھا کر میں نے پانی کی بوتل کو منہ لگا لیا۔ اس دوران ہم ممبئی دہلی ہائے وے پر پہنچ گئے تھے۔ پہلے ہم ممبئی آگرہ نیشنل ہائی وے پر محو سفر تھے۔ ممبئی دہلی ہائے وے بھی بڑی سڑک ہے۔ مجھے اس پر سفر کرنا مناسب نہ لگا اور میں مغرب کی جانب بڑھتا رہا۔ ایک پٹرول پمپ سے میں نے جیپ کی ٹینکی بھی بھروا لی تھی۔ وہیں میں نے کلاشن کوف جیپ کی عقبی سیٹ کے نیچے منتقل کر دی۔ گو جیپ کے ذریعے ہمیں ڈھونڈنا آسان ہو جاتا لیکن اسے چھوڑنے کی حالت میں بھی نہیں تھا اور مجھے کوئی مناسب تجویز بھی نہیں سوجھ رہی تھی۔

ممبئی دہلی ہائے وے سے آگے بیس پچیس منٹ کے بعد میں نے جیپ کا رخ شمال کی جانب موڑ دیا۔

پرما نے پوچھا۔ ''اب تو خطرے سے نکل آئے ہیں ناں اور آگے اسی جیپ پر سفر کریں گے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔''

''پتا ہے آپ کی سب سے بری عادت کیا؟'' شاپر کو گود میں رکھ کر وہ کچھ اور کھانے کو ڈھونڈنے لگی۔

میں نے منہ بنایا۔ ''میری بری، اچھی عادات سے آپ کو کیا لینا دینا۔''

''اکھٹے سفر کر رہے ہیں اتنا خیال تو رکھنا پڑتا ہے ناں۔'' نمکو کا پیکٹ پسند کر کے اس نے شاپر کو عقبی نشست پر رکھ دیا۔

''مجھے چھوڑیں آپ اپنا ہی خیال رکھ لیں کافی ہے۔''

اس نے تبصرہ کیا۔ ''اگر مجبوری نہ ہوتی تو یقیناً آپ کی معیت میں چند قدم بھی ہمیں لینا دشوار ہو جاتا۔''

میں نے قہقہہ بلند کیا۔ ''چلو کسی بہانے آپ کا ساتھ تو میسر ہوا۔''

وہ مکمل سنجیدگی اور فخر سے بولی۔ ''اسی لیے تو کہتے ہیں، اسے اپنی خوش قسمتی جانو اور اپنے خدا کا شکر کرو۔ راجکماری پرما کا لمحاتی ساتھ بھی کوئی چھوٹی نعمت نہیں ہے۔''

''اور اگر دعویٰ کروں آپ سے زیادہ میں تنگ ہوں۔''

اس نے کندھے اچکائے۔ ''جھوٹ بولنا تو آج کل فیشن ہے۔ آپ بھی خود کو تسلی دے لیں۔''

میں نے سنجیدگی سے جھوٹ اُگلا۔ ''چند کلومیٹر آگے ایک گاؤں میں ہمارے جاسوسوں کا بسیرا ہے۔ وہاں تک گزارا کر لو، آگے آپ کو کسی اور کے ساتھ سفر کرنا ہے۔ دونوں کی ایک دوسرے سے جان چھوٹ جائے گی۔''

''کک..... کیا مطلب؟'' وہ چونکتے ہوئے گڑبڑائی۔

''پشتو میں تو نہیں کہا، سلیس اردو بولی ہے کہ چند کلومیٹر بعد میری خوش قسمتی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہاں سے آگے آپ کسی اور کے ساتھ جائیں گی۔

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''نہیں..... نہیں، ہم آپ کے علاوہ کسی پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔''

میں نے بے نیازی ظاہر کی۔ ''اس معاملے میں مجھے بے بس سمجھو۔''

وہ روہانسا ہوئی۔ ''ہم کسی اور ساتھ نہیں جانے والے۔''

میری نظر ریلوے اسٹیشن کے سائن بورڈ پر پڑی۔ گوریل کی پٹری ہمارے ساتھ ساتھ جا رہی تھی مگر اسٹیشن کو دیکھ کر مجھے ریلوے میں سفر کا خیال آیا تھا۔ جیپ پر ہر وقت خطرے ہی میں رہتے۔ مگر ریلوے اسٹیشن جانے سے پہلے ہمیں کپڑے تبدیل کرنے کی ضرورت تھی۔ پرما کی جینز داغدار و مٹی مٹی ہو رہی تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کی جرسی کی حالت بھی ابتر تھی۔ ریشمی بال الجھے ہوئے اور بے رونق لگ رہے تھے۔ میرے کپڑوں کی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ ان کپڑوں میں ہمارے پہنچانے جانے کا امکان بھی کافی زیادہ تھا۔ سہ پہر ڈھل رہی تھی اور سردی میں بھی اضافہ ہونے لگا تھا۔ میرا ہلکا پھلکا کوٹ اور پرما کی جرسی سردی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ بڑا اوور کوٹ تو بھاگ دوڑ کی نظر ہو گیا تھا۔

تھوڑے فاصلے پر آبادی نظر آ رہی تھی، میں آگے بڑھ گیا۔ ریل یا بس وغیرہ میں سوار ہونے سے پہلے اپنا حلیہ درست کرنا ضروری تھا۔

سات آٹھ کلومیٹر کے بعد ایک اور ریلوے اسٹیشن کا سائن بورڈ نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہی بوئی سر بس اسٹینڈ کا سائن بورڈ نظر آ رہا تھا۔ بس اسٹینڈ دو اڑھائی فرلانگ آگے تھا۔ اس کے قریب سے گزر کر میں دائیں بائیں کا جائزہ لیتا ہوا دھیمی رفتار سے چلتا رہا۔ کلومیٹر ڈیڑھ کلومیٹر فاصلہ طے کر کے دائیں جانب دکانیں نظر آئیں۔ میں نے جیپ ادھر ہی موڑ دی۔ تھوڑا سا آگے جاتے ہی بی اے آر سی شاپنگ کمپلیکس کی شاندار عمارت نظر آئی۔ میں نے جیپ پارکنگ میں روک دی۔

پرما اب تک منہ سجائے بیٹھی تھی۔ ''چلو۔'' ایس آر ون کا بیگ اور شاپر اٹھا کر میں نے اسے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔

''کہہ دیا ناں کسی اور ساتھ نہیں جائیں گے۔'' وہ منہ بسورے رونے پر تیار تھی۔

میں شوخ لہجے میں بولا۔ ''اتنی مشکل سے حفاظت کر کے آپ کو یہاں تک لایا ہوں، پاگل ہوں جو کسی اور کو سونپ دوں گا۔''

اس کے چہرے پر رونق ابھری۔ ''سچ۔'' خوشی سے چہکتے ہوئے وہ نیچے اتری۔ ''ہم اچھی طرح جانتے تھے آپ ڈراما کر رہے ہیں۔''

''اب بتاؤ خوش قسمت کون ہے؟'' شاپنگ کمپلیکس کا رخ کرتے ہوئے میں نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

وہ مترنم ہنسی اچھالتے ہوئے بولی۔ ''آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد ہم ضرورت کا سامان خرید کر باہر نکل آئے تھے۔ اپنی جیپ اور کلاشن کوف وہیں چھوڑ کر میں نے ایک ٹیکسی روکی اور ڈرائیور کو کسی اچھے سے ہوٹل کا بتا کر اندر گھس گئے۔ پندرہ بیس منٹ کی بعد اس نے ہمیں درمیانے درجے کے ایک ہوٹل کے سامنے اتار دیا تھا۔

نیچے اتر کر میں نے ٹیکسی والے کو رخصت کیا۔

پرما نے پرشوق لہجے میں پوچھا۔ ''رات یہاں گزاریں گے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہاں لباس وغیرہ تبدیل کر کے نکلتے ہیں۔''

وہ ملتجی ہوئی۔ ''ہم سخت تھکے ہوئے ہیں۔ پلیز، آج یہیں رات گزارنے دیں۔''

میں نے اسے دبے لہجے میں ڈانٹا۔ ''بے وقوف، دشمن باولے کتوں کی طرح ہماری تلاش میں سرگرداں ہے۔ اور کوئی عام دشمن نہیں ہیں زیرزمین حلقوں کے ساتھ سرکاری طاقتیں بھی ہمارے خلاف ہیں۔''

''آپ سے منت کرنا ہی فضول ہے۔'' جھلاتے ہوئے کہہ کر اس نے چپ سادھ لی۔

اپنا شناختی کارڈ استقبالیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے میں بااعتماد لہجے میں بولا۔ ''مسٹر اینڈ مسز انوپ مشرا، ایک رات کے لیے کمرا چاہیے۔''

''جی سر۔'' شناختی کارڈ پکڑ کر وہ رجسٹر میں اندراج کرنے لگا۔ ہماری دگرگوں حالت کی وجہ سے اس کے چہرے پر حیرانی نمودار ہوئی تھی مگر اس نے استفسار سے گریز کیا تھا۔ یہی حیرانی ہمیں خریداری کرتے وقت سیلز مینوں کے چہرے پر بھی نظر آئی تھی۔ اور اس ہوٹل میں گھسنے کا مقصد بھی لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بننے سے بچنا ہی تھا۔ پرما مجھے تیز نظروں سے گھورنے لگی تھی۔ یقیناً مسز انوپ مشرا کا لقب اسے پسند نہیں آیا تھا۔ لیکن خیریت گزری کہ بے وقوف نے کسی حماقت کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔

کرایہ پیشگی وصول کر کے استقبالیہ نے ایک چابی میری طرف بڑھائی اور رہنمائی کو ایک بیرا ساتھ کر دیا۔

بیرا ہمارا سامان اٹھا کر آگے ہو گیا تھا۔ دوسری منزل پر کمرہ نمبر بتیس کے سامنے کھڑے ہو کر بیرے نے مجھ سے چابی لی اور دروازہ کھول دیا۔

درمیانی مالیت کا نوٹ بیرے کو پکڑا کر میں نے اس کا عاجزی بھرا ''شکریہ'' وصول کیا۔ اور اسے رخصت کر کے دروازہ قفل کر دیا۔

''کیا بکواس کر رہے تھے، ہم مسز انوپ مشرا ہیں؟'' بیرے کے غائب ہوتے ہی وہ پھٹ پڑی تھی۔

''آپ صرف احمق ہیں۔'' جھلاتے ہوئے کہہ کر، میں نے شاپر سے نئے کپڑے نکالے اور غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

''ہم جانتے ہیں آپ جیسوں کو، خوب صورت اکیلی لڑکی دیکھی نہیں کہ ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔'' وہ بالکل سنجیدہ تھی۔

''اس شکل کو کوئی اندھا ہی خوب صورت کہہ سکتا ہے۔ اور الحمدللہ میں آنکھوں والا ہوں۔'' غسل خانے کے دروازے پر رک کر میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ اور اندر گھس کر دروازہ بند کر دیا۔

گرم پانی نے ساری تھکن اتار دی تھی۔ نہانے سے پہلے میں نے کلین شیو کر لی تھی۔ ہلکا پھلکا ہو کر نکل آیا۔ دماغ تازہ دم ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی شدت کی بھوک محسوس ہوئی، مگر میں وہاں زیادہ دیر گزارنے کے حق میں نہیں تھا۔

پرما صوفے پر ٹیک لگائے بے سدھ لیٹی تھی۔ ذرا سا آرام ملتے ہی اسے نیند آ گئی تھی۔ جب میں اتنی تھکن محسوس کر رہا تھا تو وہ بے چاری میرے مقابلے میں بہت زیادہ نرم و نازک تھی۔ اور زندگی میں پہلی بار ایسے حالات سے اس کا واسطہ پڑا تھا۔

مٹی سے داغدار چہرہ، الجھے ہوئے بال اور میلے کچیلے لباس میں وہ بے حد معصوم اور پیاری لگ رہی تھی۔ یوں جیسے چھوٹی سی بچی مٹی میں کھیل کر تھک ہار کر لیٹی ہو۔ اگر ذرا بھی گنجائش ہوتی تو میں اسے جگانے کی ہمت نہ جتاتا، مگر وہاں زیادہ دیر گزارنا خطرے سے خالی نہ تھا تبھی اس کا بازو ہلانے لگا۔

اس نے بڑبڑا کر پہلو بدلا لیکن آنکھیں بند ہی رہیں۔

''پرما..... پرما.....'' میں نے زیادہ زور سے اس کا بازو ہلایا۔ بڑی مشکل سے اس کی آنکھیں کھلیں۔ کالی سیاہ آنکھوں میں گہری سرخی چھائی تھی۔ شاید ایسی ہی آنکھیں دیکھ کر شاعر نے کہا تھا.....

اس کی آنکھوں میں سرخ دھاگے ہیں
رات کس کے نصیب جاگے ہیں

مگر میں اسے شعر سنانے کی حالت میں نہیں تھا۔ اب تک اسے مسز انوپ مشرا کا تخاطب ہضم نہیں ہوا تھا۔ کوئی ایسی کوشش اسے مزید تپا دیتی۔

وہ ملتجی ہوئی۔ ''پلیز ہمیں تھوڑی دیر سونے دیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بے وقوف نہ بنو۔ یہاں سے فی الفور نکلنا ہے۔ آپ جلدی سے نہا کر کپڑے تبدیل کریں، باقی آرام ریل گاڑی میں کر لینا۔''

''ظالم کو چھوٹی سی بچی پر ترس بھی نہیں آتا۔'' درشتی سے کہتے ہوئے وہ غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ مجھے ہنسی آ گئی تھی۔ اس کے نہانے تک میں نے ایس آر ون نئے سفری بیگ میں منتقل کر دی تھی۔ رانکل کا اپنا بیگ میلا ہونے کے علاوہ میری پہچان بھی بن سکتا تھا۔ ضرورت کا دوسرا سامان بھی بیگ میں ڈال کر میں تیار ہو گیا تھا۔

پرما باہر نکلی تو حلیہ بالکل بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ہلکے بھورے رنگ کے شلوار سوٹ میں وہ تر و تازہ اور ایک دم کھلی کھلی لگ رہی تھی۔

''آپ کے دیکھنے سے ہمیں سخت کوفت و چڑ ہوتی ہے۔'' کندھوں تک آتے سنہرے ریشمی بالوں پر تولیہ رگڑتے ہوئے وہ بیڈ کے قریب پہنچی جہاں کالے و سفید رنگ کا قیمتی سوئیٹر اور ایک گرم نسوانی کوٹ پڑا تھا۔

مجھے لگا اس نے تھپڑ کھینچ مارا ہو۔ سرد لہجے میں پوچھا۔ ''اور اس کی وجہ۔''

تولیہ بیڈ پر پھینک کر اس نے جرسی اٹھانے کو ہاتھ بڑھائے۔ مگر میرے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ وہ فوراً میری طرف گھومی۔

''ہم مذاق کررہے تھے، شاید آپ کو برا لگا۔''

''کیا نہیں لگنا چاہیے؟'' میرا موڈ برقرار رہا۔

''سوری۔'' وہ گھبرا گئی تھی۔

میں رخ موڑتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ ''ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ جلدی تیار ہو جاؤ۔''

بلاشبہ اس نے بہت بے ہودہ بات کی تھی۔ اور میرا برا منانا بالکل غلط نہ تھا۔ لیکن برا ماننے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں روٹھ گیا تھا۔ میرے لیے اس کی اہمیت فقط اتنی تھی کہ اسے خیریت سے انصاری صاحب تک پہنچانے کا خواہاں تھا۔ روٹھنے منانے کا کھیل تو اپنی محبوبہ کے ساتھ کھیلنے میں مزا آتا ہے۔ اور میرے دل کی ملکہ تو وہاں سے بہت دور حلہ گنگ کی پر بہار فضاؤں میں قہقہے بکھیر رہی تھی۔ نجانے اس کے دل کا غبار دھلا بھی تھا کہ اب تک ویسے ہی خفا تھی۔ کہتے ہیں جدائی کی گھڑیاں، ہجر و فراق کے لمحے، طویل فاصلے اور دوری کا عذاب محبوب کے بڑے جرائم اور بھاری لغزشوں کو بھی فراموش کرا دیتا ہے۔ سات آٹھ ماہ کا عرصہ اتنا مختصر نہ تھا کہ وہ خفگی پر ڈٹی رہ پاتی۔ اور بالفرض اب تک اس کا موڈ ویسے کا ویسا ہی تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ مستقبل میں بھی اس کے راضی ہونے کی امید نہیں تھی۔ ایسی صورت میں علیحدگی ہی واحد حل بچتا تھا۔ اس کے بار بار طلاق چاہنے کا جواب مسلسل منت سماجت نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر واقعی اس کے دل میں کوئی ایسی دراڑ آ گئی تھی جس کا پر ہونا ممکن نہیں تھا اور وہ مزید میرے ساتھ نہیں چلنا چاہتی تھی تو اس کی خوشیوں کی راہ میں روڑے اٹکانا جائز نہ ہوتا۔

''چلیں۔'' وہ تیار ہو کر میرے سامنے آئی۔ جرسی و کوٹ پہن کر اس نے سر پر گرم ٹوپی اوڑھ لی تھی۔ گلے میں مفلر نما دوپٹا تھا جو اس نے چہرے کے گرد لپیٹ لیا تھا۔

اسے دیکھے بغیر میں نے بیگ اٹھانے کو ہاتھ بڑھائے۔ تبھی ایک دم دروازہ میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور پھر دو مسلح افراد دروازے کو دھکیلتے ہوئے اندر گھسے۔

ایک دھاڑا۔ ''خبردار، حرکت کرنے کی کوشش تمھیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔''

پرما کے حلق سے ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی تھی۔ سوچنے کی مہلت نہیں تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ایسے حالات میں تربیت یافتہ افراد سوچنے میں وقت کرنے کے بجائے شروع کی افراتفری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیوں کہ وقت گزرنے کے ساتھ دفاع کرنا مشکل ہوتا جاتا ہے۔ ان کا للکارنا، پرما کا چیخنا اور میرے ہاتھ میں موجود بیگ کا گولی کی طرح سامنے والے کی طرف بڑھنا ایک ساتھ ہوا تھا۔

بیگ پھینکتے ہی میرا ہاتھ جیب سے سائیلنسر لگا پستول نکال چکا تھا۔

بیگ سامنے والے کے ہاتھوں پر لگا، پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ پستول اٹھانے جھکا، اس کے پیچھے آنے والے نے سرعت سے پستول سیدھا کرنا چاہا مگر اس دوران گلاک کی مزل سے بے زبان گولی نکل کر اس کے پستول والے ہاتھ سے ٹکراتی ہوئی اس کے پیٹ میں گھس چکی تھی۔ ہلکی سی چیخ مار کر وہ پیٹ پکڑ کر دہرا ہو گیا تھا۔ چونکہ وہ میرے سامنے کھڑا تھا اس وجہ سے گولی اس کے پستول والے ہاتھ کو زخمی کر کے پیٹ میں گھسنے کا باعث بنی تھی۔

دوسری گولی میں نے اس کے دوسرے ساتھی کی پستول پر داغی جو پستول کو گرفت میں لینے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ گولی لگتے ہی پستول دوبارہ اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

میں نے فوراً دھمکایا۔ ''ذرا سی غلط حرکت تمھیں ہمیشہ کو بے حرکت کر سکتی ہے۔''

ان کے وہم و گمان میں بھی یہ صورت حال نہیں تھی۔ زخمی آدمی پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے دبائے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا

تھا۔ دوسرا کمر سے خم نکالتے ہوئے سیدھا ہوا۔ ''بہتر ہوگا گرفتاری دے دو۔''

میں نے قدم لے کر ہاتھ گھمایا۔ ''چناخ۔'' کی آواز سے کمرہ گونج اٹھا تھا۔ ''کسی نے مشورہ مانگا ہے۔''

وہ گال پر ہاتھ رکھے مجھے کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے غرایا۔ ''باس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ انڈیا کے چپے چپے میں ان کے وفادار موجود ہیں۔ بہتر ہوگا منہ مانگی رقم لے کر لڑکی کو ہمارے حوالے کردو۔ جس ملک کا کہو گے باس اگلے چند گھنٹوں میں تمہیں وہیں پہنچا دے گا۔''

میں نے تصدیق چاہی۔ ''تو تم وگنیش شکلا کے آدمی ہو۔''

وہ اطمینان سے بولا۔ ''وگنیش شکلا کو نہیں جانتا، میں انسپکٹر جمشید علی ہوں اور میرا باس منوج جوشی ہے۔''

میں طنزیہ انداز میں بولا۔ ''حالانکہ تمہیں بھارت سرکار سے احکامات لینے چاہئیں۔''

''تم سے مشورہ یا نصیحت نہیں مانگی۔ اپنا اکاؤنٹ نمبر بتاؤ اور لڑکی میرے حوالے کرو اگلے پانچ منٹ میں تمہارے اکاؤنٹ میں منہ مانگی رقم منتقل کردی جائے گی۔''

میں نپے تلے انداز میں بولا۔ ''اس کی کیا ضمانت کہ لڑکی تمہارے حوالے کرنے کے بعد مجھے زندہ چھوڑ دیا جائے گا۔''

پرما ایک دم گھبراتے ہوئے بولی۔ ''آپ ایسا نہیں کرسکتے۔''

جمشید علی استہزائی نگاہ پرما پر ڈال کر بولا۔ ''اس کی خوب صورتی تمہیں بہکا نہ دے۔ ایسی پریوں کے جھرمٹ تمہارے منتظر ہیں۔ بلکہ اس کے ساتھ بھی جو مرضی آئے کرسکتے ہو۔ ہفتہ، دو ہفتے، مہینا جب تک دل نہ بھرے یہ تمہارے حوالے رہے گی۔ جب دل بھر جائے تب ہمارے حوالے کردینا۔''

''میں نے کوئی اور سوال کیا تھا؟''

''جرم کی دنیا میں زبان ہی کی ضمانت چلتی ہے۔ تم ایک بہادر اور باصلاحیت جوان ہو اور ایسے افراد کو منوج جوشی ضائع نہیں کیا کرتا۔ منہ مانگی رقم کے علاوہ تمہیں بہترین نوکری بھی مل سکتی ہے۔ یقین مانو عیاشی کی زندگی گزارو گے اور دنیا ہی میں جنت کے مزے لوٹو گے۔''

''تم مسلمان ہو، اگر منوج جوشی کے بجائے اپنا تعارف بہ طور انسپکٹر کراتے تو زندہ بچ جاتے کہ کسی سرکاری آدمی کو گولی مارنا مجھے مناسب نہیں لگتا۔ کیوں کہ وہ سرکاری احکامات کے تابع اور دیش سے وفاداری کی وجہ سے میرے خلاف ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو میں حق بہ جانب سمجھتا ہوں اور دشمنی کے باوجود ان کی رعایت رکھتا ہوں۔ البتہ منوج جوشی کے آدمی کسی رعایت کے مستحق نہیں۔'' یہ کہتے ہی میں نے پستول سیدھا کیا۔

''کک..... کیا بے وقوفی کر.....'' اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے سمجھانے کی کوشش کی، مگر بے شعور گولی نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی تھی۔ دھڑام سے نیچے گر کر وہ ایڑیاں رگڑنے لگا۔

اس کا ساتھی گھگیایا۔ ''پپ..... پلیز میرا تعلق پولیس سے ہے۔ آپ میرا.....'' اگلی گولی نے اسے بھی جمشید علی کے پاس پہنچا دیا تھا۔

''راجے۔'' کہتے ہوئے پرما فرط جذبات سے بھاگ کر میرے قریب آئی، مگر اس سے پہلے کہ مجھے لپٹنے میں کامیاب ہوتی میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے دور ہی سے روک دیا تھا۔

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔'' رکھائی سے کہتے ہوئے میں جمشید علی اور اس کے ساتھی کی تلاشی لینے لگا۔ ان کی نقدی قبضے میں کرکے میں نے جمشید علی کے پستول کی میگزین پر بھی قبضہ جما لیا کہ اس کے پاس نائین ایم ایم پستول تھا۔ اور اس

کی گولیاں گلاک میں کام آسکتی تھیں۔

پرما کا چہرہ خفت سے سرخ ہو گیا تھا۔ ایسی نوابزادی جو بزعم خود حسن کا شہکار ہو، رکھ رکھاؤ والی ہو، [illegible] سے بھی تگڑی ہو، اسے کسی مرد کا دھتکارنا کتنا خفیف و شرمندہ کر سکتا ہے اس کا اندازہ کرنا اتنا بھی مشکل نہیں ہے۔ یقیناً اس نے سوچا ہوگا کہ اس کے التفات پر میں کھل اٹھوں گا۔ مگر بے وقوف، میری پلوشے اور روما کی اہمیت سے ناواقف تھی۔ بہ ہر حال میرے لیے اس کا روٹھنا، ماننا، خفا ہونا، ناراض ہونا کسی اہمیت کا حامل نہیں تھا۔

''چلو۔'' بیگ کندھے پر لاد کر میں دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر نکلتے ہی مجھے کھانے کی ٹرالی دکھیلتا ہوا بیرا نظر آ گیا۔ وہ ایک دروازے کے سامنے پہنچ گیا تھا، اس کے گھنٹی بجانے سے پہلے میں جھپٹ کر قریب ہوا۔

''سنو۔''

''جی سر۔'' وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

''کیا چاہیے، گولی یا نوٹ۔'' میں نے بائیں ہاتھ میں دو ہزار کا نوٹ پکڑ کر پستول اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

وہ ہکلایا۔ ''بب..... بھگوان کے لیے میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''

''میں مردم شماری کرنے نہیں آیا۔ پوچھا ہے نوٹ چاہیے یا گولی۔''

''آپ کہتے ہیں تو نوٹ لے لیتا ہوں۔'' اس نے جھجکتے ہوئے پیسوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''شاباش۔'' تعریفی انداز میں کہتے ہوئے میں مطلب پر آیا۔ ''اب جلدی سے ہوٹل کے عقبی راستے کی طرف ہماری رہنمائی کر دو۔''

''سب سے آخری کمرہ.....'' اس نے بتانے کو لب ہلائے، میں قطع کلامی کرتا ہوا بولا۔

''مہاراج آگے ہو جاؤ۔''

''جج..... جی..... جی۔'' سرعت سے کہتے ہوئے وہ تیز قدموں سے آگے ہو لیا۔ گیلری دائیں طرف مڑی اس کا اختتام عقبی جانب لوہے کی سیڑھیوں کے پاس ہوا تھا۔ نیچے جھانک کر اپنا اطمینان کرتے ہوئے میں بیرے کو مخاطب ہوا۔

''تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ اس ملاقات کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ ورنہ پولیس کے لتر کھانے کے ساتھ ان دو ہزار روپوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔''

وہ جلدی سے بولا۔ ''ایسا ہی کروں گا مہاراج۔''

''جو مرضی آئے کرو، میرا کام مشورہ دینا تھا۔'' بے پروائی سے کہتے ہوئے میں نیچے اترنے لگا۔

پرما نے بھی میری تقلید کی تھی۔ نیچے پہنچ کر میں چھے فٹ کی دیوار کے قریب ہوا، جسے عبور کر کے ہم ہوٹل سے باہر ہوتے۔

''اوپر چڑھو۔'' میں نے سہارا دینے کو اس کے بازو سے پکڑنا چاہا۔

''ہمیں چھوئیں مت۔'' وہ طیش سے بھری ہوئی تھی۔

''جلدی کرو دیوار عبور کرنا ہے۔'' جھلاتے ہوئے کہہ کر میں نے دیوار کے سرے پر ہاتھ ٹیکے اور اچھل کر اوپر ہو گیا۔

وہ بھی دیوار کے سرے کو پکڑ کر اوپر ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر اس کے بازوؤں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ ان کے سہارے اوپر اٹھ سکتی۔

لمحہ بھر کی کوشش کے بعد وہ روہانسا ہوئی۔ ''ہم سے نہیں چڑھا جا رہا۔''

مطعون کیے بغیر میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے اوپر کھینچا اور ایک جھٹکے سے دوسری سمیت نیچے اتار دیا۔

اس کے منہ سے ڈر کر "ہائے۔" نکلا تھا۔

جونہی قدم زمین سے ٹکرائے، میں اس کا ہاتھ چھوڑ کر نیچے کودا اور آگے بڑھ گیا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اور دکھاؤ میں کمی آنا ہمارے لیے زیادہ مفید تھا۔

تھوڑی سی تگ ودو کے بعد ہمیں ٹیکسی مل گئی تھی۔ سیٹ سنبھالتے ہی میں نے کہا۔ "ریلوے اسٹیشن۔"

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ٹیکسی واپس موڑ لی۔

بوئی سر کا شہر ہمارے لیے چوہے دان بننے والا تھا اور اس سے پہلے وہاں سے نکلنا ضروری تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ ہمارے مشکوک حلیوں کی اطلاع استقبالیہ نے ہوٹل منیجر کو دی ہوگی اور اس نے پولیس کو بلانے میں دیر نہیں کی ہوگی۔ آگے سے ہڈحرام انسپکٹر نے سارا کریڈٹ خود لینے کی کوشش کی تاکہ انعام کی خطیر رقم صرف اسی کے ہاتھ آئے۔ یہ میرا اندازہ تھا۔ ممکن تھا انسپکٹر جمشید کے اور ساتھی بھی ہم سے واقف ہوتے۔

اور یہ تو طے تھا کہ جلد ہی جمشید اور اس کے ساتھی کی لاش تک ہوٹل والوں کی رسائی ہو جاتی تھی اور اس کے بعد ہماری تلاش میں شدت آ جاتی۔ پولیس انسپکٹر کا قتل کوئی چھوٹا معاملہ نہیں تھا۔

اسٹیشن پر اتر کر ریل گاڑی کا پتا کیا تو اب تک گاڑی آنے میں تین گھنٹے رہتے تھے اور اتنی دیر اسٹیشن پر گزارنا ممکن نہ تھا۔ ہماری تلاش میں سب سے پہلے بس اڈوں اور ریل اسٹیشن ہی پر چھاپہ پڑنا تھا، بلکہ بس کے مقابل ریل گاڑی زیادہ مشکوک تھی۔

بس اڈہ چند سو میٹر ہی دور تھا۔ میں واپس مڑ گیا۔ پرما میرے پیچھے ہولی۔ خاموشی اس کی خفگی کا مظہر تھی، مگر میرے نزدیک اس کی ناراضی اتنی اہمیت کی حامل نہیں تھی کہ منانے کی ضرورت محسوس کرتا۔ میری ذمہ داری اس کی حفاظت اور خیریت سے پاکستان لے جانے کی تھی نہ کہ اس کی ناز برداری اور لاڈ اٹھانے کی۔

بس کی روانگی میں بھی پون گھنٹے کا وقت پڑا تھا۔ ہر گھنٹا بعد بس نکلتی تھی اور ہم پندرہ منٹ لیٹ تھے۔ مجھے کسی جگہ ٹک کر بیٹھنا گوارا نہ تھا۔ ایک لوکل بس کنڈیکٹر تارا پور اور وان گاؤں کی آوازیں لگا رہا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے پرما کو اس طرف بڑھنے کو کہا۔

وہ بے زبان جانور کی طرف میرے پیچھے چل پڑی۔ شاید اس روٹ کی وہ آخری بس تھی تبھی کافی رش تھا اور کوئی سیٹ خالی نہیں تھی۔ ایک بار تو میرا نیچے اترنے کو جی چاہا مگر پھر حفاظتی نقطہ نظر سے بس کا بہتر ہونا مجھے وہیں ٹکنے پر مجبور کر گیا۔ پرما کا واسطہ پہلی بار کسی عوامی سواری سے پڑا تھا، تبھی کوئی سیٹ خالی نہ پا کر وہ سوالیہ نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔

میں نے بے پروائی سے کندھے اچکا کر چھت سے منسلک لوہے کے پائپ کو پکڑ لیا تھا۔

ہونٹ بھینچتے ہوئے اس نے نظریں جھکا لی تھیں۔

دو تین منٹ بعد بس ہچکولا کھا کر آگے بڑھ گئی۔ گلی میں نو دس سواریاں ہی کھڑی تھیں۔ ان میں پرما سمیت تین عورتیں تھیں۔ کنڈیکٹر ہر سیٹ کے پاس جا کر کرایہ وصولنے لگا۔ میری نظر اسی پر تھی۔ لوگوں کے کرائے کی ادائی سے مجھے معلوم ہوا کہ بس نے تارا پور سے گزر کر وان گاؤں جانا تھا۔ اور وان آخری سٹاپ تھا۔

میں نے بھی۔ "دو سواریاں، وان گاؤں۔" کہتے ہوئے درمیانی مالیت کا نوٹ کنڈیکٹر کی طرف بڑھا دیا تھا۔

بقیہ رقم میری ہاتھ پر رکھ کر وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ ڈرائیور نے پرشور آواز میں انڈین گانے لگائے ہوئے تھے۔ موسیقی کو انسان کے حواس پر قابو پانے کا ملکہ حاصل ہے۔ خوب صورت ساز انسان کے جذبات میں ہلچل مچا دیتے ہیں۔ اور یقیناً

یہی وجہ ہے کہ دین فطرت میں ساز باجے سے دوری کا حکم دیا گیا ہے۔ میں ان بولوں میں کھو کر اپنی من موہنی دلھن کے پاس پہنچ گیا تھا۔ وہ ہنس رہی تھی، کھلا کھلا رہی تھی، مجھ سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ میری آنکھیں خود بہ خود بند ہو گئی تھیں تا کہ اسے اچھی طرح دیکھ سکوں۔

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکالی دیکھ لی

تین چار کلومیٹر چلے ہوں گے کہ اچانک پرما مجھے ٹکرائی اور ساتھ چپک کر کھڑی ہو گئی۔ بس کو کوئی جھٹکا بھی نہیں لگا تھا کہ اس کے ٹکرانے کی توجیہہ کی جا سکتی۔ نہ وہ ایسا مقام تھا کہ اسے معذرت کی سوجھتی یا اپنے کسی پرانے فعل پر ندامت کی ضرورت پیش آتی۔

میں نے حیرانی و برہمی کی ملی جلی کیفیت سے اسے گھورا۔ مگر وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے پیچھے دیکھ رہی تھی۔ تبھی میری نظر نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ اس کے عقب میں بڑی بڑی مونچھوں والا کریہہ شکل کا ایک موٹا تازہ جوان کھڑا تھا۔ اس کی خباثت بھری نظریں پرما کے وجود پر گڑی تھیں۔ ایک لحظے کے ہزارویں حصے میں میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ وہ پہلے پرما سے کافی دور کھڑا تھا۔ مگر پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ میری آنکھیں بند تھیں تبھی دھیان نہیں دے سکا تھا۔ اور اسے پرما کو نارواانداز میں چھو کر غلاظت اگلنے کا موقع مل گیا تھا۔

افسوس کا مقام یہ ہے کہ صنف نازک کو ایسے واقعات سے آئے روز واسطہ رہتا ہے۔ رش میں، بھیڑ کے مقامات پر، پبلک ٹرانسپورٹ وغیرہ میں انسانی شکل میں چھپے بھیڑیے اس حرکت کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔ عورت فطرتی شرم و حیا کے باعث خاموش رہتی ہے۔ اگر کچھ بول بھی دے تو ڈھٹائی سے کئی جواز اگل دیے جاتے ہیں۔ پرما بے چاری بھی بے بس حوا زادی ہی تھی۔

میں نے ایک دم پرما کو بازو سے پکڑ کر گھما کر اپنی دوسری جانب کھڑا کر دیا تھا۔ کریہہ شکل موٹے کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ ابھری، تاؤ دلانے والے انداز میں اس نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ لیکن وہ ایسا نہ بھی کرتا تب بھی میں اس کا ادھار چکانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ کندھوں سے بیگ اتار کر میں پرما کو مخاطب ہوا۔

''بیگ کو پکڑو۔'' اور پھر پیچھے گھومتے ہوئے برقی کوندے کی طرح میرا دایاں ہاتھ گھوما، جبڑوں پر لگنے والے بھرپور مکے نے اسے خون تھوکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''تیری تو.....'' اس نے مغلظات اگلنے کو ہونٹ کھولنے چاہے، مگر اگلا وار بہت کاری تھا۔ میں نے ایک دم اس کی ٹانگوں کے درمیان گھٹنا اٹھا دیا تھا۔

''اوغ۔'' کی دردناک آواز سے وہ جھکا، میں نے دوسری بار گھٹنا اٹھایا اور ٹھوڑی پر لگنے والی زبردست ضرب سے وہ چاروں شانے چت ہو گیا تھا۔ دائیں بائیں سیٹوں پر بیٹھے لوگوں کو جب تک ادراک ہوتا وہ اناغفیل ہو چکا تھا۔

''کیا ہوا، خیر تو ہے، لڑ و مت.....'' وغیرہ جیسی کئی آوازیں بلند ہوئی تھیں۔

گلی میں کھڑی ایک عورت نفرت بھرے لہجے میں بولی۔ ''بہت اچھا ہوا ہے۔ یہ کمینہ اس کی بیوی کو چھیڑ رہا تھا۔ ایسے کتے بے چاری عورتوں کا جینا دوبھر کر دیتے ہیں۔''

ایک دو آدمی اسے سنبھالنے لگے۔ ڈرائیور نے بس روک دی تھی۔ لمحہ بھر بھانت بھانت کی آوازیں ابھریں۔ مضروب سر جھٹکتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس کی ناک اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔

''تمھیں چھوڑوں گا تو نہیں۔'' اٹھتے ہی اس نے غراتے ہوئے دھمکی دی۔

میں نے بغیر کچھ کہے اس کی طرف قدم بڑھائے، تبھی دو تین آدمیوں نے درمیان میں آ کر رکاوٹ ڈال دی تھی۔
میں نے اعلان کیا۔ ''اگلے اسٹاپ تک اگر تو بس میں رہا تو ماں قسم، بس سے تیری لاش ہی اترے گی۔''
''دیکھ لوں گا تجھے۔'' غصیلے انداز میں کہتے ہوئے وہ سورما پیچھے کو کھسکا اور بس کے روانہ ہونے سے پہلے وہ نیچے اتر چکا تھا۔ لوگوں کے چہرے پر تبسم آ گیا تھا۔
دو لڑکوں نے اپنی سیٹ خالی کرتے ہوئے عقیدت سے مجھے دعوت دی۔ ''بھیا! آپ بیگم کے ساتھ یہاں آ جائیں۔''
خوش دلی سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے پرما کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ عجیب نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔ میری دعوت پر اس کے ہونٹوں پر خفیف سا تبسم ابھرا جسے میں کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔
اس کے سیٹ سنبھالتے ہی میں بھی بیٹھ گیا تھا۔ بس چل پڑی۔ ڈرائیور نے دوبارہ گانے چلا دیے تھے۔ گلوکارہ کی جادو بھری آواز گونجنے لگی.....

یہ کیسا سفر ہے، یہ کیسی ہیں راہیں
کہ منزل کی مجھ کو، خبر ہی نہیں ہے
ڈھونڈوں کہاں میں، سکوں اپنے دل کا
اِدھر بھی نہیں ہے، اُدھر بھی نہیں ہے
پھر کسی درد نے مجھے کیا بے قرار ہے
ہم کو تم سے پیار ہے، ہم کو تم سے پیار ہے

پرما مجھ سے جڑ کر بیٹھی تھی۔ اور پھر اس کا ہاتھ دھیرے سے رینگتا ہوا میرے ہاتھ کی پشت پر آ گیا۔ مجھے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ چہرہ گھما کر دیکھا۔ اس کے لبوں پر خوب صورت تبسم کھل رہا تھا۔
''سوری! ہم نے بہت غلط الفاظ کہے تھے۔ لیکن ہمارا مقصد آپ کا دل دکھانا نہیں تھا۔ ہم تو بس مذاق کر رہے تھے۔ پہلے بھی تو کئی بار اس سے ملتے جلتے انداز میں آپ کو چھیڑ چکے ہیں۔ پلیز معاف کر دیں۔''
گہرا سانس لیتے ہوئے میں زبردستی مسکرایا۔ ''موڈ آپ نے بنایا ہوا ہے اور خفا میں ہوں۔''
اس نے منہ بسورا۔ ''کیوں کہ آپ نے ہمارے ذرا سے مذاق پر ہماری اتنی توہین کر ڈالی۔''
''بے فکر رہو ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔'' اس کی ملائم گرفت سے نرمی سے ہاتھ چھڑا کر میں سامنے دیکھنے لگا تھا۔ خوب صورت و پرکشش ساز اور سریلی آوازوں کے ملاپ سے تشکیل پانے والے گیت نسوانی جذبات پر کچھ زیادہ ہی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور پرما کا مجھے سوری کہنا انھی جذبات کے مرہون منت تھا۔
تاراپور میں بس تھوڑی دیر رکی۔ اس دوران آدھی سواریاں اتر گئی تھیں مزید بیس پچیس منٹ کے سفر کے بعد آخری سٹاپ بھی آ گیا تھا۔
وان گاؤں کی آبادی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ سواریاں نیچے اترتے ہی گھروں کا رخ کرنے لگیں۔ میں گومگو کی کیفیت میں تھا کہ وہیں کسی کا زبردستی مہمان بنوں یا سفر جاری رکھنا درست ہوگا۔ پرما خاموشی سے دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔
بس کے تیز ہارن نے مجھے سوچوں سے نکالا۔ جدید ساخت کی بس کو دیکھتے ہی میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس سے ایک دو سواریاں اتریں، تبھی میں نے پرما کا ہاتھ تھام کر اندر کی جانب قدم بڑھا دیے۔
کنڈیکٹر نے خالی سیٹ کی طرف رہنمائی کر کے گویا ہمیں خوش آمدید کہا تھا۔

پرما کو شیشے والی جانب بٹھا کر میں نے ساتھ والی سیٹ سنبھالی۔ بس کی حالت دیکھ کر مجھے لگا وہ لمبے روٹ کی بس ہے۔ حالانکہ وہ لوکل سڑک تھی۔ ممبئی دہلی ہائے وے ہمارے شرقی جانب تقریباً بیس پچیس کلومیٹر دور ہوگی۔

کنڈیکٹر قریب آیا۔ ''جی باؤ۔'' اس نے ٹکٹ بک نکالی۔

میں مستفسر ہوا۔ ''یہ کہاں تک جائے گی۔''

وہ ہنسا۔ ''اپنا بتائیں، یہ تو بہت آگے تک جائے گی۔''

میں نے بھی دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے بھی بہت آگے تک جانا ہے دوست۔''

اس نے انکشاف کیا۔ ''احمد نگر تک جائیں گے۔''

میں نے حیرانی ظاہر کی۔ ''لوکل سڑک پر۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آمبولی تک لوکل سڑک ہے آگے ممبئی دہلی ہائے وے پر چڑھ جائیں گے۔''

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میں کرایہ پوچھنے لگا۔ مطلوبہ کرایہ ادا کر کے میں نے ٹکٹ وصول کیے بیگ کو قدموں میں رکھا کہ ڈگی میں رکھنا نہیں چاہتا تھا اور بس کے اندر بنے خانوں میں آ نہیں سکتا تھا۔ جسم آرام طلب کر رہا تھا۔ آنتوں کی دہائی بھی جاری تھی، مگر جب تک بس کسی ہوٹل پر نہ رکتی پیٹ بھرنے کا نہیں سوچا جا سکتا تھا۔ البتہ کشادہ سیٹ پر آرام کی خواہش کو رام کیا جا سکتا تھا۔ پرما نے تو سیٹ سنبھالتے ہی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ میں نے بھی اس کی تقلید کرنا مناسب سمجھا۔

—●—

میری آنکھ بس رکنے پر کھلی تھی۔ کچھ سمجھنے سے پہلے دو پولیس والے اندر آ کر سواریوں کو دیکھتے ہوئے دھیمے قدموں سے گزرنے لگے۔ زیادہ تر سواریوں کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے چہرے پر مفلر درست کر کے سیٹ پر سر ٹیکا اور پپوٹوں میں ہلکی سی جھری رکھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ پولیس والے بس کی عقبی سیٹ تک سرسری جائزہ لے کر اتر گئے۔ میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا تھا۔ بس دوبارہ چل پڑی۔

پرما میرے کندھے پر سر ٹیکے گہرے سانس لے رہی تھی۔ میں دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر نیند آنے سے پہلے بس دوبارہ رک گئی تھی۔ شیشے سے باہر جھانکنے پر پتا چلا وہ ہوٹل پر رکے تھے۔ اچھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے پرما کو ہلایا وہ کسمساتے ہوئے اٹھ گئی۔

''کیا ہوا۔'' انگڑائی کو بازو اٹھاتے ہوئے اس نے مسکنت سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''بس ہوٹل پر رکی ہے، کچھ کھانے کو جی کر رہا ہے تو آ جاؤ۔''

''ہمیں خاص بھوک تو نہیں لگی البتہ کھا لیتے ہیں۔'' وہ کھڑی ہو گئی تھی۔ یقیناً دوپہر کو گنپت رائے کی لائی باسی روٹیوں اور پھر چپس، نمکو وغیرہ سے اس کا پیٹ بھرا ہوا تھا۔ البتہ میں نے دو تین نوالوں اور بسکٹ کے ایک پیکٹ کے علاوہ کچھ نہیں کھایا تھا۔ جبکہ بھاگ دوڑ کچھ زیادہ ہی کر لی تھی۔

ہم نیچے اتر آئے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جس میں بارش کی نہایت باریک بوندیں بھی شامل تھیں۔ ہم کانپ کر رہ گئے تھے۔

وہ کپکپا کر بولی۔ ''بہت سردی ہو گئی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''بارش اور ہوا نے کام خراب کر دیا ہے۔''

اس نے بیت الخلاء کی تلاش میں نظریں گھمائیں۔ ''ہمیں تازہ دم ہونا ہے۔''

میں ایک بیرے سے رہنمائی لے کر اس طرف بڑھ گیا۔ تازہ دم ہو کر ہم نے پرتکلف کھانا کھایا اور چائے کی دو دو

پیالیاں معدے میں انڈیلیں کہ چائے کی سخت حاجت محسوس ہو رہی تھی۔

سواریاں دوبارہ بس میں بیٹھنے لگی تھیں۔ ہم بھی اندر آ گئے۔

''لگتا ہے سورگ (جنت) میں آ گئے ہیں۔'' خوشگوار حدت کو محسوس کرتے ہی ہتھیلیاں رگڑتے ہوئے اس نے تبصرہ کیا۔

میں سیٹ سنبھالتے ہوئے ہنسا۔ ''کیا سورگ پر یقین رکھتی ہو۔''

وہ اطمینان سے بولی۔ ''ہماری نظر میں ہر وہ موسم، ماحول اور جگہ جس سے بدن کو راحت ملے سورگ ہے۔''

میں شرارت سے بولا۔ ''اچھا، میں تو سمجھا شاید اللہ پاک کی جنت پر یقین لے آئی ہو۔''

''ہمیں نیند آ رہی ہے۔'' مجھے تیکھی نظروں سے گھورتے ہوئے اس نے سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

میں بھی آنکھیں میچ کر اگلا لائحہ عمل سوچنے لگا۔ اور اس کے لیے سارے معاملے کا از سر نو جائزہ لینا ضروری تھا۔ دشمن میرے اگلے قدم کے بارے جانتے تھے یا نہیں اس بارے صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا تھا۔ نجانے وگنیش شکلا میرے اور پرما کے اکٹھ کو کیا نام دے رہا تھا۔ ممکن تھا وہ سمجھتا میں انصاری صاحب کی وجہ سے پرما کا ساتھ دے رہا ہوں۔ یہ بھی امکان تھا کہ اس کے پس پردہ اسے محبت وغیرہ جیسی کوئی بے وقوفی نظر آتی ہو۔ ممتا دیدی کو میں اصلیت بتا چکا تھا۔ کرن چاولہ بھی ناواقف نہیں لگتا تھا۔ لیکن کرن چاولہ، وگنیش شکلا کو حقیقت بتا چکا تھا یا نہیں اس بارے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کرن چاولہ جیسے لوگوں ایسے رازوں کو ترپ کے پتے کے طور پر چھپا کر ہی رکھتے ہیں۔ جیسے راجیوت مجھے بتا چکا تھا کہ کرن چاولہ کے پاس ایسا مواد موجود تھا جس سے وہ شکلا کو بلیک میل کر سکتا تھا۔ تب تو پتا نہیں تھا لیکن اب میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس مواد میں پرما کی ماں کے قتل کے بارے بھی تفصیل موجود ہونا تھی۔

پہلے میں نے ممبئی آگرہ نیشنل ہائی وے پر فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور اب میں ممبئی دہلی ہائے وے پر محو سفر تھا۔ دشمنوں کے پاس میرا آخری سراغ بوئی سر شہر کے ہوٹل کا تھا جہاں میں انسپکٹر کو قتل کر کے بھاگا تھا۔ وہاں سے آگے اپنے تئیں تو میں نے کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا، لیکن ڈھونڈنے والے بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کر رہے تھے۔ سونے پر سہاگا انعام کی خطیر رقم، پرما انصاری کا پرکشش و معصوم چہرہ اور جذبات میں ہلچل مچانے والا خوش نما بدن تھا۔ وگنیش شکلا نے اپنی برأت ثابت کرنے کو بھانجی کی بے حرمتی و موت تجویز کی تھی۔ لیکن سننے والوں تک وہ بات وگنیش شکلا کے بجائے دوسروں کے واسطے سے پہنچی تھی اور تلاش کرنے والوں کو ترغیب دینے کو ساری بات کس نے سمجھانا تھی۔ بس مختصراً بتایا جاتا کہ دولت بھی ہے اور ساتھ پرکشش راجکماری کا شباب بھی ہے۔ دلیل کے طور پر پرما کی تصویر دکھا دی جاتی۔ وہ لڑکی جسے رندھیر شکلا کی حیات میں کوئی نظر بھر کر نہیں دے سکتا تھا، اب اسے دیکھنا کیا برتنے کی بھی اجازت دے دی گئی تھی۔ اور اس کمینگی میں کامیاب ہونے والا انعام کا حق دار علیحدہ ٹھہرتا تھا۔

اگر بہ نظر انصاف دیکھا جاتا تو وگنیش شکلا نے اپنے دامن کو ہلکی چھینٹوں سے بچانے کو اس مصیبت میں گردن پھنسائی تھی۔ اگر وہ باپ کی موت کے بعد احتیاط وغیرہ کے چکر میں پڑے بغیر پرما کو قتل کروا دیتا تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس کی ایک بڑی وجہ میرا اپنے مشن کو راز رکھنا بھی تھا۔ رندھیر شکلا، کرن چاولہ اور میرے دوسرے دشمن یہی سمجھتے رہے کہ میں پاکستانی جاسوس ہوں اور اپنا اصل کام پس پشت ڈالے لورا براؤن کے عشق میں مبتلا ہو کر اس کے ساتھ مل گیا ہوں۔ اس سوچ کو تقویت ڈاکٹر سجاتا کی بے وقوفی نے بھی دی کہ اس کی غلطی کی وجہ سے پرما کو قید سے فرار کا موقع ملا۔ جس سے رندھیر شکلا اور دوسروں نے یہ سمجھا کہ اسے ہم نے اپنا مقصد پورا کرنے کے بعد آزاد کیا ہے۔ رندھیر شکلا کے تئیں ہمارا مقصد دولت کا حصول تھا۔

اس کی موت کے بعد وگنیش شکلا پر یہ انکشاف ہوا کہ ہم دولت کے ساتھ رندھیر شکلا کی موت کے بھی خواہاں تھے۔ مگر انصاری صاحب کی ذات تک اسے پھر بھی رسائی نہ ہوئی۔ تبھی اس نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا سوچا اور پرما کا کانٹا نکالنے کے ساتھ باپ کے قاتل یعنی مجھے بھی انجام کو پہنچانا چاہا۔ لیکن اس بے وقوف کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس کی وجہ سے میرا کام آسان ہوا تھا۔

دولت و جائیداد بھی انسان کو ذلت کی گہرائیوں میں گرا دیتی ہے۔ رندھیر شکلا کے گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اپنی نواسی کے نام اتنی زیادہ دولت و جائیداد کر کے وہ اس کی دردناک موت کا انتظام کر رہا ہے۔ البتہ پرما کی خوش بختی تھی کہ اس کے باپ کا مقرر کیا بندہ، یعنی خاکسار اس کی مدد کو موجود تھا۔ اور اللہ پاک نے میری کوشش کو کامیابی سے ہمکنار کیا تھا کہ میں نے نہ صرف پرما کو حاصل کر لیا تھا بلکہ اسے اپنا ہمنوا بھی بنا لیا تھا۔ اگر اس کے سامنے میں شکلا کا جرم ثابت نہ کر سکتا تو اسے کبھی ساتھ چلنے پر آمادہ نہیں کر سکتا تھا۔ یوں مجھے دہری مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

بس تیز رفتاری سے محوِ سفر تھی اور اس سے کئی گنا زیادہ تیز رفتاری سے خیالات میرے دماغ میں چکرا رہے تھے۔ پرما سو گئی تھی۔ اس کا سر دھیرے دھیرے سرکتا ہوا میرے کندھے پر آن ٹکا تھا۔ باہر کے موسم کی وجہ سے بس کے اندر کی حدت کچھ زیادہ ہی خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ میرے اندازے میں ہم مہاراشٹر ریاست سے گجرات میں داخل ہو گئے تھے۔ جسے پاکستان میں صوبے کہتے ہیں، انڈیا میں ریاستیں پکاری جاتی ہیں۔ انڈیا کی اٹھائیس ریاستیں ہیں۔ ممبئی ریاست مہاراشٹر کا دارالخلافہ ہے۔ اور گجرات کا دارالخلافہ غالباً گاندھی نگر ہے۔

اچانک بس کی رفتار کم ہوئی اور ہلکے سے ہچکولے کے ساتھ بس رک گئی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ پولیس چیک پوسٹ کو دیکھتے ہی میں چوکنا ہو گیا تھا۔ بس کا دروازہ خودکار انداز میں کھلا۔ دو جوان جن میں ایک وردی والا اور دوسرا سادہ کپڑوں میں ملبوس تھا اندر داخل ہوئے۔ ڈرائیور نے تیز بتیاں روشن کر دی تھیں۔ میں نے چہرے پر مفلر درست کر کے سیٹ سے سر ٹیکا اور ادھ کھلی آنکھوں سے ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مگر اس بار معاملہ مختلف نظر آیا۔ پہلی سیٹ ہی سے وہ لوگوں کے شناختی کارڈ دیکھنے لگے۔ ایک دو کو اٹھا کر اس کی تلاشی بھی لی۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا تھا کہ کیا کروں، بھاگنے کی کوشش یا چپ سادھ کر نصیب آزماؤں۔

پرما نے ہلکے سے بڑبڑا کر کروٹ بدلنے کی کوشش کی اور کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اپنا سر میرے کندھے پر دیکھ کر وہ جھجک کر سیدھی ہو گئی تھی۔

''سوری، ہمیں نیند میں خیال ہی نہیں رہا تھا۔'' اس نے ندامت ظاہر کی۔

میں نے سرگوشی کی۔ ''آنکھیں بند کر کے دوبارہ لیٹ جاؤ، پولیس والے چیکنگ کر رہے ہیں۔''

سرعت سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لیں۔ اس کی تیزی پر میرے ہونٹ ہنسنے کے انداز میں کھل گئے تھے۔ ہم سے دو سیٹیں چھوڑ کر ایک نوجوان جوڑا بیٹھا تھا۔ پولیس والے نے شناختی کارڈ دیکھنے کے ساتھ لڑکے کی تلاشی بھی لی تھی۔ میں ذہنی طور پر ہر قسم کی صورت حال سے نبٹنے کو تیار ہو گیا تھا۔ البتہ آخر تک میری کوشش یہی تھی کہ وہ مصیبت خوش اسلوبی سے بغیر ٹل جائے۔ کیوں کہ موسم کی جو صورت حال تھی ایسے میں بس سے باہر نکلنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ خاص کر پرما کی حالت پر ترس آ رہا تھا کہ بے چاری تھوڑے آرام کے بعد پھر جوکھم میں پڑ جاتی۔

مگر میری خاموش مناجاتیں کام نہیں آئی تھیں۔ قریب آ کر پولیس والے نے شناختی کارڈ مانگا۔ شناختی کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اچانک مجھے یاد آیا کہ ہوٹل کے استقبالیے پر بھی میں نے یہی شناختی کارڈ دکھایا تھا۔ اور استقبالیین نے میرا نام و پتا درج کیا تھا۔ اگر میرا شناختی نام، یعنی انوپ مشرا آگے بتایا جا چکا تھا تو جان بچنا ناممکنات میں سے تھا۔ لمحے

کے دسویں حصے میں اس خیال نے میرے دماغ پر دستک دی۔ اور اس کی تصدیق رائفل کی ٹھنڈی نال نے کر دی تھی۔

شناختی کارڈ پر سرسری نظر دوڑاتے ہی پولیس والے نے کلاشن کوف کی نال میری گردن سے لگا دی تھی۔ ''ہاتھ اوپر۔'' وہ دبنگ لہجے میں بولا۔ سول لباس والے نے بھی مجھ پر پستول تان لیا تھا۔

''خیر تو ہے مہاراج۔'' میں نے مہلت کے حصول کو لب کھولے۔

پولیس والا دھاڑا۔ ''سنا نہیں ہاتھ اوپر۔'' اس کا انداز خصوصی تربیت یافتہ ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔ مجھے لگا وہ اسپیشل پولیس والا ہے۔ تبھی تو رائفل کے بجائے کلاشن کوف سے مسلح تھا۔ یقیناً میرے سابقہ کرتوتوں سے وہ ناواقف نہیں تھے۔ تبھی ذرا بھی لچک نہیں دکھا رہے تھے۔

میں نے ہاتھ اوپر کر دیے، سادہ لباس والے نے مہارت سے میری جیبیں تھپتھپائیں اور گلاک کے علاوہ نیفے میں اڑسا ریوالور بھی برآمد کر لیا۔ کوئی گنجائش بھی باقی نہیں رہی تھی۔

''کوئی بھی اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش نہ کرے۔ تمام لوگ آرام سے بیٹھے رہیں۔'' پولیس والا با آواز بلند اعلان کر کے مجھے مخاطب ہوا۔ ''ذرا سی غلط حرکت تمھیں ہلاکت میں ڈال سکتی ہے۔ یونہی ہاتھ بلند کیے باہر آ جاؤ۔''

میں نے قدم سیٹ سے نکالے، سادہ لباس والے نے اس سے پہلے ہی میرے قدموں میں رکھا ایس آر ون کا بیگ اچک لیا تھا۔

''تم بھی باہر آ جاؤ لڑکی۔'' وردی والے نے کلاشن کوف کی بیرل سے پرما کو ٹہوکا دیا۔ وہ سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ انھوں نے پرما کی تلاشی لینے کی کوشش نہیں کی تھی، بلاشبہ ہمارے بارے وہ تفصیل سے جانتے تھے۔

صورت حال توقع سے زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ غنیمت تھا کہ ان کے پاس ہتھکڑی وغیرہ موجود نہیں تھی اور میرا دماغ جکڑے جانے سے پہلے بھاگنے کی تجویز سوچ رہا تھا۔ مگر دونوں پوری طرح چوکنا تھے۔

''بلرام! تم آگے ہو جاؤ، یہ ذرا سی بھی غلط حرکت کرے فوراً گولی چلا دینا۔'' باوردی شخص نے سادہ لباس والے کو ہدایت دی۔

بلرام سر ہلاتے ہوئے آگے ہو گیا۔ میرا بیگ کندھے میں ڈال کر اس نے پستول کی نال میرے جانب کی اور الٹے قدم پیچھے ہٹنے لگا۔ یقیناً انھوں نے بس سے نیچے اترنے کا سادہ اور بہترین لائحہ عمل طے کیا تھا۔ میں بیک وقت دو افراد کے نشانے پر تھا۔ آگے والے پر حملہ کرتا تو عقب میں چلنے والے کا نشانہ بنتا، پیچھے والے پر ہلہ بولتا تو سامنے والا ٹھوک دیتا۔ پرما کو انھوں نے لائق توجہ نہیں جانا تھا۔ میں بھی پرما سے کوئی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ جو کچھ کرنا تھا مجھے ہی کرنا تھا۔

''لڑکی آرام سے چلتی آؤ، بھاگنے کی کوشش کرنا فضول ہوگا۔'' باوردی پولیس والے نے پرما کو دھمکایا، حالانکہ مجھے یہ کوشش فضول لگی تھی۔ کیوں کہ وہ پہلے ہی اتنی خوفزدہ تھی۔ مجھے پٹر پٹر جواب دینے والی کو دشمنوں کو دیکھتے ہی سانپ سونگھ جاتا تھا۔ کرن جاولہ اور میری لڑائی کے دوران اسے ہتھیار پر قبضہ جمانے کی مکمل آزادی تھی مگر نیک بخت نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کی تھی۔

بلرام دو تین سیڑھیاں اتر کر بس کے دروازے سے باہر نکلا اور تین چار قدم ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے پستول کا رخ میری جانب تھا۔

میں نے باہر نکل کر سامنے دیکھا بیس پچیس قدم دور چیک پوسٹ کا کمرہ تھا جہاں روشنی ہو رہی تھی۔ بلب کی روشنی کے ساتھ آگے کی سرخ لپٹیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ موسم کا لحاظ رکھتے ہوئے انھوں آگ جلائی ہوئی تھی۔ وہی بیس پچیس قدم کا

دورانیہ میرے پاس مہلت تھی۔ میز کے گرد چار افراد کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ وہاں پہنچنے کے بعد مزاحمت کرنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اور میرے بارے تو یقیناً انھیں سختی سے احکامات ملے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن تھا چیک پوسٹ میں پہنچتے ہی مجھے مزید زندہ رہنے کی اجازت نہ دی جاتی۔ اور میری موت کے بعد پرما کے ساتھ انھوں نے جو کچھ کرنا تھا وہ پہلے سے طے تھا۔ اگلے دن ٹی وی پر دو لاشیں دکھائی جاتیں، ایک مظلوم راجکماری پرما کی جو پاکستانی دہشت گردی کی زیادتی کا شکار ہوئی اور دوسری پاکستانی دہشت گرد کی جسے پولیس کے جیالوں نے زبردست مقابلے کے بعد ہلاک کیا۔

میں دل ہی دل میں اندازہ لگانے لگا کہ بلرام پر حملہ کرنا بہتر تھا یا وردی والے کو نشانہ بنانا مناسب تھا۔

''اسی طرح چلتے رہو ہوشیاری دکھانے کی کوشش تمھیں ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتی ہے۔'' مجھے حکم دے کر اس نے سر موڑے بغیر پرما کو کہا۔ ''لڑکی تم بھی آگے ..... اوغ۔'' اس کے حلق سے زوردار کراہ خارج ہوئی تھی۔ یوں لگا جیسے اس کے سر پر چوٹ لگائی گئی ہو۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرا دماغ نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ پرما نے عقب سے اس کے سر پر وار کیا تھا۔ کرن چاولہ والا پستول اس کے پاس تھا۔ یقیناً اسی کے دستے سے وردی والا کا سر بجایا گیا تھا۔

میں برقی کوندے کی طرح اچھلا، جب تک بلرام کچھ سمجھنے کے قابل ہوتا میں اس کے ہتھیار والے ہاتھ پر گرفت جما کر نال کا رخ اپنے جسم سے موڑا تا کہ اتفاقی گولی چلنے پر میں نشانہ نہ بن جاؤں ساتھ ہی میرا گھٹنا اس کے ٹانگوں کے درمیان اٹھ گیا۔

بلرام کے ہونٹوں سے اپنے ساتھی سے بھی بلند کراہ خارج ہوئی تھی۔ ایک دم وہ رکوع کے بل جھکا۔ اس کے ہاتھ سے پستول جھپٹتے ہوئے میں نے پیچھے دیکھا وردی والا اوندھے منہ گر چکا تھا۔ پرما پستول کو نال سے تھام کر ہکا بکا کھڑی تھی۔ دل چاہا اسے اکیس توپوں کی سلامی پیش کروں۔ اس نے میرا کام نہایت آسان کر دیا تھا۔

پستول کے دستے سے بلرام کا سر بجاتے ہوئے میں اسے اناغفیل کیا اور اس کی جیب سے اپنے ہتھیار برآمد کر کے اس کا پستول دور پھینک دیا۔ پھر بیگ کو کندھوں میں ڈال کر میں نے وردی والے کے ہاتھوں سے کلاشن کوف لے لی۔

پرما اب تک سراسیمہ سی کھڑی تھی۔ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ ''شاباش راجکماری، اب بس میں سوار ہو جاؤ۔''

بس والوں کو صورت حال کا علم نہیں تھا۔ ایک منٹ کے اندر یہ ساری کارروائی مکمل ہوئی تھی۔

پرما لرزتی ہوئی بس میں گھسی۔ میں نے دروازے پر کھڑے ہو کر ڈرائیور کو دھمکایا۔ ''استاد، جان پیاری ہے تو بس چلاؤ، اڑی کرنے کی کوشش تمھیں ہلاک کر دے گی۔'' کلاشن کی نال کو اپنی جانب اٹھا دیکھ کر ڈرائیور نے فوراً بس چلا دی تھی۔ بھنبھناہٹ بلند ہوئی، لوگ صورت حال جاننے کو بے چین ہوئے۔ اکا دکا عورتوں نے رونا شروع کر دیا تھا۔

میں نے احتیاطاً کلاشن کوف کاک کی۔ تربیت یہی بتاتی ہے کہ سب سے پہلے ہتھیار کا لوڈ ان لوڈ ہونا جانچا جائے۔ چونکہ کلاشن کوف پہلے سے کاک تھی اس لیے چیمبر میں موجود گولی ایجکشن سلاٹ کے راستے نکل کر باہر جا گری تھی۔ سیفٹی کیچ سنگل فائر پر سیٹ تھا۔ بس کے رفتار پکڑنے سے پہلے میں نے وہاں موجود دو جیپوں کے ٹائروں کو باری باری نشانہ بنا دیا۔ فائر کی آواز اور پھر ٹائر کے دھماکوں نے چیک پوسٹ میں موجود آدمیوں کو سراسیمہ کرنے کے ساتھ بس کی سواریوں کو بھی دہلا دیا تھا۔

عورتوں با آواز بلند چیخنے لگیں، بچوں نے رونا شروع کر دیا تھا۔

''خاموش ..... چپ ہو جائیں سب لوگ۔'' میں زور سے دھاڑا۔ بچوں کا رونا جاری رہا، مگر عورتوں نے لبوں پر ہاتھ رکھ کر چپ سادھ لی تھی۔

میں نے فوراً اعلان کیا۔ ''کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ ہم نے چند کلومیٹر سے زیادہ بس میں سفر نہیں کرنا۔ تمام لوگ بے فکر ہو کر اور آرام سے بیٹھیں۔ آپ یرغمالی ہیں اور نہ ہم دہشت گرد۔''

لوگ بے یقینی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ پرما پستول پکڑے حیران کھڑی تھی۔ اس نے دشمن پر تو وار کر کے اسے وقتی طور پر ناکارہ کر دیا تھا، مگر اب صورت حال اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ یہ بھی اس کا حوصلہ و ہمت تھی کہ اس نے بروقت فیصلہ کرتے ہوئے عمل بھی کر دیا تھا۔

پولیس کی وہ چیک پوسٹ آبادی کے خاتمے پر بنی تھی۔ میں نیچے اترنے کو کوئی مناسب مقام تاڑنے لگا۔ کیونکہ ہم مسلسل بس میں سفر نہیں کر سکتے تھے۔ دشمن کسی اور چیک پوسٹ پر ہمارے منتظر بھی ہو سکتے تھے اور تعاقب کر کے بھی ہمارے پاس پہنچ سکتے تھے۔ فلم کی طرح میں لوگوں کو یرغمال بنانے کی ترکیب بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ میڈیا وغیرہ کی آمد سے پہلے وگنیش شکلا کے کارندوں نے پوری بس ہی کو تباہ کر دینا تھا۔ جو درندہ اپنی سگی بھانجی کو بے عصمت و قتل کرانے کے درپے تھا اس کے لیے عوام کی کیا اہمیت ہوتی۔

ونڈ سکرین سے سامنے کا علاقہ نظر آ رہا تھا۔ بس کی تیز روشنیاں کافی دور تک دکھاؤ کی سہولت دے رہی تھیں۔ ونڈ سکرین پر پڑنے والی باریک بوندیں میرے اندیشوں میں اضافہ کر رہی تھیں۔ خراب موسم میری مشکلات میں اضافہ کرنے والا تھا۔

میں نے ڈرائیور کو لالچ دی۔ ''جتنی جلدی یہاں سے دور جاؤ گے اتنا جلد ہم سے پیچھا چھوٹے گا۔''

ہونٹ بھینچتے ہوئے اس نے بس کی رفتار میں ممکن حد تک اضافہ کر دیا تھا۔ ایک چھوٹی سی آبادی گزری، اس سے دو تین کلومیٹر دور آتے ہی جیسے ایک اور آبادی کے آثار نظر آنے لگے، میں نے بس رکوا کر ڈرائیور کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔

اس نے سرعت سے دروازہ کھولنے کا بٹن دبا دیا۔ ہلکی سی آواز سے خودکار دروازہ کھلا اور ہم باہر نکل آئے۔ ڈرائیور نے فوراً ہی بس آگے بڑھا دی تھی۔ یقیناً اتنی جلدی جان چھوٹنے پر وہ معبود کا شکر کر رہے ہوں گے۔

سردی سے کپکپاتے ہوئے پرما مستفسر ہوئی۔ ''یہاں کیوں اترے۔''

میں نے سڑک سے نیچے اترتے ہوئے پوچھا۔ ''تو کیا کرتا۔''

اس نے تجویز اُگلی۔ ''کسی اور سواری کا انتظام کیے بغیر بس سے اترنا مناسب نہیں تھا۔''

''کیا خیال ہے اگلی چوکیوں کو خبردار نہیں کیا جا چکا ہوگا۔''

''یہ سردی ہماری جان لے لے گی۔'' نزاکت سے کہتے ہوئے اس نے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ گھسیڑ لیے۔

میں نے تسلی دی۔ ''تھوڑا سا پیدل چلتے ہی گرم ہو جائیں گے۔''

وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔ ''ہماری ٹانگیں بلکہ پورا جسم درد کر رہا ہے۔''

میں ہنسا۔ ''جب گرم ہوں گے تو جسم کا درد بھی ختم ہو جائے گا۔''

وہ روہانسا ہوئی۔ ''یہ اچھی رہی، ہماری ہر مشکل کا حل پیدل چلنا ہو گیا۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''بھاگنا بھی پڑ سکتا ہے۔''

اس نے کوفت بھرے لہجے میں کہا۔ ''بھاگتی ہے ہماری جوتی۔''

میں طنزیہ انداز میں بولا۔ ''جب دوستوں کی جھلک دکھائی دے گی اور وہ عقب سے گولیاں چلائیں گے تب بے شک آپ آرام آرام بلکہ نزاکت سے چلتے ہوئے آگے بڑھنا۔''

وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ ''ہم آپ کے کندھوں پر سوار ہو جائیں گے۔''

''گویا اپنے ساتھ مجھے بھی مروانے کا ارادہ ہے۔''

وہ گنگنائی۔ ''اب ہم سفر بنے ہیں تو ہمت سے کام لو۔''

''یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ ہم مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ جتنا جلدی ہو سکے یہاں سے نکلنا ہوگا۔ سڑک ہمارے لیے بالکل محفوظ نہیں۔ کسی کے گھر بھی پناہ نہیں لے سکتے، کیوں کہ تین چار گھنٹوں کے اندر یہ علاقہ دشمنوں کے گھیرے میں آجائے گا۔''

وہ بے پروائی سے بولی۔ ''کیسے نکلیں گے، کہاں جائیں گے، کیا کرنا ہے، کب کرنا ہے، کیوں کرنا ہے یہ اور اس جیسے بیسیوں سوالوں کی ذمہ داری ہمارے پاپا نے آپ کو سونپی ہوئی ہے۔ اس لیے ہمیں پریشان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم بس اتنا جانتے ہیں کہ راجا ذیشان حیدر ہمارا محافظ ہے۔''

میں نے مطعون کیا۔ ''اگر ایسا ہی سمجھتی تو بحث و تکرار کیوں کرتی ہو، چپ چاپ میری بات مان جایا کرو۔''

وہ سرعت سے بولی۔ ''کب ٹالی ہے۔''

میں ترکی بہ ترکی بولا۔ ''مانی کب ہے۔''

وہ ہنسی۔ ''خیر منوا تو آپ لیتے ہیں۔''

میں نے چپ سادھ لی۔ بوئی سر ہوٹل کے ہنگامے کے بعد سے وہ مجھے بدلی بدلی نظر آرہی تھی۔ لیکن اس بدلاؤ کی توجیہہ سے میں قاصر تھا۔

سڑک سے تھوڑا فاصلہ پیدا کر کے ہم روشنیوں کی طرف چل پڑے تھے۔ ہوا بدستور چل رہی تھی، جس میں نمی کی مقدار کافی زیادہ تھی۔ میں نے گرم جرسی کے ساتھ کالے رنگ کا پیراشوٹ کے کپڑے والا کوٹ پہنا ہوا تھا جو بارش اور ہوا کے خلاف اچھی خاصی حفاظت مہیا کر رہا تھا۔ جبکہ پرمانے بھی جرسی اور اس کے اوپر ایک گرم کوٹ پہنا ہوا تھا۔ مگر اس کے کوٹ نے جلد ہی گیلا ہو کر ناکارہ ہو جانا تھا۔ خریداری کے وقت میں بادلوں پر دھیان دے سکا ہوتا تو لازماً برساتیاں (رین کوٹ) بھی ضرور خریدتا۔

پیدل چلنے کی وجہ سے سردی کی شدت میں کمی تو محسوس ہوئی، مگر ہوا اور بوندیں ہمیں تنگ کرنے پر مائل رہیں۔ دو اڑھائی فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے جب روشنیوں کے قریب پہنچے تو صرف دو عمارتیں نظر آئیں۔ سڑک کے کنارے پٹرول پمپ بنا تھا۔ جبکہ اس کے عقب میں تین چار سو میٹر دور ایک زرعی فارم بنا تھا۔ ان روشنیوں پر سرسری نظر ڈال کر میں کوئی بڑی آبادی سمجھا تھا۔ تبھی بس سے اترنے میں جلد بازی کی تھی کہ بڑی آبادی میں پولیس چوکی کا ہونا نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور ایسی صورت میں لازماً وہ تیار بیٹھے ہوتے۔ مگر یہاں تو پہاڑ کی کھودائی میں زندہ تو کیا مرا ہوا چوہا بھی نہیں نکلا تھا۔

مجھے دروازے کو گھورتا دیکھ کر وہ مستفسر ہوئی۔ ''رک کیوں گئے؟''

''میں نے سوچا تھا گاؤں ہے۔ اور یہاں سے کوئی سواری وغیرہ مل جائے گی۔''

اس نے امید ظاہر کی۔ ''شاید فارم میں کوئی گاڑی وغیرہ کھڑی ہو؟''

''دیکھ لیتے ہیں۔'' میں دیوار کے قریب ہوا جس کی اونچائی آٹھ ساڑھے فٹ کے بہ قدر ہوگی۔ بیگ اتار کر میں نے نیچے رکھا اور اچھل کر دیوار کی کگر پکڑ لی۔ ہاتھوں کے بل پر میں آہستہ سے بلند ہوا۔ سامنے کی دونوں دیواروں پر دو بڑے بڑے بلب لگے تھے جن کی روشنی سے مکمل صحن نظر آرہا تھا۔ مگر صحن میں موٹر سائیکل، کار یا جیپ وغیرہ نظر نہ آئی۔ دو تین لمحے جائزہ لے کر میں نیچے کود گیا۔

پرما بے صبری و اشتیاق سے مستفسر ہوئی۔ ''کیا رہا؟''

''چلو۔'' بیگ اٹھا کر میں چل پڑا۔ میرا جواب سے پہلو تہی کرنا اسے اچھی طرح باور کرا گیا تھا۔

وہ خاموشی سے میرے پہلو میں چلنے لگی۔ میں نے قدم لمبا ہی رکھا تھا کہ جلد از جلد وہاں سے دور نکلنا چاہتا تھا۔ پٹرول پمپ کا رخ کرنے کی ہمت مجھے نہیں ہوئی تھی۔

کلومیٹر ادھ چلتے ہی وہ منمنائی۔ ''ہم تھک گئے ہیں۔''

میں رکھائی سے بولا۔ ''اس مسئلے کا حل کم از کم میرے پاس نہیں ہے۔''

وہ تلخ ہوئی۔ ''آخر کب تک چلنا پڑے گا۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''جب تک پاکستان نہیں پہنچ جاتے۔''

وہ چیخی۔ ''تو کیا پاکستان تک پیدل چلیں گے۔''

''کوئی سواری نہ ملی تو چلنا ہی پڑے گا۔'' میرے اطمینان میں فرق نہیں آیا تھا۔

وہ برہمی سے بولی۔ ''ٹھیک ہے، پھر ہمیں اٹھا کر چلو۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''بھینس کی طرح موٹی تازی لڑکی کو اٹھانے کی ہمت کوئی پہلوان ہی کر سکتا ہے۔''

''کیا.....کیا.....کیا۔'' وہ بپھرتے ہوئے بولی۔ ''دماغ جگہ پر ہے، ہم وہی ہیں جسے کل کندھے پر اٹھا کر پہاڑ پر چڑھے تھے۔''

میں نے موشگافی کی۔ ''اور ابھی تک کندھے درد کر رہے ہیں۔''

وہ غصے سے بولی۔ ''آپ سے بات کرنا ہی پاپ ہے۔''

''پاپ و پن (گناہ و ثواب) تو دھرم کو ماننے والوں کے نزدیک اہمیت رکھتے ہیں کسی اَدھرمی (بے دین) کا اس سے کیا واسطہ۔''

اس نے وضاحت کی۔ ''ہمارا مطلب تھا بات کرنا فضول ہے۔''

''منت کس نے کی ہے۔'' میں نے اسے چھیڑنا جاری رکھا کہ یونہی اس کے دماغ سے پیدل چلنے کی مشقت کا احساس کم کیا جا سکتا تھا۔

''ہم نے سنا تھا پاکستانی فوجی بڑے منضبط اور تابع فرمان ہوتے ہیں۔''

میں ہنسا۔ ''سنا تو ٹھیک ہے۔''

''تو کیا پاپا نے یہی احکام دیے تھے کہ ہماری خوب بے عزت کرنا، توہین کرنا، طنز و طعنوں کے تیر چلانا، پیدل چلانا، بلکہ گھسیٹنا۔ بھوکا پیاسا رکھنا، ہر وقت ڈانٹنا، جھڑکنا، کوسنا، دھتکارنا اور سردی و بارش میں ہمارا کباڑا کرنا۔ اگر ایسا ہی ہے پھر تو ہمارا ماموں کے ہاتھوں مرنا بہتر رہے گا۔ اور ایسا نہیں ہے تو خاطر جمع رکھو، ایک ایک بات ہمارے دل پر نقش ہے۔ پاپا کو پوری تفصیل سے آپ کی زیادتیاں گنوائیں گے۔ تب انعام کے بجائے آپ کا کورٹ مارشل نہ ہوا تو پھر کہنا۔''

میں مزاحیہ انداز میں بولا۔ ''آپ پر جتنا خرچ کر چکا ہوں اگر بریگیڈئر صاحب نے وہ تمام رقم لوٹا دی تو مجھے مزید نوکری کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ آرام سے دکان کھول کر زندگی گزاروں گا۔''

''جیسے ہم جانتے ہی نہیں کہ سارے چوری، ڈکیتی کے پیسے ہیں۔'' وہ جھگڑنے کو تیار تھی۔

میں طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تو کیا چور ڈکیت، پیسے لوٹ کر آپ جیسی لڑکی پر خرچ کرنے کے مکلف ہوتے ہیں۔''

وہ شوخی سے بولی۔ ''شبہ ہی کیا ہے۔ اور ہمیں دھنے واد بولو کہ آپ کی بھینٹ سویکار کر لیتے ہیں۔''

میں نے قہقہہ لگایا۔ ''اگر بریگیڈئر صاحب کا خیال نہ ہوتا تو کب کا راجکماری صاحب کا سودا کر کے مال و دولت سے لدا پاکستان پہنچ چکا ہوتا۔''

وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''جھوٹ بولنا بھی فن ہے جو ہر کسی کو نہیں آتا۔''

''جھوٹ بولنا تو خیر موجب لعنت ہے۔ البتہ میرے دعوے کو جھوٹا سمجھنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔''

وہ وثوق سے بولی۔ ''ہم جیسے جانتے ہی نہیں کہ آپ کے لیے کتنے اہم ہیں۔''

میں شدومد سے بولا۔ ''انکار کب کیا ہے، میں نے تو بس آپ کو اہمیت دینے کی وجہ سے پردہ اٹھایا ہے۔ اور یقیناً پہلے بھی کئی مرتبہ یہ بتا چکا ہوں۔''

وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔ ''وضاحتوں کی زحمت رہنے دیں۔''

میں موضوع تبدیل کرتے ہوئے بولا۔ ''ویسے آج آپ کی بدولت جان بچی ہے۔ اگر آپ نے ہمت نہ کی ہوتی تو برے پھنس گئے تھے۔''

اس نے منہ بسورا۔ ''دشمنوں سے زیادہ آپ کے ڈانٹنے کے خوف نے ہمت دی تھی۔''

میں شاکی ہوا۔ ''لیں جی ایک اور الزام۔''

وہ کھل کھلا کر ہنس دی تھی۔ یونہی گپ شپ کرتے ہم نے تین چار کلومیٹر فاصلہ طے کر لیا تھا۔ مگر اب اس کی ہمت بالکل جواب دینے لگی تھی۔ قدم گھسیٹتے ہوئے رفتار مسلسل کم ہو رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر پھر روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔

پرما حسرت سے بولی۔ ''کاش، آپ کہیں بقیہ رات اس آبادی میں گزاریں گے۔''

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ''بے وقوف یہ علاقہ بے حد خطرناک ہے۔ یہاں رکنا ساری محنت پر پانی پھیر دے گا۔''

وہ رنجیدہ ہوئی۔ ''آخر وہ کون سی جگہ ہوگی جسے آپ محفوظ کہیں گے اور ہم چند گھڑیاں آرام کر سکیں گے۔''

میں ہنسا۔ ''انڈیا میں ایسی جگہ کا وجود ناپید ہے۔''

''ہم سے اور نہیں چلا جاتا۔'' پاؤں پٹختے ہوئے اس نے قدم روک لیے۔

میں اسے تسلی دینے لگا۔ ''مذاق کر رہا تھا۔ آبادی میں پہنچ کر کوشش کرتا ہوں کہ کوئی سواری مل جائے، تاکہ ایک مشقت سے تو جان چھوٹے۔''

دوبارہ قدم گھسیٹتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ''آپ تھکتے نہیں ہیں۔''

میں نے فلسفہ بگھارا۔ ''تھکن تب ہوتی ہے جب آسائش و آرام کو سوچا جائے۔ اگر حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے دشمنوں کے ہتھے چڑھنے کی بابت سوچا جائے تو حفاظت کی فکر تھکن کے احساس کو زائل کر دیتی ہے۔''

وہ تیقن سے بولی۔ ''نجانے کیوں لگتا ہے کہ آپ کے ہوتے ہوئے ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

''یہ تو نہیں کہتا کہ ایسا نہ سوچو، البتہ موت کا کوئی بھروسا نہیں کہ کب گلے سے آن پکڑے۔ اس لیے [illegible] کرنے کے بجائے حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت اپنے اندر پیدا کرو۔''

وہ استہزائی انداز میں بولی۔ ''شاید مذاق کر رہے ہو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ حقیقت ہے۔''

اسی دم عقبی و دائیں جانب تیز روشنیاں نمودار ہوئیں۔ آگے پیچھے دو گاڑیاں تیز رفتاری سے نزدیکی آبادی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ میں نے فوراً پرما کا ہاتھ پکڑا اور مڑ کر بھاگا۔ پچاس ساٹھ قدم پیچھے چند جھاڑیاں نظر آئی تھیں۔ روشنیوں کو دیکھتے ہوئے پرما کو بھی خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ جھاڑیوں کی آڑ لے کر میں رک گیا۔ پرما کا سانس پھول گیا تھا۔ پہلے

ہی نڈھال تھی، چند قدم بھاگنے پر بے حال ہوگئی تھی۔

گاڑیوں کی رفتار اور ہموار حرکت سے مجھے اندازہ لگانے میں دقت نہ ہوئی کہ بڑی سڑک اور اس آبادی کو ملانے والا لنک روڈ موجود تھا۔

پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ اس نے تصدیق چاہی۔ ''یہ وہی ہیں۔''

میں پھیکے انداز میں بولا۔ ''اس کی طرح کی نجانے کتنی ٹولیاں پورے علاقے میں پھیل گئی ہوں گی۔ اب سمجھ میں آیا میں کیوں کہہ رہا تھا کہ یہاں آرام نہیں کر سکتے۔''

اس نے تشویش ظاہر کی۔ ''اب کیا کریں گے؟''

میں اطمینان سے بولا۔ ''فی الحال تو یہاں بیٹھ کر آرام کرتے ہیں۔''

''سچ میں۔'' وہ خوشی سے کھل اٹھی تھی۔

''لمحاتی خوشی ہے۔'' میں ہولے سے بڑبڑایا کیوں جانتا تھا کہ چند لمحوں بعد اس نے ٹھنڈ کی دہائی دینے لگ جانا تھا۔ چلنے کی وجہ سے ہمارا جسم گرم تھا اس لیے ہوا اور ہلکی پھوار بے اثر لگ رہی تھی۔ لیکن رکنے پر سردی نے پوری شدت سے حملہ آور ہونا تھا۔

میرے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے لجاجت سے پوچھا۔ ''ہم بیٹھ جائیں۔'' بارش اتنی زیادہ بھی نہیں تھی کہ زمین کیچڑ ہو جاتی، البتہ ہلکی ہلکی گیلی ضرور تھی۔ میں نے گاڑیوں کی طرف دیکھا جو آبادی تک پہنچ گئی تھیں۔ موبائل فون نکال کر میں نے سکرین کی ہلکی روشنی میں جھاڑیوں کے نیچے تھوڑی سی خشک جگہ تلاش کی۔ پاؤں سے کانٹوں اور تنکوں وغیرہ کو صاف کیا اور پھر اپنا مفلر بچھا کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''شکریہ۔'' ممنونیت سے کہتے ہوئے وہ ڈھے جانے کے انداز میں مفلر پر بیٹھ گئی۔ میں نے کندھوں سے بیگ اتار کر جھاڑی کے نیچے رکھا اور اس کے ساتھ کلاشن کوف کھڑی کر کے آبادی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

پانچ چھے منٹ بعد ہی میرا خدشہ حقیقت کے روپ میں اجاگر ہوا۔ اس نے کانپتی آواز میں اعلان کیا۔ ''ہمیں سردی لگ رہی ہے۔''

گہرا سانس لیتے ہوئے میں نے اپنا کوٹ اتار کر اس کی جانب بڑھایا۔ ''یہ پہن لو۔''

اس نے رسمی انکار کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ میں نے کوٹ کے نیچے جرسی پہنی ہوئی تھی۔ لیکن کوٹ اتارتے ہی ایک بار تو کپکپا گیا تھا۔ سردی گرمی کو برداشت کر سکنے کا مطلب یہ بھی نہیں ہوتا کہ انسان کو موسم کے اثرات محسوس نہیں ہوتے۔

وہ کوٹ پہن کر جیبوں میں ہاتھ گھسیڑے بیٹھ گئی۔ میں آبادی کی طرف متوجہ ہوا مگر کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ اسی دوران بڑی سڑک کی طرف سے تین چار فائروں کی آواز اٹھی۔ میری سماعتوں نے کلاشن کوف کی تڑتڑاہٹ پہچان لی تھی۔ اگلے پانچ چھے منٹوں میں روشنیاں اس طرف بڑھتی نظر آئیں۔ میں نے فوراً کلاشن کوف اٹھائی اور جھاڑیوں میں دبک گیا۔ یہ دوسری ٹولی کے افراد تھے۔ ہم اسی علاقے میں اترے تھے اور اب یہ علاقہ شکار گاہ کا روپ دھار گیا تھا۔ شکاری ٹولیاں قسمت آزمانے کو جوق در جوق اکٹھا ہو رہی تھیں۔ پرما کی حیثیت سونے کی چڑیا کی سی تھی۔ دولت کے ساتھ ایک راجکماری کے شباب کی لالچ کئیوں کو طلب گار بنا گئی تھی۔

نیک بخت میرے پاؤں کی بھی بیڑی بن گئی تھی۔ ورنہ میں کب کا ان کے گھیرے سے نکل چکا ہوتا۔

دو جیپیں پچاس ساٹھ قدم کی دوری پر ہمارے بائیں جانب سے گزر گئی تھیں۔ ہوا کی رفتار میں ذرا سی کمی آئی لیکن

بارش تیز ہوگئی تھی۔ ہلکی پھوار نے بوندوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

پرماذرا سا کھسک کر قریب ہوئی اور مجھ سے جڑ کر بیٹھ گئی۔ میں نے بھی دور ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ حالات ایسے تھے ہماری قربت ناگزیر ہوتی جارہی تھی۔

''ہمیں ڈر لگ رہا ہے۔'' میرے کندھے پر سر ٹیکتے ہوئے وہ منمنائی۔

اس کا ملائم ہاتھ گرفت میں لے کر میں نے ہولے سے تھپتھپایا۔ ''سردی تو نہیں لگ رہی۔''

وہ دھیرے سے بولی۔ ''اب کچھ بہتر ہے۔''

میں نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا تھوڑی دیر آرام کرلو، لگتا ہے کچھ دیر یہیں گزارنا پڑے گی۔''

اس نے تشویش ظاہر کی۔ ''ہمارا کوٹ تو واٹر پروف ہے، آپ بھیگ جائیں گے۔''

میں ہنسا۔ ''بہت ڈھیٹ ہوں۔ میری فکر چھوڑو۔''

اس نے اعلان کیا۔ ''پاکستان پہنچتے ہی ہم آپ کو منہ مانگا انعام دیں گے۔''

میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ''پاکستان پہنچنا ہی میرے لیے انعام ہے راجکماری۔ باقی آپ کو انعام کی خاطر نہیں بچا رہا۔''

وہ ذومعنی لہجے میں بولی۔ ''ہم جانتے ہیں آپ پیسے کے لالچی نہیں ہیں۔ لیکن انعام ہمیشہ رقم کی صورت تو نہیں ملا کرتا۔ کبھی کبھار انسان کی ایسی خواہش بھی پوری کر دی جاتی ہے جس کے وہ صرف خواب دیکھ سکتا ہے، تعبیر پانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔''

میں دھیرے سے ہنسا۔ ''اور آپ کے خیال میں میری ایسی کون سی خواہش ہے جس کے صرف خواب دیکھ سکتا ہوں، تعبیر پانے کی امید نہیں رکھتا۔''

وہ اطمینان سے بولی۔ ''کیا خیال ہے ہم کچھ نہیں جانتے۔''

میں نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا، اس لیے عرض کی ہے کہ میری معلومات میں اضافہ فرما دیں۔''

وہ شوخی سے بولی۔ ''ہم وقت آنے پر بتا دیں گے۔''

تین اور گاڑیاں بڑی سڑک کی طرف نمودار ہوں۔ تینوں پھیل کر آگے بڑھ رہی تھیں۔ راستے میں دو تین جگہوں پر چند جھاڑیاں نظر آئی تھیں، جو اتنی گھنی بھی نہیں تھیں کہ ان کی تلاش لینے کی ضرورت پڑ سکتی۔ ساروں کا دھیان آبادی کی جانب ہو رہا تھا۔ اور ہماری خوش قسمتی تھی کہ آبادی میں داخلے سے پہلے ہی دشمنوں کی گاڑیاں نظر آ گئی تھیں۔ اگر گاؤں میں داخل ہو گئے ہوتے تو زیادہ مشکل میں پھنس سکتے تھے۔ گو خطرہ اب بھی کم درجے کا نہیں تھا۔ وہاں سے مسلسل گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ کوئی بھی اتنے قریب سے گزر سکتا تھا کہ ہماری جھلک اسے دکھ جاتی۔

پرما نے جیبوں میں ہاتھ ڈال کر میرے کندھے پر سر ٹیکا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بالکل جڑ کر بیٹھی تھی۔ میری زندگی میں ایسے لمحات پہلے بھی کئی بار آ چکے تھے کہ نامحرم لڑکی سے اس قدر قرب کی نوبت آجاتی کہ بہکنے کے بے انتہا مواقع میسر ہوتے۔ مگر اللہ پاک کا خصوصی کرم تھا کہ اس غفور الرحیم ذات نے اس گناہ گار و خطا کار کو ہمیشہ ان لمحات کی شر انگیزی سے محفوظ رکھا۔ بلاشبہ انسان محبت کسی ایک ہی سے کرتا ہے لیکن نفسانی خواہشات کی تکمیل کو تعداد کی حد متعین نہیں ہوتی۔ اور اس معاملے میں مرد کی فطرت کچھ زیادہ ہی حریص واقع ہوئی ہے۔ عورت کو انگارے سے تشبیہ دی جائے تو مرد کو ماچس کی تیلی کہا جائے گا۔ جو انگارے سے ٹکراتے ہی بھڑک اٹھتی ہے۔

راجکماری پرما بھی لاکھوں میں ایک تھی۔ شکل و صورت میں بھی بے مثال اور جسمانی کشش میں بھی لاجواب۔ اور

گزشتہ چند دنوں سے تو مکمل طور پر میرے رحم و کرم پر تھی۔ مگر الحمدللہ اس کی قربت میری خواہشات کو بے لگام نہیں کر سکتی تھی۔

بارش کی ٹپ ٹپ میں ہلکا سا اضافہ ہوا۔ بارش رکنے والی نہیں لگ رہی تھی۔ دو گاڑیاں آبادی سے باہر نکل کر جنوب کی طرف گامزن نظر آئیں۔ گاڑیوں کی چہل پہل سے یوں لگ رہا تھا گویا انھیں وہاں ہماری موجودی کا یقین ہو۔

اگر میں خود کو دشمنوں کی جگہ پر رکھ کر سوچتا تو ان کی کوششیں جائز لگ رہی تھیں۔ یہ تو طے تھا کہ ہم بس میں بیٹھ کر چوکی سے آگے نکلے تھے۔ پھر دوسری چوکی آنے سے پہلے بس سے اتر بھی گئے تھے۔ گویا دو چوکیوں کا درمیانی علاقہ ہماری پناہ گاہ تھا۔ اور اب تمام اسی علاقے کو کھنگالنے میں مصروف تھے۔ وہاں قریب قریب جتنی بھی آبادیاں تھیں تمام میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ جبکہ ہم بالکل عام سی جگہ پر چھپے تھے۔ نہ وہ جگہ چھپنے کو مناسب تھی اور نہ سردی یا بارش وغیرہ سے کوئی آڑ مہیا کر رہی تھی۔ اصولاً ہمیں فی الفور وہ علاقہ چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ یا کسی عمارت وغیرہ میں پناہ لینا چاہیے تھی۔ اور یہی سوچ انھیں آبادی کھنگالنے میں مصروف کیے ہوئے تھی۔

''ہمیں سردی لگ رہی ہے۔'' وہ زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکی تھی۔

''میرے پاس کچھ ایسا نظر آ رہا ہے جو آپ کو اوڑھنے کو دے سکوں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میں تلخ ہو گیا تھا۔

وہ رنکھی ہوئی۔ ''ہمیں سردی لگ رہی ہے نا، ہم کیا کریں۔''

میں بھناتے ہوئے بولا۔ ''صبر..... برداشت..... حوصلہ اور ہمت کے علاوہ کیا کرنے کا مشورہ دے سکتا ہوں۔''

وہ گلوگیر ہوئی۔ ''طنز نہ کریں، اپنی تکلیف آپ کو نہیں تو کس کو بتائیں گے۔''

میں نے لہجہ نرم کرنے کی کوشش کی۔ ''راجکماری صاحب، سوال وہ کرو جو مسئول کے دائرہ اختیار میں آتا ہو۔''

وہ برہم ہوئی۔ ''آپ کے دائرہ اختیار میں بس ہمیں ذلیل و خوار کرنا ہی آتا ہے۔'' تھوڑی دیر پہلے ہمارے گن گا رہی تھی، اب سردی محسوس ہوئی تو نیک بخت پھر میرے سر ہو گئی۔ میں چپ ہو گیا کہ فضول بحث کی ہمت باقی نہیں رہی تھی۔ کم عمر بچی کی سی سوچ رکھنے والی کو کیا سمجھاتا۔ عیش و آرام اور آسائشوں کی عادی نوابزادی میرے لیے نرا دردِ سر ہی بن گئی تھی۔ اس کا سر کندھے سے ہٹا کر میں نے جگہ چھوڑی اور اسے سر ٹیکنے کو بیگ دے کر جھاڑی سے باہر نکل آیا۔ سردی دم بہ دم بڑھتی جا رہی تھی۔ بارش کی بوندیں بھی زور پکڑنے لگی تھیں۔ اور بدن میں سوئیاں چبھوتی ہوا ان کے ہم رکاب تھی۔

سڑک کی جانب سے نئی گاڑیوں کی روشنی مجھے پھر جھاڑی کے سائبان میں لے آئی تھی۔ وہاں کم از کم بارش کی بوندوں سے واجبی سی بچت ہو رہی تھی۔ میری سمجھ میں وہاں سے بھاگنے کا کوئی منصوبہ نہیں آ رہا تھا۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ میں پرما کو وہیں چھوڑ کر کمین گاہ سے نکلتا اور سواری وغیرہ کا بندوبست کر کے لوٹتا۔ قباحت یہ تھی کہ پرما اکیلی رہنے پر کبھی آمادہ نہ ہوتی۔ گو اس کی بے خبری میں بھی جا سکتا تھا مگر جیسے ہی اسے میرے غائب ہونے کا پتا چلتا وہ ڈر کے مارے کوئی حماقت بھی کر سکتی تھی۔ اور پھر یقینی نہیں تھا کہ میں رازداری برتتے ہوئے گاڑی کے حصول میں کامیاب رہتا۔ فائرنگ ہوتے ہی میرا بھانڈا پھوٹ جاتا اور دشمن جنگلی کتوں کی طرح مجھے گھیر لیتے۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ میں پرما کے ہمراہ اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس علاقے سے نکلنے کی کوشش کرتا۔ لیکن پرما کی جسمانی حالت سے بعید تھا کہ وہ میرا ساتھ دے پاتی، کیوں کہ چند کلومیٹر کے علاقے میں دشمن کی سرگرمیاں زور و شور سے جاری تھیں۔ اس طریقے میں بھی ظاہر ہونے کا خطرہ کافی زیادہ تھا۔ تیسری تجویز یہی تھی کہ میں وہیں بیٹھ کر دشمنوں کی حرکت میں کمی کا انتظار کرتا۔ یوں ایک تو پرما تھوڑا آرام کر لیتی۔ دوسرا دشمن بھی مایوس ہو کر کسی اور جانب کا رخ کر لیتا۔ البتہ سردی کی اذیت ضرور بھگتنا پڑتی۔ گویا مکمل خلاصی کی کوئی صورت نہیں تھی۔

پرما بیگ پر سر ٹیکے سکڑی سمٹی لیٹی تھی۔ میں بیگ کے دوسری جانب بیٹھ گیا۔ وہ کم از کم اس لحاظ سے تو اچھی تھی کہ دو گرم کوٹ اور ایک جرسی پہنے ہوئے تھی۔ اس وقت وہ جھاڑی بھی ایک نعمت کا درجہ اختیار کر گئی تھی۔ بارش کی زیادہ تر بوندوں کو گھنے پتوں کی وجہ سے ہمیں ڈھونڈنے میں ناکامی ہو رہی تھی۔ ہوا کے خلاف بھی جھاڑی اچھی خاصی آڑ مہیا کی ہوئی تھی۔

وقت اچھا ہو یا برا گزر جاتا ہے۔ لمحے سہانے ہوں یا اذیت ناک بیت جاتے ہیں۔ فاصلہ مختصر ہو یا طویل طے ہو جاتا ہے۔ البتہ مشکل اوقات اور خوش کن گھڑیوں کے کٹنے کے احساسات جدا و مختلف ہوتے ہیں۔ صعوبت وصل کی شوقین ہوتی ہے اور ہمیشہ وفاداری پر مائل رہتی ہے۔ جبکہ سکھ، چین، آرام و آسائش فطرتی طور پر دغابازی و بے وفائی کے عادی ہوتے ہیں۔ اور وہ رات صحیح معنوں میں آزمائش کی رات تھی۔ کیوں کہ گھنٹے ادھ بعد ہی میری سماعتوں میں پرما ہونکنے کی آواز نے خطرے کی گھنٹی بجائی۔ پہلے میں سمجھا وہ نیند میں ہے لیکن ہونکنے کے ساتھ ''آہ.....اُف'' کی آواز نے مجھے ڈرایا کہ اصل معاملہ کچھ اور ہے۔

''کیا ہوا۔'' نرم لہجے میں کہتے ہوئے میرا ہاتھ اس کی گرم ٹوپی سے ٹکرا کر ماتھے پر پھسلا۔ اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کے جسم سے گویا آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔

''ہمیں سردی لگ رہی ہے۔'' اس کی منمناتی آواز نے مجھے جھنجوڑا۔

بیگ پیچھے دھکیل کر میں آگے ہوا اور اس کا بالائی جسم گود میں لے لیا۔ بغیر کوئی احتجاج کیے اس نے جسم مجھے سونپ دیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جیبوں میں ٹھونسے ہوئے تھے۔

وہ ہولے سے بڑبڑائی۔ ''ہم جانتے ہیں، ہم نہیں بچیں گے۔''

میں نے پھیکے لہجے میں تسلی دی۔ ''آپ کو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ بس تھکن اور سردی کی وجہ سے تھوڑی سی حرارت ہو گئی ہے۔ اور آپ پریشان ہو گئیں۔''

وہ گلوگیر ہوئی۔ ''ہمارا سارا جسم درد کر رہا ہے، سخت سردی لگ رہی ہے۔ سر بھی درد سے پھٹ رہا ہے۔''

دایاں بازو اس کے کندھوں کے نیچے رکھ کر میں بائیں ہاتھ سے اس کا سر دبانے لگا۔ اس کا ہونکنا جاری تھا۔ اور تب مجھے لگا میں انصاری صاحب کی لاڈلی کو بچا نہیں پاؤں گا۔ نازوں میں پلی راجکماری، عملی زندگی کی مشکلات کا تختۂ مشق بن گئی تھی۔ آسائشوں کی عادی نوابزادی کو سرد ہوا، بارش اور سردی سے ایک ساتھ مقابلہ کرنا پڑ گیا تھا۔ پھولوں کی سیج پر سونے والی کے نصیب میں سخت زمین کی آغوش در آئی تھی۔ مرسڈیز، ٹویوٹا پجارو کی مسافر پیدل بھاگتی پھر رہی تھی۔ ایسے حالات کو وہ کہاں تک سہتی، کب تک پیدل چلتی، کیسے نیند سے لڑتی، کیسے بھوک برداشت کرتی۔ اگر اس کے بجائے میرے ہمراہ کوئی عام مرد بھی ہوتا تو یقیناً ہمت ہار چکا ہوتا۔ میں تو سنائپر تھا جسے تربیت کی ابتداء کے ساتھ ان حالات سے نہ صرف آگاہ کیا گیا تھا بلکہ ایسے ہی حالات میں زندگی گزارنے کی سخت مشقیں کرائی گئی تھیں۔ اور تربیت کی بھٹی میں تپ کر میں جس حالت میں نکلا عملی زندگی کی آزمائش تربیت سے بھی دو ہاتھ آگے ثابت ہوئی۔ اور پھر عملی زندگی میں میری مشق تسلسل سے جاری رہی۔ کبھی بھوک کاٹی، کبھی سردی کے عذاب سے مقابلہ کیا، کبھی دشمنوں کے آگے پیچھے مسلسل بھاگنا پڑا، کبھی گرمی کی شدت سے نبرد آزما ہونا پڑا اور اب میرے لیے یہ روزمرہ کا کام تھا۔ کسی بھی مشن پر روانگی کے وقت میرے احساسات ایسے ہوتے جیسے عام شخص بازار میں خریداری کو جاتا ہے۔ فائرنگ کی تڑتڑاہٹ مجھے شادی بیاہ کی پھلجھڑیوں کی جیسی لگتی۔ خطروں کا سامنا کرنا ایسا لگتا جیسے ایک مسافر کو بس کے سفر میں محسوس ہوتا ہے کہ حادثہ ہونے کے خطرے کے باوجود وہ ارد گرد کے مناظر سے محظوظ بھی ہوتا ہے۔ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے دوسرے مسافر سے گپ شپ بھی کرتا ہے۔ کھاتا پیتا بھی

ہے اور نیند آنے پر سو بھی جاتا ہے۔

اس کے جسم سے جیسے آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ اسے ہوش ہی نہیں تھا کہ وہ ایک غیر مرد کی گود میں تھی۔ نہ مجھے کوئی ایسا احساس ہو رہا تھا، بلکہ پہلی بار اس سے شدید ہمدردی و اپنائیت محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت ہی قریبی عزیز تکلیف میں ہو۔ مجھے پتا نہیں چل رہا تھا کہ میں ایک دم اس کے لیے اتنا فکر مند کیوں ہو گیا تھا۔ حالاں کہ وہ میرے لیے ایک مشن ہی تو تھی۔ گو سنائپر کے ننانوے اعشاریہ ننانوے فیصد مشن کسی کی جان لینے کے ہوتے ہیں یہ پہلا مشن تھا کہ مجھے کسی کی جان بچانے کی ذمہ داری سونپ دی گئی تھی۔

وہ طویل رات میں نے ایسے ہی بتا دی۔ میں حتی الوسع اسے آرام پہنچانے کی کوشش کرتا رہا۔ جبکہ وہ بے حواس سی الٹی سیدھی ہانکتی رہی۔ اس کی بہت سی باتیں ایسی تھیں جو تہذیب و اخلاق کے لحاظ سے قابل گرفت تھیں۔ مگر وہ ہوش میں کب تھی کہ اسے مطعون کیا جاتا۔ ہوا کے دوش پر تیرتی اذان کی مقدس آواز بلند ہوئی۔ بارش رک گئی تھی، ہوا بھی مدہم ہو چکی تھی۔ البتہ آسمان پر بادل اسی طرح چھائے تھے، کیوں کہ کوشش کے باوجود میری نگاہیں کسی ستارے کی تلاش میں ناکام رہی تھیں۔

میں اسے نرمی سے بولا۔ ''اچھا آپ تھوڑی دیر بیگ سے ٹیک لگا لیں میں نماز پڑھ لوں۔''

وہ مچلتے ہوئے بولی۔ ''نہیں ہم یہیں ٹھیک ہیں۔''

میں نے اسے پچکارا۔ ''پانچ دس منٹ سے زیادہ وقت نہیں لوں گا۔''

وہ چپ رہی۔ آہستگی سے اس کے بالائی جسم کے نیچے ایس آر ون کا بیگ رکھ کر میں جھاڑی سے باہر نکل آیا۔ بیگ میں پانی کی ایک بوتل موجود تھی، مگر وضو کے لیے وہ پانی استعمال کر لیتا تو پینے کو کچھ نہ بچتا۔ اس لیے میں نے گیلی زمین پر تیمم کیا۔ اور صبح کی نماز ادا کرنے لگا۔ فرض پڑھ کر میں نے دعا کو ہاتھ اٹھائے اور بے نیاز و غنی مالک کی بارگاہ میں دامن پھیلا دیا۔ بلاشبہ میں عاجز و کمزور بندہ ان حالات سے نبٹنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ اور اللہ پاک کی مدد کے بغیر میں نہ کسی قابل تھا اور نہ کچھ کر سکتا تھا۔

دعا مانگ کر میں پھر جھاڑی کے نیچے آ گیا۔ لگا وہ میری ہی منتظر تھی۔ کیوں کہ نقاہت سے سر اٹھاتے ہوئے اس نے زور سے ناک سنکی اور بیگ کو پیچھے دھکیلنے لگی۔ بخار سے ٹوٹتا بدن یقیناً نرم بستر یا بچھونے وغیرہ کا طلب گار تھا۔ اور اس ویرانے میں یہ لوازمات کہاں میسر ہو سکتے تھے۔ البتہ میں جتنا ہو سکتا تھا اسے آرام پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے دوبارہ اسے گود میں لٹا لیا تھا۔ اس کا بدن جیسے انگارہ بنا تھا۔ بخار کم ہونے کے بجائے شاید زیادہ ہو گیا تھا۔ دوائی اور گرم بستر کی غیر دستیابی سے اس کی جان جانے کا بھی خطرہ تھا۔ ملگجا اجالا پھیلنے کے ساتھ دھند بھی اترنے لگی تھی۔ اگر موسم صاف ہو جاتا تو دھوپ سے درجہ حرارت کے ساتھ دکھاؤ کے حالات بھی بڑھ جاتے۔ جبکہ دھند سے جلدی نظروں میں نہیں آ سکتے تھے۔

نو دس بجے تک دھند چھٹنے لگی، مگر موسم صاف نہیں ہوا تھا۔ بوندیں پھر ٹپکنا شروع ہو گئیں۔ میں نے بیگ سے بسکٹ کا پیکٹ نکال کر پرما کو زبردستی کھلانے لگا۔ بہ مشکل تین چار بسکٹ کھا کر اس نے دو تین گھونٹ پانی پیا اور آنکھیں موند لیں۔ سرخ و سفید چہرے پر زردی و ویرانی نے ڈیرے ڈالے تھے۔ بالائی بدن میرے زانو پر ٹیکے وہ گٹھڑی بنی تھی۔

بقیہ پیکٹ اپنے معدے میں پہنچا کر میں اس کا سر دبانے لگا۔

وہ دلگرفتگی سے بولی۔ ''راجا! وعدہ کرو، ہماری لاش کو یونہی پھینک کر نہیں جاؤ گے۔''

میں ہنسا۔ ''تو کیا لاش کو کندھے پر اٹھائے رکھوں گا۔''

وہ میرے مذاق کا برا بھی نہیں منا سکی تھی۔ کہنے لگی۔ ''نہیں، ہمیں جلا دینا یا دفنا دینا۔''

''ہندو مردہ جلانے کو جو لکڑی استعمال کرتے ہیں وہ تو بہت قیمتی ہوتی ہے اور میرے پاس رقم کہاں کہ اتنا خرچہ برداشت کر سکوں۔ البتہ دفنا دوں گا۔ یا پھر اسی جھاڑی کی لکڑیوں میں جلنا قبول ہے تو کوشش کی جا سکتی ہے۔''

''ہم مذاق کے موڈ میں نہیں ہیں۔''

میں نے اسے چھیڑنا جاری رکھا۔ ''آپ کسی مذہب کو تو مانتی نہیں، پھر جلنے یا دفن ہونے کا مطلب؟''

وہ اداسی سے بولی۔ ''ہم نہیں چاہتے کوئی ہماری لاش سے کھلواڑ کرے۔''

''بے فکر رہو راجکماری! ان شاء اللہ آپ کو کچھ بھی نہیں ہوگا۔''

وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ ''ہم ملنے کے بھی قابل نہیں رہے۔ یہ بارش، سردی اور بخار کی دوائی کی عدم دستیابی ہمیں زندہ نہیں رہنے دے گی۔ اگر اس سے بچ بھی گئے تو دشمن نہیں چھوڑے گا۔''

میں نے شفقت بھرے لہجے میں پچکارا۔ ''آپ خاموشی سے لیٹی رہیں۔ ان شاء اللہ یہ ساری صعوبتیں اور مشکلات اللہ پاک آسانی میں ڈھال دے گا''

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ''کیا آپ کا اللہ (پاک) اس کی مدد بھی کرتا ہے جو اسے مانتا نہیں۔''

میں خلوص سے بولا۔ ''اللہ پاک تو اپنی مخلوق سے ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے۔ جب ماں اپنی اولاد کی نافرمانی پر بھی اس کے صدقے قربان جاتی ہے تو رحیم و کریم رب اپنی مخلوق کی حماقتوں کو نظر انداز کیوں نہیں کرے گا۔''

اس نے ارادہ ظاہر کیا۔ ''اگر ہم خیریت سے پاکستان پہنچ گئے تو آپ سے آپ کے اللہ (پاک) کے بارے ضرور معلومات لیں گے۔''

''اچھا اب چپ کر کے لیٹو۔ اندھیرا پھیلتے ہی یہاں سے نکلیں گے۔ امید ہے دشمن ہماری تلاش میں ناکام ہو کر آگے نکل گیا ہوگا۔''

''سچ میں۔'' اس کے بے رونق چہرے پر خوشی نمودار ہوئی اور وہ حسرت سے پوچھنے لگی۔ ''کیا ہمیں آنے والی رات کو گرم بستر نصیب ہو جائے گا۔''

میرا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ رندھیر شکلا نے اربوں کی دولت و جائیداد اس کے نام چھوڑی تھی۔ اور وہ ایک بستر کی حسرت لیے کانٹے دار جھاڑی کے نیچے لیٹی تھی۔ اللہ پاک بھی کیسے عجیب انداز میں انسان کو اس کی اوقات یاد دلاتا ہے۔ وہ اتنی دولت کی مالک تھی کہ فائیو سٹار ہوٹل کھڑے کھڑے خرید لیتی۔ اور لاچار اتنی کہ آرام کو ایک بستر بھی مہیا نہ تھا۔

میں نے اپنی فطرت کے خلاف دعویٰ کیا۔ ''ہاں میں وعدہ کرتا ہوں، ان شاء اللہ آج رات تک راجکماری کو گرم بستر مل جائے گا۔''

اس نے تشویش ظاہر کی۔ ''مگر ہم چل نہیں سکتے۔''

میں نے تسلی دی۔ ''بے فکر رہو، میں ہوں ناں، آپ کو اٹھا کر لے جاؤں گا۔''

''ہمیں آپ پر پورا بھروسا اور اعتماد ہے۔ اور یہ بھی جانتے ہیں ہم آپ کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔'' وارفتگی سے کہتے ہوئے اس نے تصدیق چاہی۔ ''ہیں ناں؟''

''ہاں۔'' اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''انصاری صاحب کی پری بلاشبہ میرے لیے بہت قیمتی ہے۔''

اس نے پرسکون انداز میں آنکھیں موند لی تھیں۔ دوپہر کو بارش کی رفتار میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس دوران میں نے

چند آدمیوں کو میں نے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گزرتے دیکھا تھا۔ آبادی کی طرف جانے والی سڑک پر تو سارا دن کافی رونق لگی رہی تھی۔ مگر ہم وہاں سے نکلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ کوئی بھی ایسا شخص، جس سے ہم مدد مانگنے کی کوشش کرتے اگر ہمارا شکاری نکلتا تو پھنس جاتے۔

میرا مکمل لباس گیلا ہو گیا تھا۔ پرما کے بالائی بدن پر تو پیراشوٹ کا کوٹ تھا جس میں پانی نہیں جاتا تھا۔ البتہ اس کا بھی زیریں لباس بھیگ گیا تھا۔ گھنی جھاڑی ایک حد تک ہی حفاظت مہیا کر سکتی تھی۔

مجھے سخت بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ بیگ میں بسکٹ کے دو تین پیکٹ موجود تھے۔ میں نے ایک پیکٹ نکال کر پرما کو کھلانے کی کوشش کی مگر اس سے آدھا بسکٹ بھی نہ کھایا گیا۔ میں البتہ پورا پیکٹ چٹ کر گیا تھا اور اشتہا ابھی باقی تھی تبھی ایک اور پیکٹ کھول کر جڑ گیا۔

سہ پہر تک بارش ہلکی ہو گئی تھی، مگر پرما کا بخار زور پکڑ گیا تھا۔ وہ پھر زور زور سے ہونکنے لگی۔ میں نے کوشش کر کے اسے مکمل گود میں سمیٹ لیا تھا۔ اور اس سے زیادہ اسے آرام نہیں پہنچا سکتا تھا۔ خود میری حالت رفتہ رفتہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ سردی اب مجھے بھی کپکپانے پر مجبور کر رہی تھی۔ اگر میں باہر نکل کر ہلکی پھلکی اٹھک بیٹھک کرتا، ڈنڈ پیلتا، اچھلتا کودتا تو بدن گرم ہو جاتا، لیکن دور سے دیکھ لیے جانے کا خطرہ موجود تھا۔ اور اس وجہ سے مجھے جھاڑی سے نکلنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

جونہی شام کا ملگجا اندھیرا پھیلا، میں نے ایس آرون کے بیگ سے شاپر میں لپٹی رقم، بسکٹ کے دو پیکٹ اور پانی بوتل وغیرہ باہر نکالی اور بیگ اٹھا کر جھاڑی سے باہر نکل آیا۔ پرما کے بے ہوش وجود کو میں نے زمین پر لٹا دیا تھا۔ جانے سے پہلے میں ایس آرون کو ٹھکانے لگانا چاہتا تھا۔ اس نے میرا بہت ساتھ دیا تھا۔ ایس آرون پچاس ساٹھ گولیوں تک درستی سے فائر کر سکتی تھی اور اس پر اب تک میں نے قریباً تیس، پینتیس گولیاں فائر کی تھیں۔ گویا بیس کے بہ قدر گولیوں کی مہلت اب تک میسر تھی، لیکن اسے مزید ساتھ پھرانا ممکن نہیں رہا تھا۔ پرما اور رائفل میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑ گیا تھا اور بلاشبہ پرما کی اہمیت زیادہ تھی۔

میں نے بیگ سے ایک مرتبہ رائفل کو نکال کر اس کے پرزوں کو مومی لفافے سمیت بو سا دیا۔ اور پھر بیگ میں ڈال کر زنجیر بند کر دی۔ پھر بیگ کو ایک گڑھے میں ڈال کر گیلی مٹی سے پاٹنے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد ایس آرون، بیگ سمیت غائب ہو چکی تھی۔ مٹی کو برابر کر کے میں نے جھاڑی سے ایک دو شاخیں کاٹیں اور ایس آرون کی قبر پر گاڑ دیں۔ یوں دیکھنے والے کو لگتا شاید وہ اُگی ہوئی جھاڑیاں ہیں۔

اس دوران اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ مومی لفافے میں لپٹی رقم میں نے قمیص کی جیب میں منتقل کی وہ میرے لیے بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ کلاشن کوف کی بیرل کو نیچے کی طرف کر کے میں نے سلنگ کی مدد سے کندھے پر لٹکائی اور پرما کو اٹھانے جھاڑی کے نیچے گھس گیا۔ وہ بے چاری بے سدھ پڑی تھی۔ شدید بخار نے اسے بے ہوش کر رکھا تھا۔ اسے احتیاط سے اٹھا کر میں جھکے جھکے باہر آیا اور پھر اسے اپنے دونوں کندھوں پر اوندھے منہ متوازی لٹا دیا۔ دوران تربیت ہم مردہ اٹھانے کی کافی مشق کر چکے تھے۔ یوں کسی بھی ساتھی کو لمبے فاصلے تک لے جایا جا سکتا ہے۔ پرما تو ہلکی پھلکی لڑکی تھی۔ زمین چونکہ ہموار تھی اس لیے مجھے حرکت میں دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ اگر ڈھلان پر چڑھنا ہوتا تو یقیناً زیادہ دشواری کا سامنا کرنا پڑ جاتا۔

پرما کچھ اول فول بڑبڑانے لگی۔ بارش زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ اب میرا لباس پانی سے شرابور ہو گیا تھا۔ لیکن وزن اٹھا کر چلنے کی وجہ سے جسم میں حرارت پیدا ہونے لگی تھی۔ آبادی کلومیٹر ڈیڑھ کلومیٹر دور تھی۔ میں سڑک والی جانب سے احتراز

برستے ہوئے اپنا رخ آبادی کے بائیں جانب رکھا۔ بارش اور سردی نے آوارہ کتوں کو بھی کونوں کھدروں میں گھسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کلومیٹر بھر کا فاصلہ طے کرنے میں ہمیں بیس منٹ لگے تھے۔ اگلا مرحلہ کسی پناہ گاہ کی تلاش تھا۔ نجانے ہماری تلاش میں سرگرداں ٹولیوں نے لوگوں کو دھمکایا تھا، لالچ دی تھی یا دونوں حربے استعمال کیے تھے۔

کسی بھی دروازے کو کھٹکھٹانا ایسا ہی تھا جیسے چوہے کا کڑکی میں پھنسی خوراک کو منہ ڈالنا۔ چوہے کی جان کھانے کی طلب لیتی ہے اور مجھے پرما کی جان بچانے کا لالچ خطرہ مول لینے پر مجبور کر رہا تھا۔ گھنے بادلوں کی وجہ سے تاریکی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مختلف گھروں کی کھڑکیوں سے جھانکتی روشنی اندھیرے کے خلاف کوئی خاص کارکردگی نہیں دکھا پا رہی تھی۔ البتہ میرے لیے اندھیرا زیادہ سودمند تھا۔ ایک گلی میں گھس کر میں محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ موسم ایسا تھا کہ بغیر کسی مجبوری کے شاید ہی کوئی گھر سے نکلتا۔

ایک مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے چیخ و پکار سنائی دی۔ میاں، بیوی بحث و تکرار میں لگے تھے۔ اور ایسے الجھے تھے گلی میں بھی ان کی آوازیں واضح سنائی دے رہی تھیں۔ چند گھروں سے بچوں کے قہقہے اور چیخنے پکارنے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ایسے بھی گھر تھے کہ موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کہیں کہیں ٹی وی کی بلند آواز گلی میں پہنچ رہی تھی۔ زندگی کے میلے بغیر کسی رکاوٹ کے جاری تھے۔ یہ میلے ہمیشہ جاری ہی رہتے ہیں۔ کیوں کہ کسی ایک یا چند ایک کی تکلیف، دکھ یا موت سے یہ ہنگامے نہیں رکتے۔

مجھے کوئی مناسب گھر نظر نہیں آ رہا تھا کہ دروازہ کھٹکھٹاتا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا کہ امیر گھرانے، مفلس گھرانے یا درمیانے طبقے کے کسی گھر کو ٹھکانہ بناؤں۔

بارش کی رفتار میں مزید اضافہ ہوا۔ یوں جیسے سرما کی جھڑی کے بجائے ساون کی موسلا دھار بارش ہو۔ ایک گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے دروازے میں جھری دیکھ کر معلوم ہوا دروازہ کھلا تھا۔ دو پائیدان طے کر کے میں دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ پانی کی پھوہار سے محفوظ ہونے پر، سکون محسوس ہوا تھا۔ وہ بیٹھک نما کمرہ انسانی وجود سے خالی تھا۔ دیوار پر ٹنگی قرآنی آیات کا عکس دیکھتے ہی میرے اطمینان میں اضافہ ہوا تھا۔ لکڑی کی میز پر چند درسی کتب رکھی تھیں، ساتھ ایک رف پیڈ بھی رکھا تھا۔ ایک کتاب درمیان سے کھلی ہوئی اوندھی پڑی تھی، لگا کوئی چند لمحے پہلے ہی اٹھ کر گیا تھا۔

میں نے پرما کو کندھے سے اتار کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ اس کے منہ سے ہلکی ہلکی کراہیں نکل رہی تھیں۔ وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔

مجھے انتظار کی زحمت نہیں اٹھانا پڑی تھی، جلد ہی ایک جوان سال لڑکا بھاپ اڑاتی پیالی پکڑے اندر آیا۔ مجھے دیکھے ہی اسے حیرانی بھرا جھٹکا لگا تھا۔

میں نے گفتگو کی ابتداء کی۔ ''معذرت خواہ ہوں آپ کو تکلیف دی، مگر بہ خدا ایسا مجبوری کی حالت میں کیا۔''

لڑکا حیرت کے جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

میں نے مقصد واضح کیا۔ ''پناہ کی تلاش یہاں تک لائی ہے۔''

وہ صاف گوئی سے بولا۔ ''اندازہ ہو گیا تھا۔ لیکن مجھے نہیں لگتا ابو جان اتنا بڑا خطرہ مول لینے کا حوصلہ کریں گے۔''

میں ملتجی ہوا۔ ''میری بیوی کو سخت بخار ہے، اگر فوری طبی امداد نہ ملی تو اس کی جان جانے کا خدشہ ہے۔ اور یقیناً مدد کے طلبگار کو در سے دھتکارنا ایک مسلم کو زیب نہیں دیتا۔''

''کل گاؤں بھر کے لوگوں کو غنڈوں کی طرف سے دھمکیاں ملی ہیں۔ پولیس والوں نے بھی کسر نہیں چھوڑی۔ آپ کو

ڈھونڈنے کی خاطر گھر گھر کی یوں تلاشی لی گئی کہ کونوں کھدروں تک کو کھنگالا گیا۔ ایسے حالات میں کوئی خود کو جوکھم میں کیسے ڈال سکتا ہے۔''

''کوشش کرنا میری یہاں آمد کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔'' دلگرفتگی سے کہتے ہوئے میں پرما کو اٹھانے کو جھکا۔

اس نے پیش کش کرتے ہوئے ہمدردی دکھائی۔۔''ابو جان کے علم میں لائے بغیر میں آپ کو ایک رات کے لیے اپنے کمرے میں پناہ دے سکتا ہوں، لیکن صبح سویرے آپ کو رخصت ہونا پڑے گا۔''

لمحہ بھر سوچ کر میں نے پوچھا۔'' گاؤں میں کوئی ایسا مکان نہیں ہے جہاں میں دو تین دن چھپ کر گزار سکوں۔''

وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بولا۔''ایک راستہ ہے تو سہی، مگر کامیابی یقینی نہیں ہے۔''

اس کا ہچکچانا مجھے ناگوار گزرا تھا۔ مگر غصے کے اظہار کا حق میرے پاس نہیں تھا تبھی لہجے میں نرمی سموتے ہوئے بولا۔''میرے پاس زیادہ مہلت نہیں ہے۔''

وہ تفصیل سے بتانے لگا۔''اس گلی کا آخری سے پہلا گھر ایک سکھ، گلشن سنگھ کا ہے۔ شبہ کیا جاتا ہے اس کا تعلق خالصتان تحریک سے ہے۔ مجھے اس کے بارے اپنے کلاس فیلو انومان سنگھ سے پتا چلا ہے جو اس کا پڑوسی ہے کہ گلشن سنگھ کے گھر مشکوک افراد کی آمد و رفت رہتی ہے۔ انومان سنگھ میرا گہرا دوست ہے۔ سچ بتاؤں تو بیٹھک کا دروازہ اسی کے لیے ہی کھلا رکھا تھا۔ وہ روزانہ اس وقت تک پہنچ جاتا ہے، مگر آج شاید بارش کی وجہ سے دیر کر رہا ہے۔ خیر میں امید کرتا ہوں کہ گلشن سنگھ آپ کو پناہ دینے کی ہمت کر لے گا۔''

''حالاں کہ یہ ہمت تمھیں کرنا چاہیے تھی۔'' گھر کی طرف سے آنے والی ناراضی بھری آواز نے مجھے حیرت سے اچھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر باریش شخص کوٹ سے بارش کی بوندیں جھاڑتا اندر گھسا، یقیناً وہ باہر کھڑا ہو کر ہماری گفتگو سن رہا تھا۔

''ابو جان! یہ وہ.....'' والد کو دیکھتے ہی اس نے صفائی پیش کرنا چاہی۔

اس کا والد قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔''پہچان لیا ہے، تعارف کی ضرورت نہیں۔ اور گلی کا دروازہ بند کر دو۔''

لڑکا سرعت سے دروازے کی سمت بڑھ گیا، جبکہ اس نے میرے قریب آ کر مصافحے کو ہاتھ بڑھایا۔

''فدوی کو عبدالخالق کہتے ہیں۔ اور آپ یقیناً وہی ہیں جس کی تلاش میں کل ہمارے گاؤں کا کونہ کونہ چھانا گیا۔''

اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے میں دھیرے سے بولا۔''ذیشان حیدر۔''

وہ خلوص دل سے بولا۔''آپ جب تک چاہیں غریب خانے پر قیام کر سکتے ہیں۔ میرے بارے برخوردار کا اندازہ ٹھیک نہیں تھا۔''

لڑکا ندامت سے بولا۔''ابو جان! معافی چاہتا ہوں۔ میرا خیال تھا آپ کو میری جسارت ناگوار گزرے گی۔''

''اپنے دوست سے مہمان کی آمد کا ذکر بالکل نہ کرنا، کیوں کہ جس راز کی تم خود حفاظت نہیں کر سکے اسے چھپانے کی کسی اور سے توقع کرنا عبث ہوتا ہے۔'' اپنے بیٹے کو نصیحت کر کے وہ میری طرف متوجہ ہوا۔''میرے ساتھ آئیں۔''

میں نے پرما کو بازوؤں میں بھرا اور عبدالخالق کے پیچھے بڑھ گیا۔ مختصر سا صحن عبور کر کے ہم اندرونی عمارت میں داخل ہوئے۔ ایک کمرے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے کنڈی کھولی اور کواڑ کو دھکیلتا ہوا اندر گھسا اور بتی جلا دی۔ اندر دو سنگل بیڈ قریب قریب پڑے تھے۔ ان پر گدے اور صاف چادریں بچھی تھیں۔ دو صاف ستھرے لحاف اور تکیے سرہانے کی جانب پڑے تھے۔ کمرے کی مجموعی ہیئت سے لگ رہا تھا کہ وہ مہمان خانہ تھا۔ پرما کو میں نے لکڑی کی کرسی پر بٹھا دیا تھا کیوں کہ اس کے پانی سے شرابور لباس سے بستر گیلا ہو سکتا تھا۔ کلاشن کوف گلے سے نکال کر میں نے بیڈ کے نیچے دھکیل

دی۔

آپ ایک منٹ ٹھہریں میں بچی کے لیے خشک کپڑے لاتا ہوں۔'' پرما پر ہمدردی بھری نگاہ ڈال کر وہ سرعت سے باہر نکل گیا۔اس کی واپس زنانہ شلوار قمیص، گرم بنیان اور جرسی کے ساتھ ہوئی تھی۔

کپڑے بیڈ پر رکھ کر اس نے کہا۔'' آپ اس کا لباس تبدیل کر دیں، پھر مجھے آواز دے لینا میں ڈرائینگ روم میں منتظر ہوں۔''

میرے اثبات میں سر ہلانے پر وہ دروازے کی طرف مڑ گیا۔باہر نکلتے ہوئے اس نے پیچھے دروازہ بند کر دیا تھا۔عبدالخالق کے باہر نکلتے ہی میں نے سرعت سے پرما کے بدن سے لباس اتار کر خشک لباس پہنایا اور بستر پر لٹا کر لحاف اوڑھا دیا۔اس دوران میں نے نظروں کو آوارگی کی اجازت نہیں دی تھی۔مظلوم حوا زادی حالات کا شکار ہو کر اس حالت میں میرے سامنے آئی تھی۔اس کی بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھانا، یا اس کے بخار سے پھنکتے بے لباس بدن کو دیکھ کر آوارگی کا دامن پکڑنا گھٹیا پن و بے حیائی کی بدترین مثال تھی۔

پرما کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔یوں جیسے اسے سانس لینے میں تکلیف ہو رہی ہو۔لحاف میں ہوتے ہی وہ زور سے بڑبڑائی، مگر مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی تھی۔میں نے دوسرے بیڈ پر پڑا لحاف بھی اسے اوڑھا دیا تھا۔

اس کے گیلے کپڑوں اور کوٹ سے سامان وغیرہ نکال کر میں نے کپڑے کمرے کے کونے میں رکھ دیے تھے۔کرن چاولہ والا پستول اب تک اس کے کوٹ کی جیب میں تھا۔فارغ ہو کر میں نے دروازے پر جا کر عبدالخالق کو آواز دی۔وہ میرا ہی منتظر تھا۔اس کی آمد خشک مردانہ لباس کے ساتھ ہوئی۔

''شکریہ'' کہہ کر میں نے اس کے ہاتھ سے کپڑے لیے اور مہمان خانے سے ملحقہ غسل خانے میں گھس کر کپڑے تبدیل کر دیے۔خشک لباس پہنتے ہی جسم میں سکون کی لہر دوڑ گئی تھی۔عبدالخالق نے بجلی والا ہیٹر بھی جلا دیا تھا۔

''لگتا ہے آپ کی ساتھی کی طبیعت سخت خراب ہے۔''

''جی چچا جان! آپ کو بالکل ٹھیک لگتا ہے۔اور یقیناً ڈاکٹر کا انتظام تو ممکن نہیں، لیکن بخار کی دوائی اور درد کش گولیاں مل جائیں تو امید ہے اسے سنبھلنے میں مدد ملے گی۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔'' گھر میں تو نہیں ہیں البتہ، اسحاق بیٹے کو بھیج کر منگوا لیتا ہوں۔''

میں نے حیرانی ظاہر کی۔'' کیا اس وقت میڈیکل سٹور کھلا ہوگا؟''

اس نے وضاحت کی۔'' ایک جاننے والے ڈاکٹر کے گھر سے دوائی لے آئے گا۔''

میں لجاجت سے بولا۔'' پھر جلدی کریں میری ساتھی کل سے بخار میں پھنک رہی ہے۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔تھوڑی دیر بعد لوٹا تو کھانے کے برتن ساتھ تھے۔میرے سامنے ٹرے رکھتے ہوئے وہ بولا۔'' آپ کھانا کھائیں۔بچی کے لیے بیگم یخنی بنا رہی ہے۔''

اور میں بے تکلفی سے کھانے کو جڑ گیا۔یقیناً ہماری آمد کے ساتھ ہی اس نے خاتون خانہ کو باورچی خانے گھسنے کا کہہ دیا تھا۔اور مہربان خاتون کو پہلے سے پکے ہوئے کھانے کو گرم کرنے میں اتنی دیر نہیں لگی تھی۔

میرے کھانا کھانے تک وہ چائے بھی لے آیا تھا۔اس دوران اسحاق بھی تین چار قسم کی گولیوں لیے لوٹ آیا تھا۔ڈاکٹر کو اس نے اپنی بہن کے بیمار ہونے کا بتایا تھا۔عبدالخالق کے دو ہی بچے تھے۔اسحاق اور اس سے ایک سال بڑی بہن عائشہ۔پرما کے پہننے کو عبدالخالق عائشہ ہی کے کپڑے لایا تھا۔

عبدالخالق گرم یخنی لے آیا۔میں نے لحاف ہٹا کر پرما کو دیکھا وہ پہلے سے قدرے بہتر نظر آئی تھی۔گرم لحاف نے

اسے کافی تقویت دی تھی۔ میں نے ہاتھ اس کی جلتی ہوئی پیشانی پر رکھا۔ اس کی پلکیں وا ہوئیں۔ مجھے ایک نظر دیکھ کر اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لی تھیں۔ میں نے اس کے سر کے نیچے ایک اور تکیہ رکھا اور یخنی کے ڈونگا لیے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔

''یخنی پی لو۔''

گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے پلکوں کی جھالر اٹھائی۔ ''ہمارا کچھ بھی کھانے پینے کو دل نہیں چاہ رہا۔''

یخنی کا چمچ بھر کر اس کے ہونٹوں کے قریب لے جاتے ہوئے میں متبسم ہوا۔ ''آپ دل کی سنتی ہی کیوں ہیں۔''

منہ بناتے ہوئے اس نے کہا۔ ''آپ کا مذاق ہمیں آپ سے بھی برا لگتا ہے۔'' اور یخنی پینے کو ہونٹ کھول دیے۔ دو تین چمچ پی کر اس نے بس کرنا چاہی مگر میں نے زبردستی آدھا پیالہ یخنی اسے پلا دی۔ پھر نیم گرم دودھ کے ساتھ گولیاں کھلا کر اسے اچھی طرح لحاف اوڑھا دیا۔

عبدالخالق میرے لیے ایک گرم کمبل لے آیا تھا، کیوں کہ میں نے دونوں لحاف پرما کو اوڑھا دیے تھے۔

عبدالخالق نے جانے کو پر تولے۔ ''آپ بے فکر ہو کر آرام کریں، کیوں کہ وہ درندے پورے گاؤں کو اچھی طرح کھنگال گئے ہیں۔ بار بار یہاں کی تلاشی نہیں لے سکتے۔ اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بے تکلفی سے آواز دے لینا۔''

میں ممنونیت سے بولا ''اللہ پاک آپ کو بہترین اجر دے۔''

ہونٹوں پر پر خلوص تبسم بکھیرتا ہوا وہ باہر نکل گیا۔ دروازہ اندر سے کنڈی کر کے میں نے پرما کی اتاری ہوئی بنیان لی کہ وہ خشک تھی۔ اس سے گلاک، P99 والتھر اور بیلے ریوالور صاف کرنے لگا۔ تینوں ہتھیاروں کا ایمونیشن خشک کر کے میں نے دوبارہ میگزینوں میں بھرا۔ اور کلاشن کوف کو بھی خشک کر کے رکھ دیا۔ پرما کے گہرے سانس اس کے سو جانے کے مظہر تھے۔ دوائی میں سکون آور گولی بھی شامل تھی، تبھی وہ آسانی سے سو گئی تھی۔

میں نے بھی کمبل میں روپوش ہو کر آنکھیں موند لیں۔ عارضی پناہ کا دستیاب آنا کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ اللہ پاک کی رحمت تھی کہ اتنی آسانی سے ٹھکانہ مل گیا تھا۔ اور ہماری خوش قسمتی تھی کہ پہلی کوشش ہی میں مسلمان گھرانے سے واسطہ پڑ گیا تھا۔

گرم کمبل کی خوشگوار حدت میرے رگ و پے میں سکون بن کر دوڑنے لگی۔ گزشتہ رات میری زندگی کی بھیانک راتوں میں سے ایک تھی۔ بارش، ہوا، سردی، بے سکونی، بے چینی اور ساتھ بخار کی شدت میں بے ہوش پرما کو سنبھالنا۔ اور آج گرم کمرا، بستر، عمدہ کھانا، چائے اور آرام میسر آیا تھا۔ مجھے نیند کی سہانی وادیوں میں اترتے دیر نہیں لگی تھی۔

میری آنکھ پرما کے پکارنے پر کھلی تھی۔ اسے پیاس لگی تھی۔ میں نے جگ سے پانی کا گلاس بھر کر اسے پلایا۔ ساتھ ہی بیت الخلاء کا بھی بتا دیا کہ تقاضا محسوس کرنے پر اسے مجھے اٹھانے کی ضرورت نہ پڑے۔

مگر میری تدبیر کارگر نہیں ہوئی تھی۔ گھنٹا ڈیڑھ بعد اس نے بیت الخلاء کی ضرورت محسوس ہوتے ہی مجھے یہ کہتے ہوئے جگا دیا تھا کہ اس سے چلا نہیں جاتا۔

اسے سہارا دے کر میں غسل خانے کے اندر پہنچایا اور باہر نکل آیا۔ اس کا بخار پہلے سے کافی بہتر لگ رہا تھا۔

باہر آنے پر اسے سہارا دے کر بستر تک لایا اور اس کے لحاف میں گم ہونے پر خود بھی کمبل میں گھس گیا۔

طلوع آفتاب کے ساتھ عبدالخالق ناشتا لے آیا تھا۔ پرما نے بہ مشکل آدھی ڈبل روٹی کھائی، البتہ چائے کی پوری پیالی پی گئی تھی۔ اسے دوائی کھلا کر پھر سلا دیا۔ میں نے ڈٹ کر ناشتا کیا۔ عبدالخالق نے کہا کہ ہمیں دن بھر کمرے کے اندر ہی بند رہنا پڑے گا۔ اور وہ دروازے کو باہر سے قفل کرے گا تاکہ گھر میں کوئی آنے والا اتفاق سے بھی ہمیں نہ دیکھ

سکے۔ ہمیں کیا مسئلہ ہوسکتا تھا، بغیر ہچکچاہٹ کے منظور کرلیا۔ ضرورت کی ہر چیز کمرے موجود تھی ہمیں باہر نکلنے کی حاجت ہی کیا تھی۔

اگلے دو تین دنوں میں پرما کے بخار کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ مسلسل آرام نے اس کے چہرے کی رونق لوٹا دی تھی۔ رخساروں کی سرخی، آنکھوں کی چمک، باتوں کی شوخی، تبسم کا ترنم اور سب سے بڑھ کر زندہ رہنے کی امید جو مشکلات کا سامنا کرنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔ عبدالخالق کی بیوی ساجدہ، بیٹی اور بیٹے سے کبھی کبھار رات کے وقت گپ شپ ہو جاتی تھی۔ اس کی بیٹی پرما کی ہم عمر تھی۔ پہلے ہی دن وہ پرما سے گھل مل گئی تھی۔ ان حالات میں ایسے مخلص خاندان کی دستیابی کو اللہ پاک کی غیبی مدد کے علاوہ کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس دوران میں نے عبدالخالق سے اردگرد کے علاقے کی خاطر خواہ معلومات حاصل کر لی تھی۔ دھامن گاؤں کے سب سے قریب سورت تھا۔ یہ ساحلی شہر ہے اور بالکل سمندر کنارے واقع ہے۔ عبدالخالق سے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ ہماری تلاش میں سرگرداں ٹولیاں گاہے گاہے وہاں چکر لگا جاتی تھیں۔ دھامن گاؤں کے مضافات ہی وہ آخری مقام تھا جہاں ہمارے ہونے کے شواہد ملے تھے۔ بس نے ہمیں جس جگہ اتارا تھا وہاں سے ہم چاروں اطراف کوئی بھی سمت اختیار کر سکتے تھے۔ البتہ زیادہ گمان سورت شہر جانے کا بنتا تھا۔ اور اس کی وجہ اس کے علاوہ کوئی نہ تھی کہ ممبئی سے نکلنے کے بعد سے ہمارا رخ قریباً مسلسل اسی طرف رہا تھا۔

عبدالخالق کو میں اجمالاً اپنی کہانی سنا چکا تھا اور اس کا مشورہ یہی تھا کہ ہمیں وہاں کچھ عرصہ گزارنا چاہیے۔ میں بھی زیادہ نہیں تو ہفتہ ڈیڑھ وہیں گزارنے کے حق میں تھا۔ یوں ہماری تلاش کی سرگرمی میں تھوڑا بہت فرق پڑ ہی جانا تھا۔

''کب تک یہاں رہنا پڑے گا۔'' وہاں آئے پانچویں شب تھی جب پرما نے عائشہ وغیرہ کے جانے کے بعد استفسار کیا۔

''آپ کا کیا ارادہ ہے۔'' میں نے گیند اس کی طرف پھینکی۔

وہ اطمینان سے بولی۔ ''ہم چاہتے ہیں جلد از جلد پاپا کے پاس پہنچ جائیں۔''

میں نے کہا۔ ''جلدی تو مجھے بھی بہت ہے، بس آپ کے صحت مند ہونے کا منتظر تھا۔''

وہ شوخی سے بولی۔ ''ہم بالکل ٹھیک ہیں اور اب اپنا لباس خود تبدیل کر سکتے ہیں۔''

میں نے بات بنائی۔ ''اسی لیے تو دوبارہ ساجدہ خالہ کو زحمت نہیں دی۔''

وہ ذومعنی لہجے میں بولی۔ ''اگر سوچتے ہو کہ ہم اس وقت بے ہوش تھے تو آپ سے زیادہ سادہ شخص شاید ہی کوئی ہوگا۔''

میرے چہرے پر خفت نمودار ہوئی۔ ''آپ جانتی ہیں بہ حالت مجبوری مجھے وہ قدم اٹھانا پڑا تھا۔''

وہ اطمینان سے بولی۔ ''ہم نے گلہ تو نہیں کیا، آپ کے شکر گزار ہیں۔ بلکہ سچ کہیں تو پاپا کے انتخاب پر فخر کرتے ہیں کہ ان لمحات میں بڑوں بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور آپ نے خود پر قابو رکھا۔''

میں نے کہا۔ ''اتنی بڑی بڑی باتیں کرنا آپ کو نہیں جچتا۔ لگتا ہے راجکماری نہیں کوئی بوڑھی مہارانی بول رہی ہو۔''

کہنے لگی۔ ''ہم نے آپ کے سر جگ رسید کیا تھا، مگر آپ نے آج تک وجہ نہیں پوچھی۔''

مجھے لگا وہ موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کا ساتھ دیتے ہوئے بولا۔ ''اس میں پوچھنے کو کیا ہے، یقیناً بھاگنا چاہتی تھیں۔ اور یہ تو ہر قیدی کا بنیادی حق ہوتا ہے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہم نے آپ کو پیشگی سزا دی تھی۔ کیوں کہ جانتے تھے آپ کچھ ایسا ہی کریں گے۔'' یہ کہہ کر وہ مسلسل ہنسنے لگی۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی بے تکلفی اور بے باکی کا مظاہرہ کر رہی

تھی۔ یقیناً یہ پچھلے چند دنوں کی خدمت کا نتیجہ تھا۔ جس طرح اسے بچانے کی کوشش میں میں ہلکان ہوتا رہا تھا، ایسا کوئی بہت زیادہ قریبی ہی کر سکتا ہے۔ ورنہ میری بلا سے اسے کچھ بھی ہو جاتا میرے لیے سب سے اہم میری اپنی جان ہونا چاہیے تھی۔ اس کے تئیں ایسا سوچنا جائز تھا۔ البتہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ وہ بے چاری یہ نہیں جانتی تھی کہ ایک پاکستانی سپاہی کے لیے سب سے پہلے اپنا مشن ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کی جان کا نمبر آتا ہے۔

''اچھا آرام کرو۔'' میں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہمیں نیند نہیں آ رہی۔''

''یقیناً یہ میرا دردِ سر نہیں ہے۔'' لحاف میں سرکرتے ہوئے میں نے جان چھڑائی کہ پلوشے سے ملاقات کا وقت ہوا چاہتا تھا۔

اس نے اپنے تئیں دھمکی دی۔ ''یہ نہ ہو ہم خفا ہو جائیں۔''

میں نے اطمینان ظاہر کیا۔ ''مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

دو تین آوازیں دے کر وہ بھی لحاف میں ہو گئی تھی۔

—●—

مزید تین دن وہاں گزارنے کے بعد ہم جانے کو تیار تھے۔ البتہ اس سے پہلے چند ضروری انتظامات کر لیے تھے۔ دو دن پہلے عبدالخالق کو معقول رقم دے کر میں نے ممبئی میک اپ کا مخصوص سامان لانے بھیجا تھا۔ دھرمودا کے کارندے کے بتائے ہوئے میک اپ کے سامان کے ضروری لوازمات کا نام یاد کرنے کو مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی تھی۔ عبدالخالق کی کامیاب واپسی کے بعد میں نے اسی دن پرما کا حلیہ تبدیل کیا۔ اس کے سنہری بالوں کو کالا کر دیا، سرخ و سفید رنگت کو گہرا سانولا اور شفاف گالوں پر چیچک کے داغ بنا دیے تھے۔ ستواں ناک کو اسپرنگ ڈال کر موٹا کر دیا، جبڑوں کی ہڈی کو بھی گم شیٹ سے ابھار دیا تھا۔ سیاہ آنکھوں کو ویسا ہی رہنے دیا کہ مقامی لوگوں کی اکثریت کی آنکھیں سیاہ تھیں۔

آئینہ دیکھتے ہی وہ بگڑ گئی تھی۔ ''ہمیں ایسا بالکل نہیں دکھنا۔''

بے وقوف نہیں بنتے۔'' اسے جھڑک کر میں اپنا حلیہ تبدیل کرنے لگا۔ کلین شیو کر کے اپنا رنگ میں نے گہرا سیاہ کر دیا تھا۔ آنکھوں میں مخصوص محلول ڈال کر سفید ڈھیلوں کو ہلکا سرخ کر دیا تھا۔ سر کے بال میں ایک دن پہلے ہی عبدالخالق کے بیٹے اسحاق سے الیکٹرک مشین کے ذریعے چھوٹے چھوٹے کرا چکا تھا۔ ان بالوں کو متعلقہ لوشن سے چپکا کرا ایسا کر دیا تھا کہ وہ مکرانیوں کی طرح گھنگرالے لگ رہے تھے۔

میری ہیئت کذائی دیکھ کر پرما کی بر ہی دھیمی پڑی تھی۔ شام کو عبدالخالق اور اس کے بچوں نے بہ مشکل ہمیں پہچانا تھا۔ ہماری حالت پر وہ خوب ہنسے تھے۔ پرما ایک بار پھر بگڑ گئی تھی۔ مگر میں نے حالات سے ڈرا کر اسے خاموش کرا دیا تھا۔ ناشک شہر سے سورت جانے والی بسیں دھامن گاؤں کے درمیان سے ہر گھنٹے بعد گزرتی تھیں۔ اور میں انھی میں سورت تک جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ سورت وہاں سے تیس پینتیس کلومیٹر کے بہ قدر تھا۔ دن بھر لوکل ٹریفک بھی ملتی تھی، مگر میں نے لوکل بس میں سفر سے احتراز برتا تھا کہ لوکل بسوں میں اکثریت مقامی افراد کی ہوتی ہے جو ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ اور نئے چہرے دیکھ کر وہ چونک سکتے تھے۔ گو اس کا بہت زیادہ امکان نہیں تھا، لیکن احتیاط برتنے میں زیادہ بہتری تھی۔

رخصت ہونے سے قبل پرما نے قیمتی لاکٹ اتار کر عائشہ کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''یہ بہت قیمتی ہے، اس میں

خالص ہیرا جڑا ہے۔ اسے بیچ کر تم اپنی میڈیکل کی تعلیم کے اخراجات آسانی سے پورے کرلوگی۔''

عبدالخالق نے جلدی سے انکار کرنا چاہا۔ ''نن..... نہیں بیٹی! اس کا باپ ابھی زندہ ہے اور ''

پرما قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ''انکل! ہم جانتے ہیں۔ مگر ہماری خوشی اسی میں ہے کہ عائشہ کی تعلیم کے اخراجات ہم برداشت کریں۔ اگر انڈیا چھوڑ کر جانا نہ ہوتا تو کوئی اور طریقہ اختیار کرتے، مگر اب مجبوری ہے۔ اور اسے اپنی توہین نہ جانیے گا۔''

عبدالخالق نے چپ سادھ لی تھی۔ البتہ ہلکی سی خفت اس کے چہرے پر نمودار ہوگئی تھی۔ البتہ ساجدہ خالہ کے چہرے پر مسرت پھیل گئی تھی۔

عائشہ سے گپ شپ کے دوران پرما کو معلوم ہوا تھا کہ وہ ایف ایس سی کے بعد تعلیم کو خیر باد کہنے والی ہے، کیوں کہ اسے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا اور عبدالخالق کے پاس اتنی رقم موجود نہیں تھی کہ میڈیکل کی تعلیم کے اخراجات برداشت کر پاتا۔ عائشہ کے لیے اپنے قیمتی لاکٹ کی قربانی دینا یقیناً اس کا اچھا فعل تھا۔ سونے کی زنجیر میں جڑے ہیرے کی قیمت لاکھوں میں تھی جو پرما نے بے پروائی و خوش دلی سے اپنی میزبان کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ صرف نام کی راجکماری نہ تھی، وسیع قلب بھی رکھتی تھی۔

میں نے الوداعی معانقے کو بازو پھیلائے، تبھی عبدالخالق نے کہا۔ ''بیٹا! برا نہ مانو تو ایک مشورہ دوں گا۔''

''بولیں چچا جان۔'' ان سے معانقہ کر کے میں پیچھے ہٹا۔

کہنے لگے۔ ''آپ کے کہنے کے مطابق، دشمن کا زور بھی اسی جانب ہے جدھر آپ کا رخ ہے۔ تو ممبئی کیوں نہیں چلے جاتے۔ وہاں سے بھی تو بیرون ملک بھاگا جا سکتا ہے۔''

میرے دماغ کو جھٹکا لگا تھا۔ اس کا مشورہ رد کرنے کے قابل نہ تھا۔ بلاشبہ دشمنوں کا پورا زور اسی جانب تھا۔ نجانے دشمنوں کی نظر میں میری منزل کیا تھی البتہ ممبئی سے نکلنے والے دونوں بڑے راستوں یعنی ممبئی آگرہ نیشنل ہائی وے اور ممبئی دہلی ہائی وے پر آگے کی جانب مسلسل رکاوٹیں کھڑی کی جا رہی تھیں۔ گویا انھیں ہمارے ممبئی واپس لوٹنے کی ذرا بھر امید نہیں تھی۔

میرے چہرے پر تذبذب دیکھتے ہوئے اس نے مکرر کہا۔ ''میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ دشمنوں کو اس جانب خوار ہونے دو اور ممبئی جا کر دوبارہ کوشش کرو۔''

میں متبسم ہوا۔ ''آپ کو یہ مشورہ پہلے دینا چاہیے تھا۔''

وہ ہلکی سی خفت سے بولے۔ ''ایک دم ہی سوجھا ہے تو اگل دیا۔''

میں نے سوالیہ نظروں سے پرما کو دیکھا۔ اس نے بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ہم کچھ نہیں جانتے۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ کا کریڈٹ کارڈ کہاں ہے؟'' میں اس کے پاس کریڈٹ کارڈ دیکھ چکا تھا۔ بلکہ ایک دو بار اس نے استعمال کی بھی دعوت دی تھی، مگر کریڈٹ کارڈ کو استعمال کرنا اپنی لوکیشن ظاہر کرنا تھا اس وجہ سے سختی سے منع کر دیا تھا۔

اس نے کوٹ کی جیب سے کریڈٹ کارڈ نکال کر میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

کارڈ لے کر میں نے پاس ورڈ پوچھا۔ جو اس نے فوراً بتا دیا۔

میں عبدالخالق کی طرف متوجہ ہوا۔ ''چچا جان! اگر آپ تھوڑی سی ہمت کا مظاہرہ کریں تو ہماری نصف مشکلات کا

خاتمہ کر سکتے ہیں۔''

اس نے حیرانی ظاہر کی۔'' کچھ سمجھا نہیں بیٹا۔''

''اگر کل سورت جا کر آپ اس کارڈ کو اے ٹی ایم مشین میں استعمال کر لیں تو دشمن کو ہماری سورت میں موجودی کا یقین ہو جائے گا۔ اور وہ اپنی ساری توجہ ادھر ہی مرکوز کر دے گا۔ یوں ہمیں ممبئی میں کم خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

اس نے پوچھا۔'' کارڈ کو استعمال کرنے میں کوئی خطرہ ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔'' اگر بے احتیاطی کرو گے تو یقیناً ہوگا۔''

''اور احتیاط برتوں تو؟''

میں اطمینان سے بولا۔'' پھر صفر فیصد بھی خطرہ نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے رضامندی ظاہر کی۔

اسحاق نے پیش کش کی۔'' ابو جان کی جگہ اگر میں چلا جاؤں۔''

ساجدہ خالہ نے فوراً ڈانٹا۔'' تم رہنے دو۔''

میں نے بھی ساجدہ خالہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔'' نہیں یار! چچا جان ہی ٹھیک رہیں گے۔''

عبدالخالق چچا مستفسر ہوا۔'' آپ احتیاط بتا رہے تھے۔''

میں نے مختصر لفظوں ہدایات دیں۔'' کسی رش والی جگہ پر اے ٹی ایم مشین تاڑنا ہے۔ وہاں سیکیورٹی کیمرے کی غیر موجودی کا یقین کر لینا، اگر کیمرہ موجود ہو تو اے ٹی ایم کیبن میں داخلے سے پہلے چہرے پر مفلر لپیٹ لینا تاکہ آپ کی پہچان نہ ہو سکے۔ پچاس ہزار روپے نکال کر وہاں سے غائب ہو جانا۔ کارڈ کو کسی گندے نالے میں پھینک دینا اور پہلی فرصت میں لوٹ آنا۔''

اس نے دلچسپی سے پوچھا۔'' ان پچاس ہزار کا کیا کرنا ہے؟''

میں نے قہقہہ لگایا۔'' ساجدہ خالہ کو اچھی سی شاپنگ کرا دینا۔''

اس نے خیال ظاہر کیا۔'' ویسے بہ ظاہر تو مجھے کوئی خطرہ نظر نہیں آ رہا۔''

''کریڈٹ کارڈ کے استعمال ہوتے ہی تمام ادھر متوجہ ہو جائیں گے۔ اب کریڈٹ کارڈ کے استعمال کی خبر ان تک کتنی دیر میں پہنچتی ہے، اس بارے حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر ان تک کریڈٹ کارڈ کے استعمال کے اگلے منٹ بھی خبر پہنچ جائے تب بھی اپنے آدمیوں کو اس اے ٹی ایم مشین تک پہنچنے کے احکام جاری کرنے اور متعلقہ افراد کے وہاں پہنچنے تک، آپ دھامن پہنچ چکے ہوں، یا پہنچنے والے ہوں گے۔ اور یاد رہے کارڈ کو کسی نالے وغیرہ میں پھینکنا نہ بھولنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے خوش دلی سے سر ہلا دیا۔

میں نے پوچھا۔'' اب یہ بتائیں، ممبئی کی گاڑی اس وقت مل جائے گی۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔'' سورت سے ہر گھنٹے ڈیڑھ بعد ممبئی کی گاڑی نکلتی ہے۔''

میں نے کہا۔'' تو ہم ابھی روانہ ہوتے ہیں، آپ کل صبح ہی سورت کا رخ کرنا۔''

رخصت لینے سے پہلے میں نے عبدالخالق کو چند اور مفید مشورے دیے اور وہاں سے نکل آئے۔ انھوں نے اسحاق کو ہمارے ساتھ بھیجنے کی کوشش کی مگر میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ میرے لیے ان کی بتائی ہوئی معلومات ہی کافی تھیں۔

ہم دیہاتی لباس میں تھے۔ کلاشن کوف میں نے دو دن پہلے ہی عبدالخالق کے گھر کے صحن میں دفنا دی تھی، کہ اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ البتہ پستول ہمارے پاس موجود تھے۔

دھامن گاؤں کے قریب ایک بڑی سڑک تو ممبئی دہلی ہائی وے تھی جہاں سے ہم ہو کر آئے تھے۔ وہ قریباً دھامن گاؤں سے چار پانچ کلومیٹر شرقی جانب تھی۔ دوسری گاؤں کے غربی جانب تھی اور تقریباً گاؤں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ وہ بھی آگے جا کر ممبئی دہلی ہائی وے سے مل جاتی تھی۔ ویسے تو وہاں سڑکوں کا جال بچھا تھا۔ مگر اس کی تفصیل مجھے معلوم نہیں اور نہ جاننے میں دلچسپی ظاہر کی تھی کہ ہماری منزل فی الحال ممبئی تھا۔

بس اڈے پر چند اور سواریاں بھی نظر آئی تھیں۔ میں نے ممبئی کے دو ٹکٹ لیے اور ہم انتظار گاہ میں بیٹھ گئے۔ نو بجے گاڑی نے آنا تھا۔ چند ہی منٹ رہتے تھے۔

بس وقت پر پہنچی تھی۔ سواریوں میں ہلچل مچی اور تمام بس کی طرف بڑھ گئے۔ ہمیں آخری سیٹیں ملی تھیں۔

بس روانہ ہوئی، میں مختلف اندیشے دل میں پالے بہ ظاہر بے پروا مگر درحقیقت چوکنا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ ایک دو جگہوں پر سرسری چیکنگ ہوئی، لیکن کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ خیریت سے ممبئی پہنچ جانا اندازوں کے برخلاف نہیں تھا۔ ہم تقریباً ڈیڑھ بجے ممبئی پہنچ گئے تھے۔ پرماتو سپٹ سے فیک لگا کر اچھی خاصی نیند لے چکی تھی۔ لیکن میں نے ایسی کوشش نہیں کی تھی۔

''سجاتا دیدی کے ہاں چلیں گے۔'' بس اڈے سے باہر آتے ہوئے اس نے پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا اور موبائل فون نکال کر اس نمبر پر کال ملائی جو میں وشواس سنگھ کو دے کر آیا تھا اور جس پر آخری بار پریتو بھابی سے پیغامات کا تبادلہ ہوا تھا۔ پریتو بھابی نے کہا تھا کہ وشواس سنگھ کی آمد تک نمبر نے بند ہونا تھا۔ گھنٹی جاتے ہی میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ دو تین گھنٹیوں کے بعد ہی وشواس سنگھ کی خمار آلود مگر خوشی سے بھرپور آواز سنائی دی۔

''زندہ ہو۔'' یقیناً اس موبائل پر صرف میری ہی کال نے وصول ہونا تھی اس نے تعارف نہیں مانگا تھا۔

''جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے۔ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔ سانچ کو آنچ کیا۔ مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ اور جس کا کوئی نہیں اس کا خدا ہوتا ہے.....''

وشواس سنگھ قطع کلامی کرتے ہوئے کراہا۔ ''رب دے واسطے چپ کر جا۔''

''جواب تو بنتا ہے۔ اور سکھ کو سمجھانا اتنا آسان بھی نہیں ہوتا۔''

''کہاں سے بات کر رہے ہو، آخری اطلاعات تک تمھیں ریاست گجرات میں دیکھا گیا تھا۔''

''سکروا ڑی بس اڈے سے باہر نکل رہا ہوں۔''

وہ خوشی سے چیخا۔ ''یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔''

''سکھوں سے مذاق کوئی احمق ہی کرے گا اور میں خود کو اچھا بھلا عقل مند سمجھتا ہوں۔''

وہ کھل کھلا کے ہنسا۔ ''یار اتنی بڑی خوش خبری سننے کے بعد تمھاری کوئی بھی بکواس بری نہیں لگ سکتی۔''

''تو بتاؤ کیا کروں۔''

وہ غصے سے بولا۔ ''بے شرم، میری تو خیر ہے اپنی پریتو بھابی کا گھر بھی بھول گیا ہے۔''

''احمق سردار! بہنوں کے گھر بھائیوں کو نہیں بھولتے، میں صرف خطرے کے بارے پوچھ رہا تھا۔''

''آج کل ممبئی میں کتے، بلے خال ہی نظر آتے ہیں، البتہ سؤروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔'' کتے وہ ایجنسی والوں کو کہتا تھا، سور پولیس والوں کو اور بلونگڑے ڈاکوؤں کو۔

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے ہم آ رہے ہیں۔'' اور رابطہ منقطع کر دیا۔

پرما مستفسر ہوئی۔ ''کون تھا؟''

''ایک دوست ہے۔'' مختصر الفاظ میں کہتے ہوئے میں ٹیکسی کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم ممبئی کے مضافات کی طرف روانہ تھے۔

ٹیکسی کو میں نے وشواس سنگھ کی حویلی سے کافی پہلے رخصت کر دیا اور آگے پیدل ہی بڑھ گیا۔

فرلانگ بھر چلتے ہی پرما نے پوچھنے لگی۔ ''کتنی دور جانا ہوگا۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''کلومیٹر، ڈیڑھ مزید چلنا پڑے گا۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''ٹیکسی میں چلے جاتے تو کیا قیامت ٹوٹ پڑتی۔''

میں طنزیہ انداز میں بولا۔ ''اتنی جلدی بھول گیا ہے کہ کیا قیامت ٹوٹ سکتی ہے۔''

وہ سرعت سے بولی۔ ''براہ مہربانی، منہ سے برے شبد نہ نکالا کریں۔ آپ کے اندیشے حقیقت میں ڈھلنے کو دیر نہیں کیا کرتے۔''

''احتیاط کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔''

موضوع تبدیل کرتے ہوئے وہ شوخی سے بولی۔ ''یہ وہی دوست ہے جس کے چہرے پر آپ نے ہماری وجہ سے تھپڑ رسید کیا تھا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ دوست نہیں تھا۔''

وہ شرارت سے بولی۔ ''اپنی محبوبہ سے بھی آپ ہمارے وجہ سے جھگڑتے رہے۔''

''لورا براؤن میری دوست تھی۔''

اس نے تیکھا انداز اپنایا۔ ''ہمیں تو نصیحتیں جھاڑتے تھے کہ لڑکیوں کے دوست نہیں سہلیاں ہوتی ہیں اور خود لڑکیوں سے دوستی کا فخریہ اعلان کر رہے ہو۔''

میں سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ کی بات سے سرِ مو اختلاف نہ کرنے کے باوجود حقیقت یہی ہے جو بیان کر چکا ہوں۔ صرف لورا براؤن ہی نہیں، ایک امریکن لڑکی جینفر ہنڈسلے بھی میرے دوستوں کی گنتی میں سرفہرست ہے۔''

''اور اس کی وجہ۔'' وہ بھی سنجیدہ ہوگئی تھی۔

میں نے بے بسی ظاہر کی۔ ''نہیں جانتا۔ اور سچ کہوں تو جینی، لورا سے بھی خوب صورت ہے۔ مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی، مگر میں نے انکار کر دیا۔''

اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ ''وجہ کیا ہے جناب، جو اتنی خوب صورت لڑکیوں کو انکار کرنا پڑا۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''پلوشہ۔''

''کیا..... ہم سمجھے نہیں۔'' وہ ششدر رہ گئی تھی۔

''آپ نے وجہ پوچھی تھی ناں، وہی بتائی ہے۔''

اس نے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''پلوشہ کون ہے؟''

میں وارفتگی سے بولا۔ ''میرے لیے تو میرا سب کچھ ہے۔ اور لوگوں کے نزدیک میری بیوی ہے۔''

''آپ شادی شدہ ہیں۔'' قدم روکتے ہوئے اس نے حیرانی ظاہر کی۔

میں اطمینان سے بولا۔ ''ایک نہیں، دو دو۔''

اس کی حیرانی سوا ہوئی۔ ''ہم سمجھے نہیں۔''

میں متبسم ہوا۔ ''میری دو بیویاں ہیں۔''

قدم بڑھاتے ہوئے وہ طعنہ زن ہوئی۔ ''ہمیں نہیں لگتا ایسا بھونڈا مذاق کرنا کمال ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کا غصہ کرنا میرے لیے حیران کن ہے۔''

''رہنے دیں۔'' کہتے ہوئے اس نے اضطراری انداز میں قدموں کی رفتار تیز کی۔

لمبے ڈگ رکھتا ہوا میں اس کے پہلو میں چلتا رہا۔ آخری دو تین سو قدم کا فاصلہ ہم نے خاموشی سے طے کیا تھا۔ اس کی خاموشی میرے لیے حیران کن تھی۔

وشواس سنگھ گرم چادر لپیٹے حویلی سے باہر منتظر نظر آیا۔ ہمارے قریب پہنچتے پر اس نے بازو پھیلا دیے تھے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد ہم اس کے ہمراہ اندر گھس گئے۔ پریتو بھابی بھی جاگتی نظر آئیں۔

چند منٹ کی گفتگو کے بعد ہم آرام کو لیٹ گئے۔ پرما، پریتو بھابی کے ساتھ لیٹ گئی تھی۔ میں اور وشواس سنگھ دوسری خواب گاہ میں سو گئے تھے۔

صبح کی نماز پڑھ کر میں پھر بستر میں ہو گیا تھا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو وشواس سنگھ غائب نظر آیا۔ تازہ دم ہو کر میں باہر آیا۔ تینوں ڈرائینگ روم میں بیٹھے تھے۔ پرما اصل حلیے میں تھی۔ یقیناً زیادہ دیر بدصورت شکل اس سے برداشت نہیں ہوئی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی وشواس سنگھ بولا۔ ''تم بھی تھوڑے سے کالک اتار لیتے۔''

''رشتا دیکھنے نہیں جا رہا۔'' اطمینان بھرے انداز میں کہتے ہوئے میں نے نشست سنبھالی۔

پریتو بھابی نے پوچھا۔ ''ویر جی، ناشتا یہیں لے آؤں۔''

میں نے کہا۔ ''اگر آپ لوگوں نے کر لیا ہے تو میرا یہیں لے آئیں۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ گئی۔

میں وشواس سنگھ سے خیریت پوچھنے لگا۔ اس نے ایجنسی والوں سے ملاقات کا اجمالی حال کہہ سنایا۔ اس کے خلاف میری مدد کرنے کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود تھا نہ مجھ سے تعلق کی مناسب وجہ۔ دھرمو دادا کو بھی شامل تفتیش کیا گیا تھا۔ مگر ان کی راجپوت دادا سے دشمنی اور پہلی بار غلط فہمی کی بنا پر مجھ سے رابطہ ہونے کے علاوہ کوئی غلطی ثابت نہیں ہوئی تھی۔ را کے بڑے زیر زمین حلقوں سے بگاڑ پیدا کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ اور دھرمو دادا اور وشواس سنگھ کے تعاون کی وجہ سے ایک دو دن کی میزبانی کے بعد انھیں جانے کی اجازت دے دی تھی۔ ویسے بھی میں نے ان سے براہ راست کوئی مدد حاصل نہیں کی تھی، تاکہ وہ پھنس نہ جائیں۔

اس کے بعد میں انڈیا سے خروج کے مسئلہ پر آیا۔ ''ہمارے نکلنے کے بارے کیا سوچا ہے۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''پہنچے ہو نہیں اور نکلنے کی پہلے پڑ گئی۔''

میں طنزیہ انداز میں بولا۔ ''سردار جی! تہانوں پریتو بھابی میسر ہے، تے تہاڈا کسی ہوردی تکلیف ول دھیان نہیں جا رہیا۔''

''یار! بیویاں تے، ہوندیاں ہی نراسر دردنیں۔'' بیویاں تک بآواز بلند سے کہتے ہوئے اس نے آخری فقرہ سرگوشی میں کہا تھا۔

پرما کھل کھلا کر ہنس دی تھی۔

میں مسکنت سے بولا۔ ''مگر مصیبت تو یہ ہے کہ اس سر درد کے بغیر چین و آرام بھی تو نہیں ملتا۔ یقین مانو، پلوشے سے جھگڑے کے بعد یہاں آنا پڑا۔ اور کئی مہینوں سے اس سے رابطہ بھی نہیں ہو پایا۔ نہ جانے کس حال میں ہو گی۔''

پرما ایک دم اٹھ کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

وشواس سنگھ نے کہا۔ ''بہتر نہیں ہوگا کہ تھوڑا عرصہ مزید یہیں گزار کر معاملے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اب بہترین موقع ہے۔ کیوں کہ میں دشمنوں کو دانہ ڈال آیا ہوں۔''

''وضاحت کرنا پسند کرو گے۔'' وشواس سنگھ نے معاملہ جاننا چاہا۔ اور میں نے پرما کے اے ٹی ایم کارڈ کے استعمال کا بتا دیا۔ یوں ہمارا سورت میں ہونا ظاہر ہو رہا تھا۔

اس نے پرجوش انداز میں کہا۔ ''اگر ایک کام اور کر لیں تو انھیں مزید بھٹکایا جا سکتا ہے۔''

پریتو بھابی نے میرے سامنے ناشتا لا کر رکھا، مگر میں پُراشتیاق نظروں سے وشواس سنگھ کو گھور رہا تھا۔

''سورت سے اسمگلروں کی لانچیں وغیرہ غیر قانونی طور پر پاکستان جاتی رہتی ہیں۔ اگر ہم یہ افواہ پھیلا دیں کہ ایک نوجوان جوڑا اس راستے پاکستان نکل گیا ہے تو یقیناً وہ تمھاری امید کرنا چھوڑ دیں گے۔ کیسا ہے؟'' تفصیل بتاتے ہوئے اس نے تصدیق چاہی۔

میں بے ساختہ بولا۔ ''تمھارے سکھ ہونے پر مشتبہ ہونے لگا ہوں۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''یار میں جانتا ہوں تم کتنے پانی میں ہو، اتنے عقل مند ہوتے تو دو شادیاں نہ کرتے۔''

اور میں قہقہہ لگاتے ہوئے ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

—●—

اگلے دن ہم ساحل سمندر پر گئے۔ ایک لانچ پر پرما کی دو تین ایسی تصاویر نکالیں جیسے اس کی بے خبری میں کھینچی گئی ہوں۔ تصاویر میں لانچ یا ساحل کے ظاہر نہ ہونے کا دھیان رکھا گیا تھا۔

اسی دن وشواس سنگھ کا ایک خاص آدمی تصویروں والے موبائل فون کے ہمراہ سورت روانہ ہو گیا۔ اس کا کام یہ افواہ پھیلانا تھا کہ پرما اور میں کسی نامعلوم لانچ پر بیٹھ کر پاکستان نکل گئے تھے۔ دو دن کے اندر اس نے اپنا کام بہ احسن خوبی کر دیا تھا۔ ہم پیشہ افراد میں رقابت کا مادہ وافر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ اس نے بھی دو مخالف گروہوں کی دشمن کا فائدہ اٹھا کر ایک گروہ کو دوسرے پر الزام عائد کرنے پر تیار کیا۔ یوں پرما کی تصویر اور اس کے وہاں سے بھاگنے کی افواہ بڑی آسانی سے دشمنوں کے کانوں تک پہنچا دی گئی۔

ہمارا سورت کے مضافات میں غائب ہونا، پرما کے اے ٹی ایم کا سورت میں استعمال ہونا اور پھر ہمارا بحری راستے سے پاکستان نکل بھاگنے کی افواہ اڑنا ایسے تسلسل سے وقوع پذیر ہوا کہ دشمنوں کو ہمارے نکل بھاگنے کا یقین ہو گیا۔ اگلے دن میں نے پرما سے وگنیش شکلا کا ای میل ایڈریس پوچھ کر ایک دھمکی آمیز پیغام بھی بھیج دیا۔

''وگنیش شکلا! یقیناً تمھیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ میری انڈیا آمد کا مقصد فقط پرما انصاری کا حصول تھا۔ تمھارے باپ نے اپنے کالے کرتوتوں کا بھگتان کاٹا ہے۔ اس نے لورا براؤن کے ساتھ غلط کیا جس کا بدلہ لورا نے لے لیا۔ میں لورا کے ساتھ فقط پرما کو اغواء کرنے کی وجہ سے ملا ہوا تھا۔ باقی تمھیں اس لیے زندہ چھوڑ دیا کہ تمھاری وہ بھانجی آڑے آ گئی جسے تم نے قتل و بے عصمت کرانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر اللہ پاک نے اسے بچا لیا۔ اب مجھے لگتا ہے ہمیں اپنی اپنی راہ ہو لینا چاہیے۔ اور بے فکر رہو پرما انصاری کو رندھیر شکلا کی حرام کی دولت و جائیداد سے کوئی غرض ہے نا مطلب۔ تمھیں بھی اب پرما کو بھلا کر اپنے جرم کی مملکت کی طرف دھیان دینا چاہیے۔ ایک اور بات ذہن نشین کر لو، اگر پرما انصاری پر پاکستان میں کوئی حملہ کروانے کی کوشش کی تو یاد رکھنا اپنے سر کو زیادہ عرصے تک سنائپر کی گولی سے بچا نہیں پاؤ گے۔ میں دعوے نہیں کیا کرتا، نہ لچر و لغو دھمکیاں دینے کا شوق ہے۔ میں وہی کہتا ہوں جو کر سکتا ہوں اور تمھیں پتا ہونا چاہیے میں نے

اپنی گولیوں کو اتنا سدھایا ہوا کہ بھٹکنے کی اہلیت کھو چکی ہیں۔ جدھر چاہتا ہوں وہیں پہنچتی ہیں۔ اور یاد رکھنا دوسروں کے پیاروں کو چھیننے والوں کو اپنے پیاروں سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ باقی تمھارا منوج جوشی والے روپ کا راز بھی میں نے مشتہر نہیں کیا۔ اگر میری دوبارہ انڈیا آمد کی وجہ میں تمھارا ہاتھ ہوا تو وہ ہاتھ رہے گا، نہ ہاتھ والا اور نہ اس پر کوئی رونے والا۔ کم کہے کو زیادہ جانو، خیر اندیش ایس ایس۔''

پیغام کا جواب تو کوئی نہ ملا، نہ مجھے جواب کی ضرورت تھی۔ میرا مقصد ایک تو وگنیش شکلا کو اس کی دولت و جائیداد کے محفوظ ہونے کی تسلی دینا تھی، دوسرا اسے یہ باور کرنا تھا کہ میں کامیابی سے انڈیا سے نکل چکا ہوں۔

اس مقصد کو وشواس کے حکم پر اس کے آدمی ایک انگریز جوڑے کو اغواء کر کے اس کے خفیہ ٹھکانے پر لے آئے۔ لڑکی گوری تھی جبکہ اس کا ساتھی سیاہ فام تھا۔ اس کے بعد وشواس سنگھ نے نہایت رازداری سے ہمارے شناختی کاغذات بنانے شروع کر دیئے۔ میک اپ کے ماہر کو بلوا کر پرما کا حلیہ انگریز لڑکی کا سا بنایا گیا۔ بالوں کو سفید ڈائی کیا گیا۔ اس کی سرخ و سفید رنگت کو مزید سفید کیا گیا۔ آنکھوں کو سبز رنگ کے لینز سے بدلا گیا۔ اور بھی کافی ساری تبدیلیوں کے ساتھ وہ برطانیہ کی شہری لگنے لگی تھی۔ آنکھوں پر بڑے گول شیشوں کا چشمہ لگا کر اس کی شکل بالکل تبدیل ہو گئی تھی۔ مجھے سیاہ فام کی شکل دی گئی۔ اس کے بعد ہماری تصاویر کھینچ کر مہارت سے پاسپورٹ پر چپکا دی گئیں۔

آخر ایک دن پرما اور میں ممبئی کے چترپتی انٹرنیشنل ائیر پورٹ سے اڑان بھر رہے تھے۔ ہماری منزل تھائی لینڈ کا شہر بنکاک تھی۔ جہاز کے اڑنے تک میرے دل میں پہچان لیے جانے کا اندیشہ موجود رہا۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس جہنم سے بہ خیریت نکل رہا ہوں۔ بنکاک انٹرنیشنل ائرپورٹ سے صحیح سلامت باہر آتے ہوئے میرے قدم خوشی سے زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ آگے کی منازل آسان تھیں۔ اس کے باوجود میں نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ جی چاہتا تھا ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پلوشہ کے پاس پہنچ جاؤں۔ رات کو اس سے بات کرنے کو دل مچلا، مگر پھر سوچا ایک دم اسے حیران کرنے میں زیادہ مزا تھا۔ پاکستان واپسی کی مزید تفصیلات قابلِ ذکر واقعے سے خالی ہیں اس لیے صرف نظر کر رہا ہوں۔ البتہ پرما، وشواس سنگھ کی حویلی میں پہنچنے کے بعد سے ذرا اکھڑی اکھڑی لگ رہی تھی۔ محسوس کرنے کے باوجود میں نے اس سے استفسار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا، کہ سیانے کہتے ہیں جس گاؤں نہ جانا ہو اس کا پتا دریافت کرنا بے وقوفی ہوتی ہے۔

تیسرے دن کراچی ائرپورٹ پر اترتے ہوئے دل خوشی سے بھر گیا تھا۔ سچ کہتے ہیں وطن کی ہواؤں کا نعم البدل جنت الفردوس کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ پاکستان کیا ہے اس کی قدر تب آتی ہے جب ہم پاکستان سے باہر ہوتے ہیں۔ دل کی وہ حالت تھی کہ گویا.....

رہیں گمنام تو بس تجھ سے ہی منسوب رہیں
جانے جائیں تو تیرے نام سے جانے جائیں

ائرپورٹ سے باہر نکل کر سب سے پہلے میں نے مارکیٹ جا کر اپنے اور پرما کے لیے نئے کپڑے خریدے۔ اور ایک ہوٹل میں کمرا لے کر میک اپ کو خیرباد کہا اور اصل حلیہ اپنا لیا۔ اب پہچانے جانے کا خوف و ڈر ہمارے دلوں سے رخصت ہو گیا تھا۔ نئے کپڑے پہن کر پرتکلف کھانا کھایا اور ہوٹل سے نکل آئے۔

بس اڈے پہنچے تو راولپنڈی جانے والی بس جانے کو تیار تھی۔ ٹکٹ لے کر اندر گھس گئے۔

پرما کراچی، راولپنڈی، اسلام آباد، لاہور، فیصل آباد، پشاور، کوئٹہ وغیرہ کے بارے سرسری جانتی تھی۔ میں نے بھی راستے میں اسے پاکستان کے محل وقوع کے بارے اچھی خاصی معلومات دی تھیں۔ اس نے میرے علاقے کے بارے بھی

پوچھا تھا۔اور میں نے اسے تلہ گنگ کے بارے بھی تفصیل سے بتادیا تھا۔

بس چلنے کے تھوڑی دیر بعد ہی ڈرائیور نے ایل ای ڈی پر انڈین فلم چلادی تھی۔لیکن مجھے فلم دیکھنے کے بجائے تصور کی آنکھوں سے پلوشہ کا ممکنہ ردعمل دیکھنے میں زیادہ دلچسپی تھی۔البتہ پرما بولنے پر اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

''اگر ہم پہلے آپ کے گھر جانا چاہیں۔''

میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔''مضائقہ تو کوئی نہیں البتہ وجہ میری سمجھ سے باہر ہے۔''

اس نے دھماکا کیا۔''ہم پلوشہ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''اپنے گھر جا کر ہماری دعوت کرنا،دونوں بیویوں کے ہمراہ پہنچ جاؤں گا۔''میں ہنسا۔''بلکہ آپ نے مجھے کوئی خصوصی انعام دینے کا بھی وعدہ کیا تھا۔''

''تب ہمیں معلوم نہ تھا کہ آپ شادی شدہ ہیں۔''دھیرے سے کہتے ہوئے وہ کھڑکی سے باہر دوڑتے مناظر کو گھورنے لگی۔

میں متعجب ہوا۔''کیوں شادی شدہ بندہ انعام کا حق دار نہیں ہوتا۔''

شیشے سے نظریں ہٹا کر اس نے مجھے گھورا۔''سچ میں پلوشہ نام کی کوئی ایسی لڑکی ہے جسے آپ بہت محبت کرتے ہیں ''

میں نے الجھن امیز لہجے میں پوچھا۔''ہاں پلوشہ کا وجود ایسا ہی یقینی ہے جیسے میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔البتہ آپ کے استفسار نے مجھے ششدر کر دیا ہے۔اور میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ مجھے ایسا جھوٹ بولنے کی ضرورت کیوں پیش آئے گی۔''

''ہمیں صرف یہ جاننا ہے کہ اگر ہمارے درمیان طبقاتی فرق موجود نہ ہوتا تب بھی پلوشہ نام کی کسی لڑکی کا ذکر کرنے کی ضرورت پڑتی۔''

میں متبسم ہوا۔''ہم پہلے میرے گھر جائیں گے۔اور انصاری صاحب کو بھی وہیں بلوائیں گے۔تاکہ آگے آپ کو خود ہی لے جائے۔''

لمحہ بھر مجھے گھورنے کے بعد اس نے گہرا سانس لیا اور سیٹ کی پشت پر سر ٹیک دیا۔

ہم اگلے دن دوپہر ڈھلے تلہ گنگ اترے۔گھر تک میں نے ٹیکسی کروالی تھی۔گھر کے دروازے پر اتر کر میں نے سرشاری بھرا گہرا سانس کھینچا،سفری بیگ کو کندھے پر درست کر کے دروازے کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔تمام صحن ہی میں بیٹھے تھے۔عبداللہ،امی جان کی گود میں تھا۔پرما بغیر چھت کے باورچی خانے میں گھسی ہانڈی بنا رہی تھی،جبکہ عدیل اور پلوشے ان سے ذرا ہٹ کر بیٹھے تھے۔وہ عدیل کو پڑھا رہی تھی۔

دروازے کی کھڑکھڑاہٹ سنتے ہی تمام اس طرف متوجہ ہوئے۔یوں بغیر دستک کوئی اپنا ہی گھر میں داخل ہونے کی جرأت کر سکتا ہے۔مجھ پر نظر پڑتے ہی پہلا نعرہ عدیل نے بلند کیا تھا۔

''لالا جان آگئے۔''وہ چارپائی سے اتر کر بھاگ پڑا تھا۔میری بے تاب نظریں تمام سے لاتعلق پلوشے کی طرف متوجہ تھیں۔وہ سرعت سے اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی تھی۔

باقیوں نے اس پر دھیان دیئے بغیر مجھے گھیر لیا تھا۔پھوپھو جان اور امی جان سے پیار لے کر میں ابو جان کی شفقت بھری بانہوں میں سما گیا تھا۔روما ہونٹوں پر خوب صورت مسکراہٹ بکھیرے کھڑی تھی۔اس نے مصافحہ کرنے پر اکتفا کیا تھا۔

جذباتی ملاپ کے بعد انھوں نے پرما کو گھیر لیا تھا۔ میں پرما کے بارے سرسری تفصیل بتانے لگا، البتہ میرے دل و دماغ پلوشہ کے رویے کو سلجھا رہے تھے۔ اور نگاہیں بار بار خواب گاہ کے دروازے کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ اس کا یوں بھاگ جانا نجانے ناراضی پر مبنی تھا یا کوئی اور وجہ تھی۔ مجھے تو امید تھی کہ اس کی خفگی اب تک ختم ہو چکی ہوگی۔

''امی جان، پھوپھو جان اور ابو جان، پرما کا حال احوال پوچھنے لگے۔ تبھی امی جان کی گود سے اٹھا کر روما نے عبداللہ مجھے پکڑایا اور میرے کان کے ساتھ منہ لگا کر شوخ لہجے میں بولی۔ ''آپ کی واپسی کے لیے نوافل کی منت مانی تھی محترمہ نے وہی پڑھنے بھاگی ہے۔''

باقیوں کو پرما کے ساتھ مصروف دیکھ کر میں نے عبداللہ کے گال چومتے ہوئے روما سے پوچھا۔ ''مجھے یاد کرتی تھی۔''

''صرف ایک مہینا اکڑ دکھائی تھی محترمہ نے، اس کے بعد پچھتاوے کی ابتداء ہوئی، پھر بھاں بھاں شروع ہوگئی، پھر مناجاتوں کا آغاز ہوا، پھر منتوں کا نمبر آیا، پھر نوافل کا زور ہوا اور آج کل صدقے خیرات کی باری ہے۔ اور اللہ پاک کا شکر کہ اب جھوٹا اجنبی تشریف لے آیا ہے۔'' آخری الفاظ اس نے ناز بھرے انداز میں کہے تھے۔

''اس سے مل لوں۔'' بے صبر دل کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے میں نے روما سے مشورہ مانگا۔

وہ ہنسی۔ ''میں تو مشورہ دوں گی اب روٹھنے کی باری آپ کی ہے۔''

میں چارپائی چھوڑ کر تھوڑا ایک جانب ہوا اور دبے لہجے میں بولا۔ ''پھر جاؤ اسے بتا دو کہ میں تیسری بھی لے آیا ہوں ''۔

روما نے قہقہہ لگایا۔ ''جھوٹے اجنبی کیوں بے چاری مہمان کا ڈراما بنواتے ہو۔'' میں نے بھی بے ساختہ قہقہہ بلند کیا۔

اسی وقت پرما نے گہری نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور پھر پھوپھو کی طرف متوجہ ہوگئی۔

میں نے دل کے واویلے پر ہتھیار پھینکتے ہوئے کہا۔ ''یار! سچ کہوں تو غلطی میری تھی۔ اس لیے میرا ہی جانا بنتا ہے۔''

''ٹھیک ہے جائیں۔'' عبداللہ کو لیتے ہوئے اس نے خوش دلی سے سر ہلایا۔ وہ صرف چہرے ہی کی نہیں دل کی بھی بہت خوب صورت تھی۔ کشمیر جنت نظیر کی باسی وسیع ظرف کی مالک تھی۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ پلوشے کی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے کے پٹ بند تھے۔ دماغ میں اندیشہ کھٹکا کہ شاید دروازہ اندر سے کنڈی ہو مگر ہلکا سا دھکا دینے پر پٹ کھل گیا تھا۔ میں نے فوراً اندر گھس کر دروازہ بند کر دیا۔

وہ مصلے پر بیٹھی تھی۔ دونوں ہاتھ دعا کو بلند تھے۔ جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا جیسے رو رہی ہو۔

میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا قریب پہنچا اور پھر بے تکلف زمین پر لیٹ کر اس کی گود میں سر رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، موہنا چہرہ دوپٹے میں یوں دمک رہا تھا جیسے چودھویں کا چاند بدلیوں میں گھرا ہو۔ ہونٹ مسلسل ہل کر باور کرا رہے تھے کہ وہ خلوص دل سے اپنے معبود کی بارگاہ میں شکر گزاری کے کلمات ادا کر رہی ہے۔ میں اپنی آنکھوں کو عیاشی کروانے لگا۔ اس کی گود میں سر رکھنا وہ تعبیر تھی جس کے سپنوں نے انڈیا کے صعوبت خانے میں بھی پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔

پھر اس کے دعا کو اٹھے ہاتھ چہرے پر پھرتے ہوئے نیچے آئے۔ میرے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے وہ کراہنے کے انداز میں بولی۔ ''راجو.....'' اور اس کی سسکیاں بندھ گئیں۔

''پلیز معاف کر دو۔'' اس کے ہاتھوں کو لبوں سے لگاتے ہوئے میں ملتجی ہوا۔

وہ کراہتے ہوئے بولی۔ ''اتنی دیر بھی لگائی جاتی ہے۔''

''کیسے لوٹتا، تم نے دھتکار جو دیا تھا۔''

''بھول گئے کیا کہا تھا.....

میں اگر کہہ بھی دوں چلے جاؤ
تم میرا اعتبار مت کرنا
''اور طلاق جو مانگی تھی۔''
''تو جو بکواس کروں گی یقین کرلیں گے۔''
میں نے بے بسی بھرے لہجے میں حقیقت اگلی۔ ''جتنا مشکل اور دشوار یہ مشن لگا کبھی کوئی مشن نہ لگا۔''
''جانتی ہوں۔'' گلوگیر لہجے میں کہتے ہوئے اس کے ہونٹ مجھے ماضی کے خوشگوار اوقات کی یاد دلانے لگے۔
اس کی وارفتگی کا جواب دیتے ہوئے میں نے چاہت سے پوچھا۔ ''کیا مجھے معافی مل گئی ہے۔''
وہ محجوب ہوئی۔ ''تنگ نہ کیا کریں۔ جانے کب سے جان سولی پر اٹکی تھی۔ اور سچ پوچھیں تو میں نے سردار بھائی کی منت کی تھی کہ مجھے انڈیا بھیج دے تاکہ اپنے راجو کی مدد کو پہنچ سکوں، مگر وہ مانے۔''
میں اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''اللہ کا شکر ہے سردار نے کوئی کام تو عقل کا کیا ہے۔ ورنہ بعید نہ تھا کہ خان صاحب بہن کو ساتھ لے کر انڈیا پہنچ جاتے۔''
اس نے منہ بسورا۔ ''آپ کو میری تکلیف کا اندازہ نہیں ہے نا اس لیے ایسا کہہ رہے ہیں.....''
میں برجستہ بولا۔ ''اپنی تکلیف کا تو ہے نا۔''
اچانک دروازے پر دستک ہوئی، میں نے سرعت سے اس کی گود سے سر اٹھایا اور اچھل کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''آجائیں۔''
دروازے کو دھکیلتے ہوئے روما، پرما کے ہمراہ اندر آئی۔
پلوشہ کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پرما مجھے مخاطب ہوئی۔ ''پاپا کو کال کردی ہے۔''
''کرلیتا ہوں۔'' اسے کہہ کر میں پلوشے کی طرف متوجہ ہوا جو جائے نماز کو تہہ کر کے عجیب سی نظروں سے پرما کو گھورنے لگی تھی۔ ''پلوشے ان سے ملو، راج کماری پرما انصاری۔ انھی کو انڈیا سے لانے گیا تھا۔''
''کیسی ہیں آپ؟'' پلوشے نے زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے اس سے مصافحہ کیا۔
''ہم ٹھیک ہیں۔'' اسے سرد مہری سے جواب دے کر وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ ''راجا! ہم یہاں نہیں رک سکتے آپ پاپا کو کال کریں یا پھر چلتے ہیں۔''
''راجو جلدی کال کریں۔'' مجھے تنبیہی نظروں سے گھورتے ہوئے پلوشہ باہر نکل گئی۔
میں نے روما کو جھڑکا۔ ''مہمان سے چائے پانی ہی کا پوچھ لیتے ہیں۔''
روما شوخی سے بولی۔ ''مہمان نے چائے پی لی ہے جناب، اب آپ کے فیصلے کا انتظار ہے کہ راجکماری کے پاپا کو یہاں بلوائیں گے یا انھیں گھر پہنچائیں گے۔ کیوں کہ مہمان آپ کے غریب خانے پر رکنے پر آمادہ نہیں ہے۔''
میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ابو جان سے موبائل فون لے آؤ۔'' کیوں کہ اب پلوشہ مجھے گھر سے جانے کی اجازت کبھی نہ دیتی۔ نہ مجھے ہی یہ گوارا تھا۔
روما۔ ''جی اچھا۔'' کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔
''بیٹھیں۔'' میں نے پرما کو بیٹھنے کی دعوت دی۔
بے نیازی ظاہر کرتے ہوئے اس نے کرسی سنبھالی اور خواب گاہ کا جائزہ لینے لگی۔ یقیناً وہ سادہ سی خواب گاہ، اس کے معیار سے بہت نیچے تھی۔ مگر مجھ سے کوئی پوچھتا تو اس کا نعم البدل کم از کم دنیا میں نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ میری پلوشے کی

خواب گاہ تھی۔ وہاں کی ہر شیئے میں پلوشے کے وجود کی مہک رچی بسی تھی۔ وہ دیواریں پلوشوں کے قہقہوں کی آمین تھیں، وہ بیڈ اور فرنیچر پلوشے کے ہمراہی تھے، پورے ماحول پر اس کی گنگناہٹ قابض تھی، پھر اس سے دنیا کے ساز و سامان سے آراستہ کوئی خواب گاہ بڑھ کیسے سکتی تھی۔ البتہ یہ بات میں پرما کو نہیں سمجھا سکتا تھا۔

پرما کو بے رخی پر آمادہ پا کر میں نے بھی مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میری نظریں تپائی پر رکھی اپنی فریم کی ہوئی تصویر پر پڑیں، جو پہلے وہاں نہیں ہوتی تھی۔

روما موبائل فون لے کر لوٹی۔ میں نے یادداشت کھنگال کر انصاری صاحب کا نمبر برآمد کیا اور مطلوبہ بٹن دبا کر موبائل فون کان سے لگا لیا۔

یقیناً انصاری صاحب کے لیے وہ انجان نمبر تھا تبھی کال وصول نہیں کر رہے تھے۔ میں نے بھی ہمت نہ ہاری، تیسری کال انھوں وصل کی۔

''اسلام علیکم سر!''

''وعلیکم اسلام، جی؟'' یقیناً انھوں نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔

میں نے تعارف کرایا۔ ''راجا ذیشان حیدر بات کر رہا ہوں سر۔''

''کک..... کیا۔'' وہ حیران رہ گئے تھے۔ ''تم سچ میں.....''

میں قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''جی سر، میں سچ میں وہی راجا ہوں جو انصاری صاحب کی پری کو لینے گیا تھا۔ اور اب راجکماری غریب خانے پر موجود ہے۔ اور اس کا حکم ہے کہ یہاں سے آگے وہ اپنے پاپا کے ہمراہ جائے گی۔ تبھی آپ کو دعوت دینے کی ہمت جتا رہا ہوں کہ شام کا کھانا غریب خانے پر تناول فرمائیں۔''

وہ پرجوش لہجے میں بولے۔ ''مم..... میں ابھی ابھی آ رہا ہوں..... بس کمرے سے نکل آیا ہوں، اپنا پتا بتاؤ..... اور میرے ڈرائیور کا کھانا بھی تیار کرا لینا کیوں کہ شاید میں گاڑی صحیح طریقے سے نہ چلا پاؤں۔''

اور میں مسکراتے ہوئے انھیں اپنا پتا لکھوانے لگا۔

—●—

ہم بہ مشکل شام کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تھے کہ دروازے پر ہارن کی آواز سنائی دی۔ میں دروازے پر پہنچا۔ انصاری صاحب پاؤں میں گھریلو استعمال کے چپل اور شکن زدہ لباس میں کار سے برآمد ہوئے۔ نہ سر کے بال کنگھی اور نہ رکھ رکھاؤ والی حالت۔ پرما کی آمد نے انھیں حواس باختہ کر دیا تھا۔

''کہاں ہے وہ۔'' مجھ سے مصافحہ یا معانقہ کرنا انھیں یاد ہی نہیں رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے براہ راست پرما کے بارے استفسار کیا تھا۔

''آئیں سر۔'' ان کی حالت کے پیش نظر مجھے بھی کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ پرما اب تک پلوشے کے کمرے ہی میں بیٹھی تھی۔ انصاری صاحب بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہوئے، انھیں دستک دینے اور اجازت مانگنے کے اخلاقیات بھولے ہوئے تھے۔

پرما دروازے کی جانب رخ کیے بیٹھی تھی۔ انصاری صاحب کو دیکھتے ہی بے ساختہ کھڑی ہوئی اور۔ ''پاپا.....'' کا نعرہ لگاتے ہوئے آگے بڑھی۔

''پری! میری جان، میری آنکھوں کی ٹھنڈک، میری روح کا سکون.....'' رنگھے لہجے میں کہتے ہوئے انصاری صاحب نے اسے بانہوں کے گھیرے میں لے لیا تھا۔

میں نے روما کو باہر آنے کا اشارہ کیا اور ہم انھیں اکیلا چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ برسوں کے بچھڑے باپ بیٹی سخت جذباتی ہو رہے تھے اور ایسی حالت میں انھیں تنہائی مہیا کرنا ضروری تھا۔

ابو جان ڈرائیور کو بیٹھک میں لے جا کر مہمان نوازی کے تقاضے پورے کر رہے تھے۔

میں نے روما کو کھانے وغیرہ لگانے کا کہا اور خود کمرے کے باہر ہی ٹھہر گیا۔

انصاری صاحب آدھے گھنٹے بعد باہر نکلے تھے۔ پرما ان کے ہمراہ تھی۔ اس مرتبہ وہ جھپٹ کر مجھے ملے۔ ''شکریہ تو خیر نہیں کہوں گا اور بالکل نہیں کہوں گا۔'' مجھے بانہوں کے گھیرے میں بھینچتے ہوئے وہ وارفتگی سے بولے تھے۔

میں مسکرایا۔ ''سر ضرورت بھی نہیں ہے شکریہ کی، بس پری وش خفا ہے اس سے معافی دلوا دینا کافی رہے گا۔''

وہ کھل کھلا کر ہنسے۔ ''ارے واہ..... میں سوچ رہا تھا کہ اپنی گڑیا کا نام کیا رکھوں گا پری وش تو بالکل جچتا ہے میری پری کے ساتھ۔''

پرما جلدی سے بولی۔ ''پاپا، ہمیں اس کا رکھا ہوا نام نہیں قبول ہے۔''

انصاری صاحب نے پوچھا۔ ''پاپا کی جان! اس جوان نے کیا بدتمیزی کی تاکہ ابھی ابھی سزا سنائیں۔''

پرما نے منہ بسورا۔ ''خود اسی سے پوچھ لیں پاپا۔''

''تو ٹھیک ہے، مسٹر ذیشان حیدر تم دو مہینوں کے لیے نوکری سے معطل کیے جاتے ہو۔ یہ عرصہ تم گھر میں نظر بند رہو گے۔ باقاعدہ احکام تمھیں یونٹ کمانڈنگ آفیسر سنا دے گا۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' ایڑیاں ملا کر میں نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

پلوشہ کسی کونے سے برآمد ہوئی اور گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''سر! بہتر ہوگا اس کا پاکا کورٹ مارشل کریں۔''

پلوشہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے انصاری صاحب نے اندازہ ظاہر کیا۔ ''یقیناً میری بیٹی! ذیشان کی دلھن ہوگی۔''

پلوشہ سعادت مندی سے بولی۔ ''جی چچا جان۔ اور میں مذاق نہیں کر رہی بیچ میں درخواست کر رہی ہوں۔''

انھوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بیٹی! یہ ایک ریٹائرڈ بریگیڈئر کے اختیارات سے باہر ہے۔''

تھوڑی دیر بعد ہم دسترخواں پر بیٹھے تھے۔ پلوشہ نے پرما کو اپنے ساتھ چلنے کا کہا، کیوں کہ مہمانوں کی آمد پر ہمارے ہاں عورتیں اور مرد علیحدہ علیحدہ کھانا کھاتے ہیں۔ مگر نہ تو پرما جانے پر تیار ہوئی اور نہ انصاری صاحب اسے علیحدہ بھیجنے پر راضی تھے۔ کھانے کے دوران ہی میں نے انھیں ڈینو کی موت کے بارے آگاہ کیا۔ وہ بس گہرا سانس لے کر رہ گئے تھے۔

کھانے کے بعد انصاری صاحب نے رخصت لینے سے پہلے میرے ماتھے کو چوم کر محبت سے بولے۔ ''دو ماہ چھٹی گزارو، میں وسیم صاحب (ہمارے کمانڈنگ آفیسر) کو بتا دوں گا۔ اور اگلے ہفتے سارے گھر والوں کی میرے ہاں دعوت ہے۔ پری وش کی واپسی کی خوشی میں ایک بڑی تقریب کا اہتمام کروں گا۔''

میں ممنونیت سے بولا۔ ''شکریہ سر۔''

''یہ تمھارا انعام نہیں ہے۔ اس کا اعلان بعد میں کروں گا۔''

پرما معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''چھوڑیں پاپا! یہ بڑے انعام کا حق دار نہیں ہے۔''

انصاری صاحب کھل کھلا کر ہنس پڑے تھے۔ انھیں رخصت کر کے ہم گھر میں آ گئے۔

—●—

اگلے دن بڑی مشکل سے پلوشہ سے اجازت لے کر یونٹ پہنچ گیا۔ تکمیل مشن اور ڈینو کی شہادت کے بارے تفصیلی رپورٹ جمع کرائی، کمانڈنگ آفیسر سے ملاقات کی اور باقی بچھڑے دوستوں سے گپ شپ ہوئی۔ بلاشبہ یونٹ بھی گھر کی طرح ہی ہوتی ہے۔ اور ایک فوجی کا تو زیادہ عرصہ گھر کے بجائے یونٹ میں گزرتا ہے۔ تصور صاحب شفقت سے ملے، اب وہ لیفٹیننٹ کا اعزازی ریک لگائے ہوئے تھے۔ انھوں نے کریدکرید کر مشن کی تفصیلات پوچھی تھیں۔ دن کیسے گزرا معلوم ہی نہ ہوا۔ بڑی مشکل سے بعد از نماز عشاء جان چھوٹی اور میں نے کار گھر کی طرف بھگا دی۔ حسب توقع پلوشہ کی آنکھیں ماتھے پر لگی تھیں۔ بقیہ شب اسے مناتے ہی گزری تھی۔

گھر واپسی پر مشن کے سخت و مشکل دن ایک تلخ سپنے کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتے تھے۔ کہاں زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا شب و روز اور کہاں رومانو پلوشہ کی دل بہار معیت۔ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چل رہا تھا۔

انصاری صاحب کے ہاں تقریب میں میں اکیلا ہی گیا تھا۔ دوران تقریب پری وش نے مجھے نظر انداز کیے رکھا۔ یوں بھی راجکماری کہلانے والی، اتنے سینئر آفیسر کی بیٹی کا ایک سپاہی سے کیا واسطہ۔ البتہ انصاری صاحب نے مجھے مکمل پروٹوکول دیا تھا۔ یوں جیسے میں کوئی بہت اہم شخصیت ہوں۔ ہر مہمان سے میرا خصوصی تعارف کرایا اور مجھے یوں ساتھ لپٹائے پھرتے رہے گویا ان کا بیٹا ہوں۔ تقریب کے اختتام پر انھوں نے مجھے بااصرار شب بسری کو روک لیا تھا۔ رات گئے تک ہم گپیں ہانکتے رہے۔ میں نے سارے واقعات تفصیل سے بتائے۔ گو پری بھی انھیں بتا چکی تھی، مگر وہ پورے واقعات سے واقف نہیں تھی۔

ہماری گپوں کے دوران پری بھی پاس بیٹھی رہی۔ البتہ وہ مجھے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ نہ ہماری گفتگو میں دخل ہوئی۔ بس موبائل فون کی سکرین کی طرف متوجہ ہو کر انگلیاں چلاتی رہی۔

انصاری صاحب نے خطیر رقم کا چیک مجھے پکڑایا تھا اور میرے انکار پر سخت ناراضی ظاہر کی مجبوراً مجھے چیک لینا پڑا۔

کہنے لگے۔ ''ڈینو کے گھر والوں کو اس سے دگنی رقم کا چیک بھجوا دیا ہے۔''

میں دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ وہ رقم ڈینو کی جان کی قیمت نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر انصاری صاحب کے بس میں تو ڈینو کے گھر والوں کی دل جوئی اور مالی امداد ہی تھی۔ جس سے انھوں نے لاغرضی نہیں برتی تھی۔ ہم نے چند لمحے ڈینو کے بارے گفتگو کی اس دوران ان کی بیوی شہناز بیگم کافی بنوا کر لے آئی تھی۔ یہ وہی ڈرائینگ روم تھا جہاں چند ماہ پہلے انصاری اپنی بیٹی کو یاد کر کے آنسو بہا رہے تھے اور آج اللہ پاک کے فضل و کرم سے جان سے پیاری بیٹی ان کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ جس کے لیے سبب اللہ پاک نے مجھے بنایا تھا۔ تبھی وہ اتنی محبت و شفقت سے پیش آ رہے تھے۔

دوران گفتگو کہنے لگے۔

''بیٹا! جانتے ہو، پری وش کو انڈیا سے لانے اور شکلا کے وجود سے دھرتی کو نجات دینے سے بھی بڑا کارنامہ پری وش کی غلط فہمی دور کرنا تھا۔ اس بارے تمھاری جتنی تعریف کروں کم ہے۔ راجپوت کی گفتگو کو ریکارڈ کرنے کا منصوبہ تمھارے ذہانت و سمجھداری کو ظاہر کرتا ہے۔ اور پھر جس طرح تم نے پری کو سنبھالا، اس کی جان بچائی، خیال رکھا۔ بلاشک شبہ یہ شکریے یا انعام سے بہت بڑھ کر تھا۔ میں اور میری پری ہمیشہ تمھارے مقروض رہیں گے۔''

میں ہنسا۔ ''سر اس نے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان جا کر مجھے منہ مانگا انعام دے گی، مگر یہاں آتے ہی سارے وعدے یوں بھلا دیے ہیں جیسے سیاستدانوں کو الیکشن کے بعد کچھ یاد نہیں رہتا۔''

انصاری صاحب نے بلند بانگ قہقہہ لگایا۔ ''اس بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

وہ برہمی سے بولی۔ ''پاپا! اس نے وہاں ہم سے کئی بار بدتمیزی کی تھی، ہمارا مذاق اڑایا، پیدل چلایا، سردی و بارش میں سخت زمین پر لٹایا، ہم رات بھر بخار میں تڑپتے رہے اور اس کے کان پر جوں بھی نہ رینگی، پوری رات پہاڑوں میں گھسیٹا، کئی مرتبہ ڈانٹا، توہین و تنقیص کی، ڈرایا، جھڑکا، طعنے دیے۔ آپ ہی بتائیں ایسا شخص انعام کا حق دار ہوسکتا ہے۔ تب کہتا تھا پاکستان جا کر معافی مانگ لوں گا، یہاں ذکر ہی نہیں کیا۔''

انصاری صاحب ہنسی دباتے ہوئے بہ ظاہر سنجیدگی سے میری جانب متوجہ ہوئے۔ ''کوئی جواب ہے جوان۔''

''سر یہ سارے واقعات حالات کی وجہ سے پیش آئے۔ میں اگر خود سوار ہوتا اور اسے پیدل چلاتا تب تو بات تھی، میں بھی تو اس کے ہمراہ پیدل ہی بھاگتا رہا ہوں۔ باقی عبدالخالق نے ہمیں چند دن پناہ دی اس کی بیٹی کو تو اپنا ہیرے کا لاکٹ تحفے میں دے دیا، مگر مجھ سے اتنا خرچا کروانے کے باوجود جھوٹے منہ بھی نہ پوچھا۔ اور رہی معافی کی بات تو پہلے ہی دن آپ سے درخواست کی تھی کہ مجھے پری وش سے معافی دلوا دیں۔''

انصاری صاحب نے میری سفارش کی۔ ''ویسے، مجبوریاں اور حالات بھی دیکھے جاتے ہیں۔ اس لیے معاف کردو۔ بے چارے نے اتنی کوشش و محنت کر کے تمھیں بھارت سے نکالا ہے۔''

وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''پاپا! کسی کسی کو معاف کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ بس آپ انھیں منع کر دیں کہ آئندہ ہمارے گھر نہ آیا کرے کیوں کہ ہمارے درمیان موجود طبقاتی فرق ہمیں بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے کلائی سے بریسلٹ اور کانوں سے ہیرا جڑے ٹاپس نکالتے ہوئے شیشے کی میز پر رکھے۔ ''یہ بھی انھیں دے دیجیے گا۔ تاکہ اپنی دونوں بیویوں کو قیمتی تحفہ دے سکے۔'' یہ کہتے ہی وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

بات مذاق کی حد عبور کر چکی تھی۔ مجھے سبکی محسوس ہوئی لیکن اظہار کی جرأت نہ کر سکا۔ انصاری صاحب کے لبوں پر کھسیانا تبسم ابھرا۔ ''اسے کیا ہوا ہے؟''

میں توہین کا کڑوا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے بولا۔ ''اسی کو پتا ہوگا۔''

وہ خفت سے بولے۔ ''بے وقوف بچی سمجھ کر معاف کر دینا بیٹا۔''

میں ملتجی ہوا۔ ''سر! اگر اجازت دیں تو میں گھر چلا جاؤں۔ پلوشے نے کہا تھا کہ لازماً واپس لوٹوں، یہ نہ ہو ناراض ہو جائے۔ اب آپ نے یوں بھی آرام کرنا ہے۔''

وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولے۔ ''جیسا مناسب سمجھو۔''

میں نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر بکھیرتے ہوئے ان سے الوداعی معانقہ کیا اور پیشہ ورانہ سیلوٹ کر کے نکل آیا۔ پرما کے بریسلٹ وغیرہ کو نہ میں نے ہاتھ لگایا تھا نہ انصاری صاحب نے اس بارے کچھ کہا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں تین بجے کا ہندسہ عبور کر چکی تھیں۔ پرما کے الجھے ہوئے رویے کو سوچتے ہوئے میں چکالہ کینٹ سے نکل آیا تھا۔

دو تین دنوں بعد میں نے ڈینو کے گھر جانے کا پروگرام بنایا۔ اس کا تعلق حیدر آباد سے تھا۔ پلوشہ، روما، عدیل اور عبداللہ بھی میرے ساتھ ہی گئے تھے۔ ڈینو کا گھر شہر کے مضافات میں تھا۔ وہ غیر شادی شدہ تھا۔ اس کے باپ اور امی سے مل کر میں نے تعزیت کی ساتھ ہی انصاری صاحب سے ملا رقم کا چیک بھی ان کے حوالے کر دیا۔ ڈینو ان کا بڑا بیٹا تھا۔ اس سے چھوٹی ایک بہن اور بھائی اور بھی تھے۔

تھوڑی دیر ان کے ساتھ گزار کر ہم نکل آئے۔ وہاں سے کراچی پہنچے۔ دو تین دن وہاں گزارے اور واپس لوٹ آئے۔

اس کے بعد دو ماہ کیسے گزرے، قسم لے لو کہ کچھ سمجھ بھی لگی ہو۔ بس ایک دن کلینڈر پر نگاہ ڈالی تو اعلان کر رہا تھا کہ وہ

گھر میں میرا آخری دن ہے۔ اگلے دن میں یونٹ جانے کو تیار تھا۔ منیر نیازی کہتا ہے

صبح صادق کی ہوا میں درد تھا کتنا منیر
ریل کی سیٹی بجی تو دل لہو سے بھر گیا

اور یقیناً گھر سے نکلتے وقت ہر فوجی کے گھر والوں کے یہی احساسات ہوتے ہیں۔ نہ معلوم جانے والے نے اپنے قدموں پر یا لوٹنا تھا یا کسی کے کندھوں پر۔ صحیح سالم لوٹنا تھا یا بیساکھیوں پر۔ اور اگر اللہ پاک کے فضل کرم سے اسے کچھ بھی نہ ہوتا تب بھی اس کی جدائی اور اس سے دوری میں وقت کاٹنے کا روح فرسا خیال ہی سکون و آرام کا قاتل بنا رہتا ہے۔

شاکر شجاع آبادی کہتا ہے:۔

تیڈا اشا کرا جاں کوئی نکھڑیا نئیں
جیندے نکھڑے ہن اوندا حال تاں پچھ

(شاکر تیرا اب تک کوئی بچھڑا نہیں ہے جس کا بچھڑ چکا ہے جا کر اس کا حال پوچھو)

اور پاک آرمی کے کام میں کیڑے نکالنے والوں کو میرا یہ پیغام ہے کہ.....

جیوں عمر بھی ہیے شاکر دی
ہک منٹ نبھا، پتا لگ ویسی

(جیسے شاکر کی زندگی بیتی ہے، ایسے ایک منٹ گزار کر دکھاؤ پتا لگ جائے گا)

تلہ گنگ بس اڈے تک پلوشہ، روما، عدیل اور عبداللہ مجھے چھوڑنے آئے تھے۔ پلوشہ راولپنڈی تک ساتھ چلنے پر بہ ضد تھی لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔ بس چلنے تک وہ کھڑی رہیں۔

بس، اڈے سے نکلی اور میں سیٹ سے سر ٹیک کر آگے کا سوچنے لگا۔ دوران سروس ایک سنائپر کو آرام و سکون کے لمحات کم ہی نصیب ہوتے ہیں۔ ایک مشن کی تکمیل کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ آگے راوی چین و سکون لکھے گا۔ ہماری کہانی کا اختتام روایتی کہانیوں کی طرح ''وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔'' کے خوش کن فقرے پر نہیں ہو سکتا۔ جب تک جان باقی ہے، جب تک کچھ کرنے کی سکت جسم میں موجود ہے، جب تک مادر وطن کو میری ضرورت ہے، جب تک دشمنوں کی کارروائیاں جاری ہیں، جب تک غدار سازشوں میں لگے ہیں، پاکستان کے بیٹے بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتے۔ اور دشمن کے لیے ہر سپاہی، عہدہ دار اور آفیسر بہ زبان شاعر یہ اعلان کرتا نظر آتا ہے.....

میرا دشمن مجھے کمزور سمجھنے والا
دیکھے مجھ کو کبھی تاریخ کے آئینے میں
میں نے ہر دور میں توڑا ہے رعونت کا طلسم
میں نے ہر عہد میں اک باب نیا لکھا ہے
میرا دشمن یہ حقیقت نہ فراموش کرے
بیعت ظلم و ستم میری روایت ہی نہیں
مجھ کو میدان سے پسپائی کی عادت ہی نہیں
عرصہ بدر میں کردار نبی ہوتا ہوں
دشت کربل ہو تو میں ابن علی ہوتا ہوں

آخر میں فقط اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ آنے والے وقت سے ہر شخص انجان و بے خبر ہوتا ہے۔ مستقبل کو جاننے والی

ذات صرف اللہ پاک کی ہے۔ یونٹ میں کون سا مشن میرا منتظر تھا، کون سی ذمہ داریاں میری راہ تک رہی تھیں اور آگے کیا کرنا تھا اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ زندگی کسی اور معرکے کی اجازت دیتی یا مہلت پوری ہو چکی ہے اس سے میرا رب ہی واقف ہے۔ پھر آپ سے گفتگو ہو پائے گی یا نہیں اس سے بھی میں ناواقف ہوں۔ مجھ سے کئی گنا بہتر اور نگڑے گمنام ہیرو وطن کی خاک پر قربان ہو چکے ہیں۔ میں خود کو ان کی کف پا کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔ کسی بھی دور میں وطن خداداد کی حفاظت پر جان قربان کرنے والوں کی تعداد میں کمی نہیں ہوئی ہے اور مجھے فخر ہے کہ اللہ پاک نے مجھ جیسے کمزور، ناکارہ اور بے بس کو بھی اس فہرست میں شامل ہونے کا اعزاز بخشا ہے۔

بس موڑ وے پر چڑھ کر راولپنڈی کی جانب رواں دواں ہوئی اور میں کھڑکی کے شیشے سے دوڑتے مناظر کو دیکھتے ہوئے آنے والے حالات کے لیے خود کو تیار کرنے لگا۔

(تمت بالخیر)